Scanned by CamScanner

Mirza Athar Baig's narrative addresses the everlasting questions and conflicts between life and death, being and nothingness, meaningfulness and absurdity, and allied issues human beings have always faced and addressed. His exploration of different strata of life around makes his work a worthy achievement... His command over language is tremendous and unprecedented in current times.

(Dr. Abrar Ahmad, The News)

The novel revolves round uselessness of human condition born out of borrowed intellectualism. It throws up a post-existentialism debate in a society not equipped with its own intellectual tools and thus unable to document and analyze its unique predicament.... It is an attempt at capturing the inner chaos that simmers underneath a seemingly composed façade of everyday life.

(Murtaza Razvi, Dawn)

"جو لوگ آج کے دور کو تخلیقی بنجر پن سے موسوم کرتے ہیں۔ اُن کو "غلام باغ" کی شکل میں شافی جواب مل گیا ہے۔"

(امجد طفیل، ادبِ لطیف)

یہ ناول ہم اپنے تمام ان خصوصی دوستوں کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں جو ناول کے کرداروں کے حیرت کدہ میں سے ایک حیرانی کو دریافت کرتے ہیں

عبداللہ عتیق

Scanned by CamScanner

ہمارا واٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر ذیل میں ہیں

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارے واٹس ایپ گروپ میں شامل ہونے کے لیے

محمد ذوالقرنین حیدر03123050300

پروفیسر سدرہ ریاض صاحبہ03340120123

محمد ثاقب ریاض03447227224

Scanned by CamScanner

اس ناول کو سافٹ میں تبدیل
کرنے کے لیے خصوصی تحریک جن
سے ملی اور جنہوں نے اس ناول
سے مجھے متعارف کروایا.... نہایت
محبت کرنے والی (نمی) کا خصوصی
شکریہ
عبداللہ عتیق

Scanned by CamScanner

غلام باغ

(ناول)

19-4-19

03478848884

مرزا اطہر بیگ

167

سانجھ

Scanned by CamScanner

غلام باغ — ناول — مرزا اطہر بیگ

سانجھ پبلیکیشنز نے نوید حفیظ پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر
46/2 مزنگ روڈ لاہور پاکستان سے شائع کی۔

اشاعتِ ششم : 2018ء

قیمت : 1600 روپے (مجلد)

اس ناول کے تمام کردار، واقعات، مقامات، حوالہ جات (کتب و تاریخ) سب فرضی ہیں۔
کسی سطح پر کسی حقیقی صورتِ حال سے کسی قسم کی کوئی بھی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔ اس سے
پہلے (۲۰۰۶، ۲۰۰۷، ۲۰۱۲، ۲۰۱۳ اور ۲۰۱۵ء میں) اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

Ghulam Bagh
(*Urdu* Novel by *Mirza At'her Baig*)

Printed by:
Naveed Hafeez Printers, Lahore, Pakistan

Price:
In Pakistan Rs. 1600

Published by:
سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN:978-969-593-273-5

Scanned by CamScanner

فہرست

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

ارذل نسلوں کے نام

Scanned by CamScanner

باب(1)

کیفے غلام باغ

''اِسی لمحے میں دیکھو۔'' کبیر نے کہا۔

''لمحہ؟ کیسا لمحہ؟'' ڈاکٹر ناصر اچاٹ سے نیم سوالیہ انداز میں بڑبڑایا اور ایک بار پھر سے سوچنے لگا کہ کیفے غلام باغ کا بیرا عاشق علی آخر ابھی تک اُن کی چائے لے کر کیوں نہیں آیا؟ ٹھیک ہے کہ پرانے گاہک ہونے کے ناطے وہ اُن کی چائے خصوصی دلچسپی اور بقول اس کے ''اسپیشل طریقے'' سے بناتا ہے اور کوئی بھی کام اگر اسپیشل طریقے سے کیا جائے تو وہ زیادہ وقت ضرور لیتا ہے لیکن پھر بھی اب تک تو عاشق علی کو آ ہی جانا چاہیے لیکن ڈاکٹر ناصر کی اس شدید خواہش کے باوجود بھی جب کیفے غلام باغ کے کچن سے عاشق علی بیرا برآمد نہ ہوا تو اس نے سامنے بیٹھے کبیر کو باقاعدہ دیکھا۔ باقاعدہ اس لیے کہ یوں تو اُس کی نظریں پہلے بھی اُسی پر جمی تھیں لیکن پہلے وہ کُھلی آنکھوں سے کچھ نہ دیکھنے کی کیفیت میں تھا۔

کبیر اسے معمول سے کچھ زیادہ ہی بیزار دکھائی دیا۔

''ہاں......وہ تم کسی لمحے کی بات کر رہے تھے۔''

''نہیں ......میں بک بک کر رہا تھا۔'' کبیر نے ناصر کی استہزائیہ مسکراہٹ کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''اِس میں کیا شک ہے۔ گزشتہ بیس منٹ سے تم یہی کچھ تو کر رہے ہو...... بک بک۔ اچھا۔ نہیں۔ ہاں کیا تھا وہ لمحہ تمہارا۔ کچھ کہہ رہے تھے تم۔''

''میں کہتا ہوں کہ اِسی لمحے میں دیکھو''۔

ڈاکٹر ناصر نے ذہن پر زور دینے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''ہاں تو کیا ہے، اس لمحے

Scanned by CamScanner

ہیں۔ اس وقت...... میری گھڑی میں شام کے آٹھ بج کر تیس منٹ اور اکتالیس سیکنڈ ہوئے ہیں جبکہ ہمارے اس پیارے کیفے غلام باغ کے اس پھٹیچر کلاک میں آٹھ بج کر تیس منٹ ہو چکے ہیں اور سیکنڈ وغیرہ کوئی بھی نہیں ہوا کیونکہ اس کی سیکنڈ کی سوئی ہی نہیں ہے۔ اگر لمحے سے تمہاری مراد یہی لمحہ ہے تو اس میں کیا ہے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ تم یعنی کبیر مہدی قلمی نام ابن بشرا یک مایوس و نامراد مصنف میرے سامنے بیٹھے ہو، اور اب میری بک بک سن رہے ہو۔ میں اُس کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں کی راہ سے باہر برستی بارش کو دیکھ سکتا ہوں جو مارچ کی درمیانی تاریخوں میں برسنے کی وجہ سے لوگوں کو بے وقت سی لگتی ہے اور ساتھ ساتھ میں سوچتا جا رہا ہوں کہ عاشق علی بیرا پتا نہیں کہاں جا کر مر گیا ہے۔ غالباً تمہارے اسی لمحے میں وہ اندر کچن میں ہمارے لیے چائے دانی میں اُبلتا ہوا پانی ڈال رہا ہوگا لیکن چونکہ میں اُسے دیکھ نہیں سکتا اِس لیے پتا نہیں وہ کیا کر رہا ہوگا۔ لیکن کچھ نہ کچھ ضرور کر رہا ہوگا۔ اسی طرح میرے پیارے کبیر مہدی تمہارے اس لمحے میں ساری دنیا میں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہوگا...... ہزاروں انسان پیدا ہوئے ہوں گے اور ہزاروں ہی مرے ہوں گے۔ اربوں کھربوں۔ بڑے سے بڑا عدد لگالو۔ ایٹم ٹوٹ کر دیگر ذرات وغیرہ میں بدل گئے ہوں گے اور یقیناً میرے بالائی عصبی نظام میں کچھ ایسی کیمیائی تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کے ناخوشگوار اثرات کا توڑ عمدہ تازہ چائے میں ہے جس میں کیفین کی مقدار وافر ہوتی ہے اور کیفین ایک الکلائیڈ ہے جبکہ عاشق علی بیرا ایک انسان ہے...... اور وہ خبیث ابھی تک چائے نہیں لایا اور......" ڈاکٹر ناصر سانس لینے کے لیے رُکا۔ کبیر اب ایک محبت آمیز تحیّر سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گُرو اپنے نالائق چیلے کی کسی غیر متوقع عمدہ کارکردگی پر بے یقین شفقت کا اظہار کرتا ہے۔ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ کہ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ پھر وہی گدھے کا گدھا بن جائے گا۔

"ڈاکٹر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ تم بھی یعنی۔۔۔ بعض اوقات اچھی خاصی عمدہ بک بک کر لیتے ہو یعنی ابھی یہ جو کچھ تم کہہ رہے تھے اس سے اگرچہ یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم ابھی تک اسی لمحے میں دیکھنے پر میرے برابر اصرار کی اصل روح تک پہنچنے سے قاصر رہے ہو۔ کیونکہ تمہارا ذہن ہی اس قابل نہیں شاید لیکن پھر بھی تمہارے اِس کلام میں ایک طرح کا "چیزا" ضرور تھا......"

"چیزا کیا؟" ڈاکٹر نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے پوچھا، جواباً کبیر نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے

Scanned by CamScanner

اسے مزید کلام سے باز رہنے کا اشارہ کیا اور بولا ''بے وقوف آدمی، لمحہ سے میری مراد کوئی خارجی اور معروضی لمحہ نہیں جس میں تمہارے یہ طرح طرح کے واقعے ہوتے پھرتے ہیں۔ پوری کائنات میں ایسا کوئی معروضی لمحہ موجود نہیں جو پوری کائنات پر محیط ہو۔ اس صدی کے شروع میں ہی اضافیت کے نظریے نے ثابت کر دیا تھا......''

''مجھے سائنس پڑھانے کی کوشش نہ کیا کرو، ادبی انسان۔'' ڈاکٹر ناصر نے جوابی وار کرنے کے اس موقعے سے فوری فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بنیادی سائنسی علوم پر مجھ سے کوئی بات کرتے وقت ذرا محتاط رہا کرو اور یہ مت بھولا کرو کہ تم بمشکل ایف۔ ایس۔ سی کر سکے تھے اور اس کے بعد تمہیں آرٹس کی طرف دھتکار دیا گیا تھا جو کہ ہمارے ہاں خدا کا شکر ہے کہ نالائقی اور کم عقلی کی پکی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ بہت اچھا ہے! ورنہ تو تم جیسے لوگ بالکل جان کو ہی آ جاتے۔ ہاں اب آگے بکو۔''

''تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ ایم بی بی ایس کرنے اور آج کل اپنی اس سائیکیاٹری میں ہاؤس جاب کرنے یعنی پاگلوں کا گھریلو کام کاج کر کے...... ہنسو مت ڈاکٹر میں سنجیدہ ہوں۔ یعنی تم سائنس کی اصلیت جان گئے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ایک سطحی سی خارجیت اور ایک اتھلی سی معروضیت تمہارے ساتھ ساتھ لنگڑاتی پھرتی ہے اور بس۔''

لیکن ڈاکٹر ناصر اب بھی ہنس رہا تھا۔ کبیر کی مخصوص زبان میں ہاؤس جاب کو ''پاگلوں کا گھریلو کام کاج کرنا'' قرار دیے جانے پر اس کے اندر کچھ ایسی اتھل پتھل ہوئی تھی کہ سارا موڈ ہی بدل گیا تھا اور اب وہ کبیر کو محبت آمیز تحیر سے دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے یہ احساس تھا کہ اپنے تمام تر سنکی پن کے باوجود یہ شخص اکثر زندگی کو قابلِ برداشت بناتا رہتا ہے، خواہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔

''ہاں تم وہ کسی لمحے میں 'سوری' اسی لمحے میں دیکھنے کی بات کر رہے تھے۔''

''دفع کرو۔'' کبیر نے منہ پھلا کر کہا۔

''نہیں پلیز میں سنجیدہ ہوں۔ غالباً تم کہنا چاہتے ہو کہ لمحے سے مراد وہ لمحہ نہیں جو گھڑیوں سے ناپا جاتا ہے۔''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں، احمق انسان، کہ وقت کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ محض ایک واہمہ ہے۔''

Scanned by CamScanner

''کیا واقعی؟'' ڈاکٹر کوشش کے باوجود اس بار بھی اپنی سوالیہ حیرت میں سے تمسخر کی پرچھائیوں کو غائب نہ کرسکا لیکن کبیر اب پوری شدت سے اپنے اُس مخصوص اشتعال کی زد میں آچکا تھا جس کا علاج ذہنی امراض کے معالج اُس کے عزیز از جان دوست ڈاکٹر ناصر کے پاس تو کم از کم ہر گز نہیں تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے راضی برضائے الٰہی قسم کی کیفیت ذہن پر طاری کی اور سننے لگا۔

اب کبیر پُر جوش انداز میں بولنا شروع ہو گیا تھا:

''ماضی محض تاسف ہے یا پھر کبھی کبھار یہ احساسِ فخر بھی بن جاتا ہے اور مستقبل بس ایک خدشہ ہے یا پھر امید۔ اور یہ چاروں احساس لمحۂ حال کے کیپسول میں بند ہیں۔ کیپسول سمجھتے ہوناں؟''

''میرا خیال ہے بحیثیت ڈاکٹر میرا واسطہ کئی قسم کے کیپسولوں سے پڑتا ہے۔''

''لیکن اس کیپسول سے نہیں پڑا ہو گا۔'' کبیر نے گرج کر کہا اور کیفے غلام باغ کے کئی پُرسکون گاہکوں نے اُن کی طرف دیکھا۔ کبیر پُرسکون گاہکوں کی بھلا کب پروا کرتا تھا۔ وہ اور بھی جوش سے وقت کے کیپسول کی وضاحت کرنے لگا۔

''لمحۂ حال کے کیپسول کے گرد کئی دائروں کا خول ہوتا ہے۔ چھوٹا دائرہ پھر اُس سے بڑا دائرہ۔ اور یہ مستقبل قریب سے مستقبل بعید تک کے دائرے ہیں جن کے مرکز میں ماضی ہے۔ یعنی دیکھو یہ جو شے ابھی تمہارے'' کبیر نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یعنی سامنے بیٹھی ہے''۔

''شے! کون سی شے؟''

''میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ میں اس شے کا ماضی پورے کا پورا یعنی کوہستان نمک کے اُس چھوٹے سے دُور افتادہ گاؤں سنمیال میں پیدائش سے لے کر اُسی علاقے کے ایک سکول میں میٹرک کرنے تک اور پھر دنیا میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے عزم کے ساتھ میدانوں میں واقع اس بڑے شہر میں اُترنے تک اور پھر سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکان کی دوسری منزل پر واقع کباڑ خانے میں رہائش پذیر ہونے تک، یہ سب ماضی کا ایک مرکز ہے جو کہ تاسف ہے۔ لیکن کہیں کہیں فخر بھی ہے۔ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں اور اس مرکز کے گرد خوف اور امید کے دائرے ہیں۔ پہلا دائرہ تو اس ناقابلِ تردید حقیقت کا ہے کہ ابھی ابھی عاشق علی بیرا ہمارے لیے چائے لائے گا۔

Scanned by CamScanner

''ماسپیشل'' جسے ہم پیئیں گے۔ پھر ہم کیفے غلام باغ سے نکل جائیں گے۔ باہر غلام باغ اور بڑے شہر میں بارش ہو رہی ہے لیکن اسی بارش میں بھیگتے ہوئے ہی مجھے جانا پڑے گا۔ غلام باغ سے نکل کر سڑک تک اور سڑک پر چلتے چلتے آخر کار ''عصری ڈائجسٹ'' کے دفتر تک جہاں مجھے افریقہ میں آدم خور شیر کے لرزہ خیز شکار کی یہ کہانی دینی ہے جو اس وقت میری جیب میں ہے۔'' اُس نے جیب تھپتھپائی، ''اور پھر وہاں سے اپنے گھونسلے میں یعنی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے سٹور میں رات سونے جانا ہے۔ یہ تو آج کا دائرہ ہے اور پھر اس کے آگے کل کا، پھر اگلے مہینے کا، پھر اگلے سال کا، پھر اُس سے اگلے سال کا اور پھر اُس مہینے اور دن کا جو میری موت ہے۔ اور یہ سب کچھ میں اسی لمحے میں دیکھ سکتا ہوں۔ اور اگر تم چاہو تو تم بھی ڈاکٹر ناصر اسی لمحے میں اپنے مستقبل کے سب دائرے دیکھ سکتے ہو۔''

ڈاکٹر ناصر نے گہرا سانس کھینچا اور ایسے موقعوں کے معمول کے عین مطابق ایک پیشہ ورانہ تشویش کے ساتھ کبیر کو دیکھا جو اب پُرسکون نظر آرہا تھا جیسے کامیابی سے اپنا کیس پیش کر چکا ہو۔

''مجھے لگتا ہے کبیر کہ اگر سکالرز اولڈ بک شاپ کے اُس سٹور میں یعنی اپنے اُس منحوس گھونسلے میں تمہاری رہائش جاری رہی تو تم یقیناً پاگل ہو جاؤ گے۔''

اب قہقہہ لگانے کی باری کبیر کی تھی۔ ''ماہرین امراضِ دماغی 'پاگل' کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ ڈاکٹر تم پہلے اپنے پیشے کی اخلاقیات تو سیکھو...... ویسے بھی تم برس ہا برس سے میرے پاگل ہو جانے کی پیشین گوئی کر رہے ہو، بلکہ میں تو کہوں گا کہ دلی خواہش کا اظہار کر رہے ہو۔ لیکن میں بفضلِ تعالیٰ دیگر احباب کا دماغ خراب کر رہا ہوں۔ یار یہ عاشق علی ابھی تک چائے نہیں لایا۔ میرا خیال ہے گھنٹہ تو ہو گیا اُسے، کمال ہے؟''

ڈاکٹر ناصر نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ چائے جیسی عام چیز کا خیال آنے پر یہ شخص کم از کم روزمرہ کی زمینی سطح پر تو آ گیا ہے لیکن فوراً ہی اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ کبیر ابھی پوری طرح خالی نہیں ہوا تھا اور پھر بولنے لگا تھا۔

''دراصل یار ڈاکٹر میرے اندر، میں پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں لیکن ایک بار پھر بتانے میں کوئی حرج نہیں، میرے اندر ایک دم سے کھلبلاہٹ ہوتی ہے۔ خیالوں، واہموں، پرچھائیوں، تصویروں، رنگوں، آوازوں، خوشبوؤں، ذائقوں حتیٰ کہ درد یلے اور لذیلے ...... میرے نزدیک

Scanned by CamScanner

لذیذ کی بجائے لذلیل ہونا چاہیے۔ اس میں ذلیل ہونا بھی شامل ہو جاتا ہے اور یہ زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ یہ کہ لذت کی خاطر انسان ابتدائے آفرینش سے ذلیل ہو رہا ہے وغیرہ۔ اگر یہ لفظ غلط ہے تو پرواہ نہیں...... اور لمسوں کی یورش شروع ہو جاتی ہے اور پھر کہیں سے لفظوں کی فوج ظفر موج ٹڈی دل کی طرح ان سب پر یلغار کر دیتی ہے، عجب گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ عجیب پکڑ دھکڑ، الامان والحفیظ ایسی افراتفری اور تلاطم برپا ہوتا ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔ نتیجہ یہ کہ میں پھر وہی بک بک کرنے لگتا ہوں۔ اگر کوئی تمہارے جیسا صابر سامع سامنے ہو تو غنیمت ہے۔ نہیں تو کاغذ پر گھسیٹ ڈالتا ہوں لیکن جو نتیجہ سامنے آتا ہے، اے وائے، وہ نہ تو نظم ہوتا ہے اور نہ غزل۔ سرے سے شعر ہی نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی شریفانہ نثر پارہ، کوئی افسانہ، ناول، نہ ڈراما، وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس ایک بک بک ہوتا ہے...... یار سنو...... میں کبھی سوچتا ہوں کہ کیوں نہ "بک بک" کے نام سے ایک نئی صنفِ ادب کی دریافت کا اعلان کر دیا جائے اور اس دریافت کو ہی میں دنیا میں اپنا اصل کام قرار دے دوں۔"

"تمہارا اصل کام! میرے عزیز، اب تم تیس سے اوپر جا چکے ہو۔ تیس سے اوپر دماغ کے سیل زیادہ تیزی سے ختم ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے بھول جاؤ۔ تمہارا اصل کام بس اب یہی ہوگا کہ سارنگ، ابنِ بشر اور اسی قماش کے دوسرے جعلی ناموں سے مختلف ڈائجسٹوں، رسالوں اور اخباروں میں واہی تباہی قسم کے مضمون لکھتے پھرو۔"

"بکومت، ایک وقت آئے گا جب میں کبیر کے نام سے ہی لکھوں گا۔ جب میرا اصل کام سامنے آئے گا تو وہ کبیر مہدی کے نام سے ہی ہوگا۔"

"لیکن اس وقت تک تو کبیر مہدی کو کوئی نہیں جانتا۔ ہاں سارنگ کی ریڈر شپ کافی ہے۔ سنسنی خیز، معلومات افزا، اخلاقی، سیاسی، سائنسی، فلسفیانہ، نفسیاتی موضوعات کو عامیانہ انداز میں پیش کرنے کا ماہر فری لانسر"۔ ڈاکٹر ناصر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ جواباً کبیر نے ایک طنزیہ اور انتقامی سا قہقہہ لگایا اور پھر یک دم عجیب لاتعلقی سے کیفے غلام باغ کی کھڑکی کی راہ سے باہر رات میں دیکھنے لگا جو وسط مارچ میں غلام باغ اور پھر بڑے شہر میں پھیلی ہوئی تھی اور جس میں تیز بارش مسلسل برسے جاتی تھی۔

Scanned by CamScanner

O

عاشق علی بیرا اچانک آ گیا لیکن اُس کے ہاتھ میں چائے کی کوئی ٹرے نہیں تھی۔ یوں بھی اُس وقت وہ اپنے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھام سکتا تھا کیونکہ اس کے باقی جسم کے ساتھ اُس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اور اس کے کپڑے بھی بھیگے ہوئے تھے۔ کیفے غلام باغ میں اُس شام موجود چند دوسرے گاہکوں نے ایک مضمحل سی حیرت سے اُسے دیکھا اور نظر انداز کر گئے کیونکہ اُن میں سے بیشتر نشے کے بعد میٹھی چائے پینے وہاں آئے تھے اور انہیں خواہ مخواہ پریشان کر دینے والے نظاروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن کبیر اور ڈاکٹر ناصر، عاشق علی کو اُس ابتری کی سی کیفیت میں دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ پھر اُن کے کسی سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔ وہ خاص طور پر ڈاکٹر ناصر سے مخاطب تھا اور اس کے لہجے سے بیک وقت اضطراب اور التجا ظاہر ہوتی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب جی، خدا کے لیے جلدی چلیے۔''

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ کیا بات ہے؟'' ڈاکٹر نے فوری طور پر تشخیصی انداز اپناتے ہوئے اور عاشق علی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''بس آپ چل کر اُسے دیکھ لیں، بھائی مدد علی کو۔ کچن میں لٹایا ہے۔ ارشاد اور مقبروں کا چوکیدار اکرم اُسے اٹھا کر لائے تھے، پچھلے والے دروازے سے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے اُسے مارا بھی ہے بھائی مدد علی کو۔ وہ مانتا نہیں لیکن حرامی نے ضرور مارا ہوگا بھائی کو۔ جبھی تو وہ بے ہوش ہوا۔ شکر ہے آپ یہاں موجود ہیں۔ آپ اسے دیکھ لیں۔ جلدی کیجئے ڈاکٹر صاحب جی۔''

''مدد علی تمہارا وہی بھائی ہے نا جو گھوڑوں کے لیے مصالحہ بناتا ہے اور غلام باغ کے کھنڈروں میں چوری چھپے نوادرات ڈھونڈتا ہے؟'' کبیر نے پوچھا۔

''ہاں جی وہی ہے۔ بالکل وہی جی۔ یہ آخری بات یہاں نہ کہیں جی۔ کوئی سن لے گا۔ چلیں ڈاکٹر صاحب۔'' عاشق علی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر اور کبیر فوراً اٹھ گئے اور عاشق علی کے پیچھے پیچھے تیزی سے کیفے کے کچن کی طرف بڑھے۔ گاہکوں کے یوں تیزی سے اٹھ کر بیرے کے ہمراہ لپکتے ہوئے کچن میں جا گھسنے کے بظاہر مشکوک منظر کو بھی نشے کے بعد میٹھی چائے پینے والوں نے نظر انداز کر دیا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہوگا کہ کیفے غلام باغ محض نشے بازوں کا کوئی ڈیرہ تھا۔ نشئی لوگ تو بس غلام باغ کے کھنڈروں، ٹوٹے پھوٹے حوضوں اور ایا بیلوں کے مسکن بنے اجڑے

Scanned by CamScanner

مسمار مقبروں میں گہری شام کی پُرسکون خاموشی ڈھونڈنے آتے تھے تاکہ وہاں وہ کسی خطرے سے آزاد ہو کر چند لمحے شغل کر سکیں، اور پھر کبھی کبھی اپنے اپنے نشے اپنے اوپر لادے وہ سہمے سہمے ڈرے ڈرے کیفے غلام باغ میں میٹھی چائے پینے بھی آ جاتے تھے اور مرعوب سے ہو کر کیفے کے ایک کونے میں بیٹھ جاتے تھے۔ اگرچہ کیفے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اُس سے مرعوب ہوا جاتا بلکہ غلام باغ کے ایک کونے میں واقع ہونے کی وجہ سے تو بعض اوقات وہ سستا سا چائے کا ہوٹل بھی عہدِ رفتہ کی ایک برباد شدہ باقیات دکھائی دیتا تھا اور گمان ہوتا تھا کہ اگر مغل شہزادیاں نہیں تو کسی انگریزی پلاٹون کے نامی سپاہی اِدھر چائے بلکہ شراب نوشی تو ضرور کرتے رہے ہوں گے۔

نشہ پانی کرنے والے دراصل کیفے غلام باغ کے معمول کے دیگر گاہکوں سے مرعوب ہوتے تھے۔ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کے طالب علم، ہاؤس جاب کرنے والے نوجوان ڈاکٹر اور بعض ریڈیکل قسم کے دانشور اکثر یہاں بیٹھتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب غلام باغ کو بڑے شہر کے مضافات میں واقع آثارِ قدیمہ میں شامل کیا جاتا تھا لیکن پھر جب بڑا شہر اور بھی بڑا ہوتا چلا گیا اور جرنیلی سڑک کے کنارے واقع غلام باغ کے گرد و نواح میں علم و فن کی تدریس کے ادارے، تجارتی عمارتیں اور دیگر آبادی بڑھنے لگی تو غلام باغ پوری طرح شہر کی لپیٹ میں آ گیا اور مضافات پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ پھر تو یہ حال تھا کہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے لیے عہدِ قدیم کی اُس یادگار کو آبادی کے رہائشی دباؤ سے بچانا بھی خاصا مشکل ہو گیا تھا اور غلام باغ کے بیرونی کنارے اکثر ملکیتی دعووں کی حریصانہ زد میں آتے رہتے تھے۔ اس طرح کے کئی مقدمے اکثر عدالتوں میں چلتے رہتے تھے۔ ایسے ہی ایک مقدمے کو اُس وقت بین الاقوامی شہرت ملی تھی جب بڑے شہر کے ایک بااثر اور اونچی سیاسی پہنچ والے نوابزادے نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے چند مؤرخین اور محققین سے حسبِ منشا تحقیق کروا کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غلام باغ درحقیقت اس کے خاندان کی جدی پشتی ملکیت ہے۔ اُن دنوں عدالتوں کا حال ذرا پتلا ہی تھا اس لیے نواب صاحب خطرناک حد تک مقدمہ جیتنے کے قریب پہنچ گئے۔ پریس کے ذریعے یہ بات اُڑی کہ غلام باغ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی ملکیت میں جانے والا ہے۔

خبر ایک بین الاقوامی ادارے تک جا پہنچی اور عالمی ثقافت کو خطرے میں دیکھ کر مہذب اقوام بہت جز بز ہوئیں اور جلدی ہی بہت سے گورے عالم غلام باغ میں نظر آنے لگے۔ ہندو، مسلم، سکھ

Scanned by CamScanner

اور کمپنی بہادر کے تعمیراتی آثار کو یوں نجی ملکیت بنتے دیکھ کر انہوں نے بہت احتجاج کیا تو حکومت نے نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو کسی نہ کسی طرح قائل کر لیا کہ اب بات چونکہ خارجہ پالیسی تک پہنچ گئی ہے اس لیے وہ باز آ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب مذکور کو کچھ خصوصی مراعات دی گئیں۔ بہر حال تہذیب یافتہ اقوام کے ماہرین آثارِ قدیمہ نے سکھ کا سانس لیا اور غلام باغ پر اپنی تحقیقات اور بھی زیادہ شدومد سے شروع کر دیں کیونکہ وہ سبھی اور اُن کی پیروی میں مقامی عالم بھی اس بنیادی نظریے پر متفق تھے کہ غلام باغ دنیا کے اس خطے میں واقع آثارِ قدیمہ کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے اور عجب معمہ ہے۔

ان دنوں جبکہ یہ شہرۂ آفاق مقدمہ چل رہا تھا گوری اقوام کے مرد و زن اکثر کیفے غلام باغ میں بھی جلوہ افروز ہوتے تھے۔ جلوہ افروز اس لیے کہ جب کبھی کھنڈروں اور مقبروں کا چکر لگاتے لگاتے وہ اچانک اُس ستے سے چائے خانے کو دیکھتے تو ایک طرح کا تجسس، ایک کھلنڈری سی مہم جوئی اور مقامی آبادی کی ایک انوکھی سی سرپرستی کے نسلی جذبوں سے اُن کے دل لبریز ہو جاتے۔ پھر جب وہ کیفے میں داخل ہوتے تو کیفے میں بیٹھے سبھی بھورے کالے رنگ دار لوگ ان گوروں کی طرف ایک ذلت آمیز قبولیت اور انفعالیت سے لبریز استقبالیہ نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور کبیر ڈاکٹر ناصر سے اس طرح کی بات ضرور کیا کرتا تھا کہ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن چٹی چمڑی، گورے بدن کا جادو بڑا ظالم ہے۔ یہی دراصل کالا جادو ہے۔ سفید فام بندے کو دیکھ کر دل کے اندر کہیں گھونسا سا پڑتا ہے اور رنگ دار بندے کی جان نکلنے لگتی ہے۔ گوروں کو باقی ماندہ گندی گالیاں کبیر کیفے کے باہر جا کر دیا کرتا تھا۔ انہیں دنوں کبیر اور ڈاکٹر ناصر کی ایک نوجوان جرمن آرکیالوجسٹ فریڈرک ہاف مین سے بہت نشست رہنے لگی تھی۔ ہاف مین کے لیے کیفے میں دلچسپی کی ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ نشئی برادری اُس کو یورپی حساب سے بے انتہا سستے نرخوں پر چرس کے سگریٹ فروخت کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتی تھی۔ ان دنوں اس طبقے کی واقعی چاندی تھی۔

ہاف مین Hash کا دھواں پھیپھڑوں میں اتار کر، کبیر اور ڈاکٹر ناصر سے سوم رس کے اساطیری پس منظر اور Hash کے بنیادی کیمیاوی مرکبات کی بائیو کیمسٹری پر باتیں کیا کرتا تھا اور چونکہ مقامی اساطیر اور نشہ آور زہریلے پودوں کے موضوعات پر علی الترتیب کبیر اور ڈاکٹر ناصر اپنے

آپ کو اتھارٹی سمجھتے تھے اس لیے اُن سے اِن موضوعات پر گفتگو کے دوران سرخ ناک والا جرمن خاصا مرعوب نظر آیا کرتا تھا۔ لیکن پھر ایک دن کبیر نے ناصر کے سامنے یہ تکلیف دہ انکشاف کیا تھا: ''یہ...... مرعوب ہرگز نہیں ہوتا بلکہ محظوظ ہوتا ہے He is simply amused جیسے کمپنی بہادر کا کوئی گورا صاحب اپنے خانسامے کو انگریزی کے فقرے پہلی بار درست بولتے دیکھ کر amused ہوتا ہوگا......''

''لیکن ہاف مین تو جرمن ہے جبکہ کمپنی بہادر کا گورا صاحب جزائرِ برطانیہ......'' ناصر نے کہنا چاہا تھا لیکن کبیر نے اُس کی بات کاٹ کر کہا تھا: ''یہ سب گورے ایک ہیں۔ ان کی......اور ہمیں دیکھو ہم اُس پر اپنی اُس علمیت کا رعب جھاڑنے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں جو اُسی کی دی ہوئی ہے، اُسی کی عطا کی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہند مسلم تہذیب پر اتھارٹی ہم نہیں بلکہ یہ مستشرقین ہیں اور زہریلے پودوں کی بائیو کیمسٹری پر غالباً سب سے زیادہ کام جرمنوں کا ہے۔ I speak now English سر...... ٹھیک بولتاناں صاحب انگلش...... I cooking pudding with stew سر۔ خیر گل تم۔ اب اچھا انگلش بولتا۔ گڈ بوائے۔ You son of a bitch ۔ لیکن خیر گل دانت نکالتا ہے۔ اس آخری انگلش فقرے کا مطلب ابھی خیر گل نہیں جانتا۔ بات تیرے کی! میرا جی چاہتا ہے، ڈاکٹر ناصر، کہ ابھی اٹھوں اور منہ سے پٹ پٹ کی آوازیں نکالتا بھاگتا ہوا جاؤں اور باہر غلام باغ میں جنم کھنڈر کے کہیں آس پاس پیشاب کروں۔ اپنے ہی جنم کھنڈر میں پیشاب کروں۔''

''لیکن تم یہ کام بھاگے بغیر اور منہ سے پٹ پٹ کی آوازیں نکالے بغیر بھی سرانجام دے سکتے ہو۔'' ڈاکٹر ناصر نے جواباً کہا تھا اور اُن دنوں بھی احتیاطاً دل ہی دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ ''یہ شخص یقیناً پاگل ہو جائے گا۔''

لیکن حسبِ معمول کبیر پاگل نہ ہوا اور ہاف مین سے ان کی ملاقاتیں بھی منقطع نہ ہوئیں۔ Hash اور غلام باغ دونوں اُسے کچھ زیادہ ہی راس آ گئے تھے اور وہ آثارِ قدیمہ کے اس معمے پر مزید کام کرنے کے لیے چند سالوں کے لیے یہیں رک گیا تھا۔ اس کام کے لیے اُس نے یونیورسٹی سے خاصی خطیر گرانٹ بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ جرمن لہجے کی انگریزی میں کہتا تھا: ''تمہارا یہ غلام باغ ایک عجیب معمہ ہے۔ عجیب اسرار ہے اس چھوٹی سی جگہ میں جو دو فٹ بال گراؤنڈز سے زیادہ

بڑی نہیں ہے۔ موریہ عہد سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی تک کے آثار ملتے ہیں۔ کاش تمہاری گورنمنٹ مجھے جنم کھنڈر کے قریب کھدائی کرنے کی اجازت دے دے۔ کچھ عجب نہیں کہ ہم اس جگہ سے وادی سندھ کی تہذیب کا کوئی رشتہ بھی دریافت کرلیں۔''

جواباً کبیر طنزیہ انداز میں اس سے پوچھتا: ''یہ غالباً پانچواں سگریٹ ہے تمہارا۔''

''چھوڑو، دوست۔ Hash میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ Psychedelic Drug ہے۔ ڈاکٹر جانتا ہے۔ اس سے میرے تجزیاتی ذہن کو ایک تخیلاتی پرواز نصیب ہوتی ہے جو میرے پیشے کیلیے انتہائی ضروری ہے۔ جانتے ہو ایک آرکیالوجسٹ کو کیسا ہونا چاہیے؟ بیک وقت ایک خواب دیکھنے والا اور ایک کمینہ حقیقت پسند۔''

واقعی ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی بھی ایک طرح کی کمینگی ہی ہے۔ کبیر نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔ ظالم کیا بات کرتا ہے۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ غلام باغ کو نجی ملکیت بنانے میں تو ناکام رہا تھا، یوں بھی اسے یہ یقین تھا کہ ایسا کبھی ہو نہیں سکے گا لیکن عالمی سطح پر ثقافتی ورثوں سے محبت کرنے والوں میں یوں تھرتھلی ڈال کر اُسے ایک گونہ اطمینان ضرور نصیب ہوا تھا اور مزید یہ کہ ماضی کے کاٹھ کباڑ کی مالی قدر و قیمت اُس پر پہلے سے بھی زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ غلام باغ پورے کا پورا اس کی ملکیت تو نہ بنا لیکن پرانی چھوٹی اینٹوں کی دیواروں، مقبروں، کھنڈروں اور منقش تختوں میں بعض گوشے ایسے ضرور تھے جہاں سے کبھی کبھار نوادرات دریافت ہو جاتے تھے اور مُلکی عجائب گھر میں جگہ پانے کی بجائے وہ نواب صاحب کے ذاتی ذخیرے کی زینت بنتے تھے۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے آنے والے معزز غیر ملکی مہمانوں کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ وہ اکثر اپنی پرانی حویلی میں، جو بذاتِ خود کچھ کم تاریخی اہمیت کی حامل نہ تھی، اُن کی پُر تکلف دعوتیں کرتا اور انہیں بتاتا کہ ہوسکتا ہے مقدمہ جیتنے کے بعد وہ خود ہی رضا کارانہ طور پر غلام باغ کو حکومت کے حوالے کر دے، بطور تحفہ.....لیکن پہلے وہ قانون کا بول بالا چاہتا ہے اور نجی ملکیت کے تقدس کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، خواہ یہ تاریخی غلام باغ ہی کیوں نہ ہو۔ ان خصوصی دعوتوں کے موقعے پر مہمان نواب کے نوادرات کے ذخائر میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کرتے: منقش لکڑی کے دروازے، سوختہ مٹی کی اشیا، سیپ اور ہاتھی دانت کا کام۔ اس عجائب خانے کی اکثر اشیا غلام باغ کی برسوں

Scanned by CamScanner

کی کریدا کریدی اور نیم شی کھدائی کے نتیجے میں اس تک پہنچی تھیں اور یہ خطرناک کام برسوں سے اس کا پرانا سائیس مددعلی کیا کرتا تھا جواب سائیس نہیں رہا تھا کیونکہ عرصہ ہوا بڑے شہر میں بگھی چلنا بند ہوگئی تھی اور مددعلی کو اس نے بگھی سمیت فارغ کر کے اس کام پر مامور کیا تھا کہ وہ غلام باغ کی چھوٹی اینٹوں کے نیچے چھپے قیمتی خزانوں کو ڈھونڈ کر اُس کے عجائب گھر کی زینت بنانے میں اُس کی مدد کرے۔ کچھ بھی مل جائے بگر ہو پرانا۔ جتنا پرانا اتنا ہی بہتر...... کسی مغل شہزادی کی سرے دانی، کسی سکھ سردار کی کٹار یا کسی انگریزی سپاہی کی قمیض کا ٹوٹا ہوا بٹن...... کچھ بھی مل جانے پر نواب مددعلی کو اتنی رقم ضرور ادا کر دیتا تھا جو اس کا بھائی عاشق علی بیرا سارے ماہ میں بھی نہ کما سکتا تھا۔

لیکن اگر گرمیوں کی تپتی دوپہروں یا سردیوں کی ٹھنڈی کالی راتوں میں مددعلی، غلام باغ میں کسی غول بیابانی کی طرح چکراتا پھرتا تھا، تو اس کا مقصد صرف نواب کے لیے عجائبات ڈھونڈنا اور اپنے لیے پیسے کی سپلائی بحال رکھنا ہی نہ تھا۔ مددعلی اپنے ہی انداز میں اور اپنی ہی وجوہات کی بناء پر غلام باغ کے سحر میں گرفتار تھا۔ اُس کا بچپن اُسی باغ میں کھیلتے گزرا تھا۔ کھیلتے کھیلتے ایک دن اس نے غلام باغ میں ایسا کچھ دیکھ لیا تھا، ڈھونڈ لیا تھا جو اب بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ کسی کو بتاتا تھا تو لوگ دیوانہ کہتے تھے لیکن مددعلی کو یقین تھا کہ جب وہ بچہ تھا تو ایک دن جب وہ گرم لُو کے موسم میں دوسرے بچوں کے ساتھ جنم کھنڈر کی بھول بھلیوں میں چکر لگاتا پھرتا تھا تو اس نے ایک کھوکھلی سی دیوار کے پیچھے سیڑھیاں نیچے سرنگ میں اترتی دیکھی تھیں۔ وہ نیچے اترا تھا اور سامنے اشرفیوں سے بھرا ایک صندوقچہ پڑا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھاگتا ہوا اپنی اُس دریافت کے بارے میں سب کو بتانے آیا تھا لیکن پھر بھی اس صندوقچے اور ان سیڑھیوں تک نہ جا سکا تھا۔ پتا نہیں وہ سب کچھ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ پچاس سال بعد اب بھی حقیقت میں مددعلی اپنی انہی گم شدہ سیڑھیوں اور اشرفیوں کے صندوقچے کو ڈھونڈنے نکلتا تھا جسے ایک چھوٹے سے بچے نے گرم لُو کے موسم میں دیکھا تھا۔ اب اگر اپنی اس تلاش کے دوران اسے کہیں سے کچھ مل جاتا تو نواب سے اس کے پیسے کھرے کر لیتا اور ساتھ ہی اُن پیسوں میں سے کچھ چوکیدار کو بھی کھلا دیتا تا کہ وہ اس کی مشکوک نقل و حرکت پر کوئی اعتراض نہ کیا کرے۔

غلام باغ کے علاوہ مددعلی کا دوسرا عشق اب بھی گھوڑوں سے تھا۔ اب وہ ذاتی طور پر تو کسی گھوڑے کا یا کسی ایسی سواری کا، جس میں گھوڑا استعمال ہوتا ہو، مالک نہیں تھا لیکن وہ باقی دنیا کے

Scanned by CamScanner

گھوڑوں کے لیے مصالحہ بنانے میں یدِطولیٰ رکھتا تھا اور اس کے مصالحے کی شہرت دور دور تک تھی۔ دن بھر غلام باغ کے باہر کی سڑک کے کنارے بیٹھ کر طرح طرح کے اجزاء ملا ملا کر مصالحہ بنانا اور پھر شام ہوتے ہی غلام باغ میں اپنے اُسی گم گشتہ لمحے کی تلاش میں نکلنا...... مددعلی کی زندگی بس اتنی ہی تھی۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی اور اپنے بھائی عاشق علی کے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ عاشق علی عیال دار آدمی تھا اور کیفے غلام باغ میں بیروں کو زیادہ ٹپ بھی مشکل سے ہی ملتی تھی۔ لیکن چونکہ مددعلی اپنی ساری کمائی عاشق علی کے کُنبے کے حوالے کر دیتا تھا اس لیے عاشق علی کے دل میں بھائی کیلئے برادرانہ محبت کی بنیادیں بہت مضبوط تھیں۔

O

ڈاکٹر ناصر اور کبیر جب عاشق علی کے پیچھے پیچھے کچن میں داخل ہوئے تو مددعلی انہیں اُس تنگ سی میز پر لیٹا ہوا نظر آیا جس پر ہر صبح کیفے کے ملازم آمنے سامنے بیٹھ کر سبزیاں کاٹا کرتے تھے۔ مددعلی کے گرد غلام باغ کا نیا چوکیدار اکرم، ارشاد بیرا، باورچی نواز اور کچن کے چند ملازم کھڑے تھے۔ اچھا خاصا جمگھٹا تھا۔ وہ سب ایک غیر ہمدردانہ تجسّس سے بظاہر بے ہوش مددعلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے سب کو فوری طور پر مریض کے گرد سے ہٹ جانے کا حکم دیا جس کی تعمیل انہوں نے بددلی سے ایک ایک قدم پیچھے سرک کر کی۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی تماشا نہیں لگا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔'' عاشق نے اپنے رفقائے کار سے غصیلے لہجے میں کہا۔

فوری طور پر ایک سٹول ڈاکٹر صاحب کے لیے تلاش کیا گیا اور جب ناصر نے ایک ایک کر کے مریض کے جسم پر تشخیصی نشانیاں تلاش کرنا شروع کیں تو کچن پر سناٹا چھا گیا۔ کبیر سوچنے لگا: یہ ڈاکٹر لوگ بھی کیسے خدائی لمحوں کے مزے لوٹتے ہیں۔ جب یہ مریض کی نبض تھامتے ہیں یا اس کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھنا شروع کرتے ہیں یا اس کی دل کی دھڑکن گننے لگتے ہیں تو اردگرد موجود لوگوں کے منہ میں وقت کا ذائقہ ہی بدل جاتا ہے۔ ہر چیز پر ایک گہرے اسرار کی دھند چھا جاتی ہے۔ اور سب کچھ ''پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے'' کے احساس میں منجمد ہو جاتا ہے، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ اب ذرا ان سب کے تنے ہوئے متوقع جسموں کو دیکھو گہری خاموشی

Scanned by CamScanner

میں مضحکہ خیز لیکن جیسے عبادت کر رہے ہوں۔ان میں سے عاشق علی کے علاوہ شاید کسی کو بھی مدد علی کی زندگی یا موت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہوگی لیکن کسی بھی انسان کے مستقبل کے بارے میں کسی انکشاف سے آگاہ ہونے کی خواہش ہر انسان کے اندر موجود ازلی تحیر کے سوتوں کو یک دم کیسے جگا دیتی ہے۔اور یہ بات بذاتِ خود کتنی حیرت انگیز ہے،اور یہ لمحہ بھی کتنا تحیر خیز ہے۔

کبیر نے اپنی بوجھل رینگتی چپکتی نگاہیں اردگرد کی موجودات پر سے گزارنا شروع کیں۔کچن میں گیس کے بڑے چولہے کا نیلگوں شعلہ اوپر رکھے دیگچے میں حرارت دھنسا رہا ہے۔پتیلیاں، پتیلے، پتیلوں میں سالن، روٹیاں پکانے والے کا توا جس کے نیچے آگ بجھی ہے اور اردگرد آٹا پھیلا ہے۔برتن، پلیٹیں، کپ، چمچے، چھریاں، چاقو، گندے برتنوں پر مکھیاں جنہیں باہر برستی بارش میں پھیلے غلام باغ کے آثار قدیمہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔دس سال پرانا اسلامی کیلنڈر، دیوار کے ایک کونے میں لٹکے مکڑی کے جالے، جالے میں مکڑی، سٹول، چوکی، پانی کی ٹونٹی، قطرہ قطرہ پانی گرتا ہے، عاشق علی، اکرم، نواز، ارشاد، مدد علی خفیف سی حرکت کر رہا ہے۔ڈاکٹر ناصر اس کی آنکھوں کے پپوٹے ایک بار پھر اٹھا کر دیکھ رہا ہے۔وہ تشخیص کر چکا ہے۔

''خطرے کی کوئی بات نہیں'' ڈاکٹر ناصر نے عاشق علی کو شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی خدائی لمحے کا طلسم ٹوٹ گیا۔

''اس کو کوئی خطرہ نہیں، بادشاہو۔یہ تو خود خطرہ ہے۔غلام باغ میں چوروں کی طرح آتا ہے اور جگہ جگہ کھودنے لگتا ہے۔اب تو بچ گیا ہے۔پھر نہیں چھوڑوں گا......'' اکرم چوکیدار نے کرخت آواز میں دھاڑتے ہوئے کہا اور جواباً عاشق علی اس پر جھپٹ پڑا۔بیچ بچاؤ اور کھینچا تانی کو ختم کرنے کے لیے کبیر نے مداخلت کی:

''یہ بند کرو۔بھائی، یہ سب۔چوکیدار صاحب غالباً مدد علی نے ابھی تمہارے ساتھ معاملہ طے نہیں کیا۔وہ پہلے چوکیداروں کو تو سیٹ کر لیتا تھا لیکن تم شاید نئے آئے ہو۔ٹک مکا ہو جائے گا۔فکر نہ کرو۔پھر تم اسے رات کے وقت غلام باغ میں اِدھر اُدھر کریدا کریدی کرنے سے روکو گے نہیں بلکہ اس کی مدد کرو گے......''

''وہ، صاحب......نہیں صاحب۔'' چوکیدار نے کھسیانے انداز میں کہا تو عاشق علی اور بھی شیر ہو گیا اور کچھ زیادہ ہی بے باکانہ انداز میں چوکیدار پر جھپٹا:

Scanned by CamScanner

''یہی بات ہے۔ جتنے پیسے یہ مانگتا ہے بھائی مدد علی سے آج تک غلام باغ کے کسی چوکیدار نے نہیں مانگے۔'' اب کی بار کشمکش کچھ زیادہ بے ڈھنگی ہو گئی جس کے نتیجے میں ایک بڑا پتیلا الٹ گیا اور ایک پُر شور تکلیف دہ گونج کے ساتھ فرش پر گرا اور مدد علی نے آنکھیں کھول دیں۔

''ہوش آ گیا ہے۔'' نواز باورچی نے مایوسانہ انداز میں اعلان کیا تو سب مدد علی کی طرف متوجہ ہو گئے جو اپنی گول گول آنکھیں چاروں طرف گھما گھما کر زمان و مکان میں اپنے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عاشق علی دل ہلا دینے والی آواز میں ''بھائی مدد علی'' کہہ کر اُس سے لپٹ گیا اور کیفے کے باقی کارندے ''تمہارا بھائی بچ گیا۔ عاشق علی شکر کرو'' وغیرہ وغیرہ کہتے اپنے اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں اُس وقت کچن کے اُس دروازے میں جو کیفے کے اندر کی طرف کھلتا تھا ہاف مین نمودار ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر ٹھٹھکا اور اپنی جرمن آواز میں انگریزی میں کہنے لگا:

''ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے کیا ہوا ڈاکٹر؟ کیا یہ بیمار ہے؟''

گورے کو دیکھ کر عاشق علی نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فریاد کرنا شروع کر دی اور اکرم چوکیدار کی طرف اشارہ کر کے وہ گڑگڑایا: ''صاحب اس نے میرے بھائی کو مارا۔''

تین سال اس ملک میں گذارنے کے بعد ہاف مین اب اس قابل تو ہو چکا تھا کہ مقامی زبان میں کسی کی فریاد سمجھ سکے۔

''مارا! تمہارے بھائی کو۔ بیٹ بُرا بات۔ کس نے؟ تم نے چوکیدار؟ اس کو مارا'' اور چوکیدار کے تو اوسان خطا ہو گئے کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ یہ گورا صاحب غلام باغ میں عرصے سے کوئی کام کر رہا ہے اور اس کے محکمے کے بڑے بڑے افسر بھی ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔

''نہیں صاحب۔ معافی دیو! صاحب۔'' وہ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم نہیں جانتا۔ یہ میرا آدمی ہائے۔'' ہاف مین نے مدد علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا آدمی ہائے۔ خبرڈار۔''

ہاف مین کا خبرڈار خاصا پُر اثر تھا۔ شاید اس لیے کہ جرمن ہونے کی وجہ سے اُس کے لیے ''خ'' کی آواز پیدا کرنا بالکل مشکل نہ تھا۔ چوکیدار بوکھلائے ہوئے انداز میں طرح طرح

Scanned by CamScanner

کی شکلیں بناتا اور سلام کرتا پچھلے دروازے سے باہر بھاگ گیا۔ ہاف مین نے قہقہہ لگایا اور کبیر کا خون کھول اٹھا۔ ''کم بخت گورے کی بڑھک پر کس طرح پیشاب خطا ہو جاتا ہے ہم لوگوں کا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تم نے کچھ کہا، مسٹر کبیر؟''

''نہیں، کچھ نہیں کہا۔ ویسے مددعلی تمہارا آدمی کب سے ہو گیا ہے، ہیر ہاف مین؟''

''اوہ، ابھی کچھ ماہ سے۔ لیکن یہ قابو نہیں آ رہا تھا۔ وہ تمہارے نواب صاحب نے بری طرح اس کو جکڑا ہوا ہے۔ مگر مجھے نوادرات سے نہیں صرف اس کی اُس کہانی سے دلچسپی ہے۔ بے حد دلچسپی۔ اس کی کہانی سنی ڈاکٹر؟ وہ نیچے سرنگ میں اترتے زینوں اور اشرفیوں کے صندوقچے والی کہانی۔''

''میرے خیال میں یہ وقت کسی بھی قسم کی کہانی سننے کا نہیں۔ میری نائٹ ڈیوٹی ہے۔ اور مجھے جانا ہے۔ اور ہاں عاشق علی تم اب اسے گھر لے جاؤ۔ اٹھو مددعلی۔ جسم میں کوئی درد تو نہیں تمہارے؟'' ناصر نے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا لیکن مددعلی کچھ نہ بولا۔ بس خوفزدہ سے انداز میں سب کی طرف دیکھتا رہا۔

''مددعلی جواب دو۔ ڈاکٹر صاحب کیا پوچھ رہے ہیں۔'' عاشق علی نے مددعلی کے گیلے بالوں کو کچن کے جھاڑن سے خشک کرتے ہوئے کہا لیکن مددعلی پھر بھی کچھ نہ بولا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کے جبڑے سختی سے بند ہو گئے ہوں اور وہ کوشش کے باوجود منہ نہ کھول سکتا ہو۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں بولتا ڈاکٹر صاحب۔ بھائی مددعلی۔ ڈاکٹر صاحب...... اس کا تو منہ بند ہو گیا ہے۔'' عاشق علی نے سراسیمہ انداز میں کہا۔ ڈاکٹر ناصر پلٹا اور پھر مریض کے پاس بیٹھ گیا اور قدرے بےیقینی سے اس کے جبڑوں کے اعصاب کا جائزہ لینے لگا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مددعلی بولو منہ کھولو۔ منہ کھولو۔ شاباش۔ شاباش۔ منہ کھولو۔'' لیکن مددعلی نے بےبسی سے انکار میں سر ہلا دیا جیسے کہنا چاہتا ہو وہ تو منہ کھولنا چاہتا ہے لیکن کھول نہیں سکتا۔

صورتِ حال میں اس نئی تبدیلی نے کچن میں موجود لوگوں میں اضطراب کی نئی لہر دوڑا دی اور وہ سب ایک بار پھر دلچسپی کے محور کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔

''ڈاکٹر یہ کسی قسم کا کوئی spasm ہے کوئی convulsion؟'' ہاف مین نے پوچھا اور

Scanned by CamScanner

عاشق علی رونے لگا۔

"بند کرو یہ رونا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" کبیر نے غصے سے کہا۔ وہ ابھی تک دل ہی دل میں تاؤ کھا رہا تھا۔ پھر اسے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس نے عاشق علی پر غصہ جھاڑ دیا۔

ڈاکٹر ناصر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ "عجیب بات ہے۔ اگر یہ کوئی کھنچاؤ ہے، کوئی spasm ہے یا کوئی دورہ ہے تو عجیب ہے۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔ آخر صرف منہ ہی کیوں بند ہو گیا ہے؟" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بہر حال اب تو اسے ہسپتال لے کر جانا پڑے گا۔" ہسپتال کا نام سنتے ہی مدد علی کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور وہ زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگا۔

"تو منہ کھولو...... ایویں اوازار کر رہے ہو سب کو۔" باورچی نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں ابھی اس کو ٹھیک کر دیتا ہوں صاحب" اور اس نے تیزی سے اپنی انگلیوں پر انڈا تلنے والے فرائنگ پین سے چکنائی لگائی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ مدد علی کے جبڑوں پر مل دی۔ ابھی وہ بھرپور مالش کرنے ہی لگا تھا کہ عاشق علی نے کھینچ کر اسے پرے ہٹا دیا اور بے بسی سے ناصر کی طرف دیکھنے لگا۔ ہاف مین ہنس پڑا۔

"ایک تو تمہارے ملک میں ہر آدمی خود ڈاکٹر بننے کی کوشش کرتا ہے۔ کیوں مسٹر کبیر۔ لیکن جلدی کرو۔ ڈاکٹر چلو اسے ایمرجنسی میں لے چلیں۔ باہر میری موٹر کھڑی ہے۔ چلو۔ پکڑو۔ اٹھاؤ۔"

کچن کے کارکن جیسے اسی اشارے کے منتظر تھے۔ انہوں نے چشم زدن میں مدد علی کو جکڑ لیا کیونکہ وہ کہیں بھی جانے کیلیے تیار معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ اُس کی مزاحمت تو اتنی شدید تھی کہ کبیر کو کہنا پڑ گیا: "ڈاکٹر، مجھے تو یہ تمہارا کیس لگتا ہے۔ اگر یہ اپنے حواس میں ہے تو چپ چاپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتا؟"

O

نواز، ارشاد، عاشق علی اور تنور پر روٹیاں لگانے والا اسلم جب مدد علی کو ایک زخمی ہرن کی طرح جکڑ کر ہاف مین کی اسٹیشن ویگن کی پچھلی سیٹوں پر سوار ہوئے تو کیفے غلام باغ کو اُس رات

کے لیے بند کر دیا گیا یوں بھی بارش کی وجہ سے کیفے پہلے ہی تقریباً غیر آباد ہو چکا تھا۔ اور باورچی خانے کے ہنگامے کی وجہ سے سروس بھی بند ہو چکی تھی۔ ہاف مین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر ناصر اور درمیان میں کبیر۔ ناصر نے مڑ کر پیچھے بیٹھے افراد کی طرف دیکھا جو سب پوری سنجیدگی اور جانفشانی سے ''بے قابو'' ہو جانے والے شخص کو کسی قیمت پر کوئی موقع نہ دینے پر کمربستہ تھے۔ ناصر کے لیے یہ منظر بہت مانوس اور روزمرہ کا تھا۔ بعض اوقات لوگ اپنے ''پاگلوں'' کو ایسے ہی لے کر اس کے وارڈ میں آتے تھے۔ ''اسے زیادہ شدت سے مت جکڑنا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن بار بار اپنا ہاتھ اپنے منہ کی طرف کیوں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔'' عاشق علی نے بے بسی سے پوچھا۔

''میں اس کا ہاتھ چھوڑوں گا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ آپ فکر نہ کریں۔'' ارشاد نے اٹل انداز میں کہا۔

''جب کوئی شخص اپنے ہاتھ سے نکل جائے تو دوسرے یوں ہی اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔'' کبیر نے سوچا اور پھر ہاتھ اور ہاتھوں کے تلازمات کے کچھ سلسلے کچھ دیر اس کے ذہن میں چلے ''لیکن پاگلوں کو تو ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا جاتا۔ ان بے چاروں کے ساتھ تو ہاتھ ہو جاتا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ مائیکل اینجلو کی شہرۂ آفاق پینٹنگ جس میں دو ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں جیسے بس چھو لینے کو ہوں۔ جیسے وہیں سے برقی شرارہ پیدا ہونے کو ہو۔ سنگتراش روڈن کے بنائے ہاتھوں کے مجسمے۔ تلازمہ یہاں رک گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ مارچ کی وہ بے تکان برسنے والی بارش اسٹیشن ویگن کی ونڈ سکرین پر مسلسل برس رہی تھی اور گاڑی کے دونوں وائپر پورے زور شور سے برستے پانی کو رگڑ رگڑ کر اتارنے اور شیشے کو چند لمحوں کے لیے پھر سے شفاف بنانے کے چکر میں تھے۔ کبیر بے آواز ہنسا۔ اسے ہمیشہ ہی سے وائپرز کا لہرا لہرا کر فطرت کے خلاف جدوجہد کرنا بہت مضحکہ خیز لگتا تھا۔ وائپرز کی لایعنی حرکت کے نظارے سے اس کا موڈ قدرے خوشگوار ہو گیا۔ اس کے بعد کبیر کو وہ ساری پچوایشن ہی بے حد مضحکہ خیز لگنے لگی اور اگر اسے عاشق علی کی دل آزاری کا خیال نہ ہوتا تو وہ باقاعدہ قہقہے لگانے لگتا۔

Scanned by CamScanner

عجیب تماشا ہو گیا ہے۔ اس نے سوچا...... وہ اور ڈاکٹر ناصر دونوں شام کی معمول کی ملاقات کے وقت جلدی میں تھے۔ ڈاکٹر کو وارڈ جانا تھا اور اسے عصری ڈائجسٹ کے دفتر۔ انہوں نے ایسے ہی کچھ وقت اکٹھا گزارنے کے لیے کیفے غلام باغ میں چائے پینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چائے لانے میں عاشق علی نے دیر لگا دی تھی اور اس دوران وہ وقت اور وقت گزاری سے لمحوں کے کیپسول کی طرف چلا گیا تھا اور بک بک کرتا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ چائے پینے کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی راہ لیں گے۔ لیکن اب یہ صورتِ حال تھی کہ وہ سب ایک جرمن ماہرِ آثارِ قدیمہ کی اسٹیشن ویگن میں ایک ایسے آدمی کو ہسپتال لے جا رہے تھے جس کا منہ کسی وجہ سے کھل نہیں پا رہا تھا۔ ''ڈاکٹر تو خیر وہیں جا رہا ہے جہاں اسے جانا ہے لیکن مجھے تو...... ہم سب مدد علی کا منہ کھولنے جا رہے ہیں...... بات تیرے کی......'' اچانک ہاف مین نے گردن پیچھے موڑ کر کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''کیا بات ہے مسٹر کبیر۔ تم بہت دیر سے خاموش ہو۔ کوئی دلچسپ تبصرہ۔ کوئی چبھتا ہوا جملہ۔ کچھ بھی نہیں؟ تم اپنے معمول کے انداز میں نہیں ہو۔''

''اپنی گردن سیدھی رکھو ہیر ہاف مین اور توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھو۔ سڑکیں پانی میں ڈوبی ہیں اور اس پانی کے نیچے ایسے قدیم گڑھے ہیں جو تمہاری اس جدید اسٹیشن ویگن کے لیے اجل کے پیامبر بن سکتے ہیں۔''

جرمن خوش دلی سے ہنسا ''یہ ہوئی ناں بات۔ تمہارے منہ سے ایسے زہریلے تیر برستے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ویسے تم انگریزی مجھ سے بہتر بولتے ہو۔ مسٹر کبیر۔''

''شکریہ۔'' کبیر نے کسی جرمن کی زبانی اپنی انگریزی دانی کی تعریف پر کسی خوشی کا اظہار نہ کیا اور پھر مڑ کر مدد علی کی طرف دیکھنے لگا جو اب بھی بار بار اپنا ہاتھ اپنے منہ کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور ارشاد اور عاشق علی فوراً اپنی جکڑ اور بھی سخت کر دیتے تھے۔ کبیر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو اسے دیوانگی کی کوئی رمق کہیں بھی نظر نہ آئی۔ ہاں بے بسی۔ خوف اور غصہ ضرور تھا۔ کیا یہ شخص ایسے ہی بن رہا ہے؟ کبیر کا جی چاہا کہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر مسکرائے اور یہ جتا دے کہ وہ سب کچھ جان گیا ہے، لیکن کیا جان گیا ہے، کبیر کو کچھ علم نہ تھا۔

Scanned by CamScanner

O

نیوروسائیکیاٹری کی ایمرجنسی میں ایک بستر پر لیٹے مدد علی کے جسم میں مسکن سیال کو داخل ہوئے اب تقریباً پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ اس کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی جس میں اس شام کے مناظر پتوں کی طرح اڑ رہے تھے: ''ایک تو اس حرام کے جنے چوکیدار نے پیچھے سے ایسا ہاتھ رسید کیا کہ ہوش ہی نہ رہا۔ وہ تو شکر ہے مولا پاک کا کہ گرتے گرتے بھی منہ میں چھپا لیا ورنہ وہیں چھین لیتا۔ اور پھر ہوش آیا تو سب مجھی پر نظریں گاڑے کھڑے تھے۔ اور اب بھی کھڑے ہیں۔ منہ سے نکالتا بھی تو کیسے؟ فوراً دیکھ لیتے اور کہیں چھپاتا بھی تو کیسے؟ کیسے...... کے سے......؟ اب تو منہ میں ہی رہے گا اور میرے ساتھ یہ ایک بار پھر بے ہوش ہو جائے گا۔ عاشق علی بھی میرے اشارے نہ سمجھا...... کہ منہ میں چھپایا ہے۔ سمجھو۔ سب کو یہاں دکھا نہیں سکتا۔ کہیں یہ میرے پیٹ میں ہی نہ اتر جائے۔ نواب صاحب نے اس کے اچھے خاصے پیسے دے دیئے تھے۔ تھے۔ تھے مزہ آ رہا ہے۔ حرام کے جنوں نے کیسے نشے کا ٹیکہ لگایا ہے۔ پے۔ پے۔ پے...... میں اترتا ہے تو؟ محفوظ تو ہو جائے گا اور پھر دوسرے راستے نکل بھی آئے گا۔ چھوٹا سا تو ہے۔ تو۔ ہن۔ ہنس۔ ہنسا بھی تو نہیں جا۔ جا۔ تا۔ تا۔ کیسا نشے کا...... ٹی...... ٹی...... کا لگا دیا۔ میں میرے مولا، میں کہیں مرنے تو نہیں لگا۔ میرے مولا اسے میرے منہ میں محفوظ رکھنا۔ اٹھ۔ اٹھا۔ بھا۔ بھا۔ بھاگا۔ بھی۔ نہیں۔ جا۔ جا۔ جا۔ تا۔ یہ گورا...... پتا نہیں کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟...... ہے...... ہے...... اشرفیاں...... صندوقچہ...... سیڑھیاں...... غلام باغ...... غلام باغ...... میں آ...... آ...... رہا ہوں...... ں...... ں...... لو بڑی تیز ہے۔''

''تم لوگ اب چلو، باہر ٹھہرو۔'' ڈاکٹر ناصر نے ارشاد اور عاشق علی سے کہا ''اس کا منہ اب کھل جائے گا نا۔ ڈاکٹر صاب؟'' عاشق علی نے باہر جاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو تم۔'' ان دونوں کے جانے کے بعد ناصر نے ہاف مین اور کبیر کی طرف بھی ایسے انداز سے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو: ''تمہیں بھی یہاں مریض کے پاس ہونا تو نہیں چاہیے لیکن خیر۔'' پھر وہ مدد علی پر جھک گیا اور آہستگی سے اس کے منہ کے عضلات کو چھونے لگا جن میں اب پہلے جیسی سختی موجود نہ تھی۔ پھر جب اُس نے اُس کے پوپلے منہ کو دبایا تو ایک حیرت زدہ چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا ڈاکٹر؟ کچھ گڑبڑ ہو گئی؟ کیا۔ مسئلہ ہے ناصر؟'' ہاف مین اور کبیر نے جو دلچسپی سے

Scanned by CamScanner

سارا منظر دیکھ رہے تھے بیک وقت انگریزی اور مقامی زبان میں کہا۔ جواباً ڈاکٹر تیز تیز انگریزی میں بولنے لگا: ''اس کے منہ میں کچھ ہے۔ او مائی گاڈ۔ اس نے تو منہ میں کچھ دبا رکھا ہے۔ یہ دیکھو، یہ گال۔ کچھ سخت چیز ہے۔'' پھر اس نے تیزی سے ایک ٹارچ اٹھائی اور بے سدھ پڑے مدد علی کا منہ کھول کر روشنی اندر ڈالی۔ شعاع جیسے غار میں پڑی کسی چمکیلی شے سے ٹکرائی۔ ''کوئی چمکیلی سی شے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''او جیز ز کرائسٹ'' ہاف مین نے بہت ہی مضطرب لہجے میں کہا۔

''مگر اسے نکالو تو۔ ہے کیا آخر؟'' کبیر بھی کم مضطرب نہ تھا۔ اور ڈاکٹر جیسے یہ بھول ہی گیا تھا کہ مریض کے منہ میں سے کوئی شے کیسے نکالی جا سکتی ہے۔ اس نے تیزی سے جراحی کا ایک آلہ اٹھایا اور اسے اتنی احتیاط سے مدد علی کے منہ میں دخل کرنے لگا جیسے کسی کینسر کی رسولی کو نکالنا چاہتا ہو۔ چمٹی نما آلہ منہ سے نکلا تو اس کی چونچ میں ایک سکہ دبا ہوا تھا جو وارڈ کی فلورسینٹ ٹیوب لائٹس میں فوراً جگمگ کرنے لگا۔ حیرتوں کے کچھ اور لمحات ان تینوں کے اعصاب میں کوند گئے۔ ڈاکٹر نے سکے کو ایک پیٹری ڈش میں ڈالا لیکن اسے چھونے سے پہلے سپرٹ سے دھونا نہ بھولا۔ وہ سب اس سنہرے سکے کو اپنی انگلیوں سے چھونے کے لیے مضطرب تھے جو ایک بے ہوش آدمی کے منہ سے برآمد ہوا تھا۔

''او میرے خدا۔ یہ تو ملکہ وکٹوریہ کے دور کا برطانوی پونڈ ہے۔ خالص سونے کا۔ برٹش گنی.....'' ہاف مین نے طلائی سکے کو اپنی کانپتی انگلیوں میں بیتابی سے گھماتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ناصر کے چہرے پر ایک حماقت آمیز بوکھلاہٹ طاری تھی۔ وہ کبھی تو مسکن دوا کے شکار بے سُدھ لیٹے مدد علی کی طرف دیکھتا اور کبھی اُس شے کی طرف جو ابھی اُس نے اُس کے منہ سے نکالی تھی اور جو اب کبیر کی انگلیوں میں پہنچ چکی تھی۔ کبیر نے سکے کے دونوں رُخوں کو بغور دیکھا۔ ایک عجیب سی شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلنے لگی اور ناصر اور ہاف مین دونوں اپنے اپنے انداز میں منتظر ہوئے کہ یہ شخص ضرور اب کچھ کہے گا۔ کبیر نے تھیٹریکل انداز میں سنہرے سکے کو فضا میں بلند کیا اور بظاہر ڈاکٹر ناصر سے مخاطب ہوا اور ہاف مین کی سہولت کے لیے انگریزی میں: ''صاحبان۔ طب کی ہزاروں سالہ تاریخ میں آج تک کسی معالج کی تشخیص اور علاج کا ایسا حیرت انگیز انجام نہیں ہوا ہوگا جیسا آج ہمارے دوست نیورو سائیکیاٹرسٹ ڈاکٹر ناصر کا ہوا ہے۔ آج تک ہم سمجھتے تھے کہ مرض کی تشخیص خواہ کچھ بھی ہو علاج کے نتیجے دو ہی ہو سکتے ہیں یعنی

Scanned by CamScanner

زندگی یا موت۔ لیکن آج ہمارے قابل ڈاکٹر دوست نے ثابت کر دیا ہے کہ علاج کا ایک تیسرا نتیجہ وکٹورین دور کے سونے کے پونڈ کی صورت میں بھی برآمد ہو سکتا ہے۔''

ہاف مین قہقہے لگانے لگا۔ ''بکومت تم......'' ڈاکٹر ناصر نے کھسیانے اور چڑے ہوئے انداز میں کہا اور مدد علی پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ ''اسے یوں کھا جانے والی نظروں سے نہ دیکھو ڈاکٹر۔ ہر آدمی کو اپنے خزانے کی حفاظت کرنے کا پورا حق پہنچتا ہے۔ تم اس ناقابلِ فراموش حقیقت سے اپنی ڈھارس باندھنے کی کوشش کرو کہ تم دنیا کے واحد ڈاکٹر ہو جس کے ناکام علاج کے نتیجے میں سونا دریافت ہوا ہے۔'' اس آخری فقرے کے بعد ناصر بھی اپنے قہقہوں کو دبا نہ سکا اور پھر آہستہ آہستہ جب صورت حال کی بے انتہا لایعنیت اور اعلیٰ پائے کی مضحکہ خیزیت اس کی جھنجھلاہٹ پر غالب آ گئی تو وہ بھی اُس سیلاب میں بہے بغیر نہ رہ سکا۔

''تو گویا اس سارے عرصے کے دوران یہ احمق شخص اس منحوس سکے کو منہ میں دبائے رہا اور میں سمجھتا رہا کہ اسے کسی انوکھی قسم کی مرگی کا دورہ پڑا ہے۔ ٹیٹنس ہو گیا ہے یا پھر اس کے جڑوں کے اعصاب کی غیر معمولی۔ ہاہا...... ہاہاہا۔''

پھر وہ تینوں ہی پھٹ پڑنے والے متعدی قہقہوں کے اُس انوکھے دورے کا شکار ہو گئے جس میں لوگ پیٹ پکڑ پکڑ کر دوہرے ہونے لگتے ہیں۔ ہاف مین کی کیفیت تو بہت ہی ابتر تھی۔ وہ قہقہوں کے درمیان بمشکل تھوڑا سا وقفہ نکال کر بلند آواز سے جرمن زبان میں کچھ کہتا تھا پھر فوراً ہی غیر لسانی رویے پر اتر آتا تھا۔

وارڈ کے اندر ڈیوٹی پر موجود نرس نے اُن غیر انسانی قسم کے قہقہوں کا شور سنا تو اس نے ٹھنڈا سانس لیا: ''لو کوئی اور کیس آ گیا۔ اب ساری رات مصیبت میں کٹے گی۔ کم بختوں کو آدھی رات کو ہی پاگل ہونا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ یہ ایک تو نہیں بلکہ کئی لوگ ہنس رہے ہیں۔ تو کیا اکٹھے کئی پاگل آ گئے ہیں؟ چلو مجھے کیا؟ ڈاکٹر ناصر تو آئے ہوئے ہیں خود ہی دیکھ لیں گے۔ بلائیں گے تو جاؤں گی۔'' باہر برآمدے میں مریض کی خیریت کی دعائیں مانگتے اپنا فرض نبھاتے عاشق علی اور ارشاد نے سمجھا کہ اندر غالباً مدد علی کو کچھ ہو گیا ہے۔ ارشاد کے ذہن میں آسیب وغیرہ کا امکان گونجا لیکن جب وہ بھاگتے ہوئے ایمرجنسی میں داخل ہوئے تو سامنے کا منظر دیکھ کر اُن کے رنگ پیلے پڑ گئے۔

O

عاشق علی کو ساری صورتِ حال سمجھانے کے بعد جب عاشق علی مدد علی برادران اور ارشاد کو ہسپتال کی ایمبولینس کے ذریعے رخصت کیا گیا تو بارش ختم چکی تھی اور چودہ مارچ کا نیا دن شروع ہو چکا تھا۔ وہ تینوں وارڈ کے باہر کمپاؤنڈ میں آ گئے۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آدھی رات کو اچانک ہی چل پڑنے والی ہوا نے موسم بہار کی خوشبوؤں کو، جو برساتی پانیوں میں کہیں چھپ گئی تھیں، پھر سے ڈھونڈ نکالا تھا۔

"گیلی فضا میں بکھری یہ خوشبو جادو ہے۔" ہاف مین نے فضا اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

"پراسرار مشرق کا جادو۔" کبیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور ہاں وہ سکہ نکالو۔ اس کا فیصلہ کرنا ابھی باقی ہے۔" ہاف مین نے سکہ جیب سے نکال کر ڈاکٹر کو تھما دیا۔

"یہ برطانوی سونا ڈاکٹر کے پاس امانت رہے گا۔ مدد علی ہوش میں آنے کے بعد چاہے تو اسے نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے پاس بیچ دے اور چاہے تو ہاف مین کے پاس۔ ویسے وہ کل تک ہوش میں آ جائے گا نا، ڈاکٹر۔"

"ارے ہاں...... جلد ہی بلکہ......" ڈاکٹر نے لاپرواہی سے کہا۔ اس وقت وارڈ کے اندر سے نرس مختار ٹک ٹک اپنے جوتوں پر چلتی باہر آئی، ان کی طرف بڑھی اور ڈاکٹر ناصر سے کہنے لگی: "ڈاکٹر ناصر، ابھی ایک اور کیس آیا ہے ایمرجنسی میں"۔ "چلیں، میں آ رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور نرس کے جانے کے بعد ہنستے ہوئے کہنے لگا: "ابھی ایک عجوبہ کیس سے فارغ ہوئے ہی ہیں کہ اور کیس آ گیا۔ اب پتا نہیں اس کے منہ سے وکٹورین پونڈ برآمد ہوتا ہے یا جارج واشنگٹن کے زمانے کا ڈالر۔ اچھا دوستو میں چلتا ہوں۔"

"ٹھہرو۔" کبیر نے کہا۔ "اب وہ کوئی اصل کیس ہی ہوگا۔ یعنی کوئی حقیقی معنوں میں ذہنی مریض۔ تمہارا وقت قیمتی ہے ڈاکٹر لیکن مجھے بھی ایک اعلان کرنا ہے اور تمہاری موجودگی میں اور ایک بار پھر وقت کے بارے میں۔" اور پھر فوراً ہی اس نے اعلان کرنا شروع کر دیا: "حضرات میں کبیر مہدی ولد مہدی خاں حال ساکن 23 سندر شام روڈ، بڑا شہر اور اصل ساکن قدیمی موضع سمیال واقع کوہستان نمک بقائمی ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ میرا 13 مارچ کا وقت کے کیپسول کا نظریہ محض بکواس تھا۔ میں اس سے فی الفور دست بردار ہوتا ہوں۔ مستقبل نہ تو امید ہے اور نہ خدشہ بلکہ 13 مارچ کے آخری چند گھنٹوں کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ مستقبل محض ایک بلائے ناگہانی

Scanned by CamScanner

ہے، ایک ان دیکھی ابتلا ہے جو غیب سے اچانک انسانوں کے سروں پر نازل ہوتی ہے۔"

"اور یہ تمہارا وقت کے بارے میں 14 مارچ کا نظریہ ہے۔ میں مزید تمہاری بک بک نہیں سن سکتا۔ خدا حافظ۔ او۔ کے ہاف مین۔ شب بخیر۔' ڈاکٹر ناصر ایمرجنسی میں نئے آئے اپنے کسی کیس کو دیکھنے اور پھر رات بھر ڈیوٹی دینے کے ارادے سے سائیکیاٹری وارڈ کی طرف مڑ گیا۔

ناصر کے جانے کے بعد ہاف مین نے دوستانہ انداز میں کبیر کے شانے پر ہاتھ مارا: "تم ایک عظیم نظریہ باز ہو۔ اگر تم جرمنی میں پیدا ہوتے تو......"

"تو کانٹ اور ہیگل کو پیدا ہی نہ ہونے دیتے۔" کبیر نے کہا اور ہاف مین ہنسا "شاید۔ میرے ساتھ ہی آؤ۔ میں تمہیں کہیں ڈراپ کرتا ہوں۔ دراصل مجھے اپنی ایک آسٹریلوی دوست کے بستر کی طرف سفر کرنا ہے۔" اس نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں پیدل ہی جاؤں گا۔ یوں بھی مجھے صرف اپنے ہی بستر کی طرف سفر کرنا ہے جو کسی بھی رفتار سے طے کیا جا سکتا ہے۔" کبیر نے قدرے تلخی سے کہا۔

"اوہ، آئی ایم سوری۔ دراصل ایک تو تمہارے معاشرے......" ہاف مین نے ہمدردانہ لہجے میں تمہید باندھنا چاہی۔

"دیکھو، تم چپ چاپ دفع ہو جاؤ۔ یوں بھی اس وقت آدھی رات کو مجھے اپنے معاشرے کی جنسی محرومیوں کے اسباب پر تبصرہ کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جاؤ۔ پھر ہو گی ملاقات۔"

"تمہاری مرضی لیکن دیکھ لو۔ یوں آدھی رات کو سڑکوں پر پھرتے پھرتے کہیں تمہیں آوارہ گردی کے الزام میں نہ دھر لیا جائے۔ آج کل تمہارے یہاں کے حالات بھی......اور پھر تمہارا ریکارڈ بھی کچھ اچھا نہیں۔"

"اوہ......تو تم ہمارے حالات کے بارے میں سب کچھ جان گئے ہو۔"

"ایک آرکیالوجسٹ، میرے عزیز، صرف آثارِ قدیمہ میں ہی نہیں آثارِ جدیدہ میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔ خواہ وہ آثارِ جدیدہ تمہارے جیسے دقیانوسی معاشرے کے ہی کیوں نہ ہوں۔" ہاف مین نے ایک عالمِ مطلق جیسے انداز میں کہا۔

"بس اب چلے جاؤ۔ تم لوگ ہمیں اندر باہر سے ننگا دیکھ کر بہت مزہ لیتے ہو۔ جاؤ۔ تمہیں کہیں اور جا کر بھی......" باقی فقرہ کبیر نے اپنی مقامی بولی میں کچھ جان دار پھکڑ تول کر مکمل کیا۔

Scanned by CamScanner

"اگرچہ میں سمجھا نہیں لیکن صوتیات بتاتی ہے کہ تم گالیاں دے رہے ہو۔ کیا مجھے؟ میں بُرا نہیں مانتا۔ ویسے میں کسی دن تفصیل سے تمہارے ساتھ بات کروں گا، کبیر۔ تم ۱۸۵۷ء میں تو نہیں رہ رہے؟ انگریز کب کا جا چکا ہے یعنی گورا صاحب رخصت ہو چکا ہے۔ پھر تمہارا یہ رویہ ناقابلِ فہم ہے۔ یہاں کے سب لوگ تو تم جیسے نہیں ہیں۔ تمہارے دانش ور بھی نہیں۔ یورپی اقوام سے تمہاری نفرت ایک عجیب و غریب سا رویہ ہے۔"

"یہ بھی ایک 'آثارِ جدید' ہے، ہیر ہاف مین۔ لیکن لعنت بھیجو۔ یہ سراسر میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ بہت پرسنل سا۔ ہو سکتا ہے یہ وقتی ہو اور کسی دن ختم ہو جائے۔ ہم بہر حال اچھے دوست ہیں جاؤ...... اور اپنی اسٹیشن ویگن میں بیٹھو۔ گیلی ہوا میں بہار کی خوشبو ضرور سونگھتے جانا...... کسی اور جگہ کوئی اور بھی بہار تمہاری منتظر ہے۔ پھر دیکھنا کس کی خوشبو میں زیادہ جادو ہے۔"

"اوہ ہائے...... ہائے......" جرمن پھڑک اٹھا۔

"خدا کی قسم تم تو شاعر بھی ہو۔ آخر تم کیا ہو؟"

"پتا نہیں میں کیا ہوں؟ کبھی، شاید جب کبھی میں نے اپنا اصل کام مکمل کر لیا تو پھر میں بتا سکوں گا میں کیا ہوں......"

"تمہارا اصل کام۔ تم اکثر اپنے اصل کام کا ذکر کرتے ہو...... وہ کیا کام......؟" ہاف مین نے ہمدردانہ تجسس سے پوچھا۔

"ایک ایسا کام جو میں نے ابھی شروع بھی نہیں کیا۔" کبیر نے کھوکھلا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"غالباً تم کوئی ناول لکھنا چاہتے تھے۔ تم نے کہا تھا، ایک بار"۔ "شاید پتا نہیں۔" کبیر نے اس موضوع کی بے یقینی سے مضطرب ہو کر جلدی سے ہاف مین کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور پھر تیزی سے مڑ کر 23 سندر شام کی دوسری منزل پر واقع اپنے گھونسلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر ہاف مین کی ویگن بھی کھڑے پانی میں چھینٹے اُڑاتی اس علاقے کی طرف بڑھی جہاں بیرونی اداروں، ایجنسیوں اور سفارتی کاموں سے تعلق رکھنے والے غیر ملکی محفوظ پہرہ بند عمارتوں میں رہائش پذیر تھے۔

Scanned by CamScanner

O

جنرل ہسپتال سے 23 سندر شام روڈ تک کا فاصلہ جو کہ چھ سات کلومیٹر سے کم نہ تھا 14 مارچ کی ابتدائی آدھی رات میں کبیر نے پیدل ہی طے کیا۔ یوں بھی رات کے ایک بجے کسی سواری کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن رات کو شہر کی سنسان سڑکوں پر سے بظاہر مشکوک انداز میں گزرنے پر اسے ہاف مین کے خدشے کے مطابق آوارہ گردی کے الزام میں پکڑے جانے کا بہر حال کوئی خطرہ نہ تھا۔ کبیر کا براہِ راست، بقول اسکے 'لکھائی کا کاروبار' اگرچہ چند ڈائجسٹ رسالوں سے تھا لیکن صحافتی دنیا سے بھی اس کے مراسم گہرے تھے اور اسی وجہ سے معتبر اخبارات کے پریس کارڈ اکثر اس کی جیب میں پڑے رہتے تھے اور گاہے بگاہے ایسے ہی لمحات میں اسے فرض شناس پولیس والوں کی نیم شبی دست برد سے بچا لیتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ محض ایڈونچر کی خاطر پولیس والوں کو دیکھ کر اپنے انداز و اطوار کو مزید مشکوک کر لیتا تھا تا کہ بعد میں ان کی بھرپور مایوسی اور دل ہی دل میں گالیوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن اس رات ایسا کوئی واقعہ اسے پیش نہ آیا۔ بڑے شہر کی گیلی سڑکوں پر جو سٹریٹ لائیٹس میں غیر معمولی طور پر چمکتی تھیں اور متعدد فٹ پاتھوں اور کیچڑ سے اٹی چند گلیوں سے گزرنے کے دوران وہ اردگرد سے اپنے معمول کے برعکس غیر معمولی طور پر بے خبر رہا۔ پچھلے چند گھنٹوں میں اتنا کچھ ہو گزرا تھا کہ اُسے اُس کا سیمابی ذہن اتنی آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ سہ پہر کو اپنے گھونسلے میں بیٹھ کر آدم خور شیر کے شکار کا مضمون ترجمہ کرنا، کیفے غلام باغ میں وقت کی ماہیت پر نظریہ بازی، مدد علی کی ناگہانی پٹنا اور پھر آخر میں ہاف مین سے اس کی گفتگو، یہ سب تہہ در تہہ واردا تیں جہاں اس کے ذہن میں لفظوں کے طوفان اٹھا رہی تھیں وہاں یقین اور عزم کا اس کا وہی پرانا ڈھیٹ اندھا کیڑا پھر سے کلبلانا شروع ہو گیا تھا: ''میں ضرور ان لفظوں کو مربوط فقروں میں ڈھال لوں گا اور پھر لازم ہے کہ وہ فقرے ایک ایسی داستان کو اپنے قالب میں جکڑ لیں گے جو آج تک کسی نے نہیں سنائی ہوگی۔ یہ روداد اُن کرداروں کی ہوگی جو برس ہا برس سے بھوتوں کی طرح مجھے چمٹے ہوئے ہیں اور جو ہر وقت انسانی جون میں آ کر اپنی لذتوں، اذیتوں اور ناقابلِ یقین حد تک کریہہ محرومیوں کی روداد چیخنے کے لیے زور مارتے رہتے ہیں۔''

ایسا ہوتا تھا کبھی تو سال میں صرف ایک بار، کبھی کسی ایک ماہ میں کئی بار اور کبھی کسی ایک دن میں بار بار اور جب یہ کیفیت اس پر وارد ہوتی تو اسے اپنے اس خیالی، اصل اور بڑے کام کی تخلیق اتنی اٹل اور حقیقی نظر آتی تھی جیسے بس اس کے ایک لفظ 'کُن' کی منتظر ہو۔ خداؤں جیسی اپنی مانوس

Scanned by CamScanner

قدرت مطلق کی بہت جانی پہچانی سرشاری اور بے خودی میں ہی کبیر مہدی نے 23 سندر شام روڈ پر واقع سکالرز اولڈ بکس شاپ تک کا فاصلہ طے کیا اور دوکان کے بند شٹر کے ساتھ ہی بنے ایک اور چھوٹے سے چوبی دروازے کا تالا کھولا جس میں اوپر چڑھتی سیڑھیاں اس کے گھونسلے کی طرف جاتی تھیں۔

کبیر مہدی کا یہ گھونسلا، جو پچھلے کئی سالوں سے اس کی ہر طرح کی پرواز کا نقطۂ آغاز و انجام ثابت ہوا تھا، تنکوں، گھاس پھونس اور پروں کی بجائے دنیا جہان کے موضوعات کی ہزاروں پرانی کتابوں اور سیکنڈ ہینڈ رسالوں سے بنا تھا۔ کتابیں، کتابیں، کتابیں، رسالے، میگزین، جرنل قطار اندر قطار، ڈھیر، انبار ہر طرف اور اتنے زیادہ کہ ان کے درمیان کہیں بچھا اس کا بستر بھی مشکل سے ہی نظر آتا تھا۔ کبیر کے لیے یہ گھونسلا دنیا کی موزوں ترین رہائش گاہ تھی۔ سکالرز اولڈ بکس شاپ کا مالک بھی اس کے کام سے بے حد خوش تھا اور معاوضے کے طور پر وہ کبیر سے اپنی اس چھوٹی سی بالائی منزل کا کوئی کرایہ وصول نہیں کرتا تھا۔

کبیر کا کام بس یہ تھا کہ وہ کوڑیوں کے مول، ردی کے بھاؤ خریدے جانے والے کتابوں کے ان ڈھیروں کی چھانٹی کر دیا کرے۔ لفظ چھانٹی تو اس کا مالک مکان استعمال کرتا تھا لیکن درحقیقت یہ لفظ کبیر کے کام کی حقیقی روح کو مجروح کرنے کے مترادف تھا کیونکہ کبیر کا کام ایک اعلیٰ پائے کے دماغ کی جماعت بندی کی صلاحیتوں اور علوم کی انتہائی متنوع اقسام سے شناسائی کے بغیر بالکل ممکن نہ تھا۔ گھونسلے میں پڑی کتابوں کے ڈھیر تو بس ایسے ہی تھے جیسے کسی گھڑے میں دنیا جہان کے اجناس ملا دیے گئے ہوں۔ گندم، جو، باجرہ، مکئی، چنا، آرٹ، ادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، نفسیات، انجینئرنگ، طب، مذہب۔ ان سب کو الگ الگ کرنا اور ان کی قیمتِ فروخت کے لحاظ سے انہیں پھر ترتیب دینا ایک ایسا کام تھا جس کے بغیر سکالرز اولڈ بکس شاپ کا دھندا ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت تھی کہ متوقع گاہکوں کے سامنے دنیا جہان کے علوم وفنون کی صف بندی کرنے کے اس کام کے بغیر خود کبیر کا اپنا دوسرا دھندا بھی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا اور وہ دھندا بقول کبیر ڈائجسٹ رسالوں کا ہاضمہ درست رکھنے کا دھندا تھا۔ ملک کے چند ممتاز ڈائجسٹ رسالوں کے قارئین سارنگ، ابن بشر، آدم زاد جیسے قلمی ناموں سے بخوبی متعارف تھے۔ اور ان قلمی ناموں کے پیچھے چھپے

Scanned by CamScanner

کبیر مہدی کا کمال یہ تھا کہ وہ بینگن کی طبی خصوصیات پر سامنے آنے والے کسی نئے سائنسی انکشاف سے لے کر عالمی سیاست کے کسی معاصر سازشی جوڑ توڑ تک اور پھر اسلاف کے فراموش کردہ کارناموں کے نوحوں سے لے کر شکاریوں کی زندگی کے خون منجمد کردینے والے لمحات تک پھیلے خشک وتر موضوعات کو ایک جیسا دلچسپ ایک جیسا سنسنی خیز بنا کر اپنے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرسکتا تھا اور یقیناً ترجمہ و تلخیص اور اخذ وترتیب کے اس کام سے وہ اتنا پیسہ تو ضرور کما لیتا تھا کہ بڑے شہر میں اپنے آپ کو اپنا 'اصل اور بڑا کام' سرانجام دینے کے لیے زندہ رکھ سکے۔ اصل اور بڑا کام جو سارنگ کو نہیں بلکہ کبیر مہدی کو سرانجام دینا تھا۔

کبیر نے کمرے میں پہنچ کر بتی روشن کی اور سارنگ کی لکھی افریقہ میں آدم خور شیر کے شکار کی لرزہ خیز داستان کو جیب سے نکال کر ایک طرف پھینک دیا اور کمرے کی واحد الماری کے ایک کونے سے کاغذوں کا وہ مسطر نکال لیا جسے اس نے ''اصل کام'' کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور جس کا خالی پن عام لمحات میں اسے متوحش کردیتا تھا۔ وہ باکرہ مقدس کاغذی سطحیں جن کے قریب سارنگ جیسے کسی سفلہ وجود کو پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ کاغذ قلم لے کر کبیر دبے قدموں گھونسلے میں بچھے اپنے بستر کی طرف بڑھا اور پھر کسی ایسے مادہ پرندے کی طرح سمٹ کر بیٹھ گیا جس کی تمام توانائیاں اس کے جسم کے اس ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں جو انڈے کے موہوم امکان کو ٹھوس حقیقت کی راہ دکھاتا ہے۔

کبیر اپنی اصل اور بڑی تحریر کے آغاز کے بارے میں کچھ بنیادی فیصلے کر چکا تھا۔ ان میں سے ایک فیصلہ یہ تھا کہ اس کا آغاز رات کے بیان سے ہونا چاہیے۔ اسے ایک ایسی بیانیہ نثر لکھنی ہے جو رات کے سحر کو گرفتار کر سکے۔ ایک ایسی رات جو پوری کائنات پر محیط ہو۔ کبیر نے لکھنا شروع کیا:

باب اول

یہ دو الفاظ لکھتے ہی یہ اذیت ناک خیال اس کے ذہن میں گونجا کہ وہ پہلے بھی ایسے کتنے ہی موقعوں پر یہ دو الفاظ لکھ چکا ہے۔ 'باب اول'۔ لیکن کوئی بھی 'باب اول' آج تک مکمل نہ ہوسکا تھا۔ اس نے فوراً ہی پوری کوشش سے ان ہمت پست کرنے والے وسوسوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور

Scanned by CamScanner

لکھنے لگا۔ اس نے لکھا:

''اور یہ رات ہے امنڈتی سیاہ رات۔ آسمانوں اور زمینوں کے بیچوں بیچ پھیلی تیرگی کا مہیب سمندر۔

پہاڑوں کی بلند چوٹیاں، فراخ وادیاں، ریتلے صحرا، سنسناتے ویرانے، لہراتے شور یلے دریا، گھنے جنگل، بنوں میں گھات لگاتے درندے، اشجار میں دبکے طیور، لمبی گھاس میں سرسراتے سانپ، پتھریلی چٹانوں پر رینگتے چھپکلے، ہزاروں بستیوں میں کلبلاتے لاکھوں انسان۔ نئے اور پرانے مردہ جسم سمیٹتے قبرستان، عمارتیں، مکان، ریستوران، مسجدیں، کلیسا، مندر، قحبہ خانے، ہسپتال، کھیل کے میدان، سڑکیں، پل، جیل خانے......سب اس عظیم تیرگی کے بوجھل غبار تلے دب کر گویا اپنے ہونے سے محروم ہو چکے ہیں۔ رات کا کالا لہو کائنات کی نس نس میں گردش کرتا ہے اور اس کی تال پر سیاہی کے آسیب رقص کناں ہیں۔''

پہلا پیرا ختم ہوا تو کبیر نے بے چینی سے اُسے دوبارہ پڑھا۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا میں ایسی ہی منظر کشی چاہتا تھا جس میں چیزوں، جگہوں کے نام ہوں اور بھاری بھرکم الفاظ؟ کیا کچھ بات بن رہی ہے یا نہیں؟ کیا اسے کاٹ دوں اور پھر سے لکھنا شروع کروں؟ نہیں رکنا نہیں چاہیے۔ بس لکھتے رہنا چاہیے۔ دوسرا پیرا شروع ہوا۔ کبیر نے لکھا۔

''......اور ہر بار جب یہ آسیب ترتیب و توازن اور ہنگامہ وافراتفری کے اس عالم پر سوار ہونے کو آتا ہے تو انسان اپنی اطراف میں اپنے اپنے مصنوعی اجالوں کا حصار قائم کرتا ہے کہ گھور اندھیرے کی آسیب زدگی چیزوں پر سے رنگوں کی کھال کھینچ کر ان کے نقوش ہڑپ نہ کر سکے اور انسان اپنے تئیں یقین دلا سکے کہ ہر شے ویسی ہی ہے جیسے کہ تھی اور وہ اب بھی ان کا آقا ہے۔ پھونس کی کٹیا میں سرسوں کا چراغ جلتا ہے اور اسفالٹ کی کشادہ سڑکوں پر نیون سائن جھلملاتے ہیں۔ ان گنت دنوں کے جال میں مقید دھرتی سورج کے گرد پیہم چکراتی ہے۔ سایہ روشنی کا تعاقب کرتا ہے اور روشنی سایے کی سمت لپکتی ہے۔ ظلمت نور سے متصادم ہوتی ہے اور خلا میں وقت بہتا ہے۔ وقت۔ اتھاہ، انمٹ، بے پایاں، بے کراں وقت۔''

کبیر کا قلم ایک بار پھر رک گیا اور دماغ میں لفظوں کی لاحاصل یورش کسی متوازن نثر کو تہ و بالا کرنے لگی۔ وقت......پھر وہی وقت......پھر وہی بک بک شروع ہوگئی جو آج شام کیفے غلام باغ

Scanned by CamScanner

میں شروع ہوئی تھی اور جس کا اختتام اس گورے آرکیالو جسٹ ہاف مین کے ساتھ اس کی گفتگو پر ہوا تھا۔ اور پھر وہ سب کچھ جو بیتا اور جس نے اُسے تخلیق کے خدائی لمحے کے سحر میں گرفتار کر دیا تھا۔ لیکن وہ لمحہ تیزی سے مٹ رہا تھا۔ میں صرف خدا نہیں ہوں بلکہ شیطان بھی ہوں۔ خدا تخلیق کرتا ہے اور شیطان تنقید کرتا ہے۔ جملہ تو یہ بھی خوب ہے لیکن ایسے لعنتی جملوں کا میں کیا کروں۔ میں وہ بد قسمت انسان ہوں جس میں سوت کاتنے والا اور سوت کاٹنے والا دونوں یک جا ہو گئے ہیں۔ میں اپنی ہی بربادی کا خالق ہوں۔ اپنی ہی تعمیر کو مسمار کرنے والا معمار...... اور اب یہ شیطان میرے اندر جاگ چکا ہے اور غرب الہند کے جزیروں کے کالے جادو کے زندہ مردے زومبی کی طرح یہ سب کچھ ہڑپ کر جائے گا۔

اس کے بعد کبیر نے قلم ایک طرف رکھ دیا اور سامنے پڑے کاغذ کو، جو لفظوں سے سیاہ ہو چکا تھا، شدید کراہت اور نفرت کے احساس سے دیکھا۔ یہ محض بکواس ہے، ایک ابکائی ہے، فضلہ ہے، سستے نمائشی جملے ہیں جن پر صفاتی لفظوں کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ امنڈتی سیاہ رات۔ تیرگی کا مہیب سمندر۔ تاریکی کا بوجھل غبار۔ رات کا کالا لہو۔ سیاہی کے آسیب رقص کناں۔ ہات تیرے کی! لعنت! کبیر مہدی یہ تیرا کام نہیں۔ بھول جا اسے۔ کسی افسانوی دنیا کی تخلیق کرنا اور اس میں جیتے جاگتے انسانوں کے شب و روز کی گنجائش پیدا کرنا اور ان کے اعمال کے جواز بنانا تیرے بس کی بات نہیں۔ تو لفظوں کا غلام ہے جب کہ لفظ تیرے غلام ہونے چاہئیں۔ بڑے ادیبوں کے بارے میں اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ زبان ان کی لونڈی ہوتی ہے۔ ویسے کتنا مکروہ ہے یہ بیان۔ لونڈی، غلام۔ لفظ اور ادیب کے درمیان آقا اور غلام کا کوئی بھی رشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ ہو تو پھر نہ کوئی غلام ہوتا ہے اور نہ آقا، ورنہ پھر بس غلام باغ ہوتا ہے۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں، یہی حقیقت ہے میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے یا پھر جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ اندر ہی اندر کہیں کسی غلام باغ میں قید ہے جس سے سنہرا سکہ چرانے والا اپنا منہ بند کر لیتا ہے۔ پہرے داروں کے خوف سے۔ خوف ہی غلام باغ کا آقا ہے۔

''باب اول'' کا انجام اب قریب آن پہنچا تھا۔ اور اب جیسے اسے صرف تعمیر و تخریب کی آخری رسوم ادا کرنا تھیں۔ کبیر نے کاغذ کو ہولڈر سے کھینچ کر نکالا۔ پہلے اسے لمبائی کے رخ میں دو اور پھر چوڑائی کے رخ چار میں پھاڑا اور پھر اسے ہر ممکن رُخ میں پرزے پرزے کر دیا۔ پھر ان

Scanned by CamScanner

پرزوں کو مٹھی میں دبا کر وہ بستر سے اترا اور اپنے گھونسلے کی واحد کھڑکی کی راہ سے ذلت و رسوائی کی ان نشانیوں کو زور سے باہر سندر شام روڈ پر اچھال دیا۔ کاغذ کے ٹکڑے کھڑکی کے قریب سے گزرتی ہائی ٹینشن بجلی کی ننگی تاروں کو چھوتے سٹریٹ لائیٹس میں اپنے چھوٹے چھوٹے سفید وجودوں کو نمایاں کرتے آہستہ آہستہ نیچے گلی کے فرش کی طرف اترنے لگے۔ کبیر محویت سے یہ تماشا دیکھنے لگا۔ اپنی اپنی رفتار سے اور اپنی اپنی چال سے وہ سب نیچے گرتے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ایک عجیب و غریب سا خیال کبیر کے ذہن میں آیا۔ ان میں سے ہر کاغذ کا پرزہ اور وہ چند الفاظ جو پھاڑنے کے نتیجے میں اُس کے حصے میں آئے ہیں ایک ایک منفرد ادب پارہ ہے۔ اور یہ ادب پارے اس وقت رات کے تین بجے میری کھڑکی کی راہ سے نیچے سندر شام روڈ پر گر رہے ہیں۔ فن پارے۔ آخری پرزے کے زمین پر اتر جانے کے بعد کبیر نے کھڑکی بند کر دی اور واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹا اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ وہ ایک عجیب سی ہنسی تھی۔ زمین کی طرف گرتے کاغذ کے ان پرزوں میں سے ہر پرزے کو الگ الگ ایک منفرد ادب پارہ قرار دینے کا وہ تصور دور کہیں ذہن کی گہرائی میں اتنا انوکھا، مضحکہ خیز اور جارحانہ تھا کہ وہ شکست خوردگی کے لحات کی زہرناکی کو اندر ہی اندر کہیں کاٹ گیا۔

زہرناکی کی وہ کیفیت کبیر کے لیے قطعاً کوئی نئی نہیں تھی۔ بیسیوں مرتبہ اس کے نام نہاد اصل اور بڑے کام کا یہی انجام ہو چکا تھا۔ ہر بار سوت کاتنے والے نے کاٹنے والے کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اور ہر شکست کے بعد وہ ہر شکست خوردہ انسان کی طرح اذیت میں بھی مبتلا ہوا تھا۔ لیکن آج وہ صرف متحیر تھا، اس بات پر کہ بعض اوقات کس طرح ایک دیوانہ سا خیال انسان کو دیوانگی سے بچا لیتا ہے۔

اور جب وہ بالآخر باقی ماندہ رات کی نیند کے لیے بستر پر دراز ہوا تو پر سکون تھا۔ کم از کم ذہنی طور پر۔ ہاں، جسم کی گہری بافتوں میں کہیں کہیں ایک بالکل مختلف قسم کی دوسری بے چینی کسی دھیرے دھیرے بیدار ہوتے سانپ کی طرح سر اٹھا رہی تھی۔ اس مانوس بے چینی کو ختم کرنے کے لیے اسے اب ایک اور رسم ادا کرنا تھی۔ برسوں سے اور اکثر نیند سے پہلے وہ یہ رسم ادا کرتا چلا آ رہا تھا اور کسی دیوی کے مندر کے مہا پجاری کی طرح وہ اس رسم کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو درجہ کمال تک لے جا چکا تھا۔

Scanned by CamScanner

کبیر مہدی ایک نامراد ادیب ہو سکتا تھا بلکہ شاید وہ سرے سے کوئی ادیب ہی نہ تھا کیونکہ وہ کوئی ادب تخلیق نہیں کر سکا تھا لیکن وہ صفت جو کسی بھی ادب ساز کا سب سے قیمتی خزانہ ہو سکتی ہے وہ اس میں شاید کامیاب ادیبوں سے بڑھ کر موجود تھی۔ اس کی طاقت ور متخیلہ جو کہ حسیاتی مناظر کو اتنی کامیابی سے چشم تصور کے روبرو مجسم کر دیتی تھی کہ کبھی کبھی تو اس کا شعور حقیقت اور محض تصور میں امتیاز کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ تعجب ہے...... اور خود کبیر کو بھی تعجب تھا کہ اس قوت کی موجودگی میں بھی وہ ناکام کیوں تھا۔ لیکن وہ خدائی قوت نیند سے پہلے کے لمحات میں اس کی غمگسار ضرور بن جاتی تھی اور اس کی اپنی مخصوص ضرورتوں کے عین مطابق دنیا کی کسی بھی نسوانی ہستی اور اس کے درمیان حائل تمام فاصلوں کو مٹا دیتی تھی۔

نیند سے پہلے کی رسم ادا کرنے کے لیے کبھی کبھار کبیر اپنی بے پناہ متخیلہ سے کام لینے کی بجائے موزوں بصری مواد سے براہِ راست فیض بھی حاصل کر لیا کرتا تھا۔ آخر تنوع پسندی انسان کی فطرت میں شامل ہے اور کبیر بھی اس بشری تقاضے سے آزاد نہ تھا۔ سکالرز اولڈ بکس کے سٹور میں دنیا جہان کی کتابوں اور رسالوں کے علاوہ ایسے شہرۂ آفاق جرائد کی بھی کمی نہ تھی جو مغربی حسن کی زہد شکن تفصیلات کو کل عالم کے سامنے پیش کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ بستر پر پہلو کے بل لیٹے لیٹے کبیر نے ہاتھ آگے بڑھا کر سول انجینئرنگ کی درسی کُتب کی قطار کے بائیں جانب رکھے ایسے ہی رنگین مجلّوں میں سے ایک مجلّہ اٹھایا۔

گورے نسوانی جسم گویا کاغذ کی سطح سے اٹھ اٹھ کر اس کی جانب بڑھنے کو بے تاب تھے۔ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک گویا امرت سے لبریز پیمانے سجے تھے اور کبیر ایک ایک پیمانے سے اپنے پیاسے مساموں کو سینچتا رہا۔ پھر اس نے رسم کو اپنے عروج تک پہنچانے کے لیے مغربی مجلّے کو واپس پھینک دیا اور چارپائی کے دائیں پائے کے ساتھ بندھے بجلی کے سوئچ کو آف کر دیا۔ گھونسلے میں اندھیرا چھا گیا۔ اور پھر ایک سانحہ ہو گیا۔

تعجب ہے کہ خود لذتیت کے بہاؤ میں جب کہ تصور اور عمل کی ہم آہنگی غیر متعلقہ خیالوں کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی کبیر کا ذہن ادھر اُدھر بھٹکنے سے باز نہ رہتا تھا۔ گرم اندھیرے میں پھیلتے ہلکوروں کے درمیان جب کہ وہ کسی ہیولے کے ساتھ ہی خود بھی نابود ہونے کے قریب تھا، جانے کہاں سے ایک طنز بھرا زہریلا خیال اس کے ذہن میں آ گھسا: ''آہ، ہمارے جیسے پسماندہ

Scanned by CamScanner

معاشروں پر اہلِ مغرب کا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں۔'' یہ ایک عجیب بے تکا بے وقت خیال تھا۔ پھر اس خیال کے بطون سے ایک ڈرا دینے والے احساس نے جنم لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اندھیرے میں اس کے چاروں طرف رکھی ہزاروں کتابوں کے مصنف زندہ ہو گئے ہیں اور وہ ہیں کہیں باقاعدہ موجود ہیں اور اسے دیکھ رہے ہیں۔

کبیر نے پوری کوشش سے اس بیک وقت سراسیمہ کر دینے والے اور انتہائی مضحکہ خیز التباس کو ذہن سے جھٹکنے اور اپنی پوری توجہ جسم کے دریا کے بہاؤ کو برقرار رکھنے پر مرکوز کی لیکن اُس رات شاید اُس کا مقدر یہی تھا کہ وہ رات کبیر مہدی کے لیے کئی طرح کی ناکامیوں کی رات بن جائے۔ لندن، پیرس، نیویارک اور ہالی وڈ کی حسین ماڈلوں کی جگہ ڈھیل بوڑھے جرمن فلسفی، پائپ پیتے انگریز ماہرین معاشیات، مدقوق روسی ناول نگار، فرانسیسی آرٹسٹ، امریکی کیمیادان، ڈچ بائیالوجسٹ، اطالوی پادری اور ایسے ہی بہت سے دوسرے، اپنی اپنی کتابوں کی کچھاروں سے نکل کر اس کے تصور کی سکرین پر دھاوا بولنے لگے۔ بہتے دریا کے طوفانی پانیوں کی جگہ صرف خشک ریت باقی رہ گئی۔

گھبرا کر بلکہ ہڑبڑا کر کبیر نے لائٹ آن کر دی اور بستر پر بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگا۔ اس نے رات کی رسم کی تکمیل کا ارادہ ملتوی کیا اور سوچنے لگا: کیا یہ اپنی عورتوں کی عصمت بچانے کے لیے یوں اچانک میرے اوپر حملہ آور ہو گئے ہیں؟ پھر اس تصور کی مضحکہ خیز نوعیت پر وہ آپ ہی آپ ہنسا، بستر سے اٹھا اور اس چھوٹے سے غسل خانے میں گھس گیا جسے مالک نے اسے ''تمام سہولتیں'' بہم پہنچانے کی خاطر بنوا دیا تھا۔ ہاتھ دھوتے وقت اس نے سامنے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ ہونٹوں کو زور سے پھیلا کر اپنے دانتوں اور زبان کو دیکھا۔ پھر زبان کو دانتوں پر آہستگی سے پھیرا اور یہ عمل بھی آئینے میں دیکھنے پر اسے ایک لایعنی سی طمانیت دے گیا۔

کبیر مہدی جب سو گیا تو صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ رات پھیکی پڑ رہی تھی اور نیچے سندر شام روڈ پر اس کے پھٹے ہوئے ادب پارے صبح کی ہوا میں اُڑ اُڑ کر گندی نالیوں میں گر رہے تھے۔

O

''کیا بات ہے تم نے کپڑے پہننے شروع کر دیے۔ کہیں جا رہے ہو کیا'' ہاف مین کی

Scanned by CamScanner

آسٹریلوی دوست گرٹریوڈ نے نیند سے بوجھل لہجے میں ہاف مین سے پوچھا جواب بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنی پتلون کو ٹانگوں پر چڑھا رہا تھا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''مگر اس وقت...... صبح کے ساڑھے چار بجے؟ یہیں سو جاؤ نا۔''

''نہیں میں اجنبی بستروں میں بیدار ہونا پسند نہیں کرتا۔'' ہاف مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خاصے ذلیل ہو تم۔ جہنم میں جاؤ۔''

''جہنم میں تو شاید موت کے بعد ہی جا سکوں۔ فی الحال تو مجھے اپنے بستر میں بھرپور نیند لینے جانا ہے اور پھر آج کا دن بہت مصروف ہوگا۔ مجھے اس سکے کے بارے میں مزید تحقیق کرنا ہے۔''

سکے کے ذکر پر گرٹریوڈ ہنسنے لگی اور بستر پر اس کا جسم اچھلنے لگا۔ ''اچھا وہ سکہ جو کسی کے منہ میں پھنس گیا تھا۔ تم اس شخص سے ملو گے۔ ویسے فریڈی تم مقامیوں سے اچھی خاصی دوستیاں بنا لیتے ہو۔''

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔''

''نہیں۔ تعجب تو خیر کوئی نہیں لیکن میرے لیے یہ ناممکن ہے۔ یہاں کے کسی مرد سے تو بات کرنا بھی دشوار ہے۔ اف میرے خدا! کتنی شدید جنسی بھوک ان کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتی ہے۔''

''اس میں شاید ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں۔''

''اچھا خیر۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ مجھے سونے دو۔''

عمارت کے رہائشی حصے سے نکل کر ہاف مین کار پورچ کی طرف بڑھا جہاں اس کی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ یہ عمارت کسی مقامی دولت مند کی ملکیت تھی اور ماڈرن طرز تعمیر کے علاوہ برمودہ گھاس اور طرح طرح کے غیر ملکی آرائشی پودوں اور درختوں کے ذریعے اسے جدید فن باغبانی کا شاہکار بنانے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ ہاف مین کو کبیر کی کہی ایک بات یاد آ گئی: ''تم یہاں کے روسا، یہاں کے نو دولتیوں، یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں حتیٰ کہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے نام نہاد علمبرداروں کی کوٹھیاں دیکھ لو۔ ان کے عالی شان بنگلے دیکھ لو۔ تمہیں وہاں ایک بھی مقامی درخت نہیں ملے گا۔ ان میں سے کوئی بھی کیکر، نیم، شریں اور شیشم کو اپنے لا

Scanned by CamScanner

نوں میں اگانا پسند نہیں کرتا۔ یہ کچھ مقامی درختوں کے نام ہیں۔ یہ سب تمہیں ملیں گے بس سڑکوں کے کنارے۔ اِدھر اُدھر اکا دکا بس اپنے زور پر اُگے ہوئے۔ تم گوروں نے ہم سے ہماری نباتات بھی چھین لی ہیں۔''

''بے چارا کبیر اور نو سامراجیت۔'' ہاف مین نے سوچا اور آہستگی سے گاڑی کو گیٹ کی طرف بڑھانے لگا۔ گیٹ سے ملحقہ کیبن میں اونگھتے چوکیدار نے صاحب کی گاڑی کی آواز سنی تو اپنی لوئی سنبھالتا اٹھا۔ پہلی رات بارش ہونے کی وجہ سے کافی ٹھنڈ ہوگئی تھی۔ اس نے چابیاں اٹھائیں اور گیٹ کھولنے کے لیے بڑھا۔ ہاف مین نے چوکیدار کو گیٹ کھولتے اور سلام کرتے دیکھ کر سوچا: ''آخر یہ شخص اس وقت میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا بلکہ رات بھر یہ میرے بارے میں کیا سوچتا رہا ہوگا؟ آج سے پچاس، ساٹھ، سو سال پہلے ایسے ہی جب کوئی گورا صاب اپنی میم صاب محبوبہ کے ہاں رات بسر کر کے رخصت ہوتا ہوگا تو چوکیدار کیا سوچتا ہوگا۔ ہاف مین نے ارادہ کیا کہ چوکیدار کو دس روپے کا ایک نوٹ دے دے۔ پھر فوراً اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ارادہ کرنے اور پھر ملتوی کرنے دونوں کی کوئی وجہ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ بس ایک بے نام سی الجھن باقی رہ گئی۔ اس نے تیزی سے گاڑی گیٹ سے نکالی اور باہر سڑک پر ڈال دی پھر اسی علاقے میں چند بلاک دور اور اس عمارت کے مقابلے میں اپنی بہت سادہ رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

O

چودہ مارچ۔ 2:30 بجے صبح۔ درجہ حرارت 99- بلڈ پریشر 100 / 180 نبض 105۔ ڈاکٹر ناصر نے بیڈ نمبر 8 کے مریض کے بارے میں دو گھنٹے پہلے نرس کے درج کردہ اعداد و شمار پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہ وہی مریض تھا جس کی آمد کی اطلاع نرس نے اسے اس وقت دی تھی جب وہ مدد علی کے منہ سے سکہ برآمد کرنے کے بعد کبیر اور ہاف مین کو رخصت کرنے کے لیے وارڈ کے باہر کھڑا تھا اور اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ہی رات میں اس کی تشخیصی صلاحیتوں کے ابھی اور بھی امتحان ہونا باقی تھے۔ اور مستقبل کے بارے میں کبیر مہدی کا ''14 مارچ کا نظریہ کہ ایک بلائے ناگہانی ہے'' کا جیتا جاگتا ثبوت جلد ہی اس کے سامنے آنے والا تھا۔

Scanned by CamScanner

مریض کو، جس کا نام یاور عطائی بتایا گیا تھا، پہلے ایمرجنسی میں لایا گیا تھا اور ایمرجنسی نے اس کے طور طریقے دیکھ کر اسے نیورو سائیکیاٹری وارڈ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اس کے ہمراہ آنے والی اس کی جوان بیٹی تھی، اور دوسرا ایک بوڑھا ملازم۔ اور ڈاکٹر ناصر نے جب وارڈ میں انہیں دیکھا تو موروثی اوصاف کی منتقلی کی جینیٹکس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود متعجب ہوا کہ ایک خوبصورت مرد کس طرح اپنی بیٹی کی شکل میں نسوانی قالب میں ظاہر ہو جاتا ہے اور اس طرح کی مشابہت رکھنے والے باپ بیٹی کو ایک ساتھ پا کر دیکھنے والا ایک عجیب سی بے چینی کا شکار کیوں ہو جاتا ہے۔ یاور عطائی جوانی میں یقیناً خاصا خوش شکل رہا ہو گا لیکن ڈاکٹر ناصر کو فی الوقت اس کی مردانہ وجاہت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یاور عطائی کی بیٹی نے جو کہانی ناصر کو سنائی وہ مختصراً یہ تھی کہ رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے مخصوص کمرے میں گیا جو اس کا دواخانہ اور کتب خانہ بھی تھا۔ کمرے میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی ایک پاؤں اٹھاتا تھا اور کبھی دوسرا۔ پاؤں زمین پر رکھتے ہوئے خوف زدہ ہو کر چیختا تھا اور بار بار ایک ہی بات کہتا تھا: ''زمین گر رہی ہے۔ لوگو میرے سامنے کی زمین گر رہی ہے۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین گر رہی ہے۔'' پھر وہ ہر طرف ناچتا پھرتا رہا اور جلدی سے ایک پاؤں رکھ کر دوسرا اٹھا لیتا تھا، جیسے پاؤں رکھتے ہی کسی گہرائی میں جا گرے گا۔ اُس کی بیٹی اور بوڑھا ملازم اسے ہسپتال لا رہے تھے لیکن رستے میں جیسے وہ بالکل نارمل ہو گیا۔ ہسپتال لے جانے پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ لیکن ایمرجنسی میں پھر ویسی ہی کیفیت اس پر طاری ہوئی۔ ناصر نے پوری تفصیل سننے کے بعد مریض کا تفصیلی معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا اور معمول کے وہ سوالات پوچھنا شروع کیے جو ایک رٹے رٹائے انداز میں سائیکیاٹری وارڈ میں لائے گئے مریضوں سے اکثر پوچھے جاتے ہیں اور جن کا مقصد مریض کی ذہنی کیفیت، منطقی استدلال پر ان کی گرفت اور زمان و مکان میں ان کے تعین کو جانچنا ہوتا ہے۔

''جی۔ آپ کا نام؟'' ناصر نے پہلا سوال کیا۔

''ان کا نام یاور حسین ہے۔'' مریض کی بجائے اس کی بیٹی نے فوراً جواب دیا۔

''آپ، پلیز انہیں خود جواب دینے دیں۔ یہ بہت ضروری ہے'' ناصر نے نرمی سے کہا۔

''زہرہ بیٹی، آپ باہر بیٹھیں۔ میں بھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر

صاحب معائنہ کرلیں گے۔ اللہ فضل کرے گا۔" بوڑھے ملازم نے معاملہ فہمی کے انداز میں کہا۔

"نہیں، میں یہیں ٹھہروں گی۔" زہرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آپ بے شک ٹھہریں لیکن انہیں خود بات کرنے دیں۔" ڈاکٹر نے کہا اور سوچا۔ "تو اس کا نام زہرہ ہے۔ یعنی Venus۔" پھر اس نے دل ہی دل میں نام کی موزونیت پر داد دی۔

مریض اس اثنا میں گہری دلچسپی سے اپنے اردگرد کا سارا منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ میں ایک ماورائی تمسخر اور کسی قادرِ مطلق جیسی بے نیازی جھلکتی تھی۔

"جی آپ کا نام؟" ناصر نے سلسلۂ سوالات پھر شروع کیا۔

"میرا نام وہی ہوا کرتا تھا جو میری بیٹی نے بتایا ہے، یاور حسین، لیکن اب کافی عرصے سے میں ایک عطائی ہوں، یاور عطائی" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کچھ اور پھیل گئی اور آنکھیں ایسے دھندلا گئیں جیسے ٹھنڈے شیشے پر کہرا جمتا ہے۔

ناصر نے سوالیہ نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ڈاکٹر صاحب۔ لوگ انہیں اس نام سے بھی جانتے ہیں۔"

"میں عطائی ہوں۔ جانتے ہو کس لیے؟" اب اس کی آنکھیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے کسی راز کا انکشاف کرنے والا ہو۔ آنکھوں کی ان فوری تبدیلیوں کو ناصر نے خاص طور پر نوٹ کیا۔

"جی؟ بتائیں۔" ناصر نے کسی خاص تجسس کے بغیر ٹھنڈے پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

"اس لیے کہ لقمان، جالینوس، سینا اور رازی بھی عطائی تھے۔ ہر معالج اصل میں عطائی ہوتا ہے اور میں بھی......"

"Megalomania" ناصر نے سوچا اور ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر پوچھنے لگا: "اچھا، آپ اس وقت کہاں ہیں؟"

"لعنت بھیجو اس بات پر میں کہیں بھی ہوسکتا ہوں۔ اچھا سنو، اپنا کان قریب لاؤ۔ ہاں ایسے۔" ناصر نے ہچکچاتے ہوئے اپنا کان مریض کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اور وہ سرگوشی میں کہنے لگا: "میری بیٹی اور یہ بوڑھا، جو میرا ملازم ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوگیا ہوں اور یہ مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ یہ ہسپتال ہے نا۔ مجھے پتا چل گیا ہے لیکن میں ان کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔

Scanned by CamScanner

آج میں سب کچھ بخش دینے، سب کچھ معاف کرنے کے موڈ میں ہوں۔ اور تمہیں بھی ڈاکٹر۔ ویسے میں ڈاکٹروں سے کوئی بیر نہیں رکھتا۔ میں کوئی ٹٹ پونجیا عطائی نہیں ہوں۔ تم دنیا کو بتادو کہ یاور عطائی دیوانہ ہوگیا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ لوگ خوش ہوجائیں گے اور بے شک یہاں دو چار روز رکھ بھی چھوڑو مجھے۔'' اور پھر اس نے قہقہہ لگایا۔ ناصر نے قہقہے کے صوتی زیروبم کو بھی خاص طور پر نوٹ کیا۔ دیوانے اور فرزانے قہقہوں کے فرق کو پہچاننا اب اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ ''جی ہم ایسا ہی کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' ناصر نے بلند آواز میں کہا اور زہرہ بہت مضطرب ہوکر پوچھنے لگی: ''کیا کہا؟ ابو کیا کہہ رہے تھے؟ بتائیں مجھے، ڈاکٹر صاحب؟''

''اوہ کوئی خاص بات نہیں۔ اچھا، یاور صاحب۔'' ناصر نے یاور عطائی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے وہ مخصوص سوال کرنے کا ارادہ کیا جسے پوچھتے وقت ہمیشہ ہی وہ اپنے آپ کو بے حد احمق محسوس کیا کرتا تھا۔

''اچھا، تو ایک محاورہ ہے، نیکی کر دریا میں ڈال۔ اس کا مطلب بتائیں گے آپ۔'' یاور عطائی نے مشکوک سی نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا اور کچھ ایسے ہی مشکوک تاثرات زہرہ اور ملازم کے چہروں پر بھی ظاہر ہوئے۔ ناصر نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔ اب وہ انہیں کیسے سمجھاتا کہ اس عجیب وغریب سوال کا مقصد مریض کی فکری کارکردگی کا جائزہ لینا ہے۔

''سوال پھر کرو۔'' عطائی نے کہا۔

''نیکی کر دریا میں ڈال کا کیا مطلب ہے؟'' ناصر نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔ یاور عطائی نے اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش شروع کی اور اس کوشش میں اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہرے تفکر اور استغراق کے عالم میں ہو۔ ''نیکی کر دریا میں ڈال۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔ ایک پراسراری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اس نے شرارت بھری نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا اور ایسے فہمائشی انداز میں اس کی طرف انگلی اٹھائی جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی شرارت سمجھ جانے پر محظوظ بھی ہوا ہو اور ایک کھلنڈرے سے انداز میں اسے متنبہ بھی کررہا ہو۔ یاور عطائی سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا: ''تم بے حد شریر ہو، ڈاکٹر۔ میں تو خیر سب سمجھ گیا ہوں لیکن کسی دوسرے کے ساتھ ایسا خطرناک مذاق نہ کرنا۔ نہیں تو وہ دریا میں ڈوب جائے گا۔ نیکی کرنا میرے جنم کی مجبوری ہے۔ اس لیے کہ میں برج حوت کی پیدائش ہوں جو کہ توام

مچھلیوں کا جوڑا ہے جو دریاؤں میں رہتی ہیں، اور تم مشورہ دے رہے ہو: نیکی کر دریا میں ڈال۔ گویا تم مجھے دریا میں ڈبونا چاہتے ہو۔ میری ہلاکت کا سامان کرنا چاہتے ہو۔'' یاور عطائی قہقہے لگانے لگا اور ناصر نے مایوسی سے زہرہ کی طرف دیکھا جس کی مایوسی میں دکھ بھی شامل تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح پھیل گئی تھیں۔ صرف ایک لمحے کے لیے، بس ایک ایسے لمحے کے لیے جس کا وقت میں کوئی تعین کبھی ممکن نہیں ہوا، ناصر اپنے گردوپیش کو، نیوروسائیکیاٹری وارڈ کو، یاور عطائی کے دیوانے قہقہوں کو، ادویات کی مانوس خوشبوؤں کو اور اپنے جسم کے ہر احساس کو اس طرح فراموش کر بیٹھا جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ اس کے سامنے صرف وہ چہرہ تھا، آنکھیں تھیں اور ہونٹ تھے اور باقی سب کچھ نیستی تھا۔

''آپ نے ابو سے ایسا عجیب سا سوال کیوں پوچھا، ڈاکٹر صاحب؟'' زہرہ کہہ رہی تھی اور اب اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کرختگی تھی۔ ناصر، زہرہ اور بوڑھے کو ایک طرف لے گیا۔ وہ مریض کے سامنے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''یہ ایک روٹین سا سوال ہے جو اکثر ہم اس وارڈ میں آنے والے مریضوں سے کرتے رہتے ہیں اور اس کا مقصد کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ مریض کے جواب سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس کی سوچ مربوط ہے یا کسی انتشار کا شکار ہو رہی ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟''

''جی میں بالکل سمجھ رہی ہوں۔ کیا ابا مکمل طور پر۔ میرا مطلب ہے ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے ہیں؟''

ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ عارضی ہو۔ اچھا یہ بتائیں کہ پہلے بھی کیا ان پر کبھی ایسی کوئی کیفیت طاری ہوئی؟''

''جی نہیں، کبھی نہیں۔'' زہرہ نے کہا اور سوالیہ نظروں سے ملازم کی طرف دیکھا۔

''ایسا تو کبھی نہیں ہوا جی۔ مالک نے۔ لیکن شاید۔ ہو سکتا ہے کہ......'' اس نے بات کو ادھورا سا چھوڑ دیا اور ناصر نے محسوس کیا کہ بوڑھا ملازم کچھ بتانا چاہتا ہے لیکن زہرہ کی موجودگی میں بتا نہیں سکتا پھر وہ علیحدگی میں ملازم سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ یاور عطائی کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ وہ کہہ رہا تھا ''گنجینۂ نشاط کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس کے راز آج تک جھوٹے نہیں ہوئے۔ میرے سب بادشاہ جانتے ہیں۔ کبھی کوئی راز جھوٹ نہیں ہوا تو پھر

Scanned by CamScanner

قرص کیف کیسے جھوٹ ہوسکتی ہے۔'' ناصر تیزی سے یاور عطائی کے بیڈ کی طرف بڑھا۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ جیسے خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا ہے اور اس کے چہرے کے نقوش بتدریج بگڑتے جا رہے ہیں۔ خوف اور دہشت کی لکیریں اس کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر رہی تھیں۔

پھر اس نے اچانک اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو بستر سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بری طرح چیخنا شروع کر دیا: ''میں گر رہا ہوں۔ میرے نیچے سے بستر گر رہا ہے۔ زمین گر رہی ہے۔ میں......''

ناصر نے جلدی سے دو وارڈ بوائز کو بلا لیا تا کہ اسے قابو کر سکیں۔ وارڈ بوائز نے سختی سے اس کے بازو اور ٹانگیں جکڑ لیں اور اسے دبا کر بستر پر لٹائے رکھنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ ناصر نے شرمندہ سے انداز میں زہرہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا:

''آپ پلیز ویٹنگ روم میں جائیں۔''

''نہیں میں یہیں رہوں گی۔'' زہرہ نے ضدی لہجے میں کہا۔

''نہیں پلیز۔ یہ مناسب نہیں۔ پلیز، آپ انہیں ساتھ لے جائیں۔'' ناصر نے بوڑھے ملازم سے کہا۔

''زہرہ بیٹی آؤ۔ ادھر آ جاؤ۔ مالک ٹھیک ہو جائیں گے اللہ فضل کرے گا۔ آؤ۔'' ملازم نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ زہرہ نے کچھ دیر سوچا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر اپنے باپ پر، جو کہ وارڈ بوائز کے میکانکی ہاتھوں تلے کسی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا، ایک متوحش نظر ڈالی اور ملازم کے ساتھ وارڈ سے باہر چلی گئی۔

ان کے جانے کے بعد ناصر نے نرس کو فوراً مسکن دوائی کا انجکشن تیار کرنے کو کہا اور پُرتشویش انداز میں یاور عطائی کی طرف دیکھا۔ نرس مختار کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ناصر سوچ میں پڑ گیا۔ اس عورت کے یوں طنزیہ انداز میں مسکرانے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس نے بحیثیت ڈاکٹر میرے رویے میں کوئی تبدیلی دیکھی ہے۔ پھر اس نے چڑ کر نرس سے کہا کہ وہ جلد انجکشن تیار کرے۔ اس پر وہ اور بھی طنزیہ انداز سے مسکرائی اور اس نے جلدی سے سرنج ڈاکٹر کو تھما دی۔

لیکن ناصر جب انجکشن لگانے کے لیے سرنج مریض کے بازو کے قریب لے جا رہا تھا تو

Scanned by CamScanner

رک گیا کیونکہ اس پر ایک غنودگی خود بخود غالب آتی جا رہی تھی۔ ناصر نے وارڈ بوائز کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور سرنج کیپ سے بند کر کے واپس نرس کو تھما دی۔

"ابھی ضرورت نہیں۔ ابھی رکھ دیں۔ شاید پھر ضرورت پڑے۔ بلکہ اسے پھینک دیں۔"

نرس شفاف پیلے سیال سے بھری ڈسپوزایبل سرنج ڈسٹ بن میں پھینک کر واپس اپنے کاؤنٹر کی طرف چلی گئی اور ناصر یاور حسین یا یاور عطائی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ آیا یہ نیند ہے یا بے ہوشی جو اس شخص پر طاری ہو گئی ہے۔ اس نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر کچھ دیکھا۔ غالباً یہ نیند ہی ہے۔ ناصر پر اب ایک بے چینی، الجھن اور بے بسی سی طاری ہو رہی تھی۔ ابھی تک وہ مرض کی کوئی حتمی تشخیص کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ صبح پروفیسر کے آنے تک اسے مریض کے چارٹ پر رپورٹ لکھنے کے علاوہ کوئی نہ کوئی عبوری تشخیص بھی لکھنی تھی۔ پھر وہ مختلف ذہنی امراض کے اپنے اپنے منطق کی گتھیوں میں الجھ گیا اور ایک بار پھر سوچنے لگا کہ آخر اس نے اس شعبے کا انتخاب کیوں کر لیا۔ جسمانی عارضوں کی تشخیص اور علاج دونوں ہی کتنے واضح ہوتے ہیں اس نے حسرت سے سوچا، لیکن ذہن، صحت مند ہو یا بیمار، دونوں ہی حالتوں میں ایک عجیب گورکھ دھندا ہے۔

"ڈاکٹر صاب۔" کسی نے اسے بہت قریب سے مخاطب کیا اور وہ چونک کر مڑا۔ یاور عطائی کا بوڑھا ملازم کھڑا تھا۔

"ہوں۔ کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر صاب" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا "میں کچھ بتانا چاہتا تھا جی......"

"ہاں، ہاں، بتاؤ۔" ناصر نے پوری دلچسپی لیتے ہوئے کہا اور اسے یاد آیا کہ یہ شخص پہلے بھی اسے کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن شاید اسے موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

"وہ ڈاکٹر صاب جی، مجھے شک ہے، نہیں جی مجھے پتا ہے کہ مالک نے کوئی دوائی کھائی تھی۔"

"او میرے خدا!" ناصر کے سر پر جیسے کسی نے ہتھوڑے برسا دیے۔ "جلدی بتاؤ کون سی دوائی؟ کس سے لی؟ کب کھائی؟" اس نے یکے بعد دیگرے کئی سوالات کر ڈالے اور لمحوں میں

Scanned by CamScanner

اسے پورے کیس کا نقشہ ہی بدلتا نظر آنے لگا۔

''جی..... مجھے نہیں پتا جی۔ کون سی دوائی۔ مالک خود ہی بناتے ہیں دوائیاں۔ وہی کوئی بنائی تھی اور کھائی تھی۔''

''اوخدایا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اگر تم نے پہلے بتایا ہوتا تو.....'' ناصر نے غصیلے لہجے میں ملازم سے کہا لیکن اندر ہی اندر کٹ گیا۔ یہ اتنا بنیادی سوال میں نے خود کیوں نہیں پوچھا۔ مجھے خود پوچھنا چاہئے تھا کہ مریض نے کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں کھائی۔ جیسے کوئی زہریلی، نشہ آور چیز۔ ناصر کو محسوس ہوا کہ ایک ہی رات میں ایک معالج کی حیثیت سے یہ اس کی دوسری ناکامی تھی لیکن اب اپنی ناکامی کے احساس کو لے کر بیٹھ جانے کی بجائے وہ فوراً ہی متحرک ہو گیا۔ ساری صورت حال اب اس پر واضح ہو رہی تھی۔ تو یاور عطائی کوئی شوقیہ نیم حکیم قسم کی چیز ہے اور اپنی کوئی اوٹ پٹانگ دوائی کھا لینے کی وجہ سے اس حال کو پہنچا ہے۔ یاور عطائی۔ تو اس لیے عطائی۔ اور وہ قرص کیف..... یہی لفظ بول رہا تھا یہ شخص۔ قرص یعنی دوائی کی گولی۔ قرصِ کیف! شاید یہ کسی نام نہاد دوا کا نام ہوگا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ناصر نے مزید کوئی تاخیر کیے بغیر وارڈ میں پھر ایک ایمرجنسی جیسی صورتِ حال پیدا کر دی اور اونگھتی ہوئی نرس اور اکتائے ہوئے وارڈ بوائز کے ''جذبات'' کی پرواہ کیے بغیر انہیں فی الفور Gastric Lavage کرنے یعنی مریض کا معدہ دھونے کا حکم جاری کیا۔ لیکن معدہ دھونے سے پہلے مریض کو جگانا ضروری تھا اور جب وہ یاور عطائی کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس کی بیٹی پھر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی اور وہ خوشی سے مڑ کر اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر اپنے اس خوشی کے اظہار پر اسے تعجب ہوا تھا اور نرس پھر طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

ناصر نے جب مریض کے معدے سے برآمد ہونے والے مواد کے کچھ حصے کو ٹیسٹ ٹیوب میں بند کر کے لیبارٹری بھجوایا تو رات پوری بیت چکی تھی۔ نرس کے طنزیہ انداز کی پرواہ کیے بغیر اس نے زہرہ کو تسلی دے کر گھر واپس بھیج دیا تھا اور اب گہری تھکن اور نیند کا بوجھ اٹھائے صبح کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ڈاکٹر پرویز تھا، اس کا دوست جو ایک دوسرے ہسپتال کی ایمرجنسی میں کام کرتا تھا۔ وہ ناصر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور وہ سُنی اَن سُنی کرتا رہا پھر اچانک پرویز کی ایک بات پر جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگا اور وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔

Scanned by CamScanner

پرویز نے کہا تھا: ''آج ایک مریض آیا۔ تمہاری لائن کا......''

''کیا مطلب؟''

''وہی بھئی میرا مطلب ہے پٹڑی سے اترا ہوا۔ عجیب باتیں کر رہا تھا۔ زمین گر رہی ہے۔ میں گر رہا ہوں۔ بچاؤ۔ مجھے پتا نہیں کیا کیا۔ ایسی ہی کھپ ڈال رہا تھا۔''

''کیا۔ کیا کہہ رہا تھا؟''

''خوف زدہ تھا اور ایسے ہی اول فول بک رہا تھا۔''

''نہیں، وہ کیا بات کر رہا تھا۔ تم جو ابھی کہہ رہے تھے۔''

''پتا نہیں کیا۔ زمین گرتی ہے۔ گر رہی ہے۔ کیوں کوئی خاص بات ہے؟''

''بہت خاص بات۔ اور تم نے کیا کیا اس کا؟''

''کرنا کیا تھا۔ بھجوا دیا یہاں کے نیورو سائیکیاٹری والوں کی طرف مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''دیکھو، میری بات غور سے سنو۔ وہ شخص جو کوئی بھی ہے اسے فوراً G.I. کراؤ۔ معدہ دھلواؤ اس کا۔ اس نے کوئی زہریلی چیز کھائی ہے۔ ایسا ایک کیس میرے پاس بھی آیا ہے۔ جلدی کرو۔''

جواباً پرویز کے کچھ حیرت بھرے کلمات اسے سننے کو ملے اور پھر اس نے فوراً ہی مریض کو ایمرجنسی بھیجنے کا بتایا۔ ناصر نے ٹھنڈا سانس لیا اور حیرت زدہ سا ہو کر یاور عطائی کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ سب آخر کیا ہے؟ کیا شہر میں کوئی انوکھی ذہنی وبا پھوٹ پڑی ہے یا...... اس نے یاور عطائی کی طرف پھر ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کے سوال کا جواب صرف وہی دے سکتا ہو۔ عطائی گہری نیند میں تھا۔

اس ایک رات میں تین اور ایسے ہی مریض وقتی اختلالِ ذہنی کا شکار ہو کر مختلف ہسپتالوں میں پہنچے۔ ان سب کے بارے میں ان کے لواحقین کو علم ہو چکا تھا کہ وہ کچھ غلط شے کھا بیٹھے ہیں اور اس طرح ان کا علاج آسان رہا۔

صبح کی ڈیوٹی پر آنے والے ڈاکٹر کے لیے مزید انتظار کرنا اب اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے نرس کو بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ یاور عطائی کے چارٹ پر ہچکچاتے ہوئے لکھا

Scanned by CamScanner

وقتی ذہنی اختلال جو کسی نامعلوم زہریلی چیز ۔Drug induced temporary psychosis کے کھانے سے واقع ہوا ہے۔ پھر نرس کو مزید تاکید کی کہ مریض کو جگا کر ادویات نہ دی جائیں بلکہ جب تک وہ سوتا ہے سونے دیا جائے۔ نرس نے سر کے خفیف سے اشارے سے یہ تاثر دیا کہ وہ اسکی بات سمجھ گئی ہے۔ اب اس کی مسکراہٹ میں طنز کے علاوہ ایک طرح کی معاملہ فہمی تھی۔ ناصر رات بھر کی پے در پے جذباتی قلابازیوں سے اتنا تھک چکا تھا کہ اب اس کے لیے کسی بھی طرح کا ردعمل ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نرس مختار ایک ''خواہ مخواہ'' قسم کی ہستی ہے جو لوگوں پر نظر رکھ کر اپنے ہی نتائج اخذ کرنے کی عادی ہے۔ ناصر نے اکتائے ہوئے انداز میں بس اتنا سوچا: ''اگر یہ خاتون یہ سوچ رہی ہے کہ میں اس مریض کی جوان خوبصورت بیٹی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں تو سوچتی رہے:'' لیکن اس غیر ضروری سی سوچ کے ساتھ ساتھ کئی طرح کے تاریک خیالات گپھاؤں کی چمگادڑوں کی طرح اس کے ذہن میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ''یہ شخص یاور عطائی کون ہے؟ اس کی وہ قرصِ کیف آخر کیا بلا ہے جس نے چار اشخاص کو دیوانگی کی سرحدوں تک دھکیل دیا؟ لیبارٹری کی رپورٹ کیا ہوگی؟ کچھ بھی نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں اس قسم کی لیبارٹریز ہی نہیں جو نباتاتی اجزا کا صحیح کیمیاوی تجزیہ کر سکیں۔ لیکن کچھ الکلائیڈ تو ضرور ہوں گے یا پھر کوئی نشہ آور چیز؟ کیا یہ شخص کسی قسم کی منشیات کا دھندا کرتا ہے؟'' پھر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ ناصر کے ہونٹوں پر پھیل گئی ''کبیر کا کونسا بک بک نظریہ وقت پر اور مستقبل پر تیرہ مارچ کا یا چودہ مارچ کا درست ثابت ہوا۔ وہ شخص جو اندر وارڈ میں پڑا ہے جو ایک دیوانے فخر کے ساتھ عطائی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے وقت کا کیپسول کیا ہے۔''

صبح کی دھندلی روشنی اب دھوپ کے چمکیلے ٹکڑوں کی صورت میں عالم میں منتشر ہو رہی تھی لیکن ایک تھکا دینے والی بے نیند رات کے بعد روشن دھوپ ناصر کے لیے ایک گاڑھے چپ چپے زرد سیال جیسی تھی جسے اس کے جسم کا ہر ریشہ رد کرتا تھا اور گہری سیاہ سب کچھ نگل جانے والی نیند کی التجا کرتا تھا۔

اسی وقت کبیر مہدی اور فریڈرک ہاف مین اپنے اپنے نیند ٹھکانوں میں بے سدھ سوتے تھے۔

مدد علی سنہرا سکہ چھن جانے کا غم دل میں لیے بیدار ہو چکا تھا اور ارادہ باندھتا تھا کہ وہ

Scanned by CamScanner

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو رات کی ساری روداد سنائے گا۔''نواب صاحب خود ہی اب ان
لوگوں سے سونے کی مہر برآمد کرلیں گے۔'' وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ آج ہی گھوڑوں کا مصالحہ بنانے
کے بعد وہ پھر غلام باغ کے اسی گوشے میں قسمت آزمائی کرنے جائے گا۔
کیفے غلام باغ کا ملازم ارشاد، جو کیفے میں سوتا تھا، اٹھ کر کیفے کی کھڑکیاں اور دروازے
کھول رہا تھا۔
ہاف مین کی محبوبہ گرٹریوڈا اپنے بنگلے کے باغ میں چہل قدمی کرتی اور ''ہیلو خان'' کہتی رات
کے چوکیدار کے پاس سے گزری جو اپنی لوئی سنبھالے سرونٹ کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ میم
صاحب کے جسم سے اٹھتی ہلکی سی خوشبو نے اس کے نتھنوں میں آگ لگا دی تھی۔ ایک اور دن کا
آغاز ہو چکا تھا۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(2)

ارذل نسلوں کی اساطیر

(قدیم)

کتاب۔ ارذل نسلوں کی اساطیر۔ مصنف۔ گلبرٹ والٹن۔ ناشر۔ کیری گرانٹ پبلشرز ویسٹ اینڈ لندن۔ اشاعت اول۔ 1892

اقتباسات۔ صفحہ 3 تا 6

پیش لفظ...... تو اب میں ایک لحاظ سے؟ اس کتاب کے آغاز یا زیادہ بہتر یہ کہنا ہوگا کہ اس کے بنیادی خیال یا مفروضے...... (اب یہ لفظ بھی ان سائنس پسند حلقوں میں کافی مقبول ہو رہا ہے جو انسانوں اور نسلوں کی ہر حرکت کو سائنسی طور پر سمجھنے کے پیچھے لگے رہتے ہیں) .... کا آغاز لندن کے رائل والبرج کلب میں ہوا۔ حسب معمول اس دھند بھری شام کو بھی ہم چھ دوست اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ اور دنیا جہان کے موضوعات کو سکاچ کے جرعوں کے ساتھ تر کر کے اُن کی چیر پھاڑ کر رہے تھے۔ غالباً میرا یہ لفظ ''دنیا جہان'' ہی کسی طرح کسی نے توپ کے منہ پر رکھ لیا، غالباً سائمن فنڈلے نے جسے ماہر لسانیات ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور لگا بارود اُڑانے۔ اس نے کہا، ''اگر اس سے تمہاری مراد، ہر وہ چیز جو سورج کے نیچے ہے' ہے تو یہ 'دنیا جہان' تو برٹش ایمپائر ہی ہو سکتی ہے۔'' اس پر کرنل جیری رچمین نے جو حال ہی میں ہندوستان سے چھٹی پر آیا تھا اور بات بات پر اپنے ہندوستانی تجربات بیان کرنے سے نہیں چوکتا تھا قہقہہ لگایا۔ ''ہاں ایمپائر میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ اور میں تمہیں بتاؤں تمہیں حیرت ہوگی کہ ہندوستان میں کچھ نسلیں سورج کی پوجا کرتی ہیں۔'' اس پر ہمارا مشہور و معروف مؤرخ پیٹرک سافٹ ڈ کرنل کی جہالت پر ایک تضحیک بھری ہنسی ہنسا اور بولا ''ہرگز حیرت نہیں ہوئی۔ یونانی اور رومن سورج کی پوجا

Scanned by CamScanner

کرتے رہے ہیں۔'' کرنل کا فوجی ذہن کسی جواب کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ جیمز بیری مُور بحث میں کود پڑا جو ابھی بحث بھی نہیں تھی مگر مجھے یقین تھا کہ بھڑکے گی اور ویسا ہی ہوا۔ بیری مُور میں بتاتا چلوں کہ شاید میرے بیشتر قاری یہ نہ جانتے ہوں مگر یہ کہ بیری مُور کسی نئی شروع ہونے والی سائنس جسے وہ انتھروپالوجی کہتا ہے کا عاشق ہے اور کہتا ہے کہ ہم انسانی قبیلوں نسلوں اور خاص طور پر پتھر کے زمانے میں ابھی تک پھنسے قبیلوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بہر حال یہ جو کچھ بھی ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ جیمز بیری مُور نے ہمارے مؤرخ کی طرف اب مشکوک تنقیدی نظروں سے دیکھا اور بولا ''مگر پیٹر تمہارا کیا خیال ہے یونانیوں اور رومنوں کی سورج پوجا اور ہندیوں کی سورج پوجا کیا ایک ہی مظہر ہے۔ کیا یہ ایک جیسی ہو سکتی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا تم سے پوچھوں گا کہ کیا افضل نسلوں اور ارذل نسلوں کی اساطیر ایک جیسی ہو سکتی ہیں؟'' اس پر کافی غیر متوقع طور پر ہمارے مؤرخ نے کڑک کر کہا، ''ارذل نسلوں کی کوئی اساطیر نہیں ہوتیں۔'' اس کی آواز بدتہذیبی کی حد تک بلند تھی گو کہ سکاچ کے اعلیٰ معیار کا ایک ثبوت تھی مگر پاس سے گزرتا بٹلر جرمیا ٹوبی بے چین سا ہوتا گزر گیا اور دور بیٹھے لارڈ ایشلے نے تو کافی بدمزگی سے ہماری طرف دیکھا۔ اُن دنوں لارڈ ایشلے کی یہ تجویز خاص دلچسپی کا باعث بنی تھی کہ ہند میں اور یقیناً دوسری کالونیز میں بھی طویل قیام کے بعد برطانیہ واپس مہذب زندگی میں پلٹنے والے رائل فوجیوں کو دوبارہ برطانوی ادب و آداب کی تربیت دینی چاہیے تا کہ ان کے ناپسندیدہ رویے جو یقیناً ابتداً انہوں نے باامر مجبوری اور ایمپائر کی عظمت کے لیے اختیار کیے ہوں گے دھوئے جا سکیں اور اُن کی اصل شخصیتیں واپس لائی جا سکیں۔

بہر حال یہ تو برسبیلِ تذکرہ تھا میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ شہرۂ آفاق مؤرخ پیٹرک سافٹ وڈ کے اس دعوے کو سن کر کہ ''ارذل نسلوں کی کوئی اساطیر نہیں ہوتیں'' ہمارے اس چھ کے ٹولے میں ایک 'علمی سناٹا' سا چھا گیا۔ ظاہر ہے ہر کسی کے ذہن میں تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس پر پیٹر پھر بولا مگر اب معقول انداز میں۔ ''اساطیر کی تشکیل۔ بُنت۔ تخیل۔ افضل اور غالب اذہان کے حصے میں آتا ہے کیونکہ اساطیر کا ارتقائی مقصد بھی ارذل نسلوں پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔'' بیری مُور نے پیٹر کی دلیل کو رد کیا اور کہا کہ افضل اور ارذل نسلوں کی اساطیر میں ساختیاتی فرق تو ہو سکتا ہے لیکن یہ کہ ارذلِ نسلوں کی اساطیر سرا سر ہوتی ہی نہیں لغو بات ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ابھی حال ہی میں ایمزن کے طاس میں سے ہو کر آیا ہے جہاں غار کے زمانے میں

Scanned by CamScanner

رہنے والے قبائل میں بھی اُس نے اساطیری شعور دیکھا ہے۔ اس پر پیٹرک سافٹ وڈ نے قطعاً مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ ''اُن میں بھی جن میں تم نے اساطیری شعور دیکھا ہوگا اُن کی افضل نسلیں ہوں گی۔'' اُس نے اتنا کہا ہی تھا کہ ہمارا ماہرِ لسانیات فنڈلے ایک پُر جوش مداخلت کرنے لگا اور الفاظ افضل۔ ارذل۔ اساطیر وغیرہ کی یونانی اور لاطینی جڑیں کھود کھود کر سامنے لانے لگا اور جناب اس پر تو میری طرح اب تک خاموش ہنری مورگن.......... جو آکسفورڈ میں انسانی فزیالوجی پڑھاتا ہے اور خفیہ طور پر اور اب کافی متروک ہو چکے علم یعنی علمِ بناوٹ کاسۂ سر کو بھی درست مانتا ہے، بحث میں شامل ہوگیا۔ اس نے کہا ''یہ جاننے کے لیے کہ افضل نسل کونسی ہے اور ارذل کونسی ہے ان لفظوں کا گورکھ دھندا ضروری نہیں۔ سروں کی بناوٹ۔ آنکھوں کے درمیانی فاصلے۔ ماتھے کی چوڑائی۔ جلد کی رنگت اور ناک کے نتھنوں کی مخصوص گولائی یا بیضوی پن۔ دانتوں کے زاویے۔ قد و قامت اور ایسا ہی اور بہت کچھ افضل اور ارذل کا فرق واضح کر دیتا ہے۔ باقی رہا اساطیر کا معاملہ تو وہ محض لغویات ہے، سائنس سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مجھ سے۔'' یہ فیصلہ دے کر اس نے بٹلر جرمیا ٹوبی کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے لیے برانڈی لائے۔ واضح رہے کہ ہمارا سائنسدان صرف برانڈی پیتا ہے شاید اس لیے کہ یہ سکاچ کی نسبت زیادہ سائنسی ہوتی ہے۔

تو جنابِ من یہی وہ لمحہ تھا جب جرمیا برانڈی لا رہا تھا کہ میں نے مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا اور میں اس دوران اپنا پورا منصوبہ بنا چکا تھا کہ جو میں نے پیش کرنا تھا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میں لندن کی اُس دھند بھری شام کو والبرج کلب کے کونے میں ہونے والی اس عجیب و غریب بحث کو لے کر آگے چلوں مجھے اپنا تعارف کرانا چاہیے گو کہ کُتب بین حضرات شاید میری کتابوں، 'جنوبی افریقہ میں ہیروں کی خفیہ تجارت' اور 'کام شاستر کے کچھ پراسرار گوشے'، کے ذریعے میرے عاجزانہ نام سے متعارف ہوں گے۔ میں گلبرٹ والٹن ایک پیدائشی ناکام شاعر، صحافی اور پیدائشی ناکام گھوڑوں کی ریس پر شرطیں لگانے والا بھی ہوں۔ جب میرا آخری گھوڑا ہارا تو میں نے سوچا کہ گھوڑے کی پیدائش میں کوئی خرابی ہو سکتی ہے مگر میں تو نجیب الطرفین ہوں تو پھر قصہ کیا ہے۔ اسی رات غیب سے مجھے امداد ملی، میں رات دیر تک اپنے جدِ امجد (روحانی اور ادبی معنوں میں) سر رائیڈر ہیگرڈ کا شاہکار ایلن کوارٹر مین پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے مستقبل کی دنیا میرے اوپر روشن ہوگئی۔ یقیناً اس عظیم مصنف کی روح نے مجھ غریب پر ترس کھایا ہوگا۔

Scanned by CamScanner

میں نے سوچا کہ ایمپائر مہم جوئی کے ادب کے لیے ایک لازوال خزانہ ہے لیکن اگر اسے ناول یا مہم جوئی کے ناول کے روپ میں لکھوں تو کبھی بھی شورائیڈر ہیگرڈ یا کچھ اور معتبر ہستیوں کے قریب بھی نہیں پہنچ سکوں گا۔ لیکن اگر میں حقیقی مہم جوئی کے لیے نکلوں اور اُسے داستانی رنگ اور ادبی چاشنی کے ساتھ پیش کروں، یعنی جتنا بھی میں ادبی تحریر لکھنے کے قابل ہوں، تو یہ ایک نئی بات ہوگی، قاری بیک وقت حقیقت اور فکشن کا مزہ لے گا اور یہ حقیقت تو بھی جانتے ہیں کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ اور حیران کن ہوتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں یہی کروں گا۔ ہمت ہو، ارادہ مضبوط ہو، خدا کا فضل ہو تو ایمپائر میں میرے جیسے مہم جو کے لیے مواد کی کوئی کمی نہیں۔ انہیں دنوں مجھے جنوبی افریقہ میں ہیروں کی تجارت کے حوالے سے کچھ خوفناک واقعات کا پتہ چلا۔ اور میں نکل پڑا۔ اور نتیجہ اس کتاب کی شکل میں سامنے آیا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ خیر یہ قصہ طولانی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ آغاز تھا۔ اب تو یہ ہے کہ میں اپنے کمزور اور عاجز قلم مگر مضبوط اور عظیم ایمپائر کو دعائیں دیتا ہوں اور بس ہر لمحے نکل پڑنے کو تیار رہتا ہوں۔

والبرج کلب میں ہونے والی گفتگو جس مقام پر پہنچی تھی وہ بس میرے نکل پڑنے کا مقام تھا۔ فوجی بیچارے کرنل رچمین کے علاوہ باقی چاروں عالموں کی گفتگو اب میرے لیے بھی 'سب یونانی' ہوتی جارہی تھی چنانچہ میں نے صاف ستھری تحکمانہ انگریزی میں انہیں مخاطب کیا اور کہا ''میری بات سنو'' اور وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوئے جیسے ابھی تک انہیں میری وہاں موجودگی کا علم ہی نہیں تھا۔

''ہاں کیا کہتے ہو رگل'' سائمن فنڈلے نے پوچھا۔

''میں یہ کہتا ہوں کہ یہ فیصلہ اس طرح کی بحثوں میں نہیں ہوسکتا کہ ارذل نسلوں کی اساطیر ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس کے لیے.............نکلنا پڑے گا۔''

سناٹا چھا گیا۔ بیری مُور نے مشکوک انداز میں پوچھا ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ میرا میدان ہے۔ تحقیقی مہم جوئی کا میدان ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو کرنل رچمین اگلے ماہ واپس ہندوستان جا رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا اور یہ میرے لیے وہاں کی تمام ارذل نسلوں کی نشان دہی کرے گا جنوب سے شمال تک۔ مقامی زبانوں کے ماہر میرے ساتھ کرے گا۔ پوری مہم میرے لیے ترتیب دے گا اور پھر ہم خود دیکھ لیں گے۔ یہ تو تم مانو

Scanned by CamScanner

گے کہ سیدھی براہِ راست تحقیق اور مشاہدے کا کوئی نعم البدل نہیں۔"

ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ جسے کرنل رچمین کے پُر مسرت قہقہے نے توڑا۔ "میرے خدا یہ تو کمال ہے۔ کیسا زبردست مزہ ہوگا۔ میں یہ سب مہم تمہارے لیے بناؤں گا کل۔ جیسا تم نے کہا جنوب سے شمال تک۔ اور...... اور...... مقامی زبانوں کا ماہر...... سارجنٹ ڈارلنگ سے بڑھ کر کون ہوگا، وہ دوغلا ہے اور اکثر مقامی عورتوں...... کرنل جوش جذبات میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سہم کر خاموش ہو گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے مگر اُس کے جوش وخروش میں کوئی کمی نہ آئی۔ کم آن والٹن یہ طے سمجھو۔ ارذل نسلوں کی اساطیر ہوتی ہیں یا نہیں ہم خود معلوم کریں گے۔ اور اگلے ماہ چھوڑو۔ اگلے ہفتے ہی نکلتے ہیں۔ ایس ایس ارگوناٹ۔ پلیمتھ (plymouth) کی بندرگاہ میں لگا کھڑا ہے۔"

میں بہر حال اگلے ماہ بھی نہ نکل سکا۔ مجھے کافی انتظامات کرنے تھے۔ اسی دوران ہمارے مؤرخ، ہمارے ایتھنرو پالوجی کے ماہر، ہمارے ماہر لسانیات اور ہمارے انسانی فزیالوجی کے پروفیسر نے ارذل نسلوں کی پہچان کے اپنے اپنے مفروضے مجھے اچھی طرح رٹا دیئے اور اسی طرح اساطیر کی پہچان کے گُر بھی مجھے بتائے گئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں کسی عام گپ بازی کو اساطیر سمجھ بیٹھوں۔ میں نے گو یہ سب کچھ سمجھ لیا اور رٹ بھی لیا مگر اندر سے مجھے پتہ تھا کہ کیا کرنا ہے۔ مجھے اپنی جبلت اور وجدان پر چلنا ہے۔ مقصد کتاب کو دلچسپ بنانا ہے۔ ہاں جہاں ممکن ہوا عالموں کے مفروضے رعب ڈالنے کے لیے چلا دوں گا۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے بعض عالم فاضل قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے مذکورہ بالا نظریات کو پوری ایمان داری سے استعمال کرنے کی کوشش ضرور کی۔

سات مارچ 1888ء کو جب میں پلیمتھ (plymouth) کی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہونے کے لیے پہنچا تو کرنل رچمین کو ہندوستان گئے دو ماہ ہو چکے تھے...... اور یقیناً اس نے مہم کے لیے قابلِ قدر عملی اقدامات کر لیے تھے جیسا کہ اس کے ملنے والے خط سے مجھے پتہ چلا تھا......

صفحہ 372۔ باب نمبر 11۔ شمال میں ہی گہرے دھان کی دنیا میں صفحہ 390۔

دوسرا پیرہ۔ عنوان۔ بھورے غبار کا بخار یا حقیقی اساطیر...... میں اب تک دھان کے کھیتوں سے اٹھنے والی اُس مسلسل بھاری مرطوب مہک سے بے زار ہو چکا تھا جو استوائی جنگلوں کی

Scanned by CamScanner

خوشبوؤں سے مشابہت رکھتی تھی اور نہیں بھی۔ لیکن سارجنٹ ڈارلنگ اس دریائی دھان کے جنگل میں پہنچ کر بہت خوش نظر آتا تھا اور خاص طور پر اس کی خوشبو تو اسے بہت متاثر کرتی تھی۔ میرے بار بار پوچھنے پر آخر اس نے بتا ہی دیا۔

''چیف والٹن کیا تم نہیں سمجھتے۔'' یہاں وہ عجیب بے حیائی سے مسکرایا ''کیا تم نہیں سمجھتے دھان کے ان کھیتوں میں سے اٹھنے والی یہ خوشبو انسانوں کے قربت کے تعلقات میں سے بہنے والی خوشبو جیسی ہے۔'' اس پر وہ پھر بے شرمی سے ہنسا اور میں نے اس کی بات پر حیران ہو کر گہرے گہرے سانس لیے اور اپنے نتھنے بار بار سکیڑے اور پھر آہستہ آہستہ پہچان کا احساس میرے اندر اترا۔ واقعی وہ بدمعاش صحیح کہتا تھا۔ ہمارے پیارے وطن کے جو اور گندم کے کھیتوں سے اٹھنے والی خوشبو کبھی اتنی حیوانی نہیں رہی جتنی ان چاول کے دور دور تک پھیلے کھیتوں سے آتی تھی اور ان کھیتوں کی شکل بھی کمال کی تھی کہ جیسے بلند اور بالکل ہموار کٹی گھاس کے میدان ہوں۔

''میں ٹھیک کہتا ہوں ناں چیف۔''

جواباً میں نے فقط کندھے اُچکائے۔ اور سوچنے لگا کہ مجھے نقشہ دیکھنا چاہئے کہ اب ہم اپنی مہم کے اگلے پڑاؤ سے کتنے دور ہیں۔ یہ 'ان ام گار' کا کوئی بڑا گاؤں تھا جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ کرنل رچمین نے جو نوٹس ہمیں دیئے تھے ان کے مطابق اس گاؤں کے قریب سرکار نے کسی بڑی نہر کے کھودنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ اور یقیناً یہ کام ان ہزارہا منصوبوں میں سے ایک تھا جن کے ذریعے سرکار برطانیہ اپنی کالونیز کی تاریک غیر مہذب دنیا میں جدید تہذیب اور ترقی کی روشنی پھیلا رہی ہے۔ میں نے سارجنٹ ڈارلنگ سے پوچھا یہ ان ام گار کتنا دور ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ابھی اس پر وہی دھانی خوشبو کا حیوانی رومان طاری ہے اور وہ ابھی کچھ مزید کہنا چاہتا ہے۔ میں ڈارلنگ کو مقامی لوگوں اور نظاروں اور جگہوں پر کچھ بھی بولنے سے منع نہیں کرتا تھا کیونکہ اس بارے میں اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں اور وہ ایک جادوئی سرعت سے مقامیوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا تھا کہ وہ اصل میں اُن میں سے ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ہند کی تمام مقامی زبانوں اور بولیوں کا ماہر تھا۔ ایسا کہنا حماقت ہوگی مگر اس نے اپنے ساتھ ایک لسانی ٹولے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ یعنی جیسا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں سات مقامی افراد کا گروپ جو ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا اور ہمارے خچروں کے چارے کا اہتمام کرنے کھانا پکانے خیمے نصب کرنے اور

Scanned by CamScanner

دوسرے کام کرتا تھا۔ ڈارلنگ اپنے اس کثیر المقاصد گروپ کے چند افراد کو ایک دوسرے سے جوڑ کر کسی بھی علاقے کی زبان میں کہی کوئی بھی بات یعنی بعض اوقات ترجمہ در ترجمہ کے ذریعے مجھ تک پہنچا سکتا تھا۔ کرنل رچمین کے بعد اگر سارجنٹ ڈارلنگ میرے ہمراہ نہ ہوتا تو میں اس مہم میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتا اور نہ یہ کتاب 'ارذل نسلوں کی اساطیر' دن کی روشنی دیکھ سکتی۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو سارجنٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں چیف۔ یہ خوشبو مجھے۔ تم جانتے ہو۔ عورت کے لیے سخت مشتعل کر دیتی ہے۔''

''ہوں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ یہاں کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ یہاں مرد ہیں یا خچر اور بس۔''
اس پر وہ خوب ہنسا ''نہیں مجھے یہ دونوں نہیں چاہئیں۔ مگر کچھ پروا نہیں جہاں ہم پہنچنے والے ہیں وہاں مانگر عورتیں خوب دستیاب ہوں گی۔''

''مانگر عورتیں؟''

''ہاں چیف کیا ان لوگوں کو کرنل نے تمہاری ان ارذل نسلوں میں شامل نہیں کیا۔ یہ لوگ سانپ۔ چھپکلے۔ حتیٰ کہ کتے بلیاں اور کیڑے مکوڑے بھی کھا جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے اُن کی عورتیں دنیا جہاں کی عورتوں سے مختلف ہیں۔ اگر تم جانتے ہو میرا کیا مطلب ہے؟''

''میں نہیں جانتا تمہارا کیا مطلب ہے'' میں نے اب قدرے بیزاری سے کہا۔ میں اس موضوع کو اب زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا لیکن دوسرا موضوع بہر حال میری دلچسپی کا تھا یعنی ارذل نسلیں جن کی اساطیر کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔ ''تو کیا 'اِن اَم گارُ' پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں یہاں کوئی ٹارگٹ مل جائے گا۔'' میں نے پوچھا۔ ''ہاں ٹارگٹ'' ڈارلنگ نے نشیلے سے لہجے میں کہا اور میں نے اُسے ڈانٹا۔ ''تم ہوش میں آؤ میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں۔'' اور وہ اپنے آپ میں آ گیا۔ ''معاف کرنا چیف میں ذرا کھو گیا تھا۔ میں اس علاقے میں رہ چکا ہوں۔ اپنی سروے کی عظیم پارٹی کے ساتھ۔ 'اِن اَم گارُ' جائیں گے مگر میں جانتا ہوں اس نہر کی کھدائی کے علاقے اور 'اِن اَم گارُ' کے درمیان یہ مخلوق بستی ہے اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو مانگر جاتی، کہلاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے الٹے پیالوں جیسے خیموں میں رہتے ہیں اور اُن کے ارذل ہونے میں کوئی شک نہیں۔''

مگر میں سارجنٹ ڈارلنگ کی تشخیص فوراً ماننے پر تیار نہیں تھا۔ میں ہمیشہ کرنل رچمین کے

Scanned by CamScanner

سادہ فارمولے پر عمل کرتا تھا۔ ''کہیں بھی پہنچ کر علاقے کے حاکم۔ سرفراز۔ ممتاز۔ قبیلے سے رابطہ کر دو وہ تمہیں خود ہی بتائے گا کہ 'دوسرا' کون ہے جو کہ کم ترین، پست ترین اور بعض حالات بلکہ اکثر حالات میں بدترین بھی ہے۔'' یہ فارمولا میرے کام کو آسان بنا دیتا تھا۔ ارذل نسل کی نشان دہی کرانے کے بعد میں اپنی مترجمین کی ٹیم کے ساتھ اُن کے افراد سے ملاقات کرتا تھا اور اپنے عالم دوستوں کے لسانی۔ تاریخی۔ انتھروپولاجیکل اور فزیولاجیکل نظریوں کا اُن کے جسموں اُن کی باتوں اور ان کی حرکتوں پر اطلاق کرتا تھا اور یوں کبھی پیٹرک سافٹ وڈ کی بات میں وزن نظر آتا تھا تو کبھی سائمن فنڈلے کا کہا درست لگتا تھا کبھی پچکے ناک اور تنگ ماتھے اور گہری بھوری کالی جلدیں دیکھ کر مجھے اپنے فزیالوجسٹ دوست ہنری مورگن کے ایک پکا صاحب سائنس دان ہونے کا یقین ہونے لگتا تھا۔ میں نے البتہ میرا خیال ہے مجھے بتانا چاہیے کہ کرنل رچمین کے فارمولے پر ابتدا میں اعتراض ضرور کیا تو اس کا جواب تھا کہ ''تمہارا کیا خیال ہے ارذل نسلیں کیا اپنی ساری کہانی یا اساطیر کہہ لو خود سنا سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ارذل ہی کیوں ٹھہرتیں'' اور اس کے اس پکے جواب کی مجھے کم از کم اس کے فوجی ذہن سے توقع نہ تھی۔ لیکن یہاں آ کر پتہ چلتا ہے کہ راج بڑی بڑی گہری سچائیاں ہمارے عام متوسط ذہن کے ہم وطنوں کے ذہنوں میں بھی کس حیرت انگیز طریقے سے پیدا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ایمپائر پوری دنیا پر پھیلی ہوئی ایک یونیورسٹی ہے۔

میرے انداز میں شک دیکھ کر سارجنٹ نے کہا ''چیف فکر نہ کرو پہلے ہم ان اَم گرہی جائیں گے وہاں کے لینڈ لارڈ دو قبیلے کاوُچل اور پاؤگل ہیں۔ وہاں سے ہمیں مانگر جاتی اور ان کی اساطیر کے بارے میں بہت کچھ پتہ چل جائے گا.............''

صفحہ 396.............ہم گہرے دھان کی سرزمین سے نکل کر اس علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے جدھر نہر کی کھدائی جاری تھی تو ایک عجیب افتاد آن پڑی۔ میرے بڑے خچر کو جس پر میرا سامان لدا رہتا تھا اور جس کا نام میں نے سلطان رکھا ہوا تھا ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا اور وہ ہمارے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اب مزید سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اور ہمیں کسی فوری امداد کی بھی ضرورت تھی۔ یہاں بھی حسب توقع سارجنٹ ڈارلنگ کا مشکل کشا ذہن کام آیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ نہر کی کھدائی کرنے والوں کا کیمپ قریب ہی ہے۔ وہاں کچھ برطانوی عملہ بھی موجود ہوگا ہمیں ہر قیمت پر وہاں پہنچنا چاہیے۔ اُس نباتاتی ویرانے میں اپنے

پیارے ہم وطنوں کی موجودگی کا تصور ہی ایک خوش کن خواب تھا۔ میں نے حکم دیا..... فوراً چلو۔ چنانچہ میرا سامان دوسرے خچروں پر تقسیم کیا گیا کچھ قلیوں نے اُٹھایا اور میں نے چاول کا ایک پودا اکھاڑ کر آخری عزت کے طور پر سلطان کے جسم پر رکھا اور ہم چل پڑے۔ میں نے گھوم کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ چند لمحوں میں ہی سینکڑوں گدھ سلطان پر اتر چکے تھے.........۔

صفحہ 398 کیمپ کا برطانوی عملہ اصل میں صرف فیلڈ انجینئر جیری پامر اور اُس کے ہیڈ سپروائزر پال فنک پر مشتمل تھا۔ ان دوستوں سے ملاقات ایک شاندار واقعہ بن گئی نہ صرف اس لیے کہ میں کئی ہفتوں سے مقامی خلط ملط خوراک کھا کھا کر دائمی پیچش کا مریض بن گیا تھا اور رات ہمیں........(ہم نے رات بھر وہیں قیام کیا اور اِن اَم گار جانے کا ارادہ اگلے دن تک موقوف کر دیا)...... صاف ستھری برطانوی غذا کھانے کو ملی بلکہ اس لیے بھی کہ یہاں مجھے اپنے اگلے تحقیقی نشانے یعنی مانگر جاتی سے ایک حیران کن براہِ راست رابطے کا موقعہ ملا۔

جیری پامر نے میری مہم کے سب اغراض و مقاصد جاننے پر خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ اُس کا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے مانگر جاتی کے قبیلے کے کچھ سو پچاس لوگوں کو کھدائی کے کام پر لگایا ہوا ہے جیسا علاقے کے اسی طرح کے اور لوگوں کو بھی۔ معاوضہ دے کر۔ مقامی حاکموں کی طرح بیگار پر نہیں۔ تو پچھلے دنوں...... اب میں پامر کے اپنے الفاظ میں بات بیان کرتا ہوں۔

''مسٹر والٹن اس مخلوق میں ایک عجیب و غریب بیماری پھیلتی ہے۔ مگر میں پھیلنا بھی نہیں کہوں گا کہ یہ کوئی وبا نہیں ہے۔ ابھی تک صرف دو افراد ہی شکار ہوئے ہیں۔ میں نے کسی بہتر نام کی عدم موجودگی میں اسے بھورے بخار کا نام دیا ہے۔ اب ظاہر ہے بخار بھورا ہو یا نیلا اس سے تمہیں کیا دلچسپی ہوگی ایمپائر کے ٹراپیکل حصے ایسی نعمتوں سے بھرے پڑے ہیں مگر اس مرض کو جو میں نے بیان کیا ہے تمہارے سامنے تو اس لیے کہ اس میں تمہاری خاص دلچسپی ہو سکتی ہے۔

پہلے تو یہ کہ اس کا شکار جیسے یرقان میں ہر طرف پیلا پیلا نظر آنے لگتا ہے تو اسے ہر طرف بھورا بھورا ہی نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے کوئی بھورا غبار اس کے ہر طرف چھا رہا ہو۔ اب ظاہر ہے اس میں بھی تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی مگر تمہیں اس میں ضرور دلچسپی ہوگی کہ جب اُس کا بخار تیز ہوتا ہے تو وہ بولنے لگتا ہے۔ ہذیان ہم جانتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے لیکن اس بھورے بخار کا شکار مسٹر والٹن

Scanned by CamScanner

میری بات غور سے سنو اور میں تو مقامی زبان نہیں جانتا لیکن میرے مکمل قابلِ اعتماد مقامی مترجموں نے مجھے بتایا ہے کہ بھورے بخار کا شکار کوئی عجیب و غریب بھولی بسری داستان بیان کرنے لگتا ہے۔ کوئی گزرنے زمانوں کی کہانی جسے تم کیا اساطیر نہیں کہو گے؟

بہرحال تو وہ اس بھورے ہذیان میں عجیب و غریب بھورے لوگوں، بادشاہوں عورتوں، غلاموں...... مگر سب بھورے کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس میں اچھے خاصے کردار ہوتے ہیں۔ زمین آسمان، شہر اور ایک پوری دنیا، میرے خدا۔ ایک عجیب و غریب دنیا...... کیا تم اسے اساطیر کہو گے؟''

جیری پامر مجھ سے یہ آخری سوال کر کے خاموش ہو گیا۔ اور میں ششدر سا ہو کر سوچنے لگا کہ جو وہ بتا رہا ہے وہ تو اساطیر کی کسی تعریف میں نہیں آتا۔ کیا اساطیر بخار زدہ مریض کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ تو کیا مجھے انگلستان سے نکلنے سے پہلے اپنے عظیم طبیب دوست فرانسس فرینک لینڈ سے بھی مشورہ کر کے آنا چاہیے تھا؟ آخر میں نے کہا ''نہیں میرا خیال ہے اساطیر صحت مند ذہنوں کی پختہ یادداشت کا حصہ ہوتی ہیں اور جیسا تم نے بتایا کسی عجیب و غریب بخار کے بعد ظاہر نہیں ہوتیں۔ مگر اچھا ہوگا۔ کیا اس وقت کوئی ایسا مریض یعنی بھورے بخار کا شکار موجود ہے؟ میں اُسے دیکھوں گا۔ ہمارے پاس مقامی بولیوں کا ترجمہ اچھی انگریزی میں یعنی ڈارلنگ کے منہ سے نکلی ہوئی انگریزی میں کرنے والی پوری ٹیم موجود ہے۔''

جواباً پامر نے فنک کی طرف دیکھا اور اُس نے ڈارلنگ کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں ٹینٹ سے باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئے تو ڈارلنگ نے بتایا۔

''ابھی ایک شخص موجود تو ہے جو بھورے بخار کا شکار ہے اور مسلسل بول رہا ہے لیکن لگتا ہے وہ اپنے آخری دموں پر ہے اور صرف اُس کے لب ہلتے دکھائی دیتے ہیں۔''

جیری پامر مجھے لے کر تیزی سے باہر نکلا اور ہم تاریک رات میں کیروسین لیمپ کی روشنی میں زمین پر لیٹے اُس اُدھیڑ عمر شخص کے سرہانے جا پہنچے۔ اُس علاقے کی بولی کا سب سے بڑا ماہر اُس کے قریب بیٹھ گیا اور سارجنٹ ڈارلنگ بھی اُس کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گیا۔ بولی کے ماہر نے اپنا کان اُس مرتے ہوئے آدمی کے ہونٹوں کے تقریباً ساتھ لگا دیا اور بڑی مشکل سے کچھ سُننے میں کامیاب ہوا۔ پھر وہ سارجنٹ سے کچھ کھسر پھسر کرتا رہا اور پھر سارجنٹ نے ہمیں عجیب انکشافی لہجے میں بتایا۔

Scanned by CamScanner

"یہ شخص کہتا ہے کہ مرنے والا شخص پتہ نہیں کیا کہتا ہے۔ کچھ سمجھنے سے قاصر ہے مگر جو سمجھ میں آتا ہے وہ بھی سمجھ سے باہر ہے۔ جو اس نے سنا وہ یہ ہے "ایک دن بھورا دریا آسمان سے اُترے گا اور زمین کو بھوری کرے گا اور وہ بھورے بچے جنے گی۔ جن میں سے ہر ایک کا قد آسمان تک بلند ہو گا۔ اس کے علاوہ اُس نے صرف کچھ الفاظ ہیں جو سمجھے ہیں جیسے بھورا بادشاہ۔ پتلا۔ کانٹا۔ پھول۔ اور بس یہی کچھ ہے مسٹر والٹن سر............"

بولی کے ماہر نے پھر کوشش کی لیکن واقعی پھر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس شخص کے لرزتے ہونٹ ساکت ہو گئے۔

"میں نے تمھیں کہا تھا ناں" فیلڈ انجینئر جیری پامر نے کہا "یہ کوئی بھورا غبار ہے جو ان لوگوں کے دماغ کو چڑھ جاتا ہے اور ان کی گفتگو یا شاید اسے ہذیان کہیں گے اس میں بھی بار بار بھورے کا ذکر آتا ہے۔ مگر کیا تم اس ہذیان کو اساطیر کہہ سکتے ہو ان لوگوں کی میرا مطلب ہے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔" میں نے گہرے شک اور افسردگی کی کیفیت میں کہا۔ کیوں کہ بہر حال وہ ایک انسان تو تھا اور اُس کی موت ہوئی تھی۔ پامر کے پاس کھدائی کے دوران مرنے والے کی تدفین یا جلائے جانے کا ایک موثر اور صاف ستھرا انتظام موجود تھا۔ چنانچہ اُس کے عملے نے 'بھورے بخار کی اساطیر' کا شک ڈالنے والے کی لاش کو فوراً سنبھال لیا۔

اُس رات ہم نے اُن سب موضوعات اور میری مہم کے خصوصی موضوع کو بھی بالکل نہ چھیڑا۔ بلکہ ہم اپنے پیارے انگلستان کی بارش، دھند، برف باری اور سکاچ اور گائے کے اسٹیک اور تھیٹر کو یاد کرتے رہے۔ مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ان آم گر پہنچ کر وہاں کا وَچل اور پاؤگل بڑوں سے جو یہاں کے ممتاز قبیلے ہیں اس بھورے بخار کے واہموں کا شکار ہونے والی نسل کی اصل اور ان کی دوسری حقیقتوں کے بارے میں ضرور پوچھوں گا.........................

صفحہ 403 انہوں نے ہمیں ایک وسیع و عریض عمارت کے ایک صحن میں بٹھایا۔ یہ کاوَچل اور پاؤگل چیفس کی کوئی بڑی جگہ تھی جسے وہ حویلی کہتے تھے۔ ان میں سے ایک آدھ ایسا بھی تھا جو انگریزی کے چند لفظ بولتا تھا اور بار بار میرے ساتھ انہیں لفظوں میں ہر طرح کی بات کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح ایک مزاحیہ صورت حال پیدا ہوتی تھی مگر میرا دل بوجھل تھا۔ میں نے بھورے بخار کی اساطیر کو کئی حوالوں سے جانچنے کی کوشش کی اور ڈارلنگ کے توسط سے کئی طرح

کے سوال کیے مگر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔

ڈارلنگ نے اپنے بہترین آدمیوں کے ذریعے ان سرداروں سے مانگر جاتی کے بھورے بخار کے بارے میں معلومات لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ''انہیں اس طرح کے مرض اور مریضوں کا سرے سے کوئی علم نہیں۔ میرا خیال ہے وہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔'' ایک شخص نے البتہ ہمارے ایک مقامی بولی کے ماہر کو رازدارانہ لہجے میں اور اس شرط پر کہ وہ آگے انگریزوں کو نہیں بتائے گا۔ اتنا ضرور بتایا کہ ان سرداروں کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی ان مانگر لوگوں میں کوئی پاگل ہو کر اُن کی برابری کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اُن کے کھیتوں اور ان کی عورتیں ان کے گھروں میں بھی کام کرتی ہیں۔ جو کوئی ایسی دیوانگی کا شکار ہوتا ہے اس کا علاج وہ وہی کرتے ہیں جو پاگل کتے کا ہوتا ہے یعنی موت۔ لیکن کتے کے برعکس مانگر کو بڑی اذیت دے کر مارا جاتا ہے۔ مقامی مترجم نے رازداری کی شرط پر عمل نہ کیا اور سارجنٹ کو زیادہ بخشیش لینے کی شرط پر سب کچھ بتا دیا۔ ڈارلنگ نے آگے مجھے بغیر کسی بخشیش کی شرط کے سب کچھ بتا دیا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ اس نے بھی مجھے سب کچھ نہ بتایا کیونکہ وہ کافی دیر تک اس مقامی بولی کے ماہر سے بات کرتا رہا اور ان کے تاثرات اور ہاتھوں کے اشارے کافی فحش قسم کے تھے۔ میں نے سارجنٹ سے پوچھا کہ وہ مقامی مترجم کے ساتھ مل کر کس قسم کی بدمعاشی پر باتیں کر رہا تھا۔ اس پر اُس نے کہا ''چیف وہ ایسی بدمعاشی ہے جو ہمارے مہذب انگلستان میں میسر نہیں۔'' پھر اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا ''چیف اگر ہم مقامیوں کی تیز گرم کھانوں کی ڈشوں سے کبھی کبھار لطف اندوز ہو سکتے ہیں تو ان کی بدمعاشیوں سے کیوں نہیں؟'' اس پر میں کافی بیزار ہو گیا اور فیصلہ کیا کہ ہم جلد از جلد گھرے سبز دھان اور نہری کھدائی کی اس سرزمین سے نکل جائیں گے۔

اختتام اقتباسات

از۔ ارذل نسلوں کی اساطیر۔ گلبرٹ والٹن

جدید

یہ انعام گڑھ کے ڈاکیے خادم حسین اور اس کے بیٹے یاور حسین کی کہانی ہے جو بعد میں یاور عطائی بنا۔

(۱) خادم حسین مانگر جاتی کا پہلا اور آخری ڈاکیا

خادم حسین کا تعلق سوکڑ نہر کے کنارے آباد مانگر جاتی سے تھا۔ اسے وہیں آباد رہنا چاہیے تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح انعام گڑھ کے کاچھر اور پنگل چوہدریوں کے درمیان ایک ڈاکیا بن کر آبسا۔ قصبے کی یہ سردار نسلیں مانگر جاتی کو ارذل کاموں اور اسفل دھندوں کے لیے بہت موزوں سمجھتی تھیں اس کے باوجود خادم حسین اپنے آپ کو ایک دیانت دار۔ فرض شناس۔ جرأت مند حتیٰ کہ خوددار ڈاکیا بنائے پھرتا تھا۔ اس کا یہ رویہ بعض اوقات خاندانی لوگوں میں ایک جھنجھلاہٹ آمیز تنفر کا باعث بن جاتا تھا اور عجیب معمہ نظر آتا تھا۔ لیکن چند کاچھر اور پنگل بزرگوں کو اس اچنبھے کی وجہ صاف نظر آتی تھی۔ ''عطر گندی نالی میں بھی بہہ جائے تو تھوڑی بہت خوشبو پھر بھی دے دیتا ہے۔'' سب اس رمزیہ بات کی اصل سمجھ سکتے تھے اور خوب ہنستے تھے۔ سب جانتے تھے کہ مانگر عورتیں ان کے گھروں میں خدمت گذاری کرتی ہیں اور ایسے ہی روا روی میں کبھی کبھار وہ اپنے مانگر خاوندوں کی ولدیت کے شبے میں کوئی نسلی بچہ جننے پر بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔

(2) خادم حسین کا نسلی گراف کیسے اوپر کو اچھلتا ہے

انعام گڑھ کے معززین کے اس در پردہ اور با پردہ نظریے سے قطع نظر اگر کوئی 'غیر جانبدار تاریخی شعور کا حامل تجزیاتی محقق' اس مٹی کی ساخت پر تحقیق کرتا جس میں خادم حسین کا خاندانی درخت اگا تھا تو اسے اس مٹی میں عجیب پستی اور انوکھی بلندی دونوں ہی گندھی ملتیں۔ مدتوں تک وہ درخت بس ایسے ہی بے کار پتے ٹہنیاں نکالتا نظر آتا تھا لیکن پھر اچانک کسی ٹہنی پر کوئی پھول بھی نمودار ہو جاتا تھا اور پھل بن جاتا تھا۔ نسلوں تک کاچھروں اور پنگلوں کے دھان کے کھیتوں میں جسمانی مشقت اِکا دُکا چوری چکاری اور عزت دار گھروں کی صفائی ستھرائی کر کے پیٹ پالنے والی اُس ارذل نسل میں اچانک کوئی شخص کبھی کبھار اپنے نسلی گراف کو تھوڑا اوپر اُٹھا لے جاتا تھا اور کسی چھوٹی موٹی سرکاری ملازمت تک بھی جا پہنچتا تھا۔

'غیر جانبدار تاریخی شعور کے حامل تجزیاتی محقق' کے لیے مانگر جاتی کی ایسی نابغۂ روزگار شخصیات کی تلاش زیادہ مشکل کام نہیں ہو سکتا۔

ایک تو اُن میں حاکو کانٹے والا ہو گزرا تھا جب انگریز نے علاقے میں سے ریلوے لائن

Scanned by CamScanner

گزاری تو حاکو (حاکم دین) انعام گڑھ کے اسٹیشن پر کانٹے والا بھرتی ہو گیا۔ سرکاری نوکری ملنے پر وہ اپنی اصل بھول گیا اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے اس کی اصل کی طرف واپس پہنچانے کے لیے چند بڑوں نے آسان طریقہ نکالا اور اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسی ریل کی پٹری پر ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کا منہ نہ باندھا اور آتی ریل کی آواز سن کر وہ پاگل ہو گیا قہقہے لگانے لگا اور وہ ایک ہی بات کہتا تھا۔ میں بھورا بادشاہ بن گیا ہوں، ریل گڈی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

پھر جانے کیسے ان میں ایک بڑی پھوں پھاں والا ماسٹر کرم الٰہی پیدا ہو گیا۔ چوہدری رحیم کاچھر نے پہلے تو اُس کی اکڑ توڑنے کے لیے اسے بڑی بھاری تنخواہ پر اپنے پاس منشی رکھنے کی ترغیب دی اسے ماسٹری سے استعفٰی دلوایا اپنے پاس منشی رکھا اور پھر جوتے مار کر نکلوا دیا۔ مانگر کو سبق سکھانے کا تجربہ رحیم کاچھر کو بڑا مہنگا پڑا۔ مستعفی ماسٹر نے رحیم چوہدری کو اس کے گھر کے سامنے چھریوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اُسے پھانسی کی سزا ہوئی مگر پھر اپیل پر بڑے انگریز جج نے جب ملزم سے انگریزی کے کچھ صحیح گرائمر کے فقرے سُنے تو خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی اس نے پھانسی کی سزا کو کالے پانی کی سزا سے بدل دیا۔ کہتے ہیں وہ مانگر جاتی میں پیدا ہونے والا سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔

پھر ایک پیراں دتا تھا جو تین جماعتیں پڑھ کر شاعر ہو گیا وہ چوپالوں اور میلوں ٹھیلوں میں اپنے ہی بنائے ہوئے قصے گا گا کر سناتا تھا اور بات بات پر رو پڑتا تھا کہتے ہیں ایک روز اسے بڑا زور کا تاپ چڑھا اور وہ مسلسل بولنے لگا اور بس یہی کہتا تھا میرے اوپر بھورے کا آوا ہوا ہے بھورے کا جاوا ہوا ہے کوئی ہے جو لکھ لے۔ مگر وہاں مانگر جاتی میں کسی نے لکھنے کا لفظ بھی نہیں سنا تھا اس کا جسم آگ کی طرح تپتا تھا انہوں نے اس کے اوپر پانی کا گھڑا الٹا دیا اور پیراں دتا قصے والا بُجھ کر مر گیا۔

پھر آخر میں 'غیر جانبدار تاریخی شعور کے حامل تجزیاتی محقق' کو خادم حسین ضرور نظر آتا جو مڈل پاس کر کے انعام گڑھ کے ڈاک خانے میں بھرتی ہوا اور مانگر جاتی کے پہلے اور آخری ڈاکیے کے طور پر زندہ رہنے میں کامیاب ہوا اور ریٹائر ہوا۔ یوں خادم حسین کی نسل کا گراف صدیوں میں بس انہیں چند مقامات پر کچھ اوپر اچھلا تھا اس لیے کہ انہیں وہ لوگ جانتے تھے جو ان میں سے نہ تھے۔ اور وہ جو ان میں ایسے تھے جنہیں صرف وہی جانتے تھے، وہ جو بھورے بخار میں مبتلا ہو کر

Scanned by CamScanner

ہذیان بکتے تھے انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جیسے وہ تھے ہی نہیں۔

(3) خادم حسین کا بیٹا یاور پڑھ جاتا ہے اور کیسا بن جاتا ہے

ارذل نسلوں کی تاریخ کا غیر جانبدار تاریخی شعور کا حامل محقق، یہ بات بھی ضرور نوٹ کرے گا کہ جب بھی مانگر جاتی کا کوئی فرد مکتب کتاب جیسے افضل اداروں کے قریب ہوا اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو گیا سوائے حاکو کانٹے والے کے جس کے ساتھ ان پڑھ ہونے کے باوجود بہت کچھ ہو گیا۔ خادم حسین کا باپ مُندری اپنی نسل کا کوئی محقق نہ تھا کہ اپنے بچے کو سکول بھیجنے کا خطرہ مول نہ لیتا وہ تو اسے سکول اپنے ساتھ اس لیے لے جاتا تھا تاکہ وہ اس کے ساتھ سکول کی صفائی اور پڑھنے پڑھانے والے بچوں ماسٹروں کے فضلے صاف کرنے کے کام میں اس کی مدد کرے۔ وہ تو یوں ہوا کہ کوئی ایک عجیب ماسٹر تھا جو کام پر آنے والے اُس بچے کو دو حرف اپنے طور پر بتانے لگا اور وہ شغل شغل میں مڈل کر گیا اور ڈاکیا لگ گیا۔

لیکن خادم حسین نے آگے سوچ سمجھ کر اپنے بچوں کو پڑھائی کے رستے پر لگایا۔ اس نے مانگر بُو چھوڑی اور انعام گڑھ کے محلہ پکھیاں کے ایک ٹوٹے پھوٹے کھولی جیسے مکان میں کرائے پر آ بسا۔ یوں بھی اب وقت بدل رہا تھا۔ کاچھروں اور پنگلوں کی دنیا اب دھان کی سرزمین سے بہت آگے پھیل گئی تھی۔ انہیں علم ہونے لگا تھا کہ اور نسلیں بھی ہیں جو ان سے بھی بہت اوپر ہیں اور ایک چاول چھڑنے کا کارخانہ لگانے میں ہی انہیں کتنی نسلی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ علاقے کا نسلی کچرا اب ایک مقامی مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ مانگر ڈاکیے خادم حسین نے اپنے بچے سکول میں بٹھائے تو اب یہ کوئی قیامت کی بات نہ تھی۔ مگر خود خادم حسین کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ وہ سکول ڈاک دینے جاتا تھا اور اپنے جگر گوشوں کو لہرا لہرا کر پہاڑے پڑھتے یا تختیاں دھوتے دیکھتا تھا تو اس کا سینہ فخر سے تن جاتا تھا۔ کئی برسوں تک خادم حسین کا ہر دن کا یہی ایک خواب لمحہ ہوتا تھا۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد خادم حسین نے زندگی سے بھی فارغ ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگائی۔ کیونکہ دن میں دیکھنے کو اب کوئی خواب باقی نہیں رہا تھا اور آخری عمر کی بوڑھی راتیں یوں بھی نیند سے خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بیوی بھی مر گئی تو کچھ بھی باقی نہ رہا اور ایک دن وہ بھی بخار میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔

Scanned by CamScanner

مرکردہ ایک ہی ہوکا ساتھ لے کر گیا کہ اس کا چھوٹا یاور حسین جو میٹرک کر گیا تھا وہ اسے اپنی غربی کی سختی کی وجہ سے آگے پڑھا نہیں سکا۔ اُسے اس بات کا کوئی دکھ نہ تھا کہ بڑا نوازش پگلوں کے چاول چھڑنے کے کارخانے میں مزدوری کرنے لگا تھا اور منجھلا مہر دین فلک شیر کا چھر کے رسا گیری کے دھندے میں بڑا آگے آگے تھا۔ خادم حسین جانتا تھا کہ وہ دونوں اتنے جوگے ہی تھے اور اپنے آپے میں تھے۔ لیکن یاور جوحاکو کانٹے والے، ماسٹر کرم الٰہی اور قصے پڑھنے والے پیراں دتے کی لڑی سے تھا وہ شہر جا کر آگے اور بڑے لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہو سکے گا۔ جب یہ ہوکا اسے اُٹھتا تو پھر وہ سوچتا چلو اتنا کم ہے کہ میں مانگر بُو اور سوکڑ نہر کے بیلے کے کنارے تیڑیوں میں بسی اپنی نسل سے اوپر اٹھ کر انعام گڑھ میں آ گیا ہوں اور عزت دار لوگوں کی طرح رہا ہوں۔ مگر پھر جب ان سوچوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ اپنی پیڑھی کے شاعر پیراں دتے کے کلام میں سے کوئی دو بول یاد کر کے دردناک آواز میں گنگناتا اور مان لیتا کہ وہ ہار گیا ہے۔

(4) یاور حسین ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا

لیکن خود یاور حسین اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ حاکم دین کانٹے والے کی ہٹ دھری اور ماسٹر کرم الٰہی کی تباہ کن اکڑ پھوں دونوں ہی اُس میں یک جا ہوگئی تھیں۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی بڑا گھر الگتا تھا۔ میٹرک کے تھوڑی دیر بعد ہی اس نے ایک دن اپنے باپ کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس نے بڑے شہر میں کلرک کی ملازمت اختیار کر لی ہے اور پھر وہ گھر میں اچھے خاصے پیسے لانے لگا۔ اس نے باپ کو ہر وہ سکھ پہنچانے کی کوشش کی جو اُس کی تنخواہ میں حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو بھی چار پیسے تھما دیتا تھا لیکن ایک دفعہ جب ان دونوں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اُس کی ساری کمائی پر حق جتانے کی کوشش کی تو اس نے ان دونوں کو ایسی قاتل نظروں سے دیکھا کہ اُن کے دل دہل گئے۔ انہوں نے ایسی ٹھنڈی چھری جیسی نظر کی جھلک بس کبھی کبھار کسی کا چھر چوہدری یا پنگل سردار کی آنکھ میں دیکھی تھی۔ وہ دن اور پھر انہوں نے کبھی یاور سے کوئی فالتو بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

(5) اپنی زندگی کی آخری رات خادم حسین یاور کو اپنے پاس بلاتا ہے

موت کے روز شام کو خادم حسین نے یاور کو اپنے پاس بلایا۔ کاتک کی چور سردیوں کے دن

Scanned by CamScanner

تھے اور خادم حسین کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پالا کہیں اُس کی بوڑھی ہڈیوں میں سینددھ نہ لگا لے۔ اس خیال سے وہ دن بھر کمرے کے اندر ہی لوئی میں سکڑا سمٹا کھاٹ پر پڑا رہتا تھا۔ باپ کے آواز دینے پر یاور نے یہی سوچا کہ ہر روز کی طرح وہ آج بھی اس سے دن بھر کے واقعات پوچھے گا۔ افسروں کے بارے میں، ساتھی کلرکوں کے بارے میں اور لاری کے سفر کے بارے میں جوان دنوں نئی نئی چلی تھیں۔ لیکن جب وہ اس طرح کے ہر روز کے سوالوں کے جواب ذہن میں بناتا باپ کی چارپائی کے پاس پہنچا اور اس نے اُس کے چہرے کی گہری لکیروں اور ٹھہری ٹھہری سی آنکھوں کو دیکھا تو فوراً بھانپ گیا کہ آج معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ پائنتی کی طرف بیٹھ گیا اور بھائیوں کی خیریت پوچھنے لگا۔ ''اُن کی کوئی بات نہیں نوازش رات دیر کو آئے گا امیر پنگل کے بیٹے کے ختنے ہیں۔ اُدھر کام کاج میں لگا ہے۔ مگر مجھے اور کسی کی بات نہیں کرنی صرف تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' خادم حسین کے لہجے میں آخری گفتگوؤں کے سب شگون تھے۔

''جی ابا جی'' یاور نے کہا۔

''میں اب جانے والا ہوں'' خادم حسین نے ایک سیدھے سے فیصلہ کن انداز میں بتایا۔ اُس وقت ایک ثانیے کے لیے یا شاید وقت کے کسی مختصر ترین لمحے کے لیے یاور حسین کے دل میں یہ خواہش جاگی کہ وہ اپنے باپ کی لوئی میں گھس جائے وہ دونوں لپٹ کر سو جائیں اور کاتک کی اُس چور سردی میں انعام گڑھ کی اس اینٹوں گارے کی کھولی میں، کالی سیاہ رات میں اور نیند کی حرارت میں چپکے سے مر جائیں۔

مگر وہ جذباتی لمحہ جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی تیزی سے ہی چلا گیا تھا۔ یاور کا انداز پھر ایسے شخص جیسا تھا جو مقدس ناقابلِ تردید سچائیوں کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ ہونے والی کو ٹالنے کے لیے کوئی واویلا نہیں کرتا۔

کمرے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا اور وہاں ہر چیز اپنی اپنی جگہ اپنی ہستی کے اٹل ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔ کونے میں پڑے ٹین کے پیپے۔ بان کی خالی چارپائیاں۔ فرش کی اینٹیں۔ چھت کی کڑیاں سب جیسے یاور حسین کی آنکھوں میں چبھن کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ جیسے وہ انہیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ بلکہ وہ خود ہی کسی جادوئی عمل سے اُٹھ اُٹھ کر اُس کی آنکھوں میں گھس رہی تھیں۔ اس نامانوس پریشان کن کیفیت سے بچ نکلنے کے لیے اُس نے باپ کی طرف دیکھا اور

خواہش کی کہ وہ جلد از جلد کچھ کہے۔ لیکن خادم حسین شاید خود اپنے آپ کو سمیٹ رہا تھا ایک آخری بات کہہ دینے کے بعد اور بھی آخری باتیں کہنا اُسے دشوار لگ رہا تھا۔

(6) آخری رات کی آخری باتیں باپ اور بیٹے کے درمیان

آخر یاور حسین خود ہی سکوت توڑنے کے لیے بول پڑا۔

''ابا جی آپ کچھ کہہ رہے تھے'' اُس نے کہا اور فوراً ہی اُسے اپنا کہا بہت بھونڈا اور بدوضع لگا مگر پھر اُس کا کہا اپنا مقصد پورا کر چکا تھا۔ یاور حسین کلرک محکمہ بحالیات بڑا شہر۔ خادم حسین ریٹائرڈ پوسٹ مین قوم مانگر، محلّہ پکھیاں انعام گڑھ...... یہ سب معروضی سچائیاں کا تک کی شام میں تیزی سے ٹھنڈے ہوتے کمرے میں واپس آ چکی تھیں۔

خادم حسین نے لوئی کو جسم کے گرد کس کر لپیٹا اور گلا صاف کرتے ہوئے گویا اشارہ دیا کہ وہ بات شروع کرنے والا ہے اور اپنے آپ پر قابو پا چکا ہے۔

''یاور بیٹا یہ تو تم جانتے ہو ہم کون لوگ ہیں؟'' اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ یاور نے سوچا کیا اس کا باپ اس سے سوال کر رہا ہے؟ مگر یہ کیسا سوال ہے جس کا جواب وہ جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں۔ مگر شاید وہ میرے منہ سے سننا چاہتا ہے اور یاور نے ایسا ہی کیا۔ اس نے بالکل کسی بیان دینے والے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ہم نیچ نسل کے لوگ ہیں ابا جی۔ مانگر جاتی وہ ارزل نسل ہے جو سوکڑ نہر کے کنارے تپڑیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتی ہے۔ بلکہ یہ بھی میں نے غلط کہا کوئی بھی کیڑا مکوڑا اپنی نسل کی رہن سہن سے نیچے نہیں رہتا، یہ انسانوں میں ہی ہے۔ خیر وہ جیسے رہتے ہیں آپ جانتے ہیں سب جانتے ہیں۔ مگر آپ نے مانگر ہو چھوڑ کر انعام گڑھ میں عزت دار لوگوں میں رہنا سیکھا۔''

خادم حسین نے بے چین سی نظروں سے یاور کی طرف دیکھا اسے یک دم اس کا لہجہ بے اعتبار سا لگا۔ اُس نے بے یقینی سے اُس کے الفاظ دہرائے۔

''عزت دار لوگوں میں۔ رہنا سیکھا۔ نہیں...... یہ جھوٹ ہے۔ آج میں تمھیں یہی بتانا چاہتا ہوں۔ یہی جھوٹ ہے جو ساری عمر میں اپنے آپ سے اور دوسروں سے بولتا رہا۔''

Scanned by CamScanner

یاور نے فیصلہ کیا کہ وہ مزید کچھ نہیں بولے گا۔ اُدھر خادم حسین بھی اپنی زندگی کے آخری انکشاف لمحوں کی طرف تنہا بڑھنے کا حوصلہ پیدا کر چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر وہ تمتماتی ہوئی سرخی تھی جو ڈوبتے سورج کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ شام گہری ہو چکی تھی اور کمرے میں اب تاریکی پھیل گئی تھی۔ صحن میں کہیں سے لڑتی بھڑتی بلیاں اودھم مچاتی آئیں اور تیزی سے سیڑھیوں کے رستے ہڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ یاور حسین نے خاموشی سے اُٹھ کر لالٹین جلائی اور پھر پائنتی پر پہلے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ خادم حسین نے لالٹین کی روشنی میں اُس کے چہرے کی طرف پھر لالٹین کی طرف اور پھر کمرے کی طرف دیکھا پھر اس نے اپنی نم ناک بوڑھی آنکھیں ملیں اور اُس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ یاور بھی جو یہ تبدیلیاں غور سے دیکھ رہا تھا متعجب سا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا ابا جی" آخر اُس نے پوچھا۔

"یہ بتی کی روشنی کو کیا ہوا ہے۔ ہر چیز بھوری نظر آ رہی ہے۔ یہ کیا ہوا ہے۔ تمہارا چہرہ کپڑے ٹین کے پیپے ان سب پر بھوری روشنی پڑ رہی ہے۔ جیسے مٹی کا رنگ ہو یا اس بوری کا۔ بھورا بھورا سا ہے۔ آندھی آئی ہے کیا باہر۔ کمرے میں گرد و غبار آ گیا ہے۔"

یاور سمجھ گیا کہ اُس کا باپ بخار میں ہے اور یہ ہذیان ہے۔ اُس نے اُس کے جسم کو چھوا۔ واقعی وہ تیز بخار میں تھا۔

"نہیں کوئی آندھی نہیں ابا جی۔ آپکو بخار ہے۔ آپ آرام کریں۔ کوئی دوا لا دوں۔ میں جاتا ہوں...... شاید کوئی حکیم......"

خادم حسین بے آواز ہنسا "حکیم...... یہاں ایک ہی حکیم ہوتا تھا جو بڑی مدت ہوگئی مر گیا۔ اس کی کہانی بھی میں نے تمہیں سنانی ہے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں نے ابھی کافی بات کرنی ہے۔ مجھے پتہ ہے یہ بخار ہے۔ یہ آخری بخار ہے۔ بس بیٹھو اور میری بات سنو۔ یارے پتر......"

(7) بھورے بخار کے بعد کی باتیں۔ "بڑے ہو کر بہت بڑے بننا"

ایک دم سے یاور حسین کا سارا وجود لرز کر رہ گیا۔ برس ہا برس سے خادم حسین نے اُسے اس نام سے مخاطب نہیں کیا تھا "یارے پتر" اُس کے بچپن کا پیار کا نام تھا جب وہ چھوٹا سا تھا تو

Scanned by CamScanner

خادم حسین کبھی کبھی اسے سائیکل کے ڈنڈے پر موٹا کپڑا لپیٹ کر آگے بٹھا کر ڈاک تقسیم کرنے ساتھ لے جایا کرتا تھا اور آگے جھک کر اس کے چھوٹے سے سر کو چوما کرتا تھا اور کہا کرتا تھا'' یارے پتر تم بڑے ہو کر بہت بڑے بننا۔'' چار پانچ سال کا بچہ بڑے اور بہت بڑے کے فرق میں الجھ کر رہ جاتا تھا اور جھنجھلا کر کہتا تھا'' ابا جی سائیکل اور تیز چلاؤ'' اور خادم حسین قہقہہ لگا کر سائیکل کی رفتار اور بھی تیز کر دیتا تھا۔

اچانک اس بھولے بسرے نام کو سن کر یاور حسین کو اور بھی بہت کچھ یاد آنے لگا مگر اُس نے اُس سب کچھ کا رستہ روک دیا اور اپنی نظر باپ کے چہرے اور کان اُس کی آواز پر لگا دیئے۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا باپ کرب کی ایک ایسی کیفیت سے دو چار ہے جو اکثر اعتراف گناہ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس پر وہ بے چین سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جانے سے پہلے اپنا کوئی خوفناک بوجھ اُس کے کندھوں پر لاد دینا چاہتا ہے، اور خادم حسین نے کہا۔

'' یہ اچھا ہے یارے پتر تم بھولے نہیں۔ ہم نکھد قوم ہیں۔ نیچ۔ ذلیل۔ ماتگر جاتی انعام گڑھ کی گندی نالیوں کا سڑا ہوا گند ہے۔ تم...... تم مانتے نہیں پر لالٹین کی لو بڑی بھوری ہو رہی ہے۔''

'' جی ابا جی...... '' یاور نے معاملہ فہمی سے کہا'' آپ بات کریں ابا جی سب کچھ جو آپ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں۔ میں سُن رہا ہوں۔''

'' ہاں...... تم نہیں بھولے یہ بڑا اچھا ہے۔ شاید حاکم دین کانٹے والا بھی نہیں بھولا تھا۔ اور ماسٹر کرم الٰہی اور پیراں دتا...... تم جانتے ہو یہ کون تھے۔''

'' جی ابا جی میں جانتا ہوں یہ کون تھے......''

''نہیں...... نہیں جانتے وہ مجھ جیسے نہیں تھے۔ وہ جھوٹے نہیں تھے۔ میں ساری عمر جھوٹ بولتا رہا۔ میں سمجھتا رہا میں نے اپنے آپ کو اپنی اولاد کو۔ رُوڑیوں کے کچرے سے اٹھا کر صاف ستھرے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں انعام گڑھ کے بڑے بھی ہیں اشراف بھی اور...... میرے۔''

یاور حسین یک دم بے آواز ہنسا اور خادم حسین کی بات کاٹتے ہوئے بولا'' ماتگر جاتی۔ کاچھروں اور پنگلوں کی جگہ کیسے لے سکتی ہے ابا جی۔ اتنے سامنے کے سچ کو کون جھٹلا سکتا ہے۔''

'' میں جھٹلاتا رہا ہوں بیٹا...... ساری عمر میں اپنے آپ سے تم سے سب بچوں سے یہی فریب کرتا رہا۔ لیکن آج میں چاہتا ہوں۔ کہ تم...... صرف تم...... باقیوں کی میں بات نہیں کرتا۔

Scanned by CamScanner

میرا خون ہیں۔ لیکن میں اُن کی بات نہیں کرتا...... تم...... آج...... میں چاہتا ہوں یہ اس بات کو جان لو کہ تمہارا باپ ایک جھوٹا شخص ہے۔ ایک فریبی ہے۔''

خادم حسین کی آواز میں اعتراف کا وہ خلا تھا جو صرف دوسرے کی قبولیت سے پُر ہوتا ہے۔ اُس نے دکھتی ہوئی سوالیہ نظروں سے یاور کی طرف دیکھا کہ وہ ضرور اُس کے اعتراف کو قبول کرے گا اور اُسے اپنے آپ سے آزاد کردے گا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کے چہرے پر کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح ٹھنڈا اور بے تاثر ہے۔

خادم حسین کا دل تیز بخار میں بھی سرد ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے ہار جانے کا احساس اٹل ہو گیا۔ اُس کی آواز میں اب لرزش گہری اور بھاری تھی۔

''میں ساری عمر عزت دار بننے کے لیے کوشش کرتا رہا۔ ایسا جو اپنی روزی خود کماتا ہے اور اس کی اولاد پہلی صف میں سب کے برابر نماز پڑھ سکتی ہے...... مگر یہ سب جھوٹ تھا......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''بولو...... کیا یہ جھوٹ تھا۔ کیا یہ فریب تھا...... تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔''

یاور حسین پھر بھی کچھ نہ بولا پھر وہ خاموشی سے اٹھا اور چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنے باپ کے سر کو اپنے جسم سے چمٹا لیا۔ لالٹین کی روشنی ان دونوں کے سایوں کو کمرے کے بھورے فرش پر اور بھوری دیوار پر گرا رہی تھی۔ اور اسی لمحے یاور کے لیے اور یاور کے باپ کے لیے وہ قبل از مرگ مکالمہ بے معنی ہو گیا۔ وہ سب کچھ جو کاتک کی اُس شام اُن دونوں کے درمیان کہا گیا تھا لایعنی ہو گیا اور وہ جو کچھ نہیں کہا گیا تھا جو ان دونوں کے درمیان حائل لفظوں کی دیوار کے پیچھے زور مارتا تھا اور اُسے مسمار کرنے کے درپے تھا، خادم حسین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت پھوٹ نکلا۔ کامل شکست کی اتھاہ ذلت کا احساس جو دنیا کے ہر لفظ کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

(8) خادم حسین کا دوسرا بیٹا نوازش آتا ہے

جیسے صدیاں گزر گئی تھیں۔ یاور نے اپنے باپ کو آہستگی سے اپنے جسم سے الگ کر کے بستر پر لٹا دیا۔ خادم حسین نے پھر سب کچھ بھورا دکھائی دینے کی شکایت کی اور پھر کہا، 'بیٹھ جاؤ بیٹا۔' اب اُس کے لہجے میں ایک عجیب طرح کا تشکر تھا۔ مگر یاور حسین کھڑا رہا اور یہی وہ وقت تھا جب

Scanned by CamScanner

نفرت اور اندھے انتقام کا پودا جو مدتوں سے اس کے اندر جڑیں گاڑ رہا تھا چند ہی لمحوں میں پھولوں اور کانٹوں سے لدا تن آور درخت بن گیا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ یاور اور خادم حسین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''نوازش ہوگا۔'' خادم حسین نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اور یاور نے صحن میں جا کر باہر کا دروازہ کھولا تو نوازش ہی تھا۔ اُس نے اپنے سر پر لپیٹنے والے کپڑے کے پلو میں کچھ باندھ رکھا تھا اور اُسے ایک فخریہ انداز میں اپنے ہاتھ میں لٹکائے اندر چلا آ رہا تھا۔ یاور نے دیکھا کہ اُس بندھی ہوئی پوٹلی میں سے قطروں کی صورت کچھ ٹپک رہا ہے۔ دونوں بھائی کمرے کے اندر داخل ہوئے تو خادم حسین نے شاید زندگی میں پہلی بار اپنے اُس بیٹے کو اُس کی سب پستی سمیت قبول کر لیا تھا۔ ناقابلِ تسخیر قوتوں کے مقابلے میں سربلند کرنے کی کوششوں کی تباہی کے بعد اب جہاں وہ خود اپنے آپ کو معاف کر چکا تھا وہاں اب اس کے پاس اپنے کسی بیٹے کو گناہ گار سمجھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

''آؤ بیٹا آ جاؤ''...... اپنے باپ کے یہ دو بول نوازش جیسے گنوار اور اجڈ کو بھی کچھ عجیب سے لگے۔ اس کے باپ کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو آج تک اُس نے اپنے لیے اُس کے لفظوں میں کبھی محسوس نہ کی تھی۔ وہ خوش ہو گیا اور دانت نکالتے ہوئے اور پوٹلی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''ابا میں تیرے لیے چاول لایا ہوں دیگ کے اوراوپر بوٹیاں اور شوربہ بھی ڈلوا لایا ہوں۔''

یاور بے حس و حرکت کھڑا پوٹلی سے گرتے قطروں کو دیکھتا رہا پھر اس نے باپ کو کہتے سنا۔

''اچھا چاول لایا ہے۔ کہاں سے؟'' وہ نوازش سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ بتایا تھا ناں۔ امیر پنگل کے چھوٹے کاکے کے ختنے تھے۔ تیس دیگیں پلاؤ کی، چار زردے کی اور آٹھ گوشت کی پکوائیں بڑا جشن ہوا۔ پہلے مجرا ہوا پھر روٹی۔ پہلے تو وڈے وڈیرے، برادری بھگتی، پھر اخیر ہماری باری آئی۔ کارخانے کے سارے بندے پہنچے ہوئے تھے۔ کھلا کھانا تھا۔ جتنا کوئی کھا لے، اور ہم نے بھی خوب کسریں نکالیں اگلی پچھلی۔'' نوازش نے ٹھہر ٹھہر کر سب بتایا۔

پھر اُس نے قہقہہ لگایا اور دانتوں سے گوشت کے ریشے نکالتے ہوئے ایک ایسی حیرت سے کہنے لگا جسے وہ خود بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ''ویسے ابا کیا بات ہے آج تم مجھے کچھ اور طرح کے لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے۔ ہیں یاور ہے ناں کوئی بات''۔

Scanned by CamScanner

نوازش نے بڑی لہر میں کہہ کر یاور کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔
مگر یاور کو دیکھ کر نوازش کی ہنسی وہیں ٹھٹھر سی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ویسی ہی بے رحم سردی تھی جو اُس کے دونوں بھائیوں کو عجیب خوف میں ڈال دیتی تھی اور اُن کی ہڈیوں تک کو بخ کر دیتی تھی۔

یاور نے دل ہی دل میں کہا "ہاں ابا آج کچھ اور طرح کا ہو گیا ہے۔ اچھا ہوا اُس نے اپنا بوجھ اُتار پھینکا۔ بوڑھا آدمی آخر اور کب تک سہتا۔ آخر مانگروں میں ہر کوئی ماسٹر کرم الٰہی جیسا چھرا مارنے والا تو نہیں ہو سکتا۔"

تب نوازش نے اپنے اُس بھائی کو نظر انداز کیا جو اُن میں سے ہوتے ہوئے بھی اُن میں سے نہیں تھا۔ اُس نے بستر کے ایک کونے کو ایک طرف لپیٹتے ہوئے کھری چارپائی پر چاولوں کی پوٹلی رکھی اور بڑی احتیاط سے اُسے کھول کر کپڑے کے کونوں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ پلاؤ اور زردے کے ملے جلے چاولوں میں جا بجا بوٹیوں اور شوربے کے بھورے آثار نمایاں تھے۔ اُس اشتہا انگیز منظر کو باپ کی نظروں کے سامنے عُریاں کرتے وقت نوازش کی آنکھوں میں ایک فخریہ داد طلب چمک لہرا گئی۔

"بس اب دیر نہ کرو ابا۔ کھا لو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تم بھی آ جاؤ یاور۔" وہ پھر کہہ تو گیا مگر اُس نے یاور کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ یاور نے ایک اچٹتی سی نظر غذا کی اُس چھوٹی سی ڈھیری پر ڈالی جو انعام گڑھ کی پنگل نسل کے کسی جشنِ طرب کی ہیئت باقیات کی صورت میں اُس کے باپ کی چارپائی پر پڑی تھی اور جسے اُس کا بھائی ایک نایاب نعمت سمجھ کر اُٹھا لایا تھا۔ یاور نے دیکھا کہ اُس کا باپ اُسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

"تم......... اگر......... تم کھا لو یاور" خادم حسین نے ایک ایسی گہری جھجک سے کہا جو صرف اجنبیوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے اور جسے باپ اور بیٹے دونوں نے پہچانا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے" یاور نے بمشکل اتنا ہی کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
اپنے اندر کے پلٹ کر باہر آ جانے کا حملہ اُس پر اتنا ہی شدید تھا۔ صحن کے ایک کونے میں بیٹھ کر قے کرتے وقت اُس کی خواہش تھی کہ اُس کے باپ کو اُس کی اس کیفیت کا پتہ نہ چلے۔ لیکن خادم حسین سب کچھ جان گیا تھا اور جب یاور کمرے میں واپس آیا تو اس کے باپ کی آنکھوں کی نمی

Scanned by CamScanner

ختک ہو چکی تھی اور وہ اپنے ہونے پر غالب آنے والی خود ترحمی کی شدت سے لڑ رہا تھا۔ اُس نے یاور کو واپس آتے دیکھا اور پھر نواز ش سے مخاطب ہوا۔

"نہیں بیٹا میں نے کہا ناں مجھے یہ کھانا موافق نہیں۔ میں بیمار ہوں، میں یہ ہضم نہیں کر سکتا۔"

نوازش نے پوٹلی پھر سے باندھ دی اور مایوسی سے کہنے لگا۔ "اچھا چلو میں اُدھر رکھ دیتا ہوں۔ صبح کھا لینا۔ جب دل چاہے..........." اُس نے چاولوں کی پوٹلی اُٹھا کر ایک طرف ٹین کے پیپے پر رکھی اور پھر جمائی لیتے ہوئے باہر برآمدے کو جانے لگا اور بولا "بڑی گھوکی چڑھ رہی ہے۔ میں تو سوتا ہوں۔" اور وہ باہر برآمدے میں پڑی کھاٹ پر آ کر گرا اور گرتے ہی سو گیا۔

(9) خادم حسین اپنے بیٹے یاور کو حکیم احسان الٰہی اور گنجینۂ نشاط کا عجیب و غریب قصہ سناتا ہے

برآمدے میں سے نوازش کے خراٹوں کی آوازیں ایک میکانکی تواتر سے اندر کمرے میں بیٹھے خادم حسین اور یاور کے کانوں میں گھس رہی تھیں اور مکمل خاموشی میں تسلسل سے اُٹھنے والی سب آوازوں کی طرح اُن دونوں کے دلوں میں ان کہی ناقابلِ فہم اذیتوں کو جنم دے رہی تھیں۔ دونوں میں ایک بار پھر کچھ کہنے کی گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ لفظ ایک بار پھر غیر متعلق ہو چکے تھے۔

آخر یاور اُٹھا۔ "میں چائے بناتا ہوں"، اُس نے کہا اور برآمدے میں نکل آیا۔ ایک کونے میں پڑے تیل کے چولہے کی طرف جاتے ہوئے وہ نوازش کی کھاٹ کے قریب سے گزرا تو اُس نے زور سے کھاٹ کے پائے کو ٹھوکر لگائی۔ نوازش کے خراٹے رُک گئے۔

چائے بناتے وقت وہ آگ کے شعلوں کو گھورتا رہا اور پانی اُبلتا رہا۔ آگ پر پانی اُبلنے کے اُس بظاہر بے حد معمولی عمل کو وہ اتنی دیر تک دیکھتا رہا کہ پانی خشک ہونے کو آ گیا۔ وہ چونکا اور پھر جلدی سے چائے بنا کر پیالیوں میں ڈال کر اندر لے آیا۔ پھر اُس نے باپ کو سہارا دے کر بٹھایا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے بخار کی شدت میں کمی آ گئی ہے۔

"آپ کا بخار کم ہوا ہے۔ اباجی مجھے لگتا ہے۔"

"ہاں مجھے بھی لگتا ہے۔ اور مجھے اب لالٹین کی لو ٹھیک دکھائی دے رہی ہے۔ پتہ نہیں وہ

بھورا سا غبار کیا چڑھ گیا تھا۔"
چائے کے بعد یاور نے ایک سکون اپنے اندر محسوس کیا اور الوداعی انداز میں خادم حسین کو واپس سہارا دے کر بستر پر لٹانے کے لیے بڑھا۔ لیکن وہ ابھی لیٹنا نہیں چاہتا تھا۔
"مجھے بیٹھا رہنے دو۔ ابھی بستر پر کمر لگانے کو جی نہیں چاہتا۔"
"میرا خیال تھا آپ آرام کرتے۔ کافی رات گزر چکی ہے۔ کوئی دوا آپ کو مل جاتی اور بھی اچھا تھا۔ مگر ...."
"دوا ...." اچانک خادم حسین نے چونک کر کہا، "حکیم، حکیم احسان الٰہی۔ یہی تو قصہ میں نے تمھیں سنانا تھا۔"
خادم اتنا کہہ کر کسی سوچ میں ڈوب گیا اور یاور نے حیرت سے دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا باپ کسی بات پر شرم محسوس کر رہا ہے، اور جب اُس کی خاموشی کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی تو یاور نے کہا۔
"آپ کچھ کہہ رہے تھے ابا جی۔"
"ہاں .... ہاں ...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہاں سے شروع کروں۔ اصل میں یہ ایک کتاب کی بات ہے۔" اس نے کچھ جھینپے ہوئے لہجے میں کہا۔
"کتاب؟ کونسی کتاب ابا جی۔ ابھی تو آپ کسی حکیم کا ذکر کر رہے تھے۔" یاور حسین کی حیرت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔
خادم حسین پھر چپ ہو گیا، اس کی بھویں سکڑی ہوئی تھیں۔ جیسے مضطربانہ انداز میں ماضی کے کونوں کھدروں میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو .... برآمدے سے اب نوازش کے خراٹوں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن اُس وقت کہ رات آدھی سے اوپر جاتی تھی انعام گڑھ کے قصبے کے پس منظر کی مدھم آوازیں کمرے میں صاف اُبھرنے لگی تھیں اگرچہ باپ بیٹا دونوں میں سے کسی کے کان بھی اُن سے متاثر نہیں ہو پائے تھے۔ جیسے وہ تھیں ہی نہیں۔ اسٹیشن سے دور ہٹتی ریل کی سیٹی کی آواز۔ محلہ پکھیاں کے عقب میں چند گلیاں چھوڑ کر کھلے میدانوں اور کھیتوں کی راہ پر چاول چھڑنے کے بہت سے کارخانوں کا زمین اور پھر قریبی مکانوں میں سرایت کرتا بھاری دھمک جیسا شور اور پھر وقتاً فوقتاً سناٹے میں اُٹھتی چوکیداروں اور کتوں کی آوازیں۔ جاگتے رہو۔ اور بھونکنے

Scanned by CamScanner

کی آوازیں۔

''وہ ڈاکٹر۔ حکیم۔ نسخوں کی بات ہوئی تو مجھے یاد آئی تھی وہ کتاب'' خادم حسین نے کہا۔

''میں نے آج تک تم سے بات نہیں کی۔ شاید ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ شاید وہ کتاب تمہارے پڑھنے کی ہوگی بھی نہیں، اور تم اُسے ادھر اُدھر پھینک ہی دو گے شاید مگر.......... ویسے بھی پتہ نہیں اُسے کتاب کہیں گے بھی کہ نہیں.......... کتاب تو ویسی ہوتی ہے ناں جو چھپی ہوئی ہوتی ہے؟''

''مگر کیسی کتاب ابا جی'' یاور کے لہجے میں اب جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔

''بیٹا بات ذرا لمبی ہے۔ بہت پیچھے جانا پڑے گا.......... میں نے اس قصبے میں انعام گڑھ اور اردگرد کی بستیوں میں گاؤوں میں تیس سال تک ڈاک تقسیم کی۔ بڑی عجیب زندگی ہوتی ہے ڈاکیے کی۔ بڑی عجیب۔ عام بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہر روز لوگوں کی۔ چھوٹوں کی بڑوں کی، کمی کمین کی۔ بہت بڑے سرداروں کی عزت داروں کی اچھوں کی بُروں کی سینکڑوں امانتیں اُن تک پہنچانی ہوتی ہیں۔ خط...... رجسٹریاں...... منی آرڈر...... پارسل...... بڑی بڑی قیمتی چیزیں ہوتی ہیں ان کاغذ کے لفافوں میں اور کپڑے کے سلے پارسلوں میں اور ڈاکیے کو...... ایک وقت تو آتا ہے بیٹا کہ ڈاکیے کو پتہ چل جاتا ہے کہ لفافے میں یا کپڑے کی تھیلی میں کیا ہے میرے ساتھ تو ایسا ہی تھا۔ لیکن اللہ کا فضل ہے کبھی دل میں چور نہ آیا۔ کبھی امانت میں خیانت نہیں کی...... سوائے.......... سوائے...... شاید ایک بار...... میرا اللہ مجھے معاف کریگا۔ کیونکہ ایک طرح سے وہ خیانت بھی نہیں تھی''

خادم حسین گہرے سانس لیتا رُک گیا۔ یاور کو ہمہ تن گوش پا کر اُسے گہرا اطمینان ہوا اور وہ پھر کہنے لگا۔

''وہ ایک کتاب تھی۔ ایک حاذق حکیم کے نام پارسل تھا۔ کیا نام تھا اُس کا......؟ ہاں وہی حکیم احسان الٰہی انعام گڑھ کے بڑے بڑے پنگل اور کا چھر چوہدری اُس سے اپنا خاص علاج کراتے تھے۔ خاص علاج سمجھتے ہو ناں۔ تم سے کیا چھپانا۔ اب تم ماشااللہ سمجھدار ہو۔ ڈھلتی عمر کے عیاش مردوں کو اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ خاص نسخوں کے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس ویسے ہی نسخے بڑے بڑے مہنگے وہ حکیم دیا کرتا تھا۔ وہ جو ضرورت اور مال رکھتے تھے۔ وہ اُس کے پاس جاتے تھے اس کی غلامی کرتے تھے اپنی مجبوری کو۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب

میں......سوچو میں...... میں کیا ہوں...... کچھ بھی نہیں............ لیکن میں یہاں کے کچھ بڑے سرداروں کی آنکھوں میں زیادہ ہی کھٹکنے لگا تھا۔ وہ کوئی اپنا بندہ ڈاکیا رکھوانا چاہتے تھے۔ انہیں یہ بات کسی طرح ہضم نہیں ہوتی تھی کہ مانگر جاتی کا ایک کیڑا مکوڑا جیسا ڈاکیا اُن کی قیمتی ڈاک پاس رکھے اور تقسیم کرے، اور انہی دنوں.................." اچانک خادم حسین کی آنکھوں سے چنگاریاں سی اڑیں۔"انہوں نے تمہاری ماں پر بھی الزام لگایا"

یاور حسین نے سوچا کہ وہ سنتا رہے گا اور دیکھتا رہے گا بولے گا نہیں۔ ابھی نہیں۔ اس کا باپ پھر بولا۔

"خیر۔ دفعہ کرو یہ تو بڑی دوسری طرح کے قصے ہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی "گزر گئی اب تو ساری۔ ہاں تو ساون بھادوں کے دن تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ دوپہر ایک بجے میں نے ڈاک خانے سے ڈاک اکٹھی کی اور ارادہ بنایا کہ کدھر سے شروع کروں۔ بعض خط بہت دور کے تھے۔ دیکھو ہر روز ڈاکیے کی منزل الگ ہوتی ہے۔ ہے ناں............ اچھا......تو......اس روز کی ڈاک میں کچھ بڑی رقم کے منی آرڈر تھے۔ اور اس ڈاک میں وہ ایک پارسل تھا بھورے سے چرمرے کاغذ میں اور اوپر حکیم احسان الٰہی کا پتہ لکھا تھا۔ حکیم قصبے کے باہر آخری کونے سے آگے ایک عجیب ڈراؤنے سے مکان میں رہتا تھا۔ ویسے لوگ کہتے تھے کہ بے تحاشا کماتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص بوڑھوں کو جوان کر دے، اسے کیا کچھ نہیں مل جاتا ہوگا۔ خیر چھوڑو......تو وہ کافی دور رہتا تھا۔ ویسے تو ڈاکیے کے لیے کچھ دور نہیں ہوتا پر اُس دن کی تقسیم میں وہ سب سے دور تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ سب سے آخر میں ادھر جاؤں گا۔ تو میں شہر بھر کی ڈاک تقسیم کر کے آخر میں وہی ایک بھورا پارسل لیے اُس جگہ پہنچا جسے چھوٹا دندا کہتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں سے آگے بس ویرانہ شروع ہو جاتا تھا۔ تو میں وہاں پہنچا تو دور سے ہی حکیم کے مکان کے سامنے بہت سے لوگ بیٹھے نظر آئے جیسے پھوڑی پر بیٹھے ہوں۔ کچھ اور قریب گیا تو کسی نے بتایا کہ حکیم پچھلی رات مر گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں مجھے وہ بھی نظر آیا جس نے......"

یاور نے دیکھا کہ اُس کا باپ پھر گہرے سانس لیتا ہے اور جیسے بات کو بدل کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا جتن کرتا ہے۔

"......جس نے تمہاری اماں پر الزام لگایا تھا۔ میرے اندر آگ بھڑکی اور میں نے اُس پر

Scanned by CamScanner

اور اُس کے اُس حکیم پر بھی لعنت بھیجی...... مر گیا تھا فاتحہ تو پڑھنی چاہیے تھی پر میں نے نہ پڑھی۔ باقی اُس حکیم کا کوئی آگے۔ پیچھے۔ کوئی آل اولاد۔ کوئی 'جیا جنت' بھی نہ تھا جسے وہ پارسل دے کر میں اپنا فرض پورا کرتا۔ اگر اُن سے بات کرتا جو حکیم کے سرپرست بنے پھرتے تھے...... تو وہ تو اُس کو فوراً اتھیا لیتے...... ایسے میں اصل طریقہ تو یہ تھا کہ بھیجنے والے کا پتہ لکھ کر واپسی ڈاک بھیج دیتے۔ تو میں واپس آ گیا۔ ابھی میں اِدھر انعام گڑھ نہیں آیا تھا۔ تو میں سیدھا مانگر بُوا اپنی تیزی میں واپس چلا گیا۔ میں نے پوسٹ ماسٹر مکرم دین سے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا۔ وہ بڑا حمایتی بنا پھرتا تھا ان دنوں کا چھروں اور پنگلوں کا۔ خیر جی۔ میں نے واپس آ کر پارسل کھولا۔ اور اللہ جانتا ہے اس ارادے سے کہ اندر سے کہیں بھیجنے والے کا پتہ نکلے گا تو اندراج کر کے واپس بھیج دوں گا۔ لیکن اندر سے تو کچھ عجیب سی شے نکلی۔ کوئی پیغام۔ کوئی پتہ کچھ بھی نہ تھا۔ بس وہ ہاتھ کی لکھی...... وہ کیا کہتے ہیں قلمی کتاب تھی...... کتاب بھی کیا نہ کوئی جلد نہ کچھ بس کوئی اسّی نوے صفحے سلے ہوئے تھے۔ جنہیں ہاتھ لگاؤ تو بھر بھرے اتنے کہ ٹوٹتے تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ کسی ایک ہاتھ کی لکھائی نہیں کئی ہاتھوں کی لکھائی ہے۔ کئی زبانوں کی لکھائی ہے۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی، سنسکرت، میں بس شکل سے پہچانتا تھا۔ تو میں ان صفحوں میں گُم سا ہو گیا......"

خادم حسین کا سانس پھول رہا تھا۔ یاور اٹھا اور گھڑے سے اُس کے لیے ٹھنڈے پانی کا پیالہ بھر لایا اور پیالے کو اُس کے منہ کے قریب تھام کر رکھا۔ خادم نے چند گھونٹ پیے تو جیسے پھر بولنے کے قابل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے یاور نے سوچا کہ اتنا مسلسل بولنا اس کے باپ کے لیے اچھا نہیں۔ مگر اس کے دل نے کہا اُس حیرت انگیز کتاب اور اس حیرت انگیز داستان کو ادھورا چھوڑنا بھی اچھا نہیں۔ یوں خادم حسین بھی کبھی اس بات کو ادھورا نہ چھوڑتا اپنی زندگی کے آخری سانس تک بھی۔ وہ بولا۔

"تو بیٹا میں نے وہ کتاب ساری دیکھی وہ ساری زبانیں تو مجھے خاک سمجھ آتیں لیکن باہر فارسی زبان میں موٹا سارا کتاب کا نام کسی نے کتابت کر کے لکھا تھا اور جس بارے میں وہ کتاب تھی وہ مجھے سمجھ آ گیا۔ وہ وہی نسخے تھے وہی مرد کی طاقت بڑھانے والے۔ اور اسے جلد بوڑھا نہ ہونے دینے والے......" خادم حسین نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔

"اور وہ کتاب کا نام؟" یاور نے گہرے اشتیاق سے پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''وہ لکھا تھا، گنجینۂ نشاط، اور آگے تھا مجربات برای درازیٔ عمر پادشاہاں و شباب دائمی ایشاں۔''

خادم پھر خاموش ہو گیا اور یاور اپنی خاموشی میں کاتک کی اُس ٹھنڈی رات میں کہیں بہت دور چلا گیا وہ سب کچھ جو اُن باپ بیٹوں کے جسم و جان کے ریشوں سے گزرتا تھا اتنا بے وزن ہو گیا کہ یاور جیسے ہوا میں اُٹھ گیا اُس کا جی چاہتا تھا زور زور سے قہقہے لگائے مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ تو بے قابو سا ہو کر اپنے باپ سے سوال کرتا ہے۔

''ابا جی وہ کتاب ہے ناں۔ آپ کے پاس۔ ابھی تک۔ کہیں گم، ضائع، تو نہیں ہوئی۔ ہے ناں وہ آپ کے پاس۔ ہے ناں؟''

''ہاں...... مجھے پانی پلا......'' اور یاور نے اسے پانی کے چند گھونٹ پھر پلائے۔ ''وہ کتاب ہے بیٹا۔ میں نے ٹرنک میں حفاظت سے رکھی ہے۔ اُس وقت ایک اور طریقہ بھی تھا اگر بھیجنے والے کا پتہ نہیں ملا تھا تو مجھے چاہئے تھا اس پارسل کو پھر سیل کر کے خطوں کے مردہ خانے میں جسے ڈیڈ لیٹر آفس کہتے ہیں وہاں بھیج دیتا۔ مگر میں نے ایسا بھی نہ کیا...... وہ پارسل...... وہ کتاب اپنے پاس رکھ لی۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا۔ ابا جی آپ نے بہت اچھا کیا۔'' یاور نے ایک انوکھے جوش سے کہا۔

''پتہ نہیں اچھا کیا کہ بُرا کیا۔ پر یہ میری پیشے کی پہلی اور آخری خیانت تھی اور ایک اور عجیب بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں...... خیر ویسے وہ اتنی عجیب بھی نہ تھی۔ ڈاک کے پیشے میں ایسے اور تماشے بھی دیکھے ہیں بہت میں نے...... پارسل پر روانگی کی مہر کی جگہ کا نام تو نہ پڑھا جاتا تھا لیکن تاریخ صاف تھی اور وہ تاریخ ساٹھ سال پہلے کی تھی۔''

(10) یاور حسین گنجینۂ نشاط دیکھتا ہے۔ عجیب کیفیتوں سے گزرتا ہے، انوکھے فیصلے کرتا ہے

یاور حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ''ساٹھ سال پہلے کی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ابا جی......''

''ایسا ہوتا ہے بیٹا'' مانگر جاتی کے پہلے اور آخری ڈاکیے نے کہا۔ ''خاص طور پر خطوں کے

Scanned by CamScanner

ساتھ تو ایسا بہت ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کسی کونے کھدرے میں کوئی ایک آدھ کسی کی بھول چوک سے پڑا رہ جاتا ہے اور پھر برسوں کسی کی اُس پر نظر نہیں پڑتی۔ پھر کوئی اسے دیکھ لیتا ہے اور پہنچا دیتا ہے۔ اپنی تیس سال کی نوکری میں میں نے پانچ خط چالیس سال پہلے پوسٹ ہوئے تقسیم کیے۔ لیکن پارسل کے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا...... تم میری بات سن رہے ہو ناں......"

یاور کے لیے ڈاک کے محکمے کے عجوبوں سے زیادہ عجوبہ وہ کوئی گنجینۂ نشاط تھا اور وہ اُس تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔

"جی ابا جی...... مگر وہ کہاں ہے۔ وہ گنجینہ کتاب کہاں ہے۔"

خادم حسین نے کمرے کے ایک نیم تاریک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں طرح طرح کا کاٹھ کباڑ رکھا تھا، "اُدھر دیکھو اس ٹرنک میں میری پرانی وردیوں کے نیچے سب سے نیچے وہ پارسل رکھا ہے۔ میں نے اخباری کاغذ میں پیکٹ بنا کر رکھا تھا۔ وہاں سے نکال لو۔"

اور یاور نے ویسا ہی کیا۔ اُس نے لرزتے ہاتھوں سے اُس پیکٹ میں سے وہ پارسل اور پھر احتیاط سے حد درجہ احتیاط سے وہ سِلے ہوئے بھر بھرے کاغذوں کی قلمی کتاب نکال لی۔ صفحات پرانے طرز کے موٹے کاغذ کے تھے۔ جو لالٹین کی روشنی میں سیاہی مائل پیلے نظر آ رہے تھے۔ اس نے سب سے باہر کے صفحے پر خوشخط تحریر کو دیکھا اور حیرت سے سوچا واقعی یہ تو وہی لکھا ہے جو اس کے باپ نے کہا تھا اور اس نے بلند آواز میں پڑھا۔

"گنجینۂ نشاط یعنی مجربات برای درازیٔ عمرِ پادشاہاں و شبابِ دائمی ایشاں...... اس کا مطلب تو کچھ ایسا ہوا ابا جی کہ عیش و نشاط کا خزانہ۔ اور آگے جیسے وضاحت کی گئی ہے کہ بادشاہوں کی لمبی عمر اور ہمیشہ کی جوانی کے لیے مجربات...... یہی ہے۔" "ہاں یہی ہے" خادم حسین نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اس کے جسم کا بخار پھر واپس آ رہا تھا۔

یاور عجیب دھن میں تھا "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عیش و عشرت کا یہ خزانہ صرف بادشاہوں کے لیے کیوں ہے۔" اُس نے خادم حسین کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر ایک تھکی ہوئی فخریہ مسکراہٹ پھیلی تھی جیسے اس نے واقعی اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ اپنے بیٹے کے سپرد کر دیا ہو۔

"صرف بادشاہوں کے لیے کیوں؟" اُس نے ٹھہر ٹھہر کر اپنے بیٹے کے سوالیہ الفاظ

Scanned by CamScanner

دہرائے اور پھر جیسے اُن کا جواب اُس کے ذہن میں آ گیا۔ ''شاید اس لیے بیٹا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ نسخے۔ جو بات...... جو بھی یہ ہیں۔ اصل میں صرف بادشاہوں ہی کے بس کی بات ہوں......''

''ہوں'' یاور کی آواز عجیب غراہٹ جیسی تھی اور پھر وہ کچھ دیر کانچ سے بھی زیادہ نازک ان صفحات کو پلٹتا رہا اور اپنے باپ کے چہرے کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

''آپ نے ٹھیک کہا ابا جی۔ واقعی یہ مجربات صرف بادشاہوں کے بس کا روگ ہیں۔ لکھا ہے صاف۔ عمائدین سلطنت سے کم تر حیثیت کے لوگ رجوع نہ کریں وگرنہ اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالیں گے۔ جگہ جگہ نیچ حیثیت کے لوگوں کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ وہ انہیں استعمال نہ کریں نہیں تو اذیت ناک موت یا دیوانگی کا شکار ہو جائیں گے۔ گنجینۂ نشاط صرف بادشاہوں...... کی درازیٔ عمر و شباب کا راز ہے۔'' یاور نے کہا اور پھر وہ ہنس پڑا۔

یاور حسین اس رات ہی نہیں شاید مدتوں بعد پہلی بار ہنسا تھا اور وہ قہقہہ ایسا تھا جس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا جو جسم کے اندر سے سمندر میں پھٹنے والی کسی بارودی سرنگ کی طرح اوپر پُر شور چیرتے اُچھلتے پانی کی صورت فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ ایسا قہقہہ جو کبھی بھی یاور حسین کے جسم سے بلند نہ ہوا تھا۔ خادم حسین متحیر رہ گیا ''کیا میرا بیٹا اس طرح ہنس بھی سکتا ہے'' اُس نے سوچا اور پھر جب اسے اُس کی ہنسی عجیب ڈراؤنی سی لگی تو وہ خود بھی ہنس پڑا جیسے اُس کے لیے لازم تھا کہ بیٹے کی ہنسی میں شریک ہوتا، اور ایسا نہ کرنا بڑا پاپ ہوتا۔ اُس کا بیٹا کہہ رہا تھا۔

''ابا جی۔ یہ آپ نے کمال کر دیا۔ کم از کم انعام گڑھ کے بادشاہوں کو تو آپ نے درازیٔ عمر اور شباب دائمی کے ان مجربات سے محروم کر دیا...... اُن کی عمریں اور ان کا شباب کچھ نہ کچھ تو ضرور مختصر ہوا ہوگا...... آپ کی وجہ سے......'' اور وہ پھر ہنسا۔ مگر اب خادم حسین اس کی ہنسی میں شامل ہونے کی بجائے لرز کر رہ گیا۔ وہ یاور کی بات کی رمز جان گیا تھا۔ کاچھروں پنگلوں کا دائمی شباب مانگر جاتی کے لیے اور اُن کی عورتوں کے لیے کیا مطلب رکھتا تھا۔ خادم حسین سے زیادہ کون جانتا تھا۔'' اُس کی سانس پھر پھولنے لگی۔ بخار نے پھر زور مارا تو اُسے لالٹین کی بتی پھر سے بھوری روشنی دکھائی پڑنے لگی۔

''یہ آپ نے کمال کیا ابا جی'' یاور پھر کہہ رہا تھا۔ مگر اچانک خادم حسین پر ایک بھاری شک اترا اور وہ گہری مایوسی سے بولا۔

Scanned by CamScanner

"نہیں بیٹا۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ کون جانتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ جھوٹ کا پلندہ ہی ہو۔ یہ گنجینہ جو ہے۔ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کوئی ایسا ہی فریب ہو یہ کچھ بھی نہ ہو۔ یہ نسخے۔ جوانسانوں کو...... چلو انسانوں کو نہ سہی بادشاہوں کو ہمیشہ جوان رکھ سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے کبھی بھی اس پر اعتبار نہیں آیا۔"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اباجی آپ کا شک ٹھیک ہو۔ لیکن یہ تو...... ثابت کرنے کی بات ہے۔ آخر یہ بھی کبھی ثابت ہو ہی جائے گا۔" یاور نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "اور اگر یہ ثابت ہو گیا تو پھر جانتے ہیں کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟" خادم حسین کی آواز میں اب خوف تھا۔

"کایا کلپ۔ جیسا یہاں کئی جگہ لکھا ہے۔ مگر مختلف.........." یاور نے کہا اور پھر ہنسا۔ اور اُس کے ساتھ ہی خادم حسین بھی۔ اور پھر اُسے ایک ایسی لذت ملی جیسی ناقابلِ تسخیر دشمن کا پتلا جلانے والوں کو ملتی ہے۔ مگر اُس کا نحیف و نزار جسم اُس انوکھی ہیجان خیزی کا زیادہ متحمل نہ ہو سکا۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور سانس بالکل الٹ کر رہ گیا۔ یاور نے جلدی سے اٹھ کر اسے بستر پر بٹھایا اور دمے کی دوا کے قطرے اُس کے حلق میں ٹپکائے۔ اُس کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اور اس نے لمبے لمبے سانس کھینچے اور کچھ کہنا چاہا تو یاور نے منع کیا اور واپس بستر پر لٹا دیا۔

"سونے کی کوشش کریں اباجی۔ صبح کے چار بج رہے ہیں۔ رات تو ساری بیت گئی۔" اس نے کہا۔

"ہاں بیت گئی۔ اچھی ہی بیت گئی اور ساتھ سب کچھ بیت گیا۔ تم بھی دو گھڑی ہو سکے تو سو جاؤ۔ تم نے شہر... اپنے دفتر بھی جانا ہے۔" خادم حسین نے کہا اور اس کی سانس پھر اکھڑنے لگی تو اس نے کروٹ کے بل لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ یاور حسین دیر تک کھڑا اپنے باپ کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ایک الوداعی سی نظر اُس پر ڈالی اور خاموشی سے باہر برآمدے میں نکل آیا۔ بھورے رنگ کا پارسل اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

Scanned by CamScanner

(11) خادم حسین کی زندگی کی آخری رات کے آخری پہر اُس کا بیٹا یاور ایک خواب دیکھتا ہے

باہر کاتک کی راتوں کی وہ ٹھنڈ تھی جو رات کے آخری پہر میں سونے والوں کو جاڑوں کی آمد کی خبر دیتی ہے اور وہ نیند کی غفلت میں بھی اپنے ٹھنڈے جسموں کے اوپر چادریں کھینچ لیتے ہیں۔ برآمدے میں نوازش کھیس اوڑھے سو رہا تھا اور چھوٹے بھائی اور باپ کے درمیان گزری طلسماتی گھڑیوں سے بیگانہ وہ اپنے ہی چھوٹے موٹے خواب دیکھ رہا تھا۔ یاور کی آنکھیں بھی اب نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن اس نے سوچا کہ چھ بجے تو اس نے بڑے شہر نوکری پر جانے کے لیے تیار ہونا ہے اور پھر سات بجے لاری پکڑنی ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کی ادھوری نیند تو اعصاب کو اور بھی جھنجھوڑ کر رکھ دے گی۔ اِس خیال پر اُس نے سونے کا ارادہ ترک کیا صحن میں آ کر گھڑے سے پانی انڈیلا اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ تازگی کا ایک کوندا اس کے جسم میں دوڑ گیا۔ تولیے سے منہ پونچھنے کے بعد وہ مکان کے تاریک صحن میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ وہ اس رات کی باقی چند گھڑیوں کا کیا کرے۔

آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گوشۂ عافیت میں جا کر چُپ چاپ بیٹھ جائے جہاں وہ اکثر اپنی خاموشی اور تنہائی کے لمحات گذارتا ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو اپنے ذہن کو سناٹے اور اندھیرے کے بہاؤ پر چھوڑ دے۔ تاکہ اِس رات کے سب بوجھ آپ ہی آپ نیچے کہیں گہرائی میں ڈوب جائیں۔ اس نے 'گنجینۂ نشاط' کے پارسل کو کسی انمول خزانے کی طرح اپنے سب سے محفوظ ٹرنک میں رکھ کر تالا لگا دیا اور پھر جسم پر چادر لپیٹ کر بانس کی سیڑھی پر قدم رکھتا مکان کی چھت پر آ گیا۔ دور مشرقی افق میں تاریکی غیر محسوس طریقے سے پھیکی پڑ رہی تھی لیکن باقی سب اطراف میں ابھی گہری سیاہی تھی اور اسی سیاہی میں انعام گڑھ تھا اور اُس کے پیچھے دور دور تک گہرے دھان کے کھیت تھے جن کی خوشبو رات کے آخری پہر قصبے کے اندر تک پہنچ جاتی تھی۔ چھت کی منڈیر کے ساتھ کونے میں مجوی بان کی ایک چارپائی رکھی تھی۔ یہی یاور کا معمول کا گوشۂ سکون تھا مگر اس وقت وہ اسے بڑا غیر مانوس اور انوکھا سا لگ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس رات کا تو ہر پل ہی انوکھا تھا۔ اور اسے حیرت ہوئی کہ ایک ہی رات میں انسان کتنی مختلف

Scanned by CamScanner

قسموں کی اذیتوں، ذلتوں، حیرتوں، دُکھوں، خودفریبیوں، فیصلوں، واہموں اور محبتوں سے گزر سکتا ہے۔ مگر ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے باپ نے مجھے وراثت میں ایک تو یہ اعتراف دیا ہے کہ اُس کی نسل کے لیے زمین پر بس رینگنے کی گنجائش ہے۔ جو کوئی سر اٹھانے کی کوشش کرے گا کچلا جائے گا۔ دوسرا اس نے مجھے بادشاہوں کا شباب برقرار رکھنے کے لیے مجرب نسخوں کی وہ نایاب کتاب دی ہے۔ کیسا انوکھا تر کہ ہے یہ۔''

یاور نے یہ سب سوچا اور چارپائی پر بیٹھ کر کمر منڈیر سے لگا کر گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے مشرقی افق کی طرف دیکھنے لگا جہاں اٹل تھا کہ سورج جنم لے گا۔

یاور کو خوب معلوم تھا کہ شب بیداری کے مشکل ترین لمحات یہی رات کے آخری لمحات ہوتے ہیں۔ ایسے میں جاگتے رہنے کے خواہش مند لوگ اپنے آپ کو طرح طرح کی سوچوں میں لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن یاور کی تو خواہش تھی کہ کسی بھی سوچ کو قریب نہ آنے دے اور ذہن کو بالکل خالی کر دے، اور شاید اسی لیے نیندیں اچانک در آئی تھیں جیسے شیشے کا کوئی خالی برتن آنِ واحد میں گہرے سیاہ پانی سے بھر جائے اور اگلے ہی لمحے پھر بالکل خالی ہو جائے۔ جلد ہی وہ جاگو میٹی کی اس کیفیت میں پھنس گیا جہاں نیند اور بیداری اور خواب اور حقیقت میں فرق مٹنے لگتا ہے۔

''اس طرح تو میں سو جاؤں گا اور پھر صبح دس بجے آنکھ کھلے گی۔'' اُس نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا ''مجھے کچھ سوچتے رہنا چاہیے۔'' اور اُس نے پھر سے گنجینۂ نشاط کے بارے میں سوچنا چاہا مگر اُس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا جو وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا مگر پھر اُس نے مرد کے مخصوص جسمانی تقاضوں اور مرد کی بڑائی کے بارے میں ضرور سوچا۔ قوت کا وہ خزانہ جس پر مرد ناز کرتا ہے اور جس سے نشاط کے قطرے ٹپکانے کے لیے وہ ہر دم بے تاب رہتا ہے، اور اسی لیے وہ بڑا مرد کہلاتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ مرد کی سب سے بڑی بڑائی اُس کی ٹانگوں کے بیچ ہے، اور یہی ثابت کرنے کے لیے وہ عورت کا تعاقب کرتا ہے۔ اُس کا شکار کرتا ہے جیسے کُتا.......... یاور کو صاف یاد آتا ہے۔ سامنے نظر آتا ہے۔ بچپن میں...... یاور...... جب کچرے کے ڈھیروں میں مانگر بچوں کے ساتھ مانگر بُو میں کھیلا کرتا تھا...... بھاگاں وہ جوان عورت جو مانگر بُو میں کھلی پھرتی گوشت کھاتی پھرتی تھی...... مانگر بلی، سیہہ، گوہ، کرلے اور سانپ کا گوشت ضرور کھا لیتے تھے...... اس نے خود دیکھا اور اب بھی دیکھ رہا تھا...... جھیڈو مانگر بلی کا گوشت کھا رہا تھا اور بھاگاں کو بھی کھلا رہا تھا

Scanned by CamScanner

اور افضل کا چھر اور سراج پنگل نے انہیں پکڑ لیا۔ اور بڑی بڑی ہاکیوں سے جھیڈ کو مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اُس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور ساتھ ہی ادھ پکی بلی پڑی تھی۔

بھاگاں بین کرتی انہیں گندی گالیاں دیتی تھی۔ اور پھر اُس کی نظروں کے سامنے بھاگاں کا منہ تو عورت کا رہا اور جسم کسی کتیا کا ہو گیا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کا چھر اور پنگل بھی ادھ ننگ دھڑنگ کتے بن گئے اور بھاگاں پر جھپٹ پڑے ما نگر مرد عورت شور مچا رہے تھے مگر آگے نہ بڑھتے تھے۔ کہ کتوں کے منہ کون لگے.......... بچہ خوف اور تجس سے یہ سب منظر دیکھ رہا تھا کہ اُس کی ماں آ گئی اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے لگی مگر وہ جانا نہیں چاہتا تھا کہ اتنے میں اس کا باپ بھی آ گیا۔ خادم حسین ڈاکیا آ گیا وہ آگے بڑھا اور کتوں کی اُس بھنبھوڑ میں سے کا چھر اور پنگل کو کھینچ نکال لایا۔ بھاگاں چاؤں چاؤں کرتی بھاگ گئی۔

خادم ڈاکیا کہنے لگا ''میں یہاں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں سرکاری ملازم ہوں اور میں تمہیں تمہاری ڈاک ضرور دوں گا۔ یہ لو اپنے اپنے خط لو۔ یہ خط لو۔ اپنی رجسٹری وصول کرو حرامزادو اپنی رجسٹری وصول کرو...... کا چھر نے سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے رجسٹری لے لی تھی۔ بچہ صاف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دستخط کر دیئے تھے اور کہا تھا ''کھادی ڈاکیے یہ تیری موت کے پروانے پر دستخط ہوں گے...... '' پر خادم حسین تو نہ مرا...... بلکہ وہ تو اپنی سائیکل کی گھنٹی بجاتا اپنی تپڑی میں آ گیا اور ماں بچے کو لیے اندر آ گئی...... ''تم نے انہیں بلی کا گوشت کیوں نہیں کھانے دیا'' ماں نے باپ سے پوچھا، ''میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میں یہاں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ میں تمہیں، تمہارے تینوں بلونگڑوں کو انعام گڑھ لے جاؤں گا..........

اور پھر ماں ایک بڑی بھوری بلی بن گئی۔ نرم، ملائم، گرم اور بچہ اس میں چمٹتا جاتا ہے اس کے اندر گھستا جاتا ہے...... اور پھر زور سے چیختا ہے۔ اک دم سے اس بڑی بھوری بلی کی کھال کھنچ کر اتر جاتی ہے مگر وہ پھر بھی اُس کے ساتھ چمٹتا جا رہا ہے۔ بھیگتا جا رہا ہے اور کھال کھنچی بلی کی آنکھیں اب روئے جا رہی ہیں۔ روئے جا رہی ہیں اور بچہ بھیگتا جا رہا ہے۔ بھیگتا جا رہا ہے.......... خادم حسین ڈاک کے تھیلے سے چھرا نکالتا ہے اور چیختا ہے۔ یہ ماسٹر کرم الٰہی کا چھرا ہے۔ اُس نے اس چھرے سے کتا مارا تھا میں بھی ماروں گا...... ماں چیختی ہے اس کے پاؤں پڑتی ہے تینوں بچے چیخیں مار مار کر روتے ہیں...... خادما...... وے خادما...... نہ جا۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا...... تو مارا جائے گا تو وہ

Scanned by CamScanner

دیر تک میرے گوشت کی بوٹی بوٹی کھاتے رہیں گے۔ نہ خادما۔ چھرا خادم حسین کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑتا ہے۔ میں یہ چھرا نہیں لے سکتا یہ چھرا بیرنگ خط میں آیا ہے۔ میں نہیں لے سکتا میں نہیں لے سکتا۔ تو ٹھیک کہتی ہے پروائی بیرنگ خط میں نہیں لوں گا...... ہم انعام گڑھ محلہ پکھیاں میں جا بسیں گے اور بلی کا گوشت ہم پر حرام ہے۔ پُروائی تو ٹھیک کہتی ہے............ پروائی...... پروائی...... پروائی ماں جب ہوا میں چلتی ہے تو بارش آ جاتی ہے۔ تیز ساونی بارش جب برستی ہے تو ما نگر ہو میں بدبوئیں اٹھتی ہیں پھر وہ اور بھی تیز برستی ہے تو بچہ دیکھتا ہے کہ سب بدبوئیں بہہ جاتی ہیں۔ پانی سب کچھ بہالے جاتا ہے...... اور بچہ دیکھتا ہے کہ محلہ پکھیاں کے مکان کے کونے میں ماں پھر سے ایک بڑی سی بھوری بلی بن جاتی ہے اور وہ اس کی نرم گرم ملائم کھال سے چمٹا اس کے اندر گھسا جاتا ہے...... بلی خُرخُر کرتی ہے...... آ...... یارے...... میرے پُتر آ...... آ میرے اندر آ...... میں تجھے پھر سے جنوں گی...... اب کی بار تجھے ایک جنگلی بلا جنوں گی...... جو کتوں کی بھی آنکھیں نکال لے گا'' ...... ماں اسے گدگدی کرتی ہے اور بچہ ہنستا ہے...... ہنستا ہے۔ ہنستا ہے، اور پھر چیخ پڑتا ہے۔

اور جاگ جاتا ہے۔ اسی وقت مشرقی افق میں سورج جنم لے چکا تھا اور روشنی کی تیز شعاعیں یاور کی نیند سے بند آنکھوں پر پڑیں تو اس کا سر جھٹکے سے اوپر کو اٹھ گیا اور پھر وہ پوری دہشت سے بیدار ہو گیا۔ اس کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ دھڑکنیں اس کے پورے جسم کو لرزا رہی تھیں، وہ خواب جیسے اُس کے ریشے ریشے میں کھلی ہر آنکھ نے دیکھا تھا...... سات بج چکے تھے۔ انعام گڑھ میں چاروں طرف روشنی پھیل رہی تھی اور دور دور عالیشان مکانوں اور اونچی حویلیوں اور دھان چھڑنے کے کارخانوں پر پڑ رہی تھی۔

یاور نیچے صحن میں آیا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں سوچا کہ نیند دغا دے گئی اب وہ دفتر نہیں جا سکے گا...... مگر آٹھ بجے کی لاری پکڑ کر وہ دس بجے تک بڑے شہر میں پہنچ سکتا ہے۔ دیر سے آنے کا کوئی بہانہ بنا سکتا ہے۔ یا پھر اباجی کے پرانے ڈاک خانے جا کر بوڑھے پوسٹ ماسٹر یعقوب سے کہہ کر بڑے شہر اپنے دفتر چھٹی کی تار بھجوا سکتا ہے۔ مورس کی، کی کلک، کلیک اُس کے ذہن میں گونجنے لگی مگر چھٹی کی وجہ کیا بھجوائے گا۔ کوئی بھی وجہ بتائی جا سکتی ہے۔ کل تو دفتر جانا ہی ہے۔''

مگر یاور حسین اگلے دن دفتر نہ جا سکا اور اگلے چند روز بھی نہ جا سکا اور چھٹی کی کوئی وجہ سوچنے

Scanned by CamScanner

کی بھی اُسے اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ تار بابو یعقوب کو موت کی تار کی مورس کلک کلیک از بر تھی۔ یاور حسین کے دفتر باپ کی موت کی چھٹی کا تار بھیجنے کے بعد اُس نے اپنے پرانے ڈاکیے کے بیٹے سے جنازے کا وقت پوچھا اور کہا میں آؤں گا۔ مگر وہ نہ آیا۔ خادم حسین کے جنازے میں اُس کے دو بیٹوں یاور اور نواز ش نے شرکت کی تیسرا جیل میں تھا نہ آسکا۔ قریبی مسجد کے چند نمازی ایصالِ ثواب کے لے شریک ہوئے اور ایک اندھا فقیر جو بغیر دیکھے کہ کس کا جنازہ ہے ہر جنازے میں شریک ہو جاتا تھا۔ یاور اور نوازش ایک دن کے لیے پھوڑی پر بھی بیٹھے اور اُسی شام یہ سوال دونوں کی سوچ میں تھا کہ اب وہ کیا کریں، مگر صرف یاور ہی اس سوال کا جواب جانتا تھا۔

اگلے دن صبح یاور حسین انعام گڑھ سے روانہ ہوا تو اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں چند کپڑوں کے نیچے 'گنجینۂ نشاط' کا پارسل موجود تھا۔ اس نے نوازش سے صرف اتنا کہا

''میں جا رہا ہوں''

''کہاں'' نوازش نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پُوچھا مگر نوازش کے اس سوال کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اُسے ایک گہری نظر سے دیکھا اور پھر کبھی واپس نہ آنے کے لیے گھر سے نکل کر لاریوں کے اڈے کی طرف قدم بڑھا دیئے جہاں سے اسے بڑے شہر کے لیے سات بجے کی لاری پکڑنا تھی۔

اور کتنے ہی برس تھے جو اُس دن کے گزرنے کے بعد گزر گئے۔

OOO

باب(3)

گھونسلے میں

''افریقہ میں آدم خور شیر کا لرزہ خیز شکار'' کی کاپی کاتب کے حوالے کرنے کے بعد کبیر عصری ڈائجسٹ کے ریکارڈ روم میں گھس گیا اور جانوروں سے متعلق مختلف رسالوں میں کسی ایسے شیر کی تصویر تلاش کرنے لگا جسے مضمون کے ساتھ مزین کیا جا سکے۔ دیگر حیوانات کے علاوہ کہیں کہیں اسے مختلف حلیوں کے شیر بھی نظر آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی آدم خوری اور لرزہ خیزی کے مطلوبہ معیار پر پورا اُترتا نظر نہ آتا تھا۔ اکثر تصویریں خاصے معصوم صورت اور بے ضرر قسم کے شیروں کی تھیں جو ظاہر ہے کہ کہانی کے حوالے سے بے کار تھیں۔ لیکن کوئی تصویر منتخب کرنا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ اس بارے میں رسالے کے ایڈیٹر نجم الثاقب کی ورکنگ پالیسی بہت واضح تھی۔ ''تصویر لگاؤ میرے بھائی، تصویر لگاؤ یہ تصویر کا زمانہ ہے۔ خالی لفظوں سے قاری نہیں پھڑکتا، تصویر سے پھڑکتا ہے۔'' یوں بھی مختلف حوالوں اور سطحوں پر قاری کو پھڑکانا عصری ڈائجسٹ کا نصب العین تھا۔ سیاست، معاشرتی مسائل، عصری تقاضے، مذہب، ثقافت، شکاریات، اسراریات، جرم و سزا، سکینڈل، ادب، محبت، سائنس، وغیرہ وغیرہ...... کسی بھی تحریر کی کامیابی کا دارومدار قاری کے پھڑکنے پر تھا۔ چنانچہ کبیر رسالوں میں مطلوبہ شیر ڈھونڈتا اور ساتھ دھیمے سروں میں گنگناتا رہا...... ''تصویر لگاؤ میرے بھائی تصویر لگا......او......''

لیکن جب ایک ایک کر کے سبھی شیر پھسڈی نکلے تو وہ اکتا کر اٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ اپنے گھونسلے میں موجود رسائل کے خزانے میں تلاش کر لے گا۔ اسے یاد پڑتا تھا کہ سفاری کے نام سے کوئی رسالہ اس نے دیکھا تھا جو یقیناً مطلوبہ مثبت نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے ریکارڈ روم سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا لیکن پھر عادتاً باہر کو کھلتی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ پانچویں منزل سے

Scanned by CamScanner

نیچے دو بجے دوپہر کی گنجان ٹریفک ہڈسن روڈ پر رینگتی نظر آ رہی تھی۔ اس سڑک کا نام حال ہی میں بدل کر خیابانِ جابر بن حیان رکھ دیا گیا تھا۔ یوں اچانک خیابانِ جابر بن حیان پر واقع ہو جانے کے ناطے عصری ڈائجسٹ نے جابر بن حیان کے کارناموں پر ایک فیچر بھی چھاپا تھا جس سے کچھ قارئین کے پھڑک جانے کی اطلاعات ان کے خطوط کی صورت میں موصول ہو چکی تھیں۔ بلندی سے نیچے سڑک پر سے گزرتی کاروں کو دیکھ کر ہمیشہ ایک ہی واہیات خیال کبیر کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر وہ کھڑکی سے نیچے کسی کار کا نشانہ باندھ کر چھلانگ لگا دے تو آخر زیادہ نقصان کس کا ہو گا اُس کا یا کار کا۔ اب بھی وہ اس خیال کو ذہن میں ٹپک پڑنے سے باز نہ رکھ سکا اور سوچنے لگا ''بلندی سے نیچے دیکھنے والے ہر شخص کے دل میں کود پڑنے کی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے اس لیے میرا دماغ خراب نہیں ہو رہا......''

''صاحب نے بلایا ہے جی'' دفتر کے چپڑاسی نے بے آواز داخل ہو کر اور پھر کبیر کے کانوں کے قریب پہنچ کر اپنی کڑک دار آواز میں کہا کہ بلندی سے پستی کی طرف سفر کی کبیر کی دیرینہ خواہش پوری ہوتے ہوتے رہ گئی اور کچھ عجب نہیں تھا کہ چند گھڑیوں بعد یہ فیصلہ عملاً ہو ہی جاتا کہ زیادہ نقصان کبیر کا ہو گا یا کسی کار کا۔

کبیر نے پلٹ کر غصے سے دیکھا۔ چپڑاسی دانت نکال رہا تھا۔

''وہ جی بلایا ہے صاحب نے ...... پر جی ادھر زیادہ آگے ہو کر نہ کھڑے ہوا کریں کوئی جنگلا منگلا بھی نہیں لگایا کم بختوں نے۔ کبھی کوئی چکر مکر ہی آ جاتا ہے بندے کو۔ وقت کا کیا پتہ ہوتا ہے......'' ''پتہ ہے مجھے۔ جانتا ہوں چکر مکر،'' کبیر نے غصے سے کہا۔ اور پھر تیزی سے ریکارڈ روم سے باہر نکل گیا۔

کبیر جب صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو عصری ڈائجسٹ کا ایڈیٹر اور مالک ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ کبیر کو دیکھ کر اس نے اپنی آواز کو کچھ رعب دار بنانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنے داہنے ہاتھ سے اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جسے کبیر نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا اور 'تصویر لگاؤ میرے بھائی' گنگناتا کمرے میں اِدھر اُدھر گھوم کر دیواروں پر لگی بعض پینٹنگز پر غور کرنے لگا جن پر پہلے بھی وہ اسی قسم کے حالات میں ''غور'' کر چکا تھا اور نتیجہ ہمیشہ ایک ہی نکلا تھا کہ پینٹنگز کے سب سے خوبصورت حصے ان کے فریم ہیں۔ پھر اس نے گھوم کر یوں ہی

Scanned by CamScanner

ایک اچٹتی سی نگاہ نجم الثاقب پر ڈالی اور اس نے ایک بار پھر کبیر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس اشارے کا نتیجہ بھی ویسا ہی برآمد ہوا۔ اب کی بار کبیر گھوم کر کونے میں پڑے اونٹ کی کھال کے بنے ایک ٹیبل لیمپ پر ''غور'' کرنے لگا۔

اس وقت ٹیلی فون پر نجم الثاقب کا مخاطب جو کوئی بھی رہا ہوگا اس نے اس کے لہجے میں اچانک ایک درشتی اور ایک طرح کا کٹیلا پن ضرور محسوس کیا ہوگا مگر وہ اس اچانک تبدیلی کی وجہ نہ جان سکا ہوگا اور اس کی خوش قسمتی کہ گفتگو ختم ہوگئی۔ نجم الثاقب نے ریسیور واپس رکھتے ہوئے کہا:۔

''کبیر صاحب لگتا ہے کہ آپ کو کمرے کی اشیاء سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے۔ بیٹھیں۔ تشریف رکھیں''

''شکریہ'' کبیر نے کہا اور ایڈیٹر کی پرشکوہ میز کے سامنے پڑی اعلیٰ نسل کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا ''جی سر، میں دراصل آپ کے ان فریموں پر غور کر رہا تھا بڑے خوبصورت اور مہنگے فریم ہیں۔''

''ان فریموں کے بیچ بھی تو کچھ ہے کبیر صاحب۔ تصویریں میرا مطلب ہے پینٹنگز......''

نجم الثاقب نے تجسس سے پوچھا۔

''پینٹنگز غیر ضروری ہیں'' کبیر نے ہڈیاں سلگا دینے والی بے نیازی سے کہا اور ایڈیٹر یکدم چڑ گیا۔

''ایک تو مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں کبیر صاحب۔ پینٹنگز غیر ضروری ہیں اور فریم ضروری ہیں۔''

''دفع کریں سر آپ کس الجھن میں پڑ گئے۔ میں کونسا کوئی مصوری کا نقاد ہوں البتہ آپ کا ٹیبل لیمپ کمال ہے۔ اگرچہ کاریگروں سے تھوڑی سی چوک ہوگئی۔'' کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چوک کیسی؟'' نجم الثاقب جو اپنے ٹیبل لیمپ کی تعریف پر قدرے خوش ہونے لگا تھا پھر محتاط اور سنجیدہ ہوگیا۔

''باہر سے تو بہت خوبصورت ہے لیکن اندر سے دیکھیں تو کھال کے نیچے اونٹ کا خشک خون چمٹا نظر آتا ہے اور کچھ بوٹیاں بھی''

Scanned by CamScanner

''بوٹیاں!؟ لاحول ولاقوۃ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے''ایڈیٹر نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''بوٹیاں نہیں کچھ ریشے سے ہیں جو یقیناً اسی متوفی اونٹ کے ہوں گے جس نے اس شاہکار کی خاطر اپنی جان گنوائی یا ہو سکتا ہے وہ پہلے ہی جان گنوا چکا ہو۔ ثقافتی دست کاریوں کی دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے سر۔ لیکن چھوڑیں ہم کس چکر میں پڑ گئے آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟ حکم؟'' کبیر نے خالص کاروباری انداز میں پوچھا۔

نجم الثاقب نے تقریباً جبلی سطح پر محسوس کر لیا تھا کہ اب اس موضوع کو ترک ہی کر دینا چاہیے۔ اس نے بے چارگی اور نفرت کی وہ نگاہ اس پر ڈالی جو کوئی آجر اپنے فن میں یکتا لیکن بعض دوسرے حوالوں سے اس کے لیے نہایت ناپسندیدہ کسی اجیر پر ڈالتا ہے۔ اس کی خدمات اس کے لیے جتنی ناگزیر ہوتی ہیں اس کا بقیہ وجود اتنا ہی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ ''اس خبیث کا کوئی نعم البدل مل جائے تو فوراً چلتا کروں۔ عجیب شیطان صفت دماغ ہے اس کا۔ عام سی معمولی باتوں میں سے ایسے منحوس نکتے نکالتا ہے کہ ہڈیاں تک سلگ جاتی ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے عصری ایک طرح سے اسی کے سر پر چل رہا ہے...... اچھا خیر لعنت بھیجو......'' نجم الثاقب نے سوچا لیکن بآوازِ بلند اس نے اپنے مخصوص تبسم کو ہونٹوں پر نمودار کرتے ہوئے کہا'' کبیر صاحب ایک کام ہے اور بہت ضروری بلکہ حساس بھی......''

''جی میں حاضر ہوں۔ فرمائیے کیا کام ہے'' کبیر نے کہا۔ جواباً نجم الثاقب اپنے میز کے دراز کو کھول کر اس میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ نجم الثاقب ادھیڑ عمر کا ناٹے قد کا مائل بہ فربہی مرد تھا۔ مکمل چوکور اور مکمل دائرے کے درمیانی کسی مقام پر اُس کے چہرے کے بیرونی خطوط ٹھہرتے تھے اور جو مختلف قسم کی جذباتی کیفیات کے زیرِ اثر کبھی مکمل چوکور اور کبھی مکمل دائرہ ہو جاتے تھے۔ اُس کی اس کیفیت کو کبیر نے ''عصری ڈائجسٹ کے ایڈیٹر مالک کے چہرے کی ہندسی بوقلمونیاں'' کا نام دے رکھا تھا اور ایک دفعہ اُس نے سٹاف کو اِس موضوع پر ایک ہلکا پھلکا لیکچر بھی دیا تھا جس کا تھیسس یہ تھا کہ چوکور سے دائرے اور دائرے سے چوکور کو مراجعت دراصل ایڈیٹر سے مالک اور مالک سے ایڈیٹر کے درمیان پنڈولیم کی طرح جھولنے کا شاخسانہ ہے۔ اس کے علاوہ نجم الثاقب کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں بھی تھیں جن کے بارے میں عمومی رائے یہ تھی کہ مخاطب کو کسی نہ کسی

سطح پر متاثر ضرور کرتی ہیں بلکہ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس کی آنکھیں برمے جیسی ہیں اور مخاطب کی کھوپڑی میں سوراخ کر کے اس کے خفیہ محرکات تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس بارے میں بھی کبیر کی تشریح دوسری تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ نجم الثاقب کی نظریں دراصل ہر وقت باہر کو نہیں اندر کو گھورتی رہتی ہیں اور السر کے درد کی کسی امکانی لہر سے ہر وقت الرٹ رہتی ہیں۔ یہ اپنے عارضے سے مسلسل چوکس رہنے کی اس کی متوحش دروں بینی ہے جسے دیکھنے والے کبھی برما اور کبھی دوربین اور کبھی خوردبین وغیرہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ کبیر مہدی کو سخت ناپسند کرنے کے نجم الثاقب کے پاس کئی جواز تھے۔

ایڈیٹر نے دراز میں سے کچھ بہت معتبر قسم کے بین الاقوامی غیر ملکی رسالے نکالے جن میں بعض مخصوص جگہوں پر چٹوں سے نشانات لگے ہوئے تھے۔ رسالے کبیر کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا:

''یہ دیکھ لیں۔ اس میٹیریل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ٹھوس مضمون تیار کرنا ہے۔ بہت حساس عالمی موضوع ہے اور اس پر ہمارا موقف بہت ہی مدلل ہونا چاہیے۔ بہت اوپر تک لوگ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں......'' اس نے نروس سے انداز میں گلا صاف کرتے ہوئے بات ختم کی۔ کبیر نے کچھ دیر ان رسائل کو الٹ پلٹ کر دیکھا، نشان زدہ حصوں کا جائزہ لیا اور کہا ''ہو جائے گا...... کب تک چاہیے......''

''اگلے شمارے میں چھپنا ہے بھائی اور جہاں کہیں تصویروں کی گنجائش ہو وہ بھی نکالنی ہے'' نجم الثاقب نے کہا۔

''لیکن اگلے شمارے کے لیے تو میں 'ادرک کی حیرت انگیز طبی خصوصیات' پر لکھ رہا ہوں جنھیں سنسناٹی یونیورسٹی کے حیاتیاتی کیمیادانوں نے دریافت کیا اور جس سے بنی نوع انسان کو بڑا فائدہ پہنچنے والا ہے......''

''او خدایا...... اس پر لعنت بھیجیں۔ بعد میں ہو جائے گا'' نجم الثاقب نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

''......تو آپ کا خیال ہے کہ یہ موضوع ادرک سے زیادہ اہم ہے'' کبیر مسکرایا۔

''پلیز مسٹر کبیر...... مذاق پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں...... یہ کام جلد ہونا چاہیے۔''

Scanned by CamScanner

''سر قصہ یہ ہے کہ یہ جو حساس موضوع ہے اور اس پر جن گورے عالموں کا تڑکا لگا کر جس نقطۂ نظر سے لکھنا ہے میں ذاتی طور پر اس سے قطعاً متفق نہیں ہوں۔ لیکن کام بہر حال عین آپ کے حسبِ منشا ہو جائے گا۔ کوالٹی کنٹرولڈ۔ مکمل...... آپ کے مخصوص موقف اور عصری کی لائن کے عین مطابق مال تیار ہو گا۔ پہلے آپ کو کبھی شکایت کا موقع ملا ہو تو بتائیں......'' نجم الثاقب کے حلق میں کچھ لایعنی سی خرخراہٹیں برآمد ہوئیں۔

آ...... آخ۔ خر۔ کھوں...... ہاں...... ہاں۔ ہاں...... ظاہر ہے آپکی تحریروں کا معیار ہی تو ہے...... عصری ڈائجسٹ معیار کی قدر کرتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آپ Involve ہوئے بغیر لکھتے ہیں...... لکھ سکتے ہیں یہ ایسے ہی آپ اُڑاتے ہیں......'' نجم الثاقب نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

کبیر نے قہقہہ لگایا۔ ''میں ایک کرائے کا ادیب ہوں سر بلکہ ادیب شاید زیادہ باعزت لفظ ہے۔ میں ایک کرائے کا لکھنے والا ہوں جیسے کرائے کے قاتل ہوتے ہیں ناں جی۔ I am a mercenery writer sir...... دنیا کے کسی بھی موضوع پر پائے جانے والے کسی بھی قسم کے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے پورے مدلل طریقے اور مکمل روانیٔ طبع سے لکھ سکتا ہوں۔ کوئی بھی آجائے معاملہ طے کرے اور کچھ بھی لکھوالے......''

نجم الثاقب نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے اور پھر ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر کہنے لگا'' گویا آپ کو قلم کی حرمت کا کوئی احساس نہیں کبیر صاحب......''

ایک طنزیہ مسکراہٹ کبیر کے ہونٹوں پر پھیلی تھی ''قلم کی حرمت اگر میں نے ابھی قلم اٹھایا ہی کب ہے کہ مجھے قلم کی حرمت کا احساس ہو......''

''اور یہ جو آپ ابنِ بشر کے نام سے......''

''جھک مارتا رہتا ہوں......'' کبیر نے ایڈیٹر کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سر، روٹی کے لیے...... وہ جو کہتے ہیں ''روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر......''

تو گویا ابھی آپ کو کوئی شاہکار تحریر کرنا ہے'' نجم الثاقب پر ایک انتقامی چڑچڑاہٹ کا دورہ پڑ گیا تھا۔

کبیر کی جارحانہ شگفتگی ماند پڑنے لگی اور اسے تأسف ہوا کہ آخر اُس نے بات اپنی دکھتی رگ

Scanned by CamScanner

کی طرف بڑھنے ہی کیوں دی۔ اس نے ارادہ کیا کہ اٹھ جائے لیکن نجم الثاقب کی شاید ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی ''آپ یقیناً کوئی عظیم ادب تخلیق کریں گے...... ارے ہاں، یاد آیا کاتب نے ایک دن ذکر کیا تھا شاید کہ آپ اس سے اپنا کوئی ناول واول کتابت کروانا چاہتے ہیں۔ ویسے یہ ناول آپ کے قلمی نام سے ہوگا یا اصلی نام سے'' نجم الثاقب گفتگو پر مکمل غلبہ حاصل کر چکا تھا۔

''قلمی نام تو دھوکے کی ٹٹی ہے جناب۔ میری اصل تحریریں تو اسی نام سے ہوں گی جو میرے باپ نے مجھے دیا'' کبیر نے سنجیدگی سے کہا لیکن اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کو خود بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کبیر نے سکھ کا سانس لیا۔ نجم الثاقب نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو۔ عصری ڈائجسٹ۔ ہوں جی......'' اس کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا تاثر ابھرا جسے کبیر نے فوراً نوٹ کیا ''ہاں ہیں بیٹھے ہیں...... آپ کا فون ہے کبیر صاحب'' ایڈیٹر نے ریسیور کبیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف ڈاکٹر ناصر تھا۔ کبیر نے سخت لہجے میں کہا ''ایسی بھی کیا افتاد آن پڑی تھی کہ یہاں فون کر دیا۔ تمہیں بتایا بھی تھا کہ ہمارے ایڈیٹر صاحب پسند نہیں کرتے۔ یہاں کوئی غیر متعلق لوگ فون کریں......'' نجم الثاقب نے کھسیانے سے انداز میں ''ارے نہیں کبیر صاحب کیا بات کرتے ہیں'' قسم کی بات کی اور صدقِ دل سے دعا مانگی کہ یہ شخص جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جائے۔ ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران اب کبیر ویسے ہی ہونق خالی خالی انداز میں ایڈیٹر کو گھورنے لگا تھا جس انداز سے خود اسے شدید چڑ تھی اور نجم الثاقب بے چینی سے اپنی گھومنے والی کرسی میں پہلو بدل رہا تھا۔

''اچھا بکواس نہ کرو۔ کیا سامنے ہی بیٹھا ہے۔ اسے ذلیل کرنے کا ارادہ ہے کیا'' ڈاکٹر ناصر پوچھ رہا تھا۔

''ہاں کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔ بہر حال فون کیوں کیا''

''دو یار جلد ملو۔ کل رات ایک عجیب واقعہ ہوا''

''عجیب واقعہ کل رات۔ یعنی کل رات K.G.B. سے لے کر برطانوی سونا ملنے تک کے واقعات کے بعد بھی کوئی اور عجیب واقعہ ہوا۔''

K.G.B. کے الفاظ سن کر نجم الثاقب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کے۔جی۔بی۔ ان لوگوں کی ذاتی اصطلاحات میں کیا معنی رکھتی ہے۔ اور پھر برطانوی سونا۔ اب وہ انتہائی چوکنے اور شدید مشکوک انداز میں کبیر کو گھور رہا تھا اور ساتھ ہی اسے اپنے ایک بہی خواہ صحافی دوست کی کبیر کے بارے میں نصیحت یاد آ گئی تھی۔ ''یہ شخص کبھی تمہیں مروائے گا۔'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایڈیٹر کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھ کر کبیر دل ہی دل میں بے حد مسرور ہو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کن الفاظ نے نجم الثاقب کے جسم و جان میں آندھیاں سی دوڑا دی ہوں گی۔

''ہاں سنو تو...... ٹیلی فون پر بات نہیں ہو سکتی۔ لمبی بات ہے......'' ڈاکٹر نے کہا

''او ہو تو کوئی خفیہ بات ہے'' کبیر کے لہجے میں بھی 'خفیہ پن' نمایاں تھا اور نظریں بدستور ایڈیٹر پر جمی تھیں۔

''ارے نہیں یار...... وہ ایک کیس آیا تھا میرے پاس تم لوگوں کے جانے کے بعد۔ نام بھی اس کا عجیب سا تھا۔ یاور عطائی''

''واہ تو کوئی عطائی پاگل ہو گیا۔ بہت خوب ان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے'' کبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''عطائی نہیں بھئی یاور عطائی نام تھا اس کا......''

''یاور عطائی...... عجیب نام ہے۔ اچھا کیا ہوا یاور......''

کبیر نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کبیر جو مسلسل ایڈیٹر کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے حیرت سے محسوس کیا کہ یاور عطائی کا نام سن کر اس کے چوکنے اور مشکوک انداز میں کوئی اور ہی انوکھی تبدیلی نمودار ہوئی تھی۔ کوئی الجھن، پریشانی، تحیر، جیسے وہ اُس نام کو پہلے سے جانتا ہو۔ اور یقیناً زیرِ لب بڑبڑایا بھی تھا یاور عطائی۔

''اچھا تو کیا ہوا اس یاور عطائی کو......'' کبیر نے اس کا نام جان بوجھ کر دہرایا۔ اور نجم الثاقب کے چہرے کے تاثرات اب زیادہ غور سے دیکھے۔ وہی نامعلوم تبدیلی اب اور بھی نمایاں تھی۔

''صرف وہی نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی...... لمبا قصہ ہے یار۔ تم ملو تو پھر بات ہوگی''

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر ناصر بات ختم کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر۔ تم ایسا کرو۔ ابھی آدھے گھنٹے بعد گھونسلے میں آ جاؤ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔O.K.''

کبیر نے ریسیور واپس سیٹ پر رکھا اور نجم الثاقب کو بناوٹی شکر گزار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''شکریہ جناب۔ بہت وقت ضائع کیا آپ کا...... یہ رسالے میں لے جا رہا ہوں۔ ڈیڑھ ہفتے تک مضمون تیار ہو جائے گا۔ اجازت......''

وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو نجم الثاقب ویسے ہی بے حس و حرکت سا بیٹھا رہا۔ کبیر نے سوچا کہ وہ کم از کم اس کی کے جی بی کی احمقانہ غلط فہمی دور کر دے۔ خواہ مخواہ اس کی جان شکنجے میں پھنسی رہے گی گھبرا کر کہیں فون ہی نہ کر دے کہ روسی ایجنٹ کھلے عام پھر رہا ہے۔ کہنے لگا'' اور ہاں نجم صاحب...... وہ کے جی بی ہمارا ایک ذاتی مخفف ہے۔ ایک جگہ ہے جہاں ہم لوگ بیٹھتے ہیں ایک کیفے جیسا ہے۔ کیفے غلام باغ کے۔ جی۔ بی۔ آپ کہیں گے کیفے تو 'سی' سے ہوتا ہے لیکن جناب ہمارے لیے 'کے' سے ہوتا ہے بس یہ بات ہے آپ گھبرائیں نہیں میں روسی جاسوس ادارے کا خفیہ ایجنٹ نہیں ہوں......'' کبیر نے ہنستے ہوئے کہا جواباً ایڈیٹر بھی مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ اب بھی بے جان ہی رہی۔

''ہاں...... میں نے بھی سوچا کہ یہ کیا الفاظ آپ کہہ رہے ہیں۔ خوب ہے بھئی کیفے غلام باغ کے جی بی لیکن وہ فون پر آپ...... وہ فون پر اچھا ٹھیک ہے۔ کوشش کریں کہ مضمون وقت پر مل جائے......''

صاف ظاہر تھا کہ وہ کبیر سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھ نہیں پا رہا تھا۔ ''بالکل سر'' کبیر نے کہا اور ایڈیٹر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ ''یاور عطائی'' ۔ اس عجیب مضحکہ خیز سے نام کو سن کر نجم الثاقب گڑ بڑا کیوں گیا تھا اور ڈاکٹر ناصر مجھے کیا بتانا چاہتا ہے۔ پانچ منزلہ عمارت کی سیڑھیاں اترتے وقت کبیر یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ انعام گڑھ سے بڑے شہر آنے والے یاور حسین اور آج کے یاور عطائی کے بارے میں کچھ بھی جاننے سے پہلے ہی وہ نامعلوم شخص کبیر کے لیے ایک بے نام خلش بن گیا۔ شاہراہِ جابر بن حیان

Scanned by CamScanner

کے فٹ پاتھ پر پہنچ کر وہ رکا اور ارد گرد ٹریفک کے چل چلاؤ پر نگاہیں ڈالیں۔ پوری دنیا دھوپ اور دھوئیں سے بھری تھی۔ یہ پٹرول اور ڈیزل کا دھواں اس پٹرول اور ڈیزل کا ہے جو کروڑوں سال پہلے زمین میں دب جانے والے جانوروں کے جسم کے سیال حالت میں تبدیل ہونے کی وجہ سے بنا تھا۔ ٹیکسٹ بک آف آرگینک کیمسٹری۔ تیرا گھونسلے میں جلد پہنچنا ضروری ہے۔ اے پرندے۔ وہاں ایک ڈاکٹر...... نہیں بلکہ ماہر امراضِ دماغی...... نہیں بلکہ بے وقوف آدمی...... ہاں جلدی تنگ آ جائے گا اس ہاؤس جاب سے اور میڈیسن کا رخ کرے گا...... تو ڈاکٹر ناصر وہاں بیٹھا ہے پرندے اور کسی عطائی نامی شخص کی پراسرار کہانی سُنانا چاہتا ہے۔ کبیر فٹ پاتھ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ سندر شام روڈ پیدل پہنچنے کے لیے کونسا رستہ اختیار کرے۔ لمبا لیکن پر سکون رستہ یا پر ہجوم لیکن مختصر رستہ۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پر ہجوم مگر مختصر رستے سے جائے گا۔

کبیر کے جانے کے بعد نجم الثاقب کچھ دیر تک اپنی گھومنے والی کرسی کو گھمائے بغیر ٹھٹھرا سا بیٹھا رہا اور اس کا چہرہ کچھ گول سا ہو گیا تھا مگر وقفوں وقفوں سے اٹھنے والی کسی بے چینی کی لہر اسے پھر سے چوکور کر دیتی تھی۔ کبیر مہدی کے ساتھ گزارے آدھ پون گھنٹے کے اثرات کے کانٹے چن چن کر نکالنا کوئی خوشگوار عمل نہ تھا۔ پینٹنگز کے فریموں۔ اونٹ کے خشک خون۔ کے۔ جی۔ بی نے زندگی پہلے ہی کافی اذیت ناک کر دی تھی اور پھر جاتے جاتے یاور عطائی۔ مگر اُسے کیا علم ہو گا یاور عطائی کا۔ یہ معاملہ کیا ہے آخر۔ نجم الثاقب نے کوفی منگوائی اور تین چار جلتے جلتے گھونٹ پینے کے بعد کچھ فیصلہ کرنے کے قابل ہوا تو اس نے ٹیلی فون پر کچھ نمبر ڈائیل کیے اور پھر بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ ''ہیلو جی یاور عطائی صاحب سے بات کرائیں۔ نجم الثاقب۔ نہیں ہیں! کہاں ہیں۔ کیا۔ ہسپتال میں۔ کونسے ہسپتال میں کیا ہوا انہیں؟۔ آپ کون صاحب ہیں؟۔ ملازم، او دیکھو میاں کسی سے بات کراؤ جسے علم ہو عطائی صاحب کا...... ان کی صاحبزادی سے بات کراؤ...... وہ بھی نہیں ہیں۔ کیا ہاسپٹل میں ہیں نہیں معلوم...... اچھا'' اس نے برا سا منہ بنا کر انگلی سے ڈسکنیکٹ کیا اور پھر کہیں اور ڈائیل کرنے لگا '' ہیلو تصدق صاحب...... ثاقب جناب کیسے مزاج...... جناب وہ علم ہے آپ کو عطائی...... ہاں جی...... نہیں مجھے تو علم نہیں...... کیا...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... پیر حیات اور چوہدری مختار بھی مگر کیسے...... پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا لیکن ہاں ٹیلی فون پر مناسب نہیں...... جی ملاقات ہو گی...... جناب ضروری ہے جلد ہی...... خدا حافظ......''

Scanned by CamScanner

ریسیور سیٹ پر رکھنے کے بعد نجم الثاقب نے گہرا سانس لیا۔ اور تیزی سے باقی ماندہ کوفی اٹھا کر حلق میں انڈیل لی۔ اُس نے پوری شدت سے دانت بھینچے تو جبڑے کی ہڈیاں اُبھر آنے سے چہرہ ایک بار پھر چوکور ہو گیا۔ پھر وہ گھومنے والی کرسی میں اس طرح آگے پیچھے جھولنے لگا جیسے سپرنگوں کی مضبوطی آزمانا چاہتا ہو۔ ٹیلی فون پر ملنے والی معلومات نے اس کے اندر یک دم کچھ کر گزرنے کا اضطراری ہیجان بھڑکا دیا تھا۔ جھولتے جھولتے اس کی نگاہ کونے میں پڑے اونٹ کی کھال کے لیمپ پر پڑی تو وہ اس تیزی سے جھولنے والی کرسی سے نکل کر اس کی طرف گیا جیسے غلیل سے غلیلہ داغا جاتا ہے۔ اس نے لیمپ کا بلب آن کیا اور کھال کے بنے شیڈ کے اندرونی حصے کو غور سے دیکھنے لگا پھر ہاتھ سے اس کی اندرونی سطح کو چھو کر دیکھا ''حرامزادہ بکواس کرتا تھا نہ کسی اونٹ کا خون خشک ہوا ہے نہ کوئی بوٹیاں چمٹی ہیں، کہتا ہے ریشے ہیں.....'' عصری ڈائجسٹ کے مالک ایڈیٹر کے منہ سے نکلتی گالیوں کی بُڑبڑاہٹ کچھ ایسی آواز تھی جیسے سخت خطرے میں کچھ چور کسی بات پر سرگوشیوں میں لڑ پڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

O

اور وہ پچھلے ایک گھنٹے سے گفتگو کر رہے تھے کبیر اور ڈاکٹر ناصر گھونسلے میں۔

''تو یوں کہو نا کہ ایک عطائی نے دوسرے عطائی سے بسلسلۂ علاج رجوع کیا۔ عطائی ہونے کے باوجود بھی چونکہ بقائمی ہوش وحواس وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتا تھا اس لیے اُس نے پہلے پاگل ہونا مناسب سمجھا'' کبیر نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر ناصر سے کہا۔

''بس بکواس کیے جاتے ہو۔'' ناصر نے عادتاً کہا اور گھونسلے میں بمشکل رکھی اپنی کرسی کو تھوڑا پیچھے کھسکانے کی کوشش کی تو فرش سے عرش تک چنی کتابوں کی دیوار لرز کر رہ گئی۔ کبیر نے احتجاجاً ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ''زیادہ پھیلنے کی کوشش نہ کرو ڈاکٹر ورنہ علم کے اس ملبے تلے دب جاؤ گے۔''

''عجیب بدبوئیں سی آتی ہیں تمہارے اس گھونسلے میں'' ناصر نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔

''عجیب بدبوئیں ہی نہیں آتیں بلکہ آوازیں بھی آتی ہیں اور کبھی کبھی تو عجیب عجیب خلیوں کے گورے بھی ان کتابوں سے نکل نکل کر مجھ پر جھپٹتے ہیں لیکن لعنت بھیجو گوروں پر اور بدبوؤں پر ویسے بھی ہم پرندے لوگ بدبوؤں کے عادی ہوتے ہیں۔''

Scanned by CamScanner

''ہاں خاص طور پر اگر وہ گدھ کی نسل کے ہوں۔''

کبیر نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا ''اچھا فقرہ ہے ویسے ڈاکٹر مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ کل کی رات یقیناً تم پر بھاری تھی یعنی پہلے تم نے مددعلی کے منہ سے قدیم برطانوی پاؤنڈ برآمد کیا پھر تم نے اپنے اس عطائی بھائی کے منہ سے کیا برآمد کیا۔ وہ کیا کہتے تھے لیبارٹری والے۔''

"Unidentified organic matter of vegitative origin" ناصر نے ایک ایک لفظ الگ الگ بولتے ہوئے کہا۔

''یعنی کوئی نامعلوم نباتاتی مادہ...... جو ظاہر ہے کوئی جڑی بوٹیاں قسم کی چیز ہوگی...... ویسے یہاں آیورویدک طریقہ علاج اور جڑی بوٹیوں پر بہت اعلیٰ پائے کی کتابیں رکھی ہیں۔ اُدھر تاریخ کی کتابوں کے ساتھ۔ کہو تو پیش کروں؟''

''لعنت بھیجو۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کبیر کہ تم کسی مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ دینے کے قابل نہیں رہے۔ تم بالکل ناکارہ ہو چکے ہو۔ تمہارا ذہن ہر وقت اُڑتا رہتا ہے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر اور ایسے لوگ زندگی میں کچھ بھی نہیں کر پاتے اور آخر کار ایک دن اُن کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے'' ناصر نے کہا۔

''کیا دن ہوگا وہ بھی۔ تمہاری تشخیص اور پیشین گوئی دونوں صحیح ہیں شکریہ۔ لیکن ڈاکٹر میں یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ ایک شخص کوئی اوٹ پٹانگ چیز کھا کر اپنا دماغ چوپٹ کر کے تمہارے پاس آیا۔ تم نے اس کا معدہ دھو دیا اور اس کا علاج کر رہے ہو پھر اس سے ملتے جلتے کچھ اور مریض لوگ دوسرے ہسپتالوں میں بھی اسی رات وارد ہوئے وہ بھی معدہ دھلائی کے عمل سے گزرے اور یقیناً ان کا بھی علاج ہو رہا ہوگا اللہ شفا دے گا مسئلہ کیا ہے......؟''

''لیکن ایک ہی رات تقریباً ایک ہی وقت بالکل ایک جیسے کیس۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟'' ناصر نے سوال کیا۔

''تو کیا تم سمجھتے ہو یہ کوئی پراسرار وبا تھی۔ Some psychic epidemic نہیں تم ایسی فضول بات نہیں سوچ سکتے تو کیا تم سوچتے ہو کہ وہ سب لوگ کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور کوئی مخصوص مادہ باجماعت کھا کر اس حال کو پہنچے۔ دیکھو اگر انہوں نے کوئی نشیلی چیز نوشِ جان کی ہوتی تو پھر تو یہ قابلِ دخل اندازیٔ پولیس واقعہ ہوتا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے

Scanned by CamScanner

حسبِ معمول حرکت میں آ چکے ہوتے کچھ مکا ہو چکا ہوتا اور تم اس وقت میرا بھیجا چاٹنے کی بجائے کسی تھانے میں بیان ریکارڈ کرا رہے ہوتے۔ اس لیے میں تمہارا یہ خفیہ گینگ کا نظریہ نہیں مان سکتا۔''

''میں کوئی گینگ وینگ کا نظریہ نہیں دے رہا نظریے بنانا تمہارا مشغلہ ہے۔'' ناصر نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری دلچسپی کی باتیں دو ہیں ایک تو یہ کہ اگر یہ کسی اناڑی حکیم ہو کیم کا چکر ہے تو اس کی تفتیش ہونی چاہیے ہو سکتا ہے کل کسی اور کو بھی کوئی نقصان پہنچ جائے اور دوسرا میں اس شے جو بھی بلا وہ تھی اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جس نے ان لوگوں میں ایک psychosis جیسی کیفیت پیدا کر دی۔ یہ بہر حال میری ایک ذاتی تھیوریٹیکل دلچسپی کی بات ہے۔ پہلی بات زیادہ اہم ہے''

''جبکہ زیادہ اہم تیسری بات ہے'' کبیر نے کہا اور ایک شرارت انگیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلنے لگی ''اور وہ اہم بات تمہارے اس مریض کی دختر زہرہ جمال ہے جس کا نام بھی غالباً تم نے زہرہ ہی بتایا ہے۔ آہ...... زہرہ...... وینس...... افرودایتی۔ ڈاکٹر تمہارے ان اصلاحِ معاشرہ اور سائنسی تحقیق کے اعلیٰ جذبوں کے پیچھے کوئی عام فہم قسم کا روگ تو نہیں......؟''

''بکومت'' ناصر نے کہا اور اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گزر گیا۔ ''تمہارے ساتھ تو کوئی بات کرنا بے سود ہے۔ تم ایک......''

''جبکہ میری دلچسپی کی بات چوتھی ہے۔'' کبیر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''اور وہ یہ کہ میرے پیارے ایڈیٹر نجم الثاقب صاحب ''یاور عطائی'' ...... یہ احمقانہ سا نام سن کر اس بری طرح کیوں چونکے کہ کے۔ جی۔ بی کو بھی فراموش کر گئے۔''

''کیا مطلب؟'' ناصر نے پوچھا۔

کبیر نے دو گھنٹے پہلے نجم الثاقب کی موجودگی میں ہونے والی ٹیلی فونی گفتگو کا قصہ سنایا۔ ناصر نے کندھے اچکائے۔ ''اس میں کیا رکھا ہے۔ کوئی شخص کسی کو بھی جان سکتا ہے تمہارا ایڈیٹر اس عطائی کو جانتا ہو گا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ہاں فرق تو جبھی پڑتا اگر میرے عزیز از جان ایڈیٹر بھی اختلالِ دماغی اور ژولیدگی شعور کا شکار ہو کر بلبلا رہے ہوتے'' زمین گر رہی ہے' ویسے یار تمہارے اس عطائی مریض نے عالمِ جنوں

Scanned by CamScanner

میں بھی کیا بات کہہ دی 'زمین گر رہی ہے' واہ...... مجھے تھوڑی دیر اس فقرے پر سر دھن لینے دو 'زمین گر رہی ہے' ہاں ویسے تمہیں یہ ہذیانی فقرہ کیا بتاتا ہے ڈاکٹر؟'' ڈاکٹر ناصر فوراً ہی موڈ میں آ گیا'' آ...... یہ...... تھوڑا سا ٹیکنیکل تجزیہ ہو گا۔ تمہاری سمجھ میں ذرا مشکل سے آئے گا......''

''مجھے Under estimate مت کیا کرو ڈاکٹر تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے بکواب،'' کبیر نے کہا۔

''یہ فقرہ اور جس حالت میں میں نے اسے اس رات دیکھا تھا اور جو دوسرے کیسز کی رپورٹ ہے۔ اس کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ وہ جو کوئی Stuff انہوں نے استعمال کیا اس میں کوئی Hallucinogene ضرور موجود تھا جو کوئی Psychedelic stuff بھی ہو سکتا ہے۔ جس نے ان کی spatial Perception کو متاثر کیا۔ نیچے پاؤں رکھتے وقت وہ ایسے Behave کر رہا تھا جیسے سامنے اسے کوئی گہرائی نظر آ رہی ہو جس میں جا گرنے کا خوف ہو۔'' ناصر نے پیشہ ورانہ اعتماد سے بھرپور انداز میں کہا جیسے کسی کلاس میں لیکچر دے رہا ہو۔

''تمہارا مطلب ہے کہ اس کی 'مکانی ادراک' کی حس تلپٹ ہو گئی بالفاظِ دیگر اس کا دایاں بایاں اوپر نیچے ہو کر برباد ہو گیا جیسے بھنگ اور چرس سے ہوتا ہے اور بھنگ چرس سے مجھے ہاف مین یاد آ رہا ہے۔ پتہ نہیں وہ مدد علی پر ڈورے ڈالنے میں کامیاب ہوا یا نہیں''

''پتہ نہیں'' ناصر نے عدم دلچسپی سے کہا'' ویسے تم ٹھیک کہہ رہے ہو بھنگ اور چرس بھی Psychedelic ہیں لیکن یہ بھنگ ونگ کا چکر نہیں اس کے پیچھے کوئی اور چکر ہے۔ جس کا شاید ہمیں کبھی پتہ نہ چل سکے۔'' ناصر نے افسردہ سے لہجے میں کہا اور اس کا تھیوریٹیکل چہرہ لٹک سا گیا۔

''دیکھو ڈاکٹر اس گھونسلے میں رنج والم اور حزن و یاس کا حق صرف مجھے حاصل ہے۔ اس لیے اپنی یہ دل گرفتہ تھوتھنی بشاش کرو۔ خاطر جمع رکھو میں یہ ضرور دیکھوں گا کہ نجم الثاقب اور تمہارے یاور عطائی کے مابین بین الموضوعی سطح پر کس طرح کی سلسلہ جنبانی ہے۔''

''یہ سڑے ہوئے متروک لفظ بول کر کوئی خاص لذت ملتی ہے تمہیں؟ اور پھر یہ اس بے چارے غریب معصوم ایڈیٹر کو کیوں بیچ میں لے آتے ہو؟......'' ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کتنا غریب اور کتنا معصوم ہے مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا لیکن فی الحال تم عطائیت کا خاتمہ کرانے اور مقامی زہریلی نباتات کی کیمسٹری ڈھونڈنے کے واہمے سے نکل آؤ لیکن افسوس

Scanned by CamScanner

ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہ تھا اگرچہ جدید تحقیق نے کہیں اب آ کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہم کا علاج اس کے بیٹے قھمان نے ڈھونڈ نکالا تھا لیکن والد بزرگوار نے جب اپنی وجہ شہرت جاتی دیکھی تو سخت جزبز ہوئے اور بیٹے کو طبابت سے تائب کرا کے شاہ ہیروڈوٹس کے گھوڑے چرانے پر مامور کرا دیا۔ دراصل جنریشن گیپ اس وقت بھی موجود تھا ہاں اینگری ینگ مین کی ذرا کمی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج طب کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔'' ناصر قہقہے لگانے لگا ''تمہاری یاوہ گوئی کچھ حد سے نہیں بڑھتی جا رہی کبیر مجھے خطرہ ہے کہ......''

''پرانی بات ڈاکٹر'' کبیر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ''یہ بولو چائے کونسی پیو گے کڑک یا ملائیوں والی...... کچھ کھانا ہے تو کھا بھی لو۔ پھر پتہ نہیں کب ملاقات ہو......''

''کیا مطلب؟'' ناصر نے حیرانی سے پوچھا۔

''کل گھر جا رہا ہوں۔ خط آیا تھا۔ ماں نے لکھوایا ہے کہ میرے بڑے بھائی کی بیوی کی چھوٹی بہن نے میرے بارے میں کوئی بہت برا خواب دیکھا ہے۔ اس لیے جلد از جلد اپنے صحیح سلامت ہونے کا ثبوت دوں اور ان کی نگرانی میں اپنا صدقہ اتروا جاؤں۔ سوچ رہا ہوں کہ کچھ پیسے بھی چھوڑ آؤں گا'' کبیر نے اسے بتایا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر سندر شام روڈ کی طرف کھلتی کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر نعرہ لگایا ''نجے دو ملائیوں والی اور ذرا جلدی میرا پتر۔'' پھر واپس بستر پر گر کر وہ خاموشی سے سوچنے لگا کہ کل کوہستانِ نمک وہ ریل سے جائے یا بس سے۔ اُدھر ڈاکٹر ناصر سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کیسے بتائے گا کہ ہاؤس جاب کے ہزار روپے وظیفے میں سے وہ آدھے تو یاور عطائی کی اُلٹی کا کیمیاوی تجزیہ کروانے پر صرف کر چکا ہے جو محض بے کار ثابت ہوا اور باقی آدھے میں سے وہ کتنے گھر کے خرچ کے لیے دے سکے گا۔''

''گھونسلے'' کی خاموشی میں وہ دونوں نجے کے قدموں کی چاپ سن رہے تھے جو ملائیوں والی چائے لیے سیڑھیاں چڑھتا آ رہا تھا۔

OOO

باب(4)

زہرہ

مہینے میں کوئی نہ کوئی صبح تو ایسی ضرور ہوتی تھی کہ جب زہرہ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی بیدار ہو جاتی تھی اور پھر بستر میں گہری لیٹی وہ آنکھیں کھول کر پہلے تو اپنے کمرے کی دھندلی نامانوس فضا میں رکھی مانوس چیزوں کو حیرت سے دیکھتی اور پھر یک دم جان جاتی کہ آج وہ ایک صبح اچانک پھر آ گئی ہے کہ جس میں وہ دن چڑھے تک سو نہیں پائے گی۔ اس انکشاف پر وہ ایک ست سی خوشی اور ایک کاہل سے لطف کی کیفیتوں سے دوچار ہو کر کچھ دیر اور بستر میں ڈوبی رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا دایاں ہاتھ یوں اوپر اٹھتا جیسے کسی غوطہ خور کا ہاتھ پرسکون پانی کی سطح کو توڑ کر اوپر ابھرتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر وہ لیٹے لیٹے کھڑکی کے پردے کو کھینچ کر پرے ہٹانے کی ایک آدھ کوشش بھی ضرور کرتی اور پھر اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد بستر کو ہی چھوڑ دیتی۔

جن دنوں وہ یونیورسٹی جایا کرتی تھی ان دنوں بھی اسے بہت صبح سویرے اٹھنا پڑتا تھا لیکن الارم کی چنگھاڑ سے ہڑبڑا کر اٹھ جانا یا پھر یوں چپکے سے بے تکان جاگ جانا...... شاید مہینے میں ایک دو بار اچانک آنے والی وہ صبحیں زہرہ پر جاگنے جاگنے میں فرق واضح کرنے ہی آتی تھیں۔ رات بھر کی مہمان نیند کو مار بھگانا ایک بات ہے اور اسے گلے لگا کر خاموشی سے رخصت کر دینا دوسری بات۔ اپریل کی وہ صبح بھی ایسی ہی تھی۔ بستر سے اٹھنے کے بعد زہرہ نے کمرے کی اونچی کھڑکیوں کے پردے ایک ہی جھٹکے میں ایک طرف ہٹائے تو اسے اریکا پام کے درخت اک دم سے سامنے دکھائی دینے لگے جو یاور ہاؤس کے عقبی لانوں کے بیچوں بیچ گزرتی روش کے دونوں اطراف میں سفید ستونوں کی مانند کھڑے تھے۔ دھندلے اجالے میں ان کے چھتنار پتے ابھی سبز نہیں ہوئے تھے اور باقی سب پودوں، درختوں، بیلوں اور آرائشی جھاڑیوں کے بھی بس

Scanned by CamScanner

بیرونی خطوط ہی نظر آتے تھے لیکن ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے نے اُسکے کمرے میں آ کر بہار کے آخری دنوں میں کھلے پھولوں کی موجودگی کا احساس ضرور دلا دیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کھلے میں نکلنے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے گزرتے وقت ایک لمحے کے لیے اسے آئینے میں اپنا عکس دکھائی پڑنے کا گمان ہوا تو رک گئی اور ایسی سوالیہ نظروں سے آئینے میں دیکھنے لگی جیسے یہ یقین کرنا چاہتی ہو کہ آئینہ آج بھی واقعی اس کا عکس بنا رہا ہے یا نہیں۔ باہر سے کمرے میں مدھم آتی روشنی آئینے میں اس کا بس ایک مبہم سا ہیولا اتار رہی تھی جسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے اس پر ایسی جھلاہٹ طاری ہوئی جیسے کوئی اجنبی شخص بغیر اجازت کمرے میں گھس آیا ہو مگر پھر وہ اتنی لاتعلق ہوگئی کہ اپنے عکس کی بجائے اسے آئینے کی سب سے بیرونی جلد پر چپکے مہین گرد کے ذرے اور میکر کے اترے ہوئے اسٹیکر کے چند باقی کاغذی ریشے دکھائی دینے لگے۔ سر کو ہلکا سا جھٹکتے ہوئے اس نے آئینے سے نظریں ہٹالیں اور دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آ گئی۔

باپ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے کھڑکیوں پر ایک نگاہ ڈالی کمرے میں اندھیرا تھا اور خاموشی تھی ''پاپا تو بہت صبح اٹھ کر پڑھنے کے عادی ہیں مگر آج کل دیر تک سوتے رہتے ہیں۔ ہسپتال سے آنے کے بعد سے ایسا ہوا ہے۔ شاید دوا کا اثر ہو مگر کس دوا کا؟'' اس نے سوچا اور ایک بے چین سی نامعلوم الجھن کا شکار ہونے لگی۔ پھر عادت کے مطابق سر جھٹکتے ہوئے اس نے یہی سوچا ''اپنے ہی آپ مجھے جگا دینے والی صبح میں مَیں باپ اور آئینے کے بارے میں کچھ نہیں سوچوں گی۔''

یاور ہاؤس بڑے شہر کے اس علاقے میں واقع تھا جو عام طور پر قدیمی شرفا اور نسلی معزز لوگوں کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ کمال ٹاؤن کی یہ شہرت انگریز کے وقتوں سے تھی اسی لیے نودولتیوں، کم حیثیت ملازمت پیشہ لوگوں اور صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والے سفلہ لوگوں کا شروع شروع میں تو یہاں گزر بھی ذرا مشکل ہی تھا لیکن پھر انگریز چلا گیا اور وقت بدلتا گیا اور ساتھ ہی شرفا کی قوتِ برداشت بھی بدلتی گئی اور اب تو یہ حال تھا کہ سبھی قسم کے لوگ کمال ٹاؤن میں آباد تھے۔ کمال ٹاؤن میں کم اصل لوگوں کے یوں کمال ڈھٹائی سے آباد ہونے کا نوحہ اب بھی بعض پرانی کوٹھیوں کے برآمدوں میں شام کے وقت بید کی کرسیوں میں بیٹھے بعض معزز لوگ کرلیا کرتے تھے اور

پرانے وقتوں کی یادیں تازہ کیا کرتے تھے۔

یاور ہاؤس کسی زمانے میں گریکسن لاج تھا مگر یاور عطائی نے جب اس عمارت کو خریدا تو اس کا نام سطوت منزل ہو چکا تھا۔ مالک سطوت علی کی موت کے بعد اس کی اولاد نے وہ عمارت بیچ دی اور بڑے شہر کی ایک فیشن ایبل آبادی کی طرف نکل گئے اور یہ وقت تھا جب کمال ٹاؤن کی عظمت رفتہ کے زوال کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ شاید اسی لیے یاور عطائی کے خاندان کو یہاں بس جانے کے بعد کچھ تنقیدی تفتیشی نظروں کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن پھر پرانے لوگوں نے اُس وقت مجموعی 'لعنت بھیجو' کا دفاعی رویہ اختیار کرتے ہوئے ان نو واردوں کو بھی نظر انداز کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ مگر پھر یاور عطائی کو بالکل نظر انداز کرنا بھی علاقے کے معزز لوگوں کے لیے آسان ثابت نہ ہوا۔ یاور عطائی کے ملاقاتیوں میں کبھی کبھار انہیں کوئی ایسی مشہور و معروف، اعلیٰ رتبے کی شخصیت دیکھنے کو ملتی کہ وہ دنگ رہ جاتے۔ کوئی بہت بڑا سرکاری افسر، اہم صنعتکار، مشہور سیاست دان نامور ادیب وغیرہ وغیرہ۔ ایسے بلند مرتبہ لوگ کسی معمولی آدمی سے ملنے بھلا کیوں آئیں گے؟ کی آرام کرسیوں میں بیٹھے کمال ٹاؤن کے معمر معززین متعجب ہونے لگے تھے اور پھر جلد ہی وہ انسان کے اپنی صحبت سے پہچانے جانے کی آفاقی دانش کی شہادت دے کر یاور عطائی کو ایک لاتعلق سی قبولیت بخشنے لگے۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ وہ خود بھی یاور عطائی کے حلقۂ یاراں میں شامل ہونے کے لیے بے چین رہنے لگے۔

یاور عطائی نے سطوت منزل کو یاور ہاؤس بناتے وقت ایک تو اس کی گریکسن لاج کی اصل کا پورا خیال رکھا اور رہائشی حصے میں کوئی تبدیلی نہ کی دوسرے اس نے گھاس سے لے کر قد آور درختوں تک انواع واقسام کی نباتاتی مخلوق کو کوٹھی کے وسیع قطعوں میں ہر آسائش فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کا ایک ملاقاتی جو ریٹائرڈ افسر تھا ہنس کر کہا کرتا تھا۔ "تمہارے گھر میں خانساماں کم ہیں عطائی اور مالی زیادہ ہیں۔"

زہرہ نے برموداگھاس کے لان کے کنارے کھڑے ہو کر جوتے اتارے اور اپنے ننگے پاؤں کو رات بھر کی اوس سے شرابور گھاس پر اتارنے کے لیے آگے بڑھایا مگر اس کا پاؤں وہیں گھاس کے فرش کے اوپر ہوا میں یوں معلق ہو گیا جیسے کوئی تتلی کسی پھول پر بے یقینی سے ساکن ہو جاتی ہے اور پھر جیسے کچھ سوچتے ہوئے کسی اور طرف نکل جاتی ہے۔ زہرہ نے پاؤں واپس ہٹا لیا اور

Scanned by CamScanner

سوچا ''نرم مخمل کے قالین جیسی برمودا گھاس پر ننگے پاؤں چلنے کا لطف مئی کی گرم شاموں میں تو مل سکتا ہے لیکن اس صبح میں نہیں'' وہ روش کی دوسری طرف گھاس کے دوسرے قطعے کی طرف بڑھی اور پھر زمین سے تنکا تنکا چمٹی سخت ڈنٹھلوں والی گھاس پر قدم رکھتے ہی ٹھنڈی اوس کے قطرے اُس کے پاؤں کے تلووں میں جذب ہو گئے اور اسے یوں محسوس ہوا کہ خون میں رات بھر کی سوئی بوجھل گرمی میں ٹھنڈی شانتی کی لہریں دوڑ پڑی ہوں اور جسم میں جگہ جگہ آنکھیں سی کھل گئی ہوں۔ صبح کے وقت یوں بھی ننگے پاؤں گھاس پر چلتے وقت ہمیشہ اس کا جی چاہتا تھا کہ گھاس کے ٹھنڈے کھردرے لمس کو اپنے پورے جسم پر محسوس کر سکے۔ مگر ہمیشہ ہی وہ پاؤں سے آگے نہ بڑھ پاتی تھی اور یہ بات اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ آج بھی اس کے جی میں یہی بات آئی ''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اگر میں اوس کے قطروں کی ٹھنڈک کو اپنے پورے جسم پر پھیلا لیتی ہوں تو اس سے کسی کو کیا نقصان پہنچتا ہے اور یوں بھی اس وقت کوئی دیکھ بھی تو نہیں رہا۔ پاپا کمرے میں سو رہے ہیں۔ ماما تو خیر رہتی ہی بھائیوں کے ہاں ہیں۔ ملازم بھی کوئی نظر نہیں آ رہا.......... مگر کوئی نہ کوئی ملازم ادھر کا رخ کر بھی سکتا ہے۔ پاپا جاگ کر سیر کرتے باہر آ بھی سکتے ہیں۔ غیر مرئی جنات بھی دیکھ سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کوئی نیچی پرواز کرتا ہوا جہاز ادھر سے گزرے اور مجھے گھاس پر ننگے لوٹ لگاتے دیکھ لے۔ یہ نہیں ہو سکتا'' پھر وہی جھنجھلاہٹ۔ زہرہ نے مخصوص انداز میں سر جھٹکا، وہ حرکت جو ابھی تک ناخوشگوار کیفیتوں کو ذہن سے ہی جھٹک دینے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرتی تھی اور پھر وہ زور زور سے گھاس پر پاؤں رگڑتے ہوئے لان کے بڑے بڑے چکر لگانے لگی۔

جلد ہی ناآسودگی کا غبار چھٹ گیا اور گیلی گھاس پر پاؤں کے نشان ایک بڑے سے دائرے کی شکل میں ظاہر ہونے لگے اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور تصور بھی اس کے ذہن میں گھس آیا۔ ایک بڑی سی سفید بطخ جو اپنے بے بال و پر سینے کو یخ پانیوں سے لگائے ایک بڑے سے دائرے کی شکل میں تیرتی جا رہی ہے گھومے جا رہی ہے۔ گھومے جا رہی ہے۔ زہرہ اتنی دیر تک گھومتی رہی کہ وقت گزرنے کا احساس بالکل جاتا رہا۔ سورج طلوع ہوا اور اس کی روشنی یاور ہاؤس کی عمارت کی اوپری دیواریں پھلانگتی لان پر آ کر گرنے لگی اور زہرہ نے دیکھا کہ شبنم کے قطرے اس کے پاؤں کے نیچے مسلے جانے کے باوجود چمک رہے ہیں۔ ''دن نکل آیا ہے'' زہرہ نے کہا اور لان کے

دائرے سے ایک دوسری سمت میں نکلتی وہ پتھر کے ایک بنچ پر آن کر بیٹھ گئی اور پھر اپنے پاؤں سے چمٹے گھاس کے سوکھے تنکے چن چن کر اتارنے لگی۔ اس کی نظر اپنے تلووں کی جلد پر پڑی جس پر دیر تک گیلی رہنے کے بعد موٹی سلوٹیں سی پڑ گئی تھیں۔

''کیا بطخوں کی جلد بھی پانی سے بھیگ کر ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ کسی دن مجھے تالاب میں سے کسی بطخ کو پکڑ کر دیکھنا پڑے گا وہ بھوری غنڈی سی بطخ ٹھیک رہے گی۔''

یاور عطائی سلیپروں میں بے آواز چلتا یک دم پام کے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہو گیا اور زہرہ تھوڑا سا چونک کر پھر اپنے پاؤں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چمٹے ہوئے آخری چند تنکے اتارنے کے بعد وہ سیدھی بیٹھ گئی ''آئیں پاپا بیٹھیں۔''

یاور عطائی خاموشی سے بیٹھ گیا اور دونوں کچھ دیر خاموش ہی رہے اور بظاہر سامنے گھاس کے قطعوں اور دھوپ کے ٹکڑوں میں رنگین ہوتے پھولوں کو دیکھتے رہے۔

''کیا سوچ رہی ہو بیٹی'' یاور نے کہا۔

''میں سوچ رہی ہوں پاپا کہ مجھے تالاب میں سے اس بھوری غنڈی بطخ کو پکڑ کے دیکھنا ہوگا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے پیٹ کی جلد بھیگنے کے بعد میرے پاؤں کی جلد کی طرح چڑ مڑ ہو جاتی ہے یا نہیں......''

یاور عطائی ہنسا اور پھر ایک جاننے والی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا ''کیسی عجیب وغریب بات سوچ رہی ہو تم......''

''آپ نے پوچھا کیا سوچ رہی ہو۔ میں نے بتا دیا۔ اچھا اب آپ بتائیں آپ کیا سوچ رہے ہیں......''

''میں......وہ......''

یاور عطائی کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔ ''میں یہی تمہاری بات......''

نہیں......آپ نہیں بتا سکتے......آپ اب سوچ رہے ہیں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں......'' زہرہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''پاپا کیا ہمیں کسی سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ویسے میرا تو خیال ہے نہیں پوچھنا چاہیے۔ کوئی جو چاہے سوچتا پھرے۔''

Scanned by CamScanner

''تم تو لاجواب کر دیتی ہو زہرہ......'' یاور نے محجوب سے لہجے میں کہا۔

''اچھا چھوڑیں۔ پاپا آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اور آپ اب بہت دیر تک سونے لگے ہیں'' زہرہ نے پوچھا۔

''اس بیماری کے بعد ایسا ہوا ہے مگر یہ تو ہونا ہی تھا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ عرصے بعد۔ میں سمجھتا ہوں کیوں ہوا ہے'' یاور نے غیر حاضر سے انداز میں کہا اور پھر زہرہ کو دیکھا جو گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی پھر شاید اس خیال سے کہ وہ اس سے کچھ اور سوال کرے گی یاور نے بات بدلتے ہوئے جلدی سے کہا ''مگر اتنی صبح کیسے آ گئی لان میں؟''

''میری آج خاص صبح ہے......'' زہرہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور یاور نے کوئی سوال نہ کیا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہنے لگا ''میں تو شاید ابھی اور بھی کچھ دیر نیند میں مردہ پڑا رہتا وہ تمہاری ماں کے فون نے جگا دیا تمہاری ماں کا فون تھا۔''

''اوہو۔ ماما نے فون کیا؟ کیا کہتی تھیں؟'' زہرہ نے گرمجوشی سے خالی لہجے میں کسی اشتیاق کے بغیر پوچھا۔

یاور کھوکھلی سی ہنسی کے بعد کہنے لگا ''وہی کہ اسے یہاں یاور ہاؤس ہر وقت گندی جڑی بوٹیوں کی بو آتی ہے اور خود مجھ سے بھی۔ اگر چہ......'' یاور نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر ہنس پڑا۔

''کیا یہی بتانے کے لیے انہوں نے فون کیا تھا'' زہرہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

''نہیں وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ تم کمرے میں تھی نہیں۔ میں نے بتا دیا آج شاید پھر فون کرے گی''

''مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ اوہو۔ میرا خیال ہے میرے لیے انہوں نے کوئی اور بر دیکھا ہوگا'' زہرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہاری ماں ہے یہ اس کا حق ہے اور فرض بھی۔''

''اور آپ کا حق اور فرض پاپا؟'' زہرہ نے پوچھا اور اس کے ہونٹوں سے تمسخر جھلکنے لگا۔

''اوہو مگر تم اجازت بھی تو دو۔ جب تم اجازت دو گی تو کسی بھی بڑے خاندان میں، بڑے سے بڑے خاندان میں دیکھ لیں گے رشتہ، بالکل......سرکاری افسر، بزنس مین......یا......''

''بھائیوں کو تو آپ نے بزنس مین بنا دیا پاپا'' زہرہ نے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور

پھر کچھ سوچ کر قہقہے لگانے لگی ''اب تو ان کے چھوٹے بڑے پیٹ بھی باہر نکلنے لگے ہیں۔ بھائی فیصل اور بھائی کاشف''

''اور گردنیں بھی موٹی ہوگئی ہیں اور سر تھوڑے سے گنجے'' یاور عطائی بھی ہنس پڑا۔

''پاپا آپ بھائیوں کو ایسا ہی بنانا چاہتے تھے......'' زہرہ نے پوچھا۔

یاور سنجیدہ ہوگیا ''میں چاہتا تھا کہ انہیں اس قابل بنادوں کہ وہ اس دنیا میں جو چاہیں خرید سکیں......''

''مگر کیوں......''

''اس لیے کہ جو خرید نہیں سکتا وہ خود بک جاتا ہے اور اب تو وہ بہت خوفناک خریدنے والے بن چکے ہیں......ظالم، کمینے، خود غرض، حریص مگر عزت دار صاحب حیثیت معزز'' عطائی عجیب سے انداز میں قہقہے لگانے لگا۔ زہرہ نے جھرجھری سی لی اور اپنے باپ کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں۔ اس کے باپ میں اچانک ہی وہ کوئی اجنبی آن گھسا تھا جو کبھی کبھی زہرہ کو خوفزدہ کردیا کرتا تھا۔

''یہ سب کیا ہے پاپا......'' زہرہ نے پوچھا اور یاور عطائی اپنی اصل کے لہجے سے نکل آیا۔

''ارے بھئی دیکھو ناں تم حق اور فرق کی بات کررہی تھی تو باپ ہو کر میں نے انہیں اتنا امیر کبیر بنادیا ہے کہ بس اب مزے کرتے پھریں۔ دنیا کی کونسی چیز ہے جو انہیں میسر نہیں......اور سچ بتاؤں تو تمہاری ماں بھی اسی لیے اُن کے پاس رہنا پسند کرتی ہے، کبھی فیصل اور کبھی کاشف کے پاس......''

''ہنھ چیزیں تو یہاں بھی کیا نہیں ہیں پاپا۔ لیکن ماما کی تفریح دوسری ہے۔ آہ میری بے چاری بھابیاں......''

''اوہو......تمہارا مطلب ہے کہ ساس کے حقوق و فرائض'' عطائی طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''جی......بالکل یہی بات۔ ویسے پاپا آپ کی بہوئیں خوبصورت بہت ہیں۔ گوری چٹی گدگدی سی۔ اتنی خوبصورت جیسے اور کچھ ہیں ہی نہیں......یا پھر شاید جیسے کبوتریاں یا جیسے خرگوشنیاں۔ کیا کہیں......''

''کچھ بھی کہیں..عارفہ کو بہرحال..یہاں..ہم باپ بیٹی کے ساتھ رہنا کچھ بھاتا نہیں۔ تمہاری ماں کو یہاں رہنا......''

Scanned by CamScanner

''شاید ہم کسی دوسری مٹی کے بنے ہیں'' زہرہ نے بے خیالی سے کہا اور یاور کی آنکھوں میں ایک حیران سی چمک لہرا گئی۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ شاید یہی بات ہے'' اس نے کہا

''کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ اولاد میں سے کچھ بچے صرف ماں کے ہوتے ہیں اور کچھ باپ کے دوسرے کا تو بس ایسے بہانہ ہی ہوتا ہے......''

زہرہ ہنس پڑی اور پھر ہنستی چلی گئی ''بہانہ...... پاپا اب یہ نہ پوچھیے گا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں......؟''

''میں ایسا کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ پتہ نہیں تم کیا کہنے لگو''

''اچھا آپ بتائیں پاپا آپ صرف ماں کے ہیں یا صرف باپ کے......''

یاور اس سوال پر ششدر سا رہ گیا اور پھر دیر تک خاموش بیٹھا دُھند میں دیکھتا رہا جو اس کی آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔

''نہیں میرا خیال ہے میں غلط کہہ رہا تھا بچے میں دونوں ہی ہوتے ہیں ماں اور باپ...... اور بچے میں بھی وہ...... میرا مطلب ہے بچے میں بھی وہ ایک دوسرے سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسے اپنی زندگیوں میں۔ کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔''

زہرہ جو گہری سنجیدگی سے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی پوچھنے لگی۔

''اچھا اس وقت آپ پر کون غالب ہے پاپا۔ ماں یا باپ''

''ماں...... میرا خیال ہے کہ............'' اس نے کہنا چاہا پھر وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو اُدھر تالاب کی طرف چلتے ہیں، تم نے بطخ پکڑنی تھی ناں''

زہرہ نے غور سے باپ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی ''اس وقت تو میرا باپ مجھ سے یہ نہ ہی پوچھے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں کیونکہ میں سوچ رہی ہوں کہ وہ کچھ لوگ جو ہم سے پیچھے کہیں ہوں گے کون تھے اور کیا تھے۔ اگر میں یہ پوچھوں گی تو باپ عجیب کرخت اور اجنبی سا ہو جائے گا اور ایسے سوالوں کے وقتوں پر وہ کیسا ہو جاتا ہے اپنی ماں جیسا یا اپنے باپ جیسا۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتی اس لیے وہ اس وقت تو یہ نہ ہی پوچھے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔''

یاور عطائی نے زہرہ سے ایسا کچھ بھی نہ پوچھا اور وہ دونوں دور کونے میں بنے تالاب کی

Scanned by CamScanner

طرف بڑھنے لگے جس کے کناروں کے گرد ایرو کیریا اور مگنولیا کے چند درختوں کے بیچ بیچ یاور عطائی نے نیم کیکر اور شیشم کے کچھ پیڑ بھی پال رکھے تھے۔ اور یہ امتزاج اس کے بعض ملنے والوں میں ”ریشم میں ٹاٹ کا پیوند“ لگا دینے کی بے چینی پیدا کرتا تھا مگر یاور اور زہرہ دونوں کو درختوں کا یہ اختلاط پسند تھا ویسے ہی جیسے زہرہ کو تالاب میں تیرتے نمائشی راج ہنسوں کے ساتھ ساتھ پھرتی عام بطخیں پسند تھیں۔

زہرہ نے کیاریوں میں لگے پھولوں کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بہار کے پھول اب ختم ہونے والے ہیں۔ اور پھر گرمیاں ضرور آئیں گی اور پھر برسات اور بارشیں، بارشیں...... مگر باپ سے اس نے صرف یہ پوچھا ”پاپا گرمیوں کے پھول کب کھلیں گے؟“

”جلد ہی میرا خیال ہے وقت آ گیا ہے۔ مالیوں نے پنیری بنالی ہوگی“

”ویسے گرمیوں کے تو دو ہی پھول ہیں گل دوپہر اور زینیا۔ گل دوپہر تو روز مر جاتا ہے مگر زینیا کئی کئی دن لو میں کھڑا رنگ نکالتا رہتا ہے۔ زینیا خاصا ڈھیٹ پھول ہے پاپا...... ہیں نا......“

”ہوں...... ہاں...... میرا خیال ہے تمہاری ماں نے ضرور کوئی خاص رشتہ دیکھا ہوگا تمہارے لیے جبھی تو اتنی صبح صبح فون کیا“ یاور نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

او ہو تو آپ ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں۔“

”نہیں یہی تو نہیں۔ ایسے ہی بس خیال آ گیا“

”آپ نے اپنی بیماری کا تو نہیں بتایا ابھی تک ماما کو......“

”نہیں“

”اور بھائیوں کو بھی نہیں“

”نہیں۔ کیا ضرورت تھی۔ اور اب تو ویسے بھی میں بالکل ٹھیک ہوں...... اور میں کچھ بیمار تو ہوا نہیں تھا“

”تو پھر آپ کو کیا ہوا تھا“

”او ہو یہ تذکرہ چھوڑو بھئی“ یاور کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ زہرہ خاموش ہو گئی اور کافی دیر کے بعد اس نے سر جھٹکنے کی ضرورت محسوس کی۔

Scanned by CamScanner

بھوری بطخ کو پکڑنا اچھا خاصہ معرکہ ثابت ہوا۔ زہرہ کسی آفت کی طرح تالاب میں تیرتے نیم آبی پرندوں کی طرف بڑھی تھی۔ راج ہنسوں کے جوڑے نے تو فوراً ہی خطرہ بھانپ کر بڑے تالاب کے وسط میں بنے چبوترے پر پناہ لے لی جو سرخ پتھر سے بنایا گیا تھا اور اس کے اوپر چھاؤں کے لیے لکڑی کی پگوڈا نما چھتری بنی تھی۔ معمولی بطخوں نے بھی پہلے تو اسی محفوظ مقام کا رخ کیا لیکن ہنسوں نے اپنے راج سنگھاسن کو عام بطخوں کے لیے پناہ گاہ بنانا کسی صورت بھی گوارا نہ کیا اور اپنی گردنیں نیزوں کی طرح لمبی لمبی کرتے ان پر حملہ آور ہوئے۔ دونوں طرف سے اپنی طرف بڑھتی بلاؤں کی یلغار کی تاب نہ لا کر وہ بڑبڑاتی پھڑ پھڑاتی اُچھل اُچھل کر گرتی پڑتی تالاب سے باہر چھلانگیں لگا لگا کر قریبی جھاڑیوں اور پھول دار بیلوں میں گھسنے لگیں۔ زہرہ اور یاور قہقہے لگانے لگے۔ بھوری بطخ تالاب کے کناروں سے نیچے کود گئی اور جب زہرہ نے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کی تو وہ جارحانہ آوازیں نکالتی چنبیلی کی جھاڑیوں کے نیچے جا گھسی۔ وہیں زہرہ نے اسے دبوچ لیا۔ بطخ نے دلدوز انداز میں قیں قیں کی آوازیں نکالیں اور اپنی گول گول مٹیالی آنکھیں گھماتے ہوئے کینہ توز نظروں سے زہرہ کو دیکھنے لگی۔

''ٹھہر جا بد بخت شہزادی۔ چھری کے نیچے دم لے۔ تجھے تو فخر کرنا چاہیے کہ میں اپنی جلد کا مقابلہ تیری جلد سے کرنے لگی ہوں'' زہرہ نے کہا اور بطخ کو اٹھا کر اس کے پیٹ کے نچلے حصے کی سرخی مائل سفید جلد کو دیکھنے لگی پھر اسے چھو کر دیکھا اور نعرہ لگایا۔

''پاپا بالکل بھی نہیں۔ بطخوں کی جلد گیلی ہونے کے بعد بھی ویسی ہی رہتی ہے۔ اس پر ویسی سلوٹیں نہیں ہیں جیسی میرے پاؤں پر پڑتی ہیں......''

''چلو اچھا ہوا۔ کچھ تو ثابت ہوا۔ اگرچہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انسان خشکی کا جانور اور بطخ پانی کا، دونوں کا کیا مقابلہ'' یاور نے مسکراتے ہوئے کہا اور جو نہ کہا اور سوچا وہ بھی بطخوں کے بارے میں تھا ''بطخ کے گوشت کو بعض اطباء مقوی باہ شمار کرتے ہیں۔ گرم تر درجہ دوم میں اگرچہ گنجینۂ نشاط میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں۔''

اُدھر زہرہ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر بطخ کے گھنے پروں کے نیچے اس کے جسم سے مس کیا۔ گرم جسم میں کہیں دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور زہرہ کی ہتھیلی میں اس کی دھمک جذب ہو رہی تھی۔ زہرہ مسکرائی۔

Scanned by CamScanner

''بیٹی اب چھوڑو بھی یہ کھیل۔ اپنے ہاتھ تو دیکھو کتنے گندے ہو گئے ہیں'' یاور نے کہا اور زہرہ نے دونوں ہاتھوں سے بطخ کو تالاب کی طرف اچھال دیا۔ بطخ پانی میں شڑاپ سے گری مگر جیسے احتجاجاً فوراً پانی سے باہر نکل آئی اور کنارے پر کھڑے ہو کر اپنے پروں کو پھلا کر جسم کو جھٹکتے ہوئے چونچ موڑ کر پروں کو اس طرح صاف کرنے لگی جیسے زہرہ کے ہاتھ نہیں بلکہ اس کا جسم گندا ہو گیا ہو۔ زہرہ نے قہقہہ لگایا۔ ''واہ...... واہ...... کیا کہنے'' پھر اس نے بھی اپنا سر جھٹکا اور باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''دھوپ میں اب گرمی آنے لگی ہے پاپا''

''ہاں'' یاور عطائی نے زہرہ کی تائید میں کہا اور سر اٹھا کر سورج کو دیکھا جو شیشم اور مکنولیا کے پتوں میں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔

بوڑھا ملازم بشیر آ گیا اتنے بے آواز اور غیر محسوس انداز میں جیسے آیا نہ ہو بلکہ بس ظاہر ہو گیا ہو۔ وہ ملازمین کی اس نایاب اور مٹتی ہوئی نسل میں سے تھا جو خواب گاہوں میں بن بلائے بھی آ جائیں تو کچھ واقعہ نہیں ہوتا۔ 'ہونا' کسی بھی طرح اُن کی مصیبت نہیں بنتا۔ اُن کی خالی خالی ہستی آقا کی دنیا کی ٹھنسی ہوئی ہستی کا اٹل جواز بنی رہتی ہے۔

''کوئی فون آیا ہے کیا؟'' یاور نے پوچھا

''نہیں مالک۔ فون نہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں ملنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ باہر گیٹ پر''

''ڈاکٹر صاحب۔ کون ڈاکٹر؟'' یاور نے ایک سوالیہ الجھن کے ساتھ پوچھا۔

''وہی مالک جس نے آپ کا علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر ناصر نام بتایا ہے''

''او ہو وہ مگر وہ کیوں؟'' زہرہ کے ذہن میں تجسس تھا۔

''وہ نوجوان ڈاکٹر؟ مگر وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟'' یاور نے کہا۔

''ہو سکتا ہے آپ کے علاج کے سلسلے میں مزید کچھ بتانا چاہتا ہو'' زہرہ نے رکتے رکتے محتاط لفظوں میں باپ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''علاج ہنہ'' یاور کے لہجے میں تمسخر تھا۔ ''تم لوگ اگر اس دن مجھے اٹھا کر ہسپتال نہ بھی لے جاتے تو پھر بھی میرا علاج ہو جاتا۔'' ملازم نے سر جھکا لیا اور زہرہ کے جسم میں غصے کی ایک

Scanned by CamScanner

لہر دوڑ گئی۔

''تم لوگوں نے خواہ مخواہ جلد بازی کی'' عطائی کہہ رہا تھا ''لیکن اب تو میں ہسپتال سے جان چھڑا چکا ہوں۔ اب وہ ڈاکٹر کیا چاہتا ہے۔''

سائیکیاٹری وارڈ میں یاور عطائی کے گزرے وہ آٹھ دن چند لمحوں میں زہرہ کے ذہن سے گزر گئے ''شاید وہ بھی وہی کچھ جاننا چاہتا ہے جو میں بھی جاننا چاہتی ہوں'' اس نے سوچا اور نہ کہا اور کہا ''مل لینے میں آخر کیا حرج ہے پاپا......''

یاور عطائی کسی سوچ میں پڑ گیا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا ''ہاں کیا حرج ہے؟ مل لینے میں کیا حرج ہے مگر وہ پھر ویسے ہی فضول سوالوں سے مجھے بیزار کرے گا لیکن مل لیتے ہیں۔ خیر۔ تم سے بھی یقیناً اس نے ان دنوں کوئی تفتیش ضرور کی ہوگی۔'' یاور نے چبھتی ہوئی نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

ایک نامعلوم سی گھٹن زہرہ کے اندر بھر گئی اور اس نے کرخت سے لہجے میں کہا ''جی۔ اس نے مجھے......کئی دفعہ پوچھا تھا کہ آپ کی طبیعت کیسے خراب ہوئی تھی۔ آپ نے کیا کھایا تھا اور اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کوئی تحقیق کر رہا ہے......''

''بکواس'' یاور عطائی نے پھر قہقہہ لگایا

''آخر وہ ایک ڈاکٹر ہے پاپا''

''اور میں ایک عطائی ہوں''......عطائی نے قہقہہ لگایا......''اچھا اس سے کہو وہ مجھ سے مل سکتا ہے لیکن اس وقت نہیں۔ آج شام آجائے پانچ بجے......''

''جی مالک'' بشیر نے کہا اور چپ چاپ یاور ہاؤس کے گیٹ کی طرف چلا گیا۔

باپ بیٹی بھی خاموشی سے رہائشی حصے کی طرف مڑ گئے۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ناصر کی اچانک غیر متوقع آمد کی اطلاع نے انہیں اس صبح کی پُرمسرت لایعنی ہنگامہ خیزی سے محروم کر دیا ہو۔ ایک دوسرے سے کوئی بھی بات کیے بغیر وہ برآمدے تک آئے اور پھر زہرہ لاتعلقی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور یاور اپنے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

O

ناصر کو جب یاور ہاؤس کے بیرونی آہنی گیٹ کے سامنے کھڑے انتظار کرتے کافی دیر ہوگی تو اس نے چوکیدار کو ایسی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا جیسے وہ کوئی مریض ہو۔ ایسے ہی بس محض وقت گذاری کے لیے۔ اس کی آنکھوں کے زرد رنگ سے اس نے فوراً ہی اندازہ لگایا کہ وہ یرقان کا مریض ہو سکتا ہے۔ پھر وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کا یرقان A ٹائپ کا ہوگا یا B کا کہ بوڑھا بے آواز ملازم آ گیا۔

''مالک اس وقت نہیں مل سکتے۔ آپ شام پانچ بجے تشریف لائیں۔ ملاقات ہو جائے گی''

ناصر جو آہنی دروازوں کے سامنے کھڑے ہو کر انتظار کرنے والوں کی کوفت اور بیزاری کے عالم سے بہت گزر چکا تھا یک دم سے اپنے آپ کو اور بھی ادنیٰ اور بے حیثیت سا محسوس کرنے لگا پھر اپنے اس احساس کے برعکس کوئی اور بے نام احساس کہیں اس کے اندر اٹھا اور اس نے دل ہی دل میں کہا ''میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے مالک پر اور اپنے اس تجسس پر کہ اس عطائی ملعون نے اس رات اور اسی طرح کے دیگر لعنتی پاگلوں نے کونسی منحوس چیز کھائی تھی...... لیکن ڈاکٹر ناصر کیا تو واقعی اسی علمی اور تحقیقی مقصد کے لیے اس عالیشان آبادی کے دروازوں کے سامنے ذلیل ہوتا پھرتا ہے...... یا کہ...... کیا تو دراصل اس شخص کی بیٹی کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا ہے۔ جس کا نام زہرہ ہے اور جو اپنے باپ عطائی کو دیکھنے وارڈ آیا کرتی تھی...... '' پھر آخر میں ناصر نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ بات بھی غلط ہے۔ پہلی نظر میں عشق...... ہات تیرے کی۔ ناممکن اور پھر اسے بُری طرح کبیر یاد آیا...... بد بخت وہیں بیٹھ گیا ہے اپنے پوٹھوہار میں جا کر...... اب تو تین ہفتے ہو گئے......''

''تو آپ تشریف لائیں گے ڈاکٹر صاحب'' بوڑھا اب بھی وہیں کھڑا تھا......

میرا خیال ہے آ ہی جانا چاہیے ناصر نے سوچا اور کہا ''ہاں جی میں پانچ بجے آ جاؤں گا پھر۔ آپ یاور عطائی صاحب سے کہہ دیجیے گا۔ خدا حافظ۔''

یاور ہاؤس کا دروازہ چھوڑنے کے بعد یک دم ناصر کو خیال آیا کہ اب وہ کدھر جائے گا وارڈ میں تو ڈیوٹی ہے رات کی اور اب صبح کے گیارہ بجے ہیں تو اتنا وقت کہاں...... اسے کبیر کی ضرورت پھر انتہائی شدت سے محسوس ہوئی...... تو پھر اب کہاں۔ گھر نہیں...... کیفے غلام باغ...... نہیں وہاں اس وقت کون ہوگا...... مگر کوئی ہوگا تو سہی...... ہاف مین شاید......

Scanned by CamScanner

اور ہاف مین اسے کیفے غلام باغ میں ہی بیٹھا مل گیا۔ وہ ایک کونے کی میز پر چائے کی پیالی سامنے رکھے آرکیالوجی کی ایک موٹی سی کتاب پڑھنے میں مشغول تھا وقتاً فوقتاً کاغذوں پر لکھے اپنے نوٹس پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ کچھ متجسس بچے گورے کو وہاں بے تکلفی سے بیٹھا دیکھ کر ٹکٹکی باندھے کھڑے تھے اور کبھی کبھی آپس میں کھسر پھسر کر کے ہنس دیتے اور ہاف مین شرارت سے ان کی طرف دیکھ کر بندر کی طرح منہ چڑا دیتا تھا۔ اس پر وہ اور بھی کھل کھلا کر ہنس پڑتے تھے۔

''ہیلو'' ڈاکٹر ناصر نے ایک قریبی کرسی لیتے ہوئے کہا۔ ناصر کو دیکھ کے اک دم ہاف مین خوش ہو گیا.... ''آ..... ہاڈاکٹر.....'' ان دونوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر بچے قہقہے لگانے لگے۔

''بہت غیر متوقع ڈاکٹر۔ کام پر نہیں گئے''

''رات کو.....رات کی ڈیوٹی ہے.....''

''اب کدھر سے آ رہے ہو.....''

''وہی یاور عطائی.....'' ناصر نے ٹھنڈا سانس لیا۔

''آ.....'' ہاف مین ہنسا اور پھر ایک افسردہ سے تمسخر سے کہنے لگا ''ہم تحقیق کرنے والے لوگ بھی عجیب چوہے ہوتے ہیں بس کریدتے رہتے ہیں۔ مجھے دیکھو تمہارے اس غلام باغ کو کرید رہا ہوں.....اور تم اپنے ایک مریض کی اُلٹی کریدتے پھرتے ہو.....''

ناصر مسکرایا اور کہنے لگا ''کبیر ہوتا تو شاید کہتا غلام باغ بھی تو ایک الٹی ہی ہے ہیر ہاف مین'' اور پھر دونوں ہنس پڑے۔

''ہاں میرا خیال ہے وہ نظریہ باز یقیناً کچھ ایسی بات ہی کرتا''

''کام کیسا جا رہا ہے؟''

''پتہ نہیں میں پڑھ رہا تھا کہ اس مقام پر مغلوں سے بہت پہلے بھی کوئی تعمیر تھی'' ہاف مین نے بے یقینی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ''پتہ نہیں۔ کچھ قابو میں نہیں آ رہا..... یہ غلام باغ.....''

''اور وہ مدد علی؟''

''آ..... وہ..... وہ قابو میں ہے۔ اور اس کا وہ نواب بھی.....لیکن ایک شرط پر''

''شرط.....کیسی شرط؟'' ڈاکٹر ناصر نے پوچھا۔

''شرط یہ میرے پیارے ڈاکٹر کہ غلام باغ پر میری تحقیق جب چھپے گی تو اس میں مجھے

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا نام ضرور شامل کرنا ہوگا...... نہیں۔ بلکہ صرف نام نہیں ایک آدھ باب لکھنا ہوگا......''

''اور تم مان گئے''

''ہاں ماننے میں کیا حرج ہے'' ہاف مین نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ''کچھ لکھ دیں گے آخر کبھی وہ اس باغ کی ملکیت کا دعویٰ دار رہا ہے کچھ تو ذکر ہوگا۔ اور پھر مدد علی بڑے کام کا آدمی ہے...... اس کی خدمات نواب نے میرے سپرد کر دی ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیے۔'' اسی وقت کچن کے دروازے کی راہ سے مدد علی کینفے میں داخل ہوا اور سیدھا ہاف مین کے میز کی طرف بڑھا۔ اس سے کچھ بات کرنے سے پہلے اس نے ارد گرد منڈلاتے بچوں کو یوں بھگایا جیسے مکھیاں اڑائی جاتی ہیں۔ اپنی پسندیدہ تفریح میں اس مداخلت پر وہ کینہ توز نظروں سے گھوڑوں کا مصالحہ بنانے والے اس گندے بڈھے کو گھورتے ہوئے چلے گئے۔ ''آؤ مدد آلی، ڈاکٹر کو چائے لاؤ'' ہاف مین نے اردو میں طبع آزمائی کی اور مدد علی کچن کی طرف مڑ گیا۔

''اس سکے کا پھر کچھ بھاؤ لگا'' ناصر نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ ادھر ایمبیسی میں ہی ایک شخص ہے پرانے سکوں کا ایکسپرٹ اس نے قیمت لگائی اس کی سو پونڈ۔ میں نے مدد علی کو کافی رقم دے دی ہے۔ اگر تم چاہو تو تمہیں بھی کچھ حصہ مل سکتا ہے۔ آخر وہ سونا تمہیں نے کھود نکالا تھا۔'' ہاف مین نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

ناصر نے کندھے اچکائے اور ہنس پڑا۔ پھر سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔

''ویسے ہاف مین یہ لین دین کچھ...... میرا مطلب ہے غیر قانونی نہیں؟ سکے کو میوزیم میں نہیں جانا چاہیے کیا؟''

ناپسندیدگی کی ایک ہلکی سی پرچھائیں جرمن ماہرِ آثارِ قدیمہ کے چہرے پر آئی اور غائب ہوگئی پھر اپنی فطری خوش طبعی سے کہنے لگا ''ہاں...... میرا خیال ہے یہ تو ٹھیک بات ہے ہونا تو ایسا ہی چاہیے۔ چلو ایسا ہی کر دیں گے۔ میوزیم کو دے دیں گے لیکن تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں ڈاکٹر۔ یہ جو میرا پیشہ ہے ناں یہ آثارِ قدیمہ کا اس میں ایک عجیب ہوس ناکی ہے۔ آرکیالوجسٹ سارے زمانۂ قدیم کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے۔ اب جو کچھ وہ کھود نکالتا ہے وہ کوئی سکہ ہو، کسی مٹی کے برتن کا ٹکڑا ہو یا کوئی پورا شہر ہو اس پر قبضہ جمانے کی حرص اس میں ضرور پیدا ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

یقین کرو میں نے بڑے بڑوں میں یہ بات دیکھی ہے...... ایسا ہی ملتا جلتا لالچ میں نے مؤرخ
میں بھی دیکھا ہے لیکن مؤرخ بچارے کے ہاتھ ٹھوس اشیا کی شکل میں کچھ نہیں آتا بس حقائق
آتے ہیں یا پھر نہیں آتے اور وہ سنکھی ہو جاتا ہے۔ یہ آرکیالوجسٹ ہے جو مؤرخ اور کسی حریص
فاتح کے درمیان کہیں پھنسا ہے۔ یہ ایک عجیب مسئلہ ہے اور اسی پر مجھے اپنا نظریہ باز پھر یاد
آ گیا ہے۔ کبیر کدھر رہ گیا ڈاکٹر۔''

''وہ ذلیل آدمی اپنے گاؤں جا کر بیٹھ گیا ہے۔'' ناصر نے مایوسی سے کہا اور پھر سوچ میں
کہیں دور نکل گیا۔ کیفے غلام باغ اور اپنے اردگرد سے دور یاور ہاؤس کے گیٹ کے سامنے اور پھر
یہ غصہ کہ زہرہ کے خبیث باپ نے اسے باہر باہر سے ہی کیوں رخصت کر دیا فوری اس سے
ملاقات کیوں نہیں کی۔ زہرہ......''

''کیا سوچنے لگے؟'' ہاف مین نے پوچھا اور اپنی کتاب اور کاغذ سمیٹ کر کرسی کے ساتھ
لٹکے کینوس کے بڑے سے تھیلے میں ڈالنے لگا۔

''کچھ نہیں'' ناصر نے مختصر جواب دیا۔

''کبیر کا گاؤں پوٹھوہار میں ہے؟'' ہاف مین نے پوچھا۔

''ہاں۔''

میں ایک دن پوٹھوہار ضرور دیکھوں گا'' ہاف مین نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ضرور دیکھنا'' ناصر کے لہجے میں لاتعلقی تھی۔

''تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ہے ڈاکٹر''

''نہیں کچھ بھی نہیں''

''چلو چائے پیو......'' مدد علی چائے لے آیا تھا۔ اس نے برتن میز پر رکھے اور ان کے پاس
ہی بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ ہاف مین نے اس کی طرف مخصوص سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نائیں؟''

''نہیں صاب ابھی تو کچھ نہیں''

جرمن ہنسا جیسے اسے مکمل طور پر اسی جواب کی توقع تھی۔ پھر ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھتے
ہوئے کہنے لگا'' جانتے ہو ڈاکٹر مدد علی میرے لیے اور اپنے لیے غلام باغ میں نیچے کو اترتا ایک

زینہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کے آخر میں ایک کمرہ ہے اور جس میں اشرفیوں کا ایک صندوقچہ ہے...... کیسا لعنتی خواب ہے...... اس خواب کی خاطر تو آدمی......" اور اس کے بعد ہاف مین نے جرمن زبان میں کچھ کہا اور بے حیائی سے ہنسا۔

"یہ تم نے کیا کہا" ناصر نے اپنے لہجے میں تجسس کو کھینچ لانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی تک زہرہ کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

"جنسی علامتیں بعض اوقات انسان کی ذلت کے بیان کو بہت بلیغ بنا دیتی ہیں۔ تمہیں اس کا ترجمہ سنا دوں؟" ہاف مین نے پوچھا۔

"رہنے دو.... پھر سہی۔ ہماری مقامی زبانیں بھی اس حوالے سے بہت مضبوط ہیں۔ کیر کو آ لینے دو پھر کسی دن تم اسی بات پر اس سے مقابلہ کر لینا"

"ہاں یہ دلچسپ ہوگا......" ہاف مین نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ کیفے غلام باغ میں اب رونق بڑھ رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے آنے والے میزوں پر قبضہ جما رہے تھے اور وقفوں وقفوں سے کونے میں بیٹھی اس عجیب سی تکڈم پر ایک بے چین نظر ضرور ڈال لیتے تھے۔ کچن سے اٹھتی گوبھی اور قیمے کی بوان تینوں میں سے جیسے صرف ناصر کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ چائے پینے کے دوران بار بار ناک سکیڑ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ اس وقت اچانک ہی ہر چیز میں اس کی دلچسپی مر کیوں گئی ہے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہی وہ وہاں سے نکل بھاگے گا اور گھر جا کر اپنے کمرے کی سب کھڑکیاں دروازے بند کر کے بستر میں گھس جائے گا۔

O

ناصر نے ایسا ہی کیا تھا اور پھر شام پانچ بجے جب وہ یاور ہاؤس کے پر تعیش ڈرائنگ روم میں بیٹھا یاور عطائی کی آمد کا منتظر تھا تو اس نے سوچا کہ اس نے اچھا ہی کیا کہ دن بھر اپنے آپ کو بستر کے سپرد کیے رکھا۔ ہاف مین نے تو اسے دن بھر اپنے ساتھ رکھنے اور کئی طرح کی پُر تفریح سرگرمیوں میں ملوث کرنے کی پیشکش کی تھی جو ناصر نے قبول نہیں کی تھی۔ نیند نے اس کے اضمحلال، بے زاری، خفت اور اسی قماش کی دوسری کیفیتوں کو دھو ڈالا تھا اور اسے کم از کم وقتی طور پر

Scanned by CamScanner

ایک پراعتماد مقابلہ پسندی سے لیس کر دیا تھا۔ اب وہ عطائی کا ویسے ہی دشمنانہ جذبے سے انتظار کر رہا تھا جو مستند معالجوں اور عطائیوں کے درمیان بالعموم پایا جاتا ہے۔ اس بظاہر پیشہ ورانہ رقابت کے ساتھ اُن انتظاری لمحات میں وہ سب جارحانہ ادراکات بھی پوری شدت سے موجود تھے جن کے ذریعے منتظر اپنی حسیات کے زور پر اُس شخص کے علاوہ گرد و پیش کی ہر شے کو رد کرتا ہے...وہ جو ابھی نہیں ہے مگر جس کی آمد کی آرزو ہے۔ وہ جو ابھی نظروں میں ایک نگل جانے والے خلا کی مانند گہرا جھانکتا ہے۔ کانوں میں ایک سناٹے کی صورت گونجتا ہے اور لمس کو ایک گہراؤ بن کر کھولا کرتا ہے۔ جسے آنا تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا اور ڈاکٹر ناصر کی نظریں ڈرائنگ روم کی سب چیزوں کا سامنا کرتی تھیں جو اپنی امیرانہ شان کے باوصف اس کے اندر کسی موہوم سطح پر ایک بے نام اذیت اکساتی تھیں اور وہ سب چیزیں جن کے بیچوں بیچ کسی سیاہ پانی کی طرح جما ٹھہرا سناٹا اور اس سناٹے میں لجلجی بام مچھلیوں جیسی گھومتی مبہم آوازیں جو عمارت کے دور افتادہ گوشوں سے آتی تھیں اور اس کے کانوں کو بہرہ بند پا کر پھسلتی پلٹ جاتی تھیں سب کچھ نیستی تھا.........صوفے، دیوان، آرائشی اشیاء، پردے قالین، فانوس، میری نظریں یہ سب کچھ دیکھنے سے بے زار ہیں۔ ناصر نے گداز نشست کے دھنساؤ میں رکھے اپنے جسم کو جنبش دینا چاہی اور ہاتھ ایک طرف بوجھل رکھا تو اسی طرف کو اتنا کھب گیا کہ اس کا توازن بیٹھے بیٹھے بگڑ گیا۔ اس لمحے لفظوں کی صورت میں احساس کی ایک ترتیب اس کے سامنے آ گئی "زمین..گر..رہی..ہے۔" یہی تو یاور عطائی کہتا تھا۔ قرصِ کیف کا یہی تو کرشمہ تھا۔

ناصر مسکرایا اور پھر تو باقاعدہ لفظوں میں آ گیا "کیا میں یہاں قرصِ کیف کا معمہ حل کرنے آیا ہوں۔ کیا میں اس وقت اس نیم حکیم دیوانے فریبی کا منتظر ہوں جو اپنے آپ کو یاور عطائی کہلواتا ہے اور جس کا اصل نام خدا جانے کیا ہے۔ کیا میں اس منحوس بوڑھے نسخہ باز دوا فروش کا منتظر بیٹھا ہوں؟......میں آخر کس کا منتظر ہوں۔"

کاری ڈور میں کھلتے ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے پہنچ کر زہرہ رک گئی ہے۔ پاپا نے کہا کہ میں ان کے ملاقاتی ڈاکٹر ناصر کو بتا دوں کہ وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کی زحمت کرے کیوں کہ وہ اپنے ایک دوست سے کچھ ضروری بات کر رہے ہیں لیکن جلد ہی فارغ ہو کر آئیں گے۔ آخر یہ ڈاکٹر ناصر ہے کیا بلا۔ آخر پاپا کی اس عارضی بیماری میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا

ہے۔ زہرہ مسکرائی۔ وارڈ میں اس روز وہ کتنی عقیدت سے۔ نہیں لگن سے۔ یا شوق سے یا کچھ بھی لفظ ہو وہ بتا رہا تھا کہ اس نے پاپا کے پیٹ سے نکلنے والے مواد کا لیبارٹری کیمیکل ٹیسٹ بھی کروایا تھا۔ کیا اسے پاپا پر کسی قسم کا کوئی شک ہے۔ کیا ویسا ہی شک ہے جو مجھے بھی کبھی ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی کہ پاپا کچھ عجیب و غریب دوائیاں بنا کر اپنے دوستوں کو دیتے ہیں اور شاید انہیں دواؤں کی وجہ سے وہ سب لوگ ان کے دوست ہیں وہ سب بڑے بڑے لوگ مگر اس میں کیا حرج ہے۔ یہ ایسی کیا بات ہے...... بہت سے حکیم لوگ دوائیاں بناتے ہیں مگر پاپا تو کوئی حکیم ویکم نہیں وہ تو بلکہ اپنے آپ کو عطائی کہتے ہیں۔ تو پھر پاپا کا معاملہ کیا ہے۔ کیا یہی میں جاننا چاہتی ہوں کہ پاپا کا معاملہ کیا ہے۔ کیا یہی وہ جاننا چاہتا ہے مگر کیوں؟ اسے کیا حق حاصل ہے...... مگر اس نے کہا تھا انہی وارڈ کے چھ سات دنوں کے دوران بھی ''میں اپنے شعبے کا ایک ایماندار طالب علم ہوں اور جو چیز مجھے سمجھ نہ آئے وہ مجھے پریشان کرتی ہے اور میں اپنی پریشانی دور کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں'' اپنی پریشانی دور کرنے آیا ہے تو شاید اور بھی پریشان ہو کر جائے گا۔ بے اختیار زہرہ کا جی چاہا کہ زور سے قہقہہ لگائے مگر وہ صرف مسکرائی اور پھر یک دم نفرت سے اُس نے اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ قہقہوں کی آواز اس کے باپ کے کمرے سے اس تک پہنچی تھی۔ امبر جان کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ پاپا کے سب دوستوں میں سے...... کیا واقعی وہ ان کے دوست ہیں؟...... یہ شخص سب سے زیادہ نفرت انگیز ہے۔ تو کیا باقی بھی کم و بیش نفرت انگیز ہیں...... نہیں کم و بیش کراہت انگیز ہیں...... یا شاید کبھی کبھی ان کی آنکھیں ایسی نظر آتی ہیں۔ پتہ نہیں۔ مگر یہ شخص امبر جان تو کسی ایسے بوڑھے بلے کی طرح غلیظ ہے جس کی کھال لٹک جاتی ہے اور جو سرخ آنکھوں سے منڈیر پر بیٹھی چڑیوں کو گیلا کرتا رہتا ہے۔ گیلا کرتا ہے یہ بات میں نے کیا سوچی۔ ہاں اس کی نظریں آکٹوپس کے لمبے لمبے کسی چپچپاتے سیال سے لتھڑے بازوؤں جیسی ہیں جن سے وہ دوسروں کو چھو لیتا ہے۔

لعنت بھیجو لعنت بھیجو۔ لعنت بھیجو۔ مگر پاپا مجھے آپ کے دوست ذرا بھی پسند نہیں اور یہ امبر جان تو بالکل بھی نہیں...... اور زہرہ نے سر کو زور سے جھٹکا اور حیران ہو گئی کہ وہ کیوں اس طرح کاری ڈور میں ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے پر لٹکے پردے کے سامنے کھڑی ہے۔ کوئی دیکھے گا تو اسے کیسا عجیب لگے گا۔ اور وہ شخص ڈاکٹر ناصر ابھی پردے کی دوسری طرف کمرے میں بیٹھا ہو گا جسے بتانا ہے کہ پاپا...... سامنے بہت قریب سے زہرہ نے پردے کو غور سے دیکھا اور فیصلہ کیا

کہ سبز زمین پر زرد پھول بوٹے اسے اچھے نہیں لگ رہے۔ میں نے پہلے اس بات پر غور کیوں نہیں کیا جلدی ہی ان پردوں کو بدل دوں گی اس پردے کو بھی جسے ہٹا کر اب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی ہوں۔

زہرہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور ڈاکٹر ناصر نے دیکھا کہ زہرہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ہے۔ پردے کی جنبش دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کا سانس رکا تھا۔ ویسے ہی جیسے انتظار کی گھڑیوں کے ختم ہونے کا کوئی اشارہ ملنے پر منتظر کا سانس پل بھر کے لیے رکتا ہے اور پھر چل پڑتا ہے اور وہ آنے والے سے کچھ معاملہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرتا ہے مگر زہرہ کو اپنے سامنے موجود دیکھ کر تو ناصر کا رکا ہوا سانس بھی رک گیا مگر اب سانس کی اس رکاوٹ میں ایک گہرا نامانوس عذاب تھا۔ ایک خوفزدہ کرنے والا تحیر جیسے مدتوں کسی گھر میں رہتے رہتے اچانک اس میں کوئی تہہ خانہ دریافت ہو جائے تاریک اور نامعلوم اور اس میں اترنے کی خواہش اور خوف ایک دوسرے پر غالب آنے لگیں۔ زہرہ کو کمرے میں داخل ہوتے اور قریب آتے دیکھ کر ناصر اٹھا مگر ایسے جیسے اٹھتے اٹھتے گر رہا ہو جیسے تیزی سے نیچے گرنے والوں کا دل بلندی کی جانب ڈوبنے کو ابھرتا ہے اور پھر اس ناقابلِ یقین احساس کا ذائقہ جسم کے خلا میں بھر دیتا ہے۔ ناصر زہرہ کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹھیں پلیز'' زہرہ نے کہا پھر اس کے ہونٹوں پر کوئی خفیف سی مسکراہٹ بھی نہ تھی اور چہرہ تاثر سے عاری تھا مگر اس کی آواز نے جیسے کمرے کی خاموشی میں پڑی جامد چیزوں کی ماہیت بدل دی تھی جیسے کٹھالی میں پگھلی ارزل دھات میں طلسمی سفوف ڈالنے سے سونا بن جائے اور اسی لمحے ناصر کو یقین آ گیا...... اگرچہ اس کے ذہن میں دور دور تک کوئی لفظ نہیں تھا مگر وہ لمحہ لفظوں سے بھی ماورا کسی سطح پر اسے بتا تا تھا...... ''یہ عورت جو اس وقت میرے سامنے ہے جو اس وقت گہری شام میں اپنے نیلگوں لباس میں اتنی شدت سے موجود ہے کہ میری نظریں جیسے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتی ہیں ایک فنا کر دینے والی ہستی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ اس سے زیادہ اور اٹل یقین اور کوئی ہو نہیں سکتا''

''آپ بیٹھیں'' زہرہ نے پھر کہا اور ناصر بیٹھ گیا اور زہرہ بھی ایک طرف صوفے پر جا بیٹھی
''پاپا تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ ان سے کوئی صاحب ملنے آئے ہوئے ہیں آپ کو تھوڑا انتظار کرنا

Scanned by CamScanner

ہوگا'' وہ سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''جی کوئی بات نہیں میں انتظار کرلوں گا''

زہرہ کے چہرے پر بے چینی اور تذبذب کے تاثرات نمودار ہوئے پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس سے ضرور پوچھے گی۔

''ڈاکٹر صاحب مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر آپ کیا جاننا چاہتے ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔ پاپا کے بارے میں آپ...... کیا انہوں نے کوئی غلط کام کیا ہے؟''

''نہیں جی میں...... وہ...... دراصل'' ناصر جو ابھی اپنا توازن بحال کرنے کے چکر میں تھا، اس بوکھلا دینے والے سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔

''میں نے آج تک ایسا کوئی ڈاکٹر نہیں دیکھا جو مریض کے صحت یاب ہونے کے بعد بھی اس کا پیچھا کرتا رہے۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' زہرہ کا لہجہ اب اور بھی سرد اور براہ راست تھا۔ برفیلی، یخ بستہ ہوا کا کوئی جھونکا جس طرح نیم گرم نشے کے گھماؤ میں اکھڑتے پھرتے کسی شخص کو یک دم سے سیدھا اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیتا ہے ویسے ہی زہرہ کے ٹھنڈے بشرے سے ناصر کی جانب آتے منجمد لفظوں نے اُسے جذباتی بے سروسامانی کی اُس کیفیت سے نکال دیا جس میں وہ لمحہ بھر پہلے تک مبتلا تھا۔ کتنی سرعت سے انسانوں میں جو بنتا ہے وہ نابود ہو جاتا ہے۔ ناصر کا تعجب بس اتنا ہی تھا اور اسی بات پر تھا اور پھر چند گھڑی پہلے کے یقین کے نیست و نابود ہونے کی جان کنی تھی ایک جکڑنے والی خفت تھی جو کہ انسان کی حدود کو دوبارہ سے اس پر نافذ کر دیتی ہے'' تم اتنے کچھ ہو نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ'' اور کیا یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ یہ عورت میرے لیے ایک فنا کر دینے والی ہستی ہے۔ اس وقت بھی۔ اس حالت میں بھی کہ جب وہ اپنی کرخت اور دشمنانہ نظروں سے مجھے رد کر رہی ہے کیا وہ کہیں اندر سے مجھے غارت نہیں کر رہی؟ ناصر نے فوری طور پر نفی یا اثبات کو اپنے اوپر چڑھ دوڑنے سے باز رکھنا چاہا مگر اس کوشش کی اذیت میں فوری طور پر ہی یہ ضرور جان لیا کہ وہ اس بے مہر چہرے والی کو دکھ پہنچائے گا اپنی گفتگو سے ابھی اور اسی وقت۔

''آپ شاید یہ جاننا چاہتی ہیں کہ میں یاور عطائی صاحب کے بارے میں اتنا متجسس کیوں ہوں''

''جی یقیناً وارڈ میں بھی آپ مجھ سے...... ملازم سے اور خود پاپا سے جس طرح کے سوال

Scanned by CamScanner

پوچھتے رہے وہ کوئی عام تشخیص کرنے والے سوال نہیں تھے۔''

''آپ ٹھیک سمجھیں مجھے بھی اُن کے بارے میں کوئی عام تشخیص نہیں بلکہ ایک خاص تشخیص کرنی ہے۔'' ناصر مسکرایا اس احساس کے ساتھ کہ اب وار کرنے کا لمحہ آ گیا ہے اور پھر مسکرایا اور زہرہ کے ماتھے کی سلوٹیں اس نے بڑی لگاوٹ سے دیکھیں۔

''کیا مطلب؟ صاف صاف بات کریں۔'' زہرہ کے لہجے میں اب نفرت بھی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ صاف صاف باتیں آپ کے جاننے کی نہیں۔ وہ باتیں مجھے عطائی صاحب سے کرنی ہیں۔''

زہرہ کی آنکھوں میں اب ایک اندھی ضد کا کھولاؤ اٹھا تھا اور ناصر نے ان جھلسانے والی نظروں کو بھی اپنے اندر سینچ لیا۔ کہ یہ بھی اسی ہستی کا ایک جُزو ہے۔

''آپ کو بتانا پڑے گا۔ کیا آپ کوئی بلیک میلر ہیں؟''

ناصر بے ساختہ ہنس پڑا۔ اپنے بارے میں بلیک میلر ہونے کا تصور اُسے اتنا ہی مضحکہ خیز لگا تھا۔ کبھی کبھی کبیر کے ساتھ گفتگو کی ترنگ بازی میں وہ اس امکان سے کھیل کر مزہ لیتے تھے کہ اگر انہیں موقع دیا جائے یا کوئی بڑا المیہ انہیں مجبور کر دے تو وہ جرم کی کس راہ کو اختیار کرنا پسند کریں گے۔ اس خیالی 'جرم طرازی' میں بھی بلیک میلنگ ڈاکٹر ناصر کو کبھی کسی پر لطف امکان کے طور پر متاثر نہیں کرتی تھی بلکہ شاید کسی معکوس سطح پر ایک معالج کی اخلاقیات اس کی فینٹسی میں آڑے آتی تھی۔ کچھ زخم اتنے گندے اور غلیظ ہوتے ہیں کہ مریض انہیں چھپانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر پر بھی لازم ہے کہ وہ انہیں سب کے سامنے نہ کھولے۔ کبیر کا ان معاملات کے بارے میں البتہ دوسرا نقطۂ نظر تھا۔ لیکن اس وقت بلیک میلنگ کے بارے میں کبیر کے نقطۂ نظر کو ذہن میں لانے اور زہرہ کے روبرو مزید خاموش بیٹھے رہنے اور اسے محض جھنجھلاہٹ میں مبتلا رکھنے کی بجائے ناصر نے سوچا کہ وہ اس سلگانے والی خاموشی کی بجائے کچھ شعلہ بھڑکا دینے والی گفتگو کر کے زہرہ کو زیادہ متحرک اذیت میں مبتلا کرے گا۔ کمینگی ایک شیطان کی طرح اس پر سوار ہو گئی تھی۔ اس احساس کے باوجود کہ زہرہ کے ریشے ریشے کے لیے اس کے اندر بھوک کا ایک خلا سنسناتا تھا۔ اگر کبیر وہاں ہوتا اور ناصر کی اس کیفیت سے آگاہ ہوتا تو شاید ضرور کہتا ''عاشق ایک آدم خور ہے جو معشوق کو ہڑپ کرنے کے درپے ہوتا ہے یا پھر یہ کہ عشق ایک طرح کی روحانی و نفسیاتی آدم خوری ہے'' اور پھر اگر

Scanned by CamScanner

وہ کسی طرح اپنی طنزیہ کلبیت کے سرور میں مبتلا ہوتا تو کہتا ''عشاق حضرات محبوبِ مسلّم سے کم تر کسی مینو پر مطمئن نہیں ہوسکتے وغیرہ وغیرہ۔'' مگر کبیر تو وہاں نہیں تھا اور نہ ہی اس کی فقرے بازی۔ ہاں وہ کمرہ تھا جو گہری خاموشی کی ایک کوکھ جیسا تھا جسے دور یاور عطائی کے کمرے سے آتے امبر جان کے ہذیانی قہقہے وقفوں وقفوں سے حاملہ کرتے تھے اور وہ دونوں تھے جن کی ایک دوسرے کے بارے میں اپنی اپنی بے یقینی اور لاعلمی کے تصادم سے ناگ پھنی کے زہریلے کانٹوں جیسا تناؤ جنم لے رہا تھا جس کی کھینچا تانی سے وہ ایک دوسرے کو زخمی کردینے پر تلے ہوئے تھے۔ امبر جان کا قہقہہ ایک بار پھر خاموشی کی کوکھ میں گھسا اور زہرہ نے کہا۔

''میں نے آپ سے پوچھا تھا کیا آپ کوئی بلیک میلر ہیں۔'' ناگ پھنی کے کانٹے کی جلن ناصر نے اپنی ناف کے اندر گہری جھیلی۔

''مجھے حیرت ہے آپ کتنی آسانی سے کسی شخص کو مجرم سمجھ سکتی ہیں۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ آپ خود جرم سے بہت مانوس ہیں جو آپ کے کہیں بہت قریب ہے۔'' ناگ پھنی کی شاخ پلٹ کر زہرہ سے چھوگئی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔ اور جلن اس کی خوبصورت آنکھوں میں دھواں بن گئی۔ ''کاش میں اِن آنکھوں کو اور بھی دیکھ سکوں۔'' ناصر کے اندر کوئی شخص کراہا۔

''یہ...... کس قسم کی بکواس کررہے ہیں آپ......''

''جی یہ کسی قسم کی بکواس نہیں۔ میں نے صرف یہ عرض کرنے کی کوشش کی کہ اگر آپ کے والد مجرمانہ قسم کی سرگرمی میں مصروف ہیں تو آپ بھی اس سے ناواقف تو نہیں ہوں گی اور اگر اس فضا میں آپ کو دوسرے بھی بلیک میلر نظر آنے لگیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔''

''کیا جرم کیا ہے میرے والد نے بتانا پڑے گا تمہیں......''

''مجھے شک ہے۔ نہیں مجھے یقین ہے کہ یاور عطائی صاحب خفیہ طور پر اور کسی خاص مقصد کے لیے کوئی زہریلی دوائی لوگوں میں پھیلا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ کوئی نشہ آور دوا ہو یا کچھ اور میں ابھی نہیں جانتا مجھے کچھ اندازہ ضرور ہے لیکن شاید وہ...... خیر...... جس رات وہ میرے پاس لائے گئے اسی رات اسی طرح کی کیفیت میں مبتلا کچھ اور لوگ دوسرے ہسپتالوں میں بھی پہنچے۔ میر حیات، ملک فیروز پنگل، کمال کا چھریہ نام آپ نے سنے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آپ کے بابا

کے دوست ہوں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں''

زہرہ کے چہرے پر سے سرخی کی پرچھائیں مٹ گئی۔ اور اُدھر امبر جان کا قہقہہ پھر سنائی دیا۔ زہرہ کے چہرے پر سرخی کو زردی میں بدلتے دیکھ کر ناصر کی کمزور متخیلہ کوئی بھی ایسی تشبیہ تخلیق نہ کرسکی جو لمحوں میں جذبوں کے بدلتے رنگوں کے طلسم کو اپنی گرفت میں لاسکتی۔ وہ اپنے ہی ایک مجروح انبساط کی دھن میں تھا۔

......میں نے اس ٹھنڈی نظروں والی کے اندر آگ لگا دی ہے۔ میرا وجود اب اس کے لیے کوئی بے وقعت بے نام حقیر کیڑے جیسا نہیں جو اچانک کسی کونے کھدرے سے نکل آتا ہے اور دیکھنے والا اس پر ایک سرد نفرت آمیز نگاہ ڈالتا اس کے کسی انجانے آزار سے محفوظ رہنے کے لیے دور دور ہٹتا ہے۔ میں اگر کیڑا ابھی ہوں تو اب اس کے گرم وجود کے اندر ہوں اور اُس کی تپتی نسوں میں جڑیں گاڑے بیٹھا ہوں جہاں کبھی اس کا باپ تھا۔ یہی وہ الفاظ تھے جو ناصر کے ہو سکتے تھے مگر اس وقت اس کا اپنا شعور خود اس کی آگہی تو حیرت ناک حد تک لفظوں سے خالی تھی۔ اگر کوئی کلام خود کلامی کی سطح پر تھا بھی تو بس لفظوں کی بے ربط جرّت کی صورت میں تھا۔ جسے......شاید، دیوانہ میں پاگل ہوں ہو رہا ہوں...... یہ سب کچھ جو نارمل نہیں۔ ہو رہا ہے...... زہرہ......سے......کتنا مشکل ہے......شائزہ وفرینیا......

وہ ایک لعنتی لمحہ تھا کامل غارت گری سے بھرا ہوا جو کوئی سے بھی دو انسانوں کے بیچ کسی کائنات کے بن جانے کے موہوم سے امکان کو بھی دھماکے سے پھاڑ سکتا تھا۔ زہرہ کی آواز بھی اب پھاڑ دینے والی تھی۔

''تم میرے باپ پر اس طرح کا بے ہودہ الزام لگانے والے کون ہو۔ میرا باپ تم جیسے گھٹیا لوگوں سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے تم جیسے خبیث بلیک میلر کیا اسے خوفزدہ کر سکتے ہیں؟ تم ......''

''آخر یہاں ایسا کیا ہو رہا ہے خاتون۔ کہ جس پر انہیں بلیک میل ہونے کا خطرہ ہے۔ خوف ہے'' ناصر کو احساس ہوا کہ وہ ایسا ہی کچھ کہہ رہا ہے۔

''نکل جاؤ......دفعہ ہو جاؤ......اسی وقت......'' زہرہ کا پورا جسم یک بارگی اتنی شدت سے کانپا کہ ناصر کو یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنی ہستی کی آخری حدوں کو چُھو رہی ہے اور اگر ایسا ایک لمحہ بھی

Scanned by CamScanner

اور گزر گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے عدم میں تحلیل ہو جائے گی۔ فنا کی آخری نظریں اس کے مجسم سروپ پر ڈالتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے اُس دروازے کی طرف بڑھ گیا جس پر پردہ آویزاں تھا جس کی سبز زمین پر زرد پھول زہرہ کو اچھے نہیں لگتے تھے۔ جس کے دوسری طرف کاری ڈور تھا جو یاور ہاؤس کے وسیع گھاس کے قطعوں کے بیچ سے گزرتے راستے پر اترتا تھا اور اس رستے کے آخر میں وہ آہنی گیٹ تھا جو باہر بڑے شہر پر کھلتا تھا۔

O

''تم ہنستے بہت ہو امبر جان۔ بات بات پر قہقہہ لگاتے ہو'' یاور عطائی نے کہا۔

''قہقہہ خون کو چالو کرتا ہے اور روح کو جوان کرتا ہے'' امبر جان نے ہنسے بغیر کہا۔

''آ...... تو گویا تمہارے اندر کوئی روح بھی ہے'' عطائی نے اپنے طنزیہ انداز سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا اور امبر جان کے لیے پھر قہقہہ لگانے کا کافی جواز پیدا ہو گیا۔ ''تمہاری باتیں ہنساتی ہیں عطائی میری روح جوان ہے...... کیونکہ تم میرے جسم کو جوان کرتے ہو اور میرا سر یہ وقت آنے پر تن پڑتا ہے جسم کو سکھ آتا ہے اور امبر جان کو قرار آتا ہے اور امبر جان اسی وقت تو پورا امبر جان بنتا ہے'' اس کا جسم جیلی کے کسی بے ہنگم تودے کی طرح تھرا رہا تھا اور پھٹے ہوئے باسی دودھ جیسی رنگت کے اس کے چہرے میں سے جھانکتی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گزری ہوئی شہوانی فتحمندیوں کی یاد سے دھندلی ہو رہی تھیں۔ ایسی کوئی فتح مندی تو عطائی کی آنکھوں میں بھی تھی اور ذرا سے کھنچے اس کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ کی لکیر میں بھی تھی مگر وہ فتح مندی کسی ایسے شخص کی تھی جو کسی وحشی خونخوار کتے کو پالتو کر لیتا ہے اور اسے اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور دیکھ کر بس بے نیاز ہو جاتا ہے۔

''ہوں'' عطائی نے کہا

''میں نے بہت دنیا دیکھی ہے لالہ اور جوانی بنانے کے بڑے شعبدے دیکھے ہیں۔ اسپینش فلائی، یوھمبین، جنسینگ اور پتہ نہیں کیا کچھ مگر سب فریب۔ جو جادو تمہاری گولیوں میں اور سفوفوں میں ہے اور کسی میں نہیں۔ ایک بات لکھ دیتا ہوں۔ عطائی تم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے جوانی دینے والے ہو......''

Scanned by CamScanner

''میں جانتا ہوں۔ مجھے تمہاری سند کی ضرورت نہیں'' عطائی نے سنجیدگی سے کہا

''ہا..... ہا'' امبر جان تھرایا ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تم اگر اپنے ان معجزوں کو کوئی نام دے کر پیٹنٹ کروالو اور مارکیٹ میں لے آؤ تو ایک دنیا ٹوٹ پڑے.....''

''مجھے دنیا سے نہیں بلکہ دنیا پر حکومت کرنے والوں سے دلچسپی ہے۔ میں تو بادشاہوں کا خادم ہوں۔ مجربات برائے درازیٔ عمر پادشاہاں وشباب دائمی ایشاں'' یا ور عطائی ہنسا مگر جیسے ہنسی کی آواز منہ سے باہر آنے کی بجائے اندر کو اتر رہی تھی۔ اندر ہی اندر کی ہنسی جو صرف اپنے لیے ہوتی ہے۔ اپنے ہی کسی گہرے راز کو راز ہی رکھنے۔ بڑی کامیابی حاصل کرنے پر جیسے کوئی چپکے سے اندر ہی اندر تھوڑا سا جشن مناتا ہے مگر کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یوں راز ذہن میں گہرا چھپا کسی زندہ ہستی کی طرح اپنی ہی ایک دیوانی سرزمین تخلیق کر لیتا ہے اور اس اقلیم جنوں کا محافظ پھر ایک پاگل بادشاہ بن کر اپنی تاج پوشی یوں کرتا رہتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ تب اپنی اس دیوانی قلمرو کا حاکمِ مطلق اور بلا شرکتِ غیرے مختارِ کل بننے پر قوت کا ایک فساد اس کے اندر جنم لیتا ہے اور اسے کمزور انسانوں کی دنیا سے اوپر ہی اوپر اٹھاتا رہتا ہے۔ جیسے ہلاکت آفریں ہتھیار چھپائے کوئی شخص تباہی کا امکان بنا پھرتا ہے اور یوں دوسروں پر اپنی اٹل برتری کے احساس سے طاقت کا نشہ نچوڑتا ہے۔

امبر جان کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے جو اس کے نقوش کو اور بھی مضحکہ خیز بنا رہے تھے ''بادشاہوں کے خادم ہو تم......؟ عطائی تم نے یہی کہا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کونسے بادشاہ؟''

''جیسے تم بادشاہ ہو'' عطائی نے کہا

''میں بادشاہ..... یعنی میں......'' امبر جان کے قہقہوں میں اب پورا خلوص تھا۔

''ہاں تم۔ تم بادشاہ ہی تو ہو اپنی دنیا کے۔ جرم۔ سمگلنگ۔ نشہ بازی اور نشہ سازی کی دنیا کے بادشاہ......''

''اوہو..... تو تم یہ کہنا چاہتے ہو......'' خلافِ معمول امبر جان کچھ بجھ سا گیا...... ''ہم کہاں بادشاہ ہیں یار..... بادشاہ تو وہ ہیں جو کسی بھی وقت ہمیں ملیامیٹ کر سکتے ہیں......'' اس نے ہنسنے کی ایک نیم دلانہ کوشش کی۔

''اُن بادشاہوں کو ملیامیٹ کرنے والے دوسرے بادشاہ بھی تو ہیں مگر ملیامیٹ ہونا کون

Scanned by CamScanner

پسند کرتا ہے امبر جان اور پھر بادشاہ ہی تو بادشاہ کے کام آتے ہیں اور میں جوان کا خادم ہوں اور میں کبھی کبھی ان کی یہ خدمت بھی کر دیتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے کام آسکیں" عطائی نے اب قہقہہ لگایا۔ اب وہ پھر اپنے راز کی قلمرو میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مجنونانہ چمک تھی ویسی ہی چمک جو حاکم دین کانٹے والے کی آنکھوں میں کبھی چمکتی ہوگی اور ماسٹر کرم الٰہی کی آنکھوں میں اس وقت تو ضرور چمکی ہوگی جب اس نے چوہدری رحیم کا چھر کو چھریوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ مانگر نسل کی آنکھوں میں وہ چمک کبھی شعلہ نہ بنی ہوگی مگر اب یاور عطائی کی آنکھوں میں وہ شعلہ تھی۔

"تمہیں یاد نہیں" عطائی کہہ رہا تھا "پچھلے سال ائرپورٹ پر تمہاری مشکل کتنی آسانی سے دور ہوگئی تھی۔"

"ہاں ورنہ میں شاید اس وقت جیل میں ہوتا، اور یہ بھی تمہاری وجہ سے ہوا...... مگر تم نے مجھے کبھی کوئی حکم نہیں کیا لالہ...... یہ بڑا افسوس ہے مجھے...... کبھی کوئی اشارہ تو کرو......"

"اتنا کم ہے امبر جان کہ تمہارے جیسا بڑا آدمی میرا دوست ہے۔" امبر جان نے اس پر دوستی خلوص اور قربانی وغیرہ کے حوالے سے کچھ لایعنی سا اظہار خیال کیا اور پھر اپنے اصل مطلب پر آ گیا"...... مگر عطائی وہ تم مجھے میری خوراک ابھی دے دو...... بہت ضروری ہے......"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ آج وہ مرکب تیار نہیں جو مہا کھنڈ قسم کے مردوں کے لیے اکسیر ہے۔ تم مہا کھنڈ ہو ناں......"

"پتہ نہیں میں کیا ہوں...... میں بس امبر جان رہنا چاہتا ہوں۔ دیکھو عطائی میں کل بنکاک جا رہا ہوں اور بنکاک میں فرصت کی گھڑیوں میں امبر جان کا بس ایک ہی مشغلہ ہوتا ہے۔ عورت کا گوشت......" بے حیائی سے لدا امبر جان کا قہقہہ اس کے عام قہقہوں سے مختلف تھا اور کسی کتے کی غراہٹ سے مشابہ تھا۔

"تم بنکاک جا رہے ہو۔ میرے لیے خالص جنسنگ کی جڑ لیتے آنا اگر ممکن ہو"

"ضرور۔ ضرور" امبر جان نے پورے خلوص سے کہا، "میں وہاں ایک طوائف کو جانتا ہوں اس کا باپ اس کا کام کرتا ہے جنسنگ کا۔ مگر جنسنگ کی جڑ کا کیا کرو گے؟"

"میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں......" عطائی نے کہا۔

Scanned by CamScanner

''کوئی ویسا ہی تجربہ پھر نہ کر لینا جس نے تمہیں اور دوسرے دوستوں کو ہسپتال پہنچا دیا تھا۔''
امبر جان نے قہقہہ لگایا۔

عطائی یک دم بے حد سنجیدہ ہو گیا ''نہیں..... ایسا نہیں ہو گا..... وہ ایک چھوٹی سی حماقت تھی جو ہو گئی..... اور اس سے بھی بڑی حماقت یہ ہوئی کہ مجھے ہسپتال لے گئے..... خیر.....'' وہ خاموش ہو گیا اور مضطرب ہو کر سوچنے لگا اس حماقت کا نتیجہ وہ ڈاکٹر..... وہ ابھی تک میرا انتظار کر رہا ہو گا..... اور زہرہ کہاں ہے؟..... کیا وہ ابھی تک میرا منتظر ہو گا؟ آج مجھے اس سے بہت سختی سے پیش آنا ہو گا..... احمق شخص..... اور اب ضروری ہے کہ میں اس احمق شخص سے بھی نجات حاصل کروں جلد از جلد۔''

''اچھا امبر جان میں تمہارے لیے کچھ ڈھونڈتا ہوں۔''

''ہاں..... ہاں..... بھلا ہو تمہارا۔'' امبر جان کے لہجے میں کسی حریص گداگر کی التجا تھی۔

یاور عطائی اپنے مخصوص کمرے کی عقبی دیوار میں بنے چوبی دروازے کو کھول کر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اس کے علاوہ اور کسی ذی روح کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ اور اسی وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھی زہرہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آج وہ اپنے باپ سے وہ باتیں ضرور پوچھے گی جو اس نے کبھی نہ پوچھی تھیں۔

O

یاور ہاؤس کے آہنی گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد ناصر حیرت انگیز حد تک پرسکون تھا۔ جیسے کوئی شخص کسی خاص مقصد کے لیے کوئی مشکل کام سرانجام دینے کے لیے آئے اور پھر چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کی حد تک اس کام کی تکمیل کر کے رخصت ہو جائے۔ رات کی ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے وہ جنرل ہسپتال کی جانب روانہ ہوا۔ کبھی پیدل اور کبھی کسی بس یا ویگن پر مگر سارے عرصے کے دوران اس شام کی کٹھن جذباتی معرکہ آرائی کا کوئی شائبہ بھی اس کے ذہن میں اپنی موجودگی کا احساس نہ دلاتا تھا۔ کچھ چھن جانے کا کوئی بے نام سا احساس کبھی لمحہ بھر کے لیے جاگتا بھی تھا تو فوراً ہی مٹ جاتا تھا جیسے کوئی بچہ گیس سے بھرے غبارے کا دھاگہ یک دم ٹوٹ جانے پر لمحہ بھر کے لیے رنج میں گھر جاتا ہے مگر پھر آسمان میں اٹھتے غبارے کی آزادانہ پرواز دیکھ کر مسحور ہو جاتا ہے

Scanned by CamScanner

اور ایک دوسرے ہی انوکھے لطف سے بھر جاتا ہے جیسے وہ خود ہی وہ غبارہ ہو جو بلندیوں میں اوپر ہی اوپر اٹھ رہا ہے۔

بڑے شہر میں اُس شام لاتعلقی سے وہ آزادانہ پرواز جیسے ہر...... غم سے...... بے نیاز...... ڈاکٹر...... ناصر کی تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتے تناؤ زدہ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنا رستہ بناتے ہوئے یا مسافروں سے ٹھنسی ہوئی ویگن کا انتظار کرتے ہوئے وہ اپنے حصے کے روز مرہ غموں کے بارے میں سوچتا بھی تھا مگر اس بچے کی طرح جو بہت نیچے کھڑا تھا اور نیچے ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بڑے شہر کے تکلیف دہ ہجوم اور شور و غوغے میں سفر کرتے ہوئے بھی مگر پھر بھی بہت ہلکا پھلکا رہتے ہوئے اور محرومی کے کسی احساس سے بالکل ہی عاری ہو کر اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ ابھی تک اس قابل نہیں ہو سکا کہ اپنے لیے ایک موٹر سائیکل ہی خرید سکے۔ باپ تو اب اس دنیا میں نہیں تھا ماں اب کہتی ہے کہ بیٹے کے ڈاکٹر بننے کے باوجود اس کے گھر سے غربت نہیں نکل سکی۔ تمہارے پاس پتلونوں اور قمیضوں کے بس دو ہی جوڑے ہیں۔ آج تم وہ قمیض پہنے ہوئے ہو جس کا رنگ کر سے اڑ چکا ہے۔ کوشش کرنا کہ ڈاکٹر خرم کی اس پر نظر نہ پڑے وہ دوسروں کے کپڑے بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر خرم ہاؤس جاب کے بعد امریکہ جا رہا ہے۔ وہاں سے پاگلوں کا بہت بڑا اسپیشلسٹ بن کر آئے گا۔ ڈاکٹر خرم نے غربت دور کرنے کے لیے اور خاندان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ڈاکٹری نہیں کی۔ ویگن آ گئی۔

ویگن نے ناصر کو ہسپتال کے بالکل سامنے اُتار دیا۔ سائیکیاٹری وارڈ میں داخل ہوتے وقت ایک تعجب جو شاید تعجب بھی نہ تھا اور ایک سوال جو شاید سوال بھی نہ تھا اُس کے شعور میں اُبھرتا اور ڈوبتا تھا۔ ''کیا میں خوش ہوں یا نہیں ہوں؟............ مگر مجھے کوئی دُکھ کوئی پریشانی کوئی اذیت کچھ بھی نہیں۔'' ویسے ہی ہوا میں تیرتے ہوئے قدم اٹھاتا وہ ڈاکٹروں کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ چند تھکے ہوئے وارڈ بوائز ایک خالی اسٹریچر کو بے رحمی سے دھکیلے لے جا رہے تھے۔ ''کیا میں مطمئن ہوں۔'' ناصر نے سامنے رکھے مریضوں کے چارٹ کو اُلٹ پلٹ کرتے پھر محسوس کیا۔

''سلام علیکم ڈاکٹر صاحب'' نرس مختار آئی ہوئی تھی اور جیسے وہ ناصر کو اس کی ناآسودگی سے، جو شاید ناآسودگی بھی نہ تھی، نکالنے کے لیے غیب سے بھیجی گئی تھی۔ ناصر نے نرس مختار کو دیکھا جو اپنی

Scanned by CamScanner

ہمیشہ کی ''میں سب جانتی ہوں'' نظریں لیے سامنے کھڑی تھی اور ہونٹوں پر ''ہم سے کیا چھپاؤ گے'' مسکراہٹ پھیلائے سامنے موجود تھی۔ ناصر نے گہرا سانس کھینچا جو پھیپھڑوں سے باہر نکلنے پر سنائی دیتا تھا جیسے غبارے میں یک دم سوراخ ہو جائے اور وہ چیتھڑا بنا زمین پر آن گرے۔

وہ ایک گہرے گندھے ہوئے درد کی ایک ٹیس ہی تھی جسے ناصر اپنے دل میں سہنے لگا۔ ''میں اس عورت سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا ہوں۔ اب میں اسے کبھی دیکھ بھی نہیں پاؤں گا۔ شاید وہ کبھی میرے لیے تھی بھی نہیں اور اب ہے بھی نہیں۔ زہرہ اب کہیں نہیں ہے......''

''میں آپ کے لیے چائے منگواؤں۔'' نرس مختار کے لہجے میں کہیں کوئی معاملہ فہم سی ہمدردی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''ہو جاتا ہے...... ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے'' اور ایک لمحے کے لیے ناصر کے دل میں یہ خواہش اُبھری کہ وہ سامنے کھڑی اُس عورت کو سب کچھ بتا دے جو کچھ اس پر بیتی ہے اور شاید ابھی بیتے گی۔ سب کچھ کھول کر سامنے رکھ دے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

''مجھے یہ سب کچھ کسی نہ کسی کو بتانا ہوگا۔ ورنہ میں مر جاؤں گا یا خود اسی وارڈ میں کسی بستر پر جا لیٹوں گا۔ ایک ہی شخص ہے ایسا اور میں اُسے ہی بتاؤں گا اسی لعنتی انسان کو جو مجھے اس حال میں چھوڑ کر اپنے اس نیم وحشی خطے میں جا کر چھپا بیٹھا ہے۔ اس ذلیل آدمی کو کبیر کو بتاؤں گا۔''

''ڈاکٹر خرم آ گئے کیا؟'' ناصر نے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کہنے کی مجبوری سے نرس مختار سے پوچھا۔

''جی وہ وارڈ میں گئے ہیں۔ اسے کچھ ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ جاسوسوں والی کو..... اسے دیکھ رہے ہیں۔''

''جاسوسوں والی'' ناصر نے ٹھنڈا سانس لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا ''پیرانویا'' اُس نے سوچا۔ ''میں بھی اُدھر جا رہا ہوں تھوڑی دیر میں ہم آتے ہیں آپ چائے منگوا لیں۔'' ڈاکٹر ناصر نے کہا اور وارڈ کے اندر چلا گیا۔

''بے چارہ ڈاکٹر ناصر'' نرس مختار نے زیرِ لب کہا اور مسکرائی ''عشق خانہ خراب کا ایک جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکا اور ایک ہم ہیں کہ ہر سال ایک آدھ عشق بھگتا لیتے ہیں'' اُس نے داد دینے والے انداز میں اپنے آپ کو مخاطب کیا اور چائے کا کہنے کے لیے کینٹین کی طرف بڑھ گئی۔

Scanned by CamScanner

O

''پھر جب آپ کے بارے میں اُس کی وہ سب باتیں میری برداشت سے باہر ہو گئیں تو میں نے اُسے اسی وقت گھر سے نکال دیا'' زہرہ نے کہا۔

''مگر یہ کام میرے کرنے کا تھا۔ میں بھی اُسے نکلوا دیتا مگر اس طرح کہ پھر کبھی وہ ادھر کا رُخ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ یوں بھی تمہیں اُس کے منہ لگنے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر لعنت بھیجو اس پر......'' یاور عطائی نے مبہم سے فہمائشی انداز میں زہرہ کو دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس انداز سے حرکت دی جیسے اُس کے ہاتھوں کی اُس اضطرابی جنبش سے ہی سارا معاملہ رفع دفع ہو جائے گا مگر زہرہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہ تھی۔ اس کے سر کی اپنی مخصوص جھٹکے دار حرکت میں اس کی فطرت کی ساری ہٹ دھرمی اور کچھ بھی تسلیم کرنے سے انکار سمٹ آیا تھا۔

''مگر وہ شخص تو آپ کے معاملے پر لعنت بھیجنے پر بالکل آمادہ نظر نہیں آتا تھا...... پاپا'' اور زہرہ جانتی تھی کہ اُس کی یہ بات اس کے باپ کے لیے اپنی جھلاہٹ پر قابو پانا اور بھی مشکل بنا دے گی اور وہ یہی چاہتی تھی۔

''کیسا میرا معاملہ'' عطائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہی جو اس نے بتایا کہ آپ کوئی زہریلی دوائیں یا شاید نشہ آور دوائیں دے رہے ہیں لوگوں کو...... دوستوں کو شاید''

''تو یہ اُس نے کہا۔ ہوں؟'' عطائی نے گہرا سانس لیا اور خاموش ہو گیا اور پہلی دفعہ سنجیدگی سے اُس نے سوچا۔ وہ ہر پھرا ڈاکٹر واقعی اُسے پریشان کر رہا ہے اور اب اُسے نظر آ رہا تھا کہ زہرہ بھی اُسے پریشان کرے گی۔ وہ اپنے انداز سے تلی ہوئی نظر آتی تھی کہ وہ اپنے باپ کی اُس زندگی میں ضرور داخل ہونے کی کوشش کرے گی۔ جو کبھی اچانک اس کی روشن آنکھوں کے پیچھے کسی بند کمرے کی تاریکی کی صورت جھلک پڑتی تھی۔ گفتگو کے دوران اچانک کوئی نامعلوم سی بے چینی جگا دینے والے کسی فقرے کی صورت چغلی کھاتی تھی۔ وہ زندگی جو عطائی کے مخصوص کمرے کے روشن دانوں سے اُٹھتی کوٹی پیسی جڑی بوٹیوں کی خوشبو میں تھی اور زہرہ کے حلق کے علاوہ اُس کے ذہن کو بھی کڑوا کر جاتی تھی۔ وہ زندگی جو عطائی کے مخصوص دوستوں کے ناقابلِ تردید برتری کے اطوار میں تھی اور زہرہ کو حیران کرتی تھی کہ آخر پاپا کے سب ملنے والے اتنی بڑی بڑی حیثیتوں کے مالک ہی کیوں ہیں کوئی چھوٹا کم تر عام سا شخص کبھی پاپا کے قریب نظر کیوں نہیں آتا۔ وہ زندگی جو

Scanned by CamScanner

امبر جان کی غلیظ آنکھوں سے ٹپکتی تھی وہ زندگی کہ جس کی طرف کبھی بے خیالی میں اُٹھا ہوا ایک قدم بھی اس کے باپ کو اسی لمحے اس کے لیے اجنبی بنا دیتا تھا اور وہ زندگی جس کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی زہرہ یقین کر لیتی تھی کہ کہیں کچھ ضرور ہے اور جسے تباہی کے کسی خواب کی مانند دیکھتے ہوئے وہ لرزاں ہو جاتی تھی۔

عطائی آہستگی سے مگر بے تکان اُٹھا۔ زہرہ کو یوں لگا جیسے وہ کچھ بھی مزید کہے بغیر ڈرائنگ روم سے ہی جا رہا ہے۔ لیکن وہ سر کو ہلکا سا خم دے کر وہیں کمرے میں بوجھل قدم اُٹھانے لگا جیسے لوگ اندر کی ہیجانی سیمابی حرکت کا توڑ کرنے کے لیے جسم کو متحرک کر دیتے ہیں، ٹہلنے لگتے ہیں۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں پاپا'' زہرہ نے پوچھا۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ عطائی کے ہونٹوں پر مٹ گئی ''تم خود ہی تو کہا کرتی ہو کسی سے یہ کبھی نہیں پوچھنا چاہیے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔''

پل بھر کے لیے زہرہ لاجواب سی ہو گئی پھر بولی، ''اچھا وہی کچھ بتا دیں۔ جو آپ نہیں سوچ رہے۔'' عطائی نے زہرہ کی اس بات کو یہ جانتے ہوئے بھی کہ مذاق نہیں ایک مذاق سمجھنے کی خواہش کی اور اس امید سے اُس کی طرف دیکھا کہ شاید اس کا موڈ بدل چکا ہوگا اور وہ اُس بالکل دوسرے آدمی کو جو عطائی میں رہتا تھا تنہا چھوڑ دے گی اور اسے باپ کے خول میں ہی چھپا رہنے دے گی۔ گہری اُداسی بھری نظروں سے عطائی نے دیکھا کہ زہرہ ایسا نہیں کرے گی وہ کسی ایسے شکاری کتے کی مانند مضطرب تھی جو جستجو کی لمبی تھکا دینے والی دوڑ کے بعد بھٹ میں چھپے شکار کے اوپر جا پہنچتا ہے اور اپنے بے تاب پنجوں سے مٹی کھودتا ہے اور منہ سے غراہٹیں نکالتا ہے۔

''پاپا کیا وہ سب سچ ہے جو وہ ڈاکٹر کہتا تھا۔'' اُس کی آواز بھاری آئی اور اُس کے نتھنے یوں پھڑپھڑائے جیسے کوئی بُو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو اور کمرے میں سکوت گہرا تھا مگر ناپائیدار کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بولے تو ریزہ ریزہ ہو جائے مگر عطائی بدستور اپنی چپ میں تھا اور زہرہ اسے گہرا دیکھتی تھی اور خاموشی جب ٹوٹی تو دونوں شور کی اذیت سے چونک گئے۔ کلاک کے گھنٹے کا دس بار بجنا ٹھہر گیا تھا اور رات آگے جاتی تھی۔

عطائی کے جلتے ذہن کے گرد بے سروپا خیالوں کے پتنگے سے پھڑپھڑائے۔ ''کیا یہ کبھی ہوا کہ کلاک اپنی گنتی بھول جائے اور وقت کے کسی لمحے کا اعلان پھر کبھی نہ ہو پائے۔۔۔ ٹن ٹن۔۔۔

Scanned by CamScanner

یہ لڑکی کیوں مجھے ایسا دیکھنا چاہتی ہے کہ اسے مجھ سے منہ چھپانا پڑ جائے۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔مگر یہ اپنی ہٹ سے ہٹے گی کیسے کہ وہ میرے ہی خون سے مجبور ہے۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔وہ اندھا ضدی خون جو مانگر نسل میں کبھی کبھی پاگل پھوٹ نکلتا ہے۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔حاکم علی کا نٹنے والے کے کٹّے جسم سے بہتا ماسٹر کرم الٰہی کی چھری سے ٹپکتا۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔پیراں دتے کے شعروں سے رستا۔ خادم حسین کے خوابوں کو رنگتا ہے۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔خون جو ذلتوں کا زہر بن کر چھوٹے سے یاور حسین کے اندر بھر جاتا ہے۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔اور آخرا سے بڑے شہر کے بڑوں بڑوں کو ٹانگوں کے عین بیچ سے قابو کرنے والے رازوں کا واحد مالک بناتا ہے۔ٹن ٹن۔یاور عطائی جسے اُس کی ماں ایک جنگلی بلا جنتی ہے جو اُس پر اپنی ہوس تھوکنے والوں کی آنکھیں نکال لیتا ہے۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔ ٹن ٹن۔۔۔ٹن۔'' گھنٹے کی ہر گونج کے ساتھ زہرہ دیکھتی تھی کہ اس کے سامنے کھڑا شخص جیسے لحہ بہ لحہ اپنی جون بدل رہا ہے۔

کمرے میں پھر چپ اُتری تو عطائی نے سوچا کہ اس کا ذہن بہک رہا ہے اُسے اپنے دونوں قالبوں کو قابو کرنا ہوگا جو ظاہر ہے وہ بھی اور جو مخفی ہے وہ بھی۔اُسے اپنے اُس فیصلے پر قائم رہنا ہوگا جو برس ہا برس پہلے اُس نے کیا تھا کہ وہ زور آوروں سے ارذل جاتیوں کا کچھ تو حساب ضرور لے گا۔وہ ٹانگوں کے بیچ میں سے مار کھاتے بادشاہوں کو پھر سے توانا کر دینے کا چھل دے کر انہیں شکار کرے گا۔مگر اُس کے راز کی سرزمین اُس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گی اور یاور عطائی جنہیں اس دنیا میں لائے گا اُن کے کندھوں پر ذلت کا کوئی بوجھ نہ ہوگا اور ایک کُھلی دنیا ہوگی جہاں وہ اپنی مرضی سے اپنی زور آوری کا راج کرتے رہیں گے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔فتح مندی سے۔مگر اب یہ لڑکی، جو اُسی کی بیٹی ہے اور یہی دنیا میں اسے سب سے زیادہ پیاری ہے، تلی ہے کہ وہ اس کی عمر بھر کی جوڑ توڑ کو غارت کر دے اور اُس کے انوکھے ساز باز کو تہس نہس کر دے۔

عطائی نے ایک طویل سانس کھینچی اور پتھر ہو گیا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔خواہ اس کے لیے اسے اپنی اولاد میں سے سب سے پیاری ہستی کو گہرا دکھ ہی کیوں نہ دینا پڑے مگر وہ اس دُکھ سے پھر بھی کم ہوگا جس کی جانب وہ بے تابی سے بڑھنا چاہتی ہے۔

اچانک عطائی کو احساس ہوا کہ یہ لحہ جو آیا ہے آنا ہی تھا۔پہلے بھی زہرہ کبھی کبھی اپنی اصل

Scanned by CamScanner

تو بتاؤ......"

"کچھ نہیں Nothing at all ۔بس کچھ سستی سی ہے شاید نیند آ رہی ہے" ناصر نے کہا اور سوچا کہ اس موقع پر ایک زوردار جمائی آ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔

وہ دونوں وارڈ کے اُس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے جو ڈاکٹروں کا کمرہ کہلاتا تھا اور وہاں سے نرسوں کا کاؤنٹر صاف نظر آتا تھا۔ جہاں نرس مختار بیٹھی اُن کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی مگر ناصر کو یقین تھا کہ اُنہی کی طرف دیکھ رہی ہے اور خاص طور پر اس کے خیالات جیسے ٹیلی پیتھی سے پڑھ رہی ہے "خبیث عورت" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ پھر اُس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ۔ یاور ہاؤس میں سے اُسے نکال دیئے جانے کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ اس سوالیہ خلش پر پورے اُترتے کئی متبادل خاکے اُس کے ذہن میں آئے مگر وہ کسی پر بھی ٹک نہ سکا۔

"کیا وقت ہوا" خرم نے بے چینی سے پوچھا۔

ساڑھے گیارہ سُن کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا یار میں اب چلتا ہوں۔ باقی ٹائٹ سنبھال لینا پلیز...... میرا خیال ہے پروفیسر تو اب آنے سے رہے۔"

"نہیں اب کس نے آنا ہے۔ تم جاؤ دیکھ لوں گا۔ نو پرابلم O.K......" خرم جیب میں گاڑی کی چابیاں ٹٹولتا خالی پڑے ریسیپشن کاؤنٹر کے قریب سے ہوتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا اور ناصر نے سوچا کہ وہ باقی ماندہ رات بسر کرنے کے لیے کوئی موزوں موڈ بنانے سے پہلے اُس پیرانائیڈ عورت کو ایک بار پھر دیکھ لے۔ اگر مزید مسکن کی ضرورت ہو تو لگوا دے تا کہ وہ خود سوئے اور دوسروں کو بھی سونے دے۔

O

"وہ سو تو نہیں سکے گی۔ مگر رات پھر بھی گزر جائے گی۔" یہی خیال لیے زہرہ بستر پر پڑی تھی۔ کمرے میں روشنیاں سب روشن تھیں اور انہیں بجھانے کا اس کا کوئی خیال بھی نہیں تھا......

"میں سو تو نہیں پاؤں گی مگر راتوں رات بدل جاؤں گی" زہرہ نے یقین سے سوچا "میں وہ زہرہ نہیں رہوں گی جو پچھلی رات سے نکلی تھی.........." اُس شام کو ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہونے اور ڈاکٹر ناصر کو دیکھنے اور پھر آخر عطائی کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل جانے تک جو کچھ بیتا

Scanned by CamScanner

تک پہنچنے کے لیے مضطرب ہوتی تھی مگر وہ اسے ٹال دیتا تھا اور ایسا صرف اسی کی طرف سے ہوتا تھا۔ بہت پہلے ہی اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے دونوں بیٹے اوسط سمجھ بوجھ کے لڑکے ہیں اور انہوں نے کبھی سوچنا بھی نہیں کہ اُن کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ پھر عطائی نے اُن کے ذہنوں میں دنیا میں کامیابیاں جیتنے کے سب ہتھکنڈے اور ترقی کے سب حربے گہرے گاڑ دیے تھے اور وہ اُن سے ذرا برابر بھی ہلتے نہ تھے۔ وہ صاحبِ حیثیت آسودہ حال تھے اور اُن کی بیویاں ان کے لیے خوش شکل بچے پیدا کرتی تھیں اور وہ عورت جو خود اس کی اپنی بیوی تھی تو وہ صرف اس کے بچوں کی ماں تھی اور عطائی کے لیے اس کی نفرت شدید تھی اور شروع سے تھی اور اس کے پیچھے بھی ایک چھوٹی موٹی کہانی تھی۔

کانوں میں باپ کی مسلسل خاموشی اور آنکھوں کے سامنے کمرے میں اُس کا اُکتاہٹ پیدا کرنے والا متواتر ٹہلاؤ زہرہ کے جی کے خلجان کو اور بھی بڑھاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ آخر وہی بات کیوں نہ پوچھے جو وہ اس وقت سے پوچھنا چاہتی تھی جب وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی اور پوچھ نہیں پاتی تھی اور جب پوچھنے کے قابل ہوئی تو پھر بھی پوچھ نہیں سکتی تھی اور جس کا اس احمق ڈاکٹر اور اُس کی سب بکواس سے کچھ تعلق نہیں تھا اور وہ بات بس اتنی ہی تھی۔ ''کہ وہ کون ہے۔''

''آپ اس ڈاکٹر کی بکواس کو چھوڑیں پاپا...... آپ مجھے ایک اور بات بتائیں۔''

''کیا؟'' آخر عطائی کے لب ہلے اور وہ انہیں قدموں پر ٹھہر گیا۔ ''ہم کون لوگ ہیں پاپا؟'' زہرہ نے کہا، اور عطائی دہل کر رہ گیا اور ایک ہی زقند میں ایک زمانہ پہلے کے انعام گڑھ میں اپنے باپ کی آخری رات میں پہنچ گیا۔ جب باپ بیٹے سے یہی سوال کر رہا تھا مگر بیٹا جواب جانتا تھا اور اب بیٹی جواب نہیں جانتی تھی اور باپ سے وہی سوال کرتی تھی، عطائی بھانپ گیا کہ وہ لمحہ آ گیا ہے کہ اسے اپنی بیٹی سے سفاک ہونا پڑے گا۔ اُس کے سوال کا جواب جو اُس رات ایک زہریلے پودے کے بیج کی طرح اس کی روح میں بویا گیا تھا اب آگے اپنی فصل نہیں بڑھائے گا۔ نازک گلاب کا پھول یہ نادان بیٹی دھتورے کا پھول کیوں بننا چاہتی ہے۔ نہیں نہیں اگر بچہ انگارہ پکڑنے کی ضد کرے تو باپ کو حق حاصل ہے کہ اُسے باز رکھنے کے لیے تھپڑ بھی مار دے۔ عطائی زہرہ کے بالکل سامنے نشست میں جم کر بیٹھ گیا اور سیدھا اس کی آنکھوں میں اُترنے لگا۔

''میں شاید تمہاری ماں کے لیے ایک ناکام شوہر ہوں لیکن تمہارا کیا خیال ہے میں ایک

Scanned by CamScanner

ناکام باپ بھی ہوں۔"

"نہیں" زہرہ نے کہا اور یک بارگی اس کا دل زور سے دھڑکا اور جان گئی کہ بس اب کچھ ہونے والا ہے۔

"تو بس یہ بات اچھی طرح جان لو کہ میں کبھی بھی ایک ناکام باپ بننا پسند نہیں کروں گا۔ تم یہ سوال جو مجھ سے پوچھ رہی ہو اور وہ سب سوال بھی جو اس ڈاکٹر کی خرافات نے تمہارے ذہن میں اٹھائے ہیں۔ تم آئندہ یہ سوال نہیں پوچھو گی۔ کبھی بھی نہیں......"

زہرہ کا زور سے دھڑکتا دل ایک پل ٹھہرا.....تو یہ ہونے والا تھا..........اُس نے سوچا۔

"اور تم یہ بھی کبھی نہیں پوچھو گی کہ تم یہ سوال کیوں نہیں پوچھ سکتی۔ کبھی نہیں" عطائی نے کہا اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور کمرے میں پھر خاموشی تھی اور کلاک کی ٹک ٹک تھی اور زہرہ تھی اور رات تھی۔

O

"نہیں یار میں یہ ذہنی صدمے ودمے کی تھیوری نہیں مانتا۔ بنڈل بازی ہے ساری۔ شائزوفرینیا ایسے نہیں ہوتا" ڈاکٹر خرم نے ناصر سے کہا۔

"ہوں تو پھر کیسے ہوتا ہے؟" ناصر نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے اپنے سوال کا جواب جاننے کی کوئی خاص خواہش نہ رہی ہو۔

"تم خود جانتے ہو۔ نروس سسٹم کی کیمسٹری کا معاملہ ہے سارا۔ میرا بس چلے تو تمہاری اس ابنارمل سائیکالوجی کو ابنارمل کیمسٹری کا نام دے دوں" خرم ہنسا اور داد طلب نگاہوں سے ناصر کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں یہ دلچسپ ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ امریکہ جا کر انہی لائینوں پر ریسرچ کروں"

"ہوں۔ امریکہ کب جا رہے ہو......"

"بس۔ ہاؤس جاب ختم ہونے کے بعد" خرم نے کہا اور بدلے ہوئے پر تشویش لہجے میں کہنے لگا۔" کیا بات ہے ناصر تم آج کچھ اترے اُترے سے نظر آ رہے ہو.....کم آن کوئی پرابلم ہے

Scanned by CamScanner

تو بتاؤ......"

"کچھ نہیں Nothing at all۔ بس کچھ سستی سی ہے شاید نیند آ رہی ہے" ناصر نے کہا اور سوچا کہ اس موقع پر ایک زوردار جمائی آ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔

وہ دونوں وارڈ کے اُس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے جو ڈاکٹروں کا کمرہ کہلاتا تھا اور وہاں سے نرسوں کا کاؤنٹر صاف نظر آتا تھا۔ جہاں نرس مختار بیٹھی اُن کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی مگر ناصر کو یقین تھا کہ اُنہی کی طرف دیکھ رہی ہے اور خاص طور پر اُس کے خیالات جیسے ٹیلی پیتھی سے پڑھ رہی ہے "خبیث عورت" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ پھر اُس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ۔ یاور ہاؤس میں سے اُسے نکال دیئے جانے کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ اس سوالیہ خلش پر پورے اُترتے کئی متبادل خاکے اُس کے ذہن میں آئے مگر وہ کسی پر بھی ٹک نہ سکا۔

"کیا وقت ہوا" خرم نے بے چینی سے پوچھا۔

ساڑھے گیارہ سُن کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا یار میں اب چلتا ہوں۔ باقی نائٹ سنبھال لینا پلیز...... میرا خیال ہے پروفیسر تو اب آنے سے رہے۔"

"نہیں اب کس نے آنا ہے۔ تم جاؤ دیکھ لوں گا۔ نو پرابلم O.K......" خرم جیب میں گاڑی کی چابیاں ٹٹولتا خالی پڑے ریسپشن کاؤنٹر کے قریب سے ہوتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا اور ناصر نے سوچا کہ وہ باقی ماندہ رات بسر کرنے کے لیے کوئی موزوں موڈ بنانے سے پہلے اس پیرانائیڈ عورت کو ایک بار پھر دیکھ لے۔ اگر مزید مسکن کی ضرورت ہو تو لگوا دے تاکہ وہ خود سوئے اور دوسروں کو بھی سونے دے۔

O

"وہ سو تو نہیں سکے گی۔ مگر رات پھر بھی گزر جائے گی۔" یہی خیال لیے زہرہ بستر پر پڑی تھی۔ کمرے میں روشنیاں سب روشن تھیں اور انہیں بجھانے کا اس کا کوئی خیال بھی نہیں تھا......

"میں سو تو نہیں پاؤں گی مگر راتوں رات بدل جاؤں گی" زہرہ نے یقین سے سوچا "میں وہ زہرہ نہیں رہوں گی جو پچھلی رات سے نکلی تھی............" اُس شام کو ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہونے اور ڈاکٹر ناصر کو دیکھنے اور پھر آخر عطائی کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل جانے تک جو کچھ بیتا

Scanned by CamScanner

تھا کسی بڑے سانحے کی طرح ابھی تک اُس کے اتنا قریب تھا کہ اُسے بالکل بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس جو باتیں اس قریب میں بھی دور تھیں وہ اچانک صاف دکھائی پڑنے لگی تھیں۔ اس نے بے چینی کی ہو کر کروٹ بدلی اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اُس نے ڈاکٹر ناصر سے اتنے بُرے لہجے میں کیوں بات کی تھی۔ وہ جب گیا تھا تو وہ عجیب طرح سے اُس کے لیے غصے اور نفرت سے بھری تھی مگر اب بھی کیسے عجیب ہی طرح سے وہ اس کے لیے خالی سی ہو گئی تھی۔ شام جو کچھ وہ کہتا تھا وہ اب کہیں نہیں تھا مگر جو وہ کہتے ہوئے بھی نہیں کہتا تھا وہ اب کہیں ضرور تھا۔ اُسی وقت تھا اُس کی آنکھوں میں کہیں یا جب وہ کچھ کہنے سے پہلے رُکتا تھا تو اُس کے ہونٹوں کے گوشوں میں آتا تھا مگر اُس وقت بستر پر لیٹے لیٹے ایک ہی خیال تھا جو بار بار زہرہ کے اندر آتا تھا۔ ''میں راتوں رات بدل جاؤں گی...... اور اتنی تیز روشنی میں بھی'' زہرہ نے کروٹ بدلی اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔

O

''آپ سمجھتے نہیں ڈاکٹر۔ وہ جاسوس جو انہوں نے میرے پیچھے لگائے ہیں وہ نظر نہیں آتے۔ اب کوئی نظر نہ آئے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ہے ہی نہیں'' پیرانائیڈ عورت نے سمجھانے کے انداز میں ناصر سے کہا۔

''ہوں...... ہوں'' ناصر نے کہا اور سوچا۔ واقعی مضبوط منطق ہے...... اب زہرہ مجھے نظر نہیں آتی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ہے ہی نہیں...... پھر وہ متفکر سا ہوا کہ اس کا رویہ کتنا غیر پیشہ ورانہ اور غیر معالجانہ ہو رہا ہے۔ آخر کیا ضرورت ہے اس عورت کے لیے قصوں میں اُلجھنے کی۔ صاف ظاہر ہے کہ اسے مسکن کے بھاری انجکشن کی ضرورت ہے مگر پیرانائیڈ ہمیشہ ناصر کو اُداس کر دیتے تھے۔ وہ ایسے انوکھے تخلیق کار ہوتے ہیں جو صرف ایک ہی تھیم پر کہانیاں بناتے ہیں۔ ''دنیا میرے خلاف سازش کر رہی ہے'' ''اور دنیا شاید میرے خلاف بھی سازش کر رہی ہے'' ناصر کا ذہن اب پہلے سے بھی زیادہ غیر پیشہ ورانہ ہو رہا تھا اور ساتھ ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ مجذوب ہو رہا تھا۔

''اس وقت بھی وہ باہر ہسپتال سے پیچھے ایک مکان میں موجود ہیں۔ پانچ ہیں'' عورت نے

Scanned by CamScanner

راز دارانہ لہجے میں کہا۔" وہاں انہوں نے وہ مشین فٹ کی ہوئی ہے جس سے وہ میری زندگی کا عرق کھینچ رہے ہیں۔ سب کچھ کمپیوٹرائزڈ ہو رہا ہے۔"

گھمبیر کیفیتوں کے بوجھ تلے دبے ڈاکٹر ناصر کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی "تو کمپیوٹر ذہنی مریضوں کے واہموں میں بھی آ گھسا...... کبیر یہاں ہوتا تو وہ اس بات کو جانے کہاں سے کہاں لے جاتا۔ کبیر......" ناصر نے ٹھنڈا سانس لیا" آپ آرام کریں۔ ابھی آپ کو ایک انجکشن لگے گا۔"

"انجکشن؟ سائیانائیڈ کا؟" عورت نے شک اور خوف سے اس کی طرف دیکھا اور ناصر واپس ڈاکٹروں کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ سسٹر مختار کے کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے۔ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر انجکشن کے بارے میں ہدایات دیں اور اک دم اس کا جی چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کیفے غلام باغ؟ مگر اس وقت وہاں کون ہو گا! اس نے کھلی کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ پچھلی راتوں کا چاند ٹی بی وارڈ کے پیچھے سے طلوع ہو رہا تھا۔

O

عطائی نے جب غیاث پنگل کا فون سنا تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"معاف کرنا یار تمہیں بے وقت بے آرام کیا" دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی ابھی سویا نہیں تھا۔ خیریت؟" عطائی نے پوچھا

"بس وہ...... ایک آدھ گھنٹے تک میری طرف کوئی آنے والا ہے اور مجھے اچانک پتہ چلا کہ میں تو 'مسلح' نہیں ہوں؟" اب آواز کے ساتھ ایک کھسیانی سی ہنسی بھی شامل تھی۔

"اوہ" عطائی کی 'اوہ' طویل اور معنی خیز تھی "سمجھا تو پھر حکم؟"

"میں ملازم بھیج رہا ہوں اس کے ہاتھ کچھ بھجوا دو...... جو تھوڑے وقت میں کام دکھاتی ہیں۔"

"مگر وہ بعض اوقات خطرناک بھی ہو سکتی ہیں غیاث صاحب......" عطائی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

Scanned by CamScanner

''عین وقت پر شرمندہ ہونے سے تو بہتر ہے کہ آدمی فوت ہی ہو جائے۔''

عطائی ہنسا ''اچھا آپ ملازم بھیج دیں اور ہاں۔ یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ وہ روغن کھانے کے لیے نہیں بلکہ..........''

''ہاں...... ہاں...... جانتا ہوں۔ جانتا ہوں......'' پنگل کے قہقہے کی ذومعنی بے حیائی ٹیلی فون کے سرکٹ کے شور نے جذب سی کر لی مگر قہقہہ عطائی نے سُنا اور کہنے لگا۔

''بہت خوش سُنائی دے رہے ہیں آپ''

''بس یار وہ تمہاری بھابی اور بچے گئے ہوئے ہیں میں نے سوچا۔''

''یقیناً...... یقیناً...... آپ نے ٹھیک سوچا......''

''پتہ نہیں ٹھیک سوچا ہے یا غلط...... ابھی تو میرے لیے دُعا کرو......''

''دُعا نہیں دوا...... ملازم بھیج دیں...... ارے ہاں یاد آیا...... اتفاق سے آپ سے بات ہو ہی گئی۔ کل میں اپنے بیٹے کو آپ کی طرف بھیج رہا ہوں۔ اس کے کچھ ایکسپورٹ کے معاملات ہیں۔ وہ دیکھ لیجیے گا...... ٹھیک ہے ملازم بھجوائیں......'' عطائی نے ریسیور واپس رکھا اور اُٹھتے ہوئے بڑبڑایا ''آسکیہ نامردوں کی بے تابی بھی دیکھنے والی ہوتی ہے جناب غیاث پنگل صاحب۔'' گہری حقارت اس کے ہونٹوں کو بگاڑ گئی۔ وہ اُٹھا اور اپنے مخصوص کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا جو اس کی خواب گاہ سے منسلک بنا تھا۔

O

چاند اب ٹی بی وارڈ سے اوپر اٹھ چکا تھا اور ہڈی وارڈ کی اونچی عمارت کے ساتھ چپکا کھڑا تھا اور ڈاکٹروں کے کمرے میں بیٹھے ناصر کو کھڑکی کی راہ سے وہ کسی سستے سے نیون سائن جیسا نظر آتا تھا۔

وارڈ میں سناٹا تھا جیسے سارے مریض مر کر ہمیشہ کے لیے اپنے دُکھوں سے آزاد ہو چکے ہوں اور صرف نائٹ ڈیوٹی دینے والے ڈاکٹر ناصر اور سسٹر مختار زندہ ہوں اور جاگتے ہوں۔

''اس عورت کو تو نیند بھی نہیں آتی'' ناصر نے تھکے اور چڑے ہوئے انداز میں سوچا۔ ''آج تک اسے نائٹ ڈیوٹی پر سوتے نہیں دیکھا...... اگر یہ وہاں کاؤنٹر پر جم کر بیٹھنے اور ہر بیس سیکنڈ بعد

میری طرف ایک نظر دیکھنے کی بجائے اسی وقت اٹھ کر یہاں آ جائے اور مجھ سے کوئی بات کرے تو میں اُس سے سب کچھ کہہ ڈالوں اور اسے بتا دوں کہ آج کا دن میرے اوپر کتنا بھاری گزرا ہے۔''

مسٹر مختار نے پھر کنکھیوں سے ناصر کی طرف دیکھا اور ناصر نے بے خیالی سے کہنیاں سامنے میز پر ٹکانا چاہیں۔ پھر بے خیالی سے ہی میز پر ایک طرف رکھے سائیکیاٹری وارڈ کے لیٹر پیڈ اور ایک بال پوائنٹ پنسل کو اپنی طرف کھینچا اور پھر شاید ویسے ہی بے خیالی سے وہ لکھنے لگا۔

اوپر دائیں کونے پر تاریخ لکھنے کے بعد اس نے لکھا ڈیڑھ بجے شب اور پھر درمیان میں اُس نے لکھا ''پیارے کبیر......'' مسٹر مختار نے مایوسی سے سر کو جنبش دی اور آہ سی بھری...... ''لو جی اب وارڈ کے پیڈ پر ہی لو لیٹر لکھنے بیٹھ گئے...... خانہ خراب ہو اس عشق نامراد کا'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے ایپرن کی جیب سے ایک الائچی نکال کر منہ میں ڈالی اور اُداسی سے اُسے کچلنے لگی۔

پیرانائیڈ عورت خواب میں اپنے جاسوسوں کو ایک ایک کر کے ہلاک کر رہی تھی۔ باہر بڑے شہر میں رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ٹھنڈ کو گھاس کے قطعوں پر سوئے ہوئے لوگ نیند میں بھی پہچان کر اپنے اوپر بھاری کپڑے کھینچتے تھے۔

ویران سڑکوں اور سنسان گلیوں میں ہوا اتنی بوجھل بہتی تھی کہ جیسے نہ تھی۔ سُندر شام روڈ پر کبیر کے گھونسلے کے نیچے فلتھ ڈپو اور چائے کے کھوکھے کے درمیان سے ہوا کا ایک ایسا ہی بوجھل جھونکا بے دلی سے گزرا اور پھٹے ہوئے کاغذ کے اُس پُرزے کو ساتھ بہا لے گیا جس طرح کے بہت سارے دوسرے پُرزے ایک اور رات کبیر نے اوپر کھڑکی سے نیچے پھینکے تھے۔

مگر سنسان سڑک پر اُڑتے ہوئے اُس کٹے پھٹے کاغذ کے پرزے پر کبیر کی تحریر کو پڑھنے والا وہاں کوئی بھی نہیں تھا جو سُناتی تھی کہ وہ...... ''گویا اپنے ہونے سے محروم ہو چکے ہیں۔ رات کا کالا لہو کائنات کی نس نس میں گردش کرتا ہے اور اس کی تال پر سیاہی کے آسیب رقص کناں ہیں......''

OOO

Scanned by CamScanner

باب(5)

جل پتھری

کھلے نیلے آسمان میں سورج تھا اور اونچی نیچی پہاڑیوں اور گہری گھاٹیوں میں کٹی پھٹی پوٹھوہار کی زمین پر دن روشن چمکتا تھا۔

کبیر نے چٹان کی طرف دیکھا اور مٹی کے اس پیالے کی طرف بھی جو چٹان کے نیچے رکھا تھا اور اوپر سے گرتے پانی کے قطرے کو ایک ایک کر کے اکٹھا کرتا تھا۔ چٹان جنڈ کے درختوں کے اُس چھوٹے سے جھنڈ سے زیادہ دور نہ تھی جہاں کبیر بیٹھا تھا۔ جھنڈ کے ساتھ ہی پیچھے پہاڑی تھی، جو یک لخت تہ در تہ سلوں میں پتھر پتھر ہو کر اوپر اٹھنے لگتی تھی۔ اسی پہاڑی کے اُس مقام سے کہ جہاں وہ اُونچا اٹھنا شروع ہوتی تھی، چٹان یک دم سے باہر نکل آئی تھی جیسے پہاڑی کے اندر چھپے کسی سنگ زاد نے اپنی انگشتِ شہادت باہر نکال لی ہو اور اس سمت اشارہ کیا ہو جہاں ازل سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ یہ چٹان جل پتھری نام رکھتی تھی اور پہاڑی کو بھی اپنی ہی شناخت دے کر اسے جل پتھری پہاڑی کہلوا دیتی تھی۔ جل پتھری کا جل مگر اتنا ہی تھا بس ایک قطرہ جو اس کے پیندے کی ایک خفیف سی درز میں سے بہت سوچ سوچ کر نیچے اس کے پتھریلے سائے میں ہمیشہ ایک ہی مقام پر گرتا تھا۔ بکریاں چرانے والے لڑکے اس مقام پر مٹی کا پیالہ رکھ دیتے تھے اور جب کبھی وہ وہاں آن نکلتے تو پیالہ بھرا ہوتا اور جو اُن میں سے پہلے پیالے تک پہنچ جاتا وہ سیراب ہو جاتا اور جو باقی بچتے وہ پیالے کے پھر سے بھرنے کا انتظار کبھی نہ کرتے اور باری باری جل پتھری کے نیچے سیدھے لیٹ کر اپنا منہ کھول دیتے اور قطرہ سیدھا ان کے حلق میں ٹھنڈا گرتا اور اُن کی پیاس بجھ جاتی شاید اس لیے بھی کہ یہ خیال ان کے دل میں بہت گہرا اُترا ہوا تھا کہ جل پتھری کے پانی کا ایک قطرہ جو حلق میں گرتا ہے اتنی ہی پیاس بُجھاتا ہے جتنا پورا پیالہ۔ کبیر جل پتھری اور اس

کے جل کا عاشق تھا۔
پہاڑی چند سوفٹ ہی اوپر جا کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تھی اور پیچھے مغرب اور جنوب میں گہری دراڑوں اور کھڈوں میں ٹوٹ پھوٹ کر اس علاقے کو جگہ دے دیتی تھی جہاں سے سلیٹی رنگ کی چٹانی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور دور تک جاتا تھا اور اسی میں کہیں ڈھورک اور گہیال نامی گاؤں تھے جن کے آس پاس کوئلے کی چند قدیم کانیں ابھی تک پیداوار دیتی تھیں۔ شمال میں پہاڑی اپنی اُتران میں زیادہ دھیرج سے اُترتی تھی اور اس تنگ سی سبز وادی میں جا پہنچتی تھی جہاں سنمیال کا گاؤں تھا اور جہاں کبیر کا خاندان صدیوں سے رہتا تھا اور گاؤں کے گرد وادی میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔

جنڈ کا درخت جہاں کبیر بیٹھا تھا اور اُس کے بائیں طرف اور جل پتھری کے پیالے کے نیچے تک پتھریلی زمین ہموار تھی مگر پھر نیچے ہی نیچے ہوتی مشرق میں اُن سرخ رنگی پہاڑیوں کی طرف اُتر جاتی تھی جو بڑے پتھروں سے تو خالی تھیں مگر جن کے اندر نمک ہی نمک تھا اور میلوں تک تھا۔

جل پتھری پہاڑی کے قدم چھو کر دور ہٹتی یہ ڈھلوان بھی گویا ایک ادھوری پہاڑی ہی تھی مگر نرم خُو کہ جس کی چڑھائی پر نہ کوئی ہانپتا تھا اور نہ اُترائی پر کوئی لڑکھڑاتا تھا اور اس کی یہی اُترائی کبیر کے بائیں جانب شمال میں بھیکڑ، کری اور سنتھے کی جھاڑیوں میں گہرے راستے بناتی نیچے سنمیال جا پہنچتی تھی۔ انہیں راستوں سے کبیر بچپن سے سنمیال سے اُٹھ کر جل پتھری کی بلندی تک آ جاتا تھا۔ کری کے پستہ قد جھاڑی دار بوٹوں سے گھنا ڈھکا ہوا آخری موڑ چڑھ کر جب کبیر پتھریلی ڈھلوان پر سر بلند کرتا تھا تو اس کی آنکھیں سیدھی جنوب کے خلا پر کھلتی تھیں۔ جنوب جدھر آگے سینکڑوں میلوں تک کہیں بھی کچھ بھی اتنا اُونچا نہ تھا بس آسمان اُونچا تھا اور زمین نیچے تھی جو میدانوں میں پھیلی تھی اتنی دور تک کہ نگاہ تھک کر اُفق میں دھند بن جاتی تھی اور اس دھند میں دریا تھے اور شہر تھے اور قصبے اور گاؤں بھی تھے اور دور، بہت ہی کہیں دور سمندر تھا۔

نرم خُو ڈھلوان شاید جنوب کو بڑھنا پسند نہ کرتی تھی یا شاید اپنے ادھورے پن کی تلافی کرنا چاہتی تھی کہ چند بڑے بڑے پتھروں کو پیچھے چھوڑ کر یک دم سے نیچے گر جاتی تھی۔ سینکڑوں فٹ کا یہ سیدھا گہراؤ ایک پرہول گھائی تھی۔ جس کی تہہ میں نوکیلی چٹانیں تھیں اور ہمت کر کے نیچے دیکھنے والوں کو قریب آنے کی سنگین دعوت دیتی تھیں۔

Scanned by CamScanner

کبیر نے ابھی سوچا ہی تھا کہ جل پتھری کا پیالہ اب تک بھر چکا ہوگا کہ روشنی کی جھلک سی لکیریں دوراچانک چٹان کے نیچے لہرا گئیں اور وہ سمجھ گیا کہ پانی کناروں تک پہنچ گیا ہے اور سورج کی کرنیں ہموار سطح سے اُٹھ کر چٹان پر منعکس ہوئی ہیں اور پھر قطرہ گرنے سے ان کا عکس اتنے شدید اضطراب سے متحرک ہو جاتا ہے کہ جیسے اس کی حرکت کبھی رُک نہ پائے گی۔ مئی کے شروع دنوں کا سورج آدھے آسمان سے کچھ ہی نیچے تھا مگر درختوں میں سایہ ٹھنڈا تھا اور جنگلی پہاڑی پودوں کی خوشبو سے بھری ہوا بھی ٹھنڈی تھی مگر ان کی نمی تیزی سے سوکھ رہی تھی۔ ''کچھ ہی دنوں کی بات اور ہے پھر یہ ہلکی سی خنکی بھی تحلیل ہو جائے گی چٹانیں اور پہاڑیاں تپنے لگیں گی اور ان میں سے شفاف سینک نکلے گا اور دن کو پوٹھوہار تندور کی طرح دہکے گا مگر اس کی راتیں پھر بھی ٹھنڈی ہی رہیں گی اور سنمیال کے مٹی پتھر کے گھروں کی چھتوں پر لوگوں کو گہری نیند سلائیں گی۔'' کبیر نے سوچا۔ پیاس کا احساس اب زیادہ قوت سے اس کے حلق میں جاگ اُٹھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ناصر کے سات صفحات پر پھیلے ہوئے خط کو سمیٹ کر کاغذوں کے ہولڈر میں پھنسایا اور پہلے سے پڑھے ہوئے خط پر کہیں کہیں پھر نگاہ ڈالی اور اُس کے ہونٹوں پر ویسی ہی شیطانی مگر محبت بھری مسکراہٹ تھرتھرائی جیسی کہ خط پڑھنے کے دوران بار بار اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ اُٹھ آتی رہی تھی۔ اس نے ہولڈر کو بائیں طرف رکھے رسالوں اور مختلف رنگوں کی بال پوائنٹ پینسلوں کے قریب رکھا اپنی کمر جنڈ کے مختصر سے تنے سے ہٹائی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم دور ایک چھوٹے سے پتھر کے نیچے دُبکا ایک دھاری دار سرخ چھپکلا متوحش سا ہو کر تیزی سے ایک دوسرے پتھر کے نیچے رینگ گیا......

پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کبیر نے پہلے تو بے تابی سے بڑے بڑے گھونٹ حلق میں اُتارے پھر سیراب ہونے اور بجھ جانے کا گہرا احساس ہونے پر چھوٹے گھونٹوں سے پیالہ خالی کر دیا تھا۔ پھر اس نے جل پتھری کے نیچے لمبا لیٹ کر گرتے قطرے کی راہ میں منہ کھول دیا۔ ٹھنڈا قطرہ اُس کے حلق میں گرا اور یوں جل پتھری سے پانی مانگنے کی رسم جیسے ادا ہو گئی اور وہ شانت ہو گیا۔ ''دنیا میں کہیں بھی ایسا پانی نہیں ہو سکتا۔ جل پتھری کے پتھریلے جسم کا رس'' اس نے گہرا سانس لیا پھر اس نے بالشت بھر لمبے اس گہرے شگاف کو غور سے دیکھا جہاں سے قطرہ ٹپکتا تھا اور پھر عادتاً اپنی انگلی اُس کے اندر ڈال دی قطرہ لمحے بھر کے لیے رُک گیا اور اس نے شرمندہ سا ہو کر اپنی انگلی باہر نکال

Scanned by CamScanner

لی۔ پھر اپنی شرمندگی پر بے ساختہ مسکرایا۔ ''لعنت ہے ایسے علم پر جو کسی معصوم سی حرکت کے پیچھے بھی جنسیت ڈھونڈ لیتا ہے''۔ کبیر ہنس پڑا اور چٹان کے سایے کے نیچے سے باہر نکل آیا اور گھاٹی کے گہراؤ کی سمت بڑھا پھر وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کنارے کے قریب پڑے ایک پتھر پر ہاتھ ٹکا کر اور آگے جھک کر گہرائی میں دیکھنے کی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ زمین میں گڑی خنجروں جیسی نوک دار چٹانیں نیچے بلاتی تھیں۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور جنوب کے اُفق میں ایک خاص نقطے کی جانب نظریں گاڑنے لگا...... بڑا شہر اسی سمت میں کہیں ہوگا اور وہاں کینفے غلام باغ میں اس وقت ہاف مین ہوگا اور شاید مدد علی، اور شاید ناصر نہ ہو۔ ہسپتال میں ہو یا گھر سوتا ہو...... میرا بے چارہ ڈاکٹر ناصر ماہر ہاؤس جاب امراضِ دماغی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کبیر ہنسا اور بڑبڑایا ''میں ابھی اور اسی وقت نامہ تیرے نام لکھوں گا عزیز کہ تیری داستان عبرت انگیز ہے''۔

کبیر نے تمسخر بھرے انداز میں آہ بھری، منہ سے چچ چچ کی آوازیں نکالیں اور پھر مایوسی سے یوں سر ہلایا جیسے ناصر کہیں اس کے سامنے ہی موجود ہو اور اس کی یہ حرکتیں دیکھ کر جل بھن رہا ہو۔ پھر اس نے بڑے شہر اور میدانوں کی سمت ایک اور نگاہ ڈالی اور واپس مڑ کر درختوں کے سائے تلے اپنے گوشۂ عافیت میں لوٹ آیا۔ پتھر کی سل جیسی نشست اور درخت کے تنے کی ٹیک میں جم کر بیٹھنے کے بعد اس نے کاغذوں کا ہولڈر اُٹھایا اور ایک ایسی پینسل منتخب کی جو روانی میں سب سے بہتر تھی۔

جل پتھری پہاڑی

ستمیال۔ ۳ مئی، بنام ڈاکٹر ناصر احمد 'مرحوم'

کہ جو عین عنفوانِ شباب میں عدوِ اعظم نسلِ انسانی مرضِ مرگِ عشق خانہ خراب کے ہاتھوں شہید ہو کر اپنے نہایت ہی غیر منطقی انجام کو پہنچے کہ گو مرحوم کوئی خاص خوبیوں کے مالک نہ تھے لیکن میدانِ طبابت میں غایت درجہ عقلی و تجربی استدلال پر بہر طور یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور اپنی انہیں صفاتِ عالیہ کے باوصف بقیہ زندگی میں بھی جذباتِ سفلہ و ہیجاناتِ رذیلہ کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے اگرچہ ان کے بعض کمینہ صفت احباب بدتر از اغیار کی رائے یہ تھی کہ بت ہائے طناز مزین از صفاتِ گوناگوں کہ جو کارخانۂ قدرت میں جذبات و ہیجاناتِ مذکورہ کی انگیخت کی علتِ اولیٰ بنتے

ہیں کہ نظامِ فطرت یہی ہے درحقیقت خود ہی بوجوہ مرحوم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ (راقم ایسی کسی بھی رائے کو قابلِ نفریں گردانتے ہوئے اس پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے)

رحلت سے پیشتر مرحوم اپنے ایک ژولیدہ فطرت، عطائی مریض کی رطوبتِ امعائی برآمداز معدہ کے علمی موضوع پر اپنی تحقیقات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر اس کی اقامت گاہ تک جا پہنچے مگر عطائی مذکور سے بالمشافہ تحقیقی گفتگو سے پیشتر ہی اس کی دخترِ زہرہ جمال کے جمال زہد شکن وغیرہ سے گھائل ہو کر تمام ہوئے۔ ہمیں ان سے ہرگز ایسی امید نہ تھی.........بس بس عزیز از جان ناصر۔ نہیں بلکہ پیارے ناصر اب مزید بک بک نہیں کروں گا لیکن تم تو جانتے ہی ہو کہ بک بک بالعموم اور متروک اردو میں بالخصوص میری کمزوری ہے۔ اس لیے جی نہ جلاؤ۔ میں مطلب کی بات پر آرہا ہوں۔

کسی خط کی صورت میں غالباً یہ تمہاری پہلی تحریر ہے جو آج یہاں جل پتھری پہاڑی کے نیچے بیٹھ کر میں نے پڑھی۔ یہ پہاڑی کیا ہے؟ اور یہ مقام کیا ہے یہ سب میں تمہیں ملاقات پر تفصیل سے بتادوں گا لیکن اتنا سمجھ لو کہ جب میں نے تمہارا خط پڑھنا شروع کیا تو یہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی مگر جوں جوں خط پڑھتا گیا ہر طرف اندھیرا چھانے لگا اور بعض مقامات پر تو اتنا گھٹاٹوپ ہوگیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ تمہیں کسی تاریک سرنگ سے گزرتے دیکھ رہا ہوں اور اگر تم مڑ کر دیکھو گے تو پتھر کے ہوجاؤ گے۔ آرفیس اور یوری ڈائی سی کی دیومالائی کہانی لمحے بھر کے لیے ذہن میں آئی۔ لیکن لعنت بھیجو دیومالا پر سیدھی صاف حقیقت یہ ہے کہ تم مارے گئے ہو۔ اسی حقیقت کو میں نے ابھی شروع میں ذرا قابلِ اعتراض اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔

انسان سے اس کے ہوش وحواس اور عقل وخرد چھیننے والے تباہ کُن عشق کا ذکر داستانی ادب میں پڑھا تھا اور اعلیٰ وادنیٰ ادب میں بھی دیکھا کہ ادباء وشعراء کس طرح مردوزن کے درمیان ہونے والی اس نفسی اور اگر تم پسند کرو تو نفسانی واردات سے حسبِ توفیق فکشن اور شاعری نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ چونکہ یہ سانحہ ایک دفعہ تو اپنی طرف سے ذہنِ انسانی کو مکمل طور پر تلپٹ کردیتا ہے یعنی اس کے اجزائے ترکیبی کو تہس نہس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا اس لیے عشاق زمانہ قبل از عشق کی طرف خود پلٹنے یا پلٹائے جانے کی کوششوں پر شدید مزاحمت کرتے ہیں اور یہی وقت اُن کے احباب اور بہی خواہوں کے لیے بڑا کڑا ہوتا ہے کہ بدبخت

Scanned by CamScanner

وصالِ یار کا بندوبست کرنے کی بجائے اپنی ٹکے ٹکے کی نصیحتوں اور عقلِ سلیم کی راہ دکھانے والے ایک سے ایک بڑھ کر ذلیل منطق سے عاشق کو ہراساں کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ازمنہ قدیم میں تو حضرتِ ناصح کا ایک باقاعدہ ادارہ اس مقصد کے لیے وجود میں آ گیا تھا اور جس کے بعض کارکن اعزاء و اقربا میں شامل ہو کر عشاق کی صفائیٔ قلب و نظر کی خاطر جسمانی تشدد کا سہارا لینے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ افسوس اب وہ زمانے نہیں رہے لیکن ناصح بہرحال موجود ہے یعنی کہ یہ خاکسار اور مزید کچھ لکھنے سے پہلے میں اپنا فرض ضرور ادا کروں گا۔

بے وقوف آدمی اگر تم نے اُسی وقت مجھ سے بکواس کی ہوتی کہ تم اس فراڈ عطائی کی بیٹی سے پٹ گئے ہو تو میں ہرگز تمہیں یعنی بیچ منجدھار چھوڑ کر یہاں نہ آتا۔ تم نے کھل کر بتایا تو ہوتا۔ آخر ایسی بھی کیا رازداری تھی۔ میں وہاں ہوتا تو واقعات کا رُخ اور رفتار کا کنٹرول میرے ہاتھ میں ہوتا اور تمہیں کوئے یار سے یوں ذلیل ہو کر نہ نکلنا پڑتا، جس کا حال تم نے اپنے خط کے صفحہ نمبر چار پر کیا ہے لکھتے ہو'یا در ہاؤس سے باہر نکلنے پر عجیب کیفیت تھی، زندگی میں پہلے کبھی اتنی بے انتہا بے عزتی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ طبیعت میں ذرا برابر ملال نہ تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بے عزتی کسی اور شخص کی ہوئی ہے ناصر کی نہیں......'احمق شخص جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ عشق کا رذیل ترین مقام ہے جہاں محبوب کی دُشنام اور صلواتیں بھی عاشق کے کانوں میں امرت گھولنے لگتی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جو ہمارے اساتذہ شعرا کو بڑے کشٹ کے بعد نصیب ہوتا تھا اور تم ہو کہ ایک ہی زقند میں وہاں پہنچ گئے۔ تُف ہے تم پر۔ اس حالت میں انا، عزتِ نفس اور خودداری وغیرہ عاشق کو قطعاً فالتو چیزیں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ طبِ قدیم میں کہیں پڑھا تھا کہ عاشق کو اس حالت میں پہنچا دیکھ کر اطباء بالآخر فصد کھولنے کا حکم جاری کر دیا کرتے تھے کہ مرضِ عشق کا سبب ان قدیم داناؤں کے نزدیک فسادِ خون ہی تھا۔ جہاں تک تمہارے جدید داناؤں کا تعلق ہے تو عشق کے بارے میں اُن کے نظریات تمہاری نظر سے بھی گزرے ہی ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ قبل از عشق میں اُن سے متاثر بھی ہوئے ہو۔ ایسے کوئی آدھا درجن نظریات میری نظر سے بھی گزرے ہیں لیکن میں اُن میں سے کسی سے بھی کُلی طور پر متفق نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عشق درحقیقت ایک لسانی مسئلہ ہے بلکہ یوں سمجھو کہ لسانی مسئلہ نہیں ہے۔ لسان سے اُوپر اُٹھنے یعنی ماورائے لسان ہونے کی خواہش ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات دو افراد کے درمیان بیک وقت

Scanned by CamScanner

یعنی اگر خوش نصیب ہوں تو، وگرنہ یک طرفہ صورت میں کسی ایک فرد کے اندر کسی دوسرے فرد کے حوالے سے ہستیِ محض کی سطح پر ایک انوکھے ابلاغ کی قدیم خواہش جاگ پڑتی ہے۔ مگر ہستی ہی کی قیود سے جو کہ لسانی قیود ہیں آزاد ہونا محال ہے اس لیے یہ ناممکن خواہش لسانی سانچے میں ترجمہ ہونے سے عاری ہوتی ہے اور یہ کیفیت ایک اذیت ناک انقباضِ روحانی کا سبب بنتی ہے۔ جسے تم عشق کہتے ہو۔ لازماً اسی لیے عاشق کی محبوب کے سامنے گھگھی بندھ جاتی ہے۔ اظہارِ عشق کی راہ میں حائل رکاوٹیں ہمیشہ محض ظالم سماج کی طرف سے ہی نہیں ہوتیں بلکہ اُس بین الموضوعی لسانی رکاوٹ کو پھلانگنے کی لاطائل کوشش سے بھی جنم لیتی ہیں جو...... علیٰ ہذ القیاس۔ افسوس کہ عشق کے بارے میں میرے اس لسانی رکاوٹ کے نظریے کو تم ذرا برابر اہمیت نہیں دو گے۔ بہر حال میرا حق تھا کہ میں عشق کے بارے میں اپنا یہ تین مَنّی کا نظریہ ضرور پیش کر دیتا۔

اور تین منّی یہاں جل پتھری پہاڑی پر خوبصورت اُتری ہے اور تمہارے مکتوب نے جو لکھت بازی کا بہانہ مجھے دیا ہے تو میرے اندر ایک خواہش جاگتی ہے کہ میں منظر کشی کے مزے لوٹوں مگر جو گھمبیر 'آفاقی' یا 'غیر آفاقی' مسئلہ اس مکتوب میں (یہاں میں لفظ خط بھی لکھ سکتا تھا مگر کیا کروں مجبور ہوں سیدھے لفظ کا متروک متبادل اگر میسر ہو تو اسے استعمال کیے بغیر چین نہیں پڑتا۔ پتہ نہیں کیوں اس سے ایک عجیب سا انتقامی مزہ آتا ہے) زیرِ بحث ہے وہ ایسی کسی مشق کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شدتِ تاثر کو جل پتھری سے ریزہ ریزہ کرنے کا خطرہ مول نہ لیتے ہوئے ہم پھر واپس آتے ہیں مگر عشق کا بیان بہت ہو چکا اس لیے فی الحال اُسے دفع کرو باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ تم اس گلی کے میرا مطلب ہے گھر کے دروازے اپنے اوپر بند کروا بیٹھے۔ تمہاری حماقتِ عشق کا فی الحال یہی نقصان ہوا ہے۔ کیونکہ جس ظاہری مقصد کے تحت تم وہاں گئے تھے مجھے لگتا ہے وہ بھی کوئی بہت جان لیوا حقیقی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ عزیزی یاور عطائی کے معاملات مجھے لگتا ہے کہ ایسے ہی رواروی کے سطحی تجسس میں چھوڑنے والے نہیں جو تم تلاش کرنے گئے تھے اور اسے کھو کر کچھ اور ڈھونڈ لائے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ اب میرا روگ بننے والا ہے۔ عطائی کے حوالے سے عزیز از جان ایڈیٹر صاحب کا ردِ عمل اگر چہ وہ لمحاتی تھا اور اس کا سیاق وسباق ظاہر ہے کہ میں نہیں جانتا مگر تمہارے گوش گزار کیا تھا۔ یاور ہاؤس میں اپنی اس آفت انگیز شام کا جو بھی حال تم نے لکھا ہے تمہاری ناکارہ قوتِ بیانیہ کے باوجود مجھے

پریشان کر رہا ہے۔ ایک بات تو واضح ہے کہ زہرہ اپنے باپ کے حوالے سے کوئی خوف اپنے دل میں پالے بیٹھی ہے مگر کس بات کا خوف، ظاہر ہے ابھی نہ تم جانتے ہو نہ میں اور نہ ہی وہ بھی جانتی ہے ورنہ یقیناً اس کا ردِعمل وہ نہ ہوتا جو تم نے بتانے کی کوشش کی ہے۔ بُرا یہ ہوا کہ تم خود ہی سب کھیل بگاڑ کر آ گئے۔ لیکن ظاہر ہے تم تو اپنے آپے میں نہیں تھے۔ یہ تم نے کیا لکھا ہے 'میرے اندر ایک عجب سی خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس لڑکی کو فوری طور پر کوئی اذیت پہنچاؤں' کیا ہوا تھا کوئی سادیت پسندی کا دورہ پڑ گیا تھا تمہیں۔ بہر حال اس موضوع پر ابھی کچھ کہنا عبث ہے لیکن میں نے دو فیصلے کیے ہیں وہ سُن لو۔ اول: یاور عطائی نامی اس شخص کی گزشتہ زندگی اور موجودہ شب و روز کی کرید اب لازم ٹھہر گئی ہے۔ یہ ایک دلچسپ سرگرمی ہو گی میں ابھی سے اپنے اندر مہم جوئی کی ترنگ محسوس کر رہا ہوں۔ دوم: ہجر و فراق کی جانکنی سے بلبلا کر تم اس معاملے میں فی الحال کوئی پنگا نہیں لو گے بلکہ میری آمد کا انتظار کرو گے۔ کیا عجب آگے چل کر پردۂ غیب سے کچھ اچنبھا ظہور پذیر ہو اور عزیزہ زہرہ سے تمہاری قربت لازم ٹھہر جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تم پوچھتے ہو کہ میں ان پتھریلے علاقوں میں آ کر کہیں پتھر تو نہیں ہو گیا کہ ایک ماہ سے یہیں جما بیٹھا ہوں۔ واقعی پچھلے دس سالوں میں سنمیال میں میرا یہ طویل ترین قیام ہے۔ بڑے شہر سے اتنی بڑی غیر حاضری پہلے کبھی نہیں ہوئی لیکن اس کے پیچھے بھی ایک حکمت ہے اور یہ حکمت تمہیں مفصل سننا ہو گی گو کہ خطوط کو دو صفحات سے زیادہ طویل کرنا میرے نزدیک پرلے درجے کی بدتمیزی ہے لیکن تمہارے سات صفحات کے جواب میں اب کچھ تو لکھنا ہو گا اس لیے اب جگتو ......میں یہاں آیا تو اس لیے تھا کہ ماں کی نگرانی میں صدقہ اُتروا دوں کیونکہ میری سلامتی خاندان کی ایک خاتون کے خوابوں میں بڑی باقاعدگی سے خطرے میں پڑ رہی تھی۔ اس خاتون (جو کہ میرے بڑے بھائی کی بیوی کی چھوٹی بہن ہے) کے ڈراؤنے خوابوں کو خاندان میں الہام اور مکاشفہ سے کم اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس لئے جب صدقے کا کالا بکرا ذبح کیا گیا تو اچانک ماں زار و قطار رونے لگی، میرا دل دہل گیا لیکن بڑے شہر کا پالا پوسا جو خبیث بندہ میرے اندر ہے اس لئے بے ساختہ ہنس پڑا۔ اندر ہی اندر۔ لیکن پھر اندر ہی اندر کسی نے میرے اُوپر لعنت بھیجی جیسے میں کسی مقدس مقام کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا تھا، اب مجھے یوں محسوس ہوا کہ سامنے کالا بکرا نہیں بلکہ خود ذبح ہوا پڑا ہوں۔ ماں مجھے چمٹا رہی تھی اور یقین جانو اس سارے منظر میں میرے رونگٹے

Scanned by CamScanner

کھڑے ہو گئے۔ سردی کی لہر جیسے کلیجے سے نکلی اور لرز اگئی۔ گھر کے کھلے صحن میں دوپہر کے سورج کی تیز دھوپ میں سب گھر والوں کے ایک ذی روح کی موت سے پتھرائے ہوئے چہروں نے مجھے ڈرا دیا۔ جو چند خیال میرے ذہن میں اُس لمحے آئے اور اب مجھے یاد آتے ہیں وہ تمہیں لکھتا ہوں۔ میں نے اس وقت سوچا کہ اور اب یہ الفاظ بھی وہی ہیں 'آسیبی لمحوں کا ہول تیز دھوپ میں اور حقیقت کی روشنی میں بھی گھات لگا تا ہے اور اچانک پیچھے سے آ کر دبوچ لیتا ہے۔ سیاہ اور ٹھنڈا پُر ہول لمحہ جو ذبح کیا ہوا کالا بکرا ہے۔ سورج میں رکھا ہے۔' یہاں سے میرا ذہن پھر بھٹکا اور میں سورج کی پوجا کرنے والے قدیم میکسیکو کے مایا انڈینز میں چلا گیا جو انسانی قربانی دیتے تھے اس طرح کہ زندہ جوان جسم کا سینہ چیر کر اُس کا دل دبوچ کر دھڑکتا باہر کھینچ لیتے تھے۔

یہ ایک سراسیمہ کر دینے والی کیفیت تھی۔ جو بظاہر جلد ہی ختم ہو گئی کہ اب ہر طرف کیفیت بدل گئی تھی اور ہر کوئی خوش تھا مگر اس کیفیت کا اثر دیر تک میرے اوپر باقی رہا اور میں گھر والوں کے تحفظ اور بلا ٹلنے کے اُس پُر مسرت اظہار میں شرکت نہ کر سکا۔ مجھے یہ عجیب احساس ہو رہا تھا کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے اور رسم میرے لیے ادھوری ہی رہی ہے۔ گھر والوں کے خوش ہونے پر گو کہ مجھے خوشی ہو رہی تھی شاید......تو عزیزم یہ ہوا میرے ساتھ اس دن مگر ابھی اور بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ تم نے سات صفحات کا المیہ بھیجا ہے تو جواباً کم از کم دس صفحات کا حُزنیہ پیش کرنا میرے اوپر واجب ہے۔ اس لیے اگر تمہیں اس وقت کسی اور مصروفیت کی پریشانی ہے تو باقی خط پھر پڑھ لینا۔"

کبیر نے کاغذوں کا ہولڈر اور پنسل ایک طرف رکھی اور مزید کچھ لکھنے سے پہلے دائیں ہاتھ کو دو تین بار زور زور سے کھولا اور بند کیا جیسے انگلیوں میں لکھنے کی تھکان مٹانا چاہتا ہو۔ سورج اب جل پتھری پہاڑی کے پیچھے اُتر رہا تھا اور اس کا سایہ جنڈ کے درختوں کے اپنے سایے کو بھی ٹھنڈا کر رہا تھا اور مشرق میں نمک کی سرخ پہاڑیاں اب ترچھی کرنوں میں بھوری ہو رہی تھیں۔ کبیر کی نظر ہولڈر کے پاس ہی پڑی اس چھوٹی سی پوٹلی پر پڑی جس میں ہر صبح جل پتھری تک آنے کے لیے گھر سے نکلتے وقت اُس کی ماں اُس کے بار بار انکار کرنے کے باوجود کم از کم تین آدمیوں کی بھوک برابر کھانا ضرور باندھ دیتی تھی۔ سرخ چیونٹیاں آج بھی پوٹلی کے کپڑے میں 'تھندے' کی خوشبو سے ہلکان ہو رہی تھیں اور اسے چوس جانے کے لیے بے تابانہ جھپٹ رہی تھیں۔ کبیر نے پوٹلی اُٹھائی اور ہاتھ سے تھپتھپا کر چیونٹیوں کو جھاڑ گرایا اور پھر اپنے اس معمول کے علم پر مسکرایا کہ کھانا

Scanned by CamScanner

اندر کاغذوں میں محفوظ لپٹا ہے اور چیونٹیوں کے منہ کا فارمک ایسڈ جو زہریلا ہوتا ہے خوراک تک نہیں پہنچ پایا ہوگا۔ پھر اس نے گزشتہ تین چار ہفتوں کے اپنے اس معمول کے مطابق ہی پوٹلی سے کھانا برآمد کیا اور ایک آدمی کی بھوک جتنا چھوٹے چھوٹے لقموں میں اور ایک بے نام سے تاسف سے اُسی وقت کھالیا۔ اس نے تڑے مڑے کاغذوں میں رکھی باقی خوراک کو اٹھایا اور جنڈ کے جھنڈ سے کچھ دور پھلائی کے اس درخت کے نیچے رکھ آیا۔ جہاں اپنے معمولات خوب سمجھنے والا ایک پہاڑی کوا کافی دیر سے اِن واقعات کا جائزہ لے رہا تھا اور جواب اس کی توقع کے عین مطابق ختم ہوئے تھے۔ دھاری دار چھوٹا چھپکلا کاغذوں کی سلوٹوں میں سے ہو گزرا مگر پراٹھوں اور آلو انڈوں کے سالن جیسی نامانوس رکاوٹوں میں اس نے کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور ایک طرف سے ہو کر نکل گیا۔ کوا البتہ پھلائی کی ٹہنی سے بے آواز اُڑا اور کھانے سے کچھ دور اتر آیا پھر کسی بے صبرے پن کا مظاہرہ کیے بغیر پُراعتماد قدم اُٹھاتا بڑی رعونت سے کھانے کی طرف بڑھ آیا۔

''کوا ایک معقول پرندہ ہے'' کچھ فاصلے پر کھڑے کبیر نے مزے سے سوچا۔ ''خاص طور پر یہ پہاڑی کوا تو اپنے جاہ و جلال میں سکندرِاعظم سے کم نہیں'' کبیر نے مرعوبیت سے پرندے کی طرف دیکھا۔ ''پتہ نہیں کیوں پرندوں کی اس نسل کو لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ حالانکہ اس کا مکمل سیاہ ہونا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔'' ''سکندرِاعظم'' نے اب آلو انڈوں میں اپنی خصوصی دلچسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کبیر مسکرایا اور پھر جل پتھری کی طرف چلا گیا۔ پانی کا قطرہ لبالب پیالے کی شفاف سطح پر گرا اور چھوٹے سے دائرے میں بنی لہریں فی الفور ختم ہوگئیں ''ایسے ہی اگر کوئی پتھر تالاب میں گرتا تو کتنے ہی بڑے دائرے کی لہریں پیدا ہوتی رہتیں اور دیر تک بکھرتی رہتیں۔ عمل ایک ہی لیکن چھوٹا بڑا ہونے سے نتیجہ کتنا مختلف ہو جاتا ہے'' کبیر نے سوچا اور پیالہ اُٹھایا اور بھرپور پی لیا۔ جل پتھری کا جل رس وہ ہمیشہ پورا پیتا تھا۔ خواہ پیاس سے بڑھ کر ہی کیوں نہ ہو۔ وہ پانی بچا کر نیچے پھینکنے کا تصور اسے گناہ کبیرہ سے کم نہ لگتا تھا۔ ''جو قطرہ قطرہ اتنی مشکل سے اکٹھا ہوتا ہے اسے اُٹھا کر پھینک دینے سے بڑا جرم کیا ہوگا'' ایسے موقعوں پر وہ اپنے آپ سے کہا کرتا تھا۔

اس نے پیالہ واپس رکھا اور چٹان سے دور ہٹ آیا اور شمال کی طرف نظریں اُٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ نیچے وادی میں سنمیال کے گھروں سے اُٹھتا دھواں پہاڑی پر اس کی اپنی بلندی سے کچھ

Scanned by CamScanner

ہی نیچے وادی میں معلق سا ہو گیا تھا اور سہ پہر کی ترچھی دھوپ میں کسی متحیر کر دینے والے سرمئی بادل
کی صورت نمایاں ہو گیا تھا۔ کبیر نے اس بے صورت، صورت کو دیکھا اور قبولیت کا گہرا نشاں
کے اندر اُتر گیا ''یہ دھواں جو دھوپ میں چمکتے سرمئی غبار سا ہے اور وادی کی شفاف ہواؤں میں
بے تکان تیرتا ہے، دنیا کی حسین ترین چیز ہے۔'' ترچھی گرتی کرنوں میں چیزوں کے سائے اتنے
واضح تھے کہ ٹھوس نظر آتے تھے اور ہر شے کے ہونے کے احساس کو کچھ اور بھی گہرا کرتے تھے مگر ہر
شے کے اپنی اپنی جگہ اٹل ہونے کا احساس اُس لمحے کبیر کو ہستی کے بوجھ تلے دبا کر بے سانس نہیں
کرتا تھا۔

'دنیا۔ اچھی۔ ہے۔' کبیر اپنی رگوں میں دوڑتا لے کر ایک گول ملائم پتھر پر بیٹھ گیا اور ایک
تازہ خوشگوار رواں دواں سانس لیا اور یہ جانا کہ سانس لیا ہے اور سوچا ''کوئی تو شے ہے جو مجھے ان
نتھرے ہوئے شیشہ لمحوں کے سحر سے دُور اُدھر کھینچ لے جاتی ہے۔ جہاں شور مچاتے شہر ہیں اور گلا
پھاڑتے لوگ ہیں اور انہیں ڈھونے والی چیختی چلاتی گاڑیاں ہیں اور دیواریں ہیں جن کے ساتھ
سینکڑوں لوگوں کے پیشاب سے جلی زمین بدبو پھینکتی ہے۔ شک اور خوف میں ڈوبے ہجوم ہیں اور
کامیاب لوگوں کا ظلم ہے اور لالچ سے ٹپکتی رال سے لتھڑی مکروہ شکلیں ہیں اور فریب ہے اور دغا
ہے مگر پھر بھی میں اُدھر کھنچا چلا جاتا ہوں'' کبیر نے گہراؤ سے آگے اُفق میں اتھاہ فاصلوں کی دھند
میں دیکھا اور اس کی نظریں تھک گئیں اور پھر اسے ایسا ہی محسوس ہوا کہ جیسے وہ کچھ بھی محسوس نہ کرتا
ہو کسی بھی وجہ کو کسی بھی سبب کو کسی بھی جواز کو جاننا چاہتا ہو، نہ سوچنا چاہتا ہو دفعتاً پگھلا دینے والی
ایک عظیم الشان کاہلی کا انزال اُس پر اُتر آیا ہو اور جیسے وہ تحلیل ہو جانا چاہتا ہو، مٹ جانا چاہتا ہو،
جیسے گرم پانی کے سمندر میں برف کا ایک ٹکڑا مٹتے مٹتے بالکل مٹ جاتا ہے۔

جب وہ چونکا اور اُن معمہ ساعتوں کے وصل سے ٹوٹ کر جدا ہوا تو دنیا پھر سے بیگانی تھی اور
اس متوحش سی جستجو کا احساس تیزی سے مٹ رہا تھا کہ ابھی پہلے آخر کیا تھا جیسے بے ہوشی سے ہوش
میں آ جانے یا نیند سے بیداری میں آنے کے بعد لمحہ بھر کے لیے لمحہ بھر پہلے کے لمحے کو پا لینے کا محال
خیال ایسے آتا ہے کہ جیسے کبھی نہیں تھا۔

کبیر ملائم پتھر کی نشست سے اُٹھ کر واپس اُسی جگہ آیا جہاں ہولڈر میں لگے کاغذوں میں
ناصر کے نام لکھا اُس کا ادھورا خط پڑا تھا۔ شام آ رہی تھی۔ اس نے اپنی لکھنے کی چیزوں کو لاتعلقی سے

Scanned by CamScanner

کپڑے کے تھیلے میں ڈالا۔ تحریروں کو ادھورا چھوڑ دینے اور انہیں تکمیل تک لے جانے سے پہلے ہی خالی ہو جانے کی نامردی کا کھٹا کسیلا ذائقہ حلق سے منہ کو آتا تھا۔ اس نے بے رحمی سے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ ''خیر یہ خط تو میں ضرور مکمل کروں گا۔'' تھیلا اُٹھائے اور سر جھکائے ڈھلوان سے نیچے گاؤں کی جانب اترتے راستے کی طرف قدم اُٹھاتے اُٹھاتے اس نے اچانک ایک چھوٹے سے گول پتھر کو دائیں پاؤں کے بوٹ سے پوری قوت سے ٹھوکر لگائی اس خواہش سے کہ پتھر کھائی کا کنارہ عبور کر جائے گا اور پھر تیزی سے نیچے ہی نیچے گرتا چلا جائے گا مگر پتھر گھراؤ سے ذرا ادھر ہی اٹک کر ساکن ہو گیا اور کبیر کو ایک سوالیہ مگر شدید خواہش نے گھیرا کہ وہ اس طرف آگے بڑھ کر اسی پتھر کو ایک اور ٹھوکر لگا کر اسے نیچے گرا دے یا ایسا نہ کرے۔ پھر جب اپنی اس ساری حرکت اور خواہش کے بے انتہا احمقانہ پن نے اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا تو وہ دوسری طرف سمیاں کی جانب اُترتی نشیب میں نیچے جا رہا تھا۔

O

''سارا دن وہاں ٹیکری پر چڑھ کر اکیلا بیٹھا وہ کیا کرتا رہتا ہے'' کبیر کی ماں کے لفظوں میں دکھ تھا جسے اُس کے بیٹوں کے باپ مہدی خان نے پہچان تو لیا مگر چپ رہا، بڑا بیٹا تیزی سے بولنے لگا جیسے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والا وہی رہا ہو۔

''وہاں اوپر جل پتھری کے ساتھ جنڈ نہیں ہیں وہاں چھاؤں میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا ہے۔''

مہدی خان ہنسا۔ اس کی ہنسی خشک اور مختصر تھی۔ پھر وہ گہرے اسرار بھرے لہجے میں کہنے لگا ''نہیں وہ لکھتا ہے۔''

''تو ایک ہی بات ہوئی ناں۔ پڑھتا لکھتا ہے۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں''۔ راسب نے بے صبری سے اصرار کیا۔ ''اس کا یہ پڑھنا لکھنا کب ختم ہوگا'' ماں کسی سے بھی مخاطب ہوئے بغیر بولی اور اس نے چولہے میں جلتی کچھ لکڑیاں پیچھے کھینچ لیں جن کی لاٹ دیگچی کے کناروں کو سیاہ کرنے لگ پڑی تھی۔ اُبلنے سے پہلے پانی سُوں سُوں کر رہا تھا۔ چائے بن رہی تھی۔ کبیر کے آنے کے بعد گھر میں چائے زیادہ بننے لگی تھی۔ مہراں نے سوچا کہ صبح جب راسب نمک کی کانوں میں

اپنے کام پر جانے لگے گا تو وہ اُس سے کہے گی کہ وہ چائے کا ایسا ایک ڈبہ وہاں قریبی قصبے کے بازار سے ضرور لیتا آئے۔ جو چائے کبیر پیتا تھا وہ سمیال کے اکلوتے دوکان دار بابے سراج کے پرچون کے ذخیرے میں شاذ و نادر ہی ملتی تھی۔

''یہ چائے تو امیر لوگ پیتے ہیں'' سراج نے ایک دن رازدارانہ لہجے میں مہدی خان کی گھر والی مہراں کو بتایا تھا اور مہراں نے حیران سا ہو کر سوچا تھا '' کہیں ایسا تو نہیں کہ کبیر بڑے شہر جا کر امیر ہو گیا ہو اور ہمیں پتہ ہی نہ چلا ہو'' پھر اس نے پکا سوچا تھا کہ شام جب وہ گھر آئے گا تو اس سے پوچھے گی کہ کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا مگر شام ہونے اور کبیر کے گھر آنے سے پہلے ہی وہ بھول گئی تھی۔

اُس وقت جب وہ شروع رات میں گھر کے صحن کے کونے میں بنی رسوئی میں بیٹھے چولہے کی آگ تاپتے تھے یہ پریشان سا خیال پھر اس کے جی کو اُچاٹ کر گیا۔ سمیال نرم اور ملائم اندھیرے سے بھرا تھا اور آدھے سے زیادہ سو بھی گیا تھا۔ کہیں کہیں اونچے گھروں کے دروازوں کی جھریوں میں اِکا دُکا روشنی بس بُھول چُوک کر جھانکتی تھی مگر ستارے اتنے زیادہ تھے اور اتنے روشن تھے کہ جیسے آسمان میں آگ لگا رہے تھے۔ اسی وقت صحن کے پیچھے بنے دو کمروں کے عقب میں بھنڈر کی جانب بنے چھوٹے سے کچے کمرے میں بیٹھے کبیر نے بھی ستاروں کے بارے میں ایسا ہی سوچا اور یہ بھی کہ اپنے اپنے آسمان کی بات ہے۔ کچھ آسمان ستاروں کو اندھا کر دیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔

'' کہیں ایسا تو نہیں مہدی خان کہ کبیر بڑے شہر جا کر امیر ہو گیا ہو اور ہمیں پتہ ہی نہ چلا ہو'' مہراں نے چائے کی دیگچی چولہے سے نیچے اُتارتے ہوئے اچانک سوال کیا۔ راسب اور مہدی خان باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں کی آنکھیں اس عورت کے لیے اپنی اپنی پیار بھری شرارت سے چمک گئیں اور پھر وہ ہنس پڑے کہ یہ معصوم اور پیاری عورت کیسی نادانی کی باتیں کرتی ہے۔

'' بھلی مانس کیسی بھول پنے کی باتیں کرتی ہو۔ وہ اگر امیر ہو گیا ہوتا تو کیا ہمیں نہ بتاتا۔'' مہدی نے کہا۔

''واہ ماں۔ اگر وہ پیسے والا ہو گیا ہوتا تو ہم یہاں ہوتے اور میں روز اُدھر نمک کی سلوں میں فلیتے لگا رہا ہوتا۔ میں تو اس وقت اُدھر اپنی پک اپ گڈی چلا رہا ہوتا۔ ڈھرک سے سابر تک کے

Scanned by CamScanner

روٹ پر ہیں"

"نہیں اس وقت تک تو تم گڈی بند کر کے گھر آ چکے ہوتے" مہدی نے چھیڑنے والے انداز میں راسب کو کہا اور اس نے بُرا مناتے ہوئے منہ پھلا لیا۔

"تم دونوں بھائیوں سے اچھا تو پھر افضل ہی رہا۔ فوج میں چلا گیا۔ عزت کی نوکری پر" مہراں نے آخری نتیجے پر پہنچ کر کہا۔

"اور بیوی کو لے کر ایک طرف ہو گیا۔ خود غرض" راسب نے سارا غصہ منجھلے بھائی پر نکال دیا اور پھر کہنے لگا۔

"ویسے بھی ماں کبیر جیسے جو لوگ ہوتے ہیں ناں ان کے پاس مال دولت نہیں ہوتی۔ وہ جو ہمارا تنخواہ والا کلرک ہے ناں دفتر میں جس کے ماتھے پر بڑا سا بھورا تل ہے وہ کہنے لگا ایک دن کوئی رسالہ پڑھتے پڑھتے ایسے ہی منہ اُٹھا کر۔ میں سامنے ہی کھڑا تھا...... راسب خان پڑھنے والے سدا غریب ہی رہتے ہیں"۔

"لکھنے والے" مہدی خان نے اپنے کسی پختہ ذاتی قیاس کے بل پر بھورے تل والے کلرک کے بیان کو فوری طور پر رد کیا اور راسب پھر جھنجھلا گیا۔

"ایک ہی بات ہے ابا...... ویسے ایک بات ہے ماں"

"کیا" مہراں نے تیسری پیالی میں چائے انڈیلی جو زیادہ صاف تھی اور جس کے کنارے ٹوٹے ہوئے نہیں تھے اور جو کبیر کے لیے تھی۔

"اس دفعہ کبیر کافی دیر تک ٹھہرا ہے ہمارے پاس۔ ایک ماہ تو ہو گیا اسے آئے ہوئے، پہلے تو بس سال میں دو تین بار آتا تھا اور دو تین دن ہی ٹھہر کر چلا جاتا تھا......"

"میرے لیے تو جیسے آیا ہی نہیں۔ کوئی بات ہی نہیں کرتا۔" مہراں نے آہ بھری

"بھلی مانس اب تجھ سے وہ بات کرے بھی تو کیا کرے۔ تیرے اپنے بکھیڑے ہیں اس کے اپنے۔ لیکن وہ جو کبھی آتا ہے ناں تو یہ سمجھ لے بس تیرے لیے آتا ہے......" مہدی نے کہا۔

"وہ تو مجھے پتہ ہے" مہراں کے لہجے میں کہیں ہلکا سا احساس فخر تھا "تو چلو وہ کوئی دو گھڑی تمہارے پاس ہی بیٹھے تم ہی سے کوئی بات کر لے......"

"کرتا ہے کیوں نہیں کرتا مگر دل کی بات نہیں کرتا۔ لگتا ہے اس کا دل وہیں رہتا ہے بڑے

Scanned by CamScanner

شہر میں۔ جہاں میں نے اسے بھیجا تھا'' اور مہدی خان کے لفظوں میں کوئی تاسف نہ تھا بس ایک خنک سا غم تھا۔ وہ اُداسی سے مسکرایا اور ماضی میں دیکھنے لگا۔ ''اس کا دسویں کا نتیجہ آیا تو ما نک وال گیا میں اُس کے سکول۔ یہ میرے ساتھ تھا۔ اس کے ماسٹر سے ملا کرم داد سے۔ میں چاہتا تھا یہ فوج میں جائے مگر کرم داد کہنے لگا مہدی خان تمہارے بیٹے نے اتنے زیادہ نمبر لے لیے ہیں کہ یہ اب یہاں نہیں رہ سکتا ان علاقوں میں۔ اسے بڑے شہر میں پڑھنے کے لیے بھیج دو۔ تو میں نے بھیج دیا۔ میں نے کوئی غلط تو نہیں کیا تھا''۔

مہراں نے چائے کی دو پیالیاں راسب اور مہدی کے سامنے رکھیں اور تیسری ہاتھ میں پکڑے اُٹھ کھڑی ہوئی ''میں اسے چائے دے آؤں'' اور رسوئی سے اندر کمروں کی طرف چلی گئی۔

''یہ چٹے سائیں کا کیا قصہ ہے ابا'' مہراں کے جاتے ہیں راسب نے مہدی سے پوچھا۔

''چٹے سائیں کا قصہ؟'' مہدی نے وضاحت مانگنے کے لہجے میں کہا۔

''اپنا کبیر۔ سُنا ہے گاؤں کے بڈھوں سے پوچھتا پھرتا ہے کہ چٹا سائیں کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ میں ماں کے سامنے پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہمی ہے پتہ نہیں کیا سمجھ لے۔''

مہدی خان ہنس پڑا ''اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا کہ چٹا سائیں اصل میں کون ہے ......اور میں نے اسے بتا دیا جو مجھے معلوم تھا۔ ہو گا اس کا کوئی مسئلہ......''

''تم نے پوچھا نہیں کہ کیوں پوچھتا ہے......؟''

''نہیں۔ ہو گی کوئی بات۔ شاید اس نے کچھ لکھنا ہو۔''

راسب نے لمبی سی ہوں کی جو اس بات کا اعلان تھی کہ وہ اصل بات سمجھ گیا ہے ''یہی بات ہے اُسے کچھ لکھنا ہو گا چٹے سائیں پر۔ ویسے چاچا نور داد بتا رہا تھا......''

''کیا؟'' مہدی کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

''کہ چٹا سائیں اس سال ضرور مر جائے گا۔''

مہدی خان ہنسا ''ایسے ہی کفر بکتا رہتا ہے وہ مغز پھرا۔ کون جیے گا کون مرے گا رب کے سوا کون جانتا ہے۔''

Scanned by CamScanner

مہراں چائے کی پیالی کبیر کی چارپائی کے پائے کے قریب رکھ کر واپس جانے کے لیے مُڑی تو کبیر نے کہا ''ماں بھنڈر میں پانی کب آئے گا؟''

مہراں مسکرائی وہیں رُکی اور کبیر کو دیکھتے ہوئے بولی ''تجھے پتہ نہیں؟''

مہراں گھر کا وہ چھوٹا سا بے ہنگم چوکور شکل کا کمرہ کھیتی باڑی کا سامان سنبھالنے کے لیے تھا مگر کبیر جب بھی آتا اُس کا اصرار ہوتا کہ وہ اُسی کمرے میں سوئے گا اور اس بات پر ہر دفعہ ایک چھوٹی موٹی بحث ضرور چلتی۔ خاص طور پر راسب کی بیوی گلنار اسے بڑا مجبور کرتی کہ وہ آئے تو اس کمرے میں سویا کرے جو آئے گئے کے لیے مخصوص تھا اور جسے وہ زیادہ تر بند رکھتی تھی اور صرف کبھی صفائی کے لیے کھولتی تھی لیکن کبیر کی ضد کے آگے آخر اسے بھی ہتھیار ڈالنے پڑتے اور پھر دونوں ساس بہو مل کر اس کے پسندیدہ کونے کو ہی کچھ قابلِ رہائش بنانے میں جت جاتیں۔ بیرونی دیوار کے ساتھ جس میں بھنڈر کی جانب ایک چھوٹے سے دروازے جیسی کھڑکی تھی، چارپائی بچھانے کے لیے کبیر کی مرغوب جگہ تھی۔ چارپائی کو دیوار کے ساتھ لمبائی کے رُخ جوڑ کر اور پھر دیوار کے ساتھ تکیہ لگا کر جب وہ بیٹھ جاتا اور اس کے دائیں کندھے سے اوپر روشن لالٹین ایک کیل سے لٹکا دی جاتی تو مہراں سمجھ جاتی کہ اب وہ جتنی دیر بھی اُن کے پاس رہے گا سکھ میں رہے گا۔

بھنڈر اس وقت رات میں کبیر کو نظر نہ آتا تھا مگر وہ پہاڑی برساتی نالہ مکان کے پیچھے کچھ ہی دور نیچے اُترائی میں تھا اور اس کی خشک ریتلی تہہ سارا سال پانی کی منتظر رہتی تھی اور اُس کے کنارے دونوں اطراف میں ڈھکیوں اور کسیتوں کے نشیب و فراز میں سنمیال کو دو حصوں میں بانٹ دیتے تھے۔ کبیر نے کھڑکی کے باہر گہرائی میں اور اس وقت اندھیرے میں خشک نالے کی موجودگی کے احساس کو اور آنکھوں کو چھوتی سنمیال کی نرم روشنیوں اور کہیں دور سے آتی پھلاہی کے دھوئیں کی مدھم سی خوشبو سے اپنا منہ موڑا اور کھڑکی کو بند کرتے ہوئے پلٹ کر مہراں سے کہنے لگا۔

''مجھے معلوم ہے ماں کہ بھنڈر میں پانی کب آتا ہے''

مہراں کچھ حیران سی ہوگئی اور کبیر کو کھلی کھلی آنکھوں سے تکنے لگی اور کبیر کو ماں کی کچھ نہ سمجھ پانے پر یکدم کھل جانے والی وہ آنکھیں تھیں جو سنمیال کے نام پر یاد آتی تھیں کبھی بڑے شہر میں چلتے چلتے کسی سڑک کا موڑ مڑتے۔ کیفے غلام باغ میں ناصر کے ساتھ بیٹھے بیٹھے یا اپنے گھونسلے میں رات کبھی اچانک سنمیال اس کے اندر جاگ پڑتا تھا۔ کچھ دھندلی اور کچھ روشن تصویروں کی خوشبو

کی مانند جل پتھری سے ٹپکتے کبھی نہ رُکنے والے قطرے۔ جنڈ کے درختوں کا سایہ۔ بھنڈر کی ریت۔ شام کے وقت جلتی سمیال کے گھروں میں آگ کے دھوئیں کی خوشبو۔ وہ سب خوشبوئیں مل کر ایک گہرا پس منظر بناتی تھیں جیسے کسی عطر فروش کی دوکان میں درجنوں خوشبوؤں کے مدغم ہو جانے سے خوشبو کی ایک فضا بنتی ہے مگر اس میں سے اُٹھتی اپنے آپ کو نمایاں کرتی کوئی ایک خوشبو الگ تھلگ پھر بھی پہچانی جاتی ہے اور کبھی پر بھاری ہو جاتی ہے وہ خوشبو جو ماں کی آنکھوں میں تھی جب وہ حیران ہوتی تھی۔

''اگر تمہیں پتہ ہے تو پھر پوچھتا کیوں ہے؟'' وہ کہہ رہی تھی۔

کبیر کے دل میں اک دم سے شرارت بھر گئی کہ وہ ماں کو اور بھی حیران کرے گا۔

''اس لیے ماں کہ جب مجھے کسی بات کا پتہ ہوتا ہے تو اصل میں مجھے پتہ نہیں ہوتا اس لیے میں پوچھ لیتا ہوں تا کہ پتہ چل جائے۔'' اس اوٹ پٹانگ پر مہراں کی آنکھیں اتنی کھلیں کہ اس سے آگے کھل نہ سکتی تھی اور کبیر اندر ہی اندر کھنکنے لگا۔

''کیا کہا تم نے یہ''

''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں'' وہ جلدی سے بولا ''تم جاؤ ماں اب آرام کرو'' مہراں جانے کے لیے مڑی ''یہ چائے پی لو، ٹھنڈی ہو جائے گی'' اور حیرت کے ساتھ اب کچھ تشویش سے اسے دیکھ کر چلی گئی۔

کبیر نے ٹھنڈی سانس لی اور اُس حیرت پر سوچا کہ جو انسانوں میں ازلی چلی آتی ہے اور شاید اصل انسانی صفت یہی ہے۔ ارسطو کی دانش کہ 'فلسفے کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے' میں اس نے احتیاط سے یہ اضافہ کرنا چاہا کہ فکشن کا آغاز بھی حیرت سے ہوتا ہے اور ایسی ہی ایک اور حیرت تھی جس کا سامنا اسے پچھلے دنوں سمیال میں ہوا تھا اور جس نے اسے ایک ماہ تک وہاں ٹھہرنے پر مجبور کر دیا تھا جو چٹے سائیں کا قصہ تھا اور جس کے بارے میں وہ ناصر سے خط میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ خط جو ادھورا رہا تھا۔

اس نے چونک کر چارپائی سے نیچے جھکتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور ہونٹوں سے لگالی۔ کافی میٹھی ہونے کے باوجود چائے اسے اچھی لگی۔ پیالی ایک طرف رکھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ کچھ بھی لکھنے کے لیے بیٹھنے کو تیار ہے۔ دیوار کے ساتھ تکیے کی نشست خوب

Scanned by CamScanner

جانے کے بعد اس نے کاغذوں کا ہولڈر بائیں زانو کے ساتھ رکھا اور کاغذ کو دیکھا جس کے اوپر
نصف تک ناصر کے نام اُس کا اُس دن کا خط پہنچا تھا۔ لالٹین کی روشنی سفید کاغذ کی سطح کو گہرا نارنجی
سنہرا رنگ کرتی تھی۔ کبیر نے قلم اٹھایا تو ایک گھٹی گھٹی سی بے چینی اُس کے سینے میں رُکی پھر فیصلہ
کرنے کی بجائے کہ کیا یہ وہی مانوس سی گھٹن ہے جو پہلا لفظ اور پہلا فقرہ کامیابی سے لکھنے تک اور
پھر اگلے فقرے کو یقینی بنا لینے تک لکھنے والے کے اندر ڈھیٹ بنی بیٹھی رہتی ہے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا
کر کھڑکی کھول دی۔ مئی کی شروع رات ابھی سردی گرمی کی بے یقینی میں جھولتی تھی۔

گھر۔ سنمیال

دس بجے شب۔ اوپر میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ چونکہ اس خط میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی
ہے۔ اس لیے تم اگر کسی مصروفیت کے ستائے ہوئے ہو تو پہلے اُسے بھگتا لو اور پھر کبھی خالی الذہن
ہو کر بلکہ اب تو کہنا چاہیے خالی ازغمِ جاناں ہو کر جو کہ ظاہر ہے ناممکن ہے اس عریضے کی طرف
رجوع کرنا۔ تمہیں یہ مشورہ دے کر میں فوراً ہی اپنے کلامِ نرم و نازک کو جاری نہیں رکھ سکتا تھا اور یہ
لازم تھا کہ اپنے ذہن کو اُس پراگندہ خیالی سے پاک کرتا جو مجسم اسرار و اشرار یاور عطائی، اُس کی
دختر زہرہ جمال اور خود تمہاری حرماں نصیبی جیسے مضامین نے طاری کر رکھی تھی۔ چنانچہ میں نے لکھنا
بند کیا۔ آلاتِ تحریر و تصنیف ایک طرف رکھے چند لقمے خوراک کے خود لئے اور باقی سکندر اعظم
کے سپرد کیے اور اس حرکت کے بعد اپنے آپ کو بے لگام چھوڑنے کے ارادے سے ایک پتھر پر جا
بیٹھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے کامیاب اظہار کے لیے جو زبان درکار ہے وہ چونکہ ماورائے
ذہن امتدادِ ذہنی اور مکانِ موضوعی میں ہستیِ محض کے وجودِ مطلق سے ادغام جیسی وحشت ناک
ترکیبوں سے اٹی ہوگی۔ اگرچہ اس نوع کے بیانیے کی اپنی ہی ایک لذت ہے لیکن فی الوقت نہ ہی
اس کی خواہش ہے اور نہ ہی وہ اِکا دُکا زدہ روانی حاصل ہے اس لیے نتیجہ سن لو۔ جو یہ ہے کہ تمہارے
لیے خط باقی دن بھر کے لیے ادھورا ہی رہا اور میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ شاید اس لیے بھی کہ اب جو کچھ
مجھے لکھنا تھا وہ اپنے ہی لکھنے پر لکھنا تھا۔ تم شاید اس الجھاؤ سے بیزار ہو رہے ہو گے۔ تو ہوتے
رہو۔ اچھا میں پھر کہنے کی کوشش کرتا ہوں لکھنا تو مشکل ہے ہی لکھنے پر لکھنا اور بھی مشکل ہے۔ نہیں
سمجھ آئی بات۔ جہنم میں جاؤ۔ لیکن میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں ویسے

Scanned by CamScanner

ناصر آخر یہ کیا بات ہے کہ میں بظاہر استہزایہ انداز میں لیکن شاید اندر سے کہیں واقعتاً تمہیں تمہارے مرتبے سے گرانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اب اس وقت کہیں یہ تو نہیں ہو رہا کہ میں تمہارے عشق کے اس نئے تجربے سے حاسد ہو رہا ہوں۔ میں کتنا کمینہ ہوں ظاہر ہے مجھے تو علم نہیں۔ اب تو میرے ذہن میں اک دم یہ خیال بھی آ رہا ہے۔ اگر اسے خیال ہی کہیں گے اور یہ ذہن میں ہی آ رہا ہے کہ یہ شخص ڈاکٹر ناصر مردانہ وجاہت میں مجھ سے بڑھ کر نہیں اب یہ ایک زہرہ جمال عورت پر فریفتہ ہوا ہے...... اگر چہ عورت ابھی تک تو اُسے دھتکار رہی ہے (دیکھا میرا لچّا پن۔ اللہ اُس کا بھلا کرے) لیکن کہیں ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ عورت بھی اس پر مائل ہو جائے۔ اگر چہ میں اُس سے زیادہ قبول صورت مرد ہوں اور کیا میرے پاس صرف ایک خام خود لذتیت ہی رہے گی۔ یہ بھٹکاؤ اگر چہ مجھے ہلکا کر رہا ہے مگر اس ارادے کو بکھیر رہا ہے جو میں نے کچھ اور لکھنے کے لیے باندھا تھا۔ اچھا میں اپنے آپ کو سمیٹتا ہوں۔ میں ایک اور طرح سے کوشش کرتا ہوں۔

سچ پوچھو تو ناصر میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے خط لکھا اور اس طرح مجھے یہ موقع فراہم کر دیا کہ میں لکھنے میں اپنے واحد متکلم کے امکان کو بھی آزما سکوں۔ (یہ ایک شریفانہ آغاز ہے)۔ (اور اتنا بکواس بھی نہیں)۔ (یا شاید گیا گزرا بھی نہیں کہنا چاہیے) تمہیں یاد ہوگا کہ گذشتہ ملاقات پر میں نے تمہیں بتایا تھا کہ نجم الثاقب نے 'افریقہ میں آدم خور شیر کا لرزہ خیز شکار' کے حساس موضوع پر میری عاجزانہ کاوش معمول کے معاوضے پر قبول کر لی تھی اور مجھے ایک اور حساس سماجی و معاشی وسیاسی وملی موضوع تفویض کیا تھا اور ساتھ لائن بھی دے دی تھی کہ مجھے دلائل و بُراہین اور زورِ بیان کے بل بوتے پر کس نسل کی سچائی برآمد کرنی ہے۔ یہ لائن بھی بڑی کمال کی چیز ہے۔ ذرا سوچو اس سے سچ سچ لکھنے کا دھندا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ اب میں نے کچھ غور کیا جو کبھی کبھی میں کر لیتا ہوں تو پتہ چلا کہ یہ موضوع بھی شکاریات کے مذکورہ بالا موضوع جیسا ہی ہے سوائے ایک جغرافیائی اور قدرے لسانی فرق کے یعنی یہ کہ افریقہ کی بجائے اپنی دھرتی ہوگی اور آدم خور شیر کا لرزہ خیز شکار کی بجائے آدم خور شیروں کے لرزہ خیز شکار پر بات ہوگی۔ 'کا' اور 'کے' کے اس فرق سے دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ ایک سنجیدہ موضوع میں ایک شکاریاتی دانش دریافت کر لینا ظاہر ہے کہ سنجیدہ طبقات کی طرف سے ایک قابلِ مذمت ذہنی کجروی قرار پائے گا لیکن اس سے میرے لیے کام بہت سہل ہو گیا ہے اور یہ واضح ہو گیا ہے کہ مجھے دراصل اپنی اسی دریافت کی

بھرپور لی کرنی ہے یعنی یہ تھیس (آہ یہ لفظ تھیس۔ مجھے ہمیشہ اس سے انسانی مادہ تولید کی بو آتی ہے اور بوجوہ مجھے اس سے اکثر واسطہ بھی پڑتا ہے۔ اب پتہ نہیں واسطے کی میری سرگرمی اینٹی تھیس کے زمرے میں آئے گی یا سنتھیسس کے)۔ ہاں تو تھیس یہ ہوگا کہ وطنِ عزیز میں آدم خور شیروں کی کسی قسم کی کوئی نسل نہیں پائی جاتی اور جب یہ بات اظہر من الشمس ہے (لاحول ولا قوۃ) تو پھر یہ نظریہ کہ یہاں آدم خوری ہو رہی ہے ایک شرمناک بہتان ہے اور مکروہ سازش ہے تاکہ پُرامن شہریوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا کر انہیں ایسے آدم خوروں کو شکار کرنے پر آمادہ کیا جائے جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے۔ ایسے گھناؤنے عزائم رکھنے والوں کو بے نقاب کرنا اور کیفرِ کردار تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو حق گوئی و بے باکی کا یہ تحریری پراجیکٹ تھا جو مجھے مکمل کرنا تھا اور عزیز از جان ایڈیٹر صاحب نے کچھ مشکل کشا قسم کے بین الاقوامی جریدے بھی فراہم کیے تھے تاکہ وساور سے بھی سند لائی جا سکے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اور صدقہ اُتروانے کے بعد جس کا حال میں اوپر لکھ چکا ہوں، میں حق و باطل کے اسی معرکے میں جُت گیا اور تین چار دن میں ہی صداقت کا علم بلند کرتا ہوا مطلوبہ حق کی فتح کے ساتھ سرخرو ہوا اور مضمون ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ کے نام رجسٹری کروا دیا۔ اب ارادہ تو یہ تھا کہ ایک آدھ دن اور جل پتھری کا پانی پیوں اور سال بھر کی پیاس بُجھا کر پھر بڑے شہر کے صحرا کا رُخ کروں۔ مگر بارے ہوسِ زر پھر آڑے آئی۔ وہ اس طرح کہ نظر آ رہا تھا کہ حساس موضوع اور "معاصر صورت حال" کے حوالے سے عصری ڈائجسٹ مارکہ سچائی ثابت کرنے کے علاوہ کم از کم تین اور برانڈ کی سچائیوں کو بھی اُتنے ہی مدلل، پُر اثر اور پُر خلوص انداز میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اب جب یہ ٹھہر ہی گیا ہے کہ میرا قلم ہر قسم کی سچائی کے لیے برائے فروخت ہے تو پھر تردّد کیسا۔ بھلا دھندا کرنے والی گاہک کے حسن و جمال کے بارے میں کب نخرہ کرتی ہے۔ چنانچہ کام بڑھ گیا اور سمجھو کہ چند دن اور لگ گئے اور اس طرح تین مضمون تیار ہوئے۔ جو ظاہر ہے ایک ہی موضوع پر مگر تین مختلف "کومیٹمنٹوں" سے لکھے گئے تھے اور ہر ایک کے اوپر ایک مختلف حرامی نام دھرا تھا۔ کام بخیر و خوبی تمام ہوا تھا اور اہم ملکی مسائل پر لکھے گئے صداقت کے ان بے لاگ پلندوں کے الگ الگ یقینی گاہک بھی میرے ذہن میں تھے۔ ایک روزنامہ، ایک ہفت روزہ اور ایک ماہنامہ اللہ اللہ خیر سلا۔ چنانچہ اس شام میں پہاڑی سے اُتر رہا تھا تو پرندے کے پر کی طرح ہلکا پھلکا تھا اور

Scanned by CamScanner

کامیابی و تکمیل کی فضا میں اُڑتا پھرتا تھا اور ایسے موقعوں کی روایتی گنگناہٹ ناک میں لیے میں گھر آیا اور چیزیں بھی بیگ میں ٹھونس لی تھیں کہ کل صبح نکل جاؤں گا۔

اب یہ خط کوئی خط تو رہا نہیں ناصر۔ یہ کچھ اور ہی بن چکا ہے اور بنتا چلا جا رہا ہے جیسے میری اپنی اپنے اصل نام سے لکھی ہوئی ہر ''اصیل'' تحریر ادب والوں کے سانچوں اور اُن کی اصناف کا منہ چڑا رہی ہوتی ہے۔ عجیب الخلقت! میں نے کئی دفعہ سوچا ہے ناصر کہ وہ عورت کیا محسوس کرتی ہوگی جو عجیب الخلقت بچہ جنتی ہے اور اسے دیکھتی ہے۔ پیار ماں کا؟ شاید اس لیے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ کم از کم ایسا تو وہ ضرور محسوس کرے۔ دہشت۔ ترحم۔ ناکامی اور لٹ جانے کا ہلکان کرنے والا عذاب۔ شاید۔ مگر مجھے یقین ہے کہ سب سے بڑھ کر وہ شرمندگی محسوس کرتی ہے۔ خجالت اسے کچل ڈالتی ہے جب وہ اُن کی نظروں کو دیکھتی ہے جو اسے اور اس کے بچے کو دیکھتے ہیں 'یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے ہماری نسل کی کومل جون کو مسخ کر دیا۔ تم برباد کرنے والی ہو۔ تم پوری نسلِ انسانی کی مجرم ہو تم معافی کی مستحق نہیں' تو یہ خط بھی کچھ عجیب الخلقت ہو رہا ہے مگر تم سے کم از کم اتنی تو توقع ضرور ہے کہ مجھے معاف کر دو گے مگر کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں تحریر کی اس مزید گا ئنا کولجی سے باز رہوں۔ شکر ہے یہ جملہ کچھ ہلکے پھلکے استہزائیہ انداز میں سرزد ہوا اور جسم میں جو کڑواہٹ گھلتی جا رہی تھی وہ کچھ کم ہوئی۔

شام اور رات کا ایک درمیانہ وقت ہوتا ہے جسے ممکن ہے بڑے شہر کے لوگ گہری شام کہنے پر مصر ہوں لیکن یہاں سنمیال میں لوگ اسے رات ہی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ دن اور رات کے درمیان یہ 'شام' ایسے ہی کچھ لوگوں کا اُڑایا ہوا رومانی چونچلا ہے گو میں بھی اب ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ ایسے ہی غیر متعین سے وقت، میں نے چٹے سائیں کا قصہ سُنا۔ رات کے کھانے کے بعد میں گھر سے نکلا تھا ایک الوداعی سی کیفیت لیے کہ جانے اب کب ان علاقوں میں پھرورود ہو۔ میں گاؤں کی واحد دوکان کی طرف چلا گیا کہ دوکان دار کے علاوہ دن بھر وہاں بیٹھے رہنے والے قربان علی اور نورداد میں سدا یہ جھگڑا چلتا رہتا ہے کہ ان دونوں میں سے پہلے کون پیدا ہوا تھا اور اُن دونوں سے مل لینے کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف سارے گاؤں سے مل لیا بلکہ علاقے کی تاریخ کا ایک ریفریشر کورس بھی ہو گیا۔ مگر اُس رات وہ دونوں بوڑھے اپنی پیدائش کی گم شدہ گھڑیوں پر تکرار نہیں کرتے تھے بلکہ بظاہر یہ

Scanned by CamScanner

خوفناک سوال اُن کے بیچ زیرِ بحث تھا کہ چٹا سائیں کب مرے گا؟ میرے آ جانے پر انہوں نے بڑے سلیقے سے موضوع بدلنا چاہا لیکن جب میں نے بمشکل تمام انہیں یہ باور کرا دیا کہ میں نہ صرف چٹا سائیں کی امکانی موت بلکہ اُس کی ساری زندگی پر بھی بے انتہا متجسس ہوں تو انہیں بات جاری رکھنے کا حوصلہ ہوا۔

اب ایسا نہیں کہ میں نے چٹے سائیں کا ذکر پہلی بار سنا تھا مگر اتنی مدتوں بعد سُنا تھا کہ جیسے پہلی بار سُنا تھا۔ اس وقت مدھم سے دیے سے بس نام کی روشن اُس دوکان کے سامنے بیٹھے، کہ جس کے اندر سے پرانے گُڑ کی خوشبو اُٹھ کر تاریک اور ٹھنڈی ہوتی پہاڑی رات کی دوسری خوشبوؤں میں مل رہی تھی۔ چٹے سائیں کی میری اپنی سب یاد بھی کسی پرانی خوشبو کی مانند ہی بچپن سے اٹھ کر آ رہی تھی اور مجھے بہت حیران کر گئی تھی کہ اتنے سالوں میں جو میں نے بڑے شہر کو دیے یا بڑے شہر نے مجھ سے لیے میں نے شاید کبھی بھی اس حیرت ناک کردار کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ جو سمیال اور اطراف کے گاؤوں کی غالباً سب سے زیادہ اچنبھا ہستی ہے۔

اب یہ سب لکھتے ہوئے ایک بڑی جانی پہچانی سی ہوس ہے جو مجھے اُکساتی ہے کہ میں لفظوں کی ایک فضا تخلیق کروں جس میں سمیال کا اندھیرا ہو اور شمال کے اُونچے پہاڑوں کی ہوا ہو اور جو ایسے آتی ہو کہ جیسے اندھیرا بہتا آتا ہے اور اس وقت اس اونچے نیچے پہاڑی مقام میں جتنی بھی روشنیاں ہوں وہ اس بہاؤ میں ڈوب جاتی ہوں اور یہ کہ اُس وقت دوکان کے سامنے بیٹھے میرے نیچے دھرے ہوئے پاؤں کس طرح جمے ہوئے پتھروں اور سرسراتی ہوئی ریت کے ذروں کو جوتوں کے اندر سے بھی تلووں میں سرکتے لمس سے پہچان رہے تھے۔ اور یہ کہ میں دوکان دار سراج، رعشہ زدہ قربان علی اور کھانستے ہوئے نور داد کے ساتھ لفظوں کا کچھ معاملہ کر کے انہیں گوشت پوست پہنادوں اور پھر 'سماں باندھنے'، حقیقت کا رنگ دینے کی قدیم داستانی لذت لینے کے بعد میں اُس پُر اسرار کردار کے بارے میں کوئی بات کہنا شروع کروں جس کا متواتر ذکر پہلے ہی تمہارے تجسس کو کافی بڑھا چکا ہو گا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں کافی بیزار کر چکا ہو گا۔

لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اس ہوس کا شکار نہیں ہونگا۔ اس لیے بالکل بے رنگ اور سپاٹ لفظوں میں میں تمہیں چٹے سائیں کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔ بالکل عام سیدھے سیدھے شریفانہ رشتوں والی نثر میں۔ خواہ اس میں کسی بھی طرح کا زبان و بیان کا چسکا ہو یا نہ ہو۔ آخر یہ کیا

Scanned by CamScanner

ضروری ہے کہ میں اسماء کی مقعد میں صفات کا ڈنڈا گھسیڑ کر انہیں بلبلانے پر مجبور کروں تاکہ پڑھنے والے کے بہرے کانوں میں ان کی کچھ شنوائی ہو یا پھر میں پاک صاف، معصوم، افعال کے تن سے اُن کی ٹکے ٹکے کی شریف معنویت کے جامے اُتار کر انہیں اتنا ننگا کر دوں کہ ان کے درمیان لواطت اور بدکاری کے انوکھے امکان پہلی بار پڑھنے والے کو ہڑبڑاتے نظر آ جائیں پھر وہ اپنی زبان کی آسودہ مطمئن بے خودی سے منہ چھپاتے نکلیں اور جائیں، چند لمحوں کے لیے ہی سہی مگر یہ جانیں، کہ ان کی تیس چالیس ہزار لفظوں کی کائنات میں فقروں کے بھی رشتے جائز نہیں۔ لکھنے والے پر پڑھنے والے کا یہ کیسا جبر ہے کہ جو کسی سفاک آقا کے کوڑے کی طرح ہر لمحے اُس کے قلم کے اُوپر لہراتا رہتا ہے کہ لکھنے والا اس کی دلبستگی کے لیے لکھے۔ اس کی تفننِ طبع کے لیے لکھے۔ اس کے مردہ لمحوں میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لیے لکھے۔ اس کے لاعلم بھیجے میں علم ٹھونسنے کے لیے لکھے۔ لکھے، لکھے اور لکھے۔ درد کی اذیت سے اینٹھتے غلام کی طرح وہ تنقید اور تنقیص کے کوڑے کھائے مگر پھر بھی لکھے۔ قبولیت اور ستائش کی موہوم ذلت انگیز امید پر زندہ رہے اور لکھے۔ لکھے۔ مجھے تم سب پڑھنے والوں سے شدید نفرت ہے۔

اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا بلکہ یقین ہو چکا ہوگا کہ یہ خط واقعی کوئی عجیب الخلقت تحریر ہے۔ واقعی اس لیے کہ میں لکھنے اور لکھتے لکھتے اسی لکھنے پر لکھنے کی محال خواہش بلکہ جنون میں مبتلا ہوں۔ تم نے ایشر کی وہ ڈرائنگ دیکھی ہے جس میں ایک ہاتھ ایک ایسے دوسرے ہاتھ کی ڈرائنگ کر رہا ہے جو کہ خود سے پہلے ہاتھ کی ڈرائنگ میں مصروف ہے یہ ایک آگہی کی خود آگہی کی آگہی تک کا عذاب ہے یہ ایک پیراڈاکس ہے جو تمہیں ایشر کی ڈرائنگوں، آئینوں اور بھول بھلیوں کی کہانیوں والے بورخیز، باخ کے میوزیکل آفرنگ اور گوڈل کے ریاضیاتی نظریے میں ملے گا مگر کیا کروں کہ کام کی اکثر باتوں کے لیے انہیں گوروں کو ہر جگہ سے سونگھنا پڑتا ہے۔ مگر فکر نہ کرو میں اپنا گورا بندہ۔ اپنا چٹا سائیں دنیا کے سامنے لا رہا ہوں اور جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا اس کی کہانی کو جو اس رات مجھے معلوم ہوئی اور جو کچھ پہلے سے مجھے معلوم تھی ایک مکمل طور پر بے حس اور بنجر زبان میں پیش کروں گا۔

سمیال ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ ایک نیم پہاڑی گاؤں ہے جیسے یہاں کے دوسرے گاؤں ہیں ویسا ہی یہ گاؤں ہے۔ اس گاؤں میں جو لوگ رہتے ہیں ان کو اگر گنا جائے تو ہزار سے

Scanned by CamScanner

زیادہ اور پندرہ سو سے کم ہوں گے۔ سمیال ایک چھوٹی سی وادی میں ہے۔ جس میں لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ باقی لوگ نمک یا کوئلے کی کانوں میں کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ فوج میں بھی کام کرتے ہیں۔ سمیال کے شمال کی جانب وادی کے اونچے نیچے میدان ختم ہونے کے بعد پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ پہاڑیاں کئی رنگوں کی ہیں۔ ان میں سے ایک پہاڑی جو کالے سے رنگ کی ہے اس میں ایک غار ہے جو کافی کھلا ہے۔ اس غار میں ایک زندہ پیر رہتا ہے۔ جس کو علاقے کے لوگ چٹا سائیں کہتے ہیں۔ چٹا سائیں اس کو لوگ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس کا رنگ سفید ہے۔ اس کا سارا جسم سفید ہے۔ چٹا سائیں کبھی غار سے باہر نہیں آتا۔ وہ غار کے اندھیرے میں ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ لوگوں کو یقین ہے کہ چٹا سائیں مرادیں پوری کرتا ہے۔ مگر تم اس سے کچھ مانگو تو وہ اندر سے گالیاں دے گا۔ گاؤں کا ایک کنبہ جس کا بڑا بوڑھا نورداد ہے، چٹے سائیں کا محافظ ہے۔ چٹا سائیں اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ کسی کو بھی اس کی عمر کا علم نہیں رہا۔ نورداد بہت عرصے سے دل سے یہ چاہتا ہے کہ چٹا سائیں مر جائے تاکہ وہ اس کی قبر بنا کر اپنا مجاور بٹھا دیں اور زندہ چٹے سائیں کو تین ٹیم روٹی کھلانے کے مشکل کام اور ہفتے میں اسے دو بار صاف ستھرا کرنے کے گندے کام سے جان چھوٹ جائے لیکن چٹا سائیں لگتا ہے کہ کبھی نہیں مرے گا۔ نہ تو وہ کبھی بیمار ہوتا ہے اور نہ بڑھاپا اس کو کمزور کرتا ہے۔ وہ بس زندہ ہے۔

وہ اس غار میں کیسے آیا ہے۔ اس نے لوگوں کی منتیں مرادیں کب سے پوری کرنی شروع کی ہیں۔ سمیال کے لوگ یہ سوال نہیں پوچھتے۔ انہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں بس چٹے سائیں کی گالیوں کی ضرورت ہے۔ انہیں چٹے سائیں کی تھوک کی ضرورت ہے جو وہ پانی کے پیالے میں تھوکتا ہے اور پانی پینے والے کا کوئی بھی مسئلہ ہو تو وہ حل ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی یہ سوال ضرور ہی پوچھے تو اسے ایک جواب ملے گا۔ یہ جواب ایسا ہے جو روایت کہلاتا ہے تو اس طرح چٹے سائیں کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے۔

روایت: چٹا سائیں اس صدی کے شروع میں نورداد کی دادی کے گھر پیدا ہوا۔ نورداد کی دادی کی نانی کی پرنانی غدر میں بچھڑی ہوئی ایک گوری میم تھی جسے باغیوں نے اپنی طرف سے خراب کر کے مار دیا تھا۔ لیکن نورداد کے خاندان کا اُس زمانے کا کوئی مرد اُسے بچا لایا۔ اُسے کہیں چھپا کر اس سے شادی کر لی اور اس کا نام سید بیگم رکھا اور اُس سے اولاد لیتا رہا اور اس کی نسل آگے

بڑھتی رہی اور اس طرح سفید خون اور نیلی آنکھیں نوررداد کی نسل کے خون میں مل گئیں لیکن اچانک جب نوررداد کی دادی کا بچہ چٹا پیدا ہوا تو وہ ڈر گئی اور اس کا خاوند بھی ڈر گیا کیونکہ وہ دونوں تو سفید نہیں تھے۔ دونوں گندمی تھے۔ بچے کی آنکھیں نیلی تھی۔ ماں باپ کی آنکھیں کالی تھیں۔ وہ ڈر گئے کہ کون مانے گا کہ یہ بچہ ان کا جائز بچہ ہے۔ کوئی بھی نہیں مانے گا۔ وہ زمانہ انگریز کا تھا۔ گورا صاحب علاقے کے دورے پر آتا تھا۔ گورا صاحب نمک کی کانوں کا انتظام دیکھنے بھی آتا تھا اور نوررداد کا دادا گورے صاحبوں کو علاقے کے دورے کرواتا تھا۔ وہ علاقے کے بڑے اہم اور بڑے خاندان کا مالک تھا۔ اس کی بڑی زمینیں تھیں جو انگریز نے انہیں دی تھیں۔ 1857ء میں نوررداد کے پردادے نے باغیوں کے خلاف انگریز کی مدد کی تھی لیکن وہ بات تو ختم ہو چکی تھی۔ جارج ہشتم کے زمانے میں نوررداد کے دادے کو دہلی دربار میں کرسی ملی تھی۔ نوررداد کی دادی کے گھر جب یہ بچہ پیدا ہوا تو پہلے نوررداد کے دادے نے فیصلہ کیا کہ وہ بچے اور بیوی دونوں کو مار دے گا اور بتا دے گا کہ بچہ جننے کے درمیان وہ مر گئی اور بچہ بھی مر گیا لیکن پھر وہ سمجھ گیا۔ اسے یقین آ گیا۔ یہ چٹا بچہ اس گوری میم کا خون تھا جو اس کی بیوی کی نانی کی پرنانی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اس چٹے نیلی آنکھوں والے بچے کو مار دے گا۔ بچہ ماں کا دودھ پیتا تھا۔ وہ ڈری ہوئی تھی اور ڈر کے بار بار اپنے خاندان کو دیکھتی تھی اور کبھی بچے کو۔ اس نے بچے کو عورت کے پستان سے الگ کیا۔ عورت بہت زور زور سے روئی۔ اس نے دہائی دی۔ اسے مت مارنا۔ مرد کا دل تھوڑا سا پسیجا۔ اس نے بچے کو دیکھا جو اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اچھا میں اسے خود نہیں مارتا۔ اس نے کہا۔ میں اسے اُدھر غار میں چھوڑ آتا ہوں۔ اب اور کچھ نہ کہنا۔ وہ چلا گیا اور رات کے اندھیرے میں بچے کو غار کے اندر رکھ کر واپس آ گیا اور مشہور کر دیا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا اور اسے دفنا کر آیا ہے۔

لیکن بات چھپ نہ سکی۔ دائی جس نے بچہ جنایا تھا وہ سب کچھ جان گئی تھی اس نے ایک مہینے کے بعد کسی کو بتایا کہ کیا ہوا تھا اور اس نے کسی اور کو اور اس طرح بات پھیل گئی۔ لوگوں نے کہا ظلم ہوا ہے' گاؤں والے اکٹھے ہو کر غار میں گئے تاکہ بچے کی لاش ملے تو اس کا صحیح طریقے سے کفن دفن کر دیں اور ظالم باپ کا معاملہ پنچایت میں لے جائیں۔ لیکن وہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا اُس نے انہیں بہت ہی حیران کر دیا۔ بچہ زندہ تھا۔ بالکل صحیح سلامت تھا۔ گھاس پھوس پر لیٹا زور زور سے ٹانگیں چلاتا تھا اور اندر آنے والوں کو نیلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ بچہ کچھ کھائے پیے

Scanned by CamScanner

ننگ ملنگا۔ غار میں جس کے اردگرد سو پھاڑ کھانے والے جانور پھرتے تھے اور سانپ ڈسنے والے رینگتے تھے زندہ رہا تھا۔ یہ تو معجزہ تھا اور سب کے سامنے تھا کون جھٹلا سکتا تھا۔ وہ بچہ کوئی عام آسانی سے مرجانے والا بچہ نہ تھا۔ آخر وہ اتنا عرصہ زندہ کیسے رہا۔ وہ سادہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ بچے کی ماں اور دائی دونوں چھپ چھپ کر آتی تھیں اور اس ننھی جان کو دودھ پلاتی تھیں۔ یہ ان دونوں عورتوں میں راز تھا اور انہوں نے اسے راز ہی رکھا۔ اگر بتاتی تھیں تو خطرہ تھا کہ باپ پھر اس کو مارنے کی کوشش کرے گا۔ اگر بچے کا معجزہ بنتا ہے تو بنے اس طرح وہ زندہ تو رہے گا وہ کیوں بچی بات بتا کر اس کی جان گنوائیں۔ گاؤں کے لوگوں کے دل قدرت کی شان سے بھر گئے۔ اُن کا جی چاہتا تھا کہ سجدہ کریں۔ انہوں نے وہیں نماز پڑھی اور فیصلہ کیا سب نے مل کر کہ وہ بچہ ہو سکتا ہے کہ کوئی پیر فقیر یا ولی ہو اور سنمیال کے لیے رحمت بن کر آیا ہو اور اب وہ ہمیشہ اس غار میں رہے گا۔ غار اس کا گھر بنے گا۔ اس کی خدمت کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی پاس حاضر رہے گا اور گاؤں کی بچوں والی عورتوں کے پستانوں کا دودھ اس کے لیے ہمیشہ حاضر رہے گا اور.........

ناصر مجھے اعتراف ہے کہ میں شدید اکتاہٹ کا شکار ہو رہا ہوں۔ چپے سائیں کے واقعے کو اپنے معلوم و مانوس اسلوب سے ہٹ کر بظاہر ایک سپاٹ بیانیے کی شکل میں لکھنے کی کوشش نے مجھے ویسی ہی بے زاری میں مبتلا کر دیا ہے جیسی کہ کسی شخص کو زبردستی بدخطی میں لکھنے پر...... اب دیکھو یہ فقرہ حسب خواہش مکمل کرنے میں مجھے مشکل پیش آ رہی ہے۔ 'بے زاری میں مبتلا' سے شروع کر چکا ہوں اور اس بے زاری کو بدخطی سے لکھنے کی 'زاری' ثابت کرتے وقت میرا قلم رُک رہا ہے اور یہی میرے مرض کی اصل جڑ ہے۔ 'اصل جڑ ہے' یہاں کتنا بدصورت لگ رہا ہے کہ میرا قلم ہر اس تحریر کے دوران رُک رُک جاتا ہے جسے میں اپنی تحریر کہتا ہوں۔ (یہ فقرے بھی مجھے ذرا اچھے نہیں لگ رہے) میں اپنے ہر لفظ کے گلے میں احتساب کا پھندا ڈالے رکھتا ہوں۔ ایک کبیر مہدی بناتا ہے، لکھتا ہے دوسرا کبیر مہدی بگاڑتا ہے، کاٹتا ہے۔ خیر لعنت بھیجو۔ اصل بات یہ ہے کہ میں تھوڑی دیر پہلے جس غیر متوازن تحریری ہیجان (اگرچہ ہر ہیجان غیر متوازن ہی ہوتا ہے) کا شکار ہوا تھا وہ اب باقی نہیں رہا۔ (پہلے میں لکھنے والا جس غیر متوازی ہیجان میں مبتلا ہوا تھا اس سے نکل آیا ہے) (نکل آیا ہے بھی موزوں نہیں۔ اس سے مکانی انخلا کا احساس جاگتا ہے۔ جبکہ ہیجان مکاں نہیں) دیکھو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا لکھنا محض موزوں الفاظ کے انتخاب کا نام ہے۔

Scanned by CamScanner

بغیر تنگ ملنگا۔ غار میں جس کے اردگرد سو پھاڑ کھانے والے جانور پھرتے تھے اور سانپ ڈسنے والے رینگتے تھے زندہ رہا تھا۔ یہ تو معجزہ تھا اور سب کے سامنے تھا کون جھٹلا سکتا تھا۔ وہ بچہ کوئی عام آسانی سے مرجانے والا بچہ نہ تھا۔ آخر وہ اتنا عرصہ زندہ کیسے رہا۔ وہ سادہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ بچے کی ماں اور دائی دونوں چھپ چھپ کر آتی تھیں اور اس ننھی جان کو دودھ پلاتی تھیں۔ یہ ان دونوں عورتوں میں راز تھا اور انہوں نے اسے راز ہی رکھا۔ اگر بتاتی تھیں تو خطرہ تھا کہ باپ پھر اس کو مارنے کی کوشش کرے گا۔ اگر بچے کا معجزہ بنتا ہے تو بنے اس طرح وہ زندہ تو رہے گا وہ کیوں اس کی جان گنوائیں۔ گاؤں کے لوگوں کے دل قدرت کی شان سے بھر گئے۔ اُن کا جی چاہتا تھا کہ بجدہ کریں۔ انہوں نے وہیں نماز پڑھی اور فیصلہ کیا سب نے مل کر کہ وہ بچہ ہوسکتا ہے کہ کوئی پیر فقیر یا ولی ہو اور سنمیال کے لیے رحمت بن کر آیا ہو اور اب وہ ہمیشہ اس غار میں رہے گا۔ غار اس کا گھر بنے گا۔ اس کی خدمت کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی پاس حاضر رہے گا اور گاؤں کی بچوں والی عورتوں کے پستانوں کا دودھ اس کے لیے ہمیشہ حاضر رہے گا اور.........

ناصر مجھے اعتراف ہے کہ میں شدید اُکتاہت کا شکار ہو رہا ہوں۔ چنے سائیں کے واقعے کو اپنے معلوم و مانوس اسلوب سے ہٹ کر بظاہر ایک سپاٹ بیانیے کی شکل میں لکھنے کی کوشش نے مجھے ویسی ہی بے زاری میں مبتلا کر دیا ہے جیسی کہ کسی شخص کو زبردستی بدخطی میں لکھنے پر...... اب دیکھو یہ فقرہ حسب خواہش مکمل کرنے میں مجھے مشکل پیش آ رہی ہے۔ 'بے زاری میں مبتلا' سے شروع کر چکا ہوں اور اس بے زاری کو بدخطی سے لکھنے کی 'زاری' ثابت کرتے وقت میرا قلم رُک رہا ہے اور یہی میرے مرض کی اصل جڑ ہے۔ 'اصل جڑ ہے' یہاں کتنا بدصورت لگ رہا ہے کہ میرا قلم ہر اس تحریر کے دوران رُک رُک جاتا ہے جسے میں اپنی تحریر کہتا ہوں۔ (یہ فقرے بھی مجھے ذرا اچھے نہیں لگ رہے) میں اپنے ہر لفظ کے گلے میں احتساب کا پھندا ڈالے رکھتا ہوں۔ ایک کبیر مہدی بناتا ہے، لکھتا ہے دوسرا کبیر مہدی بگاڑتا ہے، کاٹتا ہے۔ خیر لعنت بھیجو۔ اصل بات یہ ہے کہ میں تھوڑی دیر پہلے جس غیر متوازن تحریری ہیجان (اگرچہ ہر ہیجان غیر متوازن ہی ہوتا ہے) کا شکار ہوا تھا وہ اب باقی نہیں رہا۔ (پہلے میں لکھنے والا جس غیر متوازی ہیجان میں مبتلا ہوا تھا اس سے نکل آیا ہے) (نکل آیا ہے بھی موزوں نہیں۔ اس سے مکانی انخلا کا احساس جاگتا ہے۔ جبکہ ہیجان مکاں نہیں) دیکھو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا لکھنا محض موزوں الفاظ کے انتخاب کا نام ہے۔

Scanned by CamScanner

لیکن اگر ایسا ہی ہے تو اس انتخابی سرگرمی کا تعین کہاں ہوتا ہے۔ لکھنے سے لمحہ بھر پہلے یا لکھتے وقت۔ جب قلم کاغذ پر نشان ڈالنے لگتا ہے اُس وقت کیا لفظ اپنی ترتیب کے جبر کے زور پر خود ہی اپنے آپ کو ظاہر کر دیتے ہیں؟ یا پھر لکھنے والے کو اپنی ترتیب اور موزونیت کا فریب دے کر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ انہیں طرح طرح کی جڑتوں اور شکلوں میں اپنے ذہن کی کالی کوکھ سے گیلے گیلے نکالے اور کاغذ پر پھیلا دے سجادے۔ جیسے کتیا اپنے بچے نکالتی ہے اور انہیں چاٹتی ہے۔ اب میں شدت سے چاہتا ہوں کہ میری یہ 'خود سے شرمندہ نثر نگاری' ختم ہو۔ شاخ پر بیٹھ کر پیچھے سے شاخ کاٹے اور اپنی کھال سے باہر نکل کر پلٹ کر اپنے آپ کو دیکھنے کی کیفیت اختتام کو پہنچے اور میں بے شک کہ ہر طرح کے بکھراؤ کے بارے میں لکھوں لیکن خود قائم رہوں اور لفظ گاڑنے کے ساتھ ساتھ اُن کی جڑیں کھود کھود کر دیکھنے کی خواہش سے نجات پاؤں۔ میرا خیال ہے اس جنجال سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں وقتی طور پر چٹے سائیں پر لکھنے کا عمل ہی ختم کر دوں۔''

کبیر مہدی نے جب کاغذ اور قلم ایک طرف رکھا تو اس نے سوچا کہ رات یقیناً اتنی بیت چکی ہوگی کہ جب اُسے علم ہوگا کہ کتنی بیت چکی ہے تو وہ حیران رہ جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ رات کے گزرنے کے بعد آنے والی صبح کی پوہ اساطیری دھند کا تحیر لیے لکڑی کی بھدی کھڑکی کی راہ سے پھوٹ رہی تھی، گاؤں کی واحد مسجد کے موذن نے اذان دی اور سمیال میں رات کے خاتمے کا اعلان بھی ہو گیا۔

اور کبیر اس بات پر بھی متحیر ہوا ''میں نے ساری رات یہ واہیات خط لکھنے میں گزار دی۔ حد ہو گئی......''

پھر اسی لمحے اُس نے فیصلہ کیا وہ اُسی وقت چٹے سائیں کو دیکھنے جائے گا۔ میل ڈیڑھ میل کسیوں نالوں، کھڈوں، گھاٹیوں سے گزر کر اور تھوڑی چڑھائی چڑھ کر وہ چٹے سائیں کی غار تک پہنچے گا تو سورج نکل چکا ہوگا۔ جب وہ صحن سے گزر رہا تھا تو وضو کرتے مہدی خان نے اسے تعجب سے پوچھا ''تم ہو کبیر؟ اتنی صبح صبح...... کہاں جا رہے ہو'' اس کے دل میں اندیشہ تھا کہ شاید وہ اچانک واپس شہر جا رہا ہے۔ وہ ایسے ہی واپس چلا جایا کرتا تھا۔ مگر پھر کبیر کے جواب پر اسے اطمینان ہوا اور ایسے ہی بلاوجہ اسے بیٹے پر بے تحاشا پیار آ گیا اولاد کے لیے اچانک امڈنے والا پیار۔

Scanned by CamScanner

"نہیں میں...... ذرا سیر کے لیے جا رہا ہوں۔ ذرا دور تک۔ میں چار پانچ گھنٹے تک لوٹ آؤں گا......"

"پتہ نہیں راتوں رات یہ کیا سوچ کر کدھر جا رہا ہے"۔ مہدی خان نے پاؤں دھوئے اور جب وہ مسجد جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو کبیر بھنڈر میں دوسری جانب اُتر رہا تھا۔

"سیر؟ ہاں...... شہر کے لوگ سیر بھی تو کرتے ہیں" مہدی خان نے سوچا اور اپنے گیلے پاؤں کو جو اس کے کھلے جوتوں میں یک دم پھسل پڑتے تھے اور بھی زیادہ جما جما کر مسجد کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

OOO

Scanned by CamScanner

"نہیں میں...... ذرا سیر کے لیے جا رہا ہوں۔ ذرا دور تک۔ میں چار پانچ گھنٹے تک لوٹ آؤں گا......"

"پتہ نہیں راتوں رات یہ کیا سوچ کر کدھر جا رہا ہے"۔ مہدی خان نے پاؤں دھوئے اور جب وہ مسجد جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو کیبر بھنڈر میں دوسری جانب اُتر رہا تھا۔

"سیر؟ ہاں...... شہر کے لوگ سیر بھی تو کرتے ہیں" مہدی خان نے سوچا اور اپنے گیلے پاؤں کو جو اس کے کھلے جوتوں میں یک دم پھسل پڑتے تھے اور بھی زیادہ جما جما کر مسجد کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(6)

ننگا افلاطون

''جل پتھری پہاڑی اور چٹے سائیں کی کھوہ والی اِس پہاڑی میں بڑا فرق ہے۔ ایک فرق تو یہ ہی بڑا ہے کہ جل پتھری پہاڑی سنمیال کے انتہائی جنوب میں ہے اور کھوہ چٹا سائیں پہاڑی انتہائی شمال میں ہے'' کبیر نے سوچا اور نتھنے سکیڑ کر فضا میں کچھ سونگھا '' حتیٰ کہ جنگلی بوٹیوں، جھاڑیوں اور پھولوں کی خوشبو بھی مختلف ہے۔''

اس کی توقع کے برعکس سورج ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا اور وہ چڑھائی چڑھ کر ایک ہموار مقام تک پہنچ چکا تھا۔ ''چٹے سائیں کا غار یہیں کہیں ہونا چاہیے'' وہ کچھ اور آگے بڑھا تو ایک جھاڑی پر اسے سبز رنگ کی بہت سی دھجیاں نظر آئیں جو کسی مقدس مقام کے قریب ہونے کی واضح علامت سمجھی جاسکتی تھیں۔ پھر ہوا کے مدھم سے جھونکے میں وہ بُو اُس تک پہنچی جو جنگلی نباتات کی مشام نواز خوشبوؤں میں اچانک اس طرح گھس آئی تھی جیسے نازک اندام حسیناؤں کی محفل میں کوئی ننگ دھڑنگ کالا بھجنگ مسٹنڈا گھس آئے۔ وہ ایک سڑاند تھی، حیوانی فُضلے، کچے گوشت، جلے ہوئے دودھ، اور بند جگہوں کی باسی ہواؤں کا وہ ایک تیز و تند مرکب تھی۔ کبیر اپنے قدموں پر رُک گیا۔ نتھنوں کے اندر ایک گہرا چرکا لگا کر وہ بُو پھر یک دم سے معدوم ہوگئی تھی اور دنیا ایک بار پھر لاکھوں جنگلی پھولوں اور رات بھر کی اوس سے بھیگی چٹانوں کی مہک سے بھر گئی تھی۔ ''نتھنوں کی راہ سے اندر اُترنے والی دنیا کا کوئی نام نہیں''۔ خوشبوئیں اور سونگھنے کی باتیں کبیر کو ہمیشہ حیرت زدہ اور پریشان کر دیتی تھیں۔ ''خوشبو اور بدبو کا اپنا کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنے جسم کے نام سے پہچانی جاتی ہیں جو انہیں پیدا کرتا اور ہوا میں بے رنگ تحلیل کرتا ہے۔'' وہی بو ایک بار پھر اُس پر حملہ آور ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اُسی سمت جائے گا جدھر سے وہ آتی ہے۔ کسی اناڑی کھوجی کتے کی

طرح وہ بے یقینی سے بو کی ڈور کو تھامے آگے بڑھنے لگا اور اسے زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ چند بڑی بڑی چٹانیں اس کا راستہ روکے سامنے کھڑی تھیں اور جب وہ ان کے گرد گھوم کر پھر واپس شمال کی طرف آیا تو وہ غار یا کھوہ اُس کے سامنے تھی اور لوہے کی موٹی سلاخوں والا ایک عجیب الخلقت قسم کا دروازہ غار کے منہ کو بند کرتا تھا۔ تو یہ چٹے سائیں کی بُو ہے۔ کبیر نے سوچا اور اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ چڑیا گھر میں شیروں، ریچھوں کے پنجروں کے باہر بھی اسے ایسی ہی بو کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر یہ بو بالکل ویسی بھی نہ تھی۔ کبیر نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ چٹے سائیں کے پس منظر...... نوروداد کے خاندان کی اس انوکھی مجاوری کے بارے میں کبیر نے بچپن سے لے کر جو کچھ بھی سنا تھا اور پھر ناصر کو خط لکھتے وقت جو نقشے اور تصوراتی تصویریں اس کے ذہن میں بنی تھیں یہ مقام ان سب سے مختلف تھا۔ چٹے سائیں کی کہانی کبیر کے ذہن میں پھر سے تازہ ہوگئی۔

''یہ غیر حقیقی ہے'' کبیر کے ذہن نے فوری فیصلہ دیا۔ ''..... یہ کیسے ممکن ہے۔''

''کیا بکواس سوچتے ہو کبیر مہدی۔ یہ سیدھا سیدھا ممکن تو ہے۔ جینز یقیناً جینز سیدھی سی بات ہے۔ چٹا سائیں بالکل حقیقی ہے۔ بالکل یقینی ہے مگر جب کبیر نے اپنی آنکھوں سے چٹے سائیں کو پہلی بار دیکھا تو اس کے ذہن نے ایک بار پھر فیصلہ دیا ''نہیں یہ غیر حقیقی ہے'' یہ کیسے ممکن ہے کہ افلاطون اپنی موت کے ہزاروں سال بعد پوٹھوہار کی ایک پہاڑی غار میں مجسم ہو جائے۔ کبیر نے مغربی فکر کی کسی کتاب کے ٹائیٹل پر ایک تصویر دیکھی تھی جس میں مصوّر نے بوڑھے افلاطون اور نوجوان ارسطو کو دکھایا تھا۔ حکمت و دانش سے معمور چہرہ اور لمبا لبادہ پہنے وہ نوجوان ارسطو کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ مگر چٹے سائیں کا چہرہ حکمت و دانش سے معمور نہ تھا اور اُس کا جسم لمبا لبادہ تو کُجا کسی بھی لباس سے عاری تھا۔ غار کے اندر مشرق کی جانب کھلتے کسی شگاف سے روشنی گر رہی تھی اور طلوع ہوتے سورج کی سنہری کرنیں اس کے گورے شفاف برہنہ مردانہ جسم کے اوپر گرتی تھیں۔ گویا اسے غسل دیتی تھیں۔ یہ ایک حیرت ناک منظر تھا۔

''دنیا میں کتنے انسان ہوں گے جنھوں نے افلاطون کو ننگا دیکھا ہوگا'' کبیر ہنسا۔ اُس کی نظریں غار کی تاریکی میں سپاٹ لائٹ جیسی گرتی سورج کی شعاع میں کھڑی گورے جسم اور سنہرے بھورے بالوں کی مخلوق پر جمی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے کبیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس مخلوق کے جسم سے بخارات اُٹھ رہے ہوں جن سے اس ہیولے کے بیرونی خطوط دھندلا رہے ہوں۔

Scanned by CamScanner

کبیر آنکھوں کو ملتا آگے بڑھا تاکہ قریب سے غار میں نگاہ دوڑا سکے۔ وہ سلاخوں والے دروازے کے سامنے رُک گیا اور غیر ارادی طور پر بائیں ہاتھ سے ایک سلاخ کو تھام لیا۔

اور اسی لمحے اس کی نظروں کے سامنے چٹے سائیں کے سفید جسم نے ایک وحشیانہ جھرجھری لی۔ درندوں جیسی غراہٹ اس کے حلق سے برآمد ہوئی اور ساتھ ہی اس کا بازو بھی بجلی کی سی تیزی سے گھوم گیا۔ کبیر کو اپنے کندھے پر پتھر جیسی کسی چیز کے لگنے کا احساس ہوا۔ وہ ایک اضطراری خوف کے زیرِ اثر پیچھے ہٹ گیا اور نیچے دیکھا...... اس کے کندھے سے ٹکرا کر نیچے گرنے والی شے پتھر نہیں بلکہ گُو کا ڈھیلا تھی۔

اپنے آپ کو خود ہی اپنے پسندیدہ ناشتے سے محروم کر دینے کے بعد وہ مجسم جارحیت بن چکا تھا اور پھر ننگا افلاطون اپنے آپ سے بھی زیادہ ننگی گالیاں دینے لگا۔ مقامی زبان کی عظیم الشان مغلظات اُس کے قدیم یونانی منہ سے برآمد ہو رہی تھیں۔ کبیر کے جی کے اندر ہی اندر انوکھی شرارت بازی کی سوچیں کھلکنے لگیں۔

Delphi کا Oracle بھی کیا ایسے ہی بولتا ہوگا۔ نہیں Delphi کا اوتار تو مرد نہیں کوئی عورت تھی...... مکالماتِ افلاطون میں نئے مکالمات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ آخر یہ افلاطون ہی کیوں میرے ذہن سے چپک گیا ہے۔ تو ہزاروں سال پہلے بھی تو ان علاقوں میں کچھ گورے اپنے تولیدی مادے بکھیر گئے تھے۔ ہو سکتا ہے غدر کی داستان سب جھوٹ ہو سکندر کے فوجی بھی تو............ جبکہ چٹا سائیں اپنی شباہت میں آسانی سے یونانی خداؤں کا والد صاحب Zeus دیوتا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یونانی ہی کیوں؟ شاید اس لیے کہ گورے جسم والوں میں سے صرف یونانی مجھے پسند ہیں...... حالانکہ اب یہ اپنے ہاتھ سے زیرِ ناف جس طرح کی حرکت کر رہا ہے اس سے اسے راسپوٹین بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ناف کے نیچے چٹے سائیں کا ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ کبیر احمقانہ سے انداز میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا اور اُسے یہ عجیب سا احساس ہوا کہ جیسے وہ اس کی نظروں کی گرفت میں نہ آ رہا ہو۔ وہ اتنا عظیم الشان قوی ہیکل اور ہر جانب پھیلا ہوا تھا کہ ایک ہی نظر، ایک ہی خیال کی گرفت میں نہ آتا تھا۔

"کسی دن میں اسے ہلاک کروں گا" کبیر کے اندر سے کسی گہرے کنوئیں سے اُٹھتی جیسی صدا اسے اندر ہی اندر دہلا گئی۔ مغربی دانش مندوں کے بارے میں اس کا محبت...... نفرت کا خیالی

چل چلاؤ اپنی جگہ تھا۔ مگر کسی انسانی جاندار کو قتل کرنے کا خیال یقیناً اس کے شعوری ساز و سامان میں کہیں بھی مشکل سے ہی دستیاب تھا۔ ''مگر یہ خونی خیال آیا کہاں سے میرے ذہن میں'' کبیر نے کافی خلوص سے اپنی ہی ذات کے کسی حصے سے استفسار کیا اور جلد ہی ایک مُسکت جواب پا کر بظاہر مطمئن ہو گیا ''رات بھر کی بے خوابی اور خالی پیٹ پہاڑیاں چڑھنے کی مشقت نے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں برخوردار'' کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا ''اور اُدھر یہ چٹا سائیں بھی اپنے دماغ کی تو نہیں جسم کی چولیں ضرور ہلا کر رکھ دے گا'' کبیر نے سوچا۔ جس شدت سے زیرِ ناف اُس کا بھورا ہاتھ حرکت کر رہا تھا اسی شدت سے گالیاں اس کے منہ سے چھوٹ رہی تھیں۔ غار کے عقبی مشرقی شگاف سے گرتی سورج کی روشنی کی سپاٹ لائٹ اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی اور اس کے نقوش میں انسان کے اول و آخر کی لذت دہکتی تھی۔ گالیاں بتدریج ناقابلِ فہم ہو کر حیوانی زندگی کی کراہوں میں تبدیل ہو چکی تھیں...... اور جلد ہی ننگا افلاطون سُکھی ہونے لگا۔ کروڑوں گورے انسانوں کی امکانی پیدائش کا جینیاتی مادہ اُس کے ہاتھوں سے چپکے گُڑ کے شیرے سے آمیزہ ہو کر غار کے فرش پر ٹپکنے لگا اور چیونٹیاں تیزی سے اُن اُدھورے انسانوں کے امکانِ محض کا رس چوسنے میں جُت گئیں۔

کبیر نے ایک طویل سانس لیا۔ وہ سب کچھ جو اس کی نظروں کے سامنے تھا، ابھی بھی اس کے لیے خواب ناک اور غیر حقیقی تھا۔ اپنے ہی علاقے کی ایک پہاڑی غار میں وہ مخلوق اور اس سے وابستہ کہانی اور وہ سب کچھ جو ابھی اس مخلوق نے سورج کی پہلی کرنوں میں کھڑے ہو کر اُس کی نظروں کے سامنے منظر کیا تھا اور اُس کے اپنے ذہن میں بار بار اُٹھنے والے خونیں، پُر تشدد امیجز، جن میں وہ سامنے کھڑے سفید جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک انجانی سنسنی کی لہریں اپنے بدن میں دوڑتی محسوس کرتا تھا۔ سب کچھ بالکل انوکھا تھا اور پہلی بار تھا۔

''کیا مجھ میں قتلِ انسانی کی قدرت موجود ہے۔ کیا میں قتل کر سکتا ہوں۔ نہ صرف قتل بلکہ جو کچھ یہ سفاک امیجز ذہن سے گزرتے ہوئے بتاتے ہیں۔ کیا میں اس قابلِ نفرین فعل سے لطف اندوز بھی ہو سکتا ہوں'' کبیر نے اپنے آپ سے پوچھا اور اُدھر دیکھا۔

وہ اپنے ہاتھ اپنی رانوں سے رگڑ رہا تھا اور کبیر کو حیرت ہوئی کہ وہ اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو کبیر کے جسم میں تھرتھری سی چھوٹ گئی۔ جیسے اچانک ایک غیر مرئی سا

Scanned by CamScanner

رابطہ قائم ہو جانے کا جھٹکا لگ جائے۔
کبیر نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ یہ محض اُس کا احساس ہے کہ چٹے
سائیں کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ وہ کبیر کے بارے میں سب کچھ جان گیا ہے۔ نیلی سفید آنکھوں
میں سے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھنے والے 'میں۔ سب۔ کچھ۔ جانتا ہوں' کو کبیر ایک لمحے کے
لیے بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور پوری شدت سے اُسے جھٹلا رہا تھا اور اسی لمحے اس
بھورے حیوان نما انسان نے ایک بھرپور گونجتا قہقہہ لگایا جیسا کبیر نے کبھی نہ سُنا تھا اور پھر وہ غار
کے اندرونی حصے کو پلٹ گیا۔

کبیر سلاخوں والے دروازے سے پیچھے ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ
وہ سارا دن وہیں گزارے گا۔ منتیں ماننے والوں، چڑھاوے چڑھانے والوں اور دوسرے سب
لوگوں کو بھی غار کے دروازے تک آنے اور چٹے سائیں کو براہِ راست دیکھنے کی قطعاً اجازت نہیں
تھی۔ اسی لیے جب نورداد نے صبح سویرے کسی کو دروازے سے کچھ فاصلے پر پتھر پر بیٹھے دیکھا تو وہ
سبز جھنڈوں والی چٹان ہی سے شور مچاتا اس کی طرف بھاگا مگر قریب آ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

''کبیر...... تم...... یہاں''۔

''ہاں چاچا نورداد...... میں'' کبیر نے ہنستے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''آج میں نے سوچا
کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ چٹے سائیں کو دیکھے بغیر ہی اللہ کو پیارا ہو جاؤں۔ اس
لیے اذانوں سے پہلے ہی نکل پڑا...... مگر تمہارا یہ سائیں لوک ہے بہت بے شرم......''

کبیر نے قہقہہ لگایا اور نورداد کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ جیسے وہ چٹے سائیں کے کردار اور
سیرت کا خود ذمہ دار رہا ہو۔ اس نے بہت معذرت بھرے انداز میں کہا۔

''مجذوب ہے ناں بے خبر ہوتے ہیں یہ معصوم بیچارے......'' نورداد نے آہ بھرتے ہوئے
کہا ''مگر...... میری پاک پروردگار سے دُعا ہے اسے رب عزت و آبرو سے اُٹھا لے۔ قبر شریف
میں بنا دوں گا''۔

''نورداد کی مشکل سمجھ میں آتی ہے۔ واقعی اس طرح کے زندہ پیر کی بجائے اُس کے مزار کو
Manage کرنا زیادہ آسان ہو گا'' کبیر نے دل ہی دل میں سوچا اور بظاہر کہا ''ہاں یہ تو ہے چاچا
اللہ اس کی مدد کرے گا اور کہیں جذب کی کیفیت میں ہی اُٹھا لے گا اور جو کبیر نے نہ کہا وہ یہ تھا'' کیا

Scanned by CamScanner

میں پڑے سائیں کو قبر تک پہنچانے میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ یہ کیسے خیال میرے ذہن میں بار بار آ رہے ہیں۔ کیا میں کسی Obsession کا شکار ہو چکا ہوں''۔

''اسی لیے میں نے ادھر آنے کی اجازت بالکل بند کر رکھی ہے،'' نورداد کہہ رہا تھا''۔ آخر بیبیوں نے بھی آنا ہوتا ہے اور تم نے دیکھا ہی ہوگا''۔

''ہاں میں نے دیکھا مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی چاچا''۔

''کیا؟''

''اس کی عمر کیا ہوگی؟''

''نوے سے اوپر ہے۔ بزرگوں کی وفات کے بعد جب میں ادھر متولی ہوا تو بھی یہ ایسا ہی تھا''۔

''نوے سے اوپر اور اس عمر میں بھی یہ...... ویسا ہی...... میرا مطلب ہے رواں دواں ہے...... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو ناں چاچا''

نورداد کے چہرے پر عجیب سا تاثر نمودار ہوا جسے کبیر خوف اور حیرت کے امتزاج کے علاوہ کوئی معنی نہ پہنا سکا۔

''ہاں میں سمجھ گیا ہوں...... یہ معجزہ ہے۔ یہی تو معجزہ ہے ورنہ دودھ، گڑ، مکی کی روٹی اور کلیجی کا گوشت تو ہم بھی کھاتے ہیں''۔ نورداد نے ایسے انداز میں کہا جیسے اسے معجزے پر اس سے بڑھ کر استدلال کرنے سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ ''ہوں'' کبیر نے بھی اور کچھ نہ کہا۔

''آؤ...... اِدھر سے ہٹ آؤ...... اُدھر آ کر بیٹھو...... بدبو...... بہت ہے یہاں...... ہر دس دن بعد مصلی لگواتا ہوں...... صفائی کے لیے...... نورداد نے کبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے وہاں سے ہٹا لے جانے پر اصرار کیا۔ کبیر اس کے ساتھ ہی واپس پلٹ گیا۔ سورج سنمیال کی وادی سے نکل کر جب اردگرد کی اونچی پہاڑیوں سے بھی اوپر آسمان میں اُٹھا تو کھوہ چٹا سائیں پہاڑی پر روشنی ہموار پھیل گئی اور اُس مقام پر بھی جو غار کی دوسری جانب واقع تھا اور حاجتمند خوش عقیدہ لوگوں، 'آخری امید والوں، 'منتیں مرادیں ماننے والوں، آرزوئیں پوری ہونے پر چڑھاوے چڑھانے والوں اور معجزے پر اپنا ایمان کڑا کرنے والوں کے ہجوم کے لیے مخصوص تھا۔ اس نیم ہموار پتھریلی جگہ میں ایک طرف نورداد نے اپنے لیے پتھروں سے ایک حجرہ نما جگہ بنا رکھی

Scanned by CamScanner

تھی اور یہ حجرہ عقب میں چٹے سائیں کے غار سے اتنا قریب تھا کہ نور داد حجرے کے اندر بچھے ہوئے بستر پر لیٹا لیٹا چٹے سائیں کی غراہٹیں سُن لیتا تھا۔ حجرے کے سامنے ایک لکڑی کے تخت پوش پر لوہے کا ایک بڑا صندوقچہ رکھا تھا جس میں حاجتمند سلام کے بعد کچھ نذرانے ڈال دیتے تھے۔ سلام کا طریقہ کار بھی کافی انوکھا تھا۔ سوالی نور داد کے حجرے کے سامنے آ کر خاموش کھڑا ہو جاتا اور نور داد بھی اس سے کچھ کہے یا پوچھے بغیر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیتا اور چند لمحوں کے بعد ہاتھ نیچے گرا دیتا۔ اس عرصے میں اگر پیچھے کھوہ میں سے چٹے سائیں کی کوئی گالی کوئی غراہٹ یا چنگھاڑ سنائی دے تو گویا حاجتمند کو شرف قبولیت مل جاتا۔ ناامیدی سے ستے چہرے پر قرار آ جاتا اور چند لمحوں کے لیے کائنات کے گہرے رازوں کا بھیدی بن جانے کا احساس اس کی آنکھوں میں چمکتا اور وہ کسی دوسرے منتظر ملتجی کے لیے جگہ خالی کر دیتا۔ کبیر نے دیکھا کہ قطار کافی لمبی ہے اور کافی متنوع بھی۔ اردگرد کے دیہات کے ستم رسیدہ لوگوں کے علاوہ دور دراز کے شہری قصباتی دیہاتی سب ہارے ہوئے لوگ وہاں تھے۔ آخری سہاروں کے متلاشی چہروں کی بھی کمی نہ تھی۔ ''مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا چاچا کہ اپنے سنمیال کے اتنے قریب ایسا بین الاضلاعی بلکہ شاید بین الصوبائی قسم کا مجمع لگا رہتا ہے'' کبیر نے کہا۔

''یہ لوگ پیچھے بھیر کوٹ کے رستے سے آتے ہیں بس پر یا اپنی گاڑی پر اور اُدھر سے ہی پلٹ جاتے ہیں۔ جب تدبیر ہار جاتی ہے بیٹا تو بندہ ہونی کو ٹالنے کے لیے کہیں بھی پہنچ جاتا ہے۔ کفر تک بھی............''

''مگر یہ بھی تو ایک تدبیر ہی ہے چاچا'' کبیر نے کہا اور نور داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سامنے کھڑے ایک ادھیڑ عمر شہری انداز کے وضع دار مظلومیت کی حد تک شریف صورت شخص کے لیے ہاتھ اُٹھائے چپ تھا۔ اچانک پیچھے بھٹ میں سے چٹے سائیں نے سنمیال کی سب عورتوں کے لیے اپنی کسی ننگی خواہش کا اظہار کیا اور کبیر نے دل ہی دل میں کہا ''سن گئی'' اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ مظلوم صورت شریف شہری نے ایک ایسے بے ساختہ خوف اور بے پناہ نفرت سے کبیر کی جانب دیکھا کہ جیسے وہ مقدس لمحوں کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا تھا۔ کبیر اندر تک لرز گیا اور تاسف سے بھر گیا ''مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ...... میں؟ میں کیا؟ مگر میں نے اس شخص کے کس احساس کس جذبے کو مجروح کیا ہے کہ اس نے یوں تڑپ کر اپنی جھلسا دینے والی نفرت سے مجھے بھسم کر دینا

Scanned by CamScanner

چاہا ہے۔ شاید میں نے اُس کے کسی انتہائی نجی، گندے مگر انتہائی ضروری عمل پر ٹھٹھے بازی کی ہے جیسے کوئی کھیتوں میں رفع حاجت کرتے کسی شخص کو ڈھیلا دے مارے تو جیسے وہ پلٹ کر دیکھتا ہے۔''

اب شریف صورت آدمی کی جگہ ایک بے تاثر چہرے والی دیہاتی عورت اور اس کے ساتھ اس کا بچہ جو کسی کریہہ المنظر جلدی مرض میں مبتلا تھا منتظر کھڑے تھے۔ پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ شرمندہ شرمندہ سا شہری نوجوان آیا۔ پھر ایک برقعہ پوش عورت جس کا کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ کیا ہے۔ پھر ایک خوش شکل عورت جس کے چہرے پر غم اتنا گہرا تھا کہ جیسے ابھی مر جائے گی۔ پھر ایک لڑکھڑاتا ہوا بوڑھا جو ہر شے سے بیگانہ لگتا تھا، اس کے جوان ساتھی اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر لائے تھے۔ پھر ایک بے حد احمق صورت مرد جس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ پھر ایک تیز طرار کاروباری جو چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ پھر ایک کالج کا پروفیسر جو جانتا تھا کہ یہ سب کچھ بیکار ہے لیکن آ گیا تھا۔ اس کا بیٹا کینسر کی آخری اسٹیج پر تھا۔ ذلتوں، اذیتوں، حسرتوں کی وہ قطار ہونی اور انہونی کے بیچ لٹکے پُل صراط پر رُک رُک کر آگے بڑھتی تھی۔ کبیر اُکتا گیا۔ سامنے گزرتے منظر کے تنوع کی دلچسپی پر جب تواتر کی بے زاری غالب آ گئی تو رات بھر کا جگراتا اچانک کبیر کی آنکھوں کے پیچھے سے پھوٹ نکلا، بڑی مشکل سے اُس نے تخت پوش سے اُٹھ کر پیچھے نوروداد کے حجرے میں بستر تک چند قدم اُٹھائے۔ گرا اور گہری نیند سو گیا۔

جب کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا تو دن ڈھل چکا تھا۔ چارپائی کے پاس اُس کا باپ مہدی خان کھڑا تھا۔ وہ ایک احتجاجی سی شفقت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''تمہاری ماں پریشان ہو رہی تھی، کہاں گیا؟ کہیں شہر تو نہیں چلا گیا؟ میں نے صبح تمہیں نکلتے بھی دیکھا تھا مگر خیال تھا ہوا خوری کو نکلے ہو گے۔ وہ تو ارشاد ڈرائیور نے بتایا تم یہاں ہو...... یہاں کیا کرنے آئے تھے......؟''

کبیر کی نیند زدہ آنکھوں میں شرارت کی چمک لہرائی۔ بستر سے اُٹھ کر اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی تو جسم کے جوڑوں میں جگہ جگہ لذت کے پٹاخے سے چھوٹے اور وہ ہنس پڑا اور پھر یک دم بڑی سنجیدگی سے بولا!

''بس ابا جی ایک منت ماننے آیا تھا......ایک مراد تھی دل کی'' اور بوڑھا مہدی خان حیران سا ہو گیا۔

''سچ کہتے ہو؟ واقعی۔ دل کی مراد؟......''

''جی ابا جی۔ میرے دل کی سب مرادیں ان پہنچے ہوئے گورے چٹے ولیوں نے ہی تو پوری کرنی ہیں۔ میرے یہ بزرگ ...... میری بدبختی دیکھیں مجھے آج تک پتہ ہی نہ چل سکا...... یہ افلاطون تو گھر کے پاس ڈیرہ لگائے بیٹھا ہے۔ میں کہیں اور ڈھونڈتا رہا......''

مہدی خان نے سخت مشکوک نظروں سے کبیر کو دیکھا۔ کافی عرصہ پہلے اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کبیر جیسے بیٹے کی کسی بھی بات کو سیدھا صاف مان لینا سخت مورکھ پن ہوگا۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہوتا ہے اور اوپر باتیں کیسی کرتا ہے۔

''چل اُٹھ چلیں گھر'' اُس نے کبیر کی دل کی مرادیں اور گورے بزرگوں کی الل ٹپ گفتگو پر کوئی تبصرہ کیے بغیر نرمی سے کہا۔ دونوں باپ بیٹا حجرے سے باہر نکلے تو تخت پوش پر بیٹھے نورداد کے بازو کبیر کو بہت تھکے ہوئے نظر آئے۔ اب وہ بازو اٹھتا تا بھی نہ تھا۔ بس گود میں پڑے ہاتھوں کی انگلیاں وہیں رکھے رکھے ہی دعا کے لیے اٹھا رہا تھا۔ سائلوں کی قطار بھی اب چھدری پڑ رہی تھی۔

''بہت سخت ڈیوٹی ہے چاچا'' کبیر نے الوداعی انداز میں کہا اور عین اسی وقت اسے عقب میں سے چٹانوں کے پیچھے غار میں سے ننگے افلاطون کا قہقہہ سنائی دیا اور کبیر کے خون میں ایک دم سے اُبال آ گیا۔ کبیر نے خود ہی اپنے آپ سے کہا کہ یہ محض اُس کا احساس ہے لیکن اُس کے قہقہے میں اُس کے لیے ایک تضحیک تھی۔ ایک فاتحانہ حقارت تھی۔ فوراً ہی کبیر کے ذہن میں یہ امیج بنا کہ وہ اس وقت اپنی زیرِ ناف ایستادگی کو زور زور سے ہلا رہا ہے ''خون......'' یہی وہ لفظ تھا جو اس وقت کبیر کے ذہن میں گونجا تھا اور اس کے شعور کو گہرا سرخ کر گیا تھا۔

''کسی دن میں اسے ہلاک کردوں گا۔ اس کو ایک بے جان چیز۔ مردہ گوشت کے ڈھیر میں تبدیل کردوں گا۔ یہ تصور کتنا لذت انگیز ہے۔ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیسی Obsession ہے۔ مجھے جلد از جلد اس جگہ سے دور بھاگ جانا چاہیے......'' جب وہ دونوں باپ بیٹا پہاڑی سے اُتر کر بھنڈر میں اُترے تو مہدی خان نے بات کی۔ ''تمہاری ماں کو فکر تھی کہ تم ہمیں بتائے بغیر ہی شہر نہ چلے گئے ہو''۔

''نہیں...... میں بتا کر جاؤں گا ابا جی...... میں کل جا رہا ہوں''۔

''کیا کل؟...... اچھا؟...... اچھا کل؟'' مہدی خان کو اِک دم سے چپ سی لگ گئی جو اگلی صبح

Scanned by CamScanner

سمیال سے کبیر مہدی کے واپس شہر جانے کے بھی کچھ دن بعد تک قائم رہی۔

O

بڑے شہر واپسی پر کبیر کی ناصر سے پہلی ملاقات کیفے غلام باغ میں ہی ہوئی۔ ''تمہارے والد ولد خط کا جواب میں دستی لایا ہوں برخوردار اور وہ جواب یہ ہے۔'' کبیر نے بہت سے کاغذ ڈاکٹر ناصر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''انہیں پڑھو اور اتنی دیر میں، میں...... ہاف مین سے غلام باغ کی اصلیت کے بارے میں اُس کی تازہ ترین آثار قدیمہ قسم کی کامیابیوں کا حال سنوں گا......''

کیفے غلام باغ میں شام گرم تھی لیکن ہاف مین گھر سے نکلنے سے پہلے چند الکحلی مشروب لے چکا تھا اور مزے میں تھا۔ رہا کبیر تو وہ اپنے ہاں کی گرمی کو کبھی بُرا کہتا ہی نہ تھا ''لے دے کے ہمارے پاس ایک یہ گرمی ہی تو ہے'' اس کا یہ مخصوص فقرہ ڈاکٹر ناصر کو زہر لگتا تھا لیکن وہ اب دستی پہنچے خط کے مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا اور اسی وقت عاشق علی بیرہ چائے لے آیا......اور ہاف مین نے سوچا کہ ادھوری وسکی اور Hash کے ایک سگریٹ کے بعد چائے میں بھی کوئی ہرج نہیں۔

کبیر نے تجسس سے اُس کی طرف دیکھا تو ہاف مین نے ناصر کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں علم ہے کبیر، ڈاکٹر محبت میں گرفتار ہو چکا ہے''۔

''ہاں مجھے اس سانحے کی اطلاع وہیں مل گئی تھی اور میں اپنا تفصیلی ردِعمل لکھ کر لایا ہوں جو اس وقت ہمارے مریض معالج کے زیرِ مطالعہ ہے......''

''تو تم وہاں اتنے دن بس یہی کام کرتے رہے ہو۔ خطوط نویسی'' ہاف مین نے سامنے رکھے کپوں کی گندگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں اور بھی بہت کچھ کرتا رہا ہوں۔ سمیال اگرچہ ایک سوئی ہوئی جگہ ہے لیکن میں نے وہاں ایک بڑا کام کیا ہے۔ میں نے افلاطون کو ننگا دیکھا ہے'' کبیر نے کہا اور پھر فوراً ہی اپنے اوپر لعنت بھیجتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ کیا حماقت سرزد ہو گئی ہے۔ یہ تو اپنا راز ہے خواہ مخواہ اس گورے جرمن کو اپنے گھریلو گورے کی کہانی کیوں سنائی جائے۔ اب یہ بدبخت تفتیش کرے گا جان نہیں چھوڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں بات بدلی جا سکتی ہے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہاف مین فلک شگاف قہقہے لگانے اور کیفے میں دور دراز تک لوگوں کو متوجہ کرنے کے بعد کہنے لگا۔

''میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کبیر۔ میں پہلے بھی یہ رائے ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر کرتا ہوں کہ اگرچہ تم دنیا میں کچھ کر نہیں سکے۔ لیکن تم ایک نایاب شخص ہو۔ اب یہ ننگے افلاطون کا کیا قصہ ہے بتاؤ بتاؤ...... کم آن......'' ہاف مین نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملے اور آگے جھک کر کبیر کی آنکھوں میں دیکھنے لگا میز اس کی بھاری بھر کم کہنیوں سے ہل کر رہ گیا چائے کے برتن ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ڈاکٹر ناصر نے کبیر کے دستی خط سے نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔

''میرا کپ مجھے دو پتہ نہیں یہ ذلیل آدمی کیا بکواس لکھ لایا ہے''۔

ہاف مین یا کبیر کسی نے بھی اُس کی خواہش پر کوئی فوری توجہ نہ دی۔ وہ اپنے ہی معاملے میں جُت چکے تھے۔ کبیر نے دل ہی دل میں کہا اب ضروری ہے کہ اصل معاملے سے اُسے دور بھگانے کے لیے کچھ بک بک شروع کر دی جائے۔ اس نے کہا'' ننگے سے مراد بس ننگا ہے یعنی جس نے کپڑے نہ پہنے ہوں تم اس سے کوئی عظیم علامت مراد نہ لے لینا کہ میں نے افلاطون کو اس کے ذریعے بے نقاب کیا ہے یا اس کے فلسفے میں کوئی دور کی کوڑی لایا ہوں یا اس طرح کی کوئی اور بکواس۔ میں دراصل ایک اور ہی بکواس سوچ رہا ہوں۔''

پھر خط میں کچھ پڑھ کر ناصر نے کہا'' اور میں یہ بکواس کر رہا ہوں کہ مجھے چائے دو'' اور بے تحاشہ ہنسنے لگا'' تم ایک انتہائی لعنتی آدمی ہو خدا کی قسم یہ کیا چیز لکھ دی ہے''۔

''بے شک'' کبیر نے کہا اور چائے کی پیالی اسے تھمائی۔

ہاف مین نے اپنے سرخ ناک کو کھجلاتے ہوئے کچھ سوچا اور کہا'' میرا خیال ہے کبیر ہم یہاں سے چلتے ہیں میں نے غلام باغ میں کچھ دلچسپ جگہ ڈھونڈ لی ہے۔ ڈاکٹر ڈسٹرب ہوئے بغیر تمہارا خط پڑھتا ہے اور ہم چلتے ہیں اُدھر۔'' اس نے پیچھے شام کی تاریکی میں ڈوبے صدیوں پرانے قدیم عجوبے کی طرف اشارہ کیا اور کبیر کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر بدستور خط پڑھ کر عجیب عجیب سے منہ بنا رہا تھا۔

کبیر نے اٹھتے وقت ناصر کا کندھا تھپکا'' یہ دستاویز مزے لینے کے لیے نہیں برخوردار۔ عبرت حاصل کرنے کے لیے ہے''۔

''مجھے یہ...... مجھے اس خط کا انگریزی ترجمہ کب ملے گا'' ہاف مین نے بے تابی سے پوچھا۔

''اب اس قدر دماغ بھی خراب نہیں ہوا ہمارا۔ ٹھیک ہے تم گورے ہو اور ہمارے آقا ہو۔

لیکن اگر اس تحریر کا مزہ لینا چاہتے ہو تو اُردو زبان سیکھو۔'' کبیر نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھ دیا۔ ہاف مین ہنسنے لگا اور پھر پُر جوش انداز میں کہنے لگا'' خدا کی قسم میں یہ کر گزروں گا۔ میں صرف اسی ایک خط کو پڑھنے کے لیے اُردو زبان سیکھ ڈالوں گا'' پھر اس نے جرمن میں کچھ پھکڑ تو لے اور چاروں طرف دیکھ کر زندگی پر اپنے گہرے اطمینان کا لطف اُٹھایا۔'' چلو مجھے دکھاؤ وہ اپنی دلچسپ جگہ۔ کتنی پرانی ہے ساڑھے تین ہزار سال یا کچھ کم......'' کبیر نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

'' چلو......مگر ساتھ ساتھ پہلے وہ ننگی افلاطونیت بھی چلنے دو۔ ہاں اب بولو'' ہاف مین ابھی کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔

ناصر کو اُس کے انہماک میں چھوڑ کر وہ دونوں نکلے اور گورے اور دیسی بندے کو یوں دوستانہ انداز میں دیکھ کر ہمیشہ ششدر رہ جانے والے معصوم چائے پیتے لوگوں کی میزوں میں سے رستہ بناتے وہ دونوں کیفے غلام باغ اور غلام باغ کے درمیان بنائی گئی دیوار کے پاس جا پہنچے۔ یہ دیوار کیفے کے مالک نے صدیوں پرانی اینٹوں اور آج کے سیمنٹ گارے کا جوڑ توڑ کر کے ایک دفعہ بنا ڈالی تھی مگر پھر اس وقت سے اس بے یقینی کا شکار چلا آ رہا تھا کہ آخر اِسے بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ جدید اور قدیم دنیا کے درمیان حائل اس بے ہنگم سی حدِ فاصل کو عبور کرنے کے بعد کبیر اور ہاف مین کھریا مٹی چونے اور چھوٹی اینٹوں سے بنی اس قدیم روش پر چلے جو آگے سکھوں کی ایک بوسیدہ مڑھی سے ہوتی ہوئی زمانہ قبل از مسیح کی مسمار نشانیوں کو جا رہی تھی۔ ہاف مین نے ایک طویل سانس کھینچا اور چاروں طرف کی نیم تاریکی میں نظریں گاڑتے ہوئے پورے یقین سے کہنے لگا۔

''جو آرکیالوجسٹ کھنڈروں کی اس ہوا سے گزری صدیوں کی خوشبو کا عطر کشید نہیں کر سکتا وہ خواہ مخواہ اس میدان میں اپنی ......'' اور پھر اس نے ایسے کسی بے چارے آرکیالوجسٹ کو پُر تشدد جنسی اعمال کی جبریت سے تو نب ڈالا۔ کبیر نے فوراً اس کے'' نادر خیالات'' سے اتفاق کیا۔ کچھ اس خیال سے بھی کہ گورا شاید بہک کر اِدھر اُدھر کہیں جا نکلے گا اور اسے ننگے افلاطون کی کوئی کہانی نہیں گھڑنی پڑے گی لیکن کبیر کو ایک بار پھر مایوسی ہوئی۔

ہاف مین نے شمال کی جانب اشارہ کیا'' جنم کھنڈر کی طرف جائیں گے اور ہاں وہ ننگی ننگی افلاطونیت شروع ہو جاؤ مزہ آ رہا تھا......''

Scanned by CamScanner

''لعنت ہو تم پر۔ کبھی کسی بات کو دفع بھی کر دیا کرو'' کبیر نے کہا لیکن پھر اچانک اس کے اناپ شناپ خیالوں میں ایک چھپا کا سا ہوا اور ذہن میں کچھ جرٔت ہونے لگی جسے اس نے فوراً ہی بے انتہا سنجیدگی سے لفظوں کے روپ میں نکالنا شروع کر دیا۔

''انسان کا جسم مائی ڈیئر ہیر ہاف مین بنیادی طور پر ایک ننگا جسم ہے'' کبیر نے کہا اور ہاف مین بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا۔

''آہ...... ایسا انوکھا خیال شاید آج تک کسی انسان کے ذہن میں نہیں آیا ہوگا''۔

''پہلے پوری بات سُن لیا کرو جرمن مسخرے پھر......'' کبیر نے بھنا کر کہا۔

''او۔ کے...... او۔ کے تو گہری بات ابھی آنی ہے۔ بولو میں سننے کو تیار ہوں۔'' ہاف مین نے کہا اور کبیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کی 'گہری' بات سننے کے ساتھ ساتھ جنم کھنڈر کی گہری تاریکی اور اونچے گھنے درختوں کے نیچے پھیلی اور بھی زیادہ گہری تاریکی میں متلاشی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

''ذرا سوچو'' کبیر نے لمبے تڑنگے جرمن کو ایک لاتعلق سی دعوتِ فکر دیتے ہوئے کہنا شروع کیا ''ذرا سوچو اگر کرۂ ارض اور انسانی نسل کی ارتقائی کھینچا تانی میں کچھ ایسا ہوا ہوتا کہ انسان کو ان لباسوں کے خولوں کا محتاج نہ ہونا پڑا ہوتا تو تہذیب، آرٹ، کلچر، سائنس، فلسفہ، کتنا مختلف ہوتا۔ انسان کے اعلیٰ فکری اور تخلیقی اعمال میں اس کا یہ لباس کہیں نہ کہیں اپنا فالتو اثر ضرور چھوڑتا ہے''۔

''اب عمدہ بات ہے'' ہاف مین نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔ ''واقعی ذرا سوچو ایک سکالر کوانٹم فزکس پر تحقیق کر رہا ہے۔ بہت سی کتابیں دیکھ رہا ہے۔ بک مارک کم پڑ جاتے ہیں۔ تو ایک موٹی سی کتاب میں بک مارک رکھنے کی بجائے عارضی طور پر وہ اپنا ڈک (Dick) ٹکا دیتا ہے صفحہ 325 اور 326 کے درمیان اپنا عظیم تولیدی عضو رکھتا ہے اور کتاب کو بند کر کے گود میں رکھ لیتا ہے اور پھر تحقیق میں جت جاتا ہے۔ پینٹر کہیں کہیں سافٹ سٹروک دینے کے لیے بے چارے کو استعمال کر لیتا ہے۔ پیانسٹ یا گٹارسٹ بھی شاید اسے انگلیوں کے بجائے استعمال کرنے کے ظلم کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ آئی ڈونٹ نو...... لیکن نسبتاً کم تخلیقی کاموں میں یقیناً انسان اس سے بے انتہا فائدہ اُٹھاتا مثلاً ٹھنڈے مشروبات میں چینی گھولنے کے لیے......''

اور پھر وہ دونوں قہقہے ضبط نہ کر سکے۔

Scanned by CamScanner

"ذلیل آدمی۔" کبیر نے کہا "تمہاری نسل دنیا کو مردانہ اُبھار کی چبھن جتانے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی ہے" اور ہاف مین حیرت زدہ سا رہ گیا۔

"میرے خدا واقعی میں عورت کو تو بھول ہی گیا......" اس نے ششدر لہجے میں کہا اور کبیر نے خوب اندازہ لگا لیا کہ اب شہوانی مناظر کے سلسلے اُس کے تصور میں چل پڑے ہوں گے مگر اچانک ہی جو تصور اِک دم سے تڑخ کر خود اس کے اپنے ذہن میں اُجاگر ہوا تھا وہ چپے سائیں کا تھا اور نیچے مٹی میں گرے مادۂ تولید کے قطروں اور گوں کے شیرے کے آمیزے پر ٹوٹ پڑتی چیونٹیوں کا تھا اور جس پر گہرا خون چھار رہا تھا۔ کبیر نے ایک طرح کی جسمانی طاقت سے کام لیتے ہوئے اپنے شعور کو تیزی سے دھوڈالنے کی کوشش کی اور اپنے اندر کی ایک دم کی ہولناک سرگوشیوں سے فوری نجات پانے کے لیے جب بولا تو اس کی آواز غیر معمولی طور پر بلند تھی اور ہاف مین کو بھی اپنی خیالی لذتوں کی جلق سے واپس لا کر اس کی بات کی طرف متوجہ کر گئی۔

"میں سمجھتا ہوں افلاطون اگر ننگا ہوتا اور اسی حالت میں مکالماتِ افلاطون لکھتا تو حقیقت اور مجاز کے درمیان اس کا قائم کردہ فرق قائم نہ رہ سکتا۔ دنیائے امثال کا نظریہ شاید کبھی وجود میں نہ آتا......" کبیر نے آخری نتیجے تک پہنچ جانے کے انداز میں کہا اور جسے ہاف مین نے فوراً ہی تسلیم کر لیا۔

"ہاں یہ بات یقیناً ایک گہری بات ہے" اس نے کہا پھر اپنی دو انگلیوں کو یک دم منہ میں دبا کر تیز سیٹی بجائی...... پھر کبیر نے دیکھا کہ کھنڈر کی بوسیدہ دیوار اور پتھروں کے ڈھیر کے بیچ میں سے ایک سایہ متحرک ہو کر ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وہ مدد علی تھا اور کبیر نے دل ہی دل میں کہا "اچھا تو یہ ایک بار پھر مدد علی ہے۔ پہلی بار تو وہ تھی جب اُس کے منہ سے وکٹورین دور کے برطانوی پاؤنڈ کا سکہ برآمد ہوا تھا۔" وہ واقعہ یاد آنے پر کبیر محظوظ ہوا لیکن اُس نے دیکھا کہ ہاف مین اور وہ بوڑھا گھوڑوں کا سائیس سازشی قربت کی کئی منزلیں طے کر چکے ہیں اور اب انہیں پرانے مضحکہ خیز واقعات یاد دلانا ایک بے لذت لطیفہ گوئی ثابت ہوگا۔ کبیر خاموش ہو کر دونوں کی باتیں سننے لگا...... "ہاں...... کچھ پاتا چلا......"

"لگتی تو یہی جگہ ہے صاحب زینے ادھر سے ہی نیچے جاتے ہیں مگر آگے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ صاحب پچاس سال پہلے کی بات ہے...... آگے، نیچے جا کر کچھ یاد نہیں آتا۔ دائیں کہ بائیں"۔

Scanned by CamScanner

"چالو ابھی چالو دیکھا ہے ابھی دیکھا ہے؟"

مدد علی کے چہرے پر بے بسی اور ایک انجانے خوف کی پرچھائیاں لہرائیں اور اچانک کبیر کو احساس ہوا کہ رات دنیا میں چند لمحے پہلے کی رات سے کہیں زیادہ تاریک ہو گئی ہے اور اندھیرا چہرے کی جلد کو چھوتا ہے اور ہزاروں سال قبل کا کوئی لمحہ اچانک اُن میں در آیا ہے اور مدد علی کے چہرے پر خوف اور بے چارگی کی لکیروں میں مجسم ہو گیا ہے۔

"مدد علی جنم کھنڈر کے زینوں میں نیچے اُترنا نہیں چاہتا" کبیر نے سوچا۔

"صاحب اس وقت نیچے جانا ٹھیک نہیں" بوڑھا گھگھیایا اور دوسرے لمحے ہی ہاف مین کی جیب سے سو سو کے کئی نوٹ نکل آئے۔" یہ لو" ہاف مین نے حقارت آمیز یقین سے کہا اور کبیر نے دل ہی دل میں اسے گندی گالی دی مدد علی نوٹ جیب میں ڈال کر حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

"آؤ کبیر" ہاف مین نے ایک بے ضرر سے طنزیہ لہجے میں کبیر سے کہا۔

غلام باغ میں اس وقت گہرا سناٹا تھا جو رات کی تاریکی کو اور بھی تاریک کرتا تھا۔" خاموشی اور تاریکی دونوں ہی نیستیاں ہیں اور کیسے ننگ منتگی گلے مل کر ہستی کی...... رہی ہیں۔" ننگے افلاطون کی "دشنام افروزی" ابھی تک کبیر کے ذہن پر چھائی تھی اور اب تو وجود و عدم کی آفاقی منطق کو بھی پراگندہ کرتی تھی۔ اس نے گہرا سانس کھینچا اور ہاف مین سے پوچھنے لگا۔

"تم کرنا کیا چاہتے ہو ذلیل گورکن؟"

"میں جنوبی ایشیا کی تہذیب کی...... میں اُتر جانا چاہتا ہوں پورے کا پورا...... آہ میں دھرتی ماتا کی ...... میں ننگا افلاطون ہوں...... نہیں ...... میں...... افلاطون کا مردانہ عضو ہوں۔ افلاطون کا......" ہاف مین نے چرس کے سگریٹ کا آخری کش دُور تک اندر کھینچا اور خوفناک قہقہے لگانے لگا۔ مدد علی خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور کبیر تعریفی نظروں سے ہاف مین کی طرف دیکھ رہا تھا اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں تحیر بھی تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ننگے افلاطون کا مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی لمحہ ہے ہاف مین میں تمہارا شکر گزار ہوں"۔

ہاف مین چرس کے چکراؤ میں مسلسل بکے جا رہا تھا۔" میں دھرتی ماتا کے شگاف میں اُتروں گا میں افلاطون کا مقدس Hard on ہوں...... اور پھر میرے منہ سے مادۂ کائنات کی پچکاریاں

Scanned by CamScanner

لکیں گی۔" قہقہوں کے دوران وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔" میرے خدا میں کیا بکواس کر رہا تھا...... کبیر...... میرے دوست...... ایک تو تمہارے یہاں کی چرس میں کوئی کوالٹی کنٹرول نہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کیا جہنمی Stuff تھا...... تم پلیز...... اسے...... مدد علی کو کہو کیفے سے میرے لیے تیز کافی بنوا کر لائے بغیر چینی کے...... اُس کے بغیر میرا ذہن قابو میں نہیں آئے گا...... کہو اُسے پلیز...... میں اس وقت مقامی زبان میں بولنے کے قابل نہیں ہوں پلیز"۔

اور کبیر نے مدد علی کو بتایا کہ گورا کیا چاہتا ہے پھر وہ دونوں ہزار سال پرانی اینٹوں کی دیوار پر بیٹھ گئے اور ہاف مین نے کہا!

"جب تک وہ کافی لے کر آتا ہے ہم کچھ دل کی باتیں کرتے ہیں مگر اپنے دل کی نہیں بلکہ ڈاکٹر ناصر اپنے پیارے سائیکاٹرسٹ کے دل کی باتیں"۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "آہ بے چارے نہتے مرد کا زخمی دل جو اُوپر اس کی آنکھوں سے اور نیچے اس کی ٹانگوں کے بیچ کے اعصاب سے ملا ہوتا ہے۔ یہ کائنات کا سب سے پہلا اور آخری سرکٹ ہے۔ بہر حال قصہ یہ ہے کبیر کہ ہمارا ڈاکٹر بیمار ہے اور اس کی بیماری یعنی وہ عورت"۔ یہاں پہنچ کر وہ انگریزی سے جرمن میں منتقل ہو گیا اور کچھ دیر غیبوں، تڑوں اور اشروں کی آوازوں کی کھڑکھڑاہٹ کرتا رہا۔ کبیر نے بے چینی سے اسے دیکھا۔ "اب انگریزی ترجمہ بکو"۔

"ہاں" ہاف مین مسکرایا...... اور ڈرامائی انداز میں بولنے لگا۔ "وہ عورت، وہ عورت ہو گی جو یونانِ قدیم کے تھیٹر میں افرودایتی کا کردار ادا کرتی تھی"۔

"قدیم یونانی تھیٹر میں عورتوں کے رول بھی مرد ہی ادا کرتے تھے" کبیر نے خشک لہجے میں کہا اور ہاف مین گالیاں دینے لگا......

"لعنت ہو تم پر...... سارا Spell توڑ دیا تم نے"۔

"لیکن افرودایتی تم نے ٹھیک کہا' وینس'۔ تم کہیں صحیح جگہ جا پہنچے ہو ہیر ہاف مین' خاتون کا نام بھی زہرہ ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا......"

"زہرہ!" ہاں میں جانتا ہوں کچھ ایسا نام ہے Femme Fatale کا جیسے فرانسیسی میں کہیں گے۔

"مگر عربی میں وینس کو کہتے ہیں وہاں سے یہ لفظ اردو میں آ گیا مگر کیا تم ڈاکٹر کی محبوبہ کو دیکھ

چکے ہو؟''

''تو کیا تمہیں ڈاکٹر نے بتایا نہیں؟''

''کیا نہیں بتایا؟'' کبیر نے بھویں سکیڑتے ہوئے تاریکی میں نظریں گاڑیں اور ہاف مین کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔

''آہ۔ واقعات۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہیں پوٹھوہار خط لکھنا ڈاکٹر کی زندگی کا دنیا کے ان علاقوں میں آخری واقعہ تھا...... نہیں...... ویسے تم جانتے ہو کبیر یہ جو علاقہ ہے پوٹھوہار یہاں زمین کے چند ہزار میل نیچے Techtonic پلیٹس آپس میں ٹکرا رہی ہیں......'' جرمن کا ذہن بہکا اور جب اسے خود ہی احساس ہوا کہ بہک رہا ہے تو ہنس پڑا۔

''جانتا ہوں'' کبیر نے کہا ''مگر تم زمین میں اپنی آرکیالوجی سے زیادہ گہرا جانے کی کوشش مت کرو۔ جیالوجی میں جا پہنچے تو دفن ہو جاؤ گے''۔

ہاف مین کی ہنسی اب زیادہ پُرخلوص تھی اسی لیے اس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا ''تم بات کرنا جانتے ہو کبیر۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں''

''فی الحال تم ڈاکٹر ناصر کی محبت کی بات کرو۔ کیا ہوتا رہا ہے یہاں میری عدم موجودگی میں......'' کبیر بولتے بولتے رُک گیا اور پھر مایوسانہ انداز میں کہنے لگا ''مگر رہنے دو ایک چرس زدہ جرمن آرکیالوجسٹ میرے کسی ہم وطن معالج کی داستانِ عشق کا معقول رپورٹ نہیں بن سکتا۔ ایک مقامی ماہرِ امراضِ دماغی کے عشق کی کہانی جرمن ماہرِ آثارِ قدیمہ کی زبانی'' کبیر مقامی زبان میں بڑبڑایا اور ہنس پڑا۔

''مجھے گالیاں دے رہے ہو'' ہاف مین پھنکارا۔

''تمہارا کیا خیال ہے بے وقوف آدمی ہمارے ہاں کی زبانیں صرف گالیاں بکنے کے لیے ہیں'' اور پھر کبیر نے اسے بتا دیا کہ وہ کیا بڑبڑا رہا تھا۔

''آ...... نہیں...... بلکہ میری رپورٹ تو زیادہ معروضی ہو گی وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں Bare Facts یعنی ننگے حقائق...... ننگا افلاطون'' ہاف مین پھر ہنس رہا تھا۔

''تمہارا ذہن ناکارہ ہو چکا ہے'' کبیر نے غصے سے کہا اور دل ہی دل میں تشویش سے ناصر کے بارے میں سوچنے لگا۔

Scanned by CamScanner

"آخر کیا ہوا ہوگا اُس بے وقوف کے ساتھ اور پھر یہ گورا کہاں Involve ہو گیا...... کم بخت ہمارے ہر معاملے میں جا گھستا ہے"۔

"دراصل میں تمہارے ہر معاملے میں جا گھستا ہوں اور میرے ذہن کے ناکارہ ہونے کا اصل سبب بھی ہے" ہاف مین کا اتفاقیہ جواب کبیر کے لیے ایک ٹیلی پیتھک بے چینی پیدا کر گیا۔ جبکہ ہاف مین کہہ رہا تھا "دراصل قصور میرا اپنا ہی ہے مجھے اپنا گورے آدمی کا فاصلہ برقرار رکھنا چاہیے تھا۔ گھٹیا، غیر مہذب، پسماندہ لوگوں سے میل ملاپ نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا...... گرٹروڈ پہلے ہی مجھے کہتی ہے ڈارلنگ تم سے کبھی کبھی مجھے مقامیوں کی بُو آتی ہے"۔

"او...... تو کیا وہ مقامیوں کو بھی سونگھ چکی ہے......"

"بکواس مت کرو ورنہ مجھ میں مقامیوں جیسی یہ صفت بھی آ چکی ہے کہ میں اپنے Honour کے لیے قتل بھی کر سکتا ہوں......"

"اور میں تمہیں ویسے ہی قتل کر سکتا ہوں" کبیر نے پُرخلوص انداز میں کہا۔ "میں تمہیں کاٹ کر یہیں گاڑ دوں گا......"

"اور پھر ایک دن کوئی یہاں سے میرا ڈھانچہ برآمد کرے گا...... جیسا......" ہاف مین نے کچھ کہنا چاہا۔

"ویسا" کبیر نے اس کی بات کاٹی "اُن ڈھانچوں جیسا جیسے Auschwitz میں بے چارے یہودیوں کے برآمد ہوئے تھے مگر نہیں ڈھانچوں کی تو نوبت ہی نہیں آنے دی گئی تھی۔ برقی بھٹیاں سب کچھ اُڑا کر لے گئی تھیں...... مگر نہیں...... اُڑا کہاں...... چربی تو اکٹھی کر لی جاتی تھی شاید صابن بنانے کے لیے اور ہڈیوں کی راکھ سے کھاد شاید...... کیلشیم فاسفیٹ۔ Human stuff اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو بڑا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے"۔

کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں ہاف مین کے سینے سے برآمد ہوئیں "اب تم نے میرا نشہ غارت کیا ہے۔ Baden Baden اور نازی حوالے میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ بھی کوئی اسٹینڈرڈ جرمن رویہ نہیں...... مگر تم نے...... مگر تمہارا یہ ایک کمینہ وار تھا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں"۔

"تم یقین نہ دلاؤ تو بھی میں یقین کر لیتا ہوں" کبیر نے گہری آسودگی سے کہا "ویسے یہ

Scanned by CamScanner

کمینہ وار اپنا مقصد پورا کر چکا ہے اور تم حواس میں آ چکے ہو۔ اگر ابھی کچھ کسر باقی ہے تو......'' کبیر نے تاریکی میں نظریں گاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا...... ''اگر کوئی کسر باقی ہے تو علاج آ رہا ہے...... میرا خیال ہے اگر میں غلطی نہیں کرتا تو سکھوں کی مڑھی کے ساتھ اس وقت جو سایہ ہماری طرف متحرک ہے وہ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بے چین یک چشمی روح نہیں تو پھر بے چارہ مددعلی ہے جو تمہارے لیے بلیک کافی لا رہا ہے۔''

نازی ازم اور بلیک کافی نے ہاف مین کا نشہ اُتار دیا۔ اس نے خالی پیالی واپس مددعلی کو پکڑانا چاہی مگر پھر اسے ساتھ ہی دیوار پر رکھ دیا اور مددعلی کو حکم دیا۔ ''تم چالنٹا اُڈار...... جانام کا نڑ کا...... باٹ کرنا آ ٹا...... چالو......''

''صاحب۔ بیٹری دے دیں...... ذرا......'' مددعلی نے التجا کی۔ ''کیا مانگٹا'' ہاف مین نے دائیں ہاتھ سے ٹارچ کو اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں ایک بار پھر اوپر نیچے پھسلاتے ہوئے پوچھا اور جواباً کبیر نے کہا۔ ''یہ فحش حرکت چھوڑ دو اور اسے ٹارچ دے دو'' اور پھر خود ہی ٹارچ اُس کے ہاتھ سے نکال کر مددعلی سے پوچھنے لگا ''ڈاکٹر صاحب ابھی بیٹھے ہیں ادھر کیفے میں''۔

''نہیں صاحب چلے گئے۔ جب میں کافی لینے پہنچا تو جا رہے تھے ڈاکٹر صاحب جی کچھ کاغذ پکڑے جا رہے تھے''۔

''ہوں تو اس کا مطلب ہے اس نے پورا خط نہیں پڑھا ہوگا ابھی'' کبیر نے پُرتشویش خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''ہیں جی؟'' مددعلی ایسے بولا جیسے اس سے کوئی قصور ہو گیا ہو۔

''نہیں...... تم نہیں...... تم جاؤ جہاں گورا کہتا ہے جاؤ اُدھر ہم آتے ہیں'' مددعلی کھڑے قدموں مُڑ گیا اور ٹارچ روشن کر کے جنم کھنڈر کی طرف چلنے لگا اس کی نظریں اپنے پاؤں میں ٹارچ کی روشنی پر تھیں۔ غلام باغ میں چلنے کا یہ اس کا پرانا انداز تھا۔ اگرچہ اسے یہ معلوم نہ تھا مگر چلنے کا اُس کا یہ انداز زیرِ زمین بارودی سرنگیں ڈھونڈنے والوں جیسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مددعلی بارودی سرنگیں نہیں زیرِ زمین خزانے ڈھونڈتا تھا۔

''ڈاکٹر کا وہ خط جس کے جواب میں کچھ لکھ کر تم اپنا ہی پوسٹ مین بنے ہوئے آئے ہو عشق کی جان لیوا تنہائی میں ایک زخمی دل کی شاید پہلی چیخ تو تھی مگر آخری چیخ نہ تھی'' ہاف مین نے

Scanned by CamScanner

پُرخیال انداز اور بھونڈی انگریزی میں کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو" کبیر نے کہا۔

"عشق کے لازوال جذبے کی پیچیدگی پر اظہار خیال کر رہا ہوں"۔

"ہماری روایتی شاعری اس طرح کی خرافات سے بھری پڑی ہے۔تم وہی بکو جو تم نے کہا تھا یعنی Bare Facts اُس رات مجھے خط لکھنے کے بعد ڈاکٹر نے کیا کیا؟"

ہاف مین نے ایک طویل ٹھنڈا سانس کھینچا اور پھر گھرے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا "اس نے خط پوسٹ کر دیا"۔

اور کبیر نے اضطراری انداز میں اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "لگتا ہے کافی نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا"۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں" ہاف مین نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر سنجیدگی سے کہنے لگا "اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ Hash دماغ میں حسِ مزاح کے مراکز کو بھی...... کر رکھ دیتی ہے"۔ پھر مزید سنجیدگی سے بولا "ڈاکٹر اگلی صبح میرے فلیٹ پر آیا تھا"۔

"ہوں" کبیر نے ناک میں ذمہ دارانہ سی آواز پیدا کر کے ہاف مین کو احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ ہمہ تن گوش ہے اور اس کے متوقع بیان میں مداخلت کی کوشش نہیں کرے گا۔

"میں رات گرٹرپوڈ کی طرف تھا اور صبح دس بجے بھی سوتا تھا"

"غیر متعلق حوالے دینے سے اجتناب کرو" کبیر فوراً ہی مداخلت پر اُتر آیا "او...... آئی ایم سوری" ہاف مین کے لہجے میں طنز تھی "مجھے اپنی سویٹ ہارٹ کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔ بہر حال ڈاکٹر قرونِ وسطیٰ کے کسی عاشق کی طرح نڈھال تھا۔ جب اس دن وہ آیا......"

"قرونِ وسطیٰ میں ابھی عشق کا رواج نہیں تھا۔ یہ بعد کی ایجاد ہے" کبیر نے کہا اب جھنجھلانے کی باری ہاف مین کی تھی۔

"اس طرح تو بات ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گی" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"ok-ok......اب نہیں...... آگے چلو" کبیر نے تھپکی دی۔

"ڈاکٹر نے مجھے سب کچھ بتا دیا یعنی برطانوی پونڈ والی رات کے نصف آخر میں کسی پُراسرار دوا کی زہر خورانی کا شکار ہو کر سائیکیاٹری وارڈ میں آنے والے عطائی کے علاج سے لے کر اسی عطائی کی بیٹی کے عشق کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے تک کے سب واقعات۔ ڈاکٹر کے اس

Scanned by CamScanner

نوحے میں Herbal Medicine، زہر اور تمہارے کسی میگزین کا ایڈیٹر بھی شامل تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ یقین حد تک دلچسپ تھا اور عجیب طلسماتی سا تھا۔ میں تمہارے کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا...... میں اعتراف کرتا ہوں، بہر حال میں جانتا ہوں اس سے جو فینٹسی حوالے میرے ذہن میں بنے وہ میرے اپنے تھے۔ مجھے دانتے اور بیٹرس کا عشق یاد آیا''۔

''دانتے اطالوی تھا اور گوئٹے شاید جرمن ہونے کی وجہ سے عشق کے قابل نہیں تھا۔ کبیر بہم سے انداز میں بڑبڑایا اور پھر پورے خلوص سے ہاف مین کو کہنے لگا ''بہت خوب آگے چلو۔

''جہنمی انسان'' ہاف مین غرایا۔

''کون دانتے یا گوئٹے؟...... ہاں یقیناً گوئٹے اگرچہ Divine Commedy...... لکھتے وقت وہ جہنم کے بہت قریب سے گزرا تھا''۔

ہاف مین نے مزید بک بک کی ترغیب کو بمشکل نظر انداز کیا اور پھر اپنے بیان پر آ گیا۔ ''میں نے ڈاکٹر سے اُس کے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا۔۔۔ اگرچہ میں تمہارے کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا مگر وہ اس وقت تو شدید ہیجانی کیفیتوں کی زد میں تھا اور وہ دونوں ہی سچی تھیں۔ کم از کم اُس صبح۔ ایک تو وہ عطائی کی اصل جاننے کے لیے بے تاب تھا اور دوسرے اس کی بیٹی کے لیے اپنے جذبے کی حقیقت جاننے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کی ہیجانی دنیا میں کچھ مداخلت کرنے کی بجائے اس کے لیے معقول ناشتہ تیار کیا جو اُس نے کافی رغبت سے کھایا بلکہ اس پر مجھے لمحہ بھر کے لیے اُس کے عشق کے روگ پر شک بھی ہوا تھا۔ کیونکہ میں نے کہیں سُن رکھا ہے کہ اپنی مریضانہ حالتوں میں عشق بھوک مار دیتا ہے مگر ڈاکٹر کے کیس میں ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد جب میں نے اس سے آئندہ اقدام کے بارے میں پوچھا تو وہ پُرعزم لہجے میں بتانے لگا کہ وہ اسی وقت جائے گا اور اس بدمعاش عطائی سے صاف صاف پوچھے گا کہ وہ کس طرح کی Drugs میں Deal کر رہا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اگر کوئی پولیس کیس بنتا ہے تو بہتر ہوگا کہ وہ قانون کی مدد لے۔ مگر ڈاکٹر اس بات پر آمادہ نہ تھا بلکہ اکیلا ہی پھر اُسی گھر جانے پر مصر تھا جہاں ایک رات پہلے اسے ایک طرح سے زبردستی نکال دیا گیا تھا...... میں اگرچہ تمہارے کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن......''

''یہ فقرہ بار بار مت بولو'' کبیر نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

Scanned by CamScanner

''بہت بہتر''۔ ہاف مین نے پوری سعادت مندی سے کہا'' لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی
تھی کہ ہمارے بچارے Love Sick نوجوان سائیکیاٹرسٹ کا یوں تن تنہا اس عیار Herbalist
کی کمین گاہ میں جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اس پر
کچھ اثر نہ ہوا۔'' ہاف مین یک دم خاموش ہو گیا اور سناٹے میں کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ''تم
نے کچھ سُنا۔ شاید مدد علی کی آواز تھی......''

''نہیں میں نے کچھ نہیں سُنا۔ جب اسے اشرفیوں کا صندوقچہ مل جائے گا تو آواز دے
دے گا۔ تم اپنا بیان جاری رکھو...... تو ڈاکٹر وہاں گیا؟'' کبیر نے بے چینی سے پوچھا

''ہاں...... میں ہی اسے وہاں لے گیا۔ میں نے نواب Something جنگ کی طرف جانا
تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا وہ اسٹیشن ویگن پر میرے ساتھ ہی آ جائے۔ جہاں کہے گا ڈراپ کر
دوں گا۔ ڈاکٹر نے آخر ایک پوش آبادی کے ایک اچھے خاصے گھر کے گیٹ کے قریب گاڑی رکوائی
اور گیٹ کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا......'' ''کبیر مدد علی کی آواز لگتی ہے مجھے......'' ہاف مین نے پھر
کان کھڑے کیے۔

''ارے بابا کچھ نہیں...... ڈاکٹر کیا دیکھ کر حیران رہ گیا؟''

''بظاہر وہ کوئی حیران کرنے والا منظر نہیں تھا۔ اس راج کے زمانے کی طرزِ تعمیر والے گھر
کے اندر سے ڈرائیو وے پر ایک کار آہستہ آہستہ رینگتی آ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ میں کوئی خاتون
تھی۔ کار کے ساتھ ساتھ ایک بوڑھا مرد قدم اٹھاتا آ رہا تھا اور لگتا تھا کہ دونوں میں کوئی تکرار ہو
رہی ہے کیونکہ بوڑھے کے دونوں ہاتھ آزادانہ ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے جبکہ خاتون کا اسٹرینگ
سے آزاد دایاں ہاتھ بھی متحرک ہوتا تھا۔ ہم سڑک کے مخالف کنارے پر کھڑے تھے اور اس گھر
کے گیٹ میں سے اگر کوئی دیکھتا تو مجھے ہی دیکھتا۔ ڈاکٹر میری بائیں طرف تھا اور غالباً نظر نہیں آتا
ہوگا۔ لیکن ہماری طرف کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ پھر ایک قدرے حیران کرنے والا واقعہ ہوا۔ ہاں
اس سے پہلے ظاہر ہے ہذیانی انداز میں ڈاکٹر مجھے بتا چکا تھا کہ یہ وہی دونوں باپ بیٹی ہیں۔ تو پھر
یہ ہوا کہ کار ایک دم عین گیٹ کے بیچ میں رُک گئی۔ خاتون عجیب اضطراب کے عالم میں کار سے
باہر نکلی اور دھماکے سے کار کا دروازہ بند کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتی گیٹ سے باہر آئی اور سیدھی میری
بے چاری اسٹیشن ویگن کی طرف بڑھنے لگی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کی آمد کے وہ چند

Scanned by CamScanner

لمبے قیامت کے لمبے تھے۔ اگرچہ میں تمہارے کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن پرانے عہد نامے کو نسبتاً زیادہ جانتا ہوں۔ وہ عام معنوں میں شاید بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی مگر اس کے چہرے، روپ، جسم اور چال ڈھال میں کچھ تھا جو Biblical تھا۔ اب اسے دیکھوں تو پتہ نہیں خیال کیا ہو لیکن اُس وقت جو خاکے میرے ذہن میں بنے وہ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ ایک تو مجھے لگا کہ جیسے ملکہ سبا آ رہی ہے The queen of sheeba...... پھر مجھے جنوبی ہند کے مندروں کی مورتیاں یاد آئیں۔ ہڑپی زمانے سے نکلنے والی Terra cota کی دھرتی دیویاں یاد آئیں۔ پھر نسبتاً گھسی پٹی رائیڈر ہیگرڈ کی She......اور پھر شاید اسی لیے میرا ذہن اور بھی گھس پٹ گیا اور میں اپنی سلامتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک گورا اجنبی دنیا کے ان علاقوں میں کسی بھی آفت کا شکار ہوسکتا ہے۔ مجھے یاد ہے اس وقت وہ سڑک کے عین درمیان میں پہنچی تھی جب میں یہ سوچ رہا تھا۔ گرٹ یوڈ کے علاوہ سفارت خانے کے بعض اور بہی خواہ مجھے اکثر مشورہ دیتے ہیں کہ میں مقامیوں سے زیادہ راہ و رسم نہ رکھا کروں اور میں ہمیشہ انہیں سمجھاتا ہوں کہ میرے پیشے کی نوعیت ہی ایسی ہے۔ آرکیالوجسٹ اور کوہ پیما مقامی آبادی کی مدد کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میں انہیں سر جان گارڈنر ولکینسن کی مثال دیتا ہوں۔ اس کی مصر کی مہمات اور عربی سیکھنا وغیرہ"۔

"فی الحال تم یہ فضول قصے چھوڑو اور ملکہ کو سڑک کے درمیان سے آگے آنے دو" کبیر نے جھنجھلا کر کہا۔

"خیر میرے خدشات واقعی فضول تھے۔ اس نے تو جیسے پوری اسٹیشن ویگن کو ہی نہ دیکھا تھا وہ اسٹیشن ویگن کے بہت قریب پہنچی ضرور مگر اس وقت جب دور اُس کا باپ اُس کے پیچھے بھاگنے کی بجائے گیٹ میں روکی گئی کار میں بیٹھ کر ریورس جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر کی محبوبہ نے ایک آٹو رکشا رکوایا اور رکشا والے سے مقامی زبان میں کچھ کہا جس میں سے مجھے صرف 'جنرل ہسپتال' سمجھ میں آیا۔ آٹو رکشا چلا گیا اور سامنا گیٹ بھی بند ہو گیا۔ کوئی سگریٹ ہے تمہارے پاس"۔

"نہیں"۔

"جنرل ہسپتال" بظاہر یہ بالکل بے ضرر الفاظ ڈاکٹر کے زخمی اعصاب پر بجلی بن کر گرے تھے۔ اس نے اکھڑے سانسوں میں کہا "'جنرل ہسپتال' کیا وہ مجھے ملنے وہاں جا رہی ہے؟" ڈاکٹر کے اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں مَیں بھی اُس کی مدد کر سکتا تھا کہ اسٹیشن ویگن میں اسے فوراً

Scanned by CamScanner

جنرل ہسپتال چھوڑ آتا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اسے گیٹ پر اُتارتے وقت میں نے اس کے مستقبل کے لیے اچھی امیدوں کا اظہار کیا اور آٹھ دس دن کے لیے اجازت مانگی۔

"آٹھ دس دن؟" کبیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اسی دن نواب Something جنگ سے ملنے کے بعد مجھے شمال کی طرف جانا تھا۔ تمہیں علم ہے ادھر بھی شمال میں ایک جگہ کچھ باغات ہیں ہمارا یہ غلام باغ اگرچہ محض باغ نہیں ہے لیکن اس کے 'مغلیہ باغ' کے بارے میں میرے کچھ Hypotheses ہیں۔ انہیں پرکھنے کے لیے ان دوسرے باغات کا مطالعہ ضروری تھا"۔

"اور پھر جب تم واپس آئے تو...... ڈاکٹر......"

"میں آج ہی واپس آیا ہوں اور ابھی تمہارے سامنے ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی جب وہ تمہارا خط پڑھنے والا تھا...... مجھے آٹھ دس کی بجائے پندرہ بیس دن لگ گئے۔"

"تو گویا تمہیں کچھ علم نہیں کہ اس روز ڈاکٹر پر کیا بیتی......؟" کبیر کا لہجہ تجسس اور مایوسی سے بھرا تھا۔

"آج ہم ڈاکٹر سے معلوم کر لیں گے کہ اس روز اس پر کیا بیتی تھی اور بعد میں کیا ہوا...... ویسے مجھے یقین ہے ملکہ سبا علاج کے لیے جنرل ہسپتال میں گئی ہو گی......" ہاف مین نے ہنستے ہوئے کہا "ابھی ذرا ہم مدد علی کے ساتھ نیچے جنم کھنڈر کے مقعد میں گھس لیں پھر چلیں گے...... مگر اسے بہت دیر ہو گئی...... بوڑھا بیوقوف آیا نہیں ابھی تک" ہاف مین نے تشویش سے کہا۔

"کیا یہ خلاف وضع فطری آرکیالوجی آج کے دن ہی ہو سکتی ہے" کبیر نے بدستور ڈاکٹر ناصر۔ زہرہ۔ یاور عطائی اور جنرل ہسپتال کے بارے میں سوچتے ہوئے ہاف مین سے پوچھا۔ ہاف مین ہنسا اور پُر اسرار سے بناوٹی لہجے میں کہنے لگا۔

"آج کے دن نہیں مگر آج کی رات ہی۔ نواب Something جنگ نے بڑی مشکل سے مدد علی کو آمادہ کیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" کبیر غلام باغ کی تاریکی میں واپس آ گیا۔

"آج وہ جمعرات ہے جب ساری رات آسمان پر چاند نمودار نہیں ہو گا"۔

"کالی جمعرات" کبیر نے اضطراری انداز میں کہا۔

Scanned by CamScanner

''کیا مطلب'' ہاف مین نے انگریزی میں ترجمہ چاہا۔
'' Black Thursday......مگر یہ ایک فضول ترجمہ ہے۔ Dark Thursday شاید......''
'' Evil Thursday......زیادہ مناسب رہے گا''۔
''لگتا ہے تم مجھے اب کوئی اور بے سروپا کہانی سنانے والے ہو'' کبیر نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔
''کالی جمعرات آسیبی کہانیاں سنانے کے لیے بہت موزوں ہے نواب Something جنگ کا بھی یہی خیال ہے''۔
''تم نے جو کچھ مجھے سنانا ہے جلد سناؤ۔ میں اب مزید ہاں۔ ہوں۔ ہم نہیں کروں گا۔ کبیر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
''نواب کا خیال ہے کہ مدد علی کی سنہری صندوقچے اور اشرفیوں کی کہانی درست ہے۔ لیکن وہ صندوقچہ اصل میں جواہرات کا صندوقچہ ہے جس کی مالک راجپوت مہارانی تھی جو خاوند کی موت کے بعد ستی ہوگئی۔ اب صندوقچہ یہیں جنم کھنڈر کے اندر کہیں موجود ہے اور اس پر ایک سانپ پہرہ دیتا ہے۔ سانپ صرف کسی کالی جمعرات کو باہر نکلتا ہے. اگر اس وقت اس کا تعاقب کیا جائے تو سنہری صندوقچے تک پہنچا جاسکتا ہے۔'' ہاف مین نے داد طلب خاموشی اختیار کی اور کبیر کو دیکھا جو اب ہزار سالہ پرانی دیوار سے اُٹھ کر اس کے سامنے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔
''سانپ غالباً رفع حاجت کے لیے نکلتا ہوگا'' کبیر کسی سانپ کی طرح ہی پھنکارا۔ ''کیسی واہیات، بیہودہ بکواس ہے، میرا اُس جرمن یونیورسٹی کی انتظامیہ کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جس نے تم جیسے توہم پرست لفنگے کو غلام باغ پر ریسرچ کے لیے بھیج دیا ہے۔ کہیں تم سی۔ آئی۔ اے کے ایجنٹ تو نہیں ہو اور یہ سب فراڈ پھیلایا ہوا ہے تم نے''۔
ہاف مین کا قہقہہ بھرپور تھا۔ ''سی آئی اے کے ایجنٹ ایسی واہیات، بیہودہ بکواس کا جواب نہیں دیا کرتے۔ جہاں تک اول الذکر بکواس کا تعلق ہے تو میں بھی اُسے ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ لیکن میں اپنے کام میں بلکہ ہر کام میں تقریباً دو فی صد اس بکواس کی گنجائش ضرور چھوڑتا ہوں۔ صرف دو فی صد سنہرے صندوقچے کے لیے زیادہ نہیں ہیں اور پھر One Never Knows''۔

Scanned by CamScanner

"ہاں One Never Knows ...... بلکہ One Really Never Knows ...... تھکن کہیں اندر سے کبیر کے دل پر مار کر رہی تھی ......" تو اب ہم یہاں کیا انتظار کر رہے ہیں۔ مدد علی یہاں آ کر ہمیں بتائے گا کہ اس نے سانپ کو دیکھ لیا ہے"۔

"نہیں مدد علی تو ہراول دستے کے طور پر گیا ہے۔ وہ شیطانی زینوں کے راستے نیچے تہہ خانے میں کوئی اور خفیہ زینہ ڈھونڈے گا اور ہمیں آ کر اطلاع دے گا مگر ڈیڑھ گھنٹہ تو ہو گیا ہو گا ہمیں باتیں کرتے اور وہ آیا نہیں۔ کہیں سو گیا ہو گا۔ موسم گرم اور خواب آور ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بوڑھا سائیس افیم بھی کھاتا ہے۔ کبھی تم نے اس کی پتلیوں کو دیکھا ہے۔ آؤ چلیں اسے جگاتے ہیں اور یہ مہم کسی اگلی کالی جمعرات تک کے لیے ملتوی کرتے ہیں۔ چلتے ہیں کہیں اطالوی کھانا ڈھونڈتے ہیں اور پھر ڈاکٹر کو آدھی رات اُس کے وارڈ میں پکڑتے ہیں اور اُس سے عشق کی باقی روداد سنتے ہیں"۔

کبیر کسی اشتیاق کا مظاہرہ کرنے کی بجائے پھر ہاف مین کے بائیں طرف کھریہ مٹی کی دیوار پر بیٹھ گیا "میں بے انتہا تھک گیا ہوں" اس نے کہا "مجھے ذرا اپنے آپ کو سمیٹنے دو"۔

"تمہیں دو ڈبل جاندار وسکی کی ضرورت ہے"۔

"نہیں۔ میرا ذہن کبھی کبھی خود ہی اپنے لیے نشے کا اہتمام کر لیتا ہے"۔

"جیسا اس وقت"۔

"ہاں۔ شاید جیسا اس وقت"۔

"یہ ترکیب مجھے بھی سکھا دو Self Intoxication کی"۔

"اس کے لیے صدیوں کی ذلت درکار ہے اور اب خاموش ہو جاؤ پلیز" اور کبیر نے سوچا کہ پچھلے چند ماہ سے وہ کیسے عجیب اناپ شناپ واقعات میں گھرا پڑا ہے۔ الف الف ہے۔ الف یا تو ب ہے یا ب نہیں ہے اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ الف بیک وقت ب ہو بھی اور ب نہ بھی ہو۔ کائنات میں الف الف ہے کی مضبوط ٹھکی منطق کی کیلیں ڈھیلی ہو کر باہر آنے کو ہیں۔ الف بے ہے۔ ہاف مین سی آئی اے کا ایجنٹ نہیں ہے۔ زہرہ ڈاکٹر ناصر ہے۔ ڈاکٹر عطائی ہے۔ عطائی یاور ہے۔ یاور ننگا افلاطون ہے۔ جو سانپ ہے وہ صندوقچہ ہے۔ صندوقچہ میرا ایڈیٹر ہے۔ ایڈیٹر نجم الثاقب ہے۔ اونٹ کھال کی قرص کیف ہے۔ کیف مستی ہے۔ ہنگامہ ہے سرشاری ہے۔ موت ہے۔ جل

Scanned by CamScanner

پتھری ہے۔ قطرہ۔ قطرہ۔ قطرہ...... عورت ہے۔ جو زہرہ ہے ملکہ سبا۔ گرٹریوڈ۔ ہاف مین کی آسٹریلوی عورت ہے۔ عورت مرد ہے۔ مرد آسمان ہے۔ زمین گر رہی چاند ہے۔ کالی جمعرات ہے...... روشنی......"

ہاف مین بُری طرح بوکھلا کر جھٹکے سے اُٹھ گیا اور اُس نے جرمن میں خدا کو یاد کیا۔ مدد علی کی دلدوز چیخ دُور کسی گہرے کنوئیں سے اُٹھتی ہوئی آنے کے باوجود غلام باغ کے سناٹے میں شگاف ڈال گئی تھی۔ پھر ایک اور چیخ جو کبیر کو بھی چشم زدن میں معمول کی کائنات میں واپس لے آئی اور جس کی متوحش منطق اُن دونوں کو جنم کھنڈر کی طرف دیوانہ وار بھگانے کے لیے اُتر آئی تھی۔

OOO

مددعلی پھر چُپ سادھ لیتا ہے

ہاف مین نے اپنے تحقیقی مقالے ''غلام باغ کا معمہ'' میں ایک جگہ لکھا تھا ''یوں تو غلام باغ میں موجود سب تاریخی آثار اپنے اپنے چھوٹے بڑے اسرار لیے کھڑے ہیں یا رفتہ رفتہ گر رہے ہیں مگر سب سے بڑے اسرار اس تاریخی ساخت میں ہیں جو جنم کھنڈر کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ 'جنم' ہندی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی پیدائش کے ہیں جبکہ 'کھنڈر' برباد شدہ عمارت کا ایک لفظی ہندی مترادف ہے۔ اس لحاظ سے یہ ترکیب Paradoxical ہے۔ جنم زندگی اور نمو کی علامت ہے جبکہ کھنڈر خواہ وہ کسی عمارت کا ہی کیوں نہ ہو، وقت کے ہاتھوں آخر کار مٹ جانے کا استعارہ ہے اور موت کا پیغام ہے۔ تاریخ میں کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا جو اس ترکیب کی وجہِ تسمیہ واضح کرنے کا دعویٰ کر سکے۔ اساطیری روایات جیسا کہ اس طرح کی صورت احوال میں اکثر ہوتا ہے بہر حال موجود ہیں اور یہ روایات دراصل 'جنم' اور 'کھنڈر' کے دونوں ہندی الفاظ کے درمیان کوئی نہ کوئی رشتہ ڈھونڈ نکالنے کی کوششیں ہیں جو بعض اوقات خاصی مضحکہ خیز شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً ایک کہانی یہ ہے کہ چندر گپت موریہ کے عہد میں اس مقام پر چندر گپت کے باجگذار کا محل تھا جو مہاپدم کہلاتا تھا۔ سکندرِ اعظم کی موت کے بعد جب اُس کی سلطنت اس کے جرنیلوں میں بٹ گئی تو اس کے قابل ترین جرنیل سلیوکس نکوتار نے چندر گپت کی سرزمین پر پھر حملہ کیا۔ مہاپدم نے درپردہ سلیوکس کی مدد کی لیکن سلیوکس کو شکست ہوئی اور اسے بے بسی کے عالم میں واپس لوٹنا پڑا۔ ادھر چندر گپت کا جاسوسی کا نظام بہت اعلیٰ پائے کا تھا۔ اسے مہاپدم کی غداری کا پتہ چل گیا اور مہاپدم کو بہت عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ اس کی رانی جو حاملہ تھی، دیوتاؤں سے انصاف کی طالب ہوئی اور ایک رات اس نے وقت سے پہلے ہی ایک بچے کو جنم دیا جو دراصل انسان نہیں بلکہ

ایک راکھشس تھا اور ایک رات میں ہی وہ بچہ اتنا قوی ہیکل اور دیو قامت ہو گیا کہ محل کی دیواریں اسے سمیٹ نہ سکیں۔ رانی کی خواب گاہ کے علاوہ سب کچھ برباد ہو گیا اور پورا محل ایک کھنڈر بن گیا۔ کہانی اس بارے میں خاموش ہے کہ کیا راکھشس چندر گپت سے انتقام لینے میں کامیاب ہوا یا نہیں؟ مگر تاریخ ظاہر ہے اس بارے میں خاموش نہیں ہے کہ سیلوکس کی شکست کے بعد چندر گپت بیس بائیس سال تک پاٹلی پترا میں حکمرانی کے مزے لوٹتا رہا۔ چانکیہ کے ارتھ شاستر اور میگستھنیز کے انڈیکا میں بھی جو کہ چندر گپت موریا کے دور کے اہم ترین تاریخی ماخذ ہیں راتوں رات خوفناک حد تک بڑے ہو جانے والے دیوزاد کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ لیکن میگستھنیز اس دور کے لوگوں کے بارے میں یہ ضرور لکھتا ہے کہ لوگ خوش حال اور فارغ البال تھے، سادہ زندگی بسر کرتے تھے، دراز قد اور توانا جسم والے تھے، شراب سے اجتناب کرتے تھے لیکن بھنگ پینے کا رواج عام تھا جسے سوم رس کہا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مسمار کر دینے والے اس جنم کا قصہ کسی فارغ البال بھنگ زدہ تخیل کا تخلیقی کرشمہ ہو۔ لیکن اس Myth کا کہیں بھی حقیقت سے کچھ رشتہ جڑتا نظر نہیں آتا۔ اولاً اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا کے جس حصے میں غلام باغ واقع ہے وہاں کسی موریا تعمیر کی موجودگی ایک حیرت انگیز امر ہو گی۔ اگر دلیل کی خاطر ایسا کوئی امکان مان بھی لیا جائے (کیونکہ بہرحال موریا سلطنت کوہ ہمالیہ سے لے کر بندھیاچل تک اور خلیج فارس سے لے کر خلیج بنگال تک پھیلی تھی) کہ جنم کھنڈر میں کچھ موریا عمل دخل ہے تو بھی یہ تسلیم کرنا ناممکن ہو گا کیونکہ جنم کھنڈر کا وہ حصہ جو بالکل کھنڈر ہو چکا ہے اُس کو چھوڑ کر باقی ماندہ ایستادہ ساخت تعمیراتی اعتبار سے کسوجی، راجگیر اور کمرآباد میں ملنے والی موریا ساختوں سے کسی طرح بھی مماثلت نہیں رکھتی۔ موریا آثار میں سب سے اہم استوپا ہیں جبکہ جنم کھنڈر کسی طرح بھی استوپا نہیں ہے اور پھر کم از کم وہ حصہ جو ابھی تک برقرار ہے کوئی شاہی رہائش گاہ بھی نہیں ہو سکتا۔ دراصل سب سے اہم اور پُر راز سوال ہی یہ ہے کہ آخر اس تعمیر کا مقصد کیا تھا؟

ایستادہ حصے میں نمایاں ایک چوکور کمرہ ہے یعنی اگر اسے کمرہ کہا جا سکتا ہے تو! جس کا دروازہ مشرق کی جانب کھلتا ہے۔ اگر ہم اندر داخل ہوں تو عین سامنے مغربی دیوار میں ایک چھوٹا دروازہ نظر آتا ہے جو اس اعتبار سے حیرت انگیز ہے کہ اس دروازے کے قریب کی دیوار شمال اور جنوب سے اندر دروازے کی جانب قوسی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں

Scanned by CamScanner

مغربی دیوار کے درمیانی حصے میں باہر کو نکلتی ایک قوس بنائی گئی ہے جیسا کہ مسلم فن تعمیر میں مسجد کی دیوار میں پیش امام کے لیے جگہ بنائی جاتی ہے اور جسے محراب کہتے ہیں مگر یہ قوس عام محراب سے کافی بڑی ہے اور پھر ظاہر ہے کہ محراب کے عین درمیان میں کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔ اس دروازے کے آگے مغرب کو بڑھتی ایک طویل راہ داری ہے جس کا آخری حصہ مسمار ہو چکا ہے اور جس کی شمالی دیوار میں پانچ روشن دان باقی ہیں اور جن کے سامنے پانچ بہت چھوٹے چھوٹے سے کمرے ہیں جو اپنی انتہائی مختصر جسامت کے اعتبار سے یا تو غسل خانے ہو سکتے ہیں یا پھر ظالمانہ حد تک Claustrophobic کال کوٹھڑیاں۔

اس کمرے کے چاروں کونوں میں سے چار زینے نیچے ایک زمین دوز کمرے میں اُترتے ہیں اور یہ زینے عہدِ رفتہ کے کسی شیطانی ذہن کی انوکھی تعمیراتی تخلیق ہیں۔ جب ہم کسی بھی کونے کے زینے سے نیچے اُترتے ہیں تو سات آٹھ قدموں کے بعد ایک مختصر سی لینڈنگ آتی ہے اور یہاں سے زینہ یک دم دائیں اور بائیں کو دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ گویا ایک کی بجائے دو زینے اس مقام سے مخالف سمتوں میں نیچے اُترنے لگتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ جمِ کھنڈر کی ان باقی ماندہ زیرِ زمین ساختوں، یعنی زینے اور نیچے کا کمرہ جس کی پریشان کن تفصیل ابھی آگے آئے گی، میں روشنی اور ہوا کے گذر کو یقینی بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک طرح سے قائم زاویہ تکون کے وتر کی طرح ترچھی اُوپر کو اٹھتی تقریباً ڈیڑھ فٹ مربع کی لمبی سرنگ نما شافٹیں ہیں جو نچلے کمرے اور زینوں کے مختلف مقامات سے چاروں سمتوں میں باہر کو جاتی ہیں اور اوپری چوکور کمرے کی بیرونی دیواروں کی بنیادوں اور دوسرے مقامات میں کھلتی ہیں۔ چوکور کمرے کی بنیادوں کے قریب کھلنے والی چند شافٹوں کے علاوہ دیگر سب بند ہو چکی ہیں چونکہ باقی حصہ کھنڈر ہے۔ لیکن پھر بھی ان چند کھلی شافٹوں میں سے اتنی روشنی اندرونی حصوں تک ضرور پہنچتی ہے کہ کسی روشن دن میں ان شیطانی سیڑھیوں میں اُتر کر اچانک کسی سہ جہتی بھری التباس کا شکار ہونے والا کوئی ناواقفِ حال معصوم ٹورسٹ محض روشنی کی قلت کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔

سادہ لفظوں میں کہنے کی کوشش کرتے ہوئے دراصل ہوتا یہ ہے کہ لینڈنگ جہاں سے وہ زینے دائیں اور بائیں کو تقسیم ہوتے ہیں ایک خطرناک مقام ہے۔ کسی بھی دوراہے کی طرح

Scanned by CamScanner

آپ یہاں تذبذب کا شکار ہوتے ہیں اور اگر آپ آگے بڑھنے یعنی نیچے اُترنے پر تلے ہی ہوں تو ظاہر ہے آپ کو دائیں بائیں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ فرض کریں کہ آپ راست دست ہیں دائیں کو ترجیح دیتے ہیں تو یہ عین ممکن ہے کہ دائیں زینے میں چھ سات سیڑھیاں نیچے اُترتے اُترتے سیڑھیاں 360 ڈگری پر گھوم جائیں اور آپ کے سامنے ایک منحوس صورت حوصلہ پست کرنے والی دیوار راہ روکے کھڑی نظر آئے اب لازماً بند رستوں کا خوف آپ پر ایک لمحے کے لیے غالب آئے گا اور آپ جبلی طور پر واپس اوپر کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کریں گے اور اب یہیں سے سارے جادو کا آغاز ہوتا ہے اوپر کو چڑھتی سیڑھیاں تعداد میں بڑھ جائیں گی اور ابھی آپ اس بات پر حیران ہی ہو رہے ہوں گے کہ لینڈنگ ابھی تک کیوں نہیں آئی کہ آپ کا سر چوکور کمرے کے کسی دوسرے کونے میں باہر کو اُٹھتا نمودار ہو رہا ہوگا۔ گویا آپ ایک کونے کے زینوں میں اُترے اور دوسرے کونے کے زینوں میں سے باہر نکل آئے۔ اس شعبدے سے انسان ٹپٹا سا جاتا ہے۔ گویا کچھ ناقابلِ فہم واقعہ ہوگیا ہے۔ پھر اپنی اپنی توفیق کے مطابق تھوڑی سراسیمگی آپ کو گھیرتی ہے اور اگر مہم جوئی کا جذبہ آپ میں بالکل مردہ نہیں ہو چکا تو پھر آپ اُسی کونے کے زینوں میں پھر واپس اُتریں گے اور 95 فی صد امکان ہے کہ زیرِ زمین کمرے تک پہنچنے کی بجائے آپ ایک بار پھر چوکور کمرے کے ہی کسی اور کونے سے باہر نکل آئیں گے اور ایسا احساس ہوگا کہ آپ زمین میں نیچے کو اُترتے ہیں اور کوئی نادیدہ قوت آپ کو پھر باہر دھکیل دیتی ہے۔

درحقیقت غلطی یہ ہوتی ہے، اور وہ کوئی قدیم عجوبہ ساز یہی چاہتا تھا کہ آپ یہ غلطی کریں، کہ ایک دفعہ جب آپ ایک زینے سے اُتر کر نیچے کمرے میں پہنچنے کی بجائے دوسرے زینے میں سے باہر نکل آتے ہیں تو حیرت کے عالم میں دوبارہ پھر اسی زینے میں واپس نیچے گھس جاتے ہیں اور پھر دائیں اور بائیں اور اوپر اور نیچے کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ غالباً قدیم یونان کے Labyrinth بنانے والے معمار بھی انسان کے مکانی ادراک سے منسلک ان ہیجانی پیچیدگیوں سے کسی سطح پر آگاہ تھے۔ چوہا اپنے بلوں میں متحرک ہوتے وقت ایسی غلطیاں نہیں کرتا ہوگا مگر چوہے کو خوشبو کے اشاروں کا قوی سہارا حاصل ہے جب کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے سبب اس نعمت سے کافی حد تک محروم ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ جنم کھنڈر میں ایک جگہ نیچے گھس کر کسی

Scanned by CamScanner

دوسری جگہ سے باہر نکل آتا ہے۔ اگر چہ اس کیفیت کا شکار ہونے میں کوئی حرج بھی نہیں اگر کوئی حرج ہے تو صرف اتنا کہ نچلے کمرے تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے۔

مگر نچلے کمرے تک پہنچنا در حقیقت بہت آسان ہے بلکہ مضحکہ خیز حد تک آسان ہے۔ ظاہر ہے ہماری مثال میں اگر شروع میں ہی آپ لینڈینگ پر دائیں کی بجائے بائیں کو اُتر جاتے ہیں تو چند سیڑھیاں اُتر کر آپ نچلے کمرے میں پہنچ جاتے جس کی جزیات دیکھ کر اگر آپ کو خوشی نہ بھی ہوتی تو بھی کہیں نہ کہیں پہنچ جانے کی تسلی تو ضرور ہو گئی ہوتی۔ دنیا کی کسی بھی قسم کی سیڑھیوں پر اوپر یا نیچے سفر کرنے کے بعد کسی متوقع متعین جگہ پر پہنچ جانے کی خواہش بالکل انسانی ہے۔ مگر جنم کھنڈر کے جہنمی دوشاخہ زینوں کے سنگم پر کھڑے ہو کر آدھا دائیں اور آدھا بائیں کا متزلزل منطق انسان کی عقل کو اکثر مفلوج کر دیتا ہے اور وہ نیچے پاتال تک جا پہنچنے کی ازلی دیوانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

نچلا زمین دوز کمرہ اوپری چوکور کمرے کے مقابلے میں کافی چھوٹا ہے کیونکہ ظاہر ہے کافی جگہ چاروں اطراف کی دبیز کھوکھلی دیواروں میں بنے بھول بھلیاں زینے گھیر لیتے ہیں۔ اگر حواس کو چکمہ دینے والے زینے تحیر اور اسرار کا تاثر سیاح کے دل پر لادتے ہیں تو زمین دوز کمرہ ہڈیوں میں خوف کی ٹھنڈی لہر دوڑا دیتا ہے۔ یہ کچھ ایسی ہی خوف کی ٹھنڈی لہر ہے جو نور مبرگ کے عجائب گھر میں قرونِ وسطیٰ کے عقوبت خانوں کی عذاب دینے والی مشینیں دیکھ کر سیاح کے ریشوں میں سرسرا جاتی ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ زمین دوز کمرے میں عذاب کے آلات نام کی کوئی چیز بھی نہیں۔ مگر دل پھر بھی فوراً یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ عقوبت خانہ ہو گا یا ہونا چاہیے۔ کمرے کے وسط میں کوئی دو فٹ اونچا ایک گول چبوترہ بنا ہے جو مرکز سے کناروں کی طرف ڈھلوان ہے۔ چبوترے کے گرد تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی کھائی سی بنی ہے جس کے چاروں اطراف میں نالیاں کمرے سے باہر کو نکلتی ہیں جو کہ ظاہر ہے کسی سیال کو اُس مقام سے دور لے جانے کے لیے بنائی گئی ہیں مگر کیسا سیال؟ انسان کے قریب ترین سیال تو دو ہی ہیں یعنی پانی اور خون۔ پانی کی صورت میں یہ مقام دنیا کا انوکھا ترین غسل خانہ کہلائے گا جسے خفیہ رکھنے کے لیے بھول بھلیاں زینوں کا حیرت انگیز نظام قائم کیا گیا۔ اور یہ بات بظاہر قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری قرینِ قیاس بات اس منحوس جگہ کو فی الفور خون آشام کر دیتی ہے۔ اور دیکھنے والے کا ذہن وحشت و بربریت کے ہولناک امیجز سے بھر جاتا ہے جن میں قیدیوں کے خون سے سنے ہوئے جسموں سے لے کر

Scanned by CamScanner

انسانی قربانی کے بعد تڑپتے سر بریدہ لاشے بھی کچھ شامل ہے۔

جنم کھنڈر سے وابستہ کچھ اور روایتیں اس جگہ مدفون کسی خزانے کا بھی پتہ دیتی ہیں جو کسی سنہرے صندوقچے میں بند ہے اور جس کی حفاظت کوئی سانپ کر رہا ہے۔ بعض اوقات صندوقچے کا رشتہ کسی راجپوت رانی سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ قطع نظر اس تاریخی تضاد کے کہ راجپوتوں کا زمانہ موریہ دور کے بہت بعد کا ہے، اگرچہ جیسے پہلے ذکر کیا گیا یہ بھی قطعاً ثابت نہیں کہ یہ موریہ تعمیر ی ہے، لیکن سانپ اور خزانے کا تعلق ہندی اساطیر میں اکثر ملتا ہے۔ رہا سنہری صندوقچے کا سوال تو یہاں تو بعض خوش عقیدہ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے تک کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ اس طرح کی کہانی فیلڈ آرکیالوجسٹ کے تھکا دینے والے کام میں ایک تفریحی وقفہ تو مہیا کر سکتی ہے لیکن وہ اُسے سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔ اور پھر...... (جاری)''

O

مگر اُس رات سنہری صندوقچے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کرنے والے خوش عقیدہ مدد علی کی سناٹے کو چیرتی چیخ سننے والے فیلڈ آرکیالوجسٹ کے لیے یہ دنیا کی سنجیدہ ترین کہانی تھی جس میں تفریحی وقفے کا کہیں کوئی نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہاف مین اور کبیر تیزی سے بھاگتے ہوئے جنم کھنڈر والے کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں شمالی کونے سے روشنی کی شعاعیں پھوٹتی نظر آئیں۔ ہاف مین اُس سمت جھپٹا مگر زینے میں نیچے اترنے سے پہلے چند لمحے رکا اور تیزی سے بڑبڑایا ''شمال، جنوب، دائیں، بائیں، ہاں شمال۔ ہاں اس میں دوشاخے سے نیچے بائیں اُترنا ہوگا۔ آؤ''۔ کبیر کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ چند قدم نیچے لینڈنگ پر مدد علی کی ٹارچ روشن پڑی تھی۔ ہاف مین نے رُکے بغیر اسے اٹھالیا اور پھر وہ دوشاخے پر بائیں گھوم کر نیچے اترتے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ زمین دوز کمرے میں تھے۔

چند ثانیوں کے لیے وہ دونوں بینائی اور اندھیارے کے درمیانی خلا میں معلق رہے۔ جس میں تاریک روشنی کے دھبے روشن تاریکی کی سطح پر نمودار ہو کر پھر وہیں معدوم ہو جاتے تھے۔ پھر ہاف مین کے ہاتھ کی ٹارچ حرکت میں آئی اور شعاع کی زد میں آنے والے وجود وہیں ٹھہر کر اپنی اپنی پہچان کرانے لگے۔ صدیوں پرانی دیواریں، چھت، فرش، مکڑی کے جالے، وسط میں گول

Scanned by CamScanner

چبوترہ، سانپ اور مدد علی۔

پھر کافی عرصہ بعد تک جب تک کبیر اور ہاف مین ایک دوسرے سے ملتے اور بات کرتے رہے اس رات کے بعد کئی دنوں اور راتوں تک۔ تو وہ اس بات پر اتفاق کرتے رہے کہ سانپ اُن دونوں نے دیکھا ضرور تھا اس لیے ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے پر یہ الزام نہیں دھر سکتا تھا کہ وہ بصری التباس (Hallucination) کا شکار ہوا ہے۔ اگرچہ کبیر اجتماعی التباس کی دلیل بھی دیتا تھا لیکن دل سے وہ بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ اس نے زرد سنہرے رنگ اور سیاہ دھبوں والا وہ چتکبرا جانور نہیں دیکھا تھا جو چبوترے میں بظاہر کہیں بھی نہ بنے سوراخ میں تیزی سے گھس کر غائب ہو گیا تھا۔ غائب ہونے والی چیزیں التباس کو ہوا دیتی ہیں وہ سانپ تھا یا نہیں تھا مگر غائب تھا۔ مگر مدد علی نہ غائب ہوا تھا نہ التباس تھا اگرچہ فرش پر گری ہوئی دوسری ٹارچ کی روشنی میں نظر آتا اس کا جسم اتنے ہی خوفناک انداز میں سکڑا تھا کہ غائب ہونے کی دہائی دیتا تھا۔ وہ کمرے کے شرقی کونے میں اس طرح سمٹا ہوا اکڑوں بیٹھا تھا کہ جیسے ابھی نقطہ بن کر پیچھے کو دیواروں میں گھس جائے گا۔ کوئی نامعلوم قوت جیسے اسے دھکیلتے دھکیلتے کونے میں لے آئی تھی اور اب دیواریں اس کے جسم کو پیچھے کوئی اور راستہ نہ دیتی تھیں اور آنکھیں اس ازلی وحشت سے باہر کو آتی تھیں جو نسلِ انسانی کا اجتماعی ورثہ ہے۔ وہ دہشت جو کبھی بھی کہیں بھی اچانک روز مرہ کی ساعتوں میں لرزتی نمودار ہو کر وقت کو چُور چُور کر دیتی ہے اور گویائی سے محروم انسان وجود کی زیریں سطحوں کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اساطیری کرداروں کی طرح پتھر ہو جاتا ہے۔

مگر جب وہ دونوں گویا ہوئے، یورپین گورا انسان اور برصغیر کا بھورا، تو اُن کا مخاطب شدتِ خوف سے بھنچا ہوا ایسا انسان تھا جو اس لمحے ہر رنگ و نسل سے ماورا ہو چکا تھا اور جو کبیر کی مدد علی اور ہاف مین کی ماڈاڈ آلی کے درمیان کہیں معلق ہو گیا تھا۔

''مدد علی'' کبیر نے کہا اور دوبارہ اسے اپنے روز مرہ کے انسانی جامے میں واپس لانے کی کوشش کی۔

''اس سے پوچھو اس پر کیا جہنمی افتاد ٹوٹ پڑی ہے'' ہاف مین نے کبیر سے کہا۔

''یہ جگہ بھی کچھ کم جہنمی نہیں ہے۔'' کبیر نے چاروں طرف اور پھر وسطی گول چبوترے پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا، اور ساتھ ہی اُن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف ایسے متفقہ اضطراب

سے دیکھا کہ گویا دونوں باور کر چکے ہوں کہ صدیوں پرانے اس زمیں دوز عقوبت خانے میں انسانوں کی محفوظ اور مشفق و مہربان منطق سے اِدھر اُدھر کچھ ہو گزرا ہے جس نے قانونِ تعلیل کے ساتھ کچھ نہ کچھ بدسلوکی ضرور کی ہے۔ اور اُسی لمحے پہلی دفعہ انہوں نے سانپ پر بات شروع کی جب کہ مددعلی ویسے ہی دیوار کے ساتھ کمر کے بل بُجا کسی بڑے سے مٹی کے ڈھیلے کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔

''تم نے اسے دیکھا؟'' ہاف مین نے کبیر سے پوچھا۔

''کیا دیکھا؟'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ گورا کیا پوچھ رہا ہے کبیر نے پہلے ایک سوالیہ لاعلمی کا اظہار کیا۔

''سانپ اور کیا''

''آہ...... ہاں...... وہ...... وہ ایک دُم سی تو میں نے بھی دیکھی تھی مگر ہو سکتا ہے وہ کوئی چھپکلی ہو۔ بلکہ یقیناً چھپکلی ہی ہوگی۔ زرد دم والی چھپکلی۔''

''نہیں...... وہ سانپ ہی تھا۔ وہی سانپ جو یہیں کہیں اندر کسی جگہ خزانے کی حفاظت کر رہا ہے۔ وہی سنہرا صندوقچہ...... کبیر...... میرا...... Hypothesis صحیح ثابت ہو رہا ہے۔'' ہاف مین نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''بکومت...... بند کرو یہ بکواس۔ ہمیں اس خرافات کی بجائے اس شخص پر توجہ دینی چاہیے جس کے ساتھ کچھ انہونی ضرور ہو چکی ہے۔ جسے تم نے چند ٹکوں کے عوض اپنا غلام بنا رکھا ہے۔''

''آ...... یہ تو ہے ہی غلام باغ۔ میں نے کوئی انوکھا ظلم تو نہیں کیا'' ہاف مین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور پھر فوراً اپنے قہقہے پر شرمندہ سا ہو کر خفت مٹانے کے لیے کہنے لگا۔ ''دیکھا تم نے۔ میری حسِ مزاح ہر حال میں قائم رہتی ہے۔''

''یہ حسِ مزاح نہیں پرلے درجے کی بدمعاشی ہے'' کبیر نے زہریلے لہجے میں کہا اور جب وہ پھر مددعلی کی طرف متوجہ ہوا تو ہاف مین پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے مددعلی کو آوازیں دینے لگا۔ مگر مددعلی ویسے کا ویسا ہی پڑا رہا۔

''I think he is in a state of stark terror. شدید خوف نے اُس کے اعصاب کو شل کر دیا ہے۔'' ہاف مین نے کہا۔

Scanned by CamScanner

سے دیکھا کہ گویا دونوں باور کر چکے ہوں کہ صدیوں پرانے اس زمین دوز عقوبت خانے میں انسانوں کی محفوظ اور مشفق و مہربان منطق سے اِدھر اُدھر کچھ ہو گذرا ہے جس نے قانون تعلیل کے ساتھ کچھ نہ کچھ بدسلوکی ضرور کی ہے۔ اور اُسی لمحے پہلی دفعہ انہوں نے سانپ پر بات شروع کی جب کہ مدد علی ویسے ہی دیوار کے ساتھ کمر کے بل جُوا کسی بڑے سے مٹی کے ڈھیلے کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔

''تم نے اسے دیکھا؟'' ہاف مین نے کبیر سے پوچھا۔

''کیا دیکھا؟'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ گورا کیا پوچھ رہا ہے کبیر نے پہلے ایک سوالیہ لاعلمی کا اظہار کیا۔

''سانپ اور کیا''

''آہ...... ہاں...... وہ...... وہ ایک دُم سی تو میں نے بھی دیکھی تھی مگر ہو سکتا ہے وہ کوئی چھپکلی ہو۔ بلکہ یقیناً چھپکلی ہی ہوگی۔ زرد دم والی چھپکلی۔''

''نہیں...... وہ سانپ ہی تھا۔ وہی سانپ جو یہیں کہیں اندر کسی جگہ خزانے کی حفاظت کر رہا ہے۔ وہی سنہرا صندوقچہ...... کبیر...... میرا...... Hypothesis صحیح ثابت ہو رہا ہے۔'' ہاف مین نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''بکومت...... بند کرو یہ بکواس۔ ہمیں اِس خرافات کی بجائے اِس شخص پر توجہ دینی چاہیے جس کے ساتھ کچھ انہونی ضرور ہو چکی ہے۔ جسے تم نے چند ٹکوں کے عوض اپنا غلام بنا رکھا ہے۔''

''آ...... یہ تو ہے ہی غلام باغ۔ میں نے کوئی انوکھا ظلم تو نہیں کیا'' ہاف مین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور پھر فوراً اپنے قہقہے پر شرمندہ سا ہو کر خفت مٹانے کے لیے کہنے لگا۔ ''دیکھا تم نے۔ میری حسِ مزاح ہر حال میں قائم رہتی ہے۔''

''یہ حسِ مزاح نہیں پرلے درجے کی بدمعاشی ہے'' کبیر نے زہریلے لہجے میں کہا اور جب وہ پھر مدد علی کی طرف متوجہ ہوا تو ہاف مین پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے مدد علی کو آوازیں دینے لگا۔ مگر مدد علی ویسے کا ویسا ہی پڑا رہا۔

''I think he is in a state of stark terror۔ شدید خوف نے اُس کے اعصاب کو شل کر دیا ہے۔'' ہاف مین نے کہا۔

Scanned by CamScanner

''یہ کوئی بڑا انکشاف نہیں کیا تم نے۔ یہ تو سامنے نظر آ رہا ہے'' کبیر نے مدد علی کو شانے سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسے فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس کیسے لے جائیں۔''

''ڈاکٹر؟ یعنی ایک بار پھر اپنے پیارے جونیئر سائیکیاٹرسٹ کے پاس؟ کیا عجب کہ اس دفعہ اس کے منہ سے میرا مطلب ہے مدد علی کے منہ سے وکٹورین دور کے پونڈ کی بجائے اشوکا کے زمانے کی اشرفی نکل آئے۔'' ہاف مین نے اپنی ہی لہر میں کہہ دیا لیکن پھر مدد علی پر گڑی کبیر کی پُرتشویش نظریں دیکھ کر مزید یاوہ گوئی سے باز رہا۔ ''مگر تمہارا کیا خیال ہے کبیر کیا اسے واقعی طبی مدد کی ضرورت ہے۔ کیا معاملہ اتنا ہی سیریس ہے؟''

کبیر نے صدیوں پرانی ہوا اندر کھینچتے ہوئے اسے چند لمحوں کو اپنے اندر روکے رکھا اور پھر جانے دیا۔ ہوا میں سیلن اور کھریا مٹی کی باس تھی۔ ''چرس نے تمہارا ذہن ماؤف کیا ہوا ہے۔ تمہیں کچھ کہنا نہ کہنا برابر ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں میرا ذہن اس وقت آئین سٹائن کے ذہن سے بھی زیادہ صاف ہے۔ تم بات کرو'' ہاف مین نے اسے یقین دلایا۔

کبیر نے پھر طویل سانس لیا اور نتھنے سکیڑے ''تم نے یہ جو Perfume لگایا ہوا ہے یہ فرانس کا بنا ہے'' اس نے یک دم عجیب لاتعلق اور غیر متعلق سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں فرانسیسی ہے اور یہ Perfume نہیں صرف آفٹر شیو ہے۔ آرکیالوجسٹ کو فیلڈ میں Perfumes استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ماضی کی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ جدید خوشبوئیں اُسے گمراہ کر سکتی ہیں مگر......'' ہاف مین بولتے بولتے رُکا اور آئن سٹائن سے زیادہ صاف اُس کا ذہن ڈگمگایا اور پھر وہ بہت ہی حقیقی تحیر سے کبیر کو گھورنے لگا ''تم نے یہ Perfume کی کیا بکواس شروع کر دی اچانک۔ چرس میں نے پی ہے اور دماغ تمہارا خراب ہو رہا ہے۔''

''شاید۔ مگر دیوانگی اس ہوا میں ہے ذرا سونگھنے کی کوشش کرو۔ آج رات اس جگہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے مدد علی میرے لیے بہت بڑا مسئلہ تھا، میں اُس کے لیے ایک گہرے صدمے جیسی کیفیت میں تھا۔ پھر میں نے گہرا سانس لیا اور یہ ہوا اندر کھینچی اور سب کچھ بدل گیا۔

ایک ہی لمحے میں سب کچھ جان لینے کا احساس بڑا نایاب ہوتا ہے ہیر ہاف مین اور میں نے جان لیا ہے کہ اس ہوا میں کیا ہے۔ اِس ہوا میں چندر گپت موریا کی بغلوں کی بُو ہے، یونانی جرنیل سلیوکس کی انتڑیوں کی عفونت ہے، سلاطین دہلی کے اُونی لباس سے نکلتی کھٹی باس ہے، مغلیہ شہزادیوں کے ستر سے اُٹھتی کچی بساند ہے، شراب پیتے گورے فوجیوں کی قے سے اُٹھتی سڑاند ہے اور یہاں اس گول چبوترے پر جلاد کے وار کے بعد سر بریدہ لاشوں سے پھوٹتے خون کے فواروں سے آتی مہکار ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ازل سے یہاں نسلِ انسانی کے نتھنوں میں گھستا رہا ہے اور جس میں اب تمہارے جرمن چہرے کے فرانسیسی آفٹر شیو کی خوشبو بھی شامل ہے۔ ہیر ہاف مین یہ سب کچھ ایک ہی سانس اندر کھینچتے لمحے میں کائنات کو فقط ناک سے جان لینے کی انتہائی کوشش ہے اور اس میں مددعلی کہیں نہیں ہے۔ مددعلی وقت میں کوئی خوشبو نہیں دیتا۔'' کبیر نے ایک اور طویل سانس لیا اور خاموش ہو گیا۔

ہاف مین کی خاموشی اب اُس کے اُس مغربی ذہن کی خاموشی تھی جو سنہرے صندوقچوں کی حفاظت کرنے والے سانپوں کے وجود کو بالکل نہیں مانتا اور فیثا غورث کی ریاضی اور ارسطو کی منطق سے آگے کو چالو ہوتی جمع تفریق کے ہتھیار کو کہیں نہ کہیں ضرور چھپائے رکھتا ہے اور نازک ڈگمگاتے لمحوں میں اُسے استعمال کر ڈالنے سے کبھی نہیں چوکتا۔ اس کے اِسی نسلی محافظ ذہن نے اسے فی الفور باور کرادیا کہ وہ پُر خطر ساعتوں میں گھرا کھڑا ہے۔ ایک وحشت ناک گپھا جیسی جگہ میں دو جنون زدہ رنگ دار انسانوں کے سامنے اکیلا کھڑا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو تو فوراً فرزانگی کی طرف پلٹنا ہی چاہیے ورنہ ان کے اشتراکِ جنون کا سحر مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ تب اس نے پورے اعتماد سے کبیر کو مخاطب کیا۔

''Hash or no Hash ۔ کبیر حقیقت یہ ہے کہ ہم کافی دیر سے ہذیان زدہ گفتگو کی جلق میں ایک دوسرے سے آگے بہہ جانے کے چکر میں ہیں۔ میں اور تم...... ہم دونوں...... دو مردوں کے ذہنوں کا اکٹھے، بھکنا عورت مرد کے، اکٹھے منزل ہونے کی لذت سے کچھ کم نہیں میں تمہیں یقین دلاتا ہوں مگر......'' ہاف مین نے کہا اور اپنے کہے کے اثر کو کبیر کے چہرے پر تاڑنے لگا۔ کبیر کا کھنچا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ رہا تھا اور ایک سرور آگیں مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں پر ٹیڑھی پھیل رہی تھی۔

Scanned by CamScanner

''ہذیان زدہ گفتگو کی جلق'' کبیر ہنسا ''تم واجبی انگریزی جاننے کے باوجود بھی کبھی ترکیبیں اچھی باندھ لیتے ہو۔''

''مگر یہ وقت ترکیبوں پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ صرف گفتگو ہی نہیں بلکہ شاید واقعات بھی ہذیان کی زد میں ہیں۔ ہاں البتہ ان دونوں ٹارچوں میں پڑے ڈرائی بیٹری سیل بالکل اپنے معمول کی رفتار سے گل ہو رہے ہیں اور پیشتر اس کے کہ مکمل اندھیرا چھا جائے ہمیں مددعلی کو لے کر جنم کھنڈر سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے ڈر ہے کہ اُس کا جسم اکڑ رہا ہے۔'' ہاف مین نے یہ کہا اور مددعلی کو چھوا۔

کبیر اور ہاف مین نے جب اپنا ایک ایک بازو مددعلی کی بغلوں میں ڈال کر اُسے اپنے پاؤں پر اٹھانے کی کوشش کی تو پاؤں زمین پر رکھنے کی بجائے وہ اوپر ہی اُن کے بازوؤں میں اٹکا اٹکا اس طرح جھول گیا کہ اُس کے گھٹنے اُس کے سینے سے لگے تھے۔ رحم مادر میں جنین کی شکل میں اکڑے اس کے جسم کو دیکھ کر کبیر کو جنم کھنڈر سے منسوب دیوزاد اور اکھشس کی پیدائش کی کہانی یاد آئی اور اسے یوں ہی محسوس ہوا جیسے ابھی انہوں نے اُسے کسی دیوزاد ماں کی کوکھ سے کھینچ کر نکالا ہو۔

O

''اس انسانی بنڈل کو یہاں تک لانا آسان نہیں تھا ڈاکٹر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں'' ہاف مین نے ڈاکٹر ناصر سے کہا۔

ناصر نے بیڈ پر بدستور Fetal Position میں پڑے مددعلی کو گہری پیشہ ورانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں کہا۔ ''Classic Fetal Position ہے۔ جو شائزوفرینیا کے بعض مریضوں کی Extreme Withdrawal میں دیکھنے میں آتی ہے۔''

''مگر مددعلی شائزوفرینک تو نہیں ہے'' کبیر نے احتجاجاً کہا۔

''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' ناصر نے خشک سا جواب دیا وہ مددعلی کے بارے میں ایک دفعہ پھر کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کبیر اور ہاف مین اُسے اُس رات کی جنم کھنڈر کی روداد سنا چکے تھے۔ جسے اس نے بہت غور سے سُنا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو'' اچانک ہاف مین نے پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''کہاں ہے سانپ کا زخم؟ نہیں...... بہر حال...... پتہ نہیں۔ دیکھتے ہیں'' ناصر نے مددعلی کے بازوؤں اور پاؤں وغیرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں وارڈ بوائے آ گئے اور مددعلی کو سٹریچر پر رکھ کر اندر لے جانے لگے اور ان کے ساتھ ناصر نے اندر جاتے وقت کبیر سے کہا۔

''میں اسے اندر لے جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں اسے نارمل ہونے میں کتنا وقت لگے۔ تم لوگ چاہو تو جاؤ۔ چاہو تو میرے کمرے میں بیٹھو۔ انتظار کرو۔''

''انتظار کتنا طویل ہو گا۔'' ہاف مین نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' ناصر نے کہا اور اندر چلا گیا۔

وہ دونوں ناصر کے چھوٹے سے کمرے میں آن بیٹھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اُس رات ایک دوسرے سے مزید گفتگو کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک ٹھنڈا سا خوف زدہ کرنے والا احساس دونوں کے درمیان رواں تھا کہ جیسے اگر وہ کچھ اور بولے تو اردگرد کے واقعات کا توازن پھر درہم برہم ہو جائے گا۔ کبیر نے تشخیصی کاؤچ پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو لمبا پھیلا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اور ہاف مین نے اس کی اس حرکت پر اطمینان کا سانس لیا۔ دو انسان ایک دوسرے کے قرب میں ہوں اور جاگ رہے ہوں تو لسانی طاقتیں گفتگو کی صورت میں پھوٹ پڑنے کو زور مارتی ہیں اور خاموشی جیسے انسان کی اصل سے منکر ہونے کا گناہ بن کر نامعلوم احساسِ جرم کو جنم دیتی ہے۔

ان دونوں کے ذہن بھی اس وقت اپنے اپنے جسموں کی قید میں حیرت انگیز طور پر خالی تھے فقط مددعلی کی خبر آنے کے توقعاتی خلا میں اُن کے اپنے اپنے مستقبل قریب کے نہایت محدود سے امکانات گونجتے تھے۔

''ابھی میں یہاں سے اس معاملے کا انجام جاننے کے بعد گھر جاؤں گا اور جاتے ہی گرٹروڈ کو فون کر کے بتا دوں گا کہ میں آج رات شب بسری کے لیے نہیں آ سکتا۔ اور ظاہر ہے ہم بستری کے لیے بھی نہیں......''

''ناصر آئے گا تو پہلے تو ظاہر ہے وہ مددعلی کے انجام کے بارے میں بتائے گا۔ انجام کچھ بھی ہو میں گھونسلے میں جانے سے پہلے ناصر سے پوچھوں گا کہ زہرہ کے ساتھ اس کے غالباً یک طرفہ عشق کا کیا بنا، اور جو مہینہ بھر میں سنمیال میں بیٹھا اُس کے عشق پر خط لکھتا رہا، اس دوران اس نے زہرہ اور اس کے باپ یاور عطائی کے بارے میں کیا کچھ جانا؟ میں اس سے کہہ دوں گا کہ

Scanned by CamScanner

"مجھے لمبی کہانی نہ سنائے بلکہ انتہائی مختصر لفظوں میں بتائے کہ کیا بنا۔ لمبی کہانی نہیں۔ بس یہ بتادے کہ اس کے عشق کا کیا بنا۔ نہیں لمبی کہانی نہیں۔"

پھر کبیر کا ذہن "لمبی کہانی نہیں" "لمبی کہانی نہیں" کی گردان کرتا خواب اور بیداری کی درمیانی بے وزنی کی کیفیت میں تیرتا رہا۔

اُدھر ہاف مین ایک بے آرام سی آرام کرسی میں پھنسا بیٹھا "آج رات کی آخری ٹیلی فون کال" کو سنتا اور لامکاں میں مدد علی کے انتظار سے گرٹریوڈ کے سراپے کی سینکڑوں تصویریں بناتا اور مٹاتا تھا۔ وقت میں مستقبل کی نیستی پلٹ پلٹ کر ان دونوں پر وار کرتی تھی اور ایک اکتا دینے والی حسن ان کے لمحۂ حال پر لادتی چلی جا رہی تھی۔

سسٹر مختار نے سوچا کہ اب تو اُسے وارڈ بوائے شبیر سے چائے کا بول ہی دینا چاہیے۔ "چائے آئے گی تو پھر میں خود ہی اسے لے کر ڈاکٹر ناصر کے کمرے میں بیٹھے اس کے دوستوں ایک انگریز اور دوسرا جو دیسی ہے کے پاس لے جاؤں گی۔" سسٹر مختار بھی اپنے آنے والے پل کے بارے میں طرح طرح کے نقشے ذہن میں جماتی تھی اور ایک ہی جیسے مگر الگ الگ منظر جو کچھ بھی کسی بھی طرح کچھ دیر بعد رونما ہو سکتے تھے ابھی سے بن سنور رہے تھے۔ "چائے کو میں انگریز کے سامنے رکھوں گی؟ یا اس دوسرے والے کے سامنے جو ڈاکٹر ناصر سے زیادہ سمارٹ ہے، جس کی آنکھیں توے جیسی کالی ہیں۔ ایسی کالی آنکھیں میں نے کدھر دیکھی ہیں۔ کہیں میں نے دیکھی ضرور ہیں۔ ویسے تو انگریز بھی بڑا سمارٹ ہے آخر انگریز ہے۔ پر انگریزوں پر دل جمتا نہیں۔ اُس کی تو آنکھیں بھی نیلی ہیں، نیلی آنکھوں پر تو نظر بھی نہیں ٹکتی...... توبہ میری...... یا اللہ معاف کرنا...... کیسے گندے گندے خیال دل میں آتے ہیں۔ توبہ میری...... پر یا اللہ یہ ہیں کون؟ یہ کالی آنکھوں والا؟ یہ انگریز؟ اور...... اور...... اصل میں تو وہ...... وہ بڈھا ہے فساد کی جڑ...... جو آج اتنے عرصے بعد پھر پاگل ہو کر آ گیا ہے...... وہ کون ہے...... یہ بڈھا آخر ہے کون؟...... اُس دن بھی ڈاکٹر ناصر پریشان تھا...... اور آج بھی پریشان ہے...... یہ چکر کیا چل رہا ہے...... یا اللہ جی یہ چکر کیا چل رہا ہے...... اور ایک تو وہ چکر چل رہا ہے ڈاکٹر ناصر کا اور اُس لڑکی کا...... وہ بھی تو اسی رات شروع ہوا تھا چکر...... توبہ میری...... اُس کا بوڑھا باپ کیسے ڈرتا تھا زمین پر پاؤں دھرتے...... ہنسی آتی تھی...... اُسے زمین گر رہی ہے...... لو بتاؤ...... پاگلوں کی بھی نرالی باتیں۔

Scanned by CamScanner

زمین گر رہی ہے۔ بھلا زمین بھی کبھی گرتی ہے۔ سب کچھ تو آپ زمین پر گرتا ہے...... پر وہ چکر تو چل ہی گیا...... زہرہ...... ہاں یہی نام تھا...... ڈاکٹر ناصر نے پھنسا ہی لی...... مجھے تو پہلے سے ہی پتہ تھا یہ ہوگا...... جب اکھ مٹکا شروع ہوا...... پر کیا۔ تو کیا ڈاکٹر ناصر نے...... کیا زہرہ سے...... توبہ...... میرے اللہ معاف کرنا...... بڑے گندے گندے خیال آتے ہیں بار بار...... نہیں وہ ایکی لڑکی نہیں...... وہ ایسی لڑکی نہیں جی...... ناں...... ناں...... اوئے...... خوے...... خوے...... میں بھی سوچوں میں نے اُس جیسی کالی آنکھیں کہاں دیکھیں تھیں...... اسی کی تو دیکھی تھیں...... زہرہ کی...... ڈاکٹر ناصر سے ملنے آتی ہے تو کیسے آتی ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ زادی آ رہی ہو...... ہم سے تو بات ہی نہیں کرتی...... کرتی بھی ہے تو ایسے جیسے ہم کوئی سڑک پر پڑی...... سوکھی سڑی گنڈیری ہوں...... گشتی...... یار سے کیسے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے...... پر ناصر بھی...... اس کے سامنے کیا لگتا ہے...... خیر...... ہے تو سمارٹ...... پر اُس کے سامنے جی زہرہ کے سامنے بس ایویں ہی لگتا ہے۔ جی...... یتیم چُوچا جیسا...... چُوچا جیسے بولتا ہے ویسا۔ چی آ...... چی آ...... چی آ......"

آدھی رات کے بعد اِس لمحے وارڈ میں بیٹھی واجبی شکل وصورت کی جوان العمر نرس کے شعور کے ہلکے براؤن کینوس پر چوزے کی شکل کے ڈاکٹر ناصر کی شبیہہ تھی جو ایک قابلِ رحم انداز میں منہ کھول کر چی آ چی آ کی آواز نکالتا تھا اور اس کے پاس وہ خود ایک بڑی سی گنڈیری کی شکل میں تبدیل ہوئی پڑی تھی اور سب سے پیچھے وہ تھی زہرہ جو آسمان تک بلند ہو کر اپنی سیاہ آنکھوں سے ان دونوں پر رات گرا رہی تھی...... چوزے ڈاکٹر ناصر کی چی آ...... چی آ...... چی آ...... چی آ...... سسٹر مختار اپنے کانوں میں اتنے تواتر اور صفائی سے سنتی تھی کہ ایک بے اختیار لمحے میں اُس کے اپنے ہونٹوں نے بھی ہل کر چی آ کی ہلکی سی آوازیں ایک دو نکال دیں۔ اور پھر خود ہی وہ ہنس پڑی اور اس کے اندر کا وہ منظر تو فیڈ آؤٹ ہو گیا مگر باہر کا منظر۔ اس کے ہلتے ہونٹ۔ چی آ کی مدھم آوازیں۔ اور پھر اسکی شرمندہ سی ہنسی آپ ہی آپ سے ہنسی...... جاسوسوں والی نے اس لمحے دیکھ لی جب وہ کاؤنٹر کے قریب آئی تھی اور اس نے فوری فیصلہ کر لیا کہ سسٹر مختار پاگل ہو رہی ہے۔

پیرانائیڈ عورت کے یوں اچانک اپنے گہرے چُھپے خیالوں میں آ گھسنے پر سسٹر مختار کو سخت کوفت ہوئی تھی۔ "ایک تو اس جاسوسوں والی چڑیل نے جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے۔ مرے کہیں جا کر گھر اپنے...... کوئی لینے آئے اسے۔" سسٹر مختار دل ہی دل میں کڑھی مگر بلند

Scanned by CamScanner

آواز سے اسے مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا ''یہ بیگم صاحبہ آپ دیکھیں پلیز اس وقت اپنے بیڈ پر ہی رہا کریں۔''

''بیڈ پر میں کیسے رہ سکتی ہوں میری جان جب کہ مجھے پتہ ہے کہ میری سسٹر مختار پاگل ہو رہی ہے۔ اپنے آپ ہنستی رہتی ہے۔''

سسٹر مختار کا جی تو چاہا کہ اسی وقت جاسوسوں والی کو زمین پر گرا کر مار مار کر اس کا بھرکس نکال دے۔ ''کنجری۔ پاگل بنی پھرتی ہے۔ پتہ نہیں کس کس یار سے...... سمجھ نہیں آتی اس طرح کے مکرے پاگلوں کی ڈاکٹروں کو سمجھ کیوں نہیں آتی...... حکومت بھی کچھ نہیں کرتی۔'' پیرانائیڈز کے بارے میں سسٹر مختار کا پختہ خیال تھا کہ اُن کے کیس میں حکومت کو مداخلت کرنی چاہیے کیوں کہ یہ پاگل نہیں ہوتے بلکہ مکرے، فراڈیے ہوتے ہیں۔ اور پاگل خانوں میں خوامخواہ آ کر بے چارے اصلی پاگلوں کا حق مارتے ہیں۔'' بھلا بتاؤ۔ کوئی کہتا ہے.. کہتی ہے میرے پیچھے جاسوس لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے دشمنوں نے دارالحکومت میں مشین فٹ کی ہوئی ہے جو وہاں سے ہی مسلسل میرا خون چوستی رہتی ہے۔ ایک اور کی سنو۔ اخنے میری بیوی مجھے مارنے کے لیے زہریلی شعاعیں میرے کمرے میں بھیجتی ہے۔ اگر پوچھو یہاں ہسپتال کیسے آتی ہوں گی زہریلی، شعاعیں۔ بھلا کیسے؟ تو فٹ جواب حاضر جی! وہ اپنے کمرے سے بجلی کی تاروں کے ذریعے موت کی شعاعیں بھیجتی ہے۔ جو اس بلب کے رستے سے میرے اوپر گرتی ہیں۔ دنیا بھر کی بجلی کی تاریں تو آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ بھلا بتاؤ ایسی فٹ فاٹ دلیل پر دلیل کہانی کوئی پاگل دماغ بنا سکتا ہے۔ توبہ میری۔ اب اس جاسوسوں والی کو دیکھو۔ یہ تو خود اچھی خاصی جاسوس بنی ہوئی ہے۔ کنسویاں لیتی پھرتی ہے۔ گشتی۔''

''جی بیگم صاحبہ جی آپ کو آپ کے بیڈ پر چھوڑ آؤں۔'' سسٹر مختار نے پیشہ ورانہ ضبط کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس سے پوچھا مگر جاسوسوں والی ہنسی اور کہیں اور جانے کی بجائے سسٹر مختار کے سامنے کرسی پر ایسے جم کر بیٹھ گئی جیسے آج کچھ بات کر کے ہی جائے گی۔ ''مجھ سے دور مت بھاگو سسٹر'' وہ اپنی Husky آواز میں بولی ''میں سب جانتی ہوں۔ میں یہاں سب آنے جانے والوں پر نظر...... میری نظر سب پر رہتی ہے سسٹر مختار۔ تم پر بھی......'' وہ ہنسی اور سسٹر مختار جو ذہنی مریضوں کی آنکھوں میں دیوانی چمک دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی اس کی ہنسی اور پارے جیسی تھراتی آنکھوں سے

Scanned by CamScanner

کچھ بھی متاثر نہ ہوئی۔

"جی جی......ٹھیک ہے جی" اس نے بے حد خشک لہجے میں کہا اور سوچا کہ وہ کل بڑے پروفیسر ڈاکٹر صاحب جب راؤنڈ پر آئیں گے تو شکایت کرے گی۔ وارڈ میں کچھ تو ڈسپلن ہونا چاہیے ناں جی۔ یہ کیا ہوا آدھی آدھی رات مریض سیریں کرتے پھریں۔ ٹھیک ہے خطرناک پاگلوں کا وارڈ الگ ہے پر کسی کو خطرناک ہونے میں بھلا دیر لگتی ہے۔ ذمہ داری اس وقت ڈاکٹر ناصر کی ہے ناں......... پر وہ اپنا وہ بڈھا لے کر ایمر جنسی میں گھسا ہوا ہے۔ کل کروں گی شکایت۔ اچھا ہے ذرا کھچائی ہو اُس کی ناصر کی۔ ہائے میں مر جاؤں میں نے تو اُس کے مہمانوں کے لیے چائے بھجوائی تھی۔ پر یہ منحوس چھنال کہیں اب جائے ناں کیسی ٹھس کر کے بیٹھی ہوئی ہے۔

پیرانائیڈ عورت نے سخت لکڑی کے سٹول پر اپنی پیٹھ کو اور بھی ڈھیلا اور آسودہ کیا اور پھر جب اچانک اس نے کسی ڈانسر کی طرح اپنے کولہوں کو حرکت دی تو جسم کے ریشوں کی سب راحت اور لذت زیریں جسم کے مرکز میں ٹھہر گئی اور وہاں سے پھر روشنی کے نقطے سے پھوٹتی شعاعوں کی طرح پورے جسم میں پھیل گئی۔ سسٹر مختار کو اب اس کی آنکھوں کی لشک معمول کی مینٹل آنکھوں سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔

"اچھا تو تم نہیں مانتی کہ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں مختار۔ ابھی ابھی تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تم پاگل ہو رہی ہو۔ تمہارے پاگل ہونے کا ایک ذمے دار تو وہ تھا ہی ڈاکٹر ناصر۔ اب اس کی دوست بھی آ گئی ہے۔ زہرہ......اور تم ان دونوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی ہو۔" وہ پھر ہنسی۔ اور مختار کو ایسے ہی لگا جیسے اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا ہو۔ "تم......تم تمہیں کیسے پتہ چلا" سسٹر مختار نے خوفزدہ سے لہجے میں پوچھا اور سسٹر مختار کو خوفزدہ کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

عورت نے اپنے دونوں کانوں کے پیچھے اپنے ہاتھوں کے پیالے بنائے اور منہ سے شی کی آواز نکالی اور چاروں طرف یوں آنکھیں نچائیں جیسے آوازوں کو آنکھوں سے ہی ڈھونڈ نکالنا چاہتی ہو۔

"میں ان کی باتیں سنتی رہی ہوں۔ ڈاکٹر کی اور اس کی دوست کی پچھلے کئی ہفتے سے۔ اور تمہارے دل کی آواز بھی۔ میں تو سرگوشیاں بھی سن لیتی ہوں۔ میرے کان بڑے Sharp

ہیں۔" وہ اتنی شدت سے سسٹر مختار سے مخاطب تھی کہ اس بے چاری نرس کو یوں محسوس ہوا کہ شاید وہ یک دم چھری بن کر اس کے اندر اتر جائے گی۔ دونوں عورتیں ایک دوسرے کو نظروں سے گھرا چھیدتی تھیں۔ ایک دیوانگی میں آئے فرزانگی کے وقفے میں رکی کھڑی اور دوسری اپنے روزمرہ کے محفوظ اعتماد کے تلپٹ ہو جانے کا صدمہ سہتی۔ لڑکھڑاتی ہوئی۔ مگر دونوں ہی جانتی تھیں کہ اس وقت ان دونوں کے درمیان وہ عورت اور مرد تھے جنہیں وہ پچھلے بہت عرصے سے اپنے اپنے تجسس کے زور پر ہڑپ کرنے کے درپے تھیں۔ ڈاکٹر ناصر اور زہرہ۔ نرس کے چہرے مہرے پر خوف اور اضطراب کی پرچھائیاں دیکھ کر پیرانائیڈ عورت کو ویسا ہی مزہ آیا جیسے کسی شریر بچے کو کسی چھپی چھپائی تصویر پر پنسل سے داڑھی مونچھیں اُگانے پر آتا ہے۔ وہ ہنسی اور پھر سسٹر مختار سے یک دم بے نیاز ہو کر سوچنے لگی "تیز...... کان بھی کیسی مزے کی چیزیں ہیں...... کیسی کیسی آوازیں آتی ہیں۔ مائی گاڈ...... اب تو مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ میں Bionic woman ہوں...... میں سب کو بتا ہی نہ دوں آخر کب تک چھپاتی پھروں گی۔ مگر نہیں...... ایسے اپنے اپنے Secrets اپنے پاس ہی رکھنے چاہئیں۔ آخر ڈاکٹر ناصر اور زہرہ بھی اپنا Secret اپنے درمیان چھپائے بیٹھے ہیں Aphrodisiacs کا...... ہاں بتانا نہیں چاہئے۔ اپنی بات...... ایسے ہی یہ لوگ...... ایسی ہی باتوں پر تو یہ لوگ پاگل قرار دے دیتے ہیں۔ جیسے اس نے حمیرا نے بیوقوف نے بتا دیا کہ وہ ملکہ نور جہاں ہے۔ تو اس کو بجلی کے جھٹکے دینے لے گئے...... مجھے کیا مصیبت پڑی ہے بتا دوں میں Bionic woman ہوں...... مجھے خود پتہ ہے میں ہوں بس اتنا ہی کافی ہے...... ویسے میں مزہ ضرور لوں گی اس کو بتا کر اس کن کھجوری نرس کو۔ میں کیا کیا سن لیتی ہوں...... میں کیوں نہ مزہ لوں" اور اس نے پھر لکڑی کی تختی پر اپنے کولہوں کو لٹو کی طرح گھمایا اور اپنی مخصوص آواز میں بولی۔

"تمہیں کیا پتہ سسٹر میں کیا کیا سن لیتی ہوں۔ اس Psychiatric ward میں۔"

"اچھا جی۔ بیگم صاحبہ۔ واقعی جی؟" سسٹر مختار اب بہت کچھ اپنے اوپر قابو پا چکی تھی اور دل ہی دل میں اس بات پر محظوظ بھی ہو چکی تھی کہ "کیسے میں جو اتنا گھاگ اور کایاں بندہ ہوں ایک پاگل عورت کی باتوں سے پریشان ہو گئی تھی میں تو اس جیسیوں کی کھال بیچ کر کھا جاؤں" اس نے اپنے ساتھ اندر ہی اندر کچھ ایسا ہی جارحانہ مکالمہ کیا اور پھر جب وہ ایک مضبوط زمانہ ساز معاملہ فہم معاف کرنے کو تیار شخص کے آسودہ انداز میں بولی تو اس کے لہجے میں ایک لٹک تھی۔

Scanned by CamScanner

''جی...... بیگم صاحبہ...... جی...... کیا سن لیتی ہیں جی آپ...... ذرا ہم بھی تو سنیں۔ ڈاکٹر صاحب تو پتہ نہیں کب وہ اپنا بڈھا Patient بھگتا کر آئیں۔ اتنی دیر ذرا ہم باتیں ہی سنیں آپ کی......''

''اچھا سنوگی باتیں میری...... جو میں نے سنی وہ سنو تم...... میں نے ناصر اور زہرہ کو باتیں کرتے سنا تھا ابھی چند دن پہلے When She was here...... وہ دونوں Aphrodisiacs کی باتیں کر رہے تھے۔ تم Aphrodisiacs جانتی ہو ناں سسٹر مختار'' عورت نے پوچھا۔ نرس اگرچہ جانتی تھی کہ پیرانائیڈ عورت اپنی ہسٹری کے مطابق کافی پڑھی لکھی ہے اور ظاہر ہے انگریزی خوب جانتی ہے مگر وہ کبھی بھی اسے یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح بھی اس سے کم پڑتی ہے۔ ویسے بھی ماہ پارہ، کہ یہی اُس پاگل عورت کا نام تھا، جو چھوٹے موٹے انگریزی فقرے مارتی تھی وہ صاف اُس کی سمجھ میں آتے تھے مگر اُس وقت اُس نے جو الٹا پلٹا سا لفظ بولا تھا وہ صاف سسٹر مختار کی سمجھ سے باہر تھا۔

''جی...... کیا...... افروڈ......'' اس نے ایسے ہچکچاتے ہوئے فہمائشی لہجے میں پوچھا۔ جیسے قصور اس عورت کا ہی رہا ہو کہ جیسے وہ ٹھیک سے بول ہی نہیں سکی۔

''Aphrodisiacs؟...... تم جانتی ہو......؟''

سسٹر مختار کے لیے اب بہت مشکل تھا کہ وہ ہار مان لیتی اُس نے پورے اعتماد سے مسکراتے ہوئے کہا ''اچھا اچھا...... ...... ہوں...... تو وہ افروڈائیاک کے بارے میں باتیں کرتے ہیں...... ہوں...... ٹھیک ہے......''

''حیرت نہیں ہوئی تمہیں اس بات پر'' پیرانائیڈ عورت خود حیران تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ گھرے شک کی دنیا کی باسی تھی جس میں حیرت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

سسٹر مختار نے قہقہہ لگایا ''حیرت کس بات کی بیگم صاحبہ ڈاکٹر ناصر اور اس کی دوست زہرہ کرتے ہوں گے بات افروڈائیزیکس کی میں خود...... اکثر...... ان چیزوں کی بات کرتی ہوں...... یہ جو آپ کہہ رہی ہیں''

''تم...... اکثر بات کرتی ہو...... Aphrodisiacs کے بارے میں...... تم واقعی؟...... او مائی گاڈ......''

Scanned by CamScanner

ماہ پارہ کا کھلا ہوا منہ اور کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر نرس مختار نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کچھ زبردست گڑبڑ ہو چکی ہے اور اس پر وہ اپنی جگہ اندر باہر سے بے حس و حرکت ہو گئی کسی ایسے شخص کی طرح جو مکمل تاریکی میں اعتماد سے اپنی خشک زمین پر قدم اٹھاتا چلا جاتا ہے مگر پھر اچانک اگلا پاؤں کسی کیچڑ میں جا پڑنے کے احساس کے ساتھ ہی وہیں جم کر رہ جاتا ہے پھر جنبش سے گریزاں ہو جاتا ہے کہ کہیں آگے پیچھے دائیں بائیں کی کسی گھات کا شکار نہ ہو جائے۔ وہ اپنے تھمے ہوئے وقت میں غیب سے کسی یقین کی روشنی کے اُترنے کا شدت سے منتظر ہو جاتا ہے جو اُس کے پاؤں کی حرکت کو پھر اُس کا کھویا ہوا اعتماد دے سکے۔ نرس مختار اپنی گفتار کے کھوئے ہوئے اعتماد کے ساتھ اس لمحے ایسے ہی اپنے تھمے ہوئے وقت میں منتظر اُس منتشر ذہن والی عورت کی آنکھوں میں دیکھتی تھی۔ جس کی آنکھوں میں اب ایک نشیلا غبار تھا اور اُس کے ہونٹ گہری آسودگی میں پھیل کر پھر قوس بناتے اوپر کو اُٹھے تھے اور شانت واپس اُتر آئے تھے جیسے بلی دھوپ میں لیٹی لیٹی یک دم اُٹھے انگڑائی لے اور پھر لمبی لمبی لیٹ جائے۔ اس کی Husky آواز کا Husky پن اب اور بھی نمایاں تھا۔ ”سمجھی ...... سمجھ گئی۔ تم افروڈائیزیکس کی صرف بات ہی نہیں کرتی میری جان تم ضرور انہیں استعمال بھی کرتی ہو یا کسی کو کرواتی ہو استعمال اپنے لیے کیوں ہے ناں ایسی بات؟“ پیرانائیڈ ہنسی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اُس سے کچھ پوچھ رہی ہے نرس مختار ایک لفظ بھی نہ بولی۔ مگر عورت کی ہنسی نے کسی گہری جنسی سطح پر اُسے اتنا ضرور بتا دیا کہ ”یہ ہے کوئی بہت ہی بے شرمی کی بات“

”تم تو شادی شدہ ہی نہیں ہو۔ تم کیسے استعمال کرتی ہو گی افروڈائیزیکس مگر افروڈائیزیکس استعمال کرنے کے لیے شادی شدہ ہونا بھلا کہاں ضروری ہے۔ کیسی پاگل ہوں میں .... بس عورت مرد ہونا کافی ہے۔ .... کیوں مختار کیا صرف عورت مرد ہونا ہی کافی ہے ناں۔“

”جج ...... جی ...... جی .... پتہ نہیں جی آپ نے کبھی استعمال ...... کی ...... ہیں ...... یہ چیز جو آپ کہہ رہی ہیں“ ...... مختار نے ڈرتے ڈرتے ایک ایسے اندھیرے میں قدم اُٹھا ہی دیا جہاں اُسے اب کچھ ہلکی سی روشنی نظر آنے لگی تھی۔

نرس مختار کے اس سوال پر پیرانائیڈ عورت کا ردِعمل لمحاتی فرزانگی کے لمحوں سے اس کی واپسی کا پہلا قدم تھا۔ ”میں“ اس نے چیخ کر کہا اور اس کی ”میں“ کی صوت میں ہی گویا دیوانگی کا پھر سے اعتراف تھا اور نرس مختار ایسے اعتراف کے لمحوں کو جانچ لینے میں خوب کائیاں تھی۔

Scanned by CamScanner

''گئی......گئی......گئی......گئی اُتر گئی......پٹڑی سے............حرامزادی پھر پاگل ہوگئی

''میں استعمال کرونگی افروڈ ائیز یکس'' پیرانائیڈ نے چیخ کر کہا اُس کا لہجہ اور اُس کے

چہرے کی لکیروں کا انتشار اب نرس مختار کے دل کی آواز کی تصدیق کر رہا تھا ''میں کیوں کروں گی

استعمال......کروں گی یہ دوائیاں............مرد کے مرد کو اور عورت کی عورت کو اور بھی آگ لگانے

والی یہ دوائیاں......یہ Drugs میں کیوں استعمال کروں گی............نرس............تم جانتی نہیں

میں کون ہوں...... میں آگ ہوں...... میں تو خود آگ ہوں...... میرے اندر آگ ہے

یہاں سے جاتی ہے......اوپر کو......اور......اور اُس نے اپنے جسم کے نشیب وفراز کی طرف کچھ

ایسے اشارے کیے کہ بڑی بے باک نرس ہونے کے باوجود مختار نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا

کہ کہیں وہ دیوانی وہیں کھڑی اپنے کپڑے نہ اُتارنا شروع کردے۔

''دوائیاں...... افروڈ ائیز یکس'' نرس مختار کے ذہن میں یہی لفظ بار بار گونج رہا تھا اور پھر

اچانک 'علم' کی روشنی اُس کے چاروں طرف پھیل گئی نامانوس انگریزی لفظ کے فحش معنی پوری طرح

اُس پر نازل ہوگئے۔ جن میں جوانی کے اشتہاروں کی عبارتیں، سنیاسیوں کی کراماتیں، کُشتوں،

نسخوں اور معجونوں کی سُنی سنائی سنسنی خیز کہانیاں سب کچھ شامل تھا۔ ''بیڑا غرق............تو یہ نامراد

افروڈ کا...... پتہ نہیں کیا......تو یہ وہ دوائیاں ہیں اللہ معافی......اور ڈاکٹر ناصر اور زہرہ ان دوائیوں

کی باتیں کرتے ہیں!''

ڈاکٹر ناصر، زہرہ اور ایسی ویسی دوائیاں انکشاف کا یہ ایک ایسا تکونا فلیتہ تھا جس نے نرس

کے ذہن میں ناصر اور زہرہ کے بارے میں پہلے سے ذخیرہ کیے ہوئے ہیجان خیز بارود کو بھک سے

اُڑا دیا، اور وہ ذہنی ہی نہیں بلکہ صاف جسمانی طور پر بھی لڑکھڑا گئی۔ اُسی لمحے پیرانوائیڈ نے

بے اعتنائی اور لاتعلقی سے اُس کی طرف دیکھا، سٹول سے اُٹھی اور ایسی خاموشی سے واپس وارڈ کو

لوٹ گئی جیسے وہاں کبھی آئی ہی نہ تھی۔

نرس مختار کو علم تھا کہ جمعرات ہے اور رات ہے اور چاند کے بغیر ہے اس لیے کالی جمعرات

ہے جو اس گناہوں سے لبالب بھری دنیا پر پہرہ لگائے کھڑی ہے۔ اُسے اپنے اوپر بے تحاشا ترس

آیا کہ وہ کیا اپنے آپ کو بچائے بچائے پھرتی ہے۔ شرافت کے شوق میں اور اُدھر یہ دنیا ہے۔

میری توبہ کہاں پہنچ گئی ہے۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ ناصر اور زہرہ نہ صرف مرد عورت کا تعلق قائم کر

Scanned by CamScanner

چکے ہیں بلکہ اس حد تک آ چکے ہیں کہ اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر مرد عورت کا تعلق قائم کرنے کے لیے انہیں دواؤں کی بھی ضرورت پڑ چکی ہے۔ سسٹر مختار کے ذہن میں تخلیقِ آدم کے نہایت ارضی قسم کے مناظر کی تفصیلات اتنی آفاقی سطح پر رونما ہو گئیں کہ پوری کائنات مرد و زن کی مخصوص علامتوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ایسی دیو ہیکل شناختیں جو اپنی اپنی شناخت کھو دینے کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ تیس سالہ نرس مختار بیگم کو اس وقت وارڈ کی اونچی چھت کے لٹکے پنکھے کے نیچے کھڑے ہونے کے باوجود اتنا پسینہ آیا کہ اس کی بغلیں اور نچلے جسم تک سب کچھ بھیگ گیا اس کی سانس ایسے پھول رہی تھی کہ جیسے دس منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر آئی ہو۔

مگر جسمِ انسانی پر ذہن کے اثرات کی اس سے کہیں بڑھ کر محیر العقول مثال اس وقت ناصر کے سامنے تھی۔ مدد علی نے اُس کی ہر طرح کی انسان دوست، ذہن دوست، شعور دوست دوائیوں کے اثرات بخیر و خوبی قبول کیے تھے۔ اس کا Fetal Posture ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ ہوش میں تھا مگر قوتِ گویائی سے محروم ہو چکا تھا اگرچہ اشاروں کا ابلاغ ابھی باقی تھا۔ ڈاکٹر ناصر کی دو گھنٹے کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اب مدد علی بستر پر اکڑوں بیٹھا اپنے گول گول دیدے گھماتا اُس کے ہر سوال کے جواب میں اپنی زبان باہر نکال کر حلق سے آں آں کی آوازیں نکالتا اور نفی میں سر ہلاتا تھا اور یوں ناصر کے اس تشخیصی فیصلے کو تقویت پہنچا رہا تھا کہ شاید صدمے نے اُس کے اعضائے نطق کو مفلوج کر دیا ہے شاید اب یہ عرصے تک یا ہمیشہ کے لیے بولنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔

''تمہیں میری بات تو ٹھیک سے سمجھ آ رہی ہے ناں؟''

جواباً مدد علی نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

''لیکن تم بول نہیں سکتے ہو؟'' ناصر نے شاید بیسویں مرتبہ یہ سوال اس موہوم امید پر کیا کہ شاید اب اُس اوٹ پٹانگ گھوڑوں کے سابقہ سائیس کے عصبی نظام میں کچھ ہل چل مچے گی اور وہ جواباً دائیں بائیں مُنڈی ہلانے کی بجائے کچھ منہ سے پھوٹے گا۔ لیکن اب بھی اُس کی مُنڈی دائیں بائیں ہی گھوم رہی تھی اگرچہ وہ کچھ تھکی ہوئی تھی۔

ناصر نے گہرا سانس لیا ڈیوٹی پر موجود ایک جونیئر نرس اور وارڈ بوائے کو اس نے فارغ کیا اور پھر ہاری ہوئی نظروں سے مدد علی کے چہرے کی طرف دیکھا اور یک بارگی متعجب ہوا کہ وہ کیا تھا جو ایک لمحے کے لیے اُس کی بوڑھی آنکھوں میں لرز گیا تھا۔ بے چارگی یا اس بات پر شرمندگی کہ

ڈاکٹر کی پوری کوششوں کے باوجود وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا تھا۔ کسی ہمہ گیر خوف کا تالا اُس کے اعضائے نطق پر ایسا مضبوطی سے بند ہوا تھا کہ سائیکیاٹرک میڈیسن کی کسی کنجی سے نہ کھل سکا تھا۔ مگر ابھی تو علاج ہوگا۔ لمبا علاج ہوگا گو فوری طور پر تو جو نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ کیس Hopeless ہے۔ ناصر نے سوچا اور پھر اُس مخصوص ڈپریشن کا موڈ اُس پر طاری ہو گیا جو مریض کے لواحقین کو بُری خبر سنانے سے پہلے اُس پر طاری ہوتا تھا، اور لواحقین وہ دونوں بدمعاش ہیں جو آئے دِن اس مظلوم بڈھے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر کرا کے اُسے یہاں اُٹھا لاتے ہیں۔

''آؤ مدد علی چلیں۔'' ناصر نے کہا اور مدد علی اتنی مستعدی اور پھرتی سے بستر سے اُتر کر ناصر کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا کہ جیسے اُسے یقین دلا دینا چاہتا ہو کہ باتیں کرنے، بولنے چالنے کے علاوہ وہ اُس کے کسی بھی حکم کی تعمیل کرنے کے لیے تیار ہے۔

وارڈ میں نرسنگ اسٹیشن کے سامنے سے گذرتے وقت ناصر نے دیواری کلاک کی جانب دیکھا رات کے دو بج رہے تھے۔ سسٹر مختاران دونوں کو دیکھ کر نیم دلانہ انداز میں کھڑی ہوگئی اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ منحوس بڈھا اپنے قدموں پر چل کر جا رہا ہے۔ اب یہ ڈاکٹر تو اپنے کمرے میں جا مرے گا باقی رات کے لیے اور اس کے دوست بھی اس بڈھے سمیت دفع ہو جائیں گے اور وہ کاؤچ پر ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ جائے گی۔ زندگی اُس لمحے سسٹر مختار کے لیے بہت کسیلی اور بدمزہ ہو رہی تھی۔ اُدھر ناصر نے گذرتے گذرتے نرس مختار کو دیکھ کر سوچا ''یہ عورت بھی تو کچھ نہیں بتاتی کہ یہ کیا سوچتی رہتی ہے۔ شاید یہ بھی کچھ بتا نہیں سکتی۔ کوئی بھی اصل میں کسی کو کچھ بتا نہیں سکتا۔ نان سینس۔ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ یہ باتیں، اس طرح کی باتیں اُن بدمعاشوں کے سوچنے کی ہیں جو اُس سامنے والے کمرے میں پتہ نہیں دو گھنٹے کے انتظار کے بعد کس حالت میں پڑے ہوں گے۔ چائے............'' ''سسٹر چائے بھجوا دی تھی ناں اِدھر میرے دوستوں کے لیے'' ناصر نے بلند آواز سے پوچھا۔

''لعنت ہو اس پر بھولا پھر بھی نہیں'' سسٹر نے اندر سوچا اور باہر سے بولی۔

''ساری ڈاکٹر صاحب............ساری جی...... وہ ...... دراصل...... وہ بالکل یاد نہیں رہا...... وہ کچھ تو جی...... اُسے Manage کرنا پڑ گیا تھا۔ جاسوسوں والی کو............''

''جاسوسوں والی کو؟......'' ناصر نے رُک کر پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''وہ جی پیرانائیڈ.......جی......ماہ پارہ.............''

''ہوں................پھر...........''

''ٹھیک ہوگئی جی......SET ہوگئی ہے......بستر پر ہے اب اپنے......میں ابھی چائے بھجواتی ہوں......ٹی بی والوں کی کینٹین ساری رات کھلی رہتی ہے۔ رکھے کو بھجواتی ہوں......آپ چلیں ڈاکٹر صاحب......چائے آتی ہے......کمرے میں آپ کے۔''

''نہیں......نہیں......رہنے دو اب......'' ناصر نے بے زاری سے کہا۔

''نہیں......نہیں جی......ابھی آتی ہے چائے......بابا جی...... SET ہوگئے''

''نہیں......یہ ابھی نہیں ہوئے...... SET ......آ وَ مدد علی.......''

ناصر اور مدد علی کمرے کی طرف اور نرس رکھے کو کہیں موجود نہ پا کر خود ہی ٹی بی وارڈ کی کینٹین کی طرف چلی گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو بار بار یقین دلایا کہ دراصل خود اُسے بھی چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔

O

ہاف مین مصر تھا کہ......''ابھی جب کہ یہ حادثہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مدد علی سے کچھ بنیادی سوالوں کے جواب ضرور پوچھ لینے چاہئیں خواہ اس کے لیے اشاروں کی زبان کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ مثلاً یہ کہ کیا اُس نے بھی پیلے رنگ اور کالے دھبوں والا سانپ دیکھا تھا یا نہیں اور یہ سوال تم ہی پوچھو ڈاکٹر۔''

''ہرگز نہیں۔ تم کیس کو اور بگاڑ دو گے۔ اتنے وحشی نہ بنو۔ میں اُس کے خوف کو پھر زندہ نہیں کرنا چاہتا۔ جو کچھ بھی سلوک تم اس شخص کے ساتھ کر کے لائے ہو......وہ میں زیادہ نہیں جانتا............لیکن یہ جان لو تم کہ اُس کی Speech شاید ہمیشہ کے لیے Arrest ہوگئی ہے..............''

''کیا دماغ میں Language کے سینٹر متاثر ہوئے ہیں یعنی Broca's area......'' کبیر نے پُرخیال انداز میں پوچھا اور ڈاکٹر ناصر نے طنز بھری جھنجھلاہٹ سے اُس کی طرف دیکھا اور بولا ''ایک تو ادھورا علم لوگوں کو ٹکنے نہیں دیتا۔''

Scanned by CamScanner

”بے شک“ کبیر نے فوراً ہی ہار مان لی۔

”مگر یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ آج کی رات یعنی اس کالی جمعرات کی رات مدد علی کے ساتھ جنم کھنڈر میں کیا بیتی، خواہ اس کے لیے اُس کے دماغ کے اندر ہی کیوں نہ اُترنا پڑے“ ہاف مین نے کٹیلے پر عزم لہجے میں کہا۔

”میں ایسی کسی حرکت کی اجازت نہیں دوں گا“ ناصر کے لہجے میں بھی اُتنا ہی عزم تھا اور کاٹ تھی ”میں اُس کی قوتِ گویائی واپس لانے کی پوری کوشش کرونگا۔ پروفیسر غفور سے ڈسکس کرنا ہے ابھی یہ کیس مجھے۔ لیکن تم ہیر ہاف مین ابھی اس مظلوم شخص کو تنہا چھوڑ دو۔ پلیز“ ناصر نے کہا اور دل ہی دل میں محسوس کیا کہ وکٹورین پونڈ والے واقعے کے برعکس ابھی سچوایشن پر اُس کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔

”ہوں...... آھُم...... ھُم...... ہاخ“ ہاف مین کی لایعنی آوازیں قدرے جرمن تھیں پھر وہ انگریزی میں بولا ”دیکھتے ہیں ڈاکٹر دیکھتے ہیں۔ تم اپنا میڈیسن کا زور لگالو جہاں تک لگا سکتے ہو۔ مگر مدد علی کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ بہت بڑا ظلم ہوگا اِس شخص نے اُس جہنمی عقوبت خانے میں قدیم ماضی کے کسی تھمے ہوئے لمحے کا نظارہ کیا ہے۔ وہ ایک نابغۂ روزگار عینی شاہد ہے۔ اُسے تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بہر حال..........“ ہاف مین نے کندھے اچکائے۔ ”دیکھتے ہیں دیکھتے ہیں۔“

کبیر نے یک دم بے تحاشہ بڑا سا منہ کھول کر جمائی لی تو اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور نیند کے نزول سے جسم تھرا سا گیا۔ ”دیکھتے ہیں“ وہ کراہا۔ گھڑی دیکھی اور اُٹھ کھڑا ہوا ”ڈاکٹر بات یہ..........“

”چائے آرہی ہے“ ناصر نے اُس کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہوں.......... چائے آرہی ہے۔ تو چائے آنے تک چند گھڑیاں جو باقی ہیں اُن میں عزیزم تم میرا ادھورا علم مکمل کردو...... آہ وہ اصل بات جو میں آج جاننے یہاں آیا تھا۔ اس بڑے شہر سے غیر حاضری کے دوران تمہارے اور عزیزہ زہرہ کے عشق نے کیا منزلیں طے کیں؟......... اس داستانِ عبرت کی کچھ تفصیل تو مجھے گورے نے سنائی ہے۔ مدد علی کی قوتِ گویائی چھننے سے پہلے۔ لیکن گورا اُس وقت چرس کی شدید ترنگ میں تھا اس لیے..........“

”گورا مت کہو مجھے۔ منحوس لگتا ہے یہ لفظ مجھے“ ہاف مین نے کاٹ کھانے کے انداز

میں کہا۔

"OK.........." کبیر نے سعادت مندی سے کہا۔ "قابل عزت ہیر ہاف مین ساؤتھ ایشین آرکیالوجی کے شہرۂ آفاق ریسرچ سکالر اس وقت چرس کے نشے میں واہی تباہی بک رہے تھے اس لیے اُن کے بیانات ناقابلِ اعتبار تھے...... چنانچہ ڈاکٹر وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ تم انتہائی مختصر الفاظ میں۔ مکمل معروضی انداز میں اور بالکل غیر جذباتی لہجے میں اپنا، زہرہ اور اُس کے والدِ بزرگوار کا معاملہ جلد از جلد بتا کر مجھے فارغ کرو۔ آج کی رات کے لیے اتنا ہی بہت کافی ہو گا۔ اور ہاں انگریزی پر لعنت بھیجو اور اپنی پیاری مقامی بولی میں آ جاؤ۔ لمبی کہانی نہیں۔ یعنی یہ کہانی پھر سہی۔"

"ناممکن" ہاف مین کسی خونخوار بھورے ریچھ کی طرح دونوں بازو آگے پھیلائے کھڑا ہو گیا۔ "ناممکن...... میں کوئین آف شیبا اور جونیئر سائیکیا ٹرسٹ کے عشق کی داستان میں شروع سے شامل ہوں۔ تم مقامی بولی کا پردہ تان کر مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ مقامی بولی تو بالکل بھی نہیں...... اردو میں پھر بھی کچھ سمجھ لیتا ہوں.......... انگریزی میں بکو جو کچھ بھی ہے ڈاکٹر............ معروضی ٹھیک ہے........... مختصر بھی چلے گا...... غیر جذباتی ہی سہی۔ لمبی کہانی نہ سہی۔OK............ مگر نو مقامی بولی...... اب آؤ............"

ناصر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر ایک ایسی ٹھنڈی سانس جسے کبیر نے فوراً دل ہی دل میں "آہِ سرد" قرار دے دیا۔ کسی بھی زبان سے ماورا اُن "دو" حرکتوں کے بعد ناصر نے انگریزی جاری رکھی۔ "تم چاہتے ہو کبیر کہ تمہارے تیس صفحوں کے خط کا جواب میں چند انتہائی غیر جذباتی معروضی فقروں میں مختصراً دے دوں.........."

"یہ بہتر ہے"........... ہاف مین نے سکھ کا سانس لیا اور بیٹھ گیا.......... "یہ بہتر ہے۔"

"وہ خط محض بک بک تھا۔ وہی میری مخصوص بک بک لیکن لکھی ہوئی اور تم نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ وہ سب کا سب تمہارے عشق کے بارے میں نہیں تھا۔ اتنا اہم نہیں ہے یہ موضوع" کبیر نے بے چینی سے کہا۔ "ہاں تو تم...... زہرہ اور یاور عطائی...... معروضی...... مختصر...... غیر جذباتی.........." ڈاکٹر ناصر نے اپنے آپ کو ٹٹولا تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ خود بھی اس معاملے پر اس وقت لمبی چوڑی بک بک کرنے کے موڈ میں نہیں۔ اس لیے وہ جلد ہی کبیر کے حکم کی تعمیل کرنے

Scanned by CamScanner

کے لیے اپنے آپ کو اندر باہر سے مجتمع کرنے لگا۔

اُسی وقت کونے میں رکھی کرسی میں بیٹھے مدد علی نے سوچا کہ یقیناً اب کچھ دیر سے گورا اور دونوں دیسی اُس کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے اور اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر کبھی جب بھی اُس کے حلق میں پھنسا پھندا کھل گیا تو اُس نے جنم کھنڈر میں جو کچھ دیکھا ہے جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ سب کچھ ان میں سے کسی کو نہیں بتائے گا اگر بتائے گا تو صرف نواب صاحب کو۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو۔

ناصر نے بالآخر جیسے کسی کیس ہسٹری میں سے تشخیصی نکات نکال لیے، وہ ہلکا سا کھانسا۔

''نمبر 1۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کیفیت سب بکواس ہے۔ لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں زہرہ کے عشق میں جنون کی حد تک جا چکا ہوں۔

نمبر 2۔ زہرہ ایسے کسی جنون کا شکار نہیں۔ اُس کا جنون دوسرا ہے وہ جاننا چاہتی ہے کہ اُس کے باپ یعنی یاور عطائی کا معمہ کیا ہے۔

نمبر 3۔ ایک سچے عاشق کی طرح میں نے اس عرصے میں اُس کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے اس کے باپ کے ماضی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ میری ان خدمات کے صلے میں بس ایک بار ہی ایک مہربان نظر سے میری طرف دیکھ لے............

نمبر 4۔ جو بڑی باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ یہ ہیں کہ یاور عطائی آج سے بہت سال پہلے بڑے شہر میں آیا تھا۔ اُس نے ایک حکیم کا سیٹ اپ چلایا۔ مگر اس کی حکمت کا اصل ریکٹ صرف یہ ہے کہ وہ شہر۔ بلکہ شاید ملک کے بہت بڑے بڑے اعلیٰ پائے کے ادھیڑ عمر عیاش مردوں کو Aphrodisiacs مہیا کرتا ہے۔''

ڈاکٹر خاموش ہو گیا اُس کا معروضی بیان ختم ہوا۔ اور سناٹا جو اُس کی خاموشی کے ساتھ یک دم کمرے میں اُتر آیا تھا گہرا چھانے لگا۔ مگر پھر یک دم ہی چُور چُور ہو گیا۔ ہاف مین کی آواز اتنی ہی بلند تھی۔

''Aphrodisiacs'' اُس نے نعرہ لگایا ''Aphrodisiacs'' تمہارا مطلب ہے تم نے یہی کہا ناں Aphrodisiacs...... میرے خدا...... کوئین آف شیبا کا باپ Aphrodisiacs بیچتا ہے...... او خدایا...... گیبر...... گیبر...... کچھ ہونے والا ہے...... کوئین آف شیبا...... جنم کھنڈر...... پیلا سانپ

ہتھری صندوقچی اور اب یہ Aphrodisiacs.......... کبیر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں یہاں کچھ ہونے والا ہے Aphrodisiacs'' اور پھر ہاف مین وفورِ جذبات سے اپنی دونوں رانیں پیٹتے ہوئے قہقہے لگانے لگا۔

دروازے کے ساتھ باہر چپکی کھڑی نرس مختار لفظ Aphrodisiacs کی اس خوفناک تکرار سے لرز کر رہ گئی اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اندر جا کر یہ نہیں بتائے گی کہ کنٹین کا ملازم چائے لا رہا ہے۔ کیا پتہ ان ذلیلوں نے یہ کھا ہی رکھی ہو یہ افروڈ ڈائی.......... اور وہ وہیں سے جیسے اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔

چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اُتارنے تک بھی کبیر نے ڈاکٹر ناصر کے ''مختصر معروضی اور غیر جذباتی'' بیان پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اُس نے ہاف مین کے افروڈائیزیکس کے ذکر پر ابل پڑنے والے شہوانی اشاروں پر بھی کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ اس کے تصور کی آنکھ سینکڑوں میل دور کھوچتا سائیں میں جا کھلی تھی ''اس لمحے میں جب میں سانس لیتا یہ سب کچھ سوچتا ہوں وہاں ننگا افلاطون ہے اور سانس لیتا گڑ کھاتا وہ اپنے جسم کا رس کھینچ نکالتا ہے۔ اور مٹی پر اُچھال دیتا ہے۔'' کبیر کسی کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''میں چلتا ہوں ڈاکٹر، ہاف مین، خدا حافظ'' اور پھر اُن کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب (8)

ڈرائنگ روم (1)

یاور ہاؤس کی اُس گہری شام میں ہونے والی وہ پارٹی زہرہ کے لیے کوئی انوکھی تقریب نہ تھی۔ یہ انہیں مخصوص، تمام مردانہ، محفلوں میں سے ایک تھی جنہیں زہرہ کی ماں ایک تنفر آمیز لہجے میں بڈھے مشٹنڈوں کی دھما چوکڑی کا نام دیا کرتی تھی۔

زہرہ یہ بھی دیکھتی آئی تھی کہ اگرچہ اُس کی ماں ان محفلوں کا ذکر نفرت سے کرتی تھی مگر پھر بھی اُس کے دونوں بیٹے جو کاروباری لوگ تھے اُن کے کئی پھنسے پھنسائے کاروباری مسئلے مسائل اُن بڈھے مشٹنڈوں کے ساتھ گپ شپ میں ہی حل ہو جاتے تھے۔

''کیا مرد چالیس سال کی عمر میں بوڑھا ہو جاتا ہے'' یہ وہ پہلا سوال تھا جو اُس روز گہری شام میں اور اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی زہرہ کے دماغ میں کلبلایا۔ یاور عطائی کے دوستوں میں چالیس سے لے کر ساٹھ ستر کے پیٹے کے کئی طرح کے مرد شامل تھے۔ ''اب یہ سب کے سب ایک جیسے بڈھے تو نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اُن میں سے بعض تو اچھے خاصے جوان نظر آتے ہیں۔ جبکہ میری ماں سبھی کو بڈھا کہہ دیتی ہے۔ آخر مرد کے بڈھا ہونے کے اور پھر بڈھا مشٹنڈا ہونے کے کیا معنی ہیں؟'' زہرہ نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر جیسے جواباً اُس نے اپنے کمرے کی سب بتیاں گل کر دیں اور بڑی کھڑکی کھول کر باہر اریکا پام کی روش کے دونوں جانب گھاس کے قطعوں میں پھیلی پھیکی سی تاریکی کو دیکھنے لگی۔ اگرچہ اُس نے اکنامکس جیسے خشک مضمون میں ایم۔ اے کیا تھا مگر مخلوط کلاس اور پھر اچھی خاصی سمجھ دار 'نفسیاتی لڑکیوں' اور 'معاملہ فہم لڑکوں' کی کئی طرح کی ذومعنی بلکہ بعض اوقات تو کافی کھلم کھلا گفتگوؤں میں سے اُس نے انسان کے نظامِ تولید کی بنیادی حقیقتوں کو جان لیا تھا۔ اُسے یہ بھی علم تھا کہ مغرب میں یہ سب کچھ روٹین کی باتیں ہیں اور کوئی ایسی بڑی

Scanned by CamScanner

آنت نہیں ہیں۔ پھر بھی اپنے آپ کو معلومات کی سطح پر کسی دھوکے سے محفوظ رکھنے کے لیے اُس نے ان موضوعات پر ایک آدھ اسی نوعیت کی کتاب بھی پڑھ ڈالی تھی مگر آج تک وہ کسی مرد سے اتنا قریب نہیں ہوئی تھی کہ فطرت کی ان بنیادی حقیقتوں کو کسی گہری جسمانی سطح پر دریافت کر سکتی اور اُسے اس بات کا کوئی قلق بھی نہ تھا اور یہ جاننے کے باوجود کہ اپنے ہاں کم از کم شادیوں کے بعد یہ سب کچھ تجربہ تو ہو ہی جاتا ہے اُسے ابھی تک شادی نہ ہونے پر بھی کوئی ملال نہ تھا۔

مگر اس وقت جب کہ مرد...... عورت...... جوان مرد...... بڈھے مرد...... اور بڈھے کھنڈے مرد جیسے الفاظ اُس کے لیے ایک ایسے کراس ورڈ پزل، کی شکل اختیار کر رہے تھے جنہیں تکمیل کی ہدایات کے مطابق لازماً ایک ہی لفظ سے مربوط ہونا تھا یعنی Aphrodisiacs...... تو اُس نے کئی دفعہ کافی الجھن سے سوچا کہ اگر اُس کی شادی ہو گئی ہوتی تو شاید وہ مکمل طور پر سمجھ پاتی کہ Aphrodisiacs بڈھے مردوں کی کیسے مدد کرتی ہیں اور وہ یہ فیصلہ بھی کر پاتی کہ ڈاکٹر ناصر کی میڈیکل تشریحات اور اُس کے باپ پر اُس کے گھٹیا الزامات کس حد تک سچے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر کے نزدیک میڈیکل سائنس ایسے مادوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی تھی جو بڈھے مرد کو جوان کر سکتے ہیں۔ سوائے ہارمونز کے اور وہ بھی وقتی طور پر۔ اُس کے خیال میں ایسے مادے ٹھگوں کا بیوپار ہیں اور دراصل یہ زہریلے مرکبات ہوتے ہیں جن میں بھاری دھاتوں کے سالٹز بھی شامل ہوتے ہیں اور اکثر استعمال کرنے والوں کے گردے فیل کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اُن کا کاروبار کرنا اُس کے نزدیک جرم تھا اور اُس کے خیال کے مطابق یاور عطائی بھی اسی نوعیت کا کوئی کاروبار کر رہا تھا مگر زہرہ ناصر کی کسی بات کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتی تھی خواہ اُس بات کا تعلق اُس کے باپ سے بنتا ہو یا خود اُس کی اپنی ذات سے۔ ڈاکٹر ناصر کی شکل میں جو مرد اُس کی قربت حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا ہوا تھا وہ ابھی تک اسے کسی سطح پر بھی نہیں چھو پایا تھا۔ اُس نے ناصر سے اب تک کئی بار ان دنوں ان ہی موضوعات پر بات کی تھی اور کسی چھوئی موئی پن کا کوئی مظاہرہ کیے بغیر بات کی تھی۔ مگر وہ ڈاکٹر کے نکالے کسی بھی نتیجے کو پھر بھی مان نہیں پائی تھی۔ اُس کا باپ جو کچھ بھی ہے مگر کوئی ٹھگ نہیں ہے اور ناصر جو کچھ بھی ہے مگر کوئی ایسا خاص عاشق نہیں ہے۔

مگر پھر کچھ دوسرے لمحات میں اُس کا ذہن اچانک عجیب ہٹ دھرمی سے اپنے پہلے نتیجے میں جس کا تعلق یاور عطائی سے تھا کچھ ردوبدل کرنے کی زور آزمائی کرنے لگتا اس کے دل کے نہ

Scanned by CamScanner

چاہنے کے باوجود۔ اور کبھی اس کا دل ڈاکٹر ناصر کے عشق میں صداقت کی کچھ گنجائش پیدا کرنے کے لیے راہ دینے لگتا۔ اُس کے ذہن کے نہ چاہنے کے باوجود۔ اور ایسے ہی لمحات میں وہ احساس اُس کے اندر جاگ پڑتا کہ شاید اُس کا باپ اور اُس کا نام نہاد عاشق دونوں ہی اس کے لیے عذاب بنتے جا رہے ہیں۔ یہ احساس اُس کے جسم میں گرم بھاپ کے بگولے کی مانند اٹھتا تھا اور ہمیشہ ہی اُسے اُس گرم شام میں واپس لے جاتا تھا جب ناصر بظاہر اپنے مریض کے بارے میں پیشہ ورانہ تجسس کے شکار ڈاکٹر کے روپ میں اُس کے گھر آیا تھا اور اس نے اس کے باپ پر ایسی اوچھی الزام تراشیاں کی تھیں جو اس کی برداشت سے باہر تھیں۔ اُس نے اُس ڈاکٹر کو تو کھڑے کھڑے نکال دیا تھا مگر باپ کے بارے میں جو خلجان اس کے ذہن کے اندر اٹھا تھا وہ اگرچہ نیا نہیں تھا اس کے بچپن کے جی کے جنجال بعض گوشے ابھی تک بے نام تھے مگر وہ کھوجی کُتے جیسا ڈاکٹر اُن گوشوں میں کچھ عجیب ناگوار بدبوئیں اڑا گیا تھا۔ وہ ابھی چھوٹی سی بچی تھی اور تب سے جاننا چاہتی تھی کہ اُس کا باپ اصل میں کہاں سے آیا ہے۔ وہ اس کی ماں کے جیسے خاندان کا تو ہے نہیں۔ اور ویسے بھی اس نے آج تک باپ کے خاندان کے کسی بھی شخص کو نہیں دیکھا۔ اس لیے کیسے اندازہ لگا سکتی ہے۔ مگر اُس کا جی کہتا ہے کہ جیسے اس کی ماں امیر لوگوں کے بس ٹھیک ٹھاک۔ کھاتے پیتے۔ ہاؤ...... ہا کرتے گروہ میں سے ہے اس کا باپ اگرچہ اسی گروہ کے ساتھ چل رہا ہے اور بظاہر مزے میں ہے لیکن اصل میں کچھ اور ہی طرح کے لوگوں میں سے ہے۔ مگر وہ کیسے لوگ ہیں یا کیسے لوگ تھے۔ زہرہ یہ کبھی جان نہ سکی تھی۔

ایک دفعہ اس نے اپنی ماں سے اپنے باپ کے لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا اور اپنے سوال اور ماں کے جواب، دونوں پر ہی پچھتائی تھی۔ یوں تو یہ احساس اُسے ہمیشہ سے ہی تھا کہ اس کی ماں وہ ہستی نہیں ہے جو اس کے باپ کے بارے میں کچھ بھی اصل بات بتانے کے لائق ہے مگر جب اس نے پوچھ ہی لیا تو اس نے اپنی اُسی نفرت بھری سرد مہری کا زیادہ تفصیل سے اظہار کر دیا جو یاور عطائی کے ساتھ اس کے ہر میل جول سے جھلکتی تھی اور جسے دنیا اپنے سامنے دیکھتی تھی۔ جو کچھ زہرہ کی ماں نے ایک دفعہ اُسے بتایا تھا اور اب جو اُس شام زہرہ کو یاد آتا تھا جب کہ یاور ہاؤس کے اندر کہیں بڈھے مشٹنڈوں کی دھما چوکڑی جاری تھی اور زہرہ کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ بس یوں تھا...... "یاور۔ ہنہ عطائی کا شوشہ تو پتہ نہیں کیا واہیات ہے۔ کہیں کسی دور کے کسی جنگلی

Scanned by CamScanner

علاقے سے آیا تھا اور پتہ نہیں کیوں ابا جی اس کے گرویدہ...... بلکہ مرید ہو گئے تھے...... یہ اس وقت بھی نیم حکیمی کرتا تھا۔ اور یہاں زہرہ کی ماں جھینپ گئی تھی...... پتہ نہیں کیسے اس نے ابا جی کو بس شیشے میں اتار لیا پھر اُس نے میرا رشتہ مانگ لیا اور ایک دن وہ مان گئے۔ ہم لڑکیاں ان وقتوں میں زیادہ احتجاج نہیں کرتی تھیں۔ ابا جی نے مجھے بتایا کہ یاور دیہات کا کوئی رئیس زادہ ہے کوئی بڑا زمیندار ہے۔ مگر بعد میں یاور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایسا کچھ بھی نہیں اور...... ہنس کے پھر اس نے کہا تھا تمہارے باپ نے۔ میں بتاؤں زہرہ شادی کو بس کوئی چند دن ہی ہوئے تھے کہ ہاں اس نے کہا تھا...... ''بس یہی سمجھ لو میں کچھ بھی نہیں ہوں عارفہ کچھ نہ ہونا ہی میری اصل ہے۔'' مگر مجھے ہمیشہ ہی یہ شک رہا کہ مجھے دھوکا کس نے دیا تمہارے باپ نے یا میرے باپ نے۔ خیر پھر تم بچے...... تم لوگ ہو گئے اور بات جیسے ختم ہو گئی...... اور ہم بھی بہت کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر...... خیر...... یہ تو میں...... کہوں گی...... کبھی کسی بڑی سے بڑی چیز کی بھی خواہش کی ہو گی تو ایسا نہیں کہ تمہارے باپ نے لا کر نہ دی ہو۔ کسی عورت کو کیا چاہیے اور پھر تم بچوں کو...... کوئی کمی...... نہیں...... اور تمہارے دونوں بھائی...... ارے...... اتنے بڑے بزنس مین بنا دیئے یہ بات ہے ناں ہے......'' اور یہاں زہرہ کی ماں پھر شرمندہ سی ہوئی تھی...... ''یہ تو ہے...... بڑی بات ہے...... آخر اتنے بڑے بڑے لوگ اس کا دم بھرتے ہیں......''

اتنے بڑے بڑے بڈھے مشٹنڈے میرے باپ کا دم بھرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ افروڈائزیکس؟ کیا نانا مرحوم بھی بڈھے مشٹنڈے تھے؟ زہرہ کے ذہن میں آنے والے سوال جیسے اس کے سر سے غیر مرئی اندھیری لہروں کی صورت نکل کر ارد گرد کمرے کے اندھیرے میں جذب ہو رہے تھے اور اسے ایک ڈراؤنا سا احساس دلانے لگ پڑے تھے کہ جیسے اُس کا سر پھیل کر کمرے جتنا بڑا ہو گیا ہے۔ مکمل تاریکی میں گہری تکلیف دہ باتیں سوچنے والے کبھی کبھی ایسے واہمے کا شکار ہو جاتے ہیں زہرہ کو علم نہ تھا اس نے گھبرا کے کمرے میں بتی پھر روشن کر دی اور اُسی لمحے دور سے ایک مردانہ قہقہے کی آواز کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جو امبر جان کے قہقہے کی آواز تھی اور جو زہرہ کے اندر ایک۔۔۔ طرح کی جسمانی کراہت کا احساس جگا دیتی تھی......
''یہ مردانہ جسم والا بڈھا مشٹنڈہ......'' مگر اس کی یہ سوچ بیچ میں ہی ٹوٹ گئی تھی کیوں کہ اسے علم تھا کہ امبر جان شاید مشٹنڈہ تو ہو گا مگر بڈھا نہیں۔ اس نے جگ میں پڑے پتہ نہیں کب کے

Scanned by CamScanner

باسی پانی میں سے کچھ پانی گلاس میں انڈیلا اور پھر اپنے اندر بھی جیسے انڈیل ہی لیا اور اپنے ذہن کو پھر اُسی رو پر بھٹکنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جو اُس شام اتنی تندی سے چلی تھی کہ اسے کچھ علم نہ تھا کہ اسے کہاں لے جائے گی۔

نانا مرحوم یقیناً بڈھے مشٹنڈے تھے زہرہ کے ذہن نے فیصلہ دیا۔ بیٹی کی شادی کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے ایک ملازم کی نوجوان لڑکی سے دوسری شادی کی تھی اور چند سال بعد ہی مر گئے تھے۔ ماں کے اباجی کی کہانی اُس کے علم میں تھی اگرچہ آج اسے اس کہانی میں خود اپنے اباجی کا کردار ایسا صاف نظر آ رہا تھا کہ جیسا پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ ''مشٹنڈوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' اس کے ذہن کے کسی گوشے نے اچانک ایک ایسا عجیب فیصلہ دیا تھا کہ جسے اُس کا باقی ذہن کچھ سمجھ نہ پایا تھا، اور جواباً اس نے جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا وہ بھی کافی عجیب تھا اور کمرے کی ہر شے اپنی اپنی جگہ بے حد عجیب ہونے کی فضا بناتی تھی اور زہرہ نے سوچا کہ کہیں اس نے یقیناً پڑھا تھا کہ ہر شے کے بے حد عجیب ہونے کا احساس دیوانگی کا شکار ہونے سے پہلے بعض لوگوں کو ہوتا ہے A feeling of strangeness شائد یہی الفاظ تھے۔

مگر پھر زہرہ نے اپنے دل کو ڈھارس دی کہ وہ صرف یہی تو کرنا چاہتی ہے کہ ڈکشنری میں اس منحوس۔ کٹے پھٹے اٹکتے کھٹکتے لفظ...... مشٹنڈا کے معنی ہی تو دیکھنا چاہتی ہے اور یہ بات عجیب ہے تو کیا ہے۔ وہ پاگل نہیں ہوئی۔ آخر اس لفظ کے معنی ہیں کیا؟ کچھ معنی تو ہوں گے؟

زہرہ نے اپنی کتابوں کی الماری کے نچلے خانے میں کافی اُتھل پُتھل کے بعد اردو زبان کی ایک لغت نکال ہی لی جو اس نے ایک دفعہ اس وقت خریدی تھی جب انگریزی تعلیم کے ساتھ اسے اردو شاعری پڑھنے کا چند روزہ شوق ہوا تھا۔

'مشٹنڈا' کو اُس لغت میں دیکھنے پر اُسے مصنف کی ایک اور ہدایت لکھی ملی۔ ''دیکھو (مُسٹنڈا)'' اس پر زہرہ بے ساختہ مسکرائی اور پھر اس نے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مشٹنڈا کی بجائے مسٹنڈا دیکھا۔ (مُس۔ تن۔ ڈا) بہت موٹا۔ فربہ اندام۔ جسیم۔ تیار۔ ہٹا کٹا۔

وہ احساس گہری مایوسی اور بے لذتی کا تھا جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا زہرہ نے سوچا۔ مشٹنڈا یا مسٹنڈا کا لفظ بولنے میں جس طرح اُس کے ہونٹوں اور زبان کے عضلات کو گدگداتا، تھراتا اور لچکاتا تھا اُس صوت میں اُسے معانی سے قبل ہی ازلی جسمانی اعمال کی تال

Scanned by CamScanner

باسی پانی میں سے کچھ پانی گلاس میں انڈیلا اور پھر اپنے اندر بھی جیسے انڈیل ہی لیا اور اپنے ذہن کو پھر اسی رو پر بھٹکنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جو اُس شام اتنی تندی سے چلی تھی کہ اسے کچھ علم نہ تھا کہ اسے کہاں لے جائے گی۔

نانا مرحوم یقیناً بڈھے مشٹنڈے تھے زہرہ کے ذہن نے فیصلہ دیا۔ بیٹی کی شادی کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے ایک ملازم کی نوجوان لڑکی سے دوسری شادی کی تھی اور چند سال بعد ہی مر گئے تھے۔ ماں کے اباجی کی کہانی اُس کے علم میں تھی اگرچہ آج اسے اس کہانی میں خود اپنے اباجی کا کردار ایسا صاف نظر آ رہا تھا کہ جیسا پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ ''مشٹنڈوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' اس کے ذہن کے کسی گوشے نے اچانک ایک ایسا عجیب فیصلہ دیا تھا کہ جسے اُس کا باقی ذہن کچھ سمجھ نہ پایا تھا، اور جواباً اس نے جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا وہ بھی کافی عجیب تھا اور کمرے کی ہر شے اپنی اپنی جگہ بے حد عجیب ہونے کی فضا بناتی تھی اور زہرہ نے سوچا کہ کہیں اس نے یقیناً پڑھا تھا کہ ہر شے کے بے حد عجیب ہونے کا احساس دیوانگی کا شکار ہونے سے پہلے بعض لوگوں کو ہوتا ہے A feeling of strangeness شائد یہی الفاظ تھے۔

مگر پھر زہرہ نے اپنے دل کو ڈھارس دی کہ وہ صرف یہی تو کرنا چاہتی ہے کہ ڈکشنری میں اس منحوس۔ کٹے پھٹے اٹکتے کھٹکتے لفظ...... مشٹنڈا کے معنی ہی تو دیکھنا چاہتی ہے اور یہ بات عجیب ہے تو کیا ہے۔ وہ پاگل نہیں ہوئی۔ آخر اس لفظ کے معنی ہیں کیا؟ کچھ معنی تو ہوں گے؟

زہرہ نے اپنی کتابوں کی الماری کے نچلے خانے میں کافی اُتھل پتھل کے بعد اردو زبان کی ایک لغت نکال ہی لی جو اس نے ایک دفعہ اس وقت خریدی تھی جب انگریزی تعلیم کے ساتھ اسے اردو شاعری پڑھنے کا چند روزہ شوق ہوا تھا۔

'مشٹنڈا' کو اُس لغت میں دیکھنے پر اُسے مصنف کی ایک اور ہدایت لکھی ملی۔ ''دیکھو (مُسٹنڈا)'' اس پر زہرہ بے ساختہ مسکرائی اور پھر اس نے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مشٹنڈا کی بجائے مسٹنڈا دیکھا۔ (مُس۔ ٹن۔ ڈا) بہت موٹا۔ فربہ اندام۔ جسیم۔ تیار۔ ہٹا کٹا۔

وہ احساس گہری مایوسی اور بے لذتی کا تھا جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا زہرہ نے سوچا۔ مشٹنڈا یا مسٹنڈا کا لفظ بولنے میں جس طرح اُس کے ہونٹوں اور زبان کے عضلات کو گدگداتا، تھراتا اور لچکاتا تھا اُس صوت میں اُسے معانی سے قبل ہی ازلی جسمانی اعمال کی تال

Scanned by CamScanner

...ائی دیتی تھی۔ بعض لفظوں کی محض آواز ہی کئی طرح کے شک جی میں جگا دیتی ہے مگر بعد میں
...عانی سامنے آ کر سخت مایوس کرتے ہیں ایسا ہی زہرہ کے ساتھ ہوا۔ بڑھے مشٹنڈوں کی دھما چوکڑی
...ے اس نے جیسے بھی پُرہول نقشے اپنے ذہن میں جمائے تھے لغت کے بتائے معنی ان میں
...ے کسی کی جانب بھی کوئی اشارہ نہ کرتے تھے اور وہ یہ ماننے پر بھی تیار نہ تھی کہ اُس وقت یاور ہاؤس
...ے عظیم الشان ڈرائینگ روم میں ہونے والی تقریب محض فربہ اندام مردوں کی اچھل کود ہے یا یہ کہ
...ے جسیم مردوں کی شورش قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ کوئی تیار مردوں کا ہنگامہ
ہے، اور پھر آخر کیسے تیار مرد؟ زہرہ نے الجھن سے سوچا تو کچھ امکان اس کے ذہن میں آئے مگر
فوراً ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسے معاملات کے بارے میں مزید کچھ تصور نہیں کرے گی جس کا
...ے خود کچھ بھی تجربہ نہیں۔ مگر جہاں تک ڈرائینگ روم کا تعلق ہے وہ آج خود اپنی آنکھوں سے
دیکھے گی کہ اس کے باپ کو ملنے کے لئے آنے والے وہ سب لوگ۔ بڑے بڑے حکومتی عہدوں پر
بیٹھے والے افسر۔ سیاستدان۔ کئی طرح کے پیسے والے۔ علم والے۔ طاقت والے۔ فن والے۔
ایک ایسے شخص کے پاس آ کے بیٹھے کیا کرتے ہیں جو مزے سے اپنے آپ کو عطائی کہلواتا ہے مگر
پھر اپنے خاص کمرے میں گھس کر گھنٹوں پتہ نہیں کیا الابلا جڑی بوٹیاں کوٹتا چھانتا رہتا ہے۔ جن
کی بھین ڈھول کبھی جب کمرے کی بند کھڑکیوں میں سے باہر نکل آتی ہے تو اس کی ماں اُبکائی جیسا
منہ بنایا کرتی ہے جبکہ خود زہرہ کو وہ کڑوی کسیلی خوشبوئیں کبھی بُری نہیں لگتیں "افروڈائی زی
آک!" اس نے سوچا۔

"میں خود دیکھوں گی کہ ڈرائینگ روم میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔" زہرہ نے اپنے آپ
کو یقین دلایا۔ "مگر کیسے دیکھوں گی؟" دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے ہی یقین کو ڈگمگا دیا۔
"کیسے دیکھوں گی میں وہاں سب کچھ۔" جبکہ اُس کے باپ کا حکم ہمیشہ کے لئے موجود ہے کہ اُس
کی خاص تمام مردانہ محفلوں میں گھر کی عورتیں کہیں ڈرائینگ روم کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گی اُس
کی بیوی۔ اُس کی بیٹی۔ اُس کی بہویں بلکہ گھر کی کوئی ملازمہ بھی نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ یاور
عطائی عورت کے حوالے سے کوئی دقیانوسی شخص تھا۔ گھر میں اور بھی تقریبیں ہوتی تھیں سالگرہوں
سے لے کر تہوار منانے کے بہانے جشن کرنے تک۔ یاور عطائی ایک کامیاب کاروباری صنعت
کار بڑے مال دولت والے بیٹوں کے باپ ...... بے پناہ اثر و رسوخ والے باپ کی حیثیت

Scanned by CamScanner

میں بڑے لوگوں کے جس ہجوم کا استقبال کیا کرتا تھا اُن میں عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں اور مرد بھی۔ اس کی بہوؤں کے خاندان۔ اس کے بیٹوں کے پیشہ ورانہ تعلق داروں کی بیویاں۔ بہنیں اور پھر خود اس کے انہیں خاص دوستوں کی عورتیں بھی۔ یاور کی اپنی گھر کی عورتوں کا ان لوگوں سے کوئی پردہ نہ تھا۔ بلکہ زہرہ کی ماں اور اس کی بہویں تو ان محفلوں کی فضا میں خوب رچ بس جاتی تھیں۔ وہ فضا جو کامیاب لوگوں کی بڑی کامیابیوں کی سرشاری اور بڑی ناکامیوں کے اندیشوں سے لدی ہوتی تھی اور جس میں خوبصورت عورتوں کے جسموں سے اٹھتی کوئی خوشبو لمحوں میں کوندکر کسی نہ کسی مرد کے اندر کہیں گہری چوٹ لگا کر اس کے ہوش اڑادیتی تھی مگر کھانوں کی قابوں سے اُٹھتی دوسری لذتوں کی مہک اسے پھر سے ہوش مند بنادیتی تھی اور وقت لمحے بھر کے لیے تھم جاتا تھا جیسے نبض یکبارگی رُکے اور پھر چل پڑے۔

زہرہ کے لئے ایسی مخلوط محفلوں میں جب بھی وقت کسی نہ کسی بہانے تھمتا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا وسیع وعریض کمرہ کسی شفاف جیلی کے عظیم الجثہ Cube جیسا ہے جس میں مرد وزن نہایت مضحکہ خیز انداز میں ساکت ہیں اور جیلی کا وہ دیوہیکل Cube تھرتھراتا ہے تو اس کے گاڑھے لجلجے مادے میں پھنسے وجود اپنی اپنی جگہ کچھ متحرک ہوتے ہیں مگر پھر ویسے کے ویسے ہی ہو رہتے ہیں۔

یاور عطائی بریانی کا چمچ منہ میں ڈالتا ہے اور محکمہ خوراک کے بڑے سیکرٹری سے بات کرتا ہے کہ اس کا چھوٹا بیٹا چاول کے علاقے میں دھان کا وسیع کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سیکرٹری حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ صنعت کار کیا اب آڑھتی بنے گا اور ساتھ ہی وہ خوشبودار بھاپ اڑاتی بکرے کے گوشت کی نرم بوٹی کو منہ میں رکھ لیتا ہے۔ بھاپ اُس کی عینک پر کہرہ جمادیتی ہے اور تیز مصالحے اُس کے نتھنوں سے ایک ایسے قطرے کو آزاد کردیتے ہیں جو اُس کی ناک کی حدود سے ٹپک پڑنے کے لیے بے تاب ہے۔ اور زہرہ کے لیے وقت تھم جاتا ہے، اور جیلی کا Cube تھراتا ہے۔ ایک سیاست دان جس کا دل علاقے کے کمیوں کے مخالف ووٹوں اور عالمی طاقتوں کی ناراضگی کے خوف سے لرزتا ہے اور غلط چربیوں کے ضرر سے بند ہو رہا ہے سوچتا ہے کہ یہ چربیلا کھانا اُس کا جسم کیسے برداشت کرے گا؟ ''مگر سفید گوشت مضر نہیں ہوتا'' وہ یہ بھی جانتا ہے اور پھر وہ چکن تکہ اپنے اندر ڈالتا ہے۔ تکہ اس کے منہ میں گھلتا ہے تو اس کی نظریں ایک بڑے اخبار

Scanned by CamScanner

والے کی بیٹی کے Lowcut گلے میں سفید گوشت پر ٹکتی ہیں اور وہ تکے پر منہ مار دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں سکڑ جاتی ہیں اور جبڑے اُبھر آتے ہیں، اور زہرہ کے لیے وقت تھم جاتا ہے۔ اور اس عظیم۔۔۔۔الشان جیلی کا Cube تھر تھراتا ہے۔

ایسے ہی تھمے ہوئے کتنے ہی جیلی لمحے اُس شام زہرہ کے ذہن میں تھرا گئے۔ زہرہ کی ماں کا پیٹ جو ساڑھی کے بلاوز میں نمایاں نظر آنے کے باوجود قابلِ رحم حد تک غیر متاثر کن ہے۔ یاور عطائی کی مسکراہٹ جو میرا باپ ہے اس کی مسکراہٹ کو میں کیا معنی دوں۔ طنز، حقارت، نفرت، آسودگی، سرشاری، رحم، محبت، انتقام، اُداسی، خوف، عشق، دیوانگی، موت، زندگی، خوشی، غمی۔ سب کچھ اور کچھ بھی نہیں۔ بڑی بھابی جو بہت خوبصورت مگر بہت بے وقوف ہے اُس کے بھائی کے اشارے نہیں سمجھ رہی کہ اسے اس خوش شکل افسر سے زیادہ بے تکلف ہونے کی اب ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ کسی دوسرے غیر متعلق محکمے میں جا چکا ہے۔ ایک بڑا مولوی عالم جو ایسی محفلوں میں ضرور آ جاتا ہے مطلب کی بات کرتا ہے۔ کبھی کبھی توبہ استغفار کرتا ہے۔ حرام مشروبات سے ضرور پرہیز کرتا ہے مگر زردے میں شوربا ڈال کر کھانے اور سیاست میں نیک و پارسا لوگوں کو بلانے کا شائق ہے۔ جب زردے کا نارنجی دانہ اُس کی داڑھی کے بال کی نوک پر ناچتا ہے تو اسے پتہ بھی نہیں چلتا اور کوئی عورت اسے دیکھ کر اپنی ہنسی دباتی ہے اور وہ کچھ اور ہی سمجھتا ہے اور زہرہ کے لیے وقت تھمتا ہے اور جیلی کا Cube کپکپاتا ہے۔

کیا اس وقت بھی ڈرائنگ روم میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا وہ سب کچھ بھی دیکھ پانے پر بعد میں ایسے ہی 'جیلی لمحوں' کے ٹکڑوں کی صورت اس کے ذہن میں محفوظ رہے گا زہرہ کا اپنے آپ سے سوال تھا۔ نہیں! عورت تو کوئی ہے نہیں اور جیلی بننے کے لیے عورت اور مرد دونوں ہونے ضروری ہوتے ہیں۔ زہرہ کا اپنے عجیب سوال کا اپنے آپ کو عجیب جواب تھا۔ اور اسے اپنے آپ پر تعجب ہوا۔ اور پھر وہی اس نے سوچا A feeling of strangeness اُسے جھرجھری سی آئی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خود دیکھے گی۔ جیسے بھی ہوگا۔ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا اُس کا فیصلہ تھا۔ اس نے کمرے کی بتی پھر گل کی اور دروازہ اپنے پیچھے بے آواز بند کیا، اور تاریک کاری ڈور میں نکل آئی۔

یاور عطائی نے برسوں پہلے جب یاور ہاؤس کی تزئین و آرائش کا کام کیا تو اُس نے راج

Scanned by CamScanner

کے زمانے کی اس عمارت کے بنیادی ڈھانچے کو بالکل بھی نہ بدلا بلکہ اس کی ساختوں کو اور بھی پختہ کیا تھا۔ انہیں ساختوں میں سب سے اہم یہ ڈرائینگ روم تھا۔ گھر میں عام روزمرہ کے میل ملاقات کے لیے ایک دوسرا کمرہ استعمال کیا جاتا تھا جو وہی کمرہ تھا جہاں ناصر نے زہرہ کے سامنے اپنے دل کا بوجھ پہلی بار ہلکا کیا تھا اور پہلی بار ہی زہرہ اور یاور عطائی اپنی اصل کے جھگڑے پر آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ تقریبات اور بڑے اجتماعات کے لیے یہی ڈرائینگ روم تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض بیضوی مستطیل شکل کا کمرہ تھا جس کی لمبائی کے اضلاع سیدھے اور چوڑائی کے اضلاع نیم دائرہ تھے اور یہی نصف دائرے اونچی چھت کے نیچے چاروں کونوں میں چار مختصر تکون نما کمرے بنا دیتے تھے اور جنہیں چار مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اندرونی کاری ڈور کی طرف کا تکونا کمرہ ایک واش روم تھا۔ جبکہ پچھلے کاری ڈور کی طرف ہی دوسرے سرے پر کونے میں ایک بار تھا اور انگریز کے زمانے سے اب تک مستعمل تھا۔ بار کے سامنے چوڑائی کے رُخ کونے میں ایک ڈریسنگ روم تھا جو شاذ و نادر ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا اور یہی حال اُس کونے کے بالکل مخالف سمت میں لمبائی کے رُخ چوتھے کونے کا تھا جو صرف چوتھا کونا تھا مگر اس لحاظ سے سب سے مختلف تھا کہ اس کا ایک دروازہ تو ڈرائنگ روم میں اور دوسرا بالکل باہر باغ میں کھلتا تھا۔ چاروں کونوں کے دروازے جو ڈرائینگ روم میں کھلتے تھے ان کے سامنے بھاری دبیز پردے لٹکتے تھے اور ایک کونے میں سے بیرے مشروبات لاتے تھے تو دوسرے کونے کے دروازوں کے پیچھے بنے غُسل خانے میں جا کر مہمانوں میں سے کوئی حسبِ حاجت اپنے آپ کو آسودہ کر سکتا تھا۔ بارشوں کے موسم میں کبھی کوئی مہمان تیسرے کونے میں بنے ڈریسنگ کارنر کو چھتری رکھنے یا رین کوٹ لٹکانے کے لیے بھی استعمال کر لیتا تھا مگر پیچھے کی طرف سے باغ میں اور آگے کی طرف سے ڈرائینگ روم میں کھلنے والے چوتھے کونے کے بارے میں کم از کم مہمانوں نے کبھی کچھ سوچنے یا اس کا مقصد جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔ زہرہ نے البتہ ایک بار ایسا ضرور سوچا تھا اور فوراً سمجھ گئی تھی کہ اس چوتھے کونے کی راہ سے کبھی سفید فام مرد و زن زیادہ تنہائی کی تلاش میں بغیر کسی کو متوجہ کیے آسانی سے پردہ ہٹا کر کونے کے پچھلے دروازے کی راہ سے باغ میں نکل جاتے ہوں گے اور پھر ایسے ہی کسی کو متوجہ کیے بغیر واپس بھی آ جاتے ہوں گے۔ اور یہی چوتھا کونا ایسے ہی کسی کو متوجہ کیے بغیر مجھے ڈرائینگ روم کا منظر دکھائے گا اور سُنائے گا۔ زہرہ نے اس شام سوچا۔

Scanned by CamScanner

ڈرائنگ روم کے چوتھے کونے میں سے باہر باغ میں کُھلتے اس دروازے تک پہنچنے کے لیے زہرہ نے گھر کے سامنے کا راستہ استعمال نہ کیا بلکہ عقبی برآمدے کی راہ سے پیچھے نکلی اور اریکا پام کی روش سے ہوتی ہوئی لان میں سے گھوم کر بھاری لکڑی کے اُس پٹ تک پہنچی جسے رائل آرٹیلری کے کرنل سٹیو میکڈونلڈ نے ایک بہت ہی ہنر مند Native بڑھئی سے بنوایا تھا۔ زہرہ دروازے سے چند قدم پیچھے ہی رُک گئی۔ اُس کے قدموں کے نیچے گھسی ہوئی اینٹوں کا مختصر سا رستہ تھا جس میں سے پھوٹتی گھاس اس وقت زہرہ کو تاریکی میں نظر نہ آتی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ کہیں نیچے ہے، اور آگے دو قدم اوپر وہ دروازہ ہے جو ڈرائنگ روم کے چوتھے کونے میں کھلتا ہے۔ پھر اچانک زہرہ کو احساس ہو کہ جسے وہ اندر اپنے کمرے میں بیٹھی گہری شام سمجھتی رہی ہے وہ تو اچھی خاصی رات بن چکی ہے۔

اکتوبر کے مہینے کی رات کا ابتدائی پہر جبکہ گزری برسات اور آمدہ جاڑا دونوں فضا میں بھیگی مٹی کا ٹھنڈا رس ٹپکاتے ہیں۔ آسمان سے اوس اُترتی ہے۔ دنیا پھولوں سے یک دم خالی ہو جاتی ہے اور ہوا پانی اور مٹی تاریکی سے مل کر انسان کے دل پر غالب آ جاتے ہیں۔ زہرہ کھڑی سوچتی تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ وہیں کھڑی کھڑی ٹھنڈی ٹھار ہو جائے یا کوئی اِدھر آ نکلے اُسے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر دھکیل دینا چاہیے۔ یوں اُسے یہ اطمینان تھا کہ گھر کے اس کونے میں اس لمحے کسی کے آنے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ مالی لوگ کوارٹروں میں ہیں اور ماں بڑے بھائی کی طرف ہے۔۔۔ ایک لحاظ سے وہ گھر میں اکیلی ہے۔ زہرہ آگے بڑھی اور دروازے کو انگلیوں سے دھکیلنے سے لمحہ بھر پہلے یہ حوصلہ شکن خدشہ اُس کے جی سے گزر گیا کہ اگر یہ دروازہ اندر سے بند ہوا تو پھر کیا بڑھے مشٹنڈوں کی دھما چوکڑی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے اُس کے عزائم دھرے کے دھرے رہ جائیں گے؟

مگر ایسا نہ ہوا!۔ دروازہ پہلے تو کچھ بے آواز کُھلا پھر ایک پُرشور چرچراہٹ سے زہرہ کو دہلا کر آدھا کُھل گیا باقی آدھا بھی کھولنے کی ہمت کرنے کی بجائے زہرہ اسی نیم وا بھاری چوبی پٹ کی راہ سے اندر کو سرک گئی اور پٹ کو پھر سے بند کر دیا.................. زہرہ اب جانتی ہے کہ وہ ڈرائنگ روم کے چوتھے کونے میں ہے۔ سامنے چند قدم آگے وہ دروازہ ہے جس کے دو پٹ ہیں اور جو اکثر مقفل نہیں ہوتے اور اُس سے آگے پردے ہیں اور پردوں کے سامنے ڈرائنگ روم

ہے۔ جہاں سب مرد بیٹھے ہیں۔ زہرہ کے کان اور ناک جیسے یک دم سے کام کرنے لگتے ہیں جبکہ آنکھیں آہستہ آہستہ تاریکی سے مانوس ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ ساتھ دیوار پر ایک بٹن ہے جسے دبا کر وہ اس جگہ کو روشن بھی کر سکتی ہے مگر وہ جھنجھنا کر سوچتی ہے کہ اس بٹن سے تو بھول کر بھی اُس کا ہاتھ نہیں چھونا چاہیے یہاں اچانک روشنی ہو جانے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ خود ہی اتنے مردوں کے سامنے جا کھڑی ہو۔ وہ تاریکی میں ایسے ہی کھڑے کھڑے سامنے دروازے کو جتنا بھی بے آواز ہو سکے گا کھولے گی اور پھر پردے کو کہیں درمیان میں سے انگلی ڈال کر تھوڑا ہٹا لے گی اور پھر اُدھر کا نظارہ دیکھے گی۔ باغ کی ٹھنڈی مٹی، پودوں اور اوس کی خوشبو سے اس جگہ کی خوشبو کس قدر مختلف ہے۔ ایک مشہور اشتہاری مردانہ پرفیوم کی مانوس خوشبو اُسی راستے سے اس جگہ پہنچ رہی ہے جہاں سے بہت سی آوازوں کی بھنبھناہٹ اور مدھم سی روشنی آ رہی ہے۔ اب اُسے اس تاریک کونے میں ایک طرف رکھا وہ پچاس ساٹھ برس پرانا اطالوی صوفہ بھی نظر آ رہا ہے جو ابھی تک قابلِ استعمال ہے۔ جس کے بارے میں پتہ نہیں کس نے گھر میں ایک بار مذاق سے کہا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم میں مسولینی کے زیرِ استعمال تھا۔ حالانکہ مسولینی کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے تھا۔ غیر متعلق باتیں زہرہ کے ذہن میں آتی ہیں اور وہ جان جاتی ہے کہ اب اُس کے اعصاب اُس کے قابو میں ہیں اور وہ کسی تجربہ کار بلی کی طرح چھپ کر گھات لگانے کے لیے تیار ہے.................

سامنے دروازے کی دونوں چٹخنیاں پوری مشاقی سے بے آواز نیچے لانے کے بعد جب زہرہ نے ایک پٹ کو آہستگی سے اپنی طرف کھینچا تو عنابی رنگ کا پردہ اُس کی آنکھوں کے سامنے یک دم روشن ہو گیا۔ دوسری طرف ڈرائینگ روم کی روشنی موٹے ساٹن کے پردے کو تاریکی میں بے حد نمایاں کر رہی تھی۔ زہرہ نے اور بھی آگے بڑھ کر انگلیوں سے پردوں کی سلوٹوں میں سے اپنی دائیں آنکھ کے لیے راستہ بنایا، اور پھر اُس شگاف پر اپنی آنکھ لگا دی.................. سامنے کا منظر اس قدر مایوس کن حد تک ایک معمول کا منظر تھا کہ لمحے بھر کے لیے زہرہ کو خیال آیا کہ وہ کسی غلط جگہ آ گئی ہے۔

دوسرا اور لمحہ بھر بعد کا بصری احساس بہت سے گنجے سروں کی یک دم اور یک جا موجودگی کا تھا اور مضحکہ خیز تھا اور اس کے ساتھ ہی زہرہ کے ذہن میں نمودار ہونے والا خیال بھی اتنا ہی مضحکہ خیز تھا.................. گنجے سر کو تو مردانہ خصوصیات کی علامت ہونا چاہیے کیونکہ عورت شاذ و نادر ہی

Scanned by CamScanner

گئی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی سُنا ہے کہ اکثر گنجے مرد طرح طرح کے نسخے اپنے سروں پر تھوپتے رہتے
ہیں.......... نسخے...... زہرہ کی سوچ اٹکی اور دوسری طرف آگے بڑھنے لگی۔ نسخوں کے لیے
ہی تو آئی ہے وہ.......... یہاں...... یہ دیکھنے کے لیے کہ یاور عطائی ان گنجے سروالوں...... اور
ہاں.......... بلکہ اور بھی کئی طرح کے سروالوں کے لیے جو نسخے بناتا ہے۔ وہ کیا کرشمہ دکھاتے
ہیں۔ زہرہ نے سلوٹ کے شگاف کو ذرا کشادہ کیا تاکہ اُس کی نظر اس وسیع وعریض ڈرائنگ روم
کی چاروں جانب مار کر سکے۔

''ممنوعہ نظارہ'' چھپ کر دیکھنے والے سے کئی طرح کے کھیل کھیلتا ہے۔ کبھی تو وہ اُس پر اس شدت سے حاوی ہوتا ہے کہ ناظر اور منظر کی تخصیص ہی مٹ جاتی ہے اور ''لمحۂ حال'' ایک دائمی ''یہیں اور اب'' میں بدل کر وقت کی روایتی تقسیم کو تلپٹ کر دیتا ہے اور کبھی وہ ناظر میں بصری اشتیاق کی ایسی ہیجانی حدت جگا دیتا ہے کہ پوری کائنات شعور کے ایک ہی دہکتے نقطے میں سمٹ جاتی ہے۔ یا پھر وہ تماشہ اور تماشائی کے درمیان حائل نیستی کی خلیج کو ازل سے ابد تک محیط کر دیتا ہے۔ ''ممنوعہ نظارہ'' کبھی تو ایک ناقابلِ تقسیم کُل کی صورت اٹل قیام کرتا ہے اور کبھی حسی صفات کے انتہائی مہین ٹکڑوں میں منتشر ہو جاتا ہے.......... پچیس تیس مرد ڈرائنگ روم میں موجود ہیں۔ اُن میں سے بیشتر کچھ نہ کچھ کھا پی رہے ہیں۔ زہرہ اُن میں سے کئی چہروں کو پہچانتی ہے۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو اُس نے پہلی بار دیکھے ہیں اور پھر کچھ ایسے بھی ہیں جن کے چہرے اُسے نظر نہیں آ رہے۔ وہ یا تو اس جانب پشت کیے بیٹھے ہیں جہاں زہرہ چھپی ہے یا کوئی نہ کوئی رکاوٹ اُن کے اور زہرہ کی نظر کے درمیان حائل ہے۔ مگر جو کچھ وہ دیکھ سکتی ہے وہ.......... پتلون۔ کوٹ۔ نکٹائی۔ شیروانی۔ شلوار قمیض۔ واسکٹ۔ کوٹوں کی جیبوں میں سے جھانکتے سرخ رومال۔ آکسفورڈ شوز۔ مکیشن۔ جیکٹ۔ جناح کیپ۔ ترکی ٹوپی۔ سکارف۔ بٹن۔ کلائی کی گھڑیاں۔ سونے کے اسٹڈ۔ ہیرے کی انگوٹھی۔ یاقوت۔ زمرد۔ نیلم۔ بغلوں کا Deodorant۔ آفٹر شیو۔ سپرے۔ پرفیوم۔ کڑوی اور بھاری فرانسیسی خوشبو۔ دیسی عطریات۔ بالوں کے تیل۔ لوشن۔ کریم۔ سگریٹ۔ سگار۔ پائپ۔ سگریٹ لائیٹر۔ بوتلیں۔ جگ۔ گلاس۔ پلیٹیں۔ مشروبات۔ برف۔ نمکو۔ کباب۔ تکے۔ بیرے۔ ٹرے۔ کافی۔ چائے۔ لیموں۔ پچیس تیس مرد۔ بیٹھے ہوئے۔ کھڑے ہوئے۔ جھکے ہوئے۔ تنے ہوئے۔ سیاستدان۔ تاجر۔ صنعتکار۔

بیورو کریٹس۔ اخبار نویس۔ عالم۔ پروفیسر۔ جج۔ ریٹائرڈ فوجی۔ ادیب۔ شاعر۔ زمیندار جاگیردار۔ سمگلر۔ وکیل .... (دو۔ دو۔ تین۔ تین۔ چار۔ چار۔ میں ان کی ٹولیاں نئے سے نئے انسانی امتزاج بنا بنا کر بدل رہی ہیں۔ دو سے تین ہونے پر یا چار سے تین ہونے پر کسی نئے کردار کے آنے پر یا موجودہ کردار کے جانے پر تین تین چار چار کی ان چھوٹی انسانی دنیاؤں کی فضا ہی بدل جاتی ہے۔)

(شاعر۔ ریٹائرڈ فوجی۔ جاگیردار) (جاگیردار۔ شاعر۔ تاجر) (تاجر۔ وکیل۔ سمگلر) (سمگلر۔ سیاستدان۔ صنعتکار) (صنعتکار۔ سمگلر۔ جج) (مولوی۔ جاگیردار۔ بیوروکریٹ) (بیوروکریٹ۔ ادیب۔ اخبار نویس) (اخبار نویس۔ سیاستدان۔ تاجر) (تاجر۔ اخبار نویس۔ ریٹائرڈ فوجی) (سیاستدان۔ شاعر۔ بیوروکریٹ) (بیوروکریٹ۔ جج۔ سمگلر) (شاعر۔ جج۔ (جج۔ ریٹائرڈ فوجی) (ریٹائرڈ فوجی۔ جج۔ مولوی) (تاجر۔ جج) (تاجر۔ جج۔ صنعتکار) (عالم۔ تاجر۔ جاگیردار) ....

اور یہ سب دنیائیں آپس میں مدغم ہو کر وہ دنیا بناتی ہیں جو یاور عطائی کے ڈرائینگ روم کی دنیا ہے۔

زہرہ دیکھتی ہے کہ معقول چہروں۔ عاقل آنکھوں۔ سنجیدہ ماتھوں۔ مدبر بھووں۔ دانش ور ناکوں۔ فنکار ہاتھوں۔ حساس کانوں۔ متفکر ہونٹوں، اور پُر عزم جبڑوں کا گو کہ الگ الگ تنہا جسموں سے تعلق اٹل ہے مگر انسانی اعضا کے یہ سب جُز ایک کُل میں مربوط ہو کر ایک ایسا عفریتی وجود تشکیل دے رہے ہیں جو صرف چھپ کر ممنوعہ نظارہ دیکھنے والوں کو نظر آ سکتا ہے۔ درجنوں آنکھیں۔ ناک۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ ٹانگیں۔ سر۔ دھڑ۔ ربط کے کسی ایسے سانچے میں یک جان و یک قالب ہیں کہ انسانی آرگنزم کی روٹین جزت سے ماورا ہو چکے ہیں اور یہ منظر، خیال زہرہ کے جی میں ویسی ہی بے چینی جگاتا ہے جس کا سامنا استاد مصوروں کی ''مسخ انسانی ہیولوں کی بدشکل مصوری'' کے ناظر کو کرنا پڑتا ہے۔ زہرہ نے آنکھیں بند کر لیں، سر کو دو تین بار جھٹکے دیے اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھ کو پھر سے عنابی ساٹن کے شگاف پر لگا دیا۔

ڈرائینگ روم کا منظر ایک بار پھر انتہائی معمول کا منظر تھا۔ معزز صاحبانِ حیثیت شرفا باہم مصروف گفتگو ہیں۔ اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز حیثیتوں پر فائز یہ مرد جبر و اختیار کی کئی سلطنتوں

کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ برس ہا برس تک اہم حساس ذمہ داریوں اور کٹھن فیصلوں کی جنگ وجدل میں بِھڑے رہنے کے بعد ان کے چہروں پر ہلاکت آفرین طاقت کی ان مٹ چھاپ ہے مگر جو دیکھنے والوں کو ان کے چکنے چپکیلے ربڑ کے چہروں پر کہیں نظر نہیں آتی تاوقتیکہ ان کی اندر کی طاقت کا توازن کہیں بگڑے اور ان کا ربڑی چہرہ کہیں سے کھنچ کر بھیانک ہو جائے.........مگر زہرہ کو ربڑ کے چہروں والے ان بڈھے مشٹنڈوں کو دیکھتے رہنے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ یہ وہی بہت سے چہرے تھے جو یہاں کی معمول کی ''جیلی کیوب'' محفلوں میں بھی آتے جاتے رہتے تھے اور آج بھی آئے ہوئے تھے بلکہ آج تو وہ بہت شانت اور کسی گہرے سکون کی حالت میں نظر آ رہے تھے۔ سوائے امبر جان کے جو ایک مسلسل ہیجان کی سی کیفیت میں شراب پی کر چکراتا پھر رہا تھا اور کبھی ایک گروپ کے پاس جا کر کچھ سنے بغیر قہقہہ لگاتا تو کبھی کسی کے کندھے پر زوردار ہاتھ رسید کر کے اُس کی پلیٹ میں سے کوئی ٹکڑا اُٹھاتا تو کبھی بلند آواز سے کسی کو مخاطب کر کے کوئی بات کرتا۔ زہرہ نے سوچا کہ ان مہذب آدابِ محفل سے آشنا شائستہ شرفا میں وہ شخص ایک خواہ مخواہ کا تکلیف دہ اضافہ ہے مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کوئی بھی اُس کی کسی بھی حرکت پر کسی خاص ناگواری کا اظہار نہیں کرتا۔ بلکہ محض تمسخر سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔

امبر جان ڈرائینگ روم کے دوسرے کونے......جو ڈریسنگ روم ہے......کے پاس کھڑے گروپ کی طرف بڑھتا ہے یہ واحد ایسا چار پانچ افراد کا گروپ ہے جو زہرہ کی نظروں سے سب سے دور ہے اور جس میں شامل مرد وہ ابھی تک دیکھ نہیں پائی کیونکہ وہ وہیں اس کی طرف پشت کیے کھڑے ہیں۔ امبر جان ان لوگوں کے پاس کھڑے بیرے کو اپنا خالی گلاس تھماتا ہے اور چند لمحے انہیں تکتا رہتا ہے پھر اچانک تیر کی طرح یاور عطائی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔ جو اپنی ہی کسی اُلجھی دھن میں مگن سارے منظر کو لمحہ لمحہ اپنے اندر اتار رہا ہے جیسے اس کے مہمان اپنے مشروبات قطرہ قطرہ اپنے اندر اتار رہے ہیں۔ منظر جسے اس کی بیٹی بھی دیکھ رہی ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی بیٹی بھی دیکھ رہی ہے۔ امبر جان عطائی کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر اسے پردے کے بہت قریب لے جاتا ہے جس کے پیچھے زہرہ کھڑی ہے رازداری کا معاملہ کرنے کا یہ انداز دیکھ کر اس کا دل زور سے دھڑکتا ہے شاید اس کی مہم جوئی کا انعام اسے ملنے والا ہے اور وہ عقدہ حل ہونے والا ہے جس نے اسے کب سے پاگل کیا ہوا ہے۔

Scanned by CamScanner

عطائی بولتا ہے اور زہرہ سنتی ہے اور ایک حیرت انگیز احساس اسے چوکنا کر دیتا ہے۔ وہ اب تک محض دیکھ رہی تھی۔ محض ایک آنکھ تھی۔ مگر باپ کے بولنے کے بعد اچانک جیسے اس کے معطل کان متحرک ہو جاتے ہیں اور اسے محفل میں شامل سب مردوں کی آوازیں قریب اور دور کے فرق کے ساتھ صاف سنائی دینے لگتی ہیں۔ کیا ممنوعہ نظارہ صرف منظر ہی ہوتا ہے۔ Peeping Tom کیا صرف دیکھتا ہی ہے؟

''ہاں امبر جان سب کیسا جا رہا ہے؟'' عطائی کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ہے۔ جیسے شریر بوڑھا شریر بچے سے مخاطب ہو۔ مگر شریر بچے کے پھولے ہوئے چہرے اور گدلی چربیلی آنکھوں میں جو تاثر ہے وہ یہ بتا رہا ہے کہ جو کھلونا اسے دیا گیا تھا وہ اسے پسند نہیں آیا، اور وہ کسی بات پر ناراض ہے۔

''بتاتا ہوں...... وہ سب کیسا جا رہا ہے۔'' زہرہ صاف سنتی ہے وہ منحوس آواز.... اور گہرے اشتیاق سے اور دم سادھے اُس شخص کو تکتی ہے جس پر ایک سے دوسری نظر ڈالنا بھی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ کہتا ہے۔

''بلکہ پوچھو۔ وہ کیسے جا رہا ہے جہاں اُسے جانا ہوتا ہے............ بتاتا ہوں...... مگر پہلے یہ بتاؤ عطائی...... آج یہ اجنبی چہرے کیوں نظر آ رہے ہیں...... اور وہ اس طرف دیکھتا ہے جہاں دوسرے کونے کے پاس کچھ لوگ کھڑے ہیں اور زہرہ سوچتی ہے کہ اگر وہ دوسرے پٹ کو بھی ذرا زیادہ کھول کر دیکھے تو شاید وہ لوگ اسے بھی نظر آ جائیں مگر پھر فیصلہ کرتی ہے کہ یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ ایسا کرنے سے سامنے کا پردہ ہل جائے گا اور کسی نہ کسی کو متوجہ کر لے گا۔

عطائی بھی اس طرف دیکھتا ہے جدھر امبر دیکھتا ہے۔

''کچھ مہمان بھی تو آخر آ ہی سکتے ہیں دوستوں کے ...... ساتھ......''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے تو شکاری کتے کی طرح ہر اوپری شے کو سونگھنا پڑتا ہے...... میرا کام...... تم تو جانتے ہو............''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' عطائی معمول کے انداز میں بولا۔ ''یہاں تو سبھی شکاری کتے ہیں خیر...... چھوڑو...... تم مجھے اپنا مسئلہ......''

''وہ گورا کون ہے...... اور اُس کا ساتھی......؟''

Scanned by CamScanner

عطائی نے جھنجھلا کر پھر اس طرف دیکھا اور شرارت آمیز تجسس کی بجائے اکتاہٹ اس کے چہرے پر ظاہر ہونے لگی۔

''گورا...... ہاں وہ کوئی جرمن ہے۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا دوست...... کوئی آرکیالوجسٹ اور اس کا ساتھی پتہ نہیں کون ہے......''

''آرکیالوجسٹ؟......'' امبر کے لہجے میں احمقانہ تشویش تھی۔ یہ کون ہوتے ہیں؟ ان کا تعلق نارکوٹکس والوں سے تو نہیں ہوتا کہیں......؟''

یاور عطائی بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر بہت مزے لے کر ہنسا۔ دوسری طرف پردے کے پیچھے کھڑی زہرہ سناٹے میں آ گئی۔

جرمن ...... آرکیالوجسٹ .... جرمن آرکیالوجسٹ...... کیا ہاف مین؟ کیا کبیر؟ اور کیا ناصر؟

غیر متوقع اور اچانک ظاہر ہونے والا لمحہ جیسے ششدر کر دیتا ہے۔ زہرہ کا جسم ساکت تھا مگر ذہن اتنی ہی شدت سے متحرک۔

...... بادل زور سے گرجا اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ زہرہ جوتوں کی دوکان سے باہر نکل آئی تھی اور خریداری کا تھیلا ہاتھ میں لٹکائے سڑک کے پار کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ جانے کو تھی کہ بارش آ گئی۔ مارکیٹ کے طویل نیم دائرہ برآمدے میں کھڑی وہ حیرت سے مون سون کی آمد کو دیکھتی تھی فراٹے بھرتی ہوا میں گرتے پانی کی چادر نے لہرا کر کچھ ایسا بل کھایا کہ برآمدے میں چھوٹے موٹے کاروبار جمائے بیٹھے لوگ جگہ جگہ شرابور ہو گئے اور ٹھنڈے پانی کے لمس نے زہرہ کے جسم میں والہانہ خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ارگرد کچھ لوگ ہنسے کچھ نے فقرے کسے اپنے معاشرے کی ہر عورت کی طرح زہرہ بھی نظرانداز کرنے اور براہِ راست دیکھے بغیر اردگرد سب کچھ دیکھ لینے کی خود حفاظتی مہارتیں حاصل کر چکی تھی۔ برآمدہ بھیگ کر پناہ لینے والوں اور بھیگنے سے کترانے والوں سے بھر رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کئی نظریں اُسے گھور رہی ہیں مگر زہرہ جھنجھلاہٹ اور بےزاری اپنے اوپر لاد کر برسات کی پہلی بارش کے نشے کو غارت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی وقت وہ دائیں طرف سے آئے تھے ناصر اور کبیر اور پہلی دفعہ زہرہ نے کبیر کو دیکھا تھا......

Scanned by CamScanner

ڈرائینگ روم کے تیسرے کونے سے بالآخر پیچھے ہٹ کر زہرہ کی نظروں کی مار
آجانے والوں میں ناصر نہیں تھا وہ کبیر تھا اور ہاف مین تھا اور وہ دونوں جن دو اشخاص
کھڑے تھے ان میں سے ایک کو تو اُس کے مضحکہ خیز حلیے کی وجہ سے زہرہ نے فوراً پہچان لیا کہ
وہی ہے۔ جس کا نام بھی اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا کہ لباس۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ
جانتی تھی کہ کسی رسالے کا مالک ہے یا ایڈیٹر ہے یا پتہ نہیں کیا ہے، مگر شکل سے ہی
ہے اور ہمیشہ کی طرح پردے کے پیچھے کھڑی زہرہ نے بھی اسے دیکھ کر ایک بار پھر حیرت
کہ کیا یہ شخص واقعی ایسا ہوگا جیسا عام دیکھنے میں لگتا ہے یا جیسا اُسے دیکھنے میں لگتا ہے۔ شکی،
کمینہ، چھُپ کر وار کرنے والا، کمزور کو کبھی نہ بخشنے والا اور طاقت ور کے تلوے چاٹنے والا...... مگر
اُس ایڈیٹر کے بارے میں اپنی اس معمولی اچٹتی سی حیرت اور کبیر اور ہاف مین کی ڈرائینگ روم
میں موجودگی کی بڑی گھمبیر حیرت کے ساتھ اُس لمحے تاریک کونے میں کھڑی زہرہ کے جسم کا خون
اس کی ٹانگوں میں بار بار اکٹھا ہو کر اُسے بھاری بنا رہا تھا اور وہ وزن کو بار بار ایک پاؤں سے
دوسرے پاؤں میں منتقل کرتی تھی۔ پھر زہرہ کے سامنے یہ تیسری حیرت بھی تھی کہ کبیر اُس منحوس
شخص کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اُس کے چہرے پر معمول کی تمسخر آمیز مسکراہٹ ہے مگر جس بے
تکلفی اور قربت...... ہاں وہ اُسے قربت ہی کہے گی...... سے وہ اس ایڈیٹر سے باتیں کر رہا ہے
اُس سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ مگر پچھلے چند ماہ میں کبیر سے ناصر
سے...... جرمن سے زہرہ کی جتنی بھی باتیں ہوئیں۔ عجیب و غریب باتیں...... کھلی کھلی باتیں۔
جنہوں نے پہلے تو اُسے شاک کیا۔ پھر وہ عجیب انداز سے تین کے اُس گروہ کو اپنے خیال میں کبھی
کبھار مل کر چار کرنے لگی۔ ان باتوں میں بھی کبھی کبیر نے اُس ایڈیٹر کا یا اُس سے اپنے کسی تعلق کا
ذکر نہ کیا۔ مگر...... مگر وہ کیا جانتی ہے؟ کیا وہ کبیر کو جانتی ہے؟ اصل حیرت انگیز بات تو ان دونوں کا
یہاں اس کے باپ کی اس انوکھی محفل میں موجود ہونا ہے۔ زہرہ یہ تو جانتی ہے کہ ناصر ایک جونیئر
سائیکیاٹرسٹ اس کے باپ کا علاج کرنے کے واقعے، حادثے، کے بعد اس کی بیٹی زہرہ کے
عشق کے قابلِ رحم مرض کا شکار ہو گیا ہے، جرمن آرکیالوجسٹ اُس کا دوست ہے اور غلام باغ پر
تحقیق کر رہا ہے۔ مگر یہ کبیر کیا ہے...... اصل میں...... اپنی بہت سی...... گنجلک۔ تمسخر آمیز۔
چونکانے والی۔ غصہ دلانے والی۔ کبھی کبھار دل میں اُتر جانے والی گفتگو کے علاوہ...... زہرہ کو اپنے

Scanned by CamScanner

آپ سے یہ سلگانے والا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ کبیر کو نہیں جانتی اور وہ پھر آنکھوں سے بظاہر سامنے ڈرائنگ روم کا منظر دیکھتی کبیر سے پہلی ملاقات کی طرف لوٹ گئی۔

..........کافی کے تینوں پیالوں سے گہری دھند جیسی بھاپ اُڑ رہی تھی۔ باہر زور دار برستی بارش کی وجہ سے ریستوران کا ایر کنڈیشنر یک دم پورے زور شور سے گہری مرطوب ٹھنڈ بہانے لگ پڑا تھا۔ خوشبودار بھاپ زہرہ کے نتھنوں تک پہنچی تو اُسے اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں اور بھی آسانی ہوگئی کہ اُس نے ناصر اور اُس کے اس دوست کی کافی پینے کی دعوت قبول کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔

''میرا نام کبیر ہے'' کبیر نے کہا۔ بعد میں جب زہرہ ریستوران سے نکلی تھی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تھی تو وہ اسی مختصر سے جملے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ''میرا نام کبیر ہے'' شاید یہ واحد رسمی جملہ تھا جو اُس شخص نے بولا تھا جس کا نام کبیر تھا۔ ورنہ اُس کی سب گفتگو تمہیدی رکھ رکھاؤ اور رسمی تمیزداری سے خالی تھی اس کے باوجود کہ اُسے بدتمیز کہنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ گفتگو کو اُس کے مجلسی تحفظ کی آسودگی سے یک دم اکھاڑ کر ایسی پُر خطر سماجی اور لسانی سطح پر لے جاتا تھا جہاں مکالمے کی روزمرہ آرام دہ ابلاغیات تتر بتر ہو جاتی تھی اور شرکائے مکالمہ کو اپنی اپنی پڑ جاتی تھی۔

..........اس لمحے جب کہ زہرہ نے ایر کنڈیشنر کے نمناک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میں سویا ساس سرکے اور ہری مرچوں کی خوشبو کو پہچان لیا تھا اور انہیں کافی کے گھونٹ کے ساتھ حلق میں اُتارنے لگی تھی۔ کبیر نے کہا۔

''آ......آپ شاید یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ ناصر سے اور مجھ سے آپ کی آج کی یہ ملاقات اتفاقیہ ہے اور ابھی شاید ناصر بھی کچھ ایسی ہی کہانی گھڑ دیتا آپ کے سامنے مگر یہ جھوٹ ہے۔ دراصل ہم دونوں موٹر سائیکل پر پچھلے دو گھنٹے سے آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ آپ کے گھر کے گیٹ سے یہاں تک۔''

اسی لمحے زہرہ نے اپنے پورے وجود کی شدت سے سوچا کہ اُسے فوری فیصلہ کرنا ہے کہ اُسے ان دونوں مردوں کے سامنے میز پر دھرے کافی کے مگ میں انگلی اٹکائے، ریستوران کے دھندلے شیشوں کی راہ سے باہر برستی بارش کے بارے میں کچھ سوچے بغیر یوں ہی بیٹھے رہنا ہے یا

Scanned by CamScanner

فوراً اپنا شاپنگ بیگ اُٹھا کر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلے جانا ہے۔
زہرہ وہیں بیٹھی رہی تھی اور اُس گہرے سناٹے کو سہہ گئی تھی جو کبیر کی بات نے دنیا پر اُتار دیا تھا۔
''آپ کا شکریہ کہ آپ فوراً اُٹھ کر یہاں سے چلی نہیں گئیں۔ اس سے میں یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہوں کہ آپ میری بے ہودہ گفتگو کو برداشت کرنے کے موڈ میں ہیں''۔ کبیر نے کہا
دور ایک میز پر سے تلے ہوئے مکھن کی خوشبو مہکتی ہوئی زہرہ تک آئی اُس نے پہلی بار کافی کا گھونٹ لیا اور پھر کپ کو آہستگی سے رُک رُک کر میز پر اُتارتے ہوئے وہ ویسے ہی مدہم سے لہجے میں کہنے لگی۔ ''پتہ نہیں بے ہودگی سے آپ کی کیا مراد ہے...... رہی برداشت کرنے کی بات...... تو ابھی تو میں بیٹھی ہوں''۔
زہرہ نے اندر سے کہیں اسی وقت پالیا تھا کہ وہ لمحہ اُس کے اور کبیر کے درمیان یہ...... میں ہوں...... وہ...... تم...... ہو (اور دیکھتے ہیں کہ ہماری حدیں کیا ہیں اور کہیں ایک دوسرے کو کاٹتی چھوتی بھی ہیں یا نہیں) قسم کا لہجہ تھا۔
اب پردے کے پیچھے چھپی کھڑی زہرہ کے سامنے اسی لمحے کا پھیلاؤ تھا جو اچانک یاور عطائی کے ڈرائینگ روم تک آن پہنچا تھا۔ محفل اب مشروبات کے آسودہ رچاؤ کے زیرِ اثر تھی۔ اکڑی گردنیں اور عقابی آنکھیں ایک ڈھیلی نشیلی عام معانی کی دنیا میں اپنی اپنی جگہ بڑی شانت تھیں۔ دلکلیلی، مسکراہٹیں مل کر سب کچھ بخش دینے کی فضا بناتی تھیں جس میں اخوت، عفو، درگذر اور برداشت جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات کی بھنبھناہٹ سُنائی دیتی تھی۔
زہرہ کے لیے بھی پردے کی دوسری طرف مختلف حالتوں میں بیٹھے کھڑے لوگوں کی گفتگو ایک بہت بڑی بھنبھناہٹ تھی۔ جیسے بہت سے موٹے موٹے مکھے کسی کھانے کی چیز پر بیٹھے بھر بھر کر رہے ہوں۔ پردے کے پاس کبیر اور ایڈیٹر تھے اور اُن سے کچھ ہی پرے گورا آرکیالوجسٹ اب یاور عطائی، نواب ثریا جاہ اور امبر جان سے محوِ گفتگو تھا مگر شرکائے گفتگو میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز محویت امبر جان کی تھی جس کا منہ اور آنکھیں بھی کانوں کے ساتھ اِس انداز میں کھلی تھیں کہ کسی بھی پلے پڑنے والی بات کو فوراً ہڑپ کر لیں مگر ایسا ہونہ پاتا تھا۔ اپنی پُر خطر حیثیت کے احساس کے باوجود زہرہ ہنس پڑی اور پھر اُس نے سوچا کہ یقیناً یہ محفل کا سب سے انوکھا انسانی

امتزاج ہے۔ نواب، آرکیالوجسٹ، عطائی، سمگلر، زہرہ نے اُن کی جانب کان لگائے۔ وہ غلام باغ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ زہرہ نے کبیر، ناصر اور ہاف مین تگڈم کا محبوب ترین موضوع فوراً پہچان لیا۔ پچھلے دنوں جب بھی وہ اُن لوگوں سے ملی اور خاص طور پر ہاف مین کی موجودگی میں...... تو ناممکن تھا کہ غلام باغ، جنم کھنڈر اور مدد علی کے گونگے ہونے کے یہ سب معمے زیر بحث نہ آئے ہوں۔ ''پتہ نہیں مدد علی کا کیا بنا'' یہی زہرہ کے ذہن میں تھا کہ یاور عطائی نے کوئی بات کی اور زہرہ کے ہونٹوں پر اپنے باپ کی انگریزی کے لیے ایک شاباشی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ امبر جان نے منہ سے، یا، یا کی آوازیں نکالیں۔

گوراجو کچھ کہہ رہا تھا زہرہ پہلے بھی سُن چکی تھی ''میرا ارادہ ہے۔ کبھی ایک رات اپنی دوست کے ساتھ...... جنم کھنڈر کے نیچے تہہ خانے میں گذاروں گا۔'' نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا احتجاج شدید تھا مگر زہرہ کی سماعت سے بالاتر تھا۔ پردے کے بہت قریب کھڑے کبیر اور ایڈیٹر دونوں چُپ تھے۔ کبیر گہری نظروں سے یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے ڈرائنگ روم کی سب تفصیلات ایک ایک کر کے ہضم کر رہا ہو۔ ایک بار تو اُس نے سر گھما کر پردے کو بھی دیکھا اور زہرہ کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا مگر پھر وہ نجم الثاقب کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ ایڈیٹر نے اپنا گلاس بے چینی سے ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کیا اور خوفزدگی کی کیفیت میں اپنے آپ کو کبیر کے کسی امکانی جملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا مگر کبیر نے کچھ نہ کہا۔

.... کیفے غلام باغ کے مستقل نشئی گاہکوں میں سے ایک نے ایک بار پھر سوچا کہ فلمی ہیروئنوں جیسی یہ لڑکی اُن تینوں لفنگوں میں سے کس نے پھنسائی ہے۔ انگریز نے؟ ڈاکٹر نے؟ جو شکل سے شریف لگتا ہے اور جس کا عاشق علی بیرے نے بتایا تھا کہ پاگلوں کا تو سیانا ڈاکٹر ہے پر عام بندوں کا علاج معالجہ بھی اچھا کر لیتا ہے یا پھر تیسرے نے جس کا پتہ نہیں کیا نام ہے پر منہ ٹیڑھا کر کے ہنستا ہے اور جو کبھی ہیرو جیسا نظر آتا ہے اور کبھی ولن جیسا۔ یا پھر تینوں نے مل کر پھنسائی ہے۔ ''نہ نہیں یہ ایسی ویسی لڑکی تو نہیں لگتی''۔ اُس کے گہرے نشہ زدہ ذہن نے بھی زہرہ کے بارے میں یہی فیصلہ دیا کہ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے اور خود زہرہ نے بھی اپنے بارے میں یہی رائے دی کہ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ مگر کچھ دوسرے معنوں میں کبیر نے کہا تھا ''کیفے غلام باغ میں خواتین شاذ و نادر ہی آتی ہیں۔ فقیرنیاں آتی ہیں مگر وہ خواتین نہیں ہوتیں۔ کچھ ایسا ہی

Scanned by CamScanner

حال اُن میڈیکل اسٹوڈنٹ لڑکیوں کا ہوتا ہے جو کبھی کبھار چھوٹے موٹے ایڈونچر کی خاطر پاس کے میڈیکل کالج سے ادھر آ جاتی ہیں اپنے دوستوں کے ساتھ...... کیوں ناصر؟ معقول...... وضع دار رکھ رکھاؤ۔ رچ رچاؤ والی خاندانی لڑکیاں اس جگہ بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے اُدھر دیکھیں...... نہیں ایسے براہِ راست نہیں...... نشے بازوں کی اُس چھوٹے سے کونے والی دنیا میں آپ کی یہاں موجودگی نے ہل چل مچا دی ہے۔ گورے کے ساتھ ہمارے اٹھنے بیٹھنے کے ہی وہ ابھی مشکل سے عادی ہوئے تھے۔ کہ آج آپ جیسی لڑکی اس تکلّم کے ساتھ......"۔

"جی نہیں میرے جیسی؟ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں"۔ زہرہ نے کہا۔

"یہ ایسی ویسی کا کسی مخصوص معنوں میں استعمال ہے شاید۔ ورنہ ایسی ویسی۔ میرا مطلب یہ تو نہیں" کبیر نے سوالیہ نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہاف مین کی تلملاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ ابھی یہ کوئین آف شیبا کو کوئی جواب دے لے تو پھر وہ سب کو حکم دے گا کہ انگریزی میں بکواس کریں۔

"ایسی، ویسی، یعنی ویسی ہی، جیسے آپ نے کہی، معقول، وہ کیا تھا وضع دار رکھ رچاؤ...... رچ رکھاؤ کچھ نہیں۔" اور اچانک ہاف مین کے مسئلے کو بھانپتے ہوئے زہرہ نے انگریزی میں بات جاری رکھی...... "اور خاندانی...... میں خاندانی وغیرہ نہیں ہوں...... ڈاکٹر ناصر نے میرے باپ کی مشکوک سرگرمیوں کے بارے میں جو تحقیق کی ہے جو میں ابھی نہیں جانتی اور جو مجھے کچھ بہت مبہم لیکن پھر بھی اپنے باپ کے غیر خاندانی...... اگر میں اس لفظ کو صحیح سمجھتی ہوں تو غیر خاندانی ہونے کا پتہ چلا ہے۔ تو میرا خیال ہے میں اس جگہ بیٹھنے کا کافی استحقاق رکھتی ہوں۔" زہرہ نے ہنس کر کہا اور ہاف مین کھل اٹھا۔ چینی کا ایک چمچ بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے اُس نے ویسی ہی میٹھی انگریزی میں کہا" پلیز اس نامعقول زبان میں جاری رکھیے۔ ابلاغ کا مسئلہ ہے اور میری اس کمزوری پر یہ دونوں بدمعاش...... مجھے اکثر بلیک میل کرتے ہیں۔ لیکن میں یہاں آج یہ بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے یہاں ایک ادارہ جائن کر لیا ہے جہاں وہ غیر ملکیوں کو اُردو سکھاتے ہیں۔ اب ارادہ ہے گرٹریوڈ کو بھی جائن کرا دوں۔ آسٹریلوی ہونے کے باوجود اُردو سیکھی جا سکتی ہے۔" ہاف مین نے قہقہہ لگایا۔ مگر بقیہ افراد کے چہروں پر اپنے اس نجی مزاحیہ فقرے کا کوئی خاص ردِ عمل نہ دیکھ کر وہ کھسیانا ہو گیا۔

Scanned by CamScanner

''گرٹرپوڈ؟'' صرف زہرہ نے مسکرا کر سوال کیا۔ مگر ہاف مین کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی کبیر بول پڑا۔

''یہ ان کی ایک محبوبہ ہے۔ جس کے ساتھ یہ جنم کھنڈر کے نچلے بھیانک تہہ خانے میں ایک رات گذارنا چاہتے ہیں۔''

''اُسے بھول جاؤ۔'' ہاف مین نے یک دم پریشان ہو کر کہا اور زہرہ کی طرف براہِ راست دیکھتے ہوئے کہنے لگا............ ''دراصل آرکیالوجسٹ کو اپنی Sites کے علاقے میں بولی جانے والی زبانیں ضرور جاننی چاہئیں......ورنہ......''

''پلیز......'' کبیر نے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں کہا اور کیفے کے نشئی گاہک کو یقین ہو گیا کہ وہ حرامی کے پلّے اور پلّی انگریزی ہی بول رہے تھے۔ ورنہ اب اتنا تو نشہ نہیں چڑھا کہ پہلے کوئی کوئی لفظ پلے پڑتا تھا مگر پھر کتے بھونکنے لگے۔ جاؤ اپنی بہنوں کے یار و اس کنجری کو لے جاؤ اور باری باری سوؤ اس کے ساتھ، جاؤ۔ ٹلو یہاں سے تمہاری ماں......'' پھر اُس نے اپنی سُرخ انگارے جیسی آنکھیں زہرہ پر گاڑ دیں اور آہستگی سے اپنا بایاں ہاتھ میز کے نیچے لے گیا اور آہستہ آہستہ اپنے آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

''پلیز......اب ہمیں آرکیالوجی اور لسانیات پر لیکچر مت دینا'' کبیر نے کہا تھا پھر ناصر کی طرف ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''زیادہ اہم بات ہو رہی ہے۔ مس عطائی..........''

''پلیز مجھے زہرہ ہی کہیے'' زہرہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

پھر کبیر نے مزے سے کہا'' آئی۔ ایم۔ سوری۔ زہرہ اپنی Origins کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر ناصر نے اُن کے لیے جو تحقیق کی۔ ایک سچے عاشق کی طرح......کچھ مجھے بھی بتایا تھا اُس نے......وہ یہ ہے کہ زہرہ کی والدہ کا خاندان تو روایتی معنوں میں بالائی طبقے سے تعلق رکھتا ہے مگر ان کے والد یا ورعطائی کا خاندانی پس منظر مشکوک ہے۔ غالباً وہ طبقاتی تقسیم میں کہیں بہت نیچے جا کر ٹھہرتے ہیں......''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' ناصر نے شدید احتجاج کے لہجے میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا اور پہلی دفعہ گفتگو میں شامل ہوا۔ اس سے پیشتر وہ زہرہ کو مسلسل دیکھنے اور نہ دیکھنے کے

Scanned by CamScanner

عذاب میں مبتلا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کبیر کی اکھڑ اور بدتمیزی کی حد تک کھلی کھلی باتیں کیسے برداشت کر رہی ہے۔ اب جب سے اُس نے زہرہ کے سامنے اُسے صاف صاف اُس کا سچا عاشق کہنا شروع کر دیا تھا وہ ایک مضحکہ خیز خودحسی کا شکار ہو گیا تھا جیسے کینسر کا ایک ٹرمینل کیس ہو جو جانتا ہو کہ سب اُس کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ مر جائے گا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ زہرہ جانتی ہے اور میں اپنے آپ کو دہراؤں گا شاید مگر مجھے دہرانے دیں۔ بات ان کے والد کے میرے وارڈ میں آنے سے شروع ہوئی اُن کی مینٹل کنڈیشن ابنارمل تھی۔ پھر .G.L کے نتیجے میں اُن کے معدے سے ایسا میٹیریل ملا جو جڑی بوٹیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ اس سے میرا ذہن Aphrodisiacs کی طرف چلا گیا۔ پھر مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ اس طرح کا Stuff بنانے میں وہ ملک کی اعلیٰ ترین سطحوں کے لوگوں میں ایک مخصوص شہرت رکھتے ہیں۔ زہرہ نے میری ان باتوں سے شدید اختلاف کیا، حالانکہ میرا اختلاف محض Academic تھا...... ''۔

''Academic...... آ...... کیا بات ہے۔ Academic'' کبیر نے زہریلے سے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات...... کیا Aphrodisiacs ہوتی بھی ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہوتی ہیں تو اُن کی بائیوکیمسٹری Prognostic میکنزم...... پیتھالوجی...... وغیرہ...... وغیرہ...... وغیرہ کیا ہے یہ تو Academic باتیں ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ بات کہ کوئی شخص ایک بہت ہی محدود اور مخصوص لوگوں کے گروپ میں ایک طرح سے ایک خفیہ شاہی طبیب کی حیثیت رکھتا ہے یہ محض ایک Academic بات نہیں ہے............''۔

''تو یہ کیسی بات ہے؟'' زہرہ نے تند لہجے میں پوچھا...............

''یہ ایک دلچسپ بات ہے''۔ کبیر نے تمسخر بھرے انکشافی انداز میں کہا اور اُس کی توقع کے عین مطابق ہاف مین نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

''ہاں...... یہ ''دلچسپ''۔ یہ لفظ دلچسپ ہے۔ جب تم کسی بات پر کھل کر کچھ نہیں کہنا چاہتے تو کہتے ہو یہ دلچسپ ہے۔ مثلاً اب یہ سارا موضوع Aphrodisiacs اور ہاں یہ کبیر جو تم کہتے ہو کیا شاہی طبیب یہ ادارہ بھی۔ یہ بھی مجھے۔ میرے لیے بہت دلچسپ ہے مگر خدا جانے اس پر کھل کر بات کرنا بھی...... کبیر تو کھل کر بات کر لیتا ہے۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں۔ ہاں......

Scanned by CamScanner

میرا مطلب ہے...... میں نہیں جانتا...... اس سبجیکٹ پر میں زہرہ کی موجودگی میں بات...... کوئی مناسب...... کوئی موزوں بات ہوگی"۔

اور زہرہ نے فوراً فیصلہ کیا کہ اب وہ ان کی طبیعت صاف کرے گی ان تینوں کی۔ "میری جنس کی وجہ سے میرے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں کوئی چھوئی موئی قسم کی مخلوق نہیں ہوں اور قطعاً مجھے اس طرح کی بات جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے بھی بتا چکی ہوں"۔ زہرہ نے اچانک شدید اُردو میں کہا۔

"پلیز انگریزی میں۔ اوخدا میرے حال پر رحم فرما"۔ ہاف مین کہہ رہا تھا اور زہرہ ایک لمحے کا بھی وقفہ ڈالے بغیر کسی ماہر مترجم کے انداز میں انگریزی میں رواں دواں ہوگئی اور اپنی کہی میں اضافہ کیا۔ "میں نے یونیورسٹی میں بھی کبھی کسی کو اجازت نہیں دی تھی کہ وہ میرے ساتھ میرے عورت ہونے کے حوالے سے کوئی بے کار بات کرے۔"

"میں نے آپ سے۔ جب سے آپ نے ہم لوگوں کو کبھی کبھار کچھ وقت دینا شروع کیا ہے۔ میں نے کبھی ایسی رعایت نہیں کی آپ سے.........." کبیر نے اپنے لہجے کے فخریہ پن کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ صرف بدتمیز ہیں کبیر صاحب اور اپنی بدتمیزی کی تھیٹریکل نمائش سے لطف اٹھاتے ہیں۔ صاف گوئی اور چیز ہے اور بات بات پر دوسروں کو چونکانا اور دہلانا اور چیز ہے۔ آپ کی گفتگو ایک سستی تماشہ بازی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے پیچھے کیا ہے، کچھ ہوگا۔ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے"۔ زہرہ سانس لینے کے لیے رُکی۔

"ہے ایک مسئلہ"۔ کبیر نے عقیدت سے کہا "کبھی پیش کروں گا۔ وہ یہ کہ اگر آپ سُننا پسند کریں گی تو......"

"مجھے پتہ نہیں.........." زہرہ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا

ہاف مین کی حالت یہ تھی کہ جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ہو۔ وہ زہرہ کے لیے نو رنگی جذبات کی شدت میں یک لخت جرمن میں چلا گیا مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ "کمال ہے۔ حیرت انگیز۔ اس شخص یعنی کبیر کے کردار کا اس سے عمدہ اور اس سے زیادہ درست تجزیہ اور کسی نے نہیں کیا ہوگا اور سب سے زیادہ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ آپ نے وہ کھوٹا سکہ اس کے منہ پر

Scanned by CamScanner

دے مارا ہے جو یہ پوری بدمعاشی سے چلاتا پھرتا ہے۔ آپ نے وہ کام کر دیا جو میں اور ڈاکٹر نہ کر سکے .... بدتمیزی کی تھیٹریکل نمائش سستی تماشہ بازی .... کبیر یہ تمہارے لیے لمحہ فکریہ ہے''۔

''میں اس لمحے کو ہمیشہ محفوظ رکھنے کی کوشش کرونگا'' کبیر نے اُسے یقین دلایا۔ ''میں زہرہ سے سو فیصد متفق ہوں کہ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ کیا وہ یہ بتانا پسند کریں گی کہ ان کا اپنا مسئلہ کیا ہے''۔

''ضروری نہیں میں پسند کروں''۔

''Exactly'' ہاف مین نے بھرپور حمایتی انداز میں کہا اور زہرہ کو اُس پر پلٹ پڑنے کا موقع مل گیا۔

''آپ مسٹر ہاف مین یہ مت سمجھیں کہ کوئی بھی غیر ملکی کسی دوسرے ملک، معاشرے، کلچر کے لوگوں کے ساتھ اس حد تک گھل مل سکتا ہے کہ وہ اُن کی سوچ اُن کی روح کے اندر تک رسائی حاصل کر لے۔ No اگر ایسی کوئی غلط فہمی ہے آپ کو تو بھول جائیں''۔

''کم از کم میری روح کو یہ مکمل سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ ہم دونوں ارواحِ خبیثہ ہیں''۔ کبیر نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی اور ہاف مین کو اشارہ دیا کہ اب وہ بول سکتا ہے۔ ہاف مین کبیر کی بات سے محظوظ ہونے کے باوجود کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''آ .... آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ یہ المناک حقیقت ہمیشہ میرے سامنے رہی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کوئی کام اگر کوئی کر سکتا ہے۔ کامل طور پر نہیں۔ مگر بہت حد تک تو آرکیالوجسٹ...... کیوں کہ وہ اگر کسی بھی اجنبی معاشرے میں۔ اگر کام کرتا ہے تو اُس کے ماضی کو عزت بخشتا ہے اور یہی چیز اُسے وہاں کے حال سے قریب لے آتی ہے''۔

''یہاں سے ہی غلط ہے'' کبیر نے قہقہہ لگایا۔ ''یہاں بہت سے بلکہ زیادہ ایسے ہیں جنہیں تمہارے اس ''ماضی کو عزت بخشنے'' سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بیشک تم یہ اپنا غلام باغ یہاں سے اکھاڑ کر لے جاؤ انہیں رتی برابر فرق نہیں پڑے گا''۔

''خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اتنے بڑے بڑے فیصلے اتنی آسانی سے نہیں لڑھکانے چاہئیں مسٹر کبیر۔'' دل ہی دل میں یہ جاننے کے باوجود کہ اب وہ بحث برائے بحث کر رہی ہے

Scanned by CamScanner

زہرہ نے کہا۔

''آپ بہت سوں میں سے تو نہیں ہیں۔ آپ تو ماضی کی کھوج کرنے والے چند منتخب لوگوں میں سے ہیں۔ خواہ وہ واقعی سب کا ماضی ہو یا صرف آپ کا اپنا...... محدود...... مختصر...... مگر انتہائی شدید...... ماضی۔ کچھ لوگوں کو ایک دن اپنی ذات کی...... صرف اپنی اصل کی آر کیالوجی کرنی پڑتی ہے''۔ کبیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور زہرہ نے اُس کے ایک ایک لفظ کی دھمک اپنے اندر محسوس کی۔

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے''۔ زہرہ نے اتفاق کیا اور جی میں سوچا اتفاق کرنے میں کیا حرج ہے۔

''میرے ساتھ بھی ایسا ہے۔ مگر خطرہ اس میں یہ ہے...... وہ لوگ جو اپنی جڑیں کھود نکالنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اردگرد کے پودوں کی جڑیں بھی ننگی کر دیتے ہیں اور بعض پودے ایسا حادثہ ہونے پر سوکھنے لگتے ہیں۔ جیسا ڈاکٹر ناصر کے ساتھ ہو رہا ہے''۔

''براہ کرم میری ذات کو ڈسکس نہ کیا جائے''۔ ناصر نے کہا اور سوچا کہ اب اُسے اٹھ کر جانا چاہیے۔ وارڈ میں ڈیوٹی شروع ہونے میں اگرچہ دیر ہے۔ مگر یہ شام اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔

''تمہاری خاموشی آج کچھ معمول سے زیادہ نہیں ڈاکٹر؟'' ہاف مین نے کہا اور زہرہ نے ایک نظر ناصر کی طرف دیکھا اور پھر اپنے چائے کے کپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو خالی تھا اور ناصر نے اپنے آپ کو انتہائی شدت سے محسوس کیا اپنی پوری کھال میں جس میں وہ بند تھا۔ ہر مسام کو اپنے چہرے کو، ناک کو، ہونٹوں کے اندر انگلیوں کو، ہر ریشے کو جو وہ تھا۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ اُسے اپنے بچپن کے وہ دن یاد آتے تھے جب اُس کے باپ کی قبل از وقت موت کے بعد اُس کی ماں نے گذارے کے لیے سلائی وغیرہ کا کام سیکھنا شروع کیا تھا اور وہ اس کے سکول کے کپڑے خود کاٹتی تھی۔ یہ کپڑے اُسے اُس کے ساتھیوں کے سامنے بالکل ننگا کر دیتے تھے۔ بچوں کی معصوم بے رحمی جس میں معاف کر دینے کا شائبہ تک نہیں ہوتا اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیتی تھی اور وہ اپنی آڑی ترچھی قمیض اور پاجامے جیسی پتلون کو اپنے اردگرد لپیٹے سکول کی ایک باڑ کے پیچھے جا کر چھپ جایا کرتا تھا۔ جہاں وہ دیر تک گارڈینیے کے موٹے بھر بھرے پتوں کو مسل کر اُن کی بو سونگھتا

Scanned by CamScanner

رہتا تھا اور ایک پودے کی جڑ میں بنے سوراخ میں سے سُرخ، کالی، پیلی، چتکبریوں والے خوبصورت کیڑوں کو تیزی سے اندر اور باہر جاتے دیکھتا رہتا تھا اور اتنی شدت سے اُن کیڑوں میں سے ایک کیڑا بننے کی خواہش کرتا تھا کہ اُسے سوراخ کے اندر بنے اُن کے کیڑا گھر، کیڑا کمرے، کیڑا محلات، کیڑا اسکول، کیڑا باغ اور اُن کا اپنا کیڑا آسمان صاف نظر آنے لگتا تھا جس کے نیچے یہ کیڑے جشن مناتے تھے کیونکہ اُن کے کیڑا باپ کبھی نہیں مرتے تھے اور کیڑا مائیں کیڑا سلائی مشینوں پر اپنے بچوں کے لیے خراب خراب کپڑے نہیں سیتی تھیں۔ کیڑا کپڑے ہمیشہ خوبصورت ہوتے ہیں سرخ، نیلے، پیلے، سبز، چمکیلے...

عنابی رنگ کے پردے کے پیچھے کھڑی زہرہ نے سوچا کہ اگر کبیر اور ہاف مین اس محفل میں گھس آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو پھر ناصر بھی ان کے ساتھ کیوں نہیں۔ مگر اس طرح کے ایڈونچرز میں پڑنا اُس کی ٹائپ نہیں اور پھر اُسے یاور عطائی کی نسبت اُس کی بیٹی سے زیادہ دلچسپی ہے اور بقول کبیر وہ اُس کا سچا عاشق ہے۔ اچانک زہرہ کے اندر کہیں کبیر کا یہ ریمارک اٹک گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ ناقابلِ فہم احساس عود کر آیا جو ایسے موقعوں پر کبیر کے لیے وہ اپنے اندر موجود پاتی تھی۔ نفرت اور غصے کا ایک ایسا امتزاج جو ان دونوں جذبوں کی ہی نفی کرتا تھا۔ ایک بات یقینی تھی ایک سادہ سی، فوری طور پر سمجھ میں آنے والی بات۔ جسے تسلیم کرنے میں زہرہ کو کوئی باک نہیں تھی۔ ڈاکٹر ناصر کا بے رحمی سے مضحکہ اُڑانے کی کبیر کی سب حرکتیں اور فقرے بازیاں زہرہ کو ناپسند تھیں۔ باقی (زہرہ۔ ناصر)۔ (یاور عطائی کی بیٹی ...... جونیئر سائیکیاٹرسٹ) (خفیہ مجرمانہ حرکتوں میں مصروف عطائی کی بیٹی جو اُسے بچانا چاہتی ہے۔ اُسی عطائی کی حرکتوں کو بے نقاب کرنے پر تُلا ہوا ایک نوجوان ڈاکٹر)۔ (بے باک، پُر اعتماد، خوبصورت لڑکی۔ خوش شکل مگر ڈرا ہوا، سہما ہوا مرد)۔ (اپنے باپ کے خاندانی پس منظر کا کھوج لگانے کے جنون میں مبتلا لڑکی...... اسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ایک نوجوان مرد جو لڑکی کے اِس جنون میں اُس کا معاون بننا بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے)۔ (اِس سب کچھ کے باوجود باقی سب کچھ جو وہ عورت ہے...... اِس سب کچھ کے باوجود باقی سب کچھ جو وہ مرد ہے)........... ان سب دو دو کی اوپر تلے چُنی دنیاؤں میں زہرہ کے لیے ابھی بہت اندھیر تھا اور بہت پھسلن تھی اور ہر شے اتنی تیزی سے اپنی جگہیں بدلنے پر آمادہ تھی کہ ہاتھ پاؤں کو ذرا سی بھی جنبش دینے سے سب کچھ چکرا جاتا تھا اور متلاہٹ کی طرف لے

Scanned by CamScanner

جاتا تھا۔

تب زہرہ نے کبیر کو دیکھا اور خوش ہوگئی۔ وہ کسی رسالے کا منحوس ایڈیٹر مسلسل اُس کے ظالمانہ فقروں کے تیروں کی زد میں تھا۔ پھڑ پھڑاتا تھا اور تڑپتا تھا مگر بھاگتا نہیں تھا بس گلاس خالی کیے جاتا تھا............ اچانک زہرہ کو حیرت ہوئی کہ آخر اُس ایڈیٹر سے کبیر کی کیا دُشمنی ہے پھر اُسے شک ہوا کہ خود اُس کے اپنے اندر بھی کہیں ظلم کا ایک بند کمرہ ہے۔ ایک ٹارچر سیل جس میں وہ اپنے شکار کو صرف اس قصور پر بھی گھسیٹ کر لے جاسکتی ہے کہ اُس کی شکل اُسے منحوس لگتی ہے۔

''طاقت کے سب سرچشمے یہاں موجود ہیں سر'' کبیر نے کہا۔ ''مگر شاید اُن کے سرچشمے اُن کی ٹانگوں کے بیچ خشک ہو گئے ہیں''۔

نجم الثاقب کا جی چاہا کہ وہ کسی کُتے کی طرح منہ کھول کر اُس شخص کی بوٹیاں نوچ لے۔ مگر ایسا کچھ کرنے کی بجائے اُس نے کالا کُتا وِسکی کے گھونٹ کو منہ لگالیا۔

''یہ تو ایک خصی کلب ہے سر۔'' کبیر نے قہقہہ لگایا اور تاریک کونے میں کھڑی زہرہ تھکی ہوئی ٹانگوں کو آرام دینے کے لیے واپس پلٹ کر قدیم اطالوی صوفے پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کیا اُسے واپس چلے جانا چاہیے؟ کیا وہ کافی کچھ دیکھ چکی ہے؟''

OOO

Scanned by CamScanner

ڈرائینگ روم(2)

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو جب یقین ہوگیا کہ اُس نے واقعی ایک سنگین غلطی کی ہے تو اُس وقت آدھی رات ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اُس نے بے چینی سے گورے اور اُس کے مقامی دوست کو دیکھا جس کا نام بھی اُسے ابھی ٹھیک طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اُس نے اپنی پرانی رومن ہندسوں والی جیبی گھڑی کو واپس جیب میں رکھا اور پھر سے پچھتاوے کی سوچ سوچنے لگا۔ گورے کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ گورا خود بھی عطائی کی محفل میں آنا چاہتا تھا اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ بھی اُسے اپنے ساتھ لانے کا خواہش مند تھا۔ آثارِ قدیمہ سے متعلق سفید فام غیر مُلکیوں سے نواب کی راہ و رسم ایک معلومہ حقیقت تھی اور اس حقیقت کو معلوم ہی رکھنے کے لیے نواب کبھی کبھار تھوڑے بہت عملی مظاہرے کا بھی اہتمام کرلیا کرتا تھا۔ مگر جب گورے نے اپنے مقامی دوست کو ہمراہ لانے پر اصرار کیا تو وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔ یوں تو اُسے علم تھا کہ ہاف مین کے مقامی لوگوں سے اچھے بے تکلفانہ تعلقات ہیں خاص طور پر وہ ڈاکٹر جو مدعلی کی گویائی بند ہونے کا علاج کر رہا تھا اور اُس کے ساتھ کوئی اور کیریکٹر جس کے بارے میں نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے ہاف مین کی کبھی اِکا دُکا باتوں سے اندازا لگایا تھا کہ وہ کوئی ٹٹ پونجیا قلم گھسانے والا ہوگا..........

جب ہاف مین نے کہا کہ وہ وہی رائٹر ہے جسے وہ ساتھ لانا چاہتا ہے تو نواب کی اُلجھن اضطراب میں بدل گئی اور یہ اس لیے بھی تھا کہ وہ ہاف مین سے انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انسانوں کی خواہشات تکمیل کے لیے کس مضبوطی سے ایک دوسرے کی توقعات سے جڑی ہوئی ہیں۔ 'مقامی دوست' ہاف مین کے ساتھ یاور عطائی کی محفل میں نہیں جائے گا۔ ایک

Scanned by CamScanner

آدھ سال بعد ہاف مین کے تحقیقی شاہکار ''غلام باغ کا معمہ'' میں نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا کہیں ذکر اذکار بھی نہیں ہوگا۔ صرف یہی نہیں جرمن آرکیالوجسٹ کی خوشنودی نواب نادر جنگ کے لیے اور بھی کئی معاملوں میں ضروری تھی۔ سب سے اہم معاملہ تو خود مددعلی کا تھا۔ ان پڑھ، تحریری اظہار سے نابلد اور اب گونگے مددعلی کی کھوپڑی میں سے جنم کھنڈر کی رات کے تجربات کھود نکالنا ہاف مین سے بھی زیادہ خود نواب کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ ہاف مین نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں کہا تھا کہ اگر ڈاکٹر ناصر مددعلی کو بلوانے میں ناکام ہوگیا تو وہ اُسے جرمنی لے جائے گا اور وہاں دنیا کے چوٹی کے ماہرین سے اُس کا علاج کروائے گا۔ نواب نے اس تجویز کی بھرپور حمایت کی تھی۔

لیکن اب اگر ہاف مین کا وہ واہیات مقامی دوست اُس کے ساتھ عطائی کی محفل میں نہیں جا پاتا۔ تو یہ سب کچھ دھرے کا دھرا رہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر کی حد تک بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ نواب نے اُسے سائیکیاٹری وارڈ میں مددعلی کا علاج کرتے دیکھا تھا اور وہ اُسے ٹھیک لگا تھا، شریف اور بے ضرر۔ بلکہ معقول۔ بات کو پلٹنے کے لیے نواب نے جانتے بوجھتے ہاف مین سے کہا۔

''اچھا تو وہ اُس نوجوان ڈاکٹر کو تم ساتھ لانا چاہتے ہو...... ٹھیک ہے وہ ہمارے ساتھ جا سکتا ہے''۔

''نہیں...... نہیں...... وہ نہیں......'' ہاف مین نے قہقہہ لگایا ''وہ بے چارہ تو کبھی شاید۔ اگر ایسا ہو سکا تو وہ کیا کہتے ہیں تمہاری زبان میں...... بار را...... بارات...... ہی لے کر جائے گا مسٹر یاور عطائی کے گھر......''۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے ہاف مین کی اس بکواس کو کچھ نہ سمجھ پاتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔

''میں تو کبیر کی بات کر رہا ہوں اور میں آپ کو بتاؤں وہ واقعی میرا دوست ہے کوئی صرف مقامی مترجم یا رابطہ آفیسر نہیں ہے......... O.K تو کبیر اور میں جائیں گے''۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو ہاف مین کی خواہش کا احترام کرنا پڑا اور اُس نے گورے کو بتا بھی دیا کہ وہ محض اُس کی خاطر ایک بن بلائے مہمان کو ساتھ لے جانے کی اخلاقی بدتمیزی کر رہا ہے۔

بعد میں نواب نے سوچا بھی کہ وہ 'اجازتی' انداز میں عطائی کو بتا بھی دے گا کہ اُس کے

ساتھ اُس کے دو دوست بھی آ رہے ہیں۔ مگر عطائی کا اصول اس بارے میں بالکل سیدھا سادا تھا۔ اُسے دوستوں کے دوستوں کو شرفِ میزبانی بخشنے میں کبھی کوئی اعتراض نہیں رہا تھا۔ مگر دوستوں کے دوست کیسے ہونے چاہئیں یہ دوست اور دوستوں کو خود جاننا چاہیے۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ بھی یہ کلیہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مگر اب جبکہ آدھی رات قریب آ رہی تھی نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے دیکھا کہ 'یاور عطائی کے دوست کے دوست کا دوست' اصل میں ایک مصیبت ہے جو کسی بھی وقت آفت بن سکتی ہے اور اگر وہ اپنے ان دونوں 'دوستوں' کو آسانی سے خاموشی سے عطائی کے ڈرائینگ روم میں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اُس کی خوش قسمتی ہوگی۔

مگر خوش قسمتی اس رات صرف نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا ساتھ ہی نہیں چھوڑ رہی تھی بلکہ وہاں موجود اور بھی بہت سے لوگ یا شاید سبھی لوگ قسمت کی مہربانیوں سے محروم ہونے والے تھے۔ شاعر، سمگلر، ایڈیٹر، مولوی، ادیب، سیاستدان، امبر جان، نجم الثاقب، کبیر، یاور عطائی اور زہرہ۔

اگلا دن آدھی رات سے شروع ہونے والا تھا۔ جو شاید ویسی ہی رات تھی جس کے بارے میں کبیر نے اپنے ناول کے پرزہ پرزہ آغاز میں لکھا تھا۔ ''اندتی سیاہ رات، آسمانوں اور زمینوں کے بیچوں بیچ پھیلی تیرگی کا مہیب سمندر''۔

وہ عظیم تیرگی جو آسمانوں اور زمینوں سے پہلے سے بھی پہلے ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے بعد سے بھی بعد ہے۔ قطرہ قطرہ رات بنی اُترتی ہے۔ سنگلاخ پہاڑی چٹانوں میں گہری بنی کھوہ میں رات جو رنگ دار ماں باپ کے جنے شرم ناک گورے بچے کی حفاظت کرتی ہے۔ جنم کھنڈر میں محبوس رات جو سنہری صندوقچے کے محافظ زرد چتکبرے سانپ کو پھنکار کر مدد علی کی زبان گنگ کر دیتی ہے۔ انعام گڑھ کے محلہ پکھیاں کی رات جو مرد کی لذتوں کے راز گنجینۂ نشاط میں کھولتی ہے اور پھر اگلے کتنے ہی برسوں پر محیط ہو کر یاور عطائی کے ڈرائینگ روم تک پھیل جاتی ہے۔

نواب نے جیسے ہی یہ فیصلہ کیا کہ اب اُسے اس Trouble maker کو محفل سے کسی طرح نکالنا ہے تو اُس نے مزید مشروبات لینے سے اجتناب کیا۔ بیرے نے نواب صاحب کے سر کے خفیف سے انکاری اشارے کے سامنے ویسے ہی خفیف سے اقراری انداز میں سر جھکایا اور ٹرے کو اپنے بائیں ہاتھ پر متوازن کرتا کسی اور پیاسے کے حکم کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ گیا۔ عطائی نے

Scanned by CamScanner

جسے اپنے دوستوں کے ہر نوع کے ظرف کا بخوبی علم تھا جب بیرے کو واپس جاتے دیکھا تو اُسے نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا مذاق اُڑانے کا موقع مل گیا۔

"نواب صاحب آپ کا ظرف اتنا چھوٹا تو نہیں ہوا کرتا تھا۔"

"ہمارا ظرف تو ویسا ہی ہے مگر آپ کے 'ظروفِ آفتاب' کشادہ ہو گئے ہیں ورنہ دیکھ لیں ہم تو خدا کے فضل سے حواس میں ہیں۔"

"ایسے موقعوں پر حواس کی حفاظت خدا نہیں بلکہ شیطان کرتا ہے۔" کبیر نے مکمل سنجیدگی سے کہا۔ یہ سُن کر یاور عطائی نے قہقہہ لگایا اور دلچسپی سے کبیر کو دیکھا۔ کچھ لمحے اُس کے تمسخر سے بھرے چہرے کو گہرے تجسس سے تکتا رہا۔ پھر نواب سے پوچھنے لگا۔ "آپ کے یہ دوست...... آ...... آپ نے اپنے دوستوں کا تعارف نہیں کروایا۔ نواب صاحب............"

نواب ثریا جاہ نادر جنگ ایسے ہی کسی لمحے سے بچ نکلنا چاہتا تھا۔ اُس نے ٹھنڈی سانس لینے کی کوشش کی جو اُس کے بھاری بھرکم جسم سے باہر آنے کی بجائے اندر ہی کہیں ٹھنڈی ہو گئی۔ ہاف مین محاورے کے عین مطابق کان سے کان تک مسکرا رہا تھا۔ نجم الثاقب اپنے ایک بھٹکتے ہوئے چوکنے پن کو اپنے ساتھ لیے اُن چاروں سے اور بھی قریب ہو گیا۔ اُس کی کوئی آزمودہ حس اُسے بتا رہی تھی کہ اِدھر اب کچھ ہونے والا ہے۔ جس کے نتیجے میں اُس کے رسالے کا ذلیل ملازم اور بھی ذلیل ہو گا۔ نواب نے گفتگو کو انگریزی زبان میں اُتارنا شروع کیا۔

"دوست ......نہیں میرا تو خیر...... دوست ...... میرا مطلب ہے۔ یہ ہمارے مسٹر ہاف مین...... ہمارے آرکیالوجسٹ دوست ہیں ان کے دوست یہ شاید میں نہیں جانتا ......لیکن دوستوں کے دوست آپ جانتے ہیں۔" نواب نے بے چین سا قہقہہ لگایا اور بات کو جاری رکھا "مسٹر ہاف مین ہمارے ہاں بہت اہم تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ غلام باغ پر۔ یہ عالمی سطح کے آرکیالوجسٹ ہیں میرا خیال ہے ان کی کتاب اگلے سال شائع ہوگی جرمنی سے۔ جرمن میں ہوگی ہاف مین کتاب؟"

"جرمن اور انگلش دونوں زبانوں میں" ہاف مین نے کہا۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے کبیر کو اپنی گفتگو کے ذریعے .... "ایک فالتو ناپسندیدگی...... بس برداشت کی جانے والی...... مگر ترجیحاً نظر انداز کی جانے والی موجودگی" بنا ڈالنے کی کامیاب کوشش

Scanned by CamScanner

کی۔ نجم الثاقب نے اپنے گلاس میں سے گہرے اطمینان کا گھونٹ حلق میں اُتارا۔

''جرمن اور انگریزی۔ دونوں زبانوں میں؟'' عطائی نے پوچھا۔

''میری انگریزی تو واجبی ہے مگر میرا دوست یہاں...... کبیر مہدی میری مدد کرے گا۔ اس زبان پر عبور رکھتا ہے۔ کیوں کبیر؟''

گورا کبیر کو گفتگو کے معزز دھارے میں لانے پر مصر تھا۔ اُسے فوراً ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ اپنے کسی طبقاتی خوف کی وجہ سے کبیر کو باتوں ہی باتوں میں ''یہ...... ہم میں...... سے...... نہیں ہے'' بنا کر اُڑا دینا چاہتا ہے۔

کبیر نے ہاف مین کی 'دعوتِ شرارت' جیسی مسکراہٹ کا مفہوم خوب پہچان لیا اور اُس نے سوچا کہ 'ابلاغ' کا جو ناجائز رشتہ اُس نے کچھ ہی دیر پہلے تک نجم الثاقب ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ سے استوار کیا ہوا تھا بس اُسی کا دائرہ اُسے ثریا جاہ نادر جنگ اور یاور عطائی تک وسیع کرنا ہوگا۔

اکتوبر کی رات کی خنکی اُس لمحے یاور عطائی کے ڈرائنگ روم کی مخلوق میں سے کسی تک بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ سوائے زہرہ کے جو ڈرائنگ روم میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہ تھی چوتھے کونے کے نیم وا بیرونی دروازے کی راہ سے باہر کی ٹھنڈک اُس تک آ رہی تھی۔ عنابی پردوں کے پیچھے کھڑے اُس کے جسم کا سب خون اُس کی ٹانگوں میں اکٹھا ہو رہا تھا۔ مگر کبیر کو اس کا جانا پہچانا پینترہ بدلتے دیکھ کر کہ جس میں وہ کوئی بات شروع کرنے سے پہلے اپنے ہونٹوں کے بائیں کونے کو نیچے کھینچتا تھا اور دائیں ہاتھ سے بالوں کو پیچھے اٹھاتا تھا اور ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کی سیاہی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ زہرہ نے فیصلہ کیا اب تو خواہ اُس کی ٹانگیں کھڑے کھڑے پتھر کی ہی کیوں نہ ہو جائیں وہ دیکھتی رہے گی اور سُنتی رہے گی اور پھر اُس نے کبیر کو بولتے سُنا۔

''آ...... انگریزی زبان سے میری معمولی واقفیت بلکہ عاجزانہ شد بد۔ جسے ہاف مین عبور رکھنا قرار دیتا ہے۔ بعض اوقات معزز شرفا کو اس ناچیز کے بارے میں کافی مہلک فیصلے کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے'' کبیر نے جان بوجھ کر ضرورت سے زیادہ بھاری بھرکم انگریزی میں کہنا شروع کیا۔

زہرہ مسکرائی اور پورے جسم سے خوش ہو گئی۔ ''کیسے چبا چبا کر ایک ایک لفظ کا مزہ لے کر بولتا ہے یہ شخص آخر ہے کیا چیز کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ کیا سمجھتا ہے۔ آخر اپنے آپ کو۔ اس کی

باتیں سن کر غصہ آتا ہے مگر مزہ آتا ہے۔ کیا ہے یہ............"۔

"کیسے مہلک فیصلے؟" یاور عطائی نے کبیر سے پوچھا اور باپ کے لہجے کے تجسس نے زہرہ کو حیران کیا۔

"غیر محتاط فیصلے کہہ لیں۔ کیونکہ مہلک تو وہ بعد میں ثابت ہوتے ہیں"۔ کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا اور یک دم نجم الثاقب پر نظریں جما دیں۔ جو عینک کے اوپر سے اپنی چھوٹی بٹن جیسی آنکھوں سے کبیر کو گھور رہا تھا۔ اُس نے تیزی سے دائیں ہاتھ سے ناک پر آگے کو پھسلتی عینک کو پھر پیچھے جمانا چاہا لیکن صرف اتنا ہو پایا کہ تکوں کے رس سے سنی اس کی انگلیاں عینک کے شیشوں سے مس ہو کر اُسے اور بھی گندا کر گئیں۔ بائیں ہاتھ سے وہ گلاس کو منہ تک لے گیا مگر گلاس خالی ہو چکا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے بیرے نے تیزی سے خالی گلاس اُس کے ہاتھ سے اُچکا اور بھرا ہوا ایسے تھما دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مضحکہ خیز گڈمڈ ہوتے خیال اُس کے ذہن میں دھول کی طرح اُڑ گئے۔ پہلے تو اُسے یہ ڈراؤنا سا احساس ہوا کہ شاید اُس کے ساتھ ہی آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ "چیزیں اُس کے ساتھ واقع ہو رہی ہیں۔ وہ خود تو کچھ نہیں کر رہا۔ مگر اُس کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ جیسے خالی گلاس ہاتھ سے غائب ہوا اور بھرا ہوا آ گیا...... اُسے پہلے سے۔ ہاں پہلے سے ہی اُسے چاہیے تھا کہ اُس ذلیل آدمی کے ساتھ پنگے نہ لیتا۔ یہ لفظ پنگا بھی عجیب ہے۔ آج تک کوئی اُسے اس کا مطلب...... نہیں بلکہ اس کی اصل نہیں سمجھا سکا تھا۔ پنگا لیا جاتا ہے۔ دیا نہیں جاتا۔ اب یہ دیکھو ذرا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں سرے سے اسے منہ ہی نہ لگاتا۔ خاص طور پر اس محفل میں تو بالکل بھی نہیں۔ مگر اس خیال نے پاگل کر دیا کہ یہ حرامی اس......Exclusive محفل میں آ کیسے گیا ۔گورے کے ساتھ آیا اب...... چ...... اب ضرور کوئی بات کرنے والا ہے میرے بارے میں۔ دیکھ...... دیکھ بولا...... بولا کچھ...... نہیں ٹلے گا۔ مجھے ہی ٹل جانا چاہیے۔ اس بات پر۔ یہاں اپنے لوگوں میں۔ ایسا لوگ"۔ اور نجم الثاقب نے بھرا ہوا گلاس پھر منہ سے لگا لیا۔

نجم الثاقب کے اندر دیر تک جلتا بجھتا وقت کا ٹکڑا کبیر کی آنکھوں کی چند جھلکیوں اور ایک آدھ مسکراہٹ جتنا تھا۔ اُس نے عصری ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کے منہ میں ٹکے گلاس اور گلاس میں ترچھے ہموار ہوئے سنہرے سیال سے اپنی نظریں ہٹائیں اور میرِ محفل، (اُس وقت عطائی کے لیے کبیر کے اندر یہی دو الفاظ تھے) یاور عطائی کی طرف دیکھا جو ابھی تک کبیر سے اُس سوال کے

Scanned by CamScanner

جواب کا منتظر تھا کہ کیسے مہلک فیصلے؟''

''ایسا ہی مہلک فیصلہ میرے باس ملک کے مؤقر مجلے عصری ڈائجسٹ کے مالک اور مدیر جناب نجم الثاقب نے کیا تھا'' کبیر نے کہا۔

عطائی نے حیرت سے نجم الثاقب کی طرف دیکھا پھر کبیر کی طرف ''کیا واقعی؟'' اس نے کہا ''نجم الثاقب صاحب...... آپ کے باس ہیں...... بہت خوب......''۔

''جی ہاں میں ان کا ادنیٰ سا ملازم ہوں۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں، فیچر رائیٹر ہوں میں ان کے رسالے کے لیے ایسا مواد مہیا کرتا ہوں جس سے قارئین صحت مند چسکا لیتے ہیں''۔

زہرہ نے سوچا ''صحت مند چسکا کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہاں یہ...... میرا مطلب ہے...... یہ ٹھیک ہے مسٹر کبیر میرے لیے کام کرتا ہے۔ ترجے وغیرہ......'' نجم الثاقب نے بُھر بھرے لہجے میں کہا۔ گفتگو انگریزی میں تھی۔

''جی بالکل'' کبیر نے نیازمندی سے کہا ''ترجے...... اور؟ یہیں میری انگریزی آتی ہے۔ ایڈیٹر صاحب ملازمت کے لیے میرے انٹرویو میں میری انگریزی بولنے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جعلی انگریزی بولنے کی صلاحیت سے ہی متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ملازم رکھا اور آج تک پچھتا رہے ہیں''۔

''مگر اس میں پچھتانے کی کیا بات ہے'' ہاف مین نے کہا ''معزز ایڈیٹر جب چاہیں تم جیسے بے کار آدمی کو ٹھوکر مار کر باہر پھینک سکتے ہیں اور ایسا کرنا شاید اُن کے لیے بے حد آسان اور بے حد فائدہ مند بھی ہوگا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر؟'' پیشتر اس کے کہ نجم الثاقب کبیر کے بارے میں کسی بات کا کوئی جواب دینے کی کوشش کرتا نواب ثریا جاہ نادر جنگ اچانک بلند آواز سے بول پڑا۔

''ہاف مین تم غلام باغ کا معمہ کب چھاپ رہے ہو''۔

''آہ......'' کبیر نے حلق سے زوردار آواز نکالی۔ ''نواب صاحب گفتگو کا موضوع بدلنا چاہتے ہیں۔ آیئے کوئی اور بات کریں بلکہ آیئے غلام باغ کے بارے میں ہی بات کریں۔''

عطائی ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا رہا۔ کبیر نے نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھا مگر فوراً ہی یہ پہچان کر کہ یہ بناوٹی ہے نواب کا کھسیانا پن قہر آلود ہوگیا۔

Scanned by CamScanner

ہاف مین اپنی جگہ مزے میں تھا۔ نجم الثاقب کے دھندلے نشہ زدہ شعور کی سطح پر کہیں دماغ کے نیچے سے اُٹھ اُٹھ کر آنے والی گندی گالیاں (کبیر کے لیے) پھٹ رہی تھیں۔ جیسے کسی جوہڑ کی سطح پر تہہ سے اُٹھ کر آنے والے بلبلے پھٹتے ہیں۔

زہرہ نے سوچا کہ ایسی آسودہ لطف اندوزی سے ہنستے ہوئے اُس نے اپنے باپ کو شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔

''آپ کا کیا خیال ہے یاور عطائی صاحب'' کبیر نے کہا ''غلام باغ میں جنم کھنڈر کے نیچے تہہ خانے میں جو کمرہ ہے وہاں کبھی انسانی قربانی دی جاتی تھی؟ ویسے میں عرض کرتا چلوں کہ میں انسانی قربانی کا مخالف نہیں ہوں۔ میرے خیال میں ہر دور میں کچھ لوگ انسانی قربانی کے لائق ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں اُن کی قربانی جائز ہوتی ہے۔''

''یقیناً۔'' ہاف مین نے سنجیدگی سے کہا ''اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہیں آج کے دور میں تمہارا یہ حق کون اور کب دلوائے گا''۔

عطائی نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا ''دراصل میری معلومات بہت محدود ہیں ان موضوعات کے بارے میں آپ اصحاب یقیناً زیادہ جانتے ہوں گے۔ مگر موضوع بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں چاہوں گا آپ اپنی وہ بات جاری رکھیں کہ نجم الثاقب صاحب نے آپ کو ملازم رکھ کر کوئی غلطی کی۔ وہ جو آپ نے کہا مہلک فیصلہ کیا۔ میرا خیال ہے نواب ثریا جاہ نادر جنگ صاحب یہ موضوع بدلنے کا تقاضا نہیں کریں گے''۔

''مگر میں کروں گا۔ ضرور کرونگا۔'' اچانک نجم الثاقب غرایا۔

عطائی نے عجیب سی فہمائشی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور نجم الثاقب نے جیسے پوری قوت سے اپنے آپ کو وہیں روک لیا۔

زہرہ نے محسوس کیا کہ سامنے ڈرائینگ روم سے آتی مردوں کی بو میں ایک ایسے سینگوں والے بکرے کی کھال کی بو بھی شامل ہوگئی ہے۔ جس کا گوشت بھی بدبودار ہوتا ہے جسے ایک بار انہوں نے قربانی کے بعد سارا ہی غریبوں میں بانٹ دیا تھا۔

''میں مختصراً عرض کرتا ہوں وہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔'' کبیر نے جلدی سے کہنا شروع کیا ''وہ اصل میں میری اپنی خامی۔ کوتاہی۔ عیب کچھ کہہ لیں، کے بارے میں ہے ایڈیٹر صاحب کا

Scanned by CamScanner

اُس میں کچھ قصور نہیں۔ میں دراصل ایک Mercenary Writer ہوں جیسے کرائے کے قاتل ہوتے ہیں۔ ویسے ہی میں ایک کرائے کا رائیٹر ہوں۔ مجھ سے کچھ بھی لکھوایا جا سکتا ہے۔ میں نے جب حساس۔ نازک ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر عصری ڈائجسٹ کی پالیسی کے عین مطابق مدلل اور جامع انداز میں لکھنا شروع کیا تو ایڈیٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ مگر یہ خوشی عارضی تھی جب ان پر انکشاف ہوا کہ میں انہیں نازک اور حساس معاملات پر عصری ڈائجسٹ کی پالیسی کے بالکل مخالف نقطۂ نظر سے بھی لکھتا ہوں۔ تو یہ...... وہ کیا کہتے ہیں ورطۂ حیرت میں یا شاید سناٹے میں آ گئے۔ سر میں غلط تو نہیں کہہ رہا'' کبیر نے نجم الثاقب سے پوچھا اور نجم الثاقب کی باطنی دنیا کے اسرار و رموز کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا اُس وقت کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔

''شاید یہی بہترین موقعہ تھا کہ ایڈیٹر صاحب آپ کو فارغ کر دیتے'' عطائی نے کبیر کے بیان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''Exactly انہیں ایسا کرنے کا پورا حق پہنچتا تھا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے گالیاں دیں دھمکیاں دیں۔ ذلیل کیا۔ مگر 'عصری' کی خدمت سے محروم نہیں کیا میری ملازمت اللہ کے فضل سے ابھی تک قائم ہے دراصل ہوا یہ تھا کہ......'' کبیر بولتے بولتے رُک گیا اور اس طرح چونک کر وہ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا جیسے اُس نے مونگ پھلیوں اور چلغوزوں کے درمیان چُھپا ہوا کوئی ہیرا دیکھ لیا ہو۔

ڈرامائی وقفے میں ہاف مین نے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا اور Hash کی خاموش آرزو کی۔ اس کی آنکھوں میں ویسی ہی چمک تھی جیسی تھیٹر کے تماشائیوں کی آنکھوں میں کسی بڑے اداکار کی لاجواب اداکاری دیکھ کر لہرا جاتی ہے۔ دھوئیں کو چند نادر لمحوں کے لیے پھیپھڑوں میں بسائے رکھنے کے بعد اُس نے اُسے تنہا چھوڑ دیا اور منتظر نظروں سے کبیر کو دیکھنے لگا۔ کبیر نے گہرے استغراق کے عالم میں ڈرائی فروٹ کی پلیٹ کو کچھ دیر تک گھورنے کے بعد بالآخر ایک بادام اٹھایا اور متفکر نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے منہ میں ڈال لیا پھر منہ چلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''دراصل ہوا یہ کہ ایک بے ضمیر ایمان فروش مصنف کا میرا گھناؤنا روپ سامنے آنے سے پہلے ہی میں 'عصری ڈائجسٹ' کے ایسے کثیر التعداد قارئین کے دل و دماغ میں گھر کر چکا تھا جو اس مؤقر مجلّے کو کسی سیاسی، ایمانی، اخلاقی یا روحانی سربلندی کے حصول کے لیے نہیں پڑھتے بلکہ وقت

Scanned by CamScanner

گزارنے کے لیے، مجھے یہ مقامی لفظ بولنے کی اجازت دیں اگر آپ تو...... محض تھوڑا سا 'چس'
لینے کے لیے پڑھتے ہیں اور یہ چس، چسکا، چیزا...... جو بھی ہم بولیں...... سنسنی خیز مواد سے ملتا
ہے۔ چونکہ ان بیچاروں کی 'عصری۔ کے بغیر۔ زندگی' میں کوئی سنسنی نہیں ہوتی اس لیے جب
رسالے کے عنوانات کا صفحہ دیکھ کر یعنی شکاریات۔ جرم وسزا۔ پُر اسرار واقعات۔ جنگِ عظیم۔ فرار
کی داستانیں۔ پیرا سایکالوجی وغیرہ وغیرہ موضوعات میں جب انہیں بھیانک، ہولناک،
ہیبتناک، رونگٹے کھڑے کر دینے والے لمحات کی نوید دکھائی دیتی ہے، سنائی دیتی ہے تو وہ یہ پرچہ
خرید لیتے ہیں اور یوں آئندہ چند دنوں کے لیے ان کی 'عصری۔ کے۔ ساتھ۔ زندگی' اُن کی عام
روز مرہ کی...... مجھے مقامی زبان کا لفظ استعمال کرنے کی اگر اجازت دیں آپ تو...... چوتیا زندگی
سے کچھ ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لیے مختلف ہو جاتی ہے۔"

"او...... ہو پھر تو یہ رسالہ پڑھنا چاہیے۔ افسوس میں آج تک محروم ہی رہا" عطائی نے ایک
نظر نجم الثاقب پر ڈالتے ہوئے کہا۔ جس نے لمحہ بھر پہلے ہی ایک اور غیر خالی گلاس اپنے دائیں
ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے رکھنے کی کوشش شروع کی تھی۔

اُدھر ہاف مین نے سوچا یہ کیسی مقامی زبان ہے جس کا ہر اہم لفظ 'چ' کی آواز سے شروع
ہوتا ہے اور جن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے سوچا کہ اب تو اُسے اس گندی زبان پر احتجاج کرنا چاہیے مگر
اس نے کچھ نہ کہا۔ گندی زبان بولنے والے کو تو وہ خود لایا تھا۔ دوست کا دوست۔ لعنت ہو۔

اور اسی لمحے زہرہ نے اپنے پورے جسم میں گہری بھاری تھکن محسوس کی اور سوچا کہ پتہ نہیں
وہ کب تک بکواس کرتا رہے گا۔ وہ کچھ آرام کرے گی۔ مگر اب وہ واپس ہی کیوں نہیں چلی جاتی۔
کیا جو کچھ وہ دیکھ چکی ہے۔ سُن چکی ہے وہ کافی نہیں۔ مگر زہرہ واپس نہ گئی۔ وہ عنابی پردوں سے
پیچھے ہٹ کر کبھی مسولینی کے زیرِ استعمال رہنے والے اطالوی صوفے کی طرف بڑھی۔ باغ کی
طرف کے ادھ کھلے دروازے میں سے اکتوبر کا پچھلی رات کا ٹھنڈا چاند نظر آ رہا تھا۔ زہرہ صوفے
پر بیٹھی پھر اس نے اپنی ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر رکھیں اور لمبا لیٹتے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر
بھولی بے خبری سے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں کہ پھر وہ کبھی نہ جان پائی کہ کیسے آخر اس رات وہ
اچانک گہری نیند میں اتر گئی تھی۔ زہرہ اپنی اس بے خبری پر مدتوں پچھتاتی رہی۔

ڈرائینگ روم میں ایک طرف بیٹھے بیوروکریٹ، ادیب، تاجر، اور مولوی، کے چوکھٹے میں سے ایڈیشنل سیکرٹری نے بے چینی سے سوچا "یہ عطائی آج کس قسم کے لوگوں کے ساتھ محو ہے۔ مجھے اُس سرخ تیل کی سخت ضرورت ہے جسے یہ طلائے، پتہ نہیں کیا بکواس، کہتے ہیں۔ مگر چند قطرے ہی آگ لگا دیتے ہیں مگر یہ تو موقع ہی نہیں دے رہا عطائی بات کا۔ اُدھر میرا جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ مائی گاڈ ایک تو بج گیا۔" اُس نے پاس سے گزرتے سمگلر سے اپنا دکھڑا کہا۔ امبر جان ہنسا "میں نے بھی کچھ لے کر جانا ہے۔ جنابِ والا۔ مگر مجھے تو آگ لگانے والا نہیں کچھ آگ بجھانے والا چاہیے۔ کچھ بند باندھنے والا چاہیے۔ جنابِ والا۔ اپنا تو مسئلہ بس یہی ہے۔ کہیں آگے جانے سے پہلے ہی ایک ذلیل فوارہ سا چھوٹ نکلتا ہے۔ سینئر بیوروکریٹ 'ذلیل فوارہ' پر خوب ہنسا مگر پھر اپنی اندر کی ذاتی تشویش سے یک دم چُپ ہو گیا اگر عطائی سے آج وہ Potion نہ ملا تو میرے لیے تو کسی بھی قسم کا کوئی امکان نہیں"۔

"دیکھتا ہوں" امبر جان نے کہا۔ "مگر وہ انگریزی میں بکواس کر رہے ہیں۔ نواب جگر بند۔ نہیں کیا تھا ثریا جاہ جنگ۔ لعنت ہو خیر جو بھی ہے۔ اُس کے مہمان ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں عطائی بڑا خوش نظر آ رہا ہے۔ پہلے تو میں بھی ڈر گیا تھا جناب کہ کہیں نارکوٹکس کی انٹیلی جینس والوں کے نہ ہوں مگر پھر پتہ چلا عطائی نے بتایا کہ گورا تو آرکالوکائیٹ ہے اور دوسرا اُس کا دوست ہے"۔

"آرکالوکائیٹ؟ یہ کیا بلا ہے" ناآسودہ بیوروکریٹ نے پوچھا۔

"یار وہ جو پرانے مکان نہیں اکھاڑتے پھرتے"۔ سمگلر نے کہا۔

سینئر بیوروکریٹ پھر خوب ہنسا اور ایک بار پھر اپنی ہنسی پر خود ہی جھنجلا گیا۔ اُس نے بیرے کے ٹرے سے روسی نسل کا ایک مشروب اٹھایا اور حسرت سے یاور عطائی اور اس کے ساتھ محوِ گفتگو لوگوں کو دیکھا اور امبر جان انہیں کی طرف بڑھ گیا۔

منشیات کا سمگلر جب عطائی، آرکیالوجسٹ، نواب، ایڈیٹر، اور کرائے کے مصنف کی پنچم میں شامل ہوا تو کبیر کہہ رہا تھا۔

"دراصل جناب بات صرف اتنی ہے کہ یہ خاکسار اپنے قلم کا پیشہ کرتا ہے۔ میرا کوئی ضمیر نہیں اور نہ ہی میں کسی کومٹمینٹ کی عیاشی کرتا ہوں۔ مگر میں صرف سچا پروفیشنل بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے بھی سُنا ہے میرا اپنا کوئی تجربہ تو نہیں...... کہ ایک کامیاب طوائف جائز عورت سے

Scanned by CamScanner

زیادہ مزہ دیتی ہے"۔

امبر جان نے بے ساختہ قہقہے سے داد دی "واہ یار آپ تو اپنی لائن کے لگتے ہو۔" اُس نے کہا۔ طوائف کا انگریزی مترادف سمجھ جانے کے بعد وہ پوری طرح گفتگو میں شامل ہو گیا۔ میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کیا۔

"ایسا ہی ایک پروفیشنل ہونے کی وجہ سے میں عصری ڈائجسٹ کے قارئین کو مزہ دیتا ہوں۔ کبھی شکاریات سے کبھی نازک سیاسی مسائل کے نجم الثاقب مکتبہ فکر کے تجزیے سے۔ کبھی ایمان افروز حکایات سے۔ کبھی دار چینی کے محیر العقول طبی خواص کے بیان سے۔ کبھی دوسری جنگ عظیم سے فرار کی داستان سے مزہ۔ میں تو مزہ دیتا ہوں وہ تو میرے لکھنے اور معزز قارئین کے کچھ پڑھنے کے آسن بدلتے رہتے ہیں۔ عطائی صاحب۔"

"ایک گہرا سایہ عطائی کے چہرے پر سے گزر گیا۔ اُس نے کچھ نہ کہا۔

"آہ..... آسن۔ کاما سوترا"۔ ہاف مین نے چہک کر کہا۔

"تو سر میری وجہ سے عصری کا مزہ لینے والے گاہکوں میں کمی نہیں آنے پاتی۔ کم از کم ابھی تک تو ایسی ہی صورت حال ہے۔ تو میرے پیارے باس دل و جان سے مجھ سے نفرت کرنے کے باوجود پیشے کے لیے مجھے قیمتی سمجھتے ہیں۔ میں تو کرتا ہی پیشہ ہوں اور عصری ڈائجسٹ کو ہر آسن میں دستیاب کراتا رہتا ہوں۔ میں ورائٹی کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ کل ہی میں نے میڈیکل ہسٹری کی ایک کتاب سے عصری کے لیے ایک مضمون تیار کیا ہے کہ "پیچش، دست اور قے کے بارے میں قدیم مصریوں کے نظریات اور طریقِ علاج کیا تھے......."

نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے سوچا کہ شاید اب اس بات کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ گئی کہ وہ ایک بن بلائے مہمان کو عطائی کی محفل میں لانے کی بدتہذیبی کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ عطائی خود ان لوگوں سے اور خاص طور پر اس لوفر سے بکواس کے ساتھ حد سے بڑھ رہا ہے۔

"قدیم مصریوں کے نظریات۔ پیچش دست اور قے کے بارے میں۔ دلچسپ موضوع ہے"۔ ہاف مین نے جان بوجھ کر متلی پیدا کرنے والے الفاظ کو دہرایا اور کبیر نے اُس کی تقلید کی۔

"ہاں پیچش دست اور متعفن قے" اُس نے کہا اور پھر اور کچھ نہ کہہ سکا۔ نجم الثاقب کا چہرہ یکدم انتہائی کریہہ المنظر ہو گیا تھا کبیر نے وہ چہرہ دیکھا اور وقت اُس کے لیے اُسی پر تھم گیا.....

Scanned by CamScanner

وہ بدترین قے آنے سے لمحہ بھر پہلے کے چہرے کی منجمد تصویر تھی۔ جب کوئی شخص اُس سب کچھ کو جو اُس کے اندر سے باہر آنے کو زور مارتا ہے سمیٹے رکھنے سے عاجز آ جاتا ہے اور ابھی یہ جان بھی نہیں پاتا کہ وہ عاجز آ چکا ہے، ہار چکا ہے، کہ پھٹ پڑنے والی بربادی اُسے اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔

قے کے واقعات یاور عطائی کی خصوصی محفل کا معمول ہرگز نہ تھے لیکن اس طرح کے کسی واقعے سے نمٹنے کا پہلا سنہری اصول یہی سمجھا جاتا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یوں بھی اکثر لوگ ڈرائینگ روم کے دوسرے کونے میں بنے باتھ روم تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو ہی جاتے تھے مگر کسی کی شاذ و نادر ناکامی کی صورت میں بھی ایسے لمحوں کے ادب و آداب سے بخوبی واقف محفل کے لوگ غیر محسوس انداز میں اُس جگہ سے اپنا فاصلہ بنا لیتے تھے اور پھر اُس جگہ پہنچ کر رنگو بھائی اپنا ماہرانہ کام شروع کر دیتا تھا۔

رنگو بھائی بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ بھری محفل میں سے اُلٹی کا مواد یک دم غائب کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ یوں بھی صاحب لوگ جب اُس جگہ سے دور ہٹ جاتے ہیں تو اُسے بھول جاتے ہیں۔ پھر جتنی دیر بھی محفل میں رہتے ہیں اُس جگہ نہیں آتے ادھر دیکھتے بھی نہیں جیسے وہ اس جگہ کے لیے اندھے ہو گئے ہوں اور بڑے لوگوں کی یہی بڑائی تھی جس پر رنگو بھائی قربان ہو جاتا تھا اور یہ بڑائی اُس نے انگریزوں میں بہت دیکھی تھی۔ وہ سولہ سال کا تھا جب اُس نے انگریزوں کے کنگ جارج کلب کے بار روم میں ملازمت شروع کی تھی اور آج بڑھاپے میں بھی وہی کام کر رہا تھا۔ اُلٹی یک دم غائب نہیں کی جا سکتی تھی مگر ایسے موقعوں پر اُس کے کرنے کا کام یہ تھا کہ صاحب لوگ اُس جگہ سے نظریں تو خود بچا لیں گے مگر اُن کی ناکیں بھی بچائی جائیں یہی کرنے کا پہلا کام ہے اور اس مقصد کے لیے رنگو بھائی نے ڈرائنگ روم کے پہلے کونے میں گہرے تاریک رنگوں کے بھاری پردے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔

امبر جان نے بظاہر کافی کراہیت کے ساتھ مگر پوری شدت سے ٹکٹکی باندھ کر اس جگہ کی طرف دیکھا جہاں نجم الثاقب اپنی اُگلتی بے بسی کے سامنے بار بار ہتھیار ڈال رہا تھا اور متواتر ادھر ہی دیکھتا رہا۔ جب رنگو بھائی بھاری گہرے سبز پردے اُٹھائے اُس کے پاس سے گزرا تو اس نے دل ہی دل میں امبر جان کو نفرت سے رد کیا۔ وہ امبر جان کو بڑا آدمی نہیں مانتا تھا۔ رنگو بھائی کے

Scanned by CamScanner

دنیا میں بڑا آدمی دوسرے بڑے آدمی کی قے کو اتنی صفائی سے بھول سکتا ہے کہ جیسے وہ کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔ ”مگر اس فریبی کو دیکھو۔“ اُس نے جی میں سوچا ”کیسی بے حیائی سے اُدھر ہی دیکھ رہا ہے۔ اب یہ مجھے اپنا کام کرتے بھی دیکھے گا۔“ اور ابھی یہ اندیشے اُس معاملہ فہم بوڑھے کے دل میں ہی تھے کہ امبر جان اُسے کرختگی سے مخاطب کر کے بولا۔

”اب صاف کرے گا اسے؟“

”رنگو بھائی نے دل میں اُسے گندی گالی دی مگر باہر سے اپنی خدمتگاری کے پورے رچاؤ کے ساتھ بولا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا صاحب۔ آپ صاحب...... ذرا...... اُدھر...... صاحب“۔

”ہاں...... اُدھر“۔ امبر جان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ڈرائنگ روم کے اُس کونے کو بڑھنے لگا۔ جہاں کبیر، گورا، عطائی اور نواب کھڑے تھے اور پھر انہیں کی طرف جانے کو تھا کہ یک دم ایک بے چین سا خیال اُس کے اندر سے گزر گیا۔ ”اب رسالے والے ہمارے یار کو اُس شخص نے اُلٹی کرائی ہے اپنی باتوں سے۔ جو گورے کے ساتھ آیا ہے۔ یہ کوئی عجیب قسم کا حرامی پلا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا“۔ پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ ابھی وہ عطائی کے پاس جانے کی بجائے اس بزنس مین اور اُس کے ساتھ پستہ کھاتے سرکاری افسر اور سگریٹ پیتے سیاستدان کے گروپ کے پاس جاتا ہے جن میں سے وہ بزنس مین کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ پچھلے سال ہی اُن دونوں نے بینکاک میں پندرہ پندرہ سال کی دو تھائی لڑکیوں کو کرائے پر لیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ منڈاک کے بیچ ہوٹل میں وہ تین دن تک اُن کا تھائی سوپ بنائیں گے اور اس بات پر وہ پاگلوں کی طرح ہنسے تھے اور اُن تین دنوں میں ایک دن ایسا بھی آیا تھا کہ امبر جان ایک بار بھی سرعتِ انزال کا شکار نہیں ہوا تھا اور اس معجزے کو اُس نے شیر کی چربی سے بنے ایک معجون کے سر باندھا تھا اور یہ بھی سوچا تھا کہ اب جب بھی وہ یا ور عطائی سے ملے گا تو اُسے بتائے گا کہ دنیا میں صرف وہی ایک مجت کی مرضوں کا حکیم نہیں ہے اور بھی ہیں۔ مگر پھر بھول گیا تھا عطائی سے یہ بات اُس نے آج تک نہ کی تھی مگر اب جبکہ اس سے دو گز کے فاصلے پر نجم الثاقب چھوٹے چھوٹے وقفوں سے اُلٹیاں کر رہا تھا عطائی کے دو ملازم اُسے اُٹھا کر باتھ روم کی طرف لے جانا چاہتے تھے اور ایک ملازم ہاتھ میں لیے کپڑا گند صاف کرنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ بات یاد آ گئی اور اُس نے فیصلہ کیا کہ آج اگر

موقعہ ملا تو عطائی سے کہہ ہی دے گا کہ شیر کی چربی بھی بڑی فٹ بیٹھتی ہے۔ مگر ابھی تو عطائی پھر
انہیں، ب۔ج۔ کے ساتھ انگریزی میں بکواس کر رہا ہے اور پی رہا ہے اور عطائی آج کیسے پی رہا
ہے۔ امبر جان جیسے موٹے ذہن والے کو بھی حیرت ہوئی وہ تو بڑا سونگھ سونگھ کر پیتا ہے اور کہا کرتا
ہے کہ میرا کام پلانا ہے پینا نہیں۔ آج اُسے کیا ہوا ہے پھر اُس نے سوچا کہ ابھی وہ اپنے بزنس مین
کے پاس ہی جائے گا جو اب اپنے چھوٹے سے گروپ کے ساتھ ڈرائینگ روم کے پچھلے حصے کی
طرف سمٹ گیا ہے اور اُسے بتائے گا کہ کیا اُسے تھائی سوپ یاد ہے۔

رنگو بھائی نے اب گہری تشویش سے اُس بھبھرے چہرے والے بدمعاش کو دیکھا کہ وہ اس
جگہ سے ٹل ہی نہیں رہا تھا۔ خالد اور نعیم دونوں ملازم بالآخر نجم الثاقب کو سہارا دے کر باتھ روم کی
طرف لے جانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اب اُسے پردے ڈالنے کا کام شروع کرنا تھا۔ مگر یہ
ٹلے بھی تو......"۔

"صاحب......آپ......ذرا......اُدھر......" رنگو بھائی نے ایک بار پھر امبر جان سے کہا اور
پھر زبردست اعتماد سے بولا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ صاحب۔" گو اس اعتماد میں صاحب کو بھی
ٹھیک کرنے کی خواہش شامل تھی مگر رنگو بھائی کی اپنے پیشے کے اس خصوصی شعبے کی مہارت کامل
تھی۔ آج تک کبھی کسی نے اُس سے اس نازک موضوع پر بات ہی نہ کی تھی۔ لیکن اگر کوئی اُسے
پوچھتا تو وہ اُسے بتاتا کہ اُس نے تو کرنل ہارڈنگ کی قے کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ جس نے کلب کے
آدھے فرش کو بھر دیا تھا اور جس میں اُسے سور کے ناپاک گوشت کے ریشے لیس دار مواد میں تیرتے
صاف نظر آ رہے تھے۔ مگر وہ ذرا بھی نہ گھبرایا تھا۔ اُس نے تو خواجہ بارک اللہ کی۔ جو سب کہتے ہیں
کہ عظیم مذہبی آدمی تھا اور ابھی پچھلے سال ہی مرا تھا۔ یہیں اسی ڈرائینگ روم میں اُلٹی کا فوارہ جو
اُس کی زبردست توند کو بالکل خالی کر گیا تھا، کو پوری خوبصورتی سے غائب کر دیا تھا اور پھر پچاس
سال پہلے لیڈی میکنفائر کی اُلٹی جس میں خون بھی شامل تھا۔ وہ السر کی مریض تھی۔ اب وہ کیا کیا
بتائے کبھی کوئی پوچھے بھی تو......مگر ایسے موقعوں پر وہ اور کچھ نہیں چاہتا تھا۔ بس اتنا چاہتا تھا کہ
بڑے لوگ ایسے بن جائیں جیسے وہ۔ رنگو بھائی، اور اس کا کام۔ جیسے وہاں کچھ ہے ہی نہیں......اور
وہ بڑے لوگ بھی اُس کے لیے ایسے ہی ہو جائیں گے جیسے وہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ رنگو بھائی نے
پہلا پردہ دُہرا کر کے ایسی چابکدستی سے پھیلا کر اس جگہ پر نیچے گرایا کہ وہ جگہ یک دم سے وہاں

بن گئی۔ رنگو بھائی کو ہمیشہ اپنے اس پہلے قدم کی کامیابی پر گہرا اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

کبیر نے بوڑھے ملازم کو متعفن غلاظت پر پردے ڈالتے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر عقیدت کی حدوں کو چھوتے تعریفی جذبات اُس کے سینے میں اُس بظاہر سب کے لیے قابلِ رحم شخصیت کے لیے اُمڈ آئے۔ اُس پر گویا پہلی دفعہ یہ انکشاف ہوا کہ دنیا کا ارذل ترین کام بھی افضل ترین خلوصِ نیت اور مہارت سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ شخص تکلیف دہ خاموش اجتماعی کھنچاؤ کے اُن لمحات میں جنہیں کوئی بھی مہذب مہمان ماننے پر تیار نہ تھا اپنی نازک ذمہ داریوں سے نہ صرف پوری طرح آگاہ ہے بلکہ اُن کی ادائیگی کے لیے کمالِ فن کے اُس مقام پر پہنچنا چاہتا ہے جو صرف نابغۂ روزگار فنکاروں کے حصے میں آتا ہے۔ کبیر نے سوچا کہ اگر مصوری موسیقی، سنگ تراشی، سائنسی نظریہ سازی جیسے عظیم کاموں کو سرانجام دینے کا ایک نقطۂ عروج ہو سکتا ہے تو پھر پاخانہ صاف کرنے، اُلٹیاں ٹھکانے لگانے، گلی سڑی لاشیں دفنانے جیسے ذلیل کاموں کا بھی ایک کمالِ فن ہو سکتا ہے اور جب کبیر نے یہ سب کچھ سوچا تو پہلی دفعہ اُسے احساس ہوا کہ اپنی طرف سے اعتدال قائم رکھنے کی تمام کوششوں کے باوجود یاور عطائی کی محفل کے مشروبات شاید اُس پر بھی اثر انداز ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

"آپ کا یہ ملازم اپنے کام میں ماہر لگتا ہے"۔ کبیر نے عطائی سے کہا۔

عطائی نے ایک بار پھر نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا مہمان بن کر آنے والے اُس شخص کی طرف حیرت سے دیکھا اور بولا!

"آج تک یہاں میرے کسی مہمان نے میرے اس ملازم، اس کے کام اور اس کی مہارت پر بات نہیں کی"۔

ہاف مین نے فوراً ہی انہیں یاد دلایا کہ مقامی زبانوں کے استعمال کی وجہ سے وہ ایک بار پھر گفتگو کی تفہیم کے اپنے انسانی حقوق سے محروم ہو رہا ہے۔ کبیر نے بھی فوراً ہی اور بہت ہی میکانکی انداز میں اُسے انگریزی میں تازہ ترین موضوع سے باخبر کیا اور پھر اسی لسانی وسیلے میں عطائی سے اپنی بات کو جاری رکھا۔

"دراصل عطائی صاحب...... میرے اوپر بھی ابھی چند لمحے پہلے انکشاف کا ایک لمحہ گزرا ہے"۔ کبیر نے ایک دوستانہ رازداری سے کہا۔

Scanned by CamScanner

اور ہاف مین نے چونک کر فوراً ہی کوئی غلطی کیے بغیر کبیر کے عطائی سے اُس دوستانہ رازداری
کے انداز میں سے ایک 'بھکے پن' کو اپنے تجزیے کے لیے الگ کرلیا اور دل ہی دل میں اس امکان پر
بہت خوش ہوا کہ اگر یہاں اس خوفناک حد تک Surrealistic محفل میں کبیر (جسے اپنے عقلی انضباط
پر گو کہ کبھی مانتا نہیں، بہت غرور ہے) خود بھی میگزین کے ایڈیٹر کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ تو یہ ایک کمال کی
بات ہوگی اور بہت کچھ سامنے لائے گی۔ ایڈیٹر ابھی تک باتھ روم سے باہر نہیں آیا تھا۔ پھر ہاف مین
کے ذہن میں Dionysus اور Bacchus اور Orgies اور Frenzies اور Ecstasies جیسے یونانی
النسل الفاظ کی بوچھاڑ ہوئی۔ اُسے یونانِ قدیم کی اشرافیہ کے دیوتاؤں کے مقابلے کا شراب خور عوامی
دیوتا اور اُس کی رنگ رلیاں نظر آئیں۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر یاور عطائی کے ڈرائینگ روم میں خود یاور
عطائی کی بات سُن رہا تھا۔ جس کے بارے میں اُس کے ذہن نے فوری فیصلہ دیا کہ اس شخص کے
بارے میں یہ فیصلہ دینا بہت مشکل ہے کہ الکحل نے کس حد تک اس کے اعصابی نظام پر اثر ڈالا ہے
گو کہ آتشِ سیال نگلنے میں وہ دوسروں سے کچھ آگے ہی ہے۔ عطائی کہہ رہا تھا۔ "کہیں وہ ویسا ہی
انکشاف کا لمحہ تو نہیں ہے جناب جیسا کچھ دیر پہلے نجم الثاقب پر گزرا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ گزر
گیا ہے" یاور عطائی کی آنکھوں میں چمک اور لہجے میں شرارت تھی۔

ہاف مین اگر یاور عطائی کو اُتنے ہی عرصے سے جانتا ہوتا جتنے عرصے سے نواب ثریا جاہ نادر
جنگ اُسے جانتا تھا تو پھر عطائی کے لہجے کی اُس خلافِ معمول شرارت بازی سے بھی وہ بھانپ
جاتا کہ اُس شخص کے اعصابی نظام پر بھی الکحل کے اثرات کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ناممکن نہ
تھا۔ جب کوئی شخص اپنے روز مرہ کے جانے پہچانے مشفقانہ سرد معاملہ فہمی کے معمول میں ایک
کھلنڈرے سے چونچلے پن کو ہوا دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو مدتوں سے اُسے جاننے والوں کو
اُس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ بوجوہ اُس کا شعور کسی تبدیل
شدہ ذہنی منطقے کی طرف لپک جھپک شروع کر چکا ہے۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے لیے یہ مدتیں اُس مدت سے بھی کئی برس پہلے تک کی تھیں جو
مدت اُس کے معمر دولت مند دوست باقر علی کی بیٹی سے یاور عطائی کی شادی کی مدت تھی۔ وہ اگر یہ
دعویٰ کرتا کہ وہ یاور عطائی کو اُس کے ڈرائینگ روم کی 'تمام مرد' محفلوں کے بیشتر مصاحبین سے
بہتر جانتا ہے تو غلط نہ ہوتا۔ شاید اسی اعتماد کی بنا پر ہی وہ گورے اور اس کے مقامی ٹٹے کے بلے

Scanned by CamScanner

دوست کو اس محفل میں لے آیا تھا۔ مگر اب جبکہ وہ کُتے کا پلا اور وہ مردُود گورا اور یاور عطائی انگریزی میں بھونک رہے تھے اور کُتے کے پلے کی بکواس پر خاص طور پر یاور عطائی کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوتی تھی اور لہجے میں انوکھی شرارت دوڑ آتی تھی۔ تو نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو یقین ہو گیا کہ معاملہ کہیں بہت ہی عجیب اور نامعلوم سطح پر بہت ہی گڑبڑ ہو گیا ہے اور بات صرف ایک دو بن بلائے مہمانوں کو ساتھ لانے تک کی نہیں۔ ایسا کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا تھا۔ بلکہ اُن بن بلائی آفتوں کی وجہ سے اور اصل میں اُس 'کُتے کی نسل' کی وجہ سے اُس محفل کا نقشہ ہی کچھ اس طرح بدلنے والا ہے کہ جیسا ان محفلوں کی تاریخ میں کبھی نہ بدلا ہو گا۔ غلام باغ کے سابقہ مالک نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے پہلی دفعہ اپنے ان اندیشوں کی تصدیق کے لیے حاضرینِ محفل کا جائزہ لیا اور فوراً ہی اُسے احساس ہو گیا کہ سب کچھ معمول کے مطابق ہرگز نہیں تھا۔

معمول تو یہ تھا اور عرصے سے تھا کہ مہینے میں ایک بار کچھ لوگ گہری بے تکلفی کی فضا میں یہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ کھاتے پیتے تھے اور دنیا جہان کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے تھے اور خورد و نوش گو کہ ہر کسی کی اپنی اپنی ضرورت کے مطابق ہوتی تھی مگر بے اعتدالی پر کسی کی طبیعت بگڑ جانے کے واقعے کو بھی ایک بڑے معمول کا حصہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ "نجم الثاقب کی قے" کوئی ایسا تشویش ناک واقعہ نہ تھی مگر...... نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے سراسیمگی کے عالم میں دیکھا اور اندازہ لگایا کہ شاید یہاں تو اور بھی بہت سے دوست نجم الثاقب کی تقلید پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا اُس نے دیکھا کہ بہت سوں کی نظریں اُن چاروں پر جمی ہیں مشروبات کے گلاس اُن کے ہاتھوں میں ہیں اور چہروں پر نشے کے ڈھلکاؤ اور ذہنوں کے تناؤ کا ایسا ٹکراؤ جاری ہے جو کسی بھی وقت پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا راسخ عقیدہ تھا کہ آتشِ سیال کے اس نشے کی آسودگی اور کسی بھی طرح کے ذہنی دباؤ کا امتزاج ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا وہ حد پار ہونے پر بس منہ سے کچھ نہ کچھ نکل پڑتا ہے خواہ وہ نیچے پیٹ سے آنے والی قے ہو یا اوپر دماغ سے آنے والی کسی بھی طرح کی کوئی بکواس کوئی واہی تباہی ہو۔

مگر یہاں عطائی کے ڈرائینگ روم میں یہ حد شاید ہی کبھی پار ہوتی تھی اس لیے کہ معمول یہ تھا اور عرصے سے تھا کہ عطائی اپنی مشفقانہ سرد معاملہ فہم نفاست کے ساتھ دوست کے لیے اپنے خصوصی علم اور مہارت کے چند لمحے وقف کرتا تھا اور انہیں چند لمحوں میں دوست اپنے کسی "خصوصی

مسئلے''، اگر کوئی مسئلہ ہوتا، کا ذکر کرتا جس کا حل عطائی یا تو اُسی وقت تجویز کر دیتا یا پھر بعد کے لیے کوئی وقت طے کر لیا جاتا۔ یہ سب کچھ سیاست، مذہب، علوم وفنون، حکومت سازی، قانون، فلسفہ، آرٹ، سائنس، خارجہ امور، معاشیات، انقلاب، تاریخ، لا اینڈ آرڈر اور کرنٹ افیئرز کے ساتھ ساتھ اندر اندر چلتا رہتا ایک ایسی نازک پردہ داری سے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو مگر بھی جانتے بھی ہوں۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ یاور عطائی کی خصوصی مہارت کے علاوہ اُس کے مہمان داری کے اس فن کا بھی عاشق تھا مگر آج وہی یاور عطائی ایک بالکل غیر متعلق حرامزادے کے ساتھ بالکل کسی رذیل بکواس پر ایسے مزے لے رہا تھا جیسے اُس کے اس ڈرائینگ روم میں اُن دونوں کے علاوہ اور کوئی موجود ہی نہ رہا ہو۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ یہ بھی جانتا تھا کہ یاور عطائی خورد ونوش کے معاملے میں بھی اپنی مہمان داری کی حد کبھی عبور نہیں کرتا تھا مگر آج...... نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے ایک بار پھر ٹھنڈا سانس لینے کی کوشش کی۔ آج اُس حد کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اُدھر دوست جن میں سے بیشتر اپنی ملکی اور بعض تو بین الاقوامی سطح کی ذمہ داریوں کی وجہ سے انتہا عدیم الفرصت واقع ہوئے تھے۔ اپنے اُن چند انتہائی قیمتی لمحات میں یاور عطائی کی عدم توجہی کا شکار ہونے کی شدید بدمزگی میں مبتلا تھے اور اس صورتِ حال کے ذمہ دار اُس کسی اجنبی ذلیل آدمی کو تنفر آمیز حیرت سے دیکھتے تھے اور انتظار کے چند مزید لمحات کو قابلِ برداشت بنانے کے لیے قریب سے گزرتے کسی بیرے کی ٹرے سے ایک آدھ گلاس اور اُٹھا لیتے تھے اور ظلم عظیم یہ تھا کہ اس ساری ابتری کو پیدا کرنے والے شخص کو اس سور کے بچے کو، جواب عطائی کے کسی سوال کا جواب دینے کے لیے پر تول رہا تھا، یہاں لانے کا ذمہ دار وہ خود تھا۔

وہ سب ابھی تک ''نجم الثاقب کے اُلٹیاں کرنے۔ اُلٹیاں کرنے کے بعد باتھ روم چلے جانے اور ابھی تک باتھ روم سے واپس نہ آنے'' کے زمانے میں تھے اور اسی دور میں جبکہ کبیر عطائی کے اس استفسار کا موزوں جواب سوچ رہا تھا کہ وہ کس انکشاف کے لمحات کی بات کرتا ہے اور نواب ثریا جاہ نادر کے دماغ میں خائف کرنے والی ہزاروں سوچیں گزر کر اُسے متوحش کر گئی تھیں اور ملازموں نے یہ تسلی کرنے کے بعد کہ ایڈیٹر صاحب اب باتھ روم کے سنک میں مزید قے نہیں کرتا اور کلی کر کے واپس جانا چاہتا ہے۔ رنگو بھائی اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس ڈرائینگ روم کے اُس کونے میں پہنچا جہاں اُس عمارت کی تعمیر کے وقت سے بار بنا ہوا تھا۔ بار کے ملازم

Scanned by CamScanner

کریم بخش نے رنگو بھائی کو دیکھ کر شدید حیرت سے سوال کیا۔
"رنگو بھائی یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ پہلے تو بہت ہو تو تین پیٹیوں پر معاملہ خلاص ہو جاتا تھا مگر آج یہ آٹھویں ابھی کھولی ہے۔ آج تو صاحب لوگوں نے دریا بہا دیے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ سات سال تو ادھر مجھے بھی ہو گئے۔
"اور بیسواں میرا جا رہا ہے" رنگو بھائی نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ اُس نے بارٹینڈر کریم بخش کے استعجاب میں کوئی اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ جو ہو رہا تھا اور ہونے والا تھا اُس کے بارے میں اُس کی تاریخی قیاس آرائی کو سمجھنا کریم بخش جیسے موٹے دماغ والے کے بس کی بات نہ تھی......... رنگو بھائی کو یقین تھا کہ جب بھی کبھی کسی پرانے کلب کے دوستوں میں جو مدتوں کوئی گنڈا لے بغیر کچ کچ Drink پیتے ہیں اچانک بلانوشی کا دورہ پڑتا ہے۔ تو دراصل اس کی وجہ نکولائی زاگروف میلیانووچ پاسٹرناک کی بدروح ہوتی ہے۔ رنگو بھائی کو اس بدروح کا نام کرنل ہارڈنگ نے بتایا تھا جب ساتویں کلکتہ بریگیڈ کے دس افسر جو اعلیٰ نسل کے انگریز تھے، کوئی نامی وامی نہیں تھے ایک رات بُری طرح آؤٹ ہو گئے تھے اور گولیاں چلا کر انہوں نے کچھ دیسی سپاہیوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر دیے تھے۔ جو کچھ کرنل ہارڈنگ نے رنگو بھائی کو بتایا تھا اور جواب اُسے یاد آ رہا تھا اُس کے مطابق نکولائی زاگروف میلانووچ پاسٹرناک روس کا ایک بالشویک تھا جو بعد میں کیمونسٹ دہریے بنے۔ انقلاب لانے کے علاوہ وہ ووڈکا کے کئی کنستر پی جاتا تھا۔ زار کے سپاہیوں نے جب اُسے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کیا تو اُس سے دستور کے مطابق اُس کی آخری خواہش پوچھی گئی اُس نے کہا "میری آخری خواہشیں دو ہیں۔ پہلی انقلاب دوسری ووڈکا۔ پہلی تم پوری نہیں کر سکتے دوسری پوری کرو" کمانڈنگ آفیسر نے جو راشن کا حال اچھی طرح جانتا تھا کہا "نکولائی زاگروف میلیانووچ پاسٹرناک ہم تمہاری دوسری خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے کیونکہ ووڈکا کی سپلائی ختم ہو چکی ہے ہم تمہیں سگریٹ دے سکتے ہیں۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ سائبیریا جہاں یہ کام ہو رہا تھا دنیا کا ٹھنڈا ترین مقام تھا۔ اور کمانڈنگ افسر جانتا تھا کہ اُس کے سپاہی ووڈکا اور اُس کی ولولہ انگیز قیادت کے سہارے زار کی حکومت کو قائم رکھتے پھرتے ہیں۔ اُدھر اُسے انقلابی کی بلانوشی کا بھی علم تھا چنانچہ اُس نے کوئی رسک نہ لیا۔ مگر نکولائی زاگروف میلانووچ پاسٹرناک کمانڈنگ آفیسر کی سگریٹ کی آفرسُن کر ہنسا اور کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں زار

کی فوج ووڈ کا کے بغیر ایک سیکنڈ بھی حرکت نہیں کر سکتی۔ تم جھوٹ بولتے ہو مگر ایک بات سن لو میں دہریہ ہوں اور روح پر یقین نہیں رکھتا لیکن اگر کہیں میری روح ہوئی تو موت کے بعد میں شراب نوشوں کی محفلوں میں بدروح بن کر گھس جایا کروں گا اور اُن کے اوپر تباہی لایا کروں گا۔ اب گولی چلاؤ''۔ ظاہر ہے کمانڈنگ آفیسر نے گولی چلوادی مگر کرنل ہارڈنگ نے کہانی سنانے کے بعد یہ بھی کہا تھا اور رنگو بھائی کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کمانڈنگ آفیسر یقیناً کسی کتیا کا بچہ تھا۔ ایک بااصول، باغیرت، باکردار، دلیر اور اعلیٰ نسل کا کمانڈنگ آفیسر آخری خواہش کبھی رد نہیں کرتا بشرطیکہ اس کے اختیار میں ہو۔ کرنل ہارڈنگ نے رنگو بھائی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ دسویں بریگیڈ کے افسروں کی فائرنگ کے پیچھے نکولائی زاگروف میلیا نووچ پاسٹرناک کی روح کا ہاتھ ہو لیکن پھر بھی ان کا کورٹ مارشل ضرور ہوگا۔ کرنل ہارڈنگ اسی لیے کلب میں اجنبیوں کے داخلے کے سخت خلاف تھا کیونکہ روسی دہریے ووڈکا نوش کی بدروح اگر کہیں کسی کلب میں آسکتی تھی تو کسی اجنبی کے روپ میں ہی آسکتی تھی اور آج رنگو بھائی نے اپنے صاحب کے ڈرائینگ روم میں جو خیر کلب تو نہیں تھا مگر کئی طرح سے تھا بھی ..... کچھ اجنبی چہرے دیکھے تھے۔ جو یہاں ان بڑوں کی میٹنگ میں بہت کم ہی نظر آتے تھے۔ ان اجنبیوں میں سے ایک تو گورا ہی ہے اور روسی بھی گورے ہی ہوتے ہیں دوسرا کوئی مقامی کالا ہے مگر بدروح کا کیا ہے گوری بن کر آئے یا کالی۔ مگر کالا زیادہ خبیث لگتا ہے۔ اس لیے وہی نکولائی زاگروف میلیا نووچ پاسٹرناک کی بدروح ہوسکتا ہے............''

رنگو بھائی کے سال خوردہ ذہن میں جب یہ بھولی بسری یادیں لمحۂ حال کے خدشوں سے جڑی گزریں تو کریم بخش نے بیرے کے لیے مشروبات کی ایک اور ٹرے سجادی اور بیرا بظاہر اونگھتے ہوئے رنگو بھائی کو گہری نظروں سے دیکھتا ٹرے کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر متوازن کرتا ڈرائینگ روم میں نمودار ہوگیا۔

اور تب ڈرائینگ روم میں نکولائی زاگروف میلیا نووچ پاسٹرناک کی بدروح کبیر مہدی نے عطائی سے کہا اور ہاف مین کی سہولت کے لیے انگریزی میں ہی کہا۔ ''میرے اوپر یہ انکشاف ہوا ہے عطائی صاحب کہ دنیا کا گھٹیا ترین اور ذلیل ترین، مکروہ ترین کام بھی انتہائی اعلیٰ درجے کی فنکارانہ مہارت سے سرانجام دیا جاسکتا ہے''۔

''واہ...... واہ......'' ہاف مین نے سچی ستائش سے لبریز آوازیں اپنے منہ سے نکالیں اور

Scanned by CamScanner

پھر حیرت انگیز پھرتی سے پاس سے گزرتے بیرے کی ٹرے سے دو گلاس اُٹھا کر کبیر اور یاور عطائی کے خالی ہاتھوں میں تھما دیے پھر پہلے کے خالی گلاس اُن کے ہاتھوں سے لے کر واپس ٹرے پر اتار دیے اور پھر گویا ایک ہی ہموار حرکت میں دو مزید بھرے ہوئے اُٹھائے ایک اپنے لیے اور ایک نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے لیے۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے بُرا سا منہ بنایا جس پر عطائی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

''یہ تو کوئی گھٹیا کام نہیں۔ ذلیل کام نہیں، نواب صاحب۔ اعلیٰ کام ہے مگر ایک کام آپ نے آج رات بہت اعلیٰ کیا...... بہت اعلیٰ۔'' نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے کسی خاص تجسس کے بغیر پوچھا۔ ''کونسا اعلیٰ کام کیا ہے جناب، میں نے'' اور جی میں اُس نے اپنے آپ سے کہا ''کیا بکتا ہے سالا۔ چلو ایک بات تو ہے اس پتھر کو بھی آج پگھلتے دیکھ لیا۔''

جواباً یاور عطائی نے اپنی گہری دھند بھری آنکھیں کبیر کے چہرے پر جما دیں اور اُس کے ہونٹوں پر مکمل شانتی کی وہ مسکراہٹ پھیل گئی جسے دوسروں کے چہروں پر دیکھ کر نشے بازوں کے دل عقیدت سے بھر جاتے ہیں۔

''وہ یہ نواب صاحب کہ آپ آج رات اس شخص کو میرا مہمان بنا کر لے آئے..........''

عطائی نے کہا۔

''جی...... دراصل...... مسٹر ہاف مین خود بھی......'' نواب صاحب نے کچھ کہنا شروع کیا مگر ہاف مین نے جھنجلا کر اُس کی بات کاٹ دی ''کم آن مسٹر نواب جنگ...... مسٹر عطائی کبیر کی بات کر رہے ہیں''۔

نواب نے دل ہی دل میں کبیر اور اُس کی بات کرنے والے دونوں پر لعنت بھیجی اور کہا

''او...... میں سمجھا............''۔

''نہیں آپ نہیں سمجھے''۔ عطائی نے قہقہہ لگایا۔ ''آپ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ غلام باغ کی تاریخ۔ اس کی آرکیالوجی تو شاید سمجھتے ہوں۔ مگر نہیں...... وہ بھی یہ جرمن آرکیالوجسٹ بہتر سمجھتا ہوگا...... بہر حال ابھی تو آپ کچھ بھی نہیں سمجھے...... اس لیے کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکتے...... کیا آپ ذلت کی سچائی کو سمجھتے ہیں؟ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں جو اس شخص نے کہا کہ دنیا کا مکروہ ترین کام اعلیٰ درجے کی فنکارانہ مہارت سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔''

Scanned by CamScanner

نواب نے سوچا کہ اب اُس کے لیے بہتر ہوگا کہ کسی طرح چپکے سے کھسک ہی جائے یوں بھی اب صبح کے چار بجنے والے تھے۔ نواب نے کچھ نہ کہا اور پرانی رومن ہندسوں والی اپنی جیبی گھڑی کو جیب سے نکالنے کی ناکام کوشش کی۔

''یہ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو جانتا ہے کہ ذلت کی سچائی کا راز کیا ہے''۔ عطائی نے کہا اور اُس کی آواز میں کسی سانپ کی پھنکار جیسی تاثیر تھی۔

کبیر مہدی اُس وقت اپنی کیفیت کی سب بے یقینیوں کے باوجود وہ آواز سُن کر اندر تک دہل گیا۔ اُس نے اپنے روبرو کھڑے اس خوبرو بوڑھے کو تعجب سے دیکھا اور سوچا یہ میرے بارے میں کیا کہتا ہے میں کون سے راز کی سچائی جانتا ہوں۔ میں تو رذیل کام اور اُس نوکر کی اُلٹیاں..... نجم الثاقب......'' اور کبیر کے ذہن نے الارم دیا کہ معاملہ اُس کے ساتھ بھی گڑبڑ ہو رہا ہے۔ اُس کی ٹانگوں میں ایک ایسی بوجھل کیفیت یک دم سے بیدار ہوگئی جیسے اُس کی ہڈیاں اسفنج میں تبدیل ہو رہی ہوں اور اس احساس نے اُسے پریشان کرنے کی بجائے ہنسا دیا۔

''میں اور راز...... عطائی صاحب، ہر کسی کے راز ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے راز بڑے بڑے راز...... میرے راز آپ کے راز...... آپ تو جانتے ہیں'' کبیر نے قہقہہ لگایا۔

ہاف مین کے ذہن میں جو خیالات وقت کے اس مختصر سے وقفے میں کوند گئے جو کبیر کی بات اور عطائی کی بات کے درمیان تھا وہ ایک ہی موضوع کی الگ الگ شکلیں تھے اُس نے سوچا یہ تو میں جانتا تھا کہ جنوبی ایشیاء کے لوگوں کے جینز ایسے ہی ہیں کہ وہ الکحل سے گوری نسلوں کی نسبت زیادہ متاثر ہوتے ہیں مگر اس روٹین نشے کے بارے میں اُسے اپنے جرمن نظریات میں ترمیم کرنی چاہیے۔ پھر یہ بھی ہے کہ سوم رس کو چھوڑ کر ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ کیونکہ شراب بہر حال Dionysus کی دین ہے اور یونان کا روحانی تحفہ ہے۔ مگر یہ بکواس ہے قدیم مصری بھی تو شراب پیتے تھے۔ مگر قدیم مصری تو...... دست اور پیچش۔ مائی گاڈ مجھے اپنی ہنسی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہیے تو کیا میگزین ایڈیٹر باتھ روم میں مسلسل دست کر رہا ہے۔ جہنم میں جائے مجھے یہ سُنتا ہے یہ پُر اسرار شخص عطائی اب میرے پُر اسرار شخص کبیر سے کیا کہہ رہا ہے اور عطائی نے کہا ''میں پہلی نظر دیکھتے ہی تمہیں پہچان گیا تھا۔ تم اُن میں سے ہو جو ذلتوں سے عشق کرتے ہیں''۔

''کیوں'' کبیر کو ایسا ہی لگا کہ اُس کی بجائے کوئی اور بول رہا ہے۔

Scanned by CamScanner

''اس لیے کہ ذلتیں۔ نفرتوں کی آگ لگاتی ہیں اور آگ ہی زندگی ہے۔ آگ جو بھسم کرتی ہے جھلساتی ہے خاکستر کرتی ہے آگ جو اپنا ایندھن مانگتی ہے۔ آگ مسلسل اپنا ایندھن مانگتی ہے.......''

عطائی کی آواز اب اتنی بلند تھی کہ ان چاروں سے آگے تک بھی جاتی تھی۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو یقین ہو گیا کہ وہ منحوس عطائی کا بچہ عطائی بالآخر پاگل ہو گیا ہے۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب امبر جان نے فیصلہ کیا کہ اب کچھ بھی ہو وہ اس بڈھے عطائی کو بتائے گا کہ شیر کی چربی بھی زبردست اثر کرتی ہے اور سیکریٹری نے سوچا کہ لگتا ہے کہ آج عطائی کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے لیکن اب وہ جائے گا تو وہ عورت تو اب اُس کا انتظار کر کے جا چکی ہو گی مگر پھر بھی وہ عطائی کو زبردستی ان منحوسوں سے الگ کر کے سرخ Potion کے لیے کہے گا۔ امبر جان اٹھ کر تیزی سے اُس جگہ کے عین اوپر سے گزرا جہاں نجم الثاقب کی اُلٹیوں کے اوپر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے مگر اُس کی چال کی بے ربط بے سمت قوت نے اُس کا توازن بُری طرح بگاڑ دیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا تو اُس کا سر لوازمات کی میز سے ٹکرایا۔ گندی گالیوں کا ایک فوارہ اُس کے موٹے چہرے اور کُھلے منہ سے نکلا اور ڈرائنگ روم میں گولیوں کی بوچھاڑ کی طرح پھیل گیا۔

اسی وقت مؤقر جریدے عصری ڈائجسٹ کا ایڈیٹر اپنے معدے کی قے کی صفائی سے پوری طرح فارغ ہو کر اب اپنے دماغ کی قے کے ساتھ عطائی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے تعجب سے کان کھڑے کیے ''یہاں تو پہلے ہی کوئی گالیاں گاتا ہے''۔ وہ ہنسا ''گالیاں دیتا ہے'' پھر اُس نے تیر کی طرح اس کونے کا رُخ کیا جہاں یاور عطائی، کبیر مہدی، ہاف مین اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ کھڑے تھے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب زہرہ عنابی پردوں کے پیچھے ڈرائنگ روم کے کبھی استعمال نہ ہونے والے کونے میں اطالوی صوفے پر بے سدھ سوتی تھی اور ذلت و رسوائی کے خواب دیکھتی تھی۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(10)

اورجی (Orgy)

امبر جان نے جب اپنے سر کے اُس حصے کو چھُوا جو میز کے نکونے کونے سے پوری شدت سے ٹکرایا تھا تو انگلیوں کی چپچپاہٹ ہی اُسے فوراً خون کا پتہ دے گئی۔ پھر جب سُرخ چپچپاتے خون سے تر پوریں اُس کی آنکھوں کے سامنے آئیں تو وہ کسی زخمی درندے کی طرح ڈکرایا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی گالیوں میں مردانہ اور زنانہ جنسی اعضاء اپنی بھرپور مقامی شناختوں کے ساتھ ظاہر ہو گئے۔ اب اُن کا دائرہ کار پہلے سے زیادہ وسیع اور پُرتشدد تھا۔

نجم الثاقب نے امبر جان کے اُس اظہار کو اپنے کانوں میں گہرا وصول کیا اور اُس کے ایک ایک جز کو ذہن کے نامعلوم گوشوں میں پہنچ کر ایسی انوکھی لذت کی پھلجھڑیاں بکھیرتے محسوس کیا جیسی لذت اُس نے آج تک محسوس نہیں کی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ بچپن سے ہی اُس کے روائتی گھرانے میں گالیوں اور خاص طور پر اُن گالیوں کو جو گندی غلیظ فحش وغیرہ کہلاتی ہیں گناہِ عظیم سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا...... مگر اس وقت جبکہ اُس کا جسم سب کچھ اُگل کر پاک صاف ہو گیا تھا اور وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا امبر جان کی کراہ آمیز گالیاں اُس کے ذہن میں انتشار پیدا کر رہی تھیں۔ یہ ایک ایسا انتشار تھا جو جسم کے بعد اب اُس کی روح کو بھی سب کچھ اُگل ڈالنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔

نجم الثاقب ہنسا اور متعجب ہوا کہ کتنی مدتوں بعد وہ اس طرح کھل کر ہنسا ہے پھر اپنے اس تعجب کو انتہائی مضحکہ خیز جان کر وہ اور بھی شدت سے ہنسا۔ پھر مسلسل قہقہے لگانے کے لیے اُسے کسی بھی خاص وجہ کی ضرورت نہ رہی۔ جب قہقہوں کے زور سے اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تو وہ رُکا اور سوچنے لگا۔

Scanned by CamScanner

''آخر امبر جان وہی کچھ تو بک رہا ہے جو یہاں سب کے دل و دماغ میں بھرا رہتا ہے۔
یہاں عطائی کے پاس آنے والے سب لوگ بھلے ملکی سیاست پر، دین دنیا پر، علم و فن پر، راز و نیاز
کی باتیں کرتے ہیں مگر سب کے دلوں میں تو وہی موٹی موٹی بڑی بڑی چیزیں بھری رہتی ہیں
جنہیں امبر جان اپنی گالیوں میں سجا بنا کر باہر لا رہا ہے۔ جنہیں یاور عطائی اپنی حکمت سے مسلسل
اور اعلانیہ متحرک رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہاں سب لوگ کس لیے آتے ہیں؟ موٹی موٹی،
بھاری بھاری، گول گول، گہری گہری، لمبی لمبی، چیزیں.....'' اپنی سوچ کے انہیں آخری لفظوں پر نجم
الثاقب نے اپنے ہونٹ باہر نکال کر ہوا کو ایسے چوسا جیسے وہ شہد سے بھری ہو اور پھر ہنس پڑا۔
اس وقت امبر جان کے خون سے بھرے ہاتھ دیکھ کر بے ہوش ہونے والا یاور عطائی کا
دوست اور اُس کی معالجانہ کی بجائے نفسیاتی صلاحیتوں کا زبردست مداح ایک پرانا سیاستدان تھا
جو اپنے آپ کو بااصول سیاست کا علمبردار کہا کرتا تھا اور اسی لیے کسی بڑے سیاسی دھڑے کا رُکن
نہیں تھا بلکہ کبھی نازک موقعوں پر طاقت کا توازن بگاڑنے اور پھر بنانے کا مزہ لیتا تھا۔ وہ بچپن
سے ہی اُن لوگوں میں سے تھا جو خون نہیں دیکھ سکتے اور کہیں دیکھ لینے پر یک دم سے کسی کٹے ہوئے
درخت کی طرح گر جاتے ہیں۔ وہ گرا مگر سب نے اُسے نظر انداز کر دیا۔
پھر خون دیکھ کر عام روٹین انداز میں Sick ہو جانے والا ایک مشہور و معروف ادیب اور
دانشور تھا۔ وہ تیزی سے منہ پر ہاتھ رکھے اس باتھ روم کی طرف بھاگا جہاں سے کچھ ہی دیر پہلے
مؤقر جریدے عصری ڈائجسٹ کا ایڈیٹر برآمد ہوا تھا۔
کبیر نے یہ دونوں تینوں حادثے دیکھے اور پھر سب سے بڑا حادثہ یہ دیکھا کہ نجم الثاقب
یک دم اُن کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا اور اُسے اور عطائی کو اس طرح ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگ
پڑا تھا کہ جس کی اُس ہر وقت کے ڈرے ہوئے کمینے محتاط شخص سے کبھی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ کبیر
نے سوچا کہ ضرور اب کسی بڑی افراتفری کا آغاز ہونے لگا ہے۔ لوگوں کے اندر باہر آ رہے ہیں
اور باہر اندر جا رہے ہیں۔ یاور عطائی کے ڈرائینگ روم کی دنیا تیزی سے کسی اجتماعی اختلاط کی
طرف بڑھ رہی ہے۔ کبیر کے خیال کی تصدیق نجم الثاقب نے فوراً ہی کر دی۔ اُس کی آواز
میں عجیب سی لرزش تھی۔ جیسی لرزش کہیں بہت مشکل سے پہلی دفعہ محبت کا اظہار کرنے والے کی
آواز میں جھلکتی ہے۔

Scanned by CamScanner

''عطائی تم بہت ....'' اس کے بعد وہ امبر جان کی ہم نوائی میں اتنی دور تک چلا گیا کہ خود امبر جان خاموش ہو گیا اور حیرت سے اس معزز رسالہ نکالنے والے کی طرف دیکھنے لگا جو عجیب بھرائی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

''یہاں سب میری بات سُن لو........... اس ذلیل شخص نے، اس لعنتی .... نے اس نے ہم سب کے...... کو اپنا غلام بنا لیا ہے...... ہم سب کے ...... کو اپنی شیطانی دوائیوں کی چاٹ لگا دی ہے۔ ہم سب کے جسم جو اس وقت بھی اپنے اپنے کپڑوں میں ڈھکے اس عطائی کی توجہ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ بولو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں''۔

''نہیں، تم سچ کہہ رہے ہو' بیوروکریٹ نے بلند آواز میں کہا اور قہقہوں کا فوارہ اس کے منہ سے یوں چھوٹ نکلا جیسے پریشر کُکر سے بھاپ نکلتی ہے اور محبت کے سرخ تیل سے محرومی کا اس کا احساس ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔ ''میں تمہیں اپنی بپتا سناؤں'' وہ کہہ رہا تھا ''میں آج آیا تھا کہ سرخ تیل لے کر جاؤں گا جس کی کرامت تم جانتے ہو۔ یار وہ بڑی مشکل سے میں نے ایک...... وہ ایک میرا دل آیا ہوا تھا ایک...... پر اُس کو رام کیا تھا...... وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تھا تیل لے کر جاؤں گا۔ آخر انجن بھی تیل سے چلتے ہیں۔ میری خواہش کوئی غلط نہیں تھی۔ مگر ہوا کیا۔ پہلے میں کا چھر صاحب کے سامنے لاء اینڈ آرڈر کی آجکل کی پالیسی...... رہا پھر مولانا کے سامنے قومی معاشی مسئلوں کی...... میں...... رہا۔ مگر تیل نہیں ملا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تیل والا آج ہی پاگل ہوگا۔ سرخ تیل والا پاگل ہوگا آج ہی......''

سینئر بیوروکریٹ کی بپتا قہقہوں، چیخوں، ہاہو، اور نعروں کا ایسا طوفان برپا کر گئی کہ ڈرائنگ روم کے چوتھے کونے میں سوتی زہرہ بے چین ہو کر کروٹ بدل گئی اور جاگ جانے کے قریب ہوگئی مگر پھر بھی نہ جاگی۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا چہرہ شرم سے لال چقندر جیسا ہو گیا اور اس کی 'شرافت اور نجابت' نے اُسے سخت مجبور کیا کہ فوراً وہاں سے چلا جائے مگر ڈرامے کو انجام تک دیکھنے کی خواہش زیادہ بھاری مجبوری تھی۔ وہ چپکا کھڑا رہا اور دیکھتا رہا۔

امبر جان اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ویسی ہی آسودہ وحشت تھی جو کسی درندے کے یک دم پنجرے سے نکل کر جنگل میں پہنچ جانے پر طاری ہوتی ہو گی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا

Scanned by CamScanner

ہیورڈ کریٹ کی طرف بڑھا...... "ہا...... ہا...... ہا...... افسر سرخ تیل والا تو پاگل ہو گیا...... مگر اصل سرخ تیل تو یہ ہے" اس نے اپنا خون آلود ہاتھ سینئر ہیورڈ کریٹ کے سامنے پھیلایا "یہ ہے سرخ تیل جو میرے اندر سے نکلا ہے۔ کہو تو اور نکال دوں...... اسے لگاؤ، اپنے...... پر اور سیدھے جاؤ اپنی...... کے پاس...... ہا...... ہا...... ہی...... ہا...... یاخ...... ہونے...... ہے...... ہا...... ہی خ...... ہے...... خ خا۔"

"اگر چہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ جرمن یا انگریزی میں نہیں ہو رہا، مگر میرے لیے مکمل طور پر قابل فہم ہے" لمبی خاموشی کے بعد بالآخر ہاف مین نے کہا۔

"یقیناً، کیونکہ اورجی کی کوئی زبان نہیں ہوتی" کبیر نے کہا۔

ہاف مین نے کبیر کے لیے اپنے مخصوص تعریفی انداز میں کہا۔

"تو تم بھی ایسا ہی سوچ رہے تھے۔ میں بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا"۔

"اگر چہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سوچ سے ذرا ادھر اُدھر کی چیز ہے۔ مگر پھر بھی عظیم ذہن ایک جیسا سوچتے ہیں" کبیر نے کہا۔

"ہاں ہم دونوں عظیم ہیں" ہاف مین نے ترنگ میں کہا اور جسے سُن کر عطائی خوش ہو کر ہنسا۔

کبیر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس احساس کے ساتھ کہ اس نے پہلی دفعہ اُس شخص کو چھوا ہے اُس نے کہا۔

"نہیں آج کا عظیم آدمی یہ ہے"۔

عطائی نے کبیر کا کہا سنا اور اپنے اندر گھر الیا۔ ایک خمار آلود مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آئی اور گزر گئی۔ پھر اس کی بھویں سکڑ گئیں اور وہ ایک نئے تجسس سے ڈرائنگ روم کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ جیسے کبیر کی کہی بات پر کچھ بھی کہنے کے لیے اُسے وہیں سے کچھ تلاش کرنا تھا۔ ادھر کبیر، ہاف مین اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ اپنی اپنی دنیاؤں میں سے اُس شخص کے چہرے کو جھانک رہے تھے تاکہ نقوش میں ظاہر ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو اپنے مطلب کے معانی پہنا سکیں۔

کبیر نے سوچا کہ ترنگ میں کہے اُس کے لغو سے بے مقصد فقرے کو عطائی کہیں اپنے ساتھ دور تک لے گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی کسی بے چین سی جبلی سطح پر اُسے یقین ہو گیا کہ اب عطائی جو کچھ بھی کہے گا ایسا ہی ہو گا جسے وہ، کبیر مہدی...... دنیا میں کچھ عظیم کاموں کے لیے بھیجے

Scanned by CamScanner

جانے کے شک میں مبتلا۔ انسانی فطرت کا نباض ہونے کا دعویدار...... ہر Commitment کا
مضحکہ اُڑانے والا ناکام مصنف...... ایک غیر ہمدرد متجسس رپورٹر کے طور پر جاننا چاہتا ہے اور
جسے زہرہ اسی شخص کی بیٹی اسی شخص کی اصل فطرت کے جینیاتی تسلسل کو اپنے اندر محسوس کرتے
ہوئے بھی اُس کے ماضی اور تاریخی اصل سے لاعلم ہونے کے عذاب میں مبتلا ہستی کے طور پر
جاننا چاہتی ہے۔

عطائی نے امبر جان سے نظریں ہٹائیں۔ جس نے ابھی ابھی مُٹھی بھینچ کر اپنے بازو کو
ایک فحش حرکت دی تھی اور پھر بیورو کریٹ کا منہ چوم لیا تھا۔ پھر اُن کے قہقہوں میں نجم الثاقب
ابھی شامل ہوا ہی تھا کہ ایک اور بڑے سیاسی دانشور نے جو اپنی دانش وری میں دردمندی کے
لیے مشہور تھا اُس سے باتھ روم کا رستہ پوچھا تھا اور اپنے منہ پر ہاتھ جما لیا تھا۔ نجم الثاقب نے
اُس کی رہنمائی کی۔ اب تک وہ یاور عطائی کے کتنے ہی مہمانوں کی ایسی ہی رہنمائی کر چکا تھا
اور اب تو اُسے اس انوکھے احساس کا مزہ آنے لگا تھا جو 'باعزت اخراج' کی راہ دکھانے
والے رہنماؤں کے حصے میں آتا ہے۔ عطائی نے نجم الثاقب کو یہ عظیم مزہ لیتے بھی دیکھا اور
ایک بار پھر وہی خمار آلود مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آئی اور پھر وہیں جم گئی۔ اُس نے کبیر کی
طرف دیکھا اور کہا۔

''آج کا عظیم آدمی بھی وہی ہے، جو ہمیشہ کا عظیم آدمی ہے اور یہ وہ عظیم آدمی ہے جو عظیم
طاقتور مردوں کو اُن کی کمزور جگہوں سے قابو کرتا ہے۔ بہت سے رستے اُن کمزور جگہوں کو جاتے ہیں
مگر میں...... '' عطائی کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔ ''میں صرف اُس ایک رستے پر چلا جس کی
راہ مجھے گنجینۂ نشاط نے دکھائی۔ بادشاہوں کی درازیٔ عمر اور دائمی شباب کے لیے مجربات
......اسرار...... گنجینۂ نشاط جو میرے اوپر غیب سے نازل ہوا۔'' عطائی اپنے مخاطب اور اُس کے
دونوں ساتھیوں کے چہروں پر تحیر دیکھ کر ہنس پڑا اور پھر ایک بچگانہ سی شرارت بازی سے مغلوب ہو
کر اُن کے ذہنوں میں انوکھے واہمے جگا کر انہیں اور بھی متحیر کر دینے سے لطف اندوز ہونے کے
لیے اُس نے کہا'' ہم لوگ بلی کا گوشت کھا لیتے ہیں اور میں نے خواب دیکھا کہ میری ماں ایک
بھوری بلی ہے اور اُس نے مجھے ایک جنگلی بلا جنا ہے جو کتوں کی بھی آنکھیں نکال لیتا ہے......
مگر چھوڑو خواب کی باتیں۔ حقیقت تمہاری نظروں کے سامنے ہے''۔

Scanned by CamScanner

کبیر نے بھی عطائی کو اپنی حیرت زدگی سے محظوظ ہونے کا موقع فراہم کر دیا مگر پھر فوراً ہی 'گنجینۂ نشاط'۔ ''بادشاہوں کے دائمی شباب کے راز۔'' 'بلی کے گوشت' وغیرہ جیسی عطائی کی بکواس کو اس خیال کے ساتھ رد کر دیا کہ اتنی بے اعتدالی کے بعد کسی بھی شخص کے حواس بے قابو ہو سکتے ہیں۔ مگر عظیم آدمیوں اور عظیم مردوں کے تعلق پر عطائی نے باقی جو کچھ کہا تھا وہ کبیر نے خوب جان لیا اور اس نے پھر سے ایک نئے انوکھے تجسس سے ڈرائینگ روم کے منظر کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ منظر جو رات بھر اس کے سامنے تھا اور اب تو رات کے آخر تک آن پہنچا تھا۔

سیاستدان...... ادیب...... صحافی...... شاعر...... جاگیردار...... ریٹائرڈ فوجی...... مولوی....

سمگلر........ تاجر........ دانشور........ بیوروکریٹ........ ماہرِ تعلیم...... ڈاکٹر......

..............''

''حتیٰ کہ ڈاکٹر'' کبیر نے تعجب سے بڑبڑا کر عطائی کی طرف دیکھا۔ اُس نے اس نامور ماہرِ امراضِ جلد کو پہچان لیا تھا جو اب ڈرائینگ روم میں تھکے ہوئے مردوں کے بڑے گروہ میں شامل تھا۔ ڈرائینگ روم میں اگلی صبح کے آثار رونما ہونے سے پہلے اب دو ہی طبقے تھے۔ نجم الثاقب، امبر جان اور بیوروکریٹ سعید الزمان کی تکڈم جو ایک ہذیانی شدت کا شکار ہو کر اپنی ایک قدرے الگ شناخت قائم کر چکی تھی۔ امبر جان کے سر سے بہتا خون رُک چکا تھا اور وہ تھائی لینڈ کے بازارِ حُسن میں Inland سے سمگل ہو کر آنے والی کمسن لڑکیوں کے ساتھ اپنی خونی مڈبھیڑ کی داستانیں سُنا رہا تھا جنھیں سُن کر بیوروکریٹ اپنے آیندہ کے غیر ملکی دورے کا پروگرام وہیں بیٹھے بیٹھے مرتب کر چکا تھا اور نجم الثاقب آہیں بھرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کیوں نہ وہ فار ایسٹ کی صورتِ حال پر ایک فیچر لکھنے کے لیے ان علاقوں کا دورہ رکھ لے اور، اور ساتھ اُس حرامزادے کو بھی لے جائے...... اس لمحے اُس نے نظریں گھما کر 'حرامزادے' کی طرف دیکھا اور وہیں سے ہانک لگائی۔

''کبیر مہدی یہ مت سمجھنا میں نے تمھیں نوکری سے نکال دیا ہے، نہیں...... ہم ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے...... ہم تھائی لینڈ جا رہے ہیں...... بنکاک......''۔

''شیر کی چربی'' امبر جان نے نعرہ لگایا اور وہ تینوں قہقہے لگانے لگے۔

ڈرائینگ روم کا دوسرا طبقہ ربڑ جیسی کھال چڑھے چہروں اور مردہ آنکھوں والے مردوں کا

Scanned by CamScanner

طبقہ تھا جو ایک بے کیف، مایوس کن، بدمزہ بے نیند رات کی شرمندگی کے بعد اب ایک ایک کر کے وہاں سے نکل جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی برافروختگی، غصے، بیزاری کا برابر بھی اظہار نہ کرتا تھا۔ سستی، کاہلی، نامردی، کجی، لاغری، سرعت، بے لطفی، بے مدھال مردوں کا وہ طبقہ اپنی نجی زندگی کی ایک پریشان کن رات کو بہت آسانی سے استثنائی صورتوں کے محافظ ذات منطق کے تابع کر کے سب کچھ نظر انداز کر سکتا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی عظمت کی دنیا میں استثنائی صورتوں سے نپٹنے کا بڑا حوصلہ اور بڑا سلیقہ رکھتے تھے۔ استثنائیت کا منطق، جس کے ڈانڈے پردہ پوشی کی پالیسی سازی، فریب کاری کی ڈپلومیسی اور عقل دشمنی کی دانش وری سے جا ملتے ہیں۔

''یہ ایک Bad Trip کا منظر نامہ بھی ہے''۔ کبیر نے کہا، ''کیا ہم ایسا کہہ سکتے ہیں ہاف مین؟''

''ہاں...... یقیناً، لیکن کتنا Bad Trip یہ تو Trip ختم ہونے کے بعد ہی معلوم ہوگا''۔ ہاف مین نے کبیر کی بجائے نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جن میں اُس کا اپنا بوڑھا وضع دار لاوا پھوٹ پڑنے کو تیار تھا مگر کسی کو اندازہ بھی نہ تھا۔

''ہاں یہ ایک بے رحمی کی حد تک غیر معمولی رات ہے۔'' یاور عطائی نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر کبیر کو ایک انوکھی لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا ''کچھ ایسے لوگوں کی وجہ جن کا کہیں وجود ہی سب کچھ تلپٹ کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ غارت گری کے پیامبر ہوتے ہیں اور میں انہیں بھی عظیم آدمی کہتا ہوں''۔

''عظیم مرد نہیں......؟'' ہاف مین نے سب کچھ سمجھنے پر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر میرے معزز مہمان بے رحمی کی حد تک غیر معمولی واقعات کو جذب کرنے اور انہیں نہایت معمول کا بنا لینے میں کمال رکھتے ہیں۔ یہ بھی اُن کی عظمت کا ایک پہلو ہے'' عطائی نے اپنے مخصوص خود کلامی جیسے لہجے میں کہا۔

''یہ پہلوان کی عظمت کا سب سے عظیم پہلو ہے'' کبیر نے کہا۔

''عظیم آدمی...... عظیم انسان کہہ لو...... اور عظیم مرد...... عظیم مذکر جیسا بھی کہا جائے...... یہ تعلق بہت دلچسپ ہے۔ مگر...... مگر کیا تم تاریخ میں ایسا کوئی تعلق Quote کر سکتے ہو کبیر؟''

Scanned by CamScanner

ہاف مین نے پوچھا۔
''ارسطو اور سکندرِ اعظم ہماری سوچ کی مطلب براری کر سکتے ہیں'' کبیر نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔
''یہ ایک عمدہ مثال ہے''۔ ہاف مین نے کبیر کے لیے اپنے ہمیشہ کے تعریفی پُرخلوص لہجے میں کہا۔
''واقعی!'' عطائی نے کہا اور انعام گڑھ کے چوہدری فضل حیات پنگل کو دیکھنے لگا جو خون دیکھ کر بیہوش ہونے اور پھر ہوش میں آنے والے دانشور کو رخصت ہونے کے لیے اکسا رہا تھا۔
''مگر اس تعلق کو جسے ہاف مین دلچسپ کہتا ہے''۔ کبیر نے بظاہر عطائی کو مخاطب کر کے کہا۔
''اس تعلق کو اس مثال سے بھی زیادہ دلچسپ انداز میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ عظیم انسان وہ ہے جو عظیم مردوں کی عظمت کا فالودہ بنا دے''۔
عطائی ہنسا اور نواب ثریا جاہ کی طرف دیکھنے لگا۔
''آپ بہت دیر سے خاموش ہیں نواب صاحب''۔
مگر نواب ثریا جاہ نادر جنگ پھر بھی خاموش ہی رہا۔
''فالودہ؟ یہ کیا جہنمی چیز ہے''۔ ہاف مین نے مضطرب ہو کر پوچھا۔
کبیر ہنسا ''مجھے یقین تھا فالودہ تمہارے لیے فکری مسائل پیدا کرے گا۔ مگر مجھے افسوس ہے میں اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ تم اسے ایک غذائی Metaphor سمجھ لو بلکہ غذائی Orgy سمجھ لو تو اور بھی بہتر ہے''۔
''فالودی'' صورتِ حال ہاف مین کے لیے اور بھی زیادہ ناقابلِ فہم ہو گئی اس لیے اُس نے تفہیم کو بعد کے کسی مناسب لمحے کے لیے التوا میں ڈال دیا اور اُسی لمحے حیات پنگل اور خون دیکھ کر بیہوش ہونے والا دانشور دونوں اپنی آزردہ سی مسکراہٹیں لیے عطائی کی طرف بڑھے اور بار کے پردے کے پیچھے کھڑے رنگو بھائی نے ان دونوں کو اٹھتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ مہمانوں کے جانے کا عمل شروع ہو گیا ہے ورنہ تو ایسا لگتا تھا کہ یہ رات قیامت کو ہی ختم ہو گی۔ مگر رنگو بھائی کو یہ علم نہ تھا کہ اُس رات کا قیامت پر ہی ختم ہونا ابھی باقی تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ نکولائی زاگروف سیلیانووچ پاسٹرناک کی بدروح یقیناً ان دونوں میں سے کسی کے روپ میں تو نہیں آئی ہو گی۔

Scanned by CamScanner

کیونکہ وہ دونوں تو ملک کے بہت مشہور و معروف بڑے ہیں۔ پھر اُس نے سوچا کہ بدروحیں آخر ملک کے مشہور و معروف بڑے عظیم آدمیوں کے روپ میں بھی تو آسکتی ہیں۔ آج تو اُسے بھی ایک آدھ گھونٹ لگا ہی لینا چاہیے تھا گو کہ یہ اُس کے اصول کے خلاف تھا مگر پھر اُسے خیال آیا کہ اُلٹیوں کی بو سونگھنے کے بعد گھونٹ بھی اُلٹیوں جیسا ہی لگنے لگتا ہے اور پھر رنگو بھائی کی طبیعت کچھ پیے بغیر ہی خراب ہونے لگی۔

اُدھر ڈرائینگ روم میں عطائی نے پہلا الوداعی مصافحہ کیا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے لمس کی حلاوت کو جانے والے کے ہاتھ میں کچھ اس طرح پیوست کرتا تھا کہ رُخصت ہوتے مہمان کے جسم میں ایک فحش اعتماد کی لہر دوڑ جاتی تھی اور سب گلے شکوے دور ہو جاتے تھے۔ عطائی جانتا تھا کہ معزز مہمانوں کو آج اس خصوصی توجہ کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اُس نے حیات پنگل کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''آج کچھ بدمزگی ہوگئی پنگل صاحب''۔

''چلو کوئی بات نہیں یار...... کبھی کبھی بدمزگی بھی ہو جانی چاہیے'' پنگل نے خوش دلی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی ہو جاتا ہے'' عطائی نے گہری چُبھتی ہوئی تمسخر بھری نظروں سے دانشور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں'' دانشور نے ہنس کر کہا ''کبھی کبھی کسی کے ساتھ بھی کہیں بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے''۔

بعد میں...... آنے والے دنوں میں ...... عرصے تک یاور عطائی کے ڈرائینگ روم میں آخرِ شب کے وہ واقعات کبیر مہدی کی یادداشت میں خون دیکھ کر بیہوش ہونے اور پھر ہوش میں آجانے والے دانشور کے اسی بے ہنگم فقرے سے جڑے رہے۔ ''کبھی کبھی کسی کے ساتھ کہیں بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

اسی فقرے کے بعد نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تھا اور پچھلے چند گھنٹوں میں جو برسوں پر بھاری تھے اُس نے عطائی، کبیر، ہاف مین، نجم الثاقب، امبر جان اور دوسروں کے ساتھ ساتھ ڈرائینگ روم میں جو کچھ سُنا، دیکھا محسوس کیا اور پھر سمجھا تھا، اُسے اپنے کسی ہم رُتبہ کے سامنے اُگل ڈالنے کی خواہش اب ایک ایسی جسمانی حاجت کی شکل اختیار کر چکی تھی جسے رفع

Scanned by CamScanner

کرنے میں تھوڑی سی تاخیر بھی اُس کے وجود کے لیے سنگین خطرہ بن سکتی تھی۔

اور اسی فقرے کے بعد ہی ڈرائینگ روم کی دوسری جانب نجم الثاقب، امبر جان اور بیورو کریٹ جنہوں نے ایک دوسرے کے سامنے اپنے دل کھول کر ذہنی وجسمانی قربتوں کی راہ میں حائل کئی بند توڑ ڈالے تھے محسوس کیا تھا کہ رات کے آخری لمحات قریب آ چکے ہیں اور دوست جانا شروع ہو چکے ہیں۔ امبر جان اپنی پتلون کو اوپر اپنے پیٹ کی طرف کھینچتا اٹھا تھا اور نجم الثاقب نے اُس سے پوچھا تھا ''کدھر؟''

جواباً اُس نے اپنے ہاتھ کی باقی انگلیاں سمیٹتے ہوئے صرف چھوٹی انگلی کھڑی کر دی۔ تب نجم الثاقب نے جو کسی سکول کے لڑکے جیسا شرارت سے بھرا ہوا تھا اپنے ہاتھ کے شوخ اشارے سے اس کی رہنمائی ڈرائینگ روم کے ایک کونے کی طرف کی تھی۔ مگر یہ وہ کونا نہیں تھا جہاں غسل خانہ بنا تھا اور جس میں رات بھر دوستوں کا تانتا بندھا رہا تھا اور جس کا حال سب جانتے تھے بلکہ چوتھا کونا تھا جس کا حال کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ امبر جان نے کھلنڈری شرارت بازی کا جواب بھی اُسی جذبے سے دیا تھا اور اپنی پتلون کی زپ پر دونوں سے ہاتھ رکھتا مضحکہ خیز حرکتیں کرتا بھاری عنابی پردے کو ایک طرف ہٹا کر شیاور عطائی کے ڈرائینگ روم کے اُس کونے میں داخل ہو گیا تھا جہاں زہرہ اپنی نیند رات کے سیاہ پردے پر حیرت ناک خوابوں کے مناظر دیکھتی تھی۔

کبیر نے امبر جان کو کسی مسخرے کی طرح بندروں جیسے منہ بنا کر عنابی پردے کو ہٹاتے دیکھا تو اُسے تعجب ہوا۔ چھوٹی انگلی اٹھانے کے بعد تو اُسے اسی سمت جانا چاہیے جہاں رات بھر سب آتے جاتے رہے تھے مگر پھر اُس نے سوچا کہ وہ پہلی بار اس جگہ آیا ہے ہو سکتا ہے اُس طرف بھی ایسا کچھ اہتمام ہو۔ نجم الثاقب اور بیورو کریٹ بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ پھر پیشتر اس کے کہ وہ اپنی اس حقیری اُلجھن پر مزید غور کرتا اُسے ہاف مین کی آواز سنائی دی جو غور سے نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا اور جہاں اُن کے ساتھ ہی عطائی کھڑا اپنے مہمانوں کو رُخصت کر رہا تھا۔

ہاف مین دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا ''کبیر تم نے نواب جنگ اور باقی جو کچھ بھی اُس کا نام ہے..... کے چہرے کو دیکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے Bacchus کی اس محفل کے خاتمے پر اب وہ بھی Sick ہونے والا ہے''۔

Scanned by CamScanner

کبیر نے بھی پھر غور سے نواب کے چہرے کے نقوش کا جائزہ لیا۔ یقیناً اپنی تمام وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے باوجود وہ ایک ایسے آدمی کا چہرہ تھا جس نے شدید اذیت کی کیفیت میں اپنے اندر کچھ ایسا روک رکھا ہو جس کا اخراج لازم ہو۔........ کبیر مُسکرایا اور پھر ویسے ہی دھیمے لہجے میں ہاف مین سے کہنے لگا۔

''ہاں میرا خیال ہے ایسے آثار یقیناً موجود ہیں جلد ہی کچھ ظاہر ہوگا۔ شاید ملک کے اُس عظیم جاگیردار اور عظیم دانشور کے رُخصت ہونے کے بعد اس عظیم نواب کی طرف سے بھی کچھ نازل ہوگا اور وہ باتھ روم کا رُخ کرے گا۔ ویسے کیا خیال ہے ہاف مین آج کی اس رات کو 'عظیم الشان اُلٹیوں کی رات' کا خطاب دینا کیسا رہے گا''۔

ہاف مین ہنسا ''عمدہ مگر، 'عظیم الشان اُلٹیوں کی رات' اور 'اُلٹیوں کی عظیم الشان رات' میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا''۔

گورے کی ہنسی پر باہر کا رُخ کرتے حیات پگل نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور اُس کی پرانی کمزوری یک دم عود کر آئی۔ گوروں کی موجودگی میں ہمیشہ یہ وہم اُسے ستانے لگتا تھا کہ ضرور اُس سے کوئی غلطی سرزد ہوگی۔ درجنوں غیر ملکی اداروں اور بین الاقوامی وفود سے مذاکرات کے باوجود وہ اپنی اس پریشانی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ اُس نے نسبتاً بلند آواز اور پُر اعتماد انگریزی زبان میں عطائی سے کہا۔

''............ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اجازت لینی چاہیے...... بہرحال...... یہ ایک دلچسپ رات تھی''۔

''یہ ایک بھیانک رات تھی'' اچانک نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے ایک تھراتے ہوئے ڈراؤنے لہجے میں کہا۔ کبیر اور ہاف مین جنہوں نے چند لمحوں کے لیے اُس کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹائی تھیں چونک کر پھر متوجہ ہوئے اور ہاف مین نے بے ساختہ کہا۔

''میرے خدا...... اُس کا تو چہرہ بھی بھیانک ہوگیا ہے۔ یقیناً ایسے ہی کسی چہرے کا بھوت ہوگا جسے اس رات جنم کھنڈر میں دیکھ کر مدعلی کی زبان گُنگ ہوگئی تھی''۔

''میرا خیال ہے اب وہ کچھ نازل ہونا شروع ہوگیا ہے۔ جس کی پیشین گوئی لمحہ بھر پہلے تم نے کی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آج بھی کسی کی زبان گُنگ ہوگی یا نہیں۔'' کبیر نے کہا اور دونوں آگے

Scanned by CamScanner

بڑھ کر عطائی، حیات پنگل، دانشور اور نواب کے ساتھ آن کھڑے ہوئے۔ کبیر کو بالکل سامنے دیکھ کر نواب کی باہر کو اُبلتی آنکھیں کچھ اور بھی باہر اُبل پڑیں۔ حیات پنگل نے ایک ناخوشگوار سے تیب کا اظہار کیا اور پھر سے اجازت چاہی۔ وہ اور کچھ دیر بھی رُکنا نہیں چاہتا تھا۔

''دیکھ لو عطائی...... نواب صاحب کی اپنی رائے ہے...... اجازت......'' اُس نے کہا۔

''نہیں جناب پنگل صاحب...... ابھی آپ جا نہیں سکتے...... آپ کو سُن کر جانا ہوگا۔ جو مجھے کہنا ہے اُسے سُن کر جانا ہوگا......'' نواب نے لرزتی آواز میں کہا۔

''او...... کیا غلام باغ میں کوئی نیا دفینہ ملا ہے نواب صاحب کوئی نئی دریافت'' پنگل نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''دریافت...... ہاں اسے دریافت ہی کہہ لیں ...... مگر غلام باغ میں نہیں...... یہیں...... یہیں......''

کبیر اور ہاف مین نے ایک دوسرے کی طرف تصدیقی نظروں سے دیکھا اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی جذباتی ارتعاش سے شکستہ منحنی ہذیانی سی آواز سُن کر دانشور ہنس پڑا۔

''دراصل اس عمر میں بداعتدالی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔'' اُس نے کہا۔

''انہوں نے ہی...... آپ نے ہی جناب کہا تھا۔ کہ کبھی کبھی کسی کے ساتھ بھی کہیں بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کبھی آپ نے غور کیا کہ ہم۔ عرصے سے۔ ہم سب کے ساتھ۔ کہیں اور نہیں۔ یہیں...... یہیں اس کمرے میں کیا کچھ ہوتا رہا۔ کیا کچھ نہیں ہوتا رہا''۔

حیات پنگل نے بے چینی سے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور جلد از جلد جان چھڑانے کے بیزار لہجے میں صرف اتنا کہا۔

''کیا ہوتا رہا نواب صاحب......''

اچانک نواب نے تیزی سے عطائی کی طرف اپنا بازو تان دیا جس کے آگے اس کی انگشتِ شہادت بُری طرح لرز رہی تھی۔

''یہ...... یہ...... یہ...... ذلیل شخص...... مدتوں ہمیں ذلیل کرتا رہا...... ہمیں...... اور ہمیں پتہ ہی نہ چلا...... میں اس کا سب سے پرانا جاننے والا ہوں...... اس نے پہلے ہماری...... ہماری ہوس کو اپنا غلام بنایا اور پھر ہمیں...... ہمیں۔ ہم اشرافیہ کے سب...... اتنے بڑے لوگوں...... یہ...... یہ

...... یہ کوئی سفلہ روح ہے...... اس کی اصل کہیں گھٹیا...... ارذل...... نسل میں ہے...... مجھے یقین ہے...... یہ نیچ ...... نیچ ...... نی ...... نی ...... رج ...... رج ...... چ ...... چ ...... آ کھ...... کھ......''نواب ثریا جاہ نادر جنگ بُری طرح کھانسنے لگا۔

''عطائی...... مجھے خوف ہے...... انہیں شاید طبی امداد کی ضرورت پڑ جائے نواب صاحب کو'' حیات پنگل نے تشویش بھرے بناوٹی لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی کبیر کی یاوہ گوئی کی حس یک دم پھر سے بیدار ہوگئی۔ اُس نے عطائی کے گہرے ٹھنڈے پُرسکون چہرے سے نظریں ہٹا کر پنگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے سر انہیں قانونی امداد کی ضرورت ہے۔ دراصل بعض اوقات بڑھاپے میں ضمیر اچانک جاگ پڑتا ہے۔ یہاں رات بھر مجرمانہ مشروبات کے استعمال میں نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے بھی مقدور بھر جو شرکت کی ہے اس سے اُن کے ضمیر پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ اگر انہیں گرفتار کر کے ملکی قوانین کے مطابق سزا دلوائی جائے تو ان کے ضمیر کی خلش ختم ہو جائے گی اور یہ نارمل ہو جائیں گے..........''

''کیا یہ شخص کسی قسم کا کوئی مذاق کر رہا ہے''۔ حیات پنگل نے شدید ناگوار لہجے میں عطائی سے پوچھا۔ جواباً عطائی نے بھی اتنے ہی شدید معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''مجھے بے حد افسوس ہے مگر'' اُس نے کبیر کی طرف اشارہ کیا ''مگر یہاں بھی وہی معاملہ ہے جو۔''

''نہیں وہاں...... یہاں...... وہ معاملہ نہیں...... یہاں بھی وہی معاملہ ہے جو یہاں معاملہ ہے۔'' نواب نے اپنی انگلی عطائی کے کندھے پر ٹھونکتے ہوئے کہا ''یہاں بھی...... جو معاملہ یہاں ہے...... میں یہ...... یہ...... شخص میرا مہمان بن کر آیا مجھے شرمندگی تھی۔ تم جانتے ہو بن بلایا مہمان...... مگر...... مگر...... مجھے یقین ہے یہ دونوں ملے ہوئے ہیں'' نواب نے جس کا جسم اب لرز رہا تھا باری باری عطائی اور کبیر پر اپنی شعلہ بار نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

'دوست' جواب جانے والے تھے نواب کے اچانک آؤٹ ہونے کو شو کا آخری آئٹم سمجھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہوتے اور وہیں اردگرد اکٹھے ہوتے گئے۔ نجم الثاقب اور بیوروکریٹ نے بھی کہیں اندر ہی اپنی اس اُلجھن کو فراموش کر دیا تھا کہ آخر امبر جان اُس کونے سے باہر کیوں نہیں

Scanned by CamScanner

ادھر سے وہ باہر نکل گیا...... نجم الثاقب نے کبیر کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ نواب کو بھی اس حال تک پہنچانے والا یہی خبیث آدمی ہے۔ ''مگر جہنم میں جائیں دونوں'' اُس نے سوچا اور نواب ایک بار پھر گرجا۔ ''میں مان نہیں سکتا۔ یہ دونوں پہلے سے، ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے نہیں۔''

''ہمیشہ سے اہم ہے'' ہاف مین نے کبیر کے کان میں سرگوشی کی اور کبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر حیات پنگل کو مخاطب کیا ''نواب صاحب کے اتنے نادر خیال کے بعد تو سر ان کی گرفتاری اور بھی ضروری ہو جاتی ہے...... کم از کم کوئی ایک تو پکڑا جائے، ناجائز مشروبات استعمال کرنے کے جرم میں............''

''وٹ نان سینس۔'' پنگل نے نفرت سے کہا۔

''ہاں کبیر یہ نان سینس ہی ہے تمہاری۔ تمہارے یہاں کے ہائی سرکلز میں تو یہ سب چلتا ہے'' ہاف مین نے شرارت سے کہا۔

''تم ہمارے ملکی معاملات میں دخل مت دو۔ تمہارا تعلق صرف ہمارے آثارِ قدیمہ سے ہونا چاہیے......''

''میرے آثارِ قدیمہ میرے غلام باغ کے سابقہ مالک یہاں موجود ہوں اور اس حال میں ہوں تو میں لاتعلق کیسے رہ سکتا ہوں۔'' ہاف مین نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''غلام باغ کے مالک صرف غلام ہو سکتے ہیں۔ خواجہ سرا نہیں............'' کبیر نے کہا۔

''خواجہ سرا بھی تو غلام ہی ہوتے ہیں'' ہاف مین نے کہا۔

''ہاں، مگر......'' کبیر نے حیرت سے کہا اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا نواب ثریا جاہ نادر جنگ اپنا جسمانی توازن بھی کھو بیٹھا اور کبیر پر جھپٹ پڑا مگر اُس کی یہ بے اعتدالی ادھوری ہی رہی کیوں کہ نجم الثاقب کے بعد اب وہ بھی تیسرے کونے کے غسل خانے تک پہنچنے میں ناکام رہا اور آٹھ دس دوست جواب کبیر اور گورے کے مکالموں سے کچھ عجیب طرح سے لطف اندوز ہونے لگے تھے نواب کے اچانک 'حملے' کی وجہ سے تیزی سے پیچھے ہٹ گے اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے لیے بھی اندر باہر کے فاصلے مٹنے لگے۔

اسی لمحے رنگو بھائی آخری دو خشک پردے اور ائر فریشنر کا سپرے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا یہ سوچتا ہوا کہ ایک ہی رات میں دوبارہ یہ بہرحال اُس کی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلی بار ہوا

Scanned by CamScanner

تھا۔ اور اس لمحے عطائی نے مجموعی طور پر سب دوستوں کے لیے اپنا رُخصت کرنے کا انداز اپنایا۔ اُسی لمحے حیات پنگل نے گہرے شک سے کبیر کی طرف دیکھا اور فیصلہ کیا کہ بعد میں وہ عطائی سے اس شخص کے بارے میں ضرور پوچھے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو حساس اداروں کے ذریعے اس کے بارے میں تفتیش کروائے گا اور پھر اُسی لمحے جبکہ 'دوست' یاور عطائی کے ڈرائینگ روم کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور رات میں اگلے دن کی پھیکی لو ظاہر ہو رہی تھی، ڈرائینگ روم کی فضا کو چیرتی کاٹتی وہ چیخ بلند ہوئی جو کسی ایسی عورت کی تھی جو اپنی نیند رات کے سیاہ پردے پر اُس رات کا آخری حیرت ناک خواب دیکھتی تھی۔

OOO

باب(11)

زہرہ کے خواب

بڈھے مسٹنڈوں کی دھماچوکڑی کا اپنی آنکھوں اور کانوں سے نظارہ کرنے کے بعد زہرہ عنابی پردے کے شگاف سے پیچھے ہٹی تھی اور تاریکی میں بچھی نشست پر اپنے بوجھل جسم کو گرا دینے کے بعد جب اُس نے باہر کو کھلتے دروازے کی جانب دیکھا تھا تو اس وقت وہ نامعلوم احساسات کے اجنبی ذائقوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آدھی رات کا ٹھنڈا چاند تیرتا تھا...... اور کہیں دور دور بھی اس کے ہوش میں نیند کی خواہش موجود نہ تھی۔ وہ لمحات تو اُس کے لیے ایسے تھے کہ جیسے کسی انوکھے غیر متوقع تجربے سے گزرنے کے بعد انسان ساکت سا ہو جاتا ہے اور پھر جب اُس انوکھے اور غیر متوقع کو کہیں سمیٹنے کے لیے اُسے اپنے اندر کچھ اور نئی جگہیں بنانے کی بیگار کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اور بھی ساکت ہو جاتا ہے۔

جیسے کسی گھر میں اچانک کہیں سے غیر متوقع طور پر بہت سا انوکھا، ناپسندیدہ، بے ڈھنگا بدصورت سامان آ جائے جسے نہ تو واپس بھیجا جا سکے اور نہ ہی سمجھ میں آئے کہ کہاں رکھا جائے تو گھر کا مالک کچھ دیر کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے مگر اندر ہی اندر کلپتا ہے کہ ان مصیبتوں کے لیے کہاں جگہ بنائے۔ سٹور میں ڈرائنگ روم میں بیڈ روم میں باتھ روم میں کچن میں برآمدے میں کہاں۔ کہاں یہ مصیبتیں اس طرح رکھی جائیں کہ سارا گھر تہس نہس ہونے سے بھی بچ جائے اور یہ ٹھکانے بھی لگ جائیں۔ مگر پھر وہ آنے والی اس پُر عذاب اکھاڑ پچھاڑ کے تصور سے ہی دہل جاتا ہے اور ایک دوسرا سکوت اُس پر طاری ہو جاتا ہے۔

ڈرائنگ روم کے چوتھے کونے میں اپنی اُن سب مصیبتوں سمیت بے حس و حرکت زہرہ پر یہ دوسرا سکوت بے اختیار کر دینے والی ایک نیند کی صورت میں اُترا تھا وہ نیند جو ازل سے انسان کو

Scanned by CamScanner

بے بسی کا احساس دلائے بغیر بے بس کر ڈالتی رہی ہے۔ اُس نیند کے مصیبت زدہ خواب زہرہ کے خواب تھے۔

نیند سے پہلے زہرہ نے ایک نڈھال سی شدت سے اتنا ضرور سوچا تھا اور بار بار سوچا تھا کہ آخر وہ اس جگہ سے واپس اپنے کمرے میں چلی کیوں نہیں جاتی۔ ویسے بھی وہ خطرے میں ہے کوئی اچانک اندر آ سکتا ہے۔ اگر اُس کے باپ کو پتہ چل گیا کہ اُس کی بیٹی چھپ کر اُس کی نجی محفل میں تاک جھانک کرتی رہی ہے تو؟۔ پھر اُسے اس خدشے پر کوئی زیادہ خوف بھی محسوس نہ ہوا ویسے بھی ایسا کیا اُس نے دیکھ لیا؟۔ سارا تاثر تو بس یہی تھا کہ بہت سے، بہت گہرے دوست آپس میں مل بیٹھے ہیں ویسی گہری دوستی ویسا گہرا تعلق جو کسی جرم یا سازش میں شریک لوگوں میں پایا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیتا پھر ایسی تعلق داری والے لوگوں کے لیے کئی لفظوں کی ترکیبیں اُس کے ذہن میں آئیں۔ چوروں کی منڈلی، بدمعاشوں کا ٹولہ، ٹھگوں کا گروہ، کوئی نظریاتی سیاسی جماعت...... مگر ان سب میں کچھ نہ کچھ کمی پا کر اُسے اُلجھن ہوئی اور پھر کبیر...... وہ تو اُن میں سے نہیں ہے وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔ یہ ایک بڑی مصیبت ہے اور پھر اُس کا باپ۔ اُس نے کیسے جیسے دیکھتے ہی دیکھتے اُس لپاپے کو چُن لیا۔ کیا مطلب۔ ایک تو یہ مصیبت ہے عجیب الفاظ ذہن میں آتے ہیں اور پھر اُس کے باپ کی مصیبت جو ہمیشہ سے ہے۔ چُن لینے سے اُس کا کیا مطلب ہے۔ مطلب یعنی...... جیسے باپ اُس بدتمیز سے شخص کی باتوں سے لطف اُٹھا رہا تھا...... کبیر...... ایک تو یہ مصیبت ہے...... اور انہیں مصیبتوں پر سوچو تو مصیبتیں ہی مصیبتیں...... میرے خدا۔

زہرہ نے گہرا سانس لیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر سر کے پیچھے لے گئی پھر اپنی دونوں کہنیوں کو دائیں اور بائیں لٹکاتے ہوئے اُس نے اپنے سر کو ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ اس طرح اُس کی نظریں دروازے کے اوپر کی راہ میں سے دکھائی دیتے وسط آسمان میں رکھے چاند سے۔ نیچے باغ کی چاندنی میں اُتر آئیں۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سدا بہار اور موسمی، مقامی پودے اپنی شناخت دینے لگے۔ زہرہ نے دُور یاور ہاؤس کے اُس حصے میں موجود سرس کے ایک درخت کے بارے میں سوچا جو گرم موسم کے کچھ دنوں میں پھول دیتا تھا۔ جس کے پھول نرم رُوئی کے گالوں جیسے ہوتے ہیں اور جن کی خوشبو دنیا کی سب خوشبوؤں سے زیادہ

Scanned by CamScanner

حیرت انگیز ہوتی ہے۔ زہرہ کو اتنا یقین تھا۔ اُس نے گہرا سانس کھینچ کر تصور میں ہی اس خوشبو کو کہیں سے اندر ڈھونڈ لانے کی کوشش کی اور یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک اُس نے سامنے روش پر ایک سائے کو دیکھا، شروع شام کے بعد سے جب سے زہرہ اپنی اُس مہم جوئی کے جنون کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس تاریک گوشے میں گھسی تھی یہ پہلا دہشت ناک لمحہ تھا۔

زہرہ کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا اور منجمد کرنے والی سردی کی لہر اُس کی ہڈیوں میں سنسناتی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے سمٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ سایہ اب دروازے کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ ''یہ جو کوئی بھی ہے اندر ڈرائینگ روم والوں میں سے تو نہیں ہو سکتا'' اُس نے سوچا اور عنابی پردے کی طرف دیکھا اچانک اندر سے امبر جان کے قہقہوں کی آواز آئی .... ''نہیں اندر سے کوئی نہیں۔ اُدھر سے کوئی نہیں'' زہرہ نے اپنے آپ کو یقین دلایا وہ جو کوئی بھی تھا اب بالکل دروازے میں کھڑا تھا اور باہر چوتھے کونے کی تاریکی میں جھانک کر اندر کسی موجودگی کا سُراغ لگا رہا تھا۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ دروازے کی طرف بڑھایا اور اس سے پہلے کہ وہ دروازہ باہر سے بند کرتا زہرہ نے اُسے پہچان لیا وہ اُچھل کر صوفے سے اُتری اور جھپٹ کر اُس کی طرف بڑھی۔ یوں اچانک اندر سے کسی کے نکل کر اُس پر جھپٹ پڑنے پر ہیولے کے منہ سے ڈری ہوئی آوازیں نکل پڑیں اور زہرہ کا جی چاہا کہ قہقہے لگائے۔

''پیر بخش دروازہ بند نہ کرنا'' زہرہ نے کہا۔ وہ بیرونی گیٹ کا رات کا چوکیدار تھا۔

''بی بی جی آپ یہاں۔''

فوراً ہی زہرہ کو احساس ہوا کہ آدھی رات کے بعد اس جگہ، بیشک کہ وہ جگہ اُس کے گھر میں ہی ہے اپنی موجودگی کا کچھ قابلِ یقین جواز تو اُسے پیش کرنا ہی پڑے گا۔

''وہ میں...... ایسے ہی باہر نکلی تھی چاندنی دیکھنے...... دیکھا تو یہ دروازہ کُھلا تھا بند کرنے لگی تھی۔ ایسے ہی اندر جھانک لیا۔''

''میں بھی دروازہ بند کرنے لگا تھا جی'' پیر بخش نے دانت نکالے۔

زہرہ کا جواز اُس کے لیے بہت کافی تھا۔

''مگر تم یہاں کدھر...... باہر گیٹ؟''

''یہی تو مصیبت ہے جی...... بی بی جی......''

Scanned by CamScanner

''کیسی مصیبت......''

''وہ اندر بڑی پارٹی ہے ناں جی بڑے صاحب کی۔ تو وہ باہر گیٹ پر ایک صاحب تنگ کر رہے ہیں۔''

''گیٹ پر تنگ کر رہے ہیں؟ کیا مطلب؟''

''وہ جی کہتے ہیں........ اندر کوئی اُن کے دوست ہیں آئے ہوئے ہیں جی۔ ملنا ہے۔''

''پھر؟''

''میں نے کہا حکم نہیں اندر جانے کا۔''

''پھر؟''

''پھر کہا جی۔ میں انتظار کرتا ہوں۔ نکلیں گے تو مل لوں گا۔ پیغام دینا ہے۔ بُری خبر ہے؟''

''بُری خبر؟''

''ہاں جی۔ اسی لیے بی بی جی میرا دل پسیج گیا۔ میں نے کہا۔ اچھا دیکھتا ہوں اندر کوئی مل جائے پیغام بھجواتا ہوں۔''

''مگر ہے کون؟''

''کوئی ڈاکٹر ہے۔ جی ناصر..................''

''ڈاکٹر ناصر؟............اور......اور............بُری خبر......؟''

''کوئی کبیر صاحب ہے۔ جی......اُس کے لیے۔''

''کبیر کے لیے بُری خبر۔'' زہرہ کہتی ہے اُسے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ تیزی سے چوتھے کونے کا دروازہ بند کرتی ہے اور باہر آ جاتی ہے۔

''کیا کہا تم نے پیر بخش ڈاکٹر ناصر کبیر کے لیے بُری خبر لایا ہے۔ کیا بُری خبر؟'' زہرہ کی آواز بھرّا جاتی ہے۔

''کبیر صاحب کی موت کی خبر ہے۔ جی۔ انہیں اُن کی مرگ کی اطلاع دینی ہے۔ جی۔''

اور زہرہ بے جان ہو کر انہیں قدموں پر زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور روتی ہے......اتنا روتی ہے......اتنا روتی ہے......اتنا روتی ہے......زہرہ اور ڈاکٹر ناصر پیر بخش کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ مگر بات شروع نہیں ہو پاتی۔ ایک بوڑھی عورت مسلسل جھاڑو دیے چلی جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

دیے چلی جاتی ہے۔ لگتا ہے اس کا جھاڑو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ زہرہ غصہ کرتی ہے۔ غصہ کرتی ہے۔

''بوڑھی تو جاتی کیوں نہیں چل......چل............''

''اُسے ایسا نہ کہو......وہ جو کرتی ہے اُسے کرنے دو..................''

زہرہ ناصر کے چہرے کو دیکھتی ہے وہ ایک سہما ہوا۔ کھلی خوفزدہ آنکھوں والا بچہ ہے جو منت کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے وہ جو کرتی ہے کرتی رہے۔ مگر کبیر کی موت کی خبر بھی تو تم ہی لائے ہو۔''

ناصر غم زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر اتنا غم ہے۔ اتنا غم ہے۔ زہرہ جھاڑو دیتی عورت کو دیکھتی اور کہتی ہے۔

''تمہیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا............''

''اُسے کچھ مت کہو......میں کبیر کی موت کی خبر لایا ہوں مگر میں نے اُسے بتایا تو نہیں وہ مر چکا ہے۔''

''میں نے بھی اُسے بتایا نہیں وہ مر چکا ہے۔''

''کسی نے بھی نہیں بتایا۔''

''نہیں کسی نے بھی نہیں۔''

''تم نے کیوں نہیں بتایا؟''

''وہ ڈرائنگ روم میں ہے۔''

''پھر وہ نہیں مرے گا جب تک کوئی اُسے بتائے گا نہیں وہ مر چکا ہے وہ نہیں مرے گا............''

زہرہ ہنستی ہے......اتنا ہنستی ہے......زہرہ ہنستی ہے......ناصر کا چہرہ نفرت سے سیاہ ہو جاتا ہے۔ خوفناک چہرہ ہے۔ بھیانک چہرہ ہے۔

''میں خود اُسے بتاؤں گا وہ مر چکا ہے۔'' نفرت کے چہرے والا کہتا ہے۔

''نہیں۔'' زہرہ چیختی ہے۔ بوڑھی عورت قہقہہ لگاتی ہے۔ جھاڑو زمین پر پھینکتی ہے۔ تنکے بکھر کر سانپ بن جاتے ہیں۔

''میں خود ڈرائنگ روم میں جاؤں گا۔ خود اُسے بتاؤں گا۔ وہ مر چکا ہے'' ناصر باہر کو لپکتا

Scanned by CamScanner

ہے۔ زہرہ اُس کا راستہ روکتی ہے۔ پیر بخش کہیں سے نکل آتا ہے۔ زہرہ حیران ہے پیر بخش کا چہرہ یاور عطائی جیسا ہے۔

''پیر بخش'' ...... یاور عطائی کہتا ہے۔ ''تم فکر نہ کرو۔ ڈرائینگ روم کے چاروں دروازے میں نے بند کر دیئے ہیں۔ کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ نہ باہر آ سکتا ہے۔'' سانپ زہرہ کو ڈسنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ زہرہ شور مچاتی ہے خوف سے پیچھے کو ہٹتی جاتی ہے...... ہٹتی جاتی ہے...... دور ہٹتی جاتی ہے.......... بہت دور جب وہ غلام باغ پہنچتی ہے تو ہوا چل رہی ہے اتنی تیز...... اتنی تیز...... کہ کپڑے اُتارے جا رہی ہے۔ زہرہ اپنے کپڑے اپنے گرد لپیٹتی ہے۔ لپیٹتی ہے اور لپیٹتی ہے.......... دھوپ نکل آتی ہے...... بادل آ جاتے ہیں...... بارش ہوتی ہے مگر دھوپ پھر بھی رہتی ہے...... ہوا رک جاتی ہے...... شام ہے...... گہری شام ہے...... زہرہ اپنے آپ میں محفوظ ہے ...... مگر دنیا دکھوں سے بھری ہے...... دل لرزتا ہے۔ ایسے خوف ہیں جو خوف بھی نہیں۔ وہ جنم کھنڈر کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ کھڑی رہتی ہے۔ اکیلی۔ اچانک جنم کھنڈر کے اوپر بہت سی برقی روشنیاں رنگ برنگی۔ لگی ہوئی۔ چمک چمک کرنے لگتی ہیں۔ کوئی عظیم سانحہ ہونے والا ہے۔ ہوا بند ہے۔ مگر آہستہ۔ بہت آہستہ آفت آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ دنیا کا آخری دن ہے۔ روشنیوں میں لکھا ہوا خوش آمدید جلتا ہے بجھتا ہے۔ جلتا ہے بجھتا ہے۔ کبیر ہاف مین ناصر آ جاتے ہیں۔

''تم لوگ کہاں تھے۔ تمہارے انتظار میں اتنی دنیا گزر گئی۔'' زہرہ چلاتی ہے۔ بوڑھا آدمی جو کبیر ہاف مین ناصر کے ساتھ ہے زہرہ جانتی ہے کہ مدد علی ہے۔

''ہم تمہارے ہی سوال کا جواب اس سے پوچھتے رہے تھے اور پوچھتے رہے تھے۔ یاور عطائی کون ہے؟ مگر یہ بتاتا ہی نہیں۔ اس کی زبان گنگ ہے۔ مگر بتاتو دے۔ اب اس کی قربانی دی جائے گی۔''

زہرہ رنج کے گھیرے میں آ جاتی ہے۔ اور سوچتی ہے کبیر بھی ویسا ہی سوچتا ہے جیسا وہ سوچتی ہے۔

''کبیر کیا تم ویسا ہی سوچتے ہو جیسا میں سوچتی ہوں۔''

''مجھے نہیں علم تم کیا سوچتی ہو۔ جب جان لوں گا پھر بتاؤں گا۔''

زہرہ دیکھتی ہے کہ کبیر ناصر کو دیکھتا ہے جو مدد علی کو بیڑیاں پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبیر

Scanned by CamScanner

ہنستا ہے۔ ’’ڈاکٹر تم سچے عاشق ہو۔ مگر بیڑیاں نہیں پہنا سکتے۔ تم اس کام میں بھی نااہل ہو۔‘‘
ناصر کا چہرہ نفرت سے مسخ ہو جاتا ہے وہ زہرہ کو دیکھتا ہے، زہرہ لرز جاتی ہے۔ ناصر مسکراتا ہے اور زہرہ جان جاتی ہے کہ وہ اُسے کیا بتا رہا ہے۔ ’’میں اسے نہیں بتاؤں گا کہ وہ مر چکا ہے۔‘‘

زہرہ ناصر کا احسان مانتی ہے۔

زہرہ ہاف مین جنم کھنڈر میں ڈرائینگ روم کے...... مہمانوں کا استقبال کر رہا ہے۔ وہ جرمن زبان بولتا ہے۔ جو سب کو سمجھ آتی ہے۔ اور انہیں بتاتا ہے وہ سب پہلے زینے کے رستے اُس کے پیچھے پیچھے آ جائیں ورنہ بھول بھلیوں کا شکار ہو جائیں گے......‘‘

ڈرائینگ روم کے سب مہمان نچلے کمرے میں ہیں جیسے بہت دور تک پیچھے تک پھیلے کھڑے ہیں۔ چبوترے کے پاس عجیب نام کا نواب، منحوس شکل کا ایڈیٹر، زہرہ کا باپ یاور عطائی، کبیر مہدی، ہاف مین، ناصر، امبر جان کھڑے ہیں۔

زہرہ امبر جان کو دیکھتے ہی نفرت میں ڈوب جاتی ہے۔ کراہت میں جنم لیتی ہے۔ ابکائی میں بس جاتی ہے۔ امبر جان اُس کی طرف دیکھتا جاتا ہے۔ دیکھتا جاتا ہے۔ دیکھتا جاتا ہے۔ دیکھتا جاتا ہے۔

’’تم اب اُس کی قربانی کیوں نہیں دیتے۔‘‘ زہرہ چلاتی ہے اور مدد علی کو دیکھتی ہے۔ جو آلتی پالتی مارے چبوترے پر بیٹھا رہتا ہے۔ قربانی کا انتظار کرتا ہے۔ انتظار سب انتظار کرتے ہیں۔ انتظار...... انتظار...... انتظار...... انتظار...... زہرہ نہیں جان پاتی کہ سر کیسے کٹتا ہے۔ کٹا ہوا سر اس کے قدموں میں گرتا ہے۔ وہ دہشت سے پیچھے ہٹتی ہے۔ دیکھتی ہے وہ امبر جان کا سر ہے۔ جو آنکھیں کھولے اُسے دیکھتا جاتا ہے۔ باتیں کرتا ہے۔

’’میں تیرے لیے نہیں مر سکتا...... تیرے باپ نے مجھے بہت مضبوط کر دیا ہے...... بہت...... بہت...... بہت......‘‘

کٹا ہوا سر قہقہے لگاتا ہے اور زہرہ چیختی ہے اور خواب کے بعد خواب کے درمیان پھیلی نیستی کی تاریک دھند میں گم ہو جاتی ہے...... بھوری غنڈی بطخ کا گرم بھاری دھڑکتا جسم زہرہ کے ہاتھ میں مزہ دیتا ہے۔ وہ اُسے ہاتھ میں ترازو کرتی ہے اور ایک جھلارہ دیتی ہے۔ بطخ قیں قیں

Scanned by CamScanner

کرتی ہے۔ڈاکٹر ناصر آتا ہے۔

''تم پھر آ گئے میرے باپ پر الزام لگانے۔میں نے تو تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔''

''ہاں میں یہ ثابت کرنے واپس آیا ہوں کہ بھوری غنڈی بطخ پر Aphrodisiacs اثر نہیں کرتیں۔''

زہرہ حیران ہو جاتی ہے۔اتنی حیران......اتنی حیران......

''تم یہ کیسے ثابت کر سکتے ہو۔تم یہ ثابت نہیں کر سکتے۔''

''میں یہ ثابت کروں گا۔تمہارا باپ عطائی ہے میں عطائی نہیں ہوں۔''

''میرا باپ مانتا ہے...... جانتا ہے......وہ عطائی ہے۔''

''پھر بھی وہ عطائی ہے۔''

''تم بھوری بطخ پر اپنا الزام ثابت نہیں کر سکتے۔''

ناصر اُداسی سے مسکراتا ہے اور زہرہ جان لیتی ہے۔کہ ناصر سوچتا ہے کہ وہ یہ بات ثابت کر دے گا تو پھر زہرہ کو دُکھ ہو گا۔وہ میرا دُکھ برداشت نہیں کر سکتا......کبیر کہتا ہے وہ میرا سچا عاشق ہے......ناصر اُداسی سے مسکراتا ہے۔جیب سے سرجری کا ایک آلہ نکالتا ہے۔بھوری غنڈی بطخ کو اُلٹا کرتا ہے اور گرم سفید کھال پر ایک گہرا لمبا شگاف ڈالتا ہے۔شگاف بڑا ہو جاتا ہے۔

''دیکھ لو اندر کچھ بھی نہیں۔''

زہرہ دنگ رہ جاتی ہے۔اندر......اندھیرا ہے......خلا ہے......سناٹا ہے......بھوری غنڈی بطخ کے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔زہرہ نہیں مانتی مگر دنیا گرم کالی بھاپ سے بھر جاتی ہے اور ہر سانس کے ساتھ اندر اُترتی ہے۔زہرہ زور زور سے انکار میں سر ہلاتی ہے۔بھاگتی ہے...... بھاگتی ہے......فراک پہنے بھاگتی ہے۔آٹھ سال کی بچی بھاگتی ہے۔زور زور سے چلاتی ہے...... نائیں......نائیں......نائیں......نائیں......نائیں......بچی کی ماں بچی کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتی اُسے گھماتی ہے زمین پر پٹختی ہے......تیرا باپ بھی مجھے......نہیں......نہیں کہہ سکتا......نہیں کی بچی......سور کی بچی......ڈھیٹ...اڑیل......یہ تیرا نہیں تیرے گندے خون کا قصور ہے۔ڈاکٹر ناصر آتا ہے۔وہ سفید ایپرن پہنے ہوئے ہے۔اُس کے ہاتھ میں سرجری کا آلہ ہے۔ناصر بچی کی ماں سے بات کرتا ہے۔''میرا نام ناصر ہے میں ایک سائیکیاٹرسٹ ہوں۔میں گندا

خون نکالتا ہوں۔'' دنیا سازش سے بھر جاتی ہے درختوں، دیواروں، پتھروں، کے پیچھے بہت سے لوگ چھپے ساری باتیں دیکھ رہے ہیں سُن رہے ہیں۔ (ماں۔عورت) (ڈاکٹر۔مرد) کو (بچی۔عورت) کا گندا خون نکالنے کا کہتی ہے۔ناصر آلہ لیے بچی کی طرف بڑھتا ہے۔قریب......
قریب......قریب......قریب......قریب......

O

چوتھے کونے کے دروازے کو دھکیل کر امبر جان جب آگے کو بڑھا تو عنابی پردے کا شگاف پورا کھل گیا اور اگلے ہی لمحے اپنے بے ڈول جسم اور بے قابو ذہن سمیت وہ مکمل اندھیرے میں تھا۔ایک ابتدائی حیرت اور بے چینی کے ساتھ جو پہلی سوچ اُس کے ذہن میں آئی وہ اپنے تحفظ کی تشویش کرنے اور رسالے والے اور افسر کی شرارت بازی پر لعنت بھیجنے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ چند لمحے وہ ٹھٹکا ہوا ایک ہی جگہ کھڑا رہا۔ پر دوسرا خیال اُسے یہ آیا کہ یہ جگہ یقیناً غسل خانہ نہیں ہو سکتی اور اگر غسل خانہ نہیں ہو سکتی تو پھر کیا ہو سکتی ہے۔ پھر اُس نے سوچا کہ اب وہ اس جگہ آن ہی گھسا ہے تو دیکھ کر جائے کہ بڈھے عطائی نے انگریزوں کے زمانے کی اس پرانی کوٹھی میں یہ کیا جگہ بنائی ہے۔ یا کہ اُس کو بنی بنائی مل گئی ہے۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی تو بیرونی دروازہ اور باہر چاندنی رات میں ڈوبے درخت، جھاڑیاں، پودے اُسے یک دم سے بے حد پُر خطر نظر آئے جن میں انجانے دشمن گھات لگائے بیٹھ سکتے تھے۔ اُسے اپنے پستول کا خیال آیا جو اُس کے پاس نہیں تھا پھر اپنے اس خیال پر وہ جی ہی جی میں ہنسا مگر پھر کسی چوکنے حیوان کی طرح اُس کا ذہن اردگرد کی دنیا کو زیادہ مستعدی سے قابو میں لانے لگا اور پچھلے کئی گھنٹوں کی خرمستیوں کے اثرات ماند پڑنے لگے۔ اُس نے اب اُس تکونے کمرے کے اندر پڑی چیزوں پر توجہ کی۔ باہر کی چاندنی اندر کے اندھیرے کو ملگجا بنا رہی تھی اور امبر جان کو کاٹھ کباڑ کے اجزاء پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے دیوار کے قریب پڑے صوفے پر کسی کو لیٹے ہوئے دیکھا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور وقت کے کسی بھی لمحے میں اپنے آپ کو تنہا وجود سمجھنے والا فرد جب اچانک کسی دوسرے فرد کی موجودگی سے آگاہ ہوتا ہے تو اُس گوشے کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

یہ اچانک دریافت کہ اس انجانی جگہ میں کوئی دوسرا بھی موجود ہے اور اُس دوسرے کے بارے میں وہ سرے سے کچھ بھی نہیں جانتا سید حادل میں ٹھوکر مارنے والا احساس ہے۔ جو لمحوں کے لیے فرد کو نامعلوم کی بے وزنی میں معلق کر دیتا ہے.......... اندھیرے میں...... صوفے...... پر...... کوئی ...... لیٹا ہے۔ امبر جان جیسے کندہ ناتراش کے لیے یہ ادراک اولاً ایک بھجکی نماڈکار کا پیش خیمہ بنا پھر دہلانے والے اندیشوں کا فی الفور خاتمہ کرنے کے لیے اُس نے سوچا "یہ کوئی ملازم لیٹا ہے۔ یا سو رہا ہے۔ ہاں سو ہی رہا ہے۔ پارٹی کے بیروں میں سے ہی کوئی ہوگا تھک کر ادھر آ کر سو گیا ہوگا ہو سکتا ہے وہ اُلٹیوں پر پردے ڈالنے والا بڈھا ہی ہو۔ امبر جان نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور پھر اپنی حماقت کا احساس ہونے پر سختی سے منہ بند کر لیا۔ صوفے پر سوئے ہوئے نے بے چینی سے حرکت کی اور امبر جان اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا...... "کہیں یہ...... ماں کا یار جاگ ہی نہ جائے...... سویا رہ...... مرا رہ...... بس...... بس...... جا رہا ہوں...... سویا مرا رہ...... جا رہا ہوں...... دیکھ لیا یہاں جو دیکھنا تھا.........................."

ڈاکٹر ناصر کا سرجری کا آلہ سٹین لیس سٹیل کی چمک دیتا ہے اور بچی کے اور قریب آ جاتا ہے۔ قریب...... بچی چیختی ہے اُسے پرے دھکیلتی ہے...... پرے...... پرے...... اور یک دم سب کچھ غائب ہو جاتا ہے..........

صوفے پر پہلو کے بل سوئی ہوئی زہرہ نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی پھر سیدھی کمر کے بل سو گئی۔ اُس کا بایاں بازو نیچے کو لٹک گیا اور ہاتھ کی لمبی مخروطی انگلیاں فرش کو چھونے لگیں۔ روشنی کی ایک مدھم سی لو ڈرائینگ روم کے دروازے اور عنابی پردے کے نیچے ایک مہین سی درز کی راہ سے چوتھے کونے میں داخل ہو رہی تھی۔ اتنی مدھم کہ نظر بھی نہ آتی تھی مگر فرش کے ساتھ چپکی صوفے کے نیچے کی طرف رینگتی اسی مدھم سی لو نے اپنی راہ میں حائل ہونے والے زہرہ کے ناخنوں کے ارغوانی رنگ کو اردگرد کی مردہ تاریکی میں یک دم زندہ کر دیا۔

امبر جان کی نظر انہیں ناخنوں پر پڑی اور وہ ڈرائینگ روم کے دروازے کی طرف مڑتا مڑتا صوفے کے نیچے فرش سے ذرا اوپر اُس ہلکی سی رنگین کسی عجیب سی چیز کو نظر انداز کرتے کرتے رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے ناخنوں کی رنگین نیل پالش اور ایسی انگلیوں اور ایسے ہاتھوں میں سے اُس ہاتھ کو پہچانا اور پہچان کے اُسی ایک ہلاکت آفریں لمحے میں کتنی ہی انسانی دنیائیں ہمیشہ

Scanned by CamScanner

کے لیے اپنی جون بدل گئیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر امبر جان کی گردن ایک ثانیہ پہلے دروازے کو مڑ جاتی یا زہرہ کا بایاں بازو لمحہ بھر بعد میں صوفے کی ملائم سطح سے پھسل کر نیچے کو سرکتا تو واقعات کا دھارا مدتوں کسی اور رفتار سے کسی اور سمت میں رواں رہتا۔ یاور عطائی...... زہرہ...... کبیر...... ناصر...... ہاف مین...... امبر جان...... نواب ثریا جاہ نادر جنگ اور ڈرائینگ روم کے مہمانوں کی زندگیاں کسی اور ڈگر پر کسی اور انجام کی طرف بڑھتی رہتیں۔ مگر وہ دنیا کوئی اور ہی دنیا ہوتی۔ ایک ناممکن دنیا جس میں، تنہائی میں خواب دیکھتی عورت پر کوئی مردانہ قانونِ فطرت، حملہ آور نہیں ہو سکتا...... ایک نامرد دنیا۔

اس تاریک کونے میں اس وقت کوئی عورت موجود ہے۔ حقیقتِ حال کا اتنا علم ہی کائنات کے ''امبر جان گوشے'' میں جبر و اختیار اور ضبطِ نفس کے بچے کھچے قوانینِ فطرت کو تہ تیغ کرنے کے لیے کافی تھا۔

حملہ آور فاتح سپاہی اپنے سب ہتھیار تانے مفتوح بستیوں میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ ہم جنس دشمنوں کے گوشت کو لاتعلقی سے چیرتے پھاڑتے اُن تند و تیز جنگجوؤں کو دشمن عورت کے گوشت کی بُو پاگل کر رہی ہے۔ اُن کے جسموں کا رواں رواں دہائی دیتا ہے۔ کہ وہ کہیں ہے، وہ ضرور کہیں ہے۔ بند دروازوں، دیواروں، فصیلوں کے پیچھے کہیں ہے۔ وہ مسمار کرتے ہیں۔ آگ لگاتے ہیں تہ و بالا کرتے ہیں اور تاریک گوشوں میں کونے کھدروں میں مقفل کمروں میں، خفیہ تہہ خانوں میں اُسے جا لیتے ہیں۔ دشمن عورت کا گوشت، فتح کا وہ میٹھا پھل، جو ہر فاتح کی آخری آرزو ہے......

'دشمن عورت' یوں اچانک اُسے اپنے سامنے مل جائے گی امبر جان متحیر ہے۔ مگر اُس کا تحیر دشمن عورت کے کچے گوشت کی بو سے زیادہ شدید نہیں۔ اس کے جسم کی موجودگی سے بڑھ کر ہوش و حواس برباد کر دینے والا نہیں۔ وہ سوچتا ہے ''یہ ناقابلِ یقین ہے، مانا نہیں جا سکتا۔'' مگر وہ ہے وہ سامنے ہے پھر اُسے اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہیں رہتی کہ جو وہ دیکھ رہا ہے وہ خواب ہے یا حقیقت، واہمہ ہے یا اصلیت۔

دشمن عورت کا وجود اٹل ہے اُس کی مردانگی کو سہارا دینے والے عطائی کی بیٹی وہ عورت ہے جس کی نفرت اُس کے لیے اتنی ہی شدید ہے جتنی کہ اُس کے لیے اس کی ہوس شدید ہے۔ مگر جو

Scanned by CamScanner

بات اُس کی دُشمن عورت، کبھی نہیں جان سکتی وہ یہ ہے کہ اُس کی نفرت کی جھلسانے والی آگ اُس کے باپ کے رگڑے کوٹے کسی بھی مصالحے سے زیادہ طاقت ور ہے۔ امبر جان کا ہوس کا پودا نفرت کی مٹی میں تنومند درخت بنتا ہے...... ''مگر کیا یہ وہی ہے اتنے بڑے گھر میں اُس کے لیے یہی جگہ ہے۔ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتی۔'' وہ صوفے کے ساتھ پنجوں کے بل بیٹھ جاتا ہے اور زہرہ کے چہرے کو بہت قریب دیکھتا ہے...... ''یہ وہی ہے''..............................

فاتح سُورما کو جلے ہوئے مکان کے کھنڈر کمرے میں ایک اور مل جاتی ہے۔ وہ ملبے کے ڈھیر کے پیچھے پتھر بنی بیٹھی ہے۔ جوان مرد کی بھوکی متلاشی نظریں بھی پہلی نظر میں اُسے پتھر جان کر گزر جاتی ہیں مگر پھر دشمن عورت کی شعلے برساتی آنکھیں خود اُسی کی دشمن بن جاتی ہیں۔ وہ نظریں سُورما کو چُھو لیتی ہیں وہ جل کر پلٹتا ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ آگ کی دو بھٹیاں ہیں۔ جو سُورما کو بھسم کر دینا چاہتی ہیں۔ سُورما آگے بڑھتا ہے وہ اس پر تھوک دیتی ہے سُورما کا پورا جسم تڑپ کر اکڑ جاتا ہے اور پورا جسم ہی اُس کی مردانگی کی سب سے نمایاں شناخت بن جاتا ہے وہ دشمن عورت کے جسم کی ہر پہچان کو پیس ڈالنے کے لیے اُس پر حملہ کرتا ہے اور اُس کے لباس کی دھجیاں اُڑانے لگتا ہے۔

''نہیں یہ ناممکن ہے۔ یہاں ابھی یہ ناممکن ہے۔'' امبر جان کے ذہن نے اُسے فیصلہ دیا۔ اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اُس کی نظریں اُس سرزمین کی سب اونچ نیچ تمام بلندیاں پستیاں ماپ رہی تھیں جو اُس کے لیے خواہش کے اضطراب اور نا آسودگی کے عذاب کی سرزمین تھی۔ وہ عورت جو ہمیشہ اُسے دیکھتے ہی اپنی نظروں سے اُس پر تھوک دیتی تھی۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کی نفرت کا تھوکا ہوا امبر جان کے لیے محبت والوں کی محبت کے شہد سے کہیں زیادہ میٹھا ہے۔ وہ سرزمین جسے عبور کرنے کی حسرت سرد راتوں میں اُس کے ریشے ریشے میں آگ لگا دیتی تھی۔ وہ سرزمین اُس سے بس ایک قدم کے فاصلے پر ہے..............................

فاتح حملہ آور آگے بڑھتا ہے مگر عیار سمگلر چیخ پڑتا ہے۔

''نہیں یہ ناممکن ہے۔''

امبر جان نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنے کسی بہت ہی عملی اور حقیقی انداز میں وقت کی جوڑ توڑ کرنے لگا۔ کوئی اُسے پوچھتا کہ جرم اور وقت کا رشتہ کیا ہے تو یقیناً وہ کچھ بھی نہ بتا سکتا مگر جرم

Scanned by CamScanner

میں منجھا ہوا اُس کا جسم اور دماغ دونوں بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ واقعہ جو 'جرم' کہلاتا ہے وقت کی کسی بالکل مختلف تقسیم کا تابع ہوتا ہے جسے عام انسانوں کے سیدھے سادھے شریف وقت کے پیمانوں سے ماپا نہیں جاسکتا۔ کامیاب مجرم روزمرہ کے بے ضرر زمان و مکان میں ایک پُرتشدد شگاف ڈالنے اور پھر اُسی شگاف کی راہ سے غائب ہو جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امبر جان میں اس صلاحیت کی کوئی کمی نہ تھی۔

"عطائی کی محفل کا آج کا کھیل ختم ہو رہا ہے۔ رسالے والا اور افسر ڈرائینگ روم میں...... شرارت سے اُسے ادھر بھیجنے کے بعد کتنی دیر اور اُس کا انتظار کریں گے...... ڈرائینگ روم سے آخری آدمی کے نکلنے تک کتنا وقت ابھی لگے گا۔ یہ پردہ موٹا ہے آواز روکتا ہے۔ دروازے کو...... دونوں دروازوں کو اندر سے بند کر کے...... ایک ہاتھ پکا منہ پر بھی ہو...... وہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے...... آواز بند رہے سانس آتا رہے...... پھر آوازیں رُکتی نہیں...... جیسے...... وہ...... اور وہ...... اور...... وہ مگر اُس سب میں تو کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا...... یہ بات دوسری ہے...... قسمت میری...... دونوں...... مجھے گھنٹہ پہلے اس کونے میں دھکا دے دیتے تو شاید بات بن جاتی۔ جب ڈرائینگ روم میں اُلٹیاں ہو رہی تھیں۔ شور ہو رہا تھا۔ تو ایک ادھر بھی اُلٹی ہو جاتی...... کسی نے زور آوری کی آوازوں پر دھیان ہی نہیں دینا تھا۔ مگر اب ڈرائینگ روم خالی ہو رہا ہے۔ نیند والا کیس گڑبڑ ہی ہوتا ہے...... کچھ پتہ نہیں ہوتا جاگنے پر کیا ہو جائے...... دہشت...... بے ہوشی...... موت...... بے ہوشی ایک راہ تو ہے...... بے ہوشی کے اندر اندر ہی اندر...... دہشت کی بے ہوشیاں جلدی...... اچانک ختم ہو جاتی ہیں...... اچانک ختم ہونے والے...... اچانک شروع ہونے والے سے بچو۔ کچھ بھی ہو...... بچو...... بچو...... شروع کرنا ختم کرنا اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ یہ تو بڑی شرط ہے ان کاموں میں...... شروع تو کر لیتا ہے امبر جان پر تُو تو ویسے ہی فوفاٹ ختم ہو جاتا ہے...... اس کا علاج تو عطائی بھی نہیں کر سکا...... (تو شاید اُس کی بیٹی کر دے۔) اب تیرے لیے بس اتنا ہی ہے...... جتنی دیر تو لیتا ہے بس اتنا ہی وقت لے...... چند گھڑیوں کی ہی بات ہے...... سامنے کھڑا رہ کر دور دور سے اپنے آپ کو قربان کر دے...... ابھی اور آگے تو نہیں جا سکتا۔ دشمن عورت سے تیرا فاصلہ بھی رہے گا"۔

امبر جان نے لباس کی ترتیب کو موزوں کیا اور اس طرح اپنے جسم کو کسی رکاوٹ کے بغیر اور

تسلسل سے چھونا ممکن بنالیا..................................

فاتح حملہ آور کھلی ہوئی دھند بھری آنکھوں سے آخری فتح کا خواب دیکھتا ہے جو اُس سے ایک ہی قدم دور ہے مگر پھر بھی خواب ہے۔ وہ نا آسودگیوں کو سہلاتا اور خوابوں کو اپنے بدن سے لپیٹتا ہے۔ اُس کی سانسوں کا گرم مرطوب اندھیرا گہرا پھیلتا ہے اور دنیا اُبلتے کیچڑ کی دلدلوں سے اُٹھتی گندھک اور گھنے جنگلوں میں گلتی سڑتی کھمبیوں کی بُو سے بھر جاتی ہے۔ زہرہ اسی دنیا میں واپس آتی ہے۔ زہرہ کو اس دنیا میں کون واپس لاتا ہے؟

اُس لمحے زہرہ کے اندر کہیں کوئی خواب نہیں تھا۔ خواب کے بعد بے خواب نیند جو موت کی ہم زاد ہے۔ جو انسان کو اپنے جسم کی حدود کی سلامتی سے بیگانہ کر دیتی ہے اور موت کی قوتیں اُسے اپنے نرغے میں لینے کو بڑھتی ہیں۔ وہ نیند جسے انسان کی اجتماعی دانش ازل سے یوں جانتی ہے کہ یہ سولی پر بھی آن لیتی ہے۔ مگر سولی سے بچا نہیں سکتی۔ سولی پر چڑھنے والا اس نیند سے واپس آتا ہے اور موت سے موت کی طرف بڑھتا ہے اور زہرہ اس رات کا آخری خواب دیکھتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی۔ کچھ بھی نہیں، کہیں کوئی کچھ بھی نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں اور نہیں بھی نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے مگر پھر بھی خواب دیکھتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے جس میں وہ کہیں نہیں ہے۔ خواب بھی نہیں ہے۔ دیکھنا بھی نہیں ہے۔ شروع بھی نہیں ہے اور آخر بھی نہیں ہے۔ نیستی کا ایسا دہلا دینے والا خواب ڈراؤنے خوابوں کا آخری خواب ہے۔

زہرہ کے چہرے پر اکتوبر کی ختم ہوتی سرد رات میں بھی پسینے کے موٹے قطرے پھوٹ نکلے۔ پچھلی رات کا چاند کہیں مغربی آسمان میں ننگا آخری روشنی دے رہا تھا۔ جو چوتھے کونے کے اوپر کہیں روشن دان کے شیشے سے منعکس ہو کر امبر جان کو اردگرد کی تاریکی سے نمایاں کر رہی تھی۔ زہرہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور "او...... یہ سب کچھ تو خواب تھا۔" کا تسلی بخش سکون آور انکشاف ہونے سے پہلے ہی اپنی اُس جگہ موجودگی کا لرزانے والا احساس یک دم سے اُسے ہوش وحواس کی دنیا میں واپس لے آیا۔ جیسے سولی پر سو جانے والا جاگتے ہی جان جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ صوفے سے نیچے لٹکے ہوئے اپنے بازو کو اوپر اُٹھاتے ہوئے زہرہ نے تیزی سے اُٹھ جانا چاہا اور اُسی لمحے اس نے اسے سامنے بالکل قریب کھڑے دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اُس نے یہی سمجھا کہ شاید وہ ابھی بھی خواب دیکھ رہی ہے۔ غلام باغ کے جنم کھنڈر کے نچلے تہہ خانے میں ہے اور امبر جان کا کتا

ہوا سر واپس جا کر اُس کے جسم سے جُڑ چکا ہے اور دوبارہ جسم سے جُڑ جانے کی بے پناہ خوشی اور بے انتہا لذت نے اُس کے چہرے کے نقوش کو بُری طرح مسخ کر دیا ہے سر کی واپسی پر اُس کا سارا جسم جھٹکے کھا کر خوشیاں منا رہا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے دن کی صبح کی لو میں زہرہ کا منہ حیرت سے کُھل گیا۔ نہیں یہ خواب نہیں ہے۔ اُبلتے کیچڑ کی دلدلوں سے اُٹھتی گندھک اور گھنے جنگلوں میں سڑتی کھمبیوں کی بو اُس کے نتھنوں کو چیرتی اُتر گئی اور پھر یہ احساس ہونے سے پہلے کہ اُس کی چیخ اُس کا راز افشا کر دے گی زہرہ کے حلق سے وہ چیخ نکلی جو دشمن عورت کی ناف سے جب کوندتی نکلتی ہے تو کامیابی میں لت پت حملہ آور کے احساسِ فتح مندی کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتی ہے............

O

ڈرائینگ روم میں جو جہاں تھا اور جس حال میں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ جیسے کسی عورت کی وہ چیخ کوئی اساطیری طلسمی فسوں تھی۔ جس نے ہر متنفس کو پتھر کے مجسموں میں تبدیل کر دیا تھا۔ پھر یہ لمحہ بھی گزر گیا اور وہ حیرت استعجاب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور وہ جو ابھی تک عطائی کے قریب کھڑے تھے اُن کی نظریں فی الفور میزبان کے چہرے پر گڑ گئیں۔ بیرونی دروازے تک پہنچے 'دوست' بھی پلٹ آئے اور وہ بھی عطائی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ڈرائنگ روم میں سناٹا تھا۔ جس میں فرش پر اُلٹی کرتے نواب کی آخری غرغراہٹ بھی ختم ہو چکی تھی وہ منہ سے غلاظت صاف کرتا اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور عطائی کو گھورنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ ان گنت نگاہیں سب مل کر اُس سے اُس چیخ کا حساب مانگ رہی تھیں۔

کبیر کے ذہن میں مدد علی کی وہ دلدوز چیخ واپس آ گئی۔ جو اُس نے اور ہاف مین نے ایک تاریک رات غلام باغ میں بیٹھے سُنی تھی۔ جب وہ ایک نہ ختم ہونے والی واہی تباہی کے مزے لے رہے تھے۔ وہ چیخ جس نے مدد علی کی گویائی چھین لی تھی اور ناصر اور ہاف مین کی سب کوششیں ابھی تک اُسے بلوانے اور جنم کھنڈر کے نچلے کمرے میں اُس کے آخری لمحوں کے اسرار جاننے میں ناکام رہی تھیں۔

ہاف مین کے ذہن میں ایسی کوئی بھی یاد واپس نہ آئی۔ عطائی کے ڈرائینگ روم میں عورت کی چیخ نے اُسے فوری طور پر ایک اجنبی دیس میں اپنی 'قابلِ اعتراض' نقل و حرکت پر شدید تشویش

Scanned by CamScanner

میں مبتلا کر دیا اگر وہ یہاں کی کسی مجرمانہ واردات کے جھمیلوں میں پھنس گیا تو مکمل برباد ہو جائے گا۔ اُس کی یونیورسٹی جو پہلے ہی اُسے مزید مالی امداد دینے میں لیت و لعل سے کام لے رہی ہے اُسے سیدھا واپسی کا ٹکٹ بھجوا دے گی۔

سینئر بیوروکریٹ اور مؤقر جریدے کا ایڈیٹر ایک دوسرے کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے اُن دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

امبر جان اور اس عورت کی چیخ میں کیا تعلق ہے؟

مگر یہ کہ چیخ آئی کدھر سے ہے؟ ایسا کوئی سوال کم از کم اُن دونوں کے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ وہ اس کا جواب بخوبی جانتے تھے۔ وہ عطائی کی طرف دیکھنے کی بجائے ڈرائینگ روم کے اُس کونے کی طرف دیکھ رہے تھے جس میں انہوں نے امبر جان کو گھسا دیا تھا اور پھر وہ واپس نہیں آیا تھا صرف عورت کی چیخ آئی تھی۔

تحیر اور اضطراب سے بھرا سناٹے کا وہ لمحہ بھی گزر گیا اور پھر بیک وقت بہت سے لوگوں کی سرگوشیاں کمرے میں پھیل گئیں۔ عورت کی چیخ نے ایک ہی لمحے میں نامعلوم امکانات کا ایسا خلا تخلیق کر دیا تھا جس میں عطائی کے چاہنے والے ان سب مردانہ انسانی دماغوں کے تخیل انتہائی بے تابی سے بھن بھنا اٹھے تھے مگر اُن کے تخیل کی وہ پروازیں عطائی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مردہ ہو کر گر جاتی تھیں۔ ہر دیکھنے والا اُس ایک لمحے میں عطائی کے ساتھ اپنے اپنے جادوئی تعلق کی موت سامنے دیکھ رہا تھا۔ برس ہا برس پہلے جو شخص 'گنجینۂ نشاط' کی پوتھی تھیلے میں ڈالے بوڑے شہر میں وارد ہوا تھا جس نے دنیا کی سب سے مقبول عطایت کی قیمت سے اپنے لیے کالے جادو کا شہر تعمیر کیا تھا 'عورت کی چیخ' نے ایک ہی ہلاکت خیز لمحے میں اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

کبیر نے اُس کے چہرے کو دیکھا جسے اُس نے اُس رات پہلی بار دیکھا تھا اور اُسے اُس بے رحم مضحکہ خیز دیوانی رات کے ہر شدید لمحے سے گزرتا ہوا متواتر دیکھا تھا اور شدید لمحوں میں اُس کے چہرے پر زمانوں اور دنیاؤں کے خاتمے سے پہلے نمودار ہونے والی قیامت کی نشانیاں تھیں۔ جیسے ہر شخص اپنی اپنی قیامت سے پہلے صور پھونکنے کی آواز سنتا ہے اور آخری گھڑی کے آن پہنچنے کا اٹل احساس اُس کے چہرے پر ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ جب تار پر چلنے والا جان لیتا ہے کہ بس اب اُس کے توازن کو بگڑنے سے دنیا کی کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ فصیل میں پہلا شگاف پڑتے

Scanned by CamScanner

کی قلعہ بند تاجدار اپنے سرکوریت پر لڑھکتا دیکھ لیتا ہے۔ آخری ناقابلِ تردید ثبوت سامنے آجانے کے بعد کوئی بھی شخص مجرم کو تختۂ دار سے بچا نہیں سکتا۔ صدیوں پر محیط سچائی کے دعووں کو ایک ہی متضاد شہادت باطل کر دیتی ہے۔ بہروپیے کا بہروپ ایک لمحہ بھی اور قائم نہیں رہ سکتا...... پُر تشدد خاتموں کے وہ سب منظرنامے کبیر نے اُس ایک لمحے میں عطائی کے چہرے پر رقم دیکھے......

جرم کے زمان ومکان کی خصوصی مہارت نے امبر جان پر حکم لگایا تھا کہ وہ اپنی مردانگی کے پُرتشدد خاتمے سے باز رہے۔ اسی لیے جنگجو حملہ آور بن کر 'دشمن عورت' کو فتح کرنے کی بجائے اُس نے......اُس کے بے سدھ جسم کی موجودگی میں...... محض اُس کے تصور کو زیر کر لینا ہی کافی سمجھا تھا۔ جیسے کبھی کبھی زبردست نامی گرامی ڈاکو بھی موقع واردات پر خطرہ دیکھ کر اپنی سلامتی کی خاطر معمولی اُچکا پن دکھا کر فرار ہو جاتے ہیں۔ امبر جان اپنے ارادے کی جلد از جلد تکمیل میں جُت گیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ شانتی کے مقام تک پہنچنے میں اُسے دیر نہیں لگے گی اور پھر وہ اپنی نڈھال مردانگی کو سمیٹ کر چپکے سے باغ کی طرف کُھلے دروازے کی راہ سے غائب ہو جائے گا۔ مگر پھر دنیا گندھک اور سڑی کھمبیوں کی بو سے بھر گئی تھی اور سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ زہرہ کی چیخ حقیقت کو واپس لانے کی ازلی اضطراری کوشش تھی۔ جب ذہن اور جسم خواب اور حقیقت کی بے یقینی کی اذیت برداشت نہیں کر سکتے تو چیخ کر حقیقت کو واپس بُلاتے ہیں اور جو حقیقت زہرہ کے سامنے آئی تھی وہ کائنات میں نرحیوان کی حقیقت تھی اور پھر انکشاف کے ایک ہی لمحے میں وہ جان گئی کہ وہ سوال جو سانس روکنے والے دھوئیں کی طرح بچپن سے اُسے پریشان کرتے تھے اور جن کے جواب جاننے کے لیے وہ آخر اس رات ایسی دیدہ دلیری پر اُتر آئی تھی اور اُس رات کی اُس کی مجنونانہ جستجو اور اُسے دغا دینے والی نیند اور ایسی ہلاکت میں ڈالنے والی نیند کے محافظ غدار وہ سب زہرہ کے خواب اور اس کا باپ اور اُس کے باپ کے وہ سب بڑے بڑے بااختیار دوست اور ان کی قے اور کبیر اور ناصر اور ہاف مین اور یہ کراہت انگیز نفرت انگیز غلاظت سے بھری مخلوق جو اُس کی چیخ کے بعد بھی اپنے کسی تشنج میں جھٹکے کھا رہی تھی۔ ان سب کی حقیقت یہی ایک حقیقت ہے۔

مگر جو حقیقت زہرہ ابھی نہیں جانتی تھی وہ نرجانور کے انزال کی حقیقت تھی۔ جرم کے زمان ومکان کی طرح انزال کے زمان ومکان میں کوئی مداخلت، مداخلت کار کے لیے ہلاکت خیز انجام

Scanned by CamScanner

کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ زہرہ کی چیخ نے مرد حیوان کی مردانہ عظمت کے انتہائی لمحوں میں مداخلت کی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مرد کی نہ پلٹنے والی مردانگی کو پلٹنا اُس کے دل و دماغ میں تباہ کن دیوانگی کا دھماکہ پیدا کر سکتا ہے۔

امبر جان کی تشنجی حرکت راستے میں ہی دم توڑ گئی۔ اُس نے اضطراب کی شدت میں اپنے بازوؤں کو ہوا میں حرکت دی اور اس کے جسم میں خون کے تھپیڑے نے اُس کے دماغ کو جڑ سے ہلا دیا۔ اپنی سلامتی کی فکر کرنے اور باغ کے رستے فرار ہونے کی کوشش کرنے کی بجائے وہ وحشیانہ شدت سے اُسی محروم کرنے والی 'چیخنے والی' پر جھپٹ پڑا۔ زہرہ اُچھل کر اپنے دونوں پاؤں پر آ ئی اور اب اُس کی چیخ مدافعانہ جارحیت سے بھری غراہٹ تھی۔ پھر چشم زدن میں ہوا جھلسانے والی حیوانی آگ سے بھر گئی تھی اور اُس کی لپٹوں میں ان ہستیوں کا ازلی و ابدی تصادم تھا۔ ان دونوں میں اب ایک بات مشترک تھی۔ وہ اس حقیر خدشے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ کہ جب انہیں اُس ہولناک مقام پر ڈھونڈ لیا جائے گا تو دُنیا اُس کے بعد کیا ہو گی۔ ڈھونڈنے والوں میں عطائی سب سے پہلا تھا کہ ایسا اُسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ عنابی پردہ تیزی سے دائیں بائیں ہٹا تھا۔ دروازہ دھڑاک سے چوتھے کونے میں کھلا تھا۔ ڈرائینگ روم کی عفونت زدہ ہوا بیرونی دروازے کی راہ سے باغ میں کھلے صبح کے پھولوں کی خوشبو سے ٹکرائی تھی اور صبح کی لو تیز ہو کر اُن دونوں پر آئی تھی اور عطائی نے ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دینے پر تلی ہوئی ان دونوں قوتوں کو دیکھا۔ جن میں سے ایک اُس کے اپنے وجود کا حصہ تھی مگر نہیں تھی اور دوسری قوت اُن میں سے تھی جن کی طاقت کے قلعے میں نقب لگا کر اُس نے اپنی پچھلی نسل کی ذلت کا حساب برابر کرنا چاہا تھا اور اگلی نسل کو زمین پر عزت سے سر اٹھا کر چلنا سکھایا تھا اور انہیں کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ اصل میں کون ہے اور کس انوکھی واردات سے اُس نے خصی بادشاہوں کو پھر سے توانا بنانے کا چھل دے کر اپنی ایک بادشاہت بنائی ہے۔ اُس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ مگر یہ لڑکی جو اُس کی بیٹی تھی پوچھتی تھی جس میں اس کا پرانا گندا مگر خون زور مارتا تھا اُس سے پوچھتی تھی..................

''آپ اس ڈاکٹر کی بکواس کو چھوڑیں پاپا...... آپ مجھے ایک اور بات بتائیں......''

''کیا'' عطائی کے لب ہلے اور وہ انہیں قدموں پر ٹھہر گیا۔

''ہم کون لوگ ہیں پاپا؟''..................

Scanned by CamScanner

عطائی تیزی سے آگے بڑھا کہ اُسے بتائے کہ وہ حاکم علی کانٹے والے اور ماسٹر کرم الٰہی اور
بدراں دتے کی نسل سے ہے اور اُس کی نسل میں سے ہے جس کی ماں نے اُسے ایک جنگلی بلا جنا
تھا۔ جو اپنی ماں کے خون کو سستا بہا کر اُس پر اپنی ہوس تھوکنے والوں کی آنکھیں نکال لیتا ہے۔ وہ
آگے بڑھا دروازے میں جھانکتے خصی بادشاہ اور بھی آگے کو جھانکے اور عطائی نے دیکھا کہ وہ اُس
کی بیٹی نہیں ماں ہے.................................

اور قیامت کی نشانیوں کے بعد قیامت کا وہ لمحہ عطائی کے لیے کائناتی انکار کا لمحہ تھا۔ مکمل اور
اٹل انکار! ایک ایسی تردید جو کسی ذی روح کے لیے زندگی کے اثبات میں ممکن نہیں۔ جس کی
گنجائش صرف موت کے اتھاہ اندھیروں میں نکلتی ہے۔

"یہ اس کی بیٹی ہے؟" ایک خصی بادشاہ نے سرگوشی کی۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے کون ہو سکتی ہے" دوسرے نے کہا۔

"اس بے قوف امبر جان کو تو ہٹاؤ" تیسرے نے کہا۔

امبر جان کو ہٹانے والا کبیر تھا جو اُن سب میں سے نہیں تھا۔ امبر جان نے اپنے چہرے کے
گوشت میں کھدے دشمن عورت کے ناخنوں کے گہرے نشانوں کو چھوا، مسکرایا مُڑا اور ساری رات
انگریزی میں ادھر اُدھر بک بک کرتے رہنے والے۔ ساری تباہی لانے والے۔ کبیر مہدی کو اُسی
لمحے اپنے جرم کے زمان و مکاں میں لے گیا۔ اُس نے خون میں لتھڑے اپنے ہاتھ کو اور پھر زمین
پر گرتے عطائی کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

"سرخ تیل والا جا رہا ہے" اُس نے بھرائی آواز میں کہا۔

"زمین گر رہی ہے" ......بس یہ کچھ تھا جو اندھیروں میں اُتر جانے سے پہلے انعام گڑھ کے
یادار حسین بڑے شہر کے یاور عطائی کے شعور میں تھا اور پھر کچھ بھی نہیں تھا۔

000

Scanned by CamScanner

باب (12)

آؤ عشق پر بات کریں

ہوا کے جھونکے نے ایک ہی لمبی زناٹے دار حرکت میں سُرخ کنیر کی جھاڑیوں کو زمین پر جھکا دیا۔ لان میں گرے خشک خزاں زدہ پتے تیزی سے اُڑ کر وِپنگ وِلو کے اُس درخت سے جا ٹکرائے جو 70 پارک لین کی بیرونی دیوار کے قریب کئی برسوں سے کھڑا تھا۔ وِلو کی سدا آنسو بہاتی ٹہنیاں پھڑ پھڑا کر ہوا میں معلق ہوئیں اور پھر تیزی سے پیچھے کو ہٹ گئیں اور اس طرح درخت کا وہ موٹا تنا سامنے آ گیا جو پچھلے کئی ہفتوں سے ٹوٹ کر نیچے لٹک رہا تھا مگر دور سے دیکھنے پر نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا کے جھونکے نے اُس نیم مردہ تنے اور خشک ہوتی ٹہنیوں کو بھی بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ستر پارک لین میں اپنے بیڈروم کی کُھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی بیگم عارفہ یاور نے اُس ٹوٹے ہوئے تنے کو آج پھر دیکھ لیا اور سوچنے لگی کہ آج تو وہ ضرور مالی سے کہہ کر اس بدنما بوجھ کو کٹوا دے گی ورنہ خود گرنے پر وہ دیوار کا نقصان بھی کر سکتا ہے۔ چند ہفتے پہلے یہ تنا لان میں قناتیں لگانے والوں نے رسا باندھنے کے چکر میں توڑ دیا تھا۔ حالانکہ اس کے بڑے بیٹے نے تعزیت کے لیے آنے والوں کے بیٹھنے کے سب انتظام اپنی نگرانی میں کروائے تھے اور وہ ملازم پیشہ لوگوں کو من مانی نہیں کرنے دیا کرتا تھا۔ پھر بھی یہ تنا ٹوٹ گیا تھا اور بعد میں قنات لگانے والوں نے اُس کونے کے رسوں کو باندھنے کے لیے لمبے کھونٹے گاڑے تھے اور کاشف نے جب ان سے باز پُرس کی تھی تو اُس وقت عارفہ لان میں ہی کھڑی تھی اور کرسیاں لگوائی جا رہی تھیں۔ جن میں سے چند ایک کے سوت کے نوار میں گذشتہ اور دوسرے لوگوں کی بے شمار تقریبوں میں گرے سالنوں اور دیگر مائع کھانوں کی موہوم سی خوشبو رچی تھی۔ اُس وقت اُس خوشبو نے حسیات کے کسی نامعلوم حیران کُن منطق کے ذریعے یاور عطائی کی بیوہ کو مرگ کی تقریب کے معتبر ہونے کا احساس

رلا دیا تھا اور زندگی میں پہلی بار اُس کی آنکھیں اپنے خاوند کے لیے نم ہو گئی تھیں۔

مُردے کی آخری رسومات یاور ہاؤس کی بجائے 70 پارک لین میں ادا کی جائیں گی جو شہر کے سب سے فیشن ایبل علاقے میں اُس کے بڑے بیٹے کی رہائش گاہ تھی۔ ماں اور دونوں بیٹوں کا یہی فیصلہ تھا اور زہرہ نے اِس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ خاموشی سے اس فیصلے پر بہت مطمئن ہوئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یاور ہاؤس کی فضا کو موت کے بعد کے چونچلوں سے پراگندہ کیا جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ یاور ہاؤس وقت میں وہیں کا وہیں ویسا کا ویسا منجمد ہو جائے جیسے آتش فشاں پھٹنے کے بعد لاوے کے دریا تلے دبنے والی بستیوں میں آخری بلاخیز لمحہ ہمیشہ کے لیے وہیں تھم جاتا ہے۔

ہوا کا تند جھونکا اُن مغربی ہواؤں میں سے تھا جو سردیوں کی بارش اور ژالہ باری اپنے ساتھ لاتی ہیں اور نومبر کے آخر میں موسم کی بے یقینی کے شکار لوگ یک دم جان جاتے ہیں کہ سردیاں اس سال بھی آئیں گی۔ بادل گھرے آ گئے اور سرد ہوا کھڑکی کے اندر داخل ہوئی تو نمی سے بھری تھی۔ عارفہ بیگم نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ وہ ٹھنڈ لگنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی اور وہ بھی اس عمر میں۔ اُسے یقین تھا کہ اگر وہ بیمار پڑ گئی تو اُس کی بڑی بہو صدقِ دل سے دُعا کرے گی کہ سُسر کے بعد ساس بھی رُخصت ہو۔ دوسری دنیا میں پھر اپنے شوہر سے جا ملنے کے تصور نے ہی اُسے دہلا دیا۔ مگر کیا ایسا ہوتا ہے کہ اس دنیا کے زبردستی کے رشتے اگلی دنیا میں بھی قائم رہتے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔ وہ کسی عالم سے پوچھے گی۔ پھر ایک دوسری کیفیت اُس پر طاری ہو گئی۔ عطائی کی موت کے بعد سے اب جب بھی مرنے والے کو معاف کر دینے کا قدیمی انسانی رویہ اُس پر کچھ اثر ڈالتا تھا تو وہ سوچتی تھی کہ اُس شخص نے اس سے کوئی ایسی بڑی زیادتی بھی تو نہیں کی تھی اگر زیادتی کی تھی تو اُس کے باپ نے، مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے کمزور لمحے کو رد کر دیتی۔ وہ اُس سے نفرت کرتی تھی اور کرتی رہے گی۔ مگر جو بات اُسے پاگل کر دیتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس سے کتنی شدید نفرت کرتی ہے مگر اس بات کا اُس پر رتی برابر بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً اگر وہ اس سے شدید محبت بھی کرتی تو بھی اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ نہ نفرت قبول کرتا تھا نہ محبت یہ سب کچھ اُس کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ وہ کہیں اور ہی رہتا تھا اپنی کسی عجیب خوفناک پاگل دنیا میں جس میں ہر وقت وہی دوائیوں کی بدبو رچی رہتی تھی اور

ہر مہینے بڑھے مشٹنڈوں کی دھما چوکڑی جس میں جانے کیسی واہی تباہی ہوتی تھی اور یہی واہی تباہی آخر اُسے لے ڈوبی اور زہرہ.................."

بادل زور سے گرجا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ عارفہ بیگم کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور جب پھر سے شروع ہوا تو اُس کی سمت بدل گئی۔ بھری دوپہر میں کیسا اندھیرا چھا گیا ہے اور یہ بارش ہاں شاید اولے بھی برسنے لگے ہیں۔ اب بڑا بیٹا دوپہر کے کھانے پر نہیں آسکے گا اور کھانے کی میز پر اُسے پھر اُن دو عورتوں کے ٹھنڈے چہرے دیکھنے کو ملیں گے جن میں سے ایک اُس کی بہو ہے اور دوسری بیٹی اور دونوں اُس سے نفرت کرتی ہیں۔ مگر کیا وہ زہرہ کے بارے میں یقین سے ایسا کہہ سکتی ہے کہ وہ اُس سے نفرت کرتی ہے۔ شاید نہیں، ہاں نہیں، کیا اُس کا باپ اُس سے نفرت کرتا تھا۔ نہیں وہ نفرت بھی نہیں کر سکتا تھا یہ کوئی ایسا ہی گندا شیطانی خون ہے۔ جس میں نفرت کی گرمی بھی نہیں ان کے کوئی اپنے ہی شیطانی جذبے ہیں جن کا کوئی انسانی نام نہیں۔ کہیں اُس کی شادی کسی شیطانی مخلوق سے کسی جن، بھوت، کسی بدروح سے تو نہیں ہو گئی تھی۔ کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے اور ساری عمر انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر اولاد میں سے کچھ انسان نکلتے ہیں کچھ شیطان۔ اُس کی زندگی میں مجھے ایسا خیال کیوں نہ آیا۔ میرے مولا مجھے معاف کر۔ پاک پروردگار مجھے معاف کر۔ میرے دل میں کیسے خیال آ رہے ہیں کیسے شیطانی وسوسے آ رہے ہیں۔ بیگم عفت آراء نے جن عالم صاحب کا بتایا تھا اُن کے پاس جانا چاہیے کوئی وظیفہ بتائیں میرے دل کو سکون ملے۔ اب جبکہ وہ چلا گیا ہے تو اب تو سکون ملے مجھے۔

یاور عطائی کی بیوہ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر پورے جسم کو دائیں بائیں حرکت دیتی رہی جیسے اِس طرح انکار میں جھول جھول کر اپنے وسوسوں کو باہر نکال دینا چاہتی ہو ۔ پھر اُس نے دل سے عہد کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ کوئی ایسی اُلٹی سیدھی بات نہیں سوچے گی اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ کھڑکی کے شیشوں پر ہلکی سی دھندلاہٹ آ گئی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ کی فربہ ہتھیلی سے ایک شیشہ صاف کیا اور باہر نظریں، گاڑدیں اور پھر اُس نے اُسے دیکھا اور اُسے دیکھتے ہی اُس کے دل پر ہول طاری ہو گیا۔ وہ زہرہ تھی جو تیز برستی بارش، زناٹے دار ہوا اور اولوں کی بوچھاڑ میں گھومتی پھرتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے سر کو پیچھے جھٹک کر جو اُس کی مخصوص عادت تھی اپنا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا دیتی تھی اور منہ کھول دیتی تھی جیسے دھواں دھار برستی بارش کو سیدھا

پی جانا چاہتی ہو۔

"میرے خدا کیا یہ لڑکی پاگل ہے" عارفہ بیگم نے سوچا "ایسے یخ موسم میں یہ کیا پاگل پن کر رہی ہے"۔ اُس نے کھڑکی کے شٹر طرف گھما کر کھڑکی کو باہر کی طرف دھکیلا تا کہ زہرہ کو آواز دے کر باز کرے کہ وہ کیا کرتی پھر ہے۔ ہوا اور پانی کا فراٹا کوند کر اندر داخل ہوا اور اُس کے دائیں بازو اور سینے کو اندر تک ٹھنڈا کر اُس نے چیخ کر کھڑکی اپنی طرف کھینچ لی اور غضب ناک ہو کر دور اُسے دیکھا جیسے اُسے بھگو وہ گندی شرارت اُسی نے کی ہو۔ وہ اب فوارے کے گرد سبز سنگِ مرمر کے فرش پر جھکی کچھ رہی تھی۔ عارفہ بیگم کا کلیجہ سکڑ گیا جب اُس نے یہ دیکھا کہ وہ اولے چُن چُن کر اپنے منہ میں ڈال رہی تھی اور پھر ہزارویں دفعہ اُس کا وہی احساس اُس پر شدت سے غالب آ گیا۔ "میں نے جنم دیا ہے۔ مگر میں اُس کے لیے کچھ نہیں ہوں اور نہ ہی وہ میرے لیے۔ کیا ہو سکتا ہے لوگوں کو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔" زہرہ اب سیدھی تن کر کھڑی تھی اور بھورے لباس ساری کی ساری اُسے مٹی کی بنی دکھائی دی۔ اُس کے چہرے کا کٹاؤ ماتھے ناک ہونٹوں اور گردن پر اُترتا بالکل اُس کے باپ جیسا تھا۔ عارفہ بیگم یک دم سے بالکل لاتعلق ہو گئی اور سوچنے لگی کہ اُسے فوراً اپنا دھیان کرنا چاہیے۔ اُس نے پردہ کھڑکی کے سامنے کھینچتے ہوئے پھر باہر دیکھا تو اب زہرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ "جہنم میں جائے" اور عارفہ بیگم نے فوراً ہی اپنے بارے میں فیصلہ کیا کہ وہ اچھے خاصے گرم کپڑے پہنے گی اور پھر کچن میں جا کر خانسامے سے کہے گی کہ وہ دوپہر کے کھانے میں اُس کے لیے یخنی بھی بنا لے۔

"کاش میں اس وقت یاور ہاؤس میں ہوتی"۔ زہرہ نے سمندر بنے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خواہش کی۔ راج ہنسوں اور بھوری بطخ کو یاد کیا کہ ان گرتے پانیوں میں وہ کیسے موج مستی کر رہے ہوں گے۔ اریکا پام کے پودوں کو یہ تند ہوا بھی جھکا نہیں پاتی ہو گی اور اُس کا اپنا کمرہ بند مقفل کھڑکیوں اور دروازوں کے اندر کیسا لگتا ہو گا۔ "مجھے اب اپنے گھر جانا چاہیے میں یہاں نہیں رہ سکتی۔" اُس نے اپنے آپ کو بتایا اور 70 پارک لین وہ گھر جو اُس کے بھائی کا تھا اُس کے سانس کو روکتا تھا۔ وہ تو آج فطرت نے خود دنیا کے اس کونے پر دھاوا بول دیا تھا اور وہ اُس نفرت انگیز کمرے سے باہر آ گئی تھی جسے یہاں اُس کا بیڈروم بنایا گیا تھا۔ ورنہ وہ تو باپ کی موت کے بعد

Scanned by CamScanner

جب سے یہاں آئی تھی ایسا ہی محسوس کرتی تھی کہ زمین اور آسمان دونوں اُس سے چھن گئے ہیں۔
مگر آج پانی، ہوا اور مٹی کی طوفانی آمد پر وہ اُس گھر کے اندر ہوتے ہوئے بھی بالکل باہر آ گئی تھی
اُس نے اپنے بازو پھیلا کر چھینٹے اُڑاتے ہوا کے ایک تند جھونکے سے لپٹ جانا چاہا تو اولوں کی
بوچھاڑ پتھروں کی طرح اُس کے سینے پر برس گئی۔ ''مجھے سنگسار کیا جا رہا ہے۔''
زہرہ کے اندر اچانک ظاہر ہونے والا یہ فقرہ انسانی زبان کے اُن چھوٹے موٹے معجزوں
میں سے تھا جو ابتلا کے زمانوں میں کبھی کبھی انسان پر غیب سے نازل ہو جاتے ہیں اور اُس کی منتشر
ہستی کو ایک ہی مسیحائی لمحے میں پھر سے مربوط کر دیتے ہیں۔
ایک بے ساختہ مسکراہٹ مدتوں بعد اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی ''یہ کیسا عجیب وغریب خیال
میرے ذہن میں آیا ہے۔ مگر میں اس کی حق دار نہیں بالکل بھی نہیں میں اس کی حق دار نہیں''۔
اور پھر زہرہ نے اس طوفانی ہوا اور بارش میں خوب قہقہے لگائے اور اُبلتے کیچڑ کی دلدلوں
سے اُٹھتی گندھک اور گھنے جنگلوں میں سڑتی کھمبیوں کی بُو جو اُس کے مساموں میں دھرنا مار کر بیٹھ
گئی تھی بہہ نکلی۔ پانی میں ایک جیسے ڈوبے لان، پھولوں کی کیاریوں اور ڈرائیو وے میں سے وہ
کسی سمت کے بغیر شڑاپ شڑاپ چلتی ہوئی ایک آرائشی بینچ پر بیٹھ گئی۔ پاس ہی گرا برف کا ایک
پتھر اُس نے اُٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ ڈیپ فریزر میں جمے برف کے کیوبز کے مقابلے میں وہ
آئس برگ کا ٹکڑا تھا جس میں شہابیوں کی گرد کا ذائقہ تھا۔ یک دم سے زہرہ کو یوں محسوس ہوا کہ وہ
بالکل ہلکی ہو گئی ہے اتنی بے وزن کہ جیسے ہوا میں بلند ہو جائے گی۔ بارش تھم رہی تھی اور ہوا مدھم ہو
رہی تھی مگر وِیپنگ وِلو کے پتوں میں سے بہتی بارش کے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔
بیرونی دروازے کے پاس سے کار کے ہارن کی آواز آئی۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا اور
اُس گھر کا ڈرائیور زہرہ کے بھائی کو گاڑی میں بٹھائے اندر داخل ہوا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے اُس
بھاری بھر کم گورے چٹے نوجوان 'کاروباری بھائی آدمی' نے اپنی گولڈ فریم کی گول شیشوں کی عینک
سے گھر کے وسیع سبزہ زار کو پانی میں ڈوبا ہوا دیکھا۔ ناپسندیدگی کی ایک لہر اُس کے سارے جسم میں
دوڑ گئی۔ باہر سڑکیں بھی اگرچہ غلیظ پانی اور کیچڑ میں ڈوبی تھیں مگر پتہ نہیں کیوں اُسے یقین جیسا تھا
کہ اُس کے گھر کے اندر کے کھلے حصے پر اُس اچانک ٹوٹ برسنے والی بارش کا کچھ اثر نہ ہوا ہوگا۔
مگر ایسا نہ تھا بارش ہر جگہ ایک جیسی ہی برسی تھی اور پھر اُس نے بھی زہرہ کو دیکھا اور اُس کے چہرے

Scanned by CamScanner

کی ناگواری تحیر آمیز خوف میں بدل گئی۔ وہ کسی آبی جانور کی طرح جو پانی سے نکل کر کچھ دیر زندگی کا مزہ بدلنے کے لیے خشکی پر بیٹھ جاتا ہے، پتھر کے اس بینچ پر بیٹھی تھی جس کے پائے اُس کے اپنے پاؤں کے ساتھ پانی میں ڈوبی گھاس میں گڑے تھے۔ وہ بھی حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ جب گاڑی لمبی ڈرائیو وے پر آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی تو لہریں کیاریوں میں سے سر نکالتے پودوں کو ہلاتی پانی پر تیرتے گھاس کے خشک تنکوں کو بکھیرتی اُس کی ٹانگوں سے آ کر ٹکرا رہی تھیں اور اُس کے جسم میں ایک پُر لطف سرسراہٹ کا احساس جگا رہی تھیں۔ مگر اُسے حیرت اس بات پر نہ تھی کہ پانی کی لہریں انسانی جسم کو ہلا کر کیسے کیسے عجیب عجیب احساس پیدا کرتی ہیں بلکہ اس بات پر تھی کہ اُس کے بھائی جیسا آدمی ایسے غیر معمولی موسم میں آخر گھر کیسے آ گیا۔ صرف ماں کو خوش کرنے کے لیے، دوپہر کا کھانا گھر کھانے کے لیے تو آ نہیں سکتا۔ تو پھر وہ کون سی بات ہے جو چھوٹی باتوں میں نفع نقصان کا پاس کرنے والے اس شخص کو ایسے تند موسم میں اپنے دفتر سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ زہرہ کو اس بات پر حیرت تو تھی لیکن بس لاتعلق سی۔

مگر زہرہ کے لیے اُس کے بھائی کا تحیر آمیز خوف جبکہ اس نے اچانک اُسے مٹی ملے پانی سے یک جان ہو کر سرد ہوا کو گہری بے تکلفی سے اپنے اندر کھینچتے دیکھا تھا کسی اچانک ملنے والی دھمکی کے بعد کا احساس تھا۔ سُن کر دینے والا۔ جب تک اُن دونوں بھائیوں کا باپ زندہ تھا تو وہ دونوں زہرہ کے وجود سے ایسے ہی لاتعلق رہے تھے جیسے اپنے باپ کی اُس زندگی سے جو اُس کے مخصوص کمرے سے لے کر اُس کے مخصوص دوستوں تک محدود تھی۔ زہرہ جب تک یاور ہاؤس میں اپنے کمرے، اپنی یونیورسٹی، کتابوں، لان کی گھاس، پھولوں، تالاب، بطخوں، تک محدود تھی تو اُن کے لیے جیسے کہیں تھی ہی نہیں۔ ایک طرح سے یاور ہاؤس میں یاور عطائی کی بڑی زندگی میں ہی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ مگر اب جبکہ اُس شخص کی گہری سیاہ دُھند جیسی زندگی مٹ گئی تھی تو وہ اچانک ظاہر ہو گئی تھی۔ کیچڑ میں بھیگی ہوئی تیز سرد ہوا میں سے گھورتی ہوئی۔

گاڑی آگے بڑھ گئی اور پورچ میں رُک گئی۔ زہرہ کا بھائی جلد از جلد اُس عجیب وغریب شک کے بوجھ کو اپنی ماں کے کندھوں پر لاد دینا چاہتا تھا جو آج اُس خبطی نواب نے اُس کے ذہن پر ڈال دیا تھا اور ادھر اُس کے ذہن میں فالتو چیزوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ نواب ثریا جاہ کہنے کو تو یاور ہاؤس کی پرانی عمارت خریدنے کی پیشکش کرنے آیا تھا۔ مگر باتوں باتوں میں اس نے اُس

Scanned by CamScanner

آخری رات کی آخری صبح کا کچھ ذکر کر دیا تھا اور پھر زہرہ، امبر جان اور ڈرائنگ روم کے کسی کونے میں اُن دونوں کی موجودگی کا ذکر بہت ہی مشکوک انداز میں مگر برسبیلِ تذکرہ۔ کسی بھی خاص مقصد کے بغیر پھر کافی پینے کے دوران زہرہ کے بھائی نے بہت کرید کرنے کی کوشش کی مگر نواب صاف گول کر گیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ گیا کہ وہ دونوں بھائی سوچ لیں۔ انہیں یاور ہاؤس کا اُس سے بہتر گاہک اور کوئی نہیں ملے گا۔

اور کاشف نے اُسے بتایا کہ فیصل ابھی پاپا کے چہلم کے بعد دو دن پہلے ہی کاروباری ٹور پر بیرون ملک گیا ہے وہ آئے گا تو سوچیں گے۔ مگر دراصل وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اُسی وقت باہر سے بادل گرجنے کی آواز آئی تھی اور موسم بھی خراب ہو گیا تھا مگر پھر بھی اُس نے فوراً گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ماں خود ہی زہرہ سے پوچھے...... عجیب بکواس کی تھی بڈھے نے۔ وہاں جو کچھ ہوا ہو گا اُس میں عورت ذات کیسے پَر بھی مار سکتی تھی۔ زہرہ۔ خود اُس نے اور فیصل نے آج تک کبھی پاپا کی مخصوص get together میں شرکت کی خواہش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ دونوں مرد تھے۔ مگر کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا کہ وہ اُدھر کا رُخ بھی کرتے۔ کوئی ایسی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور اگر کبھی کوئی بہت خاص ضرورت ہوتی تھی تو پاپا خود ہی اُنہیں بُلا لیتے تھے۔ عام پارٹیاں بھی تو ہوتی رہتی تھیں اور سب اُن میں شرکت کرتے تھے۔ مگر یہ کہ...... زہرہ اُس رات اُس کونے میں تھی...... جس رات پاپا کی ڈیتھ ہوئی۔ کیا وہ پاگل ہو گئی تھی...... ہاں! اُس کے ذہن نے پورے یقین سے گواہی دی کہ وہ عورت جو اُس کی بہن ہے پاگل ہو سکتی ہے۔ جیسے وہ اس وقت پاگل ہو کر باہر گندے پانی میں بیٹھی ہے۔ جبکہ یخ ہوا اب تک فراٹے بھر رہی ہے اور بارش اب بھی اتنی ضرور گر رہی ہے کہ اچھے خاصے کپڑے برباد کر سکتی ہے اور شاید اکا دُکا اولا بھی گرتا ہو گا۔ میرے خدا تو کیا وہ برستے اولوں میں بھی باہر ہی تھی۔ یک دم یہ خیال زہرہ کے بھائی کے سامنے دیوانگی کی تباہ کن قوت کے لامحدود امکانات سامنے لے آیا اور پھر جیسے اندھیرے میں بھیانک شکلیں دیکھ کر بچہ خوف سے چیخ پڑتا ہے اور ماں کی طرف بھاگتا ہے وہ بھی ماں کی طرف بھاگا تاکہ اُسے پوچھے کہ اُس نے کیا دیکھا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

''ہاں وہ پتھروں کی طرح برستے اولوں میں بھی باہر ہی پھر رہی تھی۔ اولے اُس کے اوپر برس رہے تھے اور وہ چُن چُن کر کھا رہی تھی۔ میں اپنے کمرے سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ مگر اُسے باز

Scanned by CamScanner

نہیں رکھ سکتی تھی۔" ماں نے بیٹے کے پہلے سوال کا جواب دیا۔

"ہاں اُسے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے"۔ زہرہ کے بھائی نے کہا۔

بیگم عارفہ یاور بیٹے کے لہجے کی بے انتہا مایوسی اور اضطراب سے چونک پڑی "کیا ہوا" اُس نے پوچھا۔

پھر وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے..... جب کسی گھرانے میں کوئی عجیب الخلقت بچہ جنم لیتا ہے تو گھرانے کا ہر فرد اُسے اپنانے اور رد کرنے کی حدوں کے درمیان اُس سے اپنا ایک محفوظ فاصلہ بنا لیتا ہے تا کہ وہ اُس کی نظروں سے اوجھل رہے۔ مگر پھر جب ایک دن وہ بچہ ایک مکمل ذی ہوش ہستی بن کر اُن کے فاصلوں کو درہم برہم کرنے لگتا ہے تو سب گھر والے اُس کے خلاف ایک خاموش ان کہی مدافعتی جنگ میں جُت جاتے ہیں جس میں ہر کوئی اپنی اپنی حفاظت کے لیے اپنا اپنا حربہ استعمال کرتا ہے اور پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ اُس عجیب الخلقت کا عام انسانوں کی عام فہم دنیا سے اختلاف اتنا وحشیانہ ہو جاتا ہے کہ سارے گھرانے کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ایسے میں پھر وہ سب اپنی مصالحتی خاموشی توڑ کر مل کر کچھ واضح قدم اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

"میں اُس سے بات کروں گی" بیگم عارفہ یاور کا یہ فیصلہ ایسے ہی کسی اقدام کا اعلان تھا۔

"اور اُس سے یاور ہاؤس کو فروخت کرنے کی بھی بات کر لیں۔ اگر نواب اچھے پیسے لگا تا ہے تو ٹھیک ہے..... ویسے تو اس سو سال پرانے ملبے کی کوئی کیا قیمت دے گا۔ لیکن زمین بہت قیمتی ہے"۔ کاشف نے کہا۔

"تم بڑے بھائی ہو تم بھی بات کرو اس سے۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

کم ہمتی اور ناطاقتی کی ایک لہر بڑے بھائی کے جسم میں دوڑ گئی۔ زہرہ سے اس طرح کی کوئی بات کرنے کے تصور سے ہی وہ دور بھاگتا رہا تھا۔ مگر اب جبکہ وہ خاندان کے لیے ایک اجتماعی خطرہ بنتی نظر آتی تھی تو بھائی خطرے کے اس مقابلے میں اپنی ذمہ داریوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ لیکن وقتی طور پر بچ نکلنے کا ایک معقول عذر فوری طور پر اُس کے ذہن میں آ گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ماما" اُس نے کہا "مگر جس طرف نواب نے اشارہ کیا ہے..... اُس رات..... اللہ جانے کیا ہوا؟..... پتہ نہیں کیا؟ اس نے امبر جان کا بھی نام لیا..... صرف آپ کا ہی بات کرنا مناسب ہے آپ ماں ہیں۔ میرے سامنے..... بات ایسی نہیں..... میرے سامنے

Scanned by CamScanner

ہو...... بھائی کے سامنے...... آپ، سمجھ رہی ہیں ناں میری بات؟''

''ہاں......ٹھیک ہے......ٹھیک کہہ رہے ہو'' بات یا ورعطائی کی بیوہ کی سمجھ میں آ گئی اور پھر مرے ہوئے شوہر کے لیے اُس کا زہر شدت سے اُبل کر باہر آ گیا۔

''یہ اُسی کا نتیجہ ہے...... ویسا کچھ ہونا ہی تھا...... جو گند تمہارے باپ نے ان بڈھے مشٹنڈوں سے مل کر جمائے رکھا......ساری عمر''۔

مرحوم کا بیٹا بُری طرح جھینپ گیا۔

''پتہ نہیں...... پاپا کا تعلق......اُن دوستوں سے......وہ سب اتنی بڑی بڑی ہستیوں کے مالک لوگ ہیں......لیکن...... بہر حال...... میں چلتا ہوں......لیکن مسئلہ تو اب آگے کا ہے'' اُس نے لڑکھڑائی زبان میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آگے کا مسئلہ اب اس لڑکی کا ہے۔ جس کی رگوں میں وہی گندا خون دوڑ رہا ہے''۔ ماں نے کہا۔

نوجوان ۔ شادی شدہ۔ کاروباری بیٹے نے ساری عمر کبھی ماں کے اس گندے خون کے واویلے پر توجہ نہیں دی تھی۔ ماں کی باپ کے لیے نفرت کی تو اُسے بہت پہلے سے سمجھ تھی مگر پھر پوری طرح جوان ہونے پر اُس نے اس بات کو بھی کوئی زیادہ اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔ اپنے ہاں کی شادیوں میں اس طرح کی باتیں معمول کی باتیں تھیں۔ ماں کی شادی باپ سے زبردستی ہوئی ہوگی ۔خود اس کی شادی بہت بڑے ٹیکسٹائیل کے صنعت کار خاندان میں ہوئی تھی کوئی محبت والوں کے خاندان میں نہیں ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ تو اُسے بیوی کے عورت پن کا کافی شوق رہا تھا۔لیکن پھر وہ سمجھ گیا تھا کہ بیوی بیوی ہوتی ہے اور عورت عورت اور یہ دونوں ڈپارٹمنٹ الگ الگ ہیں اور الگ الگ توجہ اور ٹائم مانگتے ہیں۔مگر اب جبکہ وہ عورت جو اُس کی بہن تھی اور کسی کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی اور کچھ انجانے مسئلے کھڑے کرتی نظر آتی تھی تو پہلی بار اُس نے ماں کی اُس خون کی ہاہاکار پر سنجیدگی سے توجہ کی اور سوچنے لگا ہو سکتا ہے ماں ٹھیک کہتی ہو۔مگر اصل بات کیا ہے؟ اس پر اُسے تھوڑا اور سوچنا پڑا اور اوسط رفتار اور اوسط معلومات عامہ کے اُس کے ذہن نے نتیجہ نکالا کہ ''ماں شاید کسی موروثی مرض کی بات کرتی ہے۔ جو پاپا کی طرف سے اُس کی بہن میں آیا ہے اور غالباً اس مرض کا تعلق کسی طرح ذہن سے بنتا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر بھی ماں ہی اس قصے کو سب

Scanned by CamScanner

سے بہتر سمجھتی ہے۔ لیکن..........."

"کیوں نہ ہم اُس کی شادی کر دیں"۔ اچانک سوجھنے والی اُس نے فوراً اماں کو بتائی۔

"شادی" عارفہ بیگم نے ٹھنڈا سانس لیا پھر اُس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ "دیکھتی ہوں"۔ پہلے تو یہ پتہ چلے اُس رات کا قصہ کیا تھا۔

زہرہ اُس رات کا قصہ سُنانے کے لیے بہت پہلے سے تیار تھی اور وہ تو اس کے لیے بھی تیار تھی کہ جو قصہ وہ سُنائے گی وہ صرف اسی رات کا نہیں بلکہ ساری عمر کا ہوگا۔ اُس کا بھی جو گزر گئی اور شاید اُس کا بھی جو آنے والی ہے۔ مگر ایسا ہو نہ سکا اور واقعتاً جو قصہ وہ اُس بارش اولوں اور ہوا کے بعد آنے والی شام سُنا سکی وہ اُس کے چند ٹھہرے ہوئے جوابی فقروں سے آگے نہ بڑھ سکا اور ہمیشہ کے لیے وہیں تمام ہو گیا اور پھر جب تک یاور عطائی کی بیوہ زندہ رہی اُس نے یاور عطائی کی بیٹی سے اُس کے باپ کی آخری رات کے آخر کا حال پوچھنے کی بھی خواہش نہ کی اور یہ مسئلہ کہ وہ گھر اپنے عجیب الخلقت سے کیسے نمٹے گا، اِس کا فیصلہ بھی اسی شام کی اُن چند گھڑیوں میں ہمیشہ کے لیے ہو گیا تھا جب زہرہ نے کہا تھا۔

"اس رات نہ تو مجھے کسی نے ریپ کیا اور نہ ہی میں نے اپنی مرضی سے کوئی گناہ کیا"۔

"آپ اصل میں یہی پوچھنا چاہتی ہیں ممتا بھری تمہید کو چھوڑیں ماما"۔

"جی میں رات بھر وہیں رہی۔ ڈرائینگ روم کے چوتھے کونے میں عنابی پردے کے پیچھے چھپی"۔

"آپ کبھی سمجھ ہی نہیں سکتیں پاپا عمر بھر کیا کرتے رہے"۔

"یہ آپ کا مسئلہ ہی نہیں"۔

"ہاں میرا خیال ہے میں اب خوب سمجھتی ہوں کہ پاپا کا مسئلہ کیا تھا"۔

"ہاں یہ مسئلہ کہہ لیں۔ فساد کہہ لیں۔ عذاب کہہ لیں۔ اب میرا ہے"۔

"اُن کا حل اُن کا تھا اور ویسے کیا حل تھا (زہرہ ہنستی ہے۔ خوب ہنستی ہے) میرا میرا ہوگا۔ (سوچتی ہے کیا ہوگا) مگر یہ جو کچھ بھی تھا۔ ہے۔ ہوگا۔ ازل سے ابد تک کا معاملہ ہے"۔

"شاید میں پاگل ہی ہوں..................."

"تو میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں کیا..................."

Scanned by CamScanner

''امبر جان کو شرارت سے کسی نے اُس کونے میں بھیج دیا تھا۔ کبیر اور ہاف مین کا یہی خیال ہے۔ مگر مجھے کوئی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔''

''کبیر اور ہاف مین میرے دوست ہیں۔''

''ویسے جیسے دوست ہوتے ہیں۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یاور ہاؤس کو فروخت کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ یاور ہاؤس ویسا ہی رہے گا۔ وہ میرا اور میرے باپ کا گھر ہے۔ میں اپنے باپ کا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر آپ اپنے شوہر کے گھر نہیں رہنا چاہتیں تو آپ کی مرضی۔ وہ میرا گھر ہے اور مجھے اس گھر سے کوئی نہیں نکال سکتا..................''

اور یہ آخری بات تھی جو اُس شام 70 پارک لین میں زہرہ کے لیے عارضی طور پر بنائے گئے بیڈ روم میں اُن دونوں عورتوں کے درمیان ہوئی۔ دونوں کے تصور میں بھورے رنگ کی وہ عمارت تھی جسے نواب ثریا جاہ نادر جنگ خرید لینا چاہتا تھا۔ جسے زہرہ کا بھائی بیچنا چاہتا تھا۔ جسے زہرہ اپنا گھر کہتی تھی اور جس کی چار دیواری کو اُسی وقت زہرہ کی ماں نے اس کے گھر کی عجیب الخلقت مخلوق سے نجات پانے کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ (ایک زمانہ تھا جب لوگ جذام کے مریضوں کو کوڑھیوں کی بستی میں چھوڑ آتے تھے) ''بہتر یہی ہے یہ وہیں ٹکی رہے اُس پاگل خانے میں۔ میں تین چار ہٹی کٹی عورتوں کو (زنانہ پولیس) اُدھر ملازم رکھ دوں گی۔ اس کی خبر رکھتی رہیں اور مجھے بتاتی رہیں۔ ویسے بھی سوچنے کی بات ہے آخر یہ اور کہاں رہے گی۔ کاشف، فیصل کی فیملیوں کے ساتھ اس کا رہنا بڑے فساد ڈال سکتا ہے۔ مگر یہ باہر بھی تو آئے جائے گی۔ جو مرد یار بنا لیے ہیں تو کیا مرد ملازم بھی رکھنے پڑیں گے۔ (جاسوس)''

O

زہرہ کو اُن تین چار صحت مند مائیوں کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں تھا جو یاور ہاؤس میں اُس کا کام کاج کرنے کے علاوہ اکثر اُسے سخت مشکوک انداز میں دیکھتی رہتی تھیں اور دیکھتے دیکھتے تھک جاتی تھیں تو سو جاتی تھیں اور نہ ہی اُسے ان دو تین مسکین صورت ادھیڑ عمر اور بوڑھے مردوں پر کوئی اعتراض تھا جو گھر سے باہر نکلتے ہی اُس کا پیچھا کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر پھر جلد ہی اس کا

Scanned by CamScanner

بُرا ہی کھو کر ہاتھ ملتے رہ جاتے تھے۔ شروع شروع میں تو زہرہ نے اپنے گرد قائم کیے گئے اس حفاظتی چلتے پھرتے حصار کا کھیل بنا کر خوب لطف اٹھایا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتی کہ جاسوسی پر مامور کارکنوں کا جینا حرام ہو جاتا اور انہی دنوں اُس نے ناصر، کبیر اور ہاف مین سے خوب ملاقاتیں کیں اور انہیں بتایا بھی کہ یہ سب کچھ اُس کی ماں اور بھائیوں کو رپورٹ ہو رہا ہے۔ اس کی ایسی ہی کسی بات کے جواب میں کبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''سوائے عزیز از جان ڈاکٹر ناصر کی رپورٹ کے اور سب رپورٹیں بے ضرر ہوں گی۔''

''ایسا کیوں؟'' زہرہ نے جانتے ہوئے بھی کہ ''ایسا کیوں'' کبیر سے پوچھا۔

''اس لیے کہ ابھی تک وہ تمہارے عشق کے مہلک مرض سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔''

''مجھے ناصر سے پوری ہمدردی ہے'' زہرہ نے پورے خلوص سے کہا۔ اب کچھ عرصے سے اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ویسے ناصر اچھا دوست ہے اگر وہ اپنے اس مرض پر قابو پا لے یا نجات حاصل کر لے۔

ناصر نے فوراً موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے زہرہ سے کہا۔

''تمہارے جاسوس آج نظر نہیں آ رہے'' اور پھر پیشتر اس کے کہ زہرہ کوئی جواب دیتی اُس نے کہا۔

''اگر تمہارے خاندان والوں نے واقعی جاسوس تمہارے پیچھے نہ لگائے ہوتے اور یہ محض تمہارا واہمہ ہوتا تو تم بھی جاسوسوں والی بن جاتیں''۔

''جاسوسوں والی؟ کیا مطلب'' زہرہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

ناصر نے سوچا یہ اچھا ہوا کہ یہ بات اُسے سوجھ گئی۔ اب وہ 'جاسوسوں والی' اور پھر 'پیرانویا' کے بارے میں کافی بات کر سکے گا، اور بات اُس کی اپنی مصیبت سے کافی دور ہٹ جائے گی۔ اگر کبیر نے پھر کوئی خباثت نہ دکھائی تو۔

وہ چاروں کیفے غلام باغ میں تھے اُس میز کے گرد جو اب تقریباً اُنہی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی اور عاشق علی بیرہ ہر روز اُن کی متوقع آمد سے پہلے اُسے خوب چمکانے کی کوشش کرتا تھا اور جب وہ نہیں آتے تھے اور کوئی دوسرا وہ میز سنبھال لیتا تھا تو اُس کا دل بہت خراب ہوتا تھا اور وہ ایسے بدنصیبوں کو گھٹیا ترین چائے پلا کر انتقام لیتا تھا اور جب وہ کبھی آ جاتے تھے تو کھلی ہوئی

Scanned by CamScanner

باچھیں لے کر اُن کے پاس جانا جھک کر سلام کرنا اور آرڈر لینا اُس کی پیشہ ورانہ زندگی کے عروج کا لمحہ بن جاتا تھا۔ وہ چاروں اکٹھے تو کچھ کم ہی آتے تھے مگر پھر بھی اتنا ضرور آتے تھے کہ ٹلی چائے پینے والوں نے بھی انہیں زندگی کے ذرا انوکھے معمولات کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور اب اُن کی آمد پر ہڑبڑا کر متعجب ہونے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کو وہ ایک غیر ضروری مشقت سمجھنے لگے تھے۔

وہ غلام باغ میں تھے اور سرد موسم کی سرد ترین سہ پہر میں تھے۔ عاشق علی کچن کے اندر اُن کے لیے جیسے ایک وجد کے عالم میں چائے بنا رہا تھا۔ نئے سال کے پہلے مہینے کا وہ دن لوگوں نے شدید سردی اور دھند میں ڈوب کر گذارا تھا اور سورج کی آرزو کی تھی جواب کئی روز سے سہ پہر سے پہلے نظر نہ آتا تھا اور وہ بھی چند گھڑیوں سے زیادہ نہیں۔ پھر دھند اور ٹھنڈ کا اگلا چکر شروع ہو جاتا تھا۔ مگر کبھی دھند چھٹتی تو سورج کی پہلی ترچھی کرنیں دنیا میں آتی تھیں۔ ایسے ٹھٹھرے ہوئے سورج کی پہلی ترچھی کرنیں دھند چھٹنے پر آ کر غلام باغ پر گریں اور ہاف مین کا سانس چند لمحوں کے لیے رُک سا گیا۔

''زرد سورج کی یہ شعاعیں غلام باغ کو لافانی بنا رہی ہیں۔ میرے خدا کسی فوٹو گرافر کے لیے اس سے بڑھ کر عظیم لمحہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ کیمرہ ساتھ نہیں'' اُس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر خیر تم اپنی بات جاری رکھو ڈاکٹر تم نے پیرانویا کا ذکر کیا تھا اور دوسری غالباً کوئی مقامی زبان کی اصطلاح تھی جاسوسی۔ والیا............''

''جاسوسوں والی'' ناصر نے کہا لیکن پھر کبیر بول پڑا۔

''نہیں ہم بھی دومنٹ کی خاموشی اختیار کر کے ترچھے زاویوں کی زرد روشنی میں غلام باغ کی تاریخ کو زندہ ہوتا دیکھیں گے۔ ہماری بصری جمالیات بھی کوئی اتنی مردہ نہیں ہے۔''

زہرہ نے قہقہہ لگایا اور اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ کبیر اور ہاف مین کی اِس فقرے بازی اور نوک جھونک کی کتنی عادی ہو گئی ہے۔ درحقیقت وہ ان تینوں کی ہی کتنی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ ہاف مین کہہ رہا تھا۔

''تم ہر بات پر مدافعانہ رویہ اختیار کرتے ہو کبیر مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں جنوبی ایشیا میں تمہاری نسل کا یہی المیہ ہے۔''

"اور تم جو ہر بات کو فوراً جنوبی ایشیا تک پھیلا دیتے ہو، تمہاری حالت پر بھی رحم آتا ہے۔"
زہرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"رحم کوئی اتنا عظیم جذبہ بھی نہیں" جونیئر سائیکیاٹرسٹ نے کہا۔ "اگرچہ مجھے بھی بعض اوقات جاسوسوں والی پر رحم آتا ہے جو کہ میرا ایک غیر پیشہ ورانہ رویہ ہے۔"

"اب تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔ یہ کیا چکر ہے 'جاسوسوں والی' کا تم نے پھر ذکر کیا ہے"
زہرہ نے کہا۔

"وہ ایک پیرانائیڈ عورت ہے" ناصر نے کہنا شروع کیا مگر اسی وقت عاشق علی کیفے غلام باغ کے سب سے صاف ستھرے ٹرے میں کیفے کی عمدہ ترین چائے سب سے بڑھیا بسکٹ شامی کباب اور کیک کے ٹکڑے لیے آن پہنچا۔ ٹرے کو میز پر اُتارتے وقت اُس نے دائیں طرف بیٹھے ہاف مین کو محسوس کیا اور دل میں اپنے ساتھ کیا یہ وعدہ دہرایا کہ آج وہ ضرور گورے صاحب سے اپنے بھائی کے بارے میں پوچھے گا۔ کیا بھائی مدد علی اب ساری عمر گونگا ہی رہے گا۔ اُس کی زبان آخر کھلتی کیوں نہیں۔ وہ ایسے ہی مر جائے گا چُپ کا چُپ۔ وہ ضرور پوچھے گا۔

ہاف مین اور کبیر یک لخت کبابوں پر پل پڑے اور پلیٹوں میں رکھ کر کانٹے سے کھانے کا تکلف کرنے کی بجائے براہِ راست دانت استعمال کرنے لگے۔

"آہ...... یہ ایک ناقابلِ یقین حد تک پراسرار اور لذیذ ڈش ہے۔ کسی دن میں اسے گرٹریوڈ کے لیے لے کر جاؤں گا۔" ہاف مین نے پُرعزم انداز میں منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"تم اُسے یہاں لا سکتے ہو" زہرہ نے کہا۔

"وہ مقامیوں سے ملنا پسند نہیں کرتی...... لیکن پھر بھی......" ہاف مین نے کہا۔

"یعنی کافی ذلیل عورت ہے" کبیر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کافی...... لیکن اس کے باوجود میں اُسے یہاں لاؤں گا۔ ذلت کی دیگر قابلِ دید اقسام دکھانے کے لیے......" ہاف مین نے کہا۔

زہرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور وہ ہنسی ناصر کے لیے اتھاہ گہرائی میں گرنے کا بلاوا تھی۔ وہ چکرا دینے والا احساس تھی کہ انتہائی بلندی سے گہرائی کس قدر قریب ہے مگر پھر بھی کس قدر دور ہے۔ وہ عورت اتنا قریب ہونے کے باوجود کس قدر دور ہے۔ اس کی دوری فنا کا ایک انوکھا احساس ہے

Scanned by CamScanner

جو عشق ہے اور عشق ہستی اور نیستی کے اپنے اپنے زمان و مکان کے درمیان ایک لاخلا ہے جہاں وقت کا وجود محال ہے۔

''تو کیا ذلت کی بہت سی اقسام بھی ہیں۔'' وہ ہاف مین سے پوچھ رہی تھی۔

''یقیناً'' ہاف مین کا جواب مختصر تھا۔ وہ زیادہ طویل بات کر کے کبابوں کا مزہ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''یقیناً'' ناصر کے دل نے چپکے سے گواہی دی۔

''بالآخر یہ بھی ڈاکٹر کا موضوع ہی بنتا ہے۔'' کبیر نے پیلے ہلدی رنگ کیک کے ٹکڑوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور گہری چبھتی ہوئی شوخ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ اچانک ناصر کے دل میں اُس کے لیے شدید تنفر کا احساس امڈ آیا۔ شاید یہ محض اتفاق تھا مگر کبیر کا فقرہ یک دم ناصر کی بہت ہی نجی زندگی میں ایک شرمناک تاک جھانک بن گیا تھا۔

''تم پتہ نہیں کیا ہر وقت اُلٹی سیدھی بکواس کرتے رہتے ہو'' ناصر نے کبیر سے کہا۔

''آج میرا ارادہ سیدھی سیدھی بکواس کرنے کا بھی ہے'' کبیر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ناصر نے گہری تشویش سے پوچھا۔

''ابھی فارغ ہو کر ذرا بات کرتے ہیں۔ ہاف مین یہ پیلا کیک کا ٹکڑا بھی آزماؤ اس کا ذائقہ پُر اسرار تو نہیں مگر انتہائی فکر انگیز ضرور ہے'' کبیر نے کہا۔

''میں اُدھر ہی آ رہا ہوں اور کھانے سے پہلے ہی اس کا بے پناہ زرد رنگ مجھے حیران کر رہا ہے اور حیرت فکر کی ہی ایک قسم ہے'' ہاف مین نے کہا۔

''بہت ہی معتبر قسم'' کبیر نے اتفاق کیا۔

زہرہ پھر ہنس پڑی اور پھر حیران بھی ہو گئی ناصر کو دیکھ کر جس نے ابھی تک کسی بھی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

''تم تو کچھ بھی نہیں لے رہے ناصر'' زہرہ نے وہ فقرہ دہرایا جو کھاتے ہوؤں کی دنیا میں نہ کھانے والوں کو ازل سے سننا پڑ رہا ہے۔

ناصر نے ایک بسکٹ اٹھالیا اور زہرہ نے اُسے پیالی میں چائے ڈال کر دی۔ دھند پھر بھر آئی اور سنہری شعاعوں میں تھوڑی دیر کے لیے جگمگا اُٹھنے والا غلام باغ پھر سے سرمئی مٹیالی، بخ تاریکی

Scanned by CamScanner

میں ڈوب گیا۔
"تمہاری طبیعت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی ڈاکٹر" ہاف مین نے بالآخر پیلے کیک کے ٹکڑے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
"آج ڈاکٹر کی طبیعت پر کُھل کر بات ہوگی۔ آخر ہرج ہی کیا ہے"۔ کیبر نے کہا۔
ناصر اندر تک لرز گیا۔ اُسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ کیبر اپنی شیطنت میں کدھر جا رہا ہے اور اسی وقت زہرہ نے اُسے کیفے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اُس کا نام سراج دین تھا اور وہ یاور ہاؤس میں زہرہ کی حفاظت پر مامور کی گئی مائیوں میں سے ایک کا خاوند تھا اور زہرہ کی ماں کے خیال میں اعتباری آدمی تھا۔ اعتباری آدمی اس وقت بہت تھکا ماندہ اور پریشان حال تھا۔ چھوٹی بی بی پر گھر سے باہر نظر رکھنے کی ڈیوٹی اسے نڈھال کر دیتی تھی۔ اگرچہ اُس کی یہ ڈیوٹی ہفتے کے صرف دو دنوں کے لیے تھی۔ باقی دِنوں میں اس کام کے لیے اور لوگ متعین تھے اور پھر ان دو دنوں کے اُسے جتنے پیسے مل جاتے تھے باقی مہینے بھر کے دفتری کام سے نہ ملتے تھے۔ وہ بڑی بی بی کے بڑے بیٹے کی فرم میں بھی کام کرتا تھا۔ مگر اُس نے زندگی بھر کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن اُسے خفیہ پلس والوں جیسی نوکری کرنی پڑے گی اور وہ بھی اس بڑھاپے میں اور اس سردی میں۔ مگر وہ نوکری چھپر پھاڑ کے ملنے والے رزق کا خزانہ تھی جس کے ملنے کے بعد دس بھوکے پیٹ سکھ میں آگئے تھے۔ کیا ہوا جو اُسے تھوڑا دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ سراج دین چھوٹی بی بی اور اُس کے دوستوں سے جتنا دور ممکن تھا ایک میز پر بیٹھ گیا۔ حکم یہ بھی تھا کہ چھوٹی بی بی کو پتہ نہ چلے کہ گھر سے باہر نکلنے پر اُس کی نگرانی کی جاتی ہے۔ سراج دین نے دزدیدہ نظروں سے بظاہر لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے اُن چاروں کی طرف دیکھا تو اُس کی شکل اناڑی پن کی خفت سے انتہائی مضحکہ خیز ہوگئی۔ زہرہ اُس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑی۔
"اب کیا ہوا۔ میں نے یا ہاف مین نے تو کوئی بات نہیں کی۔" کیبر نے کہا۔
"تمہارا کیا خیال ہے دنیا میں صرف تمہاری باتوں پر ہی ہنسا جا سکتا ہے۔ میرا ایک جاسوس ابھی آیا ہے اُس کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آئی مگر رحم بھی آیا ہے" زہرہ نے کہا۔
"مگر میری وہ جاسوسوں والی اپنے جاسوسوں پر کوئی رحم نہیں کھاتی" یک دم ناصر نے زہرہ کی بات کو ایسے مقام سے تھام لیا جہاں سے وہ گفتگو کو آگے اپنے مطلب کی راہوں پر نکال لے جا

Scanned by CamScanner

سکتا تھا'' وہ رات بھر اپنے دیوانگی کے خوابوں میں اپنے جاسوسوں کو ایک ایک کر کے ہلاک کرتی رہتی ہے مگر صبح ہوتے ہی وہ سب پھر زندہ ہو کر اُس کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔''

''میرے خدا کِس قدر حیرت انگیز'' زہرہ نے کہا ''پلیز ناصر تمہاری بات تو بیچ میں ہی رہ گئی تھی۔ تمہاری کوئی مریض ہے وہ...............''

''پیرانائیڈ۔ اور پیرانویا میرے نزدیک سب سے زیادہ تخلیقی ذہنی مرض ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''میں ڈاکٹر سے اتفاق کرتا ہوں'' کبیر نے حوصلہ افزائی کے لہجے میں کہا۔

''آج تمہارا ہر کسی سے متفق ہونے کا دن ہے'' ہاف مین چہک کر بولا اور زہرہ نے احتجاج سے ہاتھ اُٹھا دیا۔ جاسوسوں والی اور پیرانویا اُس کی دلچسپی کو بہت متاثر کرنے لگے تھے۔

''پلیز۔ ناصر کی بات سُننے دو'' اُس نے کہا۔

کبیر اور ہاف مین جھڑکی کھا کر چُپ ہو جانے والے بچوں کی طرح خاموش ہو گئے اور منہ اُٹھا کر ناصر کی طرف دیکھنے لگے۔ ناصر نے گہرا سانس لیا چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اُسے محسوس ہوا کہ بالآخر اُس کا لمحہ آ گیا ہے۔

''اُس عورت کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں۔ خوبصورت عورت ہے۔ کافی پڑھی لکھی ہے۔ ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ پہلی دفعہ ملنے والا اجنبی اُس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دنیا کے بارے میں، انسانوں کے بارے میں، مذہب، سیاست، ادب، کھیل کے بارے میں کافی سمجھداری کی باتیں کرتی ہے۔ اُس کی اکثر باتوں سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی سوائے اس بات کے کہ اُس کا شوہر اُسے قتل کرنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ مگر اتنی بات بھی تسلیم کی جا سکتی ہے آخر ازل سے شوہر بیویوں کو اور بیویاں شوہروں کو قتل کرنے کے منصوبے بناتی ہی رہی ہیں۔ مگر اُس کا خیال یہ ہے کہ اُسے قتل کرانے کے لیے اُس کے شوہر نے 'نظر نہ آنے والے' جاسوسوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ جاسوس منجمد ہوا کے بنے ہوئے ہیں اور ٹیلی ویژن کی لہروں کی طرح ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے زہریلی شعاعیں نکلتی ہیں اور جس دن اُس نے براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھ لیا اُسی دن وہ پتھر کی ہو جائے گی۔''

''میڈوسا'' ہاف مین نے آہستہ سے کبیر کے کان میں کہا۔

''تمام مائیتھالوجی پیرانویا ہی ہے'' کبیر نے بھی ویسے ہی سرگوشی سے کہا اور پھر وہ

Scanned by CamScanner

دونوں زہرہ کی طرف پہلے داد طلب پھر اس کے تیور دیکھ کر رحم طلب نظروں سے دیکھتے خاموش ہو گئے..................

سراج دین کی چائے آ گئی۔ سخت سردی میں دھواں دیتی۔ اُس نے کپ اپنی طرف سرکایا جیب سے ایک بوسیدہ سا بٹوا نکالا اور پیسوں کا جائزہ لیا اور پھر تھوڑے سے خدشے کے باوجود بیرے کو ایک کباب لانے کا بول دیا۔ بیرا طنزیہ سی مسکراہٹ لیے واپس چلا گیا تو سراج دین نے میز کی طرف سر جھکائے جھکائے نظریں گھما کر اُن چاروں کی طرف دیکھا۔ اب اُن میں سے ایک بول رہا تھا اور باقی سُن رہے تھے اور چھوٹی بی بی تو بہت ہی غور سے سُن رہی تھی۔ شمشیر خان نے جس کی جمعرات، جمعہ کو بی بی کی جاسوسی پر ڈیوٹی لگائی گئی تھی سراج دین کو بتایا تھا کہ ''......ان تینوں میں سے گورا تو بس گورا ہی ہے اس لیے کہ گورا گورا ہی ہوتا ہے۔ مگر باقی دونوں میں سے ایک جو شکل سے شریف لگتا ہے۔ درمیانے قد کا ہے اچھے چہرے مہرے کا ہے پر ہر وقت مرجھایا ہوا سا لگتا ہے وہ پاگلوں کا ڈاکٹر ہے اور دوسرا جو نکلتے ہوئے قد کا ہے چہرے مہرے کا وہ بھی اچھا ہے پر اُس کی آنکھوں کا کالا حصہ سفید حصے سے زیادہ چوڑا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتا وہ اخباروں رسالوں میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے اور خطرے والا آدمی ہے''۔ اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے شمشیر خان نے یہ بھی کہا تھا کہ ''.......ایسے آدمی یا تو ملٹری انٹیلی جنس کے بہت بڑے افسر ہوتے ہیں دوسرا یا پھر زندگی میں کوئی بہت بڑا نیکی کا کام کرتے ہیں۔ تیسرا یا پھر پھانسی پاتے ہیں۔'' شمشیر خان خود بھی آرمی میں لانس نائیک ریٹائر ہوا تھا اور اب کاشف اینڈ فیصل انٹرپرائزز میں سیکورٹی گارڈ تھا۔ سراج دین نے اُس شخص کی طرف دیکھا جس کے بارے میں خطرہ تھا کہ پھانسی پا جائے گا۔ وہ پاگلوں کے ڈاکٹر کی بات غور سے سُن رہا تھا پھر بھی مسکرا ایسے رہا تھا کہ جیسے مذاق اُڑا رہا ہو۔ ''بی بی کو سب سے زیادہ خطرہ اسی سے ہو سکتا ہے۔'' سراج دین کے دل نے گواہی دی۔ اُس نے سوچا ''اللہ جانے یہ کیا باتیں کر رہے ہیں مگر یہ تو ہمیشہ گوروں کی زبان میں ہی بات کرتے ہیں۔ گورے کے لیے۔ چلو یہ بھی اچھا ہے۔ ورنہ یہ بھی بتانا پڑتا کیا باتیں کرتے ہیں۔ پر شمشیر خان تو کہتا ہے وہ ان کی سب باتیں سمجھ لیتا ہے دور سے بھی۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ شمشیر خان انگریزی جانتا ہے۔ بیرے نے پرچ میں رکھا ٹھنڈا کباب لا کر سراج دین کے سامنے دھر دیا۔ پرچ میں دھری پلاسٹک کی چھوٹی سی چمچی اُچھل کر میز پر آ گئی اور پھر سراج دین

Scanned by CamScanner

نے ابھی سوچا ہی تھا کہ وہ بیرے سے لال چٹنی مانگے یا نہیں کہ بیرہ پھر واپس کچن کی طرف چلا گیا اور سراج دین نے فیصلہ کیا کہ وہ لال چٹنی نہیں مانگے گا۔ اس نے چمچی اُٹھا کر کباب کی طرف بڑھائی اور ایک نظر پھر اپنی ڈیوٹی پر ڈال لی۔ اب چھوٹی بی بی اور ڈاکٹر دونوں بول رہے تھے اور سخت سردی میں اُن دونوں کے منہ سے نکلنے والی بھاپ ایک دوسرے میں گھس رہی تھی اور اس دھندلاہٹ میں سے پیچھے دور غلام باغ کے کچھ کھنڈر نظر آ رہے تھے جن سے سراج دین کو ہرگز کوئی دلچسپی نہ تھی.........

''نہیں آپ پیرانائیڈ سے بحث میں کبھی جیت نہیں سکتے؟'' ڈاکٹر ناصر نے کہا۔

''کیوں'' زہرہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ کی بحث عام روزمرہ کے۔ یا کہہ لو کہ نارمل منطق پر چلتی ہے۔ جس میں یہ کپ کپ ہوتا ہے اور میز میز ہوتا ہے۔ مگر پیرانائیڈ کی منطق میں کپ ہاتھی بھی ہو سکتا ہے اور میز ہوائی جہاز بھی ہو سکتا ہے'' ناصر نے کہا۔

''مجھے اکثر شک پڑتا ہے کہ دیوانگی اصل میں ایک لسانی مسئلہ ہے'' کبیر نے کہا۔

''یہ تم نے پتے کی بات کی ہے مگر ابھی میڈم زہرہ پیرانویا میں کھوئی ہیں اور ڈاکٹر خوب بول رہا ہے۔ اس لئے ہمارا بولنا بنتا نہیں'' ہاف مین نے غیر معمولی سنجیدگی سے کہا اور زہرہ مسکرا دی۔

''نہیں اب تم اپنی بک بک شروع کر سکتے ہو۔'' اُس نے کہا اور پیچھے اُس کے دل میں تھا ''تم کر بھی دو شروع اب اپنی بک بک'' اور اُس نے ناصر سے کہا ''تو تم اُس عورت کو کسی طرح قائل نہیں کر سکتے کہ منجمد ہوا کے بنے ہوئے نظر نہ آنے والے انسان کہیں موجود نہیں ہیں۔ ہو ہی نہیں سکتے۔ ناممکن ہیں۔''

''میں نے ایک دفعہ اُس سے یہی کہا تھا اور پھر وہ کہنے لگی تھی.......... بلکہ پہلے تو اُس نے میری طرف ایسی تمسخر بھری ترحم آمیز نظروں سے دیکھا جیسے کوئی دانش مند کسی غبی کی انتہائی احمقانہ بات سُن کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ٹھنڈی آہ بھرتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ نادان تیرا کوئی قصور نہیں اس لیے کہ تو نہیں جانتا۔''

''تعجب ہے کہ تاریخ کے پاگل خانے میں ایسے دوسرے دانش مندوں کو دنیا نے پیرانائیڈ نہیں کہا'' کبیر نے کہا۔

Scanned by CamScanner

"کہا بھی ہے" ہاف مین نے خشک ہنسی کے ساتھ کہا، زہرہ چونکی اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ناصر کہہ رہا تھا۔

"تو ایسی ہی ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد وہ کہنے لگی مجھے افسوس ہے ڈاکٹر تم اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتے کیا تم نہیں جانتے کہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے علاوہ اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں آگ کی بنی ہوں تو کیا موجود نہیں ہوں۔ میرا خاوند پانی کا بنا ہے اور اُس کے بنائے ہوئے جاسوس ہوا کے...... منجمد ہوا کے نیلگوں پُتلے جنہیں صرف میری آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ مگر میں صرف ان کے جسم ہی تو دیکھ سکتی ہوں آنکھیں نہیں۔ جس دن میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھ لیا اُسی دن زہریلی شعاعیں مجھے پتھرا دیں گی۔"

"مگر تم نے اُس سے پوچھا تو ہوتا وہ جو...... خاوند اُس کا...... وہ بناتا کیسے ہے وہ انسان...... منجمد ہوا کے جاسوس......" زہرہ نے ایک والہانہ اشتیاق اور گہرے تجسس سے پوچھا۔

کبیر اور ہاف مین نے ایک دوسرے کی طرف گہری معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ڈاکٹر ناصر کچھ کہنے لگا تو اسی وقت کبیر نے اشارے سے ہاف مین کے کان کو اپنے منہ کے قریب منگوایا اور سرگوشی میں کہا۔

"تم دیکھ رہے ہو ڈاکٹر کے چہرے پر نُور برس رہا ہے۔"

"ہاں" ہاف مین نے مختصراً جواب دیا اور پھر سیدھا بیٹھ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُن کی کوئی بھی مشکوک حرکت ڈاکٹر ناصر اور زہرہ کے درمیان قائم تحیر کے جادو کو درہم برہم کر دے۔

"ہاں میں نے اُس سے یہ بھی پوچھا تھا" ناصر نے ایک بے ساختہ خوشی سے مغلوب ہو کر اور شاید مدتوں بعد ہنس کر کہا۔ "پوچھا تھا۔ اُس کا خاوند منجمد ہوا کے جاسوس کیسے بناتا ہے اور اُس نے بہت تفصیل سے اس سوال کا جواب دیا۔"

"کیا۔"

"اُس نے بتایا کہ اُس کے خاوند کو قلمی دوستی کا شوق تھا۔ اس کی دوستی ایک ایسی امریکی عورت سے ہو گئی جس کا خاوند خفیہ تجرباتی ہتھیار بنانے کے ادارے میں سائنسدان تھا اور خفیہ ہتھیاروں کے ڈیزائین بناتا تھا اور قلم کا دباؤ نیچے والے کاغذ پر منتقل ہو جاتا تھا اور اس طرح خطوں کے کاغذوں میں کسی کو کچھ پتہ چلے بغیر وہ ڈیزائین جو منجمد ہوا سے ہلاکت خیز جاسوس بنانے کا

Scanned by CamScanner

تھا اُس کے خاوند کے شیطانی دماغ تک پہنچ گیا اور اُس نے وہ مشین بنالی۔ اب وہ اپنے شکار کے دماغ کی فریکوئنسی معلوم کرتا ہے اور منجمد ہوا کے نیلگوں پتلوں کی فریکوئنسی اُس کے مطابق کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے اُس کا کہنا ہے وہ ہر رات اپنے دماغ کی فریکوئنسی بدل لیتی ہے مگر اُس کے عیار خاوند کو پھر بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ایسی مشینیں دنیا میں صرف تین ہیں ایک اُسی امریکی خفیہ ادارے میں دوسری اُس کے خاوند کے پاس اور تیسری تبت کے دلائی لامہ کے پاس ہے۔ دلائی لامہ کے پاس آخر کیوں ہے؟ میں نے پوچھا تو اُس نے اس سوال کا جواب اُس نے صرف یہ دیا۔ ظاہر ہے ایسی تیسری مشین صرف دلائی لامہ کے پاس ہی ہو سکتی ہے۔''

''میرے خدا'' زہرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا اور آنکھیں استعجاب سے پھیل گئیں اور ناصر کے لیے اُس کے خوبصورت چہرے، اُس کے ہونٹوں، اُس کے لباس، اُس کی آنکھوں کے سب رنگ پوری کائنات پر محیط ہو گئے اور اُس کی آنکھیں اس انوکھے وصال کے نشے سے دھندلا گئیں۔ کہ وہ اس ایک لمحے میں سارا کا سارا اُس عورت کے اندر تھا اور وہ اُس کو پوری طرح لپیٹے ہوئے تھی اپنے متحیر وجود سے اُس حیران کرنے والے کو سمیٹے ہوئے تھی۔ اور اسی لمحے اُسے یوں محسوس ہوا کہ اب وہ ایک لفظ بھی اور نہیں بول پائے گا۔ پیرانائیڈ عورت کی طلسم ہوش ربا دور کہیں غلام باغ کی دھند میں غائب ہو گئی اور اُس کی جگہ مدعلی کے گنگ محل نے لے لی۔

منجمد ہوا سے بنے نیلگوں پتلوں کی کائنات اُن چاروں کے بیچ ٹھہر گئی۔ خاموش...... نادیدہ...............سراج دین نے اب سخت پریشانی سے اُن چاروں کی طرف دیکھا۔ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئے تھے چُپ کے چُپ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بیٹھے بیٹھے مر گئے ہوں یا سِل پتھر ہو گئے ہوں۔ ایسے میں ایک عجیب وحشت ناک بے چینی نے اُس کے اندر سر اُٹھایا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا اُسے ایسا لگا جیسے اس دنیا کے انتہائی آخر میں جا کر جو کچھ ہونا ہے وہ ہونا شروع ہو چکا ہے اور اُن چاروں سے ہی شروع ہوا ہے۔ سراج دین نے تیزی سے نظریں اُن سے ہٹالیں۔ احساس وہیں ختم ہو گیا اور دھڑکن باقی رہ گئی۔ اُس نے بیرے کو اشارے سے بلا کر پانی کا گلاس مانگا۔ بیرا ہنس پڑا اور چلا گیا۔ جاتے جاتے اُسے پھر چائے پینے کا مشورہ دے گیا جس پر عمل کرنا سراج دین کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ میز کے نیچے لے جا کر اپنی دونوں پنڈلیوں کو دبایا۔ دو شلواروں اور دوہری جرابوں کے اندر بھی سردی مار کر رہی تھی اور اُس

Scanned by CamScanner

کی ناتھیں بچے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بنتی جا رہی تھیں۔ اُس نے خواہش کی کیوں نہ وہ بھی مر جائے اور اسی خواہش کے ساتھ اُس نے پھر اُن چاروں کی طرف دیکھا مگر وہ اب یک دم سے پھر زندہ ہو گئے تھے اور سب سے پہلے چھوٹی بی بی ہی..........

....

''انسانی ذہن بھی کس قدر حیرت انگیز دنیا ہے۔'' آخر زہرہ نے کہا۔

''اصل چیز...... حیرت ہے...... حیرت ہی اصل چیز ہے۔ تحیر......'' اچانک کبیر نے بھاری آواز اور بوجھل لہجے میں کہا۔ اور اب ناصر اور ہاف مین نے نظریں ملائیں اور چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ وہ جان گئے تھے کہ یقیناً اُس پر کوئی نظریہ نازل ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کبیر کی آنکھوں کی سیاہ پُتلی اور بھی پھیل گئی تھی۔ جیسے دور کہیں اندھیرے میں دیکھ رہا ہو۔ یقیناً یہ نظریے کے نزول کا وقت تھا۔ زہرہ جو ابھی اُسے اتنا اندر سے نہیں جانتی تھی یا شاید کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ حیران سی ہو کر بولی۔

''حیرت ہی کیسے اصل چیز ہے؟''

جواباً کبیر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اُس نے میز پر پڑی خالی پیالیوں اور پلیٹوں کو بے اطمینانی سے دیکھا اور کہنے لگا۔

''عاشق علی سے کہو چائے لائے یہ بات اب کچھ دیر چلے گی۔'' ناصر اور ہاف مین نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مسکرائے۔ زہرہ نے اب صاف محسوس کیا کہ جیسے کچھ اُس سے چھپایا جا رہا ہے۔

''کیا بات ہے۔'' اُس نے مضطرب سی ہو کر پوچھا۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ناصر نے عاشق علی سے چائے کا کہا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ سردیوں کی شام کے سات بھی گہری رات کا دھوکا دیتے تھے۔ مگر آدھی رات اُسے اپنی شفٹ پر جانا تھا۔ ''میں تم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر سے تمہیں اور ڈاکٹر کو۔'' کبیر نے ایسے لہجے میں کہا کہ کوئی بہت اہم بات ہو رہی ہو اور اس بات کے سنتے ہی ناصر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''یہ مردود آج مجھے نہیں چھوڑے گا۔ بھولا نہیں ابھی تک۔ پیرانویا پر میری بک بک اسے کہیں اور نہیں لے گئی۔ میرے اور قریب کہیں لے آئی ہے'' ناصر اندر ہی اندر کراہا۔

''تو پھر دیکھ رہے تھے تو کیا'' زہرہ نے معصومیت سے پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''تو پھر یہ......'' ایک آسودہ مسکراہٹ کبیر کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''تو پھر یہ کہ تحیر انسان کو مسخر کر لیتا ہے کسی شخص کو حیران کر دینے کی قدرت حاصل کرنا اُسے فتح کر لینا ہے خواہ وقتی طور پر ہی سہی۔ جیسے ڈاکٹر نے ابھی کچھ دیر کے لیے تمہیں پیرانائیڈ جادوگری کے زور پر متحیر کیے رکھا......اور......عشق بھی تحیر ہی ہے۔''

''عشق'' ہاف مین نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''میں سمجھا تھا کہ تم انسان کی ازلی حیرت پر کچھ نظریہ بازی کرنے کا موڈ رکھتے ہو۔ مگر عشق...... میں عشق کے لیے تیار نہیں تھا۔''

''تم عشق کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتے اور یقیناً میں بھی نہیں۔ اگرچہ ہماری اس محرومی کے سبب جدا جدا ہیں۔'' کبیر نے تاسف سے کہا جس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ حقیقی ہے یا بناوٹی۔

''میرے لیے عشق کی کچھ گنجائش رکھو...... خدا کے لیے...... ابھی میری عمر ہی کیا ہے''۔ ہاف مین نے مزاحیہ انداز میں کہا مگر پھر سنجیدہ ہو گیا۔ زہرہ اور ناصر میں ایک بے چین سا اضطراب جنم لے چکا تھا۔ وہ کبیر کو اپنی نظروں کی زد میں لائے بالکل خاموش تھے۔

''مگر میں تمہیں بتاؤں گا۔ ہیر ہاف مین کہ عشق سے میری اور تمہاری محرومی کے جدا جدا اسباب کیا ہیں۔'' کبیر نے کہا۔

''ظاہر ہے جس ذہنی حالت میں تم ہو اِس وقت...... تمہیں کوئی کسی بات سے بھی روکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بکو۔''

''صورت حال یہ ہے کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں حیرت سے بہت آگے جا چکا ہوں جب کہ تم کبھی حیرت تک پہنچ ہی نہیں پاؤ گے۔ صرف ڈاکٹر مقامِ حیرت میں ہے اور گہرا عشق میں ہے۔ پورے کا پورا عشق میں ہے۔''

''کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے'' اچانک ناصر نے تھکے ہوئے مضطرب لہجے میں کہا۔ زہرہ نے گہرا سانس لیا اور اُس کا جسم تناؤ کا شکار ہو گیا ''آخر یہ شخص دنیا کو ناممکن صورتحال میں دھکیل کر کیا لطف لیتا ہے۔'' اُدھر وہ کہہ رہا تھا ناصر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اور اصرار کے ساتھ ''کیوں بات نہیں کر سکتے۔ اگر پیرانویا پر بات ہو سکتی ہے تو مرضِ عشق پر کیوں نہیں ہو سکتی...... آؤ عشق پر بات کریں''۔

Scanned by CamScanner

"آؤ عشق پر بات کریں۔" یہ لفظ جب زہرہ کے منہ سے نکلے تو وہ حیران رہ گئی۔

یہ ہوا کیا ہے۔ اُس نے سوچا کسی تنویمی انداز میں کبیر کے وہ الفاظ اُس سے دہرائے گئے ہیں یا پھر لفظوں پر روک رکاوٹ لگانے والی قوت کسی اور وجہ سے بے اختیار ہوگئی ہے؟ پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنے لفظوں پر قائم رہے گی۔

اُس نے گہرا سانس لیا۔ اُن تینوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرائی اور پھر اُن سے کہا

"آؤ عشق پر بات کریں۔"

اور زہرہ کے یہ پھر سے کہے لفظ جن کے پیچھے اب ذمے داری قبول کرنے کا اعتماد تھا ناصر، کبیر اور ہاف مین کو بھی حیران کر گئے۔ پہلے تو انہوں نے بھی اپنے اپنے انداز میں زہرہ کے کہے کو لسانی لغزش کے قابل معافی کھاتے میں ڈال کر اُسے تقریباً بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔ اگرچہ کبیر کو اپنے ذہن میں کچھ فرائیڈ ئین چرخے گھومتے سُنائی دیے تھے مگر زیادہ دیر تک نہیں اور پھر تو کسی مخفی محرک کی کارستانی' کا مفروضہ ہی باطل ہو گیا تھا۔ زہرہ نے اُس کی تمسخرانہ نظریہ بازی کو نہ صرف قبول کیا تھا بلکہ اُسے اپنی انتہا تک جاری رکھنے پر اصرار کیا تھا۔ اب وہ ایک مضحکہ اُڑانے والی جارحیت اپنی آنکھوں میں لیے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ہنس کر کہا۔

"حیرت ہی اصل چیز ہے۔ تم نے یہی کہا تھا ناں کبیر مہدی اور عشق بھی حیرت ہی ہے۔ تم نے یہ بھی کہا تھا اور تم نے یہ بھی کہا تھا کسی کو متحیر کرنا اُس پر قابو پانا ہے۔ تو کیا تم تینوں اس وقت میرے قابو میں ہو"۔ زہرہ نے قہقہہ لگایا اور پھر کسی کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر کہتی رہی۔

"ہاں۔ آخر عشق پر کیوں بات نہ کی جائے اور ہاں...... اگر ناصر میرے عشق میں مبتلا ہے۔ جسے تم مرضِ عشق کہتے ہو۔ تو ناصر کے اس مرضِ عشق پر بھی کیوں بات نہ کی جائے اور تم نے کہا تھا کہ عشق بھی تحیر ہے۔ اگر تحیر ہی ہے تو پھر یہ کیسا تحیر ہے؟ اپنے اس نظریے پر بات کرو۔ عشق پر بات کرو کبیر۔"

"میں نے کہا تھا آؤ عشق پر بات کریں" جب کبیر نے یہ کہا تو اُس کے لہجے میں بے یقینی اور بے اعتمادی کی ایک موہوم سی جھلک تھی جسے صرف ڈاکٹر ناصر نے محسوس کیا جو اُس کی بک بک کی شعبدہ بازی کا سب سے پرانا گواہ تھا۔

ہاف مین چوکنا ہو کر سیدھا تن کر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم میں وہی اضطراب تھا جو کھدائی کے

Scanned by CamScanner

دوران اچانک کسی انوکھی مدفون چیز کے سامنے آ جانے پر اُس کے جسم میں کوند جایا کرتا تھا۔ ''کچھ سامنے آنے والا ہے''۔ یہ ایک احساس تھا جس کی دھمک اُس نے اپنے اندر محسوس کی۔ کبیر کا نظریہ بازی کا کھیل آج کچھ گل کھلائے گا۔ وہ اپنے مزاج سے کہیں ہٹی ہوئی ایک پُر تکلف سی تمیز داری سے کھانسا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر بولا۔

''عشق پر دنیا کا سب سے انوکھا مکالمہ سامنے آنے والا ہے اور یہ ایک ناقابلِ یقین مکالمہ ہوگا۔'' کبیر نے گورے کی بات سُنی تو ایک لمحے کے لیے اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ گورے کے کہے الفاظ ''مکالمہ'' کو یہیں سے پکڑ لے اور اسی سے کچھ ایسی بک بک کا امکان پیدا کرے جو اُسے عشق پر باقاعدہ ذمہ دارانہ سوچی سمجھی رائے دینے کی متوقع ذلالت سے نکال لے جائے۔ مگر لفظ 'مکالمہ' نے فوری طور پر کسی بھی اور ہونہار لفظی بچے کو جنم نہ دیا۔ کبیر کے ذہن کی لسانی کوکھ ابھی اس احساس کے بوجھ تلے بانجھ تھی کہ...... ''یہ پہلی دفعہ ہوا ہے۔ اس عورت کے ذریعے۔ کہ کسی نے اُس کی لفظی چکر بازیوں کو یوں روک دیا ہے اور زبان بندی کے اس کے تماشے میں پیچھے کی ہیرا پھیری کو جا پکڑا ہے اور وہ ہیرا پھیری بس اتنی ہے کہ کبیر مہدی کی دنیا میں لفظ کہیں بھی دنیا سے جڑے نہیں ہوئے۔ لفظوں کی اپنی ہی ایک دنیا ہے اور اپنے ہی کھیل تماشے ہیں سب نظریے، سب سچ، سب جھوٹ، سب یقین، سب ایمان، سب علم، سب آرٹ، سب فن، سب فلسفے بس کھیل تماشے ہیں۔ دنیا کے اوپر معلق اس دنیا میں بک بک وہ صنف ہے جو لفظوں کے اندر ہی اندر رہتی ہے اور اُن کی آپس کی جڑتوں کے پیچھے چلتی جاتی ہے اور دنیا میں جڑیں گاڑنے اور دور کی کوڑی لانے اور کائناتی آفاقی سچائیاں کھوج لانے کی منحوس کوششیں نہیں کرتی۔ یہاں ایک لفظ دوسرے تک، دوسرا تیسرے تک، تیسرا چوتھے تک اور اگلا اگلے اور اگلے ہی اگلے تک لئے چلا جاتا ہے۔ یہاں بس لفظ کی لفظ سے کھینچ کے پیچھے کھنچے جاؤ اور یہ مت کہو کہ لفظ دنیا میں دھرنا مارے بیٹھا ہے۔ دنیا الگ ہے۔ لفظ الگ ہے اور الگ الگ ہے۔ نظریہ بازی الگ الگ لفظ کے تعلق کا چسکا لیتی ہے یہ لفظوں کی ''اور جی'' کا چُھپ کر نظارہ کرتی ہے۔ ویسی ''اور جی'' جو زہرہ کے باپ کے ڈرائنگ روم میں یاور عطائی کی آخری رات دیکھنے کو ملتی ہے اور ویسی ''اور جی'' جو ہر انسان کا لذت کا آخری خواب ہے اور ہر لفظ کے باقی تمام لفظوں سے اختلاط کا آخری خواب ہے۔ بہت سے انسانوں کا اختلاط، مگر ہر فرد پھر بھی جُدا جُدا ہے۔

Scanned by CamScanner

لذت اوغام کے جھپاکوں میں بھی جسم کی حدود قائم رہتی ہیں۔ ان گنت رکاوٹیں، بندشیں، ناکامیاں، مایوسیاں، پسینے، بدبوئیں، خوشبوئیں، چپچپاہٹیں، خشکیاں، تنگیاں، فراخیاں، ایستادگیاں، لاغریاں، سنسناہٹیں، سرسراہٹیں، بے حسیاں، نرمیاں، سختیاں، شدتیں، مگر انزال تو انزال ہی رہتا ہے۔ ابلاغ تو ابلاغ ہی رہتا ہے۔ جو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اور اس ہیرا پھیری کو بھی مت کہو کہ یہی سچ ہے۔ نہیں تو نہ سہی یہ بھی ایک کھیل تماشہ ہے۔ ابھی اس کو سلیٹ سے صاف کر دو اور لفظ اور دنیا کا کوئی اور تعلق ڈھونڈ لو اور یہ ڈھونڈنا بھی کیا ضروری ہے۔ لعنت بھیجو کبیر مہدی تم یہ دیکھو کہ غلام باغ میں اس وقت کیا ہے۔ دھند میں غلام باغ اب مکمل غائب ہو چکا ہے۔ سردی اور بھی شدید ہوگئی ہے اور عشق پر کچھ بھی اور بات کرنے کے لیے کیفے غلام باغ کے کچن میں منتقل ہونا ضروری ہے۔ عاشق علی خصوصی انتظام کر دے۔ وہاں گیس کے چولہے جلتے ہیں اور کائنات میں ایسی حرارت پھیلاتے ہیں جو صرف کچن تک محدود رہتی ہے۔'' اور کبیر مہدی نے گہری سانس لی جو فوراً ہی سردی میں منجمد ہو کر بھاپ کی صورت متشکل ہوگئی اور اس نے سُن لی جانے والی بات کی۔ ''عشق پر دنیا کا انوکھا مکالمہ یہاں شروع نہیں ہو سکتا.............''

''کیونکہ سردی کی شدت ہر قسم کے عشق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس عظیم مقصد کے لیے ہمیں کیفے غلام باغ کے کچن میں منتقل ہونا پڑے گا۔ کیونکہ وہاں گیس کے چولہے جلتے ہیں اور کائنات میں ایسی حرارت پھیلاتے ہیں جو صرف کچن تک ہی محدود رہتی ہے۔'' کبیر نے قہقہہ لگایا اور کیفے کے اندرونی حصے میں کہیں موجود عاشق علی کو متلاشی نظروں سے ڈھونڈنے لگا۔

زہرہ اور ہاف مین کے ساتھ ناصر کی نظریں بھی کبیر کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں مگر ناصر کی نظریں کبیر کی زبانی کلامی ہستی کے سب سے پرانے شاہد کی نظریں تھیں اور اُسے یقین دلا رہیں تھیں کہ کبیر کی بک بک کی دنیا میں زہرہ کی اچانک مداخلت نے نظریہ بازی کے کھیل پر اُس کی اجارہ داری کو کسی طرح ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔

اور پھر یقین اور بے یقینی کے ان چند لمحوں کے دوران ہی کہ جن میں کبیر اور زہرہ نے ایک دوسرے کو عشق پر کھلی بات کرنے کی دھمکی دی تھی اور ہاف مین نے عشق پر انوکھے مکالمے کے شروع ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔ انہیں چند لمحوں نے ناصر کے اُس سارے عشق کے زمانے کی ٹون بدل ڈالی جو سائیکیاٹری وارڈ میں زہر خورانی کے شکار مریض کی بیٹی کو پہلی بار دیکھنے کے لمحے

Scanned by CamScanner

اور لمحۂ حاضر کے درمیان حائل تھا۔ یک دم ناصر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اتنا ہلکا ہو گیا ہے کہ ابھی ہوا میں معلق ہو جائے گا۔ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے اور انہیں بتائے کہ وہ کیوں قہقہے لگا رہا ہے مگر اس نے کبیر سے صرف اتنا کہا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو کبیر واقعی یہاں باہر اتنی ٹھنڈ ہے کہ عشق پر بات نہیں ہو سکتی کہیں اندر کسی گرم جگہ منتقل ہونا چاہیے۔ آؤ عشق پر بات کریں۔ عاشق کو بلاؤ'' ناصر ہنسا اور خود بھی کیفے کے اندر کی جانب دیکھنے لگا۔

ناصر کا یہ انتہائی غیر متوقع ردِعمل پھر سے کبیر، ہاف مین اور زہرہ کو متحیر کر گیا۔ ہاف مین نے اپنے اوورکوٹ کے کالر اٹھا کر کانوں کے گرد لپیٹے اور سر کو گہری عقیدت سے دائیں بائیں جنبش دی اور ایسی لرزتی آواز میں بولا جیسے آسمانی رازوں کے انکشاف کا لمحہ آ پہنچا ہو۔

''میں نے کہا تھا عشق پر دنیا کا سب سے انوکھا مکالمہ شروع ہونے والا ہے اور یہ............''

''......ایک ناقابلِ یقین مکالمہ ہو گا'' کبیر نے اس کا فقرہ مکمل کیا اور پھر ہانک لگائی ''عاشق علی۔''

عاشق علی ٹھٹھرنے اور کپکپانے کے باوجود ہر ممکن تیزی سے حاضر ہوا۔

''عاشق علی عشق پر۔ مرضِ عشق پر دنیا کا سب سے انوکھا مکالمہ شروع ہونے والا ہے اور گورے کا خیال ہے کہ یہ ناقابلِ یقین بھی ہو گا۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ ایسا مکالمہ اب یہاں باہر نہیں ہو سکتا۔ اندر کہیں کچن میں کسی کونے میں ہمارے بیٹھنے کا انتظام کرو اور چولہے فل جلاؤ۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا''

عاشق علی نے دانت نکالے مگر جب وہ فوراً ہی بج اٹھے تو وہ انہیں سمیٹ کر بولا۔

''نہیں صاحب کوئی مسئلہ نہیں...... آپ بے شک ساری رات اُدھر بیٹھو...... میں نے بھی بات کرنی ہے...... میں نے بھائی مدد علی کی بات کرنی ہے............''

ڈیوٹی کے دوران اس رات وہ پہلی چند باتیں تھیں جو سراج دین کی سمجھ میں آئیں کیونکہ پھیلی ہوئی کالی پتلی والے نے بیرے سے گورے کی زبان میں نہیں دیسی زبان میں بات کی تھی اور وہ بات بھی ایسی تھی کہ اندر تک سراج دین کو ہلا گئی تھی۔ ''عشق کی بات بی بی کی ان مردوں کے ساتھ عشق کی بات۔ یا خدا میں کیا کروں اور پھر اندر کہیں جا رہے ہیں۔ چولہوں کے پاس۔ یہ تو پوری رات کا معاملہ لگتا ہے۔ میں تو اندر نہیں جا سکتا۔ بیرا ان کے ساتھ ملا ہوا لگتا ہے'' اور سردی

Scanned by CamScanner

سے اڑے ہوئے سراج دین نے پھر صدقِ دل سے دعا کی کہ باری تعالیٰ اُسے اس گناہوں سے بھری ہوئی دنیا سے فوراً اُٹھا لے۔

جب وہ چاروں کیفے کے اندر جانے کے لیے اُٹھے تو عاشق علی کی نظر اُس اکلوتے گاہک پر پڑی جو شروع شام سے ایک پیالی چائے پی کر وہاں بیٹھا ہوا تھا اور جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اور جس کے بارے میں کوئی آدھا گھنٹہ پہلے دوسرے لڑکے اور خود اُس نے متفقہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کا سردی سے نمونیہ کرا کے فوت ہونے کا ارادہ ہے۔ ''دیکھو بھلا ان چاروں امیروں کا مقابلہ کرتا ہے وہ تو موج میلے میں ہیں اس سستی سی جگہ پر بیٹھے ہیں غلام باغ کے کھنڈروں کے صدقے، پر پھر بھی کتنے بھاری گرم کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور جب بھی سردی سردی کرتے ہیں۔ تیری لڑے کی جرسی ایسے جبر جنگ پالے کو روک سکتی ہے بھلا کہیں کا۔ پاگل تو نہیں کیا؟'' پھر دوسرے لڑکے نے یہ بھی صلاح دی تھی کہ پاگلوں کا ڈاکٹر تو وہ سامنے بیٹھا ہے ابھی چیک کرا لیتے ہیں۔ پھر دونوں ہنستے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔

''وہ جی...... میں ذرا...... آپ اندر چلیں...... بہترین کرسیاں لگوا دی ہیں...... میں ذرا...... ان صاحب سے...... کیفے بند ہو گیا ہے...... اب جائے یہ بھلا جائے اپنے گھر...... عجیب آدمی ہے''۔ عاشق علی نے کہا۔

اور اُس لمحے زہرہ نے تاسف سے سوچا کہ وہ اپنے جاسوس سے کس قدر غافل ہو گئی تھی اور پھر اسی وقت اُس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ اپنے جاسوسوں سے اپنی نگرانی اپنی نگرانی میں کرائے گی۔ اس نے عاشق علی سے اُسے بلا لانے کو کہا۔ عاشق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اس...... اُس...... کو میڈم جی...... وہ...... جو''۔

''ہاں وہ میرے ساتھ ہے''۔

سراج دین کو جب عاشق علی نے زہرہ کا حکم پہنچایا تو شاک اس کے لیے اتنا شدید تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے اُسے یقین ہو گیا کہ باری تعالیٰ نے دوسری دنیا لے جانے کی دعا سُن لی ہے۔ مگر پھر جب ایسا کچھ بھی نہ ہوا تو وہ خوف سے لرزتا ہوا چھوٹی بی بی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چھوٹی بی بی نے کہا......

''دیکھیں مجھے علم ہے کہ ماما اور بھائی صاحب نے آپ کو میری نگرانی پر لگایا ہوا ہے تا کہ میں

اگر کوئی غیر شریفانہ حرکت کروں تو آپ انہیں رپورٹ کریں۔ کوئی بات نہیں آپ ایسا کریں..... مگر یہ شریف لوگ ہیں۔"

سراج دین کے لیے یہ صورتِ حال اس قدر غیر متوقع تھی کہ وہ بالکل ہی بدحواس ہو گیا.........

"جی......... وہ...... شریف...... جی...... بی بی جی...... عشق...... وہ...... انوکھی...... انوکھا...... مکال...... عشق...... بی......" بمشکل تمام...... یہ لفظ سراج دین کے منہ سے نکلے اور اس نے شدید مشکوک نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا۔ کبیر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میرا خیال ہے عشق پر دنیا کا سب سے انوکھا مکالمہ شروع ہو چکا ہے اور پہلی بات یہ سامنے آئی ہے کہ عشق ہرگز کوئی شریفانہ کام نہیں۔"

"تم۔ چپ رہو کبیر......" زہرہ نے کہا اور پھر سراج دین سے کہنے لگی۔

"آپ نے کچھ کھایا...... کھانا کھایا.........."

اس مشفقانہ ہمدردانہ سلوک پر سراج دین کا دل چاہا کہ رونے لگے مگر پھر اس نے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔

"عاشق...... آلی...... اسے کیفے کا Best کھانا کھلاتا......" اچانک ہاف مین نے بھی اس درمیانی جاسوسی صورتِ حال میں شمولیت حاصل کر لی۔

"ہاں۔ انہیں کھانا کھلائیں اور پھر اگر آپ نے جانا ہو تو جائیں۔ نہیں تو ہم ابھی گپ شپ سے فارغ ہوں گے تو میں آپ کو ساتھ لے جاؤں گی۔ آپ مائی جیناں کے شوہر ہیں"۔

"نہیں جی نذیراں کا" سراج دین نے مایوسی سے کہا اور زہرہ نے بمشکل تمام اپنی ہنسی دبائی۔ مگر کبیر ہنسا۔

صرف ڈاکٹر ناصر خاموش تھا اور گہری سنجیدگی اور تعجب سے سوچتا تھا کہ پیرانائیڈ عورت کے التباس میں منجمد ہوا کے بنے جاسوس اور اس بیچارے جاسوس میں کیا فرق ہے۔ دونوں ہی تو منجمد ہیں۔ کیا حقیقت ایک منجمد التباس ہے......"

"میں سمجھ گیا جی" اچانک عاشق علی نے سب کچھ سمجھ آ جانے کے انداز میں شور مچایا "یہ میڈم جی کے باڈی گارڈ صاحب ہیں۔ آئیں جی۔ روٹی کھائیں اور آنے والے کمرے میں ایک

Scanned by CamScanner

چارپائی بچھی ہے۔ اُدھر آرام کریں"۔

اور جب آرام دہ 'بنگ' والے چھوٹے سے کمرے میں جس میں ایک طرف آٹے کی بوریاں پڑی تھیں۔ سراج دین نے پیٹ بھر کر کیفے غلام باغ کا بہترین کھانا کھایا اور جب چارپائی پر لیٹ کر کمبل اوپر سرکا کر وہ نیند کی طرف بڑھا تو اس کا دل چھوٹی بی بی کی غلامی اختیار کرنے کے جذبے سے معمور تھا اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ چند ہی فٹ دوسری طرف کچن میں وہ شخص جسے لانس نائیک شمشیر خان کے خیال کے مطابق پھانسی لگ جانے کا خطرہ تھا۔ چھوٹی بی بی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا" پہلی بات تو یہ ہے زہرہ کہ عشق اور تحیر کے بارے میں میرا یہ اس سال کا تیرہ جنوری کا نظریہ ہے"۔

اور زہرہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر حیرت تھی اور عاشق علی دور ایک کونے میں ان چاروں کی ناقابلِ فہم گفتگو پر سر دھنتا تھا اور سوچتا تھا کہ کب موقعہ ملے اور وہ بھائی مدد علی کے گنگنے پن پر کوئی بات کرے۔

OOO

باب(13)

عشق پر ایک ناقابلِ یقین مکالمہ

''عشق پر اس سال کا تیرہ جنوری کا نظریہ......؟ یہ کیا بکواس ہے؟'' زہرہ نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا'' یہ کسی قسم کا مذاق ہے شاید؟''

''نہیں تمہاری پہلی تشخیص ہی درست ہے۔ یہ بکواس ہی ہے گو میں اسے بک بک بھی کہہ لیتا ہوں۔ ڈاکٹر ناصر اور ہاف مین اپنی اپنی قسم کے سائنسدان ہونے کے باوجود اس طرزِ سخن کو برداشت کرنے کے عادی ہو چکے ہیں''۔ کبیر نے کہا۔

''تو کیا مجھے بھی عادی ہونا پڑے گا'' زہرہ نے پوچھا اور ایک نامعلوم خفت کا احساس اُس کے اندر دوڑ گیا۔ پھر اُس نے اپنے آپ سے ہی خاموش مکالمہ کیا'' پھر میں اور کیا کہتی۔ ویسے اس موضوع پر اب جو بھی جس بھی انداز میں بات کرتا ہے کرے۔ میں پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ میرا عورت پن میرے رستے میں حائل نہیں۔ یہ تو طے ہے اگر ایسا ہوتا تو اس وقت میں ایک ویران سے چوتھے درجے کے قہوہ خانے کے باورچی خانے میں آدھی رات کے وقت بیٹھی تین عجیب وغریب مردوں کی عجیب وغریب باتیں نہ سُن رہی ہوتی''۔

باورچی خانے کی فضا حرارت اور کھانا پکانے کے عمل کی ازلی خوشبوؤں سے معمور تھی اور اُن چاروں سوچنے والوں کی سوچ پر اگر اثر انداز ہوتی بھی تھی تو اُس سطح پر جہاں اختیار کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ لاشعوری سطح پر اور اس سے بھی پہلے شاید کسی کیمیائی، حیاتیاتی سطح پر...... اُدھر کبیر زہرہ کی خاموش خود کلامی کے دوران اُس کے بے ساختہ سوال کا جواب دے چکا تھا۔

''نہیں تمہارے لیے اس طرح کی کوئی عادت ڈالنا بالکل ضروری نہیں، ویسے بھی مجھے بمشکل برداشت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ایک دن خود میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے'' کبیر

Scanned by CamScanner

نے آہ بھر کر کہا تھا۔

''اور وہ ایک دن آج کا دن ہی ہے'' اچانک ناصر نے ایک بار پھر اپنے معمول کے لہجے سے بہت ہٹے ہوئے انداز میں کہا اور ان باقی تینوں میں یہ احساس اور بھی گہرا ہو گیا کہ اس شام کی گفتگو کے سارے داؤ پیچوں کے دوران جن میں ناصر نے خود بھی پیرانائیڈ داؤ پیچ کو کافی کھل کر کھیلا تھا ناصر کے ساتھ کوئی انوکھا مگر بدستور نا معلوم باطنی واقعہ ہو گیا ہے مگر یہ کہ وہ اس کا اظہار بھی کرے گا۔ وہ تینوں اس خوش آئند امکان کو بھی ساتھ لیے بیٹھے تھے اور ہاف مین سوچ رہا تھا کہ بچپن میں سٹراس برگ اس کے چچا کی بیکری میں، چچا جو ایک بیکر تھے، اُسے آٹے کی ایسی ہی خوشبو آئی تھی۔ مگر یہاں کے آٹے کی خوشبو زیادہ فحش ہے اور بالکل مادہ منویہ کی خوشبو جیسی ہے۔ پھر اچانک ہی انگریزی کا ایک محاورہ اُس کے ہتھے چڑھ گیا'' یقیناً ناصر کی آستین میں اوپر کچھ ہے۔ کچھ......شاید وہی کچھ ناقابلِ یقین ہوگا''۔

مگر زہرہ بدستور کبیر سے اپنا بنیادی سوال طے کرنے پر بضد تھی، اُس نے کہا۔

''تمہیں یا تمہاری گفتگو کو برداشت کرنے کی بات تو الگ ہے۔ لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گی کہ وہ کیسا طرزِ گفتگو ہے جس میں ہر نظریے کی عمر بس ایک دن ہے، عشق پر تیرہ جنوری کا نظریہ......؟'' زہرہ نے زیادہ پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''عشق پر تیرہ جنوری کا نظریہ، روحانیات پر بائیس اکتوبر کا نظریہ، جمہوریت پر چھ جون کا نظریہ، فیوڈل ازم پر تین جولائی کا نظریہ، قوم کے مستقبل پر یکم اپریل کا نظریہ، تعلیمی انحطاط پر سترہ مئی کا نظریہ، وقت پر سات مارچ کا نظریہ اور غلام باغ کی حقیقت پر......؟'' کبیر نے فقرہ اُدھورا چھوڑتے ہوئے قہقہہ لگایا اور ہاف مین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اگلے سال کی درمیانی تاریخوں میں کوئی تاریخ رکھ لو۔ ابھی مجھے اپنا کام ختم کرنے میں مزید ڈیڑھ سال لگ سکتا ہے'' ہاف مین نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''تو غلام باغ کی حقیقت پر 21 جون کا نظریہ۔ 21 جون جو سال کا سب سے طویل دن اور مختصر ترین رات ہے'' کبیر نے کہا'' بک بک کی دنیا میں نظریہ بازی ایک کھیل ہے جس میں فی الحال میں نے ہر نظریے کی عمر ایک دن رکھی ہے۔ مگر کم بھی ہو سکتی ہے۔ آدھا دن ایک گھنٹہ۔ چند منٹ...... چند سیکنڈ......''

Scanned by CamScanner

ناصر گہری آسودگی سے مسکرایا۔ اُس کے انداز میں ایسی خوداعتمادی تھی جو ایسے لوگوں میں نظر آتی ہے جو جانتے ہیں کہ سب کچھ اُن کی توقع کے مطابق ہو رہا ہے۔ اُس نے کبیر کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی شکاری شکار کو پھندے کی طرف بڑھتے دیکھتا ہے۔

''تو پھر تو یہ کُھلا پاگل پن ہے'' زہرہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انسان ابھی ایک بات مان رہا ہو پھر اُس سے انکار کر دے۔ ایک دن اُس کا جو کوئی موقف ہو دوسرے دن اُس سے مُکر جائے۔ کیا یہ بھی کوئی نظریہ ہے''۔

''شاید...... شاید...... مگر نظریہ سے بھی زیادہ پریکٹس ہے۔ جیسے ہر کھیل ایک پریکٹس ہے۔ بک بک ایک لسانی کھیل ہے جو بولنے میں، سننے میں، پڑھنے میں، لکھنے میں۔ عام معزز لسانی کھیلوں سے کچھ بھی مختلف نہیں سوائے ایک بنیادی فرق کے......'' کبیر نے کہا اور حسبِ عادت بات کو تجسس انگیزی کی بے سکون فضا میں ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ قدیم داستان گوؤں کی روایت کے عین مطابق جو داستان گوئی کے دوران واقعات کو کسی ایسے موڑ پر لا کر چپ سادھ لیتے تھے جہاں آئندہ اور آمدہ کا تجسس مل ملا کر سامعین کو ہلکان کر دیتا تھا اور انہیں لمحات کے دوران وہ عظیم Oral فنکار سر کھجلانے، انگلیاں چٹخانے اور کانوں میں انگلی پھیرنے جیسے اہم کام سرانجام دیتے تھے''۔

کبیر نے اپنے متجسس سامعین کو بظاہر نظرانداز کر کے اچانک اپنے کان کسی موہوم آواز کی شناخت کرنے پر مرکوز کر دیے۔ اُس کی بھویں سکڑ گئیں اور ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آنے والے کمرے میں گہری نیند سوتے سراج دین کے خراٹے باورچی خانے کے ڈرامائی سناٹے میں چلے آ رہے تھے اور چولہوں میں جلتی گیس کی مسلسل ساں ساں کے پس منظر میں بہت نکھر کر سُنائی دے رہے تھے۔ کبیر مسکرایا اور زہرہ سے کہنے لگا۔

''تمہارا جاسوس خراٹے لے رہا ہے''۔

ہاف مین نے اُس سے صرف اتنا کہا۔ ''میرے لیے ابھی اس بات کا وقت نہیں''۔ مگر زہرہ نے کبیر کی اس زبردستی کی ڈرامائی مداخلت سے لطف اندوز ہونے سے صاف انکار کر دیا اور سخت لہجے میں اُس سے کہنے لگی۔

''تم کسی بنیادی فرق کی بات کر رہے تھے۔ کیا بنیادی فرق ہے؟''

Scanned by CamScanner

"آ...... ہاں...... بنیادی فرق" کبیر نے کہا" بک بک اور شریفانہ گفت وشنید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بک بک والے یا شاید اہلِ بکواس کہنا چاہیے یہ اور بھی مناسب رہے گا۔ ماننے نہ ماننے...... جاننے نہ جاننے۔ اقرار۔ انکار۔ یقین۔ بے یقینی۔ علم۔ لاعلمی۔ سچ۔ جھوٹ۔ حق۔ باطل۔ اچھائی۔ برائی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ پھر بھی وہ بہت کامیابی سے......"

"بک بک کیے جاتے ہیں۔" زہرہ نے جھپٹ کر کبیر کی بات مکمل کردی اور کبیر نے ایک ستائشی آسودگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم بہت تیزی سے معاملے کی تہہ تک پہنچ رہی ہو اور یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر" کبیر نے ناصر کو پھر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"میں وقت آنے پر اپنا خیال سامنے لے آؤں گا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں تم میرے لیے بہت عمدگی سے راہ ہموار کر رہے ہو۔" ناصر نے کہا۔

"عشق کے بارے میں" کبیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں عشق کے بارے میں جو تمہارا تصور ہے اُس سے آگے کی بات ہو گی یا شاید اُس سے...... پہلے کی۔"

"یقیناً عشق پر یہ ایک ناقابلِ یقین مکالمہ ہو گا" ہاف مین نے ایک بار پھر وجدانی انداز میں کہا۔

"اب مجھے حیرت ہو رہی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک جا رہا ہوں۔ حیرت ہی عشق ہے۔" کبیر نے کہا اور آنے والے کمرے میں سوئے زہرہ کے جاسوس کے خراٹوں پر چند لمحے غور کے بعد بولا۔ "خراٹے بیک وقت اُونچے اور مدہم سروں میں آ رہے ہیں اور ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب خراٹے لینے والا کوئی خواب بھی دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔"

"مگر...... کیوں...... کیسے تم جیسے لوگ سچ جھوٹ کی پرواہ کیے بغیر گفتگو یا جو تم کہتے ہو بک بک کر لیتے ہیں۔"

کبیر نے آہ بھری اور بناوٹی بے چارگی سے ناصر کی طرف دیکھا "میرا تو خیال تھا کہ ڈاکٹر تمہاری باری جلد آ جائے گی۔ لیکن اِدھر میرا یومِ حساب ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔" پھر وہ سیدھا زہرہ

سے مخاطب ہو گیا۔

''اس لیے کہ سچ جھوٹ طاقت وروں کی عیاشی ہے۔ سچائی، حقیقت، اچھائی، اقدار اور اس طرح کی دوسری بک بک پر مبنی نظریے مخالف کو زیر کرنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ کمزور کو اس کی جگہ پر رکھنے کے داؤ پیچ ہیں۔ میں صرف اتنا کرتا ہوں کہ آرڈر پر ضرورت مند کی پیمائش کے مطابق لفظوں کے پھندے تیار کرتا ہوں۔ نظریوں کے جال بُن دیتا ہوں۔ دلیلوں کے شکنجے کس دیتا ہوں۔ اس لیے کہ میں مکمل طور پر کرائے کا ادیب ہوں۔ I am a mercenary writer میرا قلم مکمل طور پر قابلِ فروخت ہے۔ عورت کی آزادی کے حق میں دس دلائل تو اس کی مخالفت میں گیارہ دلائل، جمہوریت کی بحالی پر بیس دلائل تو آمریت کی عظمت پر پچاس دلائل......''

کبیر ہنسا اور زہرہ کی زہر آلود ہنسی اُس میں شامل ہو گئی۔

''میرا خیال ہے میں سمجھ رہی ہوں......تم اپنے ذہن کی طوائف بازی کرتے ہو۔ تم ایک مختلف طرح کی طوائف ہو۔''

''بیشک......بالکل......یہی ہے کہ اس سے بڑا اعزاز میرے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' کبیر نے کہا اور زہرہ کی آنکھوں میں کچھ اُس نے ایسے دیکھا جیسے پہلی دفعہ دیکھ رہا ہو...... ''یہی ہے...... میں اگر جھوٹ سچ کی پرواہ کرنے بیٹھ جاؤں تو میرا کاروبار ٹھپ ہو جائے۔''

''اس کے باوجود تم ہر وقت سچ اور جھوٹ کی پرواہ کرنے میں لگے رہتے ہو۔ حتیٰ کہ اپنی اس مخصوص اتراتی ہوئی گفتگو میں بھی ہر وقت اپنے جھوٹ کو چھپانے کے چکر میں رہتے ہو۔'' اچانک ناصر نے کہا اور سب نے اپنی اپنی جگہ محسوس کیا کہ ہاں ایسا تو ہونا تھا ناصر نے کبیر کی بک بک میں وہ لمحہ تلاش کر لیا تھا جس میں اُس نے جیسے کچھ اپنے حق میں پانسہ پلٹ دینا تھا۔ کچھ اپنے لیے زیر وزبر کر دینا تھا اور وہ احساس کہ جو اُس شام دھند کے بوجھ میں شامل تھا کہ آج کچھ ہو جانا ہے مگر کیا؟ ابھی وہ نہیں جانتے تھے ناصر بھی نہیں۔ مگر اُس کے قریب آ پہنچنے کی تصدیق اب سب کے اندر موجود تھی۔ سردی کی ایک لہر ہاف مین کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی جو موسم کی سردی سے بہت الگ تھی۔ آتے والے کمرے سے زہرہ کے جاسوس کے خراٹے اب باورچی خانے میں نہیں آ رہے تھے۔ اتنا گہرا سناٹا اُتر آیا تھا کہ اُس نے دیوار کے ساتھ کرسی لگا کر بیٹھے اونگھتے عاشق علی کو

Scanned by CamScanner

یک دم چوکنا کر دیا تھا مگر وہ چاروں تو وہیں بیٹھے تھے۔

''میں سچ اور جھوٹ سے آگے کی بات کرتا ہوں'' کبیر نے کہا اور ایک موہوم سی بے یقینی کی ناطاقتی اُس نے یک دم اپنے اندر محسوس کی اور پھر جب اپنی اُس ناطاقتی پر اُسے غصہ آیا تو اُس احساس نے اور بھی گہرے قدم جمالیے۔

''یہ تمہارا اور بھی بڑا جھوٹ ہے'' ناصر کی آواز میں وہ قوت تھی جو آخری کامیاب داؤ لگانے والوں کی آواز میں جھلکتی ہے۔ ''بالکل بکواس''۔

''بکواس تو یہ ہے میں کب انکار کرتا ہوں۔ سوفی صد ہے اور ہم کر ہی کیا رہے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے یہ بکواس ہے۔ مگر میں شُرکائے بکواس کو یاد دلا دوں کہ موضوع بکواس عشق تھا۔ آؤ عشق پر بات کریں ڈاکٹر''

کبیر ہنسا اور زہرہ نے سوچا۔ ''کیا یہ اس کا وہم ہے یا کہ واقعی کبیر کی ہنسی میں مدافعت کرنے والوں کا کھوکھلا پن آ گیا ہے۔ وہ آخر کیوں اُسے گفتگو میں ناقابلِ تسخیر سمجھنے لگی تھی''۔

''میں عشق پر ہی بات کروں گا۔ فکر نہ کرو..... مگر تم نے کہا تھا ابھی ایک لفظ...... اعتراف۔ میں اسی لفظ کی طرف جا رہا تھا۔ انتظار کر رہا تھا۔ یہ لفظ معاملے کو بہت آسان کر دیتا ہے''۔

''اعتراف محض لفظ نہیں'' کبیر نے احتیاط سے کہا اور پھر اپنے محتاط انداز پر اپنی جھنجھلاہٹ کو محسوس کیا۔

''ہاں یہ محض لفظ نہیں اعتراف اس سے بہت آگے ہے اور ہم دیکھیں گے اعتراف لفظوں سے آگے کہاں تک جاتا ہے۔ مگر پہلا اعتراف مجھے کبیر لفظوں کے بارے میں ہی کرنا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں لفظوں میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا''۔

''کیا ایسا مقابلہ کرنا ضروری ہے'' کبیر نے کہا اور پھر فوراً ہی ہاف مین سے مخاطب ہوا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا ہاف مین...... اس حد تک کہ یہ ایک ناقابلِ یقین مکالمہ ہوگا۔ مگر کیا یہ عشق پر ہوگا؟ مجھے علم نہیں...... عشق کا اب کیا بنے گا یہ کوئی نہیں جانتا۔ نہیں میرا خیال ہے ہم مکالمے کی کسی نامعلوم سمت کو ضرور چھونے والے ہیں...... یہ سمت کیا ہوگی اس کا مجھے بھی علم نہیں...... میری حالت اس وقت اُس چلنے والے کی ہے جو یک دم گھٹا ٹوپ اندھیرے کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور اُسے علم نہیں ہوتا کہ روشنی ہونے کے بعد وہ کہاں ہوگا۔ ڈاکٹر تم نے ہمیں

Scanned by CamScanner

اندھیرے میں دھکیل دیا ہے۔ اب لازم ہے کہ روشنی بھی تم ہی دکھاؤ اور تم نے ٹھیک ہی کہا تھا...... شاید...... اعتراف...... روشنی...... شاید اُدھر سے ہی ملے گی۔ مگر دیکھ لو...... مگر چھوڑو...... تم وہیں سے آؤ...... کیا لفظوں میں...... لفظ بازی میں میرے ساتھ مقابلہ کرنا تمہارے لیے ضروری ہے''۔

''تھا...... مگر...... اب ایسا نہیں ہے...... میں اعتراف کر چکا ہوں کہ میں ایسا مقابلہ نہیں کر سکتا...... ضرورت تھی مجھے...... ضرورت ہوتی تھی مجھے...... تمہارے لیے میری نفرت کے شدید لمحوں میں...... جب تم اپنی اس بک بک کی برتری کو...... استعمال کرتے ہو...... اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے...... تم چاہتے ہو کہ اپنے آپ کو ہر وقت کامیابی سے دھوکہ دینے کی تمہاری اس کوشش میں اس...... اس تمہارے بالکل ذاتی منحوس کھیل میں...... ہر کوئی...... تمہارے ساتھ شامل ہو جائے...... مگر کیوں...... میں...... تمہیں...... بتادوں تمہارے اندر ناکامی کا...... جو اندھا گڑھا بنا ہوا ہے وہ...... تمہاری ان...... اپنے اردگرد کے دو تین درجن لوگوں سے...... تمہاری ان...... سستی لفظی فقرے بازیوں کے مقابلوں کی...... جیتوں سے نہیں بھر سکتا......''۔

ناصر کا سانس پھول رہا تھا۔ کبیر کی آنکھوں کی سیاہی پہلے سے زیادہ پھیل چکی تھی اور وہ خاموش تھا۔ زہرہ خاموش تھی۔ ہاف مین خاموش تھا اور عاشق علی بھی خاموش تھا۔ مگر سوچتا تھا کہ یہ پاگلوں کا ڈاکٹر شاید اتنی اچھی انگریزی نہیں پڑھا ہوا جب ہی تو اتنا اٹک اٹک کر بول رہا ہے۔ ویسے اب لگتا ہے کہ یہ چاروں پھر کافی مانگیں گے۔ تیاری کرنی چاہیے...... یا اللہ رات کے دو بج گئے ہیں...... آخر سونا بھی ہے...... اور بھائی مدد علی کی بھی بات کرنی ہے...... کیا وہ ساری عمر گونگا ہی رہے گا۔ ہاں اب وہ کبیر صاحب شاید اب کچھ بات کرنے لگا ہے کاش انگریزی مجھے سمجھ آتی ہوتی اور کبیر نے کہا۔

''میں اعتراف کرتا ہوں ڈاکٹر کہ کم از کم اس بار تم مجھ سے بک بک کے اس مقابلے میں بھی جیت گئے ہو''۔

''مجھے تمہارے اس اعتراف کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم وہ سب اعترافات کرو جن کی تمہیں ضرورت ہے...... مگر کر نہیں سکتے......'' ڈاکٹر کے لہجے میں چیلنج اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

''میرے خدا'' دفعتاً ہاف مین نے کہنا شروع کیا ''ہم کسی خطرناک سرزمین میں داخل ہو

رہے ہیں۔اعتراف بہت خطرناک سرزمین ہے۔اسی لیے تو ہمارے بڑوں نے اسے پادری باپ کے حجرے تک محدود کر دیا ہے۔"

"اس کے باوجود تمہارے ہاں اس کی مضبوط روایت موجود ہے" کبیر نے کہا "مگر افسوس ہم میں سے کوئی بھی سینٹ اگسٹائن یا روسو نہیں ہے۔ہم نسبتاً چھوٹے لوگ ہیں بلکہ کافی چھوٹے لوگ ہیں اور میں تو اس حد تک چھوٹا ہوں کہ جونیئر سائیکیاٹرسٹ ڈاکٹر ناصر بھی میرے اعترافی خلا سے بخوبی واقف ہے۔یقیناً خلافِ معمول لوگوں کے معالج کی حیثیت سے وہ ایسا دعویٰ کر سکتا ہے آخر ابھی کچھ دیر پہلے وہ پیرانویا پر بات کر رہا تھا...... میری التجا ہے ڈاکٹر تم مجھے میری اعترافی ضرورتوں سے آگاہ کرو۔"

کبیر میں اس کی وہ مخصوص چال ڈھال اب پھر آن موجود ہوئی تھی جو کچھ دیر پہلے زہرہ کو کہیں ڈگمگاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور اس پر اُسے ویسے ہی اطمینان کا احساس ہوا جو اپنے پسندیدہ کھلاڑی کے وقتی طور پر لڑکھڑانے مگر پھر سنبھل جانے پر ہوتا ہے مگر اُسے تو دوسرے کھلاڑی کے لڑکھڑا دینے والے اُس وار پر بھی اطمینان کا احساس ہوا تھا۔وہ کس کے ساتھ ہے؟ کیا وہ بالکل لاتعلق ہے۔چار افراد کے اُس عجیب وغریب تعلق کی دنیا میں ہے بھی اور نہیں بھی۔نہیں ایسا نہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔شاید وہ اُن تینوں سے اپنا تعلق ابھی دریافت نہیں کر پائی۔زہرہ نے اپنے مخصوص اضطرابی انداز میں سر کو جھٹکا اور ناصر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔وہ مسکرا رہا تھا جیسے کم ہی مسکراتا تھا اپنی کسی اندر کی قوت کے پس منظر کے ساتھ اور وہ اچھا لگ رہا تھا پہلے کبیر کو اپنی نظروں سے گاڑتے ہوئے اور پھر اپنے لفظوں سے......

"نہیں...... میں تمہارے سب اعتراف کی ضرورتوں کی بات نہیں کرتا۔میں صرف ایک اعتراف کی بات کرتا ہوں۔جو میری ضرورت بھی ہے۔بہت بڑی ضرورت اور دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے اعتراف پہلے بھی کیا ہے، میں نے۔جسے اس کی ضرورت ہی نہیں...... عجیب بات ہے...... مگر عجیب نہیں...... عجیب یہ دنیا ہے جو ہم چاروں کے درمیان بن گئی...... اس میں میرا یہ اعتراف وہ معنی رکھتا ہے جو اسے پہلے کبھی نہیں مل سکتا تھا...... میرے اوپر ایک لمحہ گزرا تھا ابھی کچھ دیر پہلے جب ہم باہر بیٹھے تھے اور تم نے کہا تھا 'آؤ عشق پر بات کریں' تو اس وقت وہ لمحہ میرے اوپر گزرا تھا اور مجھے یہ سب کچھ نظر آ گیا تھا جو ہونے والا ہے...... میرے ساتھ...... اور بھی کسی کے

Scanned by CamScanner

ساتھ......میں نہیں جانتا......مگر میرا بوجھ اُتر گیا......میں......میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں زہرہ سے عشق کرتا ہوں میں نہیں جانتا عشق حیرت ہے یا کچھ اور......مگر......وہ جو اسے حیرت کہتا ہے اُسے بھی اعتراف کرنا چاہیے......''

''کس بات کا'' ہاف مین نے چونک کر اور بہت سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''عشق کا......اُسے......کبیر کو اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ زہرہ سے عشق کرتا ہے اور تم ہاف مین......تم بھی......تمہیں بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ تم بھی زہرہ کے عشق میں گرفتار ہو......اگر تم جُرأت کر سکتے ہو تو ایسا اعتراف کر لو......''۔

''میرے خدا'' ہاف مین نے ایک ہی اضطرابی جھٹکے میں سانس اندر کھینچتے ہوئے کہا اور کبیر کا قہقہہ بھی اتنا ہی اضطرابی تھا جیسی کہ وہ کیفیت جو زہرہ پر طاری ہو گئی تھی جسم کے روئیں بھیگ جانے، خنکی اور پھر بے اختیاری میں تیزی سے گھوم جانے، ہر شے کے اپنے اپنے محور پر چکرا جانے کی وہ کیفیت......ناممکن اور محال امر کی تجسیم۔ ''میرے خدا'' ہاف مین نے پھر کہا۔

''میرا خیال تھا ہاف مین تم اس وقت خدا کو یاد کرنے کی بجائے پھر اپنا قول دہراؤ گے کہ یہ عشق پر ایک ناقابلِ یقین مکالمہ ہوگا۔ میں نے کہا تھا اعتراف پر مکالمہ......مکالمے پر مکالمہ......ڈاکٹر تم نے جو تاریکی پھیلائی تھی......اعتراف کی روشنی اُسے کم تو کر سکتی ہے۔ مگر دیکھ لو......اعتراف کی روشنی چندھیا بھی سکتی ہے اندھا بھی کر سکتی ہے......اس کے مقابلے میں......وہ عقل وخرد کی مدھم سی لو......بالکل غائب بھی ہو سکتی ہے......کیا تم......کیا ہم......اجتماعی دیوانگی کا خطرہ مول لے سکتے ہیں......ہاف مین نے ٹھیک کہا تھا۔ اعتراف ایک خطرناک سرزمین ہے''۔

ناصر گہرے طنزیہ انداز میں ہنسا ''اب تم اپنی فصاحت وبلاغت، رَیٹارک کا فریب دو گے۔ اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے......ٹھیک ہے میں تمہیں اعتراف پر مجبور نہیں کرتا......''۔

اور وہ جو کچھ بھی جو زہرہ کے دل ودماغ......جسم وجان میں تھا وہ اتنا ہی تھا کہ برہنگی کی خواہش برہنہ ہونے کے بعد بھی رہتی ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اعتراف برہنگی کی ازلی خواہش ہے مگر اس کی کوئی حد تو ہوگی......؟

کائنات گھوم کر پھر واپس اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔ زہرہ نے شدت سے اپنے آپ سے شکوہ کیا کہ آخر وہ کتنی ہی دیر سے خاموش کیوں بیٹھی ہے اسے کچھ کہنا چاہیے کچھ بولنا چاہیے کچھ کرنا

Scanned by CamScanner

چاہیے۔ زہرہ نے گھوم کر دیوار کے ساتھ بیٹھے اور اب پھر سے اونگھتے عاشق علی کی طرف دیکھا اور پھر غیر معمولی طور پر بلند آواز میں اُس سے مخاطب ہوئی۔

''عاشق علی'' عاشق علی ہڑبڑا کر نہ صرف جاگ گیا بلکہ کرسی سے بھی اُٹھ گیا۔ آج تک بی بی نے براہِ راست اُس سے بات نہیں کی تھی۔

''جی سرکار'' وہ بھاگا آیا۔

''کافی بناؤ پلیز............سب کے لیے............اور کچھ کھانے کو دو......''

''انڈے......ٹوسٹ بنادوں جی......'' عاشق علی نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......ہاں کچھ بھی............''

عاشق علی اپنے کام میں جُت گیا اور اُسی وقت سوئے ہوئے جاسوس کے خراٹے پھر سے ماحول کو ایک سمعی پس منظر مہیا کرنے لگے۔ عاشق علی نے لکڑی کی الماری میں سے انڈوں کی ٹوکری نکالی آٹھ انڈے چُنتے وقت اُس نے کچھ ایسے انڈوں کو خفت اور شرمندگی سے دیکھا جن پر مرغی کی بیٹ اور خون کے آثار چپکے ہوئے تھے۔ اُس نے دزدیدہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا وہ چاروں کچھ ایسی حالت میں تھے جیسے بول ہی پڑنے والے ہوں۔ مگر بول نہ رہے ہوں۔ اس نے سٹین لیس سٹیل کا ایک بڑا پیالہ نکالا اُس کے اندر صافی پھیر کر اُس نے پیالے کو صاف کرنا چاہا تو صافی پر لگے تیل کے دھبے نے ایک دھندلی لکیر دھاتی سطح پر چھوڑ دی اور پھر اُن چاروں سے سب سے زیادہ فاصلے پر ساں سا‌ں جلتے چولہے کے قریب پہنچ کر عاشق علی نے پہلے انڈے کو چولہے کے کنارے کے ساتھ ایک نپی تلی قوت سے ٹکرایا پھر مختصر سے شگاف میں دائیں بائیں سے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے ڈالتے ہوئے جب وہ مخالف سمتوں میں دباؤ ڈالنے لگا تو موسم سرما کے اس معمول کے ردِعمل کے مطابق وہ ہلکی سی مایوسی سے بھر گیا۔ سردیوں میں سب انڈے صاف ہی نکلتے ہیں۔ انڈہ کھلنے پر گندا یا چنگا سامنے آنے کا جوا بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے عاشق علی کو گرمیوں میں انڈے توڑنے کا بہت مزہ آتا تھا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ گرمیوں میں لوگ ویسے ہی انڈے کم کھاتے ہیں اور توڑنے کے مواقع بھی کم ہو جاتے ہیں۔ پوری کائنات میں عاشق علی کے اس مسئلے کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔

انڈوں، ٹوسٹوں کے ذکر، الماری کھلنے، انڈا ٹوٹنے، عاشق علی کی چلت پھرت، بیسن

Scanned by CamScanner

میں پانی چلنے کی آواز...... روزمرہ کے غیر اہم واقعات سب مل ملا کر اُن سب کے اندر ایک احساس بیدار کر گئے تھے جیسے ابھی کسی بڑی آفت سے بچ نکلنے کا موقع اُن کے پاس ہے۔ محال کیفیتوں کے ظالمانہ جبر سے بچ نکلنے کا ایک موقع اُن کے درمیان آ گیا ہے۔ وہ نامعلوم راستہ جس پر ایک بھی قدم اُٹھانے کے بعد واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اُس سے واپسی ابھی ممکن ہے۔

عاشق علی نے انڈوں کے ملغوبے میں نمک مرچ شامل کر کے جب پھینٹنا شروع کیا تو اُس نے ایک گہری نظر پھر اُن پر ڈالی۔ یہ اُس کے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی کہ وہ چاروں اکثر باتیں کرتے کرتے خاموش بھی ہو جاتے تھے۔ گو کہ وہ اُن کی باتوں کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں پاتا تھا لیکن ان کی خاموشیوں کے رنگ ڈھنگ وہ محسوس کرتا تھا۔ اب اُن کی خاموشی پر اُس کے دل نے گواہی دی کہ خاموشی کے ساتھ کچھ عجیب سی کشیدگی اُن کے درمیان اُتری ہے۔ جس نے چاروں کو اپنی اپنی جگہ تمام سا دیا ہے۔ مگر یہ کیسی کشیدگی ہے کہ کسی کے چہرے پر بھی ناراضی، غصے کے تو کوئی آثار نہیں۔ پھر عاشق علی نے سوچا اگر کہیں ہرا دھنیا ہوتا تو وہ کتر کر ڈال دیتا۔ مگر گورا صاحب تو شاید دھنیا کھاتا ہی نہیں ہو گا۔ پتہ نہیں اُن کے مُلک میں دھنیا ہوتا بھی ہے کہ نہیں...... اور اگر ہوتا بھی ہے تو کیسا ہوتا ہے۔ اُس نے پھر نظر ڈالی...... مگر گورا صاحب کی شکل کو کیا ہوا ہے...... وہ تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے...... جیسے...... عاشق علی نے پھینٹنے والا چمچہ اور بھی شدت سے چلانا شروع کیا تو یک دم تھوڑا سا مواد اُچھل کر باہر نکلا اور نیچے اُس کے پاؤں کی انگلیوں کے اوپر گر کر اندر تک چپ چپا کر گیا۔ کئی طرح کے احساس سرسراتے ہوئے عاشق علی کے دل و دماغ اور جسم و جان میں لپک گئے اور انہیں میں عاشق علی کا اُن چاروں کی جانب پھر سے دیکھنا بھی تھا اور پھر تعجب نے ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جیسے وہ چاروں بھی ایک دوسرے کی طرف ویسے ہی دیکھ رہے تھے جیسے وہ اب اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب عاشق علی نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور اپنے آپ کو اپنے ہوش میں رہنے کی تلقین کی اور بڑے لوگوں کی' کی کرائی' پر دماغ کھپانے سے اُس نے توبہ کی۔ کمی پوری کرنے کے لیے اس نے ایک اور انڈہ توڑ کر پھر پیالے میں ڈالا تو وہ جھاگ دار ملغوبے میں کہیں نیچے بیٹھ کر غائب ہو گیا۔ اُس نے پھر اُس نیچے چُھپے ہوئے انڈے کو پھینٹنے کے لیے چمچہ چلانا شروع کیا مگر آہستگی سے۔

غٹ شٹ...... شٹ شٹ...... شڑ، شڑ...... غٹ...... غٹ شٹ...... کٹ کٹ...... انڈہ

Scanned by CamScanner

پیٹے جانے کی یہ آوازیں ایک تسلسل سے اُن کی سماعت میں موجود تھیں۔ پھر جب یہ آوازیں بند ہو کر ایک مختلف تسلسل سے پھر شروع ہوئیں غٹ......شپ......شپ......شپ......سر......تو ان میں یہ احساس پھر واپس آ گیا کہ جو کچھ کہا جا چکا ہے اُس سے صاف بچ نکلنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اچانک زہرہ نے اپنے سر کو اپنے مخصوص دو تین اضطرابی جھٹکے دیئے اور ایک عجیب سی گہری بدلی ہوئی آواز میں بولی اور جسے سُن کر اب عاشق علی کے ہاتھ سے پورا پیالہ گرتے گرتے بچا اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔

''جب کبیر نے ناصر کو چیلنج کیا تھا کہ آؤ عشق پر بات کریں تو اضطراری طور پر میرے منہ سے یہی فقرہ نکل گیا تھا 'آؤ عشق پر بات کریں' اور مجھے اس پر خفت محسوس ہوئی تھی کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ مگر پھر مجھے اپنی اس خفت پر غصہ آیا تھا کہ یہ کیا ہے۔ کیا مجھے اس موضوع پر ایسے بات اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ میں ایک عورت ہوں۔ یہ تینوں مرد کیا مجھے اس دباؤ میں رکھیں گے کہ میں عورت ہوں اس لیے مجھے بیباکی سے عشق پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے اس پر اور بھی غصہ آ گیا تھا اور پھر میں نے اسی بات کو اپنا لیا تھا 'آؤ عشق پر بات کریں' کچھ بھی بات ہو کیسی بھی ہو...... میں تو تیار تھی......''۔

کبیر نے گہرا سانس لیا ''کیا یہ اعتراف ہے''۔

''اعتراف......اعتراف کہہ لو یا کچھ اور مگر مجھے اس پر کوئی خفت کوئی شرمندگی نہیں'' زہرہ نے کہا۔

''جو کچھ کہا گیا اُس کہی کی ان کہی کو کہنے کا وقت آ گیا ہے۔'' کبیر نے اعلان کیا ''کہی کی ان کہی وہ ممنوعہ کلام ہے جو ظاہری کلام کے پیچھے ہر لحہ ہمارے اندر چُھپا رہتا ہے۔ یہ خالصتاً اندر کی بک بک ہے اسے جوں کا توں باہر لانا ہے تو دیوانگی کو گلے لگانا ہو گا عقل و خرد صرف ظاہر کے رہنما ہیں۔ خطرہ بہت زیادہ ہے۔ دیکھ لو......شاید کل دنیا یہ سُنے کہ کچھ لوگ باتیں کرتے کرتے پاگل ہو گئے۔''

کبیر کے لہجے میں تنبیہ کا عنصر موجود تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ خود بھی اس خود اختیار کردہ لسانی دیوانگی کی ترغیب سے بچ نہیں سکتا۔ شاید بچنا ہی نہیں چاہتا۔

Scanned by CamScanner

''کیا یہ اجتماعی تحلیل نفسی کی کوئی سمت ہوگی ناصر'' کبیر نے پوچھا مگر ناصر کی بجائے ہاف مین نے جواب دیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ اس وقت...... آگے. کا حال میں نہیں جانتا لیکن ابھی یہ ویسی کیفیت ہے میرے اوپر...... جیسی جب میں نے پہلی دفعہ L.S.D. کا Trip لیا تو اُس سے پہلے کی کیفیت ایسی ہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں اپنے ذہن کو ملیامیٹ کرنے کے بعد میں واپس آ بھی سکوں گا کہ نہیں...... واپسی ممکن بھی ہوگی کہ نہیں''۔

''واپسی...... اپنے...... روزمرہ کے ذہن میں......'' کبیر ہنسا ''مگر واپسی سے پہلے وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ زبان کے مکمل زوال کی دنیا میں۔ زبان کا کوئی بھی لفظ وہ دروازہ ہے جو زبان کی مکمل تباہی کی راہ پر کُھل سکتا ہے مگر میں اُسی لفظ کی راہ میں داخل ہوتا ہوں جسے آج ایک بوکھلا دینے والے چیلنج کی شکل میں سامنے لایا گیا۔ 'عشق' اور جس کا محور اس عورت کی ذات کو بنایا گیا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ عورت اور مرد کے جسمانی تعلق کی جتنی بھی شکلیں اس معاشرے میں موجود ہیں کوئی بھی میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے اس لیے میں وقتی آسودگی کے لیے خیالی پیکروں سے خود لذتی کا تعلق بنالیتا ہوں۔ میری آزادی اس طرح ختم نہیں ہوتی اور میں آزاد رہتا ہوں اور بہت خوش رہتا ہوں۔ مگر جب سے زہرہ اس دنیا میں آئی ہے جسے ہم چاروں لوگ Share کر رہے ہیں میں مانتا ہوں کہ میری آزادی سلب ہونے لگی ہے۔ جب میں نے ناصر سے اس کے بارے میں سُنا تو میں ہنسا تھا پھر میں نے اسے ایک عجیب وغریب خط لکھا تھا مگر میں نے اُس وقت تک زہرہ کو دیکھا نہیں تھا۔ وہ خط ننگے افلاطون کے زیرِ اثر لکھا گیا تھا۔ جو گُو کھاتا ہے کلیجی کھاتا ہے اور انہیں ہاتھوں سے مُشت زنی کرتا ہے اور اُس کے مادہ تولید میں گُو کی آمیزش ہوتی ہے اور چیونٹیاں اُسے کھانے کے لیے اردگرد سے لپکتی ہیں''۔

عاشق علی نے کافی کے چار بڑے مگ، آملیٹ کا ایک ڈھیر اور بہت سے ٹوسٹ اُن کے سامنے رکھ دیئے۔ کبیر بولتا رہا مگر باقی تینوں بڑی رغبت سے اُس کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے اور کبیر بولتا رہا اور اُس وقت کبیر کا بولتے ہی جانا ایک ایسی خلافِ معمول بات تھی جس نے عاشق علی کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پھر یک دم اُسے ایک ایسی بات یاد آ گئی جس پر دہشت نے اُسے گھیر لیا۔ جب وہ لڑکا تھا اور گاؤں میں رہتا تھا تو ایک دن پتہ چلا کہ ایک جوان عورت پر جِن آ

Scanned by CamScanner

گیا ہے اور جن نکالنے والے آئے ہیں۔ گھر کچھ بتائے بغیر وہ تماشہ دیکھنے چلا گیا۔ پتہ چلا کہ عورت پر جو جن آتا ہے وہ کوئی بڑا عالم جن ہے اور کئی زبانیں جانتا ہے۔ جب عاشق علی گھر کے کھلے صحن میں پہنچا تو انہوں نے عورت کو زنجیروں سے باندھا ہوا تھا اور جن اُس وقت انگریزی بول رہا تھا اور بولتا جاتا تھا اور بولتا جاتا تھا نہ اُس کی آواز اُونچی ہوتی تھی اور نہ ہی نیچی ایک ہی تار میں کچھ بولتا جاتا تھا جیسے کبیر صاحب بول رہا تھا۔ جن نکالنے والوں میں سے ایک شخص جواں سال تھا اُس کا دعویٰ تھا کہ وہ فرنگیوں کی یہ زبان سمجھتا ہے اور اس زبان میں جن یہ بتا رہا ہے کہ وہ عورت پر کیوں قابض ہوا ہے۔ عورت ایک دن گاؤں سے باہر ویرانے میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے رفع حاجت کر رہی تھی۔ بعد میں اُس نے ایک مٹی کے ڈھیلے سے اپنے آپ کو صاف کیا اور ڈھیلا اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ جہاں جن کا کنبہ کھانا کھا رہا تھا۔ ڈھیلا جن کے بچے کو لگا اور وہ مر گیا اور جن اُسی وقت عورت کو چمٹ گیا اور اُس کی جان لے کر ہی اُسے چھوڑے گا۔ اسی وقت عاشق کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ جن کا بچہ صرف ایک ڈھیلے سے کیسے مر سکتا ہے اور دوسرا یہ تاثر تھا کہ اپنے بچے کی موت جن بھی برداشت نہیں کر سکتا اور اُسی لمحے اُس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تھا جو انگارے جیسی سُرخ ہو رہی تھیں اور عاشق علی نے کبیر کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بھی اُسے انگارے جیسی ہی سُرخ لگیں۔ گیس کے چولہے کا سُرخ شعلہ کبیر کی سیاہ آنکھوں میں لہراتا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

''میں سمجھتا تھا کہ میں نے عورت مرد کے اس تعلق کو بہت سادہ اور آسان بنا دیا ہے۔ میں کبھی بھی عورت سے انسان کا تعلق بنا نہیں سکوں گا اور ایسا کوئی تعلق ادھر ہے بھی نہیں۔ میں آزاد رہوں گا۔ جیسے ننگا افلاطون آزاد ہے۔ مگر کیا وہ آزاد ہے۔ آزاد ہے...... آزاد ہے...... آزادی...... موت...... زندگی...... پھول...... ایڈیٹر...... اور جی...... میری آزادی...... میں آزاد نہیں رہا...... یا ورعطائی...... میں اُس شخص کے لیے جو زہرہ کا باپ تھا...... بہت پریشان رہا...... وہ کیسا حیرت انگیز شخص تھا...... مانگر جاتی...... مانگر جاتی...... مانگر جاتی......'' کبیر کے کلام میں انتشار کی پہلی جھلک دیکھ کر ناصر، ہاف مین اور زہرہ نے ایک دوسرے کی طرف متوحش نظروں سے دیکھا پھر جیسے ایک دوسرے کی نظروں کی تاب نہ لا کر وہ پھر کافی کے مگوں میں گھس گئے۔

یک دم کافی کا مگ زہرہ کے ہاتھ میں بُری طرح لرزنے لگا۔ ہاف مین نے تیزی سے وہ

برتن تھام کر واپس میز پر رکھ دیا۔ زہرہ اک دم یوں جھٹکے سے کھڑی ہو گئی جیسے اگر بیٹھی رہتی تو وہیں مر جاتی۔ اُس کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آنکھیں اتنی کُھل گئی تھیں کہ اور کُھل نہ سکتی تھیں اور چہرے کا رنگ ہلدی کی مانند زرد تھا۔ دور دیوار کے ساتھ پشت لگائے بیٹھے عاشق علی سے یہ نظارہ برداشت نہ ہو سکا اُسے لڑکپن میں دیکھی جن چمٹی عورت پھر نظر آئی تو اُس نے تیزی سے آنے والے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا اور قرآنی آیات کا ورد کرنے لگا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ شروع سے ہی...... بلکہ دوپہر کو ہی جب وہ لوگ وہاں آئے تھے تو اُن کے ساتھ کوئی گڑبڑ تھی۔ ورنہ اتنی سخت سیت سردی میں آدھا دن اور آدھی رات اور اب اُس سے آگے کون ایسے جما بیٹھا رہ سکتا ہے۔ شروع سے انہوں نے انگریزی زبان میں کوئی شیطانی عمل شروع کر دیا تھا جب ہی تو اُسے گو کہ کوئی لفظ نہیں سمجھ رہا تھا پھر بھی کیسے کیسے عجیب وسوسے اس کے دل میں اُٹھتے تھے۔ اُن چاروں کے بارے میں...... اس کا دل جھوٹ نہیں کہتا تھا کہ ان چاروں کے ساتھ آج کچھ ہو گا یا یہ کچھ کریں گے اور وہی ہوا۔ ان کا عمل رنگ لا رہا ہے اور عورت پر جن آ گیا ہے اب یہ کسی آسیب کی آمد کا وقت ہے۔

زہرہ کے جاسوس کی نیند لازوال تھی۔ بیداری کی دنیا میں واپس آ کر چھوٹی بی بی کی زندگی کے سب سے زیادہ ہیجانی لمحوں کا نظارہ کر لینے کی اُس کے پاس کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خواب میں تھا اور دیکھتا تھا کہ اُس کی بیوی اپنی اصل عمر سے کہیں زیادہ جوان لگ رہی ہے اور زیورات میں لدی پھندی بیٹھی ہے۔

''تم''۔ کیفے غلام باغ کے کچن میں اس وقت تک زہرہ نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اُس کی آواز میں وہ لرزش تھی جو حیرت کی انتہا سے شل زبان سے نکلے لفظوں کو ناقابلِ فہم بنا دیتی ہے۔

''اعتراف اگر انکشاف بن جائیں تو اور بھی تباہ کُن ہو جاتے ہیں'' ہاف مین بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کچھ بھی نہیں۔ کوئی تباہی نہیں آنے والی جو کچھ ہو رہا ہے بہت اچھا ہو رہا ہے'' اچانک ناصر ایک انوکھی غیر متوقع شانتی کے ساتھ سب سے مخاطب ہوا۔ پھر اُس نے زہرہ کو سہارا دے کر کُرسی پر بٹھایا۔

''بیٹھو...... تم...... بیٹھو...... پلیز...... تم گر جاؤ گی...... بیٹھو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے......

پچھلے کئی گھنٹوں سے اس جگہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہم اپنے ساتھ کر رہے ہیں میں اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ یوں بھی تجزیے کرنا اس شخص کا کام ہے'' اُس نے کبیر کی طرف دیکھا۔

کبیر کی آنکھیں نیم وا تھیں جبکہ زہرہ نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں گہرے سانس لیتے تھے۔ جیسے کہ ابھی کسی شدید جسمانی تعلق کی انتہا سے ہو کر پلٹے ہوں۔

''پتہ نہیں یہ اجتماعی تحلیلِ نفسی ہے یا سائیکو ڈرامہ ہے یا کچھ اور ہے...... مگر...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں بالکل خالی ہو گیا ہوں'' ناصر کہتا رہا نیستی اور گہری آسودگی کا خلا اُس کے اندر بھر گیا وہ مسکرایا اُس کے لفظوں میں سکون تھا اور لہجے میں طمانیت، وہ کبیر سے مخاطب ہوا۔

''اگر عشق تحیر ہے کبیر تو پھر بھی تم اس میں بہت آگے ہو۔''

کبیر نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اُسے احساس ہو چکا تھا کہ اُن چاروں کے درمیان مکالمے کی دنیا پھر سے بدل گئی ہے اور اب اُس کا رنگ کیا ہو گا یہ خود معلوم کرنے کی بات ہے۔ اُس نے سامنے پڑے اپنے حصے کے آملیٹ اور ٹوسٹ کو دیکھا تو اُسے علم ہوا کہ وہ بھی بھوکا ہے۔ پھر اُس نے کہا۔

''میں اب اتنا بھونڈا اور کمینہ بھی نہیں ہوں کہ عشق کو تحیر ثابت کرنے اور اس میں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اتنی بک بک کرتا جسے تم اعتراف کہتے ہو مگر جان لو کہ تمام عشق تحیر ہے 'مگر' تمام تحیر عشق نہیں۔''

اور کبیر نے آملیٹ کھانا شروع کر دیا۔ ہاف مین مسکرایا۔ دنیا ان چاروں کے نارمل کی طرف پلٹ رہی تھی۔ پھر اُس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''تیرہ جنوری کو ختم ہوئے چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اب جو بھی نظریات، تھیوریز بنیں گی وہ چودہ جنوری کی ہوں گی۔ کیوں کبیر''۔ کبیر نے تیزی سے منہ چلاتے ہوئے نوالہ نگلا پھر کہنے لگا ''ثابت ہوا ہے کہ مکمل اعتراف ایک محال امر ہے اس دعویٰ میں ہی خود تردید ی ہے۔ لفظوں کے اپنے ہی کمینگی اور ذلالت کے رشتے ہیں۔ وہ ہم سے بالا بالا ہی ایک دوسرے کی...... میرا مطلب ہے ٹانگ کھینچتے رہتے ہیں۔ اعتراف ایک ناممکن امر ہے''۔

Scanned by CamScanner

''اعتراف کے بارے میں چودہ جنوری کا نظریہ'' ہاف مین نے قہقہہ لگایا۔
تب زہرہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ جیسے کسی اجتماعی طلسم کے زیرِ اثر محوِ خواب لوگ طلسم ٹوٹنے پر ایک ایک کر کے آنکھیں کھولتے ہیں۔

''اپنی کمینگی اور ذلالت کا ذمہ دار لفظوں کو مت ٹھہراؤ'' زہرہ نے جارحانہ لہجے میں کبیر سے کہا'' تم...... خود...... اعتراف...... جو بھی یہ ہے...... اس کی لذت سے...... اپنے آپ کو عریاں کرنے کی لذت ہی تو یہ ہے...... اس لذت کو خود قطرہ قطرہ...... نہیں بلکہ فقرہ فقرہ نچوڑ کر...... اب کہتے ہو یہ محال ہے...... بکواس کرتے ہو...... ہمیں اس سے محروم کرنا چاہتے ہو...... کیوں''۔

کبیر کے حلق میں نوالہ پھنسا اُس نے کافی کے ایک گھونٹ سے اُسے نیچے دھکیلا۔

''نہیں میں محروم نہیں کرنا چاہتا...... ہرگز نہیں...... کسی کو بھی نہیں......''

ہاف مین نے بے چینی سے ناصر کی طرف دیکھا جو بدستور اپنی انوکھی شانتی میں تھا اور لگتا تھا کہ اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

''ڈاکٹر ناصر میرا مطلب ہے...... کسی دلچسپ مگر ضرور ہے کہ بہت پیچیدہ نفسیاتی یا پتہ نہیں روحانی عمل کے بعد...... حیرت انگیز طور پر پُرسکون ہو چکا ہے۔ اگر ہم اسے Catharsis کہہ لیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا...... ڈاکٹر''۔

''نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا'' ناصر نے کہا۔

''مگر مجھے اعتراض ہوگا، یہ Catharsis بہت ہی گھٹیا سا بکواسی تصور ہے۔ سطحی۔ پوچ'' کبیر نے کہا۔

''بہرحال...... کچھ بھی ہو...... میرا خیال ہے ڈاکٹر کو مزید کسی کے اعتراف وغیرہ کی ضرورت نہیں۔'' ہاف مین نے کہا۔

''بات اب میری ضرورت کی نہیں۔ یا شاید اُس سے آگے جا چکی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں میری ضرورت تو بس یہ تھی میں...... سنو اب میں وہی کہتا ہوں جو اس وقت۔ بالکل اِس وقت میرے ذہن میں ہے۔ بچپن میں میں اپنے آپ کو اتنا چھوٹا محسوس کرتا تھا اتنا چھوٹا کہ میں سکول کی باڑ میں گھس کر کیڑوں کو زمین پر چلتے دیکھا کرتا تھا سُرخ، نیلے، پیلے رنگ کا ایک کیڑا مجھے اتنا خوبصورت لگتا تھا کہ میں اُس جیسا بن کر اُس کی کیڑا دنیا میں چلا جانا چاہتا تھا۔ اُس دنیا میں جہاں

Scanned by CamScanner

ایک خوبصورت کیڑا زمین اور کیڑا آسمان ہوگا............ پھر جب میں بڑا ہوا تو میں نے اُس کیڑا دنیا کو رد کرنا شروع کر دیا...... میں اب اسے رد نہیں کروں گا۔''

کبیر نے سانس چھوڑ دیا جو ناصر کے بولنے کے دوران وہیں کا وہیں رک گیا تھا۔

''دیکھو...... اب یہ...... ڈاکٹر کے کتنے اندر سے آئی ہے اور اس کے کسی اختیار کے بغیر...... میرے خدا...... کس قدر خوفناک مگر کس قدر خوبصورت...... مگر یہ اعتراف نہیں ہے...... ارادے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے...... اعتراف محال ہے...... مگر کبھی کبھی اس وہم میں مبتلا ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں..........''

پھر وہ تینوں اچانک ہاف مین کی طرف دیکھنے لگے اس طرح جیسے تاش کے کسی کھیل کے دوران باقی تینوں اس چوتھے کھلاڑی کی طرف دیکھتے ہیں جس نے چال چلنا ہوتی ہے۔

ہاف مین نے ہار ماننے کے انداز میں کندھے اُچکائے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ مکمل اعتراف یا مکمل سرِ عام عریانی یہ خوفناک امکان اب ٹل چکا ہے اور پھر اعتراف کے بارے میں کبیر 'عظیم نجات دہندہ کبیر' کا چودہ جنوری کا نظریہ بھی سامنے آ چکا ہے جس سے مجھے کافی حوصلہ ہوا ہے۔ میں اس نظریے کی روایت میں جو ابھی قائم ہوئی ہے یا شاید ہمیشہ سے ہے میں اپنے لفظوں کی ذمہ داری قبول کیے بغیر...... اعتراف کرتا ہوں...... مجھے دیکھنے دو......''

''مجھے دیکھو'' اچانک زہرہ نے کہا'' آؤ عشق پر بات کریں۔''

''میرا عشق'' ہاف مین نے کہنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ سب کچھ کہنے کے باوجود ہچکچاہٹ سے خالی نہ تھا'' مجھے کہنے دو...... میں اس وقت اپنے سفید فام وجود کی ظالمانہ خود آگہی کا شکار ہوں۔ بہت کم میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے خاص طور پر تم لوگوں میں بیٹھے ہوئے مگر اس وقت ہے...... میرا عشق تمہاری دنیا میں تمہارے اس غلام باغ کے لیے ہے...... مگر مجھے اعتراف ہے کہ میرے اس عشق میں ایک ادھورا پن تھا کوئی بڑا گوشہ نامکمل تھا...... میرے تمام احساس میں۔ ایک تخلیقی آرکیالوجسٹ کے احساس میں کوئی سنسناتا خلا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس......'' تب اُس نے زہرہ کو اپنی گہری نیلی آنکھوں سے مرکوز کیا...... ''اس قابلِ عزت خاتون اس معزز عورت نے...... اس عظیم نسوانی ہستی نے...... اس احساس کی تکمیل کر دی ہے...... غلام باغ میرے لیے

Scanned by CamScanner

اس ہستی نے اپنے اساطیری وجود سے کامل کر دیا...... دیکھو...... میں اسے بہت دور تک لے جا رہا ہوں۔ ملکہ سبا، قلوپطرہ، زارنیہ‘‘

’’الزبتھ ٹیلر‘‘ یک دم کبیر نے کہا۔

’’بکومت ذلیل آدمی میں جانتا ہوں کہ تم اپنے معمول کے خبیث وجود میں آ چکے ہو‘‘ ہاف مین نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ کبیر کی مداخلت پر زہرہ نے عجیب سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اُس نے فوراً ہی معافی مانگنے والوں جیسا منہ بنا لیا۔

’’آئی۔ ایم۔ ساری، پلیز ہاف مین اپنا آرکیولاجیکل کنفیشن جاری رکھو۔‘‘

’’میرا خیال ہے، دائرے میں آگے اب زہرہ ہے۔ ہاف مین اپنی چال چل چکا ہے‘‘ ناصر نے اپنے ہر ایک لفظ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

پھر وہ تینوں مرد اُس ایک عورت کو دیکھنے لگے۔

’’دائرہ نہیں، مربع کہو، میں تمہیں دائرے کی آزادی کے مزے نہیں لوٹنے دوں گی۔‘‘

’’کیا مطلب‘‘ کبیر نے دہل کر پوچھا۔

زہرہ نے باری باری اُن تینوں کی آنکھوں میں دیکھا گہری سیاہ گہری نیلی اور بھوری آنکھوں میں پھر اُس نے انہیں ایسے دیکھا جیسے تینوں کو ایک ہی نظر میں دیکھ رہی ہے۔

’’تم تینوں اپنی اپنی جگہ۔ اپنی اپنی مردانگی میں سمجھتے ہو کہ میرے لیے کافی ہو، مگر...... میں......‘‘ اعتراف کرتی ہوں کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی اکیلا اکیلا میرے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر عشق کچھ ہے تو مجھے تم تینوں کے کسی مثالی مشترک وجود سے ہے جو کہیں بھی نہیں ہے۔ بس ایسا ہی ہے، میں مانتی ہوں...... جیسا بھی ہے مگر یہی ہے...... محال ہے تو پھر بھی ہے...... میں کیا کروں...... اگر یہ مریضانہ ہے...... تو پھر بھی ہے...... میں تم تینوں کو...... ایک بنا کر ہی سوچ سکتی ہوں‘‘۔

اور وہ تینوں مرد اب اپنی اپنی دو تہائی مردانگی کی یک دم تخفیف کے بعد ایک ہو کر ایک عورت کے سامنے حیرت زدہ تھے۔

آٹے والے کمرے میں محو خواب لوگوں میں پہلے بیدار ہونے والا زہرہ کا جاسوس تھا۔ مؤذن کی اذان نے اس کے سوئے ہوئے کانوں میں اُتر کر بیداری کا حکم صادر کیا تھا۔ وہ ہڑبڑا

Scanned by CamScanner

کرا ٹھا اور انتہائی نامانوس ماحول کو دیکھ کر فوراً ہی زمان و مکاں میں مکمل گمشدگی کا شکار ہو گیا۔
"میرے خدا میں کہاں ہوں" پھر آٹے کی بوریوں کو خوابناک ہستیاں تسلیم کرتے ہوئے اُس نے چاروں طرف کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی کوشش کی تو اُسے عاشق علی بیرہ نظر آیا جو بوری بچھا کر اور دو بوریاں اوپر اوڑھ کر سو رہا تھا اور...... پھر ایک ہی زقند میں اس کی یادداشت واپس آ گئی۔

آنکھیں ملتا سہما ہوا سراج دین جب کچن میں واپس آیا تو وہ چاروں اپنے اپنے کپڑے درست کرتے۔ اٹھ رہے تھے۔

"یا اللہ" سراج دین اندر سے کراہا "اس رات ہی رات کے دوران یہاں کیا کچھ نہیں ہو گیا ہو گا...... میں بڑی بی بی بیگم صاحبہ کو کیا رپورٹ دوں گا...... ادھر پتہ نہیں کیا ہوتا رہا۔ یا اللہ مجھے معاف کر۔"

پھر اُس نے دیکھا کہ وہ جس کے بارے میں لانس نائیک شمشیر نے کہا تھا کہ پھانسی لگے گا اپنا کوٹ پہنتے ہوئے عجیب سے طریقے سے ہنستے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور اُسی انگریز کی زبان میں۔

"آخر میں...... مجھے صرف اتنا کہنا ہے اگر کوئی سننا چاہے۔ زہرہ کے اس اعتراف تک جس نے مجھے کاٹ کر ایک بٹا تین تک محدود کر دیا ہے جو کچھ گزرا ہے جو کچھ بیتا ہے اور وہ ذلتوں کے زمانے جو اس سے پیشتر بیت گئے انہی سے میں اپنے اصل کام کا خمیر اٹھاؤں گا......"

"تمہارا ناول" ہاف مین نے جلدی سے کہا۔

"پتہ نہیں...... میں نہیں جانتا ناول کیا بکواس ہوتی ہے مگر کچھ بھی افسانوی، غیر حقیقی فکشن......"

"تم حقیقی سے غیر حقیقی کی طرف جاؤ گے تو......"

"تو بس بک بک باقی رہ جائے گی" ناصر نے زہرہ کی بات کو اپنے انداز میں مکمل کر دیا۔ مگر زہرہ کا عدم اطمینان واضح تھا۔

"کیا تم ہمارے کرداروں کے گرد افسانوی دنیا بناؤ گے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"تمہارے کردار نہیں...... بلکہ وہ جو تمہارے خیالی پیکروں کے ساتھ میرے ملاپ سے میرے اندر جنم لیں گے" کبیر نے کہا۔

Scanned by CamScanner

''یہ کافی نحش ارادہ ہے فکشن کاری کا'' ہاف مین نے کہا اور ناصر ہنس پڑا۔ پھر ناصر نے شدید بے چینی سے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ رات ساری بیت چکی تھی ایک شدید پیشہ ورانہ تشویش نے اُسے گھیر لیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے پوری شفٹ کی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ آج اُس نے پیرانائیڈ مریضہ کی ادویات میں ردوبدل کرنا تھا۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اُس کی ملازمت کی کارکردگی پہلے ہی انتظامیہ کے ذہنوں میں سوالیہ نشانات پیدا کر رہی تھی۔

''میں اپنی پیرانائیڈ مریضہ کی عیادت کے لیے جا رہا ہوں'' اُس نے کہا'' پتہ نہیں بے چاری نے یہ رات کیسے گزاری ہوگی''۔

''ایسی ہی جیسی ہم نے گزاری ہے۔ حقیقت میں رہتے ہوئے غیر حقیقت کے مزے لوٹ کر...... آئے گا یہ سب کچھ آئے گا میرے اصل کام میں'' کبیر نے عجیب سرور میں کہا۔

''میں تمہیں اس ''اصل کام'' میں من مانی نہیں کرنے دوں گی'' زہرہ نے اُسے تنبیہ کی اور کبیر کے جواب کا انتظار کیے بغیر ناصر تیزی سے باہر نکل گیا۔

'' OK ...... پھر سہی'' اُس نے جاتے جاتے کہا۔

''وہاں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے'' کبیر نے جواباً زہرہ کو تنبیہ کی۔

پھر زہرہ نے سو روپے کا ایک نوٹ سراج دین کو دیا اور کہا!

''آپ جائیں اور ہاں ماما کو جو چاہیں بتا دیں۔ آج کے بارے میں''۔

''نہیں۔ نہیں۔ بی بی جی...... توبہ...... توبہ...... میں کیسے یہ...... کہہ سکتا ہوں'' سراج دین ہکلایا۔

''کیا...... توبہ...... توبہ......''۔

''نہیں...... جی...... میں...... کچھ...... نہیں...... آپ فکر نہ کریں...... میں کچھ نہیں بتاؤں گا جی...... سلام جی''۔

اور سراج دین دُزدیدہ نظروں سے سب کو دیکھتا سلام کرتا چلا گیا۔ زہرہ کا پارہ چڑھ گیا۔

''احمق آدمی...... پتہ نہیں کیا سمجھتا رہا...... توبہ...... توبہ''۔

جواباً کبیر اور ہاف مین نے خوب قہقہے لگائے۔

Scanned by CamScanner

"ہر ذہن اپنے مقام سے حقیقت کو تاڑتا ہے۔ اس کے لیے حقیقت محض توبہ...... توبہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے" کبیر نے کہا۔

"چودہ جنوری کا نظریہ نمبر 2" زہرہ ہنسی۔

"عاشق علی کہاں گیا"۔ اچانک کبیر کو خیال آیا۔

پھر انہوں نے عاشق علی کو بوریوں میں لڑھا سوتا ہوا چھوڑا اور کچن سے اور پھر کیفے سے باہر غلام باغ میں آ گئے۔ صبح صادق کی دھند بھوری سیاہی مائل تھی اور اس قدر کثیف کہ چند گز سے آگے کچھ بھی دیکھنا محال تھا۔

"اس کے بھائی مددعلی کے گنگے پن کا معاملہ تو بیچ میں رہ گیا۔ عاشق علی کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس کے بارے میں" کبیر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا اور زہرہ نے ایک طویل جمائی لی اور ہاف میں بولا۔

"شاید کچھ بات آگے بڑھے۔ میں اسی وقت جنم کھنڈر میں جانے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں جہاں مددعلی کی گویائی چھن گئی تھی۔ اگلی ملاقات تک۔" اور پھر وہ دھند میں ڈوبے غلام باغ میں ایک سمت بڑھا اور لمحوں میں غائب ہو گیا۔

"تم بھی کہیں جاؤ گے" زہرہ نے پوچھا۔

"تم مجھے میرے گھونسلے تک پہنچا دو" کبیر نے زہرہ سے درخواست کی۔

"آؤ"۔

وہ دونوں کچھ دور کھڑی زہرہ کی گاڑی کی طرف بڑھے جس پر رات بھر اُترتی دھند کے پانی لمبی لکیروں کی شکل میں اپنا نقش چھوڑ گئے تھے۔ گاڑی انہیں لیے دھند میں غرق بڑے شہر میں سے گزرتی رہی۔ آخر کبیر نے کہا۔

"بس یہیں روک دو" اور جو کبیر نے نہ کہا وہ یہی تھا کہ "کسی عورت کی گاڑی میں بیٹھنا جو صرف اسی عورت کی گاڑی ہو اس عورت کے وجود کے احساس کو بہت شدید کر دیتا ہے" کبیر کا کسی ایسی گاڑی کا ایسا پہلا تجربہ تھا اور ایک خطرناک تجربہ تھا۔

"تم...... ہاں تمہارا گھونسلہ یہاں سے قریب ہی ہے کیا"۔

"ہاں اور وہ گھونسلہ سیکنڈ ہینڈ کتابوں سے بنا ہے۔ اگر کبھی سیکنڈ ہینڈ کتابیں دیکھنے کا شوق ہو

Scanned by CamScanner

تو دیکھ لینا''۔

''کتابیں تو کبھی سیکنڈ ہینڈ نہیں ہوتیں''۔

''ہاں مگر انسان تو سیکنڈ ہینڈ ہو سکتے ہیں''۔

زہرہ ہنسی۔ کبیر گاڑی سے اُترا اور وہ گاڑی آگے دھند میں بڑھا لے گئی۔

فٹ پاتھ پر کھڑے کبیر نے ایک طویل سانس لیا۔ ٹھنڈا سفید کہرہ اس کے اندر تک اُتر گیا اور اندر تک ہی ایک سکون آور غبار کی طرح پھیل گیا۔

بڑا شہر دھند میں ڈوبا ہوا معدوم تھا۔ اچانک ''عظیم تنہائی'' نے کبیر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

کائنات میں اکیلا انسان۔

اُس جگہ فٹ پاتھ پر سے کچھ ہی آگے ایک ذیلی سڑک سُندر شام روڈ کی جانب مڑتی تھی۔ کبیر اُسی سڑک کی جانب چند قدم ہی آگے بڑھا تو اُسے کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوا۔

یہ بھی ایک گاڑی ہی تھی جو دھند میں سے بے آواز کسی سفید شارک کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ کبیر دوسرے ہی لمحے اُسے فراموش کر دیتا مگر اُس کی غیر معمولی سست رفتار نے اُسے متوجہ کیا۔ گاڑی چلانے والے کی نظریں سامنے کہرے میں گڑی تھیں اور وہ بالکل دائیں بائیں نہیں دیکھ رہا تھا مگر پھر کبیر کو شدت سے احساس ہوا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔

گاڑی رینگتی ہوئی اُس کے قریب سے گزری تو اُس نے اُسے دیکھا وہ پُرتعیش گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بائیں جانب بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔

پہچان لینے کے احساس کے بعد جو دوسرا احساس تیزی سے اور شدت سے کبیر کے ذہن میں اُبھرا وہ یہ تھا کہ گاڑی کے شیشوں کی راہ سے اُسے گھورتے امبر جان کے چہرے پر ویسے ہی گھلے ہوئے اضطراب کے تاثرات نقش تھے جیسے کبیر کو ایک اور رات میں زہرہ کی چیخ کے بعد اُس کے چہرے پر نظر آئے تھے۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(14)

کبیر مہدی کا اصل کام

یخ بستہ تاریک کہرے میں ڈوبے جاڑے کے وہ دن بھی بیت گئے۔
جیسے ہر موسم میں اُس موسم کی انتہا ایک الگ موسم بن جاتی ہے اور پھر اُس کے گزر جانے پر دنیا سمجھتی ہے کہ موسم بدل گیا ویسے ہی سورج نکل آنے اور دھوپ کے دنیا میں پھیل جانے کے بعد لوگوں نے کہا کہ سرما گزر گیا۔ مگر سرما ابھی وہیں تھا اور یہ ایک مہربان سرما تھا۔
کبیر مہدی کے 'گھونسلے' اور سکالرز اولڈ بکس شاپ کے مالک پچھتر سالہ امداد حسین نے پوری تیاری کے ساتھ چھت پر دھوپ میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ پوری تیاری سرسوں کے تیل کی ایک شیشی۔ موتیے کے عطر سے تر روئی کے ایک پھوہے۔ سرمہ دانی اور سرمہ سلائی۔ ایک نیل کٹر۔ ایک چھوٹی سی قینچی۔ ایک مختصر سے گول آئینے ایک عدد جانگیے اور خود امداد حسین پر مشتمل تھی۔ دوسری منزل کی لینڈنگ پر پہنچ کر اُس نے اُس کمرے کے بند دروازے کی طرف مایوسی سے دیکھا جسے کبیر اپنا گھونسلا کہتا تھا۔ کمرہ باہر سے مقفل نہیں تھا۔ 'اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اندر ہی ہے اور اکثر بے فکرے نوجوانوں کی طرح دن چڑھے تک سو رہا ہے۔' امداد حسین نے اندازہ لگایا۔ ہفتہ وار تعطیل کے روز دن چڑھے تک سونا، نوجوان نسل کی حد تک تو امداد حسین اس بشری کمزوری کو طوعاً و کرہاً برداشت کر لیتا تھا۔ مگر اُس کی اپنی نسل کے نیند کے متوالے بوڑھے اُس کے نزدیک کسی طرح بھی قابلِ معافی نہیں تھے۔ کیونکہ اُس کے طبی عقیدے کے مطابق، جسے وہ "طبِ شمسی" کا نام دیتا تھا، سرمئی دھوپ اور خاص طور پر پہلے پہر کی دھوپ بڑھاپے کے امراض کے لیے امرت دھارے کا مقام رکھتی تھی۔
"جو بوڑھا جاڑوں میں جتنی زیادہ دھوپ پی لیتا ہے سارا سال اُتنا ہی سُکھی رہتا ہے۔"

Scanned by CamScanner

یہ بات ایک بار اُس نے کبیر کے سامنے اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہی تھی۔ جواباً کبیر نے ہنس کر کہا تھا۔

"گرمیوں کی دھوپ کے بارے میں کیا خیال ہے امداد صاحب، وہ دھوپ تو اُلٹا پورا بوڑھا پی جاتی ہے"۔

مگر کبیر کا کیا ہے امداد حسین نے سوچا۔ ہر بات کا ٹھٹھا اُڑانا اور غیر سنجیدہ گفتگو اُس کا شیوہ ہے مگر اب کچھ عرصہ سے امداد حسین کبیر کے چھانٹی کے کام سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ چھانٹی کی بجائے وہ کسی اور ہی کام میں لگا رہتا تھا جو اُس کے اخباروں رسالوں میں مختلف جعلی ناموں سے لکھنے کا کام بھی نہ تھا پتہ نہیں وہ کیا کام تھا جو وہ آج کل کرتا رہتا تھا۔

چھت پر پہنچ کر امداد حسین دھوپ دیکھ کر نہال ہو گیا۔ مگر پھر چھت پر بنی ایک برساتی کے نیچے رکھے پرانی کتابوں کے بہت سے بنڈل دیکھ کر آزردہ ہو گیا۔ کبیر نے ابھی تک اُن کی چھانٹی شروع نہیں کی تھی۔ اب اگر وہ چھانٹی بھی نہیں کرتا تو پھر اُس کمرے کا کرایہ دے جس میں وہ اتنے سالوں سے مفت رہ رہا ہے۔ آخر بالکل مفت تو وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ امداد حسین نے تیل کی شیشی اور دیگر سامان لکڑی کی اُس چھوٹی سی میز پر سجاتے ہوئے سوچا جو بان کی چارپائی کے پاس اسی مقصد کے لیے رکھی گئی تھی۔

دھوپ لگوانے اور ذاتی صفائی ستھرائی کی رسم کا آغاز کرتے ہوئے امداد حسین نے سب سے پہلے اُن کپڑوں سے چھٹکارا حاصل کیا جو محض سرما کے پہناوے تھے۔ پھر اُس نے شلوار اُتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے لمبی قمیض کی اوٹ میں سے جانگیے کو اوپر کمر تک چڑھایا۔ پھر قمیض اور بنیان سے بھی آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ چارپائی کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ پاؤں کے تلووں اور پیٹھ کو بان کی رسیوں پر ٹکانے اور گھٹنوں کو بازوؤں کے دائرے میں سمیٹنے کے بعد اُس نے چاروں طرف سر گھما کر اس طرح دیکھا جیسے چوزہ انڈے سے نکلنے کے بعد کائنات کو پہلی بار قدیم حیرت سے دیکھتا ہے۔ مگر یہ کیفیت چند لمحوں سے زیادہ امداد حسین پر قائم نہیں رہتی تھی اور نہ رہی۔ اُس نے گھٹنوں کو بازوؤں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے ٹانگوں کو آگے پھیلایا اور کہنیوں کے سہارے کمر اور سر کو آہستگی سے نیچے چارپائی پر استوار کیا۔ پھر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ چارپائی پر اس تیزی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا جیسے ریت پر کوئی زخمی چھپکلا تڑپ رہا ہو۔ چارپائی پر

Scanned by CamScanner

لیٹے لیٹے تیزی سے اُلٹنے پلٹنے کے اس عمل سے امداد حسین کے خیال کے مطابق خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی جسے کہ دھوپ سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے تیز کرنا بہت ضروری تھا۔

خون کی گردش کو حسبِ منشا تیز کرنے کے بعد وہ شانت ہو کر سیدھا کمر کے بل لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سورج اب ہر مسام کے رستے جسم میں داخل ہو کر کونوں کھدروں میں منجمد بڑھاپے کی کثافتوں کو پگھلا پگھلا کر خون میں شامل کر رہا تھا تاکہ بعد میں اخراج کے مختلف عمل اُن سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس عمل کی کامیابی کی گواہی امداد حسین کے خیال کے مطابق اُسے اُس وقت ملتی تھی جب اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا پورا جسم موم کا ایک پتلا بن گیا ہے۔ نرم گرم جدھر چاہو موڑ توڑ لو۔

"آ..........امداد صاحب۔"

موم کے پتلے کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو وہ ہڑبڑا کر پھر سے ٹھنڈی ٹھار ہڈیوں والا امداد حسین بن گیا۔ اُس نے شدید اضطراب کے عالم میں آنکھیں کھولیں۔ کبیر مہدی منہ میں ایک ٹوتھ برش لٹکائے کھڑا اُسے تمسخر بھری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ خلوت کے لمحات میں مداخلت پر ہونے والی کوفت کے ابتدائی لمحات گزر جانے کے بعد امداد حسین نے سوچا چلو اچھا ہی ہوا یہ آ گیا آج ملاقات بہت ضروری تھی۔ اُس نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کھرکھراتی سی آواز میں کہا۔

"کبیر صاحب......آیئے......جناب۔"

"آ......نہیں......پلیز......آپ لیٹے رہیں۔ پلیز آپ اپنا سن باتھ ڈسٹرب نہ کریں...... دراصل آج مجھے بھی......ایسے ہی میرا جی بھی چاہا کہ کچھ دھوپ مجھے بھی لگوانی چاہیے......کبھی تو ایک آدھ صحت مندانہ حرکت ہمیں بھی کر ہی لینی چاہیے۔ ویسے جناب کیا بات ہے......اس سردیوں کی دھوپ کی......اکسیر چیز ہے......واہ۔"

"بے شک......گورے پاگل نہیں ہیں کبیر صاحب......آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ لاکھوں کی تعداد میں سمندروں کے کنارے دھوپ میں پڑے ہوئے ملتے ہیں۔"

"جی......جی......بالکل......کہاں پاگل ہیں جناب......اُن حرامزادوں نے تو ساری دنیا کو پاگل بنایا ہوا ہے۔ ویسے میرا جی چاہتا ہے انہیں ایک اور طرح کا سن باتھ بھی ملنا چاہیے۔"

''وہ کیا'' امداد حسین نے لیٹے لیٹے دلچسپی سے پوچھا۔

''اُسے بھی اِن گوروں نے ہی ایک نام دیا ہوا ہے ہیٹ سٹروک، یا سن سٹروک...... مگر میں اُسے 'سورج کا بلاوا' کہتا ہوں۔ جب سورج دیوتا اپنے پیاروں کو پاس بلانے کے لیے کچھ خصوصی اقدامات کرتے ہیں۔'' کبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے پہلے بھی ایک دفعہ کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا'' امداد حسین نے شک سے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دراصل آپ دل سے طبِ شمسی کے قائل ہی نہیں ہیں۔''

''نہیں جناب امداد صاحب نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو طبِ شمسی کیا طبِ قمری کا بھی قائل ہوں۔ کیا آپ کو علم ہے چودھویں رات کی چاندنی میں چودہ دفعہ نہانا۔ پانی سے نہیں خدا نخواستہ۔ بلکہ چاندنی میں چودہ راتوں کے لیے 'مون باتھ' کہہ لیں۔ ایستادگی عضو اور امساک کے لیے مجرب ہے......''

''مذاق کرتے ہیں'' امداد حسین ہنس پڑا لیکن اب اس کے لہجے میں ایک ایسی چھک تھی جسے کبیر خوب پہچانتا تھا۔ نیم فحش ذو معنی گفتگو اُس کے مالک مکان کی ایسی کمزوری تھی جس سے کبھی کبھار فائدہ اُٹھانے میں کبیر کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔

''نہ مانیں'' اُس نے لاپروائی سے کہا۔

جواباً امداد حسین نے بے چینی سے اپنے جانگیے کی سلوٹیں درست کرنا چاہیں اور اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کبیر پھر بول پڑا۔

''نہیں......نہیں...... مجھے کچھ نظر نہیں آرہا...... ویسے بھی مردانہ برہنہ جسم دیکھنے سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔''

امداد حسین کسی فوری ہیجانی ردِعمل کا شکار ہو کر چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کبیر سے پوچھنے لگا ''تو کیا زنانہ جسم؟''

''ظاہر ہے'' کبیر نے طے شدہ انداز میں کہا۔

''بے شک ظاہر ہے'' امداد حسین نے سر ہلاتے ہوئے تصدیق کی۔

''ویسے امداد صاحب ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی آپ کی............''

''کیا؟''

Scanned by CamScanner

''آپ باقی پورے جسم کو تو طبِ شمسی سے فیضیاب کرتے ہیں۔ مگر اہم ترین طبقات کو جو سورج کی خصوصی شفقت کے مستحق ہیں۔ اُن کے آگے یہ فضول سا جانگیہ چڑھا لیتے ہیں یہ کیا بات ہوئی؟''

امداد حسین ہنس پڑا۔ بس کبیر کے یہی انداز تھے گفتگو کے جو اُسے بھا جاتے تھے۔

''ٹھیک کہتے ہیں'' اُس نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک کہتے ہیں کبیر صاحب...... مگر کیا کریں جناب، اخلاقیات آڑے آتی ہے۔ اخلاقی اقدار کا لحاظ بے بس کر دیتا ہے۔ ورنہ طبِ شمسی...... آپ ٹھیک کہتے ہیں......''

''نہیں۔ یہاں...... چھت پر کہاں اخلاقی اقدار اُڑتی پھرتی ہیں'' کبیر نے کہا......

''اونچی چھت ہے۔ ارد گرد سے کوئی تاک جھانک نہیں...... بے دھڑک ہو کر مساوی دھوپ لگوایئے...... ہاں ذرا چیل کوے کا خیال رکھیے گا کہیں کوئی انتڑی ونتڑی سمجھ کر اڑا نہ لے جائے......''

جواباً امداد حسین اتنا ہنسا کہ کبیر کی طرف سے اُس کا دل بالکل صاف ہو گیا۔ اُس نے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا اور پھر ایک گہرا نیم گرم سانس لیا اور کبیر اندر سے لرز گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب کیا آنے والا ہے۔ امداد حسین کی عورتوں کی فتوحات کی داستانیں جو پچھلی نصف صدی پر پھیلی ہوئی تھیں اور جن میں جنوبی ہند کی تقریباً ہر نسل کی عورت شامل تھی۔ امداد حسین کا کہنا تھا کہ اسی شوق کے پیشِ نظر اُس نے شادی نہیں کی تھی کیونکہ بیوی سے بے وفائی اُس کے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا۔

''صاحب میں ان دنوں نینی تال میں تھا......'' ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کبیر نے سوچ لیا کہ کیوں نہ بڈھے کی توجہ اسی موضوع کے نسبتاً زیادہ نظری اور مجرد پہلوؤں کی طرف موڑ دے یقیناً اس طرح جلد گلو خلاصی ہو جائے گی۔

''جی...... جی......'' اُس نے جلدی سے کہا ''آپ ایک بات بتائیں امداد صاحب۔ آپ اتنے بڑے عورت خور رہے ہیں......''

''عورت خور...... اچھا ہے......'' امداد حسین نے اس خطاب پر فخر محسوس کرتے ہوئے کہا اور ہنسا۔

''جی...... یقیناً...... آپ ایامِ جوانی کے قصے جو کبھی سُناتے ہیں وہ اگر سچ ہیں تو آپ ''کاسانووا'' سے کم نہیں......''

''تو آپ کا مطلب ہے...... میں جھوٹ بولتا ہوں......'' یک دم امداد حسین نے بھوئیں سکیڑ کر کہا ''اور یہ بدمعاش کون تھا کاسایبا''۔

''کاسایبا۔نہیں کاسانووا...... بدمعاش ہی تھا......'' کبیر نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں نہیں آپ ہرگز جھوٹ نہیں بولتے آپ...... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا...... اسی لیے تو آپ سے راز کی بات پوچھ رہا ہوں......''

''راز کی بات؟'' امداد حسین نے سرسوں کے تیل کی شیشی اٹھا کر تھوڑا سا تیل ہتھیلی پر ڈالا اور ٹانگوں پر آہستگی سے مالش کرتے ہوئے اس نے کبیر کی طرف دیکھا۔ اب اُس کے انداز میں کسی ماہرِ فن کی بے اعتنائی تھی۔ ''کیا بات کون سی بات...... کبیر صاحب''۔

''جی...... عورت کو فتح کرنے کا راز کیا ہے امداد صاحب......'' کبیر نے پوچھا۔

''بس اُس کا شک دور کر دو۔ یہی راز ہے'' امداد حسین نے اتنے دوٹوک اور اٹل انداز میں کہا کہ کبیر حیران رہ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ بڈھا کچھ اِدھر اُدھر کی ہانکے گا اور کھسک جائے گا۔ مگر یہاں تو نظری بنیادیں بہت مضبوط لگتی تھیں اور کبیر کے تجسس کو یک دم انگیخت دے رہی تھیں۔

''شک؟ کیسا شک امداد صاحب'' کبیر نے ٹوتھ برش منہ سے نکالتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا شک نہیں۔ کیسے شک کہو'' امداد حسین نے پہلے کوئی بنیادی تصحیح کی اور پھر ٹانگوں پر مالش اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''دیکھو میاں ہر عورت ایک لمحے اس شک میں مبتلا ہوتی ہے کہ وہ مردذات کے لیے دنیا کی سب سے پُرکشش ہستی ہے اور دوسرے لمحے اُسے یہ شک ہوتا ہے کہ وہ بالکل بھی کسی کے لیے بھی کچھ کشش نہیں رکھتی۔ بس جو مرد اُسے یقین دلا دیتا ہے کہ وہی تو ہے جو سب سے زیادہ پُرکشش ہے یا اُس کا شک کچھ کم ہی کر دیتا ہے وہی کامیاب رہتا ہے''۔

کبیر نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور چھت پر ایک طرف بنے اینٹوں کے ایک چبوترے پر دھم سے بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا۔ میں نے کچھ غلط کہا'' امداد حسین نے اب رانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''نہیں امداد صاحب...... آپ نے عبرت ناک حد تک درست کہا ہے۔ یہی راز ہے۔ اب ہیں دیکھیں۔ ہم ہمیشہ اُس کے دوسرے لمحے کے شک کو اور بھی پختہ کرتے رہے............''

''اور انجام بھی دیکھ لیا ہو گا'' امداد حسین نے غور سے کبیر کو تاڑتے ہوئے کہا پھر بے حیائی سے ہنستے ہوئے پوچھنے لگا'' قصہ کیا ہے کبیر صاحب...... کوئی سلسلہ چل نکلا ہے کیا۔''

''جی کچھ ایسا ہی سمجھیں۔ مگر وہ خاتون اس خاکسار کو صرف ایک تہائی مرد سمجھتی ہے اور میں اُسے کیا سمجھتا ہوں...... پتہ نہیں'' ایک بے چینی کبیر پر آئی اور گزر گئی۔ امداد حسین کا ہاتھ جانگیے کے نیچے اپنے جسم کو سہلاتے سہلاتے وہیں رُکا اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں کے غور و فکر کے بعد آزمودہ نسخہ بیان کرنے کے انداز میں کڑک کر بولا۔ ''اُسے توڑا کرائیں۔''

''توڑا کرائیں...... یہ توڑا کیا بلا ہے'' کبیر نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا۔

''بے نیازی برتیں جناب، مت ملیں۔ بہانے کر دیں...... ملاقات طے کر کے غائب ہو جائیں...... اس طرح کشش پیدا ہوتی ہے کبیر صاحب تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ آزما کر دیکھیں۔''

''افسوس جہالت میں ہی عمر گزر گئی۔ آج تک یہی پتہ نہ چل سکا کہ توڑا کرانا کیا ہوتا ہے۔ عشق پر ناقابلِ یقین مکالمہ بھی ہو کر گزر گیا مگر نری دیوانگی میں ہی گھومتے رہے حکمت کے یہ موتی کہیں نظر نہ آئے۔''

''ہم یقینی باتیں کرتے ہیں کبیر صاحب۔''

''بے شک'' کبیر نے برجستہ جواب دیا'' آج ارادہ تھا ملاقات کا۔ لیکن اب جو راز آپ نے بتایا...... تو ارادہ ہے کہ توڑا کراؤں اور بستر میں بیٹھ کر بس اپنا کام کروں۔''

''اور میرا کام جناب'' امداد حسین نے کتابوں کے بنڈلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر یکدم ملتجی لہجے میں کہنے لگا۔ '' کبیر صاحب یہ چھانٹی کر دیں اب۔ بہت آپ کی مہربانی ہو گی۔ یقین کریں باہر فٹ پاتھ پر کتابیں کم پڑ رہی ہیں۔ دوکان کے لیے مضمون الگ الگ نکال دیں تاکہ باقی فٹ پاتھ پر بھجوا دوں۔ یہ چھانٹی کر دیں ہمیں جی............''

کبیر نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ یہ ہو ہی جانا چاہیے۔ ورنہ بڈھے کی کِل کِل روز بہ روز بڑھتی جائے گی اور اُس کے اصل کام کو متاثر کرے گی۔

''بالکل...... بالکل امداد صاحب...... معاف کیجیے گا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ یہیں دھوپ

Scanned by CamScanner

میں کرتے ہیں چھانٹی اور آج سارا دن کرتے ہیں چھانٹی......'' کبیر نے پُرعزم لہجے میں کہا اور امداد حسین اتنا خوش ہوا کہ طپ شمسی یک دم کئی گنا زیادہ موثر ہوگئی۔

''زندہ باد کبیر صاحب...... یہ ہوئی نہ بات میں ابھی بڑی دری منگواتا ہوں ادھر ہی آج کام بھی ہوگا اور دھوپ بھی لگوائیں گے۔

کبیر مسلسل دھوپ میں بیٹھنے کا عادی نہ تھا خواہ وہ سرما کی ہو یا گرما کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُسے اپنا سر دہکتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر جب سورج کی طرف کئی رُخ بدلنے کے باوجود یہ کیفیت برقرار رہی تو اُس نے وسیع و عریض دری کے ایک سرے کو گھسیٹ کر برساتی کے سائے میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ سینکڑوں کتابیں اب اُس کے سامنے بکھری تھیں۔ دری کو گھسیٹنے کے لیے اُسے امداد حسین کی مدد درکار تھی جو اُس وقت گہری محویت کے عالم میں اپنے ناک کی اندرونی خلا میں سے تاک تاک کر بال کاٹ رہا تھا اور قینچی کو کاٹنے کے بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے دائیں طرف کے منہ کو بائیں طرف اس طرح گھما رہا تھا کہ پورا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔

''کیا شخص ہے یہ بھی'' اسے دیکھ کر کبیر نے سوچا ''عورتوں کے بارے میں اس کے سب کے سب قصے جھوٹ نہیں ہو سکتے۔ ''عورت کے شک نکال دو'' کیا بات ہے۔

کبیر نے سامنے پڑی ہر عمر۔ ہر نسل۔ ہر موضوع کی کتابوں پر نظر ڈالی۔ آرگینک کیمسٹری۔ اُس نے اُس موٹی تازی باہر کی چھپی کتاب کو کیمسٹری کی کتابوں میں رکھ دیا۔ کام شاستر ایک بوسیدہ رسالہ نما۔ پرانی چھپی ہوئی باتصویر کتاب جس کی تصویریں دیکھ کر کام سے ہی نفرت ہونے کا خطرہ تھا۔ یہ باہر جائے گی فٹ پاتھ پر متفرق کتابوں میں۔ کنگ لیئر شیکسپیئر زندہ باد۔ انگریزی ادب۔ پھر ایک کتاب کبیر نے اُٹھائی جو انگریزی زبان میں تھی مگر جس کے پہلے بیس صفحات اور آخر کے نامعلوم کتنے صفحات غائب تھے۔ حاشیے میں کتاب کا ٹائیٹل یا مصنف کا نام کہیں نہیں تھا۔ اس طرح کی کتابیں سیدھی ردی میں جاتی تھیں اور اس کیٹیگری کو کبیر ایک طرف کچھ فاصلے پر پھینک رہا تھا۔ یہ کوئی ناول تھا اور کبیر اُسے پھینکنے کو ہی تھا کہ ایک خیال اُس کے ذہن میں آیا۔

ایک کردار ہے جسے ایسی ہی ایک ادھوری کتاب مل جاتی ہے جو آگے اور پیچھے سے غائب ہے مگر جو کچھ موجود ہے اُس کو پڑھ کر وہ کردار اُس کتاب کے آغاز اور تکمیل کے بارے میں سوہانِ روح میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کئی طرح کے آغاز اور انجام سوچتا ہے اور اس طرح ایک اور

Scanned by CamScanner

ناول تشکیل پاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔
کبیر نے فیصلہ کیا کہ اُسے اس آئیڈیا کو اپنے اُس رجسٹر میں جمع کر لینا چاہیے، جس میں وہ
اُن دنوں اپنے 'اصل کام' کے لیے سرمایہ اکٹھا کر رہا تھا۔ اچانک ذہن میں آنے والے خیالات۔
بھی روزنامچے کے انداز میں روزمرہ کی کوئی ایسی روداد جو اُس کے خیال کے مطابق امکانات
سے حاملہ ہوتی تھی۔ کچھ بھی۔ کچھ بھی جو دلچسپ ہو۔ حیران کُن ہو۔ کردار۔ واقعات۔ تھیمز۔
امیجز۔ کیفیات۔ نثری مشقیں۔
کبیر ادھوری کتاب کو ردی میں پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ امداد حسین متوجہ ہوا۔
''اپنا رجسٹر ذرا لے آؤں۔ نیچے کمرے سے اور پنسل'' کبیر نے وضاحت کی۔
''رجسٹر'' امداد حسین نے قینچی ناک میں سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔
''ہاں..... وہ کچھ ساتھ ساتھ اپنا کام بھی ہوتا رہے گا''۔
''مگر کیسے کبیر صاحب.....'' ''چھانٹی کے ساتھ۔ آپ اپنا لکھنے کا کام کیسے کریں گے؟''
''وہ بھی اصل میں چھانٹی کا کام ہی ہے۔ امداد صاحب..... ان کتابوں کی طرح، دماغ میں
طرح طرح کی گند بلا کے ٹائیٹل چلتے رہتے ہیں۔ اچانک کوئی کام کا ٹائیٹل آ جاتا ہے تو اُسے محفوظ
کر لیتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے ایک رجسٹر کھول لیا ہے۔ فکر نہ کریں کوئی دو تین گھنٹے میں ایک
آدھ بار کوئی ایک دو لائنیں لکھنے کا کام ہوگا۔ وہ بڑی سست رفتار چھانٹی ہے اصل کام اسی چھانٹی کا
ہوگا۔ آپ نیچے سے روٹی منگوائیں۔ بلئے چھولے والے سے نان اور چھولوں میں چار انڈے
اُبلے ڈلوا کر میرے لیے.....''
''انڈے چار ہی کھائیں گے؟'' امداد حسین نے کراہ کر پوچھا۔
''جی چار ہی'' کبیر نے کہا اور سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے میں رجسٹر لینے چلا گیا۔
امداد حسین نے موتیے کے عطر کا پھونگا کان میں اُڑسا اور سوچنے لگا۔
''چلو چار انڈے ہی سہی۔ کام پر تو لگا ہے۔ لگ گیا تو آج ختم کر ہی لے گا۔ مگر آج کل یہ
کسی اور ہی دھن میں ضرور ہے۔ آتا ہے تو پوچھتا ہوں۔''
مگر چار انڈے کھانے کے بعد اور سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے کئی بنڈلوں کی چھانٹی کرنے کے
دوران کبیر نے اپنی کسی ''اور ہی دھن'' کے بارے میں جو کچھ بھی امداد حسین کو بتایا جو امداد حسین

نے پوچھا اور جو کبیر نے جواباً کہا۔ اس سے دھوپ میں تپتے ننگ منگے بڈھے کا ذہن اور بھی الجھ گیا۔ ذو معنی بلکہ اکثر مہمل جملے جن سے کچھ بھی مفہوم نکالنا آسان نہ تھا۔

''بس امداد صاحب بعض لوگوں کو اللہ کی مار پڑی ہوتی ہے۔''

''اللہ کی یہ مار کس کو پڑتی ہے؟ ہاں یہ ایک اچھا سوال ہے امداد صاحب دیکھیں انسان کو اچھا لذیذ کھانا کھانا چاہیے۔ آرام دہ نرم بستروں میں ایسی عورت یا عورتوں (آپ کی مثال بھی تو ہے) کے ساتھ سونا چاہیے جن کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں کہ طرفین یکساں حظ اٹھاتے ہیں۔ اچھے مشروبات پینے چاہئیں۔ دنیا میں اگر دل چاہے تو گھوم پھر کر بدل بدل کر منظر دیکھنے چاہئیں۔ کوئی آٹھ دس سو، پانچ سو لوگوں پر بالادستی حاصل کر کے انہیں گاہے بگاہے ذلیل کر کے مزہ لیتے رہنا چاہیے اور پھر کسی ایک آدھ عورت میں سے ایسے انسان۔ ترجیحاً مرد پیدا کرنے چاہئیں جو آگے چل کر یہ سب کام اپنے طور پر سرانجام دے سکیں...... ٹھیک ہو گیا جی...... اب اگر کوئی بدنصیب یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اُس کے لیے اِس کے علاوہ اور اِس سے زیادہ عظیم، اصل کام بھی کوئی ہو سکتا ہے تو اُسے اللہ کی مار پڑتی ہے۔ سمجھ گئے..................''

ہنری ملر، ٹراپک آف کینسر، پلانٹ فزیالوجی، مزید حماقتیں، سگمنڈ فرائیڈ ٹاٹم اینڈ ٹیبو۔ اچار، مربے، چٹنیاں، پٹس کا شارٹ ہینڈ کا سسٹم، انٹگرل کیلکولس، گوئٹے نوجوان ورتھر کی داستان غم، لاآف ٹارٹس، سر سید اسباب بغاوتِ ہند، سرگئی ایزنشٹین، دی فلم سینس، ابنِ صفی، لاشوں کا آبشار، کارل مارکس..................

''اللہ کی مار کی سمجھ نہیں آئی آپ کو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ سمجھانے کی کوشش ترک کر دیتے ہیں۔ اچھا پھر کوشش کرتے ہیں''۔ لنگڑا جاسوس، گرے کی اناٹومی۔ ہیر وارث شاہ۔ بیٹریوں کا کارخانہ، ہر قسم کی بیٹری خود بنایئے۔ ڈکنس اے ٹیل آف ٹو سٹیز۔ ''دیکھیں امداد صاحب جیسے آپ نے کہا تھا عورت ایک لمحہ سوچتی ہے کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ پُرکشش ہستی ہے۔ دوسرے لمحے سوچتی ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر آپ جیسے ماہرین اس کا شک دور کرنے آجاتے ہیں اور اس طرح اس پر اللہ کی مار ٹل جاتی ہے۔''

آپا ثریا کا دسترخوان، آسٹریلیا میں اُون کی صنعت ''اچھا آپ کے نزدیک یہ اللہ کی مار نہیں ہے۔ او کے...... اللہ کو بیچ میں نہ لائیں۔ تو اسی طرح کچھ بدنصیب ایسے ہوتے ہیں جو ایک لمحے یہ

Scanned by CamScanner

سوچتے ہیں پورے یقین سے کہ وہ دنیا میں کوئی عظیم کام کر سکتے ہیں اور دوسرے لمحے یہ سوچتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ مگر ایسے ماہرین کہیں بھی نہیں جو اُن بدبختوں کا شک نکال سکیں۔'' ہیگل کا فلسفہ۔ ناول گرم بارش میں قتل، ناول نیلے آسمان میں دھماکے، پکی روٹی، کچی روٹی، ایروناٹیکل انجینئرنگ، انگلش گرامر اینڈ کمپوزیشن، عزیز احمد آگ ناول۔ الیکٹریسٹی اینڈ میکنا ازم، پچاس چیزیں جو ایک لڑکا بنا سکتا ہے۔'' اب مثلاً یہ دیکھیں 'پچاس چیزیں جو ایک لڑکا بنا سکتا ہے' یہ کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب فرض کریں ایک لڑکا ہے جو ان پچاس میں سے کوئی دو چار، آٹھ دس، کہہ لیں پچاس کی پچاس چیزیں بنانے کی بجائے یہ کہتا ہے کہ وہ تو کوئی ایسی چیز بنائے گا جو ان پچاسوں میں نہیں۔ تو آپ ایسے لڑکے کو کیا کہیں گے'' ۔ کبیر نے سوالیہ نظروں سے امداد حسین کی طرف دیکھا جو اب دھوپ لگوائی کے آخری مرحلے میں اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رہا تھا۔

''مگر آپ تو لڑکے نہیں ہیں کبیر صاحب۔ دوسرا یہ کہ بات کو اس قدر پیچیدہ کر دیا ہے آپ نے کہ...... یہ نہ سمجھیں کہ مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں آپ جانتے ہی ہیں پرانے وقتوں کا میٹرک اور پھر ادیب فاضل منشی فاضل ہوں۔ میں نے آپ سے بس اتنا پوچھا تھا کہ آج کل آپ کوئی خاص کام کر رہے ہیں۔ لیکن آپ نے مجھے اُلجھا کر رکھ دیا۔ سیدھی بات نہ کرنا دراصل آپ کی عادت ہے۔ لیکن میں سمجھ گیا ہوں آپ کوئی خاص الخاص کام...... کوئی کارنامہ جیسا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔ اللہ کامیابی دے...... کوئی تحقیق کا کام ہے کیا یا کوئی ناول ہے؟ لیکن صاحب کچھ بھی ہے اس دفعہ اپنے اصل نام سے چھپوایئے گا۔'' امداد حسین نے سرمہ سلائی کو سرمہ دانی میں واپس ڈالتے ہوئے کہا اور پھر گول گول آنکھیں چمکاتے ہوئے اُس نے کبیر کی طرف دیکھا جو چھپائی کے کام کی بجائے اب پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا۔

ایک ناگوار سراسیمگی کی لہر کبیر کے جسم میں دوڑ گئی۔ ''بدبخت بڈھا اچھا خاصا مجھے جانتا ہے۔'' پھر اُس کے ذہن سے ایک خیال گزرا جسے اُس نے گزر جانے سے پہلے رجسٹر میں محفوظ کرنا ضروری سمجھا۔ ہر آمد کو درج کرنے سے پہلے وہ ایک چھوٹے سے دائرے کا نشان بناتا تھا اور اس میں اثبات کا نشان۔ نشان بنانے کے بعد اُس نے لکھنا شروع کیا۔

''یہ ایک اچھا خاصا وہم ہے کہ دنیا ہمیں نہیں جانتی ہمیں نہیں سمجھتی۔ یہ بکواس ہے۔ ہم لوگ اندر تک جان چکے ہوتے ہیں۔ مگر ہم اپنے اس بکواس وہم میں پھرتے رہتے ہیں کہ ہم

Scanned by CamScanner

کوئی 'نا قابلِ معلوم' یا شاید 'نا قابلِ علم' ہستی ہیں۔ جبکہ دنیا ہمیں مزے سے ننگا کیے بیٹھی ہوتی ہے اور مزے لوٹ رہی ہوتی ہے۔ یہ خوفناک ہے مگر اجتماعی برہنگی تک پہنچنے کی وہ اعتراف کی رات جو گزر گئی اس کو کس کھاتے میں ڈالا جائے۔ 'ایگو کی رات' میں قید ہونے کی جو بک بک کرتے ہیں لوگ۔ 'ایگو کی رات' سے بچ نکلنے کی کوشش تھی کیا وہ؟ عجیب امکان۔ جو کسی افسانے یا کسی ناول میں استعمال ہوسکتا ہے ایک خواب یا فینٹسی یا کوئی بھی حقیقت کو ڈگمگانے والی صورتِ حال۔ فرض کرو...... ایک کردار ایک ایسی دنیا میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں ہر کوئی اُسے جانتا ہے مگر وہ کسی کو نہیں جانتا۔ جہاں سب اُس کے لیے اجنبی ہیں مگر وہ کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں۔ نہ صرف یہ کہ اجنبی نہیں بلکہ وہ تو اُسے بہت دور تک اور اندر تک جانتے ہیں یہ عذاب کا ایک انوکھا منظر نامہ ہے۔ مگر ایسا انوکھا بھی نہیں آخر جب خفیہ ایجنسیوں والے کسی کو پکڑ کر اس کا سارا اعمال نامہ اُس کے سامنے کھولتے ہیں تو وہ اس سے ملتی جلتی صورتِ حال ہوگی۔ لیکن ایک بنیادی فرق ہے خفیہ ایجنسیوں والی صورتِ حال میں کردار کے لیے ایجنسیوں والے خفیہ ہونے کے باوجود اجنبی نہیں ہوتے کیونکہ بطور کلاس اور پیشہ وہ جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ مکمل طور پر متوازی صورتِ حال نہیں۔ کردار جس سریلسٹک دنیا میں پہنچا ہے۔ وہاں دوسرے کا اُس کے لیے علم کامل ہے جبکہ دوسرے کے لیے اُس کی لاعلمی کامل ہے۔ یہ مکمل علم اور مکمل لاعلمی کی صورتِ حال ہے۔"

اس فقرے تک پہنچ کر کبیر نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی ذہن میں برپا ہوا تھا اُسے وہ اُس سے برھ کر قابو میں نہیں لاسکتا تھا۔ پھر وہ کیفیت اُس پر طاری ہوئی جو کسی بھی قسم کے اخراج کے بعد انسان پر طاری ہوتی ہے جو انخلا کی آسودگی ہے اور پھر اسی کیفیت میں سے کچھ اور بھی خیالات نے جنم لیا مگر جنہیں کبیر نے رجسٹر پر چڑھانے کی بجائے ابھی اور پکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس نے رجسٹر بند کیا اور قلم ایک طرف رکھا تو اُسے امداد حسین کی آواز پھر سُنائی دی۔

"کچھ سوجھ گئی تھی ناں؟ مجھے پتہ چل گیا تھا۔"

اور کبیر کا جی چاہا کہ وہ بوڑھے گوشت کے بنے اُس پتلے کو اُسی طرح دبوچ لے جس طرح سند باد جہازی کا دیوہیکل رُخ پرندہ انسان کو دبوچ کر اوپر اٹھا لیتا تھا اور زیادہ بلندی سے نہ سہی تو کم از کم تیسری منزل سے نیچے ضرور پھینک دے مگر ایسا کچھ کرنے کی بجائے اُس نے چھانٹی پھر سے شروع کرتے ہوئے اگلی کتاب اُٹھالی۔

Scanned by CamScanner

جوزف کونرڈ، ہارٹ آف ڈارکنیس۔ طبیعی جغرافیہ، کان ناک اور گلے کی بیماریاں، ادب کی آڑ میں مذہب اور وطن کی مخالفت۔ محب الوطن کے قلم سے، کرسٹل سیٹ بنانا۔ کانن ڈائیل خونی بیل۔ کوانٹم مکینکس، بہشتی زیور، بیالوجی پارٹ ٹو ایف ایس سی، لینن سامراج اور سامراجی، ایڈگر ایلن پو، کلام سلطان باہو، سحرِ ہومیوپیتھی۔ آرکیالوجی میڈ ایزی.........."

ان چند کتابوں کی طرح جو چھانٹی کے دوران کسی نہ کسی وجہ سے کبیر کی توجہ دوبارہ مانگ لیتی تھیں، اس کتاب کے عنوان نے بھی کبیر کو دوبارہ متوجہ کیا۔ آرکیالوجی میڈ ایزی، ہاف مین کو اس کتاب کی ضرورت ہو گی۔ ایک بے ساختہ مسکراہٹ کبیر کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور پھر کبیر کی وہ دوبارہ کی توجہ غلام باغ کے لیے تھی۔ ناصر کے لیے تھی۔ زہرہ کے لیے تھی۔ زہرہ کے جاسوس کے لیے۔ عاشق علی بیرے کے لیے۔ مدد علی کے گونگے پن کے لیے۔ پیرانویا کے لیے۔ دلائی لامہ کے لیے۔ تبتی عورتوں کے لیے جو ایک سے زیادہ خاوند رکھ سکتی ہیں۔ اُس رات کی منجمد دیوانگی کے لیے۔ کہرے کے سفید غبار سے سفید شارک کی طرح نکلتی کار کے لیے۔ امبر جان کے لیے..........

"آرکیالوجی میڈ ایزی' کبیر نے کتاب کے سرورق کو پھر دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اب کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اُس نے نیلے روشن آسمان میں دیکھا۔ دن بھر کی تیز دھوپ کے بعد اب سہ پہر تھی۔ لوگوں میں یہ فیصلہ کن احساس پھر سے پختہ ہو رہا تھا کہ پالا بس اب اُڑ جانے کو ہے اور کبیر کا بھی یہی خیال تھا۔ امداد حسین طبِ شمسی کے کامیاب کورس کے بعد نیچے جا چکا تھا۔ چھت پر بے اینٹوں کے فرش پر ایک طرف رکابیوں اور پلیٹوں میں چنوں کے سالن کے باقیات بھورے خشک کیچڑ جیسے ہو چکے تھے جن کے گرد نان کے ٹکڑوں کے آثار بکھرے تھے۔ علوم کے کئی معزز شعبے جماعت بندی کے مراحل سے گزر کر خوش شکل بنڈلوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ علوم کے کچرے کا شعبہ بھی نمایاں طور پر ایک طرف ڈھیر ہو چکا تھا اس کے بنڈل بننا ابھی باقی تھے..........

"سوال یہ ہے کہ کیا وہ ساری رات اُدھر منڈلاتا رہا اس گاڑی میں جو آخر میں، جیسا تم کہتے ہو، سفید شارک کی طرح تمہاری طرف بڑھی۔" ہاف مین کبیر سے پوچھتا ہے۔

"یقیناً ایسا ہی رہا ہو گا اور ہم کس طرح اس واقعہ کی وضاحت کر سکتے ہیں۔" کبیر کہتا ہے وہ

دونوں جنم کھنڈر میں ہیں اور ابھی کہرے کے دنوں میں ہیں۔
''میں تو اُس پھولے ہوئے منہ والے بندر کا رقیب بننا کسی صورت پسند نہیں کروں گا'' ہاف مین ہنس کر کہتا ہے۔
''میرے جذبات بھی تم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ یہ اعزاز صرف ناصر کو ملنا چاہیے تھا''
''مگر ناصر 'شانت' ہو چکا ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں۔ اُس رات کی کیا یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات نہیں؟''
''شاید..... زہرہ کے لیے ناصر کی محبت میرے لیے اُس کی نفرت کا اظہار تھی۔'' کبیر بے چینی سے اور کسی یقین کے بغیر کہتا ہے ''میں کچھ نہیں جانتا مگر وہ پٹی ہوئی دانش مندی جو ہے ہماری مدد کے لیے۔ انسان بہت پیچیدہ چیز ہے۔ مخلوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ''
''ہاں، ہاں میں اقرار کرتا ہوں اب اس مسخرے کو دیکھو۔ امبر جان۔ کیا وہ زہرہ کے لیے کسی خوفناک جنون میں مبتلا ہے؟''
''میرا ایسی خیال ہے۔ ظاہر ہے اُس کا جنون اپنے پیارے جونیئر سائیکیا ٹرسٹ ڈاکٹر ناصر سے بہت مختلف ہوگا۔ میں تمہیں بتاؤں اُس کے چہرے پر ویسی ہی وحشت منجمد تھی جیسی اُس رات، جب ہم چوتھے کونے میں پہنچے تھے۔ جس رات یاور عطائی مر گیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے چہرے کی وحشت جو ریپ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔'' کبیر اُسے بتاتا ہے۔
''میرا خیال ہے ہمیں اُسے بتا دینا چاہیے کہ شہزادی کو حاصل کرنے کے لیے اُسے تین طاقتور رقیبوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔'' ہاف مین مسکراتا ہے۔
''جو اصل میں ایک ہی رقیب ہے!'' کبیر بھی مسکراتا ہے۔
''چلو نیچے چلیں'' ہاف مین کہتا ہے۔
''چلو۔ کس کونے کے زینوں سے نیچے جائیں۔''
''چوتھے کونے کے'' ہاف مین ایک کونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
وہ جنم کھنڈر کی بھول بھلیوں میں اُترتے ہیں۔ نچلے کمرے میں جانے کے لیے چوتھے کونے میں اُتر کر تیسرے میں سے باہر نکل آتے ہیں۔ خوب ہنستے ہیں۔ ''ایسا مغالطہ اب کم ہی ہوتا ہے۔ آج کیا ہو گیا'' ہاف مین کہتا ہے۔

Scanned by CamScanner

"مگر آج ہو گیا مغالطہ" کبیر کہتا ہے۔

"نچلے خوفناک کمرے میں ہیں۔ کہرہ یہاں بھی پہنچ چکا ہے۔ روشنی اتنی کم ہے کہ رات جیسی ہے۔ ہاف مین ٹارچ جلاتا ہے۔

"میرا ایک ارادہ ہے اور ایک مفروضہ ہے" وہ کہتا ہے۔

"پہلے ارادہ بتاؤ۔"

"میں اس انسانی قربانی والے چبوترے پر گرٹرویڈ کے ساتھ محبت کرنا چاہتا ہوں۔ یادر عطائی کی Aphrodisiacs استعمال کر کے۔"

"اچھا۔ مبارک ارادہ ہے۔ مگر کیا تمہیں Aphrodisiacs کی ضرورت ہے۔" کبیر پوچھتا ہے۔

"نہیں۔ میرا نہیں خیال۔ مگر مجھے لگتا ہے۔ اس طرح کچھ...... کچھ بہت کچھ جو اہم ہے مگر جو جدا جدا ہے...... مربوط ہو جائے گا......"

"اگر زہرہ...... ہو تمہارے ساتھ...... تو شاید...... میں سمجھ رہا ہوں...... کیا خیال ہے تمہارا" کبیر نے اکھڑے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

"تعجب ہے۔ اگر ایسا ہو...... تو میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہونگا۔ مگر نہیں تعجب ہے یہ خیال کسی تقدس کو پامال کرنے کا خوفناک احساس پیدا کرتا ہے جیسے incest.................."

"جیسے incest" کبیر کے ذہن میں یہ ایک گرجتا ہوا احساس تھا۔ ہاں نہ وہ ہماری ماں ہے نہ بہن ہے۔ مگر پھر بھی...... میرے خدا...... کس قدر حیرت انگیز ہے۔ کیا نہیں؟ کیا یہ محض وقتی احساس ہے؟ کیا یہ محض اس جگہ کا جادو ہے۔"

"قدیم جگہیں قدیم ترین احساسات ذہنوں میں جگا سکتی ہیں۔ میں اس بات کا ماننے والا ہوں" ہاف مین کہتا ہے۔

"کیا یہ انکشاف کا جادو ہے......" کبیر پوچھتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس نے کیا پوچھا ہے

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تاریکی چھٹ گئی ہے اور روشنی پھیل گئی ہے.............."

دونوں گہری خاموشی میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہاف مین ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھماتا ہے۔

Scanned by CamScanner

''میں نے ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔'' وہ کہتا ہے۔

''بولو۔''

''جب مدد علی یہاں آیا تھا اُس رات۔''

''ہاں، اس رات۔ تعجب ہے۔ کتنی ہی دہشت ناک راتیں ہمارے تعاقب میں لگی ہیں۔ ہاں وہ آیا تھا تو پھر'' کبیر پوچھتا ہے۔

''وہ گرم موسم تھا اور گرمی میں میرا مفروضہ یہ ہے کہ......'' ہاف مین کبیر کو ایک قدیم دیوار کے قریب لے جاتا ہے...... ان دیواروں میں کم از کم ڈیڑھ ہزار سال پرانی دیوار کے یہ سب مصالحے، کائی، فنجائی اور دوسرے مائیکرو آرگنزم کے ساتھ مل کر کوئی زہریلی گیس پیدا کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے...... لوگ بند تہہ خانوں میں بے ہوش ہو جاتے ہیں...... یہاں کچھ ایسا پیدا ہوتا ہے جو حواس کو مختل کر کے۔ التباس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تمہیں یاد ہے سانپ ہم نے بھی دیکھا تھا۔''

''سانپ دنیا کا۔ انسان کا۔ ازلی و ابدی التباس (Hallucination) ہے۔'' کبیر ہنس کر کہتا ہے۔

''تو اُس ہولناک التباس نے مدد علی پر دہشت کی انتہا پیدا کی اور وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گیا۔

کبیر ہنس پڑتا ہے ''تمہارا مفروضہ ہاف مین تمہارے ارادے کا Anti-climax ہے۔ بہت ہی غیر دلچسپ اور بور۔''

''میں کیا کروں۔ ڈاکٹر کو کوئی ورکنگ ہائی پوتھیسز چاہیے۔ تمہیں پتہ ہے نہ...... وہ اب جنونیوں کی طرح...... مدد علی کے عارضے کو سمجھنے اور اس کا علاج کرنے میں لگا ہے۔''

''ہاں۔ اس لیے کہ وہ شانت ہو گیا ہے۔ ہاف مین...... کیا اب جونیئر سائیکیاٹرسٹ ڈاکٹر ناصر پیارے کی شانتی بھی تمہارے لیے ناقابلِ فہم نہیں ہوگئی۔

''میں نہیں جانتا...... شاید...... آؤ...... چلیں......''

''چلو...... اوپر کی دنیا میں......''

تھیوری بک برائے ہاسپٹل ٹیکنیشنز۔ ماں از میکسم گورکی...... خلافت اور ملوکیت مودودی...... مین آف فزکس۔ ٹی وی اور عذابِ قبر مفتی عبدالرحمان۔ پھولوں کی آرائش اور

Scanned by CamScanner

باغبان۔ ویژن اینڈ ڈیزائن روجر فرائی۔ درد آشوب احمد فراز، گوئٹے ڈیوائن کامیڈی، حکیم داتھیلا

عرف غریب ہمدرد..........................

''ہاں...... وہ...... بہت بُری طرح میری ماں اور بھائیوں کے پیچھے لگا ہے کہ وہ میری شادی اُس سے کر دیں تا کہ وہ پھر ساری عمر مجھے ریپ کر سکے۔ میرے باپ کی بنائی ہوئی مردانہ معجزوں والی دوائیاں۔'' زہرہ ہنستی ہے۔ مگر ناصر سنجیدہ رہتا ہے۔ وہ تینوں سائیکیاٹری وارڈ میں اس کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور ہاف مین کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج انہیں مدد علی سے مکالمہ کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ کہرا ابھی ویسے کا ویسا ہے۔

''میرے خدا۔'' اچانک زہرہ کو کچھ یاد آتا ہے۔ ''میں نے ابھی تک پاپا کا کمرہ کھول کر نہیں دیکھا۔ اس کے باہر ویسے کا ویسا تالا پڑا ہے۔''

ہاف مین آجاتا ہے اور بتاتا ہے کہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ اُس کمرے میں بے پناہ دلچسپی لے رہا ہے۔ کبیر بتاتا ہے کہ خصی کلب کے کچھ ارکان بھی انہیں بنیادوں پر سوچ رہے ہیں اور اُن میں اس کا عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ نجم الثاقب بھی شامل ہے۔

''مجھے یقین ہے، بہت سی معزز مرد ہستیاں خواب گاہوں میں عورت کے سامنے ذلیل ہو رہی ہیں۔'' کبیر کہتا ہے۔

زہرہ خوب ہنستی ہے۔ ''او...... پاپا......'' وہ کہتی ہے ''مگر کیا واقعی؟''

ہاف مین بولتا ہے۔ ''میری تجویز ہے۔ اگر مادام،'' اب ہاف مین زہرہ کو مادام کہنے لگا ہے، ''اجازت دیں تو ہم خود اس کمرے کو کھولیں۔ میں اور ڈاکٹر Aphrodisiacs کا کیمیائی تجزیہ کریں گے۔ میرے خدا میڈیسن کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا'' کبیر کہتا ہے، ''ہاں ہو سکتا ہے سائیکیاٹرک میڈیسن میں کچھ اضافہ ہو۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے'' ناصر اتفاق کرتا ہے ''ابھی عاشق علی لایا نہیں مدد علی کو۔'' وہ گھڑی دیکھتا ہے۔

''بہر حال...... مجھے یقین ہے کہ اس کمرے میں نقب لگانے کی کوشش کی جائے گی'' کبیر کہتا ہے۔

Scanned by CamScanner

زہرہ کبیر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتی ہے جیسے اندازہ لگا رہی ہو اُس کی بات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے یا مذاق میں اُڑانا چاہیے مگر وہ ایسا کچھ بھی کہنے کی بجائے اس سے پوچھتی ہے۔

''ہم انعام گڑھ کب جا رہے ہیں، کبیر؟''

''جب بھی تم چاہو۔''

''میں کم از کم ایک بار مانگر جاتی کا تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''تجربہ کرنا تو شاید مشکل ہے...... دیکھ سکتی ہو...... وہ تمہارا حق ہے'' کبیر کہتا ہے۔

''ہم ایسا کریں گے کہ'' اچانک ناصر کہتا ہے۔ ''بلکہ اِس طرح ہے کہ میں مدد علی کو ایک گہرے ٹرانکوالائزر کی ڈوز دوں گا۔ پھر ہم اس کے پاس بیٹھے باتیں کریں گے۔ غلام باغ کے بارے میں۔ جنم کھنڈر کے بارے میں اور دیگر متعلقہ امور کے بارے میں...... مگر اُسے بولنے پر بالکل مجبور نہیں کریں گے۔ امکان یہ ہے کہ اُس فضا میں یک دم اُس کا بند ٹوٹ جائے گا وہ بولنے لگ پڑے گا'' ڈاکٹر پورے جوش و خروش سے مدد علی کو بلوانے کا اپنا منصوبہ بتاتا ہے اور اسی وقت پیرانائیڈ عورت ہلکی سی دستک کے بعد اندر آتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر کے علاوہ باقی تین افراد گویا اس کے لیے کوئی وجود ہی نہیں رکھتے۔ وہ سیدھی ناصر سے مخاطب ہوتی ہے۔

''ڈاکٹر تم دیکھ رہے ہو دنیا میں سرد برفانی ذرے تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔''

چاروں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

''جی...... کہرا کئی دنوں سے چھایا ہے'' ناصر سپاٹ لہجے میں کہتا ہے۔

''اس کی وجہ بھی جانتے ہو گے؟''

''سردیاں اس دفعہ غیر معمولی ہیں۔ دھند پہلے بھی ہوتی تھی اس سال بہت زیادہ ہے۔''

''غلط۔'' پیرانائیڈ حقارت سے ناصر کی وضاحت کو رد کرتی ہے۔ ''اصل وجہ کچھ اور ہے۔ منجمد ہوا کے جاسوس بنانے والی ایک مشین میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں کہتی ہے اور پہلی دفعہ وہ ناصر کے علاوہ وہاں موجود لوگوں کو گہری شک بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔ ''زبردست خرابی'' اب وہ ڈرامائی انداز میں کہتی ہے ''جاسوس بنانے کے مرحلے سے پہلے ہی منجمد ہوا خارج ہو رہی ہے اور فضا برفانی ذروں سے بھر رہی ہے۔ پینٹاگون میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔''

Scanned by CamScanner

''جی......جی...... میں سمجھ گیا'' ناصر کہتا ہے اور پیرانائیڈ عورت لاتعلقی سے سب کی طرف دیکھتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ''یہی تھی؟'' زہرہ جوش سے پوچھتی ہے۔ ''ہاں یہی تھی'' ناصر کہتا ہے۔ ابھی اور کوئی بھی کچھ بھی نہیں کہہ پاتا کہ نرس مختار آتی ہے اس کے چہرے پر وہی...... 'میں سب...... جانتی ہوں' مسکراہٹ ہے۔ وہ کہتی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب۔ وہ زبان بندی والا کیس آ گیا۔''

''مدعلی آ گیا۔ اُسے لے آؤ'' ناصر کہتا ہے۔

''زبان بندی والا کیس'' کبیر ہنستا ہے اور پھر دہراتا ہے 'زبان بندی والا کیس' واہ کیا بلیغ اصطلاح ہے۔ ''یہ تمہاری ایجاد ہے ڈاکٹر؟'' کبیر ناصر سے پوچھتا ہے۔

''نہیں۔ یہ ہماری اس قابل نرس کا کارنامہ ہے۔ میں تو اسے Dysphasia ہی کہوں گا۔ مدعلی کے دماغ کا بایاں حصہ متاثر ہوا ہے۔ خاص طور پر Broca's اور ...... Wernicke's area......'' ڈاکٹر ناصر کسی ماہر کے تفاخر سے کہتا ہے۔

کبیر کے ہونٹ سکڑ جاتے ہیں۔ ''اگر تمہیں مدعلی کے دماغ کے بارے میں اتنا یقین ہے، یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''سائیکوڈرامہ'' ناصر کہتا ہے۔ اب وہ کبیر کی باتوں سے زیادہ اثر نہیں لیتا ''سائیکوڈرامہ ہمارے ہاں جائز ہے۔'' ناصر مسکراتا ہے اور کبیر کو غور سے دیکھتا ہے۔ ''ایک مفروضہ ہے آزمانے میں کیا حرج ہے۔''

مدعلی آتا ہے اس کا بھائی عاشق علی بیرہ اُسے سہارا دیے ہوئے ہے۔ لیکن بظاہر اُسے چلنے میں کوئی دقت نہیں......................

پورس کے ہاتھی نسیم حجازی............ مین آن ٹاپ نینسی فرائیڈے۔ اصولِ فلسفۂ ہنود۔ لہائی سری تو اسا ترجمہ احسان بی اے۔ خود آموز فارسی پروفیسر رازی۔ اردو برائے لیکچرار ٹیسٹ۔ اسلامک سائنس Vol-I سید حسین نصر۔ دردِ آشوب احمد فراز...........................

کبیر نے کتاب کو اُردو شاعری کے کھاتے میں ڈالنے کے بعد تیزی سے نیلا رجسٹر اُٹھایا۔ نٹ بے چینی کے عالم میں قلم تلاش کیا جو ہر طرف بکھرے ہوئے کاغذوں کے نیچے کہیں چھپ گیا تھا اور لکھنے لگا۔

Scanned by CamScanner

زبان بندی کے کیس (مدد علی) کے بارے میں ناصر کا نظریہ کہ اُس کے دماغ کے بائیں حصے میں خاص طور پر اُن حصوں میں جن کا تعلق گفتگو (زبان) سے ہے کوئی مہین نس پھٹ گئی ہے یا ہاف مین کا یہ مفروضہ کہ وہ کوئی ''التباسی'' زہریلی گیس سونگھ لینے پر اس حال کو پہنچا ہے دونوں بکواس ہیں......ایک افسانوی صورتِ حال (ناول......ناولٹ) دنیا کے کسی خطے میں...... کوئی دور دراز کا شہر مناسب رہے گا۔ اس شہر میں بولی جانے والی زبان مٹ رہی ہے۔ اُس کے مٹ جانے کی نشانیاں اکثر گنوائی جاتی رہتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس زبان میں تحریری اظہار تقریباً موقوف ومفقود ہو چکا ہے۔ شرفاء اور معززین باہمی گفت وشنید میں اس زبان کو استعمال نہیں کرتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک عجیب واقعہ بلکہ واقعات شروع ہوتے ہیں جیسے ایک عجیب وغریب وبا پھیلتی ہے اور لوگ قوتِ گویائی سے محروم ہونے لگتے ہیں۔ وہ رات چنگے بھلے (بولتے چالتے) سوتے ہیں اور صبح اُٹھنے پر نہ کسی کی بات سمجھنے کے قابل رہتے ہیں نہ خود بولنے کے (کسی بھی زبان میں) ماہرین لسانیات، عصبیات، طب، امراضِ دماغی میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے۔ کیونکہ تمام ٹیسٹ بتاتے ہیں کہ ان کے جسمانی واعصابی نظام میں کوئی خرابی نہیں۔ کسی نامعلوم وائرس کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ بلکہ اسے Broca's Virus کا نام بھی دے دیا جاتا ہے......

نیلے رجسٹر میں اندراج کے اس مقام پر پہنچ کر کبیر یک دم گہرے عدم اطمینان کا شکار ہو گیا۔ پھر اپنے ذہن کو یکسر خالی پا کر اُس نے نیلا رجسٹر اور قلم ایک طرف رکھا اور پھر چھانٹی کے کام میں مصروف ہو گیا جواب آخری مراحل میں تھا۔

پھولوں کی آرائش اور باغبانی۔ اسلامی ناموں کا انسائیکلوپیڈیا ڈجیٹل لاجک اور کمپیوٹر ڈیزائن...... ٹیپو سلطان مرتبہ عبداللہ بٹ بی اے آنرز......اور کبیر کے ہاتھ پھر نیلے رجسٹر کی طرف بڑھے۔

مذکور بالا افسانوی امکان کے بارے میں خطرہ ہے کہ یہ صرف کسی سنسنی خیز تصور یا سائنس فکشن کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اعلیٰ ادبی تحریر کے لیے یہ ایک غیر موزوں نقطۂ آغاز ہے۔

''آخر یہ اعلیٰ ادبی تحریر کیا بکواس ہے؟''

یوگا کے اسرار پنڈت شامبُو ناتھ۔ الفاروق شبلی نعمانی۔ سینس اینڈ نان سینس ان سائیکالوجی ایچ جی آئسنک۔ خلافت اور ملوکیت ابوالاعلیٰ مودودی۔ ''ارذل نسلوں کی

Scanned by CamScanner

اساطیر" گلبرٹ والٹن...... مکالماتِ افلاطون..........................

"واہ کبیر صاحب واہ......... آج آپ نے دل خوش کر دیا" امداد حسین پھر چھت پر چڑھ آیا تھا۔ "مگر جناب اب بس کریں شام ہو گئی ہے۔ ارے واہ کام تو واقعی بالکل ختم ہو گیا اور جناب لگتا ہے آج آپ کو چھانٹی کے ساتھ ساتھ آمد بھی خوب ہوتی رہی ہے۔" امداد حسین نے دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھے کبیر کے پاس پڑے نیلے رجسٹر کو دیکھ کر کہا۔

"آمد کہ جامد...... کچھ پتہ نہیں" کبیر نے آخری کتاب فلسفے کے ڈھیر میں پھینکتے ہوئے کہا اور پھر دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آمد کہ جامد...... میں سمجھا نہیں۔" امداد حسین بڑبڑایا۔

"دیکھیں امداد صاحب...... میری اکثر باتیں بکواس ہوتی ہیں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش نہ کیا کریں" کبیر نے کہا اور پھر بازوؤں اور کندھوں کو پیچھے کی سمت جھکائے گیا پھر اُس نے کمر کو دو تین دفعہ گھما کر دن بھر کی بیٹھک کے اکڑاؤ نکالنے کی کوشش کی۔

"میں یہ بنڈل اب اٹھواتا ہوں لڑکے سے کہہ کر۔" امداد حسین اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔ پھر جب وہ کبیر سے مخاطب ہوا تو اُس نے کہا۔

"گرم دودھ کا پیالہ بھجوادوں۔ کمر کی تھکن دور کرنے کے لیے۔"

"گرم دودھ کا پیالہ تو لوگ کمر کی کچھ اور طرح کی تھکن دور کرنے کے لیے پیتے ہیں امداد صاحب...... حکماء کہتے ہیں بعد از مباشرت استعمال مستحسن ہے۔"

امداد حسین نے خوش ہو کر قہقہہ لگایا۔

"بے شک...... بے شک...... مگر عام حالات میں بھی کوئی ہرج نہیں۔"

کبیر نے مغربی اُفق کی طرف دیکھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

"آپ کی طب شمسی غروب ہو رہی ہے۔" اُس نے کہا۔

ڈوبتے سورج کے گرد سنہرے بھورے رنگ آتشی گلابی اور پیلے نارنجی سے مل کر سُرمئی شام میں بدل رہے تھے۔

"ویسے کبیر صاحب...... میرا اب مشورہ ہے آپ کو ایک۔"

"جی فرمائیں۔"

Scanned by CamScanner

''یہ جو کوئی آپ کام کر رہے ہیں آج کل، اسے کر کے پھر کوئی ڈھنگ کا کام کریں۔''

کبیر نے بھرپور قہقہہ لگایا اور دل میں کہا ''میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے'' اور باآواز بلند بولا۔ ''تو آپ کے خیال میں جو کوئی بھی کام میں کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں وہ ڈھنگ کا کام نہیں ہے۔''

''نہیں...... نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں صاحب......'' امداد حسین نے پُر زور معذرت سے کہا ''میرا مطلب ہے کہ آپ جیسے لائق فائق عالم فاضل نوجوان کو اب کسی بلند مقام پر پہنچنا چاہیے۔''

''بے شک...... بے شک......'' کبیر نے خلوص سے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ مجھے گرم دودھ کا پیالہ میرے گھونسلے میں ہی بھجوا دیں اور اوپر وہ موٹی بھوری ملائی ضرور ڈلوائیں جس کا مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ دودھ کی ہی بنی ہوتی ہے یا کسی اور چیز کی۔''

کبیر نیلے رجسٹر کو ہاتھ میں تھامے سیڑھیاں اُتر کر گھونسلے کی طرف جانے لگا۔ تو پھر رُک گیا۔ اُس نے منڈیر کے اوپر ہی رکھ کر رجسٹر کھول لیا۔

یہ ادیب نہیں جو ادب تخلیق کرتا ہے بلکہ ادب زبان میں کہیں چُھپا ہوتا ہے اور ادیب کو آلۂ کار کے طور پر تخلیق کرتا ہے۔ خالق ایک سوراخ ہے جس کی راہ سے زبان میں زور مارتی حرکتیں باہر کی سمت راہ پاتی ہیں۔

یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ کہیں پڑھی ہوئی ہے (ملتی جلتی۔ چیک کیا جائے) کیا زہرہ سے اس ادبی، غیر ادبی مسئلے پر بات کی جاسکتی ہے۔ کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اعترافات کی اور جی کی رات اُس نے کیسا عجیب دعویٰ کیا تھا کہ وہ مجھے میرے کام میں من مانی نہیں کرنے دے گی۔ مگر اب لگتا ہے اُس کا وہ دعویٰ میرے اُس کہیں زیادہ عجیب بلکہ واہیات دعویٰ کا اچھا جواب تھا کہ ''میں 'دنیا گر رہی ہے' اور 'ایک بنا تین مرد' کے درمیانی لمحوں میں بچی دنیا سے اپنے کام کا خمیر اُٹھاؤں گا۔''

نیند کی غیر معمولی کمی نشے سے ملتی جلتی ایک کیفیت پیدا کرتی ہے جس میں Megalomanic دعوے کیے جاسکتے ہیں بلکہ سرزد ہوسکتے ہیں۔

ادیب پیرانویا اور Megalomania کے درمیان کہیں بستا ہے۔

یاور عطائی۔ زہرہ، ہاف مین۔ امبر جان۔
(سیٹ نمبر1)

مدعلی۔ عاشق علی۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ۔
(سیٹ نمبر2)

ضی کلب کے ارکان۔ نجم الثاقب۔
(سیٹ نمبر3)

زہرہ کی ماں۔ بھائی۔ بھائی۔
(سیٹ نمبر4)

کبیر بقلم خود۔
(سیٹ نمبر5)

کبیر مہدی
(سیٹ نمبر6)(خالی سیٹ)

کبیر نے رجسٹر بند کیا۔ اور اُس کا دل شدت سے چاہا کہ وہ اُسی وقت کہیں بھی اپنے علاوہ باقی تینوں میں سے کسی سے بھی کہیں بھی ملے۔ مگر دن بھر کی چھانٹی کے بعد اُس کے جسم کا رُواں رُواں دُکھ رہا تھا۔ وہ گرم دودھ کے تصور کے ساتھ نیلے رجسٹر کو تھامتا سیڑھیاں اُتر گیا۔

امداد حسین دنیا جہان کے علوم کے بنڈلوں کو رسیوں سے باندھ رہا تھا اور بڑے شہر میں شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔

OOO

Scanned by CamScanner

نیلے رجسٹر کے مندرجات / نثری مشقیں

فکشن کے خالق کو خدا بننے کا اختیار کس نے دیا ہے۔اُس کی ہر افسانوی حرکت مں خدا بننے کا دعویٰ چُھپا ہوا ہے اُسے ایسا عالمِ کُل اور قادرِ مطلق بننے کا حق کس نے دیا ہے؟ وہ کسی بھی متنفس کے شعور حتیٰ کہ لاشعور کی گہرائیوں میں اُتر کر اُس کے بطونِ ذات کے جملہ اسرار کی خبر لا ہے اور پھر زمان ومکان کی قید سے بھی ماورا ہو کر کائنات کے کسی بھی گوشے کسی بھی واقعے کی جزئیات بیان کرتا ہے اگر وہ کسی واحد متکلم کی ذات کو اختیار کرتا ہے تو پھر 'میں' کی اُس کھڑکی کی راہ سے، سب کچھ دیکھ لینے کا دعویٰ کرتا ہے۔

میری تخلیق کی ہوئی دنیا میں آؤ۔ یہاں تمہیں تین کردار...... نمبر1۔نمبر2۔نمبر3۔بننے کا اختیار ہے مگر یہاں کردار نمبر4۔نمبر5۔نمبر6 تمہیں مٹانے پر تُلے ہیں۔ اگر تم مٹنا نہیں چاہتے تو میں اس کا اہتمام کرنے کی کوشش کروں گا کہ تم مٹنے سے بچ جاؤ۔ پھر بھی اگر تم مٹ جاتے ہو تو تمہیں اتنا ضرور کرنا ہوگا۔ضرور محسوس کرنا ہوگا کہ تم کیسے مٹ گئے وہ کیسی دنیا ہے جو تمہیں نیست ونابود کرنا چاہتی ہے۔

فکشن نمبر1۔ دنیا کیسی ہے؟

فکشن نمبر2۔ دنیا ایسی ہونی چاہیے؟

فکشن نمبر3۔ دنیا بکواس ہے

فکشن نمبر4۔ دنیا بکواس نہیں ہے بلکہ الف...... بے...... جیم ہے۔ اگر الف...... بے...... جیم...... کو تسلیم کر لوگے تو مزے میں رہو گے جیسے کہ کردار نمبر1۔نمبر2۔نمبر3 ہیں ورنہ تمہارا حشر وہی ہوگا جو کردار نمبر4۔نمبر5۔نمبر6۔کا ہوا۔

Scanned by CamScanner

فکشن نمبر 5۔ مجھے کچھ پتہ نہیں دنیا کیسی ہے اور نہ ہی تمہیں کبھی پتہ چل سکتا ہے کہ دنیا کیسی ہے مگر اس بات کو ضرور تسلیم کرنا ہوگا ورنہ تمہارا حشر وہی ہوگا جو کردار نمبر 1۔ نمبر 2۔ نمبر 3۔ کا ہوا۔

فکشن نمبر 6۔ 'لکھنے والے' کی ساری 'خدائی' پڑھنے والے کی 'خدائی' کے سامنے ہیچ ہے۔

لکھنے والے کی 'خدائی' اُسی وقت تک ہے جب تک وہ آخری حرف لکھ نہیں لیتا۔

اگر لکھنے والا ایک ہے تو پڑھنے والا بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ یہ کیسا انصاف ہے کہ لکھنے والا ایک ہے مگر پڑھنے والے لاتعداد ہیں یہ ایک لامتناہی گینگ ریپ ہے۔

لکھنے میں کس حد تک پڑھنا شامل ہے؟ اور پڑھنے میں کس حد تک لکھنا شامل ہے کیا لکھنے والا اصل میں کسی غیر مرئی کتاب سے پڑھ رہا ہوتا ہے اور پھر پڑھنے والا اسی غیر مرئی کتاب میں لکھ رہا ہوتا ہے؟

'غیر مرئی' ایک عظیم الشان بک بک ہے۔

لکھی ہوئی 'بک بک' زیادہ معتبر لگتی ہے۔ حالانکہ ہوتی نہیں۔

میری یہ اُلٹی سیدھی مگر تحریری 'بک بک' زہرہ کے ہاتھ لگ گئی وہ کافی مجتسس ہے میرے اصل کام (کیا بکواس ہے۔ یہ بات بھی اب اچھا خاصا مذاق بن گئی ہے) کے بارے میں جب سے میں نے یہ لغو دعویٰ کیا تھا کہ میں ماضی قریب میں رونما ہونے والے واقعات کی بنیاد پر کچھ سامنے لاؤں گا اُس نے میرے وضع کردہ نشان کو دیکھ کر کہا یہ زمین کا نشان ہے۔ میں نے کہا میں نے تو اسے محض اپنی نثری مشقوں کو الگ الگ رکھنے کے لیے استعمال کیا ہے اس کے پیچھے کوئی بھی وجہ نہیں تھی۔ اُس نے کہا پھر بھی یہ زمین کا نشان ہے۔ میں نے کہا سب سے زیادہ زمینی تو ہم میں سے تم ہو۔ مگر تم زمین کی زہرہ ہو اور تمہارا نشان یہ ہے +۔ جواباً وہ ہنسی اور اُس نے زہرہ کے نشان میں زمین کا اضافہ کیا اور نشان اب اس طرح کا بن گیا پھر اُس نے انعام گڑھ جانے پر اصرار کیا شاید وہ اپنی نسل کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہے مگر میں دھواں دھار بارش کا انتظار کر رہا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ ہمیں تیز برستی بارش میں وہاں جانا چاہیے جو پانی اور مٹی کو ملا دیتی ہے۔

دنیا کی وہ غالب اکثریت، خوش قسمت اکثریت جسے عام انسان کہتے ہیں زبان کے

Scanned by CamScanner

ساتھ ایک انتہائی مستحکم رشتے کے مزے لوٹتی ہے۔ بہت کم بدنصیب ایسے ہوتے ہیں، جن کا زبان کے ساتھ توازن کا رشتہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اپنا توازن پھر سے بحال کرنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو کچھ نئے سہارے کچھ نئے کھونٹے۔ پاؤں جمانے کو کچھ نئی جگہیں اُن کے ہاتھ لگتی ہیں۔ ادب، سائنس، فلسفے، فن اور پتہ نہیں کیا کیا کے شاہکار جنم لیتے ہیں۔ تخلیق کی حقیقت کیا اتنی ہی ہے؟؟

ڈاکٹر ناصر نے بالآخر زہرہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور میرا خط اُسے دکھایا جو میں نے ناصر کو پوٹھوہار سے لکھا تھا۔ اُس خط میں عشق پر میری فقرے بازی اب بجز اُس کے مزاحیہ امکانات کے Out Dated ہو چکی ہے عشق پر دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے مگر چٹا سائیں کے حال احوال پر ننگے افلاطون کے عنوان سے میری نثری مشق نے سب کو کافی متاثر کیا۔ ہاف مین اردو سے محرومی کی بنا پر دو دن پھڑکتا رہا کہ اُسے بتایا جائے کہ یہ کیا لعنتی قصہ ہے۔ ایک بار اُس نے میری زبانی یہ اصطلاح پہلے بھی کہیں غلام باغ میں سُنی تھی۔ زہرہ اور میں (ناصر کو تو لگتا ہے اب سب سے زیادہ دلچسپی مدد علی کی گویائی بحال کرنے میں ہے) ہاف مین کی بے قراری کے مزے لیتے رہے۔ پھر اُس نے دھمکی دی کہ وہ خط کی فوٹو کاپی اپنے کسی مقامی مترجم کے حوالے کر دے گا۔ فوٹو کاپی بھلا تمہیں کون دیتا ہے۔ زہرہ نے کہا پھر اُسے رحم آ گیا اور پھر ہم نے اُس ہونق تحریر کا ایک ایک فقرہ انگریزی میں ترجمہ کر کے اُسے سنایا جو غالباً اپنے اثر میں اصل سے بڑھ گیا۔ اب اُس کا یہ حال ہے کہ وہ کہتا ہے کہ ننگا افلاطون غلام باغ سے بھی بڑا معمہ ہے۔ اُسے فوراً اُس زندہ پیر کی زیارت کے لیے لے جایا جائے جس کی رگوں میں گورا خون بہتا ہے۔ جو الف ننگا اس عمر میں بھی...... وغیرہ...... وغیرہ...... مگر میں اُس موسم کے انتظار میں ہوں جب بہار موسم گرما کو جگہ دے رہی ہوتی ہے اور جنگلی پھولوں کی خوشبوئیں مٹ جانے سے پہلے پوری شدت سے بھڑک اُٹھتی ہیں۔ آج کل ویسا ہی موسم ہے۔ مگر ابھی میں گھر نہیں جانا چاہتا۔ میں گھر واپس اس وقت جاؤں گا جب مجھے یقین آ جائے گا کہ زبان کے ساتھ میرا تباہ و برباد رشتہ کچھ بہتر ہو سکتا ہے۔ توازن بحال کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے سے کوئی نیا سہارا کوئی نیا کھونٹا۔ پاؤں جمانے کے لیے کوئی نئی جگہ مل سکتی ہے۔ پھر میں ایک لمبے عرصے کے لیے سنمیال منتقل ہو جاؤں گا۔ ننگے افلاطون کی زیارت کرنے کے لیے ان لوگوں کو ایسے ہی کسی اگلے موسم کا انتظار کرنا پڑے گا۔

Scanned by CamScanner

روداد بطور ایک افسانوی صنف۔ /تشکیل؟

ایک نسخہ خلیل جبران کا بھی ہے۔ (!؟)

صدیوں کی شدید جنسی محرومی نے یہاں ہر مرد و زن کی روح کو مسخ کر دیا ہے۔ عشقیہ افسانہ نگاری سے زیادہ بیہودہ بکواس یہاں اور کوئی نہیں ہو سکتی...... (عشق...... بہر حال نامحرم عورت سے ناجائز جنسی تعلق کی حسرت ہے۔ جس کی تکمیل سنگساری کی متقاضی ہے) یہاں کے ہر عشقیہ (جنسی) افسانے (اگر اس کا پلاٹ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد کے واقعات پر مبنی نہیں) اور فلم۔ ٹی وی ڈرامے کے پیچھے سنگساری کے پتھر ضرور اُڑتے ہیں۔ اُڑنے بھی چاہئیں! یہ ایک نفرت انگیز قابلِ رحم صورت حال ہے۔ عورت مرد کا تعلق دکھانا بھی ہے۔ آخر دنیا کیا کہے گی۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ مگر اپنی پہچان بھی تو برقرار رکھنی ہے۔ ایک افسانہ...... باپ اور بیٹے کو یقین ہو چکا ہے کہ ان کی بیٹی، بہن ایک نامحرم سے ناجائز تعلق قائم کیے ہوئے ہے۔ اس عورت کو قتل کرنے سے پہلے باپ اور بیٹے کے نازک جذبات۔ باپ اور بھائی کا پیار بھی ہے مگر قتل کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عورت مرد کے تعلق پر ازلی فلمی تخلیقات اسی بنیادی فارمیٹ پر بنائی جانی چاہئیں۔ آج میں نے اپنے پیارے ایڈیٹر صاحب سے کچھ اسی نوعیت کی گفتگو کی اور انہیں اُکسایا کہ عورت مرد کے تعلق پر ہمارے صدیوں کے تہذیبی سفر کے بارے میں اس فقیر کو کچھ لکھنے کی اجازت دیں۔ ایڈیٹر صاحب حسبِ توقع بپھر گئے۔ ارشاد فرمایا ''تمہاری باتیں منحوس ہوتی ہیں کبیر مہدی انہیں سُن کر آدمی کا دم گھٹتا ہے۔'' میری گفتگو کی مزید نحوست کی تعبیر انہوں نے یہ کی ''تم یہ منہ ٹیڑھا کر کے جو باتیں کرتے ہو۔ بندہ نہ تو انہیں جُھٹلا سکتا ہے اور نہ ہی مان سکتا ہے''۔

ہم نہ سچے ہیں نہ جھوٹے ہیں بلکہ جھوٹ اور سچ کے درمیان ایک حد درجہ کمینے زمان و مکان کی مخلوق ہیں۔

یہ رجسٹر جسے میں نے کوئی ناول واول (Vowel) .... کیا محض واولز پر مبنی زبان ممکن نہیں تھی۔ اگر نہیں تو کیوں؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واول آوازیں تمام جسمانی ہیجانات کے اُبال کا صوتی اظہار ہیں۔ جنسی فعل کے دوران طرفین کے منہ سے برآمد ہونے والی آوازیں۔ درد، لذت، خوف، غم، غصہ، آ، ای، او، اُو، اے، آ ای، وغیرہ وغیرہ۔ کیا کھردری آوازیں (Consonants) جب اس جبلی صوتیات کو قابو کرتی ہیں تو الفاظ وجود میں آتے

Scanned by CamScanner

ہیں؟ بہر حال......

یہ رجسٹر میں نے اپنی خالص نثری مشقوں کے لیے کھولا تھا اور یہ ہوس بھی تھی کہ شاید یہ کسی خیالی منضبط تحریر کے لیے اپنے افکارِ عالیہ جمع کرنے کے لیے بھی استعمال ہوگا اور خیال تھا کہ شاید کبھی اسی طرح کچھ بھلا ہو جایگا مگر یہ نوٹ بک ایک ڈائری کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ لیکن ڈائری بھی تو اپنی جگہ ایک نثری مشق ہی ہے جسے بعض افسانہ نگار مستند پیرائیۂ اظہار بھی سمجھتے ہیں۔

فکشن رائٹر کو جب اور کچھ نہیں سوجھتا تو وہ ڈائری/روزنامچے کا سہارا لیتا ہے (ڈائری کا اُردو مترادف روزنامچہ ڈائری کی آدھی سے زیادہ ڈائریت چھین لیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی منشی نما بندہ فرشی ڈھلوان میز (پتہ نہیں اصل میں اس چیز کا کیا نام ہے پر موٹا سا کھاتا کھولے جمع تفریق کر رہا ہے)

آزاد تلازمات پر مبنی تحریر کس حد تک آزاد ہے؟

مالی مجبوریوں سے 'مجبور' ہو کر آج کل پھر ایڈیٹر صاحب عصری ڈائجسٹ کے دربار میں حاضری دینا پڑ رہی ہے۔ آج انہوں نے پہلے تو کچھ نخرے دکھائے اور کہا ''عورت اور مرد کے تعلق کے حوالے سے کبیر مہدی صاحب آپ نے جس طرح کی خرافات لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا پچھلی بار (اصل میں ایک ہی دن پہلے) تو وہ تو آؤٹ آف کیوئچن ہے۔ البتہ......'' ابھی وہ البتہ کے آگے کی وضاحت کر ہی نہیں پائے تھے کہ میرے منہ سے نکل گیا'' تو پھر جناب کیوں نہ ہم عورت مرد کے تعلق کے اس حوالے کے حوالے سے بات کر لیں جس کا نام یاور عطائی تھا'' ایڈیٹر صاحب واضح طور پر کسی اندرونی جذباتی کشمکش سے گزر گئے مگر قابلِ ستائش انداز میں اپنے اوپر قابو پا کر بہت نارمل انداز میں فرمانے لگے۔ '' آ...... کبیر صاحب کچھ بے حد اہم سیاسی موضوعات پر آج کل ہمارا لکھنا بنتا ہے۔'' مگر بد قسمتی سے میرا دماغ اس دوران بہک چکا تھا اور سیاسی موضوعات کے بارے میں اُن کے احکامات سُننے کی بجائے میں نے بک بک شروع کر دی تھی جو رو کے نہیں رُک رہی تھی۔ ''خصی کلب کے اراکین سر آجکل یقیناً بہت مشکل حال میں ہوں گے......افسوس معزز اراکینِ خصی کلب اب اس ابتلا میں بلکہ ابتلائے نیم شہی میں تنہا رہ گئے۔ عطائی اعظم کی بے وقت موت نے کہیں کا نہیں چھوڑا...... کیوں نہ ہم دیکھیں کہ اس صورت حال کے کیا اثرات ملکی سیاست اور تہذیب و تمدن پر مرتب ہو رہے ہیں۔ میں کچھ اسی طرح کی بک بک کر رہا تھا۔ کہ

Scanned by CamScanner

ایڈیٹر صاحب کے چہرے کے تاثرات مجھے حد درجہ غیر معمولی نظر آئے۔ نہ صرف اُن کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا بلکہ ان کی آنکھوں میں جو کیفیت تھی اُسے خوف کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اور مجھے اور بھی حیرت ہوئی کہ اُن کی نگاہوں کا مرکز میں نہیں بلکہ کوئی اور تھا جو میرے پیچھے تھا۔ فوراً جبلی طور پر میں نے مڑ کر دیکھا تو امبر جان تھا۔ جس بات نے مجھے دھچکا سا دیا وہ اچانک وہاں اُس کی بے آواز موجودگی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اُس رات اُس کی بے آواز کار دھند سے نکل کر مجھے پیچھے آگے بڑھ گئی تھی۔ یاور عطائی کی آخری رات والی رات کے بعد پہلی دفعہ اتنے قریب سے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ گلابی سفیدی اور بھوری غیالی سرخی کی گولائیاں۔ مجھے فوری طور پر جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ یقیناً اُس کے خصیے بھی اس رنگ کے ہوں گے۔ میں نہیں جانتا مجھے یا میری آنکھوں کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کیا خیال آیا ہوگا۔ مگر پھر میں نے اُس کی آواز سُنی وہ ایڈیٹر صاحب سے مخاطب تھا۔ ''میں سناتھ تمہارے آرام والے کمرے میں...... ہیں''؟ اور پھر ایڈیٹر کے کسی بھی ردِعمل کا انتظار کیے بغیر وہ اُس کے ریٹائرنگ روم میں گھس گیا۔ ایڈیٹر نے اس ساری پیش رفت کو نظر انداز کر کے مجھے پھر مخاطب کیا ''لیکن کبیر مہدی صاحب۔ بہتر ہوگا نہ فضول باتوں میں آپ میرا وقت ضائع کریں نہ اپنا۔ کام کی بات کریں۔ مجھے پتہ ہے آپ کے پاس پیسے ختم ہو چکے ہوں گے تو آپ کو عصری یاد آ گیا ورنہ آپ مجھ پر لعنت بھی نہ بھیجتے بہر حال کام یہ ہے کہ علاقائی پس منظر میں بعض طبقات کی طرف سے انسانی حقوق، برداشت، تحمل، رواداری اور اس طرح کے دوسرے مہمل تصورات کی آڑ میں جس طرح کے سیاسی اور فکری سیکولر نظام کے اشارے دیے جا رہے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اُن کے پیچھے کن قوتوں کی سازش کام کر رہی ہے اور ان کی بیخ کنی.................'' ''رہنے دیجیے'' میں نے ایڈیٹر کی بات کاٹتے ہوئے کہا'' میں مکمل سمجھ گیا ہوں۔'' میں واقعی مکمل سمجھ گیا تھا کیونکہ 'بعض طبقات' کی طرف سے ایسے مہمل تصورات پھیلانے میں اس فقیر کا بھی ہاتھ ہے۔ اگرچہ نام دوسرا ہے رسالہ/ اخبار دوسرا ہے۔ ''یہ کام ہو جائے گا۔ تین مضامین اوپر تلے کے ہوں گے'' میں نے کہا پھر میں نے وہ دلائل و براہین اُس کے گوش گزار کیے جو ان مہمل تصورات کو رد کرنے اور بیخ کنی وغیرہ کرنے (اس لفظ سے مجھے سخت نفرت ہے پتہ نہیں کیوں) کے لیے استعمال ہوں گے۔ کچھ میں نے سازشی سیکولر قوتوں کو بھی تھوڑا بے نقاب کیا۔ ایڈیٹر خوش ہو گیا اور میں نے اُسے ایڈوانس بتایا جو اُس نے قبول کیا۔ فقیر سے شدید نفرت کے

Scanned by CamScanner

باوجود وہ پروفیشنل رویہ برقرار رکھتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ وہ مجھے چیک دینے لگا تھا میں نے کرنسی کا مطالبہ کیا تو وہ اپنی سیف کی طرف بڑھ گیا جو ریٹائرنگ روم کے دروازے کے قریب تھی اور اسی وقت میں نے اُسے پھر دیکھا امبر جان کو جواب دفتر اور ریٹائرنگ روم کے درمیانی دروازے کے پردے کے پیچھے چھپا کھڑا فقیر کو اپنی نظروں سے چھیدرہا تھا اور مجھے اُسی وقت یقین ہوگیا کہ اُس 'قدِ آدم عضو' کی فقیر کے لیے نفرت واقعی ایڈیٹر کی شدید نفرت سے بھی شدید تر ہے۔

کسی فرضی خیالی سامع کو باتیں سُناتے چلے جانے کی تیکنیک...... جو کہ ظاہر ہے واحد متکلم کی زبانی ہوتی ہے مگر ضروری نہیں، کسی حد تک داستانی طریقہ کار بھی ہے...... اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ مکالمے اور بیانیے کا امتزاج ایک ہی ہموار بہاؤ کی صورت رواں دواں رہتا ہے۔ امبر جان کے واقعہ کی بنیاد پر مندرجہ بالا نثری مشق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ تیکنیک واقعات کی مسلسل جڑت (ربطِ پیہم) کا مطالبہ کرتی ہے۔ (ترجیجاً) اور دوسرے یہ کہ واقعات اور کردار کی بیرونی پرت کا بیان ہی یہ تیکنیک پکڑتی ہے۔ رُک کر گہرا اندر جانا، شاید اس اسلوب کے لیے مشکل ہوگا۔

گہرا...... گہرائی...... سطح...... سطحی...... یہ عجیب الفاظ ہیں۔ بلکہ ان کے کچھ استعمال عجیب ہیں۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ طبعی خواص میں مادی چیزوں کی سطحیں ہوتی ہیں اور کوشش کر کے ہم اُن کے اندر گہرا جا سکتے ہیں۔ (مائعات میں خصوصاً) لیکن یہ اسمائے صفت خیالات، نظریات، تصوارت کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ سطحی نظریات میں سطحی کے لیے کوئی اور الفاظ کیوں موجود نہیں۔ 'تصورات کی گہرائی' میں گہرائی کے لیے کوئی اور لفظ کیوں نہیں...... ممکن ہے یہ ساری بات ہی سطحی ہو؟

الف...... ب...... ج...... د...... ایک ہی زمانی و مکانی تسلسل کے کردار ہیں۔

الف ۔ شروع سے ہی لکھاری (کھلاڑی...... کلہاڑی...... عیاری...... پیاری...... سُناری...... ہاری...... کاری...... اناری...... بھاری...... ساری...... اناڑی......) ہونے کا دعوی دار ہے۔ کچھ خدائی فوجدار قسم کے لوگ اُس سے اُس کے دعویٰ کا ثبوت مانگتے ہیں۔ اگر وہ لکھاری ہے تو اسے لکھاری کی آخری آزمائش سے گزرنا ہوگا۔ جو یہ ہے...... فرض کرو...... ب...... ج......

Scanned by CamScanner

کسی طلسم کے زیرِ اثر لکھاری بن جاتے ہیں۔ اب ان چاروں کو ایک واقعہ 'ق' پیش آتا ہے۔

تمہیں یہ لکھنا ہے کہ تم بطور 'الف' اس واقعے کو کیسے لکھو گے اور...... ب...... ج...... د...... اپنی اپنی علمی صلاحیت کے ساتھ واقعہ 'ق' کو کیسے لکھیں گے۔

واقعہ 'ق' کو لکھیں گے یا واقعہ 'ق' کے بارے میں لکھیں گے؟

اس صورتِ حال (مذکورہ بالا) کا مزید تجزیہ یہ ہے۔ الف...... ب...... ج اور د...... صلاحیتوں کے اعتبار سے اس صورتِ حال میں ہیں۔

الف (س...... م...... ک...... ن...... ل شروع سے (لنگڑا ہے)......

ب (ف...... ع...... غ...... ص...... ل (لنگڑا ہو جاتا ہے)......

ج (ر...... د...... گ...... پ...... ل ('' '' '')

د (پ...... ط...... ڈ...... ی...... ل ('' '' '')

ایک حسین۔ جھگڑالو، بے وقوف، نوجوان، لنگڑی عورت۔

ایک عیار۔ ٹھگنا، لالچی، بوڑھا، لنگڑا مرد۔

ایک دریادل، بزدل، وہمی، خوش شکل، لنگڑا مصور۔

سوال کیا الف اپنے خداداد لنگڑے پن کے بل بوتے پر ب...... ج...... د...... کے لنگڑے پن کی گہرائی میں جا سکتا ہے (پھر وہی گہرائی)

ب...... ج...... د...... ہر ایک کی الگ لنگڑی دنیا ہے...... (ظاہر ہے) (یہ کوئی دور کی کوڑی نہیں)

ب۔ ف ع غ ص ل مصنف اب اگر ل سے مراد تحریر کی صلاحیت ہے۔

ج۔ ر د گ پ ل مصنف

د۔ پ ط ڈ ی ل مصنف

الف کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے 'ل' کو استعمال کر کے یہ سامنے لائے کہ...... ب...... ج...... د...... اپنے اپنے 'ل' کو استعمال کر کے واقعہ 'ق' کو کیسے سامنے لائیں گے۔

واقعہ 'ق' کا بیان...... واقعہ 'ق' الف...... ب...... ج...... د...... کے ساتھ مشترک طور پر پیش آیا ہے (مشترکہ طور پر پیش آنے کا جو بھی مطلب ہے)...... الف...... ب...... ج...... د...... واقعہ 'ق' کے سیاق و سباق سے آگاہ ہیں اور اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ الف...... ب......

Scanned by CamScanner

ج...... د...... واقعہ 'ق' کے سیاق و سباق سے کیونکر آگاہ ہیں۔ کس طرح آگاہ ہیں۔ اس صورتِ حال کی پیچیدگی تقاضا کرتی .... ہے۔

فکشن میں واقعہ کی زمانی و مکانی مظہریت (جبریت/ مظہری جبریت/ جبری مظہریت)۔ فکشن میں واقعاتی جبریت کا محور مصنف کی ذات کی جبریت ہے جو کہ دراصل لسانی جبریت ہے لسان کے ساتھ ہر شخص کی طرح، مصنف کا بھی ایک منفرد تعلق ہوتا ہے جو کہ فکشن کی تخلیق میں نہ صرف واقعاتی مظہریت بلکہ کرداروں کی ظاہری و باطنی ساخت کو بھی متعین کرتا ہے۔ یہ تعلق صرف کسی مخصوص زبان (کہ جو کسی مصنف کا ذریعۂ اظہار بنتی ہے) میں مصنف کی لسانی ترجیحات و ترغیبات تک محدود نہیں بلکہ اس کے ڈانڈے(؟!) (ڈ+انڈے) (کوئی اور لفظ ہم معنی استعمال کرو۔ کوئی بھی دو لفظ ہم معنی کیسے ہو سکتے ہیں؟!) اس آفاقی ساختیت سے جا ملتے ہیں جو جملہ انسانی زبانوں کے (زیرِ ناف) عقب، کی تہہ، کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں۔ کیا اس تعلق کے خدوخال کا سراغ لگایا جا سکتا ہے یقیناً لکھاری اپنے اس تعلق کی شکل و صورت سے شعوری طور پر آگاہ نہیں ہوگا۔ (یہاں بھی سطحی ساختوں اور گہری ساختوں کے فرق کی بات کی جاتی ہے۔ اس تعلق کو کسی بھی مصنف کی تحریر میں سے بعد از تحریر (بعد از مرگ)......کھوجا جا سکتا ہے۔

ایک تجربہ اور بھی کیا جا سکتا ہے۔ فرض کریں کہ میں 'کبیر مہدی' بطور کبیر مہدی ہی اس لمحۂ موجود سے ایک بیانیے کا آغاز کرتا ہوں۔ جس میں میری اردگرد کی دنیا واقعیت اور کرداریت کے حوالے سے جوں کی توں موجود ہے۔ فرض کریں کہ میرا خیالی قاری میری اردگرد کی دنیا میں بیتنے والے واقعات سے آگاہ ہے۔ وہ کرداروں کی اپنی اپنی دنیا سے بھی متعارف ہو چکا ہے اور خاص طور پر مندرجہ ذیل اطلاعات بھی اُس تک پہنچ چکی ہیں (یہاں ایک اور اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ جو کہ ابھی تک میرے ذہن میں ہی نہیں آیا تھا۔ اسے ہم فکشن کا 'علمیاتی' مسئلہ ہی کہہ سکتے ہیں اور یہ بہت دلچسپ ہے۔ کردار......الف......ب......ج......د......کو......پا......تا......کا...... گا کا علم کس طرح فراہم کیا جا سکتا ہے۔ (گھٹیا فلموں میں Overhear کرنے یا چھپ کر سُننے کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے) اور پھر صرف قاری کو پا......تا......کا......گا......کا علم دینے کے علاوہ۔ آشی......جاشی......ماشی......ناشی......کا علم کس طرح فراہم کیا جائے۔ اکثر اوقات کسی عظیم ادبی پیرائے، بیانیے دھوبی پٹکے کا اصل مقصد محض کوئی سیدھی سی انفرمیشن فراہم کرنا ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

فکشن میں قاری علمیاتی لحاظ سے ایک مراعات یافتہ سطح پر (پھر سطح) فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اُسے (شاید وقتی طور پر) مخصوص اطلاع/علم/آ گاہی/عرفان وغیرہ وغیرہ سے محروم بھی رکھا جاتا ہے۔ تجسس کے یہ چند پرانے آزمودہ فارمولے ہیں اور تجسس ظاہر ہے کہ ایک خالصتاً علمیاتی مسئلہ ہے۔ تجربے کو وہیں سے پھر پکڑا جائے جہاں سے فکشن میں علمیات کی یہ مداخلت شروع ہوئی۔ تو فرض کرتے ہیں کہ میرے خیالی قاری تک مندرجہ ذیل اطلاعات بھی پہنچ چکی ہیں۔ (آہ کیا زمانہ تھا جب رائٹر خاص طور پر ناول کا رائٹر کسی تکلف کے بغیر بلا جھجک اپنے قاری سے براہ راست ہم کلام ہو جایا کرتا تھا اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اُسے اپنی مجبوریوں سے آگاہ کر کے اس سے ہمدردانہ بلکہ بعض اوقات دردمندانہ رویے کی اپیل کرتا تھا اور درگزر کا خواستگار ہوتا تھا)۔ یہ سوال اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ لکھاری اور قاری (اگرچہ اس کے لیے لفظ "پاڑھی" وضع ہونا چاہیے) کے اس مین ٹو مین ریلیشن پر کیوں پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس پابندی کو عارضی طور پر توڑتے ہوئے۔ پیارے قاری ہم فرض کر لیتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ۔

1- میں کون ہوں ۔ زہرہ کون ہے ۔ ہاف مین کون ہے اور باقی بھی میری دنیا میں کون کون ہے۔

2- عصری ڈائجسٹ کے ایڈیٹر نجم الثاقب کے کمرے میں امبر جان سے مڈبھیڑ ہونے کے بعد میں نے تین دن گھونسلے میں گزارے اور نام نہاد، ترقی پسند (مطلوبہ معنوں میں) مذہب دشمن اور انسانی حقوق وغیرہ کی آڑ میں سیکولر سیاسی اور فکری نظام کے اشارے دینے والوں کے خلاف ایک بھرپور مضمون لکھا اور ایک طرح سے گھر کا بھیدی ہوتے ہوئے میں نے ان 'گمراہ' طبقات کی آراء اور دلائل و براہین کے دل کھول کر پرخچے اُڑائے اور پھر ان پرخچوں کی فوٹو کاپیاں کروا کے رکھ لیں۔ کیونکہ آگے چل کر 'گمراہ' طبقات کی آراء اور دلائل و براہین کی بھرپور حمایت میں بھی جواب مضمون لکھنے کا آرڈر مل سکتا تھا۔ ایڈیٹر صاحب مضمون پا کر شاداں و فرحاں ہوئے۔ میں نے منہ مانگی مزدوری حاصل کی اور پھر ان کے فیاضانہ موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا کہ امبر جان اس فقیر کو اُس دن کیوں معاندانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مضمون پر سرخوشی کا وہ عالم اُن کا کمزور لمحہ تھا اس لیے انہوں نے جو کچھ کہا ممکن ہے بلکہ یقیناً وہ کبھی بھی اُن کے روزمرہ کے معمول کی ایڈیٹرانہ ذہنی کیفیات

Scanned by CamScanner

میں اُن کے کترویں مونچھوں والے منہ سے برآمد نہ ہوتا۔ اُن کے اُس کلامِ نرم و نازک،
سے مندرجہ ذیل حقائق عیاں ہوئے تھے۔

الف۔ امیر جان قدوی کو اپنا دشمن نمبر 1 سمجھتا ہے۔ کیونکہ اُس کا خیال ہے کہ سُرخ تکل والے کی بیٹی جس بدمعاش ٹولے میں پھنسی ہے اس میں سے وہ ایڈیٹر کے ملازم (خاکسار) سے سب سے زیادہ متاثر ہے اور اگر کبھی وہ جسمانی تعلق یا قانونی و جسمانی تعلق قائم کرے گی تو اسی سے۔ دوسرے نمبر پر وہ گورے کو اور تیسرے پر ناصر کو رکھتا ہے (ہائے بے چارہ ناصر)

ب۔ امیر جان اور خصی کلب کے کچھ دیگر ارکان کو شک ہے کہ چونکہ ایڈیٹر کا صحافی ملازم (کبیر مہدی) عطائی کی آخری رات اُس کے ڈرائنگ روم میں بمعہ جرمن آرکیالوجسٹ موجود تھا اور تمام واقعات کا عینی شاہد ہے مزید براں وہ عطائی کی بیٹی (سرپھری) سے قریبی تعلق رکھتا ہے (یہ تعلق باشارہ دیا گیا کہ خصی کلب کے کئی ارکان کے لیے باعثِ دلچسپی، تشویش اور حسد و رقابت ہے وغیرہ وغیرہ)۔ ایجنسیوں کی رپورٹ کے مطابق بھی بندہ شرارتی ہے۔ اس لیے کچھ عجب نہیں کہ یاور عطائی کے خصی کلب کے کسی رُکن یا ارکان کے ساتھ عطائی مرحوم کے دیرینہ مراسم کی ٹوہ لگانے کی کوشش کرے اور بعد میں کچھ الٹا سیدھا چھاپ کر فساد پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

ج۔ اپنی فطری، بدفطرتی بلکہ بے فطرتی سے مغلوب ہو کر اس حقیر پُرتقصیر نے خصی کلب کے ارکان کی تشویش اور ایڈیٹر صاحب کی خصوصی حیثیت (اس عاجز کے ان داتا ہونے کے ناطے) کو مدِنظر رکھتے ہوئے کچھ فی الفور قسم کا غور و فکر کیا اور یوں کلب اور ایڈیٹر صاحب کو بلیک میل کرنے کی مذموم حرکت کرنے کا ارادہ از خود ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب کے گوش گزار کیا گیا کہ ناچیز تو پہلے ہی ان لائنوں پر کام کر رہا ہے۔ یاور عطائی ایک حیرت انگیز بلکہ شہوت انگیز عظیم کردار ہے۔ جس نے مردانہ جنسی اعضاء کی راہ سے طاقت کے سرچشموں کے دل و دماغ تک ہاتھ بڑھایا ہے یا پھیلایا ہے۔ احقر اس عمل کی مزید تفصیلات حاصل کر کے ایک نیم افسانوی تحریر خلقِ خدا کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جس میں ایک عالمی پس منظر فراہم کرنے کے لیے اٹھارویں اُنیسویں صدی کے

یورپین اوباش امراء و رؤساء کے جنسی کلبوں کے بارے میں نہایت لذیذ تفصیلات زیبِ داستان کے طور پر پیش کی جائیں گی۔ نیز مبہی ادویات کے بارے میں مزید تحقیق بھی ضبطِ تحریر میں لائی جاوے گی اور اس طرح سے بشرطِ زندگی، اشخاص، واقعات، مقامات سے کسی بھی قسم کی مماثلت کو محض اتفاقیہ قرار دینے کے بعد از حالی تین سو صفحات پر مشتمل افسانہ پیش کر دیا جائے گا۔ جس میں ظاہر ہے کہ کوئی معلوم نام نہیں ہوں گے مگر رازدان سمجھ جائیں گے۔ یہ بک بک کرنے کے بعد جو کہ ظاہر ہے وقتی ترنگ کا نتیجہ تھی گو دیکھا گیا کہ پیارے ایڈیٹر صاحب کے لیے نہایت مؤثر تھی، اس حقیر پُرتقصیر نے بلیک میلروں والی غایت کمینگی کے ساتھ یہ عندیہ دیا کہ مذکورہ تحریر منصۂ شہود میں آنے سے پیشتر ہی تلف کی جا سکتی ہے بشرطیکہ لذتِ تحریر (کتنی) سے محرومی و دیگر متعلقات کا کچھ مداوا از راہِ مال و زر محرر کو فراہم کر دیا جائے۔ (پیارے پڑھنے والے۔ لفظ محرر کو سُن کر ایڈیٹر صاحب کا چونکنا دیدنی تھا۔ کیونکہ وہ بھی خواندہ بندگانِ خدا کی اکثریت کی طرح "محرر" کو چُنگی محرر کے علاوہ کسی نوع کی معنویت بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بصد مشکل انہیں باور کرایا گیا کہ محرر سے مراد فقط تحریر کرنے والا ہے۔ خواہ وہ تحریر بلیک میلنگ جیسے مقاصدِ رذیلہ کے لیے ہی کیوں تخلیق نہ کی جا رہی ہو۔ بایں ہمہ راقم یہ معمہ حل کرنے سے عاری ہے کہ لکھنے والے کے لیے۔ تحریر کرنے والے کے لیے رائیٹر کے لیے محرر کا لفظ کیوں رواج نہیں پا سکا۔ جبکہ لکھاری جیسا بے رنگ لفظ اکثر اب ثقہ ادبا کے ہاں بھی مستعمل نظر آنے لگا ہے)۔ اے میرے صابر قاری یقیناً آپ میری تحریر کی کج روی سے بیزار ہو رہے ہوں گے اور تجسس کے فطری تقاضوں سے مغلوب ہو کر جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے امیر جان کے معاندانہ و مفسدانہ رویے کے بارے میں جب ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ سے استفسار کیا تھا تو بارے کچھ حقائق اُس مردِ دانا کے جوابی کلام سے عیاں ہوئے تھے جنہیں نقاط الف...... ب...... ج...... د...... وغیرہ کی تدوین کے ذریعے پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن نقطہ ج میں بلیک میلنگ کی آمد آمد سے کلام بے قابو ہو گیا اور مزید حقائق کہ جو عیاں ہوئے تھے کہ بیان میں خلل پڑ گیا۔ (درحقیقت (کونسی حقیقت؟) یہ سوال قاری کے لیے ہے۔ اس تحریر کی خواندگی کے بعد رجوع کر سکتا ہے)...... اس روز لا

Scanned by CamScanner

دینی طبقات کے مذموم عزائم کے خلاف لکھا ہوا جواب مضمون ایڈیٹر صاحب کے سپرد کرنے کے بعد جو نشست رہی اُس میں بلیک میلنگ کی شرارت بازی راقم سے بالکل آخر میں سرزد ہوئی تھی۔ جبکہ زیرِ نظر تحریری بیان میں اُس کا ذکر عین درمیان میں در آیا ہے۔ اس طرح اصل واقعاتی زمان و مکان اور تحریری زمان و مکان میں عدم انطباق کا سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس فنی لغزش کا ازالہ کرنے کے لیے (دیر آید درست آید) اس سوال کو کہ ایڈیٹر صاحب نے خصی کلب بمعہ اراکین کو بلیک میل کرنے کی میری خالصتاً تفنن ورائے بازی پر کس ردِ عمل کا اظہار کیا، ہم زیرِ نظر تحریر کے اختتام تک موخر کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر نقطہ ج کے بیان کو التوا میں ڈالتے ہوئے فی الحال نقطہ ذ کی طرف بڑھتے ہیں۔ (لمحۂ تحریر زمان و مکان سے ماورا ہے۔ ماضی اور مستقبل، دو حیثیتوں کا لسان کی کوکھ میں اختلاط واقعیت کے التباس کو جنم دیتا ہے۔ جو پھر بھی نیستی ہی رہتا ہے۔ کہیں یہ نقطہ گراں بہا ختم کیا جائے گا۔ موضوع مزید تفکر کا متقاضی ہے)۔

ذ۔ امیر جان نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی 'مشاطیانہ' خدمات حاصل کر کے زہرہ کی والدہ ماجدہ اور برادران کے سامنے عقد کی خواہش ظاہر کر چکا ہے۔ والدہ اور برادران کے لیے ایک انتہائی دولت مند خانوادے سے ناتا جوڑنے کا یہ ایک نادر موقع ہے۔ ان کے ہاں معاملہ بدستور زیرِ غور ہے لیکن لڑکی نہیں مانتی (نوٹ۔ پیارے قاری لڑکی نہیں مانتی، کے پُرجوش، ولولہ انگیز اظہار کا راقم عینی شاہد ہے۔ زہرہ کے آتشیں سیمابی مزاج سے واقف تفنن بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں)۔

ر۔ یاور ہاؤس کی عمارت کو مع یاور عطائی کا خصوصی کمرہ خریدنے کے خواہش مندوں میں نواب کے علاوہ امیر جان بھی شامل ہو چکا ہے۔ کلب کے کئی ارکان اپنی نجی محفلوں میں عطائی کے تیر بہدف سمی مرکبات کے یوں ضائع ہونے پر آزردہ ہوتے ہیں۔

س۔ ایڈیٹر صاحب کی سوچی سمجھی رائے کے مطابق امیر جان ایک انتہائی خطرناک آدمی ہے۔

ج۔ بقیہ۔ گذشتہ سے پیوستہ۔ بلیک میلنگ کے حوالے سے میرے مذاق کو حقیقت جان کر ایڈیٹر صاحب نے گہری سنجیدگی اختیار کی اور فرمایا کہ وہ کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ میرے اس خطرناک تحریری ارادے کا امیر جان یا کلب کے کچھ دیگر ارکان کو پتہ چلے۔ کیوں کہ

عصری کے لیے میری خدمات سے فی الحال محروم نہیں ہونا چاہتے اس لیے معاملہ اپنی سطح پر ہی نمٹائیں گے۔ طے پایا کہ ایسی کوئی افسانوی یا غیر افسانوی تحریر سامنے نہیں آنی چاہیے۔ ایسی تحریر سے باز رہنے کے معاوضہ کے طور پر انہوں نے کچھ مالی مراعات کی پیشکش احقر کو کی۔ ایک لمحے کو تو میں نے سوچا کہ ایڈیٹر صاحب کو بتادوں کہ یہ تو محض آپ سے دل لگی کے لیے تھا ورنہ کہاں ہم اور کہاں بلیک میلنگ وغیرہ وغیرہ۔ مگر پھر خود ہی جو طلسم بنا تھا اُسے توڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باقی یہ بھی ہے کہ مالی ضروریات تو ہر کہ و مہ کی ہوتی ہی ہیں۔ (مذکورہ بالا معلومات کا ماخذ بنیادی طور پر ایڈیٹر صاحب سے میری وہی نشست ہے۔ دیگر معلومات کہ جو قاری تک پہنچانی مقصود ہیں وہ مذکورہ نشست کے بعد کے واقعات سے ماخوذ ہیں اور امید کی جاتی ہے یہ معلومات بھی قاری کے علمیاتی مکان اور مظہریاتی زمان پر اثر انداز ہو کر اُسے اس تجرباتی افسانوی تحریر کا جائز قاری بنا ڈالیں گی جسے میں کچھ دیر بعد پیش کرنے کی کوشش کروں گا اور جس کے تجزیے سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے گی کہ کبیر مہدی نامی شخص جو محرر ہونے کا مدعی ہے اس کا زبان کے ساتھ رشتہ کس نوعیت کا ہے۔)

3. ایک دن زہرہ نے بتایا کہ اُس کے بھائیوں اور ماں نے اپنی اوقات اور ہمت سے بڑھ کر اُس پر شدید دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ وہ امیر جان سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے۔ لیکن انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ ایسا ہی دباؤ اُس پر یاور ہاؤس کو نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے ہاتھ بیچ دینے کے لیے ڈالا گیا۔ مگر یہاں بھی زہرہ نے اُن کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

4. ایک رات نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے ہاف مین سے مل کر سازش کرنے کی کوشش کی کہ کسی طرح 'یاور ہاؤس' میں عطائی کے بدستور مقفل کمرے تک رسائی حاصل کی جائے اور سمی مرکبات و تحریری نسخہ جات اقدامِ سرقہ بلا اخفا کے ذریعے حقدار تک پہنچا دیے جائیں۔ (یعنی نواب صاحب تک اور ان کے ذریعے پھر کسی نئے ڈیلیوری سسٹم کے ذریعے خصی کلب کے ارکان تک) ہاف مین نے شرارت کی پہلے تو نواب کی آتشِ شوق کو اس طرح بھڑکایا کہ اُسے سمی مرکبات کے عقل گم کر دینے والے تجارتی امکانات کی طرف لے گیا

Scanned by CamScanner

جس میں بائیو کیمسٹری اور جدید سائنسی و تکنیکی علوم کے حوالے دے کر اپنے بیان کو نہایت
قابلِ عمل و قابلِ اعتبار بنا دیا مگر جب نواب صاحب منصوبے کے بے داغ ہونے پر
مصر رہے تھے تو غلام نے سرقہ جیسے مجرمانہ اور غیر مذہبی و غیر اخلاقی اقدام میں ملوث
ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ نواب مذکور کو بھی بے پناہ شرم دلائی کہ ایک طرف تو وہ
روایتی پارسائی کا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف بہیمات کے لیے اتنی دیوانگی
کہ قانون شکنی پر اتر آئے۔ نواب صاحب ہاف مین کے الٹ پلٹ ذاتی رویے پر مبہوت
ہو گئے۔ پھر جب ہوش سنبھالا تو ہاف مین کو دبے لفظوں میں دھمکی دی۔ جس کا لب لباب
یہ تھا کہ وہ غلام باغ پر اُس کی ریسرچ کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔ جواباً ہاف مین نے
دھمکی دی کہ وہ مدد علی کی طرف سے بیان دلوائے گا کہ نواب صاحب کس طرح ابھی تک
(یعنی اُس وقت سے لے کر جب غلام باغ اُن کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا) رات کے
اندھیرے میں آرکیالوجی کے ملازمین کے ساتھ مل کر مدد علی کے ذریعے چھوٹی موٹی
نوادرات کی چوریاں کراتے ہیں۔ پھر ہاف مین کو اچانک خیال آیا تھا کہ مدد علی تو بدستور
قوتِ گویائی سے محروم چلا آ رہا ہے۔ اُس سے بیان کیسے دلوایا جائے گا۔

5. ہاف مین نے یہ سارا قصہ مزے لے لے کر ہمیں (ناصر، میں، زہرہ) کو سنایا جب ہم کیفے
غلام باغ میں بیٹھے تھے۔ اُس کے مزے میں خوشی شامل ہونے کے علاوہ دو باتیں واضح
طور پر سامنے آئیں۔ پہلی تو یہ کہ زہرہ کو اب خود ہی اپنے مرحوم و مغفور باپ کے کمرے
میں جھانک لینا چاہیے۔ مگر جھانکنے کے اس عمل میں اپنے بہی خواہوں کو بہر حال شامل کرنا
پڑے گا۔ زہرہ نے تسلیم کیا کہ اس طرح کی حرکت وقت کا اہم تقاضا ہے اور جلد ہی اسے عملی
جامہ پہنایا جائے گا۔ دوسری اہم بات یہ سامنے آئی کہ اب وقت آ گیا ہے (انگریزی کے
ہائی ٹائم کا محاورہ بولا گیا) کہ مدد علی کی زبان چالو کرنے کے لیے کوئی فیصلہ کن اقدام کیا
جائے کیونکہ ایک طرف تو جسم کھنڈر کے نچلے کمرے میں مدد علی پر کیا بیتی؟ اس بپتی کا حال
جاننا آرکیالوجی کی سائنس کی خدمت کے لیے ضروری ہے۔ دوسری طرف نواب کی کسی
امکانی بدمعاشی کا قلع قمع کرنے کے لیے مدد علی کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر تیار کرنا
ضروری ہے۔ میں نے ہاف مین کی ہمت بندھائی کہ نواب آخر نواب ہے اپنے سابقہ

گورے آقاؤں کی نسل میں سے کسی کے ساتھ پھڈا ڈالنے کی کوشش نہیں کرے گا خواہ وہ
گورا جرمن ہی کیوں نہ ہو۔ ہاف مین نے کہا میں تمہاری اس مابعد السامراجی منطق کو تسلیم
کرتا ہوں۔ میں نے 'مابعد' کی بجائے 'نو' کا تقاضا کیا جو تسلیم کر لیا گیا۔ مگر ان 'ان ہاؤس'
چونچلوں کے باوجود 'مدد علی' کو پھر سے لذتِ گفتار سے ہمکنار کرنے کی علمی و ثقافتی اہمیت پر
اتفاق رائے برقرار رہا۔ سب نظریں ناصر کی طرف اٹھیں اور سب کی سب مع میری سوالیہ
تھیں۔ میں نے اس باب میں ناصر کی گذشتہ ناکامیوں کا دبے لفظوں میں ذکر کیا جو اتنے
دبے ہوئے بھی نہیں تھے۔ مگر ناصر زہرہ کے عشق سے سنبھلنے کے بعد اب زیادہ پُراعتماد ہو
چکا ہے اور میری طرف مدافعانہ نظروں سے دیکھنے کی بجائے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دیکھنے سے بھی نہیں چوکتا مگر ایسے میں مَیں کبھی کبھی آنکھ مار دیتا ہوں تو اچانک ایسا لگتا ہے
کہ پرانے والا ڈاکٹر ناصر پھر سے سامنے آ گیا ہے۔ بہر حال یہ تو ہے جو بھی ہے۔ دن
رات اکٹھے رہنے والے انسانوں میں بھی کتنے ہی رشتے ہوتے ہیں جو ہمیشہ چھپے رہتے
ہیں۔ ناصر نے تسلیم کیا کہ وہ معلوم میڈیسن اور دیگر طبی طریقوں کو مدد علی پر آزما چکا ہے لیکن
ناکام رہا ہے۔ ایک سائیکوڈرامہ ہی ہے۔ اب ایک مختلف سائیکوڈرامہ کا تجربہ ہے جو آزما
دیکھتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ زہرہ نے اس ڈرامائی بلکہ نام نہاد ڈرامائی طریقۂ علاج میں
بھر پور بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ جس کی تفصیل میں تھوڑے توقف کے بعد اپنے خیالی
قارئین کی نذر کروں گا۔ پھر مجھے زہرہ کی دلچسپی پر اپنی حیرت پر حیرت ہوئی اور پھر اُس
حیرت پر حیرت پر حیرت...... وعلیٰ ہٰذا القیاس...... پھر خیال آیا کہ پہلے تو یا میں زہرہ
کی دلچسپی ڈاکٹر کے لیے اُس کے مرضِ عشق سے نجات (کیا واقعی) کا وسیلہ بن گئی اب اس
نئے نفسیاتی الاؤ میں اس کی والہانہ دلچسپی کیا رنگ لائے گی۔

4. مگر دلچسپی سب کی تھی گو کہ زہرہ جیسی والہانہ نہ تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے بتایا کہ کرنا کیا ہے۔ اس
نے فوراً واضح کیا کہ اُسے میری (کبیر مہدی) اور ہاف مین کی مدد درکار ہوگی۔ ہمیں اُسی
رات کے واقعات کو پھر سے تخلیق کرنا ہے۔ اتفاق سے اندھیری راتیں چل رہی تھیں۔ میں
نے اور ہاف مین نے بھی اس کمال کے نفسیاتی منصوبے پر بدل و جان صاد کیا۔ میں نے
شرارتاً کہا کہ عورتوں کا وہاں کوئی کام نہیں۔ جواباً زہرہ نے میرا کان شدت سے مروڑ دیا

Scanned by CamScanner

تک ہلکا ہلکا درد ہوتا رہا اور مجھے ڈچ پینٹر وان گو کی یاد آتی رہی جس کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی طوائف پر اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے اپنا کان کاٹ کر اُسے پیش کیا تھا واللہ اعلم بالصواب۔ اس رات، رات واقعی اُس رات جیسی مزیدار بھیانک تھی، میں نے اصرار کیا کہ اُس رات ہاف مین Hash میں تھا اس لیے لازم ہے کہ آج بھی ہو، ناصر نے باول ناخواستہ اور گورے نے بدل وجان یہ فیصلہ قبول کیا اور اُسی رات زہرہ بھی اس ممنوعہ خان طرب انگیز سے متعارف ہوئی۔ مدعلی کو ناصر ہسپتال سے نکال کر لایا۔ ایک ربڑ کا بہت اعلیٰ کوالٹی کا مہیب سانپ حاصل کیا گیا تھا جو نقل بہتر از اصل لگتا تھا۔ مدعلی کا حال یہ تھا کہ اُسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ یہ شیطانی منڈلی اُس کے ساتھ کیا کرنے والی ہے۔ جب اسے جنم کھنڈر کے تہہ خانے میں پہنچنے کا کہا گیا تو وہ شخص جس نے ساری عمر زینوں کی بھول بھلیوں میں کبھی غلطی نہ کی تھی دو تین بار نیچے اُتر کر پھر باہر نکل آیا۔ اُس کے چہرے پر ایک قابل رحم تاثر تھا جسے ناصر نے Panic reaction قرار دیا۔ مگر میرے خیال میں اُس کے ذہن میں یہ وحشت ناک خیال تھا کہ اس سے مشورہ کیے بغیر اُس کی قربانی دی جانے والی ہے۔ وہ ہاتھ میں ٹارچ پکڑے نیچے کی جانب اُترتا تھا اور پھر کسی زینے سے باہر نکل آتا تھا اور منہ سے ال......لل......ہم......آ......عل......بلیت......ہلپ......پپ......
پپ کی آوازیں نکالتا تھا۔ بالآخر وہ نیچے پہنچ گیا۔ یعنی کچھ دیر تک کسی بھی زینے سے باہر کر اختتام برآمد ہوا تو ہم چاروں ٹارچیں لیے نیچے پہنچے۔ ربڑ کا سانپ ایک کونے میں پہلے سے چھپا دیا گیا تھا۔ مدعلی نے جو بے تکے انداز میں اِدھر اُدھر ٹارچ کی روشنی گھما رہا تھا اچانک سانپ پر روشنی جمادی۔ اُس نے سانپ کو دیکھا تو ہمیں توقع ہوئی کہ وہ شاک کی کیفیت میں پہنچے گا اور اگر اُس کے عصبی نظام میں اور گفتار کے دماغی مراکز میں کہیں کوئی 'اڑاؤ' یا 'اٹکاؤ' ہے تو وہ بجلی کے سپارک کی صورت 'چڑک' کر کے نکل جائے گا اور وہ سانپ سانپ بولنے لگا یا کچھ بھی بولے گا اور اُس کی مادری زبان کی مشین پھر سے چل پڑے گی۔ مگر افسوس ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ بے چارہ سانپ دیکھتے ہی وہیں کھڑا کھڑا گر پڑا۔ چیخ سُنائی دی مگر وہ زہرہ کی تھی۔ ایک Major ایمرجنسی پیدا ہوگئی۔ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اس صورت حال پر ہنسیں یا روئیں۔ مگر ایسا کچھ بھی کرنے کی بجائے مدعلی کو بصد مشکل

ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس دفعہ اُس کے دماغ کی بجائے دل پر اثر ہوا تھا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ بمشکل بچایا گیا پھر خدا جانے کس طرح ان واقعات کا یعنی صرف مدعلی کو ہسپتال سے لے جانے اور پھر نازک حالت میں واپس لانے کا علم نواب ثریا جاہ نادر جنگ کو ہو گیا۔ (ناصر کا خیال تھا بلکہ اُسے یقین تھا کہ اس کی ذمہ دار نرس مختار ہے۔) اُس نے خاصا فساد (Fuss) پیدا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائیکیاٹری وارڈ کے سربراہ ایک بڑے ڈاکٹر نے جو مرگی کا علاج کرنے کی تخصیص اور شہرت رکھتا ہے ناصر کو مرگی کا مریض قرار دیا (یہ اس کی مرغوب گالی تھی) اور اس کی ہاؤس جاب فوراً ختم کر دینے کی دھمکی دی۔ یہ ڈاکٹر پہلے ہی ڈاکٹر ناصر کی حرکتوں سے تنگ ہے۔ ہاف مین مدد کو آیا اور اپنے ایک سفارتی دوست کے ذریعے مرگی والے ڈاکٹر سے بھی بڑے ڈاکٹر جو طبی نوکر شاہی کا سربراہ بھی ہے اور جرمنی ریٹرنڈ ہے مرگی والے ڈاکٹر کو سرزنش کرائی اور ناصر پھر سے دل جمعی سے اپنے روزمرہ کے فرائض میں مصروف ہو گیا اور یہ باتیں سوچنے لگا کہ مدعلی کو بلوانا اب ایک عظیم پروفیشنل چیلنج بن گیا ہے۔ اب کیا کیا جائے اور دوسرے نرس مختار کے ساتھ اب کچھ ہونا چاہیے۔ مگر کیا؟ یہ بھی اُسے معلوم نہیں۔ ان سارے واقعات کے دوران لفظ Fiasco بہت دفعہ بولا گیا۔ میں نے کہا میں اس کے ترجمے کے لیے ایک نیا لفظ "'جھولا' معرض وجود میں لانا چاہتا ہوں اگر دوست اجازت دیں۔ قابل فہم طور پر ہاف مین اس بحث سے خارج تھا مگر پھر بھی منہ مارنے کی کوشش کرتا تھا۔ ناصر نے فیاضی سے جبکہ زہرہ نے باول ناخواستہ اجازت دے دی۔ میں نے اُس ہچکچاہٹ کا نوٹس لیا اور اُسے کہا کہ پھر تم کوئی نیا مترادف بنا دو۔ اس نے فوراً کہا 'اُگر مگر ولا' کیسا ہے Fiasco کے لیے۔ میں نے کہا اس سے بہتر تو 'مگر ولا' ہے۔ بحث ابھی جاری ہے۔ بچڑ کولا۔ پھنکارا۔ غرقاب۔ بگڑاس۔ الفلولا اور آنچھاس بھی تجویز کیے گئے مگر کوئی بھی Fiasco کو چھو کر نہیں گزرتا۔ Inset کہیں اور منتقل کیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ میں نے اپنے خیالی قاری/قارئین کے لیے، ایک افسانوی (خیالی) تحریر پیش کرنے سے پہلے ایک واقعاتی پس منظر تخلیق کرنے اور یوں کچھ از حد ضروری معلومات فراہم کرنے کا ارادہ کیا تھا اور کوشش بھی کی تھی۔ بلکہ یہ کوشش جاری ہے مگر لگتا ہے کہ زبان واقعے کو فتح نہیں کر سکتی بلکہ واقعہ زبان کو فتح کر لیتا ہے یا شاید یہ کہنا زیادہ درست ہو کہ دونوں میں سے

Scanned by CamScanner

کبھی ایک حاوی ہوتا ہے تو کبھی دوسرا۔ (جدلیاتی ترغیب یہاں بہت شدید ہے) (اگرچہ
جدلیات دن بدن متروک ہوتی جارہی ہے)

عجیب دن گزرے ہیں یہ پچھلے۔ چند دن تھے یا چند ہفتے اس کا بھی اندازہ نہیں۔ مگر مکمل ذہنی انجماد کا وقفہ تھا (جس کی جدلیات نامعلوم ہے۔ کم از کم میرے لیے) کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ کب ذہن چند لفظ جوڑنے سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ ایک گہرا سیاہ، ٹھنڈا خلا، سر میں بھر جاتا ہے۔ مگر دنیا ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ دنیا آج کل کیسی ہے۔ میں تو جیسے دنوں سے گھونسلے سے نکلا ہی نہیں۔ ہر روز یہ نیلا رجسٹر مجھے خوف زدہ کرتا ہے۔ عجیب احساسِ جرم میں مبتلا کرتا ہے۔ میں اسے کھولتا ہوں اور میرا سر بھورے پتھر کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔ پھر میں خوب کھاتا ہوں۔ خواہ مخواہ غسل خانے میں جا کر بیٹھا رہتا ہوں۔ ناصر، باقر مین، زہرہ آج کل کیسے ہیں کچھ علم نہیں۔ کیا عجب کہ میں اس ژولیدگی (بہت خوب) کے عالم سے نکل کر اس عالم میں یعنی گھونسلے سے باہر کی دنیا میں جاؤں تو ناصر، باف مین، زہرہ اور ہاں امیر جان کی جگہ نئے کردار آ چکے ہوں۔

مجھے کچھ نہ کچھ...... کچھ نہ کچھ...... کچھ نہ کچھ...... ہر روز...... ہر روز...... ہر روز...... لکھتے رہنا...... چاہیے...... چاہیے...... چاہیے...... چاہیے۔ کیا تکرار دیوانگی کی علامت ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب جانورستان (؟) اُن کے اس دور کی تحریری یادگار ہے جب کہ موصوف بتدریج ذہنی توازن سے محروم ہو رہے تھے۔

میں نے کچھ عرصے سے اس نشان کو ٹھوس خیالات کے ساتھ ساتھ ہوائی ہیجانات اور مائع کیفیات کے اظہار کے لیے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ ہاں جائز ہے۔ آخر خیالات، کیفیات، ہیجانات، میں کونسا ایسا بڑا فرق ہے۔ یوں بھی کون اب ریکارڈ سیدھا رکھنے کے لیے نئے نشان بناتا پھرے۔ مگر ریکارڈ بھی کیسا؟ مشقوں، ہشتی سرگرمیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ باکسر جو ہوائی مُکے چلاتا ہے۔ پہلوان جو نمائشی ڈنڈ بیٹھکیں نکالتا ہے۔ کھلاڑی جسم کو گرم کرنے کے لیے جو اُچھل کود کرتا ہے۔ ان سب کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا اور ان حرکتوں کے معیار کو جانچنے کا کوئی پیمانہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر میں نیلے رجسٹر میں اپنی ان تحریری یک بیک مشقوں کے دوران بھی اس واہمے کا شکار رہتا ہوں کہ یہ کسی معیار کی حامل ہیں / ہو سکتی ہیں اور کسی

واہیات تخیل کو دل میں جگہ دینے کا جواز فقط یہی ہے تو یہ محض میرے ذہنی دیوالیہ پن کی علامت ہے۔
ایک عجیب دیوانگی نے مجھے اندر سے ٹھوکر لگائی ہے۔ کہ میں نیلے رجسٹر میں...... جو چاہوں کروں لکھوں۔ جو بھی چاہوں لکھوں۔ جو بھی چاہوں لکھوں...... جو بھی...... جو بھی...... جو بھی...... یہ وہ ادب ہے جو اور کسی بھی انسانی آنکھ کے لیے، انسانی ذہن کے لیے نہیں۔ کوئی بھی دوسرا جو میرے ادب پر فیصلہ دے۔

فردِ واحد کا ادب۔ فردِ واحد کا فن، صرف خالق کے لیے خالق مخلوق، تخلیق، خلق، سب ایک ہو جائیں خلق اور جلق...... کیسا گہرا رشتہ ہے...... کیا ایک مخلوق کی مکمل خود کفالت خود اکتسابی ہے، اور مکمل طور پر حاوی ہو چکی ہے۔ مگر مخلوق تصورِ غیر سے عاری نہیں ہوتا۔ فردِ واحد کے جلقی ادب میں تصورِ غیر بھی خالق خود ہے۔ یہاں کچھ ایسا ہے جسے میں کبھی نہیں پار پایا، زبان کی گرفت میں نہیں لا پا رہا۔

شاید ایسا ہے کہ زبان پلٹ کر مجھے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ یہ کیفیت بھی اس سے آگے ناقابلِ فہم ہے۔ ابھی تک۔

نیلا رجسٹر ایک انجانی نجی دنیا ہے۔ ایک ایسا ادب جو صرف اور صرف میرے لیے ہے۔ مگر اگر یہ صرف میرے لیے ہے تو کاغذ کی سطح پر جو کہ غیر ہے اسے نشانات کی صورت اُتارنا کیا ضروری ہے۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ یہ ہے۔ میرے اندر کہیں۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے کوئی شک نہیں۔ مجھے کسی کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں۔ ایک لفظ لکھے بغیر بھی کوئی ادیب ہو سکتا ہے۔ ایک لکیر کھینچے بغیر بھی کوئی مصور ہو سکتا ہے۔ گہری خاموشی کا خالق سب سے بڑا موسیقار ہے۔

آج میں نے اُس اطلاع نامے کو جسے میں نے اس نیلے رجسٹر میں اپنی لذت کوشی کے لیے جاری کیا ہے شروع سے آخر تک پڑھا۔ کچھ عجیب خیال میرے ذہن میں آئے۔ کیسی دنیا ہوتی یہ اگر تحریر بھی گفتار کی طرح ہر لمحہ موجود میں تحلیل ہو جاتی (پھر وہ تحریر کہاں ہوتی گفتار ہوتی) پھر خیال آیا کہ کچھ ایسی صورت حال ہوتی کہ تحریر کے دائمی تحفظ پر پابندیاں عائد ہوتیں۔ تحریر کو سامنے لانے پر محرر کو وضاحت کرنا پڑتی کہ وہ کس عرصے تک کے لیے ہے اور پھر کب اُسے تلف کر دیا جائے گا گویا ہر تحریر کی Expiry Date ساتھ دینا شرط ہوتی...... یہ بھی پتہ چلا کہ اطلاع نامے میں بالحفظ اور حفظاً تحریری منصوبے میں نے شروع کیے ہیں۔ تھے مثلاً، خدائی فوجداروں کی ادب

Scanned by CamScanner

کی آخری آزمائش..... فکشن میں قاری کو ضروری معلومات فراہم کرنے کی علمیاتی چکر بازیاں (تحقیق نشاندہی) حقیقی دنیا کے حقیقی کرداروں کی افسانوی تجسیم...... اور اس حرکت کے بعد ایک خیالی زمان ومکان میں موجود خیالی قارئین کے لیے ایک خیالی تحریر ترجمہ/ افسانوی تخلیق..... اور پھر اس عزم پُر از دروغ کا اظہار کہ مذکور تحریر کے منصۂ شہود پر...... پر...... پھر...... پھر...... آنے کے بعد عمر رأسے زبان کے ساتھ اپنے رشتے/ رشتوں کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے استعمال کرے گا ان سب Quixotic ''لفظ بازیوں' کے پیچھے ایک ہی 'ذُبر پاش' خوف ہے قاری کا خوف۔ قاری جو میرا ازلی دشمن ہے اور خود ہستی میں ہے کہ تحریر ہستی میں ہے مگر اس کی ہستی ایسی کر یہ ہستی ہے کہ عدم سے خلق میں آنے سے پہلے ہی مجھے پھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

ورنہ زبان سے اپنے رشتے کی اصل کب مجھے معلوم نہیں۔ میں اسمائے صفت کا غلام ہوں اور زبان میرا وہ غلام باغ ہے جس میں جگہ جگہ نصب کیفیاتی فواروں میں سے صفات کے پانی چھوٹ چھوٹ کر نکلتے ہیں پھوٹ پھوٹ کر باہر آتے ہیں۔

کائنات اس قدر گیلی ہے پھسلوان، ڈھلوان، ہے کہ پاؤں کہیں، جتا نہیں۔ کھونٹا کہیں اکھتا نہیں۔ مدعلی کا اور میرا المیہ ایک ہے۔

چچ...... چچ...... گچ...... گچ...... غچ...... غچ...... تس...... تس...... چچ...... چچ......

چپ...... چپ...... گرچ...... گرچ...... چ۔

چپ...... مچپ...... چلپ...... شدب...... شراپ...... چیپ...... شرپ...... پپ......

چچ......

سامنے کی بات نمبر 1 تحریری خود لذتی کے لیے ڈائری (روزنامچے) سے بہتر کوئی پیرایۂ اظہار انسان نے ابھی تک ایجاد نہیں کیا...... سامنے کی بات نمبر 2 اس رجسٹر میں جس کا رنگ نیلا ہے ابھی کتنے ہی صفحات خالی ہیں اور خالی صفحات میرے دوسرے ازلی دشمن ہیں...... جب خیال ذہن میں آیا ہے...... خالی صفحات اصل میں قاری کے ہتھیار ہیں...... میرا قلم ایک آلۂ تحریر ہی نہیں ایک آلۂ تناسل بھی ہے...... سامنے کی بات نمبر 3 ان باقیماندہ صفحات کو 'بھر' دینے میں کیا حرج ہے۔

ایک عجیب واقعہ...... جو ابھی رونما ہوا۔ اگرچہ یہ اتنا بڑا واقعہ بھی نہیں کہ اس کے لیے

زیادہ کا لفظ استعمال کیا جائے مگر ہوا۔ میرا یہ میز جس پر نیلا رجسٹر اور یہ قلم باہم بجتے ہوئے ہیں۔ کا ازل اولڈ بکس شاپ کے سودے کی زد میں بھی رہتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کتابیں دائیں بائیں دھری ہی رہتی ہیں اور کاغذ اور قلم کی آزادانہ حرکت کو متاثر کرتی ہیں۔ کاغذ قلم کا آسن درست کرنے کے لیے میں نے رجسٹر کو حرکت دی تو جلد کے سخت گتے نے ایک بوسیدہ سی ڈکشنری کو دھکیل کر کھول دیا جو میز کے کونے پر پڑی رہتی ہے۔ میں نے دیکھا تو سیدھی میری نظر دو لفظوں پر پڑی اور دونوں ہی میرے ذخیرۂ الفاظ میں نہیں تھے۔ (اب ہیں) اور دونوں نے ہی فی الفور مجھے اپنی صوت اور معانی کے اسرار میں گرفتار کر لیا اور وہ الفاظ یہ ہیں۔

1- گیگلا۔ سادہ لوح...... بھولا...... احمق...... مورکھ......

2- گیلڑ...... پہلے خاوند کا وہ بچہ جسے عورت اپنے ساتھ دوسرے خاوند کے پاس لائی ہو۔

گیگلا گیلڑ...... گیلڑ گیگلا...... گیگلی...... گیگلا گیگلا...... گیلڑ گیلڑ...... گگ...... گگ...... گا......

گل...... گولا...... گال...... گیگلا...... گل...... بات کہیں بہت دور تک جاری ہے۔

سامنے کی آخری بات۔ صفحہ پلٹیں۔ مگر میں یہ صفحہ کل پلٹوں گا جب کل تقریباً گزرنے والا ہوگا۔ گیگلا۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(16)

نیلے رجسٹر کے مندرجات (2) روزنامچہ

18 اپریل:

آج جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اپنا اصل نام یحییٰ کبیر مہدی ترک کر کے ایک نیا نام اختیار کیا ہے مگر جسے میں صرف اپنی ادبی، افسانوی تحریروں میں استعمال کروں گا تو وہ کوئی خاص متاثر نہ ہوئے۔ ہاف مین نے بُرا سامنہ بنا کر کہا "تم پہلے بھی کئی بار اپنا نام ترک کر کے جعلی ناموں سے لکھتے ہو۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔ مگر جو نئی بات ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنے وعدوں سے پھر جاتے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہیں اندر کیفے کے باورچی خانے میں جمانے والی سردی میں جب عشق پر ہمارا آخری مکالمہ ہوا تھا تو تم نے آخر میں اعلان کیا تھا کہ تم اپنا عظیم ادبی کام اپنے اصل نام سے سامنے لاؤ گے"۔ میں گورے کی یادداشت اور میری عاجز ذات میں اس کی دلچسپی پر حیران ہوا مگر میں نے فوراً کہا۔ "عظیم ادبی کام کے لیے عظیم نام کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ نام اب مجھے ملا ہے۔" اس پر زہرہ کچھ زیادہ متجسس ہوئی اور پوچھنے لگی۔ "نام کیا ہے؟" "گیگلا۔" میں نے کہا۔ اس پر زہرہ اور ناصر بے ساختہ ہنس پڑے اور خوب ہنسے مگر ہاف مین ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی جرمن صوتیات میں گے،گ، لا، کہیں سے بھی کسی مزاحیہ ردِعمل کو انگیخت نہیں دیتا تھا۔ بلکہ وہ تو گیگلا کے، گے، سے ہم جنسیت کی جانب چلنے کو تھا۔ اس پر میں نے اُس پر لعنت بھیجی اور زہرہ نے بہت خوش ہو کر اور منہ بھر کر کہا "گیگلا۔ کیا مزے کا نام ہے۔"

ناصر ہنسا اور پوچھنے لگا "ظاہر ہے یہ لایعنی ہے اور تمہاری ایجاد ہے۔"

"ہرگز نہیں" میں نے جواب دیا، یہ بالکل بامعنی ہے اور ایک مستند ڈکشنری میں پایا

جاتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس کا" زہرہ نے پوچھا۔

"یہ کسی کا بھی Guess ہے۔ مگر ہر کسی کا نہیں۔ ہاف مین خارج ہے۔"

"ہاں ہاف مین خارج ہے۔" اُس نے جب یہ کہا تو سب اُس کے لہجے پر چونکے اور گیگلے کو بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ اتنی اُداسی سے شاید ہی کبھی بولا ہو گا۔ استفسار کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا پراجیکٹ غلام باغ سخت خطرے میں پڑ گیا ہے۔ سفارت خانے نے یونیورسٹی کو ایک زبردست خط لکھا ہے کہ یہ شخص جسے آپ لوگوں نے آثارِ قدیمہ پر تحقیق کرنے کے لیے بھیجا ہے اور خطیر وظیفہ دیا ہے، یہ شخص اپنا اصل کام کرنے کی بجائے بعض مقامی لوگوں کے مشکوک معاملات میں انتہائی خطرناک حد تک ملوث ہو چکا ہے۔ اس حد تک کہ بعض مقامی خفیہ ایجنسیوں نے اس کے بارے میں سفارت خانے سے استفسار کیا ہے۔ یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ صورتِ حال ہے۔ جس کا ازالہ دو صورتوں میں ممکن ہے۔ یا تو اسے کسی طرح راہِ راست پر لایا جائے اور سختی سے تاکید کی جائے کہ وہ مقررہ مدت کے اندر اندر اپنا تحقیقی کام مکمل کر کے یہاں سے رخصت ہو جائے اور مقامیوں سے اپنے مشکوک رشتے فوری طور پر منقطع کرے۔ (اس حوالے سے سفارتی عملہ پیش رفت کے لیے تیار ہے) دوسری صورت یہ ہے کہ یہ پراجیکٹ ہی فوری طور پر ختم کر دیا جائے اور ہاف مین کو واپس بلا لیا جائے............ اس دل سوز کلام کے سامنے آنے کے بعد میں نے گورے کو مشورہ دیا کہ اول الذکر صورت ہی مستحسن ہے اور یہ کہ وہ راہِ راست پر آ جائے اور ہم مشکوک مقامیوں سے اپنے مشکوک رشتے ابھی منقطع کرے اور وہ سامنے غلام باغ ہے وہاں جائے اور اپنی تحقیقی کھدائی کا کام کرے۔ مگر اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا اور کہنے لگا "نہیں۔ کبیر یہ سنجیدہ بات ہے...... ویسے مجھے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے نواب، کیا کہتے ہیں اُسے۔ نادر جنگ کا ہاتھ ہے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ گرزیوڈ کی شرارت ہو۔ کیونکہ ہمارے تعلقات اب تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ میں اس کے ساتھ آسٹریلیا نہیں جا سکتا۔ بھلا آسٹریلیا میں آرکیالوجسٹ کا کیا کام۔ وہاں کوئی انتھروپالوجسٹ جائے تو جائے ایب اور جنل قبیلے سے دوستی گانٹھے...... میں...... وہاں کہاں...... بہر حال......" "تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔" زہرہ نے پوچھا تھا اور اس نے منہ ٹیڑھا کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب امید کی ایک ہی کرن باقی ہے۔" "اور امید کی اس

Scanned by CamScanner

ایک ہی باقی ماندہ کرن کی وضاحت یہ سامنے آئی کہ..... ''دراصل فرسٹ سیکرٹری نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا اور پچھلے لان میں بیٹھ کر رم پیتے ہوئے اُس نے میرے ساتھ 'مین ٹو مین' گفتگو کی۔ ''دیکھو ہاف مین''..... اور یہاں پر اُس نے مجھے کچھ رپورٹیں دکھائیں۔ مگر پڑھنے کو نہ دیں۔ کہنے لگا 'دیکھو ہاف مین۔ مجھے پتہ چلا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم یہاں کسی سیکس کلب میں شمولیت کرتے رہے ہو۔' جواباً میں نے ہنس کر اُسے کہا جناب یہ ایک انتہائی روایتی قدامت پسند مذہبی معاشرہ ہے یہاں اس قسم کے ادارے کا تصور ہی محال ہے۔ 'نہیں وہ کوئی 'آل میل' کلب ہے یا تھا مجھے نہیں پتہ جہاں افروڈ ایزاک تقسیم کی جاتی تھیں۔ وہاں تم جاتے رہے ہو۔' تو کیپر میرے دوست مادام زہرہ اور ڈاکٹر ناصر۔ اس موقع پر میں نے گہرا سانس لینے کی کوشش کی تھی یعنی جتنا گہرا وہ جا سکتا تھا۔ پھر بظاہر لاپروائی سے اُسے بتایا کہ ہاں نواب جاوہ نادر جنگ..... جو بھی ہے ..... اُس کی انویٹیشن پر میں کچھ اس طرح کی پارٹی میں شامل ضرور ہوا تھا۔ مگر تو اب سے مجھے ورکنگ ریلیشنز قائم رکھنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ غلام باغ سے اُس کا تعلق بہت دلچسپ رہا ہے۔ یہ میری پیشہ ورانہ مجبوری ہے۔ یہاں پر ہیر شٹ نے میرے لیے ایک اور رم بنائی اگرچہ رم مجھے ناپسند ہے بہیں سے وہ دراصل 'مین ٹو مین' پر اُتر آیا کہنے لگا 'سُنو..... تو تم نے بھی کچھ لیا..... میرا مطلب ہے کوئی مسّی مرکب'..... ہاف مین نے یہ سارا قصہ بہت تفصیل سے سُنایا جس میں جگہ جگہ رم کے گلاس آتے جاتے رہے۔ مختصراً یہ بات سامنے آئی کہ فرسٹ سیکرٹری نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہاف مین کسی طرح مسّی مرکبات کے ذخیرے تک رسائی حاصل کرے۔ تاکہ اوّل تو فرسٹ سیکرٹری خود فیض یاب ہونے کے بعد طبقۂ انساء پر پل پڑے اور ثانیاً کچھ تیر بہدف مرکبات سمگل کر کے جرمنی بھجوائے جائیں اور انہیں پیٹنٹ کرا کے لاکھوں مارک کمائے جائیں۔ روایتی گیند اب ہاف مین کی کورٹ میں ہے اگر وہ ہیر شٹ کے منصوبے میں شامل ہوتا ہے تو پھر وہ جب تک چاہے جیسا چاہے غلام باغ پر کام کرے۔ بصورتِ دیگر لفتھانسا ائر لائنز جرمن باشندوں کے لیے بہترین ہوائی سفر مہیا کرتی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ ہاف مین کی بپتا تمام ہونے پر ہم تینوں کی نظریں بے اختیار زہرہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ کیونکہ مسّی مرکبات کا ذخیرہ ابھی تک مقفل ہے۔ یاور عطائی کے کمرے کو ابھی تک کھولا نہیں گیا۔ زہرہ نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا ''میری اپنے باپ اور اُس کے قبیلے سے محبت بڑھتی جا رہی ہے۔'' جواباً سب خاموش رہے۔

گویا ایک کامل اور بہت مدلل جواب تھا اور مجھے ایک انوکھی سطح پر کائناتی انصاف کا احساس ہوا۔ گویا عطائی کی وراثت حقیقی وارث تک پہنچ گئی۔ ''مردوں کو قابو کرنے والے شعبدوں کی مالک مردوں کو قابو کرنے والی ہی ہونی چاہیے۔'' مگر یہ ایک لمحاتی احساس تھا۔ جو گزر گیا۔ بات ادھوری ہی رہی۔ جب سب اُٹھ گئے۔ ناصر کو ہسپتال جانا تھا۔ ہاف مین نے اپنے دم توڑتے تعلقات والی کے پاس اور زہرہ نے اپنے جاسوس سراج دین کو اُس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد اپنے گھر جانا تھا (سراج دین اب ہمارے پاس ہی بیٹھ کر مزے سے چائے پینے اور زہرہ کی جاسوسی کا کام کرتا رہتا ہے۔) جہاں وہ اس وسیع و عریض عمارت میں اکیلی رہتی ہے۔ اکثر مجھے۔ میرے تصور میں آتا ہے کہ وہ وہاں کیسے رہتی ہوگی۔ اکیلی برآمدوں میں کمروں میں روشنیوں میں گھاس کے قطعوں میں کیسے گھومتی ہوگی اور وہ جو بتاتی ہے کہ وہاں اُس کی بلّیاں ہیں اور راج ہنس ہیں اُن سب کے ساتھ وہ کیسی نظر آتی ہوگی اور میں گھونسلے میں واپس آ کر روزنامچے کے پچھلے دن سے نیچے رجسٹر کے باقی ماندہ صفحات پُر کرنے کے لایعنی کام کو شروع کر رہا ہوں۔

میں آج کے دن کو بند کرنے والا تھا بلکہ کر چکا تھا کہ امداد حسین آ گیا اور مجھے بتانے لگا کہ آج پھر کچھ لوگ میرے بارے میں پوچھتے پھرتے تھے۔ پھر اُس نے مجھے بتایا کہ چھپائی کا اور بہت سا کام آ گیا ہے۔

19 اپریل:

پچھلے دو تین دن روزگار کی اُلجھنوں میں گزر گئے۔ میرا روزگار کہ 'لاکھائی' سے بندھا ہوا ہے۔ (لاکھائی، یعنی وہ لکھائی جسے میں تحریر نہیں مانتا اور نہ ہی اُس کی کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہوں۔ یہ لفظ آج تک میں نے کسی کے سامنے استعمال نہیں کیا اور نہ ہی کروں گا۔) ایسی اُلجھنیں سامنے لا رہا ہے کہ جن کا سامنا لکھاریوں کی اشرافیہ کو نہیں کرنا پڑتا۔ تین مختلف ناموں کے چیک اُسی صورت میں کارآمد ہو سکتے ہیں اگر انہیں ناموں کے اکاؤنٹ بنکوں میں کھلے ہوں اور انہیں ناموں کے شناختی کارڈ بھی ہوں۔ یہ سارا بندوبست جرم ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے اس لیے کہ میں صرف اپنی حق حلال کی کمائی کھری کرنے کے لیے اس بے ضابطگی کا مرتکب ہوتا ہوں۔ لیکن دو تین دن پہلے جب میں عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ کو

Scanned by CamScanner

ابن الہیثم کی طبیعیات کے بارے میں ایک بہت دلچسپ مضمون دینے گیا تو اُس نے مضمون تو لے لیا اور پیسے بھی دے دیے۔ چیک لینے سے میں انکار کر چکا تھا۔ اس پر اُس نے منہ منحوس انداز میں بگاڑتے ہوئے کہا کسی اور نام سے چیک دے دوں۔ ماشاءاللہ دو دو تین تین شناختی کارڈ ہیں۔ میں اُس کے لہجے پر چونکا کیونکہ ایک طرح سے اس صورتِ حال کا راز دان تو وہ پہلے سے تھا مگر پہلے اُس نے کبھی جتایا نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا ''کبیر مہدی صاحب کچھ لوگ آپ کے بارے میں پوچھتے پھرتے ہیں۔'' میں نے 'کچھ لوگوں' کے بارے میں خفیف سا تجسس بھی ظاہر نہ کیا بلکہ ٹھنڈے سے لہجے میں اگلے شمارے کے لیے کام کے بارے میں پوچھا۔ وہ کچھ مایوس سا ہوا مگر مجھے لگا کہ اندر ہی اندر پیچ و تاب بھی کھا گیا ہے۔ پھر اس نے کہا ''ہاں...... دماغ لڑائیے'' یا اس طرح کے کسی مناسب عنوان سے کچھ ریاضیاتی گتھیاں، معمے چیستان ٹائپ بنا دیں جیسی باہر کے سائنسی ٹائپ رسالوں میں چھپتی ہیں۔ عصری میں بھی یہ عنوان شامل نہیں ہوا مگر لوگ دلچسپی لیتے ہیں، میں نے صاد کیا پیسے طے کیے اور دماغ لڑاتا ہوا ہی عصری کے دفتر سے باہر آ گیا۔ مگر دماغ کی بجائے چھٹی حس نے بتایا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ پھر دماغ نے مشورہ دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم 'لا لکھائی' کے کچھ مزید بار آور چینلز تلاش کرو۔ چنانچہ میں نے مدتوں پہلے کی رد شدہ پیشکشوں کے بارے میں سوچا۔ پہلے تو میں کتاب مارکیٹ گیا اور کچھ درسی کتابوں کے خلاصے تیار کرنے کے آرڈر لیے۔ پھر میں نے ایک پرانے پروفیسر دوست کے گھر کا رخ کیا۔ ایک زمانے میں میں نے اُس کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسز 'تحقیق اور تحریر' کیا تھا۔ جس کے معاوضے کے طور پر اُس نے ایک سال تک مجھے خورد و نوش اور رہائش کی فکر سے آزاد کیے رکھا تھا۔ بعد میں وہ لیکچرار ہو گیا تو اُس نے بتایا کہ مناسب فیس پر تھیسز بنا دینے والوں کی انتہائی ڈیمانڈ ہے اور بندہ ملتا نہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہارے لیے کام کی لائین لگا سکتا ہوں۔ میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ کیونکہ انہی دنوں مجھے گھونسلہ اور چھپائی کا کام مل گیا تھا اور عصری کے ساتھ بھی رابطے استوار ہو رہے تھے۔ آج مدتوں بعد مجھے دیکھ کر وہ بیک وقت شرمندہ بھی ہوا اور خوش بھی۔ ایسی کیفیت کسی پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب وہ کسی ایسے شخص سے ملتا ہے جس سے بچپن میں کہیں لواطت کا تعلق رہا ہو۔ بہر حال اُس نے مجھے تین انڈوں کا آملیٹ کھلایا اور بتایا کہ 'کام' بہت ہے تم کرنے والے بنو۔ میں نے کہا ترجیحاً تاریخ، ادب، پولیٹیکل سائنس میں ہونا چاہیے ویسے عمرانی علوم سب ہی

بل سکتے ہیں۔ اُس نے کہا تم فکر ہی نہ کرو۔ پھر پیسوں کی بات ہوئی اور میں وہاں سے نکلا یہ سوچتا ہوا کہ یہ کام چل پڑے تو عصری پر لعنت ہی بھیجی جائے۔ پھر یہ تھیسز دھندا ایسا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی طرح طرح کا علم ساتھ مفت کا ملتا ہے۔ جس کی اگرچہ فقیر کو چنداں ضرورت نہیں مگر مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ واپسی پر حسبِ معمول پیدل ہی سڑکیں ماپ رہا تھا گویا بڑے شہر کی بڑائی کو پاؤں سے روندتا ہوا، تو وہی چند شکلیں پھر مجھے کہیں نہ کہیں نظر آ گئیں۔ میں نے اپنا رخ ناصر کے ہسپتال کی طرف موڑ لیا اور اُسے کہیں نہ کہیں نظر آنے والی شکلوں کے بارے میں بتایا۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا ''یہ تو...... پیرانویا کی علامتیں ہیں۔''

20 اپریل:

صبح اُٹھا تو بارش ہو رہی تھی۔ ایسی صبحیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور فوراً یہ احساس جاگ اُٹھتا ہے کہ زندہ رہنے کا کچھ نہ کچھ جواز تو بہر حال موجود ہے۔ پھر فوراً ہی یہ خواہش بھی جاگی کہ معلوم ہو کہ زہرہ اس بارش کو کیسا لے رہی ہے۔ پھر اس خواہش کے بعد اس تشویش نے سر اُٹھایا کہ ''زہرہ کیا سوچتی ہے۔'' میرا یہ سوچنا میری سوچ کے قابو سے باہر کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اس تشویش ناک سوال کا جواب تلاش کرنے کی خواہش مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں نیلے رجسٹر کا روزنامچہ اُٹھاؤں اور حال کے تسلسل میں اپنے آپ کو ریکارڈ کرتا جاؤں۔ میں یہ نام نہاد ڈائری رات کے وقت دن کے تمام ہونے سے پہلے لکھتا ہوں۔ کہ شاید یہی دنیا بھر کے ڈائری بازوں کا وطیرہ ہے۔ مگر آج اپریل 20 کی صبح۔ ہاں تو بج کر گیارہ منٹ پر اور اس سے آگے میں لکھتا چلا جاتا ہوں کسی زمانی مفروضے کے بغیر۔ ماضی اور مستقبل دو مفروضے ہی تو ہیں۔ ایک انوکھی خالص تحریر کی ہوس مجھے دیوانہ کر رہی ہے۔ جس میں..... اگلا فقرہ بھی مجھ سے بن نہیں رہا۔ کس قدر شدید ذہنی دباؤ ہے مجھے اس سے بچ نکلنا چاہیے۔ میں بارش میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔ آج میں۔ اس وقت میں تحریر کے جال میں بام مچھلی کی طرح پھسلتی پھسل کر نکل جانے والی ذہنی کیفیتوں کو جکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ کیفیت خود اپنے ہی قابو سے باہر ہے۔ دیوانگی میں کہیں ہے، نا قابلِ بیان کو بیان کرنے کی خطرناک کوشش جو لسانی توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔ زہرہ کے ساتھ میرا توازن بگڑ رہا ہے۔ بگڑ رہا تھا کوئی دس منٹ پہلے (اس) سے پہلے کہ میں یہ بھول جاؤں میں یہ لکھ دوں کہ تحریر۔ لکھنے کے عمل کے

Scanned by CamScanner

دوران محرر جو وقفے لیتا ہے۔ قلم ہاتھ میں لے کر جو خالی زور لگاتا رہتا ہے۔ وہ وقفے بھی پورے جہان ہوتے ہیں مگر کبھی تحریر میں ریکارڈ نہیں ہوتے ہستی کے بنڈلوں کی طرح۔ مگر گفتار میں گفتگو کرنے والا۔ خاموشی اور 'بے ذہنی' کی کیفیتوں کو چھپا نہیں سکتا اور ہا، آہ، اے اور کوئی نہ کوئی لایعنی جملہ 'تم جانتے ہو' 'میرا مطلب ہے۔' وغیرہ وغیرہ۔ اس ہستی میں بھر دیتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ سامع پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جبکہ تحریر میں ایسا نہیں ہوتا وہ ایک پاک صاف کی ہوئی چھانی ہوئی چیز ہے۔ یہ لفظ چیز مجھے اچھا نہیں لگ رہا اور اس کی جگہ اور کوئی لفظ ڈھونڈنا بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ میں نے بات کو اپنے ذہن کو کہاں سے توڑا تھا۔ ہے، اب یہ بھی ماضی میں چلا گیا چند لائنیں پیچھے۔ ہر لفظ حال ہے اور ہر لفظ اسی وقت معدوم ماضی، اور معدوم مستقبل ہے۔ پتہ نہیں یہ شیث میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔ ہاں تو میں نے نیلا رجسٹر اٹھایا تھا اپنے اوپر رنگ کو سیٹری لکھنے کے لیے۔ زہرہ۔ میں بستر میں ایسے بیٹھا ہوں جیسے یہ یوگا کا کوئی آسن ہو اور جبکہ میں یہ لکھتا ہوں لکھ رہا ہوں۔ (فعل حال، فعل حال جاری؟ بہر حال) تو باہر بارش جاری ہے۔ جس کی آواز۔ جب قطرے مکانوں کے پچھوں گلیوں کی اینٹوں اور عمارتوں کی چھتوں پر گر رہے ہیں تو ایک آواز مجھ تک پہنچتی ہے۔ جو بارش کی آواز ہے۔ میرا جسم ایک گرم نقطہ ہے جو اپنی ہی بو کے غبار میں۔ کوئی مجھے بتاتا ہے کہ بو کا غبار نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور یہاں ہونا چاہیے تھا۔ کتنا ذہنی دباؤ ہے۔ مگر اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرنا اور نیلے رجسٹر کو ایک طرف رکھ دینا اور بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ بہت مہلک ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں لکھ رہا ہوں۔ لکھ رہا ہوں۔ ہوں ...... او ...... ایک خیال آیا ہے یہ کیسی بات ہے۔ کیا یہ ضروری ہے۔ کہ کوئی تحریر۔ ہر تحریر۔ ہر قابل تحریر۔ ہر معلومہ اضافہ کی حامل تحریر کا کوئی مقصد بھی ہو۔ کوئی Goal بھی ہو۔ کوئی حاصل بھی ہو۔ آخر ایک بے مقصد۔ لاحاصل۔ بس تحریر صرف تحریر بھی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن میں ...... میں سوچتا ہوں کہ اس وقت جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے اور قلم جس طرح نیلے رجسٹر کے کاغذ پر ناچتا کودتا آگے جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے زہرہ ہے۔

زہرہ کیا ہے۔ میں نے نیا پیرا بنایا ہے۔ کیوں کہ اگر جو تھا اور ابھی نہیں ہے اتنی جلدی میں ...... اگر وہ جاری رہتا تو .... ؟ بہر حال ...... میں ایک انتہائی خطرناک صورت حال سے گزر رہا ہوں اور اگر میں نے ...... ٹھیک ہے میں زہرہ ...... بارش ہو رہی ہے۔ میں جسم کی گہری خوشبو میں لپٹا گرم شعور کا ایک نقطہ ہوں اور اس قدر شدت سے اپنے شعور سے آگاہ ہو رہا

ہوں۔ اپنے آپ سے۔ کہ خطرہ ہے کہ کہیں جل کر راکھ نہ ہو جاؤں ...... زہرہ ...... کیا میں آج تک ...... اس لفظ تک کے لکھنے تک ...... اپنے آپ سے جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ کیا میں اس عورت کے وجود کو ...... میں اپنی کیفیت کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ناکام رہتا ہوں ...... کئی لفظ میرے ذہن میں آ رہے ہیں۔ مگر کوئی بھی ...... میں استعمال کیے جانے والے۔ میرے ذہن میں جڑیں گاڑ چکے ہیں۔ میرا رواں رواں اُس کے لیے مضطرب ہے۔ (وقفہ)

یہ آخری فقرہ لکھنے کے بعد میں آگے جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ اس لیے یہ اب جو میں لکھتا ہوں تو یہ چند منٹ پہلے کا ماضی ہے۔ اس میں میں نے اُٹھ کر جگ میں سے پانی ایک گلاس میں ڈالا تھا اور پیا تھا اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ قدیم دانش کہ 'پانی پلاؤ' اپنے اندر کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور رکھتی ہے۔ یہ پانی۔ آتشی کیفیات میں پانی اپنی عناصر اربعہ میں سے ایک ہونے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ایک کائناتی ٹھنڈک ڈال دیتا ہے۔

پھر نیا پیرا بناتا ہوں۔ زہرہ —— ؟ بارش اب بھی ہو رہی ہے اور گھونسلے کی کتابیں فضا کی نمی سے متاثر ہو کر اپنی باس دینے لگی ہیں۔ پرانے بوسیدہ کاغذوں، جلدوں کی ایک مجموعی بو۔ جو مجھے اکثر "تنہائی" نہیں دیتی کہ میں اسی کا کیڑا ہوں۔ مگر ...... زہرہ نے مجھے شاید مختلف کر دیا ہے اور گھونسلے میں سے نکال کر وہ مجھے چار عناصر کی کائنات میں لے جاتی ہے۔ وہ کیا ہے۔ کیا میں اُس سے مباشرت کرنا چاہتا ہوں۔ فوری طور پر میرا ذہن کہتا ہے۔ میری جبلتیں کہتی ہیں۔ نہیں۔ مجھے ناصر اور ہاف مین کا خیال آتا ہے۔ عشق پر اُس ناممکن مکالمے کا خیال آتا ہے۔ جو اس مسلسل حال کی تحریر کی طرح ناممکن تھا۔ وہ عورت تین مردوں کو اُن کی اپنی اپنی وحدت سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ محض ایک دیوانے تھیٹر کا سین نہیں تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ آج کل اُس مجددات کے بعد۔ تینوں ایک بنا تین مرد اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی ایک بنا تین مردانہ شناخت کو مکمل کر رہے ہیں اور باقی دو بنا تین کی تکمیل کے بعد اپنی اپنی وحدت، اپنے آپ کو، اس عورت کے سامنے پیش کریں گے تاکہ وہ باقی دو کو اُس کی خاطر رد کر دے۔ اچانک مجھے خیال آتا ہے کہ میں اس عشق کے مسئلے کو، کہ جو میرے ...... ناصر اور اُس گورے اور یاور عطائی کی اُس بیٹی کے درمیان موجود ہے۔ اس کو سمجھنے کے کہیں بہت قریب ہوں۔ یہیں مجھے یہ پیرا ختم کرنا چاہیے۔

تو پھر میرے۔ میرا، مجھ میں، وہ کیا تھا صرف تیسرا حصہ جو اس ماں دیوی یا بہن دیوی جیسی

Scanned by CamScanner

عورت کو بھاتا ہے اور جب تک وہ مکمل نہیں ہو جاتا وہ ماں یا بہن کہ جن کے ساتھ مباشرت حرام ہے، ہی رہے گی۔ میرا وہ اصل کیا ہے اور ناصر کا وہ اصل کیا ہے اور ہاف مین کا۔ میں ناصر کے بارے میں سوچتا ہوں۔ تو...... تو دیکھو ابھی میرا ذہن یک دم کمرے کی لذیذ حرارت اور ٹھنڈک، اور اپنے ہی منہ کے ذائقوں سے بھر جاتا ہے اور ایک لمحے کے لیے زہرہ اور یہ سب سوال کہیں اور نکل جاتے ہیں۔

میں اس وقفے کو بیرا بدلنے کا جواز بنالیتا ہوں۔ میں پھر لکھتا ہوں۔ زہرہ اور ناصر...... یہ کیا میرے خیال میں آرہا ہے۔

کسی دلیل۔ کسی منطق۔ کسی جواز۔ کسی استدلال کے بغیر۔ زہرہ اور ناصر کا رشتہ غلامی کا ہے۔ اطاعت، محبوب (گو کہ یہ نقطہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا) کے سامنے کامل فنا کا رشتہ۔ تو کیا ناصر ان دنوں اس...... اس...... زہرہ کے روبرو۔ اس کے حضور...... مکمل غلامی کی تکمیل کر رہا ہے۔ تاکہ وہ اُسے اس فنا کے مقام پر قبول کرلے...... میں سوچتا ہوں۔ اس وقت بالکل اس وقت سوچ رہا ہوں۔ کہ شاید میں کسی صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں اور میں سوچتا ہوں کہ یہ اچانک جو میرے اندر اپنی دنیا کے لوگوں کے رشتوں کے اسرار وا ہونے کا سلسلہ چل پڑا ہے خواہ یہ لفظی واہمہ ہی کیوں نہ ہو اسے جاری رکھوں۔ کیا عجب کہ یہ کشف ابھی ختم ہو جائے اور میں ایک ایسی کیفیت میں ہوں کہ جیسے مجھے کوئی انوکھی روحانی یا شاید...... چھوڑو...... یہ ایک بخار جیسی کیفیت ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ ختم ہو جان لو کہ زہرہ اپنے دوسرے اور تیسرے ایک بنا تین مرد کے ساتھ...... میں کیا دیکھتی ہے۔

جیسے میں ہانپ رہا ہوں۔ جیسے مجھے خطرہ ہے کہ ابھی یہ 'وجدانی' انکشافی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ ابھی یہ ہے تو ہے۔ اس سے پوچھو...... ہاف مین اور زہرہ...... کوئی مجھے کہتا ہے...... کہ وہ...... سحر زدہ ہے۔ اس کے ساتھ...... ہاف مین کے ساتھ زہرہ کا رشتہ سحر کا ہے کوئی جواب دیتا ہے۔ سحر غلامی نہیں۔ مسحور...... عدم اور ہستی کے درمیان ہے۔ وہ سحر کے عدم کی لذت کو ہستی میں رہ کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہاف مین جادوگری کے جادو سے مسلسل مزہ لیتا...... نہیں یہ گھٹیا لفظ ہے۔ اس سے اکتساب...... نہیں...... جو بھی جیسے بھی اس رشتے کو بیان کروں۔ میں سمجھ گیا ہوں سمجھ رہا ہوں وہ ساحرہ کے سحر میں رہنا بھی چاہتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ جانا رہنا چاہتا ہے کہ وہ اس کے سحر میں ہے۔ گویا اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتا جبکہ ناصر...... تو کیا یہی فرق ہے...... مجھے لگتا ہے یہ انکشافی

تو بہ کا دوں والی دوڑ ہے۔ میں کسی جگہ گرا ہوں۔ ٹھوکر کھاتا ہوں۔ مگر پھر بھاگتا ہوں۔ بھاگو اپنی طرف...... اور پوچھو...... جو سب سے اہم ہے...... تمہارے لیے تم کیا ہو...... زہرہ...... میرے اندر کچھ ہے جو اس کے ساتھ ہر رشتے کو کسی بھی رشتے کو رد کرتا ہے...... مگر...... پھر اس دشمنی کے رشتے کو تسلیم بھی نہیں کرتا...... میں...... باغی...... جھٹلانے والا...... اور اُسے نہ ماننے والا...... اس پر ایمان لانے والا ہوں...... مگر میں...... اپنی بغاوت...... اس کے لیے اپنی بغاوت...... اُس کے لیے میرا انکار...... اُس کے لیے میرا جھٹلانے والا وجود...... اُسے تسلیم نہ کرنے والی میری یہ ہستی...... میرا عشق اسی اپنے ہی سب کچھ کے لیے ہے اور کیا وہ میرے اس ہی سب کچھ کے ایک باطن سے عشق کرتی ہے اور آخر...... اس کی تکمیل کیا ہو گی۔ جو میرے لیے اس جسم کی ممنوعہ حیثیت کو ختم کرے گی اور کیا میں واقعی ہی یہ تکمیل چاہتا ہوں کیا میں وہ بننا چاہتا ہوں۔ ان تینوں امکانات میں سے ایک جو زہرہ کے لیے قابل قبول ہیں...... میں نہیں جانتا...... میرا ذہن یک دم سے خالی ہو جاتا ہے۔ وہ کیفیت گزر جاتی ہے جو تحریری ہذیان کی ہے یا شاید کچھ اور ہے۔ ایک گہری تھکن میرے اوپر آتی ہے مگر آسودہ۔ جیسے طوفان گزر جاتا ہے۔ میرے جسم کا ہر ریشہ اتنا اجاڑ پڑ جاتا ہے...... مجھے یہ بارش...... بارش...... کی صبح ہے...... اور زہرہ اس لمحے بارش کی اس صبح کو کیسے جی رہی ہو گی...... قطرے گرتے ہیں ہوا کی آواز آتی ہے اور...... میں......

"......

رات گیارہ بج کر 20 منٹ...... ابھی ابھی میں نے یہ ہذیانی نثر پڑھی جو صبح بستر میں بیٹھے بیٹھے میرے اوپر طاری ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں بال بال بچا ہوں۔ اس ہذیان کے آخر میں میں گہری نیند میں چلا گیا تھا۔ بارہ بجے آنکھ کھلی تو رجسٹر میرے اوپر دھرا ہوا تھا اور قلم نیچے چادر میں گھسا ہوا تھا۔ بارش رک چکی تھی اور دنیا معمول کے مطابق تھی مگر میرے اندر کسی حیرت انگیز انداز میں تبدیل ہو جانے کا احساس تھا۔ جسے میں بہت کچھ سمجھتا ہوں اور بہت کچھ نہیں بھی سمجھتا۔ میں 20 اپریل کا روزنامچہ سونے سے پہلے پھر پڑھوں گا اور شاید بعد میں بھی مجھے اسے بار بار پڑھنا پڑے۔

بعد میں ہاف مین کا فون مجھے امداد حسین کی دوکان پر آیا جبکہ میں گھونسلے میں بیٹھا عصری ڈائجسٹ کے لیے ریاضیاتی معمے بنا رہا تھا۔ "دماغ لڑائیے۔" امداد حسین حسب معمول گرتا پڑتا مجھے بتانے آیا کہ کسی۔ اسی آپ کے دوست انگریز کا فون آیا ہے۔ میں ہنسنے گیا۔ انگریز چاہتا ہے

Scanned by CamScanner

کہ سب کسی دن بیٹھیں، فرسٹ سیکرٹری والے معاملے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ کچھ مشورہ کرنا ہے مجھے لگتا ہے کہ اب یہ معاملات کسی پُر تشدد اختتام کی طرف بڑھ رہے ہیں یا ہو سکتا ہے یہ میری Wishful سوچ ہو۔ بہر حال اگلے چند دنوں میں کچھ نہ کچھ سامنے آئے گا۔ (کیا عطائی کا کمرہ کھولا جائے گا) بہر حال..... آج پروفیسر نذیر کا فون بھی آیا۔ مجھے یہ خوش خبری سنائی۔ کہ دو ایم فل کے اور دو پی ایچ ڈی کے تھیسس لکھوانے کے گاہک مل گئے ہیں۔ تم کمر کس لو۔ میں نے اُسے بتایا کہ میری کمر کثرتِ بہاؤ کی وجہ سے دائمی درد کی حالت میں ہے۔ وہ دوسری طرف ہنسا اور کہنے لگا کہ تم شادی کر لو۔ یعنی شادی اور بے شادی میں صرف بہاؤ کا فرق ہے۔ بہر حال یہ اچھی خبر تھی۔ میں کل پروفیسر کے پاس جاؤں گا اور دیکھتا ہوں کہ کرائے کی تحقیق و تحریر کے لیے کون سے موضوعات ہیں۔ آخر بعض طوائفیں بھی گاہک کے انتخاب میں Selective ہو سکتی ہیں۔ کوئی ایسا موضوع چُنتا ہوں جس میں کچھ مزہ بھی آئے۔ یعنی پیسے کے علاوہ..... دوبارہ پڑھتا ہوں اور پھر سوتا ہوں۔

21 اپریل:

آج پروفیسر نذیر کی طرف جانا تھا۔ گیا اور ساتھ وہی تین چار شکلیں جو میرے گھونسلے سے نکلتے ہی مناسب فاصلوں پر رہ کر میرے ساتھ ہی دن بھر کے سفر پر گامزن ہو جاتی ہیں۔ آج بہت مزہ آیا یقیناً انہیں علم ہے کہ میرے پاس سواری نام کی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی کسی سواری کو کرائے پر حاصل کرتا ہوں۔ اس لیے وہ بھی پیدل ہی ہوتے ہیں۔ مجھے یک دم جو ترنگ آئی تو ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہو گیا اس بات کا مزہ لیتا کہ وہ پیچھے تلملا رہے ہوں گے اور ہو سکتا ہے آج ڈیوٹی ختم ہونے پر رپورٹ دینے پر انہیں اپنے افسر اعلیٰ سے ڈانٹ بھی پڑے۔ میں نے بہر حال ٹیکسی پروفیسر نذیر کے گھر تک لے جانے کی بجائے ناصر کے ہسپتال کے سامنے چھوڑ دی اور ناصر سے ملا۔ اس کی صبح کی ڈیوٹی ختم ہوئی تھی اور اُس کے پاس کافی وقت تھا۔ میں نے اُسے شکلوں کا ماجرہ سنایا تو اُس نے کہا کہ یہ پیرانویا کا آغاز نہیں لگتا بلکہ نگرانی کا آغاز لگتا ہے۔ میں نے عاجزی سے عرض کیا کہ اتنی عقل خدائے ذوالجلال نے مجھے بھی دی ہے۔ مگر یہ کیسی نگرانی ہے؟ کون ہیں نگرانی کرنے والے۔ کیا یاور عطائی مرحوم و مغفور کی بیوہ اور پسران عالی مرتبت ہیں یا کوئی حساس ادارے وغیرہ میری غیر حساس ذات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ناصر نے کہا کچھ ایسا ہی معاملہ لگتا ہے۔ لیکن اگر

یہ سب تو پھر ہم سب ہی نگرانی کرنے والوں کی نظر میں آ چکے ہوں گے۔ لیکن فی الحال انہوں نے تمہیں ٹارگٹ بنایا ہے۔ کیونکہ تم سب سے زیادہ مشکوک ہو۔ میں نے اس عزت افزائی پر ناصر کا شکریہ ادا کیا پھر ہم شک، شکوک، مشکوک، اشتباہ، وغیرہ کی آفاقی تھیوری کو ملکی، غیر ملکی اور بین الاقوامی منظروں میں رکھ رکھ کر سر دھنتے رہے۔ ناصر کا خیال تھا کہ جو امر مجھے سب سے زیادہ مشکوک بناتا ہے وہ میرے قلم کا بے ضمیرانہ استعمال ہے جس میں دائیں اور بائیں کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ''تم دراصل ایک قلمی دہشت گرد ہو'' اُس نے کہا۔ جواباً میں نے خوش ہو کر ناصر سے کہا کہ تم آج اُس طرح کی باتیں کر رہے ہو جو کبھی تم یاور عطائی سے پہلے کی دنیا میں میرے ساتھ کیا کرتے تھے۔ یعنی اچھی خاصی بک بک۔ یاور عطائی کے حوالے پر میں نے دیکھا کہ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا جو کہ ظاہر ہے فی الفور اُس کے شعور میں عطائی کی دختر نیک اختر زہرہ نامی کے ظہور کے سبب سے تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں ناصر کو کل میں جس ہذیانی تحریری اُبال کی کیفیت سے گزرا تھا اور جس کے دوران میرے اوپر زہرہ، ناصر اور زہرہ ہاف مین کے تعلق کے جو اساطیری مطلع اُترے تھے۔ اُس پر اُسے اعتماد میں لوں۔ پہلے تو میں کچھ ہچکچاتا رہا اور چائے پیتا رہا پھر میں نے اُسے بتایا۔ اُس نے زہرہ کے ساتھ اُس کے غلامی اور فنا کے رشتے پر میرے مکاشفے پر گہری خاموشی اختیار کیے رکھی۔ پھر اچانک اس نے مجھے بتایا کہ پیرانائیڈ عورت کی آج .E.C.T کی گئی یعنی دماغ میں بجلی کے جھٹکے لگائے گئے۔ میں نے کہا کہ اتنی جنرل سائنس میں بھی جانتا ہوں کہ .E.C.T کیا ہوتا ہے مگر میں نے اپنی یہ حیرت اُس کے سامنے ظاہر نہ کی کہ یہ کیا ہے یہ پیرانائیڈ عورت کا ذکر کہاں سے بیچ میں آ گیا ایسے جیسے ہم بات ہی اس موضوع پر کر رہے تھے۔ حالانکہ بات زہرہ کی ہو رہی تھی اور میرے مکاشفے کی ہو رہی تھی۔ اگلی بات اُس نے بہر حال اسی بارے میں کی اور مجھ سے سوال کیا ''گورے کے ساتھ سحر کا تعلق زہرہ کا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا مطلب؟ وہ اس کے حُسن اُسکی شخصیت سے مسحور ہے؟ اُسے ملکہ سبا تو کہتا ہے۔ مگر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' میں ہنسا اور کہا میرے عزیز یہ ذہن سے آگے پیچھے کی باتیں ہیں۔ ذہن سے دائیں بائیں کی باتیں ہیں اور میں تو دائیں بائیں دونوں کے تقدس کو پامال کرتا ہوں۔ پتہ نہیں وہ ایک کیفیت تھی جو کل صبح بیدار ہونے پر..... یہ ادراک ہونے پر کہ باہر دنیا میں بارش ہو رہی ہے میرے اوپر طاری ہوئی تھی اور میں نے اُسے من و عن قلم بند کر لیا..... یا یوں کہو کہ

قلم بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی نزول کی کیفیت تھی جو انزال جیسی ہی ہوتی ہے۔ بہر طور، میرا ذہنی ہیجان زہرہ کے بعد کی ہماری دنیا کی طرف بھٹک گیا اور مجھے علم ہوا کہ عشق پر ناممکن مکالمہ آخری نہیں تھا۔ تو جو ظاہر ہوا تمھیں بتا دیا...... مگر...... اگر میں اب سوچوں یعنی بقائمی ہوش وحواس، اگر چہ میں کسی لمحے بھی اپنے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا...... تو مجھے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہاف مین کی ٹائپ نشے باز کی ٹائپ ہے اور نشہ بھی اصل میں سحر کی ایک قسم ہے۔ گویا ملکہ سبا کے نشے میں مبتلا ہے اور نشے والا میں سمجھتا ہوں کبھی فنا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عام تصور ہے۔ بات ذرا پیچیدہ ہے مگر دیکھو۔ نشے والا ایک سطح پر قائم و دائم رہتا ہے۔ ایک چٹانی سطح پر قائم رہتا ہے اور وہیں سے اپنے عدم قیام کے رقص کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ اپنے ہی رقصِ دیوانگی کا تماشائی بھی ہے۔ اپنے آپ کو اپنے سامنے نچاتا ہے اور مزے لیتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو نشے کا مخصوص شعور ہی ناممکن ٹھہرے۔ بات ناصر کی کچھ سمجھ میں آ گئی۔ کہنے لگا دلچسپ بات ہے۔ مگر کہیں؟ یہاں وہ مضطرب ہو گیا ایک...... اپنی پیشہ ورانہ اغراض کے ساتھ۔ "کیا دیوانگی میں بھی کچھ ایسا ہی تو نہیں ہوتا کہ دیوانہ بھی ایک سطح پر محفوظ ہوتا ہے اور وہیں سے اپنا تماشہ دیکھتا ہے۔" میں نے کہا نہیں یہی تو مسئلہ ہے۔ "دیوانہ اصل میں وہ محفوظ مقام ہی کھو بیٹھتا ہے۔ مگر یہ بات کہیں اور نکل جائے گی۔" ناصر نے کہا "ہاں یہ تو ہے مگر...... تو تم کہو گے کہ ہاف مین زہرہ کا نشہ کرتا ہے۔" میں نے کہا، یہ "ایک نازک صورت حال کو بہت گنوار اور غیر جمالیاتی انداز میں کہنے کے مترادف ہے۔ یوں کہو کہ وہ اپنے آپ کو اس کے سحر اس کے تحیر کے حوالے کر دیتا ہے اور عادی ہو گیا ہے اور اس رات اس منجمد کر دینے والی رات کیا یہ سامنے نہیں آیا تھا کہ تحیر ہی عشق ہے۔" "اس رات کے حوالے پر بھی ناصر کچھ دہلنے کی کیفیت میں آیا اور بولا اور میں منتظر ہوا کہ بات کسی واضح انکشاف کی طرف شاید جانے لگی ہے مگر پھر مایوسی ہوئی جو وہ بولا وہ اور بھی مبہم تھا "تو وہ رات بھی کسی حوالے سے آخری رات نہیں تھی۔" اس کے اس فقرے پر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے مکالمے پر مزید بک بک کی گنجائش نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے ساری صورت حال کو اور بھی لایعنی بنانے کے لیے کہا۔ "دفع کرو یہ ساری میری ذہنی پراگندگی۔ شاید پیرانو یا سے پہلے اس طرح کے Episodes آتے ہوں گے۔ ویسے میں کہوں کہ زہرہ کے بعد کی دنیا عناصر اربعہ کی دنیا ہے۔ اگر زہرہ آگ ہے۔ یہاں میں یک دم اُلجھ گیا مگر کیا وہ آگ ہے یا مٹی ہے۔ پانی اور ہوا تو وہ ہرگز نہیں۔ ہم چاروں میں سے کون کیا

ہے۔ یہ Who is Who کا معاملہ ہے اور ناصر ہنسا اور میں نے شکر کیا کہ ہم ایک اور ذہنی انتشار سے بچ گئے مگر اچانک ناصر نے کسی وارننگ کے بغیر وار کیا۔ "تم یہ بک بک میں سے اپنے ہر مخمصے میں سے اپنے آپ کو صاف بچا لے جاتے ہو۔ یہ الہام تمھیں نہیں ہوا؟ کوئی وجدان تمھیں ہوا کہ تمہارا کیا تعلق ہے؟ اس عناصر اربعہ کا جو تم نے نیا شوشہ چھوڑا ہے اس شوخی زبان میں ہی کچھ کہو......" "کچی بات ہے مجھ سے بات بن نہیں رہی تھی۔ مگر میں نے کچھ اس طرح کی بکواس کی کہ میں پانی اور مٹی سے مل کر بننے والا کیچڑ ہوں۔ جسے ہوا خشک کرتی ہے اور آگ پختہ کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ...... پھر میں نے بات کو اس زلزلہ زدہ خطے سے نکال لے جانے کے لیے کہا...... "دراصل ناصر میاں یہ سب کچھ بہت ہی راتوں کا کیا دھرا ہے مگر یاد ہے عطائی کے ڈرائنگ روم کی وہ رات جس میں تم نہیں تھے وہ ویلڈا۔ ویلڈا تم نہیں جانتے اندھیری اور بڑی رات کو کہتے ہیں اور وہ میری موجودہ انتہا کے پیچھے ہے۔ بعض راتیں ممنوعہ نظاروں کی راتیں ہوتی ہیں اور ایسے نظر بازوں کو دنیا معاف نہیں کرتی۔" "تو کیا خصی کلب؟" ناصر نے پوچھا۔ میں نے کہا "لعنت بھیجو سب پر۔ آج کی گفتگو کا حاصل وہ خطاب ہے جو تم نے مجھے دیا یعنی قلمی دہشت گرد اور میں اس قلمی دہشت گردی میں تخلیقی دہشت گردی کا اضافہ کرنے والا ہوں۔" پھر میں نے اُسے پروفیسر زیڈ کے پراجیکٹ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ میں اُسی کی طرف جا رہا تھا مگر پہنچ اِدھر گیا اور اب ایسی بک بک کے بعد اُدھر جانے کا بھی یارا نہیں۔ ناصر اور میں اکٹھے ہی ہسپتال سے نکلے اس نے اپنی موٹر سائیکل لی اور مجھے کہیں جا اتارنے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول نہ کیا اور پھر مجھے شدید حیرت کے لمحات سے گزرنا پڑا وہی تینوں شکلیں پھر مختلف جگہوں پر نظر آ رہی تھیں۔ کمال ہے میرے منہ سے نکلا۔ کیا ہوا ناصر نے پوچھا۔ "وہی" میں نے کہا۔ "کہاں" اُس نے پوچھا مگر شاید وہ بھانپ گئے تھے اس لیے اس سے پیشتر کہ میں ناصر کو بھی ان کے چہرے کراتا وہ ادھر اُدھر ہو گئے۔ یہیں تھے۔ ایک اُدھر کھمبے کے پاس دوسرا اس بس سٹاپ کے قریب اور تیسرا اُس جنرل سٹور کے قریب مگر غائب ہو گئے۔ ناصر نے ایک دفعہ پھر مجھے اُن نظروں سے دیکھا جنھیں میں خوب پہچانتا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ "جاؤ گھر جاؤ۔ ابھی میرا پاگل پن شروع نہیں ہوا۔" ناصر کچھ کہے بغیر چلا گیا اور میں فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ اچانک ایک اور مضحکہ خیز خیال میرے ذہن میں آیا اگر میں ایک دم فٹ پاتھ پر دوڑنا شروع کر دوں تو کیا وہ بھی میرے پیچھے بھاگنے لگیں گے اور پھر

Scanned by CamScanner

فوراً ہی میں نے اپنے اس ارادے کی جانچ کرنے کے لیے عملی اقدام کیا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ راہ گیر لوگ یقیناً ناصر کی نسبت زیادہ یقین سے میری ذہنی صحت کے بارے میں رائے قائم کر رہے تھے۔ میں نے گھوم کر دیکھا ان میں سے کوئی بھی کہیں نہیں تھا۔ میں رُک گیا تو حیرت سے اور بھی وہیں کا وہیں رُک گیا۔ وہ عین میرے سامنے تھا اور اپنی جیپ گاڑی میں سے نکل کر باہر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا میرا پرانا مہربان امبر جان............

میں نے مکمل نظر انداز کر کے۔ گویا کہ بالکل پہچانا نہیں۔ آگے بڑھ گیا اور ایک گونہ اطمینان سا ہوا کہ یہ تو معاملہ سادہ سا لگتا ہے۔ یعنی وہی رقابت...... ایک بے ساختہ قہقہی کیفیت میرے اندر بھر گئی۔ مگر کیا یہ صرف اتنی سادہ بات ہے۔ آخر...... اچانک مجھے یاد آیا۔ اس دن ایڈیٹر عزیز از جان مجھی ثم الثاقب نے بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ یہ بھی تو کہا تھا: "کبیر مہدی صاحب کچھ لوگ آپ کے بارے میں پوچھتے پھرتے تھے۔" اور اگر یہ پوچھنے والے امبر جان کے ٹھگ ہی ہیں۔ تو پھر یقیناً اُسے علم ہوتا اور وہ مجھ سے یہ سوال نہ کرتا۔ پھر سوچا، ضروری تو نہیں امبر جان رسالے والے کو ہر معاملے میں اعتماد میں ہی لے اور پھر اُدھر زہرہ کی ماں اور بھائی بھی تو ہیں کیا عجب امبر جان سے مل کر مشترکہ کھچڑی پک رہی ہو۔ عجیب بات ہے یہ میں لکھ تو رہا ہوں۔ کھچڑی۔ مگر اس وقت فٹ پاتھ پر چلتی چلتی سوچوں میں بھی جبکہ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا کا ہر انسان مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ لفظ کھچڑی ہی میرے ذہن میں آیا تھا اور یہ لفظ ایک طرح سے ایک لسانی نعمت کا نزول تھا کہ اس سے اگلا خیال مجھے خوراک کا آیا اور میں حیران رہ گیا یہ جان کر کہ اصل میں زندگی کا کوئی بھی لمحہ اور سب لمحے ملا کر کتنے آسان ہیں۔ میں نے جانا کہ میں فوراً بہت اچھا پکا ہوا اور بہت زیادہ گوشت کھانا چاہتا ہوں اور اس وقت ہستی کے اور کوئی دوسرے معانی ناپید تھے۔ میں نے جیبیں ٹٹولیں۔ اتنی رقم بہرحال موجود تھی کہ زندگی کو فوری طور پر بامعنی بنانے میں کام آتی۔ اسی وقت میں اندرون بڑے شہر اس جگہ گیا جہاں ایسا لحمیاتی طعام بنانے کے ماہرین موجود ہوتے ہیں۔ میں نے کھایا گوشت اور اس قدر کھایا کہ لوگ باقاعدہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے کہ یہ انسان ہے یا حیوان۔ دنیا کو بار بار اپنے معاملات میں ملوث کر کے مجھے خوشی ہوئی۔ گھر کی طرف چل پڑا۔ سایہ کرنے والی شکلیں پھر نظر نہ آئیں۔ میں نے سوچا زہرہ سے کچھ باتیں کھل کر ہوں گی۔ ہاف مین بھی تو چاہتا تھا لیکن

ابھی وہ بڑے شہر پہنچا نہیں۔ اس کے پہنچنے پر کچھ ہو گا۔ گھونسلے میں پہنچا تو امداد حسین نے عجیب رازدارانہ راز داری سے کہا "وہ کبیر صاحب کسی لیڈی کا فون آیا تھا۔" مجھے حیرت ہوئی "کیسی لیڈی۔ لیڈی اور مجھے...... کیا مطلب......" "جی ہاں میرا بھی یہی خیال تھا شاید رانگ نمبر تھا پوچھا بھی کسی اور کا تھا عجیب نام تھا۔" "کیا نام پوچھا تھا۔" میں نے پوچھا کہنے لگا "عجیب تھا ٹھگا نہیں ٹھگا۔ گیدا۔ عجیب۔" اور پھر یک دم ایک قہقہی انبساط میرے اندر بھر گیا "ٹھگا" میں نے قہقہی تمتماہٹ سے کہا اور امداد حسین نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے پوچھا "تو کیا آپ......" "ہاں میں ہی ٹھگا ہوں۔" میں نے کہا اور اُڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ آخر میرا نمبر...... میرا ابھی کیا...... مجھے سکالرز اولڈ بکس شاپ کا نمبر زہرہ کو کہاں سے ملا...... اور آخر میں بیٹھ گیا آج تک سلسلہ جنبانی۔ روابط انسانی کے اس ارزاں وسیلے سے مستفید کیوں نہیں ہوا اپریل کی نیم گرم سہ پہر اور پیٹ میں حلق تک ٹھنسی ہوئی خوراک...... ایک وحشیانہ خمار اور پھر ایک وحشیانہ نیند...... اٹھا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ نہایا چائے کے پیسے نہیں تھے نیچے سے چائے اُدھار منگوائی اور دو فیصلے کیے ایک تو یہ کہ کل کا دن معقولیت سے گزارنا ہے۔ پہلے ایڈیٹر مصری کے پاس جا کر دماغ لڑا دینے کی تین قسطوں کے پیسے لینے ہیں اور پھر پروفیسر نذیر کے پاس جا کر جیمس ورک کا کوئی مناسب سودا طے کرنا ہے۔ یہ احساس بعض اوقات ہولناک ہو جاتا ہے۔ کہ زندگی کے بامعنی مکمل لمحوں اور میرے درمیان فقط چند ہزار دو ہزار سے ہزار روپلی کا فاصلہ ہے۔ رات کے 2 بج رہے ہیں۔ ایک معقول دن کے انتظار میں۔ کل تک بلکہ صبح تک۔

22 اپریل:

رات کے تین بجے۔ اس لیے اصل میں تو یہ 23 اپریل ہی ہے۔ بہرحاصل 22 ہو یا 23 کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر فرق یہ پڑا ہے کہ اس وقت میرا دماغ ایسا ہے کہ جیسے بھک سے اُڑا ہوا ہو۔ بلکہ پچھلے چودہ گھنٹے کے مسلسل پڑھنے کے عمل کے دوران کئی بار بھک بھک سے اُڑا اور پھر نیچے آ گیا۔ آنکھوں میں جلن ہے اور پانی بھی بہہ چکا ہے۔ مگر جو کچھ میں نے اس کے دوران پڑھا۔ اس نے میرا آج کا دن معقولیت سے گزارنے کا خواب درہم برہم کر دیا اور یہ سارا وقت خوفناک غفلت کے عالم معقولیت میں گزر گیا...... ہوا یوں کہ میں صبح حوائج ضروریہ وغیرہ ضروریہ سے فارغ

Scanned by CamScanner

ہونے کے بعد معقولیت کی پہلی منزل یعنی دفتر عصری ڈائجسٹ کی جانب روانہ ہونے ہی والا تھا کہ بڑھا امداد حسین چھانٹی، چھانٹی، کرتا سیڑھیاں چڑھتا گھونسلے میں گھس آیا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں بالکل چھانٹ چکا ہوں اور کچھ وصولیاں کرنے جا رہا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میں ابھی ایڈوانس وصولی اُس سے کروں اور چھانٹی کروں جو زیادہ نہیں ہے۔ ابھی میں بچ نکلنے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے خاموشی مکمل رضا، جانتے ہوئے باہر نکل کر لڑکے کو آواز دی اور تھوڑی دیر بعد ہی کوئی پانچ چھ سو کتابوں کی کھیپ گھونسلے میں پہنچا دی گئی۔ جو اتنی زیادہ بہرحال نہ تھی اور میں نے کام کوئی تین گھنٹے میں مکمل کر لیا اور اسی چھانٹی کے روٹین کام کے دوران وہ غیر معمولی کتاب میرے ہاتھ لگی جس نے میرے پہلے سے بے سکون سکون کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ میں نے کوئی فزکس کی ٹیسٹ پیپر ٹائپ چیز کو اُس کی جگہ تک پہنچایا تھا اور پھر جب اگلی کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا وہ میرے ہاتھ آ گئی اور اُس کی جلد کو دیکھتے ہی میری نظریں وہیں جم گئیں۔ ہزار ہاتھوں اور نسلوں کی کتابوں کے ہاتھوں اور نظروں سے گزرنے کے بعد اب جلد کے نظارے سے ہی کتاب کی اصلی عمر جاننے کی صلاحیت دماغ میں پیدا ہو چکی ہے۔ اُس کی بھُربھُری جلد اور اوپر ایک خاص انداز سے چسپاں نیلا کاغذ یہ نشانیاں اُس کی عمر کو انیسویں صدی کے کہیں وسط میں ٹھہرا رہی تھیں۔ چھانٹی کے تقریباً میکانکی عمل کے درمیان یہ بھی کبھار رُک کر ذہنی توجہ مرکوز کرنے کا ایک لمحہ تھا۔ لیکن ابھی یہ محض ایک تجسس تک محدود تھا۔ میں نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا باہر کچھ درج نہ تھا جلد پوش پہلا صرف کتاب کا ٹائٹل درج تھا اور مصنف کا نام۔ اندرونی صفحات پر عجیب منتشر سا چھپا تھا کہیں باریک ٹائپ میں کہیں موٹا کہیں لائنیں سیدھی کہیں ٹیڑھی اور کئی جگہوں پر سیاہی پھیل کر لفظوں کو چھپا رہی تھی۔ 'بدخطی' کے مقابلے میں یہ 'بدچھپائی' کا نمونہ تھا۔ جیسے آزمائشی طور پر چھپائی چیک کرنے کے لیے کوئی چیز چھاپی جائے۔ کاغذ کی قسم سے اُس کی قدامت کا اندازہ ہوتا تھا اور میرے حساب سے انیسویں صدی کے وسط آخر کا تھا۔ موٹا اور بھورا جو اُس زمانے کی کتابوں میں ملتا ہے، کتاب کا ٹائٹل البتہ میری کسی فوری دلچسپی کا حامل نہیں تھا۔ '' ہند میں ایک مشنری کے اعترافات'' میں نے سوچا اس میں یقیناً کسی انگریز پادری نے اعترافاتِ گناہ کی آڑ میں مسیحیت کا پرچار کرنے کی کوشش کی ہوگی چنانچہ میں نے لاپروائی سے کتاب کے اندر اِدھر اُدھر جھانکا یہ سوچتے ہوئے کہ بہرحال اسے پرانی کتابوں میں بالکل بے قدری سے تو نہیں بک جانا چاہیے بلکہ اسے

کسی ہنگی ادارے کو تحفہ دیتے ہیں۔ کہ اچانک میری نظر ایک دو ایسے الفاظ پر پڑی کہ میرا ماتھا ٹھنکا اور پھر ماتھا ہی نہیں ماتھے کے اندر کے طبقات بھی ٹھنکتے چلے گئے۔ یہ الفاظ تھے '' ٹھگ ..... ٹھگ ..... بھوانی ..... سفید رومال ..... اور پھر جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ انیسویں صدی کی ابتدا سے گورا راج میں ٹھگوں کی حشر سامانیوں سے جنم لینے والی ایک حیرت انگیز کتاب ہے ٹھگ اور ٹھگی ... کئی برس پہلے ایک دفعہ اس موضوع نے مجھے اپنی طرف کھینچا تھا اور جرائم کی تاریخ میں یہ لوگ مجھے انتہائی منفرد اور ممتاز مقام پر فائز نظر آئے تھے۔ جو کچھ بھی اس موضوع پر معلوم اور میسر تھا وہ میں نے پڑھ ڈالا تھا مشہور زمانہ میڈوز ٹیلر کی، ایک ٹھگ کے اعترافات، فینی پارکس، اور بج، ولیم سلیمن اور جارج بروس سے لے کر لطف اللہ کی آپ بیتی تک جو کچھ ملا پڑھ ڈالا۔ مگر اب یہ پادری ریورینڈ جیک میکنازکیا اعتراف کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی ٹھگوں کے بارے میں۔ پھر مجھے سخت حیرت اس بات پر ہوئی کہ تاریخ کے اس لرزہ خیز باب کے بارے میں بہت سوں نے لکھا مگر ان پادری صاحب کا حوالہ کسی نے بھی نہیں دیا۔ گھونسلے میں دن کا ایک بج رہا تھا اور روشن دانوں سے دھوپ گزرتی موجودہ صدی کی کتابوں کی دیوار پر گر رہی تھی۔ مگر میرا ذہن گزری صدی کی ایک تاریک رات میں تھا۔ میں امیر علی ٹھگ کے گروہ کے ہمراہ تھا۔ بدری ناتھ، حسین بخش، ارجن سنگھ، رحمت خان .... گنگا کے کنارے پڑاؤ ڈالا گیا دریاں بچھی تھیں سوداگر بیچے ہماری حفاظت میں بہت لطف اٹھا رہے تھے۔ دن بھر سفر جاری رہتا اور رات راگ رنگ کی محفل ہوتی۔ مگر ہر سفر ایک دن تمام ہوتا ہے۔ بدری ناتھ نے کہا آج بھوانی سے شگون لیا جائے گا۔ ہم سوداگروں کے گروہ کو چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے جنگل میں گئے۔ امر ناتھ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر بلند آواز میں کہا بھوانی اے ملکہ کوئی نشانی دے سوداگروں کو تیری بھینٹ چڑھایا جائے۔ پھر گہرا سناٹا چھا گیا اور ہم انتظار میں پہر کھڑے رہے۔ پھر دور ایک درخت سے اُلو بولا۔ اس سے اچھا شگون اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہم نے نعرہ لگایا جے بھوانی۔ جے بھوانی۔ بھوانی تیری فتح ہو۔ رات رات پہلے سے بھی زیادہ پُر تکلف ہوئی۔ کھانے کے بعد ہم پندرہ ٹھگ پندرہ سوداگر بچوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ میران بخش لڑکا بڑی سُریلی آواز میں گا رہا تھا اور سب مست ہو رہے تھے سوائے ہمارے۔ پھر رات کافی گزر گئی۔ سوداگر نیند کے غلبے میں آنے لگے۔ ہم سب نے نظروں ہی نظروں میں اور ہاتھ کے اشاروں سے اپنی خفیہ زبان میں بات کی کہ بھوانی کی دیے کا لمحہ آن پہنچا

Scanned by CamScanner

ہے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا 'پانی لاؤ' اور ایک ہی لمحے میں چندرہ سفید ریشمی رومال لہرا کر سوداگروں کے سروں کے اوپر لہراتے ہوئے ان کی گردنوں میں حمائل ہوئے اور موت کے پھندے بن گئے۔ میرے سامنے کریم الہٰی تھا اور پچھلے چند دنوں میں ہی میرے ساتھ بہت محبت کرنے لگا تھا اور بار بار خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ 'جنگل تک اُس سفر میں اُسے مجھ ایسا بہادر سردار اور اس کے دلیر ساتھی ہم سفر مل گئے اور اُن کا سفر محفوظ ہو گیا۔' میں نے جی میں کہا لے اب تجھے بھوانی کی حفاظت میں دیا اور رومال کو زبردست مروڑا دیا اور وہ مرغ بسمل کی طرح پھڑ پھڑ کنے لگا۔ پھر میں نے اُس کے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور اُس کی گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز آئی۔ جو آواز مجھے ایسے موقعوں پر بھوانی کے مندر کی گھنٹیوں جیسی بھلی لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں پیچھے کو کھلی ہوئی میری آنکھوں میں اُتر رہی تھیں۔ میں نے اُس کا لاشہ ایک طرف گرا دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف لاشے پھڑک کر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ سب کچھ بہت ہی صفائی اور خوش اسلوبی سے سرانجام پایا تھا۔ یقیناً بھوانی ہماری مددگار تھی۔ پھر گڑھا کھودا گیا اور لاشے دبا کر اوپر مٹی ڈالی گئی تھی۔ اوپر آگ جلائی گئی اور وہ دن ہم نے اس جگہ کے اوپر قیام کیا۔ مٹی سخت ہوئی راکھ پھیل گئی۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نیچے کالی کے شکار دفن ہیں.......... میں نے پادری ریورینڈ جیکب میکلنائر کی کتاب ابھی کھولی بھی نہیں تھی۔ مگر برسوں پہلے کے اس ہولناک مطالعے سے اُٹھ کر آنے والے خونی مناظر میرے ذہن میں ایک ہی سوال پیدا کر رہے تھے کہ پادری اپنی اس کتاب میں گردنوں کے منکے ٹوٹنے کی موسیقی اور سفید لہراتے رومال کی موت کے رقص کے علاوہ اور کیا دکھائے گا۔ کیا کہے گا اور پھر ایک پادری اور پھر اعترافات۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اُس گزرے زمانے سے یوں اچانک نمودار ہونے والی تحریر سے جو نہ صرف بُری چھپائی بلکہ جگہ جگہ غلط املا سے بھی پُر تھی براہِ راست ملاقات کی جائے۔ چنانچہ میں نے ایڈیٹر عصری اور پھر پروفیسر نذیر کی طرف جانے کے ارادے موقوف کیے، کپڑے بدلے، امداد حسین کو بلوا کر چھانٹی شدہ کتابیں اُٹھوائیں اور چائے کا ایک کپ حلق میں انڈیل کر بستر میں گھس گیا اور پادری صاحب کے ساتھ ان کے اعترافات کے سفر پر چل پڑا۔ یہ سفر چودہ گھنٹے جاری رہا اور اس وقت رات کے چار بج رہے ہیں اور میرا دماغ زن زن کر رہا ہے۔ مگر جو کچھ میں نے پڑھا ہے وہ اس قدر حیرت انگیز ہے کہ اُسے ابھی۔ اُس کے مجموعی تاثر کو اُس کی روح کو۔ خلاصے کو۔ ابھی جب کہ میں اُس کے سحر میں گرفتار ہوں پکڑنا ضروری

ہے تا کہ بعد میں کہیں میرے کام آئے۔ یہ سفر ٹھگوں کی سفاک، بے رحمانہ قتل و غارت گری کی داستانوں سے کہیں زیادہ بھیانک تھا کیونکہ یہ پادری صاحب کے اپنے ایمان دھرم اور بالآخر ذہن اور عقل و خرد کی تنگی اور موت کا سفر تھا۔ جیکب میکلنائر اس زمانے میں اپنے مشنری مقاصد کی تکمیل کی خاطر ہند آیا تھا جبکہ گوروں نے ٹھگوں کے خلاف زبردست مہم شروع کر رکھی تھی۔ چنانچہ ہمارا پادری ٹھگی کے ان تمام واقعات اور اُن کی تفصیلات سے آگاہ ہوتا ہے جس نے اس زمانے کی مہذب دنیا میں خوف و دہشت کی لہر دوڑا دی تھی۔ ان واقعات کو پادری دہراتا ہے اور ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ مگر سکاٹ لینڈ کا یہ پادری مذاہب کے تقابل کا بہت سنجیدہ طالب علم بھی تھا۔ وہ مذاہب کے باہمی تقابل سے جنم لینے والی صورت حال کا گہرا مطالعہ کرنے کا بھی بہت شوق رکھتا تھا اور یقیناً اُس کی یہ دلچسپیاں اور فکری ترجیحات اُس کے پیشہ ورانہ کام میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہوں گی۔ جلد ہی پادری کے لیے یہ امر گہری دلچسپی کا باعث بن گیا کہ ٹھگوں میں برصغیر کے دونوں عظیم مذاہب کے ماننے والے یعنی ہندو اور مسلمان دونوں ہی برابر شامل ہوتے تھے اور بحیثیت ٹھگ ہندو مسلم کی کوئی تمیز۔ کوئی اختلاف۔ کوئی جھگڑا سرے سے موجود نہیں ہوتا تھا۔ میکلنائر کے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ یہاں وہ اس خیال کا اظہار کرتا ہے اور سابقہ تجربات کا حوالہ دیتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ مسیحیت کا سچا خدائی پیغام لے کر جب میں افریقہ کے ساحلوں تک گیا تو کالوں نے اُسے قبول کیا مگر یسوع مسیح کے پیغام پر ایمان لانے کے ساتھ وہ اپنے باطل چھوٹے موٹے کالے بھجنگ دیوتاؤں اور جنگل کی ارواح کو بھی پوجتے تھے۔ مگر وہ تو غیر مہذب قدیم ناپختہ مذہبی شعور کا معاملہ تھا اور یہاں اُس صورت حال کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں تو بہت ہی ترقی یافتہ مذہبی شعور کے حامل ہندوؤں اور مسلمانوں کا سوال ہے جن کے بنیادی تصورات بھی یکسر مختلف ہیں۔ مسلمان موحد ہیں جب کہ ہندو کثرت اصنام کے پیروکار ہیں۔ میکلنائر سامی مذاہب اور ہندومت کے حوالے سے ایک لمبی عالمانہ بحث کرتا ہے جس میں سینٹ آگسٹائین، افلاطون، ارسطو، اوپنشاد، ابن سینا تک کے حوالے آتے ہیں۔ مگر بالآخر دیکھا جائے تو صرف ایک سوال صرف ایک سوال پادری مذکور کے ذہن میں پھنس جاتا ہے اور جلد ہی اُس کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے اور یہ وہ مقام بھی ہے جہاں کہ چھپائی کی بے ترتیبی اور اغلاط قاری کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ ٹھگ بھوانی کے پجاری تھے جو ہندومت میں تباہی

اور موت کی دیوی ہے۔ (یہاں وہ ٹھگی اور بھوانی کا اساطیری روایتی پس منظر بھی بیان کرتا ہے۔)
ٹھگ کالی سے ہی شگون لیتے تھے اور اپنے پیشے میں فتح و کامرانی کے لیے اس کے نام پر قربانی دیتے
تھے۔ ظاہر ہے ایک ہندو ٹھگ کے لیے تو یہ سب کچھ قابلِ فہم ہے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے۔ (یا
کم از کم پادری میکنائر کے لیے یہ حیرت انگیز بات بن گئی) کہ ایک مسلمان اور باقاعدہ پکا مسلمان
شرع شریعت پر پکا ایمان رکھنے والا پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان بھوانی پر پوری والہانہ مذہبی عقیدت
اور روحانی جوش و خروش سے کیسے ایمان لا سکتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی انسان مختلف مذاہب کی
اعلیٰ اخلاقی اقدار اور روحانی سچائیوں پر ایک مجموعی یقین کر لے۔ مگر کیا یہ ممکن ہے وہ کہتا ہے کہ
مثلاً "میرا خدا مجھے معاف کرے کہ میں کلیسائے مقدس کی لازوال سچائیوں پر کامل ایمان رکھنے
کے ساتھ ہندو موت کی ایک مکروہ خونی دیوی پر بھی ایمان لے آتا۔ میرے خدا یہ کیسے ممکن ہے۔"
پادری کے الفاظ یہاں اُس کی شدید ذہنی اذیت اور روحانی خلفشار کی عکاسی کرتے ہیں اور ایک پُر
اثر مگر ہیجانی منتشر انگریزی نثر کی شکل اختیار کرتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اناڑی چھاپے
خانے کا انتشار اس صورتِ حال میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہاں وہ میڈوز ٹیلر کی مشہور زمانہ 'ایک
ٹھگ کے اعترافات' کا حوالہ دیتا ہے اور ٹھگ سائیکی پر ٹیلر کی حیرت سے اتفاق کرتا ہے۔ ٹیلر یہ
سوچتا رہتا تھا "کہ دنیا کے آغاز سے ہی انسان ایک دوسرے کو قتل کرتے آئے ہیں، خواہ اس کی وجہ
نفرت ہو یا حسد، محبت، انتقام، رقابت یا خوف۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ قاتل کا ضمیر اُس کو ملامت کرتا
ہے اور وہ سزا سے بچ بھی جائے تو بھی اپنے نفس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن ٹھگ عجیب
لوگ ہیں، ان کا ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتا۔ اگر انہیں قید کر دیا جائے تو جی بھر کے کھانا کھاتے
ہیں، باقی اسیروں کو اپنے کارناموں کی داستان سُناتے ہیں اور اس بات پر تیار رہتے ہیں کہ جیل
سے چھوٹتے ہی دوبارہ اپنے کام میں لگ جائیں گے۔ ٹھگوں کے بارے میں سب سے عجیب بات
یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ مل کر چلتے ہیں اور ایک ہی قسم کے توہمات میں مبتلا ہیں۔
ہندوؤں کے ہاں تو چلیں دیوی پوجا کی سمجھ آتی ہے لیکن مسلمانوں کا اس عمل کو اختیار کرنا انتہائی
ناقابلِ فہم ہے۔ خصوصاً ایسے مسلمان جو نماز روزے کی بھی پابندی کرتے ہوں۔ ان کے قرآن
میں تو جان بوجھ کر قتل کرنے کی زبردست ممانعت ہے۔ امیر علی اور اس کا باپ دونوں باشرع
مسلمان ہیں، نماز روزہ کی پابندی کرتے ہیں مگر دونوں ہی نہایت بے رحم قاتل ہیں۔ قید خانہ کا

حافظہ کہتا ہے کہ امیر علی اچھا آدمی ہے، شکل سے ہی شریف نظر آتا ہے۔ مذہبی اقدار کی پابندی کرتا
ہے۔ محرم میں مرثیہ پڑھتا ہے، نماز کبھی قضا نہیں کرتا، رمضان کے روزے رکھتا ہے اور آخرت کی
فکر کرتا ہے۔ لیکن اگر واقعتاً دیکھا جائے تو وہ ایک قاتل ہے جس کے سامنے دُنیا کے تمام قاتل ہیچ
ہیں۔" پادری میکنائر جب ٹیلر کی اس روحانی پریشانی سے متفق ہوا تو اُس کی کتاب کا سب سے بڑا
کردار امیر علی اور اس کے کئی ساتھی 'جے بھوانی' کے نعرے لگاتے پھانسی کے تختے پر جھول چکے تھے
اور ٹھگی کا غلبہ بظاہر ختم ہو چکا تھا۔ یہاں میکنائر کسی ماہرِ عمرانی علوم کی طرح اس خواہش کا اظہار کرتا
ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں کسی بچے کھچے ٹھگ سے ملاقات کرے گا اور مندرجہ ذیل معمے حل کرنے کی
کوشش کرے گا۔

(الف) ٹھگ ذہن کیا ہے۔ اس کی ساخت کیا ہے۔ وہ عمل کیا ہے۔ کہ جو عظیم مذاہب کو مسخ کر
کے ہولناک جرائم کے ارتکاب کو عین مذہبی فرائض کی پُرعقیدت انجام دہی بنا دیتا ہے۔

(ب) انسانی ضمیر کی قوت کی صداقت کیا ہے۔ کیا یہ کوئی آفاقی عمل ہے۔ مذہب سے اس کا رشتہ
کیا ہے۔

(ج) کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ٹھگ اصل میں ایک الگ مذہب ہو۔ ایک طرح کا ٹھگ مت اور اس
کے پیروکار اصل میں دکھاوے کے ہندو یا مسلمان ہوں۔ اپنے اس مفروضے کے حق میں
پادری پھر ٹیلر کی کتاب میں سے حوالہ دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں امیر علی کے باقاعدہ
ٹھگ بننے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ وہ پہلے بھوانی سے شگون لیتا ہے اور بعد میں قرآن
شریف پر بھی قسم کھاتا ہے اور اس کا والد اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے "بیٹا آج سے تم اس
گروہ میں شامل ہوئے ہو جو دنیا کا قدیم ترین مذہبی فرقہ ہے۔ تم نے وفادار، بہادر اور
راز دار رہنے کی قسم کھائی ہے۔ آج سے تم بنی نوع انسان کے دشمن ہو اور ہر شخص کو
بلا پس و پیش ہلاک کر سکتے ہو۔"

(د) عقلی اور منطقی تضادات تو بیک وقت ساتھ ساتھ ذہن میں معلق پڑے رہ سکتے ہیں مگر مذہبی
اختلافات کس طرح اس حالت میں رہ سکتے ہیں۔ ذہن کی شکست و ریخت کے بغیر۔

(ذ) کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ ٹھگوں کی شناخت کے انتہائی خفیہ ہونے کی باتیں سب
نامعقول اور جعلی ہی ہوں۔ اصل میں ٹھگ مقامی بااثر لوگوں، حکمرانوں، نوابوں،

Scanned by CamScanner

جاگیرداروں، رئیسوں کے پروردہ رہے ہوں اور سب وارداتیں اُن کی شراکت داری میں ہوتی رہی ہوں۔

(ر) ایک مہلک امکان، مفروضہ کہہ لیں میرے ذہن میں آتا ہے اگر مسلمان اور ہندو (نام کے ہی سہی) کا بھائی کی ہستی میں ادغام ہستائی کا ڈھنگ دیتا پیدا کرتا ہے تو کیا ایک ہستی کے لیے بھی ایسے کسی اختلاط کا امکان موجود ہے اور اس کے نتیجے میں کیسی ہستی سامنے آئے گی؟

غالباً یہ مؤخرالذکر ہلاکت خیز مفروضہ ہی تھا۔ جس کو پرکھنے کی خواہش اور باقاعدہ عملی کوشش نے ریورنڈ جیکب میکنائر کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا۔ کیونکہ اس مقام پر بدنصیب پادری کا مربوط منضبط کلام اختتام پذیر ہوتا ہے اور اس کے بھائی سیموئیل میکنائر کا اضافہ شروع ہوتا ہے۔ سیموئیل میکنائر جو ویسٹ اینڈ لندن میں ایک چھاپہ خانے کا مالک تھا اپنے بھائی جیکب کا ہند سے خط وصول کرتا ہے۔ جس میں جیکب اُسے بتاتا ہے کہ وہ اس موسم گرما میں انگلستان واپس نہیں آ سکے گا کیونکہ وہ جنگل کے موضوع پر تحقیق میں اُلجھ گیا ہے۔ مزید تحقیق کافی وقت لے سکتی ہے۔ مزید اس کی طرف سے سیموئیل کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اس تحقیق و تصنیف کو چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر خوش دلی سے کہتا ہے کہ ایک چھاپہ خانے کا مالک بھائی ہونے کا یہ فائدہ تو ہے کہ انسان کچھ بھی چھپوا سکتا ہے۔ مگر پھر فوری اس یقین کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں کبھی کچھ تو کبھی بھی نہیں چھپوایا جا سکتا اور پھر عجیب بات کہتا ہے۔ کبھی کچھ تو ہاتھ سے لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ کبھی کچھ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ پھر جیکب مبہم سے انداز میں سیموئیل کو بتاتا ہے کہ وہ ایک لمبا سفر شروع کرنے والا ہے جس میں اُسے کئی مقامات پر جانا ہوگا اور کئی لوگوں سے ملنا ہوگا۔ اس سفر سے جو کچھ حاصل ہوگا اور جو کچھ میں نے اب تک لکھا ہے اس میں سے میرے پیارے بھائی ہم آئندہ برس ایک کتاب بنائیں گے۔ سیموئیل گہرے دُکھ سے لکھتا ہے کہ وہ آئندہ برس نہ آیا اور جیکب اور میں ذی ہوش انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے ہم کلام نہ ہو سکے۔ مجھے انڈیا آفس میں سے اطلاع دی گئی کہ ریورنڈ جیکب میکنائر دماغی توازن کھو بیٹھا ہے اور اُسے گریٹ آرمیڈا نامی بحری جہاز پر سوار کرا کے واپس وطن بھیجا جا رہا ہے۔ اُس کا سامان اُس کے ہمراہ ہے۔ اُسے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پلیمتھ کی بندرگاہ پر جہاز کی آمد کے موقع پر موجود رہے اور بھائی کو وصول کرے۔ سیموئیل آگے لکھتا ہے کہ اُس کا بھائی اس وقت لندن کے بدنام زمانہ پاگل خانے میں ہے۔ اُس کے سامان میں اس کے ہاتھ سے لکھے کئی

پلندے تھے۔ میں نے اس کی خواہش کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش اس طرح کی ہے کہ جو باب ابھی تک مربوط و منضبط شکل میں سامنے آئے ہیں اُن کی محض اپنی نجی کمپوزیشن بنالی ہے۔ صرف ایک چھاپہ خانے کا مالک ہی ایسی عیاشی کر سکتا ہے۔ باقی جو کچھ مجھے جیکب کے کاغذات میں سے ملا ہے۔ وہ ناقابل فہم ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے۔ کہ وہ بتدریج ناقابل فہم ہوتا چلا جاتا ہے۔ تاریخیں ملتی ہیں۔ پہلے پہلے اُن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے سے بہت سے لوگوں کے نام اور جگہوں کا ذکر آتا ہے۔ پھر ایسے اشارے ملتے ہیں کہ جیسے جیکب میرا پیارا بھائی کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے اور پھر ایسے اشارے ملنے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ پھر تاریخیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور الفاظ ٹوٹ پھوٹ کر ایسے ہونے لگتے ہیں۔ جیسے یہ کوئی نئی زبان پیدا ہو رہی ہو۔ جو کہ میرا خیال ہے کوئی بھی زبان نہیں ہے۔ بلکہ میرے پیارے بدقسمت بھائی کی ذہنی شکست و ریخت کی مہمل آوازیں ہیں۔ اس کے بعد سیموئیل میکنائر نے نمونے کے طور پر ان مہمل آوازوں کو بھی کمپوز کر کے دو تین صفحات میں پیش کر دیا ہے یا کہنا چاہیے کہ محفوظ کر لیا ہے۔ ان مہمل الفاظ میں کہیں کہیں اچانک کچھ الفاظ بامعنی ہو جاتے ہیں کچھ اشارے، نام، اشخاص کے، جگہوں کے۔ مگر کہیں بھی اصل نام سے نہیں، بلکہ اس طرح...... وہ جس کے ماتھے پر کالا تل ہے۔ جس کا دانت آدھا ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ جو موتیوں کی مالا پہنتا ہے۔ وہاں جہاں کھجور کے گھنے درختوں میں عبادت گاہ ہے۔ وہاں جہاں خون جلد سوکھتا نہیں، وہاں جہاں شیطانی زینوں سے نیچے جاتے ہیں۔ (جہاں تک میرے دماغ کے بھک سے اُڑنے کا تعلق ہے تو شیطانی زینوں کے اس اچانک حوالے سے یقیناً ایسا ہی ہوا۔ مگر یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں وہ جمّ کھنڈر کے زینے ہوں جو غلام باغ میں ہیں۔ وہ کوئی بھی اور زینے ہو سکتے ہیں اور میکنائر کا مخبوط ذہن کیسے شیطانی کہتا ہے، کوئی نہیں جانتا) آخر میں سیموئیل میکنائر لکھتا ہے کہ وہ اپنی اس نجی چھپائی کو اس انتظار میں محفوظ رکھ رہا ہے کہ جب اُس کا بھائی صحت یاب ہو جائے گا تو پھر اس پر نظر ثانی کر کے جس طرح بھی چھپوانا چاہے گا چھپوالے گا۔

یہ سب کچھ لکھنے میں ایک گھنٹہ ضرور گزر گیا ہے۔ اس وقت رات کے پانچ بج رہے ہیں اور نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں مگر ابھی اچانک مجھے خیال آ رہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ سب تحریر محض لایعنی اور کوئی بہت بڑا مذاق ہو کیونکہ اگرچہ کاغذ پچھلی صدی کا ہے۔ مگر کوئی بھی کتاب اس بھدے انداز میں چھاپی نہیں جا سکتی۔ سیموئیل میکنائر نے اپنے چھاپہ خانے کا نام اور سن کہیں

Scanned by CamScanner

نہیں لکھا۔ پھر خیال آتا ہے کہ اگر ریورینڈ جیکب میکفائر جعلی ہیں تو کسی جعلی چھاپہ خانے اور جعلی سن اشاعت کو بھی چھپائی میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ پھر اچانک مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ بھی تاریخ سے آنے والی ایک لاتحریر ہے بلکہ غیر تاریخ سے آنے والی غیر تحریر۔ کچھ اسی قسم کا تماشا اور اس کی حیثیت رہی ہے جو میرے اس نیلے رجسٹر کے مندرجات کی ہے۔ نثری مشقیں یا روزنامچہ یا کسی کا ذاتی ریکارڈ، پھر خیال آتا ہے کہ چھپائی بھی تو ہے اور چھپائی کسی بھی تحریر کو ایک ناقابل تردید دوام دے دیتی ہے۔ نیند کے باوجود میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگتا ہے اور پھر سوچنے کی بات ہے کہ اگر ریورینڈ جیکب میکفائر نامی کوئی پادری واقعتاً ان ایام میں یہ سب حرکتیں کر رہا ہوتا تو ناممکن ہے کہ تاریخ میں۔ تحقیق کی تاریخ میں۔ بلکہ تحقیق کی تاریخ نویسی میں کہیں اُس کا ذکر نہ آتا۔ تو نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ یہ کسی انیسویں صدی کے ناکام انگریز رائٹر بننے کے شائق، مگر چھاپہ خانے کے مالک کا کام ہے جو ویسے تو صاحب کتاب نہیں بن سکتا تھا مگر اس طرح ایک عدد کتاب اُس نے چھاپ کر اپنے پاس رکھ لی اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوگا۔ جیسے میں یہ سب خرافات لکھ لکھ کر۔ بلکہ اب تاریخ وار لکھ لکھ کر پاس رکھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں کہ ہاں اس حد تک کہ کچھ وقت گزر جاتا ہے۔ یقیناً اس دور میں تحقیق کے واقعات نے انگلستان میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی تھی اور کچھ نہ کچھ لکھنے کی حسرت میں مبتلا کسی بھی شخص کے لیے اس موضوع میں بہت دلچسپی رہی ہوگی۔ اس لیے یہ کتاب۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ ایک بات یقینی ہے کہ اس انوکھی کتاب کے انوکھے پن کے بارے میں لکھنا شروع کرتے وقت میرے جو نظریات و تاثرات تھے وہ کافی حد تک زائل ہو چکے ہیں۔ اور اب صرف یہ خیال باقی ہے کہ اگلے دن میں دن چڑھے تک۔ بلکہ دن ڈھلے تک سوتا رہوں گا اور ایڈیٹر اور پروفیسر دونوں سے کاروباری امور کے بارے میں معاملات جوں کے توں رہیں گے۔ مگر کیا ہو سکتا ہے۔ میرا ایک لاابالی پوائنٹ پن دم توڑ رہا ہے۔ یہ آدھی لائنیں سُرخ بال پوائنٹ سے لکھ رہا ہوں اور اس رجسٹر میں اب تقریباً آدھے صفحات بھرنے رہ گئے ہیں، وہ سرخ روشنائی سے ہی بھرتا ہوں۔ سُنا ہے انگلینڈ ڈیوماڈول کال روشنائی سے لکھتا تھا، ڈرامہ سُرخ سے۔ اور شاعری سبز رنگ سے۔ چلو اسی بہانے ایک چھوٹا موٹا انگلینڈ آف ٹاپ بننے میں کیا حرج ہے۔

OOO

باب (17)

نیلے رجسٹر کے مندرجات۔ 3

(روزنامچہ۔ سُرخ روشنائی سے لکھا ہوا)

23 اپریل:

رات بارہ بجے۔ یہ وہ دن ہے۔ وہ ایک دن جو ساری عمر پر حاوی ہوتا ہے اگر میں شاعر ہوتا تو کہتا وہ دن جو پوری زندگی پر ابدیت کی طرح چھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر آج وہی دن ہے۔ ہوا یہ کہ گذشتہ رات پانچ بجے بالآخر جب میں وہ حیرت انگیز تحقیق اور حیرت انگیز چھپائی کا شاہکار ایک طرف رکھ کر سونے لگا تو امید تھی کہ اب دن بھر کی نیند میں تحقوں کے ڈراؤنے خواب دیکھوں گا اور، اور کچھ نہیں تو کم از کم بے چارے پادری جیکب میکفائر کی زیارت تو ضرور ہی کر لوں گا۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا وہ ایک بے خواب مکمل سیاہ پردے والی نیند تھی جس سے بیدار ہونے پر خود بیداری پر حیرت ہوتی ہے۔ بہرحال بیداری کے بعد کی رسوم ادا کیں۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ سوچا کہ عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ کے دفتر کا چکر تو لگایا ہی جا سکتا ہے۔ کپڑے بدلے اور جانے سے پہلے ریورینڈ جیکب میکفائر کی دستاویز کو ذاتی کتب میں رکھنے سے پہلے اس کی ایک الوداعی ورق گردانی کی اور پھر اچانک بالکل آخر کے صفحے پر یعنی کتاب کے خاتمے کے بھی بعد کے بظاہر خالی دو صفحات میں سے ایک پر مزید کچھ لکھا بلکہ چھپا ہوا پایا جسے پڑھ کر وہی کیفیت طاری ہوئی جو Fiasco کہلاتی ہے زہرہ کی یاد آئی اسی حوالے سے، اور پادری میکفائر کی داستانِ الم یک دم کسی اور ہی منطقے میں داخل ہو گئی۔ بھورے بھربھرے کاغذ پر ایک مستطیل شکل کے ڈبے میں یہ لکھا تھا۔

Scanned by CamScanner

''ایک رد شدہ مسودہ جسے چھپائی کے ایک نو ایجاد شدہ عمل روٹری پریس اور نو ایجاد شدہ کاغذ بذریعہ سلفائیٹ پلپ، کی جانچ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ تاکہ چھپائی کا نمونہ کا کھوں کو دکھایا جا سکے۔ توجہ۔ یہ ایک کتاب نہیں ہے۔''

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سب کچھ واضح ہو گیا تھا یہ عجوبہ کتاب جس کا مطالعہ کل کا سارا دن اور ساری رات چاٹ گیا تھا سرے سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ ہاں چھاپہ خانے کی تاریخ میں اس کی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے اور اس حوالے سے اسے صنعت چھپائی کے کسی میوزیم میں رکھا جا سکتا ہے۔ مگر کچھ عجیب احساس ہوا جیسے کوئی سانحہ ہو گیا ہو۔ ''یہ ایک کتاب نہیں ہے۔'' یہ فقرہ میرے ذہن میں جم کر رہ گیا۔ میں نے ایڈیٹر کی طرف جانے کی بجائے پبلک لائبریری کا رخ کیا اور چھپائی کی تاریخ پر ایک مضمون پڑھا۔ صورت حال مزید واضح ہو گئی۔ 1868 تک لیتھوگرافی کے عمل میں پتھر کی بجائے جست کی پلیٹوں کا استعمال فروغ پا چکا تھا۔ جست کی دھاتی پلیٹیں ایک رولر کی شکل میں موڑی جا سکتی تھیں اور اس سے چھپائی کا کام بہت سہل اور تیز ہو گیا اس طریقے کو روٹری پریس کا نام دیا گیا۔ پھر میں نے کاغذ سازی کی تاریخ پر بھی کچھ پڑھا تو پتہ چلا کہ اسی زمانے میں بنجمن۔ سی ٹلگمن نامی ایک امریکی نے لکڑی کا پلپ بذریعہ سلفائیٹ کیمیکل بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔ سب کچھ واضح ہو گیا اور مجھے ایک اور ہی طرح کی حیرت کے سناٹے میں لے گیا۔ جس میں مسلسل وہی پانچ الفاظ گونج رہے تھے۔ ''یہ ایک کتاب نہیں ہے۔'' 23 اپریل کا دن اس وقت تک 'یہ ایک کتاب نہیں ہے' کا دن تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ آخر کار اس دن کو ''وہ ایک دن'' بننا ہے جو پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔ مگر اس وقت تک 'غیر تاریخ' سے آنے والی اس لاتحریر نے مجھے ایک خالی کر دینے والی اُداسی سے بوجھل کر دیا۔ ایک نچوڑ دینے والی اُداسی۔ ایک انوکھے انداز میں ٹھگی کا شکار ہونے کے بعد کی موت جیسی اُداسی۔ کون اس ٹھگی کا شکار ہوا۔ میں؟ ریورینڈ جیکب میکنائر؟۔ سیموئیل ٹیلر؟ اس نامعلوم معلوم کو کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک صدی بعد بھی اور ہمیشہ سے بھی اور ہمیشہ بعد بھی کیونکہ 'غیر تاریخ' زمان ومکان سے ماورا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ عنقریب وقت کے بارے میں میرا کوئی اور نظریہ جنم لینے والا ہے۔ مجھے ہاف مین کی یاد آتی ہے اور پھر ہم چاروں کی۔ وقت کا جو نیا نظریہ۔ نئے وقت کے نظریے کا جو انڈہ میں دوں گا...... وہ ''یہ ایک کتاب نہیں ہے'' کی ہیئت سے جنم لے گا...... یہ کوئی

آدھ گھنٹے پہلے کی بات ہے جب میں ایسی ہی ہیئت کی خلا سے بھرا ہوا کیس ماپ رہا تھا۔ لائبریری سے باہر نکل کر بے مقصد اور بے سمت میں چلتا رہا۔ پھر 'عظیم مابعد الطبیعیاتی خلا' بوک کے جیسے پوچ اور کمینے سے خلا کی شکل میں ڈھلنے لگا اور مجھے ہنسی آئی کہ یہ خلا کس قدر بامقصد ہے۔ میں نے جیبیں ٹٹولیں۔ سکہ رائج الوقت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو نیو ہورائزن ایڈیٹر کے پاس پہنچ کر دماغ لڑا لینے کی تین قسطیں فوراً ہی کرنسی کی شکل میں بدلوائی جائیں۔ مگر یہ طریقہ غیر متوقع حادثات و واقعات کی طرف لے جا سکتا تھا۔ خصوصاً پچھلے کچھ عرصے سے ایڈیٹرز جس طرح فقیر کے حوالے سے نامعلوم قسم کی تبدیلیوں سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کے بعد سے میرے لیے یقین سے یہ توقع کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ عزیز از جان نجم الثاقب سے اگلی ملاقات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اس لیے میں نے دوسرے آزمودہ طریقے پر عمل کیا اور پھر گھر نیلے کا رخ کیا کہ امداد حسین سے روٹی کے لیے کچھ پیسے پکڑتا ہوں۔ اتفاق یہ ہوا کہ سکالرز بکس شاپ پہنچا تو امداد حسین روٹی کھانا شروع ہی کرنے والا تھا۔ اس نے دعوت دی اور کچھ ایسی بدولت سے ندی۔ میں نے بہر حال قبول کی اور روٹی کھانے کا فرض ادا کر کے پانی پیا۔ اب پیسے مانگنے کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ نکلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے اس 'عظیم مابعد الطبیعیاتی خلا' نے پھر مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں ایک ایسی کیفیت میں تھا کہ جیسے ابھی سب کچھ ایک چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ مٹ مٹا جائے گا۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بھی نہ تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اس امید میں کہ وہ میرا سامنا کرنے والی شکلیں ہی کہیں نظر آ جائیں۔ جنھوں نے کچھ عرصے سے زندگی میں ایک نئی دلچسپی سی پیدا کر دی تھی مگر امبر جان سے آمنا سامنا ہونے کے بعد سے وہ چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے امداد حسین سے پوچھا کہ کیا اب تو کوئی میرے بارے میں پوچھتا ہوا نہیں آتا۔ جواباً امداد حسین نے پُر خیال انداز میں خلال جاری رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا اُس کی آنکھیں تشویش سے بھری تھیں۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا چنانچہ میں پھر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ کیا کوئی میٹھا کھلوانے لگے ہیں۔ کہنے لگا نہیں کڑوا۔ پھر مزید کوئی علامتی زبان استعمال کرنے کی بجائے کہنے لگا ''دیکھیں کبیر صاحب۔ آپ اتنے برسوں سے میرے ساتھ رو رہے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میں آپ کو پسند بھی کرتا ہوں۔'' میں نے کہا ''میرے جذبات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ گو کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ بوجھل سے انداز میں مسکرایا

Scanned by CamScanner

اور بولا: "آپ کی ظرافت بھی پسند ہے۔ مگر زندگی کا کچھ کریں۔ کوئی ڈھنگ کا کام کریں۔ اپنا کچھ بنائیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ آپ لاپرواہ بھلے ہوں۔ مگر صاحب ہمیں کچھ پرواہ تو آپ کی ضرور ہے..... آپ اس چکر سے نکل جائیں۔" "کون سا چکر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "جو بھی ہے آپ بے شک نہ بتائیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ کچھ بُرے لوگ آپ کے پیچھے لگے ہیں۔" "میں خود بہت بُرا لوگ ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ جواباً اُس نے ویسی ہی مایوسی سے میری طرف دیکھا جیسے لوگ لاعلاج مریضوں کی طرف دیکھتے ہیں اور اتنا کہا: "بس آپ خیال رکھیں۔" میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُسے یقین دلایا کہ میں ایسا ہی کروں گا اور پھر اپنا خیال رکھنے اور اپنی زندگی کا کچھ کرنے کے لیے ایک بار پھر بڑے شہر میں نکل پڑا۔

جب میں یادر ہاؤس کے آہنی گیٹ کے سامنے پہنچا تو مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی کہ میں وہاں کیسے پہنچ چکا ہوں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ عورت جو اندر کہیں اس مکان میں ہے اس سے اتنا عرصہ گذرنے تک جو بھی قربت ہوئی وہ دوسرے دو مردوں کے ساتھ ہوئی اور یہ کتنی تسلیم شدہ اور نہایت قابلِ قبول، معقول، بلکہ شاید ناقابلِ تردید قسم کی صورتِ حال تھی جو ہم کچھ لوگوں میں قائم تھی۔ مگر یہ لمحہ کہ میں اس آہنی دروازے کے سامنے اکیلا کھڑا ہوں یہ لمحہ۔ ارتداد کا یہ لمحہ پہلے بھی، کب نہیں تھا۔ مگر اب یہ ارتداد کا لمحہ ایک نکھار کی صورت میرے اوپر اُترا تھا جس میں "یہ ایک کتاب نہیں ہے۔" کی گونج تھی۔ عظیم مابعدالطبیعیاتی خلا، شدید بھوک میں مفت کی روٹی کھانے کا سطحی پن اور بڈھے امداد حسین کے انسانی تعلق واسطے کی گرمی تھی...... میں گیٹ کی طرف بڑھا تو ایک ہدایت یافتہ، فربہ مگر معصوم صورت چوکیدار نے میرا راستہ روکا۔ میں نے سیدھا بتایا کہ میں زہرہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ "کس سے؟" اُس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔ میں نے کہا "زہرہ سے۔ اس خاتون سے جو اس مکان میں رہتی ہیں۔" پہلے تو اُس نے بہت بُرا سا منہ بنا کر میری تصحیح کی: "یہ مکان نہیں بنگلہ ہے۔" میں نے فوراً تسلیم کیا اور کہا "یقیناً یہ بنگلہ ہے اور میں اُس خاتون سے ملنا چاہتا ہوں جو اس بنگلے میں رہتی ہیں۔" "بی بی مردوں سے نہیں ملتی" اُس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ یہ ایک ٹھپ قسم کی صورتِ حال نظر آتی تھی۔ یہ محال تھا کہ میں وہیں کھڑا کھڑا کسی طریقے سے اپنے آپ کو جوہرِ مردانگی سے محروم کر کے پھر شرفِ باریابی کی درخواست کرتا۔ اس لیے ممکن تھا کہ میں اپنے مردانہ اوصاف وغیرہ سمیت اُلٹے پاؤں پلٹ جاتا اور یہ دن وہ ایک دن نہ

بن پاتا جو یہ دن بنا۔ بعض اوقات حرکات کی چھوٹی سی اونچ نیچ، واقعات کا سطحی سا جھول عظیم حوادث کو ٹال دیتا ہے۔ اس وقت جبکہ میں نیلے رجسٹر کے بقیہ صفحات سُرخ روشنائی سے بھر رہا ہوں۔ اس وقت میرے اندر ایک عجیب تسلسل بھرا ہے۔ یہ پچھلے آٹھ دس گھنٹوں کا ہی معاملہ تھا مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس مختصر سے زمانے کو ہزار ہا صفحات پر محیط کر سکتا ہوں جیسے ہر دو لمحوں کے درمیان ابدیت حائل ہو گئی ہے۔ مگر سُرخ بال پوائنٹ پنسل اور نیلے رجسٹر کے بقیہ صفحات محدود امکانات ہیں۔ عجیب ذہنی کیفیت ہے۔ میں پانی کا ایک ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیتا ہوں اور گہرے گہرے سانس لیتا ہوں اور پھر یادر ہاؤس کے گیٹ کے سامنے پہنچتا ہوں۔ میں واپس مڑنے کو تھا کہ چوکیدار نے پہلے سے بھی زیادہ سخت اور پہلے سے بھی زیادہ احمقانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے بتایا ہے ناں بی بی مردوں سے نہیں ملتی۔" "مگر میں مرد نہیں ہوں۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ چوکیدار کے چہرے پر اب شدید ترین حماقت آمیز حیرت کے ایسے تاثرات اُبھرے کہ جو کسی بھی مصور کا شاہکار موضوع بن سکتے تھے اور اُس کے ان ہی تاثرات میں مجھے ابھی اتنی جلدی واپس نہ پلٹنے کا اشارہ ملا۔ میں نے قہقہہ پھوٹ پڑنے سے پہلے کی کیفیت کو قابو میں کیا اور وہ کہنے لگا سخت پریشانی سے "مرد نہیں ہو۔ تو پھر کیا ہو؟" یہ ایک نہایت ہی معقول سوال تھا اور فوری کسی نہایت ہی معقول جواب کا متقاضی تھا۔ "گیگلا" میں نے کہا اور اپنی معقول حاضر جوابی پر اپنے آپ کو داد دی۔ "کیا کہتے ہو؟ کیا؟ کیا؟" چوکیدار کا تحیر پریشانی اور کچھ نہ سمجھ پانے کی کیفیت دو چند ہو گئی اور میری شیطنت نے مجھے یقین دلایا کہ میں اس کیفیت سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "گیگلا۔ بھائی۔ گیگلا۔ میں مرد نہیں گیگلا ہوں۔ تم گیگلا بھی نہیں سمجھتے۔" اب تو وہ غریب باقاعدہ بوکھلا گیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ معصوم دیہات کا باشندہ ہے اور ابھی بڑے شہری کی چلتر بازیوں کو پورا نہیں سمجھا اور اب اس تذبذب میں ہے کہ کیا عجب یہ کوئی چیز ہو ہی۔ جو مرد ہو نہ عورت ہو۔ بلکہ گیگلا ہو۔ چنانچہ میں نے ایک بھانپتے ہوئے تیقن کے ساتھ کہا۔ "بس تم بی بی تک پیغام پہنچا دو کہ گیگلا آیا ہے۔" مزید چند لمحوں کے تذبذب کے بعد اُس نے ایک ہتھیار ڈالتا ہوا سانس لیا اور بولا "ٹھیک ہے۔ پیغام پہنچاتا ہوں۔ کہ گے۔ گیلا گیلا آیا ہے" "گیلا گیلا نہیں۔ گیگلا۔" میں نے درستگی کی اور بمشکل اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ "ہاں گیگلا......" اس نے کہا اور اندر کو چل پڑا۔ مجھے خطرہ ہوا کہ اگر اس نے کسی اور کے ہاتھ پیغام اندر بھیجا تو یقیناً وہ

Scanned by CamScanner

کوئی اور اتنا معصوم تو نہیں ہوگا کہ گیگلے کو ہضم کر لے۔ لیکن وہ خود ہی زہرہ تک گیا اور ان لمحوں میں
میرا ذہن اس معصوم چوکیدار کے گیلا گیلا پر آ گیا۔ پھر گیلا گیلا۔ گیلا گیلا۔ پ۔ جیسے ابھی پیدا ہوا ہو
اور مجھے ابھی پیدا ہونے کا احساس ہوا۔ جیسے کوئی چھوٹا سا باب پیدائش۔ گیلا گیلا...... اور جب
زہرہ آئی تو اُس نے مجھے ایسا ہی لیا گیلا گیلا...... جیسے عورت نومولود کو دیکھتی ہے۔ گیلا۔
گیلا...... اُس کے دروازے پر آنے والا۔ پیدا ہونے والا۔ اور میں نے اُسے دیکھتے ہی ایسا
ہی کہا۔ "میں ابھی ابھی تمہارے دروازے پر پیدا ہوا ہوں" اور اُس نے بھی ذرہ برابر توقف کیے
بغیر کہا "پھر تو یہ دروازہ تمہارے اوپر بند ہو چکا۔ تم تو پیدا ہو چکے۔" ہم دونوں ایک دوسرے کی
آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ اپنے اپنے کہے کے بعد یوں جیسے اچانک ازلی وابدی ممنوعات کے
نرغے میں آ پھنسے ہوں۔ اپریل کی گرم سہ پہر کا سورج ہمارے ساتھ ہی ساکت ہو چکا تھا۔ سب
کچھ وہیں کا وہیں تھم چکا تھا۔ سانس لینا ناممکن تھا۔ آگے بڑھنا بھی اور پیچھے پلٹنا بھی۔ تب وہی
معصوم پھر واپس آ گیا اور مرئی کائنات کو اپنے ایک ہی کُن کے ساتھ واپس لے آیا۔ "بیگیا بیبی جی
گیگلا۔ بی بی جی" سانس پھر سے چل پڑا اور گرم سورج کی تمازت کے ساتھ مجھے ہوا کا خفیف سا
جھونکا اپنے چہرے پر سے گزرتا محسوس ہوا اور وہ ہنس پڑی۔ اُسی مخصوص انداز میں سر جھٹکتے
ہوئے۔ "ہاں ٹھیک ہے تم جاؤ اور تم آؤ گیگلے......" "معصوم چوکیدار دروازے کی حفاظت کے
لیے چلا گیا اور وہ مجھے ساتھ لیے لیے سرخ پرانی اینٹوں کے راستے پر عمارت کی طرف آگے بڑھی
اور رُک گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اچٹتی سی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر چاروں طرف
دیکھا۔ کیا دیکھا مجھے علم نہ ہو سکا مگر پھر اس کی آنکھوں میں تشویش، اُلجھن شاید کچھ خوف، کچھ غصہ،
کچھ بیزاری، کچھ نفرت مگر پھر سب پر حاوی سب کچھ تہس نہس کر دینے والا جنون آیا۔ اس نے گہرا
سانس لیا اور پھر آگے کو چل پڑی "شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا" میں نے کہا۔ "ہاں تمہیں
یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔ پھر میرے اندر یہ توقع جاگی کہ وہ کچھ ایسا کہے گی "مگر مجھے
یقین تھا کہ تم آؤ گے" مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہ کہا اور رُک گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اب ہم
جہاں کھڑے تھے وہاں گھاس، مٹی، پانی اور بہار کے اُن پھولوں کی خوشبو تھی جو اپنے اپنے تنوں کی
پوٹلیاں سمیٹے مرجھائے سوکھے کھڑے رہتے ہیں۔ اُس بھاری جسموں کو سہلاتی خوشبو میں مجھے اس
کا چہرہ بالکل بے تاثر لگا بظاہر کسی بھی جذبے، کسی بھی کیفیت سے عاری، اور میرے اوپر ایک

بے چینی طاری ہوئی جو نامعلوم سے مقاربت پر طاری ہوتی ہے مگر اب جبکہ میں اس لمحے کو ماضی
میں دیکھ رہا ہوں یہ سب لکھتے ہوئے تو مجھے معلوم ہے کہ وہ گناہ کو قبول کر لینے کے بعد کی بے بسی کا
لمحہ تھا۔ میں اس لیے بھی یہ جانتا ہوں کہ جلد ہی میرے اوپر بھی اسی کیفیت کا ورود ہوا۔ جب اس
نے کہا "کتنا عجیب لگ رہا ہے کیا نہیں؟ کیسی عادت ہو چکی ہے تمہیں ناصر اور ہاف مین سے ملنے
کی...... ایک ساتھ۔ اور جیسے یہ ممکن ہی نہیں تھا۔" تب وہ کیفیت میرے اوپر آئی ایک طرح
کی نجات اور احساسِ گناہ مگر کیسے؟ کس سے؟ ناصر سے؟ ہاف مین سے؟ تمہیں سے؟ اور پھر اس
پر حیرت "اس لیے مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟" میں نے ایسے سوال کیا کہ جیسے سوال نہ کیا ہو
اور اس کا جواب یا تو پہلے سے معلوم ہو یا جاننے کی خواہش ہی نہ ہو۔ زہرہ ہنسی۔ "نہیں۔ وہ دوسری
بات تھی۔" اور اس نے پھر ایک حقارت بھری نظر ادھر اُدھر دوڑائی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ
یہاں اس میں مختلف جگہوں سے کئی نظریں ہمیں گھور رہی تھیں۔ کچھ بوڑھی عورتیں مختلف کام کرتی
ہوئیں، مالی، شاگرد پیشہ لوگ۔ "اوہ" میرے منہ سے نکلا "اس صورتِ حال کا تو مجھے اندازہ ہی نہ
تھا" "میری ماں اور میرے بھائیوں کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی یہاں ضرور آئے گا اور وہ آ گیا۔
گیگلا" زہرہ نے بھرپور قہقہہ لگایا "آج تم مجھے یہ بتائے بغیر نہ جا سکو گے کہ اس لفظ۔ اس
مہملی کرتے لفظ کا اصل مطلب کیا ہے؟" "میری یہاں موجودگی بھی اس لفظ کے مطلب کو
واضح کرتی ہے" میں نے کہا۔ "مگر آج یہ لفظ میری نجات کا وسیلہ بن گیا ہے۔ میں اس دروازے
میں کبیر کے نام سے داخل نہیں ہوا بلکہ یہ نیا گیگلا نام لیے آیا ہوں۔ کبیر پر تو دروازہ بند ہو چکا
تھا...... اس لیے کہ وہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ پلٹ کر آیا ہے گیگلا بن کر۔ جس کے ساتھ کوئی ناصر اور
ہاف مین نہیں"۔ "مگر تم نے تو اعلان کیا تھا کہ تم اپنا یہ نیا نام صرف اپنی ادبی اور افسانوی تحریروں
میں استعمال کرو گے۔" اس نے کہا "ہاں یہ اعلان میں نے کیا تھا" میں نے اعتراف کیا اور مجھے
حیرت ہوئی کس طرح، کس لیے اس نے میری اس بات کو یاد رکھا ہوا ہے اور میرا دل خوفزدہ
کرنے والی حیرت سے بھر گیا اور میں نے پھر کہا "دراصل میرے ساتھ ایک واقعہ ہو گزرا ہے۔
پچھلی رات اور پچھلے دن۔ جس نے مجھے ایک چلتا پھرتا ادب پارہ۔ ایک گھومتا پھرتا افسانہ بنا دیا
ہے اور اس واقعے کا نام ہے۔" "یہ۔ ایک۔ کتاب۔ نہیں۔ ہے" ...... زہرہ نے گہرا سانس لیا
اور خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ "ہاں میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہے" اس نے

Scanned by CamScanner

کہا اور ایک بار پھر بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں اور جو کچھ ہوا
ہے وہ میں پھر تمہیں بتاؤں گا۔ چند روز میں ہم غلام باغ میں بیٹھیں گے۔ ہاف مین بھی آنے والا
ہے شاید میرا یہاں آنا مناسب نہیں تھا۔ میں چلتا ہوں۔'' زہرہ کی نظروں میں ایک شکایتی تبسم
تھا۔ وہ بے ساختہ ہنسی ''جاؤ، جاہو تو جاؤ...... تو اس کا مطلب ہے کہ کبیر سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان
نہیں ہے۔ اس کے قہقہے میں فتح مندی کی بے اختیاری تھی یا شکست کی میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔''
لیکن وہ گفتگو ہماری ایک ایسی گہری رمزیت کی سطح پر تھی جہاں ترغیبات اور ممنوعات لمحہ بہ لمحہ ایک
دوسرے کو رد کر رہی تھیں پھر میرے اندر کسی باطنی سطح پر کوئی فیصلہ ہوا جو میرے علم میں اس خیال کی
صورت اُبھرا کہ مجھے کسی بھی طرح کی مزاحمت سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے کہا
''نہیں یہ بہت آسان ہے۔ میں کبیر کو اس آہنی دروازے کے باہر ہی چھوڑ آیا ہوں اور جو اندر
آسکتا تھا'' (اور اپریل کی اس سہ پہر کو یاور عطائی کے گھر میں اس کی بیٹی کے سامنے کھڑا اس کی
آنکھوں میں اُترنا چاہتا تھا) ''وہ کبیر نہیں ہو سکتا۔ اسے وہی لفظ۔ جسے تم گدگدی کرتا لفظ کہتی ہو
وہی لفظ اسے بیان کرتا ہے اور اب میں تمہیں اس لفظ کے معنی بتاتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے،
مورکھ، نادان، احمق، سادہ لوح، بھولا، بے وقوف اور یہ تھوڑی تھوڑی دیر کو جو کبیر واپس آ جاتا ہے تو
وہ تمہاری سلامتی کی خواہش کے لیے۔ ایک مورکھ، نادان یہاں اس گھر میں آ کر تمہارے لیے
بہت سی مشکلات پیدا نہیں کر سکتا کیا؟'' ...... زہرہ کی آنکھوں میں چمک لہرائی ''دیکھو کبیر گیلے۔ میری
سلامتی اور تحفظ کی خواہش کرنے والے میری ماں اور بھائی لوگ ہی کافی ہیں اور کیا تم سمجھتے ہو کہ
میں ان کے ان احمقانہ پہروں اور جاسوسوں کو ایک ہی ٹھوکر میں تہس نہس نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے
میں کر سکتی ہوں'' ...... ایک گہری نشہ آور کیفیت میرے اوپر اُتری اور میرے ہونٹوں پر ایک لذت
آگیں احساس کی طرح مسکراہٹ بن گئی۔ ''ظاہر ہے تم ایسا کر سکتی ہو...... کیوں کہ تم بھی میری
طرح برباد کرنے والوں میں سے ہو''۔ ''ہاں اور جو آخر میں...... اپنے آپ کو برباد کر لیتے ہیں''
اس نے بے ساختگی سے کہا ''ہاں یہی بات ہے......'' میں نے کہا پھر مجھے پچھلے دنوں ناصر کی کہی
بات یاد آئی۔ ''ناصر نے مجھے پچھلے دنوں ایک قلمی دہشت گرد کا خطاب دیا ہے۔'' میں نے اسے
بتایا ''واقعی؟'' اس نے ایک ستائشی بے اعتنائی سے کہا ''کہیں بیٹھیں۔ کچھ باتیں کریں وہ تم کیا کہہ
رہے تھے۔ تمہارے ساتھ جو واقعہ ہوا ہے یہ ''ایک کتاب نہیں ہے۔'' میں خاموش رہا۔

''کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ مجھے بتاؤ۔ بتاؤ۔ ہم پیچھے بیٹھیں گے۔ تمہیں اپنی بطخیں دکھاؤں
گی'' وہ ایک عجیب لمحہ تھا وہ مجھے ایک چھوٹی سی بچی... مگر ساتھ ساتھ کئی مختلف عمروں کی عورت بیک
وقت نظر آئی۔ جب اس نے ایک ملازم کو بلا کر کچھ کافی اور کھانے کے لیے لانے کو کہا............ ہم
عمارت کے سامنے حصے سے دائیں طرف کی روش پر مڑے اور پھولوں کی کیاریوں اور جھاڑیوں
سے گزرتے ہوئے عقبی حصے میں جا نکلے، اور یک دم کھلی روشن دھوپ میں آنے کا احساس ہوا
جس میں امریکا پام کے درخت ایک کھلی روش کے دائیں بائیں دو لمبی قطاروں میں کھڑے تھے۔
اور دونوں اطراف میں گہری سبز گھاس کے قطعے اور پیچھے آخر میں ایک تالاب اور تالاب میں راج
ہنس اور بطخیں۔ اور مجھے حیرت ہوئی۔ میں آج تک ان بطخوں وغیرہ کے تذکرے کو محض تصور اور
وہم جیسا ہی سمجھتا رہا تھا اور پھر میں نے اپنے آپ سے کہا آخر اس حماقت کا بھی کیا جواز تھا۔ بھلا
بطخوں کے حقیقی ہونے میں کونسی مابعد الطبعیاتی ممانعت حائل ہو سکتی ہے۔ اور پھر میں نے زہرہ
سے اپنی یا ادھیڑ بن Share کی ''تمہاری بطخیں تو واقعی ہیں۔'' میں نے کہا'' کیوں تمہیں کچھ شک
ہے'' ہاں میں آج تک تمہارے بطخی حوالوں کو تمہارا وہم ہی سمجھتا رہا'' زہرہ ہنسی .... ''پچھلے کئی
دنوں سے ہمارے ساتھ جو کچھ بیت رہا ہے۔ اس نے حقیقت اور واہمے کو گڈمڈ نہیں کر دیا کیا؟''
''ہاں۔ کچھ ایسا ہی ہے'' میں نے آسانی سے اعتراف کیا۔
''اچھا اب بتاؤ تم...... اب کس واہمے نے تمہاری بچاری حقیقت پر حملہ کیا ہے؟'' زہرہ نے
اُس وقت پوچھا جب ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ پتھر کے دو بنچوں پر آمنے سامنے اور درمیان میں ایک
پتھریلا میز تھا۔ یہ جگہ جو شاید یاور ہاؤس والوں نے اپریل کی سہ پہروں۔ نومبر کی شاموں یا مارچ
کی صبحوں میں آمنے سامنے بیٹھ کر گہرا مکالمہ کرنے والوں کے لیے بنائی تھی .... ''تمہارے
ساتھ کیا ہوا ہے؟'' اُس گھر کی بیٹی نے اپنی دونوں کہنیاں پتھر کی میز پر ٹکاتے ہوئے اور اپنے
چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے پوچھا اور میں نے کہا ''منگلی'' .... اپریل کی جاتی
دھوپ میں ایک سایہ سا ہم دونوں کے اوپر سے گزر گیا۔ جیسے ریشمی رومال لہرا کر چہرے کے اوپر
سے بہتا ہوا آگے گردن پر آتا ہے...... اور پھر میں نے اُسے بتایا۔ نیلے رجسٹر کے ہذیانی
مندرجات میں سے بہت کچھ۔ نثری متنوں کی ذلت انگیز لا حاصلیت سے لا لکھائی تک۔ لکھاری
کی آخری آزمائش مرتب کرنے والے خدائی فوجداروں سے لے کر سنسان راہوں میں گلا گھونٹ

Scanned by CamScanner

کر مار دینے والے لمحوں تک۔ ریورینڈ جیک میکنائر کے روحانی عذاب سے لے کر صحیفہ
چھاپہ سازی کی تاریخ تک۔ تاریخ سے غیر تاریخ تک اور غیر تاریخ سے لا ماضی سے لا حال، لا۔
حال تک میرا معدوم حال جو امبر جان ہے جو عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ ہے جو پروفیسر
نذیر ہے اور جو وہ تھیسس ہے جو ابھی لکھنا ہے۔ وہ لکھنا جو لکھنا نہیں ہے وہ لکھا جو کبھی لکھا نہیں جائے
گا۔ وہ کتاب جو ایک کتاب نہیں ہے...... کس قدر عجیب بات ہے۔ ابھی میں نے دعویٰ کیا تھا کہ
میں اس دن کے بارے میں ہزاروں صفحات لکھ سکتا ہوں مگر اب جبکہ اس سہ پہر کو گزرے اور شام
ہوئے اور ان چند گھنٹوں کو جو ہم نے پتھریلے بنچوں پر آمنے سامنے بیٹھے ایسے گزارے کہ جیسے کوئی
دو ایک دوسرے کے ذہنوں کو مسلسل حاملہ کر رہے ہوں۔ اب ان لمحوں کے بیان سے میں عاجز ہو
رہا ہوں۔ میری یادداشت جواب دے رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ کچھ یاد نہ
آنا، یادداشت کی فقط ایک شکست ہے مگر اتنا کچھ یاد آنا کہ بیان ہی مشکل ہو جائے۔ یہ یادداشت
کی دوسری شکست ہے۔ میں بھی اس وقت اسی شکست خوردگی کا شکار ہوں میں لکھنا موقوف کرتا
ہوں...... میں اٹھتا ہوں...... میں چھت پر سے واپس آیا ہوں رات کے پچھلے پہر کی خنکی میں اور
بلندی سے بڑے شہر کی روشنیوں کو اور اوپر آسمان پر ستاروں کو دیکھ کر واپس آیا ہوں اور میرے
اعصاب سکون کی حالت میں ہیں۔ میں پھر آج شام کی طرف پلٹتا ہوں۔

اب شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ یار ہاؤس کے عقبی لانوں میں گہرا ہو رہا تھا اور اس گھر کے
بنانے والے نے روشنیوں کا جو اہتمام کیا تھا، وہ میرے دیکھنے میں آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے اس
وسیع عمارت میں روشنیاں ظاہر ہو رہی تھیں اور ایسے میں ہی کہیں زہرہ نے پوچھا تھا "اگر ایک
کتاب کتاب نہیں ہو سکتی اور تحریر تحریر نہیں ہو سکتی تو کیا زندگی بھی زندگی نہیں ہو سکتی۔ وہ کیسی زندگی
ہے جو زندگی نہیں ہے۔ یہ کس قسم کی گتھی ہے کبیر؟" اور یہی وہ لمحہ تھا جب میرے جسم کے ریشے
ریشے میں اس کے جسم کے ریشے ریشے کو چھو لینے کی خواہش جاگی۔ عشق کی خواہش مگر اس عشق۔
اس میں سے ایک بنا تمیں عشق۔ عشق پر اس انوکھے مکالمے۔ کیسے غلام باغ کی منجمد راتوں میں عشق
پر کی گئی، خیال طرازیوں اور گفتگو کی انوکھی گھاتوں اور لفظوں فقروں کے پیچ پلٹوں کی لذتوں سے
اتنا مختلف کہ جیسے ایک اور ہی دنیا ہو جو نہ پہلے دیکھی ہو نہ سنی ہو مگر عجب ہے کہ اب جبکہ میں اسے
بیان میں لاتا ہوں تو یہ ہے کہ میرے بیان میں بس اتنی ہے۔ اتنی سطحی، اتنی عمومی، کہ میرا ہاتھ اس

کے ہاتھ سے چھوتا ہے۔ مگر اب بار بار دفعہ انسانوں میں بیتنے والا یہ نہایت معمولی سا واقعہ پھر بھی
کسی نہ کسی پر پہلی دفعہ دنیائے حیرت کے در وا کر دیتا ہے...... میں نے ٹھنڈے پتھر پر رکھے
اس کے ہاتھ کو اٹھایا اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں سمو لیا۔ جسم سے جسم کا یہ تعلق
ایک گہری ضرب لگاتی دھمک کی طرح تھا جو میرے اندر اتر رہی تھی اور سب روز مرہ کے جسمانی
اندازے ایسے غائب ہو گئے تھے کہ میرے لیے اپنی ہی دھڑکن کا سراغ لگانا ممکن نہ رہا تھا......
میرے لیے اس کیفیت کو لفظوں میں گرفتار کرنا اب ممکن نہیں مگر یہ کیفیت کچھ دیر رہی۔ کتنی دیر اس کا
بھی مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا...... مگر پھر اس کیفیت میں ہی...... اس کیفیت میں بھی اس وقت
میرے اندر کہیں نچلی لفظوں کی شیطنیت بیدار ہوئی اور فقروں کی ایک پھریری سی آئی۔ میں مسکرا دیا
تھا اور میں کہہ رہا تھا "تو اس کا مطلب ہے کہ عشق کے بارے میں میرا نظریہ غلط نہیں تھا۔ عشق
حیرت ہی ہے۔" میں نے کہا تھا "ہاں عشق تحیر ہے" وہ ہنسی اور اس نے کہا "ہاں مگر یہ وہ حیرت نہیں
کہ جسے" اور ہم جانتے تھے کہ وہ کس حیرت کی بات کر رہی ہے —— گہری شام اب رات تھی۔ اس
نے اپنے ہاتھ کو مجھ سے الگ کیا اور اچانک ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ کر غائب ہو گئی،
جیسے تارہ ٹوٹ کر غائب ہو جائے۔ میں منتظر تھا کہ وہ کچھ کہے گی مگر وہ خاموش رہی۔ آخر مجھ سے نہ
رہا گیا اور میں نے پوچھا "کیا سوچ رہی ہو؟"...... "سچ بتاؤں؟" اس نے سوال کیا جس میں
صرف شرارت تھی...... میں نے کہا "اگرچہ یہ پوچھنا مجھے کبھی کسی سے اچھا نہیں لگا کہ وہ کیا
سوچ رہا ہے اور نہ ہی کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے مگر تم جو بھی بتاؤ گی وہ میرے لیے سچ ہو
گا......" "بھوانی" اس نے کہا اور خوب قہقہے لگائے اور بار بار اپنی اس بات کے مزے میں
ڈوبتی رہی...... "تو پھر مجھے اپنا چیلا سمجھو" میں نے کہا "کیا" اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا اور پھر ہم
ایک ایسی روانی میں بولنے لگے جیسے کسی اسطوری تمثیل کے از بر مکالمے بول رہے ہوں "تم کیسے
چیلے ہو، تم کہاں کے ٹھگ ہو۔ میں تو تمہیں پہچانتی نہیں"...... "بے بھوانی، بے ماتا، اے ملکہ ——
رحم کر۔ مجھے اپنے چرنوں سے مت دھتکار میں ٹھگ ہوں۔ ہاں ہوں میں ٹھگ —— مگر مال و دولت
کا نہیں۔ میں لفظوں کی ٹھگی کرتا ہوں۔ میں زندہ انسانوں کو بہلا پھسلا کر سنسان افسانوں اُجاڑ
کہانیوں اور بیابان قصوں کی سرزمین میں لے جاتا ہوں اور پھر نہایت عیاری اور ہوشیاری سے
موقع پاتے ہی اپنی بیتی کے رومال سے ان کی اصلیت کا گلا گھونٹ دیتا ہوں اور انہیں لاشے بنا کر

Scanned by CamScanner

اپنی شکل دے دیتا ہوں۔ شکل جو لاش ہے بے بھوانی، مجھے اشیر باد دے کہ ابھی اس دھندے میں تیرے اس چیلے نے بہت دور تک سفر کرنا ہے۔" "تجھے سفر مبارک ہو چیلے مگر یہ سفر بھی بہت پُر خطر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا کوئی شکار، شکار ہونے سے پہلے ہی پلٹ کر تیرے گلے میں رومال ڈال دے مگر تیرے لفظوں کی عیاریاں تیرے فقروں کی مکاریاں میں خوب جانتی ہوں تو اتنی آسانی سے ہار کھانے والا نہیں۔ میں تجھے اشیر باد دیتی ہوں" اس نے کہا اور مجھے کالی کے مندروں کی گونج سنائی دی۔ میں نے تھک کر کہا" مجھے کوئی نشانی دے اے ماتا" ...... اور پھر زہرہ نے میرے ماتھے کو چھوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی انگارے نے مجھے مَس کر لیا ہو۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ہم دونوں نے اپنے ہی وجود کے تھیٹر میں تماشائی بن کر خوب داد دی ...... اپریل کی رات میں اب وہ خنکی تھی جو گرمی کے لطف کو بڑھا رہی ہے۔ میرا جسم بھرپور خالی پن کے مزے میں تھا جو زبان اور لفظوں کی تھکی کے اس اختتامی کھیل نے ہم دونوں میں قائم کر دیا تھا...... اسی وقت کوئی اندر سے آیا اور مجھے جانا پہچانا لگا اور پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ تو زہرہ کا 'جاسوس' سراج تھا اس کے چہرے پر رازداری کی ذمہ داری تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ زہرہ نے پوچھا "کیا بات ہے سراج دین" سراج دین تھوڑے سے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا" وہ اصل میں ...... بی بی جی۔ وہ ...... صاحب بھی یہاں آئے نہیں ناں ......" اس کا اشارہ میری طرف تھا اور وہ میری طرف دیکھ بھی رہا تھا "ہاں تو پھر؟" زہرہ نے پوچھا۔ "وہ جی بی بی جی۔ ابھی بڑی بیگم صاحب کا فون آیا تھا وہ آج کا ماجرا پوچھ رہی تھیں" زہرہ ایک دم ہنس پڑی "آج کا ماجرا کیسا ماجرا؟" "کچھ نہیں جی ...... وہ میں نے بول دیا سب خیر خیریت ہے۔" اس نے کہا "ہاں تو پھر ٹھیک ہے۔ جاؤ پھر۔ سب خیر خیریت ہے تو۔" سراج دین سلام کر کے چلا گیا مگر جاتے جاتے اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے یقین تھا کہ اس سوئمبر میں تم ہی جیتو گے۔ میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں ......" تب زہرہ نے مجھے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو" ۔۔۔؟ اور میں نے سوچا کہ میں بھی جو میں نے سوچا میں یقیناً وہی بتا دیتا ہوں اور میں نے اُسے بتا دیا۔ سوئمبر پر وہ خوب ہنسی اسے میری خوش فہمی قرار دے کر میرا مذاق اُڑاتی رہی اور میں اس کی باتوں اور ہنسی میں اُس سوچ کی تصدیق ڈھونڈتا رہا ...... پھر یہ بھی گزر گیا۔ زہرہ کہنے لگی" مجھے تو لفظ ماجرا پر ہنسی آئی تھی" ۔ "ہاں یہ عجیب لفظ ہے ماجرا ...... حالات، واقعات کا بیان مگر کچھ عجیب سا بیان" میں نے کہا پھر اپنی بات جاری رکھی '

جیسے آج اس دروازے میں گیگلا بن کر داخل ہونے کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتی اس کا ماجرہ بیان نہیں کیا جا سکتا (میں اس وقت کتنا جھوٹ بول رہا تھا۔ یا شاید اُس وقت وہ سچ ہی تھا مگر آٹھ دس منٹ بعد۔ اس وقت نیلے رجسٹر کے بقیہ صفحات کو جلد از جلد بھر دینے اور اس کے بعد۔۔ کیا پھر آزاد ہو جانے کی ہوس میں ...... میں یہی حرکت کر رہا ہوں ...... ماجرہ ......)" ہاں مگر دوسروں کی خوشیوں کا ماجرہ بیان کرنا زیادہ آسان ہے۔ باہر کھڑے کھڑے۔" زہرہ نے کہا۔ میں نے جواباً اسی کی دونوں باتیں دہرا دیں" دوسروں کی خوشیں؟ باہر کھڑے کھڑے؟" ۔۔ "ہاں میری بیچاری ماں۔ بلکہ میرے بیچارے بھائی دوسروں کی خوشیں۔ جو میرے باپ کی کامیابیاں تھیں۔ ماں، بھائی صاحب، دوسرے بھائی صاحب، جناب امیر جان کو امیر بھائی کہتے ہیں اور نواب کو نواب چچا۔ چند دن پہلے میری ماں اس گھر میں آئی۔ یہاں جب وہ آتی ہے تو سہمی ہوئی ہوتی ہے۔ دراصل ایک دن میں نے اسے کافی دہلا دیا تھا یہ جھوٹا قصہ سنا کر کہ چاندنی راتوں میں میرا باپ باغوں میں ٹہلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے کمرے سے اب بھی دوائیاں بنانے، کوٹنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی اُس کی آنکھوں میں کیسی دہشت طاری ہوئی۔۔ "ہے۔ وہ۔ وہ ایسا کر سکتا ہے وہ یقیناً ایسا کرتا ہوگا" اس نے کہا تھا تو کیسے ماں میری کے خیال میں تو باپ میرا مرنے کے بعد بھی وہ تم کیا کہتے ہو فرضی کلب کا خیال رکھے ہوئے ہے مگر فرضی کلب والے مجھے لگتا ہے اپنے طور پر کچھ کرنے والے ہیں۔ اب یہ جو تم مجھے اس منحوس چہرے والے کا بتاتے ہو کہ وہ تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے ...... تو خیر چند دن پہلے کا ماجرہ میں بیان کرنے لگی تھی۔ میری ماں وہی ڈری ڈری یہاں آئی۔ روشن دن میں ڈری ہوئی۔ رات کو تو یہاں آنے کی کوئی ان میں سے جرأت ہی نہیں کر سکتا اور میرے لیے اب اُن کی نفرت میں میرے وہ باپ کے آسیب کا خوف بھی شامل ہو چکا ہے۔ مجھے اس سے بہت مزہ آتا ہے۔ اتنا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ بہر حال وہ آئی۔ وہ ڈرائنگ روم یا اندر کسی بھی کمرے میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم ادھر ہی کہیں بیٹھے اور اس نے جو باتیں کیں وہ ...... وہ اصل میں اتنا پوچھنا چاہتی تھی کہ میں جن مردوں سے ملتی ہوں تو میرے اُن سے تعلقات کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اب بھلا میں اُسے کیا بتاتی۔ میں نے اچانک دوران میں ایک درخت، بلکہ تالاب کی طرف گھورنا شروع کیا اور پھر عجیب طریقے سے مسکرائی اور کہا" پاپا پھر رہے ہیں۔ سراج نفسوں کو دانا ڈال رہے ہیں: اتنا سننا تھا کہ وہ عورت وہ کیا کہتے

Scanned by CamScanner

ہیں کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ اب اُدھر اس بھائیوں کے گھر میں یہ پھیل گئی ہے کہ زہرہ کا پاگل
خلیفہ باپ مرنے کے بعد یادر ہاؤس میں آتا جاتا رہتا ہے اور عنقریب اس کی خلیفہ نسل کی بیٹی بھی
پاگل ہو جائے گی۔ یہ صورت حال میرے لیے مثالی ہے اگر وہ میری جان ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں
مگر ایسا بھی نہیں ہو رہا۔ اصل میں 'امیر بھائی اور نواب چچا' کے اپنے اپنے مسئلے انہیں چین نہیں
لینے دیتے۔ امیر بھائی وہ جو اس رات نہ کر سکے جس کے ایک عینی شاہد تم بھی ہو اسی کی تکمیل چاہتے
ہیں اور نواب چچا ابھی تک اس عمارت اور عمارت میں پاپا کے کمرے کو حاصل کرنے کے ارادے
سے دستبردار نہیں ہوئے بلکہ بھائی لوگوں سے کاروباری شراکت داری کے رشتے تو دونوں نے
بڑھا لیے ہیں۔ یعنی امیر بھائی نے بھی۔ امیر بھائی کے ساتھ میں نے سوچا ہے کہ کسی روز خود ہی مل
بیٹھوں اور پوچھوں۔ بھائی جان آپ کیا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کیسا لگے گا۔ میں ایسا کروں"
"نہیں۔ تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتیں" میں نے بالکل بے اختیاری سے کہا۔ "سوچ تو میں رہی
ہوں۔ آگے کروں یا نہ کروں۔ اس کا کیا ہوگا کون جانتا ہے" پھر اُس نے ہنس کر کہا "اچھا آگے
سنو۔ ابھی ماجرہ جاری ہے یہ جو مائیاں ہیں ملازمین ان میں ایک مائی ہے نجی۔ جو بکی حرامزادی
ہے۔ وہ اصل میں امیر بھائی اور نواب چچا دونوں کے لیے کام کر رہی ہے اور کام بھی کیا فضول یعنی
مجھ غریب پر نظر رکھنا۔ اب تمہارے آنے کی خبر ماں بھائی لوگوں کو ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر امیر اور
نواب کو کب کا علم ہو گیا ہوگا۔ ماں بھائی لوگ تو میرے پاپا کے آسیب والے ڈرامے کے بعد مجھے
بدروح سمجھ کر بھول جانے کے چکر میں ہیں مگر یہ...... اچھا سنو کل یہ بڈھی نجی میرے پاس آئی۔
میرے خدا اس کی دیدہ دلیری دیکھو۔ اِدھر اُدھر کی لاتی پوتی لگانے کے بعد پوچھنے لگی۔ بی بی ایک
بات کہوں بُرا تو نہیں مناؤ گی۔ میں نے کہا تم بات کرو بُرا منانا نہ منانا میرا مسئلہ ہے۔ بولو۔ کہنے لگی
بی بی۔ تم جوان ہو۔ جوان عورت مرد کے بغیر ایسی ہے جیسے پاؤں کے بغیر جوتی...... ذرا مثال
دیکھو......" میں نے کہا "مثال تو اعلیٰ درجے کی ہے۔ نہایت ہی فرائڈین" زہرہ ہنسی ہم دونوں ہنسے
اور بولی "ہاں مگر میرا جواب فرائڈین نہیں تھا۔ میں نے کہا نجی ایک وہ جوتا بھی ہوتا ہے ناں جو کسی
کے سر پر برستا ہے تو وہ جوتا پاؤں میں نہیں ہوتا اور میں وہی جوتا ہوں۔ پتہ نہیں اس ذلیل کو بات
سمجھ آئی کہ نہ۔ مگر میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر وہ اور بھی شیر ہو گئی۔ پھر میں نے پوچھا مگر تو یہ
کیوں کہتی ہے یہ مشورے مجھے کیوں دیتی ہے۔ تجھے کسی نے کہا ہے مجھے ایسا کہنے کو؟ میری ماں

نے؟ نہیں بی بی۔ بھائیوں نے؟ نہیں بی بی...... تو پھر کس نے؟...... تو وہ بولی ہاں کہا ہے بی بی کسی
نے۔ اس نے جس نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ اگر تو اس کی نہ ہوئی تو پھر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔ میں
سمجھ گئی کہ امیر بھائی جان کے علاوہ اور کوئی میرا ایسا طلب گار نہیں ہو سکتا اور یہی میں نے اسے کہہ
دیا۔ امیر جان بھائی جان نے تجھے بھیجا ہے پیغام دے کر تو وہ ہنسی ہاں مرد بننے سے پہلے سب بھائی
ہی ہوتے ہیں سوائے ماں جایوں کے۔" اب لفظ مرد سے ہی میرے اندر وہی شیطان پھر آ گیا جو
ماں کے میری، ایسے ہی کچھ سوال جواب کے وقت آیا تھا۔ میں نے کہا ہنس کر وہ میرا مرد بنے گا۔
وہ تو مرد ہی نہیں ہے، بڈھی کا منہ دیکھنے والا تھا کہنے لگی ہائے ہائے بی بی۔ تو یہ کیا کہتی ہے تجھے کیا
معلوم۔ کنواری لڑکیوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ زیب دیتی ہیں یا نہیں اس کا تو مجھے پتہ
نہیں بڑی اماں، میں نے کہا مگر اب تو نے پوچھا ہے تو سُن کہ مجھے کیسے معلوم ہے ایک تو ایسے کہ وہ
میرے ابا سے علاج کرواتا تھا اور میرا ابا بڑے بڑے خصیوں کا علاج کرتا تھا اور دوسرے اس کے
سامنے بھی دیکھا ہے اُس مرد کو...... ایک رات اس مرد نے زبردستی مجھے عورت بنانے کی کوشش کی
تھی اور اس کی مردانگی رستے میں ہی رہ گئی تھی۔ اس سے بولنا پہلے تو میرا ابا اسے مرد بناتا تھا اب وہ
نہیں رہا تو وہ اس کی بیٹی کا کیا کرے گا۔ ہاں اگر وہ کوئی دوائی نسخہ چاہتا ہے تو جب کبھی میں ابا کا وہ
خزانہ کھول لوں گی اسے دے دوں گی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں یہ سب سُن کر اس بڈھی مائی نے کیا کہا
تھا میں سوچتی تھی بوکھلا جائے گی اور ہفان ہو جائے گی مگر نہیں جی وہ تو جیسے میری بات کو اور خود مجھے
کسی اپنے ہی حساب کتاب سے تول رہی تھی۔ آخر بولی ٹھیک ہے بی بی جو تو نے کہا وہ بھی اسے بتا
دوں گی اور جو وہ کہے گا اس کا تمہیں بتا دوں گی یہ کہا اور دفع ہو گئی میں نے جاتی جاتی کو کہا ہاں ہاں
یہ بھی کہہ دینا امیر جان بھائی جان کو" زہرہ ماجرہ سناتے سناتے خوب ہنسی اور میں نے کہا "میں یہ
سوچ رہا ہوں کہ تمہارے ان نادر خیالات سے آگاہ ہونے کے بعد عزیزم امیر جان عرف امیر
بھائی کا کیا حشر ہوا ہوگا" "ہاں میں بھی کئی مرتبہ یہی سوچ کر مزے لے چکی ہوں۔ میرے ذہن
میں ایک تصور تو بار بار آتا ہے ایک زخمی سُور کا۔ ویسے اور بھی امیج آتے ہیں۔ تب میں نے کہا" اور
میرے ذہن میں یہ امیج آتا ہے کہ اگر وہ نیم بسمل مرد خنزیر نما واقعی ہی گم گشتہ مردانگی کی بحالی کے
لیے طلائی امداد لینے آ گیا تو پھر کیا ہوگا"......"ہوگا کیا میں پاپا کا کمرہ کھول لوں گی اور......"
اور زہرہ نے کھلنڈرے پن سے کہنا شروع کیا مگر اچانک خاموش ہوئی تو کہیں اور تھی۔" پاپا کا کمرہ

Scanned by CamScanner

تو اسی رات سے بند ہے۔ تم سب نے کہا بھی کئی بار۔ اب ہاف مین نے جو تقاضا کیا ہے مگر میں
نے بھی کھولنے کا سوچا نہیں، سچ بتاؤں۔ اسی رات سے بند ہے" زہرہ نے جب یہ انکشاف کیا تو میں
نے گہرا سانس لیا اور یقین ہو گیا کہ وہ رات جو ہم دونوں کے درمیان اُتر آئی ہے۔ آسانی سے
جانے والی نہیں جیسے قربت میں دو انسانوں کے درمیان پہلے سے موجود مگر بظاہر مخفی کہیں آس پاس
چھپا 'غیر' ظاہر ہو جائے اور ان دونوں کی مشترکہ قبولیت کا نذرانہ لیے بغیر ٹلنے سے انکار کر دے۔
میں جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ زہرہ جانتی ہے کہ ہم نے پہلے کبھی یعنی ہم دونوں نے پہلے کبھی
اُس رات پر بات نہیں کی...... اور اب بھی نہ کی اور گہری خاموشی دیر تک ہم دونوں کے درمیان
بھری رہی۔ جیسے بڑے دکھوں عظیم صدموں پر انسان کا اشتراک زبان کو شکست دینے پر ہی ممکن
ہوتا ہے اور انسان خاموشی کی ساجھ میں ایک دوسرے کی قربت کا اعتراف کرتا ہے...... ہم ابھی
تک پتھر کے بنچوں پر ہی بیٹھے تھے۔ چاند آسمان میں آ گیا تھا اور زہرہ کے چہرے پر چاندنی
تھی...... قریبی میزوں کی ٹھنڈی سطح پر اوس جمنے لگی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ میز کی گیلی ٹھنڈک پر پھیرا
اور زہرہ کے چہرے کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سے چپ چاپ باہر جھانکتے پانی میں ان گنت
چاند اتر رہے تھے۔ وہ مسکرائی اور اپنی آنکھیں پونچھیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ خاموشی کی ساجھ
بھی ایک واہمہ ہے۔ ہم دونوں کے درمیان حجابی پردہ اب بھی حائل ہے۔ انسانوں کے درمیان
حجابی، پیلے، ہرے، کالے، سفید، بھورے، سرخ، قرمزی پردے ازل سے ابد تک حائل رہیں گے
مگر انجانا جان لینے کے بعد کوئی ایک آدھ پردہ کچھ دیر کے لیے ضرور ہٹ جاتا ہے۔ شاید اسی لیے
جب ہم چاندنی رات سے اٹھ کر اندر اُسی ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھے تو اب وہ اُس رات کا یاور
عطائی کا ڈرائنگ روم نہیں تھا، ایک عام کمرہ تھا کسی بھی ماضی کے بغیر۔ جیسے اس جگہ کا ایک نیا ماضی
ابھی شروع ہوا ہی تھا۔ جیسے میرا ماضی ابھی شروع ہوا ہی تھا یا ایک عجیب طرح سے مغالطے میں
ڈالنے والی کیفیت تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیسے پن کے اس عظیم الشان دن کا اختتام اسی کیفیت
پر کروں اور رخصت ہو جاؤں مگر ایسا ہونے والا نہیں تھا...... اور جو ہوا اس نے ایک بار پھر
میرے وقت کے بارے میں اُس واہیات نظریے کی یاد تازہ کر دی کہ وقت ایک بلائے ناگہانی
ہے اور یہ بلائے ناگہانی اُس وقت ظاہر ہوئی جب زہرہ کے ساتھ الوداعی لمحے گزارنے کی متوقع
آشفتگی میرے اوپر طاری ہونا شروع ہو چکی تھی...... وہ ادھیڑ عمر عورت، کافی وغیرہ کے برتن

اٹھانے والی ملازمہ کے ساتھ آئی تھی۔ کافی ہم نے زہرہ کی خواہش پر پھر پی تھی اور اچھی خاصی
رات کے کھانے کا نعم البدل تھی۔ برتن اُٹھانے والی کے ساتھ اسے دیکھ کر زہرہ اک دم بھڑک
اٹھی۔ اس نے کہا۔ "نیتی تو...... تو یہاں کیوں آئی ہے" اب میں نے غور سے اس عورت کی طرف
دیکھا۔ سوکھے ہوئے چہرے اور کینہ توز گول آنکھوں کے ساتھ وہ ایک سال خوردہ لومڑی لگ رہی
تھی اور جب وہ بولی تو روایتی مسکین لومڑی کا تاثر بھی قائم ہو گیا۔ اس نے زہرہ کو کچھ بتایا کہ وہ
ملازمہ کی کام میں مدد کے لیے ساتھ چلی آئی۔ اب تو زہرہ آگ بگولا ہو گئی۔ "تو جس کام کے لیے
آئی ہے وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں مگر اب تو صرف ایک کام کرے گی۔ اسی وقت اس گھر سے
دفان ہو جائے گی۔ سنا تم نے۔"
میں کہ میری نظریں اسی عورت کے چہرے پر جمی تھیں، حیران ہوا کہ عام ملازم پیشہ افراد کی
طرح کے ایسے موقعوں کے ان کے مدافعتی ردعمل کہیں موجود نہ تھے بلکہ مسکینی بھی نہایت عارضی
ثابت ہوئی تھی اور اب وہ ایک عیار لومڑی لگ رہی تھی۔ اس کی حیوانی مکاری اس قدر نمایاں اور
چیلنجنگ تھی کہ میرا ذہن جانوروں کی مہلک علامتوں سے گھر گیا جیسے حیوانی نمائندگیوں کا چڑیا گھر
کھل جائے۔ لومڑی، سانپ، بھیڑیا، کوا، چیل، بچھو، گدھ سب اُس عورت کی ذات میں سمٹ
گئے تھے۔ میں نے ایک نظر زہرہ کو دیکھا واضح طور پر وہ بھی مرعوب نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ عورت بولی
اور اب تو اس کی آواز بھی بدل رہی تھی "میں کب یہاں رُکنے والی ہوں بی بی مجھے مالکوں نے واپس
بلا لیا ہے۔ میں تو اپنا سامان لینے آئی ہوں اور تجھے سب کچھ نہیں بتاؤں گی جو اس نے کہا مگر میں
جاتے جاتے بس تجھے اتنا سمجھانے آئی ہوں کہ جس عورت پر اُس کی خواہش آ جاتی ہے وہ اپنے
اندر کو اس سے بچا نہیں سکتی، لاکھ بھاگتی پھرے آخر ایک دن وہ اس کی ٹانگوں میں پورا آ جاتا ہے
اور سب کچھ کھول دیتا ہے۔ کبھی سانپ اور تتلی کو دیکھا ہے تتلی بڑے بل کھاتی ہے مگر موٹا سانپ
آخر سارے کس بل نکال دیتا ہے" وہ ہنسی اور اس کے جسم میں لرزش تھی اور آنکھیں دھندلی اور جیسے
وہ اپنے آپ کو کہیں اور ہی دیکھ رہی تھی اور پھر بولی "کبھی چیل کو دیکھا ہے کوئی ایک چائیں چائیں
کرتی ہے، پر آخر بولتی بند ہو جاتی ہے" وہ پھر ہنسی اور بولی: "اور تو اور گدھی بڑی دولتیاں مارتی ہے
مگر آخر گدھا تک آ جاتا ہے۔"
میں مانتا ہوں میں مبہوت سا ہو کر اس غیر معمولی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں

Scanned by CamScanner

سے اب نر مادہ جانور کے ازلی تعلق کی ساری سفاک لذت ٹپک رہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف مڑی اور مڑتے مڑتے رُک کر اس نے ایک قاتلہ کی نظر سے مجھے دیکھا جس کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا "اور تیرے ساتھ تو وہ ہوگا ناں جو کسی کے ساتھ کبھی ہوا نہیں ہوگا۔" زہرہ تڑپ کر اٹھی اور غصے اور نفرت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی "دفع ہو جا ذلیل بڑھیا۔" مگر ذلیل بڑھیا یہ آخری حکم سننے سے پہلے ہی جا چکی تھی اور اس کے بعد ملازمہ بھی برتن سمیت گرتی پڑتی بھاگ گئی.........

ڈرائنگ روم میں گہری خاموشی تھی ہم دونوں تھے اور وہ کیفیت تھی جو نیتی نامی اس عجیب و غریب عورت کی عجیب و غریب باتوں نے قائم کر دی تھی۔ میں مانتا ہوں کہ کم از کم میری حد تک وہ کیفیت ایک ایسی ہی بے چین کیفیت تھی جیسے کوئی دو بچے اچانک کوئی ننگی تصویر دیکھ لیں اور ایک دوسرے سے زیادہ دوسرے کے ردِ عمل کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہو جائیں۔ شاید اسی بے یقینی سے 'ہم دونوں' کو نکالنے کے لیے میں نے ایک "صورتِ حال کو سنبھالنے والے" کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ خاموشی میں اس کیفیت کو ختم کر لینا ہم دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ چنانچہ بزعم خود میں نے خاموشی کو توڑنے کی کامیاب کوشش کی تھی جب میں نے بظاہر ایک معتدل لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے زہرہ سے کہا تھا "یہ عجیب و غریب کریکٹر تھی یہ عورت" مگر بعد کی گفتگو جو ہم دونوں میں چلی اس نے مجھے فوراً ہی باور کرا دیا کہ 'ہم دونوں' ہی نہیں بلکہ دنیا کے کوئی بھی 'ہم دونوں' 'ہم دونوں' کے بارے میں کبھی کوئی پختہ فیصلہ نہیں کر سکتے اور ایسا پختہ فیصلہ کرنا سب سے بڑی خام خیالی ہے۔ اب ایسا نہیں کہ یہ نام نہاد آفاقی حقیقت پہلی بار میرے اوپر آشکار ہوئی تھی۔ یہ ایک کافی روزمرہ کی حقیقتوں کے میرے سٹاک میں پہلے سے موجود تھی اور میں روزمرہ کے انسانی تعلقات میں اکثر اس سے کام چلایا کرتا ہوں لیکن گیگلے پن کے اس دن، ان طویل نشستوں (جو اصل میں ایک ہی نشست تھی مگر کئی ذہنی جذباتی مراحل میں منقسم ہونے کے ناطے کئی نشستوں جیسی بھی تھی) کے دوران جن کیفیتوں سے ہم دونوں گزر رہے تھے۔ (بلکہ شاید کہنا چاہیے کہ میں گزر رہا تھا) مرد اور گیگلا۔ بہار کے آخری پھولوں کے ہیجان۔ گھگی کا انتہائی تھپیڑ......... یہ ایک کتاب نہیں ہے۔ کتاب زندگی۔ زہرہ کے جسم کو چھونے کی خواہش۔ 'ہم دونوں' کے واہمے کا جادوئی حقیقت بن جانا اور ان گنت لمحے، اضطراب، احساس، جنہیں نام دینا محال ہے، اس سب

کچھ نے مجھے مذکورہ بالا چالو حقیقت سے کچھ دور کر دیا، بہرحال...... میرے اس نیوٹرل سے فقرے کہ "یہ عجیب و غریب کریکٹر تھی۔ یہ عورت" کے جواب میں زہرہ نے غصے سے کہا "یہ کوئی کریکٹر نہیں تھی یہ دَسی تھی اور اسی گندے سور کے لیے بول رہی تھی سب کچھ۔" (یہاں اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں زہرہ اور اپنی گفتگو جو اس مقام سے آگے ہوئی اسے مسلسل نثر کی شکل میں لکھنے کی بجائے الگ الگ مکالموں کی شکل میں لکھوں جیسے ڈرامے لکھنے والے لوگ لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت سے پہلے رجسٹر کے کاغذ زیادہ خرچ ہوں گے مگر ابھی کافی پڑے ہیں۔ خالی، ابھی کافی کاغذ پُر کرنے باقی ہیں اور مقصد تو ان کاغذوں کو بھرنا ہی ہے جب بھی بھر جائیں اور میری جان اس خواہ مخواہ کی تحریر بازی۔ ڈائری بازی سے چھوٹے اور آج کے اس عظیم دن، کی ڈائری بازی نے تو اگلا دن کر دیا ہے۔ کب سے 24 اپریل آ چکا ہے۔ اس وقت دن چڑھا ہوا ہے تھوڑی دیر پہلے صبح ہو گئی تھی، میں نے لکھنا درمیان میں چھوڑ کر (کیا کہنے لکھنے کے) ناشتہ بنایا تھا اور دو پیالے سخت بولی کافی کے پیے تھے کیونکہ یہ لازم ہے کہ میں اس واردات (وارداتوں) کو اسی تسلسل میں پکڑتا جاؤں۔ اگر نیند نے آ لیا تو سب کچھ بکھر جائے گا (گو کہ اس سے بھی رتی برابر فرق نہیں پڑے گا) بہرطور میں آگے مکالمے لکھتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کیا نئی صورت حال بلکہ نثری صورت حال پیدا ہوتی ہے۔)

000

Scanned by CamScanner

باب(18)

نیلے رجسٹر کے مندرجات-4

روزنامچہ بذریعہ سادہ مکالمہ نویسی و خودکار مشترکہ ہذیانی مکالمہ نویسی وغیرہ

24اپریل جاری:

(24اپریل کا روزنامچہ جو 25 اپریل کو لکھا گیا)......... زہرہ۔''یہ کوئی کریکٹر نہیں تھی۔ یہ وہی تھی اور وہ اسی گندے سُور کے لیے بول رہی تھی۔ وہ سب کچھ۔''

میں۔''آ...... ہاں...... وہ...... وہ تو...... خیر ٹھیک ہے مگر وہ سب کچھ...... میرا مطلب ہے ایک عورت ہو کر...... وہ انداز بیان کافی غیر معمولی تھا۔''

زہرہ۔(مزید غصیلی آواز میں)''ایک عورت ہو کر؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟''

(میں تھوڑا گھبرا جاتا ہوں۔ مجھے صاف محسوس ہوتا ہے کہ زہرہ تو کہیں اور سے بول رہی ہے۔ وہاں سے نہیں جہاں سے میں سمجھتا تھا کہ وہ بولے گی۔)

میں۔''ہمارے ہاں...... خواتین خواہ جنس کے موضوع پر ہی کیوں نہ بات کریں...... بلکہ...... بلکہ اس طرح کیوں کہ اگر انہیں کسی مرد کی جنسی دھمکی کو...... کسی دوسری خاتون تک پہنچانے کا...... میں کہوں گا کہ...... خوفناک حد تک خلاف معمول کام ہی کیوں نہ سرانجام دینا ہو...... پھر بھی ایسا پیرایۂ اظہار...... وہ اختیار نہیں کر سکیں گی...... جو ابھی اس خاتون...... کیا نام...... ہاں...... محترمہ نجی نے اختیار کیا......''

زہرہ۔(بدستور مجھے غصیلی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور میں سوچتا ہوں غصہ کس پر ہے

اس فقیر پر یا نجی پر)''ہوں...... تو گویا...... یہ...... جو تم کہتے ہو۔ انداز بیان...... پیرایۂ اظہار...... یہ...... اس کا حق...... اس کے استعمال کا...... اسے اختیار کرنے کا حق...... صرف مردوں کو حاصل ہے؟''

میں۔(ہنسنا چاہتا ہوں مگر نہیں ہنستا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زہرہ اور میری گفتگو کچھ عجیب تار پر چلنے کی کیفیت میں آ گئی ہے۔ کوئی بھی غیر محتاط قدم توازن بگاڑ سکتا ہے)''آ...... میں ذاتی طور پر...... اپنے کسی...... ایسا کوئی حق حاصل نہیں کرنا چاہتا جس کے ذریعے نر جانور کے ہاتھوں مادہ جانور کی اذیت ناک جنسی تسخیر کی منظر کشی کی جائے۔''

زہرہ۔''ہوں......''

میں۔''مگر اب یہ غصہ تھوک دو۔ اس عورت نے عزیزی امیر جان کے جذبات تم تک۔ بلکہ شاید مجھ تک بھی۔ منتقل کرنے تھے۔ وہ اس نے کیے اور رواں ہو گئی۔''

زہرہ۔''مجھے غصہ اس بات پر ہے کہ میں اس 'ذلیل کتیا' کو اسی کی زبان میں جواب کیوں نہ دے سکی۔''

میں۔(میں مانتا ہوں کہ زہرہ کی یہ بات سُن کر مجھے کچھ حیرت ہوئی ہے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ زہرہ کے سلسلے میں کسی بھی وقت کوئی بھی حیرت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی جو بات منہ پر آ چکی ہے وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ دیتا ہوں)''آ...... وہ...... میرا خیال ہے یہ تمہارے لیے ممکن نہ ہوتا۔''

زہرہ۔(بھڑک کر)''کیوں کیا اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں......؟''

میں۔''نہیں...... یہ میرے لیے بھی ناممکن ہوتا...... میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔''

زہرہ۔''کیوں؟ تمہارے لیے کیوں ناممکن ہوتا......؟''

میں۔''اس لیے کہ میں مرد نہیں ہوں۔ میں گیگلا ہوں...... کتنی دفعہ یقین دلاؤں۔''

(زہرہ ہنس پڑتی ہے اور اس کی ہنسی میرے اندر اتر جاتی ہے۔ پھر وہ اپنی مخصوص اضطرابی کیفیت میں سر کو جھٹکتی ہے۔)

زہرہ۔''آئی ایم سوری...... میں بھول جاتی ہوں گیگلے......''

میں۔''مت بھولو...... آج ہم یہی کچھ تو حاصل کر سکتے ہیں۔ مرد اور عورت کے فرق سے آگے کا گیگلا پن...... یہ ایک کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک مرد نہیں ہے۔ یہ ایک عورت نہیں ہے......''

Scanned by CamScanner

زہرہ۔"اس لیے میں کہوں گی کہ یہ مت بھولو کہ عورت اور مرد کے فرق کے اندر بھی میں ایسی عورت ہوں جو تم جیسی عورت کو اس کی زبان میں جواب دے سکتی ہے.....اور یہ جو تم نے منہ بنا بنا کر کہا ہے، نر جانور کے ہاتھوں پتہ نہیں کیا مادہ جانور کی اذیت ناک تسخیر.....،"

میں۔"جنسی تسخیر"(اب میں ہنس پڑتا ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہنس پڑنے میں کوئی حرج نہیں۔)

زہرہ۔"ہاں وہی.....تو یہ میرے لیے.....کوئی ایسا شی موضوع نہیں۔"

میں۔"شی شی خوبصورت ہے.....اچھا ہے۔"

زہرہ۔"آخر میرا باپ بھی تو ساری عمر نر جانور کو مادہ جانور کی تسخیر کی ترغیب دے کر خوش ہوتا رہا.....میرا باپ میرے لیے اب کوئی راز نہیں ہے۔"

میں۔"نہیں یار عطائی کو اتنی جلدی رازوں سے محروم نہ کرو....."(میں چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ڈرائنگ روم اُس اورتی کی رات کے مناظر سے بھر جاتا ہے۔ زہرہ بھی یک دم خاموش ہو جاتی ہے اور میری طرف دیکھ رہی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے مان لیا ہے کہ میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا۔ وہ مسکراتی ہے۔)

زہرہ۔"ہم انعام گزٹ کب جا رہے ہیں۔"

میں۔"جب بارش ہوگی۔"

زہرہ۔"بارش کب ہوگی؟"

میں۔"جب آسمان پانی کا بوجھ برداشت نہیں کر پائے گا۔"

زہرہ۔"دیکھئے تم شاعر بھی.....شاعری بھی کبھی کی تم نے.....؟"

میں۔"اللہ مجھے اس روگ سے محفوظ رکھے.....شاعری کیا میں نے تو نثری بھی نہیں کی کبھی۔"

زہرہ۔"اب مجھے پھر یہ تم مت بتاتے بیٹھ جانا کہ تم ایک کرائے کے ادیب ہو اور یہ کہ تمہارا کوئی دین ایمان نظریہ عقیدہ نہیں۔ کرائے پر جو چاہے لکھوا لے بہت دفعہ سُن چکی ہوں....."

میں۔"اب میں کرائے پر تحقیق شروع کرنے والا ہوں۔"(میں زہرہ کو پروفیسر نذیر اور تھیسس کے متوقع کام کے بارے میں بتاتا ہوں جس سے میں کل ملاقات کرنے والا ہوں۔)

زہرہ۔(بہت دلچسپی لیتی ہے)"ہوں.....جو موضوع طے ہو وہ مجھے بھی بتانا....."

میں۔"ضرور بتاؤں گا.....ویسے اچھا ہوا.....وہ کم بخت تھی تو تمہارے ذہن سے اتر گئی۔"

زہرہ۔(گہری سانس لیتی ہے)"اور اور تم نے.....پھر مجھے اس کی.....جان بوجھ کر یاد دلا دی۔"

میں۔"ہاں اس لیے کہ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم اسے بالکل ہی بھول جاؤ۔"

زہرہ۔"کیا مطلب۔"

میں۔"میں نہیں چاہتا کہ وہ اور اس کی گفتگو ہمارے درمیان ایسے ہی پھنسی رہے جیسے ایک.....کیا کہنا چاہئے.....ایک.....ایک بدبودار سی وراثت بن کر نہیں.....کیا کہنا چاہیے.....ایک ناقابلِ فہم سا تیز دھار چھلاوہ.....نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیا بکواس کر رہا ہوں۔"

زہرہ۔(ہنس پڑتی ہے۔ اگرچہ میں نے اسے محض ہنسانے کے ارادے سے بکواس نہیں کی تھی۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارے درمیان پھر ویسے ہی لفظی کھیل کا آغاز ہونے والا ہے جیسا سہ پہر کو باہر لان میں بھولائی اور اس کے چیلے کے درمیان ہوا تھا۔ اب جبکہ میں یہ سب کچھ یاد کر کے لکھنے بیٹھا ہوں میں اپنی طرف سے پوری ایمانداری سے بھر رہا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اصل میں یہ سب کچھ کسی مافوق اللسانی سطح پر اسمائے صفت کے اچانک بے قابو ہو جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسمائے صفت پر ہر وقت کا پہرہ لسانی جبر کی ایک کیفیت ہے اور اس وقت اچانک مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا ہے بلکہ بہت پہلے سے موجود شک کی تصدیق ہو رہی ہے کہ میری لسانی بیماری یہی صفات ہی ہیں بہرحال.....مکالمے نویسی میں واپس آتے ہوئے اور اس عظیم دن میں واپس جاتے ہوئے۔)"

زہرہ۔"چھپتی ہوئی نگی نحوست.....تمہاری بیماری۔"

میں۔"ہاں.....متعفن مجھداری....."

زہرہ۔"بے حیا بیاری"

میں۔"فحش بیزاری"

زہرہ۔"جنسی الماری"

میں (میں جنسی الماری کی معنویت پر سر دھنتا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور اب کی باری محض قافیہ ملانے کے لیے)"بے شرم سناری۔"

زہرہ۔(قہقہے لگاتی ہے)"خواہ مخواہ سناری کو بدنام نہ کرو۔ وہ حرامزادی تو لوہاری بھی

Scanned by CamScanner

نہیں۔ (سوچتی ہے) اچھا...... اچھا...... بدبخت کراری۔ نہیں یہ نہیں۔"

میں۔ "بہت معیاری (میں کہہ دیتا ہوں) نہیں یہ نہیں......"

زہرہ۔ (زہرہ کے پاس بھی قافیے کم پڑ رہے ہیں) "ہوں...... ہوں...... امبر جان کی پیاری"

میں۔ (فوراً ہی میرے منہ پر آتا ہے) "عطائی کی عیاری۔"

("عطائی کی عیاری" پر ہم دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ زہرہ کی آنکھوں میں چمک ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ جسے میرا اب جی چاہتا ہے کہ یوں لکھوں اس کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ آتی ہے پھر وہ اپنے سر کو جھٹکتی اور کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "ہاں...... یہ سب کچھ عطائی کی عیاری کا ہی کیا دھرا ہے......" (شاید یہ میرا واہمہ ہے یا زہرہ کی آنکھوں کا رخ کمرے کی روشنیوں کی جانب کچھ ایسا ہے کہ مجھے ان کی چمک بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اب اس کے ہونٹوں پر کوئی شرارت بھرا ممنوعہ کام کرنے سے پہلے کی دھک دھک کرتی کیفیت ہے جو لحظہ لحظہ بڑھ رہی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ مگر کام...وہ کیا ہوگا یہ نہیں جانتا۔ پھر وہ بولتی ہے تو اس کا لہجہ انسان کی ازلی و ابدی سازشوں سے بھرا ہوا ہے۔)

زہرہ۔ "گرگلے......"

میں۔ "ہوں......" (اس 'ہوں' میں شریک جرم بننے کی مکمل رضامندی اور بے اختیاری ہے۔)

زہرہ۔ "وہ کمرہ ابھی تک بند ہے۔"

میں۔ "کونسا کمرہ" (میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہتا ہوں۔ مگر میرے اندر بھی آنے والا وہ لحظہ دھک اُٹھتا ہے جس کا شاید مجھے ہمیشہ سے انتظار تھا۔)

زہرہ۔ "میرے باپ کا کمرہ۔ یار عطائی کا کمرہ۔ عطائی کی عیاری۔"

میں۔ "جنسی الماری"

(زہرہ ہنستی ہے مگر میں اب اس کی ہنسی میں شامل ہونے سے احتیاط کرتا ہوں۔ پھر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ یہی بات مجھے مضطرب کرتی ہے۔ پھر جو کچھ وہ کہتی ہے اس پر مجھے حیرت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔)

زہرہ۔ "تم تینوں وہ کمرہ کھولنے کے لیے کتنے بے چین تھے......"

میں۔ "آ۔ ہا...... ہاں...... وہ ہاف مین کے لیے تو...... اب...... اب تو اس کے...... وہ......

تم...... وہ خط...... اس کا وہ سفارت خانے۔ کے کسی شخص نے جو شرط رکھ دی ہے......" (میں اپنے آپ سے بہت ہی غیر مطمئن سا ہو جاتا ہوں۔ زہرہ جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت ہی بے یار و مددگار محسوس کرتا ہوں۔ جیسے تیز روشنی کے نیچے انسان ننگا ہو جائے۔ پھر اچانک زہرہ کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "مجھے عجیب سا احساس ہوتا ہے گرگلے۔"

میں۔ "کیا؟"

زہرہ۔ "جیسے کوئی اپنے بہت عزیز رشتوں سے محروم ہو جاتا ہے تو محسوس کرتا ہے...... جیسے بھرا در گویا...... دور ہٹ گئے ہیں۔ کہیں اور چلے...... کیا کہنا چاہیے...... ہوں......"

(میں اب بہت کچھ کہہ سکتا ہوں مگر میں اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ خاموش رہتا ہوں اور جلد ہی مطمئن ہو جاتا ہوں کہ اس وقت خاموشی ہی اس کی سب سے بڑی مدد ہے۔ دونوں خاموش ہیں۔ پھر ہم دونوں اپنی اپنی خاموشی کے غار سے کیسے نکلتے ہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میں اس کی آنکھوں میں چمک کو آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ واپس دیکھتا ہوں...... کیا میں لکھوں۔ "جیسے کوئی موت سے پلٹ آتا ہے" نہیں یہ اس صورت حال کا درست بیان نہیں ہوگا۔ تو پھر...... بہر حال...... میں اسے گرفت میں نہیں لے سکتا...... اس کی آنکھوں میں پھر سے شریر بچوں کی سی چمک ہے اور یہی میرے لیے کافی ہے۔ بہت کافی ہے اور وہ کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "آؤ"

ہم دونوں اُٹھتے ہیں اور اب جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں تو گہری قربت کا ویسا احساس ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جیسا صرف شریک جرم انسانوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ وہ بے ساختہ میرا ہاتھ پکڑتی ہے باہر کی طرف کھینچتی ہے اور کہتی ہے، "آؤ ہم دیکھتے ہیں......"

(ہم عطائی کے ڈرائنگ روم کے سنگین ماضی سے باہر آتے ہیں اور اس کے رازوں بھرے مقفل کمرے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ کاری ڈور میں مدھم روشنی ہے۔)

زہرہ۔ "اوہو...... چابی......"

(زہرہ چابی لینے واپس ڈرائنگ روم میں جاتی ہے۔ میں اکیلا کھڑا رہ جاتا ہوں اور پھر کسی بھی تخیلی اشارے کے بغیر غیر حقیقت کا احساس اس شدت سے مجھ پر وارد ہوتا ہے کہ متحیر کر دیتا ہے اور

Scanned by CamScanner

یہ تجربہ بھی انتہائی غیر حقیقی ہے...... جیسے ابھی سب کچھ گھوم جائے گا اور میں اگلے لمحے اپنے آپ کو زمان و مکان کے کسی اور ہی منطقے میں برآمد ہوتا پاؤں گا۔ غیر حقیقت کا یہ احساس آگہی کے تھپیڑے سے پیدا ہے اور جو گزر جاتا ہے۔ میں ابھی وہیں کھڑا ہوں اور زہرہ کا انتظار کر رہا ہوں جو چابی لینے اندر گئی ہے...... اور اب کچھ اور ہوتا ہے جو پہلے کے برعکس بھی ہے اور نہیں بھی مگر اس سے کہیں زیادہ متوحش کرنے والا ہے۔ یہ ایک خالصتاً حد تک شدید آگاہی کی کیفیت ہے ہر چیز سے انتہائی حد تک آگاہ ہونے کا احساس۔ اپنے آپ سے بھی...... جو عام قسم کی خود آگاہی سے بہت مختلف ہے...... کاریڈور میں جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ۔ فضا میں مدہم خوشبوئیں...... اور اس عمارت میں اپنی موجودگی...... پھر مجھے احساس ہوتا ہے کہ عطائی کی بیٹی کے گھر میں موجود ہر شخص اس وقت میرے وجود سے آگاہ ہے اور اُن بھانت بھانت کے ذہنوں میں زہرہ اور میرے تعلق کے ہزار ہا نقشے بن رہے ہیں۔ میں ان نقشوں سے آگاہ ہوتا ہوں اور پھر یہ بھی گزر جاتا ہے...... اب یہ تجسس غالب آتا ہے کہ عطائی کا کمرہ کھول کر وہاں کیا نظر آئے گا۔ مگر پھر اس پر بھی حاوی اور پہلی دفعہ اس خاص حوالے سے ہمراز ہاف مین کا خیال آتا ہے...... جب انہیں پتہ چلے گا کہ میں نے اور زہرہ نے مل کر...... زہرہ آجاتی ہے اور میں واپس پہلے والی کیفیت میں آجاتا ہوں۔ زہرہ پہلے سے بھی زیادہ کھلنڈرے جوش کی کیفیت میں ہے۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک گچھا ہے جسے وہ فخر سے چھنکاتی ہے۔)

زہرہ۔ ”آؤ“

(ہم کاریڈور میں آگے بڑھتے ہیں۔ زہرہ میری طرف دیکھ کر کہتی ہے)

زہرہ۔ ”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنے ہی گھر میں ڈاکہ ڈالنے جا رہی ہوں۔“

(ایک لمحے کے لیے میرا ذہن اُس کے فقرے کے کسی ممکنہ گہرے معانی کی طرف جاتا ہے مگر میں کچھ نہیں سوچتا۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے دیتے رہنا میرے لیے زیادہ آسودگی کا مقام ہے۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھتے ہیں۔ زہرہ ہنس پڑتی ہے۔)

زہرہ۔ ”کیا پاگل پن ہے۔ مزے سے جاتے ہیں۔ نارمل انداز میں۔ بھلا کون دیکھ رہا۔ کون مجھے منع کر رہا ہے۔“

میں۔ ”تم خود“ (میں صرف اتنا ہی کہتا ہوں میں زیادہ بولنا نہیں چاہتا۔ میں کسی اضطراری کیفیت میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ ہم اس پرانی عمارت کے کاریڈور

کے آخر میں جا پہنچتے ہیں بالکل سامنے ایک بند دروازہ ہے۔ جو باہر گھاس کے قطعوں اور پھول چلواڑیوں کی طرف کھلتا ہے۔ اس کے دروازے کے اوپر پرانی طرز کے افقی سمت میں پیچھے کو گر کر آدھے کھلے روشن دان ہیں۔ جن کے اوپر سے چاندنی رات کی دو مستطیلیں نظر آ رہی ہیں اور کسی اونچے درخت کی ٹہنیاں جو باہر کہیں عمارت کے ساتھ ہی ہے۔ لہرا کر سامنے آ جاتی ہیں۔ بائیں طرف وہ مقفل دروازہ ہے اور وہ کمرہ ہے)

میں۔ ”باہر ہوا چل رہی ہے۔“

زہرہ۔ ”نہیں...... ہاں...... کچھ آواز آ رہی ہے۔ اپریل کی رات کے آخری پہر میں تیز ہوا۔ کہیں بارش تو نہیں آنے والی۔“

میں۔ ”نہیں۔ چاندنی تو پوری کھلی لگتی ہے۔“

زہرہ۔ ”ہم کن باتوں میں پڑ گئے...... پتہ نہیں چابی کونسی ہے......“

میں۔ (جانتے ہوئے بھی) ”کیا یہی کمرہ ہے؟“ (زہرہ ایک چابی لگاتی ہے پھر دوسری، تیسری مگر تالا نہیں کھلتا، پھر اور چابیاں لگاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ اضطرابی کیفیت میں سلسلہ کرتی جا رہی ہے۔ اگرچہ میں بھی مضطرب ہوں مگر میں گچھا اس کے ہاتھ سے لیتا ہوں اور ایک ایک کر کے الگ الگ کرتے ہوئے چابیاں لگاتا ہوں آخر کلک کی وہ آواز آتی ہے جسے سننے کے ہم منتظر تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جس میں ہے کہ ”اب واپس جانا مشکل ہے......“ زہرہ بند پرانے طرز کے کنڈے کو بائیں طرف حرکت دیتی ہے اور کھٹاک کی بلند آواز سنسان برآمدوں میں پھیل جاتی ہے۔ اب صرف دروازے کو آگے دھکیل کر کھولنا باقی ہے۔ زہرہ دروازے کو دھکیلتی ہے اور میری اس توقع کے برعکس کہ وہ آسانی سے نہیں کھلے گا کہ عرصے سے بند ہے دروازے کے دونوں پٹ دائیں بائیں کھل جاتے ہیں اور کمرہ ایک دم کسی تاریک امکان کی راہ دکھاتا ہے۔ مگر سامنے ایک دبیز پردہ حائل ہے جیسا پرانی طرز کی عمارتوں میں دروازوں کے آگے اوپر کو لگے لکڑی کے فریم میں آویزاں کیا جاتا تھا۔ ابھی ہم سامنے پردے اور پیچھے کھلے دروازے کے درمیانی خلا میں کھڑے ہیں اور وہ خوشبو ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ نامعلوم باتات کی ایک مجموعی سی مہک جو عرصے سے بند کمرے کی باس کے ساتھ مل کر ایک ناگوار سا تاثر پیدا کر رہی ہے۔ اچانک ہماری نظروں کے سامنے پردہ زور سے ہلتا ہے جیسے کوئی اندر سے باہر آتا

Scanned by CamScanner

چاہتا ہوں۔ زہرہ کے منہ سے ایک ہلکی سی خوفزدہ سی آواز نکلتی ہے۔ میں ہنستا ہوں)

میں۔ "ہوا ہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ اندر کوئی روشن دان شاید کھلا ہوگا۔ یہ دروازہ کھلا تو ہوا نے رستہ بنالیا۔" (کمرے سے آنے والی خوشبوئیں یا بدبوئیں اب اور بھی نمایاں ہو جاتی ہیں)

زہرہ۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

میں۔ "کہ کہیں عطائی کی روح نہ ہو؟"

زہرہ۔ "نہیں۔۔۔ ایسا۔۔۔ تو شاید نہیں۔۔۔ یوں تو میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔۔۔ مگر۔۔۔ اگر پاپا کی روح واقعی یہاں نظر آ جائے تو مجھے تو بہت اچھا لگے گا — (ایک دم ہنستی ہے) البتہ میری ماں کو نظر آ جائے تو شاید کھڑی کھڑی فوت ہو جائے۔" (اب ہوا کا پہلے سے بھی زوردار جھونکا کمرے کے اندر سے کہیں نکل کر پردے کو اڑاتا دروازے کی راہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور زہرہ تیزی سے آگے بڑھ کر پردے کو دائیں بائیں سمیٹ دیتی ہے۔ برآمدے کے بلب کی روشنی ایک ترچھی تکون کی شکل میں فرش پر بچھے ایک پرانے قالین پر پھیل جاتی ہے اور کمرے میں رکھے ایک پلنگ کا کچھ حصہ بھی یک دم ظاہر ہو جاتا ہے۔ زہرہ بائیں مڑ کر دروازے کے پٹ کے پیچھے دیوار پر کچھ ڈھونڈتی ہے اور پھر الیکٹرک سوئچ ایک ایک کر کے دبانے لگتی ہے اور جگہ جگہ برقی روشنیاں چھت پر، دیوار پر اور چھوٹے بڑے لیمپوں کی شکل میں روشن ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ اب ہم پاپا عطائی کے کمرے میں ہیں۔ فوری تاثر ایک بہت طویل کمرے کا ہے۔ جس رخ سے ہم داخل ہوئے ہیں اس رخ سے چوڑائی میں کم مگر پیچھے دور تک ہے اور یہ کمرے کا پچھلا حصہ ہی ہے جو سب سے پہلے ہماری توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کمرے کے نصف سے آگے تینوں اطراف میں بڑے بڑے آہنی شیلفوں کی الماریاں ہیں جیسی لائبریریوں میں کتابوں کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ مگر ان شیلفوں میں کتابیں نہیں کچھ اور ہی چیزیں ہیں ایک جیسی مگر لاتعداد۔ میں آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا ہوں بادی النظر میں اور اتنے فاصلے سے جو پچیس فٹ سے کم نہ ہوگا۔ وہاں گولائی مائل برتن سے نظر آتے ہیں۔ ہم پلنگ اور کئی طرح کی چھوٹی بڑی میزوں اور نشستوں میں سے گزرتے آگے بڑھتے ہیں۔ کمرے کے عین درمیان تقریباً دس فٹ کی بلندی پر آمنے سامنے دیواروں میں نصب ایک موٹا آہنی پائپ ہے جس پر اتنی ہی موٹائی کے چھلے ہیں جو دونوں اطراف میں موٹے پردوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے

کہ اس انتظام کے ذریعے کمرے کے پچھلے حصے کے سامنے یہ پردہ حائل کیا جا سکتا ہے مگر اس وقت یہ پردہ ہٹا ہوا ہے۔ ہم شیلفوں کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔)

زہرہ۔ "میرے خدا۔ یہ۔۔۔ کیا ہے۔۔۔؟ یہ کیا چیزیں ہیں۔۔۔"

(یہی سوال میں بھی زہرہ سے کر سکتا ہوں۔۔۔ ہم دیکھتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیشے کے سینکڑوں مرتبان ہیں جو موٹے شیشے کے ڈھکنوں سے بند ہیں۔ یہ کچھ ویسے ہی ہیں جیسے پیتھالوجسٹ اپنی لیبارٹریوں میں عمل جراحی کے بعد الگ کیے گئے انسانی اعضاء، غیر معمولی رسولیاں اور دیگر دلچسپ نمونوں کو الکحل میں محفوظ کر کے نمائش کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔۔۔ یہاں ان مرتبانوں میں ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے مگر جو ہے وہ کسی بھی قسم کے مریضانہ حیاتیاتی نمونوں سے زیادہ حیران کرتا ہے۔ شیشے کے ان شفاف برتنوں میں جن کی ان گنت قطاروں سے وہ شیلف بھرے پڑے ہیں ہر ایک میں رول کیے ہوئے کاغذ رکھے ہیں کہیں ایک اور کہیں دو اور کہیں بہت سے اکٹھے لپیٹ کر رکھے ہوئے ہیں۔ رول کیے ہوئے ان کاغذوں کے ساتھ ہر مرتبان میں جو کچھ ہے وہ گو کہ عطائی کی دنیا کا سب سے زیادہ متوقع منظر ہے مگر گول شفاف برتنوں میں اس کی منظر کشی نامعلوم بے چینیوں کو پیدا کرتی ہے۔ کاغذوں کے ساتھ۔۔۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سکرولز۔۔۔ تو سکرولز کے ساتھ ہی خام حیاتاتی، معدنی بلکہ شاید حیوانی ماخذ سے متعلق بھی مختلف ہیئت کی اشیاء بند ہیں۔ خشک پتے، پھول، جڑیں، ڈلیاں، سفوف، برادے، بظاہر کنکر نما چیزیں۔ حتیٰ کہ دھاتی ٹکڑے اور کہیں کہیں خشک مگر قابل شناخت کیڑے مکوڑے۔۔۔)

زہرہ۔ (گہری سانس لیتی ہے) "میرے خدا یہ کیا ہے۔۔۔؟"

(پتہ نہیں کیوں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں زہرہ کے اس سوال کا فوری جواب دوں۔ خواہ وہ جواب کچھ بھی ہو۔ میں مرتبانوں کو اور قریب سے دیکھتا ہوں۔ ہر مرتبان کے باہر ایک لیبل نما کاغذ کا ٹکڑا ہے جس پر کسی نہ کسی مرد کا نام لکھا ہے اور اس کے نیچے کہیں ایک اور کہیں دو تاریخیں درج ہیں اور ان کی اہمیت ظاہر کرنے والے تین چار الفاظ۔ "مرتبان کھولا گیا" "مرتبان بند کیا گیا" میں دیکھتا ہوں کہ کچھ تاریخیں بہت پرانی ہیں۔ کچھ مرتبان کھل کر کئی برس بعد بند ہو چکے ہیں اور کچھ پر بند ہونے کی تاریخیں درج نہیں گویا بدستور کھلے ہیں۔)

(زہرہ بھی وہی کچھ دیکھ رہی ہے جو میری نظروں کے سامنے ہے۔ مگر وہ پوچھتی ہے یا شاید

Scanned by CamScanner

بغیر پوچھے کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "یہ کیا ہے...... یہ سب......"

(میں جان جاتا ہوں کہ اب لازم ہے کہ ہم کچھ بات کریں۔ جیسے ان سب افراد کے ساتھ ہوتا ہے جو اکٹھے حیرت ناک نظاروں کے ناظر بنتے ہیں۔ ابتدائی حیرت چند لمحوں کے لیے انہیں ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا کر دیتی ہے مگر پھر یہ جدائی ان کے لیے سنبھالنی مشکل ہو جاتی ہے اور وہ تیزی سے مکالمے کے تحفظ کی طرف پلٹتے ہیں۔ میں فیصلہ کرتا ہوں کہ میں زہرہ کو وہ سب کچھ ویسے کا ویسے بتاتا جاتا ہوں جو میرے ذہن میں سے گزرتا جاتا ہے۔)

میں۔ "میں ان رول کیے ہوئے کاغذوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے سکرولز یاد آتے ہیں اور سکرولز سے مجھے ڈیڈ سی سکرولز یاد آتے ہیں جو بحیرۂ مردار کے کنارے کہیں دریافت ہوئے تھے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بائبل کی تاریخی دقیانوسی صداقتوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اس لیے کہیں نہ کہیں سرکاری طور پر چھپائے جاتے ہیں۔ بس اس سے آگے...... ظاہر ہے ڈیڈ سی سکرولز کا اور ان عطائی کے مرتبانوں میں مقید سکرولز کا کوئی تعلق نہیں۔ ان پر کیا لکھا ہو گا وہ ابھی ہم نے پڑھا نہیں۔ اگر تم اجازت دو گی تو اسے پڑھیں گے کیونکہ اس کمرے کی ہر شے اور ہر راز کی تم امین ہو۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی میں کون ہوتا ہوں یہ کہنے والا۔ بہر حال، ویسے...... میرے خدا...... ہم یہ سب کے سب کہاں پڑھ سکتے ہیں۔ سینکڑوں ناممکن...... مگر کچھ دیکھیں گے۔ کچھ پڑھیں گے۔ اس سے ہو سکتا ہے ہمیں کچھ اندازہ ہو کہ یار عطائی کا معمہ کیا تھا۔ میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ ابھی اپنے باپ کو کسی عام فہم سادہ سی تشریح کے ذریعے بے راز نہ کرو۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ کوئی راز بھی نہ ہو۔ یہ میرے یا شاید تمہارے بھی اور جو وہ دو یہاں نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اور گورا...... ان کے ذہنوں کی پیداوار ہی ہو۔ یار عطائی بس ایک چالاک حکیم ہی ہو۔ جو مردانہ جنسی صلاحیت بڑھانے کے جھوٹے سچے نسخے ایک بہت اعلیٰ پیمانے پر بیچتا رہا ہو...... یا ہو سکتا ہے کہ ان سکرولز میں کچھ اور بھی ہو۔ مگر یہ تو دیکھنے پر ہی پتہ چلے گا۔ ویسے جو باقی چیزیں ہیں۔ انہیں یہاں کہیں نہ کہیں دیکھ پانے کے لیے میری نظریں پہلے سے تیار تھیں۔ یہ وہ خام چیزیں ہیں جن سے روایتی دوائیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ مؤثر ہوتی ہیں یا نہیں اس پر ہم مدتوں سے بحث کر رہے ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر ناصر سے۔ اس لیے...... میں سمجھتا ہوں اب یہ فضول سوال ہے۔ یہ مکمل ہے اور یہ نام۔ ظاہر ہے یہ عطائی کے مداحین۔ حاجت مندوں۔ کہہ لو مریضوں

کے نام ہیں تو ایک طرح سے یہ عطائی کا مریضوں کا کیٹالاگ ہے جیسے ڈاکٹر ریکارڈ رکھتے ہیں...... مگر اس عجائب خانے کو ریکارڈ کہنا تو اسے ایک بہت سطحی مقام پر لاتا ہے۔ اس لیے یہ سب کیا ہے۔ اتنا کچھ کہنے کے باوجود میں نہیں جانتا یہ سب کیا ہے مگر یہ عطائی کی دنیا ہے۔"

(میں جیسے سانس لینے کے لیے رُکتا ہوں اور زہرہ کو دیکھتا ہوں۔ میں اس کی آنکھوں میں کلام کی تمازت دیکھتا ہوں اور جان لیتا ہوں کہ اب مجھے خاموش رہنا ہے۔ میں یہ بھی جان لیتا ہوں کہ وہ جان چکی ہے کہ یہ ایسا لمحہ ہے کہ سوچ اور کلام کے درمیان اپنے آپ کو حائل رکھنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ وہ کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "ہاں یہ عطائی کی دنیا ہے۔ مگر شاید ابھی ہم اس دنیا کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ کیا ہمیں یہیں سے واپس پلٹ جانا چاہیے۔ کیا مجھے یہیں سے واپس پلٹ جانا چاہیے کیا تم میرے ساتھ واپس پلٹ سکو گے مگر میں جو تمہیں یہاں تک لائی ہوں۔ تم نے ایک مردہ سمندر کا ذکر کیا تھا۔ یہ کاغذ اس سمندر کے کنارے نہیں ملے مگر یہ خوف کے مردہ سمندر کے کنارے ملے ہیں۔ کیا تم خوف زدہ ہو؟ [illegible]"

(زہرہ میری آنکھوں میں دیکھتی ہے اور پھر وہی الفاظ دہراتی ہے۔)

زہرہ۔ "کیا تم خوف زدہ ہو؟"

(میں اس کے الفاظ کے لرزانے والے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ وہ ایسا لرزہ ہے جو ہمارے جسموں میں سفر شروع کرتا ہے اور ایک سے دوسرے میں آ کر واپس پلٹتا ہے اور پھر آتا ہے۔ ہم پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُترتے ہیں۔ لرزاں، اور میں جان لیتا ہوں کہ خوف کے مردہ سمندر میں کلام زندگی کی روح نہیں پھونک سکتا۔ مگر خاموشی میں ازلی قربت ہی وہ گفتار ہے جو خوف کے کلام پر غالب آتی ہے...... ہم گہری خاموشی میں اس قدر قریب آ جاتے ہیں کہ بس سانسوں کی آواز سنتے ہیں جیسے وہ ایک ہی سانس ہے جو گرم ہوا کے چلن جیسی ہے اور ہمیں اندر سے اندر تک جھونکتی ہے۔ پھر باہر اپریل کی رات میں ہوا سانس لیتی سنائی دیتی ہے۔ جسے میں بھی سنتا ہوں اور زہرہ بھی سنتی ہے۔)

زہرہ۔ "ہوا ہے...... باہر......"

میں۔ "ہاں...... باہر...... ہوا چل رہی ہے۔"

Scanned by CamScanner

(پھر ہم لمحے کے اس گیگلے پن پر ہنستے ہیں اور اپنے ہونٹوں سے ایک دوسرے کو باہر کی دنیا پر یوں لایعنی گفتار بازی کرتے رہنے سے باز رکھتے ہیں اور اس شدت سے کہ جیسے اب ایک دوسرے کو اس خوف سے ہمیشہ کے لیے آزاد کرکے ہی دم لیں گے جو ہمارے اندرون میں کلام کی صورت میں چھپا بیٹھا ہے۔ جب ہمارے جسموں کی گہرائیوں سے خوف دور بھاگ جاتا ہے تو ہمارے وجود ایک دوسرے کی خوشبو اور ذائقے سے بھر جاتے ہیں اور ہر مسام میں زندگی کی چاپ سنائی دیتی ہے مگر یہی چاپ ہے جو ہمیں.....)

(25 اپریل دن گیارہ بجے گھونسلے میں۔ اس عظیم دن کے ان عظیم لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنا میرے لیے ایک عجیب تجربہ ہے۔ وہ وقت میرے لیے اتنا عظیم واقعہ تھا کہ اس کے سامنے تخلیق کائنات بھی ہیچ تھی اور اس بیان میں بھی میں یہی چاہتا ہوں کہ اس واقعے کو زبان کی کسی ایسی سطح پر لے آؤں جہاں زبان اور واقعے میں مغائرت ختم ہو جاتی ہے اور زبان بذات خود واقعہ بن جاتی ہے۔ اب میں نے یہ پچھلی لائن پڑھی جب سے جہاں سے میں نے زہرہ کے ساتھ عطائی کے کمرے کی طرف سفر شروع کیا ہے تو مجھے بار بار شک پڑتا ہے کہ میں شاعری کا ارتکاب کر رہا ہوں کچھ عجیب صورت حال ہے۔ لکھتے لکھتے اچانک میرے اندر سے کوئی اور ہی ذلیل آدمی نکل آتا ہے اور پہلے لکھنے والے کا دشمن ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں۔ یا کہیں ایسا تو نہیں۔ میرا مطلب ہے ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی شخص میں کئی طرح کے لکھنے والے موجود ہوں۔ مگر کامیاب ان میں سے کوئی ایک ہی ہوتا ہو اور باقی لکھنے والے کمزور وجود کو کسی پراسرار نامعلوم، حیرت انگیز، ہنوز ناقابل فہم لسانی تشدد کے ذریعے لکھنے سے باز رکھتا ہو اور خود ہی سارے مزے لینا چاہتا ہو۔ کیا اسے ہم محرر کی کثیر الذاتی کشمکش کہہ سکتے ہیں یا شاید بین الذاتی زیادہ مناسب ہو..... مجھے..... یاور عطائی کی بیٹی کے ساتھ واپس آتے ہوئے..... زہرہ اور میرے اس جسمانی تعلق کی شدت یقیناً اب اس مقام پر تھی جہاں سے کچھ بھی آگے جانے پر گہرائیوں میں مسلسل گرتے جانا ناگزیر ہو جاتا۔ وہ کوئی تنبیہ تھی ہماری اپنی یا شاید علم تھا کہ ہم ابھی اس Fall کے مستحق نہیں قابل نہیں کہ گریز ہمارے اوپر غالب آ گیا۔ ویسے میں اب یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں یہ بڑھ کر اس ایک دو لمحے کی لسانی سطح پر آ گیا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہیجانی سے گریز کی طرف مراجعت کی اس سطح پر تحریر کو قابو میں رکھنے کے قابل نہیں تھا، جو سطح شاید میں نے دو تین پیرے پہلے

سے قائم رکھنی شروع کی تھی۔ بہرحال، بہرحال، بہرحال..... یہ سب کس قدر مشکل ہے خواہ وہ اپنے اوپر ہی کیوں نہ بیتا ہو بلکہ شاید اسی لئے تو اور بھی مشکل ہے..... بہرحال..... تو..... زہرہ کہہ رہی تھی۔)

زہرہ۔ "یقین کرو۔ میں اس کمرے میں پہلی دفعہ آئی ہوں۔"

میں۔ "مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔"

(میں یہ فضول سا فقرہ کہتا ہوں اور مجھے اپنے ہونٹوں سے زہرہ کی مانوس سی خوشبو اٹھتی ہوئی آتی ہے اور میں مسکرا پڑتا ہوں۔ زہرہ کچھ اور ہی سمجھتی ہے۔)

میں۔ (اور بھی مسکرا کر) "او..... میں کب کہتا ہوں تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

زہرہ۔ "پھر یہ عجیب طریقے سے مسکرا کیوں رہے ہو۔"

میں۔ "عجیب طریقے سے؟" (ہنستا ہوں) "نہیں میں تو عام سے طریقے سے مسکرا رہا تھا بلکہ اب تو ہنس رہا ہوں۔"

زہرہ۔ (اب غصے میں ہے باقاعدہ) "مگر کیوں..... کچھ تو بات ہے۔"

(اور میں اسے بات بتا دیتا ہوں۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر آتا ہے جیسے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہی ہے اور کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

میں۔ 'سوچ بہت معمولی سی چیز ہے۔"

زہرہ۔ "ہاں، شاید۔ شاید ایسا ہی ہے۔"

میں۔ "اصل باتیں۔ بہت اہم باتیں یا تو سوچ سے پہلے کی ہوتی ہیں یا پھر سوچ سے بعد کی۔"

زہرہ۔ "ہاں..... یہ کافی تمہاری سوچی بھی بات لگتی ہے۔"

(میں بہت خوش ہو جاتا ہوں اور کہہ دیتا ہوں، بے ساختہ)

میں۔ "میں سوچتا ہوں کہیں میں تم سے عشق تو نہیں کرنے لگ پڑا۔"

زہرہ۔ "..... بہت معمولی سی چیز ہے۔"

(میں اسے چوم لیتا ہوں۔ کسی حجاب۔ کسی بناوٹ۔ کسی رکاوٹ۔ کسی سوچ کے بغیر.....

Scanned by CamScanner

عطائی کی دنیا پھر آڑے آتی ہے۔ میں اُدھر دیکھتا ہوں۔)

زہرہ۔ ''آؤ......''

(ہم ان آہنی شیلفوں کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں اور بالکل سامنے پڑے مرتبانوں پر نظریں جما دیتے ہیں۔)

میں۔ ''میں اسے کھولنے لگا ہوں۔ میں...... (لیبل پر لکھا نام پڑھتا ہوں) میں چوہدری الیاس پنگل کو کھولنے لگا ہوں...... (میں کھولتے کھولتے رُک جاتا ہوں۔ پھر فوری طور پر زہرہ سے مخاطب ہوتا ہوں کہ کہیں وہ امیج جو اچانک میرے شعور کے پردے پر اُبھر آیا ہے میرے ذہن سے نکل نہ جائے اور میں اسے بتا نہ پاؤں) زہرہ...... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شیشے کے ان تمام مرتبانوں میں عطائی نے مردانگی کا ایک ایک منفرد شیدائی قید کر رکھا ہے۔ عجیب فینٹسی میرے ذہن میں آتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ جیسے ان سب مرتبانوں میں عطائی نے ان گنت مردانہ عضو جمع کر رکھے ہیں۔ مجھے سمجھ آ رہی ہے سب سمجھ آ رہی ہے۔ یہی اس کا Passion تھا۔ مردانہ عضو جمع کرنا۔ جیسے لوگ سکے جمع کرتے ہیں۔ ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا کچھ جمع کرتے ہیں۔ مگر یہ شاید ہی کسی نے جمع کیے ہوں میرے خدا...... مجھے ہر مرتبان میں یہ نظر آ رہے ہیں چھوٹے، بڑے، سکڑے ہوئے، ٹیڑھے، سیدھے، ہارے ہوئے، تھکے ہوئے، تنومند، بے تاب، بے صبرے، شرمیلے، شریف، بااخلاق، فصیلے، عاجز، انتہا پسند، معاملہ فہم، صابر، قناعت پسند، لاغر، نیلے، پیلے، کالے، سفید، متفکر، آزردہ، خوش طبع، جلد باز، جامد، متحرک، منفرد، خاندانی، رذیل، کم ذات، نسلی، اصلی، نقلی، محبِ وطن، غدار، سیاسی، فوجی، علمی، ادبی، قومی، صوبائی، عوامی، جمہوری، دردمند، بے درد، ترقی پسند، دور اندیش، کوتاہ اندیش، دانشور، علیحدگی پسند، وحدت پسند، اپنے، بیگانے، انجانے، جانے پہچانے، جھوٹے، دوغلے، منافق، عیار، مکار، فنکار، زندہ، مردہ، نیم مردہ، زخمی، کرشماتی، روحانی، غمناک، دہشت گرد، جہاں گرد، فریبی، بہروپیے، بے چارے، بدنصیب، لاعلاج، بے خبر، بے خطا، بے خود، بے خوف، بے داغ، بے دخل، بے اختیار، بے اصل، بے انداز، بے ایمان، بے باک، بے بس، بے بہرہ، بے پردہ، بے تحاشا، بے تکلف، بے جوڑ، بے دریغ، بے راہ، بے ربط، بے ریش، بے زبان، بے ساختہ، بے عقل، بے غرض، بے غیرت، بے فکر، بے قابو، بے فیض، بے قدر، بے قرار، بے کار، بے کس،

بے کل، بے گناہ، بے گھر، بے لاگ، بے لحاظ، بے لطف، بے لگام، بے نیاز، بے نظیر، بے وفا، بے وقت، بے ہنگم، بے ہوش، بے مثال، بے شمار، بے...... بے...... بے...... بب...... بے...... بب...... بے...... بے'' میری آواز بلند ہو جاتی ہے اور میرے ذہن کا کوئی حصہ مجھے بتاتا ہے کہ مجھے کوئی دورہ پڑ گیا ہے۔ عطائی کی اس دنیا نے جو تحریک میرے اندر بیدار کر دی ہے اس سے میرے اندر سے اسماء اور صفات کا ایک ریلہ پھوٹ نکلا ہے جو کسی طرح میرے قابو میں نہیں آ رہا۔ میرا ہر لفظ نئے معانی حاصل کر رہا ہے اور یہ ایک معنویت ہے جس کے پیچھے وہی ایک قوت ہے اور جسے خاموش کرنا میرے لیے محال ہے۔ میں خود اپنی زبان سے نکلتا جا رہا ہوں...... اور پھر جب...... پھر جیسے مجھے ہوش آتا ہے تو زہرہ مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہی ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے (جواب یہ فقرے لکھتے ہوئے مجھے خیال آتا ہے کہ شاید شرم کی وجہ سے سرخ ہو رہا ہوگا۔) میں گہرے گہرے سانس لیتا ہوں اور زہرہ کی طرف دیکھتا ہوں۔

زہرہ۔ ''کبیر...... کبیر...... کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا...... کیا ہوا ہے تمہیں؟''

میں۔ ''یہ عطائی کی دنیا ہے۔''

زہرہ۔ ''کیا ہوا تھا تمہیں۔ مجھے تو لگ رہا تھا تمہیں کوئی دورہ پڑ گیا تھا...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے......''

میں۔ ''ہاں یہ کوئی دورہ ہی تھا کوئی لفظی، لسانی دورہ، میری تمام زبان مجھ سے خارج ہوئی جا رہی تھی۔ سب کچھ نکل جاتا اگر تم مجھے اس ہذیان سے خاموش نہ کرا دیتی تو تمام الفاظ خارج ہو جاتے اور میں گونگا ہو جاتا۔ مدہلی کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا۔''

(زہرہ کی آنکھوں میں میرے لیے تشویش ہے۔ وہ خواہ مخواہ میرا ماتھا چھوتی ہے۔ گویا کہ ہذیانی دورے کے ساتھ بخار کا ہونا بھی امکانی ہے۔ میں ہنس پڑتا ہوں۔)

میں۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ کیا دیکھ رہی ہو۔''

زہرہ۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ...... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں...... کچھ......''

میں۔ ''کچھ نہیں...... کچھ...... مدہلی......''

زہرہ۔ ''یہ مدہلی کا ذکر اچانک...... تم کہاں سے لے آئے......''

میں۔ ''ویسے ہی...... پتہ نہیں......''

Scanned by CamScanner

زہرہ۔ "چلو واپس چلیں....."

میں۔ "نہیں.....نہیں"

زہرہ۔ "ہم پھر کبھی آ سکتے ہیں۔"

میں۔ "نہیں۔ ابھی واپسی..... نہیں ہو سکتی..... میں بالکل ٹھیک..... (میں کمرے میں چاروں طرف، شیشے کے مرتبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں) یہ ایک دیوانے ذہن کی دنیا ہے..... یہ ایک دیوانی دنیا ہے۔ یہ سر بسر پاگل پن ہے۔ یہ ایک ایسا پاگل پن ہے..... کہ یہاں کسی کے ساتھ بھی..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسے شخص کے ساتھ۔ جو ہر وقت دیوانگی اور فرزانگی کے درمیان تلوار جیسی تیز دھار پر ناچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے..... یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم اس عجیب و غریب خوف کا شکار نہیں ہوئے تھے؟"

زہرہ۔ "مگر ہم نے ایک دوسرے میں پناہ لے لی تھی۔"

میں۔ "ہاں..... مگر" (زہرہ میرا ہاتھ پکڑتی ہے اور ہم پہلی دفعہ اس عجائب خانے میں ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ بیٹھے۔ جیسے لرزتی ہوئی دیواریں ایک دوسرے کو سہارا دے رہی ہوں۔ ہمارے سانس تھکی ہوئی ہوا جیسے ہیں مگر اسی تھکان میں سے وہ گہرا سکون لمحہ بہ لمحہ جنم لیتا ہے جو مجھے قربت کی مسیحائی پر حیران کر دیتا ہے۔ ہم اب اپنے اپنے آپ میں ہیں اور میں پھر کہتا ہوں..... آؤ..... اور زہرہ کہتی ہے۔)

زہرہ۔ "..... آؤ"

(میں چوہدری الیاس ہگل کے مرتبان میں ہاتھ ڈال کر وہ کاغذ نکال لیتا ہوں۔ ہمارا بچپنا نہ تجسس اور کھلنڈرا پن واپس آ چکا ہے جو مجھے مطمئن کرتا ہے۔ ہم بے تابی سے رول کیا ہوا کاغذ کھول کر نظروں کے سامنے لاتے ہیں اور توقع کے عین مطابق دیکھتے ہیں کہ وہاں کچھ لکھا ضرور ہوا ہے وہ اگرچہ سیدھے سادے لفظوں میں ہے مگر ہماری سمجھ سے یکسر بالاتر ہے....." بادشاہ جو ملکہ اور رنڈی کے بیچ مارا گیا۔ دیکھو طبیب شاہی کے اعترافات، گنجینۂ نشاط صفحہ ۸۳-۸۶..... مانسک کلیتا..... (ماجرہ) اندر جو۔ کاکڑا نگی۔ جیوک۔ بداری قند۔ قلفل دراز وغیرہ........"
زہرہ میری طرف اور میں اُس کی طرف دیکھتا ہوں۔ ہمیں ناقابل فہم کا سامنا ہے اور زہرہ پھر پوچھتی ہے جو پوچھا نہیں ہے۔)

زہرہ۔ "یہ سب کیا ہے؟"

میں۔ "یہ جو بظاہر ناقابل فہم، کاکڑ قند۔ بداری زبان میں ہے وہ میرے لیے قابل فہم ہے۔ ظاہر ہے یہاں عجیب الخلقت جڑی بوٹیوں اور پتہ نہیں کیا کیا کے نام ہیں اس میں کوئی دقت نہیں مگر باقی۔ کون سا شاہی طبیب؟ کیسے اعترافات؟ اور بادشاہ جو ملکہ اور رنڈی کے بیچ مارا گیا؟ اور یہ گنجینۂ نشاط کیا بلا ہے، صفحہ ۸۳؟ اس کا مطلب ہے یہ تو کوئی کتاب ہے۔ ہاں یہ تو کوئی کتاب ہے!"

زہرہ۔ "ہاں۔ یہ تو کوئی کتاب ہے جس کا حوالہ....."

(میں کاغذ واپس اس مرتبان میں رکھتا ہوں اور ایک دوسرا کھولتا ہوں۔ یہ بھی بند کیا جا چکا ہے اور کسی سردار فیض بخش کا ہے۔ میں اس میں ایک رول کیا ہوا کاغذ کھولتا ہوں اور عبارت پڑھتا ہوں....." تحویلدار اپنی تحویل کو تحویل میں نہ رکھ سکا اور مانسک کلیتا کا شکار ہوا۔ دیکھو طبیب شاہی کا مکاشفہ، گنجینۂ نشاط صفحہ ۲۳-۲۵۔ (ماجرہ) اژدسہ۔ کمرچانی۔ کچنگ۔ کچھوے۔ گولوچن وغیرہ وغیرہ۔ "میں ایک گہرا سانس لیتا ہوں اور پھر ایک ایک کر کے کئی مرتبان کھولتا ہوں جن میں کچھ پرانے جانے پہچانے نام ہیں اور جن میں سے کچھ مطائی کی سکیم کے مطابق بند کیے جا چکے ہیں اور کچھ ابھی کھلے ہیں اور سب میں ویسی ہی حیرت انگیز عبارتیں ملیں..... سررشتہ داری کے بھوت پر مرتا۔ کیا بادشاہ ہر حالت میں بادشاہ رہتا ہے۔ وزیر با تدبیر کی تعبیر، ہر رات خواب میں اسی خوفناک عورت کو دیکھتا ہے۔ مہارانی..... مہارانی سے ہول کھا گیا۔ مرد میدان اور زنا شوئی کی گھاتیں۔ سپہ سالار۔ گھسان کا رن اور گھسان کی زن۔ کھل بل لگائی جہنم کی دہائی۔ عجیب فرماں روا کہ جیسے برائے بیسوا۔ امیر زادہ۔ نہ کسب رہا نہ کسبی..... غرض ان اَن گنت کاغذوں پر تاجداروں، جاگیرداروں، مہا منتریوں، منصب داروں، گماشتوں، شاہی سوانح نگاروں، منشیوں، قاضیوں، سفیروں، مشیروں، سررشتہ داروں، سورماؤں اور مدبران سلطنت کے عورت ذات سے تعلق پر ہیجانی تجسس انگیز عنوانات لگائی وہ عبارتیں ہیں اور ان عبارتوں کے متن تک پہنچنے کے لیے ویسی ہی رہنمائی ہے..... دیکھو طبیب شاہی کے اعترافات۔ طبیب شاہی کا مکاشفہ۔ طبیب شاہی پر الزامات اور ان کا مسکت جواب۔ معالج سلطانی کا وصیت نامہ۔ طبیب خاص کے خطوط فرزند ارجمند کے نام۔ طبیب شاہی کے چند نصائح۔ طبابت شاہی کے اسرار و رموز۔ ہدایت نامۂ طبیب قیصر و کسریٰ..... اور ان سب حوالوں کا ایک ہی حوالہ سامنے آتا ہے۔

Scanned by CamScanner

گنجینۂ نشاط..... پھر ہر کاغذ پر وہی عجیب الصوت عجیب الخلقت الفاظ نظر آتے ہیں جو قرز زمان
قیصر و کسریٰ کے امراضِ نفسانی کے نام ہیں یا پھر ان کے مداوے..... جیوک، رال، پرشٹ، پرنی،
بالنکھانہ، ستاور، مانک کلیوتا، سج کلیوتا، اسگندھ آری، ماس سولاس، ویرج جاجہ کلیوتا، بست کی
کراسی، بیج اُوب گھات، دکامیشوراس، جرا سہو، دھوج بھنگ، آسیکہ، اپرشک، کسکھک، مصکی،
عقر قرحا، شتاقل، باجی کرن، کریا آری، شکر شہد کلیوتا، بہمن سفید، موچرس، ترپھلہ، ویرج کھنبہ
کلیو..... ان حکمرانوں اور حکمران نما ہستیوں کے سب جنسی اعمال ناموں کو کھولنا میرے لیے ممکن
نہیں۔ یوں بھی اب میرے ذہن پر وہی دو الفاظ حاوی ہو چکے ہیں "گنجینۂ نشاط" یہ جو کچھ بھی.....
اور اگر اس کے صفحات بھی ہیں تو یہ کتاب ہی ہوگی۔ اس کتاب تک رسائی حاصل کرنی ہوگی۔
اسے ڈھونڈنا ہوگا وہ اس چیستان کا آخری متن ہوگا۔)

میں۔" یہ گنجینۂ نشاط ہمیں ڈھونڈنی ہوگی۔"

(زہرہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوں اور اچانک محسوس کرتا ہوں کہ
وہ جو اپنے باپ کے اس حیرت کدے تک پہنچنے کے لیے اس قدر بے تاب تھی اب کافی دیر سے
خاموش ہے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر ہے جسے میں کچھ سمجھ نہیں پاتا اور سمجھنے کی کوشش بھی
نہیں کرتا۔ کیونکہ میرے جسم میں اور میرے ذہن میں بس اُن ہی دو طلسمی الفاظ کی بو ہے: "گنجینۂ
نشاط" اور میں سونگھ کر ڈھونڈ نکالنے والے کتے کی طرح بے چین اور بے قرار ہو رہا ہوں۔ میں پھر
کہتا ہوں۔)

میں۔" یہ کتاب ہمیں ڈھونڈنی ہوگی۔ لازماً یہیں کہیں ہوگی۔"

زہرہ۔" ہاں..... یہیں کہیں ہوگی۔ شاید اس الماری میں۔"

(زہرہ پلنگ کے ساتھ رکھی اور شیلفوں سے کافی دور ایک بڑی آہنی سیف کی طرف اشارہ
کرتی ہے پھر چابیوں کا گچھا میری طرف بڑھاتی ہے۔ میں ایسی چابیاں الگ کرتا ہوں جو اس
الماری کو کھول سکتی ہیں۔ قفل کے سوراخ میں ایک اور پھر دوسری چابی گھماتا ہوں پھر ہینڈل گھماتا
ہوں۔ الماری کھل جاتی ہے۔ اس الماری میں بھی کچھ مرتبان ہیں مگر ان مرتبانوں سے جسامت
میں بڑے ہیں جو باہر شیلفوں میں رکھے ہیں۔ مگر ان میں انواع و اقسام کی گولیاں۔ بمارے،
معجون، تیل اور اسی قبیل کی دوسری بہت سی چیزیں ہیں۔ ان پر بھی ویسے نام لکھے ہوئے ہیں اور پھر

اچانک ایک نام میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے اور میں وہیں اس مرتبان میں اور اس کے
لیبل کو یکٹک رہتا ہوں اور پھر زہرہ کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ اب بھی خاموش ہے اور میں ایک لمحے
کے لیے اس کی خاموشی کو سمجھنے کے لیے کچھ سوچنے کا فیصلہ کرتا ہوں مگر پھر ایسا کچھ کرنے کی بجائے
اسے کہتا ہوں۔)

میں۔" قرص کیف۔ یہ نام تمہیں کچھ یاد آتا ہے۔" (زہرہ اپنی خاموشی میں جیسے اور بھی
خاموش ہو جاتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔) "ہاں یاد..... یہی تھا جب پاپا ہسپتال پہنچے۔" (اداسی کی
کیفیت اس پر طاری ہے۔) "اور ناصر مجھے بتاتے یہاں آیا ہے چارہ ناصر تمہیں یاد ہے.........."
"ہاں یاد ہے..... اس سے اگلے دن..... جب ناصر نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا ایک مریض زہر
خورانی کا شکار ہو کر کہتا ہے کہ زمین گر رہی ہے......"

زہرہ۔ (اچانک عجیب لہجے میں جو مجھے مجبور کر دیتا ہے کہ میں اس کی طرف دیکھوں۔)
"زمین گر رہی ہے..... زمین واقعی گر رہی ہے..... اور پھر جیسے زمین گرتی چلی گئی..... لگتا ہے ایک
زمانہ گزر گیا ہے زمین کو گرتے ہوئے اور اب ہم یہاں کھڑے ہیں۔ ایسی جگہ جو شاید زمین بھی
نہیں ہے۔ زمین پر نہیں ہے بلکہ جیسا تم کہتے ہو۔ یہ دیوانگی کی سرزمین ہے۔"

(میں جیسے زہرہ کی بات سُن ہی نہیں رہا اور اسی الماری کے اندر گھسا چلا جا رہا ہوں جو
کتابوں، کاغذوں کے پلندوں اور فائلوں سے بھری پڑی ہے۔ میرا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا
ہے۔ میں ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں اور جو کچھ پڑھا جا رہا ہے، پڑھتا ہوں۔ مگر وہ طلسمی
الفاظ کسی کاغذ پر نظر نہیں آتے۔ میں بہت مایوس ہو جاتا ہوں۔ میری مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔
مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ایک عظیم ناکامی میرا مقدر بننے والی ہے۔ میں "گنجینۂ نشاط" کو کبھی نہیں
دیکھ پاؤں گا میں یہ صدمہ کیسے برداشت کر پاؤں گا۔ یہ تجسس، یہ تلاش، یہ کھوج اس قدر شدید ہے
کہ کائنات میں میری اور کوئی منزل نہیں۔ بس یہی ہے اور اگر تلاش لاحاصل رہی تو جان لیوا ہو
گی۔ میں اس الماری میں کیا کچھ نہیں دیکھتا خفیہ کلب کے ارکان کے نام اور ان ناموں سے متعلق
کیا کچھ نہیں دیکھتا مگر گنجینۂ نشاط کا کہیں ذکر نہیں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ میں اس قدر مایوس ہو جاتا
ہوں کہ یہ مایوسی میرا سانس بند کرنے والی ہے۔ میں کبھی نیچے بیٹھ کر اندر دیکھتا ہوں کبھی پاؤں کے
بل کبھی گھٹنوں کے بل کبھی پورا سر اندر گھسیڑ دیتا ہوں کبھی ایک بازو کبھی دونوں..... مگر نہیں.....

Scanned by CamScanner

آخر جب میں ناکامی و نامرادی سے جیسے مرنے والا ہوں تو اس بھورے سے بوسیدہ لفافے کو اٹھا لیتا ہوں جسے میں مسلسل نظر انداز کرتا رہا ہوں۔ یہ ایک ڈاک کا بڑا سا پارسل جیسا لفافہ ہے۔ میں غور سے دیکھتا ہوں تو ڈاک کے ٹکٹ کسی اور ہی زمانے کے ہیں۔ اوپر ایک پتہ لکھا ہے جو بمشکل پڑھا جاتا ہے۔ حکیم حاذق احسان الٰہی بمقام چھوٹا ونڈا۔ انعام گڑھ...... انعام گڑھ...... اب میں پھر چونکتا ہوں اور لفافے میں جو کچھ بھی ہے نکال لیتا ہوں اور وہ جان افروز الفاظ میری نظر کے سامنے آتے ہیں جن کے لیے میری روح ترس رہی تھی "گنجینۂ نشاط"......)

میں۔ (نعرہ لگاتا ہوں) "گنجینۂ نشاط مل گیا...... مل گئی...... (میں نیچے لکھی ہوئی ایک لائن بھی پڑھتا ہوں) مجربات برائے درازیٔ عمر پادشاہاں وشباب دائمی ایشاں...... " میں پہلے تیزی سے مگر پھر احتیاط سے، کیونکہ صفحات بھربھرے ہیں اور ٹوٹ سکتے ہیں، اس کتاب کو کھولتا ہوں اور پھر وہ سب کچھ مجھے نظر آجاتا ہے۔ شاہی طبیبوں، پنڈتوں ویدوں اور درباری حکیموں کے وہ اختراعات، وہ نسخے اور سب کچھ وہ سب مخطوطے اکٹھے سلے ہوئے ہیں اور ہر ایک تحریر کو رسالہ کہا گیا ہے)

میں۔ (جوش و خروش کے عالم میں) "زہرہ...... زہرہ...... دیکھو...... زہرہ" (مگر زہرہ وہاں نہیں ہے۔ جہاں میں مسلسل سمجھ رہا ہوں کہ وہ ہے میرے ساتھ کھڑی ہے اور میری تلاش کو لمحہ بہ لمحہ دیکھ رہی ہے مگر وہ وہاں نہیں ہے۔ وہ وہاں نہیں ہے۔ زہرہ کہاں ہے۔ میں الماری کی طرف سے گھوم کر کمرے میں چاروں طرف دیکھتا ہوں اور وہ مجھے نظر آجاتی ہے۔) زہرہ...... مجھے مل گئی یہ کتاب...... یہ دستاویز، یہ مخطوطے...... اب ہمیں پتہ چل جائے گا یہ سب کیا ہے؟"

"کیا ہے؟......"

"میں جانتی ہوں یہ سب کیا ہے۔"

اس کی آواز بوجھل ہے اور اس میں ایک چونکانے والی لرزش ہے۔ وہ سامنے دیوار کے ساتھ رکھے صوفوں میں اس جگہ بیٹھی ہے جہاں ساتھ ہی آہنی شیلفیں شروع ہوتی ہیں اور ایک کونا سا بن گیا ہے۔ اس کونے میں بیٹھی ہوئی وہ ایک نظر میں تو نظر ہی نہیں آتی۔ مجھے اس کی بات اور اس کا لہجہ دونوں سمجھ نہیں آتے۔ میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ وہ قلمی کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔

"تم جانتی ہو؟ یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم نے سنا۔"

میں اس کے پاس ہی بیٹھ جاتا ہوں اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ اس کے چہرے پر افسردگی ہے اور آنکھیں سرد۔ میں جان جاتا ہوں کہ میری اس مضطرب کر دینے والی کھوج کے دوران جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اس عورت کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا ہے۔ کچھ ایسا کیا ہے جو میرے علم میں نہیں اور کیا وہ کبھی میرے علم میں آئے گا۔ آ بھی سکتا ہے یا نہیں یہ سب امکان مجھے ایک انوکھی وحشت میں مبتلا کر دیتے ہیں میں وہ بھورا لفافہ ایک طرف رکھتا ہوں اور اس اعتماد کو اکٹھا کر کے پوچھتا ہوں جو مجھے اس دن کی سب قربتوں نے دیا ہے۔

"کیا ہوا...... کیا بات ہے زہرہ...... کیا ہوا؟"

میں سمجھتا ہوں یہ اسی اعتماد کی کچھ زندگی ہے جو زہرہ قبول کرتی ہے اور میری طرف دیکھتی ہے۔ ورنہ یہ لغو سے الفاظ۔ کیا ہوا ہے۔ کیا بات ہے؟ کون کسی کو بتا سکتا ہے کیا ہوا ہے...... کیا بات ہے...... اور کون یہ پوچھ ہی سکتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی ہے اور اب اس کے اندر کی اداسی یخ بستہ ہوا کی طرح میرے اندر اتر جاتی ہے اور میرے دل کو منجمد کر دیتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ میرے وجود میں ایک ایسا ادراک اتر آتا ہے جو زبان، الفاظ، کلام سے کہیں آگے کا ہے اور میرے اندر سے کوئی مجھے سرزنش کرتا ہے اور کچھ بھی بولنے سے باز رکھتا ہے۔ میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک نظر ہی مجھے کافی معلوم ہوتی ہے اور سب کچھ واضح کر دیتی ہے مگر زہرہ شاید مجھے زبان و بیان سے ماورا کسی ایسے ادراک کے قابل نہیں سمجھتی اور مجھے مخاطب کرتی ہے اور اس تخاطب میں وہ جس بھی کیفیت میں ہے وہ اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

"تم حیران ہو مجھے یہ یک دم کیا ہو گیا ہے مگر تم خود ہی تو کہتے ہو یہاں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ہم خوف کا شکار ہوئے جیسے تم اس لفظوں کی...... کیا کہوں گی لفظوں کی بوچھاڑ، لفظوں کے اُبال کا شکار ہوئے یہ ایک خطرناک جگہ ہے۔ یہ ایک شخص کی سرد منجمد کر دینے والی، لرزانے والی تنہائی کا باطن ہے۔ جب جگہیں مدتوں کیفیتوں کی شدت کی آماجگاہ بنی رہتی ہیں تو وہ خطرناک بن جاتی ہیں مگر یہ وہ سب نہیں جس نے مجھے اپنی گرفت میں لیا ہے اور وہ اب ایک اور طرح کے لفظی اُبال کی شکل میں میرے اندر سے باہر آرہا ہے...... میں جو اتنی...... تم سے بھی زیادہ جوش و خروش سے اس کمرے میں آنا چاہتی تھی کہ دیکھ سکوں۔ اور زیادہ قریب سے دیکھ سکوں کہ میرا

Scanned by CamScanner

آخر جب میں ناکامی و نامرادی سے جیسے مرنے والا ہوں تو اس بھورے سے بوسیدہ لفافے کو اٹھا لیتا ہوں جسے میں مسلسل نظرانداز کرتا رہا ہوں۔ یہ ایک ڈاک کا بڑا سا پارسل جیسا لفافہ ہے۔ میں غور سے دیکھتا ہوں تو ڈاک کے ٹکٹ کسی اور ہی زمانے کے ہیں۔ اوپر ایک پتہ لکھا ہے جو بمشکل پڑھا جاتا ہے۔ حکیم حاذق احسان الٰہی بمقام چھوٹا دھنا۔ انعام گڑھ..... انعام گڑھ..... اب میں پھر چونکتا ہوں اور لفافے میں جو کچھ بھی ہے نکال لیتا ہوں اور وہ جان افروز الفاظ میری نظر کے سامنے آتے ہیں جن کے لیے میری روح ترس رہی تھی "گنجینۂ نشاط".....)

میں۔ (نعرہ لگاتا ہوں) "گنجینۂ نشاط مل گیا..... مل گئی..... (میں پیچھے لکھی ہوئی ایک لائن بھی پڑھتا ہوں) مجربات برائی درازی عمر پادشاہاں وشباب دائمی ایشاں....." میں پہلے تیزی سے مگر پھر احتیاط سے، کیونکہ صفحات بھربھرے ہیں اور ٹوٹ سکتے ہیں، اس کتاب کو کھولتا ہوں اور پھر وہ سب کچھ مجھے نظر آجاتا ہے۔ شاہی طبیبوں، پنڈتوں، ویدوں درباری حکیموں کے وہ اختراعات، مکالمے اور سب کچھ وہ سب مخطوطے اکٹھے سلے ہوئے ہیں اور ہر ایک تحریر کو رسالہ کہا گیا ہے)

میں۔ (جوش و خروش کے عالم میں) "زہرہ..... زہرہ..... دیکھو..... زہرہ" (مگر زہرہ وہاں نہیں ہے۔ جہاں میں مسلسل سمجھ رہا ہوں کہ وہ ہے میرے ساتھ کھڑی ہے اور میری تلاش کو کھڑے ہو کر دیکھ رہی ہے مگر وہ وہاں نہیں ہے۔ وہ وہاں نہیں ہے۔ زہرہ کہاں ہے۔ میں الماری کی طرف سے گھوم کر کمرے میں چاروں طرف دیکھتا ہوں اور وہ مجھے نظر آجاتی ہے۔) زہرہ..... مجھے یہ مل گئی ..... یہ کتاب..... یہ دستاویز، یہ مخطوطے..... اب ہمیں پتہ چل جائے گا یہ سب کیا ہے؟"

"کیا ہے؟............"

"میں جانتی ہوں یہ سب کیا ہے۔"

اس کی آواز بوجھل ہے اور اس میں ایک چونکانے والی لرزش ہے۔ وہ سامنے دیوار کے ساتھ رکھے صوفوں میں اس جگہ بیٹھی ہے جہاں ساتھ ہی آہنی شیلفیں شروع ہوتی ہیں اور ایک کونا سا بن گیا ہے۔ اس کونے میں بیٹھی ہوئی وہ ایک نظر میں تو نظر ہی نہیں آتی۔ مجھے اس کی بات اور اس کا لہجہ دونوں سمجھ نہیں آتے۔ میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ وہ قلمی کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔

"تم جانتی ہو؟ یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم نے سنا۔"

میں اس کے پاس ہی بیٹھ جاتا ہوں اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ اس کے چہرے پر افسردگی ہے اور آنکھیں سرد۔ میں جان جاتا ہوں کہ میری اس مضطرب کتے جیسی کھوج کے دوران جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اس عورت کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا ہے۔ کچھ ایسا بیت گیا ہے جو میرے علم میں نہیں اور کیا وہ کبھی میرے علم میں آئے گا۔ آ بھی سکتا ہے یا نہیں یہ سب امکان مجھے ایک انوکھی دہشت میں مبتلا کر دیتے ہیں میں وہ بھورا لفافہ ایک طرف رکھتا ہوں اور اس احتراز کو ٹھکرا کر کے پوچھتا ہوں جو مجھے اس دن کی سب قربتوں نے دیا ہے۔

"کیا ہوا..... کیا بات ہے زہرہ..... کیا ہوا؟"

میں سمجھتا ہوں یہ اسی اعتماد کی کچھ زندگی ہے جو زہرہ قبول کرتی ہے اور میری طرف دیکھتی ہے۔ ورنہ یہ لفظ سے الفاظ۔ کیا ہوا ہے۔ کیا بات ہے؟ کون کسی کو بتا سکتا ہے کیا ہوا ہے..... کیا بات ہے..... اور کون یہ پوچھ ہی سکتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی ہے اور اب اس کے اندر کی اداسی یخ بستہ ہوا کی طرح میرے اندر اتر جاتی ہے اور میرے دل کو منجمد کر دیتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ میرے وجود میں ایک ایسا ادراک اتر آتا ہے جو زبان، الفاظ، کلام سے کہیں آگے کا ہے اور میرے اندر سے کوئی مجھے سرزنش کرتا ہے اور کچھ بھی بولنے سے باز رکھتا ہے۔ میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک نظر ہی مجھے کافی معلوم ہوتی ہے اور سب کچھ واضح کر دیتی ہے مگر زہرہ شاید مجھے زبان و بیان سے ماورا کسی ایسے ادراک کے قابل نہیں سمجھتی اور مجھے مخاطب کرتی ہے اور اس تخاطب میں وہ جس بھی کیفیت میں ہے وہ اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

"تم حیران ہو مجھے یہ یک دم کیا ہو گیا ہے مگر تم خود ہی تو کہتے ہو یہاں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ہم خوف کا شکار ہوئے جیسے تم اس لفظوں کی..... کیا کہوں گی لفظوں کی بوچھاڑ، لفظوں کے ابال کا شکار ہوئے یہ ایک خطرناک جگہ ہے۔ یہ ایک شخص کی سرد منجمد کرنے والی، لرزانے والی تنہائی کا باطن ہے۔ جب جگہیں مدتوں کیفیتوں کی شدت کی آماجگاہ بنی رہتی ہیں تو وہ خطرناک بن جاتی ہیں مگر یہ وہ سب نہیں جس نے مجھے اپنی گرفت میں لیا ہے اور وہ اب ایک اور طرح کے لفظی ابال کی شکل میں میرے اندر سے باہر آ رہا ہے..... میں جو آئی..... تم سے بھی زیادہ جوش و خروش سے اس کمرے میں آنا چاہتی تھی کہ دیکھ سکوں۔ اور زیادہ قریب سے دیکھ سکوں کہ میرا

Scanned by CamScanner

باپ ساری عمر کیا کرتا رہا۔ اگرچہ میں پہلے بھی دیکھ چکی ہوں اور مجھے توقع نہیں تھی کہ کوئی بہت نئی بات معلوم ہوگی۔ اس رات جس کے آخر میں میرے باپ کے پالے ہوئے مرد نے مجھی پہ حملہ کیا۔ جس رات کے تم بھی تماشائی تھے اس رات سب کچھ واضح ہو گیا تھا مگر پھر بھی میں ہر چیز کو قریب سے دیکھنے کی بہت خواہش مند تھی اور اب جبکہ میں یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں تو کیسے اتنی لاتعلق اور دور ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ شاید آج کا سارا دن ہی ایسا ہے جو گزر گیا وہ بھی اور جو گزرنے والا ہے وہ بھی۔۔۔۔۔ کہ میں جیسے ہر لمحہ بدل رہی ہوں۔ ہر لمحے پیدا ہو رہی ہوں۔ جیسے بہت کچھ رکا ہوا تھا۔ بندھا ہوا تھا اور وہ سب کسی رکاوٹ۔ کسی بندش کے ہٹنے کے بعد آج ہی ہو جانا ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جانتی ہوں مگر نہیں بھی جانتی۔۔۔۔۔ آج ہم جیسے ایک ایسے سفر پر چل نکلے کہ نہ تو جس کے آغاز کا علم ہوا کہ کب آغاز ہوا اور نہ جس کے انجام کی خبر ہے کہ کیا ہوگا۔۔۔۔ مگر دیکھو ہم کہاں کہاں سے ہو نکلے ہیں۔ شاید وہ سب پہلے سے ہمارے اندر ہی ہو مگر اندر کی کب خبر ہوتی ہے۔ یہ بہت سطحی سی حقیقت ہے مگر آخر سطحی باتوں میں کیا حرج ہے۔ وہ لوگ بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں جن کی سطحی باتوں سے تسلی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ تو خیر ہم کہاں کہاں سے ہو نکلے ہیں آج۔ گرتے پڑتے، بچتے بچاتے، ایک دوسرے کو سہارا دیتے جب ہم اس مقام تک پہنچے جب تم ایک زبردست اشتیاق سے اس اندھی غار میں اس الماری میں وہ کوئی تحریر ڈھونڈ رہے تھے جس کی سند جگہ میرے باپ نے دی ہے تو اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمہارا اشتیاق اس غار میں گھس جانے کا اور ڈھونڈ نکالنے کا ہے۔ اب اشتیاق نہیں ایک جنون بن گیا ہے اور پھر وہ جنون بڑھتا ہی گیا۔ بڑھتا ہی گیا۔۔۔۔۔ مجھے حیرت سی ہوئی۔ میں اپنی ہستی کے بارے میں بڑے سخت شک میں پڑ گئی۔ پھر مجھے غصہ آیا۔ پھر اپنے آپ پر غصہ آیا میں تمہاری اس کیفیت میں تمہارے ساتھ کیوں نہیں چل پا رہی۔۔۔۔ "گنجینۂ نشاط" بالکل صحیح لفظ ہیں۔ وہ خزانہ ڈھونڈنے والی کیفیت اور میں اس کیفیت میں تمہارے ساتھ کوئی اشتراک نہیں کر رہی۔ یہ عجیب بات ہے ناں کہ کچھ لوگ اکٹھے خزانہ ڈھونڈنے نکلیں اور پھر ان میں سے ایک کی خواہش ہی مردہ ہو جائے۔۔۔۔۔ تب میں نے سوچا جو نہیں ہے وہ نہیں ہے اور مجھے اپنے اوپر گزرتی کیفیت کی سچائی کے ساتھ چلنا چاہیے اور تمہیں تمہارے حوالے کر دینا چاہیے۔ میں وہاں سے ہٹ آئی اور یہاں آ کر بیٹھ گئی۔ تم خزانہ۔۔۔۔ میرے باپ کا خزانہ ڈھونڈنے میں اس قدر مگن تھے کہ تمہیں احساس ہی نہ ہوا کہ میں

ہٹ آئی ہوں۔۔۔۔ میں اس کمرے کو اس کمرے میں اپنے باپ کے سجائے ہوئے ان برتنوں کو پہچانتی ہوں۔۔۔۔ ہم پہلے بھی دیکھتے رہے تھے۔ تمہیں تو ان مرتبانوں میں مردانگی کے نشان نظر آئے تھے مگر مجھے ان میں مُردوں کی راکھ نظر آئی۔ اسٹیج کی بات ہے ناں جیسے تم پر آیا ایسے ہی مجھ پر بھی آیا اور گزر گیا۔۔۔۔ پھر مجھے اپنا باپ نظر آیا۔ نہیں میں کسی بھوت اور روح کی بات نہیں کر رہی مگر وہ اس کمرے میں مجھے جگہ جگہ نظر آیا اور مجھے پہلی دفعہ کچھ احساس ہوا کہ میری ماں اس سے کیوں نفرت کرتی ہے۔ وہ ان میں سے ہے جو صرف ایک انسان کی دنیا میں رہتے ہیں۔ دنیا جو صرف اور صرف ان کی اپنی ہوتی ہے اور اس بے انتہا۔۔۔ ناقابل بیان۔۔۔ لامتناہی تنہائی نے مجھے سرد کر دیا اور میں صاف صاف جان گئی کہ ایسی تنہائی کو۔ ایسی پاگل کر دینے والی تنہائی کو عقل کے زور پر سمجھنا بے عقلی ہے۔ میرے باپ کی اس عمر بھر کی دیوانگی کو عقلی زور و شور سے سمجھنے کی کوشش کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ ہاں اس خواب تماشے کو خواب کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جاگتے خواب کے ذریعے اور جب میں سوچ رہی تھی۔ نہیں۔ خواب دیکھ رہی تھی اور یہ سب محسوس کر رہی تھی تو ادھر سے میں تمہاری بے چینی، اضطراب، خزانہ ڈھونڈنے میں جو تھا دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ اور مجھے تمہاری وہ سب حرکتیں کراہت انگیز لگیں اور پھر مجھے حیرت ہوئی۔ آخر میں بھی تو یہاں کچھ ایسا ہی ڈھونڈنے آئی تھی اور اب وہی تمہیں ڈھونڈتے دیکھنے پر لاتعلقی اور نفرت کا احساس ہوتا ہے کیوں؟۔۔۔ تمہیں یہاں میں لائی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو یہاں لائے۔ اب میں دور کیسے ہٹ سکتی ہوں۔۔۔۔۔۔ اب ایسا بھی نہیں کہ میں یہاں اس کمرے میں کچھ عجیب و غریب چونکا دینے والے، پریشان کرنے والے کسی منظر کو دیکھنے کی بالکل ہی متوقع نہیں تھی نہیں مگر تم جانتے ہی ہو کہ جو ہم نے دیکھا۔۔۔۔ دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ہم نے اپنے دیوانے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا مگر یہاں تو دیوانے کے خواب کی تعبیر مجسم نظر آتی ہے۔۔۔۔ اور تم جو مرد، مردانگی کا تمسخر اڑانے والے بنتے ہو مردانگی کے اس خزانے کو ڈھونڈتے جا رہے تھے۔ ڈھونڈتے جا رہے تھے۔۔۔۔ پھر وہ نفرت کراہت بھی ختم ہو گئی اور مرد و عورت کے تعلق کے سوال نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ دیکھا جائے تو ہم چاروں بڑی مدت سے اسی پھندے میں گرفتار ہیں اور اس سے نکلنے کی کوشش میں دیوانگی کی حدوں کو چھوتے رہتے ہیں۔ سرد راتوں میں عشق پر وہ ہمارے ناممکن، ناقابل یقین مکالمے، جب ہم سوچ سمجھ کر کوئی بات کرنے کی بجائے کوئی بھی بات۔ کسی کی بھی کوئی بات پکڑ کر

Scanned by CamScanner

اسی بات کی ان دیکھی دنیا میں گھستے چلے جاتے تھے اور ایسے ایسے وحشت ناک مقامات پر پہنچ جاتے تھے کہ بعد میں بچ نکلنے پر حیرت ہوتی تھی اور پھر تم نے 'حیرت' پر عشق کے کیسے کیسے تماشے بنائے مگر سب کچھ وہیں کا وہیں رہا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

زہرہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی اور اس کی گفتگو جس میں کوئی اُتار چڑھاؤ نہیں تھا جیسے وہ عمل تنویم کے نتیجے میں بولے جارہی تھی اور اس کا وہ مسلسل بولتے جانا مجھے بھی نیند کی ایک ایسی دنیا میں اُتارے جارہا ہے کہ جہاں میرے لیے یہ تفریق کرنا بہت مشکل ہورہا ہے کہ وہ سوچ رہی ہے اور میں بول رہا ہوں یا وہ بول رہی ہے اور میں سوچ رہا ہوں یا ہم دونوں سوچ رہے ہیں اور کوئی تیسری ہستی بول رہی ہے۔ جب وہ رُکتی ہے تو میرے اندر ایک لذت انگیز سراسیمگی کا احساس پیدا ہوتا ہے جیسے میں اپنے کسی اختیار کے بغیر خود بولتے بولتے اچانک چپ ہوگیا ہوں۔ مجھے اس انوکھی کیفیت سے باہر آنے میں کچھ دیر لگتی ہے اور آخر مجھے علم ہوتا ہے کہ زہرہ نے غالباً مجھے سوالیہ انداز میں مخاطب کیا تھا۔ میں بہت کوشش سے اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا ہوں اور وہ آوازیں پیدا کرتا ہوں جو شاید میری اس لمحے کی زندگی کا حال بیان کرسکتی ہیں۔ مجھے اس کوشش میں بہت دقت محسوس ہوتی ہے۔

"تم نے خود کہا یہ جگہ، یہ آج کا دن غلط اور درست میں امتیاز کرنے کا نہیں ہے تم نے کہا کیا میں غلط کہتی ہوں! اصل میں تم جاننا چاہتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں یا نہیں۔ میں تمہیں صرف اتنا بتاسکتا ہوں کہ جب تم بول رہی تھی۔ بولتی جارہی تھیں۔ جیسے پہلے میں ڈھونڈتا جارہا تھا تو میرے لیے۔ میرے اور تمہارے کا۔ تم اور میں کا فرق بالکل ختم ہوچکا تھا اور تمہارے ساتھ ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی غیر متعلق ہوگیا تھا کیونکہ سب ایک ہی تھا مگر سب ایک ہی بھی نہیں رہتا۔ بیچ کر دو۔ کئی ہو جاتا ہے۔ جیسے ہم اس تلاش میں ایک نہ رہ سکے۔ ایسے ہی......" اور مجھے اچانک احساس ہوتا ہے کہ میں نہیں زہرہ بول رہی ہے اور پھر میں گفتگو کی اس خودکار منتقلی کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیتا ہوں۔

"......ایسے ہی ہم گفتگو میں ایک سے دو اور دو سے ایک ہورہے ہیں اور اس جھولنے کی کیفیت میں رہنا اسے سمجھنے سے زیادہ لذت انگیز ہے۔ زیادہ اہم بھی ہے۔ جیسے آج کا یہ دن.... اب ایسا نہیں کہ میں مرد کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ پتہ نہیں اچھی طرح جاننا بھی کیا ہوتا ہے۔

میں یہی کہہ رہی تھی۔ منجمد راتوں میں عشق پر مکالمہ بازی ادھوری ہی رہی۔ ہر کوئی بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تم تینوں جو میرے عشق کا دعویٰ کرتے ہو۔ میں تم تینوں کو چاہتی ہوں یا چاہتی تھی۔ آج جسم کے تعلق کا تجربہ ہونے کے بعد جیسے تم نے۔ جیسے ہم نے باقی دونوں کو خارج کردیا مگر یہ تجربہ بھی ادھورا ہی رہا۔ میں اور تو میں کیا کچھ حائل نہیں۔ جب میں وہاں تمہیں اس الماری میں مردانگی کا خزانہ ڈھونڈتے چھوڑ آئی اور یہاں بیٹھی ان مرتبانوں کی طرف دیکھتی رہی جن میں مردوں کی راکھ ہے تو میرا ذہن، نہیں احساس، نہیں خواب، عورت پنے میں آگے ہی آگے چل پڑا۔ عورت مرد، مرد کا ظلم، عورت کی غلامی، عورت کا استحصال، مرد کا معاشرہ، پدری معاشرہ، مادری معاشرہ، عورت کی آزادی اور ایسا ہی اور بہت کچھ جو میں جانتی آئی ہوں میرے اندر کتنی شدید خواہش جاگتی ہے کہ میں عورت کے تحفظ کے لیے بنائے گئے ان عقلی چھپروں میں سے کسی کے نیچے جا کھڑی ہوں مگر یہ کمرہ، یہ لمحے مجھے مسلسل احساس دلاتے ہیں کہ کوئی بھی عقلی فیصلہ ممکن نہیں آج نہیں، ابھی نہیں۔ یہ بہت آسان راستہ ہے۔ ادھر یا ادھر۔ یہاں وہاں یا وہاں نہیں تو وہاں۔ ہر جگہ کے دلائل مل جاتے ہیں۔ تم جیسا نظریہ باز تو یہ بات خوب جانتا ہے۔ تم تو اپنی اس پہچان سے بہت مزے لیتے ہو.... مگر آج اس عورت مرد کی بات پر ایسی ہی جگہ پر پہنچنے پر میں مزے نہیں لے پائی۔ میں دُکھ میں گھر جاتی ہوں۔ اداسی میری ہڈیوں کو منجمد کردیتی ہے اور گہرا غم میرے اندر اترتا جاتا ہے۔ یہ دنیا ہی غم ہے۔ ویسی ہی اُداسی ہے ویسا ہی دُکھ ہے جو ناممکن اور ممکن کے یک جا ہونے پر ظاہر ہوتا ہے جیسا میں نے تمہیں بتایا اس کتاب کو دیکھ کر۔ پڑھ کر جو ایک کتاب نہیں ہے..... جیسے یہ "گنجینۂ نشاط" یہ کتاب۔ ایک کتاب نہیں ہے۔ وہ کتاب جو ایک کتاب نہیں ہے مجھے غم واندوہ سے بھر دیتی ہے۔ جو ہستی اور نیستی کے مدغم ہونے پر آغاز اور انجام کے ملاپ پر کھلے راز کی طرح۔ ڈھکے ہوئے ظاہر کی طرح ہے۔ نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے مگر نہیں ہے۔ عورت مرد کا تعلق ہے یہ وہ تعلق ہے کہ جو۔ "یہ ایک تعلق نہیں ہے۔" "یہ وہ کتاب ہے جو۔" "یہ ایک کتاب نہیں ہے۔" "ایک تعلق ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ ماں اور بیٹے کا، باپ اور بیٹے کا، بھائی کا بہن کا اور ایسے ہی اور تعلق ہیں 'ایک' تعلق ہیں۔ پھر کچھ بے تعلقی کے مکمل دو کے تعلق ہیں۔ دوست دوست کا تعلق۔ مگر عورت مرد کا تعلق بیک وقت ایک اور دو کا تعلق ہے اور اس تعلق کو جو۔ "ایک تعلق نہیں ہے۔" "اس لاتعلق تعلق کی قبولیت انسان کی ازلی شکست کی قبولیت ہے، مگر عظیم

Scanned by CamScanner

مرد انسان' کی بدبختی کہ اُسے اپنی ہستی کی سختیاں، دنوں کی مجبوریاں اس شکست کی قبولیت سے محروم کر دیتی ہیں مگر وہ بچ نہیں پاتا۔ کوئی فرار اس کے لیے بھی نہیں ہے مگر وہ اس لاتعلق تعلق، ہستی اور نیستی کے اس تعلق کا سامنا کرنے پر ایک عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ اپنی بدنصیبی کو پورے جہاں کی بدنصیبی بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے عذاب کو کبھی ایک کے شکنجے میں جکڑتا ہے کبھی دو کی تفریق میں چیرتا پھاڑتا ہے اور پھر اسے پورے نظام باغ پر مسلط کرنے کا ظلم کرتا ہے........ ہاں میرا باپ اسی ظلم کا تاجر تھا۔ شاید اس لیے کہ اس پر بھی ظلم ہوا تھا۔ مرد یا عورت کے طور پر نہیں۔ انسان کے طور پر۔ ظلم عظیم انسان پر ہوتا ہے۔ مرد یا عورت پر نہیں.....''

اور پھر مجھے لحاتی طور پر وہی چکرا دینے والا احساس ہوتا ہے کہ بیان تو پھر مجھ سے بچھڑ کر زہرہ کے ذہن میں جا چکا ہے بیان آخر کس کے پاس ہے کس کے اندر ہے کس کے باہر ہے گویائی سے محرومی اور گویائی کی خودکار بحالی کی اس واردات پر مجھے ذرہ برابر بھی اعتراض نہیں ہوتا مگر اس احساس کا ہلکا سا جھٹکا میرے اندر کہیں عقل و فہم اور ہوش و حواس کی معطل ساختوں کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور میں یہ فضول بات سوچنے سے باز نہیں رہتا کہ یہ ہمارا خودکار مشترکہ ہذیانی مکالمہ یقیناً لسانی التباس کی کوئی نامعلوم شکل ہے اور لازماً یہ مرتبانوں میں سے اٹھنے والی کسی دوا یا ادویات کی دھول کا کرشمہ ہے جو مرتبان کھولنے پر ہمارے اعصاب کو چڑھ گئی ہے۔ نامعلوم نباتاتی۔ کیمیاوی مرکبات ہمارے ذہنوں کو نامعلوم سمتوں پر سفر کے لیے اکسا رہے ہیں۔ جیسا کبھی ان مشکک خیز نام کی گولیوں 'قرص کیف' نے کیا تھا اور جیسا زہرہ نے کہا تھا اور شاید آج ہی کہا تھا کہ جہاں سے ساری بات شروع ہوئی تھی...... میں ہوش مندی سے یہ سب جمع تفریق کر رہا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ کتاب کتاب ہے، تعلق تعلق ہے، الف الف ہے۔ کس دنیا میں میری اس وقتی واپسی کے دوران زہرہ کیا کچھ کہتی رہی ہے میں اس بیان کو کھو چکا ہوں مجھے اس کا علم نہیں ہو سکے گا اور اس محرومی پر مجھے اتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے کہ وہ عقلی مداخلت کاری آپ ہی آپ دم توڑ دیتی ہے۔ زہرہ اسی اپنی سُلانے والی آواز میں اب بھی وہیں ہے........ ''اور عشق اسی ازلی شکست کی قبولیت کی عدم قبولیت کا مسلسل عذاب ہے اور پھر اس عذاب سے بھی آزاد ہو جانے کی اتنی ہی شدید خواہش ہے اور یہ وہ آزادی ہے جو اس سب کچھ پر ہنس دینے سے ملتی ہے اور اس سب کچھ

پر رو دینے سے ملتی ہے۔ تم ہنس سکتے ہو، میں جانتی ہوں مگر میں ہنس نہیں سکتی۔ تم تم ہو میں میں ہوں، میں روشنی ہوں یہاں طرح کی آزادی ہے یا ایسے کی آزادی ہے۔ یہ آزادی کوئی کسی سے چھین نہیں سکتا........'' زہرہ خاموش ہو جاتی ہے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ہم کب سے خاموش تھے کوئی نہیں جانتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کمرے میں ایک نامانوس روشنی پھیل رہی ہے۔ باہر کہیں سورج طلوع ہو رہا ہے۔ رات گزر چکی ہے۔ میں اٹھتا ہوں اور سامنے کھلی الماری کو پھر سے مقفل کرتا ہوں اور پھر واپس آ کر زہرہ کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو آہستہ آہستہ نیچے کو ڈھلک رہے ہیں اور اس کے حسین چہرے پر ان دونوں آنسوؤں کا لمحہ بہ لمحہ نیچے اترنا ایک ایسا نظارہ ہے جو مجھے مسحور کر دیتا ہے میں عمر بھر ایسے ہی اس کے ساتھ اس کے آنسوؤں کا ساتھ دے سکتا ہوں مگر خود رو نہیں سکتا۔ شاید کبھی، پھر کبھی میں اسے ہنس پڑنے پر آمادہ کر سکوں۔ میں اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھ دیتا ہوں اور اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھو لیتا ہوں۔ بس ایک احساس ہے کہ ایک بڑی تخیل کی رات گزر چکی ہے۔ ایک بڑے سحر کی کیفیت گزر چکی ہے........ ''اب تم جاؤ'' زہرہ کہتی ہے۔ چابیاں اٹھاتی ہے اور میں بھورا لفافہ اٹھانا نہیں بھولتا۔ ہم یاد اور عطائی کی دنیا سے باہر آتے ہیں۔ برآمدوں میں تیز ہوا کے جھونکے اُڑتے پھر رہے ہیں۔ ان میں نمی ہے۔ شاید رات باہر کچھ بارش بھی ہوئی ہے۔

زہرہ۔ ''لگتا ہے رات کچھ بارش بھی ہوئی ہے۔''

میں۔ ''ہاں مگر یہ وہ بارش نہیں ہے۔''

زہرہ۔ ''جس بارش میں ہم انعام گڑھ جا سکیں گے۔''

میں۔ ''ہاں...... وہی...... مگر وہ بھی آئے گی''..... میں یہ لے جا رہا ہوں۔'' (میں اسے بتاتا ہوں کہ میں بھورا لفافہ اور جو کچھ اس میں ہے لے جا رہا ہوں۔)

زہرہ۔ ''ہاں تم اسے یہاں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ یہ دوسری کتاب ہے جو تمہیں ملی اور جو یا ایک کتاب نہیں ہے۔''

میں۔ ''نہیں ایک تیسری بھی ہے وہی جو میں خود لکھ رہا ہوں۔ وہی نیلے رنگ کا رجسٹر جسے میں اپنی ہذیانی کیفیتوں کو نثری متنوں کی شکل دے کر بھر رہا ہوں۔''

زہرہ۔ ''تم مجھے دکھاؤ گے۔ دکھا سکو گے۔''

Scanned by CamScanner

میں۔(گہری سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا)" میں کچھ کہہ نہیں سکتا، ابھی
کچھ کہہ نہیں سکتا۔"(اور زہرہ ہنس پڑتی ہے۔ جیسے سورج کی پہلی کرن آ جاتی ہے۔ اور واقعی دماغ
روشن ہونے لگتا ہے۔)

زہرہ۔ "اب تم جاؤ گھیلے"(میں اسے الوداعی سا چھوتا ہوں اور برآمدے سے باہر آ جاتا
ہوں۔ روش پر وہ گیٹ کی طرف جاتی ہے، چل پڑتا ہوں اور گیٹ سے کچھ پہلے بائیں طرف کچھ
پھولدار جھاڑیوں کے پیچھے وہ مجھے ایک لمحے کے لیے نظر آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں
وہ عورت جو اب محسوس ہوتا ہے کہ جیسے صدیوں پہلے مجھے اور زہرہ کو کہیں ملی تھی۔ میں بھول گیا
تھا اور یادر ہاؤس کے کسی بھی ذی روح کی طرف دیکھے بغیر گیٹ سے باہر آ جاتا ہوں۔

26 اپریل، صبح۔ یادر ہاؤس میں گزرا وہ دن اور رات اور اس گزرے دن اور رات کو نئے
رجسٹر میں منتقل کرتا ہوں، الگ الگ بڑے واقعات تھے، جنہوں نے وقت کی میری تقسیم کو گڈمڈ کر
دیا ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ کونسا واقعہ کب شروع ہوا اور کونسا واقعہ کب ختم ہوا۔ آج اس وقت میں اٹھ
جاتا ہوں کہ 26 اپریل کی صبح ہے اور میں ایک نئے دن میں جاگا ہوں اور بظاہر معمول کی زندگی
چاروں طرف ہے اور اسی زندگی میں سے نکل کر کچھ دیر پہلے میرا مالک مکان بوڑھا امداد حسین آیا
تھا۔ کبھی کہتا تھا میں دو دن سے سو رہا ہوں، کبھی کہتا تھا تین دن سے، کبھی صرف ایک دن رات کی بات
کرتا تھا۔ عجیب بوکھلایا ہوا تھا شاید اس کی بوکھلاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے لیے کب سے تین
ٹیلی فونی پیغام اٹھائے پھرتا تھا جن کے بارے میں اسے بھی علم ہے کہ میرے قریب ترین لوگوں
کے ہیں۔ پہلا پیغام زہرہ کا تھا جو صرف اتنا تھا کہ "ہاف مین ملنا چاہتا ہے" دوسرا ہاف مین کا تھا جو
یہ تھا کہ "میڈم اور تم سے ملنا چاہتا" یہاں امداد حسین نے شکایتی لہجے میں ہدایت کی کہ "کبیر
صاحب آپ ان گورا صاحب کو کہہ دیں وہ بے شک انگریزی زبان میں پیغام دیا کریں۔ میں مکمل
سمجھتا ہوں" میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کا پیغام بھی گورے تک پہنچ جائے گا وہ اگلا پیغام
بتائے۔ یہ ناصر کا تھا جس میں اس نے کہیں مل بیٹھنے کی دعوت دی تھی اور یہ "کہیں" ظاہر ہے کہ غلام
باغ کے قہوہ خانے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ پیغامات وصول کر کے میں نے امداد حسین کا شکریہ
ادا کیا اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ غالباً وہ غسل آفتابی کے سلسلے میں تساہل سے کام لے رہا ہے
کیونکہ نصیب دشمناں اعصاب کچھ مضمحل سے لگتے ہیں۔ جواباً اس نے اضمحلال کا سبب گھر والوں کی

بے رخی، بیٹیوں اور بہوؤں کو قرار دیا اور پھر غسل آفتابی اور اپریل کے مہینے کی دھوپ میں پائے
بخش شعاعوں کی کثرت اور جلد کے سرطان کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کا پختہ ارادہ ظاہر کیا۔
میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بالائے بنفشی مسائل پر بحث سے معذرت کی جو اس نے کچھ
وضاحتوں کے بعد قبول کر لی اور وضاحتیں یہ تھیں کہ آج کا دن میں نے بہت ضروری کاموں کے
لیے وقف کیا ہے اور وہ کام یہ ہیں کہ ایک تحقیقی مقالہ مناسب قیمت پر لکھنے کا معاہدہ کرنا ہے جتنی
اگر ہو سکا تو...... اور عزیز از جان ایڈیٹر مصری ڈائجسٹ کی چاکری سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل
کرنی ہے اگر وہ کچھ دے دلا سکا تو ٹھیک ورنہ جہنم میں جائے۔ امداد حسین میری طرف ایسی گہری
جذب سے دیکھتا چلا گیا اور پھر میرے لیے لڑکے کے ہاتھ ناشتہ بھجوایا۔ جو میں کر چکا ہوں۔ اب
یہ دن آج میرے لیے کیا لاتا ہے۔ اس کا حال (ماجرا) رات کسی وقت واپس آ کر لکھوں گا......"

وقت گیارہ بجے رات...... آج کا دن بہت دلچسپ رہا، ہنگامہ خیز بھی رہا اور کہہ سکتے ہیں
کہ عبرت ناک بھی رہا۔ گو مجھے نہیں سمجھ آتی کہ عبرت ناک بجز ایک خالی امکان کے اور کیا ہے اور
اگر اسے پکڑا نہ جائے (عبرت پکڑنا، عبرت حاصل کرنا، عبرت کرنا، عبرت اترنا، عبرت آنا، عبرت
جانا، عبرت پانا، عبرت رکھنا، عبرت سیکھنا، عبرت سمجھنا، عبرت ہو جانا، اور پھر عبرت تک۔) تو یہ محض
ایک منہ چڑانے والی کیفیت رہ جاتی ہے۔ بہر حال...... گھر سے نکل کر میں نے پروفیسر
ڈاکٹر نذیر بشیر ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کو فون کیا اور پوچھا کہ تحقیقی مقالہ نگاری کا کام آخر مجھے
کب دیا جائے گا۔ کیا اس وقت جب میری تحقیقی اور تخلیقی قوتیں جو ان دنوں زوروں پر ہیں
اچانک میرے اندر سے خارج ہو جائیں گی اور میں وہیں کہیں کھڑا یا بیٹھا منہ دیکھتا رہوں گا۔
دوسری طرف پروفیسر صاحب نے بلند بانگ قہقہے لگائے اور مجھے بتایا کہ وہ تو کب سے کئی کئی
دن سے میرے منتظر ہیں بلکہ امیدوار بھی متعدد بار استفسار کر چکے ہیں۔ پھر کسی والہانہ جذبے
سے مغلوب ہو کر کہا "یار تم فوراً اپنا ٹیلی فون نمبر دو مجھے" میں نے عرض کیا کہ وہ بھی دے دیا جائے
گا۔ پہلے کوئی معاہدہ تو طے ہو۔ کچھ ایڈوانس طے اور کچھ میری روٹی پانی کا سبب بنے۔ فرمایا "فوراً
آ جاؤ۔ آج ہی تین انٹرویو کر لیتے ہیں۔ ایک تاریخ کا ہے۔ دوسرا سیاسیات کا ہے اور تیسرا
...نفسیات میں بھی منہ مار لیتے ہو ناں۔" میں نے عرض کیا کہ نفسیات میں منہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ
پاؤں بھی مار لیتا ہوں۔ کہا "گڈ" پھر خیال آیا کہ یہ بات تو شاید مذاق کے طور پر کی گئی تھی۔ چنانچہ

Scanned by CamScanner

فوراً بس کر سنایا۔ پھر آخری حکم دیا۔ "بس فوراً پہنچو یار آج یہ انٹرویو فائنل کرتے ہیں" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "مگر انٹرویو میرا ہو گا یا P.H.D کے امیدوار کا؟....." جواب آیا

"دونوں کا..... بس تم پہنچنے والی بات کرو۔"

میں پروفیسر ڈاکٹر نذیر بشیر کی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچا تو وہ سوٹ پہنے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ماہ اپریل کے آخر میں اس کی یہ حرکت ایسی تھی کہ لباس، حسن و جمال، توازن سلیقہ وغیرہ کی میری روبہ زوال حسیات بھی مجروح ہونے سے بچ نہ سکیں۔

"یہ خاصی غیر انسانی حرکت ہے تمہاری پروفیسر۔ اپریل کے آخر میں جبکہ تقریباً گرمیاں آ چکی ہیں تم یہ سوٹ چڑھائے پھرتے ہو"

"آ..... نہیں..... وہ تو ہے ویسے دو دن پہلے رات بارش ہوئی تھی موسم کافی ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے سوچا کچھ دیر اور پہنے رہتے ہیں۔"

"دو دن پہلے بارش ہوئی تھی رات کو۔ کب؟"

"کہاں رہتے ہو تم..... ہوئی تھی..... باقی اور یہاں کونسے انسانی کام ہو رہے ہیں بلکہ سوٹ میں تو انسان کافی انسان انسان سا لگتا ہے۔"

پروفیسر نے اپنے پرزور فقرے پر داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے بھی ہنس کر عرض کر دیا۔

"بے شک۔ پروفیسر اور انسان میں اسی انسانیت کے جامے کا فرق ہے۔"

اب کے جواباً پروفیسر نے کامل سنجیدگی اختیار کی۔ میں اس کے ڈرائنگ روم میں ایک نشست سنبھال چکا تھا اور بظاہر قطعاً کسی عجلت وغیرہ کا تاثر نہیں دے رہا تھا اور انداز ایسا ہی تھا کہ یہ میں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کی خبر نہیں۔ بہر حال بیٹھے ہیں۔ میرے اس جہاں بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے سٹائل پر پروفیسر کچھ بے چین سا ہو کر پوچھنے لگا۔

"جانا نہیں؟......."

"تم جانو..... میں تو آ گیا ہوں۔ چائے کے حالات کیا ہیں۔"

"چائے..... ادھر ہی پئیں گے۔ ان لوگوں سے۔"

"بہت خوب۔ مگر یار۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں مجھے باخبر بھی تو کرو۔ صرف، تاریخ،

سیاسیات اور نفسیات تو کافی نہیں۔ کچھ انسانی سیاق و سباق، حدود اربعہ؟"

پروفیسر۔ "تینوں کافی الگ الگ کریکٹر ہیں..... یاد آیا..... کریکٹرز سے تم کسی زمانے میں کوئی ناول لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا بنا......."

میں۔ (بھنا کر) "کام کی بات کرو..... ہاں..... تو تینوں۔ کیا ہیں"

پروفیسر۔ "ایک تو ۔۔۔۔ ذکیہ تو ۔ ادھیڑ عمر کی اسسٹنٹ پروفیسر۔ تنخواہ میں اضافے کے لیے تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتی ہے۔"

میں۔ "نہایت معقول وجہ ہے........"

پروفیسر۔ "دوسرا امتیاز جاوید ہے نوجوان ہے۔ نفسیات میں ایم۔ اے کے بعد باپ کے ساتھ کاروبار میں شامل ہونا پڑا مگر ڈاکٹریٹ ضرور کرنا چاہتا ہے۔ اس تگڑی آسامی سے میرا خیال ہے تمہیں اچھی فیس مل سکتی ہے۔ سرمایہ دار آدمی ہے۔"

میں۔ "ہوں..... اور تیسرا"

پروفیسر۔ "..... آ ..... یہ ..... میں خود کچھ نہیں سکا ابھی۔ ویسے میری ملاقات بھی نہیں ہوئی لیکن ایک بیوروکریٹ ہے۔ پولیٹیکل سائنس میں ریسرچ ڈگری کی ضرورت ہے۔ بہر حال تم ملو گے تو پتہ چل جائے گا۔"

میں۔ "نام"

پروفیسر۔ "نام میں کیا رکھا ہے..... ہا..... ہا..... ہا ہیں۔ یہ یار تم تو بہت ہی سنجیدہ سے نظر آتے ہو۔ بہر حال نام فیصل ذیشان ہے۔"

میں۔ "تو پہلے ہم کس کے پاس جا رہے ہیں۔"

پروفیسر۔ "اسی ترتیب سے۔"

ہم پروفیسر نذیر بشیر کے گھر سے نکلتے ہیں اور اس گاڑی کی طرف بڑھتے ہیں جو اس نے پہلے سے گیٹ کے باہر کھڑی کر رکھی ہے۔ میں چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ بظاہر یہ ایک عام سا سادہ سا یعنی کافی معقول سا دن ہے۔ جس دن میں کچھ بھی ہونے نہ ہونے کی توقع نہیں ہوتی۔ آسمان نیم گرم سا ہے اور ہوا بالکل ساکن ہے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہیں تو پروفیسر اپنے سوٹ کے بٹن کھول دیتا ہے۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا ہے اور پھر میری طرف مشفقانہ اور تادیبی انداز میں

Scanned by CamScanner

دیکھتا ہے۔

پروفیسر۔ ''ویسے یار میرا مشورہ ہے کہ تم کوئی ڈھنگ کا کام بھی اب شروع کر دو۔''

میں۔ ''ٹالی کی کرو۔ کچھ اور ڈھیلی کرو۔ تمہارے دماغ کو اخرے چڑھ رہے ہیں۔''

پروفیسر۔ ''نہیں مذاق نہیں...... کچھ فیصلہ کرو اپنی زندگی کے بارے میں۔''

میں۔ ''بس آج یہ فیصلہ ہو جائے گا۔ زندگی کا۔''

پروفیسر پھر کچھ نہ بولا۔ گاڑی سڑکوں پر دوڑنے لگی اور میں یہ لکھتے وقت......

(آج پہلی دفعہ مجھے اس بات پر بھی کافی اطمینان بلکہ خوشی (ایک زہریلی خوشی ہا، ہا، ہا، ہا) ہو رہی ہے کہ نیلے رجسٹر کے صفحات اب بہت کم (بھرنے) باقی رہ گئے ہیں اور وہ دن جلد آنے والا ہے جب اس تحریری بک بک سے میری جان چھوٹے گی اور کوئی اور شغل ڈھونڈنا پڑے گا اور یہ شغل آج مجھے مل تو گیا ہے۔ وہی تو میں لکھنے لگا تھا...... ویسے یہ لکھتے وقت مجھے یہ خیال آ رہا ہے کہ میں نے پروفیسر کی خواہ مخواہ کی بک بک کے جواب میں جو خود بک دیا تھا کہ ''بس آج یہ فیصلہ ہو جائے گا۔ زندگی کا'' تو یہ بات کس قدر سچی نکلی۔ ان تحقیقی انٹرویوز کے دوران واقعی زندگی کا ایک فیصلہ ہو گیا۔ ان انٹرویوز کو جن میں بقول پروفیسر نذیر بشیر، وہ میرا انٹرویو لیں اور میں ان کا۔ ان انٹرویوز کو میں اسی نثری مشق کے زمرے میں لاتا ہوں کہ جو مکالمہ بازی۔ ڈرامہ بازی یا ڈرامہ سازی کہلاتی ہے۔ یہ ایک عجیب ترنگ میرے اندر اٹھی ہے۔ ڈرامائی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مگر مزہ آتا ہے۔ نیلے رجسٹر کا بھی تو مزہ ہے۔ نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ پڑھنے والا۔ نہ تنقید کرنے والا۔ لیکن مجھے ایک عجیب تجربہ ضرور ہوا ہے۔ اس کھلم کھلا...... نہیں صرف اپنے لیے کھلم کھلا۔ یعنی بلا روک ٹوک اس تحریری بک بک، نثری مشق کے دوران جس طرح میں نے پکڑے جانے کے کسی خوف کے بغیر قابل احترام نثری اصناف کی عصمت دری کی ہے اس سے پتہ چلا ہے (بلکہ احساس ہوا ہے کہ...... بلکہ کئی طرح کے احساس ہوئے ہیں) کہ اب نیلا رجسٹر ختم ہونے کو ہے، میرا نہیں خیال کہ میں ان 'قیمتی' احساسات کو قلم بند کر سکوں گا۔ کیونکہ رجسٹر بھی چند دنوں کے بعد بند ہو جائے گا۔ مگر ایک انوکھی بات یہاں ہو سکتی ہے۔ سادہ بیانیے سے جب میں کسی حدود و قیود کا خیال رکھے بغیر مکالماتی، ڈرامائی، بیانیے، نثر کی طرف چھلانگ لگاتا ہوں تو وہی کردار جو زبان کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں پٹ پٹ آنکھیں کھول کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دوڑتے بھاگتے

ہیں۔ یہ تو خیر ہونا ہی ہوتا ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ کرداروں کی اون ہی نہیں بدلتی بلکہ وقت اور جگہوں کی بھی کھال اُدھڑ جاتی ہے۔ اگر زہرہ اور میرا وہ عظیم دن اور رات اگر اس کا روزنامچہ میں اسی اسلوب میں نہ لکھتا تو شاید بلکہ یقیناً اسے کچھ اور ہی لکھ ڈالتا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بازیافت بھی لسانی اسلوب کی پابندیوں کی تابع ہے یعنی واقعہ۔ ب۔ ج۔ اگر...... (اس خواہ مخواہ کے ذہنی جھاڑ سے اب بچنا چاہیے۔ میرے نیلے رجسٹر...... میری کتاب زندگی کے صفحات اب تھوڑے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس لیے انہیں صرف ٹھوس حقائق کے بیان تک محدود رکھنا چاہیے بلکہ وقف کرنا چاہیے۔ مگر اس احمقانہ فیصلے کا بھی کیا جواز ہے۔) (احمقانہ فیصلے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ احمقانہ ہونا سب سے بڑا جواز ہے)

...... بہرحال...... تو میں اور پروفیسر ٹھوس حقائق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گاڑی تیز دھوپ میں سڑکوں پر رواں دواں تھی اور سوٹ زدہ پروفیسر یقیناً اب گرمی سے پریشان ہو رہا تھا۔ دو تین بار اس نے زیر سوٹ جسمانی طبقات تک رسائی حاصل کر کے کھجلانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔ البتہ ایک مرتبہ گاڑی ایک مزدور پیشہ سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور اس کا دیہاڑی کا سامان گسی اور تاسیبے نیچے گر پڑے اور پھر چند لمحے بعد جاندار اور شاندار گالیاں ہم تک پہنچیں جو کم از کم میرے کانوں میں شہد گھول گئیں۔ میں نے پروفیسر سے صرف اتنا کہا۔

''سوٹ پہننے کی سزا بعض اوقات اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔''

جواباً پروفیسر نے مزدور کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے اسے مورد الزام ٹھہرایا کہ کیوں سائیکل گاڑی کی زد میں لایا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ واقعہ گزر گیا مگر شاید یہی بظاہر معمولی سا واقعہ تھا جس نے مجھے ایک نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے اور اسی خاموشی کے دوران وہ بے چینی میرے لیے 'معلوم' ہونے لگی۔ چنانچہ جب اچانک سوٹ زدہ پروفیسر نے مجھے بتایا کہ ہم پروفیسر ذکیہ بانو کے گھر پہنچنے والے ہیں تو میں نے اپنی خاموشی برقرار رکھی۔ میں چاہتا تھا کہ جو آ رہا ہے دل و دماغ میں وہ آتا رہے...... مجھے پہلے تو اپنی ساری سرگرمی کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر ہنسی آئی جو ظاہر ہے ہونٹوں تک نہ آئی کیونکہ ایسی ہنسی مجھے پہلے بھی آ چکی تھی۔ کیا واہیات سی حرکت ہے کہ میں روزی روٹی کے لیے کوئی ایسی آسامی ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھ سے کسی نام نہاد تحقیقی کام کے سلسلے میں مدد لے کر میری مالی مدد کرے۔ یہ حرکت بنیادی طور پر امتحان میں عوضانہ لے کر

ناجائز ذرائع فراہم کرنے کی دیگر 'انسان دوست' "علم دوست" حرکتوں جیسی ہی ہے اس لیے اسے ضمیر وغیرہ پر بوجھ ڈالنے کا کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے اور ایسا کوئی مسئلہ تھا بھی نہیں۔ جو اصل انکشاف مجھ پر ہوا باقاعدہ کچھ اور ہی تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کیا بکواس ہے کہ یہ لوگ چار حرف پڑھ لیتے ہیں اور پھر چار سے بھی آگے کے حروف پڑھ جانے کے ثبوت مہیا کرنے کے لیے کاغذی سندوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ معاش کے لیے ایسے پیشے کام دھندے ہی کیوں ڈھونڈتے ہیں جن میں مزدوری بنیادی طور پر صرف ذہن کی...... دماغ کی ہوتی ہے۔ آخر ایسے لوگ پیسہ کمانے کے لیے کوئی جسمانی کام کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ کیسی عجیب نااہلی ہے۔ کیا عجیب فالج ہے۔ آخر چار حرف پڑھ جانے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ کوئی اگر چاہے بھی تو روزی کے لیے جسمانی مزدوری نہ کر سکے۔ آخر کچھ تھوڑے بہت علم پر قابض ہونے کے بعد یہ کیا پابندی لگ جاتی ہے کہ ایسا شخص بس اپنی کھوپڑی کی خدمات ہی بیچ سکتا ہے۔ آخر باقی جسم بھی پڑا ہے۔ آخر یہ کیا بکواس ہے۔ میرے اندر کے سوال کا جواب بھی ظاہر ہے کہ اندر سے ہی ملا اور میرے کسی مہذب ہم زاد نے اس سوال کو ہی بکواس قرار دیا اور پھر مجھے ہاتھ اور دماغ میں سے دماغ کی فضیلت سے آگاہ کیا (میرے اُس اندر کے سوال و جواب کو اگر کہیں بذریعہ فلم بندی پیش کرنا ضروری ہوتا تو صورتحال بالکل ویسی ہی ہوتی جیسی بعض گھٹیا بلکہ بعض اوقات بڑھیا فلموں میں بھی ہیرو یا ولن کے اندر کا ذلیل یا جلیل انسان بوجوہ مجسم ہو کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور پھر خوب ڈائیلاگ بازی ہوتی ہے اور آخر میں کہانی کے تقاضوں اور سکرپٹ کی مجبوریوں کے مطابق کسی ایک کی فتح ہوتی ہے۔ میرے اندر کے جلیل القدر اور ذلیل القدر انسان کے درمیان اس وقت ہاتھ، دماغ اور روزگار کے موضوع پر جو مکالمہ چل رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ گاڑی چل رہی تھی۔)

جلیل القدر۔ "تم یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہو کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انسان کو محنت مزدوری کر کے روزی کمانی چاہیے۔"

ذلیل القدر۔ "اگر اعلیٰ تعلیم سے تمہاری مراد ڈگری اندوزی ہے تو میں اسے سرے سے تعلیم ہی نہیں مانتا اعلیٰ ادنیٰ کی بات تو الگ رہی۔ پھر 'انسان' کی بات کرتے ہو تو مجھے تو اکثر تمہارے انسان ہونے یا ہوش مند معقول انسان ہونے پر شک ہوتا ہے۔ باقی رہ گئی محنت مزدوری کی بات تو محنت کی عظمت تو سب مبلغین و واعظین کا پسندیدہ موضوع رہی ہے اور مزدوری کو بھی کسی نے

اخلاقی جرم قرار نہیں دیا۔"

جلیل القدر۔ "لفظوں کو گھما پھرا کر غلط معنی دینے کی کوشش نہ کرو۔ اعلیٰ تعلیم سے مراد اعلیٰ تعلیم ہی ہے۔ تعلیم یافتہ افراد ہر زمانے میں اور آج کل بھی ہر معاشرے میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعے معاشی مسئلہ حل کرتے ہیں، ان کی محنت ذہنی ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے یہ مراد ہے کہ جسمانی مزدوری کرنے والے افراد کو کمتر سمجھا جائے۔"

ذلیل القدر۔ "جسمانی مزدوری کی کمتری تمہاری دلیل کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ آخر تعلیم یافتہ افراد کو یہ اختیار کیوں نہیں دیا جا سکتا کہ اگر وہ چاہیں تو ذہنی مزدوری کریں اور چاہیں تو جسمانی مزدوری کریں۔ یہ اختیار آخر کیوں چھینا جاتا ہے۔"

جلیل القدر۔ "یعنی پڑھ لکھ کر سڑکوں پر روڑی کوٹیں۔ اینٹیں گارا اٹھائیں، قلی کا کام کریں، نالیاں صاف کریں۔"

ذلیل القدر۔ "کیوں نہیں۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ٹھیک ہے اَن پڑھ یا جسے تم کم پڑھا لکھا کہتے ہو ایسے فرد کے لیے شاید ذہنی مزدوری کی گنجائش کم ہو مگر پڑھنے لکھنے کے بعد تو دونوں چوائس رہنے چاہئیں۔ یہی تو مزہ ہے تعلیم یافتہ ہونے کا۔ میرا خیال ہے کہ علم کی برکتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علم سے بہرہ ور ہونے کے بعد دونوں رستے کھل جاتے ہیں۔ عالم چاہے تو ذہن سے روٹی کمائے چاہے تو جسم سے۔ کیا خیال ہے؟"

جلیل القدر۔ "یہ ایک انتہائی لغو۔ گمراہ کن بلکہ تباہ کن خیال ہے۔ یہ معاشرے کو علم کی فضیلتوں اور تعلیم کی مثبت قوتوں سے محروم کرنے والی بات ہے۔ تم چاہتے ہو کہ ذہنی صلاحیتوں کو گٹر میں پھینک دیا جائے۔"

ذلیل القدر۔ "زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر معاشرہ یہ چاہتا ہے کہ کم از کم کچھ فراوانی جسے تم کہتے ہو ذہنی صلاحیتیں انہیں گٹر میں پھینک دے۔ کم از کم ایسے افراد کو تو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ گٹر میں پھینکوانے کی بجائے ذہن وغیرہ کو اپنے پاس ہی رکھیں اور اپنے جسم کے فراوانی پر زندہ رہنے کی کوشش کریں۔"

جلیل القدر۔ "مجھے لگتا ہے تمہارے ذہنی انحطاط کی رفتار میرے خدشات سے کہیں زیادہ تیز ہے۔"

Scanned by CamScanner

ذلیل القدر۔ ’’میں اس رفتار کو کم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اسی لیے تو مجھے یہ خیال آیا ہے کہ مزید ذہنی انحطاط سے بچنے کے لیے ذہن کو محفوظ کر لوں اور اسے کم سے کم استعمال کروں اور روپے، کرنسی نوٹ، سو روپے، ہزار روپے، دس ہزار روپے، پچاس ہزار روپے وغیرہ وغیرہ کمانے کے لیے تو بالکل بھی استعمال نہ کروں۔‘‘

جلیل القدر۔ (زہر خندہ) ’’اور جسم کے ذریعے تو تم...... پچاس ہزار کیا۔ پچاس روپے بھی مشکل سے کما سکو گے۔‘‘

ذلیل القدر۔ ’’نہیں۔ مجھے اپنی جسمانی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ ویسے بھی میری ضرورتیں محدود ہیں۔ پیسہ میرا مسئلہ نہیں۔‘‘

جلیل القدر۔ ’’اور معاشرے میں عزت، مقام، حیثیت، قدر و قیمت، سٹیٹس، مرتبہ۔‘‘

ذلیل القدر۔ ’’جو شخص ان عیاشیوں سے پہلے ہی محروم ہو۔ اسے ان سے مزید محروم کون کر سکتا ہے۔ ان کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا۔‘‘

جلیل القدر۔ ’’گویا تم پستیوں میں گر کر کیڑے مکوڑے جیسی زندگی گزارنا چاہتے ہو۔ جہاں ذہنی صلاحیتوں کا کوئی عمل دخل ہی نہ ہو......‘‘

ذلیل القدر۔ ’’میں نہیں جانتا کیڑوں کی زندگی میں ان کی ذہنی صلاحیتوں کا کہاں تک عمل دخل ہوتا ہے۔ مگر جب بھی انہیں دیکھا قابل رشک پایا۔ کیسے کلبلاتے، چہلیں کرتے، بھاگتے دوڑتے پھرتے ہیں۔ زندگی سے بھرپور، میرا مطلب ہے جسمانی زندگی سے......‘‘

جلیل القدر۔ ’’(تنفر آمیز لہجہ) ’’اٹھائے پھرو۔ سنبھالتے پھرو اپنے جسم کو......‘‘

ذلیل القدر۔ ’’نہیں۔ میں اپنے ذہن کو اور بھی زیادہ سنبھالوں گا۔ بالکل محفوظ رکھوں گا۔ چیز محفوظ پڑی ہو تو کبھی نہ کبھی کام آ ہی جاتی ہے......‘‘

میں اپنے اس ’مابین الدماغی‘ مکالمے میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے بالکل پتہ ہی نہ چلا کہ پروفیسر اپنی کار ایک مکان کے سامنے روک چکا ہے اور یہی وہ مقام تھا جب میرا ’جلیل القدر‘ ہمزاد مجھے ایک آدھ پھٹکار جما کر بھاگنے کے چکر میں تھا۔

پروفیسر۔ ’’کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ سو گئے ہو کیا؟ پروفیسر صاحب کا مکان آ گیا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔‘‘

میں۔ ’’آ گیا۔‘‘

سامنے ایک مکان ہے۔ ایک دروازہ ہے۔ پروفیسر دستک دیتا ہے۔

OOO

باب(19)

نیلے رجسٹر کے مندرجات-5

روزنامچہ بذریعہ انٹرویو نویسی و جبری مختصر نویسی

انٹرویو نمبر1

ایک ڈرائنگ روم۔ ڈرائنگ روم بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات مکینوں کی عمر بھر کی ان کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جن کے ذریعے وہ معاشرے کو اپنا 'عمدہ ترین ظاہر' دکھاتے رہنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ اہتمام اور یہ کوششیں کبھی نفرت انگیز ہوتی ہیں تو کبھی مضحکہ خیز اور کبھی قابلِ رحم اور عبرت انگیز۔ یہ ڈرائنگ روم بھی اس عمومی اصول (اصول کہیں گے یا کیا کہیں گے) سے مستثنیٰ نہیں۔

یہ ایک مربع شکل کا کمرہ ہے اور ایک ایسے مکان کا حصہ ہے جو درمیانے درجے کے افسروں اور اس کیس میں ایک تعلیمی افسر کو مہیا کیا گیا ہے۔ ایک کھلی گلی میں سے جسے گلی نہیں بلکہ سٹریٹ کہا گیا ہے۔ ہم باہر سے اس کمرے میں ایک دروازے کے رستے داخل ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے اس ڈرائنگ روم میں سے باہر سے آنے والا گھر کی دیگر مکانی کیفیات سے آگاہ ہوئے بغیر اور کسی راز داری پر نظر ڈالے بغیر باہر باہر سے ہی رُخصت ہو جاتا ہے۔ باہر باہر سے مہمان کی خاطر مدارت اور گھر کی قابلِ دید تصویری پیشکش کے بعد رخصت کر دینا ایک معاشرتی تکنیک ہے جو ابھی تک کافی مستعمل ہے۔ ڈرائنگ روم جہاں ایک طرف مکینوں کی معاشرتی پیچیدگیوں کے جذباتی اظہار کو سامانِ تزئین و آرائش کی شکل میں مجسم کرتے ہیں وہاں وہ ایک ایسی فضا بھی تخلیق کرتے ہیں جس میں غیر مرئی گمبھیر خطر ہیجان اُڑتے پھرتے ہیں اور نو وارد اگر غیر مرئی تحسسات کے لیے زندہ ہو یعنی ڈاکٹر پروفیسر نذیر بشیر کی طرح ٹھس نہ ہو تو لازم ہے کہ وہ اُن کی لپیٹ میں آ

جائے گا..... مگر میں یہ کس طرف نکلتا جا رہا ہوں۔ میں نے پیچھے وعدہ کیا تھا (اپنے آپ سے) کہ میں آج سے ہر روز کی روداد تقریباً اس طرح لکھوں گا جیسے ڈرامے لکھنے والے منظر لکھتے ہیں مگر کسی لیے بھی اپنی بک بک کا غلبہ کم نہیں ہوتا۔ میں کوشش کرتا ہوں اس طرح لکھوں (کیا میں اور کیا میرا لکھنا) (عجیب خوف طاری ہو رہا ہے یہ لایعنیں لکھتے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پاگل پن کے آغاز میں التباسی کیفیات شروع ہونے سے پہلے یعنی ابتدائی اظہار (یہ بھی ایک اظہار ہے) کے طور پر انسان کو اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے اور مجھے اس لکھائی (لا لکھائی، جب کہہ دیا ہے لا لکھائی ہے تو لا لکھائی ہے) میں گونج لکھائی کا عمل بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ہے بھی تو کیا۔ اس سے جان چھڑاؤ۔ بھول جاؤ..........) تو ہم۔ میں اور پروفیسر ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ بارہ تیرہ سال کا وہ لڑکا جس نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے دیا تھا، دبلا پتلا لمبوترے چہرے اور بڑی بڑی نم ناک سی آنکھوں والا تھا وہ اندر جا چکا ہے۔ ہم پروفیسر ذکیہ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ کمرے میں باہر سے داخل ہوں تو دائیں طرف وہ صوفہ ہے جس پر میں/ہم بیٹھے ہیں۔ ایک لمبا اور دو چھوٹے، جسے تین ٹکڑوں کا صوفہ سیٹ کہا جاتا ہوگا۔ اس کے اوپر ایک اُجلا سفید ڈھلا ہوا غلاف اس مہارت سے چڑھایا گیا ہے کہ اصل صوفے کی سطح کو دیکھنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یقیناً یہ صوفے اس کمرے کا سب سے قابلِ فخر فرنیچر ہیں۔ بالکل دیوار کے ساتھ کین کی بنی ہوئی کچھ کرسیاں رکھی ہیں۔ جن کی رنگت پیلے اور بھورے کا عجیب سا مرکب ہے۔ باہر سے سورج کی روشنی گلی کی طرف کھلتی کھڑکیوں کی راہ سے ان پر کہیں کہیں ٹکڑوں کی شکل میں گر رہی ہے اور ان روشن جگہوں پر سے کرسیاں عنابی رنگ کی میل کو نمایاں کر رہی ہیں۔ وہیں کہیں سے ایک مکھی اڑتی ہے اور روشنی کی شعاع میں اتنے فاصلے سے بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ اس لیے بھی کہ میں اس جانب غور سے دیکھ رہا ہوں اور پھر وہ یک دم غائب ہو جاتی ہے اور یک دم ہی پروفیسر نذیر بشیر کی ناک پر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ جھلا کر جھٹکتا ہے اور مجھ سے دنیا کا احمقانہ ترین سوال کرتا ہے۔

پروفیسر۔" کیا سوچ رہے ہو۔"

(میں اس کا احمقانہ ترین جواب ہی دے دیتا ہوں۔)

میں۔" کچھ نہیں۔"

Scanned by CamScanner

پروفیسر۔ "پروفیسر صاحب آئی سی ہوں لی۔"

میں کوئی جواب نہیں دیتا اور کیبن کی کرسیوں کے پیچھے دیوار پر لگی چیزوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔ ڈرائنگ روم کی آرائش کرنے والوں نے ایک پینٹنگ کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ آنے والے اسے دیکھ کر کچھ اچھی رائے قائم کریں اور اگر اتفاق سے کوئی آرٹ لن سے کوئی واسطہ رکھنے والا آ جائے تو جان جائے کہ اہل خانہ کا ذوق عمدہ ہے۔ یہ ایک سٹل لائف ہے جس میں خربوزہ نما پھل، کتاب، قلم دان اور ایک طشتری ہے جنہیں ایک مکانی عدم توازن میں جامد کر دیا گیا ہے۔ پس منظر میں نیلی خلا ہے یا دیوار ہے۔ مکھی اُڑ کر پینٹنگ کے بے جان خربوزے پر بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ میں خربوزے میں دور سے اسے پینٹ کا ایک نقطہ سمجھ رہا تھا جو پھر یک دم غائب ہو گیا اور اگلے ہی لمحے پروفیسر نے پھر ہاتھ جھٹک کر اسے اپنی ناک سے اُڑایا۔

پروفیسر۔ "ذلیل مکھی۔"

غم ناک آنکھوں والا لڑکا پھر آتا ہے۔

لڑکا۔ "ای بس آ ہی رہی ہے۔"

پروفیسر۔ "کوئی بات نہیں بیٹا ہم بیٹھے ہیں۔" لڑکا جاتا ہے۔

پروفیسر۔ "تم تو بالکل منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ گئے ہو۔"

میں۔ "نہیں، میں چیزیں دیکھ رہا ہوں۔"

بہت سی چیزیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تپائیاں۔ جن پر کروشیے کے جھالروں والے میز پوش ہیں اور آرائشی چیزیں۔ سنگِ مرمر کا گلدان۔ کسی کالے پلاسٹک یا لکڑی سے بنے دو ہاتھی۔ کچھ کتابیں جو پتہ نہیں کونسی کتابیں ہیں۔

پینٹنگ کے ساتھ دائیں طرف ایک کیلنڈر ہے جو ٹورازم والوں کا ہے جس میں دو مہینوں کی تاریخیں سامنے ہیں جن میں سے ایک گزر چکا ہے۔ کیلنڈر میں اوپر ایک فوٹو گراف ہے۔ رنگین اور کسی اچھے فوٹو گرافر کا کام لگتا ہے۔ یہ کوئی تاریخی، آثار قدیمہ جیسی جگہ ہے اور اگلے ہی لمحے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں فوراً ہی کیوں نہ پہچان سکا یہ غلام باغ کے ایک حصے کی تصویر ہے۔ جنم کھنڈر اور ملحقہ حصے مشرقی طرف سے کیمرے کی گرفت میں لیے گئے ہیں۔ پیچھے درختوں

کے عقب میں سورج ڈوبتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ مجھے وہ رات یاد آتی ہے جب ہاف مین اور میں وہیں کہیں بیٹھے طویل بک بک کرتے رہے تھے اور پھر مدھلی کی چیخ نے ہمیں دہلا دیا تھا۔ مگر میں پروفیسر سے کہتا ہوں۔

میں۔ "یہ دیکھا...... وہ کیلنڈر...... میرا خیال ہے غلام باغ کی تصویر ہے۔"

پروفیسر۔ (دیکھ کر) "ہاں...... ہوگا...... مجھے تو یہ سب کھنڈر وغیرہ ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔"

میں۔ "انہیں لگنے بھی چاہئیں پروفیسر۔"

پھر میں ایک کونے میں رکھی میز پر بچھے ایک کڑھائی کے کام والے کپڑے کو دیکھتا ہوں جس پر ہلکے گلابی پھول ہیں اور اس کے اوپر بھی ایک فریم کی ہوئی تصویر رکھی ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کے رشتۂ ازدواج میں بندھنے کی سند ہے۔ عورت حسب معمول سر جھکائے عروسی لباس میں ہے اور مرد حسب معمول تنا کھڑا ہے اور کیمرہ کی راہ سے دنیا سے مخاطب ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب کچھ انتہائی معمولی اور معمول کے مطابق ہے۔

میں۔ "سب کچھ...... کتنا معمول کا ہے......"

پروفیسر۔ "ہیں؟"

میں۔ "میں کہہ رہا تھا کہ سب کچھ کتنا معمول کا ہے ہر چیز اپنی جگہ کتنی عام سی ہے مگر پھر بھی چیزوں کے اس مجموعے میں غیر معمولی غم واندوہ گھومتا پھرتا ہے۔"

پروفیسر۔ (زور سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے) "یار یہ مکھی...... (اچانک) تم نے کبھی غور کیا ہے کہ بعض اوقات کسی جگہ بالکل عجیب طریقے سے کوئی مکھی صرف تمہارے پیچھے پڑ جاتی ہے اور ساتھ بیٹھے لوگوں کو کچھ نہیں کہتی۔ بندے یہ ہنسنے والی بات ہے مگر میں نے باقاعدہ نوٹ کیا ہے۔"

میں۔ "...... کہ مکھی بیٹھتی ہے اور صرف تم پر آ کر بیٹھتی ہے۔ ہاں یہ ایک چھوٹی موٹی پراسرار بات ہے۔ اس پر تحقیق ہونی چاہیے۔ ریسرچ کے لیے جگہ جگہ امکانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔"

پروفیسر ہنستا ہے۔

پروفیسر۔ "اچھا ہے...... مگر ہاں تم کچھ اور کہہ رہے تھے۔ میرے کان میں پڑا تھا۔ غم واندوہ غیر معمولی۔ اللہ رحم کرے۔ ہاں کیا۔ غم واندوہ......"

میں۔ "بھول جاؤ...... گزر گئی بات......"

Scanned by CamScanner

میں یک دم کمرے کو دیکھنا بند کر دیتا ہوں اور پروفیسر سے باقاعدہ گفتگو کرنے لگتا ہوں۔

میں۔ ''بعض اوقات کوئی مکھی سب کو نظر انداز کر کے بار بار تمہارے ناک پر ہی آخر کیوں آ بیٹھتی ہے۔ آخر کیوں؟''

پروفیسر۔ (ہنستے ہوئے) ''چھوڑو یار...... وہ تو مذاق...... یہ بیٹھی پھر...... بھن...... شی......''

پروفیسر یہ جان کر کہ وہ کسی شریفانہ جگہ بیٹھا کسی خاتون خانہ کا انتظار کر رہا ہے خود ہی اپنے آپ کو شی کر کے چپ کرا دیتا ہے۔

میں۔ ''بیٹھی نہ پھر...... نہیں بظاہر یہ معمولی سی بات ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی نامعلوم مظہر کارفرما ہو...... مثلاً...... مثلاً ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں بعض انسانوں کے جسم سے کوئی ایسی غیر مرئی شعاعیں خارج ہوتی ہوں جن سے صرف حشرات متاثر ہوتے ہوں۔''

پروفیسر۔ (بے یقینی سے ہنستے ہوئے) ''تمہارا مطلب ہے میرے جسم سے شعاعیں خارج ہو رہی ہیں............''

میں۔ ''ضروری نہیں مگر یہ ایک مفروضہ ہے اور مفروضہ میری جان ہر طرح کی ریسرچ کی بنیاد ہے۔ کسی بھی خلاف معمول بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم لوگوں کو یہی تو اللہ کی مار ہے کہ ہم تحقیق نہیں کرتے۔ جبکہ گورے ہر بات کی تہہ میں جاتے ہیں۔ بال کی کھال اتارتے ہیں اور اس طرح تھوڑا تھوڑا کر کے انہوں نے فطرت کی تسخیر کر لی ہے۔ کچھ کر لی ہے کچھ باقی ہے۔ وہ بھی ہو جائے گی۔ تحقیق کرو...... تحقیق...... ریسرچ...... ریسرچ...... ریسرچ......''

پروفیسر اب اس تکلیف دہ کیفیت میں ہے جہاں اسے اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ میری باتوں کو محض یاوہ گوئی سمجھے یا کوئی نہایت سنجیدہ بات سمجھے اور میں اسے اس کیفیت میں رکھنا چاہتا ہوں۔

میں۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

پروفیسر۔ ''آ...... وہ...... ہاں...... نہیں...... یہ بات تو ہے...... مگر تمہارا کچھ پتہ نہیں۔''

میں۔ ''میرا کچھ پتہ نہیں...... کیا مطلب...... میں بکواس کر رہا ہوں؟''

پروفیسر۔ ''آ...... وہ...... نہیں...... (ہنس کر بوکھلاہٹ)...... مگر مکھی...... کھ...... مکھیاں...... مکھیوں پر تحقیق............''

میں۔ ''پھر وہی بات...... بات مکھیوں کی نہیں...... بات یہ ہے کہ بظاہر نہایت معمولی سی باتیں...... بعض اوقات غیر معمولی حقائق کو سامنے لے آتی ہیں مثلاً...... ایک اور بات...... آج تک اس چیز کو نہیں سمجھا جا سکا کہ محفل میں جب کوئی ایک شخص جمائی لیتا ہے تو کوئی نہ کوئی دوسرا بھی کیوں جمائیاں لینے لگتا ہے؟''

پروفیسر۔ ''ہاں یار...... ویسے یہ تو ہے......''

میں۔ ''اب یہ میرا میدان نہیں...... یہ بیالوجسٹ اور ماہرین عضویات اور ماہرین نفسیات کا کام ہے...... آخر پھر کوئی گوراہی ان پر کام کرے گا دیکھ لینا۔ علم کا دروازہ ہم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔''

پروفیسر اب واقعی گہری پُر تشویش نظروں سے مجھے دیکھتا ہے اور اس وقت دروازہ پھر کھلتا ہے اور فہم ناک آنکھوں والا لڑکا پھر آتا ہے۔ اب تھوڑا سا خوش بھی ہے مگر آنکھیں ویسی ہی ہیں۔

لڑکا۔ ''انکل...... امی...... آ گئیں ہیں...... نہیں...... میرا مطلب ہے۔ وہ بس آ رہی ہیں......''

پروفیسر۔ ''پروفیسر صاحب کہیں گئی تھیں......''

لڑکا پریشان سا ہو جاتا ہے۔ غالباً اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو اس کے خیال میں اسے نہیں کہنا چاہیے تھی مگر پروفیسر بھی ایسا ڈھیٹ اور احمق ہے کہ پھر پوچھتا ہے۔

پروفیسر۔ ''کہاں گئی تھیں؟''

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکا جان گیا ہے کہ اس شخص سے جھوٹ موٹ کوئی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بتا ہی دینا چاہیے۔

لڑکا۔ ''جی...... وہ مارکیٹ تک گئی تھیں آپ کے لیے پیسٹریاں، اور دوسری چیزیں لینے......''

میں پھر ویسی ہی فہم واندوہ کی لہریں گزرتی محسوس کرتا ہوں۔

پروفیسر۔ ''او...... اچھا...... اچھا...... ٹھیک...... چلو...... پر تم چلے جاتے ناں بیٹے۔''

لڑکا۔ ''مجھے امی زیادہ باہر نہیں بھیجتیں۔'' ل

پروفیسر۔ (احمقانہ ترنگ) ''تو تمہارے ابو چلے جاتے......''

لڑکا۔ ''ابو نہیں ہیں ناں...... میرے ابو نہیں ہیں۔''

پروفیسر۔ (کچھ یاد آتا ہے سنجیدہ اور اُداس ہونے کی کوشش کرتا ہے) ''او...... ہاں...... مجھے یاد ہی نہیں رہا...... چلو کوئی بات نہیں...... چلو شاباش آپ......''

(لڑکے کو تھپکی دیتا ہے لڑکا جاتا ہے) پروفیسر اب معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتا ہے مگر اس کی نظروں کے کیا معنی ہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

میں۔ ''کیا ہوا''

پروفیسر۔ ''بچے کا باپ نہیں......''

میں۔ ''اوہو...... تو پروفیسر صاحب بیوہ ہیں۔ تم نے بتایا ہی نہیں۔''

پروفیسر۔ ''آ...... بس عجیب چکر ہے۔ بیوہ ہیں بھی اور نہیں بھی......''

میں۔ ''کیا فضول بات کر رہے ہو۔''

پروفیسر۔ (دھیمے لہجے میں) ''دراصل تین چار سال پہلے خاوند غائب ہو گیا۔ ایک بڑا بس کا حادثہ ہوا تھا۔ شک ہے کہ اس میں مارا گیا مگر ثبوت کوئی نہیں ملا تھا۔ اب جب تک چار سال گزر نہیں جاتے ذکیہ بیگم کہیں اور شادی نہیں کر سکتیں۔ ویسے کرنے کا ارادہ بھی نہیں...... آپس کی بات ہے۔ مطلب یہ کہ یا تو وہ آ جائے یا پھر چار سال گزر جائیں۔ اس حساب سے بیوہ ہو کر بھی اور نہ بھی...... میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا......''

(پروفیسر نذیر بشیر نے مجھے جو کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور وہ جو کچھ میرے پلے پڑا میں فوری طور پر اس سے لاتعلق ہی رہا مگر مجھے ایک ظالمانہ سی خوشی ہوئی کہ اس کمرے کے بارے میں (میں غیر ارادی طور پر ماضی کے صیغے کا استعمال کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ مکالمے اور پھر ڈرامائی مکالمے میں منظر کشی حال میں چلتی ہے تو تصحیح کرتے ہوئے) پروفیسر نذیر بشیر جو کچھ بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور جو کچھ بھی میرے پلے پڑتا ہے میں فوری طور پر اس سے لاتعلق ہی رہتا ہوں مگر مجھے ایک ظالمانہ سی خوشی ہوتی ہے کہ اس کمرے کی فضا کے بارے میں میری حسیات کچھ غلط نہیں بتا رہیں۔ یہ کمرہ مدتوں سے (تین چار برسوں سے تو کم از کم مگر میرا خیال ہے اس سے پہلے سے بھی) اُداسیوں اور غم ناک کیفیتوں کا مسکن رہا ہے۔ (مسکن ؟؟) اور میرے اس تاثر کی تصدیق بھی فوراً ہی ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ذکیہ بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ وہ ایک نرالی دلکش

ہوئی لا رہی ہے۔ جس پر چائے وغیرہ کے برتن رکھے ہیں۔ پروفیسر اور میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ رسمی سلام وغیرہ ہوتا ہے ذکیہ بیگم کی آنکھیں اپنے بیٹے جیسی غم ناک ہیں مگر لڑکے کی آنکھوں میں جہاں کہیں اُمید، جوش اور مضطرب زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ ذکیہ بیگم کی غم ناک آنکھوں میں بے بسی۔ بے چارگی اور نا امیدی ہے جس سے کوئی چھٹکارا اُس کی آنکھوں کو ملتا ہے اور نہ اُس کی آنکھوں کو دیکھنے والوں کو۔ اُس نے کریم رنگ کی بڑی چادر سے اپنے جسم کو اور سر کو ڈھکا ہوا ہے۔ وہ گول چہرے اور گندمی رنگ کی پینتالیس سے ایک آدھ سال اوپر نیچے کی خاتون ہے۔ ہم سب بیٹھ جاتے ہیں۔)

ذکیہ بیگم۔ ''معاف کیجئے گا آپ کو بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ دراصل آپ کی خاطر مدارت کے لیے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ بچیاں کالج گئی ہوئی ہیں۔ بچہ چھوٹا ہے۔ مجھے ہی جانا پڑتا ہے۔ کچھ معاملہ ہی ایسا ہے......''

پروفیسر۔ (غم زدہ نظر آنے کی کوشش میں اور بھی احمق لگتا ہے) ''آ.. وہ میں نے بتایا ہے...... مبارک صاحب کے بارے میں......'' (عورت کی آنکھوں میں اس سرعت سے نمی چھلکتی ہے کہ میں حیران رہ جاتا ہوں۔ جیسے یہ سب میکانکی طور پر ہوا ہو۔ پھر وہ ایک گہرے احساس ذمہ داری کے ساتھ چائے بنانے لگتی ہے۔ مجھے تو وہ احساس ذمہ داری ہی لگتا ہے۔ میرے اندر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ مجھے اس عورت سے کچھ بات کرنی چاہیے۔)

میں۔ ''آپ نے...... خواہ مخواہ اتنی زحمت کی (پھر فوراً ہی مجھے احساس ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کا لفظ میں نے بہت بھدا بولا ہے۔ کچھ اور کہنا چاہیے تھا مگر عورت پر اس بات کا بھی بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی ہے ایک زیادہ نارمل انداز میں............)

عورت۔ ''آپ ہیں؟''

(پروفیسر جیسے خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اصل گفتگو شروع ہوئی۔ فیصلہ کن انداز میں ایک پلیٹ اٹھاتا ہے اور اس پر ایک پیسٹری ڈالتا ہے اور ساتھ ہی فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے۔)

پروفیسر۔ ''جی یہی ہیں............''

عورت۔ ''آپ بھی پروفیسر ہیں (میری طرف ایک پلیٹ بڑھاتی ہے۔)

میں۔ ''جی۔ میں لیتا ہوں...... پلیز۔''

Scanned by CamScanner

(میں پلیٹ واپس رکھتا ہوں۔ پروفیسر نذیر بشیر اب روایتی کان سے کان تک کی مسکراہٹ دے رہا ہے اور میری طرف فخریہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ عورت کی طرف فخریہ نظروں سے دیکھتا ہے۔)

پروفیسر۔"یہ..... پروفیسر تو نہیں ہیں مگر ریسرچ کا بہت تجربہ ہے۔ میں نے بھی اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے دوران ان سے کچھ مدد لی تھی۔ آپ کو بتایا تھا ناں۔"

عورت۔"جی بھائی....."(آہ بھر کر)"مگر میرا تو مسئلہ صرف مدد کا نہیں ہے جناب..... میرا تو سارا کام ہی انہیں کرنا پڑے گا۔ ٹا..... پک کا انتخاب، تھیسس لکھنا، مجھے پھر انٹرویو کی تیاری کرانا..... اب انٹرویو تو خود ہی دینا پڑتا ہے..... ناں"

پروفیسر۔(قہقہہ لگاتا ہے)"ہاں..... یہ تو ہے....."(مگر جب مجھے اور عورت کو کسی حتمی کیفیت میں نہیں پاتا تو چپ ہو جاتا ہے اور پھر بولتا ہے)"کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں کبیر۔"

عورت۔(مجھ سے مخاطب)"آپ تو کچھ لے نہیں رہے....."

میں۔"جی..... میں..........."

(میں ایک پلیٹ میں ایک بسکٹ رکھ لیتا ہوں۔ مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری ہو رہی ہے جو کبھی کبھی موت کی دعوت میں شمولیت کرنے پر طاری ہوتی ہے۔ لوگ دل جمعی سے کھا پی رہے ہوتے ہیں جبکہ میرے لیے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھنا بھی کراہت کا باعث بن رہا ہوتا ہے۔ عورت امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے کہ میں بسکٹ اب اٹھاؤں گا اور کھاؤں گا اور میں بسکٹ اُٹھا لیتا ہوں اور سامنے دانتوں میں تھوڑا سا کتر کر آہستہ آہستہ منہ چلانے لگتا ہوں۔ عورت مطمئن نظر آتی ہے۔)

عورت۔"دراصل جناب۔ آپ سے کیا چھپانا۔ میرے جو حالات ہیں۔ تاریخ میں ٹیوشن بھی نہیں ملتی۔ بچیاں جوان ہیں۔ آمدنی کا اور کوئی وسیلہ نہیں۔ اب پروفیسروں کو پی۔ ایچ۔ ڈی پر کافی تنخواہ میں اضافہ مل جاتا ہے۔ ابھی کافی سروس ہے۔ پھر ترقیاں، سلیکشن آسان ہو جاتی ہے۔ مبارک صاحب ہوتے تو اور بات تھی..... (میں نمی کا منتظر ہوں مگر اب کوئی نمی نہیں)..... تو یہ ریسرچ وغیرہ جناب..... اب میرے بس کی بات نہیں..... لائبریریاں کھنگالنا۔ کیسے کر سکتی

ہوں..... بڑا مشکل ہے..... بڑا مشکل ہے..... لیکن ڈگری بھی ضروری ہے..... اتفاق سے پروفیسر صاحب نے آپ کا ذکر کیا..... تو....."

میں۔"جی..... جی..... میں..... میں حاضر ہوں....."(بسکٹ کا ٹکڑا میرے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ میں چائے کا گھونٹ لیتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں کہ چائے تو مجھے ضرور پینی چاہیے۔ ورنہ میرے حلق میں پھندا پڑ جائے گا۔)

پروفیسر۔"بس باقی آپ اب ہم پر چھوڑ دیں، ٹاپک ہم چنیں گے۔ ڈیپارٹمنٹ سے بورڈ سے اپروو میں کروا لوں گا۔ پھر یہ کام کریں گے..... وہ..... بس..... میں (پروفیسر دزدیدہ نظروں سے میری طرف پھر عورت کی طرف دیکھتا ہے)..... میں چاہتا تھا کہ آمنے سامنے بات ہو جائے..... ٹیوشن کی....."

میں۔"ٹیوشن..........؟"

پروفیسر۔"..... فیس کہہ لیں....."

عورت۔"..... جی..... بالکل..... جی..... وہ تو..... آپ جو..... مبارک صاحب کی..... انشورنس تھی..... مگر..... کمپنی والے..... بہت کم دیا..... کہنے لگے لاش مل جاتی تو..... پورے مل جاتے۔ (میں تیزی سے آنکھوں کو نمی کے لیے دیکھتا ہوں مگر کہیں نمی نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے) کہنے لگے..... کیا پتہ کہیں چلے گئے ہوں..... آ جائیں..... (اب آنکھوں میں ایک دم نمی آ جاتی ہے اور مجھے ایک گہرا اطمینان ہوتا ہے۔ جو چیزوں کو ویسے ہی دیکھنے پر ہوتا ہے جیسے انہیں ہونا چاہیے۔) مگر میں کیا اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی..... جی جناب..... بالکل..... میں فیس دوں گی..... انشاءاللہ..... آپ حکم کریں..... اتنا بڑا کام کرنا ہے..... آپ نے..... آپ فرمائیں....."

(میرے لیے کچھ بھی بولنا ناممکن ہو رہا ہے مگر مجھے بولنا ہے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں اور چائے کے گھونٹ لیتا ہوں۔ پروفیسر اور عورت (عورت پروفیسر ذکیہ بیگم) میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میری نظر غلام باغ والی تصویر پر جا پڑتی ہے اور میں بس بول پڑتا ہوں۔ شاید گفتگو کو اور طرف لے جانے کے لیے بھی۔)

میں۔"یہ ٹورازم والوں نے کیلنڈر..... آثارِ قدیمہ کا خوب بنایا ہے..... یہ غلام باغ کا فوٹو گراف بہت عمدہ ہے....."

Scanned by CamScanner

عورت۔ (حیرت سے) "جی...... کیا...... آ اچھا جی...... ہاں...... یہ کیلنڈر...... اچھا کا آپ کو...... میری ایک کولیگ نے دیا تھا...... اس کے میاں شاید اس محکمے میں ہیں......"

پروفیسر۔ (احتجاجی لہجہ) "یار...... تم...... ڈھنگ کی بات کرو...... کیا غلام باغ کی تصویر میں پھنسے ہو۔ (عورت سے مخاطب ہوتا ہے وضاحتی لہجے میں)...... دراصل...... یہ...... ان کا پرانا شوق ہے۔ یہ کھنڈر وغیرہ...... ان کا...... ان کے کچھ گورے بھی دوست ہیں جو وہاں...... شاید ریسرچ کرتے ہیں......"

عورت۔ "اچھا جی...... اچھا...... واقعی...... مگر میرا تو تاریخ پر تھیسس...... ہو...... گا...... ناں......"

میں۔ "جی...... جی...... بالکل...... (میں دل کڑا کرتا ہوں اور بات کرتا ہوں)...... دیکھیں...... یہ...... وہ...... فیس وغیرہ کی بات۔ میں پھر ان سے پروفیسر صاحب آپ کو بتا دیں گے...... لیکن کوئی...... کوئی موضوع...... کوئی ٹاپک وغیرہ آپ نے سوچا ہو...... کچھ ہو آپ کے ذہن میں...... تو آسانی رہے گی......"

(عورت ذہن پر زور ڈالتی ہے۔)

عورت۔ "مجھے تو ساری تاریخ ایک جیسی ہی لگتی ہے...... چھوڑیں جناب یہ تو آپ نے ہی بتانا ہے...... مجھے تیاری کروانی ہے...... خاندان دیکھ لیں۔ مغل دیکھ لیں اور انگریز...... بعد کا زمانہ...... نہیں جو آپ مناسب سمجھیں......"

میں۔ "ٹھیک ہے جی...... میں پھر دیکھتا ہوں...... میں کیا کر سکتا ہوں......"

پروفیسر۔ "کرنا کیا ہے۔ ریسرچ کرنی ہے۔ علم حاصل کرنا ہے اور کیا۔"

میں۔ (عورت سے) "کبھی کوئی چیز...... عجیب لگی ہو۔ کوئی سوال۔ کوئی مسئلہ کہیں کچھ پیدا ہوا ہو...... شاید اس سے کوئی موضوع نکل آئے۔"

پروفیسر۔ "آ...... آ بالکل اور باقی ہم نکال لیں گے"...... میں سوچتا ہوں کہ...... مگر جو میں سوچتا ہوں وہ تو ڈرامے کا حصہ نہیں بن سکتا مگر بن ہی سکتا ہے۔ وہ جو Aside کی ایک تکنیک ہوتی ہے۔ ایکٹر کا سوچا ہوا تماشائیوں کو سنائی دیتا ہے مگر دوسرے ایکٹروں کو نہیں (لا لکھائی جو لکھاری کو پڑھائی دیتی ہے مگر قاری کو نہیں) (نہیں مماثلت موزوں نہیں) لیکن Aside

کارآمد ہے۔

میں۔ (Aside) احمق ہے یہ پروفیسر...... میں تو ایسے ہی جان چھڑانے کے لیے بات کر رہا ہوں۔ یہ سمجھتا ہی نہیں۔ اب کہیں یہ عورت واقعی کسی ٹا...... پک کے بارے میں سوچنے نہ لگ پڑے۔ مجھے فوراً جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہیے۔ ایسی دردناک ریسرچ کی کمائی مجھے ہضم نہیں ہو گی۔ یہ ساری حرام کی کمائی ہے۔ کمائی وہی جو ہاتھ کی کمائی۔ پتہ نہیں کیا بکواس سوچ رہا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں۔

عورت۔ "اکثر سوالوں کے جواب تو کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ پھر بھی لڑکیاں بعض اوقات سوال پوچھتی ہیں۔ بڑی بے وقوفی کے.........."

میں۔ (تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں) "مثلاً کیا؟"

عورت۔ (اب ایک پروفیسر بن جاتی ہے۔ یعنی روتی ہوئی بیوہ سے ایک روتی ہوئی پروفیسر بن جاتی ہے) "بی۔ اے کی ایک لڑکی ہے شگفتہ۔ میں جنگ پلاسی پڑھا رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پوچھنے لگی۔ "میڈم جو لوگ تاریخیں لکھتے ہیں یا پتے آپ ہی لکھنے لگتے ہیں تاریخیں یا کوئی انہیں لگاتا ہے اس کام پر...... میرا مطلب ہے میڈم سب سے پہلے کس نے لگایا تھا انہیں اس کام پر اور کیوں لگایا تھا......"

پروفیسر۔ "ہاں سارے فساد کی جڑ تو وہی ہے جس نے انہیں اس کام پر لگایا" پروفیسر خوب قہقہہ لگاتا ہے مگر عورت مجھے بدستور سنجیدہ دیکھ کر اس کا ساتھ دینے سے اجتناب کرتی ہے۔

میں۔ "سوال دلچسپ ہے بلکہ میں تو کہوں گا اصل سوال ہی یہی ہے...... تو آپ نے کیا جواب دیا لڑکی کے اس سوال کا.........."

عورت۔ "جواب کیا دینا تھا۔ لڑکیاں ساری ہنسنے لگیں اور.........."

پروفیسر۔ "اور...... لڑکی کو اس کے سوال کا جواب مل گیا——"

میں۔ "اگر آپ چاہیں...... تو اسی سوال پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ سکتی ہیں۔"

میرے لہجے اور انداز میں شاید کوئی ایسی بات ہے یا پتہ نہیں کیا بات ہے کہ عورت لگتا ہے کہ دہل سی گئی ہے اور پھر وہ یقیناً میری بات کا غلط مطلب نکالتی ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں اسی میکانکی سرعت سے نمی آ جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

عورت۔ ''آپ ..... آپ شاید میرا مذاق اُڑا رہے ہیں ..... میری مالی مجبوری ہے جناب .....اسی لیے میں نے سوچا یہ ڈگری مل جائے تو..... تنخواہ میں اضافہ ..... کاش مجھے اتنا ہی پتہ چل جائے کہ مبارک ..... اس دنیا میں ہیں یا نہیں..........''

میں۔ (شدید بوکھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے) ''آ..... م ..... میں ..... م ..... میں ..... میرا یہ مطلب ہرگز نہیں مذاق بالکل نہیں۔ میں تو بہت سنجیدگی ..... بات''

پروفیسر۔ (عجیب مصالحانہ مداخلت کرتے ہوئے) ''آ..... نہیں ذکیہ بہن ..... (میری طرف فہمائشی نظروں سے دیکھتا ہے) مذاق نہیں.......... یہ بندہ اس کی حسِ مذاق ہی ایسی ہے۔ نن.....نہیں ..... اس میں مذاق ہے ہی نہیں ..... اس کی سوچ ہی ایسی ہے دل میں کچھ ہوتا ہے زبان پر کچھ ..... آپ فکر نہ کریں۔ ہم سب کچھ طے کرتے ہیں ..... پھر میں آپ کو بتادوں گا..... ہمیں اجازت دیں ..... (مجھے چلنے کا اشارہ کرتا ہے) ..... باقی ..... وہ ..... ذرا ایک ذاتی سا سوال تھا ..... مبارک صاحب کی گمشدگی کو چار سال تو اب ہونے والے ..... مطلب ہے کب ہوں گے۔''

عورت۔ ''جی اسی سال''

پروفیسر۔ ''اللہ فضل کرے ..... ہمیں اجازت دیں ......''

ہم باہر کا رُخ کرتے ہیں۔ غم ناک آنکھوں والا لڑکا اب دروازے میں کھڑا ہمیں باہر جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اسی لمحے اچانک مکھی پھر پروفیسر کی ناک پر آن بیٹھی ہے۔ پروفیسر جھلا کر ہاتھ مارتا ہے تو اس کے ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابیاں دور جا گرتی ہیں۔ غم ناک آنکھوں والی عورت اسے چابیاں اُٹھا کر دیتی ہے۔

(گاڑی میں)

میں۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ وہ مکھی نہیں تھی کوئی اور تھی..........''

پروفیسر۔ ''جہنم میں ڈالو مکھی کو ..... مگر تم نے یہ کیا کیا؟''

میں۔ ''میں نے کیا کیا؟ کیا کیا میں نے؟''

پروفیسر۔ ''عجیب عجیب طریقے کی باتیں کرتے رہے وہاں ..... بھئی میں نے تمہارے لیے ریسرچ کا گاہک ڈھونڈا ہے ..... تم اسے بتاؤ ..... کتنے پیسے Synopsis کے۔ ریسرچ کے .....

پھر اگر تھیسس بھی لکھوانا ہے تو کتنے پیسے۔ انٹرویو کی تیاری کے کتنے پیسے۔ بتاؤ ..... جیسے تم نے مجھے بتایا تھا .....''

میں۔ ''بتاؤں گا..........''

پروفیسر۔ ''ہوں ..... تو پھر مجھے بتاؤ ..... اب مجھے ہی بتاؤ..........''

میں۔ ''ابھی نہیں..........''

پروفیسر۔ ''تو پھر کب..........''

میں۔ ''جب تک مبارک صاحب کی لاش نہیں مل جاتی یا جب تک وہ خود زندہ سلامت واپس نہیں آ جاتے یا جب تک ان کی گمشدگی کو چار سال کا عرصہ پورا نہیں ہو جاتا میں یہ نہیں بتا سکتا کہ میں ..... ایک روتی ہوئی بیوہ کے لیے جو بیوہ نہیں ہے تاریخ پر تحقیق کرنے کے کتنے پیسے لوں گا۔ اب چلو اور کہاں چلنا ہے ..... آج لگتا ہے کہ کچھ فیصلہ ہو جاتا ہے ..... میرا فیصلہ ہو جاتا ہے آج میرا ایک اور یوم حساب ہے ..... چلو کہاں چلنا ہے ..... تحقیق کروانے ..... علم کے بند دروازے کھلوانے کا اور گاہک کون ہے ..... کوئی بیورو کریٹ؟ چلو ......''

پروفیسر گاڑی بھگا دیتا ہے۔

(بیورو کریٹ کے دفتر میں۔ انٹرویو نمبر 2)

یہ بیانیہ مکالماتی انداز مزے کا ہے۔ مزے سے ایک جگہ سے چھلانگ لگا کر دوسری جگہ پہنچ گئے۔ وقت کی بچت ہوتی ہے اور کاغذوں کی بھی۔ ابھی میں نے نیلے رجسٹر کے بقیہ کاغذ جو ابھی خالی ہیں اور میری لکھی بے راہ روی (بدکاری، عیاشی، اخلاق باختگی، فحاشی، عریانی، بدمعاشی) کی زد میں نہیں آئے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جتنے یہ بقیہ کاغذ اب کم ہیں اتنے کم پہلے کبھی نہیں تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ بات ہمیشہ درست رہی ہے.......... (ایک امکان)۔ ایک حیرت انگیز کتاب، جادوئی، سائنس فکشن وغیرہ۔ جس کے بقیہ صفحات کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس میں کچھ علامتی چکر ڈال کر ایک افسانہ بنایا جا سکتا ہے۔

بیورو کریٹ کے کمرے میں بھی بھکیوں کے احساسی منطق کا عمل دخل قائم و دائم ہے (عمل قائم، دخل دائم، عمل دائم، دخل قائم، قائم دخل، دائم عمل، دائم دخل، دائم قائم، دخل عمل، دخل دخل،

Scanned by CamScanner

عمل عمل، دائم دائم، قائم قائم۔ سوال۔ ان سب میں سے کون کونسے امتزاج با معنی ہیں اور ممکن ہیں؟ جواب...... بھی با معنی ہیں اور بھی ممکن ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بیورو کریٹ کے کمرے میں کون کون سے با معنی ہوتے ہیں اور کون کون سے ممکن۔ بیورو کریٹ کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہے۔ اُس کے چہرے پر وہ نور ہے جو با اختیار لوگوں کے چہروں کے مساموں میں سے غیر مرئی شعاعوں کی طرح پھوٹتا ہے اور مکالمے سے پہلے ہی دل میں اُتر جاتا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے یہ سمجھنے کے لیے ہمیں پھر سے کمرے کی وضاحت کرنی پڑے گی۔ کمرہ دوہرے دروازے والا ہے جس میں سے نہ اندر کی آواز باہر جاتی ہے نہ باہر کی آواز اندر آتی ہے صرف سائل اور اہلکار اندر آتے ہیں اور باہر بھی جاتے ہیں۔ وہ تپاک سے ہمارا استقبال کر چکا ہے اور ہمیں اُس کا پی اے کافی وسیع مربع کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ رکھے صوفوں پر بٹھا چکا ہے۔ یہ نشستیں ایسے سائلوں یا اہلکاروں کے لیے بنی ہیں جنہیں وہ ابھی فوری طور پر توجہ نہیں دے سکتا مگر وہ سب بیٹھے یہ دیکھتے رہ سکتے ہیں کہ جب وہ سائل یا نائب یا اہلکار پر توجہ دیتا ہے تو کیسے دیتا ہے۔ ویسے دیوار کے ساتھ بیٹھے لوگ اگر چاہیں تو اور بھی بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں مگر دلچسپ یا شاید حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کمرے میں کسی بھی چیز کو دیکھئے، اس پر غور کرنے کی کوشش کریں گھوم پھر کر آپ کی نظریں پھر اُسی پُرکشش چہرے والے کی طرف آ جائیں گی جو اپنی میز کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اگر اس کمرے میں اُس کے بعد کوئی چیز دیکھنے والی ہے تو وہ اُس کی میز ہے اور ظاہر ہے کہ وہ سب کچھ بھی جو اس کی میز پر ہے۔ پہلی بات جو دل کو ضرب لگاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایسی میز ہے جو اور کہیں نہیں دیکھی جا سکتی۔ ایک ہرے رنگ کا وسیع و عریض موٹا کپڑا اس کے اوپر بچھا ہے اور اس کے اوپر ایک بہت موٹا شیشہ اُسی جسامت کا بھاری پڑا ہے۔ یہ شفاف اور رنگین سطحیں مل ملا کر انسان کو عاجزی اور احترام پر مجبور کرتی ہیں۔ اس دائم دائم، سطح پر جو اشیاء سب سے زیادہ 'قائم قائم' ہیں وہ تین ٹیلی فون ہیں جن میں سے کوئی کسی بھی 'دائم قائم' لمحے بج پڑتا ہے تو سائل یا سائلوں میں سے کچھ 'دخل دائم' ہو جاتے ہیں پھر 'وہ' ایک 'دائم عمل' احساس کے ساتھ سنتا ہے اور 'دائم دخل' لہجے میں بات کرتا ہے تو کچھ اور سائل 'دخل دخل' سے ہو کر 'قائم دخل' ہو جاتے ہیں۔ اس ٹیلی فونی مکالمے کے دوران وہ ایک حیرت ناک ادا سے کمرے میں موجود کسی بھی متنفس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے بلکہ آنکھوں پر آنکھیں جما دیتا ہے اور وہ متنفس

اس کی اداؤں، اس کی مسکراہٹوں، اس کے لہجوں، اس کے لفظوں کو بڑی احتیاط سے اپنے اندر لیتا ہے اور پھر بڑی احتیاط سے اندر لینے کی شہادت بھی دیتا ہے۔ پھر جب وہ ٹیلی فونی رابطہ منقطع کرتا ہے اور اپنی وہ نظریں جو نظریں نہیں ہیں متنفس سے ہٹاتا ہے تو متنفس کے اندر کا سب کچھ اچھل کر اس کے حلق میں آ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے جاتا ہے اور 'وہ' اپنی میز پر اپنے سابقہ انداز میں واپس آ جاتا ہے مگر یہ بھی ایک نیا انداز ہے۔ اس چوکور کائنات کے ہر کونے پر ایک لفظ ہے۔ قائم، دائم، عمل، دخل، جو اپنی جگہیں بدلتے ہیں تو چاروں کونوں اور چاروں اطراف سے لامتناہی خطوط ایک دوسرے کو اور سب کو قطع کرنے کے لیے پھوٹتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت اس کی کائنات اس حالت میں ہے۔ قائم عمل، دائم دخل، قائم دخل، عمل عمل، دائم۔ میں سوچتا ہوں۔ پتہ نہیں۔ جیسے اس وقت یا اس وقت کے کسی کونے میں مکالمہ Aside ہو سکتا ہے اسی طرح کسی جگہ کسی مقام کا منظر بھی Aside ہو سکتا ہے۔ میں بیورو کریٹ کے Aside منظر سے واپس آتا ہوں۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے پھر بات کر رہا ہے۔ کمرے میں اب ایک دو افراد اور ہیں۔ پروفیسر میرے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتا ہے اور مجھے پتہ چلتا ہے وہ ٹیلی فون نہیں انٹرکام پر بات کر رہا ہے۔ پروفیسر کی نظریں مسلسل کمرے کے کونوں پر جمی ہیں۔

پروفیسر۔ (سرگوشی میں) "میرا خیال ہے اب فارغ ہونے ہی والے ہیں۔ انٹرکام پر پی اے سے بات کر رہے ہیں۔"

میں اس کی آواز سنتا ہوں۔

وہ۔ "اور دیکھو اب اندر کسی کو نہیں بھیجنا۔ میرے دوست آئے ہوئے ہیں اور ہم بہت ضروری بات کر رہے ہیں۔" کمرے میں موجود دو اہلکار اپنی فائلوں کے فیتے باندھ کر نکل جانے کے چکر میں ہیں۔ ان میں سے ایک جاتے جاتے ہماری طرف گہری نظروں سے دیکھتا ہے جیسے ہماری شکلوں کو ذہن میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ کمرے میں اب ہم دونوں ہیں اور 'وہ' ہے اور خاموشی ہے جو...... 'وہ' کے حضور میں ہونے کے احساس کو اور بھی شدید کر رہی ہے اور یہ احساس میرے ساتھ بیٹھے تاریخ کے پروفیسر کو بہت پریشان کر رہا ہے کیونکہ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدلتا ہے مگر اس کی نظریں مسلسل 'وہ' پر گڑی ہیں...... ہماری نظروں کے سامنے 'وہ' اپنی میز پر سے کچھ چیزیں ایک فیصلہ کن سست روی سے سمیٹ کر دراز میں رکھتا ہے۔ ایک ٹیلی فون کا ریسیور

Scanned by CamScanner

پروفیسر ہنستا ہے مگر 'میں' کا یہ احمقانہ جملہ 'وہ' کی حسِ مزاح پر شاید گراں گزرتا ہے۔ وہ ایک خشک سی نہایت مختصر سی ہنسی جیسی آواز نکالتا ہے۔ اس محفل میں 'میں' کا یہ پہلا کلام 'وہ' کے لیے کوئی دل شکن ہے۔

'میں' (Aside) یقیناً یہ سوچ رہا ہے کہ کیا یہ 'میں' ایسا شخص ہو سکتا ہے جس کے لیے اس شروع میں کہا تھا، اصل آدمی تو آپ ہیں۔

'وہ'۔ (سرد تحقیر آمیز لہجہ) "میرا خیال ہے چھٹی جماعت میں ماسٹر نے ہمیں مضمون لکھوایا تھا اس میں کوئی ایسا فقرہ تھا۔ جملہ"

پروفیسر۔ (جوش سے) "جی..... جی..... بالکل علم کی برکتیں..... علم وہ خزانہ ہے جسے چور بھی نہیں چرا سکتا۔"

'میں'۔ "حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔"

'وہ'۔ "کیا مطلب؟"

'میں'۔ "علم چرایا جا سکتا ہے مثلاً یہ ہمارے ڈاکٹر زبیری مسلسل گوروں کے علم کے خزانے سے علم چرا رہے ہیں اور چراتے چلے جا رہے ہیں۔"

'وہ'۔ (ذرا ناراض ہو کر) "گوروں کے علم؟ یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ؟ واٹ نان سینس۔ علم تو علم ہے۔ سب کا ہے۔ سب کے لیے ہے۔ گورا کالا کیا؟"

'میں'۔ (ہنس پڑتا ہے) "کالا تو بہرحال ہوتا ہے۔ جناب۔ کالا علم نہیں سنا آپ نے اور اگر کالا ہوتا ہے تو گورا بھی ضرور ہوگا....."

پروفیسر خوفزدہ نظروں سے 'میں' کی طرف دیکھتا ہے۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ وہ 'میں' کو کوئی مبہم سا اشارہ کرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ 'میں' بکواس بند کرے مگر ساتھ ہی 'میں' کے چہرے پر ایک شیطانی سی مسکراہٹ طاری ہوتی ہے اور پروفیسر کا چہرہ اور بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ 'میں' کی اس مسکراہٹ کا مطلب سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ منحوس گھڑی آنے والی ہے مگر پھر بھی وہ صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروفیسر۔ "آ..... ایں..... آ..... وہ..... میرا خیال ہے سر کہ مذاق کے ساتھ ساتھ اصل بات بھی شروع کر دی جائے۔"

'وہ'۔ (منہ بگیڑتے ہوئے کندھے اُچکاتے ہوئے) "اصل بات..... پتہ نہیں پروفیسر صاحب..... بات کچھ آگے بڑھتی نظر آ نہیں..... رہی....."

پروفیسر۔ "نہیں نہیں۔ سر بالکل نہیں..... آپ بڑھائیں۔ بات آگے بڑھائیں بالکل بڑھائیں سر..... فرمائیں..... اسی لیے تو ہم حاضر ہوئے ہیں۔"

'وہ' اٹھتا ہے اور پروفیسر اور 'میں' کے سامنے ایک مضطرب مگر نپے تلے وقار کے ساتھ دائیں بائیں قدم اٹھاتا ہے۔ پھر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اوپر سے دونوں کو نیچے بیٹھے دیکھتا ہے۔

'وہ'۔ "دیکھیں جناب میں تاریخ، سیاسیات اور انتظامی امور کا طالب علم ہوں۔ میری بدقسمتی کہ میں تدریس کے شعبے کو اختیار نہ کر سکا۔ کیوں؟ کچھ مجبوریاں تھیں۔ جن کی وضاحت پیش کرنے کی مجھے اس وقت کوئی ضرورت نہیں۔ اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ ان ڈسپلنز کے حوالے سے کچھ چیزیں۔ کچھ سوال۔ کچھ مسائل میرے ذہن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کچھ انتہائی تحقیق طلب سوال۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں مسٹر..... آ..... کبیر....."

'میں' کی نظریں مسلسل سامنے رکھی میز پر رکھے بسکٹوں پر گڑی ہیں پھر وہ ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا ہے۔

'میں'۔ "جی۔ جی فرمائیں۔ ویسے آپ نے کبھی ان بسکٹوں پر غور کیا ہے۔ خاص طور پر اس برانڈ کے بسکٹ۔ مونگ پھلی والے۔ میں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ بسکٹ براؤن ہو جاتے ہیں مگر اندر مونگ پھلی کافی سفید رہتی ہے۔ حالانکہ فزکس کے قوانین کے مطابق۔ نہیں بلکہ بائیو کیمسٹری کے مطابق سٹارچ اور فیٹی ایسڈز میں کافی فرق ہے اور ان کے کیمیکل ری ایکشن..... یہ انتہائی تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ آپ آرگینک کیمسٹری میں ریسرچ کیوں نہیں کرتے۔ بہت....."

'وہ' کا جبڑا ایک عجیب تحیر کے عالم میں لٹک جاتا ہے۔ پھر وہ بے یقینی سے پروفیسر کی طرف دیکھتا ہے۔ جبکہ پروفیسر کی کیفیت ایسی ہے کہ جیسے نیند میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔

'وہ'۔ (لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں) "میں..... ہم..... میں بالکل نہیں سمجھا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

'میں'۔ "آئی..... ایم..... ساری، ویری ساری..... میں معافی چاہتا ہوں ایک بالکل غیر

Scanned by CamScanner

متعلق بات کو درمیان میں لے آیا۔ دراصل سر میں جو ایک کرائے کا محقق ہوں تو جب میں تحقیقی کیفیت میں آ جاتا ہوں تو ہر چیز پر تحقیق کرنے کو جی چاہتا ہے اور میرے لیے اپنے تجسس کو روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے..... پروفیسر! ڈاکٹر نذیر بشیر آپ کو بتائیں گے کہ ہم کس اور جگہ بیٹھے کسی شخص کی ناک پر کسی مکھی کے بار بار آ بیٹھنے کے موضوع پر تحقیق کرنے کا سوچ رہے تھے۔ کیوں پروفیسر......."

پروفیسر کا انداز ایسا ہے کہ اسے اسی وقت صورتحال کو بچانا ہے ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے مارا جائے گا۔ اپنی قوت مرکوز کر کے 'وہ' سے مخاطب ہوتا ہے۔

پروفیسر۔ "آ..... سر مجھے ذرا..... وضاحت کرنے دیں..... دراصل سر بات یہ ہے کہ ہمارے یہ مسٹر کبیر مہدی..... یوں سمجھ لیں کہ ایک تحقیقی جینئس ہیں۔ انتہائی زیادہ تحقیقی انرجی کے مالک۔ آج کل چونکہ کوئی کام نہیں کر رہے۔ اس لیے انرجی زور مارتی ہے۔ آپ کا کام کریں گے تو بالکل نارمل ہو جائیں گے۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔"

'وہ'۔ "میرا خیال ہے مجھے..... مزید آزمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے پروفیسر صاحب کیا آپ کو علم تھا کہ ان صاحب کا کوئی ذہنی مسئلہ ہے یا نہیں علم تھا اور کیا آپ جانتے بوجھتے انہیں یہاں لے آئے؟؟"

'میں'۔ "دیکھیں جناب..... آپ پروفیسر صاحب کو الزام نہ دیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کس کا کیا ذہنی مسئلہ ہے لیکن انہوں نے جو وضاحت دی ہے وہ اتنی غلط بھی نہیں..... میرا ذہن کبھی کبھی Hyper active ہوتا ہے۔ بہرحال ابھی آپ فرمائیں اگر تو آپ نے۔ آپ کے ذہن نے مجھے پاگل قرار دے دیا ہے تو ہمیں اجازت دیں۔ لیکن اگر ابھی کوئی گنجائش ہے تو آپ فرمائیں۔ آپ فرما رہے تھے کچھ مسائل تاریخ، سیاسیات کے حوالے سے ہیں جن پر آپ ریسرچ کرنا چاہتے ہیں......."

'وہ' کا پُراعتماد چہرہ ایک ایسے تذبذب کا شکار ہوتا ہے جو پہلی دفعہ نظر آتا ہے۔

'میں'۔ (Aside) "ایسے تذبذب کا سامنا اسے کبھی نہیں کرنا پڑا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ابھی ذرا آگے تو دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ 'وہ' آواز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر 'پروفیسر' اور 'میں' پر

ایک بے چینی، اضطرابی نظر ڈالتا میز کی طرف بڑھتا ہے۔ ریسیور اٹھاتا ہے۔

'وہ'۔ "ہیلو..... ہلا..... م..... م..... سر۔ یس سر۔"

پروفیسر 'میں' کے قریب کھسک آتا ہے اس کے چہرے پر بیک وقت کیا جاسف اور غصے کے تاثرات ہیں جن کا مجموعی تاثر مضحکہ خیز ہے۔

پروفیسر۔ ('میں' سے تیز سرگوشی میں) "یہ یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔ کوئی دورے پڑ رہے ہیں تم پر؟"

'وہ'۔ (فون پر آواز) "یس سر..... یہ تو ہونا ہی تھا سر۔ ایکشن پالیسی کے مطابق ہے۔"

پروفیسر۔ "پہلے تم نے ادھر پروفیسر ذکی کی طرف تماشا لگایا۔ اب یہاں اگر ایسا ہی کرنا تھا۔ مجھے ذلیل کرانا تھا تو بار بار فون کر کے اپنے دکھڑے رونے کی کیا ضرورت تھی کہ بھوکوں مر رہا ہوں۔ کوئی ریسرچ کا کام دلوا دو۔"

'میں'۔ "دیکھو..... اسے دیکھو۔ وہ بظاہر ہمارے اوپر ہی نظریں جمائے فون پر بات کر رہا ہے۔ مگر ہمیں ہرگز نہیں دیکھ رہا۔ ویسے پروفیسر یہ بھی ایک ریسرچ کا موضوع ہے کہ یہ اعلیٰ لوگ فون کرنے کے دوران اپنے سامنے بیٹھے کسی نہ کسی شخص پر یوں آنکھیں کیوں جما دیتے ہیں۔ سنو..... سنو..... وہ کیا کہہ رہا ہے۔"

'وہ'۔ "یس سر مگر یہ تو سنٹرل لیول پر ہی ڈسکس ہو گا۔ اگر ہوتا ہے تو مگر اس سے زبردست تبدیلی آئے گی۔ جی میں نوٹ کرتا ہوں سر۔ جی (ایک پیڈ پر لکھتا جاتا ہے) جی ہیلو میں۔ ایجوکیشن، زراعت، انڈسٹری، لوکل گورنمنٹ، انرجی، سائنس، کمیونیکیشن..... جی..... جی..... اچھا الگ ڈرافٹ بنیں گے۔ میں سمجھ گیا۔ ان سب آفیسرز کو سر..... جی..... میں DATA اکٹھا کروا تا ہوں سر۔ رائٹ او کے..... آ..... وہ میری بھی ایک Request تھی سر..... مجھے تو ایجوکیشن میں بھجوا دیں۔"

پروفیسر۔ (دہل جاتا ہے) "وہ..... وہ..... تو ایجوکیشن میں آ رہا ہے..... تم نے مروا دیا مجھے۔"

'وہ'۔ "جی سر PHD کے لیے کام شروع ہے سر۔ بس وقت تو سر نکالنا پڑتا ہے....

Scanned by CamScanner

جی..... نہیں..... وہ پوسٹ ڈاک کے لیے باہر..... جب یہ ہو گیا۔"

پروفیسر۔ "اب..... وہ..... وہ..... یہی بات کر رہے ہیں..... تم..... تم..... انسانیت کے جامے میں کیوں نہیں آسکتے۔"

'میں'۔ "آ گیا بس سمجھ میں آ گیا۔ لو میں نے پہننا شروع کر دیا جامہ..... آ گیا لیکن 'وہ' آ رہا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اسے ڈھب پر لے آؤں گا۔ اور میری اپنی روٹی کا سوال ہے بابا۔"

'وہ' دونوں کی طرف واپس آتا ہے اور دونوں کو ایسی سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ کون ہیں اور وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں، پھر گھڑی دیکھتا ہے۔

'وہ'۔ "بہت شکریہ پروفیسر صاحب..... آپ کا بھی وقت برباد ہوا اور میرا بھی بہر حال........"

پروفیسر۔ (بوکھلا کر) "نن..... نہیں سر..... بالکل نہیں..... ہمارا برباد۔ نہیں وقت بہت ہے ہمارے پاس ہم برباد....."

'وہ'۔ (درشت لہجے میں) "مگر میرے پاس بالکل نہیں وقت (انگریزی زبان میں) میں بہت مصروف آدمی ہوں۔"

'میں' کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور پھر وہ ایک فیصلہ کن انداز میں 'وہ' کی طرف دیکھتا ہے اور رواں انگریزی میں اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

'میں'۔ "یقیناً جناب آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ مگر ہم بھی کوئی فالتو یا فارغ لوگ نہیں ہیں۔ آپ دیکھ لیں اگر آپ پسند کریں تو جس مقصد کے لیے ہم یہاں آئے ہیں جو تحقیقی مسائل آپ کو درپیش ہیں ہم ان پر بات کریں بصورت دیگر....."

'وہ' کو ایک ذہنی جھٹکا لگتا ہے۔ گہری حقیر نظروں سے 'میں' کو دیکھتا ہے۔ پروفیسر کے چہرے پر پہلی دفعہ اطمینان کی لہر دوڑتی ہے، گفتگو انگریزی میں جاری رہتی ہے۔

'وہ'۔ "مقصد بہت واضح ہے جناب..... ویسے ہی سیدھے اصل نقطے پر آئیں۔ مجھے ایک ریسرچ اسسٹنٹ کی ضرورت ہے جو میرے ذہنی کام کو Document کر سکے۔ یعنی حوالے تلاش کرنا، لائبریریاں کھنگالنا، سکالرز سے ملنا، میرا مطلب ہے اگر ضروری ہو تو..... اور پھر چونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں..... اس لیے میں ڈکٹیٹ کرواؤں

گا۔ پھر مسودے کی ٹائپنگ وغیرہ وغیرہ..............."

'میں'۔ "آپ کا مطلب ہے کہ ریسرچ کا تمام گندا کام (Dirty work)"۔ 'وہ' پہلی دفعہ خوش دلی سے ہنستا ہے اور پروفیسر کے چہرے پر ایسے تاثرات ہیں کہ وہ ہیں بیٹھا بیٹھا قربان ہو جائے گا۔

'وہ'۔ "شاید..... شاید..... مگر بہت ضروری..... بہت اہم کام..... یقین کریں اگر میری یہ ڈگری کی لعنت نہ ہوتی تو میں خود یہ سب کرتا۔ آئی لو اٹ........"

'میں'۔ "مگر گندے کام کو شروع کرنے سے پہلے میں ستھرے کام پر کچھ ضروری بحث آپ سے ضرور کروں گا تاکہ مجھے پتہ چلے کہ گندا کتنا گندا ہے اور ستھرا کتنا ستھرا ہے۔"

'وہ'۔ "آپ کا ڈکشن دلچسپ ہے بلکہ بعض اوقات تو کافی پُرلطف ہو جاتا ہے۔"

پروفیسر۔ "ان کی باتیں ہی تو سر ہمیں لے بیٹھی ہیں۔"

'وہ'۔ "اور کہیں مجھے بھی نہ لے بیٹھیں۔"

(سب ہنستے ہیں) 'میں'۔ "نہیں سر میری باتیں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں سوائے میرے اپنے..... خیر تو آپ نے کہا تھا کہ تاریخ، سیاسیات اور علم انتظامی امور کے حوالے سے کچھ مسائل آپ کے ذہن میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

'وہ'۔ "Exactly"

'وہ' یک دم بے چین سا ہو کر اٹھتا ہے اور اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دو قدم آگے دو قدم پیچھے ٹہلتا ہے۔ پھر رک کر مخاطب ہوتا ہے۔ 'وہ' کے ٹہلنے کے دوران پروفیسر 'میں' کو نظروں ہی نظروں میں تھپکی دے چکا ہے۔

'وہ'۔ "میں سمجھتا ہوں جناب کہ یہ ایک انتہائی اہم موضوع ہے اور اسے..... دلچسپ بات ہے کہ آج تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ شاید اس طرف کسی کی نظر نہیں گئی مگر....."

پروفیسر۔ "مگر آپ کی نظر تو گئی اور آپ کی تو گئی..... سر....."

'وہ' پروفیسر کی اس مداخلت پر ناپسندیدگی سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔

'میں'۔ (گہری سنجیدگی) "پلیز پروفیسر۔ سنجیدہ بات ہو رہی ہے..... ڈسٹرب نہ کریں۔"

('وہ' تعریفی نظروں سے 'میں' کی طرف دیکھتا ہے)

Scanned by CamScanner

'وہ': ''تو میں سمجھتا ہوں کہ اصل بات تعلق کی ہے...... اس تعلق کی......''

'میں': ''یعنی جو تعلق تاریخ، سیاست اور انتظامی امور میں ہے...... اگر میں آپ کی بات غلط نہیں سمجھ رہا تو......''

'وہ' ۔ (جلدی سے) ''نہیں...... بالکل نہیں...... آپ میری بات غلط نہیں سمجھ رہے...... بالکل درست سمجھ رہے ہیں۔ اب جو بات میں کرتا ہوں...... یعنی جو تھیسس میں سامنے لا رہا ہوں...... وہ یہ ہے کہ یعنی اس تعلق کی نوعیت کیا ہے......''

'میں': ''دلچسپ بہت دلچسپ...... نوعیت یعنی آپ کا مطلب ہے کہ تاریخی عوامل سیاسی قوتیں اور انتظامی ڈھانچے کس طرح عمل اور ردِ عمل کے ذریعے عظیم تہذیبی فیصلوں کی بنیاد بنتے ہیں۔''

'وہ': ''Precisely, Exactly...... تہذیبی فیصلے اور بلکہ ثقافتی رنگ ڈھنگ بھی کہیے۔ کیا ہے آخر یہ...... یہ سب کچھ...... انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے...... انتہائی سنجیدہ فکر انگیز...... آخر کب تک ہم اندھیرے میں بیٹھے رہیں گے۔ کب یہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے۔''

'میں': ''اور انتہائی دلچسپ بھی...... اب یہ سر آپ ایک انتہائی تخلیقی سطح سامنے لا رہے ہیں۔ تحقیق میں تخلیقی پہلو واہ۔ اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو آپ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کلچر، تاریخ، سیاست اور انتظامی امور کا Epi- phenomena ہے۔ یہ آپ...... آپ بہت نئی بات کر رہے ہیں۔ (Aside) یہ کلچر کے بارے میں میرا 28 اپریل کا نظریہ ('وہ' سے)...... بہت نئی بات کی ہے جناب آپ نے...... یہ......''

'وہ' ۔ (عالمانہ عاجزی سے) ''آ...... میں نہیں جانتا یہ نئی بات ہے یا نہیں...... مگر (ہنستا ہے) وہ کیا کہتے ہیں۔ کہ سورج کے نیچے۔ کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ مگر میں آپ کو راز کی بات بتاتا ہوں...... (یک دم ہاتھ ہوا میں اُچکاتا ہے) کافی...... ابھی میں تو کافی لوں گا۔ بات آگے بڑھ رہی ہے۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔ کافی ضروری ہو گئی ہے......''

(وہ بات ادھوری چھوڑ کر میز کی طرف جاتا ہے اور انٹرکام پر کافی اور سینڈوچز کا کہتا ہے۔)

'میں' ۔ (پروفیسر سے) ''اس سے کہو کسی طرح سینڈوچ زیادہ منگوا لے۔ بھوک سے پیٹ

پھٹا جا رہا ہے۔''

پروفیسر ۔ (بوکھلا کر) ''شی...... آہستہ بولو...... بے...... بے وقوف......؟ آیئے سر۔'' 'وہ' پھر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک فیاضانہ مسکراہٹ انہیں دیتا ہے۔

'میں': ''جی...... تو آپ بتا رہے تھے کوئی راز کی بات......''

'وہ' ۔ (ہنس کر) ''واقعی...... ویسے یہاں تو ہم کرتے ہی راز کی باتیں ہیں (سب ہنستے ہیں)...... راز کیا ہوتا ہے...... میں عرض کرتا ہوں...... یہ جو میری نوکری ہے۔ ڈل اور بے روح...... مگر میں اس ڈل اور بے روح کام پر بھی ساتھ ساتھ غور کرتا رہتا ہوں یعنی تحقیقی اور تخلیقی سطح پر۔ مثلاً ابھی جو ابھی کچھ دیر پہلے فون پر بات کر رہا تھا تو جانتے ہیں دوسری طرف کون تھا۔''

(خاموشی کا ایک پُر اسرار وقفہ جس میں پروفیسر واضح طور پر کانپ جاتا ہے۔ پھر 'وہ' ہنستا ہے)

''چھوڑیں...... اور جو فیصلے اور جو حکم احکام مجھے بتائے جا رہے تھے۔ کیا تھا...... چھوڑیں...... مگر بہت بڑے فیصلے ہونے والے ہیں...... کیا...... چھوڑیں...... مجھے ان سے ایک اور سطح پر دلچسپی ہے۔ میں یہ دیکھتا ہوں۔ میں انہیں اپنے تھیسس کی عملی شکل کے طور پر دیکھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ...... آ...... وہ...... آ......''

'میں': ''آپ دیکھتے ہوں گے کہ فیصلے کرنے والوں کے اس پیشے کی 'حرکیات اور مظہریات' کیا ہیں اس کے اسٹرکچرز کا ہر جز کس طرح گہری تاریخی ساختوں اور سیاسی مظاہر سے جڑا ہوا ہے اور ان کے اثرات مجموعی ثقافت پر کیا مرتب ہوتے ہیں۔'' (Aside)...... اور اسے ہم ایک شاندار بک بک کہتے ہیں۔ بلکہ اسے ستراطی بک بک کہنا چاہیے جو کچھ اُس کے اندر موجود ہے اُسے اس طرح اُس کے اندر سے نکالنا کہ اُسے بھی یقین ہو جائے کہ واقعی اُس کے اندر تھا۔ حمل کی غیر موجودگی میں حمل کا دایہ گیری نظریہ...... ('وہ' سے) آپ یہی۔ یہی سوچتے ہیں ناں۔''

'وہ': ''بالکل سو فیصد۔ مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند آئی کبیر صاحب۔ کہ آپ نہ صرف بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ اُس کی وضاحت کے لیے کسی حد تک موزوں الفاظ بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک اچھے ریسرچ اسسٹنٹ میں یہی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ مجھے امید ہے ہم مل کر بہت اچھا کام کریں گے۔''

'میں': ''جی سر۔ مجھے بھی بہت امید ہے مگر اس کے لیے سر تھیوری کو بہت کھنگالنا پڑے گا۔''

Scanned by CamScanner

'وہ'۔ "رائٹ Definitely........"

'میں'۔ "بہت وسیع ایریا کور کرنا پڑے گا۔ اس تعلق اور سب مسائل کے بارے میں جو نظریات دیئے گئے ہیں۔ جس طرح ہمیں سمجھا گیا ہے۔ ہمیں بار بار اور کئی طرح سے سمجھایا گیا ہے سکالرز نے فلسفیوں نے، مورخوں نے، ادیبوں نے، ماہرین نے، ان سب نظریات کو، ماڈلز کو، سانچوں کو، جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ اس سب کچھ کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک نچوڑ نکالنا ہوگا اور پھر اپنا تھیسس لکھنا ہوگا۔ میرا مطلب آپ کا تھیسس لکھنا ہوگا۔"

'وہ'۔ "Excellent--- جو ماڈل نکلے گا اس کو اپلائی کرنا ہوگا۔ بالکل یہی سمجھو ڈالو جی۔ میرے ذہن میں ہے ہمارے ذہن بہت ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔"

کافی اور سینڈوچز آ جاتے ہیں۔ گفتگو تھوڑی دیر کے لیے موقوف ہوتی ہے۔ 'میں' سینڈوچ پر ہاتھ صاف کرتا ہے اور کافی کا گھونٹ لیتا ہے۔

'وہ' (پُر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے اور ساتھ ساتھ کافی پیتے ہوئے۔) "یہی بات.... ہم بالکل ایک ہی لائنوں پر سوچ رہے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ پروفیسر گائیڈ اور ریسرچ اسسٹنٹ کا ذہن ساتھ ساتھ چلے..... اور جب تھیسس لکھا جائے گا مکمل ہو جائے گا تو..... پھر....."

'میں' (اچانک غیر متوقع اور معمول سے بلند آواز میں)۔ "تو پھر یہ دوبارہ لکھا جائے گا۔ (Aside) یہ جملہ سکرپٹ میں نہیں تھا۔ یہ کہاں سے آ گیا۔ مگر آ گیا ہے اب کیا ہو سکتا ہے۔ کیا تھا۔ دوبارہ لکھو۔"

'وہ' اور پروفیسر کے کپ ہوا میں وہیں کے وہیں معلق ہیں اور وہ بے یقینی سے 'میں' کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

'وہ'۔ "کیا کہا آپ نے؟ دوبارہ لکھا جائے گا۔ کیا مطلب۔ میں نے شاید ٹھیک سے سنا نہیں۔"

'میں'۔ (Aside) "یہ ایک ارشمیدی لمحہ ہے۔ پالیا۔ کہ دوبارہ لکھو' یہ اب واپس جانے والا نہیں۔ ('وہ' سے) نہیں آپ نے بالکل ٹھیک سنا نچوڑ نکالنے کے بعد اپلائی کرنے کے بعد تھیسس لکھا جائے گا اور پھر تھیسس دوبارہ لکھا جائے گا۔ (بلند آواز میں) دوبارہ لکھو" (قہقہہ لگاتا ہے)

پروفیسر کی حالت ایسی ہے کہ جیسے کسی شخص کو شدید ضرب لگائی گئی ہو اور وہ حواس کھوتے کھوتے مدد کے لیے پکارنے لگا ہو۔

پروفیسر۔ "..... کافی..... کافی..... کافی..... بالکل کافی........"

'وہ' کو اس کے مرتبے کے خطرات نے، اس کی آگاہی نے بتا دیا ہے کہ معاملہ پھر گڑبڑ ہے اور 'وہ' بے یقینی ڈانواں ڈول کرنے والے لمحوں سے نپٹنے کے لیے اپنی تربیت کو کام میں لاتا ہے اور اس کا چہرہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے.........

'وہ'۔ "شاپ اٹ۔ یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ کافی..... کافی..... کیسی کافی.........."

پروفیسر۔ "کافی پینے پر پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ اب بھی۔ کافی اس کا ذہن آؤٹ کر دیتی ہے۔"

'وہ'۔ "اب اس کا ذہن ہی نہیں جسم بھی آؤٹ ہوگا..... آؤٹ....."

'میں'۔ "کیوں آپ کو..... دوبارہ لکھنے پر اعتراض ہے۔ کیا خیال ہے ایسے لکھنے کو کوئی مٹا نہیں سکتا..... دوبارہ لکھو۔"

'وہ'۔ "بکومت۔"

'میں'۔ "او..... دراصل سر آپ سمجھ نہیں رہے۔ کہ دوبارہ کیسے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً..... مثلاً ('میں' چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہے) آ..... وہ میز آپ کی..... اُسے میز لکھا جاتا ہے۔ مگر جب اسے دوبارہ لکھا جاتا ہے۔ تو لکھا جاتا ہے۔ یہ چیز کالے علم کا ایک تعویز ہے۔ جس کے ایک کونے پر قائم ہے۔ دوسرے پر دائم ہے۔ تیسرے پر عمل ہے چوتھے پر دخل ہے اور قائم...... دائم..... عمل..... دخل..... کیا ہیں ان کے الفاظ معنی ڈکشنریوں میں نہیں ہیں اور جو ہمیں..... انہیں دوبارہ لکھنا پڑے گا۔"

پروفیسر تھر تھر کانپ رہا ہے اور اب 'وہ' کی بھی تقریباً یہی حالت ہے۔ 'وہ' انٹرکام پر کہیں بات کرتا ہے۔

'وہ'۔ "سیکورٹی والوں کو بھیجو فوراً۔ ایمرجنسی ہے۔"

'میں'۔ "ہاں..... یہ دوبارہ لکھو کی ایمرجنسی ہے۔ تاریخ کو دوبارہ لکھو ایک روتی ہوئی بیوہ کے قلم سے جو بیوہ بھی نہیں ہے۔ (Aside) یہ وقتی خود اختیار کردہ دیوانگی کے دورے دراصل میری

ایک ٹیکنیک ہے۔ جس کے ذریعے میں فن کے اعلیٰ معیارات کے گرے بغیر (اور مرے بغیر) پراپیگنڈا قسم کی باتیں کہہ جاتا ہوں۔ سیدھی سیدھی بات کہنا ویسے بھی پاگل پن ہے۔.........''

سیکورٹی کے دو تین بندے دھڑ دھڑ آتے اندر آ جاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ پروفیسر پر پل پڑتے ہیں اور بے چارے کو دھکے دیتے کمرے سے باہر نکال دیتے ہیں۔ ہم برآمدوں میں کھلی ہوا میں پہنچتے ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے پروفیسر سے زیادتی کی ہے اور پھر ندامت کا یہ احساس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں اُس سے معذرت کرتا ہوں۔ پھر معافی مانگتا ہوں۔ مگر پھر مجھے ایک مختلف احساس ہوتا ہے۔ میرا ایسا اظہارِ افسوس اپنے رویے پر نہ صرف لاحاصل ہے بلکہ لایعنی بھی ہے۔ کیونکہ پروفیسر بھی میرے بارے میں وہی فیصلہ دے چکا ہے جو اندر اس شخص نے دیا تھا جو میرے پیچھے پیچھے یا میرے آگے آگے تاریخ، سیاست اور انتظامی امور کا تعلق ڈھونڈتے چلا تھا۔ پروفیسر بھی اب میری باتوں کو ویسے ہی سُن رہا تھا جیسے کوئی بھی ذی ہوش شخص دیوانے کی لاف زنی کو سُنتا ہے اور درگزر کی خاموشی کو برقرار رکھنے کے ساتھ معاملہ فہمی کی کوئی ایک آدھ بات بھی کر دیتا ہے۔ پروفیسر بھی ایسی ہی بات کرتا ہے اور اس کی بات میں ہمدردی اور افسوس بھی شامل ہے۔

''مجھے بہت افسوس ہوا ہے تمہاری حالت پر۔ آخر یہ ہوا کیسے؟ ایک اتنا باصلاحیت آدمی برباد ہو گیا۔ آخر کیسے ہوا؟''

''اتنا باصلاحیت آدمی کیسے برباد ہو گیا۔'' میں پروفیسر کو ایسی کوئی داستان سُنانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ جواباً میں وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں پروفیسر کہ تمہاری وجہ سے (یہاں میں ہنستا ہوں) وجاہت۔ وجاہت کے بھی کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔ انداز ہوتے ہیں۔ بہر حال تمہاری وجہ سے مجھے میرا اصل کام مل گیا۔''

''کیا۔ کیسا اصل کام؟''

''دوبارہ لکھو۔'' میں کہتا ہوں اور پروفیسر افسوس سے سر ہلاتا ہے اور منہ سے چُچ چُچ کی آوازیں نکالتا ہے اور اسی دوران ہم فیصلوں کا کاروبار کرنے والوں کی عمارت کے طویل برآمدوں سے باہر آ جاتے ہیں۔

(واپس ماضی بذریعہ فعل ماضی) مجھے اب ٹھیک طرح یاد نہیں کہ ابھی ہم اُس عمارت سے باہر آ چکے تھے یا اندر ہی تھے کہ میں نے ان شکلوں کو پھر دیکھا اور مجھے لگا کہ کافی عرصہ بعد میں انہیں دیکھ رہا ہوں مگر پھر بھی وہ ویسی کی ویسی ہی نظر آ رہی تھیں۔ ہاں...... اب مجھے یاد آیا ہم بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے اور ادھر ہی کہیں پارکنگ تھی۔ پروفیسر کی گاڑی بھی اُدھر ہی کہیں کھڑی تھی۔ شکلیں وہیں پارکنگ میں گھوم رہی تھیں۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر پروفیسر نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔ یقیناً مجھے مزید ساتھ لیے پھرنے کا خیال اُسے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے جلد ہی اُسے اُس کی پریشانی سے نجات دلا دی۔

''تو پھر پروفیسر۔ میرا خیال ہے تیسرے انٹرویو کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اگرچہ میں تمہارے اس نوجوان نفسیات کے ایم اے کو جو جل مالک بھی ہے اور ریسرچ کا جذبہ برابر دل میں رکھتا ہے وہی مشورہ دے سکتا تھا جو میں نے افسر کو دیا۔ اگر کبھی ملے تو اُسے پیغام دے دینا۔''

''کی۔ کک۔ کیا پیغام۔''

''دوبارہ لکھو۔'' میں کہتا ہوں۔ پروفیسر کے لیے مزید رُکنا ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ مگر پھر بھی وہ کہتا ہے۔ ''میں تمہیں کہیں ڈراپ کر دوں۔'' میں اُدھر دیکھتا ہوں تو شکلیں بھی ایک گاڑی میں سوار ہو رہی ہیں۔

''نہیں۔ میرے ساتھ تمہارا مزید دیکھے جانا تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ بہت شکریہ۔ تم مجھے اور میرے کیس کو یہیں ڈراپ کر دو۔''

پروفیسر نے ایسا ہی کیا اور سرعت سے اپنی گاڑی بھگا کر لے گیا۔ میں اپنے قدموں پر چلتا عمارت سے باہر آ گیا۔ کچھ پرواہ کیے بغیر۔ کچھ دیکھے بغیر کہ شکلیں میرے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہیں۔ بڑے شہر کے فٹ پاتھ پر چند ہی قدم آگے چلنے کے بعد میں انہیں بھول چکا تھا۔ میں ایک کانکالی 'دوبارہ' کی گرفت میں تھا اور بڑے شہر کو بھی دوبارہ دیکھ رہا تھا۔

(گھونسلا) رات گیارہ بجے۔ آج کا دن جو 'دوبارہ' کا دن ہے۔ اس دن میں اب اور کیا تھا۔ جہاں تک 'دوبارہ کے مکاشفے' کا تعلق ہے تو نیلا رجسٹر اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف اس لیے کہ اس 'کتابِ زندگی' کے صفحات اب واقعی ختم ہونے والے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ 'کالکھائی' سے 'دوبارہ لکھائی' تک پہنچنے کے لیے بہت طویل سفر طے کرنا ہوگا۔ اس لیے میں اس کلام نرم و نازک کو

Scanned by CamScanner

نہیں چھوڑتا ہوں۔ یعنی اُن آندھیوں جیسی کیفیتوں کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ جب میں عصری ڈائجسٹ پہنچا اور ایڈیٹر عزیز از جان کو بتایا کہ میں 'کام' چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اُس نے پوچھا "کہیں اور لکھ رہے ہو؟" خوامخواہ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ "نہیں دوبارہ لکھوں گا"۔ اُس کے چہرے پر رنگ سا بکھر گیا اور کہنے لگا "میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ تو تم باز نہیں آؤ گے۔" میں نے اپنی چند ضروری چیزیں جو وہاں ایک الماری میں رکھی تھیں اُٹھا لیں اور اُس سے کہا کہ وہ میرا حساب کر دے۔ اُس نے اپنے کلرک کو بلایا اور کچھ کھسر پھسر کی۔ کلرک نے ایک سو چالیس روپے کا حساب بنایا جس میں نے غنیمت جانا۔ کلرک نے مجھے پیسے دیے اور "دماغ لڑاؤ" کی ایک قسط جو ابھی استعمال نہیں ہوئی تھی مجھے واپس کی۔ میں نے ایڈیٹر سے کہا "اسے میری طرف سے ادارے کے لیے حقیر سا تحفہ سمجھیں۔ کیونکہ مجھے 'دماغ لڑاؤ' سے زیادہ دوبارہ دماغ لڑاؤ" سے دلچسپی ہے۔" ایک بار پھر ویسا ہی رنگ ایڈیٹر کے چہرے پر بکھر گیا اور اُس نے پھر کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" حالانکہ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا سمجھ گیا ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ جب میں ایک سو چالیس روپوں کو جیب میں ڈالے اور کہیں فوری کھانا کھانے کا ارادہ دل میں لیے اُس دفتر سے نکل رہا تھا جس کا میں نے گذشتہ کئی برس تک سامنا کیا تھا۔ تو مجھے اُس کی آواز پھر سنائی دی۔ میں نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ ٹیلی فون کا ریسیور اُس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "ٹھیک ہے۔ کیپر مہدی تمہارا حساب ختم ہو گیا۔"

O

زہرہ کے دروازے پر پہنچا تو وہ معصوم صورت چوکیدار کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جس نے پچھلی دفعہ میری گویا شناخت قبول کر کے مجھے داخلے کی اجازت دی تھی۔ اُس کی جگہ ایک منحوس شکل کھڑی تھی اور مجھے فوری حیرت اُسے پہچان کر ہوئی۔ وہ ان ابتدائی شکلوں میں سے ایک تھی جب شکلیں مجھے پہلی دفعہ نظر آنی شروع ہوئی تھیں۔ پھر بعد میں آج کل والی نظر آنے لگی تھیں۔ پہچان کی حیرت اُس کی آنکھوں میں بھی آئی مگر میری طرح اُس نے بھی اُس پر قابو پا لیا۔ اُس نے میرا پیغام اندر بھجوایا جو میرے ماں باپ کے دیے نام سے تھا اور پیغام واپس آنے پر مجھے اندر بھجوا دیا۔ زہرہ مجھے ڈرائنگ روم میں ملی اور اُس سے ملنا اس قدر تیز و تند تھا جیسے آندھی میں ہم دونوں کے

قدم اکھڑنے لگے ہوں۔ اُس نے بدقت مجھے الگ کیا اور پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے آج۔"

میں نے اُسے آج کی روداد سنا دی اور سننے پر اُس کی طویل اور گہری خاموشی نے مجھے بتا دیا کہ اس روداد پر کسی کا بھی کچھ کہنا کس قدر مشکل ہے۔ اُس نے صرف اتنا کہا۔

"مجھے سمجھ میں تو آ رہا ہے۔ مگر نظر نہیں آ رہا۔"

پھر ہم زیادہ صاف نظر آنے والی چیزوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اُسے منحوس شکلوں۔ دوسری شکلوں اور دوسرے خدشوں کے بارے میں بتایا۔ اُس کا ردعمل وہی پُرتشویش غیظ و غضب کا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اسے سراغ سے پتہ چلا ہے کہ یہ عمارت یا تو بک چکی ہے یا بکنے والی ہے۔ وہ وکیل کو بھی مل چکی ہے جو تسلیم کرتا ہے کہ یاور عطائی نے یاور ہاؤس زہرہ کے نام لکھا ہے۔ مگر وہ کوئی قانونی پیچیدگیوں کی بھی بات کرتا ہے۔ میں اس طرح کی بک بک میں بالکل کورا ہوں صرف زہرہ کی بات سنتا رہا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بھی ہمارے اوپر جو پیچیدگی پر حاوی ہونے والی سادہ خواہشیں حاوی ہونے لگیں مگر پھر ان کی بھی اپنی پیچیدگیاں راہ میں حائل ہو گئیں۔ ہم ہنستے رہے اور زہرہ نے کہا۔

"ہمیں اس کا حساب دینا ہوگا کبھی۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کل شام کو اپنے پیارے کیفے غلام باغ میں۔ یافت میں ناصر، تم اور میں ہوں گے اور شام رات میں ضرور بدلے گی۔" پھر میں کچھ سوچ کر ہنس پڑتا ہوں۔

"کیا ہوا۔"

"مجھے خیال آیا ہے کہ کتنے ہی یوم حساب گذر چکے ہیں اور وہ سب گہری چھپانے والی راتوں میں گذرے تھے۔ آج کا میرا یوم حساب واحد ہے جو دن دیہاڑے گذرا اور ایسا دن جسے روز روشن کہتے ہیں۔ اگرچہ میں روز روشن کی مخلوق نہیں ہوں۔"

"تم پتہ نہیں کیسی مخلوق ہو" وہ عجیب سے لہجے میں کہتی ہے۔

"تم پتہ نہیں کیسی مخلوق ہو" میرا جواب سُن کر وہ ہنستی ہے ـــ ایک گہرے اطمینان کی ہنسی مگر پھر بھی پوچھتی ہے۔

"کیا مطلب؟"

Scanned by CamScanner

میں اُس کے قریب آتا ہوں اور کہتا ہوں۔
''دوبارہ۔''
کچھ دیر بعد وہ کہتی ہے۔
''اب تم جاؤ گے۔''
میں جانے کے لیے اُٹھتا ہوں۔ دروازے کی طرف بڑھتا ہوں تو وہ اچانک کہتی ہے۔
''میں سوچ رہی ہوں اگر ہاف مین کو پاپا کے اُن جڑی بوٹی جیسی شعبدوں..... جو بھی وہ ہیں..... کی ضرورت ہے اُس کے کسی کام آ سکتے ہیں۔ تو اُسے دے دوں۔''
میں سوچتا ہوں وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے یا اپنا فیصلہ سنا رہی ہے۔ دونوں ہی صورتیں میرے لیے محترم ہیں۔ مگر میں زہرہ سے ایک اور سوال کرتا ہوں۔
''ناصر کو کیا دو گی۔'' وہ ایک گہرا سانس لیتی ہے اور کہتی ہے۔
''پتہ نہیں۔''
ہم ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں آتے ہیں۔ وہ کہتی ہے۔
''تم نے وہ..... کتاب پڑھ لی'' جستی ہے۔ ''جو ایک کتاب نہیں تھی..... جو تم نے پاپا کے کمرے میں سے اس وحشت ناک تلاش کے بعد حاصل کی تھی۔''
''نہیں۔ ابھی نہیں 'گنجینۂ نشاط' اس دوسری کتاب کو جو ایک۔ کتاب۔ نہیں۔ ہے۔ میں کل رات کسی وقت پڑھنا شروع کروں گا۔ جب میری اپنی کتاب۔ 'جو..... ایک..... کتاب نہیں..... ہے۔'' ختم ہو جائے گی۔ ایسا ہی ہوگا۔ اُس رجسٹر میں بس اتنے ہی صفحات باقی ہیں جس میں بمشکل کل کے یوم حساب اور شاید آخری یوم حساب کی روداد بھری جائے گی اور پھر 'کلا لکھائی' کا وہ شاہکار اپنے انجام کو پہنچے گا اور کائنات میں سناٹا چھا جائے گا اور پھر.....................
''اور پھر.........؟''
''دوبارہ لکھائی۔''
وہ میرے قریب ہے آمنے سامنے سانسوں کی سانجھ کے رشتے میں اور پوچھتی ہے۔
''تم مجھے وہ دکھاؤ گے نہیں وہ میلا رجسٹر۔''
''پتہ نہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے گندے کپڑے دکھانا پسند نہیں کرتا۔''

''ہاں لیکن کچھ کپڑے اگر کسی کے ساتھ مل کر گندے کیے ہوں تو اُسے باقی سارے گندے کپڑے بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔''
''ہاں اگر کسی کو دکھائے جا سکتے ہیں تو ایسے ہی کسی کو دکھائے جا سکتے ہیں۔''
میں سمندر شام روڈ پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ خلافِ معمول بوڑھا امداد حسین ابھی تک دوکان کھولے بیٹھا تھا۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا اور انتظار کی وجہ دی تھی۔ نہیں..... میں نے کہا یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ پھر اس نے نئی بات بھی بتائی۔ کچھ لوگ اُس کی عدم موجودگی میں شام سے ذرا پہلے آئے اور ملازم لڑکے کو یہ بتا کر کہ وہ بجلی والے ہیں اور علاقے کے کنکشن چیک کر رہے ہیں دوکان میں سیڑھیوں میں اور پھر بعد میں اوپر چھت پر پھرتے رہے۔ کمرے کے اندر کا درشن بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر تالا پڑا تھا۔ چابیاں مانگتے رہے۔ جب جا رہے تھے (تین تھے) تو امداد حسین آ گیا اور بقول امداد حسین ''یقین کریں کبیر صاحب ان کی شکلیں بجلی والوں جیسی ہرگز نہیں تھیں۔''
''کیوں بجلی والوں کی شکلیں کچھ خاص طرح کی ہوتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''خدا کے لیے کبیر صاحب یہ کون لوگ ہیں۔ میں نے پہلے بھی کئی بار آپ سے کہا ہے کہ کچھ کریں۔''
''ہاں میں کچھ کروں گا۔ اور کل سے ہی۔''
''کیا صاحب؟''
''میں روٹی کمانے کے لیے بس خالص جسمانی کام کروں گا۔ یہاں ذہن کے زور پر پیسہ کمانا ایک بہت بڑی ٹھگی میں شامل ہونا ہے۔ میں کل سے ٹھگوں کے اس گروہ سے نکل رہا ہوں۔ جو اپنے اپنے ذہنی رومالوں سے معصوم جسموں کو پھندے لگاتے ہیں۔ میں کل سے دیکھتا ہوں کیا کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ پہاڑی دارے سے شروع کروں گا۔ اب امداد صاحب یہ چھائی تو ظاہر ہے اچھا خاصا ذہنی کام ہے یہ اب نہیں ہوگا مجھ سے، اور یہ نہیں ہوگا تو ظاہر ہے یہ جگہ مجھ سے پاک ہو جائے گی۔ چند دنوں تک آپ مجھے یہاں نہیں پائیں گے۔ سب خیر خیریت ہو جائے گی۔ شکلیں بھی نظر نہیں آئیں گی۔''
بے چارے امداد حسین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اُس کی مشفقانہ حیرت میں سرکاری افسر

Scanned by CamScanner

اور پروفیسر کی خبر تھیں شامل نہیں تھیں مگر اس کی آنکھوں کا فیصلہ بھی وہی تھا۔" یہ بدنصیب شخص پکڑ کی دوسری طرف چلا گیا ہے۔" میں نے دیکھا کہ بوڑھا امداد حسین عجب باقی کیفیت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کوئی فالتو شرارتی یاوہ گوئی نہیں کی تھی۔ بلکہ وہی کچھ اُسے بتایا تھا جو میرا فیصلہ تھا اور اُس فیصلے کا سب سے پہلا اثر اُسی پر پڑ سکتا تھا کیونکہ وہ میری اس رہائش گاہ کا مالک ہے جسے میں گھونسلا کہتا ہوں۔ میں اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر گھونسلے میں آ گیا اور آج کے 'کایا کلپی' دن کی روداد لکھتا رہا۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور کچھ دیر میں اگلا دن شروع ہونے والا ہے اور یہ دن بھی مجھے 'مستقبل' سے کھنچا ہوا نظر آتا ہے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے خفیہ رجسٹر کے بقیہ صفحات دیکھے ہیں۔ صرف دو صفحے باقی ہیں۔

30 اپریل گھونسلہ۔ رات۔ تیس اپریل جیسا میرا دن اور صرف دو صفحات۔ یہ ایک انوکھی صورتحال ہے۔ میں نے اس امکان پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس 'لکھائی' کا انجام جبری مختصر نویسی پر بھی ہو سکتا ہے۔ مختصر نویسی کے فن میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ تمام زوائد حذف کر دیئے جائیں مگر ضروری اجزا میں سے کسی کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ لیکن کسی ایک دن کے بیان میں کیا زائد ہے اور کیا ضروری اس کا تعین کرنا کس قدر مشکل ہے اور وہ دن بھی ایسا جیسا آج کا دن۔ اگر یہ دن بھی زندگی کے بیشتر دنوں جیسا 'غیر واقعاتی' دن ہوتا تو پھر بھی مجھ جیسے قلم کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر چلنے والے کے لیے مختصر نویسی کی ایسی ناگہانی در جبری مشق عذاب سے کم نہ ہوتی چہ جائیکہ آج کا دن جو اُن دنوں جیسا ہے جن کا ہر لمحہ ایک واقعہ ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ واقعہ زیادہ اہم ہے یا اُس کے اثرات اور اثرات زیادہ اہم ہیں یا اُن سے جنم لینے والے امکانات اور خدشات۔ انتہائی محدود صفحاتی ذرائع کی موجودگی میں مجھے اہم بلکہ اہم ترین کے علاوہ باقی سب کچھ فراموش کرنا پڑے گا۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے کہ طویل جدائی کے بعد ملاقات پر عاشق سے کہا جائے کہ وہ دو لائینوں میں حال دل کہہ سنائے۔ عاشق کو تو شاید شاعری میں پناہ مل جائے مگر کسی پر آشوب دن کے واقعات اثرات اور امکانات .... مگر میں یہ کیا بکواس کر رہا ہوں کیسا دھوکہ کھا گیا ہوں۔ میں خفیہ رجسٹر کے قریب العدم قرطاسی مکان کو اپنی تمہیدی اضطرابی بک بک میں ضائع کر رہا ہوں۔ افسوس اب آزادانہ لسانی بک بک کے لیے میرے پاس ایک بھی لفظ کی گنجائش نہیں۔

واقعات: آج میں ایک مزدور کا روپ دھار کر صبح سویرے مزدوری حاصل کرنے کے لیے نکلا۔ ایک چوک میں دوسرے جسمانی کام کرنے والوں کے ساتھ جا کر بیٹھا کہ مجھے بھی کوئی مزدوری کے لیے لے جائے۔ بالآخر ایک پک اپ آئی اور آٹھ دس دوسرے مزدوروں کے ساتھ میرا انتخاب بھی ہو گیا۔ ایک تعمیراتی جگہ لے جا کر ہمیں کام پر لگایا گیا۔ وہاں میں نے شام پانچ بجے تک اینٹیں اُٹھانے کا کام کیا۔ جو مجھے کچھ مشکل نہ لگا۔ مزدوری ملی اور مجھے ایسا مزہ آیا جس کا زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ واپس گھونسلے میں آیا۔ شام ہوئی تو اپنا سابقہ معمول کا روپ اختیار کر کے پیدل ہی غلام باغ کی طرف چل پڑا۔ گزرے ہوئے کل کے "بڑے شہر... کے 'دوبارہ'... کے تجربے" کے بعد آج کا بڑے شہر کا تجربہ ایک اور طرح کا 'دوبارہ' تھا۔ (مختصر ..... مختصر ..... اور مختصر) شام چھ بجے تک ہم چاروں کیفے غلام باغ میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ جن معاملات پر پیچیدہ موضوعی تہہ در تہہ گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہیں۔ میرا اور زہرہ کا نیا تعلق۔ یاور عطائی کا کمرہ کھولنے کے فیصلے اور عمل میں ناصر اور ہاف مین کو شامل نہ کرنا۔ عطائی کے کمرے کی دنیا کا حال و احوال جیسا میں نے اور زہرہ نے دیکھا۔ 'گنجینۂ نشاط' نامی مخطوطے کی دریافت کا حال۔ ہاف مین کا معاملہ کہ اُسے غلام باغ میں ریسرچ کی مدت میں توسیع کے لیے فرسٹ سیکریٹری کو قدیم مسیحات سے خوش کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے عطائی کے خزانے کو دوبارہ کھولا جائے گا تاکہ وہ مفید بر مطلب اشیا حاصل کر سکے۔ ہاف مین ..... مبہم انداز میں ذکر کرتا ہے کہ اُسے جنم کھنڈر کے نچلے کمرے کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملی ہیں جن میں سے وہاں انسانی قربانی کی نوعیت کے بارے میں کچھ نظریات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ استفسار پر اُس نے کہا کہ وہ سب کچھ کتاب 'غلام باغ کا معمہ' کے باب بعنوان 'جنم کھنڈر کی اساطیر' میں لکھ دے گا۔ (ٹھیک ہے صفحات کی تعداد بڑھائی نہیں جا سکتی مگر قلم کی نوک انتہائی باریک کی جا سکتی ہے اور لفظی نشان انتہائی چھوٹے کیے جا سکتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لفظ کم سے کم قرطاسی خلا میں سما سکیں۔ اب یہ فالتو لکھنا بھی زیاں ہے کیوں مجھے خیال نہیں رہتا۔) ناصر کے معاملات۔ ایک تو وہی عشق کا معاملہ جس پر کوئی گفتگو نہیں ہوتی مگر یہ معاملہ ہر لمحہ ایجنڈے میں شامل رہتا ہے۔ مدبلی کی گویائی بحال کرنے کی اہمیت اور اس ضمن میں ہر طرح کی طبی، نفسیاتی و دیگر نوع کی جدوجہد جاری رکھنے پر سب کا اتفاق..... زہرہ کے معاملات۔ یاور ہاؤس کے بک جانے کا امکان اور اس حوالے سے نواب، امیر جان اور

Scanned by CamScanner

زہرہ کے بھائیوں اور ماں وغیرہ کا کردار۔ زہرہ کا قانونی چارہ جوئی کرنے کا عزم۔
میرے معاملات۔ لاالکھائی کے اسرار و رموز۔ پادری میکفائر کے اعترافات، یہ ایک کتاب نہیں
ہے۔ "دوبارہ کا مکاشفہ" اور متعلقہ امور۔ میرا یہ وعدہ کہ گنجینۂ نشاط خود پڑھنے کے بعد باقی دو
مردوں کو بھی مطالعے کے لیے فراہم کروں گا۔ ہاف مین کے لیے ترجمہ کی ذمے داری میں لیتا
ہوں۔ اثرات، فیصلے اور امکانات۔ جو کہ ظاہر ہے کہ میرے ذہنی تعصبات سے آلودہ ہوں گے۔
بہرحال...... ایک بنا تمین کا حفاظتی زکاوتی طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور ہر مرد واحد اپنی ذات کے اس
باقی ماندہ دو بنا تمین کے ساتھ۔ اصل کے ساتھ سامنے آنے کو ہے جو ابھی تک سب کے لیے نا
معلوم ہے شاید خود اس کے لیے بھی۔ اب عورت بھی ایک ہے اور مرد بھی الگ الگ ایک ایک
ہیں۔ کیا رقابت کا سبز سانپ سر اُٹھا چکا ہے کیا؟ یہ کہ یہ احساس میری مردانگی کی تکمیل کا خود ساختہ
واہمہ ہے؟...... بے یقینی...... بے اعتباری...... شکوک...... لاتعلقی...... ایک ایسی سوالیہ فضا طاری ہے
ہیں جن سے سب متاثر ہیں مگر یقیناً یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب کوئی آج دینا نہیں چاہے گا۔
زہرہ کا یہ فیصلہ کہ عطائی کا کمرہ کل ہم چاروں کی موجودگی میں پھر کھولا جائے گا اور پھر ہاف مین
عطائی سیمیات کے خزانے پر قابض ہو سکتا ہے۔ یہ فیصلہ ناصر پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ مجھے
کچھ اندازہ نہیں۔ "میرے لاالکھائی"...... "یہ ایک کتاب نہیں" اور "دوبارہ کے مکاشفے" کو ہاف
مین میری تیس اپریل کی نظریہ بازی قرار دیتا ہے۔ مگر میں اُسے جواب دیتا ہوں کہ یہ تو ابھی مکاشفہ
ہے نظریے نے تو ابھی جنم لینا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ "دوبارہ لکھو" جب نظریہ بنے گا تو غلام باغ
بھی اس کی لپیٹ میں ضرور آئے گا۔ میرے اس جواب کے جواب میں ہاف مین خلاف توقع
خاموش رہتا ہے اور بات کو آگے نہیں بڑھاتا۔ وہ اندر ہی اندر کیا سوچتا ہے کیا فیصلے کرتا ہے مجھے
کچھ اندازہ نہیں۔ ایک اور کیفیت بھی گزرتی ہے۔ اُداسی...... محرومی...... ناسٹلجیا...... باغ عدن
سے نکالے جانے کی کیفیت۔ مگر اس پر کوئی بات نہیں کرتا۔ زہرہ ایک بات کہتی ہے جو میری اس
جبری مختصر نویسی سے کہیں اعلیٰ پائے کی مختصر نویسی ہے "میرا خیال ہے جو کچھ کبیر کے اوپر وارد ہوا
ہے۔ وہ یہاں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے لیے دوبارہ پیدا ہو رہے ہیں۔" کیا
اس میں زہرہ کا چیلنج میرے لیے بھی تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ مگر میں نے ایک فوری فیصلہ کیا کہ
میں کچھ عرصے کے لیے سمیال چلا جاؤں گا وہاں اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کروں گا اور

بقیہ وقت "دوبارہ" پر صرف کروں گا۔ گیارہ بجے رات جب ہم منتشر ہوئے تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا
کہ کینٹے غلام باغ میں یہ آخری نشست ہے۔ جاتے وقت میں نے زہرہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا
تو اس نے ایک سوال کیا۔ "کیا تم کوئی ایسا فیصلہ اپنے طور پر کر سکتے ہو؟" پھر میرے جواب کا
انتظار کیے بغیر وہ چلی گئی۔ اب یہ آخری سطر ہے اور اس کے سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہیں۔
میں اب تھوڑی دیر بعد عطائی کی الماری سے نکلے گنجینۂ نشاط سے فیض یاب ہونا شروع کروں گا۔
اس وقت تک جب تک کہ نیند مجھے نہیں آلیتی اور یہ خاتمہ ہے ایک طویل نثری مشق کا اور لاالکھائی کا
اور ایک زمانے کا۔ اختتام۔

OOO

باب(20)

دوبارہ لکھو

کیفے غلام باغ کا بیرہ عاشق علی اپنے دل کی کیفیت کو نہ سمجھ پانے پر پریشان تھا اور پریشان اس بات پر تھا کہ وہ پریشان ہے یا حیران اُن چاروں پر جو ابھی اُٹھ کر گئے تھے اور پھر ایک ایک کر کے ایسے چلے گئے تھے جیسے پہلے کبھی نہ گئے تھے اور پھر اچانک اُسے سمجھ آ گئی کہ اُس کے دل کو دھکا کیوں لگا ہے۔ یہ تو سب اُجڑ گیا ہے۔ وہ جب آئے تھے تو وہ کتنا خوش ہوا تھا جیسے ہمیشہ اُن کے آنے پر ہوتا تھا۔ پھر انہوں نے چائے منگوائی اور کھانے کی چیزیں جیسے ہمیشہ منگواتے تھے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ جیسے ہمیشہ کرتے تھے۔ مگر نہیں نہیں۔ پھر اُن کے درمیان کچھ ایسا کالے سائے جیسا چل پڑا جو ہمیشہ سے نہیں تھا۔ ٹھیک ہے عاشق علی بیرہ انگریزی نہیں جانتا مگر وہ ان انگریزی بولنے والے چاروں خوبصورت لوگوں کو تو جانتا ہے اور پھر اُن کے بیچ جو کچھ بھی ہوا وہ ہمیشہ سے نہیں تھا اور شاید پہلی اور آخری بار تھا۔ عاشق علی نے اُن کی میز سے برتن سمیٹے تو اُس کا جی چاہا کہ وہ اُن برتنوں کو اُس میز کو ویسے کا ویسا پڑا رہنے دے۔ جیسے لوگ غلام باغ میں اُجڑے آثار دیکھتے ہیں ویسے ہی وہ انہیں دیکھے گا۔ اُس نے گہرا سانس کھینچا اور اُس کا دل بولا "اُجڑ گیا۔"

زہرہ کی گاڑی وہی پرانی مرسیڈیز تھی جو مدتوں عطائی کے زیرِ استعمال رہی تھی۔ عطائی کو پرانا گھر اور پرانی گاڑی بدل دینا اس لیے کہ وہ پرانے ہو چکے ہیں کبھی پسند نہ رہا تھا۔ نئی ملکیتیں۔ نئی جائیدادیں۔ نئی عمارتیں۔ اُس کی بیوی اور بیٹوں کی خواہشیں تھیں۔ مگر جن کی تکمیل کا اہتمام عطائی نے اپنے مگر جاتی ولولوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ خوب کیے رکھا تھا۔ عطائی کے بعد زہرہ جو باپ کی اس نامعلوم وراثت کو اپنے جسم اور اپنے خیال میں سمیٹے اب دنیا میں موجود تھی ملکیتوں کے بارے میں ویسے ہی رویے رکھتی تھی، وہ اپنی پرانی گاڑی اور پرانے یادوں ہاؤس سے محروم ہونے پر

کسی قیمت پر تیار نہیں تھی۔ یہ صرف تحفظ کا سیدھا سادھا احساس نہ تھا جو یہ متحرک اور ساکن جگہیں اُس کی ہستی کو فراہم کرتی تھیں۔ یوں اُس عدم تحفظ کا اُسے کوئی تجربہ بھی نہ تھا جو مروج پرورشی سانچوں کے تحفظ میں 'نشوونما' پانے والی لڑکیوں کے سینوں میں ایک 'سہم' کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ کھلے آسمانوں یا جانی ان جانی چھتوں کے نیچے اُس کے دل کو کسی ہول کا سامنا نہیں ہوتا تھا کہ اُس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ مانوس جگہوں کے تحفظ میں پناہ ڈھونڈتی پھرتی۔

غلام باغ کے قہوہ خانے میں مکالمہ بازی کی وہ رات ختم ہوئی تو چاروں کے اندر یہ احساس تھا کہ یہ رات ایسی ہی گھلک مگر سب کو جکڑ دینے والی مکالمہ بازی کی سابقہ راتوں کا خاتمہ ہے اور اس احساس کے بھی نیچے کہیں جو احساس تھا اور جو ابھی پہچانا نہ جاتا تھا وہ چار کی غلامی کا حصار ٹوٹ جانے کا احساس تھا اور اتنی ہی نامعلوم ابھی آزادی کی وہ ڈانواں ڈول کرنے والی کیفیت تھی اور آغاز اور انجام کے ایک ہو جانے کا چکرا دینے والا احساس تھا۔ مگر ان سب پر حاوی کہیں نہ کہیں کسی زیادہ مانوس مقام پر پہنچ جانے کی خواہش تھی اس لیے کہ مانوس جگہیں غیر مانوس کیفیتوں کو مانوس زبان بخشتی ہیں اور اُن کے ساتھ معاملے کو آسان بناتی ہیں۔ اسی لیے جب زہرہ سب سے الگ ہو کر اپنی گاڑی تک پہنچی اور پھر دروازہ کھول کر اُس کے اندر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی اور جب اُس نے دروازہ ایک مخصوص جھٹکے دار دھمک سے بند کیا اور سنا اور جب اُس نے گاڑی کے اندر کی مانوس خوشبوؤں کو پہچانا اور اپنے جسم کو نشست کی نرمی، سختی اور لچک میں جانچا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے آپ میں ہے۔ اگر چاہے تو اپنا حال اپنے آپ کو بتا بھی سکتی ہے۔ سمجھا بھی سکتی ہے۔ اسی حوصلہ مندی نے اُسے یہ یقین دلایا کہ سب کچھ بکھر کر بھی دنیا پھر بھی کہیں نہ کہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اپنی پرانی گاڑی کی اعتماد بحال کرنے والی زندہ فضا میں نہ ہوتی تو شاید اسے وہ کچھ یاد بھی نہ آتا جو اُسے اس لمحے یاد آیا۔ جب وہ اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے بیٹھی تھی مگر ابھی انجن اسٹارٹ نہیں کیا تھا تو اسے یاد آیا کہ اس کی موجودہ کیفیت کچھ ویسی ہی کیفیت ہے جیسی وہ کیفیت تھی، جب اس نے اپنے باپ سے پہلی بار اپنے نسل اصل کے بارے میں سوال کیا تھا اور پھر سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا مگر وہ پھر بھی بچ نکلی تھی۔ پھر بھی بچ نکلنے کی امید کو گاڑی کی فضا اور بھی پختہ کرتی تھی۔ 'بحالی' کے اسی عالم میں زہرہ نے اپنے آپ کا حساب لینا شروع کیا تو سب سے پہلے اسے کبیر کی وہ بات یاد آئی جسے سن کر وہ غصے میں بھر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے

Scanned by CamScanner

جب وہ اٹھنے والے تھے اور جب سب فیصلے ہو چکے تھے تو آخر میں کبیر نے اپنے اسی مخصوص بالاتر انداز میں فیصلہ سنایا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر سنبھال جا رہا ہے۔ 'دوبارہ' کو دریافت کرنے اور اپنے باپ کی زمینوں میں کام کرنے۔ زہرہ نے اس سے پوچھا تھا۔ بے اختیاری سے کہ وہ اپنے طور پر ایسا کوئی فیصلہ کیسے کر سکتا ہے مگر اب گاڑی کی اگنیشن میں چابی لگاتے وقت مگر اسے گھمانے سے پہلے اس نے سوچا کہ "آخر کبیر اپنے طور پر ایسا کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر سکتا؟"

"تعلق" اس کے ذہن نے جواب دیا۔ "تعلق انسانوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں۔" زہرہ نے چابی گھمائی، گاڑی اپنی میکانکی نیند سے بیدار ہو گئی اور حرکت کا امکان بنی گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ زہرہ نے بھی گہرا سانس لیا اور گاڑی کا شیشہ نیچے گرانے لگی۔ اسی لمحے ایک بڑی سی لمبی گاڑی کسی سفید شارک کی طرح زہرہ کے اتنے قریب سے گزری کہ جیسے اسے چھونا چاہتی ہو۔ گاڑی والے کے لیے ایک بے ساختہ گالی زہرہ کے ہونٹوں پر آئی اور بدن میں چنگاریاں سی دوڑ گئیں مگر وہ اسے دیکھ نہ پائی۔ یوں اگر وہ اسے دیکھ بھی لیتی تو اسے پہچان کر اس کے جسم کی چنگاریاں شعلے تو ضرور بن جاتیں مگر زہرہ اس رات کے باقی ماندہ واقعات کے ہونے کو روک نہ پاتی۔

امبر جان دل کھول کر اور منہ کھول کر ہنسا اور اس کے منہ کے ابخرے گاڑی میں پھیل گئے۔ وہ اس تصور سے بے اختیار لطف لے رہا تھا کہ زہرہ کسی نامعلوم شرارت کرنے والے کو گالیاں دے رہی ہوگی اور جل بھن رہی ہوگی۔ پھر اپنے اس خیال سے اسے اور بھی مزہ آیا کہ 'اچھا ہے ابھی سے اس کا موڈ بن جائے'' کیونکہ جو آگے آنے والا ہے اس پر تو وہ غصے سے پاگل ہو جائے گی اور...... اور...... اور پھر آج رات ہی جو آخر میں اس کے یار کے ساتھ ہونے والا ہے اس کے بعد تو شاید وہ مر ہی جائے گی۔ "مگر نہیں" امبر جان نے سوچا "ابھی اسے مرنا نہیں چاہیے عطائی کی بیٹی کو۔ جب تک میں اس کے ساتھ اس سے بڑھ کر نہیں کر لیتا جو اس کے ساتھ اس کا یار کرتا رہا۔"

امبر جان نے دانت پر دانت جمائے تو اس کے جبڑے پھول گئے اور چہرہ ایسے بھوکے کتے جیسا ہو گیا کہ جس کے منہ سے نوالہ چھین لیا جائے۔ اس کی گول سرخ آنکھیں آدھی رات کے سنسان شہر کی اس سڑک پر جمی تھیں جو یار ہاؤس کو جاتی تھی مگر جو وہ دیکھ رہا تھا اس رہا تھا وہ زہرہ اور کبیر کے تعلق کے مناظر تھے جس حد تک بھی اس کا تصور مرد و زن کے تعلق کو عریاں دیکھ سکتا تھا اور جس حد

تک بھی اس کی شیطانی قوت متصورہ نیچ کی اطلاعوں کو منتقل کر سکتی تھی۔ وہ عورت جو دوسری عورتوں کو امبر جان کے لیے رام کرنے کے فن کی ماہر تھی۔ زہرہ سے گالیاں کھانے کے بعد وہ آئی تھی اُسے بتانے کہ اس کا یار آیا تھا۔ "وہ دونوں تو جی دوپہر سے پہلے کے باتیں کرتے ہوئے جی۔ باہر لانوں میں پھلواڑیوں میں اور بیچ میں ہی شام ہو گئی۔ ہنستے بولتے کبھی اونچا کبھی اتنا نیچا کہ سننے کو قریب ہوتے جی کہ جیسے وہیں ایک دوسرے میں گھس جائیں گے۔ پھر اندر چلے گئے۔ آدھی رات ہوگئی۔ دروازے بند۔ میں نے دیکھا تو نہیں۔ پر سب کچھ کیا ہوگا۔ بعد میں میں نے اس کی شکل دیکھی جب وہ جا رہا تھا۔ میری نظریں دھوکا نہیں دیتیں جی۔ جب عورت پہلی بار یہ کام کرتی ہے...... اس کمرے میں ہی کیا ہوگا انہوں نے جو کیا ہوگا۔ وہ جو کمرہ جو بتاتے ہیں اس کے باپ کا تھا۔ جس پر تالا پڑا رہتا ہے۔ اسی میں جو ہوا وہ ہوا۔ بیچ میں ہی صبح ہو گئی۔ جب جا رہا تھا پھر میں نے دیکھا جی۔ کوئی کاغذ کاپی کتاب جیسی چیز اس کے ہاتھ میں تھی جسے نکال کر لے جا رہا تھا اس کمرے سے۔ پہلے اسی برآمدے میں انہوں نے چوما چاٹی کی"...... امبر جان کے اندر کھولاؤ سا اٹھا جیسے کسی دیگ میں ابال اٹھتا ہے۔ اس نے ایک ننگی گالی دونوں کو دی اور خود سے بولنے لگا "چوما چاٹی...... بھی گئی اور کمرہ بھی گیا۔ کمرہ اب میرا ہے اور کمرے کا وہ مردوں کا علاج معالجہ سامان جو بھی نکلے گا وہ نواب کا ہے۔" چوما چاٹی کروانے والی کے پہنچنے سے پہلے۔ ٹرک سب کچھ نکال کر لے جائیں گے سب کچھ۔ وہ جب پہنچے گی تو سب لے جائیں گے۔ پھر اس سے بات ہوگی عطائی کی بیٹی سے۔ تجھے یار چاہیے یا گھر چاہیے۔ گھر چاہیے تو پہلے میرا گھر بسا۔ پہلے میرا گھر بسا۔ امبر جان نے قہقہہ لگایا اور اس کی گاڑی یار ہاؤس کی طرف بڑھتی رہی۔

گاڑی کو اس کی گاڑی سے ٹکرا دینے کی کوشش کرنے والے کی بے ہودہ۔ غلیظ فطرت نفرت انگیز شخص کے لیے اپنے طیش کو زہرہ نے اپنے آزمودہ طریقے سے قابو کیا۔ جیسے کسی جگہ اچانک کوئی بدبو ناک میں گھسنے کو آئے تو ناک بند کر کے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں اسی طرح ایسے موقعوں پر ذہن بند کرلو اور کچھ اور سوچو...... زہرہ نے پھر وہی سوچا جو سوچ رہی تھی "تعلق انسان کو یہ حق دیتا ہے کہ دوسروں کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکے۔" "مگر کیا وہ خود چاہے گی کہ کبیر اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا ذہن صاف ہاں یا نہ کہنے سے عاری ہے تو پھر اگر وہ جانا چاہتا ہے تو وہ اسے کیسے روک سکتی ہے۔ کیا تعلق آزادی سے محروم کرتا ہے کیا دونوں کو آزادی سے

Scanned by CamScanner

محروم ہونا پڑتا ہے یا ایک دوسرے پر قابض ہونے کی خواہش اس میں نئی ہے۔ کیا چار کی غلامی ختم ہونے کے بعد دو کی غلامی شروع ہوگی۔ تعلق میں کچھ نہ کچھ تو اپنے آپ سے محروم ہونا ہوگا۔ ورنہ زبردستی کی یک طرفہ قربت ٹھونسنے والے۔ جیسے وہ گاڑی والا۔ "تعلق اور آزادی اور آزادی سے محرومی کی اس ادھیڑ بن میں زہرہ کا ذہن پھر یک دم غصہ سے بھر گیا "مگر صرف کبیر کے لیے۔ مگر صرف کبیر کے لیے کیوں؟" غصے میں الجھن شامل ہوگئی۔ اس نے جھنجھلا کر پیچ نکلنے کے لیے گاڑی کو یار ہاؤس کی سمت حرکت دے دی۔

کبیر جب گھونسلے میں پہنچا تو بتی روشن کرنے کے بعد سب سے پہلے اس نے جھپٹ کر نیلے رجسٹر کو اٹھایا اور اس کے خالی صفحات کا جائزہ لینے لگا۔ صرف دو صفحے باقی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور ایک اضطراب اور چیلنج کے احساس کے ساتھ سوچا کہ آج کے دن کے سب واقعات کو جن پر سینکڑوں صفحات کالے کیے جا سکتے ہیں۔ اسے صرف دو صفحات میں سمیٹنا ہوگا۔ اس نے رجسٹر واپس رکھا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور آرام کے لباس میں آنے کے لیے گھونسلے میں اس کونے کی طرف بڑھا جہاں اس کے کپڑے ایک ڈھیر کی صورت پڑے رہتے تھے۔ اسی وقت باہر سیڑھیوں کی لینڈنگ پر ایک شخص نمودار ہوا۔ یہ انہیں میں سے ایک تھا جنہیں کبیر "شکلیں" کہتا تھا۔ اس "شکل" نے تاریکی میں آگے بڑھ کر سیڑھیوں سے نیچے اترنا شروع کیا اور بیرونی دروازے کی کنڈی کو اندر سے کھول دیا تاکہ بعد میں جب اس کے ساتھی آگ لگانے کا سامان لے آئیں تو فوراً ہی اندر پہنچ جائیں۔ اس کام کے بعد وہ ویسے ہی دبے قدم اٹھاتا اوپر چھت کے اس کونے میں پہنچ گیا جہاں وہ شام سے کتابوں کے ایک بڑے ڈھیر کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔

گرزیلڈا نے ڈبل وسکی ہاف مین کو تھمائی اور گہری پرتشویش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "کیا بات ہے تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہے آج؟"

"آ نہیں۔ میں دوستوں کے ساتھ تھا۔" ہاف مین نے مشروب کا چھوٹا سا گھونٹ منہ میں گھماتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔

"مقامی دوستوں کے ساتھ" گرزیلڈا نے زہریلے لہجے میں کہا "یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ مقامی دوست۔ جن میں وہ مقامی کتیا بھی شامل ہے جو بیک وقت تین مردوں کے ساتھ سوتی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ میں تمہیں بہت دفعہ بتا چکا ہوں ایسا کچھ نہیں ہے ہمارے درمیان۔ لغو

باتیں مت کرو۔ ایسا کچھ اگر۔۔۔۔" ہاف مین نے گلاس پھر منہ سے لگایا اور پھر ایک بے یقینی سے انداز میں کہنے لگا۔۔۔۔ "ایسا کچھ اگر ہے بھی تو وہ اس کا اور کبیر کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"آ۔۔۔۔" گرزیلڈا کے منہ سے آواز نکلی وہ تڑپ کر ہنسی اور فلمی جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو۔ "آ تو یہ بات ہے اس نے کسی مقامی کتے کا انتخاب کر لیا ہے اور تم منہ دیکھتے رہ گئے اور یہ وجہ ہے تمہارے اترے ہوئے چہرے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کی۔۔۔۔ یہ وجہ ہے۔"

ہاف مین نے نیم برہنہ آسٹریلوی عورت پر چڑھ دوڑنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے سوچا "کیا یہی وجہ ہے۔"

ناصر نے سوچا "کاش آج میں کسی طرح نائٹ ڈیوٹی سے بچ جاتا اور سائیکیاٹری وارڈ جانے کی بجائے گھر جاتا اور کسی مسکن خواب آور دوا کی دوہری مقدار پھانک کر کل شام تک سوتا رہتا" مگر ایسا کچھ کرنے کی بجائے اس نے اپنی موٹر سائیکل اس چھوٹی سی سڑک پر ڈال دی جس کی یک طرفہ ٹریفک کی ہدایت کو وہ آدھی رات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نظر انداز کر سکتا تھا اور ہسپتال تک کا فاصلہ اور بھی مختصر کر سکتا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ کم از کم ایک کوشش تو کر سکتا ہے وارڈ میں اپنے ساتھی کو فون کرکے پوچھ تو سکتا ہے آیا وہ اس کی جگہ صبح تک ڈیوٹی دے سکتا ہے۔ ناصر نے ارد گرد کا جائزہ لیا کوئی رات بھر کھلا رہنے والا اسٹور، کوئی ریسٹورنٹ جہاں فون ہو۔ پھر اسے تعجب ہوا کہ وہ اپنے گھر کو کیوں بھول رہا ہے جو یہیں پچھلی آبادی میں ہے وہ گھر سے بھی فون کر سکتا ہے۔ ناصر کا گھر نچلے درمیانے اور درمیانے کے درمیان پھنسی ایک آبادی میں تھا جہاں پرانی تنگ گلیاں بھی پہنچتی تھیں اور کھلی سڑکیں بھی۔ اس نے ایک تنگ گلی میں موٹر سائیکل ڈال دی جو اسے بہت جلد اور سیدھا گھر لے گئی۔ اس کی ماں اور چھوٹا بھائی دونوں اسے دیکھ کر متعجب ہوئے۔ جب شام وہ گھر سے نکلا تھا تو معمول کا خیال یہی تھا کہ کل صبح ڈیوٹی دے کر واپس آئے گا۔ ناصر نے ان کی سوالیہ نظروں کا جواب خود ہی دے دیا "دوستوں کے ساتھ تھا۔ اب وارڈ جا رہا تھا۔ سوچا گھر سے ہوتا چلوں چائے بنا دیں۔ ایک فون بھی کرنا تھا۔ باہر کہیں فون کرتا۔۔۔۔ اس وقت فون ملتا نہیں" ناصر کی ماں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ہسپتال جا کر بھی تو فون کر سکتا تھا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ اسے کہاں فون کرنا ہے مگر اس نے کچھ دیر اسے ماؤں کی ان نظروں سے ضرور دیکھا جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ جاتی ہیں۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کے دوست کیسے لوگ تھے مگر باتوں

Scanned by CamScanner

سے کبھی جو وہ ایسے ہی کر دیتا تھا اسے اندازہ ہوا تھا کہ ان میں کوئی انگریز ہے کوئی امیر گھر کی لڑکی ہے اور کوئی ان دونوں سے پرانا اس کا دوست ہے جو شاید کہیں لکھتا ہے کسی رسالے میں۔ اللہ جانے مگر وہ جب بھی ان دوستوں کے ساتھ رات رات بھر بیٹھ کر آتا تھا۔ اسے ٹھیک سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کیا وہ بہت خوش ہے یا بہت ہی ناخوش۔ اسی بات سے اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ پھر اسے اس کے بچپن کا کوئی نہ کوئی واقعہ یاد آ جاتا۔ جب وہ بچہ اسے سمجھا جاتا تھا اور پھر واقعہ یاد کر کے اسے تسلی سی ہو جاتی اور اپنے آپ سے کہتی۔ ناصر ہمیشہ سے ایسا ہی تھا مگر آج جب اس نے اسے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا اور اس کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش دیکھی تو ماں کی عقل سے بہت دور بہت چھپے جوان بیٹے کو سمجھنے کی اُس کی تکنیک ناکام ہوتی محسوس ہوئی۔ مگر اس کے علاوہ اس عورت کے پاس ماں کی زندگی گزارنے لائق بنائے رکھنے کی کوئی تکنیک تھی بھی نہیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ ریسیور کان سے لگائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی نظروں میں وہ خاموش حکم تھا کہ وہ کسی سے بات کرنے لگا ہے اور وہ وہاں سے جائے۔ وہ وہاں سے ہٹ آئی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ پہلی بات تو یہی آج مختلف تھی کہ یہ 'کیا وہ بہت خوش ہے یا بہت ہی ناخوش ہے' والی بات نہیں تھی یہ تو خوشی ناخوشی سے بھی الگ ہی کوئی بات تھی۔ اُس نے دودھ اور پانی کی دیگچی چولہے پر رکھی اور ابلنے کا انتظار کرنے لگی...... ناصر اور چھوٹا آصف نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ انہیں ڈھونڈتی چھت پر چلی گئی جہاں بچے چارپائیوں کا گھر بنا کر اندر بیٹھے تھے اور ناصر اندر بیٹھا سب سے کوئی بات کر رہا تھا اور اس کی باتیں سن کر وہ دہل گئی۔ وہ معصوم بچہ دوسرے معصوم بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ تو باپ کے مرنے کے بعد بڑے مزے میں ہے۔ جن بچوں کے باپ زندہ ہوتے ہیں وہ تو بڑی مصیبت میں ہوتے ہیں۔ وہ سُن سی ہو کر الٹے پاؤں واپس آ گئی۔
تھوڑی دیر بعد ناصر نیچے آیا اور کہیں ماں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ماں کو اجنبی سی نظروں سے دیکھا مگر ماں نے معصوم بیٹے کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ دیکھا۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا کام کر کے آ رہا ہے۔ جسے چھپانا ہی ایک بہت بڑا کام ہے۔ ابھی جب وہ ٹیلی فون کرنے لگا تھا تو اس نے ماں کو دیکھا تھا تو اسے ناصر کے چہرے پر ویسا ہی رنگ نظر آ گیا تھا۔ میرے خداوہ کیا کر کے آ رہا ہے۔ نہ میں اُس بچے سے پوچھ سکتی تھی اور نہ ہی اب پوچھ سکتی ہوں۔ اُس نے ابلتے پانی کی دیگچی نیچے اتاری۔ دوسرے کمرے سے ناصر کی آواز آ رہی تھی فون پر بات کرتے

ہوئے۔ پھر جب وہ چائے لے کر اس کے پاس گئی تو وہ جانے کے لئے تیار تھا اور چائے کا اُسے خیال ہی نہیں تھا مگر اس نے چائے پی اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے ساتھی ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اس کی بھی مجبوری ہے وہ اس کی جگہ صبح تک ڈیوٹی نہیں دے سکتا۔ ناصر کی ماں نے دروازہ بند کیا اور سنسان گلی میں ناصر کی موٹر سائیکل کی آواز کو اس وقت تک سنتی رہی جب تک کہ وہ مدھم ہوتے ہوتے بالکل غائب نہ ہو گئی۔

آگ لگانے کے لیے آنے والے نے انتظار سے بے چین ہوتے ہوئے سوچا کہ وہ دونوں ابھی تک آئے کیوں نہیں پھر اس نے گھڑی دیکھی ابھی تو رات اتنی نہیں گزری۔ حکم تھا کہ کام رات کے آخری پہر میں ہو۔ جب وہ سو جائے مگر یہ کیسے پتہ چلے گا کہ وہ سو گیا ہے۔ جب بتی بجھ جائے گی مگر بتی جلائے جلائے بھی لوگ سو جاتے ہیں۔ اسے آہٹ سی ہوئی شاید وہ پٹرول کا ٹین لے کر آ گئے مگر نہیں وہ کوئی بلی تھی۔

کبیر نے سوچا یہ عجیب عذاب ہے، ایک ایسی صورت حال کو انتہائی مختصر لکھنا کہ جس پر جی چاہے کہ بکتے چلے جاؤ کھلتے چلے جاؤ۔ بھٹکتے چلے جاؤ۔ کرتے چلے جاؤ۔ وہ ہنسا اور یہ بک بک بھی میں یہاں درج نہیں کر سکتا مگر جب بھی میں دوبارہ لکھوں گا تو اس طرح کی صورت حال کو بھی دوبارہ لکھوں گا۔ فی الحال میں ایسا کچھ بھی لکھنے کی بجائے...... لکھتا ہوں اور کبیر نے مختصر نویسی کے تابوں میں اور تھوڑی جنبش کی تھوڑا آگے لکھا۔ ناصر کے معاملات......"

وارڈ میں پہنچنے اور ساتھی ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ مریضوں کے روزانہ کے چارٹ وغیرہ دیکھ چکا تو نرس مختار آ گئی اور ڈاکٹر ناصر کو دیکھتے ہی اس کے تجسّس تنقیدی ذہن نے اسے معمول سے کچھ مختلف اشارے دیے۔ آج ڈاکٹر ناصر کیسا لگ رہا ہے جیسے کہیں سے مار کھا کر آیا ہے۔ نہیں ایسا نہیں تو پھر...... ہاں کچھ ویسا جیسے شادی کی پہلی رات کے بعد صبح... میاں بیوی نہیں خاص کر میاں نظر آتا ہے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ رات اس نے کچھ کیا ہے۔ بعضوں سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پر آتے وہ بھی ایسے ہی ہیں نظر۔ پر نہیں ڈاکٹر ناصر ویسا بھی نہیں نظر آ رہا۔ یا اللہ مجھے معاف کر کیسی گندی باتیں دماغ میں آتی ہیں۔ جی سسٹر مختار۔ ڈاکٹر ناصر پوچھ رہا تھا۔ "ہاں تمتماتا" نرس مختار نے فیصلہ کیا "ڈاکٹر ناصر تمتماتا نظر آ رہا ہے۔" مگر ڈاکٹر ناصر کو اس کے تمتمانے کے بارے میں کوئی اطلاع دینے کی بجائے نرس مختار نے اسے پیرانائیڈ عورت کے بارے میں اطلاع دی۔

Scanned by CamScanner

''ڈاکٹر صاحب وہ پلی بی نے آج سے کچھ اور ہی کہانی سنانی شروع کر دی ہے۔ نرس عشار جانتی تھی کہ ڈاکٹر ناصر دوسرے پاگلوں کے ڈاکٹروں کے برعکس 'کہانی والے' پاگلوں کی کہانیوں میں بھی دلچسپی لیتا ہے مگر خلاف توقع ڈاکٹر ناصر نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا مگر نرس عشار نے مایوس ہونے کی بجائے فیصلہ کیا کہ وہ بتائے گی ضرور کہ...''وہ عورت اب برف کے بازبلوں پیچھے زہریلی آنکھوں والے باووں کو بھول گئی ہے اور کچھ اور ہی کہانی سنانے لگی ہے''......''وہ کچھ اور ہی کہانی سنانے لگی ہے اب ڈاکٹر صاحب......''۔ اور نرس عشار نے پیرانا بخیٔ عورت کی نئی کہانی سنانی شروع کی اور ڈاکٹر ناصر نے تعجب سے سوچا کہ آج بھلا یہ مشکوک۔ تو ور کھنے والی متجسس عورت میرے بارے میں کیا اندازے لگاتی ہوگی۔ اور عین اسی لمحے، اُسی لمحے میں جو پوری ارضی دنیا پر پھیلا تھا امیر جان اُس منزل کی طرف کچھ اور آگے بڑھ گیا جہاں اُس عورت کے ساتھ ''یار جا چاہیے یا گھر جا چاہیے'' کا کھیل کھیلنے کے لئے اُس نے مدتوں انتظار کیا تھا۔ اُسے یار جا چاہیے۔ حرامزادی کو اور یار نے تم نہیں حرامزادی کو۔ صبح تک اپنے اُس کوڑے کے ڈھیر کے ساتھ بھسم ہو جائے گا اور اس فیصلے تک پہنچنے میں بھی انہوں نے......اُن سب بڑوں بڑوں نے اتنا وقت غارت کیا۔ اُس پہ ہوتا تو جیسا عطائی کے مرنے والی رات سے اُس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اب تک کہیں پڑا گلِ سڑ رہا ہوتا۔ پر نہیں جی مجھے باز رکھتے رہے۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ امیر جان اپنے اوپر قابو رکھو۔ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ یادر ہاؤس کی خریداری ہو جائے۔ جائیداد تمہارے نام ہو جائے۔ کمرہ خالی ہو جائے۔ پھر دیکھا جائے گا۔ ہنہ۔ وہ تو تیتی نے بتایا کہ وہ تو اس کی بچی کے ساتھ سو بھی چکا ہے اور باپ کے خزانے سے بھی کچھ نکال نکال کر لے جا رہا ہے وہ تو پھر رسالے والا بیچا اور امیر جان کا دماغ اس منظر سے بھر گیا جو نواب کے گھر وہ سب جمع تھے اور رسالے والا۔ چیخ رہا تھا۔ ارے نہیں سیکریٹری صاحب۔ وزیر صاحب۔ بنگش صاحب۔ کاچر صاحب۔ جرنیل صاحب۔ حضرت صاحب۔ آپ سب سن لیں وہ باز نہیں آئے گا۔ آج اس نے فون کر کے مجھے بتایا حرامزادے نے وہ فقرہ کہا مجھے۔ وہ دوبارہ لکھے گا۔ ''دوبارہ لکھے گا'' ان سب نے یک بارگی حیرت سے کہا۔ کیا۔ کیا لکھے گا؟ وہی جو پہلے لکھنے کی دھمکی دے چکا ہے اور کیا۔ یہاں امیر جان نے بڈھے نواب کی توجہ پہلے چپکیلے مشروب کی خالی بوتل کی طرف دلائی تھی اور نواب کی سنجیدہ مسخرہ خیز صورت دیکھ کر اسے ہنسی آئی تھی اور رسالے والا کچھ اس طرح کی بات کر رہا تھا۔

اس وقت پہلے اس نے اٹھارویں صدی کے یورپین نظریہ جنسی کلبوں کا حوالہ دیا تھا۔ جہاں وہ بانکے ہیں کر شرکت کرتے تھے۔ تم خود سوچ لو وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں وہ باز نہیں آئے گا۔ ضرور لکھے گا۔''

اور کبیر مختصر نویس نے صرف اتنا لکھا ''میرے 'دوبارہ' کے مکالمے کو ہاف مین میری تیس اپریل کی نظریہ بازی قرار دیتا ہے۔''

''نہیں یہ اس کی تیس اپریل کی نظریہ بازی نہیں ہے'' ہاف مین کے منہ سے وہ کچھ تھوڑا سا پھسل گیا جو اس کے ذہن میں لہریں مارتا تھا اور ڈوب کر پھر اوپر ابھرتا تھا۔ اس پر فطری حالت میں اس کے ساتھ دراز گوری عورت پھر آگ بگولا ہو گئی۔ تمہارا ذہن ابھی وہیں ہے اس طوائف اور اس کے مقامی دلالوں کے ساتھ۔ ڈھانکو اپنا یہ بے جان چھچھڑا اور دفع ہو جاؤ۔ تم ضرور مجھ کے آئے ہو اور ہاف مین پہلی بار اپنی حالت پر باقاعدہ متعجب ہوا۔ ایسا اس کے ساتھ آج تک نہیں ہوا تھا۔ گر ٹروڈ کو اس کی آمادگی کے اشاروں کے مجسم ہونے کے لیے اتنا انتظار کبھی کرنا ہی نہیں پڑتا تھا مگر آج اس کی سب تگ و دو کے سامنے وہ ڈھیر تھا۔ ''میں Hash ٹرائی کرتا ہوں۔'' اس نے کہا ''اس سے صرف تمہارا دماغ آؤٹ ہوگا'' گر ٹروڈ نے نا آسودگی کی جھنجھلاہٹ سے کہا اور پھر یک دم مائل پڑ گئی۔ اس نے ایک آدھ کپڑا اپنے اوپر کھینچا اور کہا۔ ''او کے بھول جاؤ۔ پھر سہی۔ مجھے تم یہ بتاؤ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دن اس غیر فطری محبت میں تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوا۔ تم پھر کوشش۔ پھر میں نے جا کر سونا ہے اپنے کمرے میں''۔ ''میں کوئی طوائف نہیں ہوں جس کے ساتھ فارغ ہو کر تم دفع ہونا چاہتے ہو۔ میں جانتی ہوں تمہارا جسم نہیں ذہن متاثر ہوا ہے۔ ابھی تم کیا بڑبڑا رہے تھے۔ پاگل پن ایسے ہی شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کیا کہہ رہے تھے تم.... کوئی.... نظریہ بازی....''

''ہاں وہ اس کی پرانی نظریہ بازی نہیں تھی۔''

''کیا مطلب''

''کچھ اور تھا''

''کیا مطلب'' وہ پھر بے اختیار ہو کر پھیپھڑوں کے زور سے دھاڑی۔

Scanned by CamScanner

ہاف مین نے زیر جامہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دونوں پاؤں کے اوپر سے گزارا اور پھر اسے اوپر کی طرف کھینچتا چلا گیا اور ہنس پڑا۔

"دیکھو ڈارلنگ یہ حالت میرے ساتھ پہلی بار ہوئی ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں کل مبہیات کا ایک خزانہ مجھے ملنے والا ہے۔ سارے کا سارا فسٹ سیکریٹری کے قبضے میں تو نہیں جائے گا۔ اب تو مجھے بھی ان قدیم معجزوں کی ضرورت ہے۔ اب تو مجھے بھی عطائی کا گاہک بننا پڑے گا۔ ہاہا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" ہاف مین نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اس کی ہنسی کو ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ اس بے قابو ہنسی میں لڑھکتا چلا گیا۔ گرٹریوڈ کی آنکھوں میں پہلی بار خوف کا سایہ اترا اور وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔ "کیا ہوا ہے...... کیا ہوا ہے...... تمہیں......"

امیر جان نے گھڑی دیکھی اور کئی طرح کے اندازے لگانے لگا۔ عطائی کے کمرے کا مال اسباب تو اب تک بڈھے نواب ثریا جاہ کے تہہ خانے میں پہنچ چکا ہوگا جو کچھ بھی نکلا ہوگا ایک ٹرک میں تو نکلا ہوگا۔ عطائی کے بیٹے بھی یاور ہاؤس پہنچ گئے ہوں گے۔ بہن کو گھر لے جانے۔ پھر اس کے تصور میں زہرہ کے بھائیوں کی پوری شکلیں پھر گئیں وہ ہمیشہ اسے موٹی موٹی سفید مولیوں جیسے نظر آتے تھے اور وہ ان پر ہنستا تھا اور اب بھی ہنسا جبکہ اس کی گاڑی یاور ہاؤس کی طرف جاتی سڑک پر تھوڑا آگے بڑھ گئی۔ کبھی ایسے ہی موٹی موٹی جیسے لونڈے بھی اسے بھاتے تھے مگر اب نہیں......

اُن کی بہن اُن جیسی نہیں۔ وہ تو...... اس کے سینے سے گرم بھبکا جیسا سانس نکلا۔ وہ حرامزادی اپنے باپ جیسی ہے۔ اس کی گاڑی کہیں بہت پیچھے ہی ہوگی۔ اس کو کیا پتہ گاڑی سے گاڑی بھڑانے والے سے کچھ دیر بعد ہی ملاقات ہوگی...... ہا...... ہا...... ہا...... ہا"

ہاف مین کی ہنسی نہ رکی مگر اس نے گرٹریوڈ کے سوال کے جواب میں کہنے کی کوشش کی......

"جو...... کچھ...... مجھے ہوا ہے وہ نہ تو میں شاید بتا سکوں...... نہ تم سمجھ سکو...... گی"

مختصر نویس نے لکھا...... مگر میں اسے جواب دیتا ہوں کہ یہ تو ابھی مکاشفہ ہے نظریے نے تو ابھی جنم لیا ہے...... مگر اتنا ضرور ہے کہ "دوبارہ لکھو" جب نظریہ بنے گا تو غلام باغ بھی اس کی لپیٹ میں ضرور آئے گا......

زہرہ کی گاڑی یاور ہاؤس کی طرف متحرک رہی مگر جیسے ساکن رہی جیسے سلوموشن میں ناممکن فاصلے ماپنے والی گاڑیاں۔ مگر وقت کے اس بہت مختصر دورانیے میں بھی زہرہ کے ذہن میں وہ سب

کچھ بیت گیا جو زہرہ جانتی تھی کہ کبیر پر بیت رہا ہے مگر وہ کیا جانتی ہے صرف اتنا کہ وہ کسی بڑی کالا کلب کے کسی بڑے پھیر میں آ چکا ہے۔ بہاؤ میں ہے اور خطرے میں ہے۔ پھر زہرہ کے دل کو چوٹ لگی۔ ایسے میں تو مجھے اسے ایک لمحے کے لیے اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے غصے نے ڈبو کر کیا اس کی بات سن کر کہ وہ جا رہا ہے۔ کیا وہ واقعی جا رہا ہے؟......

مختصر نویس فقرہ مکمل کرتا ہے...... میرے اس جواب کے جواب میں ہاف مین خلاف توقع خاموش رہتا ہے اور بات کو آگے نہیں بڑھاتا۔ وہ اندر ہی اندر کیا سوچتا ہے کیا فیصلے کرتا ہے مجھے کچھ اندازہ نہیں۔

آگ لگانے کے لیے آنے والا دوسرے آگ لگانے کے لیے آنے والوں کے انتظار میں بیزار ہو جاتا ہے اور وقت کو گالی دیتا ہے جو گزرتا نہیں اور ان چیونٹیوں کو بھی جو گھٹنوں سے وہاں اس کے وہیں پڑے ماس کو چکھنے کے لیے بار بار آ رہی ہیں۔

"تم ڈرنک بھی پہلے بہت لے چکے ہو اور پھر سے Hash۔ ختم کرو یہ سب کچھ۔ کپڑے پہنو اور جاؤ اپنے فلیٹ میں جا کر سوؤ۔ اگر تم یہاں نہیں سو سکتے تو جاؤ"۔ "جاؤں گا" ہاف مین کراہا اور پھر میرے نشے کی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ بولنے لگا۔ "وہ کہتا تھا وہ غلام باغ میں ایک اور گڑھا کھودے گا۔ بہت چوڑا اور وسیع دریچوں اور سب کچھ خود کھود نکالے گا۔ وہ اپنا گڑھا خود کھودے گا۔ میرے گڑھے کے متوازی۔ میرے گڑھے کے مقابلے میں میرے گڑھے کے ارد گرد۔"

"بکواس" گرٹریوڈ نے کہا "بالکل بکواس۔ یہ مقامی تو آرکیالوجی کی اے۔ بی۔ سی بھی نہیں جانتے۔ لعنت بھیجو اس پر یہاں کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" اور ہاف مین نے کچھ سنے بغیر کہا "کیا بات ہے مجھے تمہارا جسم نہیں نظر آ رہا۔ کیا تم کپڑے پہن چکی ہو۔ آؤ زہرہ الفرودائی مجھے Aphrodisiacs کی رشوت دے کر دفع کرنا چاہتی ہے۔ وہ دونوں ہی مجھے میرے گڑھے میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے مبہیات کی رشوت دے کر اور دیکھو۔ دیکھو مجھے ان کی ضرورت بھی ہے۔ میرے خدا اُن کی باقاعدہ ضرورت ہے Aphrodisiacs کی" ہاف مین نے قہقہہ لگایا اور پھر اپنے جسم کو ہاتھ سے پکڑ کر دائیں بائیں ہلانے لگا۔ "یہ ایک کائناتی انکار ہے ڈارلنگ۔"

"ختم کرو" گرٹریوڈ چیخی۔ "اپنے آپ کو ڈھانکو اور خبردار تم نے کبھی کوئی نام نہاد Aphrodisiac چیز لی۔ کیا تم مرنا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں پتہ نہیں یہ عطائیوں کا دیس ہے۔"

"جانتا ہوں مگر جب کوئی عطائی دھڑلے سے اپنے آپ کو عطائی کہتا ہے۔ تو وہ بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔" ہاف مین نے کہا اور یک لخت اونچی آواز میں گانے لگا۔ "لنڈن برج گر رہا ہے۔ لنڈن برج گر رہا ہے۔ زمین گر رہی ہے۔" پھر اس نے اچانک کہا اور دہشت زدہ سا ہو کر اٹھ بیٹھا "یہ بات میں نے کہاں سنی ہے"۔ اس نے بے چینی سے گرزیلڈ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر زور لگا کر ایک لمبا گوز خارج کیا۔ ڈارلنگ یہ فقرہ میں نے کہاں سنا تھا۔

"جہنم میں" گرزیلڈ نے کہا اور ہاف مین کی انگلیوں میں اٹکا سگریٹ نکال لیا جو پہلے ہی ختم ہو کر بجھ چکا تھا۔ کبیر کا قلم دیر تک ہوا میں معلق رہا اور اس کا ذہن غلام باغ میں آخری نشست کی روداد کو مختصر نویسی کے جبر کے تابع کرنے کی کوشش کرتا رہا اور وہ ان آخری لمحوں کی کیفیت کو کم سے کم لفظوں میں سمیٹنے کی خود اختیار کردہ دیوانگی کا کرب سہتا رہا۔ پھر اس نے گہری خود اذیتی کی لذت سے دو چار ہو کر لکھا اور لکھنے والے کی "خود دلیتی" کو پورا جیتے ہوئے لکھا...... ایک اور کیفیت بھی گزرتی ہے۔ اُداسی، محرومی۔ ناسٹلجیا۔ باغِ عدن سے نکالے جانے کی کیفیت۔ مگر کوئی اس پر بات نہیں کرتا......

زہرہ کی گاڑی چند لمحے آگے گئی اور نامعلوم بے چینی سے اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے رات کے اندھیرے کو جو گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں سیاہ ہو کر نمایاں ہوتا تھا، بہت محسوس کیا اور سوچا۔ ابھی اس رات کی کالی کوکھ سے کیا جنم لے گا۔ کوئی نہیں جانتا...... کبیر کے ساتھ کیا ہو رہا ہے کوئی نہیں جانتا...... کیا میں ابھی اس کے پاس چلی جاؤں...... میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے پھر اس نے یاد کیا جو اس نے کبیر کے بارے میں کہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب یوں لگتا تھا کہ ان سب کے درمیان سب کچھ ختم ہونے کو بھی خاتمہ ہونے والا ہے اور وہ دونوں۔ نہیں تعجب ہے کہ شاید چاروں۔ خود کبیر بھی۔ وہ کبیر کی طرف سے دل ایسے کیے بیٹھے تھے جیسے وہ کوئی بڑا بھاری مجرم ہو، تب اس نے عجیب طرح بلک کر کہا تھا سب سے۔ "جو کچھ کبیر پر وارد ہوا ہے۔ وہ یہاں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے لیے دوبارہ پیدا ہو رہے ہیں۔"

اور مختصر نویس نے بھی یہی لکھا۔

آگ لگانے والے نے پھر گالیوں بھرے دل سے سوچا کہ یہ...... تو بتی بجھاتا ہی نہیں...... سوتا ہی نہیں۔ سوئے گا نہیں تو آسانی سے اسے زندہ جلانا بڑا مشکل ہوگا...... بڑا مشکل کام دیا ہے

بیٹھا امبر جان نے۔

اور امبر جان نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ کرائے کے قاتلوں کے لیے شاید عطائی کی بیٹی کے یار کو زندہ جلا دینا مشکل ہی ہوگا مگر سب بڑوں کا یہی فیصلہ تھا اس کے یار کے ساتھ جو کچھ یار نے سرخ تیل والے کے گھر سے چرایا ہے، وہ بھی ساتھ ہی جل کر راکھ ہو جائے اور کوئی ثبوت باقی نہ رہے اور باقی جو کچھ اس کمرے میں ہے۔ وہ تو ٹرک میں لد کر تو اب کے گھر پہنچ ہی چکا ہوگا۔

سفید شارک جیسی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

کبیر زہرہ کا کہا "ہم سب ایک دوسرے کے لیے دوبارہ پیدا ہو رہے ہیں۔" لکھ کر پھر رک گیا اور اس نے سوچا کہ مختصر نویسی کے احمقانہ کھیل کو وہیں، ختم کرنے کے لیے اس سے بہتر جملہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر نیلے رجسٹر کے ختم ہونے میں۔ ابھی بھی آٹھ دس لائنیں باقی تھیں۔ کبیر نے سوچا مختصر نویسی کا انحصار فقط کاغذی مکاں تک محدود ہے۔ دس لائنیں خواہ پل بھر میں لکھی جائیں یا سال بھر میں دس لائنیں ہی رہتی ہیں۔ پھر وہ اپنے اس دائمی لاانتہائیت کے مرض کو اپنی سانسوں میں پہچاننے لگا۔ اس نے گنجینۂ نشاط۔ تنگی۔ شاہی طبیب۔ بادشاہ کا...... مشیوط کرد۔ کبیر اندر ہی اندر گھٹ گیا اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے باہر کوئی آہٹ سنی ہو۔ لیکن دوسرے لمحے ہی بھول گیا اور پھر قلم پکڑ کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے سوچا کہ زہرہ نے ایسا کیوں کہا کہ "ہم سب ایک دوسرے کے لیے دوبارہ پیدا ہو رہے ہیں۔" کیا میں اس کے لیے بھی اور وہ میرے لیے بھی۔ یا ور عطائی کے گھر میں گہری شام میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔ اور رات کو اس پر آشوب ڈرائنگ روم میں اور عطائی کے اس حیرت ناک کمرے میں ہم ایک دوسرے کے لیے دوبارہ پیدا ہوئے ہیں ایک دوسرے کے اندر پھر سے پیدا ہوئے ہیں مگر شاید پیدائش کا عمل وہیں رک نہیں سکتا جاری رہتا ہے یہ باب پیدائش ہے۔ کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا اور اس کا دل نامعلوم سرد جذبوں سے ٹھٹھر گیا مگر مختصر نویس نے صرف اتنا آگے لکھا۔ "کیا اس میں زہرہ کا چیلنج میرے لیے بھی تھا مجھے کچھ اندازہ نہیں۔"

باقی دونوں آگ لگانے والے خوب تیار ہو کر آئے تھے۔ پٹرول کا کنستر۔ ایک فالتو ڈھکن جس میں نصب دو ربڑ کی نالیاں ایسی کہ ڈھکن کنستر میں لگا کر ایک میں پھونک مارو تو دوسری میں سے 'بہتی آگ' کی دھار پھوٹ کر نکلے۔ نئے آنے والوں میں ایک جس کا نام بھولا

Scanned by CamScanner

تھا اور کام ستھرا اور پکا کرنے پر یقین رکھتا تھا باقی دونوں کو اپنے خونی منطق کا قائل کرنے کی
کوشش کر رہا تھا۔ "ستھرا اور پکا کام کرنا ہے تو پہلے دروازے پر ہلکا سا ٹھوکا دو، باہر نکلے گا، منہ پر
ہاتھ رکھ کر اندر گرا دو اور گلے پر چھرا پھیر دو۔ پھر آرام سے تسلی سے پٹرول چھڑک کر آگ لگا
دو۔" "ستھرا کام؟" تیسرے نے شک کا اظہار کیا۔ "نہ پتا گر وہ دروازہ کھولتے ہی شور ڈالنے
لگا تو؟ ہاتھ سیدھا کھا پڑ گیا تو؟" انتظار کرنے والا بھی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے دونوں کو اپنی
آوازیں مدہم رکھنے کا مشورہ دیا اور کہا "تھوڑی دیر اور انتظار کر لو۔ آخر سو ہی جائے گا" بھولا بے
چین ہو گیا اور بولا "کر لو انتظار کر لو یہ جلد ساز تو ساری ساری رات نہیں سوتے" اسے یاد آ گیا
جب وہ دوسری جماعت میں پڑھتا تھا تو اس کے محلے کا ایک جلد ساز ساری ساری رات جاگ کر
کتابیں جلد کرتا رہتا تھا۔

کبیر نے گنجینۂ نشاط اور پادری میکنائر کے اعترافات کو ایسے ہاتھوں کی انگلیوں میں تھاما اور
صفحات جیسے اعضاء الٹ پلٹ کیے کہ جیسے ان کے لمس سے لذت کشید کر رہا ہو اور ابھی ان کے
ساتھ اور بھی کئی گہرے لمس کے لمحے گزارنے ہوں۔ ان صفحات کی گہری سلوٹوں میں سے کہیں
کوئی لفظ کوئی جملہ بدن کی خوشبو جیسا اٹھ کر اس تک آیا۔ شاہی مورخ کی حرامزدگی۔ داشتہ کو
جاسوس بنا کر راز لیتا رہا۔ ٹھگ کبھی ارذل ذات والوں کو ہلاک نہیں کرتے تھے۔ جیسے دھوبی۔
موچی۔ چمار۔ نائی اور عورت کو بھی قتل نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر حاملہ عورت کو۔ بابچی۔ تخم
ترل۔ عین میدان جنگ میں سپہ سالار کی چتا۔ کایا کلپ نباتات کا استعمال اور عورت مفقود۔
الاماں۔ کبیر ہنسا اور اسے ایک بار پھر ایسا لگا جیسے باہر کوئی پھر رہا ہے۔ بلیاں اس نے فیصلہ کیا اور
ایک بار پھر گنجینۂ نشاط اور پادری میکنائر کے اعترافات کو تکیے کے نیچے رکھ کر اور نیلے رجسٹر کو سامنے
رکھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور یوں آگے جھک گیا جیسے اسے سجدہ کر رہا ہو۔

"جی ڈاکٹر صاحب۔ وہ کہتی ہے وہ ہر رات ایک بچہ پیدا کرتی ہے۔ ساری رات اسے پال
پوس کر بڑا کرتی ہے اور صبح....." نرس ہکلاتے کہتے کہتے رک گئی۔ "صبح کیا" ناصر نے مضطرب ہو کر
پوچھا وہ وقتی طور پر ہی سہی مگر اس رات کے اپنے اضطراب کو بھول گیا تھا۔

"صبح..... جی۔ وہ کہتی ہے..... صبح قلعے کے جلاد اس کی قربانی دینے کے لیے اسے لے
جاتے ہیں۔"

"میرے خدا....." ناصر نے ایک ٹھنڈے لرزے سے کہا اور سوچنے لگا کہ یہ ایڈہائیڈ عورت
کے التباس اب کس قدر خونی اور پرتشدد ہوتے جا رہے ہیں مگر یہ سب کچھ کتنا مانوس ہے قلعے کا
جلاد۔ قربانی۔

زہرہ۔ کبیر۔ اسیر جان۔ ہاف مین۔ ناصر۔ پرانی مرسیڈیز جو رحم مادر کی طرح زہرہ کو سمیٹے
ہوئے ہے۔ گھونسلہ جسے آگ لگانے کی تیاریاں آخری مراحل میں ہیں۔ سفید شارک جیسی گاڑی
جس میں شارک کی انتڑیوں جیسی تمام غلاظت بھری ہے۔ سفید فام عورت کی خوشبو اور شراب کے
ابخروں اور چرس کے دھوئیں سے بھری خواب گاہ میں سفید مرد اپنی دیوانگی کے اظہار سے انسان اور
دنیا، رنگ اور نسل اور حاضر اور غائب کے پیچیدہ مسائل پر سامنے بیٹھے خیالی حاضرین کو لیکچر دینے لگتا
ہے مگر خیالی حاضرین کی تالیاں نہ سن کر انہیں گندی گالیاں دیتا ہے۔ عورت اپنی ذات کے مرد پر
دیوانگی کے آسیب اترتے دیکھتی ہے اور سوچتی ہے کہ اسے اس کے فلیٹ اور اس کے بستر تک
پہنچانے کے لیے اسے خان چوکیدار کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی جو اس وقت گیٹ کی ڈیوٹی پر نہیں
بلکہ پیچھے اپنے کوارٹر میں ہوگا اور اس کے کوارٹر میں سے لہسن، انسانی پسینے، سگریٹ اور تازہ وارنش کی بو
آ رہی ہوگی۔ پھر گرتے پڑتے ٹانگیں آگے پھیلائے بستر پر سیدھے بیٹھے ہاف مین کو پیچھے دھکا دیا اور
تقریر کرتا کرتا اس کا سر پیچھے تکیے پر گر گیا۔ اس نے اس کی پتلون کے دونوں پائنچوں کو الگ الگ
اٹھا کیا اور اس کے پاؤں کو پائنچوں میں سے نکال کر پتلون کو اس کی پیٹھ کی طرف کھینچ لے گئی۔
آرکیالوجسٹ کو زیر ناف بند کرنے کے بعد اس نے اس کے بازوؤں کو اوپر کھینچا اور اس کا دھڑ کسی
تھیلے کی طرح اوپر اٹھ آیا۔ پھر عورت نے اس کی قمیص کو بہت کوششوں سے اس کے جسم پر چڑھایا۔
کیونکہ جوش خطابت میں وہ مقرر ہاتھ ہلانے سے باز نہیں آتا تھا۔

"اور یہ جو غلام باغ۔ یہ کیا غلام باغ ہے کیا یہ غلام باغ ہے؟ بھلا اس باغ کیسے غلام ہو سکتا
ہے؟ نباتات کسی کی غلام نہیں ہوتیں۔ حیوان؟ حیوانات میں پالتو ہوتے ہیں غلام نہیں اور غلام
پالتو ہو سکتے ہیں؟ مگر پالتو غلام نہیں۔ یہ منطق کا مسئلہ ہے تمام غلام پالتو ہیں مگر باغ غلام نہیں ہو
سکتا۔ تو یہ جگہ متعین نہیں جگہ سے ہی ہر چیز کا تعین ہوتا ہے۔ اگر جگہ کا ہی تعین نہیں تو کھدائی کیسے ہو
گی۔ اگر کھدائی نہیں ہوگی تو آرکیالوجی کیسے ہوگی؟ غلام باغ کا معمہ۔ غلام کا معمہ اور باغ کا معمہ
نہیں ہے۔ جنم کنڈلی کا معمہ؟ خواتین و حضرات یہ معمہ مجھ پر کھل گیا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔

Scanned by CamScanner

اب چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خواتین و حضرات۔ آرکیالوجی سوسائٹی کے قابلِ عزت
ممبران۔ رائل انسٹیٹیوٹ آف آرکیالوجی کے فاضل ارکان۔ جمِ کمنڈر کے نیچے بھیانک تہہ خانے
میں کس چیز کی قربانی دی جاتی ہے۔ اس چیز کی۔ اس چیز کی۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ اس چیز کی۔"
مقرر اپنی پتلون کی زپ سے بھونڈے انداز میں اُلجھنے لگا۔ گرٹروڈ چیخی۔ "خبردار! اگر تم نے ایسا کیا۔
اگر تم نے ایسا کیا تو میں دوبارہ تمہیں پتلون پہنانے کے بجائے ننگا ہی باہر سڑک پر دھکیل دوں گی۔
پھر تم جانا اپنی اُس سماجی کتیا پر سوار ہو جانا۔" پھر اُس نے جھپٹ کر باف مین کو دھکا دے کر نیچے گرا
دیا۔ اُس کے منہ پر دو تین زبردست تھپڑ مارے اور پانی کا پورا بھرا جگ اُس کے سر پر انڈیل دیا۔
"بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میں ڈوب رہا ہوں۔" باف مین ڈکرایا۔ اور گرٹروڈ اُسے بچانے
کے لیے ہی چوکیدار کو بلانے چلی گئی۔

زہرہ نے اپنے بیڈروم اور آرام دہ بستر کا تصور ذہن میں جمایا اور گہری موت جیسی نیند کی
آرزو کی۔ سونا۔ سونا۔ نیند نیند۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ اُس نے گاڑی پر پاؤں سے زور ڈالا اور
گاڑی اُسے سمیٹے تیزی سے یاور ہاؤس کی طرف بھاگنے لگی۔ امبر جان یاور ہاؤس کے گیٹ پر پہنچا
تو اُسے وہی کچھ نظر آیا جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ آہنی گیٹ کھلا تھا اور ٹرک دوسرے پھیرے میں عطائی
کے کمرے کا آخری تنکا بھی سمیٹ کر نواب ثریا جاہ اور جنگ کی حویلی میں لے جانے والا تھا۔
نواب گیٹ میں آدھے اندر آدھے باہر کھڑے ٹرک کی کھڑکی کے ساتھ کھڑا ڈرائیور کو کوئی ہدایت
دے رہا تھا۔ "شیشے کے مرتبان بڑی احتیاط سے رکھنا۔ کوئی ٹوٹنے نہ پائے۔" "اچھا بزرگو"
ڈرائیور نے لاتعلقی سے کہا اور ٹرک آگے سرکا دیا۔ جب نواب نے دیکھا کہ ایک سفید گاڑی کی ہیڈ
لائٹس سیدھی اُس کی آنکھوں میں پڑ رہی ہیں اور وہ فوراً سمجھ گیا کہ یاور ہاؤس کا نیا مالک آ گیا
ہے۔ امبر جان نے گاڑی گیٹ میں کھڑے نواب کے اتنے قریب سے گذاری کہ اُسے بدک کر
پیچھے ہٹنا پڑا۔ امبر جان مزے سے ہنسا "اس بڈھے کو بھی پتہ نہیں کیا آگ لگی ہوئی ہے۔ کہیں
عطائی کے سارے تیلوں کی مالش کر بیٹھا یا نسخے اُلٹے سیدھے پھانک لیے تو پھڑک ہی نہ جائے۔
جب تک عطائی زندہ تھا تو وہ بڑا حساب کتاب رکھ کر چیز دیتا تھا کئی چکر لگواتا تھا۔ اکثر تو کچھ بھی
نہیں دیتا تھا بس تسلی دیتا تھا اور معاملہ سیٹ ہو جاتا تھا۔" وہ سب سوچتا سوچتا گاڑی کو اندر گھساتا
لے گیا۔ وہ سب پورچ میں سامنے ہی کھڑے تھے۔ سفید مولیوں جیسے بھاری پیڈ ٹھوں والے

عطائی کے بیٹے اور اُن کی ماں اور اُن کے سامنے کوئی بڈھا ملازم سا تھا جو کانپ کر ہاتھ جوڑتا
اور معافیاں مانگتا تھا۔

عطائی کی بیوہ نے ایک زبردست تھپڑ سراج کے منہ پر جڑ دیا۔ بوڑھا تھرا کر گرا اور پھر تیزی
سے اپنے پاؤں پر اُٹھ کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ سراج دین کے ذہن کا یہ جسمانی موازنہ کہ
ٹھنڈا تھپڑ سے زیادہ مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اُس وقت کی "سراج دین کائنات" کی سب سے
بڑی سچائی تھی۔ پھر بھی بیگم یاور عطائی نے اُس کی کمر پر ایک ٹھوکر لگائی اور کہا "حرامزادے تجھے۔
تجھے لگایا تھا اُس کنجری کی نگرانی پر کہ اس بات کی خبر دے کہ کن یاروں سے ملتی ہے اور تو تجھے اُس
کے ساتھ مل گیا۔ بول کتنے پیسے دیتی تھی وہ تجھے۔" کاشف نے اُکتا کر جمائی لی اور بڈھے کو پھر
اُٹھتے دیکھا پھر ویسی ہی اُکتاہٹ سے اُس نے سوچا کہ ماں یہ کیا فضول ہاتھ پاؤں تھکا رہی ہے۔
ہمیں سب پتہ چل تو جاتا تھا زہرہ کا اور یہ بھی پتہ تھا کہ یہ بڈھا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ لعنت بھیجیں
پھر وہ پریشان ہو گیا۔ اصل مرحلہ تو ابھی آنے والا ہے۔ زہرہ کے آنے پر...... فیصل جو کاشف جیسا
بھی تھا اور نہیں بھی تھا۔ اس نے سوچا کہ جب تک زہرہ آ نہیں جاتی یہ اچھا شغل ماں نے شروع کر
دیا۔ اُس نے ایسا کوئی منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بڈھا جب گرتا تھا اور پھر ہاتھ جوڑتا چیختا چلاتا
اُٹھ کھڑا ہوتا تھا تو فیصل کے اندر ایسی سنسنی کی لہر دوڑ جاتی تھی جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس
نہیں کی تھی اور اُس نوجوان کاروباری کی حیرت ویسی ہی تھی جیسے زندگی میں پہلی بار انسان اپنی
ناف کے زیریں حصوں میں انوکھی سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس کرتا ہے۔ حیران ہوتا ہے اور ہمیشہ کے
لیے بدل جاتا ہے۔ جب تک زہرہ آ نہیں جاتی۔ وقت گذارنے کے لیے یہ اچھا شغل ہے اُس
نے اپنے آپ سے مشورہ کیا۔ اُس کی ماں نے پھر بڈھے سے وہی سوال کیا "بول کتنے پیسے دیتی
تھی وہ تجھے؟" اور بڈھے کا جواب سُن کر فیصل کو ہنسی آ گئی۔ "پیسے نہیں دیتی تھی جی۔ چائے پلاتی
تھیں اور کیک اور کباب"۔ "اور ہم سے جو پیسے لیتا رہا۔" اچانک فیصل نے خود بھی کھیل میں شامل
ہوتے ہوئے کہا اور وہ چند لفظ بولنے میں اُسے ایسا مزہ آیا جو پہلے کچھ بھی بولنے میں اُسے کبھی نہیں
آیا تھا۔ پھر تو اُس نے اور بھی ہمت کی اور آگے بڑھ کر بڈھے پر ایک ہاتھ گھما دیا۔ اوچھا وار سراج
دین کی گردن پر پڑا۔ وہ گرا اور گرتے گرتے اُس کے جسم نے جوان وار اور بوڑھی عورت کی ضرب
کا فرق بتا دیا اور اسی لمحے اُس نے یہ اندازہ لگایا کہ قصور اُس کی پچ کا ہے۔ اُسے کچھ بھی اول فول

Scanned by CamScanner

بولتے رہنا چاہیے۔ بکتے رہنا چاہیے۔ اُس کی چُپ پر وہ مشتعل ہو جاتے ہیں اور بہت مارتے ہیں۔ "او۔ بول جو پیسے ہم سے لیتا رہا، اس کا کیا کرتا رہا۔" فیصل نے پوچھا اور اندر ہی اندر ہنسا اُسے اپنی آواز اجنبی لگی تھی اور اس بات پر بھی اُسے بہت لطف آیا تھا پھر اُس نے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ بڈھا فرفر بولنے لگا۔ اب امبر جان نے جو ابھی تک تماشائی بنا چپ تھا قہقہہ لگایا۔ اس غیر متوقع تفریح کا اُس نے سوچا بھی نہ تھا۔ عرصہ ہی ہو گیا تھا اس طرح کا تماشا اُس نے خود جمایا ہی نہ تھا۔ جو کبھی اُس کا مرغوب تماشا تھا۔ پھر اُس نے بھی حساب لگایا کہ عطائی کی بیٹی کے آنے تک اور بڑا تماشا شروع ہونے تک یہ اچھا تماشا ہے۔ وہ آگے بڑھ آیا اور کھیل میں اپنی شدت شامل کرنے کے لیے جیب سے پستول نکال لیا اور دائیں ہاتھ میں تھام کر بائیں سے کیرج کو پیچھے دھکیلا تو کلک کلک کی مزیدار آواز اُسے آئی۔ پھر اُس نے پستول کو بڈھے پر تان کر گرج دار آواز بناتے ہوئے پوچھا۔ "جواب دے جو صاحب پوچھتا ہے۔" سراج دین نے موت کے اس نئے اضافے کو دیکھا تو پہلے اُسے یہی محسوس ہوا کہ اُس کی ٹانگوں کے بیچ شلوار میں ایک نرم گرم سکون پھیل گیا ہے۔ اس بات کو جاننے میں اُسے کچھ وقت لگا کہ اُس کا پیشاب خطا ہو گیا ہے۔ شلوار کے کپڑے کا لمس ٹھنڈا ہو کر جب اُسے اپنی یہ حقیقت بتا رہا تھا۔ تو اُس وقت وہ بے تکان بول رہا تھا۔ "آپ کے پیسوں سے روٹی کھاتا رہا جی اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بی بی گھر سے نکلتی تھی اور میں پیچھے پیچھے رکشا کرا کے چل پڑتا تھا۔ مجھے پتہ ہی ہوتا تھا کہ بی بی نے کہاں جانا ہے۔ غلام باغ جو ہے نہیں جی بولتے ہیں جسے۔ وہاں جو چائے کا ڈھابہ ہے وہیں جاتی تھی۔ وہیں چاروں جاتے تھے۔" "چاروں کون" فیصل نے جاتے جاتے ہوئے بھی پوچھا اور بیگم عطائی اپنے بیٹے پر خوش ہوئی کہ وہ کتنی آسانی سے "نوکروں کی بھی کبھی باز پرس کرنی چاہیے۔ تاکہ دوسروں کو نصیحت ہو" کی بر موقع مہم میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر امبر جان کے پستول لے کر اُن کے گھریلو انتظامی معاملے میں شامل ہو جانے پر وہ ناخوش تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب خاموش ہی رہے گی۔ معاملہ مردوں میں آ گیا ہے ٹھیک ہے۔ یوں بھی امبر جان 'سب کچھ' جانتا ہے۔ شاید اُن سے زیادہ ہی جانتا ہے۔ کاشف تو ہے ہی خس۔ باقی جو فیصل بڈھے سراج سے کرتا ہے کرے۔ وہ دخل نہیں دے گی۔ ادھر بڈھا سراج 'چاروں کون ہیں؟' کا تفصیلی جواب دے رہا تھا۔ "ایک تو جی ڈاکٹر ہے پاگلوں کا۔ دوسرا کوئی اخبار میں لکھتا ہے۔ تیسرا گورا ہے جو غلام باغ کے وہ جی کھنڈر ڈھونڈ رہے ہیں وہ چیک کرنے

باہر کسی ملک سے آیا ہے۔" "ہوں۔ تو تیرے یار بن گئے وہ سارے؟" فیصل نے اپنے ذہن سے اس تصور کو نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اگر امبر جان بڈھے کو گولی مار دے تو وہ مرنے میں کتنی دیر لے گا۔ "غریب آدمی کا کوئی یار نہیں ہوتا جی۔ بس میں لالچ میں آ گیا جی۔ سردی بہت ہوتی تھی اتنی دیر اُدھر ٹھنڈی میز پر بیٹھنا ہوتا تھا۔ بار بار چائے پینے کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ پھر وہ خود ہی چائے بھیجنے لگے۔ باتوں میں لہو جم جاتا تھا جی۔ میں نے انکار نہ کیا۔ ساری رات اُن کی انگریزی میں باتیں سُننی ہوتی تھیں۔" "اچھا تو ساری رات اُدھر ہی گذارتے تھے" اچانک امبر جان نے پوچھا اور ماں بیٹے نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا کہ شاید اس طرح ہی وہ سمجھ جائے کہ بنیادی طور پر یہ اُس کا معاملہ نہیں، "نن۔ نہیں جی ساری رات نہیں جی۔ کبھی دو گھنٹے کبھی تین گھنٹے۔ ہاں ایک دفعہ ساری رات رہے تھے۔ پچھلی سردیوں میں۔ جب ہر طرف کئی کئی دن دُھند پڑی رہتی تھی جی اور وہ چاروں بھی دُھند پر بڑے اوازار تھے پھر جیسے اپنی اوازاری کا بھی چسکا لینے لگے۔ مجھے اُن کی بات سمجھ نہیں آتی تھی جی پر پھر بھی سمجھ آ ہی جاتی ہے۔ بی بی کی بات کی بھی سمجھ مجھے نہیں آتی تھی پر کچھ آ ہی جاتی تھی۔"

"اُسے تو خیر اب سمجھ آ جائے گی۔" بیگم یاور عطائی نے دل میں سوچا اور سوچتی رہی۔ پتہ نہیں حرامزادی کہاں مر گئی ہے۔ اب آ بھی مرے۔ یہ جگہ وہ کہتی تھی ادھر عطائی کا بھوت پھرتا ہے۔ کیا سچ سچ؟ اگر اس نے کوئی فساد کھڑا کر دیا تو پھر بس بھوت کی بات ہے۔ عطائی کا بھوت تو اُس کے اندر بھی ہے۔ اگر اُس نے آ کر کوئی آفت کھڑی کر دی تو کیا ہوگا اور اسی طرح کے بہت ڈھانے والے وسوسے بیوہ کے دل کو چھوٹا کرنے لگے۔ مگر پھر اُسے ہمت ہوئی۔ فیصل جس طرح اُس منحوس بڈھے کو سنبھال رہا ہے اسی طرح اُسے بھی سنبھال لے گا۔ مگر اُس کے دل کا ہول بڑھتا گیا اور اندر اس طرح کی دھک دھک ہونے لگی۔ ابھی آئی کہ ابھی آئی اور ہر بار وہ دور گیٹ کی طرف دیکھ لیتی۔

اُدھر سراج بولے چلا جا رہا تھا۔ "وہ بڑے عجیب سے بندے ہیں جی وہ چاروں...... نہ پتہ چلتا تھا شریف ہیں نہ پتہ چلتا تھا بدمعاش ہیں۔ کبھی پتہ چلتا تھا سو گئے ہیں کبھی پتہ چلتا تھا جاگ رہے ہیں، کبھی زندہ ہیں، کبھی مردہ ہیں، کبھی بی بی کے ہیں، کبھی بی بی کے نہیں ہیں، کبھی کچھ نہیں ہیں......" جب سراج کی کبھی کچھ ہیں کچھ نہیں ہیں، کی گردان نے زیادہ ہی طول کھینچ لیا تو فیصل نے زور سے کہا

Scanned by CamScanner

"دماغ چل گیا ہے ذلیل بڈھے کا" اور جواباً امیر جان نے قہقہہ لگایا۔ "ابھی ٹھیک کر لیتے ہیں" اُس نے کہا اور فائر کر دیا۔ دھماکے کی آواز سے سراج تڑپ کر سیدھا ہو گیا اور بے اختیار چیخنے لگا۔ "مار دیا۔ مار دیا۔ مار دی۔ گولی مار دی۔ مجھے گولی مار دی۔" "بکواس بند کر" امیر جان دھاڑا "ابھی نہیں ماری۔ پر آگے ضرور ماروں گا اگر تو نے بتایا نہیں ساری رات انہوں نے اس رات کیا کیا؟ بتا۔" اور سراج دین فوراً ہی آگے بولنے لگا جیسے کسی نے دوسرا سوئچ دبا دیا ہو۔ "چاروں اندر باورچی خانے میں جا بیٹھے۔ چولہے جلے ہوئے تھے۔ کافی گرم تھا۔ آرام تھا۔ مجھے آنے والے کمرے میں روٹی کھلا کر سُلا دیا اور آپ ساری رات کچن میں رہے۔ عاشق علی بیرو انہیں کھلاتا پلاتا رہا۔" امیر جان نے بے تحاشہ قہقہے لگائے اور پوچھنے لگا "اور وہ کیا کچھ کرتے رہے؟ کیا کچھ؟ سب بتا۔"

"پتہ نہیں جی" سراج نے کہا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے اندر سے کسی نے اُسے بتایا نہیں تجھے پتہ ہے سراج دین، بتا دے، جو وہ پوچھنا چاہتے ہیں بتا دے کہ...... ادھر امیر جان کی فائر جیسی آواز پھر اُبھری "بتا"

اور سراج دین ویسی ہی مستعدی سے بتانے لگا۔ "پھر انہوں نے......" مگر یک دم اُس کی مستعدی میں رکاوٹ آ گئی۔

اور یاور عطائی کی بیوہ اور قریب ہو گئی اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ بھی اُس کے قریب رینگ گیا۔ ایک احساس تھا کہ اب اصل بات سامنے آنے والی ہے اور سراج دین نے ایسا کہنا شروع کیا جیسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھ رہا ہو۔ بیگم یاور کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اُس نے اپنے برسوں کے یقین کو اپنے کانوں سے سُن لیا تھا۔ "مجھے یقین تھا اُس عورت کے بارے میں بھی ایسا ہی ضرور سننا پڑے گا۔ سُن لیا۔" ادھر امیر جان پاگل ہو رہا تھا "اور بتا اور بتا۔" "سراج دین بولتا رہا۔" عاشق علی بیرو جی پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور توبہ توبہ کرنے لگا۔" "اور میں یہ نہیں پوچھتا۔" امیر جان دھاڑا اور قریب تھا کہ سراج دین پر گولی چلا دیتا کہ اچانک فیصل کی غیرت مندی کا نیا نویلا احساس تھا یا بہن کی بدکاری کا سُن کر کچھ ملا جُلا مگر بر محل ردِ عمل ظاہر کرنے کا ولولہ تھا اُس نے آگے بڑھ کر ایک زنّاٹے دار تھپڑ سراج کے منہ پر مارا اور اُس کے زمین پر گر جانے کے بعد بولا "بکواس کرتا ہے حرامزادہ۔ بکواس کرتا ہے" اور پھر تیزی اور تواتر سے اور شدت سے اپنے آکسفورڈ بوٹ سے اُس کے جسم پر ٹھڈے مارنے لگا۔ تب دور کھڑے کاشف نے جمائی لی۔ اپنی

بیٹے کو تسلیم کیا اور اُونگھتے ہوئے سوچا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ کیوں وحشی ہو رہے ہیں۔ چھوڑیں اِس بڈھے کی جان...... مگر یہ زہرہ پتہ نہیں کب آئے گی۔ آئے اور یہ معاملہ ختم ہو۔ سب جا کر سوئیں۔ ٹھڈوں کی اذیت اور درد سے پھٹتے جسم کے ساتھ سراج دین کو پھر بھی خیال آیا، ہو سکتا ہے، اُس رات کا میرا یہ جھوٹا بیان ابھی بھی ان لوگوں کے لیے ناکافی ہو۔ پھر اُس نے اپنے بہتے ہوئے تخیل کو فرضی واقعات کے بیان کے لیے ننگی بازاری زبان دے دی۔ امیر جان اپنی زندگی کے عروج کے لمحات پر پہنچ گیا اور گہرا کہیں اندر سے اُٹھ کر بیگم یاور عطائی تک یہ خیال آیا۔ یہ بھی مجھے یقین تھا اس عورت کا میں یہاں تک بھی سنوں گی۔ ایسا بھی سنوں گی۔ صرف وہی ہے جو اُس کے چلن سے عطائی کی ہے۔

اس لمحے نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے فیصلہ کیا کہ اب اُسے فی الفور مداخلت کرنی چاہیے۔ ان لوگوں کو شاید علم نہیں کہ اس طرح یہ بڈھا مر بھی سکتا ہے اور اگر مر گیا تو اچھی خاصی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور فیصل کو مخاطب کر کے زور سے بولا...... "نہ کرو...... نہ کرو...... نہ...... نہیں...... بس...... نہ کرو......"

زہرہ کی گاڑی دوسری بار لہرا کر سڑک سے اُتری مگر اُس کے کہیں ٹکرا جانے سے پہلے ہی وہ پھر نیند کے جھونکے سے واپس آ گئی اور سوچنے لگی ایسی مفلوج کر دینے والی نیند اُسے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ کیا کرے؟ خواہش نے کہا کہ وہ کسی طرح کبیر کے گھونسلے میں پہنچ جائے اور وہیں سو جائے۔ پھر اُسے کبیر کی بات یاد آ گئی ایک بار اُس نے گھونسلے میں سونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تو اُس نے کہا تھا "ابھی انڈے بچے نکالنے کا موسم نہیں آیا۔" وہ ہنس پڑی اور گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ اُتر آئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی کہ یہاں دنیا میں ایسا کچھ کیا ہو سکتا ہے جو اُس کی بیداری کو قائم رکھنے میں اُس کی مدد کر سکتا ہے۔ اُسے ایک پٹرول پمپ نظر آیا اور وہ وہاں پہنچ گئی۔ ایک طرف گاڑیاں دھونے والوں کا پانی کا اونچا پائپ تھا۔ شیشے کے کیبن میں اُونگھتے تین سخت مرد ملازم آدھی رات میں جوان تنہا عورت دیکھ کر تڑپ کر اٹھ کر باہر نکل آئے۔ اُن کے سامنے ہی زہرہ نے اپنے سر پر پانی کا نل کھولا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر مرد جسموں کی زبان سے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس پاگل عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے اندر ڈال لیں گے اور باقی ساری رات اُسے ذہن کر رکھ دیں گے۔ مگر وہ ایسا کچھ بھی نہ کر سکے۔ عورت پانی میں

Scanned by CamScanner

شہرِ لاہوران کے قریب سے گزر کر گاڑی میں جا بیٹھی اور گاڑی نکل گئی۔ (برس ہا برس تک اُن تینوں کو
اُس پاگل عورت کا شہوت انگیز خواب آتا رہا اور جو ہو سکتا تھا مگر نہ ہوا وہ گرم لوہے کی سلاخ کی
طرح انہیں داغتا اور درد دیتا رہا۔) زہرہ نے جب جھٹکے ہوئے سر کے ساتھ اور کھلی آنکھوں کے
ساتھ اپنی گاڑی یاور ہاؤس کی طرف بھگا دی تو اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ جھٹکے ہوئے سر اور جسم کے
ساتھ ہاف مین آسٹریلوی محبوبہ کی گاڑی میں خان چوکیدار کی گود میں سر رکھے خود زہرہ کو خواب میں
برہنہ دیکھ رہا تھا اور آسٹریلوی محبوبہ اُسے اُس کے فلیٹ تک پہنچانے والی تھی۔

کبیر نے نیلے رجسٹر کی آخری لائنوں کا آخری سفر طے کرنا شروع کر دیا اور مختصر نویسی نے
لکھا...... "میں اب تھوڑی دیر بعد عطائی کی الماری سے نکلے 'گنجینۂ نشاط' سے فیض یاب ہونا شروع
کروں گا۔ اُس وقت تک کہ جب تک نیند مجھے نہیں آ لیتی اور یہ خاتمہ ہے۔ ایک طویل نثری مشق کا
اور لا لکھائی کا اور ایک زمانے کا۔ اختتام۔" "اختتام" وہ آخری لفظ تھا جسے کبیر نے نیلے رجسٹر کی
آخری لائنوں اور جلد کی درمیانی سلوٹ میں گھسا دیا اور مزید لکھائی کے امکان کو محال ثابت کر دیا
اُس نے رجسٹر بند کیا۔ پھر کھولا اور آغاز اور انجام کو گتے کی جلد کی معتبر حدود میں قائم و دائم دیکھ کر
ایک لمحے کے لیے تکمیل کا بے پایاں احساس اُس پر حاوی ہوا پھر اُس احساس کے اندر چہلیں
کرتے عظیم الشان ادھورے پن اور ازلی نا آسودگی میں سے اپنے آپ سے کامیاب عملی مذاق کا
قہقہہ پھوٹ پڑا اور وہ دیر تک ہنستا رہا۔

تنہائی میں بیٹھ کر اپنے آپ ہنسنے والوں کی اولین شناخت کہ ہمیشہ سے ناظر کے لیے
دیوانگی رہی ہے۔ گھونسلے کے باہر آگ لگانے والوں میں سے ایک نے جو دوسرے کے کندھوں
پر کھڑا اور روشن دان کی راہ سے اندر جھانک رہا تھا کمرے کے مکین کو دیوانہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ
لگائی۔ وہ روشن دان سے منہ ہٹا کر دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے بیٹھا پھر دوسرے کے کندھے پر ہاتھ
جما کر پیچھے کو اچھل گیا اور اُسے بھی واپس کونے میں لے گیا تھا تا کہ تینوں مل کر اس نئی صورت حال
کو سمجھ سکیں اور فیصلہ کر سکیں کہ انہیں کیا کرنا ہے انہیں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ پاگل کو آگ لگانی
ہے۔ وہ...... تو پاگل ہے۔ ٹھیک بتا رہا ہوں۔ کوئی کاپی سی دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے ماں کا...... یہ
پاگل تو مجھے سو نظر نہیں آتا کل دوپہر تک میری مانو تو ڈائریکٹ کارروائی کرو مگر پہلے نے جرأت
پھر انگاری کی گلی میں پہتا رہا تھا سوچا کہ دونوں ابھی آئے ہیں اور خالف کام دکھا کر بھاگنے کے چکر

میں ہیں۔ رقم تینوں کو برابر کی ملی ہے انہیں بھی ذرا اپنا خون جلانا چاہیے اس نے گمبھیر معاملہ فہمی کے
لہجے میں کہا "دیکھو تھوڑی دیر اور دیکھ لو سو جائے گا۔ پاگل جب سونے پر آتے ہیں تو ایک دم سو
جاتے ہیں جیسے بچے۔ ایسے جلدی میں کام خراب ہو گیا تو رقم تو خیر...... لگے گی ہی ہمارے اپنے قابو
آنے کا خطرہ ہے اور قابو آنے پر اس طرح کے کام کروانے والے یہ ہی صاف کروا دیتے ہیں یہ
کوئی عام شام معاملہ نہیں لگتا کہ بندہ دکھایا۔ ٹھیک ہے جی کام ہو جائے گا اور ٹھاہ۔ بس کام ہو گیا۔
رقم اپنی جیب میں ڈالی۔ چل میرے بھائی۔ یہ کوئی لمبا ہی بڑا عجیب معاملہ لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ
صرف اُس بندے کا معاملہ نہیں جو اندر ہے بلکہ ساتھ سب جو مال گودام ہے اس کا بھی معاملہ ہے تم
نے سنا نہیں تھا دو بار سیٹھ نے کہا تھا سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے۔ کچھ باقی نہیں بچنا چاہیے۔ سب
کچھ برابر کرنا ہے ساتھ اس کے مجھے تو یہ پٹرول بھی تھوڑا لگتا ہے جو تم لائے ہو۔ چلو۔ پر یہ کوئی اور
ہی چکر ہے اور یہ جو تم نے دیکھا ہے کہ پاگل ہنس رہا ہے تو یہ تو اور بھی سخت چکر کی بات ہے۔ یہ کوئی
بڑی شے ہے جو اندر بیٹھی ہے کیا پتہ اصل میں کوئی جاسوس ہو کوئی سیاسی ہو۔ کوئی سرکار کا دشمن ہو۔
ہاں...... ہاں سیٹھ بھی مجھے سامنے کا بندہ لگتا ہے۔ پیچھے کوئی اور ہیں۔ کون ہیں؟ کون کون ہیں؟ کیا
پتہ۔ اتنی رقم بھی کسی نے دی ہے۔ ہاں آدھی ملی ہے۔ باقی کام کر دو گے تو باقی آدھی ملے گی نہیں تو
آدھی کے ساتھ پوری جان بھی جائے گی۔ یہ کام اگر پکا نہ ہوا تو بچو گے نہیں۔ یہ میں بتا دوں۔
اوچھا وار نہیں ہونا چاہیے۔ احتیاط کرو۔ کچھ دیر اور دیکھ لو۔ سو جائے گا۔ تیر سو ہی جائے گا۔"

اور کبیر آخر سو ہی گیا۔ نیند کے سامنے بالکل بے بس ہونے سے پہلے اُس نے "گنجینۂ
نشاط" کا مخطوطہ بستر کے ساتھ پڑے سٹول پر پادری میکلائز کے اعترافات کے اوپر رکھا اور پھر
اُس کے اوپر اپنی لا لکھائی کا پلندہ نیلا رجسٹر اُٹھا کر رکھا اور پھر وہ بتی بھی گل نہ کر سکا اور گہری نیند سو
گیا۔ نیند دنیا پر کسی بھاری اور گاڑھے سیال کی طرح اُترتی جا رہی تھی اور جسے زہرہ تھوڑی دیر کے
لیے اپنے سر پر سے اُتار کر پھر اپنے اوپر گرا لینے کے لیے یاور ہاؤس میں اپنی خواب گاہ کی طرف
بھاگ رہی تھی اور اس کی پرانی مرسیڈیز اور یاور عطائی کے گھر کے درمیان فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا اور
اسی وقت نشے کی مدہوشی اور نیند کی بے ہوشی کے درمیان بے سدھ ہاف مین کو خان چوکیدار نے
کسی رول کیے ہوئے قالین کی طرح اُس کے بستر پر لڑھکا دیا تھا۔ جرمن آرکیالوجسٹ بستر پر
پشت کے بل ہوا تو اُس نے دونوں بازو چوپٹ دائیں بائیں گرائے اُس کی آنکھیں چند لمحوں

Scanned by CamScanner

کے لیے کھلیں اور اپنی بچپن کی علاقائی جرمن میں بولا..... ''زہرہ زہرہ میں اپنے مقدس عضو کو تمہارے لیے قربانی کے لیے پیش کرتا ہوں۔ آؤ جہنم کھنڈر میں آؤ اور میری مردانگی کی آخری رسومات ادا کرو۔'' گرز یوڈ جرمن زبان سمجھنے سے قاصر تھی مگر زہرہ کا نام اُس نے خوب پہچان لیا۔
''کم ان۔ لیٹ اس گو خان۔ کہتے وقت اُس نے اپنے آپ سے کہا۔'' کسی وقت میں اس کتیا کو دیکھنا ضرور چاہوں گی۔''

یوں اگر کسی معجزانہ انداز میں وہ عین اُسی وقت یادر ہاؤس کے گیٹ کے سامنے پہنچ جاتی تو وہ اُس 'کتیا' کو دیکھ لیتی۔ اگر وہ اس پرانی کار میں جھانک لیتی تو اُس عورت کو دیکھ لیتی جو اُس کے خیال کے مطابق یقیناً مردوں کے سب رس چوس جانے والی کوئی ازلی شیطانی مخلوق تھی۔ زہرہ جب سڑک کے اس مخصوص مقام پر پہنچی جہاں سے وہ یادر ہاؤس کے گیٹ کی طرف گاڑی گھمایا کرتی تھی تو اُس کا پہلا احساس اجنبیت اور کچھ بہت غلط ہو جانے کا احساس تھا۔ رات کے اس پہر چوپٹ کھلے گیٹ کا نظارہ انجانے حوادث کا منحوس پیامبر تھا۔ زہرہ کا جسم اور ذہن دونوں چشم زدن میں مکمل خطرہ بنے ہوئے مستقبل کی نیستی کا سامنا کرنے کے لیے بیدار ہو گئے۔ گاڑی روکنے کچھ سوچنے۔ اندازہ لگانے۔ جانچنے بھانپنے کی جیسی احتیاطی رکاوٹوں کو نظرانداز کرتی وہ گاڑی کو گیٹ میں سے تیزی سے گذارتی ڈرائیووے پر دوڑاتی سیدھی اُس جگہ تک لے گئی جہاں وہ سب کھڑے تھے اور کچھ ہی فاصلے پر سراج دین زمین پر گرا تھا اور اُس کے منہ سے خون آلود رال بہہ کر ایک چھوٹے سے دائرے کی شکل میں یادر ہاؤس کی زمین میں جذب ہو رہی تھی۔

تیز رفتار گاڑی کے یک دم رُکنے کا دھچکا اُن سب نے محسوس کیا۔ دل ہی دل میں وہ جانتے تھے کہ جب وہ آئے گی تو ہر ایک کے لیے کوئی گہرا دھچکا لائے گی اور شاید اُس صدمے اور دھچکے کے مستقبل کی ڈانواں ڈول کرنے والی نیستی تھی اور اُس سے بچنے کی خواہش تھی مگر بچ نہ پانے کی اُن کی سخت جھنجھلاہٹ تھی جو سراج دین کے جسم پر عذاب بن کر ٹوٹی تھی۔ اب جب کہ وہ آ گئی تھی تو وہ ہارے ہوئے مجرم بنے کبھی زہرہ کو اور کبھی اُس کچلے ہوئے جسم کو دیکھتے تھے جس کی نبض بوڑھا نواب ٹٹول رہا تھا اور دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ وہ بدبخت نہ مرے ورنہ قتل کے الزام میں وہ بھی دھر لیا جائے گا۔ اس کی بزرگانہ مخیلہ نے اُسے جیل میں ناقابلِ برداشت صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے دکھا بھی دیا تھا۔ زہرہ کے لیے رات کے پچھلے پہر یادر ہاؤس میں ان سب کی موجودگی اور ان سب

میں اُس پھولے ہوئے گوشت اور چربیلی آنکھوں والے امیر جان کی موجودگی ایک ایسی ابھری تشکیل تھی جو پہلے سے ہی کہیں زہرہ کے ذہن میں خدشات کی سرزمین کا حصہ تھی۔ سوائے سراج دین اور زمین پر اُس کے آڑے ترچھے پڑے جسم کے باقی سب کچھ ایک قابلِ فہم اور متوقع نظارہ تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہوگا۔ مگر اور کچھ بھی کہنے کرنے کی بجائے وہ اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اور سب کچھ بھول کر روتی ہوئی سیدھی سراج دین کے قریب گئی اور کہا ''اسے کیا ہوا ہے؟''

''یہ ملازم..... ہمارا..... ہاں..... سزا اسے..... ملے..... نافرمان..... کو سزا ملے گی۔'' فیصل نے اُسی زبان میں کہا جو پون گھنٹہ پہلے جب وہ ایک باغیرت بھائی کے طور پر پیدا ہوا تھا۔ خوب رواں ہو گئی تھی مگر اب جیسے وہ وقتی طلسم تھا جو ہوا ہو گیا تھا اور اب وہ وہی سیدھا سادھا کاروبار کرنے والا نوجوان تھا جسے کسی بھی چیز سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اور جو اپنے آپ کو اچانک ایک ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین صورت حال میں پا کر سخت پریشان تھا۔ بوڑھا نواب ثریا جاہ نادر جنگ ہراساں ہو کر بولا اور اُس کا مخاطب زہرہ تھی گو ایسا اُس نے جتایا نہیں تھا۔ ''یہ زخمی ہے۔ ہسپتال پہنچانا..... فوراً..... چاہیے..... جان جانے..... خطرہ..... کا جانے..... کا ہے.....'' تب کاشف نے جو صلح جو اور بلغمی مزاج کا تھا سوچا یہ کیا اب بھی وقت کی بربادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اب بھی اصل بات پر نہیں آتے۔ پھر وہ معاملہ فہمی کے انداز میں آگے بڑھا اور ایسے ہی ہلکا سا کھانسا تو بلغم ٹوٹ کر اس کے حلق میں آ گئی۔ جسے وہ ادھر اُدھر تھوکنے کا موقعہ نہ پا کر واپس نگل گیا۔ پھر اُس نے جیب میں سے عدالتی ڈگری کی ایک نقل نکالی اور اُسے زہرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمھیں یہ بتانا تھا کہ یہ عمارت امیر جان صاحب کے پاس فروخت ہو چکی ہے۔ بہن تمہارا کلیم خارج ہو چکا ہے۔ عدالت نے دو تین دن پہلے فیصلہ دے دیا تھا۔ تمہارا وکیل پیشیوں پر حاضر نہیں ہوتا رہا اس لیے عدالت نے یک طرفہ فیصلہ دے دیا۔'' زہرہ نے اضطرابی کیفیت میں بس اتنا کہا ''مگر وہ تو مجھے بتاتا رہا کہ وہ ہر دفعہ حاضر ہوتا رہا اور ہم مقدمہ جیتنے والے.....'' پھر وہ یک دم خاموش ہو گئی کہ یہ سب تو ان سب سے کہنے کا نہیں اور وہ بالکل سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہوگا۔ دُنیا کی ہر چیز اور ہر شخص کی طرح اس کا وکیل بھی بک گیا۔ اُس کے ساتھ دھوکہ کرتا رہا اور در پردہ اُن کے ساتھ مل گیا۔ نفرت سے زہرہ کے ہونٹ سکڑ گئے اور وہ پھر کہنے سے رہ نہ سکی۔

''تو وہ کتا اور پردہ تمہارے ساتھ ملا ہوا تھا۔'' ''ہاں جیسے یہ..... کتا..... کتا..... کتا.....'' بیگم یادر

Scanned by CamScanner

علائی نے قہقہہ لگاتے ہوئے بلند آواز کے ساتھ سراج دین کی طرف اشارے کرتے ہوئے
کچھ کہنا چاہا، مگر عورت کے اندر سے کسی پوشیدہ ٹرنک میں سے علائی کی دوائیوں کی مہک میں پھندہ
ڈالنے والی خوشبوؤں کے تھپڑوں سے اس کو گرائی اور وہ دہشت زدہ ہو کر اس جگہ کو چاروں اور پیچھے
گئی جہاں اس نے ایک عذاب عمر گزاری تھی۔

کاشف پھر آگے بڑھا اور بولنے لگا۔ "ہم پاپا کا سامان شفٹ کر رہے تھے۔ تیسرے
پھیرے کے لیے ٹرک آنے والا ہے تم بھی بس اپنا سارا سامان نکلوا لو اپنی نگرانی میں پارک لین
میں گھر کا سارا پچھلا پورشن تمہارے لیے سیٹ کرا دیا ہے۔ جہاں تم جیسے چاہو رہو۔" دل میں اس
نے اپنے آپ سے کہا مجھے کچھ غرض نہیں کیسے رہو۔ مگر اس گھر میں ——— "اس گھر کے ساتھ کیسی" یہ
گھر اب امیر جان صاحب کا ہے" اس نے کہا۔ امیر جان جو اس سارے عرصے میں غور سے زہرہ
کے تیکھے بالوں اور بیاہی کو دیکھ رہا تھا۔ تخت حیران تھا کہ یہ عورت جب غلام باغ سے نکلی تھی تو
سوکھی صاف ستھری تھی اور پیچھے پیچھے اس کی گاڑی کے آنے کی ہوگی یہ اب اچانک اتنی بھیگی کیسے ہو کر
کہاں سے آ گئی ہے۔ کیسے آئی ہے۔ کاشف کی کھوں کھوں کرتی آواز تو وہ جیسے سن ہی نہیں رہا تھا
اس کے ذہن میں تیکھے اور بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ رات کے پچھلے پہر اپنی گاڑی سے نکلنے
والی عورت تھی جب کہ آسمان سے کوئی بارش بھی نہیں برس رہی تھی۔ وہ ضرور کہیں اور بھی گئی تھی پھر
وہ عورت اپنے ریشمی تیکھے جسموں کے ساتھ زندہ موت اختلاط سے اترتے قطروں میں شرابور ہو
کر کھوں میں آئی تھی اور پھر وہیں بھیگی جاتی تھی اس ایڑیاں رگڑتے بڑھتے کے پاس۔ امیر جان
اپنے اسی ٹھگی پچھانی بھولا ذہن تو تھا مگر اس کی سماعت سفید موٹی جیسے جسم والے کاشف کی آواز سے کسی
مخصوص فقرے کا اشارہ لینے کی ضرور منتظر تھی۔ کہ جب وہ فقرہ آئے گا تو پھر امیر جان بولے گا اور
وہ فقرہ آ گیا "یہ گھر اب امیر جان صاحب کا ہے اور وہی اس کے مالک ہیں۔" امیر جان اپنے پیچھے
سے تیار کردہ جملہ سامنے لے آیا۔ "تمہیں تو یہ گھر اب بھی ان کا ہی ہے ———" اس نے زہرہ کی
طرف دیکھ کر کہا جو نواب کو دیکھے جا رہی ہے سراج دین کا منہ اپنے رومال سے صاف کر رہی تھی۔ اس
نے آوازوں کی گچھم گچھا میں کہا "یہ گھر اب بھی ان کا ہی ہے زہرہ صاحبہ کا۔ میں نے بیگم
صاحب سے التجا کی ہے کہ مجھے قبول کریں ———" اک دم سراج دین کے دھڑ کو جھٹکا سا لگا اور
پیلے رنگ کا موادا اچھل کر نواب کے منہ پر جا گرا اور زہرہ نے اسی لمحے جان لیا کہ ایک لمحہ بھی اور

وہاں گزارہ اس کمزور بڈھے زخمی شخص کی موت کو یقینی بنا دے گا۔ میدان جنگ میں شکست کے بعد
زخمی ساتھی کو اٹھا کر بھاگنے والے سپاہی کی طرح اس نے ایک ہی جست میں گاڑی کے دروازے
کے ہینڈل کو دبا کر مشکل سے دروازہ کھولا اور سراج دین کو پچھلی سیٹ پر آہستگی سے بچھا دیا۔ دروازہ
بند کر کے وہ واپس مڑی تو نواب ثریا جاہ اور بیگ نے دبی دبی معاملہ فہم مددگاری کے ساتھ
آگے بڑھتے ہوئے موہوم سا مشورہ دیا۔ "ایمرجنسی میں جانا ——— صاحب ——— حالت
جلدی ——— حالت ٹھیک نہیں۔" اور زہرہ کا بازو ایک بے اختیار دہشت میں اس پر گھوم گیا۔ اور وہ
ضرب اتنی شدید تھی کہ ایک ہی لمحے میں نواب کے ناک کی ہڈی ترخ گئی۔ مصنوعی بتیسی ٹوٹ کر
نیچے اسی جگہ گری جہاں سراج دین کا تھوک مٹی پر پڑا تھا۔ نرم سرمگیں گال کا گوشت پھٹ گیا۔ گول فریم
کی پلاسٹک کی عینک کا ہلکا سبز شیشہ ٹوٹ کر بائیں پپوٹے میں گہرا شگاف ڈال گیا۔ مگر اندر والی
آنکھ محفوظ رہی۔ بعد میں معالجوں نے نواب کو بتایا کہ اس "ٹریفک ایکسیڈنٹ" میں اس کا سر اتنی
تیزی اور شدت سے گھوما ہے کہ اس کی گردن کے مہروں کو نقصان پہنچ گیا ہے اور اس نقصان کی
حفاظت نواب کو شاید تاحیات گردن کے گرد لپٹے سخت کالر کے طوق کے ساتھ کرنی ہوگی۔

ان سب کی عمل بے اختیاری سے بھری اور ناقابل یقین سے انکار کرتی نظروں کے سامنے
زہرہ نے اپنی غراتی ہوئی آواز میں ٹاٹا کی گاڑی کو گھمایا اور سوچ لیا کہ وہ سیدھی ناصر کے ہسپتال جائے
گی۔ وہ تیزی سے گیٹ پار کرنے لگی تو وہ ٹرک اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو تیسرے پھیرے میں
زہرہ کے کمرے کا سامان لاد کر لے جانے کے لیے آیا تھا۔ دونوں سفید موٹیوں جیسے جوان مردوں
کی رنگت پیلی ہو گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس رات میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ مگر اتنا تو انہیں۔ اس
جیسا نہیں۔ یہ خیال انہیں خوفناک انداز میں دہلا رہا تھا۔ نواب کی سفید شلوار قمیص اور سفید اچکن
پر سرخ خون کے دھبے نمایاں ہو رہے تھے۔ نواب اسی جگہ اور اسی انداز میں گرا تھا جہاں سراج دین
گرا تھا اور بیگم یاور کو ایسا لگا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ تراحرا سراج دین ویسے کا ویسے پڑا ہے اور
زہرہ نے ابھی آنا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوا ——— سفید چولہ والے جوان مرد نیچے جھک کر نواب کو زمین پر
سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے تو ان کی بھاری آنکھیں امیر جان کی جانب اٹھ گئیں اور اچانک
امیر جان کے اندر کئی پرانے ارتعاش دوڑ گئے۔ جنہیں سفید اچکن پر سرخ پھول جیسے بکھیرتا نواب
کا خون اور بھی تیز کر رہا تھا۔ تب اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں تو کب کا تھما ہوا

Scanned by CamScanner

پستول ہے۔ جسے اس نے کھیل میں شامل ہونے کے لیے نکالا تھا۔ اُس ٹھنڈے لوہے کی آگ اس اُس کے بازو کو بے اختیار کر کے اوپر فضا میں لے گئی اور گولیوں کے دھماکے یا ہاؤس کی گذرتی رات میں گونجنے لگے جیسے کسی بڑی تقریب کے اختتام کی رسوم ادا کی جا رہی ہوں اور ڈرائیور اور کنڈکٹر نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی اُس سب سے حیرت انگیز رات کا ایک اور انوکھا رنگ دیکھا۔ وہ سارا راستہ بحث کرتے آئے تھے کہ شیشے کے ان روغنوں مرتبانوں میں کیا تھا۔ اگر بوتلیاں رنگین دوائیوں جیسی تھیں تو پھر مرتبانوں میں وہ ڈھیر سارے لکھے ہوئے کاغذ کیوں ٹھسائے ہوئے تھے اور اُن کاغذوں پر کیا لکھا تھا اور اب وہ یہ بحث شروع کرنے ہی والے تھے کہ وہ کون تھی جو ان کے ٹرک کو ٹکر مارتے مارتے بچی تھی اور پاگلوں کی طرح کار چلاتی ہوا ہو گئی تھی، اور ابھی کنڈکٹر نے جسے بولنی تھا کہ بڑے لوگوں کی کوٹھیوں میں کئی سال کام کر چکا ہے اور بڑے بڑے تماشے دیکھ چکا ہے ایسے کہ کوئی نئے تو اعتبار نہ کرے۔ وہ جہاں دیدہ شخص ابھی بیان دینے ہی والا تھا کہ "پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑانے والی ضرور ان تینوں امیر شکلوں کے مردوں میں سے کسی ایک کی بیوی ہوگی" کہ گولیاں چلنے لگیں۔ پھر جب انہوں نے زمین پر گرے ہوئے نواب کو دیکھا تو "خون ہو گیا ہے" "قتل کر دیا" زنانے دار خیال ان کے اوپر سے گذر گیا۔ پھر گواہی، عدالت، تھانے، کچہری کے اندیشے انہیں پریشان کرنے لگے۔ پھر یہ تذبذب اُٹھا کہ بھاگ جائیں یا رہ جائیں۔ بھاگ جانے کے خیال کو فوری مسترد کرتے ہوئے جہاں دیدہ کنڈکٹر نے کہا "بڑے گھروں میں قتل کی واردات ہو جائے تو ملازم پیشہ لوگوں کو ڈر کر بھاگ نہیں جانا چاہیے کیونکہ اس طرح اُن کے پکڑے جانے اور بے گناہ پھانسی چڑھ جانے کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ بالآخر ان بقیہ ہزار روپوں نے اُن کے قدم روک ہی لیے جو انہیں تین پھیرے مکمل کرنے پر ملنے تھے اور جن میں سے تیسرے پھیرے کے بارے میں وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس میں اُسی عورت کے کمرے کا سامان ڈھویا جائے گا جو کچھ دیر پہلے پاگلوں کی طرح بھاگی تھی۔

"کمرے کی بتی جلتے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کمرے کے اندر رہنے والا ابھی تک سویا نہیں۔" یہ وہ دل خراب کرنے والی تفہیم تھی جو آتش زنی کے لیے آنے والوں کو قائم کرنا پڑی جب رات اُس نقطے پر پہنچ گئی تھی کہ جہاں وہ کسی لمحے بھی سب کچھ چھپا لینے والی اپنی مہربان ظلمت سے محروم ہو سکتی تھی۔ دوسرے نے کہا "استاد ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں، اور اگر کبھی نہیں تو سمجھ لے

مارے گئے۔ ایڈوانس تو واپس جو سو کرنا ہی پڑے گا۔ پر جو ذلیل خوار ہوں گے دھندے میں۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" تیسرے نے دل میں سوچا لعنت بھیجو منہ دکھانے پر۔ ہمارے منہ تو دنیا ایک ہی بار دیکھتی ہے۔ میں وہ حصہ ایڈوانس کا جو مجھے ملا ہے میں تو وہ واپس نہیں کر سکتا۔ چھوٹے بیٹے کی انگلش میڈیم سکول کے سارے ٹیشن کی پوری فیس ادا کر دی ہے۔ وہ تو واپس نہیں ہو سکتی۔ کسی دیسی سکول میں داخل ہوتا پھر تو........ پر میری اولاد ہی کیوں پیچھے رہے۔ یہ کام تو ہر حال میں پورا ہونا ہی چاہیے۔ ایسے ہی خواہ مخواہ اتنی دیر کرا دی انتظار کرا کرا کے۔ 'ابھی نہیں تو کبھی نہیں' کی افراتفری کی زمانیت نے اُن تینوں کے اندر اپنے اپنے خدشوں کی چھریاں چلا دیں اور تیسرا تو اولاد کی تعلیم اور مستقبل کی خاطر زبردست مستعد ہو گیا۔ وہ فوری طور پر روشندان کے نیچے جا کھڑا ہوا اور دوسرے نے اُس کے کندھے کے اوپر کھڑے ہو کر روشندان سے اندر جھانکا اور فوراً ہی گندی گالیاں دیتا نیچے اُتر آیا" وہ..... تو کب کا سویا مرا پڑا ہے۔" پھر وہ تینوں بھنائی ہوئی بھونتیوں کی طرح اُس کام میں جُت گئے جس کام کے لیے وہ آئے تھے۔

سراج دین کی حالت دیکھتے ہی ناصر نے یہ فیصلہ کر لیا کہ "یہ کیا ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا" جیسے سوال وہ ذرا دیر سے بعد میں کرے گا۔ پہلا کام اُس شخص کی جان بچانا ہے جسے اُس کے ذاتی خیال کے مطابق پتے پر چوٹ آئی تھی۔ رفیق کار ڈاکٹر کی کیس میں ذاتی دلچسپی پر ایمرجنسی کے لوگ اس کیس کو موت کے سفر سے واپس لانے میں مستعدی سے مصروف ہو گئے، ویسی ہی مستعدی سے کسی اور ایمرجنسی کے لوگ ایک اور کیس کو موت کے سفر پر روانہ کرنے کے لیے اپنے شدید عمل میں مصروف تھے اور حادثاتی سمتوں کے اس فرق کے درمیان دنیا آباد تھی اور دنیا برباد تھی۔ ہاف مین اپنی بھولی بسری یونیورسٹی کے متعلق خواب دیکھتا تھا کہ اس عظیم اکیڈمی کا نام غلام باغ یونیورسٹی رکھ دیا گیا ہے اور ہاف مین بے حد خوش ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو یاور عطائی کی سوانح عمری گا گا کر سنا رہا ہے۔ مگر مخالف قائل نہیں ہوتے اور اکٹھے دائیں بائیں انکار میں سر ہلاتے ہیں۔ اُن کے اس طرح اکٹھے باجماعت (ان کی تعداد سینکڑوں میں تو ہو گی۔ ہال بھرا پڑا ہے۔) بیک وقت سر ہلانے سے ہوا میں غف غف کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ تب ہاف مین اپنی پتلون کی زپ کھول کر اپنا آپ دکھاتا ہے اور چیخ کر کہتا ہے۔ "میں ننگا افلاطون ہوں کیوں نہیں مانتا۔" مخالف آپس میں صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ پھر اُن کا نمائندہ کبیر مہدی اُن کا لکھا ہوا

Scanned by CamScanner

مؤقف اُس کے پاس لاتا ہے جسے اف مین پڑھے بغیر ایک ایک لفظ سمجھ جاتا ہے۔ مخالف کہتے ہیں کہ یہ پرانی دلیل ہے مگر اف مین چلاتا ہے۔ مگر یہ ٹھوس دلیل ہے۔ تم اس دلیل کی طاقت اُس وقت تسلیم کرو گے جب میں عطائی کے کمرے سے سیمیات کا سارا خزانہ لا کر لے آؤں گا۔ اونٹوں پر لاد کر۔ کیونکہ میں علی بابا ہوں اور کھل جا سم سم ابھی بھولا نہیں۔ تب اُسی خواب لمحے میں عدم کے تماشے میں پیرانائیڈ عورت اُس رات کا پہلا بچہ جنتی ہے۔ نومولود کے رونے کی آواز اُسے سنائی دیتی ہے۔ اُس کے رونے کی آواز بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ بلند ہوتی چلی جاتی ہے اس قدر بلند کہ بادلوں کی گرج اور زلزلوں میں آتش فشاں پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ اُس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے پیرانائیڈ عورت دونوں کانوں پر ہتھیلیاں رکھے چلاتی ہے۔ بس۔ بس۔ بس اور یک دم خاموشی چھا جاتی ہے۔ تھلے کا آہنی دروازہ کھولنے کی آواز آتی ہے۔ شاہی جلاد آن پہنچے ہیں بچے کو قربانی کے لیے لے جانے کے لیے اور عورت کل کے لیے پھر سے حاملہ ہونے کے منصوبے بناتی ہے۔

سب سے پہلے آنے والے نے پٹرول کے دونوں کنستروں میں وہ ڈھکن نصب کیے جن میں پلاسٹک کے دو پائپ لگے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا اور دوسرا لمبا پائپ۔ چھوٹے میں پھونک مار کر پٹرول تیزی سے لیے کی راہ سے باہر نکلنے کو بڑھتا تھا پھر اُس نے .... لمبے پائپ کو روشن دان کی راہ سے کمرے کے اندر تک اُتار دیا۔ تب تیسرا پھونک مارتا ہے اور آتش گیر سیال الف لیلیٰ کے پرانے نسخے پر گرتا پیچھے پیچھے نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ جغرافیہ، بائیو کیمسٹری، فزکس، تاریخ، جنوبی ہند، مذہب، سیاست، ادب، فلسفہ، فلکیات، نقش مصوری، جمالیات، مشاہیر عالم، کو بھگوتا نیچے نیچے دائیں بائیں جذب ہوتا ایک پتلی سی دھار کی صورت میں اس سٹول کے نیچے جا پہنچتا ہے جہاں گنجینۂ نشاط، پادری میکنائیر کے اعترافات اور خیالات رجسٹر اوپر تلے رکھے ہیں۔ گھونسلہ زہرہ تک آتش گیر بخارات سے بھر جاتا ہے اور کبیر مہدی بے خواب گہری نیند میں سوختنی قربانی کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ انہیں ٹین کے کنستر اور سب کچھ وہیں چھوڑنا ہے کمرے کے باہر سے کنڈا لگایا جاتا ہے اور اب وہ تینوں شعلہ دکھانے کے ساتھ ہی پلک جھپکنے میں موقع واردات سے دور بھاگ جانے کی آخری زبردست سرگرمی کے لیے تیار ہیں۔

ایمرجنسی میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے سراج دین کے جسم کے ساتھ تمام زندگی بخش آلات مرتب کیے۔ آکسیجن اور ڈرپ کی مقدار کو متعین کیا اور پاس کھڑے ڈاکٹر ناصر کو مریض کے ٹھہراؤ کی

حالت میں ہونے کی خبر دی۔ اُس لمحے اُس نے سائیکیاٹری کے رفیق کار کے ساتھ کھڑی حسین عورت سے پوچھ ہی لیا "آپ کے رشتے دار ہیں" اور زہرہ کے ذہن میں سراج دین اور اُس کا ایک ہی رشتہ سامنے آیا "میرا جاسوس ہے" اور اس شدید درماندگی کی کیفیت میں بھی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی مگر جو اُس نے ڈاکٹر سے کہا وہ ایک رسمی اثبات کا اظہار تھا "جی" مگر وہ مسکراہٹ ڈاکٹر کے لیے خواہ مخواہ کا معمہ بن گئی۔ اصول ہے کہ جاں بلب مریضوں کے سرہانے کھڑی رشتے دار عورتیں مسکراتی نہیں۔ پھر سائیکیاٹری وارڈ سے وارڈ بوائے بھاگتا ہوا آیا اُس نے ڈاکٹر ناصر کے کان میں کچھ کہا۔ ڈاکٹر ناصر کی آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ پھر اُس نے عورت سے کچھ کہا اور عورت کے چہرے پر آنے والی تبدیلی اس حیرت انگیز مسکراہٹ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی اس کا جیسے خون یک دم نچڑ گیا تھا اور جیسے وہ وہیں کھڑی کھڑی مر جانے والی تھی۔ پھر وہ اپنے مریض کو وہیں چھوڑ کر وحشت زدگی کی کیفیت میں فوراً وہاں سے چلے گئے۔ جیسے انہیں کسی بہت بڑے حادثے کی اطلاع ملی ہو۔ جیسے انہیں کسی ایسے عظیم سانحے کی خبر ملی ہو کہ جسے شاید وہ ابھی اپنی سعی عظیم تر سے روک سکتے ہوں۔ جیسے ہونی کے جبر کو ٹالنے کی دیوانگی انسان کو تدبیر و اختیار کی آخری حدوں تک لے جاتی ہے۔ جہاں موت کو صرف موت سے باطل کیا جاسکتا ہے۔

کالرز اولڈ بکس شاپ کے نچلے حصے میں محو خواب بوڑھے امداد حسین کو جب دروازہ پیٹنے اور چوکیدار کے خوفناک واویلے اور آگ، آگ کی آوازیں آئی تھیں۔ تو وہ ہمیشہ کی طرح بستر میں مکمل برہنہ حالت میں دراز تھا۔ جب مکان پر ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی اور مالک مکان کے لیے ہاہاکار مچی تھی تو امداد اپنے لباس کے مختلف حصوں کی تلاش اس کے لیے ایک لغتی جنجال بنی ہوئی تھی۔ کمرے میں برقی روشنی ممکن نہ ہوئی بالائی منزل کے قریب سے گذرتی تاریں شعلوں کی زد میں آ کر پگھل گئی تھیں۔ بالآخر امداد حسین نے اندازے سے اپنا ازار بند کھول کر نیا جوڑا پہنا دروازہ کھول کر باہر گلی میں آیا تو نارنجی شعلوں کا سینک لپک کر اُس کی طرف آیا گلی میں شور اور لوگ تھے پھر اُس نے اوپر دیکھا اور جو اُس نے دیکھا ویسا ہی تھا جیسا کہ اُس کا دل اور جیسا کہ دن رات کے نحس شگون کب کے گواہی دے رہے تھے کہ ہوگا۔ جو ہوا تھا اور ہونے والا تھا وہ اُس کی عمر بھر کی کمائی اس کی بڑھی جان کو تو برباد کرنے والا تھا ہی مگر یہ آفت اپنے اوپر لانے والا اب صرف اُس کی ذمہ داری نہیں رہ سکتا کوئی اور بھی آئے۔ دو رابطے جو امداد حسین کے پاس عرصے سے تھے جن میں سے ایک اُس

Scanned by CamScanner

عورت کا تھا جس کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی وہ سب کچھ جانتا تھا اور دوسرا کسی اور شخص کا جو کبیر کا دوست تھا۔ شور وغل کی آوازوں میں بھی امداد حسین کو ٹیلی فون پر دوسری طرف سے عورت کی آواز کی بجائے ایک کرخت مردانہ آواز پہچاننے میں دقت نہ ہوئی جس کا نامعلوم مالک گندی فحش زبان میں پوچھ رہا تھا کہ کیا لینے کے لیے اُس نے رات کے چار بجے اُدھر فون کیا ہے۔ وہ تو چلی گئی ہے۔ زہرہ کے کمرے میں سے سامان اُٹھانے والے اپنے ساتھی کی حرکت پر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ دوسری بار امداد حسین سے کسی عورت نے بات کی اور سب کچھ دو فقروں میں ہی بتا دیا اور نرس بقارو دو فقروں میں ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ امداد حسین نے دو بھاری کمبل کھینچے اور کونے میں رکھے پانی کے ٹب میں بھگونے لگا۔ کچھ تدبیر تو وہ کرے گا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اُن چیخ و پکار کرتے لوگوں میں سب سے پیش پیش تھا جو کبیر مہدی کے گھونسلے کا دروازہ توڑنے کے لیے ایک بھگدڑ کی طرح سیڑھیوں سے اوپر چڑھ رہے تھے۔

بڑے شہر کی سنسان سڑکوں پر رفتار اور فاصلے کے ٹکراؤ میں سنسناتی ہوا میں ناصر کی موٹر سائیکل پر اُس کے ساتھ بیٹھی گر جیسے لامتناہی خلا میں مسلسل گرتی زہرہ یک دم بالکل سُن ہو گئی۔ ہر شے وہیں جامد ہو گئی اور گہرے شک کا عظیم الشان لمحہ اُتر آیا۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہر شے کہیں اور ہے اور وہیں کی وہیں ہے۔ وقت کا کوئی وجود نہیں کائنات ایک بلند مرتبت جھوٹ کے نرغے میں آ گئی ہے۔ ورنہ ایک ہی رات یہ سب کچھ ممکن نہیں۔ اتنا بہت کچھ محال ہے۔ ایک ہی رات اپنی کوکھ میں اتنا کچھ سمیٹ نہیں سکتی۔ کچھ بھی نہیں ہوا اور جو ہوا وہ سامنے آیا تو کوندتے ہوئے شعلوں کے حُسن کا پرہیبت نظارہ تھا۔ ان دونوں کے گھونسلے کے سامنے پہنچنے تک لوگ دروازہ توڑ چکے تھے اور دھڑ دھڑ جلتی کتابوں کے اُس جہنم میں اُس کا مکین کچھ ہی دور اندر سب کے سامنے بستر پر ایسے سکون سے بے حس و حرکت دراز نظر آتا تھا جیسے علم کی چتا میں ستی ہوتا عالم۔

ناصر اور زہرہ کو دیکھتے ہی بوڑھا امداد حسین دھاڑیں مارتے ہوئے اندر کو اشارے کرنے لگا۔ "بچا لو۔ اُسے بچا لو۔ میں بزدل اور لعنتی ہوں۔ ہمت نہیں پڑتی۔ لعنت ہے میری جان پر جو مجھے پیاری ہے مگر وہ بھی پیارا ہے جو نظروں کے سامنے جل رہا ہے۔ میرے مولا میں کیا کروں" وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور وہ گیلے کمبل زہرہ اور ناصر کی طرف بار بار بڑھا رہا تھا۔ لوگ تماشا کرتے تھے اور شعلوں کی طرح ہی اجتماعی عورت کو حیرت سے دیکھتے تھے جو کمبل اپنے جسم کے اوپر لپیٹ کر ایک

ہی لمحے میں اُس بھسم کر دینے والی آگ میں گہرا اُترتی چلی گئی تھی اور اُس کے پیچھے وہ مرد۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ موت کے سامنے وہ ضرور کچھ ڈگمگایا مگر پھر وہ بھی اُتر گیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ جلنے والوں میں سے نہیں لگتے تھے۔ زہرہ دھوئیں اور تپش کے گرداب میں دیوانی ہوئی کبیر کی جانب بڑھی تو جلتی ہوئی کتابوں کی ایک قطار دیوار سے ہٹ کر لہراتی ہوئی اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی جیسے کوئی زندہ مخلوق ہو پھر گر کر کتابوں کی جلتی ہوئی دیوار بن کر اس کا رستہ مسدود کر گئی اور اسی لمحے اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ کبیر کو آگ سے نکال نہ سکی تو واپس نہیں جائے گی اور کبیر کے گھونسلے میں سونے کی اُس کی خواہش ہمیشہ کے لیے پوری ہو جائے گی اور اسی لمحے ناصر کے اندر کوئی ناصر دہائی دینے لگا۔ پلٹ جاؤ۔ یہ محال ہے۔ یہ موت ہے۔ تُو یہاں سوائے اپنے کسی کو نہیں بچا سکتا۔ پھر اُس نے زہرہ کو دیکھا جو بے حس و حرکت کبیر کو سلگتے ہوئے بستر کے اوپر سے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور اتنا ہی ناصر کے لئے کافی تھا موت ایک چھوٹا فرق بنی چنگاریں مارتی تھی۔ آتشیں لمحوں کے آخری منطق پر ایمان لانے کو للکارتی تھی۔ وہ ایمان جو عورت کو مرد کا کر کے وجود کو پورا کر رہا ہے اور ناصر کو آخری موقع فراہم کرتا ہے وہ زہرہ کے پاس جاتا ہے اگر تم اُس کی خاطر موت پر ایمان لا سکتی ہو تو تمہاری خاطر میرے لیے بھی یہ ناممکن نہیں۔ آگ میں خیال جلتے تھے اور ولولے۔ منصوبے۔ ہیجان۔ خلشیں۔ آرزوئیں۔ داستانیں۔ زندہ جلا دینے والوں کی اور زندہ جل جانے والوں کی سب جلتی تھیں، اور باہر ہجوم نظارہ کرتا تھا اور قیاس کرتا تھا۔ کیا وہ تینوں اب کبھی واپس آئیں گے؟ یا جل جائیں گے؟۔

اور جب وہ آئے تو دہکتے ہوئے آئے۔ عورت اور مرد کے چاروں بازوؤں پر وہ شخص تھا جو آگ میں سے آیا تھا عورت کے ساتھ باہر سے آنے والے مرد نے بہت مشکل سے ایک جھلسی ہوئی کتاب اپنے بائیں ہاتھ میں دبا رکھی تھی۔ کبیر مہدی کا نیلا رجسٹر اب نیلا نہیں رہا تھا۔ جھلسا ہوا بدرنگ سیاہی مائل۔ جیسا خود اُس رجسٹر کو لکھنے والا اور زہرہ مدتوں یہ نہ جان سکی کہ ناصر نے آگ میں سے کبیر کے علاوہ اور کسے بچایا اور کیوں بچایا۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب (21)

باب پیدائش

مدعلی کے قوتِ گویائی سے محروم ہونے اور عاشق علی کے ان چاروں سے محروم ہونے کی درمیانی مدت میں دونوں بھائیوں کی ابلاغیاتی دنیا دس بارہ اشاروں سے زیادہ وسیع نہ ہو سکی تھی۔ یہ اشارے جو دنیا کی کسی اشاروں کی زبان میں موجود نہ تھے انسان کی بنیادی ضرورتوں اور مدعلی کی خصوصی ضرورتوں کے علامتی اظہار تھے اور جن کی حقیقت ناطق دنیا میں صرف عاشق علی جانتا تھا۔ بھوک، پیاس، نیند، حوائج ضروریہ، متوجہ کرنے کی احتیاج، اثبات، انکار، التجا، نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا نکالا۔ گھوڑوں کا مصالحہ اب بن گیا ہے اٹھالو۔ میں نے غلام باغ جانا ہے۔ میں سارا دن اور جتنا حصہ رات کا جب تک کہ تمہارا کیفے بند نہیں ہو جاتا غلام باغ میں ہی رہوں گا پھر اگر مجھے کوئی چیز مل گئی تو نواب کو دے کر خود ہی گھر آ جاؤں گا اگر کچھ نہ ملا تو میں کیفے بند ہونے تک تمہارے پاس آ جاؤں گا پھر کیفے میں جو کھانے کو بچا ہو گا وہ کھا کر ہم اکٹھے ہی گھر آ جائیں گے۔ اس ساری پیچیدہ صورتِ حال کے اظہار کے لیے بھی ایک مبہم سا اشارہ دونوں بھائیوں کے لیے کافی تھا۔ عاشق علی کے الفاظ میں پیدا علی کے گم ٹھپ ہو کر گھر آنے کے بعد جلد ہی عاشق علی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائی مدعلی گونگا ضرور ہوا ہے مگر بہرا نہیں۔ لیکن ظلم یہ ہوا ہے کہ بندوں کے بولنے چالنے کی آوازیں یا کتے بھونکنے کی آوازیں۔ گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں۔ ان سب میں اس کے لیے کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

انہی دنوں ڈاکٹر ناصر اپنے شعبے کے نفرت انگیز سربراہ سے مدعلی کا کیس ڈسکس کرتا تھا اور عاشق علی پر ہو جانے والے اسی عام فہم انکشاف کو طبی اصطلاحات میں بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مدعلی کا Aphasia نہ تو صرف Broca ٹائپ ہے نہ ہی صرف

Wernicke ٹائپ ہے بلکہ دونوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ سربراہ جسے ہر عجیب و غریب چیز سے نفرت تھی ناصر کی تشخیص کو لغو یعنی عجیب و غریب قرار دیتا تھا اور اس مسئلہ بندرائے کا اظہار کرتا تھا کہ سائیکیاٹری میڈیسن کی شاخ ہے اور اس میں افسانوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر وہ مدعلی کے کیس کو نیورالوجی کی طرف Refer کرنے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ مگر ناصر صدرِ شعبہ کی رائے اور ہدایت کو نظر انداز کر کے کیرہ، باف مین اور آخر میں تو زہرہ بھی ان میں شامل ہو گئی ان تینوں نیم حکیموں کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے مدعلی کو جنم گھنڈر کی معالجاتی مہمات پر لے جاتا رہا اور جن کا نتیجہ ڈاکٹر اور اس کے مریض دونوں کے لیے کافی پریشان کن رہا تھا۔ اور انہیں دنوں عاشق علی نے فیصلہ کیا تھا کہ بھائی مدعلی کو سارا سارا دن گھر بیٹھے رہنے یا کبھی کبھار نواب صاحب کے لیے غلام باغ میں سکے تلاش کرنے کی بجائے کوئی اور کام بھی کرنا چاہیے تاکہ اس کا دل بہلا رہے۔ کوئی ایسا کام جس میں بول چال سمجھنے اور خود بولنے کی ضرورت نہ پڑے اور ایسا کام وہی ایک کام ہو سکتا تھا جو وہ ساری عمر کرتا رہا تھا۔ گھوڑوں کی صحت اور کارکردگی بحال رکھنے کے لیے استعمال ہونے والا مصالحہ بنانے کا کام۔ عاشق علی کے لیے اپنی یہ خواہش اور منصوبہ مدعلی کے دماغ کے اندر تک پہنچانا ایک جان جوکھوں کا کام تھا۔ اپنے ہاتھوں کے ہر اشارے میں ناکام ہو کر بالآخر اس نے سیدھا راستہ اختیار کیا اور مدعلی کے سامنے اس کے سامان کی ساری پٹاریاں اور برتن لے آیا اور انتظار کرنے لگا اور آہستہ آہستہ مدعلی کی آنکھوں میں تفہیم کی چمک لہرائی اور گھوڑوں کے مصالحوں کی دنیا کے اشاروں نے جنم لیا۔ ایک صورتِ حال دونوں بھائیوں کے درمیان بامعنی ہو گئی اور اس کے معانی پر دونوں کو اختیار بھی حاصل ہو گیا۔

مگر جو صورتِ حال اب عاشق علی کے سامنے تھی اور جس کی سب تباہی و بربادی کو وہ بھائی مدعلی کے دل و دماغ کے اندر اتارنا چاہتا تھا، وہ گھوڑوں کا مصالحہ بنانے کے عمر بھر کے کسب کو پھر سے چالو کروانے کی خواہش سے بہت مختلف تھی۔ وہ گھوڑوں کے مصالحوں کی پوٹلیاں تو بھائی مدعلی کے سامنے لا کر رکھ سکتا تھا مگر ان چاروں کو نہیں اور پھر جو کچھ اسے پتہ چلا تھا جو کچھ خون سرد کر دینے والی ہونی ان چاروں پر بیتی تھی۔ وہ سب کچھ مدعلی کو کیسے سمجھائے گا جبکہ بول کر سن کر سمجھنے سمجھانے کا دروازہ بند ہے۔ کیسے اس بند دروازے کے پیچھے وہ دل کے ٹکڑے کرنے والی وہ کہانی پہنچائے گا جو آج ہی اس نے ڈاکٹر ناصر کے ہسپتال جا کر سنی تھی جب وہ ہفتے کی دوائیاں لینے گیا تھا

جو مدد علی کے لیے ڈاکٹر ناصر نے وارڈ سے مفت جاری کروائی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ناصر تو اسے نہیں ملا تھا نرس مختار ملی تھی۔

اور جو کچھ نرس مختار نے اسے بتایا تھا وہ تباہی کی ایک کہانی تھی جسے سن کر عاشق علی کا دل ڈوب گیا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کو اور اٹھا نہیں سکیں گی اور وہ وہیں پتھر کی طرح گر جائے گا۔ نرس مختار دوائیاں اکٹھی کرنے اور اس کے بھائی کی خیریت دریافت کرنے کے دوران جو کچھ بولتی رہی اس سے عاشق علی اپنے ہی خوفناک منظر بناتا رہا..... اس رات جب وہ چاروں الگ الگ ہو کر کیفے سے نکل گئے تھے اور اس کی دنیا اجڑ گئے تھے تو اسی منحوس رات میں ابھی جو اور بھی منحوس رات باقی تھی اس رات میں ہزار آفتیں کہیں چھپی ہوئی تھیں جو ان چاروں پر ٹوٹ پڑی تھیں۔

''پہلے تو وہ عورت ذات جو ان کے ساتھ پھرتی ہے اس کا کوئی رشتے دار بڈھا بہت سخت زخمی ہو کر آیا خود لے کر آئی ڈاکٹر ناصر کے پاس پھر جنرل ایمرجنسی جا کر ڈاکٹر ناصر نے اس بڈھے کے لیے تو تھلی مچا دی۔'' نرس مختار نے کہا اور عاشق علی نے سوچا کہ کیا وہ سراج دین ہو سکتا ہے۔

''وہ بڈھا تو خیر بچ جائے گا پر وہ جو نہیں ان کے ساتھ پھرتا ہے کالی کالی آنکھوں والا..... اللہ معافی..... پر وہی میرا دل کہتا ہے اس عورت ذات کا کچھ ہے ڈاکٹر ناصر تو ایویں کھجل خوار ہو رہا ہے۔ تو وہ تو مجھے بچتا نظر نہیں آتا۔ تُو سنا تیرے بھائی کی زبان کچھ کھلی ہے یا نہیں۔''

''نہیں'' عاشق علی نے بے چینی سے کہا۔ وہ بھائی مدد علی کا معاملہ قطعاً بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا ''ہوا کیا تھا جی؟''

''ہونا کیا تھا۔ اس رات ابھی وہ ادھر جنرل ایمرجنسی میں بابا اٹینڈ کرا ہی رہے تھے کہ ادھر اپنی ایمرجنسی میں کال آ گئی جی ادھر..... ادھر میرے پاس۔ میں نے آپ اٹینڈ کی کہ جی وہ..... کبیر..... ہاں کبیر ہی نام ہے ناں۔ اس کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ میں نے جی ٹافٹ مولوی رحمت کو دوڑایا وہ جو نہیں وارڈ بوائے ہے ادھر..... پچھلے سال ہی داڑھی رکھ کر مولوی ہو گیا ہے ادھر ہی کہیں پھرتا ہو گا۔ دیکھا نہیں.....؟''

''دیکھا ہے جی..... دیکھا ہے..... دیکھا ہے.....'' عاشق کے منہ سے نکلا۔

''ہاں جی۔ اس نے جا کر اطلاع دی پھر تو بہ جی ڈاکٹر ناصر اور وہ عورت ذات..... زہرہ..... زہرہ ہی نام ہے شاید..... وہ کوئی گئے ہیں تو یہ میری اللہ معافی آندھی طوفان

کی طرح..... یہ جو گولیاں ڈاکٹر ناصر نے لکھی ہیں ناں تیرے بھائی کی زبان چالو کرنے کے لیے۔ میرے حساب سے بالکل غلط لکھی ہیں پر کیا کر سکتے ہیں ڈاکٹر ڈاکٹر ہے نرس نرس ہے۔ ہے کہ نہیں؟''

''ہاں جی ہے۔ نہیں ہے۔ ہاں..... جی..... ہے جی ہے..... پھر جی..... کیا ہوا..... بچ گئے جی؟''

''اچھا وہ..... بچا لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ناصر جلا ہے اور ساتھ وہ عورت ذات بھی جلی ہے پر کہہ رہے ہیں بچ ہی گئے ہیں۔ پر وہ بے چارہ تو..... اللہ معافی۔ فارٹی پرسنٹ برن سیکنڈ ڈگری کے۔ ان برن والوں کی تو نرسنگ بھی بڑی کتی ڈیوٹی ہوتی ہے تو بہ میری۔ ویسے تیرے بھائی کا کیا حال ہے اب کوئی ہوں ہاں کرنے لگا ہے کہ نہیں کوئی لقمہ اٹھانے لگا ہے کہ نہیں۔ یہ دماغ سے تحریک نکالنے والی دوائیں ہیں۔ اس غریب پر تیرے بھائی پر بھی ان چاروں نے بڑے تجربے کیے کوئی بات میری نظر سے بچ نہیں سکتی'' نرس مختار ہنسی اور عاشق علی نے سوچا کہ اسے بس خاموش رہ کر سننا چاہیے۔

''تو یہ میری بڑی ذات پڑی ڈاکٹر ناصر کو ہیڈ صاحب سے..... ادھر جو کھنڈروں والے باغ میں بابے کو۔ تیرے بھائی کو..... لے جا کر پتہ نہیں کیا اچھی سیدھی حرکتیں کر کے اس کے ساتھ ادھ موا کر کے چھوڑ جاتے تھے..... چلو جی ہمیں کیا''۔ ''آگ..... سچ..... جلنا.....'' عاشق علی پھر خاموش نہ رہ سکا۔

''ہاں جی..... وہ جو برن سنٹر ہے ناں اس میں ہے..... بیڈ نمبر سات منٹ لگا ہے اوپر جسم کا پانی بچانا ہوتا ہے ناں نہیں تو اڑ اڑ جاتا ہے جلے کے زخم اللہ معافی بڑے ہی نامراد زخم ہوتے ہیں کوئی کوئی بچتا ہے..... سالس بڑے ضائع ہوتے ہیں ناں۔ بڑی کتی ڈیوٹی ہے برن کی نرسنگ، ایک دفعہ لگی تھی میری اللہ معافی بڑے ہی نامراد زخم ہوتے ہیں..... اور وہ عورت ذات جس پر دونوں میں لڑائی ہوئی ڈاکٹر ناصر اور اس کالی آنکھوں والے میں وہ بچ گئی۔ اصل فساد کی جڑ تو وہ تھی وہ بچ گئی پھرتی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ ہو میں نے سنا ہے اپنے ماں باپ بھائیوں سے جائیدادوں کے مقدمے لڑتی پھرتی ہے۔ اللہ معافی کیسا بے درو زمانہ آ گیا ہے۔'' نرس مختار نے خاموش ہو کر غور سے عاشق علی کی آنکھوں میں دیکھ کر شدت سے تصدیق طلب کی۔

''جی..... آ گیا ہے''

"ہاں۔ تو ایسی ہی ہوتی ہیں نا۔ جو پاگل ہو کر پھر ادھر ہمارے پاس آ جاتی ہیں۔ جیسے وہ اندر بیٹھی ہے کہتی ہے۔ ہر رات ایک بچہ دیتی ہوں اور توبہ میری توبہ۔ تو دیکھو ناں بیان دونوں کو لے ڈوبی ناں یا شاید تینوں کو وہ تیسرا ابھی تو ہے گورا۔ پر گورا ادھر نظر نہیں آیا ابھی تک۔ بڑے خود غرض ہوتے ہیں یہ گورے۔ دیکھو کتنی یاری تھی ان میں اندازہ انسان کو ہو جاتا ہے۔ ناں جب ادھر آتے تھے ڈاکٹر ناصر کے کمرے میں۔ کئی بار میں نے دیکھا ہے گورے کو سب کے ساتھ ہنستا تھا اور کھاتا پیتا تھا۔ اب یار جل سڑ گیا ہے مرنے کو پھرتا ہے تو آیا تک نہیں حال پوچھنے۔ ویسے حال بہت برا ہے۔ اللہ معاف کرے۔ پر اصل فساد کی جڑ تو وہی تھی تینوں کو پیچھے لگایا ہوا تھا۔"

نرس مختار کی مسلسل یک طرفہ بڑبڑاہٹ کے اس مقام پر عاشق علی پھر مداخلت کیے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔

"آپ کیا بات کر رہی ہیں سسٹر جی ایسی تو کوئی بات نہیں تھی ان چاروں میں"۔ نرس مختار کی چونکی ہوئی "ہوں" بہت طویل تھی۔ پھر وہ اپنے پیدائشی "میں سب جانتی ہوں" انداز میں مسکرائی اور بولی۔

"ہاں جی تمہیں تو پتہ ہوگا تمہارے ہوٹل میں تو جا کر بیٹھتے تھے۔" "اور کیسے بیٹھتے تھے۔ یہ بھی۔" عاشق علی نے سوچا۔ اور نرس مختار کی بات جاری تھی۔

"ایک دفعہ بتایا تھا تم نے جب تم پہلی بار دوائیاں لینے آئے تھے۔"

"مم۔ میں جا سکتا ہوں جی جا کر حال پوچھنے۔ مل سکتا ہوں جی۔ کبیر صاحب سے" عاشق علی نے پوچھا۔

"نہ۔ نہ۔ نہ۔ برن والوں کے پاس تو کسی ایرے غیرے کو پھٹکنے بھی نہیں دیتے ناں۔ بڑی دیر تک۔ بڑا نازک کام ہوتا ہے کوئی پتہ نہیں ہوتا برن والا کس وقت مر جائے۔ یہی تو بات ہے ناں برن والوں کی ابھی لگتا ہے ٹھیک ٹھاک ہے تو ابھی گیا بس چلا گیا۔ پاس کوئی بس ایک آدھ اٹنڈنٹ ہوتا ہے یا کوئی مصیبت کی ماری نرس۔ تو یہ بڑا گندا کام ہے۔ جب جلا ہوا ماس جھڑتا ہے۔ کچا گوشت نیچے سے نکل آتا ہے دیکھا نہیں جاتا۔ ابھی تو وہی اُس کے پاس ہوتی ہے۔ دن رات یا پھر سنا ہے۔ سنا ہے۔ دیکھا نہیں ایسے ہی میں کہوں۔ ڈاکٹر ناصر جاتا ہے پر وہ تو اسی عورت کے چکر میں جاتا ہوگا۔ کوئی تیمارداری کے لیے تھوڑا جاتا ہوگا۔ جلے ہوئے کی۔" نرس مختار بھی

اور عاشق علی کے لیے مزید سننا ناممکن ہو گیا۔

"اچھا سسٹر جی۔ بڑی مہربانی۔" اس نے کہا۔

"ہاں" وہ بولی "یہ دوائیاں بڑی مہنگی تمہیں مل رہی ہیں۔ ڈاکٹر ناصر کی سفارش پر۔ کوئی فائدہ بھی ہوا ہے یا نہیں۔ تمہارے بھائی کو۔ کوئی لفظ بولنے لگے سمجھنے لگا ہے یا نہیں؟"

"نہیں کچھ نہیں۔" عاشق علی نے نرس مختار کی اس ساری بک بک کو یاد کرتے ہوئے سوچا جب کہ مدد علی اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا اور وہ بے بسی اور غصے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عاشق علی نے سوچا "نہ کوئی لفظ بولتا ہے نہ سمجھتا ہے مگر اسے اتنا سمجھنے کا تو حق ہے کہ کبیر صاحب جل گیا ہے اور کسی وقت بھی مر سکتا ہے۔ دوائیاں دینے اور علاج کرنے والا ڈاکٹر بھی جلا ہے پر بچ جائے گا۔ گورے صاحب کا کچھ پتہ نہیں اور میڈم بی بی زہرہ....." عاشق علی کو وہ رات یاد آ گئی جب زہرہ نے عاشق علی کو انڈوں کا آملیٹ بنانے کو بولا تھا۔ مدد علی کو اتنا بھی سمجھنا چاہیے کہ وہی عورت کبیر صاحب کی دن رات تیمارداری میں لگی ہے اور ان سب پر جو آفت آئی ہے وہ آگ کی سب سے ظالم آفت ہے۔

مئی کی گرمی عاشق علی کے چھوٹے سے گھر کے صحن سے آہستہ آہستہ واپس جا رہی تھی۔ ابھی شام کو کچھ ہوا بھی چل پڑی تھی۔ عاشق علی نے مدد علی کی طرف دیکھا جیسے کوئی شخص کسی پر مسلسل نظریں جمانے کے باوجود بار بار دیکھتا ہے۔ دونوں بھائیوں میں 'کچھ۔ ہوا۔ ہے'۔ کی نامعلوم بے چینی اور بھی شدت سے موجود ہو گئی تھی۔ مگر سب کچھ اشاروں کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر عاشق علی کو ایک خیال آیا۔ جن دنوں وہ چاروں بھائی مدد علی کو غلام باغ کے کھنڈروں میں لے جاتے تھے تو ان چاروں کے لیے ایک اشارہ دونوں بھائیوں میں جم گیا تھا۔ عاشق علی اپنے دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیوں کو اس طرح حرکت دیتا تھا جیسا ناپ کر رہا ہو اور مدد علی سمجھ جاتا تھا۔ اس خیال پر عاشق علی کو ایک اور خیال آیا اور اس نے فوراً اسے آزمانے کی ٹھانی۔

عاشق علی نے مدد علی کے سامنے بار بار چاروں انگلیوں کو مخصوص حرکت دی۔ مدد علی نے بار بار اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار تو پاس پڑے ہوئے دوائیوں کے لفافے کو اٹھا کر دکھایا۔ عاشق علی بہت خوش ہوا کہ اس کی ترکیب بہت کامیاب جا رہی ہے پھر اس نے اسٹیج کے جادوگر کی طرح جیب سے ماچس نکالی دیا سلائی جلائی اور آگ کے شعلے کو ان چاروں انگلیوں کے قریب لے گیا

Scanned by CamScanner

انتا قریب کر کے جیسے انگلیوں کو جلا ہی دینا چاہتا ہو۔ پھر اس نے اس عمل کو کئی بار دہرایا اور ہر بار امید
بھری نظروں سے مدعلی کی طرف دیکھا۔ مگر عاشق علی کے تلازم خیال بھڑکانے کے اس چھوٹے
سے مظاہرے کا اثر اس کے بے زبان بھائی پر بہت غیر متوقع ناقابل فہم اور بھیانک ہوا۔ انگلیوں
اور شعلے کا منظر دیکھتے دیکھتے اچانک اس کا منہ ایک قابل رحم شگاف کی طرح کھلا جس میں سے
آ..... آ کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر وہ کسی تشنج کی ظالمانہ گرفت میں آکر ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا
اور اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ عاشق چیخ کر زمین پر گرے بھائی کو سنبھالنے کے لیے لپکا
اور اس کا نام پکار پکار کر واویلا مچانے لگا۔ گھر کی عورتیں اور بچے اندر کے کمرے سے باہر بھاگ
نکل آئے۔ ایڑیاں رگڑتے مدعلی کے ساتھ فرش پر بہت سی جلی ہوئی تیلیاں اور کھل کر بکھری ہوئی
ماچس دیکھ کر بھی انہیں عمر بھر سمجھ نہ آئی کہ اس شام دونوں بھائیوں کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

مدعلی کے ساتھ کیا ہوا تھا اس بارے میں ڈاکٹر ناصر نے فوری تشخیصی مفروضہ اسی وقت قائم
کر لیا جب عاشق علی ڈرتے ڈرتے اپنی روداد سنانے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ناصر اس
کے علاجی تجربے کی تلازمی تفصیلات سن کر ہنس پڑا۔ اگرچہ وہ دن ایسے ہی تھے کہ ہنسنا مسکرانا ایک
نامانوس ممنوعہ فعل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ گیلے کمبلوں نے ان کے جسموں کو بہت حد تک آگ
سے محفوظ رکھا تھا مگر چہرہ اور اس کے اپنے ہاتھ اور بازو فرسٹ ڈگری برنز کی زد میں آئے تھے۔
ناصر نے عاشق علی سے کہا کہ وہ بس کبیر کے لیے دعا کرے اور آئندہ اپنے بھائی کو کچھ بھی
سمجھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دیکھ کر پہچاننے کی صلاحیت سے بھی محروم
ہو جائے۔ ناصر نے Aphasia سے Agnosia کی طرف بڑھنے کے خطرے سے عام زبان
میں خبردار کرنے کی کوشش کی "بس دوائیاں دیتے رہو۔ اللہ فضل کرے گا"۔ اس نے کہا۔ عاشق
علی غیر مطمئن سا ان چاروں کے لیے کچھ کرنے کی حسرت لیے چلا گیا۔ ناصر نے اپنے فسٹ
ڈگری زخموں پر تنقیدی نظر ڈالی۔ جلد کی سب سے بیرونی سطح پر شعلوں کے اثرات ماند پڑ رہے
تھے۔ اندمال کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ مگر کبیر کا معاملہ دوسرا تھا۔

تدریسی ہسپتال کا پروفیسر طلبا کو برن سینٹر کا مطالعاتی راؤنڈ کروانے کے بعد جلنے کے زخموں کی
اقسام اور ان کی پیتھالوجی پر لیکچر دے رہا تھا اور طلبا انسان پر نازل ہونے والی اس سب سے بڑی آفت
کے بیان کو علمی زبان میں اپنی کاپیوں میں درج کر رہے تھے۔ "سیکنڈ ڈگری برنز کی بھی دو اقسام ہیں سطحی

زخم اور گہرے زخم۔ سیکنڈ ڈگری برنز کافی خطرناک ہیں۔ گہرے ظاہر ہے کہ اور بھی زیادہ خطرناک
ہیں جسم سے مائعات اور نمکیات بے انتہا خارج ہوتی ہیں انہیں بحال کرنا بے حد ضروری ہے۔ سوڈیم،
پوٹاشیم اور دوسرے الیکٹرولائٹس کو بحال کرنا بے انتہا ضروری ہے انفیکشن کا خطرہ بے انتہا ہوتا ہے۔
اب وہ دیکھیں بیڈ نمبر سات والا کیس جو میں نے آپ کے ساتھ ڈسکس کیا تھا 40% سیکنڈ ڈگری برن
والا ہے اسے انفیکشن سے بچانا بے انتہا ضروری ہے اس کے لیے سلور نائٹریٹ کی مرہم بے انتہا
مفید..... نہیں میں کہوں گا بے انتہا تو نہیں لیکن کافی مفید ہے۔ لیکن اگر بیرونی جلد مکمل جل جائے جیسا
کہ سیکنڈ ڈگری اور تھرڈ ڈگری برنز میں ہوتا ہے تو اندر کے ٹشو، گوشت، چربی اور بعض اوقات ہڈی تک
جل جاتے ہیں۔ بہرحال تھرڈ ڈگری کی طرف بعد میں آئیں گے اس کیس میں 40% والے میں میرا
خیال ہے کہ اس کی سکن گرافٹنگ ہمیں کرنی پڑے گی۔ یہ ایک بے انتہا مہارت کا کام ہے غیر متاثرہ
جلد سے بے انتہا باریک تہہ جسے Epithileum بولتے ہیں آپ جانتے ہیں متاثرہ جلد پر جمائی جاتی
ہے اب یہ ایک ایسا عمل ہے جو....."۔

"بے انتہا" اچانک لیکچر تھیٹر کے کسی کونے سے آواز آئی۔ کچھ طلبا ہنس پڑے اور پروفیسر
کا جی چاہا کہ اگر آواز لگانے والا کسی نہ کسی طرح پکڑا جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح اُسے زندہ جلا دے
مگر ایسا کچھ کرنے کی بجائے اس نے کہا۔

"براہ مہربانی توجہ دیجیے۔ یہ ایک بے انتہا اہم ٹاپک ہے اور امتحان میں اس پر ایک سوال
لازمی آتا ہے۔"

O

پروفیسر نذیر بشیر نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ وہ لوگ جنہیں حال ہی میں اس نے کبیر مہدی
سے متعارف کروایا تھا۔ انہیں یہ ضرور بتانا چاہیے کہ..... مناسب معاوضے پر ضرورت مندوں کے
لیے ریسرچ کر دینے والے اور آخر میں آکر مخبوط الحواس ہو جانے والے شخص کا بالکل آخر میں آکر
کیا انجام ہوا۔ پروفیسر نذیر بشیر کو کبیر مہدی نامی دوست نما شخص کے انجام پر سچا افسوس تھا اور اسی
بنا پر وہ سمجھتا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ دوسروں کی ہمدردیاں وصول کرنے کا بھی حق پہنچتا ہے۔ سب
سے پہلے وہ اس خاتون پروفیسر کے گھر پہنچا جسے کبیر نے "تاریخ کی روتی ہوئی بیوہ" کا نام دیا تھا۔

Scanned by CamScanner

اور اسے کافی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خاتون کیسر کا سن کر آبدیدہ ہوگئی اور بہت حیران ہوئی پھر اس نے غم ناک آنکھوں والے لڑکے سے پروفیسر کے لیے سوڈے کی بوتل لانے کا کہا اور بولی۔

"مجھے مبارک صاحب کا خیال آ گیا تھا ان کی بس بھی بعد میں جل گئی تھی۔ یا میرے مولا یہ دنیا تو نے کیوں بنائی ہے دکھوں کا گھر۔ نذیر بھائی اُن صاحب کی تو شکل سیدھی نظروں کے سامنے پھرتی ہے۔ وہیں بیٹھے تھے آپ کے ساتھ کس قدر قابل انسان تھے انہوں نے تو میرے لیے ابھی ریسرچ کا نا یک بھی چنا تھا۔ انہوں نے ابھی انکار تو نہیں کیا تھا ناں نذیر بھائی؟"

"جی نہیں ابھی انکار نہیں کیا تھا" پروفیسر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"ان کی شکل بار بار میری نظروں کے سامنے آتی ہے" عورت نے کہا پھر ٹھہرے ٹھہرے خوف زدہ لہجے میں بولی "اب جل گئے ہیں تو ریسرچ....."

"نہیں" پروفیسر نے سوڈے کی ٹھنڈی بوتل پکڑتے ہوئے کہا چہرہ بچ گیا ہے مگر باقی جسم، بازو، ٹانگیں، کمر، بری طرح جل گئی ہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں انہوں نے مجھے جانے نہیں دیا مگر سنا ہے۔"

"ہاتھ کیا بچ گئے ہیں۔ ریسرچ تو ہاتھوں سے ہوتی ہے ناں..... مطلب ہے لکھنا....." عورت نے پوچھا۔

"پتہ نہیں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا" پروفیسر نے بددلی سے کہا۔

"اللہ رحم کرے، اللہ رحم کرے۔" عورت نے کہا۔ اس کے لیے یہ واقعہ کہ کوئی شخص جو کچھ عرصہ پہلے ایک دن اس کے گھر میں بیٹھا اس سے باتیں کرتا تھا ایک خوفناک حادثے کا شکار ہوا اب کچھ جذباتی اہمیت کا حامل بننے لگا تھا اور اب پروفیسر نذیر بشیر نے گہرے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی "مگر ہوا کیسے بھائی، یہ حادثہ ہوا کیسے"۔

مگر ہوا کیسے، کا تفصیلی بیانیہ جو پروفیسر نے اپنے ذہن کے اندر تیار کیا تھا وہ کہیں اور پیش کرنے کے لیے تھا۔ 'تاریخ کی روتی ہوئی بیوہ' کے لیے نہیں تھا۔ اس نے ایک پراسرار تاسف کے ساتھ کہا۔

"چھوڑیں بہن کئی باتیں ہیں، بہت سی باتیں ہیں، بس آپ دعا کریں، میرا دوست

تھا۔" پروفیسر نے آواز کی ہلکی سی لرزش سے کہا جو سوڈے کی ترشی کی وجہ سے اور بھی متاثر کن ہوگئی تھی۔ اور پھر عورت نے بالآخر کہہ دیا "بہت افسوس ہوا نذیر بھائی، اگلی گھڑی کیا ہوتا ہے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔"

اس کلام کو سننے کے ساتھ ہی پروفیسر کو احساس ہوا کہ اب غم ناک موضوع پر مزید بات کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں۔ لیکن بیوروکریٹ کے پاس مناسب وقت پر پہنچنے میں ابھی کوئی آدھا پونا گھنٹہ باقی تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ آدھا گھنٹہ اسے وہیں گزار لینا چاہیے۔ پھر اس نے خاتون پروفیسر سے حالیہ پروموشنز کی فہرست پر گفتگو شروع کر دی۔ جو بہت کامیاب رہی۔

پروفیسر نذیر بشیر کے نام کی چٹ دیکھ کر بیوروکریٹ نے ایک لمحے کے لیے تو سوچا کہ اس بے وقوف کو باہر باہر سے ہی بھگا دے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ باہر باہر سے ہی بھگانے کو اکثر یقین نہیں آتا کہ اُسے بھگایا جا رہا ہے اور ایسے اکثر واپس آ جاتے ہیں اُسے اندر لا کر خود ہی بھگانا چاہیے۔ "بھیج دو" اس نے چٹ ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے چپڑاسی سے کہا۔

پروفیسر نذیر بشیر بقول اس کے دھلس کے بند ہونے والے ذہرے دروازے کی راہ سے اندر داخل ہوا تو اس نے اسے سلام کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی سائل سے گفتگو میں مصروف تھا اور پردہ کے قریب دوسرے سائل کمرے کی اطراف میں رکھی نشستوں میں بیٹھے اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔ نذیر بشیر بھی ایک کونے میں جم کر بیٹھ گیا۔ طویل انتظار کے بعد بالآخر صاحب کی توجہ حاصل کرنے کے لمحے تک جا پہنچنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر آج کچھ نئی بات ضرور تھی۔ ایک تو وہ بات جسے لیے ہوئے وہ وہاں آیا تھا۔ آج تک اس نے کسی کے حادثے میں جل جانے کی خبر افسران بالا تک نہیں پہنچائی تھی۔ دوسری نئی بات صاحب کے تیور تھے جو آج نئے تھے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ انتظار کے تکلیف دہ لمحات کے دوران ایک خاصے مضبوط نظام کے ساتھ صاحب 'منتظر' کو ایک دو بار کبھی اپنی اچٹتی، کبھی مسکراتی کبھی سنجیدہ مگر پہچانتی، کبھی حیرت انگیز حد تک دوستانہ اور کبھی معذرت خواہانہ نظروں سے نواز دیتا تھا۔ اور منتظر کے ٹوٹتے ہوئے حوصلے اسی لمحے پھر بلند ہو جاتے تھے۔ آج بھی ایسا ہو رہا تھا مگر دوسروں کے لیے۔ اسے اس مسیحائی نظر التفات سے مسلسل محروم رکھا جا رہا تھا۔

جب کمرہ خالی ہو گیا تو صاحب بڑے اطمینان سے ایسے اٹھنے کی تیاری کرنے لگا جیسے فریادیوں کی فریادیں سننے اور احکام جاری کرنے کے تھکا دینے والے کام سے فارغ ہو کر اب تھکے

Scanned by CamScanner

میں جانے والا ہو۔ اب پروفیسر اٹھا اور اس کے سلام علیکم سر پر صاحب نے اُس کی طرف دیکھا مگر ایسے انداز سے جیسے اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ وہاں بیٹھا تھا۔

"ہاں جی۔ پروفیسر صاحب" اس نے کہا اور اس کے انہیں تین چار لفظوں نے پروفیسر نذیر بشیر کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

"فرمائیں" ۔ وہ کہہ رہا تھا۔ پروفیسر کی زبان لڑکھڑائی۔ "وہ جی۔ بس سر۔ وہ....."

اب صاحب نے اپنی مکمل توجہ اس کی طرف مرکوز کر دی۔ "آپ۔ آپ یہ بتائیں پروفیسر صاحب کہ آپ یہاں اس وقت کرتے کیا پھرتے ہیں۔ آپ کو کالج میں نہیں ہونا چاہیے؟" کچھ مزید ہکلاہٹ کے ساتھ پروفیسر نے کچھ کہنا چاہا تو بیوروکریٹ اٹھ کھڑا ہوا اب بالکل ایسے انداز میں جیسے کمرے سے نکلنے ہی والا ہو۔ اور بولا "او یار.....او.....سنو.....سنو میری بات تم لوگ۔ کچھ شرم کرو۔ کیا کرتے ہو تم او یار..... کہتے ہیں قوم کا مستقبل ہے تمہارے ہاتھ میں۔ معمار قوم۔ نان سینس۔ جاؤ.....جاؤ.....جاؤ پڑھاؤ۔ جاؤ پڑھاؤ جا کر۔"

نازک لمحات میں ٹھنڈے دل سے انہیں لمحات کا تجزیہ کرنے کی تھوڑی بہت خداداد صلاحیت استعمال کرتے ہوئے پروفیسر نے سوچا۔ پچھلی دفعہ جو کبیر مہدی نے صاحب کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد ایسا ردعمل تو آنا ہی تھا اور کبھی نہ کبھی اسے اس بدتمیزی کی سزا تو ملنا ہی تھی۔ چیزوں کی تشریح کر لینے کے بعد پروفیسر کو کچھ حوصلہ ہوا اور اس نے نسبتاً واضح لفظوں میں کہا۔ "دوسرا.....دراصل.....میں حاضر ہوا تھا.....بتانے حاضر ہوا تھا.....وہ سر.....کبیر مہدی جل گیا آگ میں.....زندہ.....نہیں میرا مطلب ہے....."۔

صاحب نے الفاظ سنے اور اچانک اس کے چہرے پر کچھ کھنچا سا ہوا اور ماتھے پر بل پڑ گئے۔ چند لمحے وہ پروفیسر کو گھورتا رہا۔

"کبیر مہدی.....آپ کا مطلب ہے.....وہ.....جو....."۔

جی سر.....جی.....وہ ریسرچ اسسٹنٹ کی پوسٹ۔ نہیں میرا مطلب ہے آپ کی ریسرچ....."

بیوروکریٹ پھر چند لمحے خاموش رہا اور پروفیسر کے چہرے پر امید کی کرنیں گرنے لگیں۔ وہ خاموشی اس بات کی دلالت کرتی تھی کہ اسے اس ذلت آمیز انتظار کا انعام ضرور ملے گا۔ کبیر

مہدی کا جل جانا یقیناً ایک ایسا واقعہ تھا جس کی تفصیل جاننے سے وہ لاتعلق رہ نہیں سکتا تھا۔ پروفیسر نے یقین سے سوچا اور دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک لحاتی مسکراہٹ آئی ہے اور گزر گئی ہے۔ اس مسکراہٹ پر پروفیسر کوئی رائے قائم نہ کر سکا کیونکہ جو کچھ صاحب اسے اب کہہ رہا تھا اسے سن کر پروفیسر کے دل کی مراد بر آئی۔

"آپ بیٹھیں۔ پروفیسر صاحب.....بیٹھیں پلیز....."۔

اور پروفیسر کے علاوہ وہ خود بھی گہرے انجذاب کی کیفیت میں بیٹھ گیا اور اسی کیفیت میں اس نے چائے کا کہا۔ پھر ایک موہوم سی آواز میں بولا۔ "کیا اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی؟"

"سر۔ سر۔" پروفیسر نے کہا اور فوراً ہی خاموش ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا ابھی اس سے کچھ پوچھا نہیں جا رہا تھا۔ صاحب کی بات ابھی جاری تھی۔ "اس طرح کے لوگ عموماً خودکشی کرتے ہیں اور وہ بھی خودسوزی کے ذریعے۔ میں نے اس موضوع پر کافی ریسرچ کی ہے۔ جو لوگ کسی عظیم مقصد کے بغیر باغی بننے کی کوشش کرتے ہیں ان کا انجام یہی ہوتا ہے۔ انقلابی بننا بڑا مشکل کام ہے پروفیسر صاحب....."۔

"یس سر" پروفیسر نے صدق دل سے کہا اور پھر اسے سننے لگا۔

"مجھے اس انجام کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس ایک بہت دلچسپ میٹنگ کے دوران ہی جو آپ نے میری اس سے کروائی۔ حالانکہ اس میں اسی کا فائدہ تھا۔ مگر آثار واضح تھے۔ ذہنی خودکشی تو وہ اسی وقت کر چکا تھا۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا۔ آپ کے سامنے ہی سب کچھ ہوا تھا۔"

"یس سر۔ آئی ایم ویری سوری سر۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔"

"Exactly" صاحب بولا "ایسے لوگ Highly Unpredictable ہو جاتے ہیں اور ذہنی خودکشی ہی جسمانی کی طرف لے جاتی ہے۔...مگر آپ کہتے ہیں کہ اس نے خودکشی نہیں کی۔"

پروفیسر نذیر بشیر پر بوکھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ آخر یہ کیسا الزام ہے اور اس کا اس نے کیا جواب دینا ہے۔ اس نے دل سے خواہش کی کہ کاش کبیر مہدی نے خودکشی کی کوشش ہی کی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور صاحب جواب کا منتظر تھا، پروفیسر نے دل کڑا کر کے کہا۔

"نہیں سر ایسا تو نہیں ہوا خودکشی کی کوشش تو نہیں کی۔"

Scanned by CamScanner

"تو پھر کیا ہوا؟" باس نے یک دم ایسے لہجے میں پوچھا۔ کہ آخر ایسا حیرت انگیز واقعہ ہوا کیسے۔ "چائے لیں"

"تھینک یو سر" پروفیسر نے قدرے اعتماد سے کہا "دراصل سر کبیر مہدی کتابوں کے گھر میں رہتا تھا۔"

"کتابوں کا گھر۔ کیا مطلب؟"

"آ۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ سر میں شاید غلط کہہ گیا۔ وہ پرانی کتابوں کی ایک دوکان کے سٹور میں رہتا تھا۔ وہاں کچھ کام بھی کرتا تھا۔ اوپر کی منزل۔۔۔۔۔ میں ایک دفعہ میں وہاں گیا بھی تھا"۔

"اوہ۔۔۔" صاحب کے ہونٹ تنفر سے سکڑے۔ "آئی سی تو وہاں سگریٹ وگریٹ پیا ہوگا۔ آگ لگ گئی۔ ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ افسوسناک حادثات۔"

"جی سر اخبارات میں تو یہی آیا ہے سر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔"

تو جو اخباروں میں آیا۔۔۔۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"پتہ نہیں سر کئی افواہیں ہیں۔ کئی سنی سنائی۔ عجیب و غریب باتیں" پروفیسر کو اب یہ پرلطف احساس ہو رہا تھا کہ گفتگو بالآخر اسی طرح اس کے قبضے میں آ رہی تھی جس طرح اس نے سوچا تھا۔

"ایک تو سر یہ کہ۔۔۔۔ شاید کبیر مہدی کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کمرے کے باہر پٹرول کے کنستر ملے ہیں۔"

"اوہو۔۔۔۔ کیا واقعی؟"

"اور یہ بات اخباروں میں نہیں آنے دی گئی۔"

"کیا بات کر رہے ہیں آپ پروفیسر صاحب۔ آخر کیوں؟ وہ کیوں آخر۔ اخباروں میں نہیں آنے دی گئی؟ کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"سر۔۔۔۔ وہ دراصل کچھ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اب پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔ ویسے اس کا کچھ گوروں کے ساتھ بھی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ باہر کے لوگوں سے دوستی یاری تھی۔"

بیوروکریٹ کو جھٹکا سا لگا اور تجسس میں یک دم سوگنا اضافہ ہو گیا۔ آگے جھکتے ہوئے اس نے پروفیسر سے پوچھا "گوروں سے۔ تمہارا مطلب ہے۔ یورپین، انگریز، امریکن وغیرہ۔"

"جی سر۔۔۔۔ وہ نہیں ہوتے سر آرکیالوجسٹ۔ کئی دفعہ اس نے باتوں باتوں میں ذکر کیا۔

جرمن آرکیالوجسٹ۔۔۔۔۔"۔

"جرمن آرکیالوجسٹ۔۔۔۔ Interesting very interesting اس لوفر سے شخص کا۔۔۔۔۔ بہر حال۔ مگر اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔"

"پتہ نہیں سر۔۔۔۔ پچھلی دفعہ جب ہم یہاں آئے تھے آپ کے پاس۔ جب وہ بدمزگی پیدا ہوئی تھی سر۔"

"ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔" صاحب نے بدمزگی سے ہی کہا۔

"اس روز جب ہم یہاں سے گئے سر تو اس نے پارکنگ میں مجھے وہ لوگ دکھائے جو اس کے کہنے کے مطابق اس کا پیچھا کرتے رہتے تھے اور اس روز پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک بھی آ گئے تھے۔۔۔۔ میں سوچ رہا تھا سر ہو سکتا ہے انہوں نے کبیر مہدی پر قاتلانہ حملہ کیا ہو۔ آگ کے ذریعے۔۔۔۔"

"اور یہ بات اخباروں میں نہیں آنے دی گئی۔۔۔۔" بیوروکریٹ نے ایک نامانوس بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور سن سا ہو کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر اسی حالت میں رہا۔ پروفیسر نے بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ گفتگو غیر محسوس طور پر اس کے اختیار سے نکلتی جا رہی تھی اور پھر صاحب اور بھی زیادہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور جو اس کا پیچھا کرتے یہاں تک آئے تھے انہیں یہ بھی علم ہوگا کہ وہ یہاں کس کے پاس آیا ہے۔۔۔۔"

پروفیسر کچھ بھانپ گیا کہ صاحب کیسے اندیشوں اور خدشوں کا شکار ہو گیا ہے مگر یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اس یک دم اٹھ کھڑی ہونے والی کیفیت کا انجام خود اس کے لیے کیا ہوگا۔"

"بولو پروفیسر صاحب۔ کیا وہ لوگ جو اس کا پیچھا کرتے یہاں تک آئے انہیں علم تھا کہ وہ یہاں کس سے ملنے آیا ہے۔"

اب باس کا لہجہ واضح طور پر جارحانہ تھا۔

"م۔۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں سر۔ میں تو۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔ تو۔۔۔۔"۔

بیوروکریٹ نے متعدد بار تاسف کے انداز میں سر کو دائیں بائیں ہلایا اور بڑبڑاتا رہا۔ "مائی گاڈ۔۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا" پھر اس نے یک دم پروفیسر کو مخاطب

Scanned by CamScanner

کیا؟ تمہیں کچھ معلوم ہے پروفیسر صاحب...... ایسے لوگ جس کسی سے بھی ملتے ہیں۔ پیچھا کرنے والے ان کی بھی فائلیں کھولتے جاتے ہیں۔ اگر وہ بظاہر پاگل۔ نام نہاد ریسرچ سکالر۔ جعلی انقلابی۔ اگر وہ وہی کچھ ہے جواب میں سمجھ رہا ہوں کہ وہ ہے...... جن کے پیچھے جیسا تم کہتے ہو لوگ لگے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہی...... تو" یک دم باس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔" تو پھر پروفیسر میں اب ایک نشان زدہ آدمی ہوں...... مائی گاڈ...... میں سمجھتا تھا کہ بس میرے وقت کی بربادی ہوئی ہے۔ طبیعت اس کی واہیات بکواس سے منغض ہوئی ہے اور بس ختم...... مگر نہیں...... یہ تو...... اور پھر اسے زندہ جلانے کا فیصلہ کیا انہوں نے۔ پروفیسر تم نے اسے یہاں لا کر میرا بہت بڑا نقصان کیا۔ تمہیں اس کا جواب دینا پڑے گا"۔

پروفیسر نذیر بشیر نے اس گھڑی پر ہزار بار لعنت بھیجی جب اس کے دل میں یہ ترنگ آئی تھی کہ کبیر مہدی کی آگ والا واقعہ اس افسر سے مل بیٹھنے اور تجدید تعلقات کا ایک اچھا بہانہ بن سکتا ہے جو چند ہفتوں بعد ہی اس کے اپنے محکمے کا ایک بہت بڑا افسر بننے والا تھا۔ مگر وہ مل بیٹھنا خوفناک صورت اختیار کر رہا تھا جس سے نکلنے کا اب اس کے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا۔

"تم نے پہلے کیوں مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ اس طرح کا خطرناک آدمی ہے۔ جنہیں وہ ادارے......"۔

"مجھے...... مجھے...... سر...... مجھے خود پتہ نہیں تھا...... میں...... میرا مطلب ہے کہ میں...... اتنا پتہ نہیں تھا۔ جتنا آپ کو پتہ ہے...... میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ میں اللہ رسول کی قسم کھاتا ہوں...... مجھے اپنے بچوں کی قسم...... میں......"

"پلیز...... پلیز...... پروفیسر صاحب...... مجھے حد سے زیادہ Annoy مت کریں۔ آپ کو کچھ تو پتہ تھا۔ آپ کو یہ بھی پتہ تھا کہ میں جس حساس کرسی پر بیٹھا ہوں۔ ایک ایسا شخص جیسا کہ پتہ چل رہا ہے کہ وہ ہے...... تھا؟ ہے۔ ویسے شخص کا یہاں آنا اور اتنی دیر تک یہاں اندر رہنا اور پھر میرا سیکورٹی کے عملے کو بلوا کر اسے نکلوانا...... اور پھر کچھ عرصہ بعد اس کا مشکوک حالات میں زندہ جل جانا...... یہ سب کچھ...... اگر اُدھر رپورٹ ہو گیا تو؟"

"اُدھر کدھر سر؟"

"شٹ اپ"۔

"یس سر"۔

"اچھا یہ بتائیں، اب غور سے سُنیں۔ اُس نے کب کہا تھا کہ وہ لوگ اُس کا پیچھا کرتے یہاں تک آن پہنچے ہیں۔ یہاں میرے آفس سے نکلنے کے بعد ہی یا کچھ قریب یا کہیں آ گے۔"

پروفیسر نے کہا "تقریباً"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ تقریباً" صاحب گرجا۔

"جی...... جی...... میرا مطلب ہے کہیں باہر ہی سر۔ برآمدے میں......" پروفیسر نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"برآمدے میں، او مائی گاڈ......"

دل کو گھبرا دینے والی خاموشی پھر دونوں میں ٹھہر گئی۔ پروفیسر کا جی چاہا کہ یا تو زمین اُسے رستہ دے یا ہوا اُسے اپنے میں تحلیل کر لے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوتا دیکھ کر وہ کرسی کے اندر پیچھے کی طرف ایسے بیٹھنے لگا جیسے وہیں سکڑ کر غائب ہو جانا چاہتا ہو۔ صاحب کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

" Now get out ۔ جاؤ۔ نکل جاؤ"۔

پروفیسر کمان سے نکلے تیر کی طرح بھاگ جانا چاہتا تھا مگر وہ دہلانے والی آواز پھر پڑی۔

"ٹھہرو"۔

اور پروفیسر نذیر بشیر انہیں قدموں پر پھر وہیں جام ہو گیا۔"

"جی...... جی...... سر......"

بیٹھو...... بیٹھو اِدھر...... ابھی تم جا نہیں سکتے۔ بیٹھو اِدھر۔"

اور پروفیسر اُدھر بیٹھ گیا۔ صاحب نے ٹیلی فون پر نمبر ڈائل کیے اور تھوڑے وقفے کے بعد کہا "ہیلو...... ہاں ایڈیٹر صاحب سے بات کرواؤ۔ میں فرحان مسعود بول رہا ہوں۔ خاموشی کے اس وقفے میں جب کہ صاحب ریسیور کو کان سے لگائے اپنے منتظر کان کی کلفت کو آنکھوں کی راہ سے پروفیسر پر گزار رہا تھا، پروفیسر نے اس غیر موجود شخص کی موجودگی کو شدت سے محسوس کیا جو اس کی اس سب مصیبت کا باعث بنا تھا۔ اُس نے کبیر مہدی کو چشم تصور میں پہلی بار دیکھا اور اپنے دوسرے حواس سے بھی اُس کو مجسم کیا۔ ایک جلا ہوا۔ سیاہ ہوا شخص جسے پہچاننا مشکل ہے۔ جس کے قریب کھڑے ہونے پر جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔ پھر یہ بو جراثیم کش ادویہ کی تیز خوشبو میں غائب

ہو جاتی ہے۔ ایک خوبصورت عورت جس کے بازوؤں پر جلنے کے نشان ہیں اُس کے پاس کھڑی ہے اور تمارداری کے لیے آنے والوں کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔" یہ پروفیسر تنزیر جیز ہیں" جلا ہوا شخص اُس کا تعارف خوبصورت عورت سے کراتا ہے اور وہ اور بھی ناپسندیدگی سے اُس کی طرف دیکھتی ہے۔ "یہ کیسے ہو گیا کبیر صاحب، کیا ہو گیا؟" اور عورت اُسے فہمائشی انداز میں کہتی ہے کہ اُسے زیادہ بولنے سے منع کیا گیا ہے...... صاحب کی آواز اچانک اُبھرتی ہے شاید وہ نرس بھی رہا ہے۔ "نہیں جناب، میرا اُس شخص سے کیا تعلق ہونا ہے۔ میں نے تو اس لیے پوچھا۔ آپ باخبر لوگ ہیں وہ دراصل...... وہ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ایک صاحب ہیں اُن کے ساتھ وہ یہاں میرے دفتر آیا تھا جی سفارش لے کر ہی آیا سمجھیں۔ جی کوئی نوکری کے چکر میں ہی تھا۔ مگر مجھے تو بہت مخبوط الحواس سا لگا میں نے دفتر سے نکلوا دیا" صاحب ہنستا ہے اور کہتا رہتا ہے۔ "نہیں جناب ایسی کوئی بات نہیں ایسے الزام نہ لگائیں۔ جی...... تو خیر...... مجھے ایسے ہی تجسس ہوا جب پتہ چلا......" صاحب پھر پروفیسر کو نظروں سے جکڑ لیتا ہے۔" اور سنائیے۔ جی...... جی...... جی جی...... جی ہاں...... جی جانتا ہوں...... ارے نہیں صاحب...... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ نجم الثاقب...... جی جانتا ہوں وہ عصری، شاید یہی نام ہے ڈائجسٹ والے...... نہیں کیا ضرورت ہے میری ملاقات...... جی جانتے ہوں گے...... چھوڑیں...... جی...... بس جلد ہی ایجوکیشن میں جانے والا ہوں۔ جی۔ بالکل قوم کی خدمت کے لیے...... آپ سر میں نہیں جانتا کن معنوں میں فرما رہے ہیں مگر میں...... ایسی ہی کوشش کرتا ہوں"...... پروفیسر نے استنتاج کیا کہ ایسی سے مراد یقیناً قوم کی خدمت ہی ہوگی اور اچانک اُس نے محسوس کیا کہ صاحب اپنے فارغ ہاتھ کی اُلٹی طرف سے اس کی طرف ویسے ہی اشارے کر رہا ہے جیسے مکھی کو اُڑانے کے لیے کیے جاتے ہیں اور اُن اشاروں سے اگر انسان کے لیے ہوں تو انہیں الفاظ کا استنتاج کیا جا سکتا ہے کہ "جا...... جا دفع ہو جا......"

فٹ پاتھ پر پہنچتے ہی ذلت اور توہین کا ہڈیاں کھوکھلا کرنے والا احساس پروفیسر پر حاوی ہو گیا۔ مدتوں سے اب کبھی اُسے ایسے احساس کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بقول اُس کے 'بے عزتیاں کرنے والوں' کی نفسیات اُس سے بہتر کوئی نہیں سمجھتا تھا اور وہ انہیں اس خطرناک حد تک جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ مگر آج اُس کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اُس نے منہ کھول کر ایک طویل سانس لینا چاہا تو اسی لمحے قریب سے گزرتی ایک سواری نے گرد اور لید کا مہین غبار اُس کے منہ کے آگے

اُڑا دیا۔ اس نے تیزی سے تھوکا تو تھوک کا کچھ حصہ اُس کی پتلون کے نچلے حصے پر گرا۔ یہ وہ لمحہ تھا جو بتاتا تھا کہ اب اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ ذلت کے اس کال لمحے کے بطون سے پھر اُس شخص کا ہیولا نمودار ہوا جو موجود نہیں تھا اور پروفیسر کو ایک چونکانے والی سنسناتی لذت کا احساس دے گیا۔ اُس نے ایک گندی گالی صاحب کو دی اور پھر اُسے مخاطب کیا "تیرے ساتھ کبیر مہدی نے جو کیا تھا وہ بہت اچھا کیا تھا۔" گالیاں اُس کے اندر سے بول رہی تھیں اتنی بلند کہ اُسے خطرہ ہوا کہ کہیں ساتھ گزرنے والے سُن نہ رہے ہوں۔ صاحب کے دفتر میں کبیر کی اُس ہنگامہ آرائی کا ایک ایک لمحہ بڑے شہر پر اُترتا تھا اور بڑا شہر جادو کا شہر تھا جو اُس شخص کے ہر تصور کے ساتھ قہقہے لگاتا اور رنگ بدلتا تھا۔ ماضی سے اُٹھ کر آنے والی ہستی نے کبھی اُس روزمرہ کے دانش مند ملازمتی زمانہ ساز، ناقابلِ رحم، محتاط تعلیم باز شخص کی ہستی کو اس طرح سرشار نہیں کیا تھا۔

O

آگ اس قدر شدید تھی کہ کاغذ کی بنی کسی شے کے بچ جانے کا تصور بھی ناممکن تھا۔ گھونسلے کی چھت کے لوہے کے گرڈر بھی پگھل گئے تھے۔ لکڑی کی کڑیاں راکھ ہو گئی تھیں اور چھت کی جگہ اب آسمان تھا۔ فائر بریگیڈ کے جس اہلکار نے دیوار کے ساتھ پڑے پٹرول کے کنستروں کی خبر زمانے کو دی تھی اُس نے اب تفتیشی افسر کے سامنے تسلیم کر لیا تھا کہ اُسے یقین نہیں کہ کنستر پٹرول کے تھے یا موبل آئل کے یا سرسوں کے تیل کے۔ سب کچھ جلنے کے بعد ملبے کے ڈھیر میں بدل چکا تھا۔

دنیا آگ سے واپس آ چکی تھی اور اس امر کی تصدیق وہ بارش کرتی تھی جو آگ کے بعد کی پہلی بارش تھی۔ پانی کی عظیم سطحیں بڑے شہر پر اُترتی تھیں اور دھواں دھار برستا پانی جلے ہوئے کاغذوں کو اپنے اندر حل کرتا ایک سیاہ رنگ کے مائع کی صورت میں سندر شام روڈ پر بہائے لیے جا رہا تھا اور دیکھنے والوں کو حیران کرتا تھا۔

امداد حسین نے بارش کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا۔ آگ کے بعد یہ پہلا اطمینان تھا جو اُسے ملا تھا۔ ورنہ وہ سمجھتا تھا کہ جو بدبختی اُس پر ٹوٹی ہے اُس کا کوئی توڑ نہیں۔ چلو اب یہ پانی کم از کم جلی ہوئی کتابوں کی راکھ کو بہا لے جائے گا۔ کچھ صفائی دھلائی خود بخود ہو جائے گی۔ ملبہ اُٹھانے والوں کو آسانی ہوگی۔ ہوا ہو تو جلے ہوئے کاغذوں کو اُڑانے کی شرارت ضرور

کرتی ہے۔ مگر پانی ہو تو سمجھداری سے سب کچھ سمیٹ کر ساتھ بہالے جاتا ہے۔ سمندر شام روڈ
کے قہوہ خانے میں بیٹھے امداد حسین نے سوچا۔

وہ قہوہ خانہ اُس کی تباہ و برباد دوکان کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری جانب تھا۔
امداد حسین دن بھر وہیں بیٹھا سامنے اپنی بربادی کا منظر دیکھتا رہتا تھا۔ قہوہ خانے کا مالک اور اُس کا
پرانا دوست صدیق کام کے وقفوں کے بیچ اُس کے پاس آ بیٹھتا تھا اور پھر وہ دونوں کبیر مہدی کی
بات کرتے تھے۔ بادل زور سے گرجا اور بارش اور بھی تیز برسنے لگی۔ صدیق چائے کی دو پیالیاں
اُٹھا کر لایا اور ایک اُس کے اور دوسری اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ امداد حسین نے سامنے اپنی
دوکان کی چھت کی سیڑھیوں سے نیچے سڑک پر آتے کالے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ایسا نہیں لگتا صدیق کہ لاکھوں کروڑوں لفظوں کی سیاہی دُھل کر پانی میں بہتی جا رہی ہے۔"
صدیق نے چائے کا گھونٹ لیا اور امداد حسین کی طرف تشویش سے دیکھا۔ اُسے شک ہوا کہ اتنے
بڑے نقصان نے بوڑھے کے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ "اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔
بھائی امداد کوئی اور کاروبار کرنے کا سوچو۔"

"کوئی اور کاروبار! میں نے ساری عمر پرانی کتابوں کو سونگھنے کا کاروبار کیا ہے یہی پھر
کروں گا۔ مگر وہ جو میرے ساتھ کاروبار میں شامل تھا وہ پڑھتا بھی تھا، لکھتا بھی تھا اور کتابوں کے
ساتھ سوتا بھی تھا۔" امداد حسین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور دُکھ کی چھُری اُس کے اندر پھر گئی۔

"اب حال کیسا ہے اُس کا؟ چائے پی لو، بارش نے ٹھنڈک کر دی ہے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"
صدیق نے کہا۔

"کچھ پتہ نہیں۔" امداد حسین نے پھر آہ بھر کر کہا۔ "وہ جو عورت اور وہ جو دوست، ڈاکٹر جو
ہے، وہ کسی کو اُس سے ملنے نہیں دیتے۔ خاص کر وہ عورت۔ بس یہی خبر ملتی ہے۔ دعا کرو۔ اللہ فضل
کرے۔ یہ سب تو جبھی کہتے ہیں جب کوئی امید نہ ہو۔" صدیق کے ہونٹوں پر ایک متحیر مسکراہٹ
نمودار ہوئی اور بزرگوں کے بیان جیسے انداز میں اُس نے کہا۔

"کیا عورت تھی جی وہ۔ بھائی امداد حسین کیا عورت تھی، اُس نے نہیں دیکھا آگ کو۔ اس نے
نہیں دیکھا تپش کو۔ اس نے نہیں دیکھا آپ جل کر مر جاؤں گی۔ میں کہتا ہوں تیرے وہ گیلے کمبل نہ
بھی ہوتے تو بھی وہ جاتی سیدھی اُس دوزخ میں۔ اپنے بندے کو بچانے۔ ابھی وہ جو مرد ساتھ تھا وہ

واویلا ہو گیا تھا۔ میں تمہیں بتاؤں۔ پر گیا جی وہ بھی ساتھ گیا آخر، بڑی بات ہے۔"

"ہاں جی بڑی بات ہے"۔ امداد حسین نے اپنے ہی کسی کاغذی یقین سے کہا اور پھر بولا
"بڑی بارش ہے یہ تو صدیق" اُس نے پہلی بار اُس بارش پر حیرت کا اظہار کیا مگر صدیق بدستور
آگ کے مناظر دیکھ رہا تھا۔

"ایسے بازوؤں پر پھول کی طرح اُٹھا کر لے گئے۔ پر میں کہتا ہوں۔ باؤ کبیر کی آنکھ کیوں
نہیں کھلی۔ ذرا پہلے جاگ جاتا تو دروازہ کھول کر نکل جاتا۔"

"پٹرول کا اثر اور دھواں بے ہوش کر دیتا ہے"۔ امداد حسین نے ایسے موقعوں کے سوال
جواب کا وہی جواب دیا جو اب کسی بھی پوچھنے والے کو دیتا تھا اور بات ختم ہو جاتی تھی۔ مگر صدیق
نے کچھ آگے بات کی "اب کہتے ہیں یہ پٹرول وغیرہ کا چکر ہی نہیں تھا۔۔۔۔" بادل پھر زور سے گرجا
اور کڑک کر بجلی کہیں دھماکے سے گری، اور پھر صدیق نے بھی بارش پر حیرت سے کہا۔

"یہ تو بڑا طوفان ہے یار۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو پانی تھڑے سے آ لگا ہے۔"

"ہاں وہ صرف پٹرول کا چکر نہیں تھا" امداد حسین نے کہا اور ہارے ہوؤں کی خشک مختصر ہنسی
ہنسا "وہ چکر ہی اور تھا۔ میں جانتا نہیں تھا پر دل سمجھ جاتا ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا تھا مگر وہ
باز نہیں آیا تھا۔"

"دشمنی بھی بڑی ظالم ہے۔" صدیق نے کہا۔

"دشمنی چھوٹی سی بات ہے وہ کچھ اور ہی بات تھی۔ کیا بتاؤں، وہ کچھ ہوتے ہیں اور ہی
ہوتے ہیں، جو نہیں چھوڑتے۔ کچھ کر لو۔ کہیں چھپ جاؤ۔ غائب ہو جاؤ نہیں چھوڑتے۔ میں نے
سمجھایا جیسے کوئی میرا اپنا چھوٹا بھائی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پر نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہونی ہوئی تھی۔" صدیق نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ ہوئی" امداد حسین نے اتنا کہا اور پھر چونک کر کہا "دیکھو پانی تو تھڑے کے اوپر
آ گیا ہے۔"

اُس نے سامنے پڑی ٹھنڈی چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ سمندر شام
روڈ جو نہر کی طرح بہہ رہی تھی اب رک کر آہستہ آہستہ اوپر کو بلند ہونے لگی تھی۔ ہر طرف سے آ کر
آپس میں ملتے پانی اپنی مشترکہ سطح کا پھر سے تعین کرنے کی سازش کر رہے تھے اور بڑے شہر میں

قرقاب بستیوں کی پہلی نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔

O

طب کے طلبا مسلسل برستی بارش کی آواز کے پس منظر میں طب کے استاد معالج اور جراح کا جلے ہوئے زخموں کے عمل جراحی کا بیان سنتے تھے۔ "سیکنڈ ڈگری گہرے اور تھرڈ ڈگری کے تمام جلے کے زخموں کا اندمال اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک ان پر صحت مند جلد کی تہہ مریض کے جسم کے ہی صحت مند حصوں سے عمل جراحی کے ذریعے اُتار کر نہ جمائی جائے۔ بعض اوقات ایسی کئی Crops کو گرافٹ کرنا پڑتا ہے۔" اس پر طب کے کسی طالب علم کو برن سینٹر کے کسی مریض کا فقرہ یاد آ گیا جب وہ مطالعاتی راؤنڈ پر تھے۔ "اس کا مطلب یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ میرے جسم کے زرخیز حصوں کو میرے جسم کے بنجر حصوں پر کاشت کیا جائے گا۔ میں اس زراعت میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔" اس پر طلبا کا گروپ ہنس پڑا تھا اور وہ عورت تھی جو مریض کی تیماردار عورت تھی۔ اس نے مریض کی طرف قربان ہو جانے کے انداز میں دیکھا تھا۔ مریض بھی ہنسا تھا یا ہنسنے کی کوشش کی تھی اور تکلیف کی لہریں اس کے جسم میں دوڑ گئی تھیں۔ تو ویسی ہی لہریں اس عورت کے چہرے پر بھی دوڑ گئی تھیں۔ طب کے کسی طالب علم نے سوچا، جلد جو لگائی جاتی ہے اُس کے اندمال کے عمل میں اُس کو سکڑنے سے بچانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ جسم کا وہ حصہ مسخ ہو جاتا ہے اور عمر بھر کے لیے بد ہیئت ہو جاتا ہے۔ طب کے کسی طالب علم کو پھر کسی مریض کی باتیں یاد آ گئیں۔ "ڈاکٹر صاحب جب آپ مجھے میری جلد میں پھر سے لپیٹ کر یہاں سے رخصت کریں گے تو کیا دنیا پھر مجھے پہچان لے گی؟" "جو تمہیں پہچانتے ہیں انہیں پہچاننے میں کچھ وقت نہیں ہوگی" عورت نے بے ساختہ کہا تھا اور پھر شاید کچھ شرمندہ سی ہوئی تھی۔ کہ اُسے اُس سائنسی معروضی ماحول میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر طب کی کچھ طالبات اور طلبا کے گروپ میں راؤنڈ کے بعد پھر یہ بحث چھڑی تھی کہ وہ عورت اُس شخص کی کیا ہے اور وہ شخص اُس کا کیا ہے اور اُس بحث کے وقت بھی بارش جاری تھی اور طب کے کسی طالب علم کو کسی مریض کا وہ فقرہ پھر یاد آ گیا جو بارش کے بارے میں تھا "ڈاکٹر صاحب مجھے اس بارش کا بہت انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آئے گی اور جب یہ آئے گی تو وہ وقت آئے گا جب ہم" اُس نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا

تھا۔ "جب ہم اپنے انعام کی سرزمین میں جائیں گے۔" شاید اُس نے کہا تھا اور عورت کی آنکھوں میں نمی کی تہہ اُبھر کر غائب ہو گئی تھی اور مریض کہہ رہا تھا۔ "یہ بارش زمانوں کو ختم کرنے والی آخری بارشوں جیسی ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا مگر دور سے سُن سکتا ہوں اور سونگھ سکتا ہوں۔" طب کے کسی طالب علم کے ذہن میں کوئی سوال اُبھرتا ہے وہ ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے۔

"سر میرا ایک سوال ہے۔ برن کا مریض تھرڈ ڈگری اور سیکنڈ ڈگری کے خراب کیس کا میرا مطلب ہے ایسا کیس سر۔ جب ابتدائی شاک کے پیریڈ سے نکل جاتا ہے۔ سر کچھ Stable ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی جلد کی گرافٹنگ شروع ہوتی ہے اور اُسے Deform ہونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے تو اس طویل Hospitalization کے پیریڈ کے دوران سر..... اس کی ذہنی حالت بھی کیا متاثر نہیں ہوتی۔"

"یہ آپ کا ایک سوال تھا یا دس سوال تھے۔" پروفیسر نے کہا اور کلاس ہنس پڑی اور پروفیسر نے پھر کہا۔ "یقیناً اس عمل میں مریض بہت سی Stressful کیفیتوں سے گزرتا ہے۔ مگر آپ فی الحال مجھے اس میں Involve نہ کریں۔ یہ شاک اور Trauma کے پروفیسر صاحب سے پوچھیں وہ اس پر بھی لیکچر دیں گے۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ برن کے مریضوں کی Care اور تیمارداری انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور بہت ہی صبر آزما کام بھی ہے۔ لیکن ابھی ہم اس بے انتہا اہم سبجیکٹ پر بات کرتے ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ سکن گرافٹ جو ہوتا ہے اس میں ایک تو پوری تہہ کی تہہ جمائی جاتی ہے۔ جسے Sheet graft کہتے ہیں اور یہ دوسرا جو ہے اسے Meshed graft بولتے ہیں۔" پروفیسر نے ایک ہاتھ کی چار کھلی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی چار کھلی انگلیوں کے اوپر رکھ کر چار خانہ بنانے کا تصور طلبا کو دیا اور کہا "اسے توجہ دیں یہ بے انتہا اہم موضوع ہے۔"

اور طب کے کسی طالب علم نے سوچا بے انتہا اہم تو تیمارداری ہے۔ جیسے وہ کوئی عورت اُس کسی مریض کی تیمارداری کرتی ہے۔ مگر جو کچھ وہ کرتی ہے اس کو تو تیمارداری جیسا عام سطحی نام دینا مشکل ہے۔ ماں بچے کی تیمارداری ہی نہیں کرتی اُس کی بیماری کو مکمل خود جھیلتی ہے۔ مگر وہ عورت اُس کی ماں نہیں۔ طب کے طلبا کے اُس گروپ میں اس موضوع پر پھر بحث ہوتی ہے اور بعض جذباتی طالبات کی آنکھوں میں نمی آ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ وہ مریض کسی بھی لمحے مر سکتا ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ اگر وہ مر گیا تو وہ عورت بھی یقیناً مر جائے گی اور سب اپنے اپنے طور پر کچھ

Scanned by CamScanner

کے بغیر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ یہ ایسا موضوع ہے جس پر طب ابھی خاموش ہے اور بادل بھی خاموش تھے اور بھورے رنگ کے تھے۔ جن کی بارش ویسی پھوار کی صورت مسلسل برس رہی تھی اور کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ گرجتے اور تیز بارش برسا کر نکل جانے والے بادلوں سے یہ دھیمے برسنے والے کہیں زیادہ ہلاکت خیز ہیں۔

O

پاؤں کے نیچے خشک مٹی تیزی سے چھنتے جانے کا احساس ایک آفاقی سراسیمگی کی صورت میں بڑے شہر کے مکینوں پر اتر آیا تھا۔ آفتِ سماوی کے آنے اور آ کر ٹھہر جانے پر اب دائمی رجائیت پسندوں کو بھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ کردہ اور ناکردہ گناہوں کی پاداش پر وہ خاموش مکالمے کرتے تھے اور جب خالقِ کائنات سے رحم کے طلب گار ہوتے تھے تو مساجد میں اذانیں بلند ہوتی تھیں۔

پانی ڈاکٹر ناصر کے گھر میں بھی ویسے ہی داخل ہوا تھا جیسے اور ہزاروں گھروں میں۔ لوگ اُسے دہلیزوں کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ بلند ہوتا دیکھتے رہے پھر جب وہ اس حفاظتی بلندی سے بھی اوپر چلا جاتا تو گھروں کی مٹی اُس کے سامنے بھیگتی چلی جاتی تھی اور پانی اشیاء کو تیر جانے والی اور ڈوب جانے والی، کی ازلی تقسیم سے دوچار کرتا برآمدوں، خواب گاہوں، مہمان خانوں، باورچی خانوں، غسل خانوں، چھوٹے کمروں، بڑے کمروں، اگلے کمروں، پچھلے کمروں، درمیانے کمروں، گھاس کے قطعوں، روشوں، گیراجوں، سیڑھیوں، جانوروں کے کھڈوں، دائروں، تکونوں، مستطیلوں اور دوسری سب ہندسی اشکال کی خشک سطحوں پر پھیلتا چلا جاتا تھا۔ لوگ جب دیکھتے تھے کہ پانی کی سطح اُن کی خلوت کی بے مدافعت جگہوں میں، بند الماریوں میں اور محفوظ آہنی تجوریوں کے اندر بھی وہی ہے جیسی گلیوں، بازاروں، کھلی شاہراہوں، کھیتوں، اور میدانوں میں ہے تو اُس آبی مساوات کی دہشت اُن کے دلوں کو منجمد کر دیتی تھی۔

ناصر، اُس کی ماں اور بھائی کو پانی نے جتنا موقع دیا وہ اُسی قدر گھریلو اشیا، الماریوں، صندوقوں میں بند چیزیں اور روزمرہ کا سامان بچا کر بالائی منزل تک لا سکے۔ وہاں ایک ہی کمرہ تھا اور ایک ادھورا سا برآمدہ۔ دونوں کی اطراف میں سے لوہے کے سریے باہر نکلتے تھے جو اس بات کی نشانی تھی کہ ابھی

وہاں اور تعمیر ہوگی۔ یہ تعمیر رہ چند کمرے اور مکمل برآمدہ، ناصر کی ماں کا خواب تھا جسے بیٹے کے ڈاکٹر بننے کے بعد شادی ہونے سے پہلے حقیقت بننا تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور پانی آ گیا تھا اور وہ ادھورے برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھی تیل کے چولہے کو جلانے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی۔ جبکہ دوسرے کونے میں ناصر ایک چارپائی پر رکھے بہت سے گول لپیٹے ہوئے بستروں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور سامنے ڈھیری اپنے کمرے کی اُن چند چیزوں کو دیکھتا جا رہا تھا جو بچ گئی تھیں۔

ناصر کی ماں نے ایک اور دیا سلائی جلائی اور شعلے کو چولہے کی بتیوں کے قریب لے گئی۔ وہی ایک بتی جو ہر بار جل اُٹھتی تھی وہ اب بھی جلی مگر اس کے بار بار جلنے سے لَو کم ہو گئی تو دوسری بتی بھی جل اُٹھی اور پھر تیسری نے بھی آگ پکڑ لی تو ناصر کی ماں کو اطمینان ہوا کہ چولہا کام کرے گا۔ اُس نے ہزارویں مرتبہ پھر آسمان کی طرف دیکھا جو ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ سے تھا بھورے بادلوں سے بھرا اور مسلسل پھوار برساتا۔ اُس نے باورچی خانے میں سے تیزی سے سمیٹ کر لائی گئی چیزوں کے ڈھیر میں سے دال کا ایک لفافہ منتخب کیا اور کہا "یہ آفت ہے اور کچھ نہیں بچے گا۔"

ناصر نے بستروں کے رول کو اپنی کمر سے پیچھے کی طرف دبایا اور اُنہی بچ جانے والی چیزوں کی طرف سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ یہ طب کی کچھ کتابیں تھیں۔ اُس کی ڈگریاں اور زمین اور مکان کے کاغذات تھے۔ موسیقی سنانے والے کچھ برقی آلات تھے۔ کیمرہ تھا۔ جوتے تھے۔ کپڑے تھے اور چہرے اور جسم کو بنانے سنوارنے والے کچھ لوازمات تھے اور وہ رجسٹر تھا جسے کبیر بلال رجسٹر کہا کرتا تھا اور اُس میں اپنی تحریروں کے بارے میں طرح طرح کے اعلان کرتا رہتا تھا اور اُن تینوں کے دلوں میں موہوم رازوں کی تجسیں جگاتا رہتا تھا۔ ناصر نے ماں کا کہا سُنا تو اُس کے دل نے خواہش کی کہ کاش اُس کی پیش گوئی پوری ہو چکی ہوتی اور کچھ بھی اس بڑے سیلاب کے سامنے بچ نہ پایا ہوتا۔ جھلسے ہوئے کاغذوں کا وہ پلندہ بھی جسے وہ آگ سے بچا لایا تھا۔ اگر اُس نے اُسے وہیں پڑا رہنے دیا ہوتا جہاں وہ گذشتہ کئی روز سے رکھا تھا تو اس کی لکڑی کی الماری کے نچلے خانے میں اس کی کتابوں اور پرانے نوٹس کے بنڈلوں کے ساتھ تو رات جب پانی چپکے سے گھر میں داخل ہوا تھا تو یہ بھی بالآخر گھر کی برباد ہونے والی چیزوں کا مرتبہ حاصل کر کے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور پھر شاید آہستہ آہستہ وہ سب لغزشیں، خدشے، لذتیں، محبتیں، منصوبے، اور آگ سے پہلے کے زمانوں میں جب 'لا لکھائی' پر وہ اپنے مخصوص انداز میں فقرے بازی کیا کرتا تھا تو ناصر کا

Scanned by CamScanner

دل اُس خفیہ تحریر کے راز جاننے کی ہوس سے بھر جاتا تھا۔ وہ ہوس اور ظاہری ارادے جو اُس رات زہرہ کے ساتھ آگ میں کود کر کبیر کو اور زہرہ کو کچھ بتائے بغیر چپکے سے اُس کی تحریر کو جسے کبیر تحریری بک بک کہا کرتا تھا بچالانے کا سبب بنے تھے، وہ سب کیفیتیں بھی ایک ایک کر کے وقت کی دبیز خود فراموشی کے ساتھ ساتھ اُس کے دل سے اوجھل ہو جاتیں اور اُسے اُس احساسِ گناہ سے شاید نجات مل جاتی جو اب ہر وقت اُسے گھیرے رہتا تھا جب کہ ہر طرف پانی برستا تھا۔

مگر وہ نجات اُس کے گزشتہ شب کے معمولات میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کے باعث اُس کا مقدر نہ بن سکی۔ سونے سے پہلے ناصر نے پھر ہزار ردوکد کے بعد پھر اُس جلتے ہوئے مخطوطے کے اندر جھانکنے کا ارتکاب کیا جسے کبیر 'لالکھائی' کا شاہکار کہا کرتا تھا۔ مگر اب اس کا اندر اُس متلاہٹ سے بھرا تھا جس کا سامنا ممنوعہ نظاروں کا شدید تجسس کرنے اور پھر اس تجسس سے بچ جانے کی بھی اتنی ہی شدید خواہش کرنے والوں کو کرنا پڑتا ہے۔ ہوس کی ان دونوں شدتوں کو بیک وقت مطمئن کرنے کے لیے اُس نے یہ طریقہ نکالا، بلکہ وہ طریقہ خود بخود سامنے آ گیا، کہ جیسے وہ دیکھ رہا ہے اور نہیں بھی دیکھ رہا۔ پڑھ رہا ہے اور نہیں بھی پڑھ رہا۔ وہ کہیں سے بھی رجسٹر کھول کر جہاں کہیں بھی نظر گرتی کچھ پڑھ لیتا اور پھر آگے تک پڑھ جانے سے پہلے ہی بند کر دیتا۔ اور سوچتا کہ اول سے آخر تک پڑھنے کا حوصلہ اُس میں نہیں۔ کیا وہ خوفزدہ ہے کہ یہ ایک برباد کر دینے والی پڑھائی ہو گی۔ اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر نیلے رجسٹر کو کہیں سے بھی کھول کر کہیں سے بھی پڑھ لیتا۔ "لالکھائی" کی 'لا پڑھائی' کی تھوڑا تھوڑا جرم لادنے والی اس روزمرہ کی حرکت کے بعد ناصر نے روزمرہ کے معمول کے خلاف رجسٹر کو نچلے خانے میں رکھنے کی بجائے درمیانے خانے میں رکھ دیا۔ رات پانی آیا اور Gray کی اناٹومی اور سائیکیاٹری کی قیمتی کتابوں کو برباد کر گیا مگر نیلا رجسٹر آگ سے بچنے کے بعد پانی سے بھی بچ گیا۔

ناصر نے رجسٹر اُٹھایا اور کھولا اور پڑھا ...... "نیلا رجسٹر ایک انجانی نجی دنیا ہے۔ ایک ایسا ادب جو صرف میرے لیے ہے۔ لیکن اگر یہ صرف میرے لیے ہے تو کاغذ کی سطح پر (جو کہ غیر ہے) اسے نشانات کی صورت اُتارنا کیا ضروری ہے۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ یہ ہے۔ میرے اندر کہیں۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے کوئی شک نہیں۔ مجھے کسی کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں..... ایک لفظ کے بغیر کوئی ادب ہو سکتا ہے۔ ایک لکیر کھینچے....." (بند) پھر کھولا پھر پڑھا...." پیارے قاری ہم فرض

کر لیتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ زہرہ کون ہے ناصر کون ہے بالف مین کون ہے اور باقی بھی میری دنیا میں کون کون ہے....." (بند) پھر کھولا پھر پڑھا....." میں لفظوں کی تنگی کرتا ہوں۔" (بند)..... پھر کھولا پھر پڑھا۔ "ایک انوکھی خاص تحریر کی ہوس مجھے دیوانہ کر رہی ہے جس....." (بند) پھر کھولا پھر پڑھا "زہرہ بند پرانے طرز کے کواڑ کو بائیں طرف حرکت دیتی ہے اور کھناک کی بلند آواز سنسان برآمدوں میں پھیل جاتی ہے۔ اب صرف....." (بند) پھر کھولا پھر پڑھا۔ "مختصر یہ بات سامنے آئی کہ فرسٹ سیکرٹری نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بالف مین کسی طرح سبھی مرکبات کے ذخیرے تک رسائی حاصل کر سکے....." (بند)۔ پھر کھولا پھر پڑھا۔ "25 اپریل دن گیارہ بجے گھونسلے میں۔ اس عظیم دن کے ان عظیم لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنا ایک عجیب تجربہ ہے۔ زہرہ سے وہ جسمانی قربت میرے لیے......." (بند)۔ پھر کھولا پھر پڑھا "بادشاہ جو ملک اور رنڈی کے بیچ مارا گیا۔ دیکھو طیب شاہی کے اعترافات۔ گنجینۂ شفا صفحہ نمبر 83-86"..... (بند) پھر کھولا پھر پڑھا۔ "میں"۔ "یقیناً جناب آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ مگر ہم بھی کوئی فالتو لوفر وغیرہ نہیں ہیں"......... (بند)۔ پھر کھولا پڑھا۔ "پادری میکنائز کی داستانِ الم ایک دم کسی اور ہی مطلعے میں داخل ہو گئی"..... (بند)۔

نمناک ہوا میں اُبلتی ہوئی دال کی خوشبو ناصر کو بھلی لگی۔ اُس نے رجسٹر بند ہی رہنے دیا اور اپنے بھائی اور ماں کی گفتگو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ پینے کا پانی نچلی منزل سے ربڑ کے پائپ کے ذریعے اوپر لانا ممکن نہیں تھا۔ جو قطرہ قطرہ مہین دھار نیچے آتی تھی اُسے نیچے سے ہی برتنوں میں سمیٹ کر اوپر لانا ہوگا۔ پیاس کے بے پناہ احساس نے ناصر کی روح کو خشک کر دیا۔ اُس کے بھائی نے امداد طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے پانی سے بچ جانے والی اپنی چیزیں ایک بڑے کپڑے کے تھیلے میں ڈالیں اور پھر دونوں بھائی نیچے جا کر پینے کا پانی اکٹھا کرنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور اُسی لمحے انہوں نے وہ آواز سنی۔ وہ ایک گڑگڑاہٹ تھی جو فوراً ہی ایک ارتعاش میں بدل گئی جس کا خاتمہ ایک بھاری دھمک دار قرقراہٹ میں ہوا۔ جیسے آسمان سے کچھ ٹوٹ کر زمین پر گرا ہو۔ تینوں کی خوفزدہ سوالیہ نظریں ایک دوسرے کی طرف اُٹھیں۔ پھر انہیں نیچے اپنے صحن میں سے پانی کی شپ شپ کی آوازیں سنائی دیں۔ جھانکنے پر انہیں عجیب منظر نظر آیا گھر کے اندر گھسے ساکن پانی میں کہیں باہر سے لہریں آ رہی

Scanned by CamScanner

تھیں اور پانی دیواروں اور آدھی ڈوبی چیزوں سے ٹکرا کر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ پھر قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور ناصر کا بھائی سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہے۔ سول انجینئرنگ کا طالب علم ہونے کے ناطے اُس کے لیے اس نتیجے پر پہنچنا آسان تھا کہ بعض عمارتوں کو اگر معمول کے خلاف دیر تک پانی میں کھڑا رہنے پر مجبور کر دیا جائے تو زیادہ عرصے تک اتنا بوجھ نہیں اُٹھا سکتیں۔

''یہ کوئی...... کہیں کوئی مکان منہدم ہوا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''گھر گرنے لگے ہیں۔'' اُن کی ماں نے کہا۔

''زمین گر رہی ہے'' کسی میکانکی بازیافت کے نظام نے ناصر کے ذہن میں اُس فقرے کی گونج پیدا کر دی۔ اور پھر بھولے ہوئے وقت سے مناظر کا ایک سیلاب چل پڑا جسے ناصر نے لمحۂ حال کی دنیا پر جلد منقطع کیا۔ ''کیسر کی بائیں ٹانگ کی سکن گرافٹنگ آج ہو گی مگر کیسے ہو گی۔ میرا جانا ہسپتال میں ضروری ہے۔ مگر زہرہ ہے کہ جیسے اُسے کیسر کے معاملے میں کسی کی ضرورت نہیں'' ناصر نے سوچا اور کہا۔

''کھانا پک جائے تو میں کسی طرح ہاسپٹل پہنچوں۔'' مگر اُس نے دیکھا کہ اس کی ماں سجدے میں گری پڑی ہے اور خدائے ذوالجلال کے قہر سے لرزاں معافی کی عبادت کرتی ہے۔ پھر دونوں بھائیوں نے کچھ بات کی کہ امدادی کارروائی کرنے والوں کی کشتی جس مقام تک پہنچتی ہے وہاں پہنچنے کے لیے بھی ناصر کو گہرے پانی میں سے گزر کر جانا پڑے گا۔

''مگر یہ ضروری ہے''، ناصر نے کہا اور مسکرایا ''میرا تعلق لازمی خدمت گذاروں میں سے ہے۔''

'' Essential Services'' بھائی نے کہا اور پھر یک دم آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھیں۔''

بھورے مسلسل جمے ہوئے بادلوں کے اوپر سے سیاہ بادلوں کے پرے مشرق سے مغرب کی طرف اُڑتے جا رہے تھے۔ وہ دونوں اور بڑے شہر کے سب لوگ اس منظر کا مطلب خوب جانتے تھے۔ پھوار کی جگہ اب بوچھاڑ برسے گی اور ایسا ہی ہوا اور اُن کا تعلق ہوا غرقاب وقت کی محض تماشائی تھی۔

O

''میرا خیال ہے وہ بچ جائے گا۔'' ہاف مین نے گرٹروڈ سے کہا۔

''تم اُس کو دیکھنے گئے تھے۔''

''ہاں...... میں آخری دلعہ اُس سے ملنے گیا تھا۔''

''اور وہ عورت واحد، مسلسل، مکمل، اُس کی تیمارداری کرتی ہے؟''

ہاف مین بے چین سا ہو کر اُٹھا اور گرٹروڈ کے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے پردہ ایک طرف ہٹایا اور کہا۔

''تم بھی ایک بات کیوں بار بار پوچھتی ہو۔''

بڑے شہر کا یہ علاقہ پانی کی زد میں ہونے کے باوجود محفوظ تصور کیا جاتا تھا اور پہیوں کی سواریاں وہاں ابھی تک محدود فاصلے طے کرتی تھیں۔

''پتہ نہیں کیوں۔ شاید اس لیے۔ ہاں...... یہ دلچسپ ہے۔ یہ بتاؤ۔ اگر تم ایسے ہی جل گئے ہوتے۔ تو کیا وہ اسی طرح تمہاری بھی دیکھ بھال کرتی۔ واحد، مسلسل، مکمل، ویسے تو وہ تم تینوں کے لیے تھی۔ لیکن میں سمجھتی ہوں تبت کے بعض قبائل میں جہاں عورتیں کئی خاوند رکھتی ہیں۔ وہاں بھی عورتیں کسی ایک کے حق میں ضرور ڈنڈی مار جاتی ہوں گی۔'' گرٹروڈ نے کہا اور خوب ہنسی۔

ہاف مین نے کھڑکی کی راہ سے باہر درختوں پر گرتی بوچھاڑ کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا ''تم نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

گرٹروڈ اُس کے قریب آ گئی اور اُس کی گردن کو سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میرا بیچارہ چھوٹا جرمن لڑکا۔ اب تو اُسے کچھ کہنے کی ہی نہیں کچھ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھو...... بارش کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے استوائی خطوں کی بارش بہت اچھی لگتی ہے۔ آؤ......''

''یہ استوائی خطہ نہیں ہے اور یہاں ایسی بارش قدرتی آفت ہے۔''

''مگر دنیا ان لوگوں کی مدد کرے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا...... ارے ہاں کہیں وہ ہسپتال بھی تو نہیں ڈوب گیا۔ جہاں وہ بیچارہ مریض اور اُس کی عشق تیماردار ہیں۔ تمہاری پریشانی بتاتی ہے کہ وہ بھی......''

''نہیں...... اُسے بہت محفوظ کیا گیا ہے بہت مستعدی سے۔ ویسے بھی وہ ہاسپٹل نشیبی علاقوں سے کچھ دور ہے۔ مگر خطرہ ہر جگہ ہے......''

"جیسے یہ جگہ بھی ہے۔" وہ ہاف مین کے اور قریب ہو گئی۔ "کسی دن میں ان جگہوں کو مِس کروں گی اور اس شاندار سیلاب کو بھی اور سب سے زیادہ تمہیں جرمن لڑکے۔ اگر آسٹریلیا میں بھی کوئی پرانے کھنڈر ہوتے تو تم ضرور میرے ساتھ جاتے۔ تم کل واپس جا رہے ہو۔ آؤ آخری مرتبہ پیار کریں۔ مجھے پیار کرو..........."

"تم جانتی ہو اس معاملے میں میرے ذہن اور جسم کا رابطہ ابھی تک منقطع ہے۔"

"جانتی ہوں۔ میں بھی اُس ضرورت کی بات نہیں کر رہی۔ تم مجھے اپنے، تم میرے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ لگائے رکھو۔ میں بس ایسا چاہتی ہوں۔ بس اتنی قربت...... آخری بار...."

تُند ہوا کا جھونکا پردے کو اُڑا کر کمرے میں داخل ہوا۔ ہاف مین ہنس پڑا۔ "میں یہاں سے غلام باغ کا معمہ اور اپنی نامردی لیے جا رہا ہوں۔ گو کہ وہ بھی ایک معمہ ہے......."

"میں نہیں سمجھتی۔ ایسا صرف تمہارا میرے لیے ہو گیا ہے کسی اور عورت کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے لیے۔"

"میں نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تم مانو گے نہیں مگر تمہارے ساتھ ایسا اس لیے ہوا ہے کہ تم نے نسلوں کے درمیان حائل خطرناک فاصلے ختم کرنے کی کوشش کی ہے......."

"خطرناک فاصلے؟"

"ہاں..... خطرناک فاصلے...... جو جسمانی نہیں ہوتے۔ کچھ اور ہوتے ہیں۔ کیا؟..... میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کچھ..... جو دور کرتا ہے۔ ہٹاتا ہے۔ دور کرتا ہے میں نہیں جانتی...... جسمانی فاصلے تو کچھ بھی نہیں۔ وہ تو اجنبی نسلوں کے مرد و عورت دور کر سکتے ہیں جب خواہش ان پر غلبہ حاصل کرتی ہے اور یہ خواہش بھی...... کچھ زیادہ شدید ہی ہوتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں..... مگر خطرناک فاصلے پھر بھی وہیں رہتے ہیں۔ پتہ نہیں...... تم سمجھ رہے ہو یا نہیں..... مگر ـــ" اچانک گرٹروڈ ہنسی جیسے کوئی بہت مزیدار بات یاد آ گئی ہو...... "میرے دادے کا پردادا یہ حقیقت خوب جانتا تھا۔"

"تمہارے دادے کا پردادا۔"

"ہاں..... دادے کا پردادا بار بار کہنا مشکل ہے۔ ہم اُسے جان کہہ لیتے ہیں۔ میں پچھلی صدی کی بات کر رہی ہوں۔ دوسرے یورپین خاندانوں کی طرح ہمارے لوگ بھی آسٹریلیا

آئے۔ جان گھر بار والا تھا اس کے بچے تھے۔ مگر اسے ایک عجیب چسکا پڑ گیا۔"

"عجیب چسکا۔"

"ہاں۔ ایبوریجنز عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرنے کا چسکا....."

"اوہ..... خوب....."

"ہاں..... وہ...... جان نے اُس کام کے لیے اپنے Ranch پر ایک الگ کمرہ بنا رکھا تھا۔ وہ آسٹریلین Out back سے ان عورتوں کو لاتا تھا۔ پھر خود ہی انہیں اچھی طرح دھوتا اور صاف کرتا تھا۔ کپڑے پہناتا تھا۔ خوشبو لگاتا تھا اور پھر ان سے جسمانی تعلق بناتا تھا۔" گرٹروڈ نے ایک گہرا گونج دار قہقہہ لگایا۔

اور ہاف مین کو اس قہقہے میں آسٹریلین Out back کی گونج سنائی دی اور کینگرو کا شکار کرتے نیم برہنہ سیاہ مرد اور اسی کینگرو کے گوشت کو آگ پر بھونتی برہنہ عورتیں۔

"جان دلچسپ آدمی تھا۔" اُس نے کہا اور عرصے بعد اُس نے اپنے جسم میں وہ ارتعاش محسوس کیا جو عورت کی تمنا لیے مرد کے جسم کو عورت کے لیے تیار کرتا ہے۔

"ہاں..... وہ یقیناً کوئی دلچسپ بدمعاش تھا...... ہمارا جد امجد...... جان......" گرٹروڈ ہنسی

"مگر تمہیں جان کی کہانی کس نے سنائی؟"

"لو..... دیکھو..... یہ ہماری خاندانی لیجنڈ ہے اور اب تو ویسے خاندان نہیں رہے۔ مگر میں تصور کر سکتی ہوں کہ کس طرح ہمارے پہلے مرد رات کھانے کے بعد اکٹھے بیٹھے جان اور اس کی ایبوریجنل عورتوں کی باتیں کرتے ہوں گے۔"

"ایک ہفتے میں وہ تقریباً کتنی عورتیں لے آتا ہوگا۔" ہاف مین نے پوچھا اور گرٹروڈ خوب ہنسی۔

"ایک ہفتے میں یا ایک مہینے میں کتنی ایبوریجنل عورتیں۔ جان کی ایسی کوئی اسٹیٹکس تو موجود نہیں۔"

"یقیناً" ہاف مین نے کہا اور گرٹروڈ کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"یہ کیا" ایک حیرت زدہ سی چیخ گرٹروڈ کے حلق سے نکلی۔

"لگتا ہے تمہیں تو جان نے زندہ کر دیا ہے۔"

Scanned by CamScanner

''ہاں...... شاید...... مگر تمہارے جسم میں سے مجھے کینگرو کے کچے گوشت کی بو آ رہی ہے اور تمہاری بغلوں کے یہ بال اگر کچھ بھی اور بڑھ گئے تو کوالا کی لوئیں بن جائیں گے۔ مجھے تمہیں بہت دھونا ہوگا۔ بہت صاف کرنا ہوگا۔''

''جان'' گرٹریوڈ نے سسکی لی اور اُس کی آنکھیں اجنبی خواہشوں کی شدت سے پھیل گئیں۔

''تمہارے جسم پر قدیم آسٹریلیا کی سب غلاظت ہے۔ مجھے تمہیں دھونا ہوگا......'' ہاف مین نے کہا اور اُس کے ہاتھ ایبروجنل عورت کو بے لباس کرنے کے لیے اُس کے جسم پر رینگنے لگے۔

جان نے ایبروجنل عورت کے جسم پر پانی گرایا اور صحرا کی زرد مٹی اُس کے مساموں سے اکھڑ کے نیچے کو بہنے لگی۔ پھر اُس نے اُس کے بالوں میں سے جنگلی جھاڑیوں کے بیج اور خشک پھولوں کے ٹکڑے چنے۔ اور اُس نے سوچا کہ یہ گونڈامان ہے جو صحرا کی روح ہے جو سوئے ہوئے شکاریوں کی خوابوں میں رہنمائی کرتی ہے۔ اور اُن کا بوم رنگ شکار پر ہلاکت خیز ضرب لگا کامیابی سے پھر اُن کے ہاتھ میں پلٹ آتا ہے۔ وہ اُنہیں شہد بنانے والی چیونٹیوں اور پانی کے گڑھوں اور میٹھی جڑوں والے پودوں تک لے جاتی ہے۔

ایبروجنل عورت نے پانی کو اپنے جسم کے اوپر سے پھسلتا بہتا محسوس کیا اور پھر اُس کے لیے یہ فرق جاننا ممکن نہ رہا کہ یہ جان کی لرزتی ہوئی انگلیاں ہیں یا پانی ہے جو بلندیوں سے گہرائیوں کی طرف چلتا ہے اور گہری سلوٹوں میں سے بھی آلائشوں کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اُس کے نتھنوں سے گرم ہوا تیزی سے باہر آنے لگی۔ جس میں سلگتے ہوئے خون کی مہک تھی۔

''کیا یہ گونڈامان کی بہن ننگالیول ہے جو قوسِ قزح کی روح ہے اور دونوں ننگاکن بری ایلایامی کی بیٹیاں ہیں۔''

ایبروجنل عورت نے حیرت سے جان کے جسم کو دیکھا کہ اس شدت سے کبھی وہ اُس کا خواہش مند نہ رہا تھا۔

''آؤ'' اُس نے پھنکار جیسی آواز میں کہا۔

اور اچانک جان نے کہا۔ ''تم خوابوں میں راہ دکھانے والی روح ہو یا دھنک دیوی ہو۔ یا پھر...... کیا تم...... جادوئی سانپ عورت موجگو ہو جس کی کہانی تیزے کی انی اور ڈھال سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جو غیروں کو سنائی نہیں جاتی۔ موجگو کی کہانی نیلے دریا اور زرد صحرا کے ساتھ سفر کی کہانی

ہے......''

گرٹریوڈ ہنس پڑی اور ہنسی کی شدت سے اُس کا ڈھلا ہوا جسم تھرانے لگا۔

''او خدایا۔ مجھے تمہاری باتیں سنتا نہیں چاہئیں تھیں۔ مگر میں ہنسی روک نہیں سکی......''

ہاف مین نے اپنے ہاتھ الگ کر لیے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''کیوں''۔

''جان ایسی باتیں نہیں کرتا ہوگا۔'' گرٹریوڈ نے کہا۔ ''جب ایبروجنل عورت لاتا تھا۔ تو ایسی کوئی باتیں نہیں کرتا ہوگا۔ باتیں اُس کا مسئلہ نہیں تھیں۔ یوں بھی ایبروجنل عورت اُس کی زبان نہیں سمجھتی تھی...... وہاں سب کچھ زبان سے الگ ہی ہوتا ہوگا۔''

''ہاں...... شاید تم ٹھیک کہتی ہو......'' ہاف مین نے کہا۔

''کیا ہوا...... تم......''

''کچھ...... نہیں......''

''مگر۔ ایبروجنل مائیتھالوجی کے بارے میں تمہاری معلومات وسیع ہیں۔''

''وسیع...... نہیں شاید...... بس کچھ...... معمولی......''

''آؤ......''

مگر انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ دور گزر چکا تھا۔ اجنبی نسلوں کی لذت کا ناٹک ادھورا ہی ختم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے معمول کے دل و دماغ کے ساتھ بیٹھے تھے تو گرٹریوڈ نے گہرے تاسف سے کہا۔

''مجھے تمہاری کیفیت میں یوں بک نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے بھدے۔ تخیل سے خالی وجود کو اپنے قابو میں رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس ہے......''

''نہیں قصور میرا تھا...... تم نے پہلے ہی جو کہا تھا وہی ٹھیک تھا...... وہی ہوا...... مجھے...... خطرناک فاصلے طے کرنے کی کوشش کرنے والوں کو سزا ملتی ہے۔''

دونوں اس بات پر کچھ بھی نہ بولے۔ ہاف مین نے اپنا رین کوٹ جھاڑا اور گاڑی کی چابیاں کھینچیں اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں جا رہا ہوں۔''

گرٹریوڈ اُٹھی تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُس کا جسم اُٹھنے کے قابل نہیں رہا اور سانپ

Scanned by CamScanner

عورت کی طرح زمین پر بچھتا جا رہا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو اوپر کھینچتے ہوئے ہاف مین کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا کیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"تم نے کل جرمنی واپس جانا ہے۔ ابھی کدھر جاؤ گے۔"

"میں کیپر، زہرہ اور ناصر کو الوداع کہہ چکا ہوں۔ تمہیں...... الوداع کہہ رہا ہوں۔ اب ایک آخری ملاقات مجھے نواب ثریا، پتہ نہیں کیا جنگ سے کرنی ہے۔ مگر اُس میں الوداعی وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے اُس سے کچھ حساب کتاب کرنا ہے......................"

"مگر اس سیلاب میں تم......... حرکت کیسے کرو گے۔"

"یہ لینڈ روور زبردست پانی میں آسانی سے چلتی ہے۔ نواب کا گھر گہرے پانی کے علاقے میں نہیں ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔"

برستی بارش میں وہ اُس کے ساتھ گیٹ تک آئی۔ ہاف مین گاڑی میں بیٹھا تو باہر کھڑی گرٹروڈ کو اپنی طرف کھینچ کر اس نے اُس کے ہونٹوں پر خنک بوسہ دیا۔

"یہ وقت یاد رہے گا۔"

"مجھے بھی" گرٹروڈ نے کہا اور خان چوکیدار کی طرف دیکھا جو گیٹ کھولے کھڑا تھا اور سر سے پاؤں تک بھیگا اُس کا لباس اُس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔

"میرے سارے ملازم اپنے لوگوں کو اس طوفان سے بچانے چلے گئے ہیں مگر اسے میں نے جانے نہیں دیا۔ آخر گیٹ کی حفاظت کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے۔ جب تک ایجنسی کے لوگ مجھے لینے آتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے" ہاف مین نے کہا اور گاڑی گیٹ سے باہر بڑھا لے گیا۔ گرٹروڈ نے لینڈ روور کو گیٹ کے کچھ ہی باہر پانی میں اُترتے دیکھا۔ اور چوکیدار کو دیکھا اور کہا۔

"گیٹ بند کر دو اور تالا لگا دو۔" اور خان چوکیدار نے ایسا ہی کیا۔ اور مسلسل گرتی بارش میں وہ میم صاحب کے پیچھے سر جھکائے چلتا عمارت کے اندرونی حصوں کی طرف بڑھنے لگا۔

OOO

باب (22)

گھیراؤ

ہاف مین نے جب محسوس کیا اس کے زبانی یقین دلانے پر نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی تسلی نہیں ہوئی تو اس نے اپنے بریف کیس میں سے 'غلام باغ کا معمہ' کا جرمن مسودہ نکالا اور اسے وہ جے انگریزی میں ترجمہ کر کے سنائے جہاں تحقیق کے سلسلے میں ہاف مین نے نواب کی خدمات کا فراخ دلی سے اعتراف کیا تھا اور اس دور کا بھی تفصیلی ذکر کیا تھا جب 'غلام باغ' نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی ذاتی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ 'عالمی ورثہ' بن جانے سے پہلے غلام باغ کی حفاظت کے ضمن میں اپنی گراں قدر خدمات کے جرمن زبان میں ذکر کا انگریزی ترجمہ سن کر وہ خوش ہو گیا اور کہنے لگا۔

"یہ ایک عظیم تحقیقی کتاب ہوگی۔ آرکیالوجی میں میں صرف جرمن اور انگریز کو مانتا ہوں۔ غلام باغ کا معمہ" نواب نے گہرے تفکر اور ایک عالمانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مگر غلام باغ کا معمہ، شاید معمہ ہی رہے گا جب تک کہ اسے دوبارہ نہیں لکھا جاتا۔" ہاف مین نے اچانک ایسے لہجے میں کہا جیسے کہ یہ طے ہو کہ مخاطب نہ صرف اس بات کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کے تمام سیاق و سباق سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اسی لیے نواب کی حیرت نہ صرف ہاف مین کی اس بات پر تھی بلکہ اس کے انداز پر بھی تھی۔ اس نے اپنی آنکھ کے نیچے کے زخم کے نشان پر بے چینی سے انگلی پھیری اور سوچا "اس حرافہ کی وحشیانہ ضرب نے شاید دماغ کو بھی متاثر کیا ہے اب یہ گورا جو بات کرتا ہے سمجھتا ہے کہ میں اسے بخوبی سمجھتا ہوں۔ مگر میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ اپنی مکمل سماعت کا بہانہ کر کے دوبارہ پوچھ سکتا ہوں۔ پھر اس نے پام ہاؤس کی فروخت کی رات کے مناظر بدقت تمام اپنے ذہن سے نکالے اور اپنے دائیں کان کے

Scanned by CamScanner

پیچھے ہاتھ کا پیالہ سا بنایا اور کہا۔
"کیا کہا آپ نے مسٹر ہاف مین۔" اور ہاف مین نے بلند آواز میں دوبارہ لکھنے کا دوبارہ ذکر کر دیا۔

"اوہ" اچانک بات کا سرا کہیں سے پکڑ لینے پر نواب مسکرایا اور پھر اس نے بھی ہاف مین جیسے انداز میں کہا "میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ مسودے کی نظر ثانی کرنا چاہتے ہیں۔ نظر ثانی کی اہمیت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا بڑی سے بڑی تحقیق اور عالمانہ مسودوں میں بھی کچھ کوتاہیاں کچھ خامیاں رہ جاتی ہیں۔ نظر ثانی ایک اعلیٰ۔ بلکہ میں کہوں گا۔ محققانہ اور عالمانہ روایت... جو آپ مغربی سکالرز کی ہے۔ اس کا ایک اعلیٰ ترین روایوں کہہ لیں اعلیٰ ترین میں سے ایک رویہ ہے.... لیکن" اچانک وہ مشکوک سے انداز میں ہنسا "لیکن مجھے امید ہے کہ مسودے میں میری عاجزانہ خدمات کا ذکر نظر ثانی کی نذر نہیں ہوگا۔"

اور ہاف مین جو شدت سے ہنس پڑنے کی حاجت دبائے ہوئے تھا نواب کے اس آخری ریمارک کا بہانہ بنا کر خوب دل کھول کر ہنسا "نہیں ایسا نہیں ہوگا نواب صاحب" اس نے کہا "بلکہ آپ کی تو میں فوٹو گراف کتاب میں شامل کر سکتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ یہ کچھ غیر موزوں بھی نہیں ہوگا کہ آپ کی تازہ تصویر مناسب متن کے ساتھ.... لیکن.... بشرطیکہ.... آپ...."

نواب کی آنکھوں میں چمک لہرائی جو تازہ تصویر اور تازہ چہرے کے تصور سے کچھ ماند پڑ گئی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ یاور ہاؤس کی فروخت کی رات کے پہلے کے اپنے چہرے کی کوئی فوٹو گراف گورے کو دے سکتا ہے۔ اس نے ایک سنجیدہ اور قدرے لاتعلق دلچسپی سے کہا "بشرطیکہ کیا؟ مسٹر ہاف مین.... آپ میری فوٹو گراف شامل کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اگر اس سے آپ کی ریسرچ.... آپ کی کتاب کو کوئی فائدہ.... پہنچتا ہے تو...."

"یقیناً۔ غلام باغ کا معمہ اس سے اور بھی گھمبیر ہو جائے گا اور کتاب کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ مگر کچھ فائدہ مجھے بھی پہنچنا چاہیے نواب صاحب۔"

نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے سوچا، "بشرطیکہ"..... سے گورے کی مراد کچھ اور ہے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہا "جی.... جی.... آپ کہیں.... آپ کہیں.... جو بات کہنا چاہتے ہیں...."

ہاف مین نے گہرا سانس لیا اور دل میں سوچا کہ وہ جو کہنے جا رہا ہے۔ نہ تو وہ اسے کہنا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے کہنے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ گرٹروڈ سے آخری ملاقات کے بعد جب وہ نواب سے آخری ملاقات کے لیے نکلا تھا تو کوئی طے شدہ ایجنڈا اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ ہاں مگر..... اتنا ضرور ہے۔ کہ ایک گہرا بے چین احساس ضرور تھا کہ نواب کے ساتھ اس کی گفتگو سخت غیر متوقع نتیجوں والا احساب کتاب ہوگی۔ جس کے ساتھ۔ جس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں نواب جنگ کہ کچھ عرصے سے میرے فرسٹ سیکرٹری کے کانوں میں یاور عطائی کے مہمات کے خزانے کی بھنک پڑی ہوئی ہے اور وہ مجھ پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ کسی طرح میں اس کے لیے اس تک..... وہ یہ کہ خزانے تک رسائی حاصل کروں۔ مگر پھر حالات بدل گئے۔ میں نے ریسرچ کو جلدی لپیٹ دیا۔ بلکہ لپیٹنا ہی پڑا۔ اب میں واپس جا رہا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ چیزوں کی تفہیم یقیناً اس سے کچھ بہتر ہو جائے گی یا کم از کم اس پر کچھ برا اثر نہیں پڑے گا اگر مردانہ طاقت کی ان مددگار طاقتوں کے خزانے میں سے مجھے بھی کوئی ایک آدھ نایاب موتی، کوئی قیمتی ہیرا، کوئی انمول پکھراج مل جائے۔ آپ اس پر کیا کہتے ہیں۔"

ہاف مین کی قطعاً غیر متوقع بشرطیکہ سن کے پہلے سے سنبھل کر بیٹھا نواب ثریا جاہ نادر جنگ اور بھی سنبھلا اور مضحکہ خیز ہو گیا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے ملازم کو کافی کا کہا تھا۔ لیکن شاید آپ ڈرنک لینا پسند کرتے، ویسے میں تو اس سیلابی موسم میں کافی کو ہی ترجیح دوں گا"۔

"عظیم سیلاب کے تقدس میں میں کافی کو ہی ترجیح دوں گا" ہاف مین نے کہا اور سوچا "خدا جانے میں کیا بک رہا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ کاش مجھے ڈرنک یا کافی کی بجائے Hash کے کچھ سلسلے مل جاتے۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ اس دنیا میں آ کر ہوا ہے۔ اور شاید ابھی ہونا ہے۔ جب تک میں یہاں سے چلا نہیں جاتا وہ کسی نشئی کی واہموں بھری کائنات سے مشابہ ہے اور اس کی تفہیم بھی گہرے نشے کی ترنگ میں ہی ہو سکتی ہے۔ انسان ہی وہ واحد جانور ہے جو نشہ کرتا ہے اور بولتا ہے۔ عشق بھی ایک نشہ ہے..... اس کے جلے ہوئے جسم پر سے کھرنڈ اتر رہے تھے اور وہ بستر پر سے آہستگی سے جلے ہوئے گوشت کے سیاہ ٹکڑوں کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر ایک طرف گراتی تھی۔ اس کی کھال کے جل کر اترنے کے بعد نئی کھال اس کے گوشت پر چھائی

Scanned by CamScanner

کا خالی پیالہ بار بار منہ کو لگائے جاتا ہے۔

''مجھے آپ کے لیے ایک اور پیالہ کافی بنانے دیں'' اس نے کہا۔

''ہاں یقیناً۔ یہ عمدہ کافی ہے......'' ہاف مین نے ایسے کہا جیسے وہ کہیں بھی غائب نہیں ہوا تھا اور بس کافی کا ایک پیالہ ملنے کی آرزو میں خاموش بیٹھا تھا۔

''میں ...... سمجھا...... آپ ...... اپنی کسی گہری سوچ میں چلے گئے'' نواب نے تذبذب سے کہا۔

''ہاں...... اپنی ہوائی ٹکٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور واپس یونیورسٹی میں اپنی حیثیت متعین کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا نواب جنگ...... یادر عطائی کے میبہات کا خزانہ......''۔

''لعنت'' نواب نے دل میں کہا ''اوہاں'' پھر اس نے اپنے فرضی نسیان پر معذرت خواہانہ آواز نکالی اور کہا جو اس نے سوچا کہ اگر کچھ کہنا ہی پڑا تو اس سے کہے گا ''اگر میں یہ کہوں مسٹر ہاف مین کہ...... کہ یہ سب کچھ افسانہ ہے تو......''۔

''آہ......'' ہاف مین کے حلق سے نکلی آواز کے پیچھے یہ احساس تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے اور جسے وہ سمجھتا بھی ہے کہ آسان نہیں ہوگا۔ تو کیا وہ اس سب کچھ پر لعنت بھیجے گا اور غلام باغ پر لکھے گا وہ پرانے قلمی مخطوطے نواب سے لے کر جنہیں دینے کا اس نے اس سے وعدہ کیا ہوا ہے اور جنہیں وہ اپنے تھیسس کی تیاری کے سلسلے میں پڑھ بھی چکا ہے اور اب اسی وعدے پر جرمنی لے جا رہا ہے کہ وہاں نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے نام کے ساتھ اسے میوزیم میں رکھوا دے گا۔ وہ بس یہی کاغذی خزانہ حاصل کرے اور وہاں سے چلا جائے۔ یا کسی ڈھیٹ کتے کی طرح اپنی بوکا پیچھا نہ چھوڑے۔ جو مرد کے لیے میبہات کے لیے ازل سے موجود ہے...... اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بوکا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

''آہ'' اس کے حلق میں سے اب اسی فیصلے کی آواز نکلی اور اس نے نواب سے کہا ''نہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میں...... نہ صرف یہ کہ مجھے...... جیسا آپ جانتے ہیں۔ بلکہ آپ کے ذریعے سے یہ ممکن ہوا تھا کہ مجھے عطائی کی آخری عظیم الشان رات میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا اور وہ رات ہی آپ کی اس افسانہ والی بات کو رد کرنے کے لیے کافی ہے...... بلکہ یہ بھی ہے اور جو اصل بات ہے اور بہت اہم ہے کہ میں جانتا ہوں کہ زہرہ اور کبیر نے عطائی کے عجائب خانہ کرے میں کیا دیکھا اور یادر ہاؤس کے بک جانے کی آخری رات کیا ہوا اور...... اور وہ خزانہ کہاں گیا...... میں یہ بھی جانتا ہوں......'' نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے چہرے پر سے ایک تاریک سایہ گزر گیا اور اس نے اپنی آنکھ کے نیچے کے ابھرے ہوئے زخم کے نشان کو ایسے سہلایا جیسے اسے رگڑ کر اتار دینا چاہتا ہو۔

''میں یہ بھی جانتا ہوں'' ہاف مین نے اپنا فقرہ دہرایا اور اسے محسوس ہوا کہ نواب لمحہ بہ لمحہ کسی ایسے اضطراب کی کیفیت میں ڈوبتا جا رہا ہے جس میں کم از کم اس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ نواب کی وہ کیفیت خود اس کے لیے خطرہ بننے والی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے معمول کے پیشتروں اور مغربی ماہرین آثار قدیمہ سے معاملہ کرنے کے اس کے سفاک رویوں سے مختلف کیفیت ہوگی۔ معاملہ کسی نامعلوم خوفناک سمت میں بڑھنے والا ہے جس کے بارے میں ابھی وہ کوئی مکمل اندازہ نہیں لگا سکتا۔ بالآخر اس نے دیکھا کہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے ہونٹ متحرک ہوئے۔

''کیا یہ سب جاننا تمہارے لیے ضروری تھا مسٹر ہاف مین۔'' وہ ایسا لہجہ تھا جیسے کوئی کہے ''افسوس تم نے یہ کیا کیا'' اور ہاف مین نے فوری فیصلہ کیا کہ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے معمول کے ہاف مین کو قائم رکھے اور برقرار رکھے۔

''ضروری'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا ضروری کیا ہے اور پھر جاننے کے معاملے میں ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں کچھ جان لینے پر کچھ اور جان لینے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔''

''بس یہی بڑا فرق ہے۔ میں کوئی عالم نہیں ہوں مگر لیکن میرے دادا کہتے تھے کہ ایک حد سے آگے جاننے کی کوشش کرنا ہلاکت میں ڈالتا ہے...... ایسی جانکاری سے بچ جانا چاہیے''۔

''اور وہ حد کیا ہے۔''

''وہ حد کوئی بتاتا نہیں مگر جو ہمارے بڑے ہیں۔ ہر لحاظ سے بڑے ہیں، معتبر ہیں، حاکم ہیں، بالاتر ہیں، وہی سند ہیں، ان کا رویہ اور عمل بتاتا ہے کہ آگے ہمارے لیے کرید جستجو کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔''

Scanned by CamScanner

ہاف مین نے حیرت سے نواب کی طرف دیکھا۔ انگریزی زبان پر اس کا عبور تو اس کے لیے حیرت انگیز نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نوابوں کے یہ خانوادے راج کے زمانے سے اپنی اولادوں کو بہترین برطانوی تعلیم دلواتے تھے۔ مگر یہ کہ وہ پیچیدہ تصورات کو بھی زبان دینے کی کوشش کر سکتا ہے یہ بات اس کے لیے نئی تھی۔ وہ تو اسے ایک شہرت و ناموری کے بھوکے، عیار، مکار، چاپلوس، بنیادی طور پر قطعاً ناقابلِ اعتبار مگر مشترکہ مصلحتوں کو تسلیم کرنے کے بعد کارآمد اور بہت اعلیٰ حلقوں میں اثر و رسوخ رکھنے والے نواب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جس نے 'غلام باغ' کی ذاتی ملکیت سے محروم ہونے کے باوجود بھی اس کے لیے، ایک جرمن آرکیالوجسٹ کی حیثیت سے مقامی حالات میں وہاں ہر جائز، ناجائز کام کرنا ممکن بنا دیا تھا۔ جو اس سے زیادہ تر اُس کے کام کے موضوع پر ہی بات کرنا پسند کرتا تھا اور جو مقامی باشندوں سے اُس کے میل جول کو ناپسند کرتا تھا مگر مصلحتاً برداشت بھی کر لیتا تھا جس کی موجودگی میں ہاف مین کو اپنی سفید جلد کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا اور وہ اپنے آپ کو کسی وائسرائے کا لوفر سا گورا گماشتہ محسوس کرنے لگتا تھا مگر ایسا گماشتہ کہ جو اپنا کام نکلوانے میں کامیاں تھا اور نواب کی کمزوری سے خوب آگاہ تھا مگر کیا آج اس گماشتے نے اس کی کسی پوشیدہ مضبوطی کو ٹھوکر ماردی ہے اور وہ گھوڑا، جو ہر کسی کو دولتی مارتا تھا، اس نے ایک دن ہم کو دولتی ماردی۔ پتہ نہیں کہاں سے یہ مغربی محاوراتی ضرب المثل ہاف مین کے ذہن میں آئی اور پھر اُسی تصورات و خیالات کے..... سیل رواں میں اسے کبیر کا خیال آیا کہ اگر وہ اس مکالمے میں شرکت کرتا تو کیا ہوتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ کبیر کی وجہ سے ہی ہوا جو ہوا ہے اور کبیر ہر جگہ موجود ہے۔ ہاف مین نے مکالمے میں نواب کی کہی گذشتہ بات کو واپس ذہن میں لا کر اس پر ایک جوابی فقرہ انگریزی زبان میں بنایا اور نواب کے سامنے بول دیا۔

''کون سے معاملات ہیں جہاں آپ جستجو کا دروازہ بند سمجھتے ہیں اور بالآخر عظیم تر کی سند کو حکم مانتے ہیں۔''

''تمام اہم بنیادی معاملات، زندگی، موت، حکومت، عورت، بلکہ ایک حد کے بعد اس پر بھی خاموشی ہے آگے دیوار ہے کہ کونسا معاملہ اہم ہے بنیادی ہے۔''

''یہ ایک تضاد سے بوجھل بات ہے۔ میرا اکثر ورد ذہن اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔'' ہاف مین نے کہا۔

''دیکھو میں تمہیں بے تلے تیز طرار سکالروں فلاسفروں کے فقروں میں نہیں سمجھا سکتا مگر..... اپنی زندگی میں سے بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں کہ کہاں خاموش رہ کر تسلیم کرنا اور کوئی سوال نہ کرنا بنتا ہے۔'' نواب نے اٹھتے ہوئے کہا اور بیٹھنے سے اٹھنے کی کوشش نے جسمانی اذیت کی لہریں اس کے چہرے پر دوڑا دیں۔ دیوانگی اور وحشت بھی ایسا بند گلی کا معاملہ تھا جہاں بے کار کرید کرنے والوں کو گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مگر بوکھلائے ہوئے کتے کی طرح اپنی بوا دواب کی طرح کی بوؤں کا پیچھا کرتے ہاف مین نے نواب کی کیفیت کو بھانپ لیا اور ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگا۔

''نواب جنگ۔ تم ٹھیک تو ہو۔ تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ تم بیمار نظر آرہے ہو خیریت تو ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔''

نواب ثریا جاہ نادر جنگ تن کر کھڑا ہو گیا اور قاطعانہ سے انداز میں بولا ''یہ بھی ایک ایسا معاملہ ہے جس پر کوئی سوال نہیں بنتا۔''

ہاف مین ہنس پڑا پھر اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''مجھے معاف کرنا لیکن اتفاق سے میں اس معاملے کو جانتا ہوں۔''

نواب کے جسم کا تناؤ یک دم ڈھیلا پڑ گیا اور اسے خیال آ گیا کہ ہاں یہ تو پہلے ہی بتا۔ گورا یادوہ اس کی فروخت کی آخری رات کا اشارہ دے چکا ہے۔ اسے اپنی کمزوری پر شدید غصہ آیا۔ ''ہوں'' پھر اس نے ہاف مین کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس کھینچا اور آہ بھرنے کے انداز میں اس طرح آہستہ آہستہ خارج کیا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''افسوس۔ افسوس'' پھر اس نے اپنے بوجھل قدم ڈرائنگ روم کی آخری کھڑکی کی جانب بڑھائے۔ ایک دم سے اس میں آسمان کا حال جاننے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ آخری کھڑکی کا پردہ ہٹانے پر حقبی گھاس کے قطعوں پر نظر ڈالی جا سکتی تھی۔ گھاس کہیں نہیں تھی پانی تھا اور بھورے آسمان سے مہین پھوار واپس آ چکی تھی۔

''ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا کہ جب یہ بارش بالکل بند ہو جائے۔'' اس نے کسی بھی تاثر کے بغیر کہا۔

''کیا اس بارش کا معاملہ بھی ایسا نہیں نواب بہادر کہ اس کے بارے میں زیادہ کرید نہیں کرنی چاہیے''۔ ہاف مین نے خشک لہجے کے ساتھ کہا۔

Scanned by CamScanner

نواب نے کوئی فوری جواب نہ دیا۔ اچانک گردن موڑ کر ہاف مین کی طرف دیکھا اور پھر باہر آبی دنیا میں دیکھا پھر گورے کی طرح شیطانی ذہنتائی بھری صورت کو دیکھا اور پھر ذرد لان کے آخر میں مولسری کے پودوں کو پھوار میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر ایک فیصلہ کر لیا۔

"میں کوئی کرید جستجو کی بات نہیں کر رہا مسٹر ہاف مین۔ مزید برآں مجھے ایسی ہی بارش کا انتظار تھا جو تین مسلسل برسے اور عمارتوں میں مکمل جذب ہو کر انہیں اتنا بودا کر دے کہ وہ آسانی سے ڈھے سکیں۔"

"میرے خدا مگر یہ تو بہت خوفناک خواہش ہے نواب جنگ......" ہاف مین نے کہا۔

"شاید مگر جب میں تمہیں اس کی تفصیل بتاؤں گا تو تم بھی اس خوفناک خواہش کا شکار ہو جاؤ گے۔ اب اتنا میں بھی تمہارے بارے میں جانتا ہوں۔"

"کیا واقعی؟" ہاف مین نے خلوص سے حیران ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں" نواب کھڑکی کے پاس کھڑا اس کی جانب بڑھ کر گہرے انکشافی انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔ "ہاں...... ایسی ہی بارشوں میں کبھی کبھی غلام باغ اپنے پوشیدہ خزانے اگل دیتا ہے۔ میں نے مددعلی کو بلایا ہے۔ وہ شاید آ چکا ہوگا۔ اگر تم نہ آ جاتے تو شاید میں اس وقت اس کے ساتھ غلام باغ میں کھڑا مٹی کی کوئی دیوار کرید رہا ہوتا۔ یقیناً تم بھی ایسی کرید کرنا چاہو گے۔ طوفانی بارش میں آر کیالوجی۔ تمہارا تو پیشہ ہے جنگ میں ہمیشہ......"

"عطائی رہوں گا"۔ ہاف مین نے زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے نواب کا فقرہ مکمل کر دیا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور آنکھیں اس کے جوش سے چمکی تھیں۔ اس نے سوچا ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں کہ یہ مجھے کہاں لے جاتا ہے۔ پھر چند لمحوں پہلے کے انداز سے بالکل مختلف ایک پرجوش انداز میں اس نے کہا "دلچسپ، بہت دلچسپ۔ نواب جنگ۔ بے حد دلچسپ۔ اگر تم اس سنسنی خیز مہم کے اچانک اعلان کے ذریعے میری توجہ یاور عطائی کے خزانے سے ہٹانا چاہتے ہو تو تم یقیناً اس میں کامیاب رہے ہو۔ میں اپنی جنسی صحت کی بحالی کی خواہش کو طوفانی بارش میں غلام باغ کے خزانے کی مہم پر قربان کرتا ہوں مگر میری ایک التجا پھر بھی ہے۔"

"وہ کیا" نواب نے قدرے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"نواب بہادر ثریا...... جنگ نواب...... او...... خدایا کاش میں تمہارا نام بھی پورا درست

بول سکوں۔ مجھے معاف کرنا...... مگر بہر حال میری التجا یہ بھی ہے نواب جنگ کہ اس حقیر نفسیاتی خواہش کے اظہار کے بعد ہمارے درمیان جو حیرت انگیز نظریہ علم اور خوفناک نظریہ الم جنم لے رہا تھا اور جس کے اپنے بالکل ذاتی جواز کو تم اپنی زندگی میں سے مثالیں دے کر سامنے لانے والے تھے اور جس کی ایک تمہاری مثال غالباً موزوں نہیں رہی تھی...... تم وہ...... تم ان مثالوں سے خدا کے لیے مجھے محروم نہ کرو۔"

"مددعلی آ گیا ہے" اچانک نواب نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر واپس ہاف مین کی طرف مڑا اس گہرے اطمینان کے ساتھ کہ اس نے گورے کی دوستی اور اس سے وابستہ اپنے مفادات سے محروم ہوئے بغیر صورت حال کو اس طرح ازسر نو مرتب کر لیا ہے کہ گورا خطرناک علاقوں میں منہ مارنے سے باز آ گیا ہے۔ کل یہ یہاں سے رخصت ہو جائے گا اور سب معاملات ویسے ہی آگے بڑھتے رہیں گے جیسے کہ انہیں بڑھنا چاہیے...... یوں تو میں مددعلی کے ساتھ اس سیلابی وقت میں بھی اسے غلام باغ لے جانا پسند نہ کرتا لیکن خزانے سے کم کسی لالچ پر اس نے ٹلنا نہیں تھا مبہات کا یا غلام باغ کا...... کہیں یہ اس کی انگیخت پر تو نہیں آیا تھا جو جلتے جھلسنے کے باوجود ابھی زندہ ہے یا شاید اس دیوانی حرافہ نے اسے کوئی سبق پڑھا کر بھیجا تھا...... بہر حال جو طے ہو چکا ہے جو فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس میں کسی نئی رخنہ اندازی کو وہ برداشت نہ کرتے۔ پہلے بھی وہ ماضی میں میری اس سنگین غلطی کو معاف کرنے پر آج تک تیار نہیں۔ یقیناً عطائی کی آخری رات کا اس شرارتی اور فسادی عشق کو شاہد بنانا ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ مجھے عمر بھر اہانت کا داغ لگا رہے گا۔ پھر اس فسادی کو آگ بھی بھسم نہ کر سکی یقیناً اس میں عظیم فسادیوں کی روح ہے جو اکثر موت سے بچ نکلتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے بڑے بڑے شریروں کو اکثر موت طرح دے جاتی ہے۔ یہ انہیں میں سے کسی کا نیا جنم ہے۔ ورنہ اس آگ سے کون بچ سکتا تھا۔ جو بتایا گیا ہے۔ مگر پھر اسے بچانے والی آ گئی اور یہ بھی منحوس باغیوں کی ایک پکی نشانی ہے کوئی نہ کوئی عورت ان کے آگے پیچھے ضرور ہوتی ہے۔ بہر حال غلام باغ کی حد تک تو اسے برداشت......" پھر اچانک نواب نے فیصلہ کیا اب جو بات اس کے ذہن میں آئی ہے وہ اس کا بلند آواز میں ذکر گورے سے ضرور کرے گا۔

"ہم غلام باغ کو تو عالمی ورثہ بننے کی اجازت دے سکتے ہیں مسٹر ہاف مین لیکن یاور عطائی کو نہیں......" اس نے کہا اور گورا آر کیالوجسٹ پھڑک اٹھا "واہ نواب...... یہ ایک بہت اعلیٰ پائے

Scanned by CamScanner

کا فقرہ ہے۔ مجھے اس میں صرف اتنا اضافہ کرنے کی اجازت دو۔ ہم ایک آرکیالوجی کی اجازت دے سکتے ہیں مگر دوسری کی نہیں" اچانک ہاف مین نے فیصلہ کیا جو بات اب اس کے ذہن میں آئی ہے اسے بلند آواز میں بڈھے نواب کے سامنے بولنے کی ضرورت نہیں ہے کہ..... "اگر کبھی یہاں ہوتا تو کہتا کہ دوسری آرکیالوجی پر صرف ہمارا حق ہے۔ دوبارہ کھودنا ہمارا کام ہے۔"

"میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو" نواب کہہ رہا تھا "مگر وہ ستالیس اپنی زندگی میں سے میں تمہیں ضرور دوں گا جب کھوجیوں کی سرکوبی لازم ہو جاتی ہے اور جانکاری پہ پہرہ اٹھانا پڑتا ہے اور اس پہرے کے پاس پھٹکنے والوں کو بھی دردناک موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس ابھی کچھ وقت ہے۔ مدھل کو تیار کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

ہاف مین اس بوڑھے چالباز کی باتوں میں اس قدر منہمک تھا کہ یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا ہی نہ ہوا کہ "مدھل کو تیار کرنے" سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ دیکھو نواب اپنی نوابی تاریخ میں سے کیا انکشاف سامنے لاتا ہے۔ یا یہ کوئی انکشاف ہوں گے بھی یا نہیں یا یہ سب سراسر بکواس بھی ہو سکتی ہے اسے ٹالنے کے لیے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ میں یادر عطائی کے معاملے میں ذرا برابر بھی دلچسپی لوں۔ بہرحال، اب یہ غلام باغ میں اس سیلابی صورت حال میں کھدائی بلکہ "کھر چائی"..... مجھے اپنا سامان بھی پیک کرنا ہے۔ مگر اس مہم کو بھی کسی قیمت پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بہرحال..... "میں تمام کانوں سے سن رہا ہوں نواب ثریا جاہ نادر جنگ۔ آ..... میں تمہارا نام پورے کا پورا بولنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ اس مہم کے آغاز کا ایک اچھا شگون ہے مجھے مبارک دو نواب جنگ۔ مجھے مبارکباد دو۔"

"تم کئی معاملات میں مبارک باد کے مستحق ہو مسٹر ہاف مین" اس نے کہا مگر پھر آگے بڑھ کر بولا کہ سب سے بڑی مبارک باد تو یہی ہے کہ تم ایسے معاملات کی بھنک لے جا رہے ہو جنہیں جاننے کی خواہش کرنے والے کی سزا موت ہے۔ پھر موت اور سزائے موت سے اسے کچھ یاد آیا اور اس نے ہاف مین کی طرف ایسے انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کیا وہ کہانی شروع کرے۔

"میں تمام کانوں سے سن رہا ہوں" ہاف مین نے پھر کہا۔

"یہ غدر کے زمانے کی بات ہے۔ میرے ننھیال کے خاندان کا تعلق ہے جو بات میں کرتا ہوں میں جگ کا نام نہیں لوں گا اور کسی فرد کا بھی نہیں۔"

"ضروری نہیں ہے" ہاف مین نے تسلیم کیا۔

"سمجھ لو کہ وقت ہے کہ غدر کا تاریک ترین وقت گزر چکا ہے راج کو درپیش خطرہ ٹل گیا ہے۔ قانون کی بالادستی پھر قائم ہو رہی ہے فسادیوں کی سرکوبی شروع ہو چکی ہے۔ انہیں پھانسیوں پر لٹکا کر توپوں کے دہانوں کے سامنے اڑا کر کیفر کردار تک پہنچایا جا رہا ہے۔ ہر تعلقہ، ہر پرگنے، ہر جاگیر میں سے شر پسندوں دہشت گردوں کو چن چن کر لٹکانے لگایا جا رہا ہے۔ امن و امان بحال کرنے کی اس مہم میں مقامی اشرافیہ لاٹ صاحب کی ہر ممکن مدد کر رہی ہے۔ ایسے میں ایک انگریز کپتی ہمارے.............. جگ کا نام نہیں لوں گا اور کسی فرد کا بھی نہیں۔"

"آ..... نہیں یہ ضروری نہیں ہے....." ہاف مین پھر اسے یقین دلاتا ہے۔

"کپتی کا میجر..... اس کا نام میں لے سکتا ہوں۔ میجر آرچی بالڈ میرے ننھیال کے خاندان کے سربراہ سے ملتا ہے ویل نواب صاحب مجھے تمہارے علاقے میں سے کم از کم تین باغیوں کو ختم کرنا ہے۔ راج کے خلاف بغاوت کی سزا موت ہے۔ مجھے کم از کم تین سزائے موت چاہئیں۔ تمہارے مکمل انتظامی تعاون کے ساتھ اگر تم بعد میں ہمارا مکمل انتظامی تعاون حاصل کرنا چاہتے ہو اور اپنے عمل دخل کا علاقہ وسیع کرنے کے خواہش مند ہو۔ ہمارے سربراہ نے میرا مطلب ہے کہ میرے ننھیال کے سربراہ نے کہا یقیناً میں اس کا خواہش مند ہوں میجر۔ لیکن باغیوں کی تعداد تین نہیں ہوگی۔ کہتے ہیں اس کے بعد ہمارے سربراہ نے..... میرا مطلب ہے ہمارے ننھیال کے سربراہ نے میجر کے کان میں کچھ کہا اور میجر آرچی بالڈ لڑکھڑا گیا۔ اس نے نواب سے شراب کی فرمائش کی جو پوری کی گئی....." نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے کسی بھی داستان گو کی طرح سامع کے چہرے پر اپنی داستان کے موثر ہونے کا جائزہ لیا اور پھر گہرے اطمینان کے ساتھ اس نے ڈرامائی انداز میں ہاف مین سے پوچھا..... "سربراہ نے میجر کے کان میں کیا کہا؟..... میجر لڑکھڑایا کیوں اور اس نے شراب کیوں طلب کی؟ اور اس کے بعد کیا ہوا؟..... میرے پیارے ہاف مین تمہارا کیا خیال ہے ان سوالوں کے جواب کا علم کا چسکا لینے والوں کے لیے ڈھنڈورا کیا جاتا۔ تین دن ہمارے سربراہ۔ میرا مطلب ہے....."

"تمہارے ننھیال کے سربراہ" ہاف مین نے اس کا فقرہ مکمل کرنے میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کی۔

Scanned by CamScanner

"تین دن تک ہمارے تخیال کے سربراہ اور میجر آرچی بالڈ کے درمیان اس موضوع پر بحث ہوتی رہی کہ اگر باغیوں کی تعداد تیس کی بجائے کچھ اور ہو جائے تو ایک ایک کو پھانسی دینا یا گولیوں کی باڑ مارنا کے جیسے سزائے موت کے طریقے کس حد تک موزوں ہوں گے۔ کیا کوئی اور زیادہ مؤثر زیادہ صاف ستھرا طریقہ ہو سکتا ہے؟...... مسٹر ہاف مین اس بحث سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟...... کیا ان نتائج کو سستے تجسس کی تسکین کرنے والوں کے لیے عام کر دیا جائے۔ کیا تاریخ میں طرح طرح کے سراغ لگاتے پھرتے کھوجی کتوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے"

"آ...... نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ باغیوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا"

ایک عیارانہ مسکراہٹ نواب کے ہونٹوں پر پھیل گئی پھر اس نے بائیں آنکھ کے نیچے زہرہ کے لگائے ابھرے ہوئے زخم کے نشان کو سہلایا اور ایک ادائے دل ربائی سے بولا۔ "میں نے کب کہا اضافہ۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ تعداد تیس نہیں ہو گی......" نواب نے پھر پہلی بار اس سیلابی سہ پہر میں خوش دلی سے قہقہہ لگایا اور ہاف مین کی طرف اس انداز میں دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ "اب کہو کہ کیا کہتے ہو" مگر ہاف مین کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ملازم آ گیا اور نواب کے بہت قریب جا کر اس کے کانوں میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ نواب کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ملازم کے ساتھ اندر جاتے ہوئے اس نے ہاف مین سے کہا "میں ابھی آیا۔"

"کیا باغی نے شراب کی فرمائش کی ہے؟" ہاف مین نے پوچھا اور نواب چونک کر قہقہے لگانے لگا۔ جس پر ہاف مین کو کچھ تعجب ہوا کیونکہ اس کا وہ فقرہ اس کے خیال میں کچھ ایسا پر مزاح ہرگز نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو نواب کے اس سنگین رازدارانہ ہلاکت خیز نظریۂ علم پر ایک پھبتی تھا۔ مگر نواب نے جلد ہی وضاحت کر دی "کیسا عجیب اتفاق ہے۔ واقعی معاملہ یہاں بھی ایسا ہی ہے مگر باغی کا نہیں مدد علی کی تیاری کا مسئلہ ہے۔ وہ خود نہیں پیتا۔ جانتا بھی نہیں کہ یہ کیا ہے۔ اسے زبردستی وغیرہ کر کے پلانی پڑتی ہے۔ اب تو یہ اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ میں آ کر بتاتا ہوں سب کچھ......" وہ اندر چلا گیا اور ہاف مین کے تعجب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ بڈھے نے پہلے بھی گفتگو میں کہیں "مدد علی کی تیاری" کا ذکر کیا تھا اور اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی...... کیسی تیاری؟...... غلام بارغ...... اور اب یہ شراب نوشی...... زبردستی...... کیا بکواس...... یہ کیا جہنمی کھیل

ہے جو یہ شیطان اس قابل رحم مخلوق کے ساتھ کھیلنے والا ہے جس کی زبان نے پہلے ہی اس کے جسم کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے۔ وہ شیطان صفت نواب مدد علی کے ساتھ اس سیلابی سہ پہر میں کیا کرنے جا رہا ہے۔ بے چینی کا ایک بگولا ہاف مین کے ذہن میں اٹھا اور مناظر، مکالموں، کیفیتوں کے وہ سب سلسلے وقت کی اضطرابی گردش میں چکرانے لگے جن میں گھوڑوں کے اس سائیس نے ان چاروں کے ساتھ وقت کا اشتراک کیا تھا...... ڈاکٹر ناصر بے ہوش مریض کے منہ سے قدیم برطانوی سونے کا سکہ برآمد کرتا ہے۔ کبیر اور ہاف مین جیس کے چکراؤ میں مدد علی کی دل ہلا دینے والی چیخ سنتے ہیں جو جسم کنٹھر کی تہہ میں سے آتی ہے اور پھر مدد علی دوبارہ کبھی آواز حاصل نہیں کر پاتا۔ وہ چاروں اس کو اس کی گویائی واپس دلانے کے لیے کئی طبی نفسیاتی کھیل کھیلتے ہیں اور اس کی حالت اور بھی بگڑ جاتی ہے اور اب کبیر یہ کہتا ہے...... ہاف مین اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پرشکوہ ڈرائنگ روم میں قدم اٹھاتا اس کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے جہاں کچھ دیر پہلے نواب کھڑا تھا اور باہر بارش کو دیکھتا تھا اور منحوس تاریخی لمحوں کی بات کرتا تھا۔ ہاف مین دیکھتا ہے کہ وہ ویسی ہی ہے۔ برستی ہوئی۔ کبھی مہین کبھی بھاری، کبھی مدھم، کبھی تیز مگر نہ جانے والی، نہ ختم ہونے والی...... "یہ سب گناہ بہا کر لے جائے گی میرے جسم کے سب گناہ میرے ذہن کے سب گناہ" کبیر کہتا ہے "میرے جسم کی آلائشیں اس میں بہہ جائیں گی۔ یہ قربانی یہ قبول کرے گی تو جائے گی اور جب میں اس میں سے جلا ہوا ڈھلا ہوا نکلوں گا"۔ "یہ کچھ ہذیانی کیفیت ہے شدید جلنے کے کیسوں میں کبھی یہ ذہنی کیفیت ہو جاتی ہے" ماہر ڈاکٹر کہتا ہے...... "یہ کچھ ہذیان نہیں ہے ڈاکٹر میں جانتی ہوں اور ہاف مین جانتا ہے اور ناصر جانتا ہے۔ جب یہ جلا نہیں تھا تو بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا" اور ہاف مین دل میں کہتا ہے "زہرہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ وہ عرصہ جو میں نے تمہاری دنیا میں گزارا وہ ہذیان کا زمانہ تھا۔ اب میں واپس ہوش مندی کی زبان بولنے والوں کی ٹھنڈی منطق کی دنیا میں جا رہا ہوں اور میرا دل برف کی ایک سل ہے۔ کاش تم اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس سردی کو محسوس کر سکتی جو میرے اندر بھری ہے......" اور کبیر ہنس رہا ہے اور کہہ رہا ہے "اس وقت تو فطرت ہذیان کا شکار ہو رہی ہے ڈاکٹر" اور ماہر ڈاکٹر کبیر کی آنکھوں کو آلے سے چیک کرتا ہے اور بجلی کا دیا کوئی پھیلاؤ نہیں دیکھتا جو آنکھوں کے پیچھے چھپے کسی بڑے انتشار کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹر ناصر کی طرف دیکھ کر ایک امید افزا اثبات میں سر ہلاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ تیمار دار

Scanned by CamScanner

خاتون سچ کہتی ہے۔ وہ جاتا ہے اور کبیر کہتا ہے "ناصر ہذیان کے زمانے کیا ہوئے؟ جو ہم نے دیوانگی کے اشتراک میں کسی انوکھی فرزانگی کی آرزو میں گزار دیے مگر...... گورا جا رہا ہے غلام باغ کا معمہ ساتھ لیے مگر غلام باغ کا معمہ جوں کا توں قائم ہے" وہ پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے "دیکھو فطرت بھی ہماری پیروی میں دیوانی ہو رہی ہے آگ، پانی، مٹی...... مگر ہوا بے نیاز اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ بے نیاز ہوا آخر تشویش سے واپس آئے گی تو سورج بھی واپس آئے گا گیلی مٹی خشک ہونے کو آئے گی تو بیج پھوٹیں گے اور پھول کھلیں گے پھر زہرہ انعام گزیدہ جائے گی اور میں دیکھوں گا جل کر بجھنے والا عجیب اتفاقات کبیر اسے انعام دلائے تو کیسے دلائے۔ پھر ہم مدد علی کو لے کر چنے سائیں کی درگاہ پر جائیں گے۔" کبیر ہاف مین کی طرف دیکھتا ہے "آہ میرے پیارے ہاف مین تم ننگے افلاطون کی زیارت سے محروم رہ گئے۔ کیا یہ تمہاری زندگی کا ایک چھوٹا سا المیہ نہیں ہے......" "یہ کافی بڑا المیہ بن رہا ہے میری زندگی کا۔ مگر افسوس میں اور یہاں رک نہیں سکتا۔ میرا وقت ختم ہو گیا ہے کاش کہ ہم ابھی وہاں جا سکتے اور دیکھتے جو غار میں برہنہ زندہ ہے اور لوگوں کی مرادیں محض اس کے ہونے سے آپ ہی آپ پوری ہو جاتی ہیں کیا ایسا ہی ہے؟" "شاید ایسا ہی ہے۔" کبیر کہتا ہے "مگر ہم ابھی اس کی زیارت کے لیے نہیں جا سکتے۔ اس لیے کہ فطرت ابھی دیوانی ہے اور میرا جسم بھی ابھی...... پھر ہم...... مگر ہم آنے والے گرما میں وہاں جائیں گے۔"

"آنے والا گرما میرے لیے ناممکن ہے...... مگر تم یہ بتاؤ...... کبیر تم مدد علی کو وہاں لے جانے کا کیا کہتے ہو۔ یہ کیا کہتے ہو۔" کبیر ناصر کی طرف دیکھتا ہے اور اس کی ہمیشہ کی خاموشی اور اداسی کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور کہتا ہے۔ "ڈاکٹر نے اس قابل رحم حیوان غیر ناطق کا کیس بند کر دیا ہے۔ اس کے دماغ کے مراکز صوت و نطق، لسان اور پتہ نہیں کیا کیا کو...... وہ اپنی کسی بھی طبی، نفسیاتی وغیرہ وغیرہ چالوں سے دوبارہ چالو نہیں کر سکا۔ ہمارے اشتراک سے اس کا کیس اور بھی بگڑ گیا ہے یا شاید سنور گیا ہے۔ وہ اب انجذاب کی کیفیت میں ہے۔ اس قدر گہرے انجذاب کی کیفیت میں کہ مجذوب اس پر رشک کر سکتے ہیں یعنی اگر وہ ہنوز رشک کرنے کے قابل ہوں۔ مجذوبوں کی اس لحاظ سے دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ابھی تک رشک کرنے کے قابل ہوتے ہیں دوسرے وہ جو رشک کے مقام سے آگے چلے جاتے ہیں۔ یہ دونوں ہی اقسام چنے سائیں کے مزار کے گرد وافر پائی جاتی ہیں۔ مجھے امید ہے ہمارا مدد علی وہاں اپنا مقام بنائے گا اور جب میں مزار کے متولی

چاچا نور دادا کو بتا دوں گا کہ یہ اللہ کا پیارا بڑے شہر کا گرم سرد چکھ کر اس حال کو پہنچا ہے تو وہاں اس کا مقام اور بھی ممتاز ہو جائے گا۔ جیسے میں بڑے شہر کا گرم سرد چکھ کر اس حال کو پہنچا ہوں مگر مقام کا ابھی کچھ پتہ نہیں......" کبیر قہقہہ لگاتا ہے اور اس کے کرب کے عضلات جو سکڑ چکے ہیں اس کو قہقہے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے چہرے پر درد کے تاثرات ابھرتے ہیں اور زہرہ ناصر کی طرف شاکی نظروں سے دیکھتی ہے اور ناصر کہتا ہے "فزیو تھیراپی شروع ہو گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ۔" "مدد علی کو ہم سب نے مل کر گونگا کیا ہے اور ہمیں اس کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ کیوں ہیر ہاف مین......" کبیر ہاف مین کی طرف دیکھتا ہے اور اپنی مخصوص تیز سی مسکراہٹ سے کہتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں کسی کے واپس آنے کی آوازیں آئیں تو ہاف مین کھڑکی سے پلٹا۔ ملازم شراب نوشی کے لوازمات رکھ رہا تھا۔ پھر نواب بھی آ گیا اور ہنستا ہوا کہنے لگا "میں نے سوچا ہم کیوں محروم رہیں۔ ویسے وہ لے رہا ہے اب۔ ایک کے بعد جب اس پر مستی طاری ہوتی ہے تو پھر مزاحمت محسوس نہیں کرتا۔ تم ہاف مین، بارش کو چھوڑو۔ ویسے ہمیں غلام باغ تک پہنچنے کے لیے بھی کسی بڑی گاڑی کی ضرورت ہو گی۔ میں نے ایک اونچی لینڈ روور منگوائی ہے جو پانی میں چل سکے۔ ویسے پانی غلام باغ کے اندرونی اونچے حصوں تک نہیں پہنچا۔ یہ بھی غنیمت ہے لیکن چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ بہر حال دیکھا جائے گا۔ ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔ تم لوگوں۔ اُسے دھت ہونے اور ہمیں قدرے پرسکون ہونے میں ایک جتنا وقت ہی لگے گا۔ آؤ۔" ہاف مین نے تھکے قدم اٹھاتا آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور سنجیدہ سخت لہجے میں پوچھنے لگا "تم اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو نواب جنگ۔ تم اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہے ہو۔ اس مظلوم مخلوق کے ساتھ......؟" یک دم نواب کے چہرے پر تفکر آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی "تمہارے...... اُسے مظلوم مخلوق بنانے والے تمہارے وہ مقامی دوست ہیں" نواب نے کہا پھر یک دم خاموش ہو گیا جیسے غلطی سے کسی کے منہ سے ایسی بات پھسل جائے جسے کہنے کا حکم نہ ہو۔ پھر اس نے ایک خشک سی اخلاقی بے حسی سے کہا "مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں مدد علی کی یہ حالت کیسے ہوئی...... میں تو صرف اتنا کرتا ہوں کہ اپنے عمر بھر کے اور اب ناکارہ ملازم کو یہ دوا پلاتا ہوں اور پھر وہ پھر سے کار آمد ہو جاتا ہے کچھ دیر کے لیے......"

Scanned by CamScanner

"کیا وہ بولنے لگ پڑتا ہے؟" ہاف مین نے سخت حیرت سے پوچھا۔

"نہیں بولتا تو نہیں مگر اس کے دماغ کے سخت کسے ہوئے پیچ کچھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ڈھیلے پڑے شاید کچھ کس جاتے ہیں..... مگر وہ کسی بات کو کچھ سمجھنے لگتا ہے پھر کچھ انوکھی ترنگ میں لڑکھڑاتا پھرتا مزے میں آ کر آپ ہی آپ ایسی جگہوں کی طرف لے جانے لگتا ہے جہاں ہمیں کچھ ہلکی پھلکی کھدائی کرنی چاہیے۔"

نواب کی شیطانی ترکیب پر ہاف مین دنگ رہ گیا اور اس نے فوری فیصلہ کیا کہ گو کہ وہ کیپر، ناصر، زہرہ سب سے آخری ملاقات کر چکا ہے مگر ڈاکٹر ناصر کو کل جانے سے پہلے کسی طرح اسے ضرور ملنا ہوگا اور مدد علی پر ہوئے اس نئے نوابی انکشاف سے ضرور آگاہ کرنا ہوگا۔ باقی مدد علی جیسے صحت یاب کرنے کا ہر حربہ ناکام رہا تھا۔ وہ بقول نواب "انوکھی ترنگ میں لڑکھڑاتا آپ ہی آپ غلام باغ میں مدفون خزانوں کی طرف کیسے رہنمائی کرے گا۔" یہ تماشا وہ خود دیکھ لے گا۔ اس قہر خداوندی بارش میں جو پرانی دیواروں کو اس حد تک بھربھرا کر دیتی ہے کہ نوکیلے اوزاروں کے سامنے ان کی مزاحمت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا مظاہرہ وہ دیکھ لے گا یعنی اگر یہ سب کچھ ایسا ہی ہے اور وہ بوڑھا عیار جھوٹ نہیں بکتا اور وہ گاڑی آنے والی ہے۔ جو پانی میں ڈوبے بڑے شہر میں سے گزر کر انہیں غلام باغ تک لے جائے گی۔

ہاف مین نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنا گلاس اٹھایا اور نظریں نواب کے چہرے پر جما دیں۔ اسے یاد آیا کہ مدتوں پہلے جب وہ اس خطۂ زمین پر اترا تھا تو ہوائی مستقر کے باہر یہ پہلا مقامی چہرہ تھا جو اس سے مخاطب ہوا تھا۔ جس نے غلام باغ کے سابقہ 'معزول' مالک اور عالیہ خود ساختہ محافظ کی حیثیت سے اپنا تعارف اس سے کروایا تھا۔ وہ ایک روایتی، وضع دار، قدیم نوابی رکھ رکھاؤ والا چہرہ تھا جس کی سفید مونچھوں اور بھوری آنکھوں میں سے اشرافیہ کی ٹھاٹھ باٹھ اور پرتعیش مہمان نوازی کا وعدہ جھلکتا تھا اور مہمان کو متاثر کرتا تھا۔ وہی چہرہ اس سیلاب زدہ سہ پہر میں کسی طوائف کے بوڑھے دلال کا چہرہ تھا جس کی عمر بھر کی ذلت نا آسودہ گاہکوں کے لگائے زخموں کے نشانوں کی صورت میں اس کے چہرے پر ثبت ہو گئی تھی۔

"کیا دیکھتے ہو گورا صاحب" نواب نے ہنس کر پوچھا اور ہاف مین کے لیے بات بنانی مشکل ہو گئی۔

"آ..... وہ نواب جنگ..... میں..... میرا خیال ہے غلام باغ کا معمہ میں اشاعت کے لیے تم اپنی کوئی پرانی فوٹوگراف دے دو..... یہ جو کوئی حادثہ تمہارے ساتھ ہوا ہے اس نے معاف..... کرنا تمہارے چہرے کو کچھ بگاڑ دیا ہے۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم نے اسے ایسا ہی کیوں رہنے دیا ہے معمولی پلاسٹک سرجری سے یہ بالکل ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

نواب مسکرایا اور اس نے آنکھ کے نیچے پھولے ہوئے زخم کے نشان اور دوسرے نشانوں اور پھر جبڑے کے ٹیڑھے پن پر ایک فحش خود لذتی کی کیفیت میں انگلیاں پھیریں اور بولا "نہیں یہ ایسا ہی رہے گا۔"

"کیوں" ہاف مین کی حیرت بجا تھی۔

نواب نے اپنا گلاس پھر بھرا اور اس کی وہ کیفیت دوچند ہو گئی۔ "مسٹر ہاف مین ابھی کچھ دیر پہلے ہم کچھ سنگین بات کر رہے تھے جسے تم نے 'رازداری علم' یا کچھ ایسا ہی تعلیمی سا نام دیا تھا۔ تمہیں یاد ہے۔" "ہی رہی تھی۔ تم ابھی کچھ اور مثالیں اپنی ذاتی تاریخ میں سے دینے والے تھے۔ میں پھر تمام کانوں سے سن رہا ہوں" ہاف مین نے پھر وہ مخصوص انگریزی محاورہ استعمال کیا اور پورے اشتیاق سے۔

"نہیں میں اپنے آباؤ اجداد، اپنے عہد رفتہ اور رفتہ سے پیوستہ تاریخ عہد ساز عظیم اسلاف وغیرہ کی بات نہیں کروں گا مگر یہ زخموں کے نشان یہ چہرہ میں ایسا ہی رکھنا چاہتا ہوں کیوں؟ کیا ہر کسی کو اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ میرے اس کیوں کا جواب جاننے کی کوشش کرے۔"

"نہیں۔ یقیناً نہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔"

"نہیں تمہارا معاملہ مختلف ہے۔" نواب نے جلدی سے کہا

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تم..... " نواب فقرہ ادھورا چھوڑ کر گہری نظروں سے ہاف مین کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔ "اس لیے کہ تم جانتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں۔"

"نہ صرف یاد ہے بلکہ یہ بھی یاد ہے کہ وہ بات ادھور

"کیا یہ کچھ اگلوانے کے چکر میں ہے" ہاف مین نے سوچا اور پھر اچانک اسے نواب کی

Scanned by CamScanner

ایک کمزوری کا خیال آیا اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم کوئی اور بات کریں نواب جنگ ہمیں اٹھا نہیں چاہیے اب؟ کیا وہ پانی میں چلنے والی کشتی ابھی آئی نہیں۔ مدوعلی کی تیاری مکمل نہیں ہو گی ہو گی؟ ویسے مجھے کہنے دو نواب جنگ آنکل کی تمہاری برداشت بہت کم ہو گئی ہے۔" ہاف مین نے اصل بات آخر میں کی اور نتائج کے انتظار میں نواب کی طرف دیکھنے لگا۔

"جیسے ہی گاڑی آئے گی ہم نکلیں گے مجھے اطلاع ہو گی...... اور یہ تم کیا بات کرتے ہو ہاف مین برداشت۔ کالا کتا وھسکی کے دو گھونٹ سے تمہارا خیال ہے میں بہک جاؤں گا۔ کیا کہو اس ہے۔ میں نے سوچ سمجھ کر کہا تھا کہ تمہارا معاملہ مختلف ہے۔"

"مگر میں کیسے سمجھ سکتا ہوں تمہارے بتائے بغیر۔"

"یقیناً، بتائے بغیر" نواب نے کہا پھر کسی عیاش بوڑھے کی نشئی رال ٹپکاتی آنکھوں سے ہاف مین کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا "تم ابھی جوان ہو میرے پیارے آرکیالوجسٹ، مگر جب تم میری عمر تک پہنچو گے بلکہ میری عمر سے کافی پہلے ہی ایک عمر تک پہنچو گے تو تم کیسا پسند کرو گے کہ تمہاری بیٹی کی عمر کی کوئی عورت تمہیں درد میں مبتلا کرے۔ وہ تمہیں شدید درد دینے والی ضربوں سے کچل ڈالے۔ تمہیں ایسی اذیت دے کہ تمہارے گوشت کا ریشہ ریشہ جدا ہونے کو آئے مگر پھر بھی جدا نہ ہو۔ وہ چوٹ لگائی جائے اور تمہارے جسم کے تار ٹوٹ جانے کو آئیں مگر ٹوٹ نہ سکیں اور اندر کے غلاف پھٹ جانے کو آئیں مگر آہ...... مگر پھٹ نہ سکیں" نواب نے سسکی سی لی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں "کیا تم ایسی سنگین راز خواہشوں کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہو۔"

"نہیں" ہاف مین نے کہا اور فیصلہ کیا کہ اس کے لیے اب کچھ نہ بولنا یا کم سے کم بولنا ہی بہتا ہے۔ نواب نے اپنے چہرے پر ویسے ہی قحش لمس ٹٹولنے شروع کیے اور کچھ دیر بعد بولا "یہ چہرہ ایسی ہی خواہش کی اچانک تکمیل کی نشانی ہے اور اسے چھونا ہی میرے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اس تکمیل کی یاد تازہ کرنے کے لیے تم سن رہے ہو ناں غلام باغ کا معمہ کے مصنف؟"

"ہوں...... ہاں"

"میرے دادا چچا کے حرم میں۔ زنانہ میں ایک دُور افتادہ کمرہ تھا۔ جہاں سے آدھی رات کے بعد چوڑیوں اور گھنگروؤں کی آوازوں کے ساتھ یکدم دادا مرحوم کی درد بھری چیخیں ابھرتی تھیں جیسے کوئی بیل ذبح ہونے سے پہلے ڈکراتا ہے اور پھر آخر میں ذبح ہونے والے بیل کے کٹے ہوئے

حلق سے نکلتی خرخراہٹ کی طرح کی آوازیں آتی تھیں اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ میں بچہ تھا۔ ایک دن قبلہ گاہی والد صاحب مرحوم...... میں انگریزی میں اس طرز تخاطب کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ بہر حال میں قبلہ والد صاحب مرحوم سے ان آوازوں کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ قبلہ نے زندگی میں پہلی اور آخری بار مجھے شدید زدوکوب کیا اور فرمایا "آئندہ یہ سوال مت پوچھنا...... نہیں مسٹر ہاف مین ہر سوال پوچھا نہیں جا سکتا...... ورنہ......" اچانک وہ ہنسا "سوال نہ کرنے والے بوریوں میں سے نکل جاتے ہیں مگر سوال کرنے والے بوریوں میں ہی رہ جاتے ہیں۔ نہیں سمجھے؟"

"نہیں"

"دادا چچا مرحوم کی ہی بات ہے۔ عظیم انسان تھے۔ عظیم انسان وہ ہوتا ہے جو خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا اور پھر اسے یقینی بناتا ہے۔ مرحوم کی نیم شبی آوازیں دوسرے سنتے تھے مگر مزید سننے سے پہلے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے مگر ان کا فیصلہ تھا کہ خود نہیں بھی تو ویسی ہی آہ و بکا سننے کا حق ہے۔ دیوان نے اس مقصد کے لیے 'بوری کوٹ' کی ملازمت کا اجرا کیا اور اس کی خفیہ تشہیر کی اب دیکھو یہ خفیہ بھی ہے اور اس کی تشہیر بھی ہو رہی ہے کون ایسے تضاد کو زندگی دے سکتا ہے بہر حال ہم 'بوری کوٹ' پر آتے ہیں۔ میں تمہارے تجسس کا مزید امتحان نہیں لینا چاہتا۔ یہ ملازمت صرف پندرہ منٹ کی تھی اور معاوضہ دس روپیہ۔ ذرا اندازہ کرو اس زمانے کا دس روپیہ آج کے ہزار کے برابر ہے۔ خفیہ طور پر یہ ایک کھلی پیش کش تھی کہ جسے دس روپے کمانا ہیں پندرہ منٹ کے لیے بوری میں گھس کر بیٹھ جائے۔ بوری کا منہ بند کر دیا جائے گا اور دادا چچا اپنے بید سے ضربیں لگائیں گے۔ چیخ و پکار کا پندرہ منٹ کا کھیل تماشہ، رعیت میں سے بہت لوگ آتے تھے۔ دس روپلی کما کر لہولہان بوری سے نکل کر گرتے پڑتے چلے جاتے تھے اور پھر مزے سے ٹھیک ٹھاک ہو جاتے تھے۔ دس روپے سے کئی مہینے اپنے بچوں کو روٹی کھلاتے تھے۔ خلقت کا بھلا تھا مگر پھر کچھ فسادیوں نے دادا چچا مرحوم کے اس شوق پر سوال پوچھنے شروع کر دیے۔ بک بک شروع کر دی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ وہ اپنی مرضی سے بوریوں میں بند نہ ہوئے۔ بند کیے گئے اور دس روپے بھی نہ کما سکے بوریوں سے نکل ہی نہ سکے۔ دادا چچا مرحوم کو بھی کئی کئی بار پندرہ پندرہ منٹ لگانے پڑے تو ہر سوال پوچھا نہیں جا سکتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں" ہاف مین کے منہ سے بے اضطراری لفظ نکلا اور سُن کر دینے والے خوف نے اسے

اندر تک کھنڈر کر دیا۔ "نہیں" اس کے منہ سے پھر نکلا۔

"تم ایک اچھے سامع ہو ہاف مین۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بات جسے گو کہ تم نے کہا تھا کسی علم کا نظریہ....... گو کہ تم نے کوئی ایسا پیچیدہ طنز کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ تم قائل ہو رہے ہو بوڑھے نواب کی بات کے، کہ ایک حد سے آگے پھر خاموشی ہے۔ آگے دیوار ہے......"

"یقیناً"

"یقیناً" نواب نے تقدس آمیز لہجے میں کہا" راز خاموشی سے پوچھنے کی چیزیں ہیں۔ اب کون اس راز پر سوال پوچھ سکتا تھا کہ میرے..... ہمارے..... اب میں رشتے کا نام بھی نہیں لوں گا۔ تعلق بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ ضروری نہیں" ہاف مین نے تابعداری سے کہا۔

"بہر حال وہ جو بھی تھے ان کا ایک گورکن سے بہت گہرا تعلق تھا۔ کیا تعلق تھا؟ میں نہیں جانتا؟ کوئی نہیں جانتا کہ وہ دو ٹکے کا رذیل کیوں کیسے ان کا اتنا منہ چڑھا بن گیا کہ جیسے وہ چاہتا ویسا ہی کرتے مگر آگے دیوار ہے۔ خاموشی ہے۔ کبھی نہیں پوچھا کسی نے نہیں پوچھا۔ کیا تم پوچھ سکتے ہو؟" نواب نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں" ہاف مین نے کہا مگر اب اس کا نہیں اضطراری نہیں تھا بلکہ ایک جوابی دھمکی جیسا اظہار تھا" میں یہ نہیں پوچھوں گا مگر میں ایک اور سوال پوچھوں گا کیا تمہارے ہاں مردانہ اور زنانہ کفن ایک جیسے ہوتے ہیں؟"

"ہاں ایک جیسے ہوتے ہیں مگر تم یہ کیوں پوچھتے ہو؟" نواب کا چہرہ کسی کبیدگی کے بعد اور بھی مکروہ نظر آنے لگا۔

"کیونکہ مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ میں تمہارے اس سوال کا جواب نہ دوں مگر میں یہ کہوں گا کہ اگر تم یہ کہتے کہ نہیں مردانہ اور زنانہ کفن مختلف ہوتے ہیں تو میں یہ کہتا کہ جس بھی زمانے کی تم بات کرتے ہو اگر اس زمانے کا کوئی تجسس کا مارا ہوا اس گورکن کی کوٹھڑی کا مشاہدہ کر لیتا تو اسے پھر اور کوئی خطرناک سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی کوٹھڑی کی خاموشی خود ہی بولتی اور دیوار خود ہی گر جاتی۔"

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کی آنکھوں کی پتلیاں ہاف مین کی بات سن کر پھیل گئیں جیسے اندھیرا پھیلنے پر یا خوف کے غلبے پر جانوروں کی پتلیاں پھیلتی ہیں۔ نواب گاہ میں سناٹا تھا اور ہاف مین سوچ رہا تھا کہ وہ واپس جا کر ایک خط کبیر کو لکھے گا اور اسے اس موضوع پر اپنی مخصوص نظریہ بازی کی دعوت دے گا کہ جنسی کجروی کی مختلف شکلیں کہ اپنی واضح اور کھلی حالت میں نہایت قابلِ نفرین گردانی جاتی ہیں مگر انہیں کا پرتو انسان کے اس بنیادی تعلق کے سب جائز گوشوں پر پڑتا نظر آتا ہے تو کیا کجروی کی مکروہ ترین شکل کی علامتی صورتیں اور کم تر شکلیں ہر ثقافت میں عورت کے حوالے سے مرد کے فکر و عمل میں نہیں ملتیں؟ عورت کی میت صرف جسمانی میت تو نہیں، ایک بھیانک خط ہاف مین نے اپنے مستقبل میں کبیر کے نام مرتب کر لیا اور کبیر کے جواب کے مختلف امکانات پر کہ جس قدر وہ کبیر کو جانتا تھا کچھ توقعات بھی لگائیں مگر ہاف مین یہ خط کبھی نہ لکھ سکا (وہ ..... خط..... جو..... کبھی...... نہ...... لکھا...... گیا)

ملازم آیا اور اس نے بتایا کہ گاڑی آگئی ہے اور مدد علی سمیت سب کچھ تیار ہے۔

"آؤ مسٹر ہاف مین، چلیں" نواب نے کہا اور اس کی آواز کسی نامعلوم اضطراب سے تھرتھرا رہی تھی۔

مدد علی کے کندھے آگے کو جھکے تھے اور بازو پیچھے کو لٹکے تھے اور چلتے وقت جب وہ کچھ لڑکھڑا کر آگے بڑھتا تھا تو زمانہ قدیم کا کوئی انسان نظر آتا تھا جو لوہے کی ایک ٹیڑھی نوکیلی سلاخ لیے شکار کو نکلا تھا اور رین کوٹ پہنے ہوئے جدید زمانے کے دو انسان اس کا تعاقب کرتے تھے۔

رین کوٹ پہننے کے باوجود وہ طوفانی پانی سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے تھے۔ کیفے غلام باغ کی راہ سے گزرتے وقت انہیں گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزرنا پڑا تھا۔ غلام باغ کا موجودہ کھنڈر کا چوکیدار جب اپنی خدمت گزاری کا صلہ وصول کرنے کے بعد واپس اپنی کوٹھڑی میں جا گھسا اور وہ اس دنیا کے آمنے سامنے آئے جو ان تینوں کی سینکڑوں مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھی اور جہاں ہاف مین نے ان گنت گھنٹے، دوپہریں، سہ پہریں، شامیں اور راتیں گزاری تھیں۔ کبھی اکیلے، کبھی کبھی اپنے پیشے کے دوسرے افراد کے ساتھ۔ کبھی مدد علی کے ساتھ۔ کبیر کے ساتھ اور کبھی ان چاروں نے اکٹھے مگر اس وقت پہلی نظر میں جیسے وہ اپنی اس مانوس ترین جگہ کو پہچان بھی نہ سکا۔ وہ جگہ جو اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا محور تھی اور جس کا معمہ حل کرنے کی کوشش میں اس نے کئی برس

Scanned by CamScanner

لگائے تھے اور سینکڑوں کتابوں اور نایاب دستاویزات پر عرق ریزی کی تھی وہ جگہ وہ کھنڈر اور سمار باقیات ماضی کے خاتمے کی بجائے اب مستقبل کے خاتمے کا یاس انگیز پیغام دیتے تھے۔ سب کچھ ڈوب کر دنیا کا خاتمہ۔

مدد علی پانی میں شراپ شراپ پاؤں پٹختا آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانی آرزو کی چمک تھی جو بار بار دھندلا جاتی تھی۔ نم ناک ہوا اسے نامعلوم سندیسے دیتی تو وہ پاؤں پر چاروں طرف گھوم جاتا پھر ویسے ہی جھکے ہوئے اپنے لڑکھڑاتے قدموں میں آگے کسی سمت بڑھنے لگتا۔ یہ ایک متحیر کرنے والا احساس تھا کہ جیسے جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے جو اسے نظر آ رہا ہے وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا...... "چھپے ہوئے خزانے ڈھونڈنے کی حس ایک الگ حس ہے میرے پیارے ہاف مین" کیسر نے کہا اور ہاف مین نے گہرا سانس لیتے ہوئے ڈھونڈنے والے کو دیکھا اور پھوار بنی ہوا اس کے اندر اتر گئی

"یہ تو مجھے ان حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک زیر زمین پانی تلاش کرنے والے جیسا لگتا ہے جو اپنی مخصوص دوشاخہ لکڑی کی شاخ دونوں ہاتھوں میں تھامے چلتا ہے اور پھر کسی جگہ رک کر نیچے اشارہ کرتا ہے پانی ہے مگر اب تو ہر جگہ پانی ہی پانی ہے...... یہ کیا ڈھونڈے گا" ہاف مین نے کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے کہا۔ آبی سناٹا نامعلوم خوف پیدا کرتا تھا اور پھر انہوں نے وہ بھاری آواز سنی شراپ دھم۔

"دیکھا دیکھا آپ ہی آپ کوئی دیوار گری ہے" نواب نے جوش سے کہا اور مدد علی اچانک کسی رقاص درویش کی طرح اپنے ہی پاؤں پر گھومنے لگا۔ اس کی حرکت سے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اٹھتی لہریں ہاف مین کی پتلون کے پائنچوں سے ٹکرائیں تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سینکڑوں کیڑے مکوڑے پانی میں سے نکل کر اس کی ٹانگوں پر اوپر کی جانب رینگنے لگے ہیں۔ پھر مدد علی یک دم رکا اور پھر اور بھی تیزی سے سلاخ لہراتا اس سمت بڑھنے لگا جدھر سے دیوار کے گرنے کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی تھی۔

جنم کھنڈر اور اس کے ملحقہ حصے اونچائی پر ہونے کی وجہ سے ابھی تک ڈوبنے سے بچے تھے۔ ایسے ہی غلام باغ کے وہ حصے جن کی بنیادوں کی تہوں اور تعمیر در تعمیر کے عمل نے انہیں کچھ بلند کر دیا تھا اور بظاہر محفوظ تھے مگر بارش سے کچھ محفوظ نہ تھا لیکن سکھوں کی مڑھی یا نامعلوم سردار کی قلعہ بندی اور بھیم سرائے جو کسی وقت گورے سپاہیوں کی عارضی رہائش کے طور پر بھی استعمال ہوئی تھی یہ قدیم آثار زیر آب آ چکے تھے۔ مدد علی بھیم سرائے کے اس حصے کے سامنے رکا جہاں گھٹے نے

شاہی مطبخ' کی تختی کا ذکر بھی تھی مگر اب دیوار گرنے کے ساتھ ہی یہ تختی بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ پانی میں گری دیوار کے ڈھیر پر ابھی تک زمانہ قدیم کی گرد کا مختصر سا بادل معلق تھا اور ہاف مین نے حیرت سے دیکھا کہ کس طرح نمکین بارش اسے آہستہ آہستہ کھاتی جا رہی تھی۔

"شاہی مطبخ" اس نے کہا "یقیناً یہاں سے کسی پرانے برتن کے برآمد ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔" مدد علی ملبے کے ڈھیر کے اوپر چڑھنے کی بجائے اس کے چاروں طرف پانی میں گھوما پھر ایک جگہ پانی میں بیٹھ کر اس نے سلاخ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے سر سے آگے کر دی۔ اس عجیب و غریب حالت میں وہ کوئی سونڈ دار آبی جانور نظر آتا تھا جو اپنے بل میں گھس جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سیلابی آرکیالوجی کے دوران ہاف مین نے مدد علی کے گہرے مشاہدے کے باوجود ابھی تک اپنے لیے یا نواب کے لیے اس کی آنکھوں میں پہچان کی کوئی خفیف سی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے ایک مکمل لاتعلق ہیجان میں تھا جس کا وہ قدم قدم پیچھا کر رہے تھے۔

نواب نے اسے کیچڑ، پرانی اینٹوں اور عہد رفتہ کے چونے مٹی کے گارے میں سوراخ بناتے دیکھا تو خوش ہو گیا اور بولا "اب تم میرے ملازم کے میرے جزوقتی علاج کے قائل ہوئے ہو یا نہیں۔ مائی ڈیئر ہاف مین۔"

"میں نہیں سمجھتا یہ کسی قسم کا علاج ہے، وہ اپنی کسی دنیا میں ہے۔ اُسے کیا نظر آتا ہے وہ کیا ڈھونڈے گا کوئی نہیں جانتا" ہاف مین نے خشک لہجے میں کہا۔

"تم دیکھ لوگے" نواب نے کہا اور اپنے ہاتھ میں لٹکے ایک پلاسٹک کے تھیلے کو ہلکا سا جھلاتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہنے لگا "ورنہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ مالک کے لیے کچھ کما کر نہ لایا تو اُسے سزا ملے گی۔" وہ ہنسا اور اس کی ہنسی میں ایک عجیب سی نحوست بھری تھی جسے ہاف مین کوئی معنی نہ پہنا سکا۔

"کیا مطلب"

"کچھ نہیں" نواب نے اسے کندھے پر تھپکی دی۔ "آؤ ہم ادھر سے درخت کے نیچے باقی ماندہ سرائے کی دیوار کے ٹکڑے پر بیٹھ کر وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا خزانہ ڈھونڈنے والا اپنا وقت لے گا۔" چند فٹ اونچی اس دیوار پر بیٹھنے کے بعد بھی ان کے پاؤں پانی میں تھے۔ ہاف مین نے نواب سے کافی دور ہٹ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور یہ صاف تاثر دیا کہ وہ کسی بھی گفتگو

Scanned by CamScanner

میں الجھنا نہیں چاہتا۔ غلام باغ میں آخری وقت گزارنے کا احساس ایک ذاتی صدمہ بن کر گھنا اور بھاری اس کے دل میں ایسا اُترا جیسے پہلے کبھی نہ اُترا تھا اور بارش اب بھی برسے جا رہی تھی ......اسے یاد آیا کہ یہ وہی دیوار ہے جہاں ایک رات کبیر اور وہ چکرا دینے والی اس گفتگو کے بعد میں جسے وہ بک بک کا نام دیتا تھا خدا جانے کدھر کے کدھر نکل گئے تھے اور پھر انہیں جتھم کھنڈر کے تہہ خانے میں سے مدھلی کی دلدوز چیخ سنائی دی تھی اور پھر آرکیالوجی کی تاریخ میں کچھ نئے افق کے باب کھل گئے تھے اور یہ آج...... یہ آخری باب ہے۔ ہاف مین نے ٹھنڈا سانس لیا اور دور اس حیرتناک عمارتی ساخت کو دیکھا جو غلام باغ کے اس کے صد جہتی مطالعے کا محور بن گئی تھی وہ چکرا دینے والے بھول بھلیاں زینے جن پر اس نے کتنی مشکل سے عبور حاصل کیا تھا اور وہ تہہ خانہ جہاں اس کی تحقیق کے مطابق مردانہ عضو کی قربانی دی جاتی تھی مگر جس کے شواہد ابھی اس کے خیال میں اتنے کافی نہ تھے کہ تحقیق کی کڑی شرائط پر پورے اترتے اور وہ اسے اپنی کتاب 'غلام باغ کا معمہ' کا حصہ بنا سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جانے سے پہلے وہ جتھم کھنڈر کے تہہ خانے میں بھی آخری بار ضرور جائے گا۔ آج ہی...... ابھی...... کچھ دیر بعد۔ کل اس کل سے پہلے جب وہ ہزاروں میل دور ہوگا اس وقت سے۔ "جو ایک بلائے ناگہانی ہے۔" کبیر نے کہا...... "دیکھو کون آیا ہے" زہرہ نے اپنی مسلسل جاگتی سرخ آنکھوں سے کبیر کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ہاف مین کے لیے اپنی محبت سے اسے دیکھا۔ ہاف مین نے آگے بڑھ کر اسے کندھے کے ساتھ تھام لیا...... چلتے ہوئے کی دنیا میں یہ بارش سے پہلے کا زمانہ تھا اور ہاف مین پہلی مرتبہ کبیر کو دیکھنے آیا تھا...... اچانک وارڈ میں کچھ نئی آوازیں ابھرتی ہیں اور ان کے قریب آجاتی ہیں اور ہاف مین محسوس کرتا ہے کہ اس کے کندھے کے ساتھ لگا زہرہ کا جسم اچانک تن گیا ہے...... وہ سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں شعلے جیسی زبان اسے نظر آتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔

ناصر جو جھک کر کبیر کے زخموں کا جائزہ لے رہا ہے وہ بھی مضطرب سا ہو کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ تین ہیں جو آئے ہیں۔ ناصر ان میں سے ایک کو سلام کرتا ہے تو ہاف مین جان جاتا ہے کہ وہ کوئی ہسپتال کی انتظامیہ کا بڑا ہے اور باقی دو کو وہ یاور عطائی کی آخری رات کی مخلوق کے طور پر جانتا ہے۔ انتظامیہ کا بڑا ناصر سے مخاطب ہوتا ہے "آپ یہاں ڈیوٹی پر ہیں"۔ "ج...... جج...... ج...... یس سر" ناصر جھوٹ بولتا ہے کیونکہ وہ سائیکیاٹری میں ڈاکٹر ہے برن میں

نہیں۔ وہ تو ہاف مین کے ساتھ آیا ہے۔ انتظامیہ کا بڑا کہہ رہا ہے "میرے پاس ایڈیٹر صاحب آئے۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ ان کا مریض یہاں ہے ایڈیٹر صاحب کے دوست۔" وہ اس شخص کی طرف دیکھتا ہے جو اپنی گندی چربیلی آنکھوں اور پھولے ہوئے موٹے سرخ چہرے کے ساتھ ہاف مین کے ذہن میں دوسری بہت سی کراہت آمیز یادداشتوں کے ساتھ محفوظ ہے...... وہ شخص مسکراتا ہے اور زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ زہرہ کی سانس تیز چل رہی ہے اور ہاف مین منتظر ہے کہ کچھ ہوگا اور اگر کچھ ہوا تو اُس میں اُس کا کردار کیا ہوگا۔ کیا ہو سکتا ہے کچھ بھی نہیں۔ وہ یہاں کی کسی بھی اصل حقیقت کا حصہ نہیں۔ حصہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسے بے انتہا ناتوانی کا احساس ہوتا ہے۔ 'بڑا' پہلے ہی معمول کی مرعوب نظروں سے ہاف مین کی طرف دیکھ رہا ہے اور بنی بنائی انگریزی میں اس سے مخاطب ہوتا ہے "یہ...... وہ...... آپ بھی مریض کی عیادت کے لیے آئے ہیں؟" "ہاں میرا نام فریڈرک ہاف مین ہے۔ میں ایک آرکیالوجسٹ ہوں۔ کبیر میرا ایک پیارا دوست ہے" 'بڑا' فراخ دلی سے مسکراتا ہے۔ "مجھے نہیں علم تھا کہ اتنا اہم مریض ، مریض یہاں ہے۔ ڈاکٹر بہترین توجہ دی جا رہی ہے ناں......؟" ناصر کہتا ہے "یس سر" ایڈیٹر ڈاکٹر کی بجائے ہاف مین کی طرف دیکھ کر بڑے ڈاکٹر کو مخاطب کرتا ہے۔ "یہ میرا پرانا سٹاف رائٹر ہے ڈاکٹر زبیر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا بے چارے کے ساتھ یہ حادثہ پیش آجائے گا۔ اللہ معاف کرے کس بری طرح جل گیا ہے۔ بہت اچھا رائٹر ہے میرا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اچھے ادیبوں۔ لکھنے والوں کی سرپرستی کی ہے۔" "جی، جی، آپ......" 'بڑا' کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ایڈیٹر رازدارانہ لہجے میں پوچھتا ہے۔ "ویسے آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب......" ڈاکٹر کے جواب دینے سے پہلے ہی زہرہ بولتی ہے "وہ مرے گا نہیں اگر تم یہ پوچھ رہے ہو تو میں تمہیں بتاتی ہوں"۔ زہرہ کی آواز کئی بے خواب راتوں کے بوجھ سے بھاری آتی ہے اور سناٹا چھا جاتا ہے جس میں اچانک کبیر آنکھیں کھولتا ہے۔ "یہ کیسی خبر ہے ہاف مین۔ خزانوں کی خبر، افروڈائیٹ کس کے خزانوں کی خبر ہے، تم ان خزانوں کی خاطر خصی کلب کے ارکان سے جا ملے ہو تم سے یہ توقع نہیں تھی مگر تم خطرہ نہیں دیکھ رہے۔ وہ خزانہ صرف اپنے ارکان میں بانٹیں گے۔ پھر جب میں ہر رکن کی سوانح حیات لکھوں گا تو یہ ضرور لکھا جائے گا...... کہ مجھے ایک بار جلانا کافی نہیں۔ مجھے بار بار جلانا پڑے گا۔ انہیں مجھے دوبارہ جلانا ہوگا...... کیا ہوا نیلا رجسٹر جل کر خاک ہو گیا کیا ہوا گنجینۂ نشاط بھسم ہو گیا۔ کیا ہوا پادری

Scanned by CamScanner

میکنائز کے اعتراضات جل گئے..... مگر سب کچھ میرے یہاں محفوظ ہے۔" وہ اپنے بازو کو حرکت
دینا چاہتا ہے جو لٹکی ہوئی نرم پٹیوں میں آویزاں ہے۔ ناصر اسے منع کرنے کی کوشش کرتا ہے
اور بے چینی سے انتظامیہ کے بڑے سے مخاطب ہوتا ہے۔ "یہ سر یہ اس شاک فیز میں
Disorientation ہو جاتی ہے۔ سانس کا عدم توازن نروس سسٹم پر اثر انداز ہو کر ذہنی انتشار پیدا
کرتا ہے۔" "جانتا ہوں۔" بڑا خشک لہجے میں کہتا ہے۔ "مگر یہ انتشار خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔
برن کے ہیڈ سے کہو ہماری طرف سے کوئی کمی نہ ہو توجہ میں" پھر وہ ایک مبہم سی عزت کے اظہار کے
لیے خفیف سا جھکتا ہے اور کہتا ہے "مجھے اجازت دیں۔ آپ عیادت کریں مگر مریض کو زیادہ بولنے
نہ دیں۔" بڑا جاتا ہے اور فوری طور پر چھ لوگوں کا وہ اجتماع بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔ ہاف مین
دیکھتا ہے کہ ایڈیٹر فوراً وہاں سے غائب ہو جانا چاہتا ہے مگر ہوس ناک آنکھوں والا بھدے انداز
میں اس کی پتلون کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر اسے روک لیتا ہے۔ وہ مسلسل زہرہ پر نظریں گاڑے
کھڑا ہے اور زہرہ ناصر سے پوچھتی ہے "ڈاکٹر ناصر کیا اس ہسپتال میں کتوں کا داخلہ ممنوع نہیں
ہے اور وہ بھی پاگل کتوں کا۔" ایڈیٹر کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے وہ جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہے مگر وہ
اسے تھامے ہوئے ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہو رہا ہے اور ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ کبیر کی
آنکھیں پھر سے بند ہو چکی ہیں۔ پھر ناصر بہت ہی تحمل والی تمیز داری سے ان سے مخاطب ہوتا ہے
"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ برائے مہربانی آپ یہاں سے تشریف لے جائیں"..... ہاف
مین حیران ہوتا ہے کہ بھولے چہرے والا یک لخت اس کی طرف دیکھنے لگا ہے اور پھر وہ اور بھی
حیران ہوتا ہے جب اسے بولتے سنتا ہے۔ شاید اسے گفتگو میں شامل رکھنے کے لیے وہ انگریزی
لفظوں کے ساتھ ایک پر تشدد اظہار کا آغاز کرتا ہے جس میں ہر لفظ ایک گالی جیسا پرتاثیر
ہے۔ ایڈیٹر کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے....." رسالہ، مالک، بہادر، نہیں، جانتا، میں، بھی، تین
دوست، یاور عطائی، بیٹی تین دوست، خاوند نہیں، خاوند کا کام، کام کرنا، جاننا، رسالہ، مالک،
بزدل۔ (ہنستا ہے) تین خاوند، کام کرنا، سرخ تیل، مالک، بیٹی، آنا، نہیں، میں، نہیں، کوئلہ، ملنا،
مرنا، جاننا، سن، عورت، سرخ تیل، بیٹی، عدالت، یاور ہاؤس، تم، تم ماں، جائیداد، عاق، ماں،
بھائی، بہت مزہ کرنا، میں، ٹانگوں، کے بیچ، تم، اچھا، بہت اچھا، (ناصر کی طرف دیکھتا ہے) جوا،
خاوند کا کام کرنا، (کبیر کی طرف دیکھتا ہے) کوئلہ، مرنا، اگر، اچھا، خاوند، محبت، (ہنستا ہے)،

سفید آدمی (ہاف مین کی طرف دیکھتا ہے)۔"

ہاف مین محسوس کرتا ہے کہ غلیظ آنکھوں والے کے انگریزی کے وہ الگ الگ لفظ گولیوں کی
طرح ان تینوں کے اندر اتر رہے ہیں جبکہ کبیر اپنی گہری نیند جیسی بے ہوشی میں ان سے محفوظ ہے
اور وہ لفظ کسی بھی رواں زبان دانی سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہو رہے ہیں۔ زہرہ کا رنگ پیلا
پڑ چکا ہے اور ناصر بت کی طرح کھڑا دیکھ رہا ہے اور ہاف مین ایسا ہے کہ جیسے کسی وقت بھی جھپٹ
پڑے گا۔ یک دم زہرہ مقامی زبان میں بھولے چہرے والے کو مخاطب کرتی ہے اور جو کچھ بھی بولتی
ہے ہاف مین کچھ نہیں پاتا۔ سوائے اس کے کہ کہیں اس میں وہ اپنے باپ کا حوالہ دیتی ہے مگر وہ کچھ
ایسا آتشیں کلام ہے کہ بھولے چہرے والے کو آگ لگا دیتا ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر اور بھی پھول
جاتا ہے۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور پھر انگریزی اسماء، اور افعال اور صفات کی بوچھاڑ
کر دیتا ہے۔ "میں، میں، (اب وہ لفظوں کے ساتھ کچھ جنسی اعضاء کے عالمی طور پر قابل فہم
جسمانی اشاروں کو بھی اپنے اظہار میں شامل کر لیتا ہے) یہ، یہ میں تم..... جانتا، یہ..... میرا.....
اچھا، اچھا، گورا، نہیں، اچھا۔"

"اس کتیا کے بچے کو کہو کہ یہ اپنی گندی بکواس بند کرے مسٹر میگزین ایڈیٹر، ورنہ میں اسے
اس قدر ماروں گا کہ فضلہ اس کے جسم کے ہر سوراخ سے بہہ نکلے گا۔" ہاف مین کے لیے ضبط
ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر پہلے ہی سخت جانکنی کے عذاب میں ہے۔ وہ اس بپھرے ہوئے
جانور کو لے کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے مگر اس پر قابو پانا اس کے لیے کسی طرح بھی ممکن
نہیں۔ "امبر جان امبر جان، چلو چلو، نہ کرو، چلو۔" ہاف مین ایڈیٹر کی التجائیں سنتا ہے مگر گورے کی
بات سمجھ کر امبر جان اور بھی آگ بگولا ہو جاتا ہے اور جنونی کیفیت میں اپنی پتلون کو آگے سے
کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایڈیٹر چیختا ہے۔ وارڈ بوائز اور ڈاکٹر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ امبر جان
دھاڑ رہا ہے۔ "گورا گورا..... گورے کا..... ٹانگوں کے بیچ..... میں..... یہ..... یہ....." اور پھر
ہاف مین اسے مزید اشارے نہیں کرنے دیتا اور جھپٹ کر اس کے منہ اور پیٹ میں زبردست
ضربیں لگاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر سیکیورٹی کو مدد کے لیے بلاتا ہے اور اب مقامی زبان میں وسیع و عریض
گالیاں بکتے اس شخص کو وارڈ سے باہر دھکیلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر پہلے سے مشکوک ہوئے طبی عملے
اور لواحقین کے سامنے ایک طرف کھڑا طویل وضاحتیں پیش کرتا ہے۔ اسی وقت کبیر آنکھیں

Scanned by CamScanner

کھولتا ہے۔''یہاں کہیں ہاف مین تھا۔ سنو گورے چھپے ہوئے خزانے ڈھونڈنے والوں کی سزا
موت ہے خواہ وہ زمین کھودنے والے ہوں یا علم کھودنے والے ہوں انہیں مجھے دوبارہ جلانا پڑے
گا......'' مقامی باشندے کے منہ اور پیٹ پر لگائی ضربیں ہاف مین کے اپنے باشندوں کی دنیا
تک سفر کر جاتی ہیں۔ بارش کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔ جو فرسٹ سیکریٹری کے ڈارئنگ روم کی
کھڑکیوں میں سے باہر نارفوک پائینز کے درختوں پر گرتی نظر آ رہی ہے مگر وہ بارش کو نہیں
ہاف مین کو دیکھتا ہے اور ایک افسردہ تیقن سے کہتا ہے''تم بھٹک گئے ہو ہاف مین۔ اتنا تو کم از کم
ہے جو مجھے کہنا چاہیے۔ یہاں کے متعلقہ حلقوں سے...... تم جانتے ہو میں کن حلقوں کی بات کر رہا
ہوں۔...... ان حلقوں سے تمہارے بارے میں بہت بری رپورٹیں آتی ہیں اور انکوائریز آتی ہیں
جنہیں میں گول کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اتنا کچھ تو پھر بھی بچ جاتا ہے کہ ہمارے اپنے لوگوں کو
سخت برہم کر سکے۔ جتنی مشکوک اطلاعیں، پراسرار افواہیں اور ناقابل یقین کہانیاں تمہارے
بارے میں سننے کو ملتی ہیں۔ مجھے یقین ہے پوری دنیا میں کسی ہمارے کسی سفارت خانے کے کسی
بدنصیب افسر کو اپنے کسی غیر ملک میں مقیم جرمن شہری کے بارے میں سننے کو نہیں ملتی ہوں گی......وہ
رم ہونٹوں سے لگاتا ہے اور مزید مضطرب ہو کر کہتا ہے......''اب...... اب یہ نیا یہ جو ہم تک پہنچا
ہے۔ تم کسی مقامی عورت کے چکر میں کسی بزنس مین سے جو در پردہ منشیات کا سمگلر ہے تم اس سے
کسی میڈیکل کالج میں جسمانی طور پر الجھ پڑے تھے۔ تم نے اس کا دانت توڑ دیا۔ تمہارے
مقامی نواب حمایتی نے تمہیں بچا تو لیا مگر بات ہم تک پہنچ گئی جیسے کہ پہنچنی چاہیے تھی۔ اب تم اس پر
کیا کہتے ہو''۔''میں اس پر یہ کہتا ہوں'' ہاف مین کہتا ہے۔''کہ رم کا چوتھا تمہارے لیے ضروری
ہو گیا ہے۔ پہلا تمہاری بویرین جرمن کو لڑکھڑا دیتا ہے۔ دوسرے پر تم رواں ہو جاتے ہو مگر
تیسرے پر پھر لڑکھڑانے لگتے ہو۔ اس لیے اب چوتھا تمہارے لیے ضروری ہو گیا ہے ویسے تم اس
بارش پر غور کیوں نہیں کرتے جو دنیا کے اس خطے میں آ کر جم گئی ہے جیسے کبھی نہیں جائے گی''......

''اس پر ہم غور کریں گے پہلے یہ خفیہ خط پڑھ لو یا رپورٹ جو تمہاری یونیورسٹی کے رجسٹرار نے
یہاں سے جانے والی تمہارے بارے میں ہماری رپورٹوں، جو میں نے نہیں بھیجیں، خدا مجھے
معاف کرے، اور تمہارے تحقیقی کام کے بارے میں تمہارے ڈیپارٹمنٹ کے متعلقہ لوگوں کی آراء
حاصل کرنے کے بعد اس نے مرتب کی ہے اور ہمیں بھیجی ہے یہ رپورٹ...... اور یہ ایک منحوس

دستاویز ہے ہیر ہاف مین۔ کسی بھی فیلڈ ورکر، آرکیالوجیکل محقق کی موت کا پروانہ ہے۔''''میں
جانتا ہوں بوڑھے جینٹس کو جانتا ہوں اس کے پردادے کا پردادا Inquisition میں جادوگرنیوں
کو زندہ جلانے کا پیشہ کرتا تھا۔'' ہاف مین کہتا ہے۔''دکھاؤ'' اور فرسٹ سیکریٹری اسے ایک بھورا موٹا
لفافہ دیتا ہے اور لاتعلق سا ہو کر اتنی دیر کے لیے واقعی بارش کو دیکھنے لگتا ہے جتنی دیر میں اس کے
خیال میں ہاف مین وہ رپورٹ پڑھے گا۔ ہاف مین دیکھتا ہے کہ تحریر کچھ زیادہ نہیں اور لفافے کی
دبازت دو موٹے پیلے کاغذوں کی وجہ سے ہے جن کے اوپر قدیم کلیسائی نشان فوراً اسے اپنی
یونیورسٹی کے طاقت ور انسانوں اور مقاموں کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں وہ پڑھتا ہے۔

......حوالہ جملہ خط و کتابت بمتعلق ریسرچ سکالر شعبہ آرکیالوجی فریڈرک ہاف مین۔ اُن
تمام اطلاعات، معلومات، رپورٹوں اور سرکاری تاثرات کے غیر جانبدارانہ اور تجزیاتی مطالعے کے
بعد جو مذکورہ ریسرچ سکالر کے بارے میں مجھے موصول ہوتی رہتی ہیں مجھے یہ بیان دینے میں قطعاً
کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ مذکورہ سکالر کا کردار، طرز عمل اور متعلقہ آثار قدیمہ زیر مطالعہ
کے حامل ملک میں اس کی سرگرمیاں نہایت ناقابل رشک رہی ہیں اور میرے لیے ان کی مذمت نہ
کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس شخص کا طرز عمل نہ صرف تحقیق کے شعبے پر ایک دھبہ ہے بلکہ قومی وقار
کے بھی منافی ہے۔ متعلقہ شعبۂ علم کے ماہرین کی رائے کے مطابق مذکورہ سکالر محقق شعبۂ علم مذکورہ
کے اعلیٰ سائنسی معیارات کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے غیر متعلقہ اساطیر، ذاتی خیال
آرائی، موضوعی قلم کاری اور فینٹسی میں الجھ کر رہ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو اس کے دلائل مقامی
توہم پرستی سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ یہ سب تکلیف دہ مشاہدات ہماری ان عظیم تحقیقی اور علمی
روایات کے پس منظر میں ہیں جو گزشتہ چار صدیوں کے دوران ہمارے فقید المثال محققین اور
مستشرقین نے دنیا کے متعلقہ حصوں میں کیں۔ ان تاثرات کے بعد یہ مطلع کیا جاتا ہے کہ
سکالر مذکورہ کے پراجیکٹ کو فی الفور معطل کیا جاتا ہے اور تمام مالی اعانت، وظائف وغیرہ یک قلم
موقوف کیے جاتے ہیں۔ درس گاہ ہذا کو سکالر مذکورہ کے رویے کی وجہ سے پہنچنے والے علمی، مالی
نقصان اور وسائل کے زیاں کا اندازہ لگانے کے لیے تحقیقی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے جو سکالر مذکورہ
کے مواخذے اور احتساب کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ مزید برآں یونیورسٹی سفارت خانے
کی طرف سے فریڈرک ہاف مین کی جلد از جلد واپسی کے لیے کیے گئے اقدامات کو قدر کی نگاہ سے

Scanned by CamScanner

دیکھے گی۔ الفریڈ بینجمن رجسٹرار۔

ہاف مین خط کو واپس لفافے میں بند کرتا ہے اور فرسٹ سکیر یٹری کی طرف بڑھا رہا ہے جو اب چوتھا ختم کرنے کو ہے۔ وہ لفافہ ایک طرف رکھتا ہے اور کہتا ہے۔ ''اس بارے میں کچھ ایسا ضرور ہے جو خوفناک ہے.....'' ''ہاں میں نے پڑھ لیا۔'' ہاف مین کہتا ہے ''تمہیں میں بارش کی بات کر رہا ہوں.....'' ''ہاں میں متفق ہوں مگر میں رجسٹرار کے مجھے فوری واپس بھیجنے کے فیصلے سے متفق نہیں ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں اس وقت تک واپس نہیں جا سکتا جب تک کہ مجھے یہ یقینی علم نہ ہو جائے کہ میرا ایک مقامی دوست جو تھرڈ ڈگری برزخ میں مبتلا ہے وہ زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔''

''مقامی.....آہ.....مقامی'' فرسٹ سکیر یٹری ہنس کر کہتا ہے۔ وہ اب کہیں اور سے بات کر رہا ہے۔ ''تم جتنی دیر چاہتے ہو یہاں رہو میرے پیارے۔ بس یونیورسٹی پر لعنت بھیجو۔ مقامی.....آہ.....مقامی، مجھے تم سے سخت شکایت ہے تم مجھے مقامی جادوئی مہمات سے متعارف نہ کرا سکے''۔

''میں ایک آخری کوشش ضرور کروں گا۔ اگرچہ وہ منحوس بوڑھا ہی..... دیکھا جائے تو.....میری تباہی کا پہلا سبب ہے۔'' ہاف مین کہتا ہے اور ہنستا ہے اور بارش برستی ہے.....

اور بارش اب بھی برسے جاتی تھی.........اور ہاف مین نے اس جانب دیکھا جہاں منحوس بوڑھا کچھ دیر پہلے دیوار پر بیٹھا تھا اور وہ خود اس سے ہٹ کر کم از کم کچھ دیر کے لیے اس سے کچھ بھی کلام نہ کرنے کے ارادے سے بیٹھا تھا مگر نواب وہاں نہیں تھا۔ ہاف مین کی نظر ملبے کے ڈھیر کی طرف گئی جہاں مدد علی کو انہوں نے کسی بڑے آبی چوہے کی طرح قدیم دنیا کی مٹی کھودتے چھوڑا تھا۔ نواب وہیں اس کے پاس کھڑا کسی چیز کا جائزہ لے رہا تھا جو یقیناً مدد علی نے اپنی مافوق الفطرت آرکیالوجی کے نتیجے میں برآمد کی تھی اور جس کی شناخت اتنے فاصلے سے ہاف مین کے لیے ممکن نہ تھی۔ ابھی وہ یہ اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ وہ دھات کا کوئی ٹکڑا ہے یا لکڑی کا کہ نواب نے اس شے کو ایک جانب پھینک دیا۔ پھر اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک ایسی چیز نکالی جس کے بارے میں ہاف مین اپنے کسی خوفناک خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا اور جسے دیکھتے ہی مدد علی

کے منہ سے کسی جانور جیسی آواز نکلی۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے چمڑے کا کوڑا ہوا میں لہرایا اور مدد علی کی ننگی کمر پر گرا دیا۔ ایک غیر انسانی چیخ اس کے حلق سے نکلی اور ہاف مین وحشت زدہ ہو کر اس طرف بھاگا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ یہ کیا جہنمی حرکت ہے تمہاری'' وہ نواب پر چیخا۔

نواب نے جواباً زمین سے ایک زنگ آلود چھری اٹھائی اور ہاف مین کے مشاہدے کے لیے اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ.....یہ.....دیکھو.....اتنی دیر میں۔ ہماری اتنی مصیبت کے بعد۔ یہ اس نے تلاش کیا میرے لیے'' اور اس کے ساتھ اس نے کوڑا پھر لہرایا۔ مدد علی کی چیخ پھر گیلے کھنڈروں میں گونج گئی۔

''بند کرو..... میں کہتا ہوں بند کرو'' ہاف مین نے دھاڑتے ہوئے کہا اور نواب کا کوڑے والا ہاتھ ہوا میں ہی دبوچ لیا۔

''تم اس میں دخل مت دو'' نواب نے شدید جھلاہٹ سے کہا ''تم نہیں جانتے یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ تم اس عمل کی حقیقت کو کیا سمجھو گے۔ درد، ہیجان، اذیت، شدید درد، اس کی وہ آنکھیں کھول دیتا ہے جو زمین کے نیچے، دیواروں کے پیچھے کھلتی ہیں۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ میں اپنا کام جانتا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ آئے ہو تو تمہیں میں اپنے کام میں دخل دینے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہٹو پیچھے، ہٹو'' نواب نے پھر ہاف مین کو دھکیلنے کی کوشش کی تو فطرت اس کی مددگار بن گئی۔ ہاف مین کا پاؤں پھسلا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ پیچھے کیچڑ میں جا گرا اور اس کا دایاں بازو برساتی کی آستین سمیت کہنی تک ملبے کے ڈھیر میں دھنس گیا اور اسی عرصے کے دوران نواب نے اکڑوں بیٹھے مدد علی کی کمر پر کوڑوں کی بارش کر دی۔ خدائی پانی سے تر اس کی جلد پر سرخ لکیریں ابھر آئیں اور اس کی دلدوز چیخیں یک دم بند ہو گئیں۔ وہ کسی لچک دار جسم والے لڑکے کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا۔ سرعت سے اس نے زمین پر سے زنگ آلود چھری اٹھائی اور پھر اپنی اسی مخصوص ناچتی ہوئی مگر پہلے سے بہت تیز چال میں غلام باغ میں اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

ہاف مین کیچڑ میں لت پت جب اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہوا تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ نواب

Scanned by CamScanner

کے چہرے پر زہرہ کے چھوڑے نقوش کے علاوہ کچھ اپنی نشانیاں چھوڑنے کی کوشش کرے گا مگر مد
علی کی کیفیت دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے نواب کو اپنی مادری جرمن میں دل کھول کر گالیاں
دے کر دل ٹھنڈا کیا جواباً نواب نے کوزہ پھر تھیلے میں ڈالا اور کہا ''اب اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ۔
اس کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔''

''اس کا رخ جنم کھنڈر کی طرف ہے'' ہاف مین نے ہکلاتے ہوئے کہا اور آسمان کی طرف
دیکھا۔ مدتوں سے گہرے بادلوں کے پردے کے پیچھے لاپتہ سورج اب بھی کسی نامعلوم کائنات
میں سے صبح دوپہر شام کی تقسیم کو تاریکیوں کے فرق کے ساتھ قائم کرتا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی
تھی۔ شام آ رہی تھی۔ جب وہ اس ناچتے ہوئے بھوت کے پیچھے بھاگتے جنم کھنڈر کے قریب پہنچے
تو بارش موسلا دھار ہونے لگی۔ ہاف مین نواب کے پیچھے چار بھربھری بوسیدہ سیڑھیاں چڑھ کر
اوپر بھول بھلیاں زینوں والے کمرے میں فوراً جا پہنچنے کی بجائے وہیں کھڑا ہو گیا تاکہ بارش اس
کی برساتی اور ہاتھوں پر سے کیچڑ کو بہالے جائے۔ اس نے آسمانی پانی میں بازو آگے پھیلا کر
ہتھیلیاں کھول دیں۔ جیسے پناہ مانگنے والا کوئی آخری انسان۔ قطرے اس کی ہتھیلی پر گر کر غلیظ
پانی میں بدل کر نیچے گر جاتے تھے، پھر اس نے ہاتھ دھونے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا
اور برساتی کے کن ٹوپ میں اوپر سے گرتے قطروں کی تڑتڑاہٹ سنی تو سب کچھ غیر حقیقی ہونے
کا احساس اس پر بیت گیا۔

وہ آگے بڑھا۔ عظیم جنم کھنڈر سامنے تھا۔ اس نے دیکھا کہ عقبی اطراف میں وہ صدیوں پرانی
تعمیر گہرے پانی میں ڈوب چکی تھی۔ وہ بھربھری سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم جماتا مشرق کی جانب
کھلنے والے اس جانے پہچانے دروازے کی راہ سے اوپر چوکور کمرے میں آیا تھا...... چونک کر مڑ کر
اس نے دیکھا کہ چوتھی سیڑھی اس کے پاؤں کے آخری قدم کے بوجھ سے آدھی ٹوٹ کر نیچے گر گئی
تھی چوکور کمرے میں نواب اکیلا کھڑا تھا۔

''وہ کہاں گیا؟'' ہاف مین نے سامنے مغربی دیوار کے محرابی گھراؤ میں۔ بنے دروازے میں
دیکھتے ہوئے پوچھا ''اُدھر؟ راہداری میں؟...... ان غسلخانوں میں؟''

''نہیں راہداری کے نصف تک پانی آ چکا ہے۔ وہ نیچے گیا ہے۔''

''نیچے؟ میرے خدا۔ اس وقت نیچے تہہ خانے میں تو گھپ اندھیرا ہوگا'' ہاف مین نے کہا۔

''یہاں کیا کم ہے۔ اندھیرا اس کا رستہ نہیں روک سکتا۔ اسے وہیں جانا ہے۔ جہاں اس کی
اپنی روشنی اسے لے جا رہی ہے۔'' نواب نے ٹھنڈا سانس لیا ''مجھے یقین ہے آج وہ سنہری
صندوقچی اسے ملنے والا ہے جو اس نے دیکھا تھا جب وہ بچہ تھا اور جس کی تلاش میں اس نے عمر
گزار دی...... اور شاید اس کے پیچھے میں نے بھی......'' ہاف مین کا دل اضطراب سے دھڑکا۔ یہ وہ
دھڑکن تھی جو خزانہ ڈھونڈنے والوں کو اس وقت اپنے دل میں سنائی دیتی ہے جب انہیں یہ احساس
ہوتا ہے کہ وہ منزل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں ''کیا واقعی'' اس نے دل میں سوال کیا اور پیچھے
بات کرنے کے لیے نواب سے کہہ دیا۔

''مگر جس وحشی دیوانگی کی غیر معمولی کیفیت میں وہ ہے۔ وہ ان شیطانی زینوں سے نیچے
کیسے پہنچا ہوگا'' ''کیا بچگانہ بات کرتے ہو ہاف مین۔ جو دیواروں کے پیچھے دیکھ لیتا ہے اس کے
لیے یہ زینے کیا چیز ہیں ہاں۔ البتہ ہمیں دیکھنا ہے ہم اس کونے سے نیچے اتر کر کسی دوسرے کونے
میں سے باہر آتے ہیں یا پھر نیچے پہنچتے ہیں۔ اور نیچے پہنچتے ہیں تو کتنی کوششوں میں۔ آؤ'' اس نے
کہا اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال دیا ''گھبراؤ نہیں میرے پاس روشنی کا اعلیٰ انتظام ہے۔ یہ میں نے
برطانیہ سے منگوائی تھی کوئلے کی کانوں میں وہ اسے استعمال کرتے ہیں۔''

وہ ایک چھوٹے سے ڈبے کی شکل کی حیرت انگیز طور پر تیز روشنی والی برقی ٹارچ تھی جس کے
پیچھے ایک ہینڈل بنا ہوا تھا۔ ''آہ...... یہ ایک شاندار چیز ہے'' ہاف مین نے کہا۔ اور نواب نے
روشنی کا رخ شمالی اور مغربی دیواروں کے کونے میں سے نیچے اترتے زینے کی طرف کر دیا۔ ہاف
مین نے سیڑھیوں کی گہرائی میں قدم رکھا جیسے وہ سینکڑوں مرتبہ پہلے بھی اسی جگہ قدم پہلے رکھ چکا تھا
اور اس چکرا دینے والے گھماؤ میں دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے کی فریب کاری کو شکست دیتا نیچے
تہہ خانے میں کئی بار پہنچ چکا تھا۔ مگر پھر پہلی بار ایسا ہوا کہ کسی نامعلوم خوف کا برفیلا جھونکا اس کے دل
کو چھوتا گزر گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے قدم ٹھٹھر کر وہیں رک گئے۔

''آؤ ہاف مین آؤ۔ میرے پیچھے پیچھے اترتے آؤ'' اس نے نواب کی آواز سنی اگر میں کہیں
غلطی کرنے لگوں تو مجھے میرے قدم کو درست کر دینا۔ پہلا، دوسرا، تیسرا سے بائیں، چوتھے سے
پھر اوپر۔ پانچویں سے بائیں پیچھے۔'' اس نے بڑبڑاہٹ شروع کی۔

''چھ سے آگے ہموار۔ پھر دائیں سات، آٹھ، نو، دس سے پھر اوپر'' ہاف مین نے اسی انداز

Scanned by CamScanner

میں گہرائی میں اترنے کی راہ دکھائی۔ تیز روشنی نے اس کی متزلزل حوصلہ مندی کو تقویت دی۔

جب وہ تہہ خانے میں پہنچے تو پہلی نظر میں ہاف مین کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ وہی منظر ہے اور وہی وقت ہے جب وہ مدد علی کے ساتھ ریچھ کے سانپ کا ڈرامہ کر کے اس کی قوت گویائی بحال کرنے کے لیے اسے یہاں لائے تھے..... مگر اگلے ہی لمحے منظر بدل گیا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ بوڑھا منحوس نواب تھا اور اب اس لمحے کا وہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس پاتال جیسے تہہ خانے کے باہر تو پھر بھی ایک دنیا ہے معمول کا تحفظ دینے والی دنیا اب باہر اور پرچھی دنیا معمول کی نہ تھی بارش کی دنیا تھی اور ہاف مین نے دیکھا کہ مدد علی بھی وہ نہیں تھا مدد علی تو وہ مدد علی بھی نہیں تھا جو نواب کے گھر سے چلتے وقت اس نے گاڑی میں بیٹھتا دیکھا تھا اور وہ شخص بھی نہیں تھا جو سیلاب اور آسمانی پانی میں آدھے ڈوبے غلام باغ میں ناچتا پھرتا انہیں مدفون خزانوں کی بو کے پیچھے لے جا رہا تھا۔ یہ وہ بھی نہیں تھا جو نواب کے کوڑے کھاتا گرتا پڑتا دلدوز چیخیں مارتا لوہے کی سلاخ اور زنگ آلود چھری اٹھائے جہنم کنڈ میں اتر گیا تھا۔ یہ شخص کوئی اور تھا۔

نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے اپنی کان کنی کی ٹارچ قربانی کے گول چبوترے کے درمیان رکھی مگر ہاف مین نے آدھی اینٹ کی جسامت والی اس روشنی کو تہہ خانے کی دیواروں میں بنے ان طاقچوں میں سے ایک میں رکھ دیا جہاں اس کی اپنی تحقیق کے مطابق قربانی کے وقت چربی کے چراغ جلائے جاتے تھے۔ ٹارچ کے طاقچے میں رکھے جانے کے بعد کمرہ اور بھی روشن ہو گیا۔

ہاف مین نے اسے پھر سے دیکھا۔ کسی شخص کے نقوش میں اور اس کے جسم کے سب اعضا میں کچھ بھی نہ بدلنے پر بھی اس شخص کا مکمل بدل جانا وہ ہراساں کرنے والا احساس تھا جو ہاف مین پر قابض ہو گیا۔ برفیلا جھونکا پھر اسے چھوتا گزر گیا۔ اس نے نواب کی طرف دیکھا کہ وہ بھی کچھ ایسا دیکھ رہا ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ نواب چبوترے پر بیٹھ چکا تھا اور وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ شخص جو تہہ خانے کی مشرقی دیوار کے ساتھ اپنے جسم کو لمبا سیدھا کیے کھڑا تھا اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی اور اس کی نظریں شمالی دیوار پر گڑی تھیں۔ پھر وہ آگے بڑھا اور ہاف مین نے دیکھا کہ یہ دیکھا بھی جا سکتا ہے کہ یہ مدد علی نہیں کوئی اور شخص ہے۔ وہ سیدھا اور تنا ہوا چل رہا تھا اور سلاخ اور زنگ آلود چھری کو ایسے حرکت دیتا تھا جیسے کوئی تلوار باز۔ وہ چال گھوڑوں کے

مظلوم سائیس کی چال سے بہت مختلف تھی۔ ہاف مین نواب کے قریب چلا گیا۔

''تم دیکھ رہے ہو نواب...... وہ'' اس نے سرگوشی کی۔

''ہاں...... اب وہ اس کیفیت میں ہے۔ میرے خدا اب وہ اس کیفیت میں''

''یہ کیفیت کی بات نہیں... وہ کسی کیفیت میں نہیں...... وہ کسی اور میں ہے یا کوئی اور اس میں ہے......''

''خاموش رہو......'' نواب نے اسے تنبیہ کی اور ہاف مین خاموش ہو گیا اور برفیلا جھونکا اتنی دیر تک اس کے ساتھ رہا کہ اس کی جلد پر رونگٹے ابھر آئے اور سارے جسم پر لباس کا لمس بے انتہا ناگوار لگنے لگا۔

مدد علی مشرقی دیوار کے اندر بنے طاقچوں میں سے ایک کے سامنے رکا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں سے سلاخ کو بائیں میں منتقل کیا پھر اپنا دایاں ہاتھ طاقچے کے اندر لے گیا اور طاقچے کے کونے کھدروں پر ایسے انگلیاں پھیرنے لگا جیسے کسی زندہ جسم کے لمس کو محسوس کر رہا ہو۔ پھر اس کی انگلیاں یک دم ساکت ہو گئیں اور اس کے حلق میں سے آواز نکلی جو اس کے کسی گہرے نامعلوم اطمینان کو ظاہر کرتی تھی۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب ہاف مین نے تھرتھراہٹ کو اپنے قدموں کے نیچے محسوس کیا اور خیال کیا کہ اس کی ٹانگیں اس لاطائل مہم جوئی میں تھکن کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس نے اپنے جسم کے بوجھ کو ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کیا تو وہ تھرتھراتی جنبش پھر آئی اور اب اس کے جسم میں برقیلی سنسناہٹ کی طرح دوڑ گئی۔ اس نے نواب کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں اور منہ دونوں کھلے تھے اور وہ اپنے ہوش ناک اضطراب میں مدد علی کی ہر حرکت میں نظریں گاڑے بیٹھے قربانی کے چبوترے پر پیٹھ دھرے بیٹھا تھا۔ مدد علی نے سلاخ کو طاقچے کے اندر کسی مقام میں داخل کیا اور گہرا اندر اتارتا چلا گیا اور پھر آواز آئی کہ جیسے سلاخ کی نوک کسی دھاتی شے سے ٹکرائی ہو۔ نواب کے لیے اب وہیں بیٹھے رہ کر نظارہ کرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ تیزی سے اٹھا لڑکھڑایا اور پھر مدد علی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''ہاف مین میں...... تم...... میں اس خزانے کو پانے والا ہوں جسے دیکھنے کے لیے تم یہاں آئے ہو''

Scanned by CamScanner

اس شخص نے جو مدعلی کے اندر متحرک تھا اپنا دوسرا ہاتھ طاقچے میں ڈالا اور کچھ مٹی باہر نکالی اور پھر ہاف مین نے محسوس کیا کہ اس کے پاؤں کے نیچے تہہ خانے کا فرش تھلتھلاتی مٹی کا بن گیا ہے جیسے وہ موٹے ربڑ کی تہوں کے اوپر کھڑا ہے۔ تھرتھراہٹ اب آئی تو کہیں بہت دور سے آئی گڑگڑاہٹ کے ساتھ آئی۔ مدعلی کا سیدھا تنا جسم یک دم خم کھا گیا وہ سلاخ کو طاقچے کے اندر ہی چھوڑ کر مڑا تو ہاف مین نے دیکھا کہ وہ مدعلی ہی تھا اور اس کی آنکھوں میں کسی خوفزدہ ہرن کی وحشت تھی۔ زنگ آلود چھری اب اس کے دائیں ہاتھ میں تھی اور موت سے فرار کی جبلت اس کے جسم کے ہر ریشے کو متحرک کرنے لگی تھی۔

"یہ زلزلہ ہے۔ نواب۔ نکلو، جلدی کرو....." ہاف مین نے چیخ کر کہا اور اضطراب کی شدت میں بھی اس کے ذہن نے سوال کیا کہ کیا یہ واقعی زلزلہ ہے۔ نہیں یہ زلزلہ نہیں ہو سکتا یہ.....نہیں وہ گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی اور ہاف مین نے مدعلی کو تہہ خانے کے واحد دروازے کی طرف لپکتے دیکھا۔ نواب کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے مدعلی کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ ایسے الجھائی کہ خود بھی منہ کے بل گر پڑا۔ "تم کہاں بھاگ رہے ہو۔ ذلیل مردود تم اسے، خزانے کو کہیں چھوڑ کر بھاگ رہے ہو جس کے انتظار میں میں نے ساری عمر گزار دی.....زلزلہ ہے.....یا جو بھی ہے ......نکالو.....کھودو.....نکالو....."

وہ ایک دیوانگی تھی جو موت کے خوف پر طاری ہونے والی دیوانگی سے بھی بڑھ کر تھی۔ یک دم اس نے اٹھ کر تھیلے میں سے کوڑا نکالا اور نیچے گرے مدعلی کی کمر پر برسانے لگا۔ ہاف مین نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو ذلیل بڈھے" وہ چیخا "یہ سب تباہ ہونے والا ہے۔ باہر نکلو....." اس نے مدعلی کو بازو سے کھینچ کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے دیکھا کہ وہ تو پھر بدل رہا ہے اس کی کوشش یا نواب کے کوڑوں سے بے نیاز پھر مدعلی میں آ رہا ہے وہ بوڑھے خمیدہ جسم میں سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے مگر اس کی آنکھیں کہیں دور ہیں۔

"اٹھو.....اٹھو.....ذلیل.....کھودو.....کتے.....کھودو.....نکالو.....اٹھو.....اٹھو" نواب کی آواز کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سے مشابہہ ہو چکی ہے۔ "حرامزادے، میرا خزانہ حرامزادے....." وہ شخص جو مدعلی میں آیا ہے نواب کے سامنے کھڑا ہے اور اُسکے ہاتھ سے کوڑے کو ایسے نکال دیتا ہے جیسے وہ کبھی اس کے ہاتھ میں تھا ہی نہیں۔

زمین جنبش کرتی ہے اور ہاف مین ایک ہی وحشت انگیز لمحے میں جان جاتا ہے کہ وہ شخص عظیم جنم کھنڈر کا وہ دیوتا ہے...... رہی ہے۔ عظیم جنم کھنڈر کا وہ وہیت ناک تہہ خانہ اپنے جنم کی اصل میں اپنی زمین کی کوکھ میں جنس رہا ہے۔ وہ لمحہ اس آخری احساس کا لمحہ ہے کہ کائناتی قوتوں کی ازلی اکھاڑ پچھاڑ میں بھی اپنی زندگی کے سوا باقی سب کچھ باطل ہے۔ ہاف مین آخری لمحے سے بچ نکلنے کی دیوانگی میں اوپر جاتے شیطانی زینوں کے دروازے کی طرف چھلانگ لگاتا ہے۔ آخری سے اوپر دو بائیں، پھر اوپر، ایک نیچے......ہاف مین دیکھتا ہے کہ زینوں کے تنگ دروازے اور تہہ خانے کے فرش میں گہرا شگاف کھلتا جا رہا ہے یہ آخری وقت ہے وہ ایک ہی زقند میں پہلے قدم پر پہنچ جائے گا پھر بھول بھلیاں زینے کو گہرائی سے اونچائی تک مات دیتا اوپر جنم کھنڈر کے کسی کونے میں جا نکلے گا اور پھر خود بھی غلام باغ سے نکل کر بارش برساتے بڑے شہر میں اپنا رستہ بناتا اپنے فلیٹ میں چلا جائے گا، اپنے آپ کو مدہوش کرے گا......اور آخری لمحے میں آمدہ وقت کی صدیوں حسرتیں سمٹی ہیں۔

مگر آخری لمحہ بعد میں آتا ہے جو زندگی سے موت کی جانب پلٹانے والا ہے۔ روکنے والا ہے۔ موت سے فرار ہوتے ہرن کی آخری زقند پر چیتے کا پنجہ ہے نواب کی چیخ اس قدر بھیانک ہے کہ بھیانک موت سے دور بھاگتے کو بھی پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کرنے کی اندھی طاقت رکھتی ہے۔ ہاف مین دیکھتا ہے کہ وہ شخص جو مدعلی میں ہے چبوترے پر برہنہ گرے نواب کی ٹانگوں کے بیچ زنگ آلود چھری چلا رہا ہے اس گہرے اتھاہ سکون کے ساتھ جو موت ہے اور طاقچے میں سے زرد سانپ نیچے اتر رہا ہے۔

وہ پلٹنا آخری پلٹنا ہے اور وہ منظر روشنی کا آخری منظر ہے۔ وہ جنبش اک ایسا لرزہ ہے جو دیواروں کو پھاڑ دینے کی طاقت رکھتا ہے مصنوعی روشنی گرتی ہے اور اتھاہ اندھیرے میں وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کے اوپر سے گزرتا اوپر چلا گیا ہے۔ وہ کون ہے؟؟؟

"اوپر......اوپر، اوپر......" زندگی کی آگ اس پر لپکتی ہوئی کہتی ہے۔ وہ اچھلتا ہے اچھلتا ہے اور اور اور......پھر گرتا چلا جاتا ہے وہ آواز اب دیوہیکل زمینی اژدہے کے کھلے منہ کے شگاف میں سے آتی نکلنے کی مہیب آواز ہے اور جو پانیوں میں گرتے کھنڈروں اور مسمار ماضی کے آثار کو ہڑپ کرنے کی آواز ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے۔ سونگھ لیتا ہے۔ سنتا ہے......وہ آ رہا ہے اور پھر وہ

Scanned by CamScanner

اس کے جسم کو چھو لیتا ہے۔ کائنات کا ازلی و ابدی پانی آتا ہے مکمل تاریکی میں وہ کالا پانی آتا ہے گہرا تاریک جیسے موت ..... پانی آتا ہے۔ اور وہ خدائی قوتوں کے سامنے اپنی آخری خواہش کرتا ہے کہ وہ جو کچھ اس کے اندر ابھی تک روشن ہے وہ بجھ جائے اور جو کچھ ابھی تک گویا ہے وہ خاموش ہو جائے اور وہ ایک ہی لمحے میں عظیم الشان تاریکی میں جا ملے۔ ازلی سناٹے میں گم ہو جائے۔

سب کچھ گہرے گہراؤ میں دھنستا چلا جاتا ہے تو شیطانی زینے اور ان سے اوپر کے سب صدیوں کے آثار بھی قربانی کے سفر پر چل نکلتے ہیں قربان گاہ کی ایک بے چھن دیوار اور بھی زیادہ تیزی سے متحرک ہوتی ہے اور بکھر جاتی ہے..... وہ اپنے اندر اپنی چمک کو آخری بار شعلہ زن دیکھتا ہے ..... آگے لازوال رات ہے۔

OOO

باب (23)

وقت مقام کو برباد کرتا ہے یا مقام وقت کو؟

گرڑ بوڑ نے اچٹتی نظر سے ان دو مقامی مردوں اور عورت کو دیکھا۔ اس کی یہ نظر جو مقامیوں کے لیے مخصوص تھی اسے فوراً یہ بھی بتا دیتی تھی کہ آیا کسی نہ کسی حوالے سے ان پر دوسری نظر ڈالنا ضروری ہے یا نہیں اور یہ حوالہ اس کے الفاظ میں مقامیوں کے بدبو چھوڑتے معمول کے رویوں سے ہٹ کر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بات کہ وہ اسے آنکھیں پھاڑے پورا نگل جانے کے لیے منہ کھولے دیکھتے ہوں گے نہایت معمول کی بات تھی مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی سرے سے اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا اور یہ ایک خفیف سی مایوسی کی بھی بات تھی کیونکہ وہ دونوں کم از کم مقامی انداز میں اچھے خاصے خوش شکل اور متوجہ کرنے والے تھے اور وہ عورت جو دیکھنے والے کی توجہ کو یک دم جھٹکا سا دیتی تھی اس کا وہ انداز مقامی تھا یا کچھ اور تھا گرڑ بوڑ کے لیے سمجھنا مشکل تھا مگر یہ یقیناً بعد کی باتیں تھیں۔ جس بات نے اُسے ان پر دوسری نظر ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا وہ اس وقت غلام باغ میں ان کی موجودگی تھی۔

اسے بتایا گیا تھا کہ سیلاب کے بعد اور زمینوں اور مکانوں کے خشک ہونے کے بعد غلام باغ کو عام لوگوں کے لیے مستقل طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ یہ کہ گرڑ بوڑ ایک غیر ملکی۔ مقامی عملے کی رکن ہونے کی حیثیت سے عام لوگوں میں شامل نہیں ہے مگر آثارِ قدیمہ کے لوگ بخوبی جانتے تھے مگر پھر بھی اسے غلام باغ میں داخلے کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑی تھی۔ اس کے افسراں میں سے کچھ کو بعض مقامی سفارشیں اور غیر معمولی مداخلتیں کرنا پڑی تھیں۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ آئندہ کیا محکمہ آثار کیا پولیس کو بھی داخلے کی اجازت دے گا یا نہیں، تحقیق کے لیے ہی سہی تو اس کا فیصلہ ابھی محکمے کے اعلیٰ سطحی اجلاس میں ہوگا۔ فریڈرک ہاف مین نامی ایک

Scanned by CamScanner

جرمن آرکیالوجسٹ کی غلام باغ میں حادثاتی موت کے بعد محکمہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔ آثار قدیمہ میں داخلے کے تمام رستوں کو خاردار تار سے بند کر دیا گیا تھا اور وہاں بتایا گیا کہ کوئی مقامی قہوہ خانہ تھا اسے بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ اجازت نامہ ملنے پر گرٹریوڈ کو کافی فخر کا احساس ہوا تھا کہ جیسے وہ کوئی مراعات یافتہ عورت ہے اور اس کا تعلق ایسے طبقے سے ہے جنہیں ممنوعہ علاقوں میں جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اب یہ وہی غلام باغ تھا جس میں وہ مقامی مرد اور عورت سیلاب کے بعد کی آنکھوں کو چندھیانے والی تیز دھوپ میں یوں پھر رہے تھے جیسے وہ وحشت ناک کھنڈر باغ ان کی ذاتی ملکیت تھا۔

پھر ذاتی ملکیت کے خیال سے گرٹریوڈ کو یاد آیا کہ ہاف مین کے ساتھ کوئی غلام باغ کی ذاتی ملکیت کا دعویدار کوئی نواب شخص جس کا کچھ سوانحی نوٹ مقامی انگریزی اخبار میں حادثے کے بعد چھپا تھا وہ بھی ہاف مین کے ساتھ دفن ہو کر مر گیا تھا تو کیا یہ مقامی لوگ اس نواب کے خاندان کے لوگ ہیں، ہو سکتا ہے انہیں یہاں اب بھی آنے کی اجازت ہو۔ گرٹریوڈ نے پھر کوئی چھٹی ساتویں نظر ان پر ڈالی اور محسوس کیا ایک مرد جو اس ناقابل فہم انداز میں غالب عورت کے برابر آتا ہے اور جیسے ان دونوں مرد عورت کی ایک دوسرے پر ملکیت کی دعویداری ہو، چلنے میں لنگڑاتا ہے مگر پھر بھی معذور نہیں لگتا اور جو دوسرا مرد جوان کے پیچھے سیدھا چلتا ہے وہ بھی یوں سر جھکائے چلتا ہے جیسے ان کا کوئی غلام ہو مگر پھر وہ ایسا نہیں بھی لگتا۔ پھر گرٹریوڈ نے دیکھا کہ وہ بھی مسلسل اسی جانب بڑھ رہے ہیں جہاں اُن نحوست زدہ آثار قدیمہ کا محافظ انہیں لے جا رہا تھا۔ اس موت کے کھنڈر کی طرف جو ہاف مین کا آخری مدفن بن گیا تھا اس طوفانی بارش کے دنوں میں جب وہ اس سے محبت کرنے میں آخری بار ناکام رہا تھا...... پھر گرٹریوڈ نے دیکھا کہ وہ تینوں ایک جگہ رک گئے تھے اور آسمان میں دیکھتے تھے۔ کیا سورج کو دیکھتے تھے؟

کبیر نے نیلے آسمان میں چمکتے سورج کو دیکھا اور پھر زہرہ کی آنکھوں میں اترتے ہوئے بولا ”نیل میں طغیانی کے بعد بنجر زمینیں پھر سے زرخیز ہو جاتی تھیں۔ نم آلود مٹی میں چھپے بیج پیپرس کے بیج پھوٹ نکلتے تھے اور خشک ٹہنیاں ثمر بار ہو جاتی تھیں۔ تب گھنے اشجار کی کنجوں میں اور بھی نسبتاً کم گھنے کھجور کے نخلستانوں میں بے روزگار دیوی دیوتا رنگ رلیاں مناتے تھے اور خداوند شمس آمون را کی مدح کرتے تھے اور خوب کدکڑے بھرتے تھے مگر ایک لنگڑا دیوتا انہیں حسرت سے

دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں ہزار بد دعائیں دیتا تھا۔ اس کی بد دعاؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال نیل میں باڑھ نہ آئی اور زمین پھر سے بنجر ہو گئی کال پڑا اور خوب تباہی مچی۔ اس لیے اے لوگو لنگڑے دیوتا کی بد دعاؤں سے ڈرو۔“ کبیر نے کہا اور لنگڑاتا ہوا ناصر کی طرف بڑھا جو گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ مدتوں بعد زہرہ اب پھر کبیر کی بک بک پر اسی فریفتگی سے ہنس رہی ہے جیسے وہ پہلے ہنستی تھی۔

”ہم نہ لنگڑے دیوتا کی بد دعاؤں سے ڈرتے ہیں اور نہ خود لنگڑے دیوتا سے۔ ہمیں باڑھ کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی باڑھ بہت تباہی لا چکی ہے۔ ویسے لنگڑے دیوتا کو فزیوتھراپی کی ضرورت ہے۔“ زہرہ نے کہا۔

”Exactly“ ناصر نے مضمحل سی مسکراہٹ سے کہا ”تم نے کبیر یہ یاد رکھنا ہے۔ فزیو نے جو کچھ بتایا اس پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ آہستہ آہستہ تمہاری ٹانگ کے مسلز میں لچک آ جائے گی اور تمہاری چال ٹھیک ہو جائے گی۔“

”شکریہ“ کبیر نے کہا ”لیکن مجھے چال سے زیادہ ڈھال کی ضرورت ہے جو مجھے میرے آگ پھینکنے والے دوستوں کے تیروں سے بچا سکے...... لیکن ڈاکٹر تم اس قدر رنجیدہ صورت کیوں نظر آ رہے ہو۔“

ناصر اور بھی زیادہ رنجیدہ نظر آنے لگا اور تلخی سے بولا ”میرا خیال ہے یہ کوئی ایسا خوش گپیوں کا موقع بھی نہیں۔ ہم پہلی دفعہ اس جگہ جا رہے ہیں جہاں ہاف مین دفن ہو گیا۔ ایک لحاظ سے اس کی قبر پر جا رہے ہیں۔ میں تمہارے بارے میں نہیں جانتا لیکن میں سمجھتا ہوں وہ ایک بہت اچھا دوست تھا...... میں نہیں کہہ سکتا مجھے اس کی موت کا گہرا صدمہ نہیں ہوا......“

”کیا ہم ایسا کہہ سکتے ہیں؟“ کبیر نے کسی بھی تاثر سے عاری لہجے میں کہا اور زہرہ نے گہرا سانس لیا اور محسوس کیا کہ ہوا میں ابھی تک خشک ہوتے کیچڑ کی خوشبو باقی ہے۔ ”چلیں۔“ اس نے کہا۔

گرٹریوڈ نے مڑ کر دیکھا تو وہ پھر اسی سمت آ رہے تھے۔ اب اس سے نہ رہا گیا اور اس نے ”کافی مہذب“ مقامی مسٹر جاوید عادل کو نپے تلے لیکن مضبوط الفاظ میں اپنا مسئلہ بتایا اور پھر مزید مضبوط الفاظ میں ہدایت کی کہ وہ چوکیدار سے ان لوگوں کے بارے میں استفسار کرے کہ وہ

Scanned by CamScanner

وہاں آخر کیسے کھلے گھومتے پھرتے ہیں جبکہ اسے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے زمین آسمان ایک کرنا پڑا۔' کافی مہذب مقامی' مسٹر عادل نے عینک کو اپنی ناک پر متوازن کیا اور میڈم کے مسئلے کی سنگینی کو سمجھنے میں چند منٹ لگائے جن کے دوران گرٹروڈ نے کئی بار کے سوچے ہوئے کو ایک دفعہ پھر سوچا کہ اس شخص کے ذہن میں خیالات صرف سرجیکل آپریشن کے ذریعے پہنچائے جاسکتے ہیں۔ یہ سب ایسے ہی ہیں صرف آپریشن کی شدت میں کچھ کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے وہ اس دم گھٹنے والی...... تکلیف دہ لوگوں کی گرم حبس آلود دنیا سے جارہی ہے۔ پرتگال یورپ کا سب سے اچھا سفارتی اسٹیشن نہ سہی مگر یہاں کے مقابلے میں جنت ہی ہوگا۔ اس نے مسٹر عادل کی طرف دیکھا جو بدستور سر کھجلا رہا تھا جیسے واقعی 'خیالات' کو جسمانی کوشش سے ذہن میں اتار رہا ہو۔

"کیا میں اپنی بات واضح بیان کرسکی مسٹر عادل" گرٹروڈ نے ایک خشک سختی سے کہا اور جاوید عادل جو میڈم کے لہجے کی خشکی اور تلخی کو خوب سمجھتا تھا فوراً گھبرا کر بولا "میں اس سے پوچھنا شروع کرنے والا ہوں میڈم۔" پھر اس نے چوکیدار سے مکالمہ شروع کیا جو مقامی زبان میں ہونے کی وجہ سے گرٹروڈ کی سمجھ سے بالکل باہر تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا اور چوکیدار انہیں قدموں پر رک گیا اور جاوید عادل کو اور گرٹروڈ کو بھی رک جانا پڑا۔ وہ بھیم سرائے کے ساتھ رکے تھے جہاں بارشوں کے زمانے میں مطبخ زمین بوس ہوا تھا۔ ملبے کے ڈھیر کے نچلے حصے پر خشک کیچڑ کی مہین تہہ ایک چوڑی لمبی پٹی کی صورت میں جمی تھی اور اب بھی بارش کے زمانے میں وہاں موجود پانی کی سطح کی نشان دہی کرتی تھی۔ خشک جمی ہوئی مٹی کی پپڑیوں کے نیچے جھانکتے چھوٹی اینٹوں، کھریا مٹی اور چونے کے ٹکڑوں میں سے ہزار ہا سرخ چیونٹے کسی نامعلوم عذاب میں مبتلا تیزی سے حرکت کررہے تھے۔ پیچھے ابھی تک تمام سرائے کے تنگ نم آلود کمروں میں سے ہوا کی سڑاند آتی تھی اور ایک بھاری گلے میں اترتے ہوا کے بدبودار گھونٹ کی صورت میں برداشت کرنا پڑتی تھی جبکہ سورج کی تیز روشنی آنکھوں کو چندھیاتی تھی۔ گرٹروڈ کے لیے وہ جگہ اور وہاں رکنا کامل بربادی اور موت جیسی بیزاری کا لمحہ تھا۔ اس نے چوکیدار کی طرف دیکھا جس کی میلی قمیض بغلوں پر سے پسینے میں بھیگی تھی اور جس کے نتھنوں میں سے سیاہ بال سرکنڈوں کی طرح باہر پھوٹ رہے تھے۔ اس نے کراہت آمیز لہجے

میں پوچھا "یہ رک کیوں گیا ہے؟"

"میں نے اس سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا ہے میڈم۔" جاوید عادل نے کہا اور چوکیدار نے ماتھے پر ہتھیلی پھیلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کوئی غلطی ہوگئی ہے صاحب"

"کیا کہتا ہے یہ؟" گرٹروڈ نے پوچھا۔

"آ..... آپ کیا پسند کریں گی میڈم میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جاؤں یا اکٹھی بات آخر میں بتادوں۔"

"آخر میں ہی بتا دینا" گرٹروڈ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور سوچنے لگی کہ اس نے کیا یہ جہنمی بکواس شروع کروادی ہے۔ "جہنم میں جائیں وہ لوگ۔ اور جہنم میں جائے یہ سب کچھ۔ اسے ہاف مین کے آخری مدفن پر اس کی محبت اور اپنی محبت کی یاد میں چند آخری لمحے گزارنے ہیں اور بس۔ یہاں کوئی آئے جائے۔ جہنم میں جائے۔ کوئی بھی اور یہ لوگ بھی....."

پھر اس نے دیکھا کہ وہ لوگ۔ لنگڑا مرد، سر جھکا کر چلنے والا مرد اور عورت، جس کی خوبصورتی اسے بدتمیزی جیسی لگتی تھی، ان سے کچھ فاصلے پر سے کچھ راستہ بدل کر ایک دوسری روش پر سے ہوتے ہوئے جنم کھنڈر کو پہنچ رہے تھے اور یہاں اس کے پاس "کافی مہذب مقامی" دوسرے بالکل غیر مہذب مقامی کی توجہ ان کی طرف دلا کر مقامی زبان میں کچھ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں وہ جو تین جارہے ہیں۔ تم کسی طرح انہیں یہاں سے جھنڈی نہیں کرا سکتے۔"

"جی کیا کہا جی صاحب" چوکیدار نے حیرت سے منہ اور آنکھیں کھول کر کہا اور گرٹروڈ نے "یہ کیا کہتا ہے" پوچھنے کی خواہش پر بمشکل قابو پایا۔

"دیکھو یار، میری میم صاحب چاہتی ہیں کہ یہ لوگ کسی طرح یہاں سے دفع ہوجائیں۔ یہ کام کردو۔ بہت انعام ملے گا۔"

چوکیدار کی حیرت سے پھیلی آنکھیں اب غصے سے سکڑ گئیں۔ اس نے ایک نظر میم صاحب کی طرف بھی دیکھا اور گرٹروڈ نے پھر سوچا کہ وہ کس خواہ مخواہ کے لعنتی جھمیلے میں پڑتی جارہی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا پوچھ رہا ہے اور وہ کیا بھونک رہا ہے کہ اس کا چہرہ غصیلے کتے جیسا ہورہا ہے۔

"یہ آپ کیا کہتے ہو صاحب" چوکیدار نے کہا اور پھر دور جنم کھنڈر کے قریب ان پر ایک

Scanned by CamScanner

نظر ڈالی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا صاحب۔ میں ایسا نہیں کر سکتا"

"کیوں؟ تم یہاں چوکیدار ہو۔ پرانے لگتے ہو کافی دیر کے ہو گے یہاں پر۔"

"ہاں جی کافی دیر کا ہوں جی۔"

"پھر انہیں نکالنا تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں ہونا چاہیے۔"

"اسی لیے مشکل ہے صاحب میں نے بڑی عمر گزاری ہے اس اجڑے باغ میں اب اور جو اجڑ گیا ہے۔ جسے تم غلام باغ بولتے ہو۔ پر میں جانتا ہوں جی۔ انہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا"

"کیا ان کے پاس اجازت نامے ہیں؟"

"انہیں نکالنے کے لیے اجازت نامے چاہئیں جی۔ میں نے کئی بار خواب میں دیکھا ہے۔ کوئی ایک بار دیکھا ہو تو بندہ کہے خواب ہے۔" گرٹروڈ نے اچانک شدید بیزاری سے کہا "بات ختم کرو مسٹر جاوید عادل۔ چھوڑو بھول جاؤ۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"میڈیم۔ پلیز۔ ایک لمحہ پلیز۔ اصل بات سامنے آنے والی ہے....." مسٹر جاوید عادل نے مضطرب لہجے میں کہا۔

گرٹروڈ منہ پھیر کر شاہی مطبخ کے ملبے کو دیکھنے لگی۔ سرخ موٹی بھدی چیونٹیاں ایک مردہ چھپکلی کو کتر کتر کر غائب کر رہی تھیں۔

"ہاں بولو..... بولو..... کیا خواب دیکھتے ہو؟"

"چھوڑو صاحب۔ کیوں میرا اور اپنا اور میم صاحب کا ٹیم برباد کرتے ہو۔"

"نہیں نہیں تم ٹیم کا فکر نہ کرو۔"

چوکیدار نے ٹھنڈا سانس لیا اور بولا "دیکھو صاحب جی..... یہ جو ہیں جنہیں تم یہاں سے بھگانے کا بولتے ہو۔ وہ ادھر ہی راجہ، مہاراجہ، شہنشاہ، امیر وزیر، رہتے ہیں کبھی.....اور" اس کے چہرے پر خواب ناک ترما ہٹ پھیل گئی "اور..... ملکہ..... رانی، مہارانی، بادشاہ زادی، میں نے کئی بار خواب دیکھا ہے خواب میں کوئی ایک بار ہو..... تو....."

"تو بندہ کہے بھی....." مسٹر عادل نے اس کا فقرہ مکمل کیا اور بھرپور قہقہہ لگایا "آ ئیں چلیں، میڈیم، میں آپ کو بتاتا ہوں، پھر اس نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور وہ پھر جنم کھنڈر کی طرف

چل پڑے۔

"ایسی مزاحیہ بات کیا ہے مسٹر عادل" گرٹروڈ نے پوچھا۔

"ایسی ہی ہے میڈیم آپ بھی سنیں گی تو ہنسیں گی۔ یہ چوکیدار کہتا ہے کہ وہ لوگ جو اس بڑے جیسے کھنڈر کے پاس کھڑے ہیں اور جہاں اب ہم بھی جا رہے ہیں شاید۔ انہیں یہاں سے نکالنے کے لیے اجازت نامے چاہئیں۔"

"کیا؟" گرٹروڈ کے منہ سے زور سے نکلا "ہم۔ میں نے انہیں نکالنے کا کب کہا تھا تمہیں؟..... میرے خدا" گرٹروڈ نے اضطراب سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی "بہر حال، پھر اور کیا کہا اس نے....."

"وہ کہتا ہے اس نے کئی بار ان لوگوں کو خواب میں یہاں کے راجہ مہاراجہ، ملکہ، مہارانی بنے ہوئے دیکھا ہے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کو یہاں سے نکال نہیں سکتا۔"

"اوہ میرے خدا۔ میں نے انہیں نکالنے کا کب کہا تھا بے وقوف آدمی" گرٹروڈ نے چیخ کر کہا "میں نے تو کہا تھا اسے پوچھو وہ ہیں کون۔"

"آئی ایم ساری میڈیم....." کافی مہذب مقامی نے بری طرح گڑبڑا کر کہا "میں پھر پوچھتا ہوں یہ کون ہیں۔"

"بند کرو..... بند کرو..... یہ بکواس۔ تم لوگ مجھے پاگل کر دو گے۔ یہ جگہ مجھے پاگل کرے گی۔ یہ..... یہ..... شیطانی..... منحوس..... غلیظ جگہ۔" گرٹروڈ نے چیختے ہوئے کہا۔ اور چوکیدار دہل گیا۔ اس نے غلام باغ دیکھنے کے لیے آنے والی بہت گوری عورتیں دیکھی تھیں مگر ایسے غصے میں دھاڑتی پہلی دیکھی تھی۔ اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مائی دیو میم صاحب۔ مائی صاحب" پھر وہ صاب کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔ "معافی دلا دو صاحب۔ میری نوکری چلی جائے گی"

"کیا کہتا ہے وہ"

"وہ معافی مانگ رہا ہے میڈیم" مسٹر جاوید عادل نے کہا پھر چوکیدار کی معافی کا ترجمہ سنایا۔

گرٹروڈ یک دم ٹھنڈی سی ہو گئی اور گہرا سانس لیتے ہوئے کہنے لگی۔ "مسٹر عادل حالانکہ

Scanned by CamScanner

ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتا ہے اور پھر بدتمیز حسن والی اس عجیب و غریب عورت کی طرف بے چینی سے دیکھتا ہے۔ لنگڑا مرد سر کو خفیف سی حرکت دیتا ہے یقیناً وہ اس کے وہاں کھڑے ہونے سے آگاہ ہو گیا ہے مگر اس عورت نے جو شاید خودکشی کرنے والی ہے ایک بھی نظر اس پر نہیں ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں اب پانی صاف نظر آتا ہے اور وہ نیچے گہرے اندھیرے میں دیکھ رہی ہے۔
اچانک مسٹر عادل تیزی سے بولنے لگتا ہے۔ "میڈم یہاں اس پورے چوکور کھنڈر میں ایسا ہی ایک فرش تھا جس کے چاروں کونوں میں سے زینے نیچے جاتے تھے تہہ خانے کو۔ یہ زینے بھول بھلیاں....." اور گرزیوڈ نے بے ساختہ ہاتھ کی جنبش سے اسے بولنے سے منع کر دیا۔ جیسے وہ طور گہری خاموشی اور مؤدب کھڑے رہنے کا تقاضا کرتا ہو۔

"غلام باغ کے نظارہ باز لوگ آنا شروع ہو گئے" کبیر نے اذیت سے سوچا اور پھر اپنی تینوں کی لاتعلق خاموشی میں پلٹ گیا۔ سہ پہر کے سورج کی ترچھی زرد کرنیں اس کے سائے کو اس جگہ تک گرا رہی تھیں جہاں زہرہ کے پاؤں تھے۔ وہ ادھڑی ہوئی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ کبیر نے آنسو کا ایک قطرہ اس کی آنکھ سے ٹوٹتے دیکھا اور پھر وہ کچھ لمحے سورج کی کرنوں میں چمکتا اسے تاریکی میں گرتا نظر آیا اور پھر تاریکی میں تاریکی ہو گیا۔ کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اس نے ناصر کی طرف دیکھا جو اجنبیوں کے آ جانے پر کافی بے چین نظر آ رہا تھا۔

"چلیں" اس نے کبیر سے کہا "ہاں" کبیر نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا بازو زہرہ کی طرف پھیلایا اور زہرہ آہستگی سے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے جو ختم کھنڈر کے اندر بن چکے موت کے گھراؤ سے ہٹ آئی۔ اس نے غیر ملکی عورت، اس کے ساتھی اور چوکیدار کو اچٹتی نظر سے دیکھا۔ یہ لوگ پہلے بھی نظر آئے تھے اس نے سوچا اور کبیر اور ناصر سے کہا "غلام باغ معمول پر آتا جا رہا ہے، دنیا 'غلام باغ کا معمہ' دیکھنے کے لیے پھر یہاں پہنچنے لگی ہے۔" زہرہ نے بوجھل لہجے میں کہا اور وہ تینوں واپسی کے لیے مڑے۔

"غلام باغ" کبیر نے گہرا سانس لیا۔ "اب کچھ اور ہے اور 'غلام باغ کا معمہ' بھی کچھ اور ہے۔ وہ ایک اور دنیا تھی جو بارش اور ہاف مین سے پہلے کی دنیا تھی۔ اب یہ کچھ اور دنیا ہے۔ ہاف مین کے بعد کی دنیا۔" کبیر نے کہا اور دیکھا کہ وہ گوری سیاح عورت ایسے بت بنی کھڑی ان تینوں کی طرف دیکھ رہی ہے جیسے آثار قدیمہ کے بجائے وہ انہیں دیکھنے وہاں آئی

ہو۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس سے گزر گئے مگر ناصر نے بے چین و دزدیدہ نظروں سے پھر اسے ضرور دیکھا اور گرزیوڈ کو زندگی میں پہلی بار افسانوں کہانیوں میں بیان کی گئی اس صورت حال کی صداقت پر یقین آ گیا جب کسی کی کوئی بات۔ کوئی فقرہ۔ کوئی نام سن کر کوئی کردار اپنے پاؤں پر اپنا بوجھ اٹھائے رکھنے کے قابل نہیں رہتا۔ مسٹر عادل نے تیزی سے آگے بڑھ کر میڈم سے کہا "ہر چیز ٹھیک ہے کیا میڈم"۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے" وہ بڑبڑائی اور اپنے توازن کو قائم رکھنے کی کوشش میں گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ لنگڑے مرد نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی مقامی بولی کی Gibberish میں دو بار 'ہاف مین' کا نام لیا تھا اس کے کان کبھی دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ وہ دو مرد اور وہ عورت...... وہ تین مرد اور وہ عورت وہ عورت۔ وہ عورت..... کیا وہ عورت؟

"کوئی چیز غلط ہے میڈم" مسٹر عادل پھر بے چینی سے آگے بڑھا.....

"ہاں کچھ غلط ہے" گرزیوڈ نے کہا جیسے اس لمحے کچھ کہنا کسی سے بھی کچھ کہنا ناگزیر تھا خواہ سننے والا مقامی احمق مسٹر عادل ہی کیوں نہ ہو۔ پھر گرزیوڈ نے کہا "جس نے غلطی کی اسے اس کی سزا مل گئی۔" اور گھراؤ کی طرف دیکھا "مگر یقیناً وہ عورت ایسی ہی ہے۔ غلط کاری کی ترغیب دینے والی، ان طاقتوں کی مجسم ترغیب، گناہ کے وعدے کے ساتھ موجود گہرے حسی ذائقوں کا پیغام دینے والی....." مسٹر عادل کی جبلت نے اسے بتایا کہ میڈم کی وہ بڑبڑاہٹ اس کے لیے نہیں اور اسے یہ بھی یقین آ گیا کہ کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہوا ہے اور جس کا تعلق انہی تین افراد نہیں بلکہ ان افراد اور اس خوبصورت عورت سے ہے۔ پھر گرزیوڈ کے ذہن نے اچانک پلٹا کھایا، ہو سکتا ہے یہ سب میرا واہمہ ہی ہو۔ ہو سکتا ہے 'ہاف مین' کی صوت جیسا یہاں کی مقامی زبان میں کوئی لفظ ہو جس کا مطلب 'ہاف مین' نہ ہو کچھ اور ہو آواز وہی ہو مگر مطلب کچھ اور ہی ہو۔ ایسا ہوتا ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ اس نے مقامی مسٹر عادل کی طرف دیکھا جو بے چینی اور بے بسی میں کھڑا اپنے دونوں پاؤں پر اپنا وزن بار بار بدل رہا تھا۔ "مسٹر عادل۔" اس نے میڈم کی آواز سنی اور یک لخت اپنی بے پناہ اشتیاقی فرینڈلی کے ساتھ آگے بڑھا "یس یس میڈم یس یس یس میڈم"

"تمہاری یہاں کی مقامی زبانوں میں کوئی لفظ ہے جس کی آواز..... میرا مطلب ہے جس کی صوت بولنے میں لفظ 'ہاف مین' جیسی ہو مگر جس کا معنی کچھ اور ہو۔ و......ف...... مے.....

Scanned by CamScanner

ن ــــ اس کے علاوہ ہف مین، ہف مین، ہقام، ہلمان، ہف مم، پر بھی غور کر لو۔ ایسی کوئی آواز ہے تمہاری مقامی زبانوں میں۔ کسی لفظ کی ـــــ آواز؟"

اب یہ صرف بے بسی تھی جو اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ مسٹر عادل کے مقامی وجود پر اتر آئی تھی اور دیکھنے والے کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے بے پایاں جذبات ابھارتی تھی۔ "میرے خدا" اسے دیکھ کر گرٹروڈ کا سانس حلق میں اٹک گیا اور دور کھڑے چوکیدار نے سوچا کہ اب یہ پھر خدا کا نام بار بار کہنے لگے ہیں ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ پھر وہ زمین پر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ لوگ اسے کچھ بخشیش بھی دیں گے یا نہیں۔ پھر اس نے زمین پر سے ایک مہین سا تنکا اٹھایا اسے صاف کیا اور یہ نہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ گیارہ سو سال پہلے ایک چوب دار کی چوب کا حصہ تھا اس نے تنکے کو اپنے دائیں نتھنے کے اندر اتارا اور ایک دھما کہ دار چھینک کو انگیخت دینے لگا۔

"میں نہیں سمجھ سکا میڈم۔ مجھے ڈر ہے کہ میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔" بالآخر مسٹر عادل نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا اور گرٹروڈ کے 'میرے خدا' کہتے ہی وہ دونوں چوکیدار کی بھیانک چھینک کی طرف ایک لمحے کے لیے متوجہ ہو گئے اور گرٹروڈ نے اضافی شدت اور وضاحت کے ساتھ مسٹر عادل کے سامنے اپنا سوال دہرایا۔

"یس میڈم" اب اس نے اعتماد سے کہا" ایسا لفظ ہے۔ یقیناً ہے۔ ہماری زبان میں"

"کیا" گرٹروڈ کا اشتیاق یک دم پھر سے بیدار ہو گیا۔

"ہاف مین میڈم" مسٹر عادل نے پورے خلوص اور کچھ فخر کے ساتھ کہا۔

"اوہو۔ تو ہے۔ یہ اچھا ہے کیا مطلب ہے اس آواز۔ میرا مطلب ہے لفظ کا...... کس مقامی زبان کا ہے۔"

مسٹر عادل کی زبان پھر لڑکھڑائی "ز...... زبان...... میڈم...... میرا مطلب ہماری بھی زبانوں میں یہ لفظ بولا جا سکتا ہے اور مطلب۔ صاف ظاہر ہے...... میرا مطلب ہے انگریزوں کا نام ہوتا ہے۔ ہم بھی بول سکتے ہیں۔ ہاف مین بول سکتے ہیں۔" گرٹروڈ نے اپنے بازو ہوا میں اچھالتے ہوئے اتنی دفعہ او میرے خدا...... او میرے خدا کہا کہ چوکیدار بوکھلا کر گیارہ سو سال پرانا تنکا ایک طرف پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور خدا سے خیر مانگتے ہوئے ان کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

"یہ تمہارا قصور نہیں مسٹر عادل۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ...... یہ...... یہ" گرٹروڈ نے پھر آگے اور کچھ نہ کہا۔ وہ تیزی سے گھوم کر چوکیدار کی طرف مڑی" اور اسے اس کی ٹپ دو مسٹر عادل۔ اچھی ٹپ دو۔ ہم نے اس کی ڈیوٹی سے زیادہ اس کی خدمت لی ہے بہت اچھی ٹپ دو۔" یہ سب کہتی ہوئی وہ جسم کھنڈر کے گہراؤ کی طرف بڑھی اور عادل جیب سے بٹوہ نکالے چوکیدار کی طرف بڑھا۔ پھر وہ اسی مقام پر جا کر کھڑی ہو گئی جہاں کچھ دیر پہلے زہرہ کھڑی تھی اور اس نے حلق کے بل پوری قوت سے چیخ کر اندھے گہراؤ میں کہا۔ "میں نے اسے دیکھ لیا ہے ہاف مین اس دنیا کو جس نے تمہیں نامرد بنا دیا تھا" اس کی آواز اندھے کنویں میں گونجی۔

گھاؤ۔ گھاؤ۔ ہاؤ۔ ہاؤ۔ گھاؤ...... ہاؤ گہرے اندھیرے سے ہاف مین نے قہقہہ لگایا۔ ہاؤ۔ گھو۔ گھاؤ۔ ہاؤ۔ گھاؤ۔ ہاؤ

O

جب پانی آیا تھا اور بلند ہوتا چلا گیا تھا تو ایک وقت آیا تھا جب کنیئے غلام باغ کے کھلے میں رکھی میزیں اور کرسیاں ہلکی ہو کر آنے والے کے جسم میں تیرنے لگی تھیں اور پھر اپنی کرسیوں اور میزوں کی آمنے سامنے کی ترتیب سے آزاد ہو کر وہ مدتوں اپنی آزادی میں جھولتی رہی تھیں۔

کبیر نے اور زہرہ نے اور ناصر نے اس دنیا کو دیکھا جو ان کی ان گنت سہ پہروں اور شاموں اور راتوں کی دنیا رہی تھی۔ کڑکتے جاڑوں میں چلچلاتی گرمیوں اور پھولوں کی بہاروں میں اور ایسے موسموں میں جن کے کوئی نام نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس دنیا کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھا تو صدمے ان کے دلوں میں اترتے چلے گئے ان سب لمحوں کے جو کبھی وہاں ان کی پرخطر دیوانگیوں میں جنم لیتے اور معدوم ہوتے رہے تھے۔

پانی جب واپس گیا تھا تو تیرتی میزیں اور کرسیاں پھر سے زمین کی قید میں واپس اتر آئی تھیں اور گاڑھے موٹے کیچڑ نے ان کے کرسی میز کے مقدس رشتے کی پامالی کو اپنی نرم گرفت میں لے لیا تھا لیکن پھر پانی جب کیچڑ میں اپنے آخری چور قیام کے بعد فرار ہوا تو ان کی ٹانگیں خشک مٹی کی جکڑ میں وہیں کی وہیں قابو آ گئیں۔ اب اس زرد سہ پہر میں وہ سب وہیں تھیں جہاں تھیں اور کرسیوں کی نشستیں اور پٹکیں میزوں کی لمبائیوں اور چوڑائیوں کو ہر امکانی سمت میں رد کرتی

Scanned by CamScanner

تھیں اور ایک ناقابلِ تغیر افراتفری کو دوام بخشتی تھیں جو دیکھنے والے کی بصارت کو منتشر کرتی
اور ذہن کو متزلزل کر دیتا تھا۔

"یہ آگ اور پانی کے بعد کی دنیا ہے اور یہ باعزت نشست و برخاست کے شیدائیوں کے
لیے تباہی کی دنیا ہے۔" بلاشبہ کبیر نے کہا۔

"کبھی ہم بھی اسی نشست و برخاست کا حصہ تھے۔" زہرہ نے کہا اور محسوس کیا کہ خشک کیچڑ
میں جمی ہوئی کرسیوں میزوں کے اس انتشار پر مسلسل نظر جمائے رکھنا کس قدر مشکل ہے مگر اس
تکونوں، مستطیلوں، مربعوں، متوازی الاضلاع جیومیٹری شکلوں کے پھندے سے نظریں نکالنا بھی
کس قدر مشکل ہے۔ اس نے کبیر کی آواز سنی جو انکاری آواز تھی۔

"مگر وہ کبھی بھی متعین اور باعزت نہیں تھی وہ نشست و برخاست وہ جب بھی ایسی ہی تھی مگر
خواب اور خیال اور جنون کی سطح پر۔ اب آگ اور پانی اور مٹی نے اسے مجسم کر دیا ہے، غیر متحرک
چار کرسیوں میزوں کی یک بیک کو ۔۔۔۔"

ناصر نے ٹھنڈا سانس لیا اور اس جگہ کا تعین کرنے کی کوشش کی جہاں ماضی کے کیفے غلام باغ
کے اس کھلے حصے میں وہ بھی دونوں تو کبھی تینوں اور کبھی چاروں پہروں بیٹھتے تھے۔ فکر کرتے
تھے۔ بک بک کرتے سنتے تھے۔ محبت اور رنج کرتے تھے قہقہے لگاتے تھے۔ حسد میں جلتے تھے
اور خطرناک دیوانی باتیں کرتے تھے مگر وہ سب اب کہیں نہیں تھا۔ اس نے خشک کیچڑ میں جکڑی
ہوئی دو کرسیوں اور دو میزوں کے جڑے ہوئے کونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہماری میز اس جگہ ہوا کرتی تھی"

"اور میرا جاسوس سراج دین شاید اس جگہ بیٹھتا تھا" زہرہ نے ایک سمت اشارہ کیا۔

"اور عاشق علی بیرہ غالباً اس سمت سے ہمارے لیے چائے لاتا تھا" کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"لگتا ہے اطراف مر گئی ہیں۔" زہرہ نے کہا۔

"جب اطراف مر جاتی ہیں تو صرف میزیں کرسیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ وقت کے کیچڑ میں
دھنسی۔ پھر وہ وقت بھی گزر جاتا ہے اور وہ خشک کیچڑ میں پتھر ہو کر ہمیشہ کے لیے ساکت رہ جاتی
ہیں۔ تعلق کے جنون کا بہاؤ اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو واقعات وقت کے خشک کیچڑ میں جکڑے نظر
آتے ہیں اور کیفے غلام باغ میں تاریخ کی سرخیاں ابھرتی ہیں۔"

ناصر نے گہری تھکن زدہ شکست خوردہ نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا اور بولا "میں تمہیں
مبارک باد دیتا ہوں کبیر اور تمہیں زہرہ۔ کبیر اپنی فطرت کی اصل اپنی اصلی بک بک کی طرف مکمل
لوٹ آیا ہے پوری قوت سے اب یہ وہی کبیر ہے جو ہمیشہ سے تھا۔"

کبیر چوبی زاویوں کے اس خلفشار سے ایک لمحے کے لیے بھی نظریں ہٹائے بغیر
بولا "نہیں یہ وہ کبیر نہیں ہے۔ یہ تقریباً کبیر ہے جو اتفاقی الزام ہونے کے بعد اپنا جلا ہوا چھلکا اتار
کر تاریخ کا دوبارہ نظارہ کرنے نکلا ہے" اس نے کہا اور اپنے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنے
مخصوص نظریہ بازی کے انداز میں بولا "میں آج کی تاریخ کا نظریہ دوں گا اور زمین میں خوفناک
بے ترتیبی سے گڑی ہوئی ان کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ کر دوں گا اور لازم ہے کہ میرے
دوسرے میرے بالمقابل نشست کریں اور انتشار میں اپنا اپنا مقام تلاش کریں۔"

زمین میں سختی سے گڑی ان کرسیوں میزوں میں ایسی نشستیں سنبھالنا جہاں وہ تینوں ایک
دوسرے کے قریب بھی ہوں اور آمنے سامنے بھی ہوں جلد ہی ایک مضحکہ سا کھیل بن گیا۔ زہرہ
ہونے کی خواہش انہیں دور دور لے جاتی اور قربت کی خواہش انہیں ایک دوسرے سے منہ پھیر کر
بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتی۔ پھر انہوں نے ہر اس جگہ بیٹھ کر دوسرے کی طرف دیکھنے کا ہنگامہ کیا جہاں
کسی طرح بھی بیٹھا جا سکتا تھا اور جب اس کھیل میں تھک گئے تو اچانک ایک نامعلوم سمت میں
مڑی کرسی میں بمشکل گھس بیٹھی زہرہ نے گردن موڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میں جانتی تھی کہ تم اس کو کبھی نہیں دیکھو گے"

"کیسے؟" ناصر نے پوچھا۔

"چوتھی خالی کرسی کو" زہرہ نے کہا

سہ پہر ڈھل کر شام بن رہی تھی۔ غلام باغ میں سائے لمبے ہو رہے تھے اور ہوا میں اجاڑ
مقامات کا سناٹا تھا تب اچانک ناصر نے اپنی وہ کرسی چھوڑ دی جس کے پاؤں زمین نے پکڑ رکھے
تھے اور اطراف میں پھنسی ہوئی میزوں میں الجھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں کچھ بتاتا ہوں" اس نے کہا اور کبیر نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ کم از کم وقتی
طور پر تو زہرہ کے آخری فقرے کا سامنا کرنے سے بچ جائے گا باقی ناصر کچھ بھی بتائے اس سے
نمٹا جا سکتا ہے لیکن وہ ایسا بھی کیا بتانا چاہتا ہے کیا جو کچھ وہ بتانا چاہتا ہے اس کا تعلق زہرہ کی اسی

Scanned by CamScanner

بات سے ہے...... اور زہرہ بھی سوچ رہی تھی جو ناصر کہنا چاہتا ہے کیا اس کا تعلق اس بات سے ہے جو اس نے کہی...... اور زہرہ اور بھی بہت کچھ سوچ رہی تھی۔

دونوں کی خاموشی کو طویل ہوتا دیکھ کر ناصر نے خفت سے سوچا کہ شاید وہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں "ٹھیک ہے اگر تم نہیں سننا چاہتے تو نہ سہی" اس نے تلخی سے کہا۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے" کبیر نے ناصر کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اور زہرہ فوراً ہی اپنی "عجیب القیام" نشستوں کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرسیوں میزوں کی بھیڑ بھاڑ میں سے رستہ بناتے وہ کینٹے غلام باغ کے باورچی خانے کے بند دروازے کے سامنے آ کھڑے ہوئے جس پر ایک زنگ آلود تالا پڑا تھا۔ قریبی کھڑکیوں اور دروازے کے کواڑوں کے اوپر پانی کی بلند ترین سطح کا نشان ابھی تک باقی تھا۔ کبیر نے زہرہ کی طرف دیکھا جو اس نشان کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ان دونوں نے ناصر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور متوجہ ہونے کا عندیہ دیا۔

"وہ غیر ملکی عورت جو جنم کھنڈر کے پاس کھڑی تھی۔ جب ہم وہاں کھڑے تھے تو وہ وہاں آئی تھی۔ جانتے ہو وہ کون تھی" بالآخر ناصر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی ٹورسٹ وغیرہ تھی۔ غلام باغ کا تماشا دیکھنے آئی ہوئی" زہرہ نے کچھ مایوسی سے کہا اور سوچا یہ تو کوئی اور ہی فضول بات کرنا چاہتا ہے ناصر۔

"وہ ہاف مین کی عورت تھی" ناصر نے کہا

وقت کے اس مختصر وقفے کے دوران جو زہرہ اور کبیر نے اس کے انکشاف کو اپنے اندر سمیٹنے میں لیا اور جو ناصر کو بہت طویل محسوس ہوا ناصر نے ایک خود ملامتی تلخی کے ساتھ اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ ان اشخاص کے ساتھ وہاں کیا کر رہا ہے اور فوراً وہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا۔ پھر اس نے یک لخت بہت بے چینی سے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر بنے مٹی کی لکیر جیسے آبی نشان کو انگلی سے چھوا اور مٹایا۔ نیلے رجسٹر کو آگ سے بچانے اور اس کے خالق کے علم میں لائے بغیر اس پر قابض رہنے کا احساسِ گناہ اب ایسے ہی اس پر اچانک چھا جانے والے اندھیرے کی طرح غالب آ جاتا تھا۔ "ہاف مین کی عورت؟" نیلے رجسٹر کا مالک کہہ رہا تھا۔ "گرٹروڈ...... یہی نام لیا کرتا تھا ہاف مین...... اس عورت کا......"

"مگر تم کیسے کہہ سکتے ہو ناصر...... وہ وہی تھی" زہرہ کے چہرے پر انوکھی حیرت تھی۔ پھر اس سے پیشتر کہ ناصر اسے کوئی جواب دیتا کبیر نے اپنا سرمستی کا مخصوص ہیجانی قہقہہ لگایا جو کلاسوں میں فسادڈال کر مطالب و معانی کو وہیں بھرا کر کے بکھیر دیتا تھا۔ زہرہ اور ناصر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کینٹے غلام باغ میں تاریخ کی پہلی سرخی ابھر رہی ہے۔ ہماری قریب ترین تاریخ کا متن۔ "گرٹروڈ ہاف مین کی آخری آرام گاہ وہاں جنم کھنڈر جاتی ہے۔"

کبیر نے کسی کتاب سے پڑھ کر سنانے کے انداز میں کہا اور پھر اسی انداز میں آگے بولتا رہا "متن، اگرچہ کہنے کی ضرورت نہیں، آگ اور پانی کی آفتوں سے نکل کر لنگڑا کبیر زہرہ اور ناصر کے ہمراہ غلام باغ جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست جرمن آرکیالوجسٹ آنجہانی ہاف مین کا مدفن جنم کھنڈر دیکھتے ہیں۔ بعد میں ناصر کبیر اور زہرہ کو اس شک میں ڈالتا ہے کہ وہ ہاف مین کی عورت گرٹروڈ تھی۔"

کوئی شک نہیں مجھے یقین ہے وہ وہی تھی" ناصر نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"مگر ہمیں تو شک کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ زہرہ تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ عورت کیا ہاف مین کی عورت تھی۔"

زہرہ کے پورے جسم نے بے سکونی سے جنبش کی۔ اس کی آنکھیں پھڑپھڑائیں اور بولی "میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"ہاں۔ کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ ماضی محال امر ہے اگر تم اسے جزئیات میں لے جاؤ گے۔ کھوپڑیوں کے اندر کی صورتِ حال تاریخ نہیں۔ مگر پھر بھی یہ ایک اچھا موقع ہے ماضی کی بذلہ بازی کو کھنگے کا...... آؤ ہم یاد کریں۔ تم زہرہ جو تھی خالی کرسی میں ہاف مین کو بٹھاؤ اور دیکھو سنو اس نے اس عورت کے بارے میں تم سے۔ مجھ سے۔ ہم سے۔ کیا کہا۔ ناصر کو اگرچہ یقین ہے مگر وہ اپنے یقین کو اور بھی پختہ کرنے کے لیے...... تمہیں اس کینٹے غلام باغ میں اپنے ہاف مین کے ساتھ اور اس نامعلوم اور ہمیشہ موجود عورت کے ساتھ ماضی میں جا سکتا ہے یا جیسے کچھ لوگ کہیں گے جھانک سکتا ہے۔ غوطہ لگا سکتا ہے۔ پلٹ سکتا ہے کھنگال سکتا ہے۔ دوبارہ...... زندہ......"

"بس......" ناصر نے ہاتھ اٹھا کر کبیر کو وہیں خاموش کر دیا اور غلام باغ کی اپنی خاموشی اضطراب اور وحشت سے تھرا اٹھی۔ کبیر نے ہاتھ بڑھا کر زنگ آلود تالے کو کسی مقصد کسی ارادے

Scanned by CamScanner

کے بغیر اپنی گرفت میں لیا تو وہ کسی کچی مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔
پھر اس نے واضح مقصد اور ارادی کوشش کے ساتھ کینے غلام باغ کے باورچی خانے کے بوسیدہ دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو ایک کواڑ چوکھٹ سے الگ ہو کر دھماکے کے ساتھ اندر جا گرا اور دوسرا آدھا ٹوٹ کر ایک طرف لٹک گیا۔ اپنے اپنے ماضی میں سرگرداں ناصر اور زہرہ اس پُرشور مداخلت پر بری طرح چونک کر لمحۂ حال میں واپس آ گئے۔ کبیر نے اپنے دائیں بازو کو ایک لہراتی ہوئی قوسی حرکت دینے کی کوشش کی جو اس کے جلے ہوئے ناتواں شل شدہ پٹھوں کی کجی کی وجہ سے بہت کچھ ادھوری رہی مگر اس کے الفاظ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کافی تھے۔

"آیئے..... گو میرا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ پانی کے بعد کے غلام باغ کے اس گوشے کا بھی نظارہ کروں یہ باورچی خانہ جو ایک لحاظ سے کینے غلام باغ کا باطن تھا۔ میرے لیے یہ باہر کے کرسیوں میزوں کے قضیے ہی کافی تھے..... مگر بعض اوقات بے مقصد حرکتیں اچانک آسانیاں فراہم کر دیتی ہیں..... کینے غلام باغ کا ایک اور ہمارا ماضی ادھر اندر ہے..... تاریخ کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے..... دیکھو..... ہاف مین نے اپنی عورت کا کچھ علم ہمیں..... کہیں یہاں بھی دیا ہو..... اُن پُرآشوب راتوں کے باورچی خانے میں۔"

وہ تینوں سامنے گرے دروازے کے چوبی پٹ کے اوپر پاؤں دھرتے اندر داخل ہوئے تو ایک فوری اور اجتماعی تحیر ان پر غالب آ گیا۔ وہ جگہ جو کبھی کینے غلام باغ کے ادارے کا محور تھی۔ جہاں سے ایک طرح سے سب کچھ ظہور میں آتا تھا اب ایک ناقابل شناخت مقام تھی۔

زہرہ کا فوری احساس یہ تھا کہ جیسے وہ گھنے جنگل میں بنی کسی بربادعمارت میں داخل ہوئی ہے جس کے مکینوں کی تباہی کے بعد اردگرد کی بے رحم نباتات اس پر قابض ہو چکی ہیں۔ چھت کے نیچے کی غیر فطری دھرتی میں جڑیں گاڑے اور ٹہنیوں، پتوں اور ڈنٹھلوں کے سبز پنجے پھیلائے وہ کسی شیطانی گھات میں تیار کھڑی نظر آتی ہیں۔ ہزار ہا کھمبیوں کی قطاروں میں سے مرطوب سڑاند کے ابخرے ایک یاس انگیز نحوست کے ساتھ تیرتے اٹھتے ہیں۔ چھوٹی بڑی، موٹی، لمبی، پتلی، سفید، کالی، بھوری، چتکبری کھمبیاں زنگ کے ڈھیر بنے گیس کے چولہوں کے گرد فصل در فصل اُگی کھڑی ہیں۔ زہرہ کھمبیوں کے گھنے جنگل میں جھانکتی ہے اور آنے والے کمرے کی طرف قدم اٹھاتی ہے۔ وہی کیچڑ جو باہر خشک سخت مٹی میں تبدیل ہو کر کرسیوں میزوں کو جکڑ چکا ہے یہاں

پاؤں کے نیچے جیلی جیسا تھلتھلاتا ہے۔ مٹی کے خمیر میں گندھا آٹا گلی سڑی بدبوؤں میں سے ایک تسلسل کے ساتھ نکل رہا ہے اور زہرہ دیکھتی ہے کہ چپٹے ڈھیروں میں لاکھوں کروڑوں سفید کیڑے متحرک ہیں۔ زہرہ بے بسی سے آگے جھک کر دیکھتی ہے۔ وہاں متورم مقامات میں اس قدر زیادہ ہیں اور اس قدر جنون سے حرکت کرتے ہیں کہ زہرہ کی نظریں انہیں سنبھال نہیں پاتیں۔ تب وہ دیکھتی ہے کہ اوپر تلے وحشی تھیلی بوریوں کے اندر بھی جنونی حرکت اس شدت سے جاری ہے کہ بوریاں باہر سے بھی جگہ جگہ تھرتھرا رہی ہیں۔ تب زہرہ وہ آواز سنتی ہے جو وہاں بیٹھے ہوئے کسی شخص کو ایک مدھم مگر تیز سرسراہٹ جیسی سنائی دیتی ہے اور کانوں کے رستے جسم میں اتر کے ایک نامعلوم ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ زہرہ اس آواز کو پہچان نہیں پاتی پھر پہچان لیتی ہے تو اس کا بدن جھرجھری لیتا ہے۔ وہ اُن کیڑوں کی اجتماعی حرکت کی آواز ہے۔ وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ کبیر اور ناصر وہ بے جسم چہرے ہیں جو ہوا میں معلق اس کے پیچھے موجود ہیں اور سیلے مرطوب کمرے کے موذی میں لاکھوں کروڑوں گڑبڑ کرتے کیڑوں کا نظارہ کرنے کی اپنی اپنی کیفیتیں دکھا رہے ہیں۔ زہرہ ان کی آنکھوں میں ایک انوکھی متحیر لذت کی چمک دیکھتی ہے مڑتی ہے اور وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ ان دونوں کو تیز سرسراہٹ بھرے سیلے کمرے میں نظریں گاڑے ہوئے چھوڑتی ہے اور دیکھتی ہے کہ اس جگہ کی پچھلی دیوار کی کھڑکی اور دروازہ جو پیچھے غلام باغ کو کھلتے ہیں ٹوٹ کر گر چکے ہیں اور شام کے قریب جاتے سورج کی دھیمی روشنی اندر آتی ہے اور اس مقام میں کبھی پکائے جانے والے اجناس کی آوارہ فصل اسے ملنے کو باہر جھک رہی ہے اور ایک گھمنڈ وحشی سماں بنا رہی ہے جس میں ایسی ڈرانے والی شدت کی کشش ہے کہ زہرہ کے پاؤں اس طرف اٹھ جاتے ہیں۔ اس کا پاؤں لجلجے کیچڑ میں وحشی کسی کھوکھلی رکاوٹ سے ٹکراتا ہے۔ ایلومینیم کا ایک پچکا کھلے منہ کے زنگ کیچڑ میں عمودی دھنسا ہے۔ زہرہ کا پاؤں اُس کھلے منہ کے تاریک نیم دائرے میں جا گھستا ہے۔ ایک بھورا سبز مینڈک اس کے اوپر چھلانگ لگاتا ہے اور ایک اضطراری چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوتی ہے۔

ناصر اور کبیر زہرہ کی چیخ سنتے ہیں اور تیزی سے اس کے قریب آ جاتے ہیں۔ مینڈک پھر چھلانگ لگاتا ہے۔ پھر وہ تینوں کھڑکی اور دروازے کے خلا سے روشنی کی سمت بڑھتی اُن اجنبی وحشی نباتات کے بہت قریب چلے جاتے ہیں۔ اچانک اڑنے والے حشرات کا بھنبھناتا بادل

Scanned by CamScanner

ہر طرف چھا جاتا ہے۔ زرد سانپ پہلے پڑتے دُھندلکوں میں لمبا لیٹا مردہ پڑا ہے جگہ جگہ سے اس کی ہڈیوں کا پنجر صاف ستھرا نکلا نظر آتا ہے۔ دوسری جگہوں پر ابھی تک قائم اس کی زرد کھال اس کی شناخت کو ناقابل تردید بناتی ہے۔ "یہ مدعلی کا سانپ ہے" کبیر کہتا ہے۔

"مدعلی کہاں ہے" ناصر پوچھتا ہے۔ کبیر کوئی جواب نہیں دیتا۔ زہرہ کوئی جواب نہیں دیتی۔

کبیر خاموش ہے، زہرہ خاموش ہے، ناصر خاموش ہے۔ ناصر کیا سوچتا ہے، کبیر کیا سوچتا ہے، زہرہ کیا سوچتی ہے، مدعلی کہاں ہے، عاشق علی بیرہ کہاں ہے۔ سراج دین جاسوس کہاں ہے۔ نواب ثریا جاہ تار جنگ کہاں ہے۔ عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ نجم الثاقب کہاں ہے۔ ہاف مین کہاں ہے۔ یاور عطائی۔ بھوری بٹی۔ بیرا نابغہ عورت۔ میٹھی چائے پینے والے۔ امبر جان۔ انگلیاں ڈھانپنے والا بیرہ۔ حیات چنگی۔ یاور عطائی کی بیوی میری ماں۔ پروفیسر نذیر بشیر۔ تاریخ کی روتی ہوئی بیوہ پروفیسر۔ سستر فقار۔ شکلیں۔ جلانے والی۔ پٹرول چھڑکنے والی۔ نیلا رجسٹر۔ پادری میکنا کہاں ہے۔ کبیر خوبصورت بولتا ہے۔ زہرہ جو عشق کرتی ہے۔ ناصر جو عشق کرتا ہے ناصر جو جھوٹ بولتا ہے۔ گنجینۂ نشاط کہاں ہے۔ کبیر جو دوبارہ لکھتا ہے۔ خصی کلب کے ارکان کہاں ہیں۔ زہرہ جو عنابی پردے کے پیچھے سے باپ کو دیکھتی ہے۔ کہاں ہے۔ زہرہ جو امبر جان کے جسم سے لیس دار مواد نکلتا دیکھتی ہے کہاں ہے۔ زہرہ جو کبیر کے زخموں سے پیپ نکلتی دیکھتی ہے کہاں ہے۔ زہرہ جو کبیر کے ساتھ عطائی کے کمرے میں جاتی ہے۔ کبیر جو زہرہ کے ساتھ عطائی کے کمرے میں جاتا ہے۔ شیشے کے مرتبان کہاں ہیں۔ ناصر جو زہرہ کی دیوانگی میں دیوانگی سے ذرا پہلے لوٹ آتا ہے کہاں ہے۔ ناصر جو گھات لگاتا ہے۔ ناصر جو چنگیر سے خوبصورت کیڑوں کی دنیا کا آسمان دیکھتا ہے۔ کبیر جو خط لکھتا ہے۔ کبیر جو بک بک کرتا ہے۔ کبیر جو زہرہ کے ساتھ رات گزارتا ہے۔ گجی کہاں ہے۔ نیلے رجسٹر میں کیا ہے۔ زہرہ کے دل میں کیا ہے۔ ہاف مین کا منصوبہ کیا ہے۔ زہرہ کا ارادہ کیا ہے۔ زہرہ کا فیصلہ کیا ہے۔ کبیر کا مسئلہ کیا ہے۔ ناصر کا المیہ کیا ہے۔ نرس مختار کہاں ہے۔ ننگا افلاطون کہاں ہے۔ سکندر اعظم نامی کوا کہاں ہے۔ جل پتھری، جل گھونسلہ، یاور ہاؤس، بیوروکریٹ محقق کہاں ہے۔ سنہرا سکہ کہاں ہے۔ مدعلی بولتا کیوں نہیں۔ ادھر آتی کیوں نہیں۔ زہرہ آتی کیوں نہیں۔ ناصر روتا کیوں نہیں۔ کبیر آتا کیوں نہیں۔ دیوانہ کون ہے۔ فرزانہ کون ہے۔ عاشق کون ہے۔ معشوق کون ہے۔ ظالم کون ہے۔ مظلوم کون ہے۔ لکھتا کون ہے۔ پڑھتا کون

ہے۔ حاکم کون ہے۔ محکوم کون ہے۔ سچا کون ہے۔ جھوٹا کون ہے۔ آگے کون ہے۔ پیچھے کون ہے۔ اوپر کون ہے۔ نیچے کون ہے۔ یاور عطائی کیا چاہتا ہے۔ امبر جان کیا چاہتا ہے۔ زہرہ کیا چاہتی ہے۔ ہاف مین کیا چاہتا ہے۔ ناصر کیا چاہتا ہے۔ کون کیوں چاہتا ہے۔ انعام گڑھ کہاں ہے۔ ماگھر جاتی کہاں ہے۔ کیوں ہے کہاں ہے کون کیوں ہے۔ عشق پر مکالمہ جھوٹا کیوں ہے۔ کبیر کا کام ادھورا کیوں ہے۔ ننگا افلاطون کیوں ہے۔ نیلے رجسٹر میں لکھا سرخ کیوں ہے۔ سرخ میں لکھا کالا کیوں ہے کالا سفید کیوں ہے کیسا ہے کیسا ہے یہ وقت کیسا ہے یہ لمحہ کیسا ہے۔ یہ مقام کیسا ہے۔ کیا ہے کیا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا ہے۔ کیا ہے کیا ہے۔ کیا ہے۔ ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟......

کبیر نے زہرہ کے لرزتے جسم کو سہارا دینے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ کی جنبش نے اور ناصر کے تھوڑا پیچھے ہٹنے کی حرکت نے مردہ سانپ کے جسم سے چمٹے اڑنے والے حشرات کو پھر سے ایک 'زن زناتے' بادل کی شکل میں منتشر کر دیا۔ زہرہ کبیر کا سہارا قبول نہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹی اور چیخی۔

"بند کرو۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ میں یہ آوازیں اور نہیں سن سکتی...... ہٹ جاؤ۔ یہ کیسی جگہ ہے یہ سب......"

کبیر نے کیفے غلام باغ کے باورچی خانے میں جو کیفے غلام باغ کا باورچی خانہ نہیں تھا دیکھا۔ اس جگہ کو جہاں کھڑکی سے روشنی اب تاریکی کی شکل میں آ رہی تھی اور اس نے گندم اور چنے کے مضحکہ خیز بے تحاشہ وحشیانہ اُگے پودوں کے اندر مردہ لیٹے بل کھائے سانپ پر الوداعی نظر ڈالی اور زہرہ کو اس ہولناک نظارے سے دور ہٹا لے جانا چاہا مگر اس سے پہلے ناصر اُسے دور لے گیا۔

اب ناصر کا پاؤں کیچڑ میں آدھے دبے چپٹے کے چہرے سے ٹکرایا اور مینڈک نے اپنی مینڈکی دنیا میں پھر مداخلت کا پھر نوٹس لیا اور پھر ایک طویل چھلانگ لگائی اور اس جگہ جا پڑا جہاں کسی زمانے میں عاشق علی بیرہ ان چاروں کے لیے چائے کی ٹرے سجاتا تھا۔ پہلے کیک کے ٹکڑوں اور کبابوں سے آراستہ کرتا تھا جو بستہ راتوں میں ان کے لیے آملیٹ بناتا تھا۔ جہاں کھڑا وہ پچھلے دروازے کے رستے بھائی مدعلی کی غلام باغ سے واپسی کا انتظار کرتا تھا۔ مدعلی کہاں تھا؟

نیچے گرے بوسیدہ دروازے کے تختے کے اوپر پاؤں رکھتے وہ باہر آ گئے۔ ٹوٹا ہوا زنگ آلود تالا کبیر کو اپنے پاؤں میں پڑا نظر آیا اس نے اسے ایک اضطراری ٹھوکر لگائی اور وہ منجمد کرسیوں

Scanned by CamScanner

پیڑوں کے پیچھے کہیں جا کر رک گیا۔ جیسے پھر کسی ٹھوکر کا منتظر ہو۔ زہرہ ہنس پڑی۔
''کبیر مہدی اس مقام سے کوئی راستہ ہاف مین کی کسی بھی عورت کی طرف نہیں جاتا'' اس نے کہا اور ناصر نے کہ غیر معمولی ہنسی پہچانا جس کا پیشہ تھا سوچا کیا زہرہ کی ہنسی ہسٹیریائی ہے۔ پھر اس نے قیاس کیا کہ شاید وہ خود بھی کچھ بھی دیر اور اندر اس مقام میں رہتا تو اس کی اپنی ہنسی بھی کسی نامعلوم سمت میں غیر معمولی ہو جاتی۔
کبیر کہہ رہا تھا کہ ''یہ مقام ہمیشہ سے ناقابل یقین واقعات اور مکالموں کا مقام رہا ہے تمہیں یاد ہے؟''
زہرہ اور ناصر اپنی یاد کے ذکر پر خاموش رہے اور ان کی خاموشی نے کبیر کو اس کے خاموش رہنے کے حق سے اور بھی محروم کر دیا۔
''تمہیں یاد ہے ناصر ایک دفعہ میں نے تمہیں اسی لمحے میں دیکھنے کا مشورہ دیا۔ یا شاید مطالبہ کیا تھا''
''شاید حکم دیا تھا'' ناصر بولا۔
''اب یہ ایک ناجائز اور محال حکم ہوگا'' کبیر نے کیچڑ میں جکڑی ہوئی اور گہری سرخ شام میں رنگی ہوئی کرسیوں پیڑوں کی طرف قدم لنگڑاتے ہوئے کہا۔
''کیوں؟'' زہرہ نے شدت سے پوچھا اور پھر پوچھا۔ ''کیوں؟'' اور ناصر نے سوچا کہ زہرہ کی بھلائی اس میں ہے کہ ابھی کبیر اس کے کیوں کا جواب دے۔ ایسا جواب جو اسے شانت کر دے۔
''آگ اور پانی کے بعد اس مقام اور اس وقت۔ اس واقعے اور اس لمحے نے ایک دوسرے کو تہس نہس کر دیا ہے۔ کچھ وقت ہوتا ہے جو مقام کو برباد کر دیتا ہے اور کوئی مقام ہوتا ہے جو وقت کو برباد کر دیتا ہے۔ کیسے غلام باغ کے باہر اور اندر میں یہی فرق ہے میں اندر نہیں جانا چاہتا تھا سارا قصور اس زنگ آلود تالے کا تھا''
اور ناصر نے دیکھا کہ کبیر زہرہ کو شانت کر سکتا ہے۔ زہرہ نے اپنے آپ میں واپس آتے ہوئے کبیر سے کہا ''تم مجھے ایک قابل رحم لنگڑے بوڑھے بچے لگ رہے ہو۔ مگر ذرا دیکھو شام کس قدر سرخ ہو رہی ہے۔ کیا تم نے کبھی ایسی شفق یہاں دیکھی ہے۔''

''نہیں'' کبیر نے مغرب کے آسمان میں دیکھا اور پھر ناصر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''نہیں'' ناصر نے کہا اور پھر کبیر نے پھر کہا..... ''نہیں کم از کم اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ سورج کو ایسے خونی رنگ میں غروب ہوتے میں نے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔''
اچانک ناصر کے ہونٹوں پر گہری طنز بھری مسکراہٹ ابھری اور اس نے کبیر سے کہا'' کیا یہ بھی تاریخ کی سرخی ہے؟ تمہارا آج کی تاریخ کا تاریخ کا نظریہ پیش نہ ہو سکا' سرخیاں اور متن؟''
''پھر سہی۔ پھر کبھی کسی اور وقت اور مقام پر جب میں اس خونی شفق کے لمحے کو یاد کروں گا اور اس مستقبل میں جو حال ہوگا۔ اس حال تک پہنچنے والی سب موٹی موٹی بھدی سرخیاں اور ان کے ضروری ضروری متن دہراؤں گا۔ جیسا میں آج کرنے والا تھا۔ اگر زنگ آلود تالا ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں نہ آ جاتا.....''
''وہ کیسا وقت کیسا مقام ہوگا؟ وقت کے ہاتھوں برباد ہونے والا مقام یا مقام کے ہاتھوں برباد ہونے والا وقت'' زہرہ نے پوچھا ''میں نہیں جانتا'' کبیر نے آہ بھری اور ایک منجمد کرسی میں جا کر بیٹھ گیا۔
زہرہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر پھیل گیا'' مجھے تم پر بے انتہا ترس آ رہا ہے۔ لنگڑے بوڑھے بچے جب تم چلے ہوئے میرے سامنے پڑے رہتے تھے اور تمہارے زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی تو مجھے تم پر ترس نہیں آتا تھا مگر اب میرا جی چاہتا ہے تم پر ترس کھاتی چلی جاؤں۔ مجھے حیرت ہے ناصر۔''
''ہاں حیرت ہے۔'' ناصر نے ٹھنڈی سانس لی۔
''مگر کیا یہ ترس ہے؟'' اچانک زہرہ نے پوچھا جیسے کسی سے بھی نہ پوچھا ہو۔
''ہاں یہ سوچنے کی بات ہے'' ناصر نے خشک لہجے میں کہا اور پھر کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا'' جانا چاہیے''
''ہاں جانا چاہیے'' کبیر نے اپنی کرسی کی خشک کیچڑ میں انجمادی مزاحمت کو ہلا جلا کر جانچتے ہوئے کہا'' مگر میں تمہیں اس ماضی کی سرخی اور متن سے محروم نہیں کروں گا۔ جس کا فساد تم نے

باف مین کی عورت کا انکشاف کر کے پھیلایا" کبیر نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بولا "نہایت مختصر نہایت غیر دلچسپ۔ اور نہایت معمولی.... ناصر کبیر اور زہرہ کا سیلاب سے تباہ و برباد غلام باغ کا دورہ... غلام باغ کے دورے کی آخری کڑی کے طور پر تینوں کیفے غلام باغ جاتے ہیں تاکہ وہاں گزارے اپنے سابقہ ایام کی یاد تازہ کر سکیں۔ مگر یہیں ناصر ایک غیر ملکی عورت کے جسے انھوں نے جمِ کھنڈر کے پاس دیکھا تھا کے حوالے سے اس شک کا اظہار کرتا ہے کہ وہ باف مین کی محبوبہ تھی۔ یہ صورتحال انھیں کافی ذہنی پریشانی میں مبتلا کرتی ہے کیونکہ اسے دور کرنے کا کوئی بھی طریقہ نہیں، ادھر کیفے غلام باغ کی تباہی و بربادی دیکھ کر ان کا دل اور بھی خراب ہوتا ہے۔"

کبیر نے قہقہہ لگایا اور زہرہ نے ہنستے ہوئے اپنا بازو اس کی طرف پھیلایا... "آؤ... اب چلیں... لنگڑے...."

ناصر نے سرخ شفق کو دیکھا اور ان کے چلنے سے پہلے ہی آگے چل پڑا۔

OOO

باب (24)

سُرخیاں اور متن

"اسی لمحے میں لکھو" کبیر نے کہا۔

"ہاں لکھواؤ۔ کیا لکھوں؟" زہرہ نے کہا اور ہاتھ میں تھامے قلم کو کاغذوں کے فولڈر کے اوپر ایسے حرکت دی جیسے ابھی زمین پر اترنے سے پہلے پرندہ ہوا میں بے چینی سے معلق ہو جاتا ہے۔

"نہیں۔ تم کبھی نہیں۔" کبیر بھی بے چینی سے بولا "یہی لکھو۔ میرا مطلب ہے یہی فقرہ لکھو۔ اسی لمحے میں لکھو۔ اسی لمحے میں لکھو۔ ویسے تم کچھ بھی لکھ سکتی ہو۔ میرا بولا ہوا۔ مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہم جان سکیں کہ یہ متبادل طریقہ.... میرے لکھنے والے ہاتھ کی عدم موجودگی میں.... یا یوں کہہ لو کہ لکھنے والے مفلوج ہاتھ کی موجودگی میں.... میں ایسے کیسے لکھوں گا کہ میں بولوں گا اور تم لکھو گی.... لکھو...."

زہرہ نے کچھ لکھنے کی بجائے قلم کو ایک طرف ہٹا لیا اور کہا "اگر تم بار بار یہی سننا چاہتے ہو تو پھر سنو کہ تمہارا ہاتھ مفلوج نہیں ہے یہ جلنے کے بعد کی کمزوری ہے اور آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر تمہیں بتا چکے ہیں۔"

"میں اپنے جسم کو دنیا کے کسی ڈاکٹر سے بہتر سمجھتا ہوں۔" کبیر نے اضطراب سے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے کہا "اچھا لکھو.... لکھو.... یہی لکھو.... لکھو میری آواز تم تک ٹھیک پہنچ رہی ہے؟ تمہارا قلم ٹھیک چلتا ہے؟ کاغذ کی سطح کوئی مزاحمت تو نہیں کرتی؟ میری جان لکھو.... اور بتاؤ۔ اندازہ لگاؤ۔ قلم کی نوک اور کاغذ کی ہمواری اور میری کہی ہوئی بک بک سب ایک ساتھ ٹھیک بنتی ہیں یا نہیں۔ اچھا۔ اچھا یہی لکھو میرے ہاتھ... لکھنے والے ہاتھ کی حالیہ تاریخ لکھو.... بالآخر جب کبیر مہدی آگ اور پانی کی دنیا سے نکل کر اپنے 'دوبارہ' کے عظیم مکاشفے کو قلم بند کرنے بیٹھا تو

Scanned by CamScanner

دو لائنیں لکھنے کے بعد اُس کا قلم بالکل بند ہو گیا اور اس کا ہاتھ ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچنے اور کاٹنے لگا۔ لکھ رہی ہو۔"

"نہیں" زہرہ نے غصے سے کہا "میں ایسی کوئی بے ہودہ بات نہیں لکھ سکتی۔"

کبیر نے قہقہہ لگایا۔ "ارے بابا اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں کہ تم کیا لکھ رہی ہو۔ وہ میرا مسئلہ ہے۔ اچھا دیکھو... سمجھنے کی کوشش کرو... یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے وہ تمہیں مائیکروفون کو چیک کرنے کے لیے یا ٹیپ ریکارڈر کی کارکردگی جانچنے کے لیے تمہیں کہتے ہیں کہ اس میں کچھ بولیں... اب اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ آپ کیا بولتے ہیں... اگر... بولا ہوا محفوظ ہو رہا ہے۔ آسانی سے ٹھیک طرح سے محفوظ ہو رہا ہے تو سب ٹھیک ہے......"

"تو سب ٹھیک ہے..." زہرہ نے لکھتے ہوئے کہا اور بولی "ایک منٹ ٹھہرو یہ کاغذ پر خراشیں ڈالنے والا کالی سیاہی والا پین میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ نہیں چلے گا۔" اور کبیر نے جو کمرے کی دیوار کے ساتھ چنی کتابوں کی دیوار کی طرف دیکھتا ہوا بول رہا تھا چونک کر اُس کی طرف مڑا۔

"تو تم یہی سب لکھ رہی تھیں۔" "ہاں" زہرہ نے کہا اور پھر دونوں ہنس پڑے۔ کمرے میں نو تعمیر شدہ عمارتوں کے خام مواد کی خوشبو تھی جو کبیر کے قدیم گھونسلے کی خوشبو سے کہ جو پرانی کتابوں کی خوشبو سے الگ کسی خوشبو کا احساس نہیں دلاتی تھی یکسر مختلف تھی۔ اب اس نئے گھونسلے میں جسے کبیر نے بیت القفس کا نام دیا تھا پرانی کتابوں کی خوشبو نمناک سیمنٹ، پینٹ اور لکڑی کی خوشبوؤں میں اجنبی، بوکھلائی پھرتی تھی۔

سکالرز اولڈ بکس شاپ کے جل جانے اور بہہ جانے کے بعد امداد حسین کے بہی خواہوں نے اور خود کبیر نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ روزگار کے لیے کوئی اور دھندہ اختیار کرے۔ مگر اُس کا جواب تھا کہ روزگار اُس کا مسئلہ نہیں وہ دھندہ وہ دھندے کے مزے کے لیے کرتا ہے اور وہی کرے گا جو عمر بھر کرتا رہا ہے۔ اور کبیر کے لیے اس کی آخری دلیل یہ تھی۔ "اور پھر آپ کو بھی تو پھر سے آباد کرنا ہے کبیر صاحب۔"

"قفس کی نو آبادکاری" بقول کبیر اگرچہ سکالرز اولڈ بکس شاپ کے ازسرِنو اجراء کی کوئی معقول دلیل نہ تھی مگر امداد حسین کی دلجوئی کے لیے اور کتابوں کے کباڑ خانے کے لیے 'علمی ماحول' کے تسلسل کے لیے اس نے قبول کر لی تھی۔ "اچھا یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ تم اور کس تیزی سے لکھ سکتی

ہو۔ اور ہاں تمہارے ہجے کیسے ہیں؟ یہ بھی تو دیکھنا ہے۔ مجھے اس وقت اس عظیم ناول نگار کا نام یاد نہیں آ رہا۔ جو اسی طرح، یعنی میری طرح اگرچہ میں ناول نگار نہیں ہوں۔ ٹہل ٹہل کر املا دیتا تھا۔ جو کوئی سیکرٹری، املا کار، پتہ نہیں یہ لفظ صحیح ہے یا نہیں۔ اسٹینو گرافر.... جو بھی.... بہرحال۔ جو ہجوں کی غلطیاں کرتا تھا وہ زیادہ دیر اس کے پاس ٹک نہیں سکتا تھا۔"

"میں بھی لگتا ہے زیادہ دیر تمہارے پاس ٹکوں گی نہیں۔ لیکن اُس کی وجہ میرے ہجے نہیں ہوں گے۔ بلکہ تم خود ہو گے۔ اور آئندہ مجھے سٹینوگرافر یا سیکرٹری یا ٹیپ ریکارڈر کہنے کی غلطی نہ کرنا۔"

"ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ مگر پھر بھی تمہارے ہجے چیک کرنا ضروری ہے۔ اچھا یہی لکھو۔ "بیت القفس" اور یہ پین چھوڑ دو۔ وہ بال پوائنٹ لے لو۔ اس کا ننھا سا دھاتی گینڈ کاغذ کی سطح پر پھسلتا چلا جاتا ہے۔ اور لکھنے والے کے عضلات میں گہری طمانیت کا احساس جگاتا ہے۔ مجھے حیرت ہے اس آلے کے موجد کو ادب کا نوبل پرائز کیوں نہیں دیا گیا۔ مگر شاید یہ ڈائنامائیٹ کی ایجاد سے پہلے کا واقعہ ہے۔ تمہارے اندر گہری طمانیت کا احساس جاگ رہا ہے۔ یا نہیں؟"

"ہاں لکھو۔ مشکل الفاظ اور معنی۔ نہیں معنی تمہارا مسئلہ نہیں۔ ویسے یہ میرا مسئلہ بھی نہیں۔ اور سچ پوچھو تو یہ کسی کا بھی مسئلہ نہیں۔" کبیر نے مضطرب سا قہقہہ لگایا اور پھر بولا "بیت القفس کی جائے تاریخ۔ زہرہ نے بال پوائنٹ کو ایک اخبار پر زور زور سے چلایا اور بڑے بڑے دائرے اور ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچیں اور پھر کہا۔ "نہ نہیں۔ ہاں کیا کہا؟۔ چائے تو پلواؤ ملائیوں والی۔"

"یقیناً" کبیر نے کہا اور 'بیت القفس' کی وہ کھڑکی کھولی جو نیچے سندر شام روڈ پر کھلتی تھی اور جہاں اُسی جگہ پہلے گھونسلے کی ویسے ہی باہر کھلنے والی کھڑکی ہوتی تھی۔ "میں ملائیوں والی کے معیار کی کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتا کیونکہ ملائیوں والی چائے بنانے والا ایک کاریگر جو بگا نامی ایک شخص تھا قہر آتش و آب کے بعد لاپتہ ہو گیا قیاس ہے کہ وہ اپنے وطن مالوف کو، جو کہ ایک قسم کوہستانی میں واقع ہے، مراجعت کر گیا ہے۔ اب اس کا جانشین جھلا نامی ایک آزاد مرد ہے اور ابھی زیر تربیت ہے" کبیر نے کہا اور کھڑکی میں سے منہ نکالتے ہوئے زور سے ہانک لگائی "چھلے چائے ملائیوں والی۔" پھر اُس نے مڑ کر زہرہ کو دیکھا جو مسکرا رہی تھی اور کاغذ پر لاتعداد چھلے بنا رہی تھی۔

"ایسے ہی مشکل الفاظ تمہیں لکھ کر دکھانے ہوں گے۔"

"ہاں۔ لکھواؤ" زہرہ ہنسی۔

"متنفس۔ قہر آتش و آب۔ اغلب۔ وطن مالوف۔ اقلیم کوہستانی۔ مراجعت۔"

"لکھ لیا" زہرہ نے نظریں کاغذ سے اُٹھا کر کبیر پر ڈالیں۔ "آگے"

"آگے؟ ہاں آگے۔ وہی بیت المقدس کی حالیہ تاریخ لکھو۔ یہ فقید المثال ادارہ بعید از مکانی ابعاد کی حدود میں تعمیر کیا گیا جو ایام سابقہ میں "گھونسلا" نام کی ایک تعمیر کے تصرف میں تھی اور جو اپنے موجودہ مکین نامراد سمیت خاکستر ہوئی۔ ہر چند کہ مکین مذکورہ بعد از طویل ایام جاں کنی و لمحات نزع بسبب لطف و کرم بسیار و توجہ دختر یار و عطائی شفایاب ہوا۔ مگر اس کا لا اکھسائی کا شاہکار رزق خاک سیاہ ہوا۔۔۔۔ لکھ رہی ہو؟"

"ہاں"

"میری آواز ویسی تو نہیں۔"

"تمہارا کچھ بھی ویسا نہیں ہے۔۔۔۔ آگے چلو۔۔۔۔ یعنی آگے بولو۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ خاک سیاہ ہوا۔۔۔۔ گھونسلے کے نذر آتش ہونے کا سبب بعض حلقوں کی طرف سے مکین کا بھوگ بلاس قرار دیا گیا۔۔۔۔"

"کیا؟" زہرہ نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"بھوگ بلاس"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن بہرحال اس کا مطلب ہے۔ عیش و عشرت۔ سرور و انبساط۔ حظوظ نفسانی۔ رنگ رلیاں۔ جشن و شادمانی۔ لطف زندگانی۔ آنند اور مزہ۔ زندگی کے مزے۔ خواہشات کا پورا کرنا۔ راگ رنگ۔ گانا ناچنا۔ سیر و تماشا۔ کھیل کود۔ لہو و لعب۔ تعیش۔۔۔۔"

زہرہ نے خوب قہقہے لگائے اور کبیر نے کہا "یہ تو خیر ابھی ہم مائیکرو فون ٹیسٹنگ۔ ون ٹو تھری کر رہے ہیں۔ لیکن جب میں باقاعدہ بولنا۔ میرا مطلب ہے لکھوانا۔ یعنی لکھنا شروع کروں گا تو تم ایسے درمیان میں ٹوکو گی نہیں۔ اور اپنے کسی فضول تجسس اور لایعنی اعتراض کو خود تک محدود رکھو

گی۔ یہ سب ٹوکا ٹاکی اس عمل میں کوئی مقام نہیں رکھتی۔"

"اچھا جی"۔ زہرہ نے کہا اور ناپسندیدگی سے سامنے رکھے کاغذوں کو دیکھا جو ایک سخت فولڈر میں جکڑے ہوئے تھے۔ "ویسے تمہارا کیا خیال ہے کبیر یہ لکیر دار کاغذ خواہ مخواہ پابندی نہیں لگاتے لکھنے پر۔ یہاں سے شروع کرو۔ یہاں ختم کرو۔ اگلا پیرا یہاں شروع کرو۔ کاغذ بالکل سفید ہونا چاہیے۔ روانی میں مدد ملتی ہے۔ جہاں سے چاہو شروع کرو۔ جدھر مرضی جاؤ۔"

"بے شک" کبیر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "یہ تمہارا میدان ہے۔ قلم و قرطاس کے انتخاب میں تمہارے اختیارات لامحدود ہیں۔۔۔۔ یہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ قرطاس ابیض۔۔۔۔ یعنی بالکل ابیض۔"

کبیر نے میز کی دراز سے سفید کاغذوں کا ایک دستہ نکالا اور فولڈر میں لگا کر زہرہ کے سامنے رکھ دیا۔ زہرہ نے کاغذ کی ملائم سفید سطح کو سہلایا اور کہا۔ "ہاں۔ ایسا ہی میں چاہتی تھی۔ صاف اور ملائم۔" کبیر نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے ہاتھ اوپر اٹھایا جیسے اُسے کوئی فوری ہدایت دینا چاہتا ہو۔ "اب جب ہم باقاعدہ لکھنا لکھانا شروع کریں گے تو اچانک مجھے خیالات آئیں گے۔ اب دیکھو یا اچانک دو خیالات میرے ذہن میں آئے ہیں جن کا فوری تحفظ بھی متن کے ساتھ ضروری ہوگا۔ تم اس کے لیے الگ جگہیں مخصوص کرو گی۔ جہاں پہلے دوسرے تیسرے اور بعض حالات میں چوتھے درجے کے تحل کرنے والے خیالات فوری محفوظ کیے جائیں گے۔ ڈکٹیشن لیتے وقت تمہیں ان کے لیے الگ کھاتے کھولنے پڑیں گے۔"

"یعنی مجھے چار جگہوں پر بیک وقت لکھنا ہوگا"

"ایک لحاظ سے بیک وقت ایک لحاظ سے نہیں۔ لیکن میں ان دونوں 'لحاظوں' کی فی الحال تشریح نہیں کروں گا۔ کیونکہ عظیم خیالات ذہن سے پھسل رہے ہیں لکھو کہیں۔ لکھو۔ لکھو۔ 'محفوظ'۔"

زہرہ نے دو کاغذ کھینچ کر الگ کیے اور انہیں میز پر الگ الگ پھیلا دیا اور کہا۔

"بولو۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔؟"

"کیا گودنا بھی تحریری عمل کی ہی ایک شکل ہے؟ یہ نمبر ایک ہے۔ نمبر دو کیا تمام تحریری اعمال اصل میں گودنے کے عمل کی ہی مختلف شکلیں نہیں؟ فرق زندہ جسمانی جلد اور زندہ ذہنی جلد میں ہے۔ نمبر تین شعور کے جلدی امراض۔ ایک افسانوی امکان۔" کبیر نے کہا اور زہرہ نے تیزی

Scanned by CamScanner

سے ایک اور کاغذ پھر الگ کیا اور کبیر کا کہا الگ الگ رقم کیا۔ پھر تینوں کاغذوں کے اوپر الگ الگ لکھا اور لکھتے وقت بولی" بک بک نمبر1، بک بک نمبر2 ، بک بک نمبر3......"

"لاجواب۔ بہت عمدہ۔" کبیر نے چہک کر کہا۔

"آگے۔ بھوگ بلاس۔" زہرہ نے شوخی سے کہا۔ "ویسے کیا یہ اتنا ہی کافی نہیں لنگڑے بھوگ بلاس۔"

"بلکہ اب تو لولے بھی نہیں۔ ابھی کچھ دیر۔ ہمارے اس املائی تعلق میں ابھی اور کئی آسن دریافت ہوں گے۔"

"بکواس"

"بھوگ بلاس کا تذکرہ۔ آسنوں کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر میں فقط املائی، اور تحریری آسنوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہاں جی تو ہم کہاں تھے۔ اب.....دیکھو یہ اکثر آیا کرے گا۔" ہاں جی تو ہم کہاں تھے"۔ جب میں تحریری انقباض کا شکار ہو کر۔ یا استدلال کے گونا گوں مصائب کا شکار ہو کر۔ یا نا معلوم کے تحیر کا شکار ہو کر......"

"یعنی شعور کے جلدی امراض کا شکار ہو کر......" زہرہ نے کبیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور کبیر کے چہرے پر وہ مسکراہٹ پھیل گئی جو ان دونوں میں صرف ایک دوسرے کے لیے تھی۔

"آ۔ مجھے تم سے ایسی ہی مداخلت کی توقع تھی۔ اور گو کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارا ایک تعریفی بوسہ لوں۔ لیکن یہ ایک پُر خطر اقدام ہوگا جس سے تعرض ضروری ہے۔ 'تعرض' بھی کبھی لکھو، دیکھوں گا تجھے۔ بہر حال ہاں جی تو ہم کہاں تھے؟"

"ابھی ہم یہیں ہیں۔" زہرہ نے قلم کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ "یعنی تمہارا مطلب ہے۔ یعنی یوں ہوگا کہ لکھتے لکھتے۔ یعنی لکھواتے لکھواتے تم چپ سادھ لو گے اور ذہن پر زور دالو گے یعنی ذہن کی جلد پر......"

"یقیناً۔ یہ لازمی ہوگا۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔ یہ گودنے کے لمحے یقیناً آئیں گے۔ ذہن کی جلد کو گودنے کے........"

"اور ان لمحوں۔ وقفوں کے درمیان میرے لیے کیا حکم ہوگا۔"

"انتظار۔ غیب سے میرے لیے مضامین کی ترسیل کا انتظار۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان وقفوں کے دوران میں جسمانی جلد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کیا کروں........ذرا دل بہلا رہے گا۔"

"ہر گز نہیں" کبیر نے بوکھلا کر کہا۔ "میں تخلیقی و املائی عمل کو اس طرح سبوتاژ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہاں جی تو ہم کہاں تھے......؟"

زہرہ نے قہقہہ لگایا کبیر دار کاغذ کو پلٹا کر دیکھا اور بولی۔ "غالباً 'بیت المقتس' کے کسی بھوگ بلاس حدود دار لیے کی بات تھی۔ ہاں۔ لیکن کا بھوگ بلاس قرار دیا گیا آگے۔" "آگے کچھ لکھوانے کی بجائے کبیر نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور بیس پچیس فٹ دور، نیچے سڑک کی دوسری جانب چائے کی دوکان پر نظریں جمانے کی کوشش کی اور بڑبڑایا "چھوٹا تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ لیکن چائے غالباً بہاری ہی بن رہی ہے۔" پھر وہ زہرہ کی طرف مڑا اور بولا...... "ہاں آگے لکھو......لیکن یہ دانے کر گھونسلے کی آتش زدگی طائر لاہوتی کے اشغال شبیہ وقبیہ پر نازل ہونے والا قہر خداوندی تھا چنداں قرین قیاس نہیں ہے۔ اس لیے داخل دفتر کی جاتی ہے۔ اگلا پیرا۔"

زہرہ نے اپنا ہاتھ کاغذ پر رکھا نیچے کھسکایا اور کہا "ہو گیا"

"اب یہ ضروری نہیں" کبیر نے غیر املائی انداز میں کہا کہ میں ہر دفعہ تمہیں یہ بتاؤں کہ اگلا پیرا۔ بعض اوقات تخیل کی بے نشان پرواز کے دوران اور دلائل و براہین کی کھٹا کھٹ کی روانی کے دوران میں یہ کہنا بھول بھی سکتا ہوں۔ "اگلا پیرا"

"میں سنبھال لوں گی۔ اگلا پیرا۔" زہرہ نے کہا۔

"ہاں اگلا پیرا۔ تحریری وقفہ سازی بھی ایک طرح کی حساسیت ہی ہے۔" کبیر نے کہا اور زہرہ نے یہی لکھا اور کہا۔ "کیا بکواس ہے"۔ "نہیں یہ میں لکھوا نہیں رہا" کبیر نے کچھ کہنا چاہا مگر زہرہ نے اُس کی بات کاٹی "کیا فرق پڑتا ہے۔"

"یقیناً کچھ فرق نہیں پڑتا۔" کبیر نے کہا اور دونوں ہنسے پھر کبیر نے کہا "املائی ٹیسٹنگ۔ ون۔ ٹو۔ تھری...... ہاں جی تو ہم کہاں تھے۔ ہاں 'بیت المقتس' کی مکانی حدود کا تعین ہو چکا اب ہم اس تعمیر کی زمانی تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔"

زہرہ کا قلم تیزی سے کاغذ کی سطح پر دوڑ پڑا اور اس نے کہا "آہستہ بولو میں بہری نہیں ہوں" اور کبیر نے ہونٹوں کو ایسے حرکت دی جیسے لفظوں کو ایک ایک کر کے اُگل رہا ہو۔ "بیت المقتس کی

Scanned by CamScanner

قبر، آمادۂ فروخت و آپ کے مطلوبہ ثبت تاریخ حاصل ہونے کے جلد بعد ہی کر دیا گیا۔ تخلیق زمانی کے اعتبار سے یہ واقعہ دور ہے جب ایک عمارت یادار ہاؤس موسوم کا مقدمہ برائے حقوق ملکیت و قبضہ مدعیہ زہرہ یادار کی جانب سے عدالت ذی وقار میں پیش کیا گیا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ بیت النفس کی تعمیر کی تکمیل اور مقدمہ ہذا کا فیصلہ بحق مدعیہ بھی معاصر واقعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز یادار ہاؤس کا تملیک نامہ مدعیہ کے سپرد کیا گیا اور ممتاز رہائشی کے مدعا علیہ عزیزی و مجی امیر جان نے مغلوب الغضب ہو کر سماعت زہرہ کے قریبی ساتھی کو مستقل قریب یا بعید میں دردناک موت سے دوچار کرنے کا سندیسہ دیا اسی روز......"

کبیر نے دیکھا کہ زہرہ نے اپنے سر کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے سہارا دیا ہوا ہے، کہنی میز پر ٹکی ہے، دایاں بازو آدھا میز اور آدھا کاغذ کے فولڈر پر پھیلا ہے اور بجلی لیمپ کی روشنی میں صرف اس کی تین انگلیاں اور انگلیوں میں دبا قلم متحرک نظر آتا ہے۔ اس کا چہرہ اور سارا جسم کسی شدید تناؤ کی گرفت میں ہیں۔

"میرا خیال ہے آج کی اتنی ہی مشق کافی ہے۔" کبیر نے کہا۔

زہرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"مشکل، بلکہ مشکل ترین الفاظ کی اتنی ہی املائی بک بک کافی ہے"۔

زہرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اب ہم مائیکروفون ٹیسٹنگ ون ٹو تھری کی مشق عام فہم زبان میں جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں جی تو ہم کہاں تھے...... ہاں اسی روز "بیت النفس" کے مالک امداد حسین نے طائرِ لاہوتی کو اپنے آشیانے کا رنگ روغن چیک کرنے کی دعوت دی۔ بیت النفس میں طائرِ لاہوتی کی منتقلی اور یادار ہاؤس میں زہرہ کی منتقلی البتہ ایک ہی روز انجام نہ پا سکی اور اس کی کوئی کوشش بھی نہ کی گئی کہ لایعنی...... میں خود یہ لفظ اکثر لکھنا بھول جاتا ہوں۔ یعنی لایعنی کے ہجے بھول جاتا ہوں۔ لکھو فوری...... مداخلتی خیال...... تحریری نسیان کیا ہے؟ یعنی لکھنے والے......؟"

زہرہ نے تیزی سے ایک دوسرے کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا اور کبیر بولتا رہا...... "بعض

اوقات اچھے بھلے معلوم و معروف الفاظ کے ہجے بھول جاتے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔ واپسی اصل متن...... ایک منٹ۔ نہیں۔ لکھو لکھو۔ مداخلتی خیال۔ نہیں مداخلتی بازیافت...... متن سے مجھے کیا یاد آتا ہے۔ سرخیاں اور متن۔ یہ کب ہوا۔ خیر چھوڑو۔ اس پر ہم پھر بات کریں گے۔ لیکن لکھوانے کی مائیکروفون ٹیسٹنگ ون۔ ٹو۔ تھری میں سرخیاں اور متن کی تکنیک کی املائی مشق بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن جانے آنے تک یہ مشق ختم ہو جانی چاہیے...... میرا مشورہ ہے کہ اسی طرح ایک ہی زاویے میں بیٹھے بیٹھے لکھتے رہنے سے تم تھک جایا کرو گی۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔ لکھائی کے عمل کے دوران جسمانی حالتیں کیسی ہونی چاہئیں۔ جسم ساکن بھی رہنا چاہیے مگر متحرک بھی ہونا چاہیے۔ یعنی غیر تحریری انداز میں بھی متحرک ہونا چاہیے تاکہ تھکن وارد نہ ہو۔ اس حوالے سے بھی سائنس بہت ترقی کر چکی ہے...... بہر حال...... ہاں جی تو ہم کہاں تھے لکھو سرخی کیا کہنا چاہیے سرخی لگاؤ۔ متن جماؤ...... سرخی لگاؤ۔ بیت النفس کی تاریخ۔ متن...... بیت النفس...... پیچھے لکھو۔ کچھ جگہ چھوڑ کر تاکہ سرخی اور متن الگ الگ نظر آئیں۔ سرخی متن کو مختصر کرتی ہے۔ جب کہ متن سرخی کو مفصل کرتا ہے۔ سرخی ایک سکڑی ہوئی توقع ہے جو متن کی طوالت بڑھنے کے ساتھ ساتھ پوری ہوتی جاتی ہے۔ سرخی سے متن۔ حالتِ انتشار سے حالتِ امتداد۔ مختصر اور سکڑا ہوا وجود جب درازی، طوالت اور ایستادگی اختیار کرتا ہے۔ سرخی لگاؤ۔ متن جماؤ۔ سرخی لگاؤ...... بیت النفس کی زمانی تاریخ...... متن جماؤ۔ کبیر مہدی عرف طائرِ لاہوتی۔ عرف ع سے الف سے نہیں۔ طائر۔ ط سے۔ ت سے نہیں کبیر مہدی عرف طائرِ لاہوتی کی بیت النفس میں منتقلی ایک اور زمانی حوالے سے بھی گہری دلچسپی کی حامل ہے۔ حامل۔ ح۔ حتے والی۔ یہی حروف زیادہ مغالطے پیدا کرتے ہیں۔ ح۔ ہ۔ ا۔ ع۔ س۔ ص۔ ث۔ ز۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ ط۔ ت۔ ک۔ ق...... یہ بھی لکھ رہی ہو خوب......؟"

کبیر نے کہا اور دیکھا کہ زہرہ کا ہاتھ اب ایک میکانکی انداز میں سفید کاغذ پر مسلسل نشان ڈالتا جا رہا ہے۔

"خوب" اس نے کہا۔

"خوب" زہرہ نے نشان بنایا۔

"ہاں جی تو ہم کہاں تھے۔ مجھے خوشی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے ذہن کے اندر پہنچے

Scanned by CamScanner

والے اُبال کو۔ کیا کہنا چاہیے مواد کو..... لعنت۔ اس سے تو پھوڑے کا مواد ذہن میں آتا ہے۔ خیالات کو۔ ہاں..... مداخلتی خیال نمبر ۱۔ خیالات اور ذہنی جلدی امراض سلسلہ نمبر ۲۔ کیا خیالات ذہنی پھوڑوں کے مواد ہیں واپسی متن۔ سرخی۔ بیت التفکس کی زمانی تاریخ..... زرد سانپ۔ کیچڑ میں جکڑی کرسیاں اور میزیں واپسی متن۔ بیت التفکس کی تاریخ کا آخری واقعہ یعنی طائر لاہوتی کی اپنے سابقہ خاکستر شدہ گھونسلے کی تعمیر نو میں منتقلی کا واقعہ اور اسی دور میں رُونما ہونے والا ایک دوسرا واقعہ بلکہ سنگین واقعہ ہم عمر ہیں۔ اور یہ واقعہ دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر ناصر کی بڑے شہر میں ذلت و رسوائی کا واقعہ ہے.......''

کبیر آگے بڑھ کر زہرہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اُس نے اُس کے قلم کو بے لگام سفید کاغذی میدان میں بھاگتے دیکھا اور گہرا سانس لیا۔ لیمپ کی گرم روشنی زہرہ کے بالوں میں سے اُس کے جسم اور شیمپو کی خوشبو کو آزاد کر رہی تھی۔ کبیر کے جسم میں جانے پہچانے اضطراب کی جھرجھری دوڑ گئی اور تیزی سے پیچھے ہٹ کر اُس نے کہا۔

''مجھے یقین ہے تمہارا ہاتھ میرے ذہن کو اتنی ہی عمدگی سے۔ اتنی ہی صفائی سے اتنی ہی وابستگی سے۔ اتنی ہی محنت سے کاغذ پر منتقل کرے گا جتنا کہ کبھی یہ ناکارہ لولا ہاتھ منتقل کرتا تھا۔ بہرحال یہ تو ایک جملہ...... بلکہ جملہ ہائے معترضہ تھے۔ ہم آگے چلتے ہیں...... ویسے میرا خیال ہے چھلا ابھی ابھی چائے کی ٹرے لے کر دوکان سے نکلا ہے۔ اب ہم تیزی سے ڈکٹیشن کی مشق کریں گے! واپسی متن..... جس روز کبیر بیت التفکس میں منتقل ہوا اسی روز بڑے شہر کے ایک ہسپتال کے سائیکیاٹری وارڈ میں ایک جونیئر ڈاکٹر۔ ڈاکٹر ناصر نے اپنی ایک ہیرا ناپیڈ مریضہ پر جنسی تشدد کیا..... سرخی لگاؤ۔ ذہنی مریضہ پر ڈاکٹر کا جنسی تشدد۔ متن جماؤ۔ بڑا شہر (وقائع نگار خصوصی) مقامی ہسپتال کے شعبہ امراضِ دماغی میں زیرِ علاج ایک مریضہ ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کی ہوس کا نشانہ بن گئی۔ تفصیلات کے مطابق یہ شرمناک واقعہ گذشتہ رات ملزم جس کا نام ڈاکٹر ناصر بتایا جاتا ہے کی نائٹ ڈیوٹی کے دوران پیش آیا۔ واقعہ کی عینی شاہد نرس مختار بیگم کے بیان کے مطابق رات دو بجے کے قریب وہ کچھ ادویات کے بارے میں ڈاکٹر ناصر سے ہدایات لینے گئی تو اُسے اپنے کیبن میں موجود نہ پا کر اُس نے ڈاکٹر کو وارڈ میں اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اسی دوران اُس کو وارڈ روب میں سے کچھ آوازیں آتی سنائی دیں۔ اندر جانے پر نرس نے ڈاکٹر کو گندی

چادروں کے ایک ڈھیر پر مریضہ کے ساتھ گھناؤنے فعل کا ارتکاب کرتے دیکھا۔ نرس کے شور مچانے پر ڈیوٹی پر موجود نچلے سٹاف نے ڈاکٹر کو قابو کر لیا۔ اور بعد میں معاملہ ہسپتال کی اعلیٰ انتظامیہ کے علم میں لانے کے بعد ملزم کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس دردناک واقعہ نے عوامی اور طبی حلقوں میں گہرے اضطراب کی لہر دوڑا دی ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ طب کے مقدس پیشے کی پامالی پر ملعون ڈاکٹر کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ نیا پیرا۔'' کبیر نے کہا۔

زہرہ کا ہاتھ رک گیا اور اس کی انگلیاں اور انگلیوں میں تھاما ہوا قلم جیسے سب کچھ پتھر کا ہو گیا ہو۔ پھر اُسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم بھی پتھرا رہا ہے اور سانس بھاری اور بوجھل آ رہا ہے اور زکنے کو ہے اور وہ ایک غارت کر دینے والے لمحے کی گرفت میں ہے جس کا خالق وہ شخص ہے جس کی کہی ہوئی آواز کو وہ کاغذوں پر کسی فرق کے بغیر سب کے متعین لفظی نشانوں کی صورت میں کھینچتی جا رہی ہے اُتارتی جا رہی ہے۔

''نیا پیرا'' کبیر نے پھر کہا اور پھر زہرہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اُسے اُس کے جسم کی خوشبو چند لمحوں پہلے کی خوشبو سے بہت مختلف لگی۔ اور اُس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا ''مداخلتی خیال جو بھی نمبر ہو...... جسم کے اندر جاگنے والا ہر اضطراب اپنی الگ خوشبو رکھتا ہے۔ انسان بھی اگر کتوں جیسی۔ کم از کم کتوں جیسی قوتِ شامہ رکھتا تو انسانی دنیا کے معاملات کس قدر آسان ہو جاتے یا کس قدر مختلف ہو جاتے۔ سوالیہ نشان...... واپسی متن......''

زہرہ کا ہاتھ بھاری پتھر کی طرح نپے تُلے کام جیسے کسی نے اختیار کردہ پیشے کے معیار پر پورا اُترنے کے اولائی تقاضے کے ساتھ اُس نے وہ جو کچھ کبیر بول چکا تھا اپنی یادداشت میں سے نکال کر بہت تیزی سے کاغذ پر محفوظ کیا۔ اور پھر کبیر کے کہے کو حال کے ناممکن حد تک مختصر لمحے میں جا پکڑا۔ اور کبیر نے مسکرا کر کہا۔

''میرا خیال ہے مجھے ساتھ ساتھ کہیں کہیں یہ پوچھتے جانا چاہیے۔ لکھ لیا۔'' اور زہرہ نے لکھا 'لکھ لیا' اور کبیر ہنس پڑا اور زہرہ نے ایک اشتعال کے ساتھ سوچا اس شخص کی آواز جو کہ ہنسی ہے اور ہنسی کوئی لفظ نہیں ہے اور یہ لکھی نہیں جائے گی۔ لکھی نہیں جا سکتی...... وہ اس کے اگلے اگلے لفظ کا انتظار کرنے لگی اور یہ انتظار تھے کے مریض پر مرض کے اگلے حملے کا انتظار تھا۔

''مصدقہ ذرائع کے مطابق ملزم شروع سے ہی مشکوک چال چلن کا مالک رہا ہے۔ ہاؤس

Scanned by CamScanner

جاب کے دوران بھی اُس نے مریضوں کی تیمار دار خواتین میں اپنی نازیبا دلچسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ماضی میں شہر کے اعلیٰ طبقے میں مخصوص شہرت کے مالک ایک مرحوم طبیب کی بیٹی کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے جسے ڈاکٹر مذکور سے خصوصی قربت حاصل رہی ہے۔ ذرائع کے مطابق ڈاکٹر ناصر نے عرصے تک اپنے بعض دوستوں سمیت جن میں کچھ غیر ملکی بھی شامل ہیں سائیکیاٹری وارڈ کو اوباشی دیئے کے اڈے کے طور پر استعمال کیے رکھا۔ اخلاقی گراوٹ اور مجرمانہ جنسی سرگرمیوں کے علاوہ ڈاکٹر کچھ سنگین نوعیت کی پیشہ ورانہ بداعتدالیوں کا مرتکب بھی ہوتا رہا۔ اس ضمن میں ایک مریض کا حوالہ دیا جاتا ہے جو کسی ذہنی مرض کا شکار ہو کر قوتِ گویائی سے محروم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ناصر نے اُس مریض کو اپنے دوستوں کی مدد سے اغوا کر کے غلام باغ کے تہہ خانوں میں پہنچا دیا۔ جو حالیہ سیلابوں میں منہدم ہو چکے ہیں۔ ذرائع کے مطابق بدقسمت مریض کو کسی نامعلوم تشدد اور منشیات کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں جب اس کی حالت بہت بگڑ گئی تو اسے واپس ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس حوالے سے جب ہسپتال کی انتظامیہ سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے اس واقعہ کو سراسر من گھڑت قرار دیا۔ مگر ذرائع اپنے موقف کی صحت پر مصر ہیں۔ اور باور کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا محرک بھی دراصل ملزم اور اس کے دوستوں کی جنسی کجروی پر مبنی کوئی شیطانی رسم تھی۔ غالباً انتظامیہ اس ضمن میں پردہ پوشی سے کام لے رہی ہے۔ ذہنی مریضہ کی حالیہ عصمت دری کا واقعہ بہرحال اتنا ظاہر ہو رہا ہے کہ انتظامیہ کے لیے ملزم کے گھناؤنے کردار پر مزید پردہ ڈالنا ممکن نہیں نرس مختار بیگم نے مزید بتایا......"

"بند کرو یہ بکواس۔ بند کرو۔ بند کرو۔ بند کرو۔ چپ کرو۔ چپ کرو۔ مت بولو۔ مت بولو......ورنہ۔ ورنہ............ تمہاری اِس لفظوں کی قے پر میں قے کر دوں گی...... میں ق......"

زہرہ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اُٹھی تو کاغذوں کا فولڈر، سفید کاغذ لکیر دار کاغذ۔ متن، مداخلتی خیالات نمبر1، نمبر2، نمبر3۔ کالی سیاہی کا پین۔ بال پین سب فرش پر گر کر ہر طرف پھیل گئے۔ پھر وہ اپنے اندر کے ابکائی کو ٹھکانے لگانے کے لیے بہت مشکل سے کمرے کے کونے میں بنے ایک مختصر سے غسل خانے تک پہنچ سکی۔ کبیر بے حس و حرکت کھڑا اُسے دیکھتا اور سنتا رہا۔ جیسے کوئی شخص کسی اچانک رونما ہونے والے واقعے پر کسی بھی ردعمل کا اظہار نہیں کر پاتا اور سن سا ہو

جاتا ہے۔

زہرہ واپس آئی تو کچھ دیکھے بغیر فرش پر بکھرے کاغذوں پر پاؤں دھرتی اور قلموں کو کچلتی آئی اور ایک کرسی میں بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ کبیر کے جی میں آیا کہ پوچھے کہ "کیا ہوا" مگر پھر اپنے اس سوال کی واضح لایعنیت نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ زہرہ کے ساتھ کیا ہوا۔ کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب دوسرے کی بہترین مدد بھی ہوتی ہے کہ اُس کی کوئی مدد نہ کی جائے اور خاموشی سے ایسے لمحات کی خاموشی برقرار رکھنے کا حق دوسرے کو دے دیا جائے۔

"کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ ناصر نے ایسا ہی کیا۔ جیسا تم...... کہہ...... رہے تھے...... بول رہے تھے......" بالآخر زہرہ نے کہا۔

"نہیں میں ایسا نہیں سمجھتا۔ نہیں۔ یہ تو وہ فلاں اخباری رپورٹنگ تھی جو......"

"تو پھر"

"تو پھر بھی وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کیا تم ابھی تک سمجھی نہیں۔ کوئی واقعہ نہ تھا۔ نہ کوئی بیان تھا۔ نہ کوئی تاثر۔ کچھ بھی نہیں۔ تم جانتی ہو۔"

"جانتی ہوں۔ مگر تم فضول بکواس کر رہے ہو۔ مائیکروفون ٹیسٹنگ ون۔ ٹو۔ تھری میں بھی کوئی گالیاں نہیں بکتا۔ اور یہ کیا ضروری تھا کہ تم اس ڈکٹیشن لینے دینے کے ڈھکوسلے میں اپنے ہی، اپنی ہی زندگیوں کے واقعات گھسیٹتے بیٹھ جاؤ۔"

"ڈھکوسلا۔ یہ لفظ آج کے اِس عمل کو ہی نہیں میری پوری زندگی کو کتنے کامل انداز میں سمیٹ لیتا ہے" کبیر زیرِ لب بڑبڑایا۔

"کیا؟"

"کچھ نہیں شاید یہ قریب ترین اور آسان ترین مصرف یک بیک تھی جو میں بے تکان کر سکتا تھا۔ کچھ نہ کچھ بولتے جانے۔ لکھواتے جانے اور تمہارے لکھتے جانے کے لیے...... جی بولیں جی۔ ٹیپ ریکارڈ آن ہے۔ بولیں۔ بولیں۔ کچھ بھی بول دیں۔ آپ کی تحریر چیک کرنی ہے۔"

"کیا ایسی روانی تمہاری اس وقت بھی برقرار رہے گی جب تم اپنے اصل کام کے پہلے...... کہرا۔ پہلے باب کا پہلا پیراگراف لکھوانا چاہو گے۔ مجھے۔ جب میں وہیں۔ اس جگہ...... وہاں

Scanned by CamScanner

بیٹھی ہوں گی۔ منتظر۔ قلم لیے۔ کاغذ لیے۔ منتظر..... تمہارے عظیم خیالات کی آواز سننے کے لیے منتظر.....''

خنکی کی ایک لہر کبیر کے جسم میں دوڑ گئی اور اُسے محسوس ہوا کہ اس کا لکھنے والا ہاتھ اور جو اب لکھنے سے معذور ہے کپکپا رہا ہے۔ اُس نے اُسے جلدی سے پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور نیچے بستر کے کنارے پر بیٹھ کر کمرے میں چاروں طرف بکھری پرانی کتابوں کی نئی قطاروں کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا اور کہا۔

''میر اور بارہ کا اصل کام ہے۔ اور روانی۔ فراوانی۔ ہذیانی۔ نادانی۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم خود دیکھ لوگی۔ اب تو تم خود دیکھ لوگی...... وقت آنے پر...... مگر یہ جو ناصر کے المیے کا تذکرہ سرزد ہو گیا۔ وہ اخباری گندگی جو اُس پر اچھالی گئی تو...... میرا خیال ہے یہ سب سُرخیاں اور متن! کا کیا دھرا ہے۔ جو مجھے ناصر کے واقعے کی اخباری سرخیوں اور متن کی طرف لے گیا۔ سُرخیاں اور متن''

''سُرخیاں اور متن؟''

کبیر خاموش ہو گیا اور اُس نے دیکھا کہ زہرہ تو پہلے ہی کہیں دور پیچھے جا چکی ہے۔ اور اس کے چہرے پر لمحۂ حال کی اکائی کا اذیت ناک تناؤ ختم ہو چکا ہے اور اُس کی آنکھوں میں ماضی کی اُداس دھندلاہٹ ہے۔

''ہاں یاد ہے'' زہرہ کی آواز جیسے ماضی کی تھکن سے بوجھل تھی۔ ''اُس وقت بھی تم شاید کچھ وقت۔ تاریخ۔ تاریخ کی سُرخیوں کے عذاب میں تھے۔ جو تم نے شاید..... اپنے اس انداز میں...... ہوا اور شام...... میرے خدا کیسی سُرخ شام تھی وہ..... تم نے سُرخیاں دے دی تھیں۔ تاریخ کی..... میرے ذہن میں وہ خوفناک جناتی پودے ہیں اور اُن میں پیچھے مرا پڑا کہیں کہیں ڈھانچہ بنا زرد سانپ اور مہین کیڑوں کا بادل..... اور ناصر جو خوش نہیں تھا...... اور شاید ہم سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر تم مُصر تھے کہ تم تاریخ اور سرخیوں پر اپنی بک بک ضرور کرو گے۔ اور تم نے ایسا ہی کیا.....''

''نہیں میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ تم بھول رہی ہو۔ میں نے اس سرخیوں اور متن کی بک بک کو مستقبل کے کسی لمحے تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ.......''

''ہاں'' یک دم زہرہ نے گہری اُداسی سے کہا ''تم نے کہا تھا کہ کچھ وقت جگہوں کو برباد کرتے ہیں اور کچھ جگہیں وقت کو برباد کرتی ہیں۔ اور میں نے پوچھا تھا......''

''تم نے پوچھا تھا گو کہ اُنہیں الفاظ میں نہیں پوچھا تھا کہ..... جب تم پھر کبھی مستقبل میں جو اُس وقت حال ہوگا۔ اب تک کے لمحے کی جو اُس وقت ماضی ہوگا کی تاریخ کو موٹی موٹی سرخیوں میں بتاؤ گے تو وہ لمحہ۔ یعنی یہ لمحہ..... یہ جو ابھی گزر گیا۔ مگر پھر بھی ہے اور پھر گزر گیا مگر پھر بھی ہے..... اس لمحے میں جبکہ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اور تم ابھی ابھی ناصر کی ابتلا پر بھاری رنج کر چکی ہو اور اس غلیظ اخباری رپورٹنگ پر۔ اُس کراہت انگیز جھوٹ کے پلندے پر اور اُس بے پناہ ذلت و رسوائی پر جس کا سامنا اُس شخص کو کرنا پڑا۔ ناحق پاگل کر دینے والی ناانصافی کے ساتھ..... تے کر چکی ہو۔ تو اُس لمحے کا وقت کیسا ہوگا۔ جگہوں کو برباد کر دینے والا ہوگا یا وہ جگہ وقت کو برباد کر دینے والی ہوگی... بیت العکس کیفے غلام باغ کے اندر کے مردہ سانپ کی دنیا کے ساتھ جاتا ہے یا باہر کی خشک کیچڑ میں منجمد کرمچھوں میزوں کی دنیا کے ساتھ جاتا ہے۔ اور یہ وقت کیا سڑتے ہوئے آٹے میں کلبلاتے لاکھوں کیڑوں کی مجنونانہ زرزناہٹ سے بھرا ہے یا یہ اُس ہوا سے اور ہوا میں پھیلی اُس شام کی روشنی سے بھرا ہے جو خون جیسی شفق سے پھوٹ کر آتی ہے......''

دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز نے زمان و مکان کی بربادی کا طلسم توڑ دیا۔ وہ طلسم جو کبیر کے منہ سے نکلے لفظوں کی روانی نے قائم کیا تھا۔ اَن لکھے الفاظ بھی فرش پر بکھرے لکھے کاغذوں کی طرح بکھر گئے۔ کبیر اور زہرہ یک لخت جیسے اپنے آپ میں آ گئے۔ دستک پھر سنائی دی اور کبیر نے کہا ''آؤ''

چھلا اپنی دائیں ہتھیلی پر چائے کی ٹرے رکھے کمرے کے اندر آ گیا۔ پھر اُس نے فرش پر بکھرے بے شمار کاغذوں کو دیکھا تو ٹھٹھک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

''آ جاؤ چھلے۔ آگے آ جاؤ... کوئی بات نہیں۔'' کبیر نے اُسے حوصلہ دیا کہ وہ کاغذوں کو روندتا ہوا آگے بڑھ سکتا ہے۔ مگر چھلے نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے ٹرے کو وہیں دروازے کے پاس رکھ دیا اور کہا ''نہیں جی''

''کیوں؟'' کبیر نے پوچھا

''بزرگوں کی ہدایت ہے جی کاغذوں کے اوپر کبھی پاؤں نہیں دھرتے۔ ان پر پاک نام لکھے

Scanned by CamScanner

ہوتے ہیں۔"

"لیکن ان پر بہت ناپاک اور گندی چیزیں بھی لکھی ہوتی ہیں" کبیر نے کہا

"مجھے کیا پتہ جی میں تو پڑھا لکھا نہیں جی" چھلے نے آسانی سے کبیر کی دلیل رد کی اور نیچے جھک کر تیزی سے کاغذ چننے لگا۔ کبیر اور زہرہ نے ایک دوسرے کی طرف ایک نایاب تفہیم کی نظر سے دیکھا اور چھلے کے ساتھ کام میں شامل ہو گئے۔

"لکھے ہوئے لفظ کی حرمت کا احساس اسی کو ہو سکتا ہے جو خود پڑھا لکھا نہ ہو"

کبیر نے کہا اور کاغذ، ایک ٹوٹا ہوا بال پین اور کچھ دوسرے قلم سب کچھ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ چھلے نے چائے کی ٹرے بھی اسی لکھنے والی میز پر رکھ دی۔ کبیر نے ٹرے پر بنے گھسے ہوئے رنگین پھولوں کے نیچے جھانکتی دھاتی سطح کو تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت دیر لگا دی تم نے چائے میں۔"

"نہیں جی۔ میں تو فوراً ہی آ گیا ہوں۔ آپ کی آواز پڑتے ہی" سیدھے کھڑے۔ دبلے پتلے لمبوترے چھلے نے جو خود بھی ایک عظیم القامت انگشتِ شہادت جیسا نظر آتا تھا پھر کبیر کی بات کی تردید کر دی اور کبیر اور زہرہ نے پھر ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"چھلے کا وقت کچھ اور ہے اور ہمارا وقت کچھ اور ہے" کبیر نے کہا اور چھلے نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "بالکل جی" اس اچانک تائید پر گہرے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کبیر نے اس کی بات آگے سنی "نیچے چاچا امداد بھی کہہ رہا تھا کہ وقت بہت نازک ہے۔" زہرہ بے ساختہ ہنس پڑی تو چھلے نے لہرا کر گھبرا کر کبیر کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں۔ تم بات کرو۔ چاچا امداد کیا کہہ رہا تھا۔"

"وہ جی چاچا امداد نیچے بیٹھا ہے جی اس نے کہیں جانا بھی ہے۔ بم پر کہیں پہنچنا ہے۔ پر اس نے اوپر بھی آنا ہے آپ سے کوئی بات کرنی ہے اس کا بم جا رہا ہے۔ اسی لیے شاید وہ کہہ رہا تھا۔ وقت بڑا نازک ہو رہا ہے۔"

"تو وہ آتا کیوں نہیں۔ کیوں وقت کو نازک کرتا جا رہا ہے" کبیر نے حیرت سے پوچھا تو چھلے نے جھلتی نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھا جو چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ملائیوں والی چائے میں ملائی تو کہیں بھی نہیں۔

"وہ بیگم صاحب آئی ہوئی ہیں ناں" چھلے نے کھلی رازداری کے انداز میں کہا اور چشم زدن میں زہرہ اس کیفیت میں چلی گئی جب شرورات سے لطف اندوز ہوتے لوگوں کو اچانک ہنسی آن لیتی ہے۔ سختی سے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے سامنے اس نے تیزی سے ہاتھ رکھا تو اس کے حلق سے 'ہموم' کی بلند آواز برآمد ہوئی جس پر چھلا بری طرح گھبرا گیا۔ کبیر نے اٹھ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تم جاؤ امداد حسین صاحب سے کہو۔ جب چاہیں آ جائیں۔"

چھلے کے جانے کے بعد زہرہ نے بمشکل تمام منہ میں گرم چائے کا گھونٹ لگا اور پھر دونوں نے 'بیگم صاحب آئی ہوئی ہیں' پر خوب قہقہے لگائے۔

"دنیا تمہارے بارے میں کیا فیصلے دیتی ہے اس پر تمہارا کچھ اختیار نہیں" آخر کبیر نے کہا

"دنیا کے فیصلے تسلیم کر لینے سے زندگی آسان نہیں ہو جاتی کیا۔"

"ہاں جنہیں آسانی کی ہوس ہو ان کے لیے یقیناً بیگم صاحب"

زہرہ کی ہنسی اب زہر آلود تھی۔ "ویسے مجھے اس لفظ سے ہمیشہ سے نفرت رہی ہے۔ 'بیگم صاحب' یہ مجھے میری ماں کی یاد دلاتا ہے۔"

"تمہارا اور تمہاری ماں کا تعلق ایک معمہ ہے۔"

"غلام باغ کا معمہ" اچانک زہرہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور ایک افسردہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"آہ...... مجھے ہاف مین کی یاد آتی ہے اور دل پر ایک چھری سی چل جاتی ہے...... وہ کس قدر گہرا میرے ساتھ۔ ہمارے ساتھ چلا گیا تھا۔" کبیر نے کہا۔

"مگر وہ رکا نہیں"

"تمہیں یاد ہے میں نے اسے کہا تھا میں غلام باغ کی تاریخ دوبارہ لکھوں گا"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ اسی آخری رات..... تم نے اسے کہا تھا" زہرہ کی آواز میں لرزش تھی۔

"کتنی ہی آخری راتیں آئیں اور گزر گئیں"

"اس آخری رات تم 'دوبارہ' کی گرفت میں تھے"

"کیا اب نہیں ہوں؟" کبیر نے کہا اور اچانک اپنے دائیں ہاتھ کو سامنے اپنی نظروں کے

Scanned by CamScanner

برابر لا کر ساکن کر دیا۔ پھر اس نے انگلیوں کو ایسے حرکت دی جیسے مٹھی بھینچ رہا ہو اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "جن لوگوں کے لکھنے والے ہاتھ کسی حادثے میں کٹ جاتے ہیں وہ دوسرے ہاتھ سے لکھنا سیکھ لیتے ہیں۔ یہ صرف عضلات کی ٹریننگ کی بات ہے۔ میرا خیال ہے دو تین ماہ میں دوسرا ہاتھ رواں ہو جائے گا۔"

زہرہ نے اداسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تو میرا تمہارے ساتھ ساتھ تمہارا لکھوایا لکھنے جانے کا تجربہ کامیاب نہیں رہا۔"

"نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ وہ تو تجربے سے زیادہ ایک کھیل تھا۔ اور کھیل کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ ہاں کھلاڑی ناکام ہو سکتے ہیں۔ مگر اصل تجربہ تو اس وقت شروع ہوگا جب ہم بیٹھیں گے۔ وہی جو تم نے کہا تھا...... میری روانی کو چیلنج کرتے ہوئے۔"

"کیا؟"

"پہلا باب۔ پہلا پیراگراف پہلی لائن"

"کب"

"بہت جلد"

"ہم ناصر سے ملنے کب جائیں گے؟"

"اگلی جمعرات کو۔ تین بجے۔ میں نے ملاقات کا وقت لے لیا ہے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ پرانا تعلق نکل آیا۔"

"اگلی جمعرات کو۔ تین بجے۔" زہرہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"میں اب اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔ کیا کہنا ہے اُس نے امداد حسین نے۔ آئی نہیں رہا۔ بیگم صاحبہ کے خوف سے..... ادھر وقت نازک ہوتا جا رہا ہے...... اچھا اب وہ لوگ.....؟ آج کل.....؟ تمہاری ماں اور بھائی لوگ؟"

"میرے لیے عاق نامہ تیار کروا رہے ہیں۔ ان کا وکیل آیا تھا میرے کچھ دستخط لینے۔"

"آہ..... دنیا کا ایک اور فیصلہ۔"

"مگر یہ بھی زندگی کو آسان بنا دے گا۔ اگرچہ میں آسانی کی ہوس کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"آزادی؟"

"پتہ نہیں۔ شاید۔ اچھا ہوگا ایک مردہ تعلق کو سرکاری طور پر مردہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ ویسے نہیں خوف ہے میں یادر ہاؤس کے بعد اور جائداد کی طرف بھی ہاتھ نہ بڑھا دوں۔ اب یہ مخمصہ ختم ہو تو میں انعام گڑھ جاؤں گی۔"

کبیر بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی سے باہر شروع دوپہر کی دھوپ کو دیکھ کر بے یقینی سے بولا وقت واقعی نازک ہو رہا ہے۔"..... زہرہ نے اس کی بات پر کچھ بھی نہ کہا تو پھر اس نے کہا "کبھی میں کہتا تھا۔ ہم بارش کے موسم میں انعام گڑھ جائیں گے مگر پھر بارش آئی اور سب کچھ بہا کر لے گئی۔"

"میں اکیلی جاؤں گی۔"

"کبھی ناصر تمہیں عشق میں جیتنے کے لیے انعام گڑھ گیا تھا تمہارے لیے معلومات ڈھونڈ کر لایا تھا۔"

"ناصر کے بارے میں ایسی باتیں مت کرو۔"

"کیا کیا باتیں نہیں ہو چکیں۔ یہ کوئی بڑی بات ہے۔"

"وقت بچھڑوں کو ہی نہیں باتوں کو بھی برباد کر دیتا ہے۔"

کبیر نے ایک ٹھہری ہوئی خوفزدگی سے زہرہ کی طرف دیکھا۔ سورج کی روشنی اب ایک مستطیل کی شکل میں اس کے لباس پر اتر رہی تھی اور کمرے کی بھوری، ملیالی، بدرنگ فضا میں رنگ نمایاں ہو رہے تھے۔

"ہم انعام گڑھ جائیں گے۔" کبیر نے کہا۔

"کیا یہ ضروری ہے جہاں میں جاؤں وہاں تم بھی جاؤ..... میری..... حفاظت کے لیے۔" اور کبیر ہنس پڑا۔ "کیا تم مجھے اس قدر احمق سمجھتی ہو۔ یہ تو اشتراک کی بات ہے۔"

"یہ کیسا اشتراک ہے۔ کیا ہم اسے سمجھتے ہیں؟"

"نہیں ہم اسے نہیں سمجھتے مگر یہ بات کہ ہم اسے نہیں سمجھتے۔ یہ بات مجھے پریشان نہیں کرتی کیا تمہیں کرتی ہے؟"

"ہاں۔ کبھی....."

Scanned by CamScanner

''تو کوئی بات نہیں۔ پریشانی کو بھی ساتھ چلنے دو۔ پریشانی کو سمجھنے کی کوشش اور بھی پریشان کرتی ہے۔''

''وہی تمہاری کبیر مہدی کی باتیں'' زہرہ نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں باتوں کی اب...... عشق پر اب باتوں کی...... عشق پر اور ناممکن مکالموں کی ہمت نہیں اب''

''مجھ میں بھی اس کی ہمت نہیں اب''

''بس اسی بے بسی کا اشتراک ہے'' کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے دونوں ہاتھ زہرہ کی طرف پھیلائے اور وہ انہیں تھام کر اس کے قریب سامنے اٹھ آئی۔ روشنی کی مستطیل کا ایک کونا اب اس کے آدھے چہرے کو روشن کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ کبیر کی آنکھوں میں الٹا عکس بنا رہا ہے۔

''میرا چہرہ آدھا روشن ہے آدھا تاریک تمہاری آنکھوں کے عکس میں'' اس نے کہا۔

کبیر نے زہرہ کے چہرے پر پڑتی دھوپ کو چھوا اور کہا'' آدھا روشن آدھا تاریک ہی حقیقی ہے۔ مگر میں دھوپ کے راستے میں ہوں۔ ابھی یہ پورا تاریک ہو......'' دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں جیسے کسی جبلی میکانکیت سے دور ہٹ گئے۔

''دستک کی آواز پر دور ہٹ جانے کی ہمت بھی کب تک رہے گی'' زہرہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ اس زندگی کی فروعی تفصیلات ہیں'' کبیر نے کہا۔

''فروعی تفصیلات بھی...... کچھ اور طرح کی بے بسی پیدا کرتی ہیں۔ جس میں اشتراک شاید مشکل ہوتا ہے۔''

''شاید...... لیکن......'' دستک کی آواز پھر سنائی دی اور کبیر نے بلند آواز میں اعلان کیا

''آ جائیں امداد صاحب۔ دروازہ کھلا ہے''

امداد حسین معذرت خواہانہ انداز میں جھکا ہوا ایسے اندر داخل ہوا جیسے ابھی باہر نکل جائے گا۔ کبیر اور زہرہ کو ہوائی سلام کرنے کے بعد وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ کبیر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ''اور سنائیں پھر امداد صاحب

آپ کا غسل آفتابی کیسا چل رہا ہے۔ میں نے اوپر جا کر دیکھا ہے نئی چھت پر کافی کھلی جگہ بن گئی ہے۔''

''جی...... جی...... جب...... بالکل۔'' غسل آفتابی کے یوں اچانک تذکرے پر امداد حسین پر بوکھلاہٹ سی طاری ہو گئی اور زہرہ سمجھ گئی کہ کوئی لطیفہ ہے جو کبیر کے سر پر سوار ہو گیا ہے۔ کبیر اب اس سے ایک تعارفی لہجے میں مخاطب ہوا۔

''ہمارے امداد حسین صاحب مکمل برہنگی کی حالت میں گاہے بگاہے اپنے آپ کو سورج کے حوالے کرتے رہتے ہیں اور انتہائی صحت افزا نتائج حاصل کرتے ہیں۔''

''اوہ...... بہت دلچسپ'' زہرہ نے فیصلہ کیا کہ اس کے لیے بہتر ہے کہ ایک سنجیدہ نیم دلچسپی کا انداز اختیار کیے رکھے۔ مگر امداد حسین کے لیے سرے سے کسی بھی قسم کا کوئی انداز اختیار کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ کے آثار دیکھ کر کبیر نے اسے بیٹھ جانے کا مشورہ دیا جو اس نے قبول کیا مگر پھر فوراً اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اٹھنے کی کوشش کی جیسے بھاگ جانا چاہتا ہو۔

''میرا خیال ہے...... میں پھر حاضر......''

''امداد صاحب آپ نے کوئی بات کرنی تھی'' کبیر نے احتجاج کیا'' چھلا جا رہا تھا آپ کا وقت نازک ہو رہا ہے......''

''جی...... وہ...... وہ تو ہے......'' امداد حسین مطمئن ہوا کہ گفتگو اب روز مرہ کے انسانی ڈھب پر آ جائے گی مگر اگلے ہی لمحے کبیر نے کہا۔

''زہرہ امداد صاحب ہمارے ایک اور معاملے میں بھی بہت بڑے فنکار ہیں۔''

''فنکار؟'' زہرہ نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''ازلی خواتین کو رام کرنے کے فنکار...... ایک بار انہوں نے مجھے بھی تو ڑا کرانے کا مشورہ دیا تھا''

''توڑا کرانا؟'' زہرہ نے اب کچھ تجسس سے پوچھا اور امداد حسین نے صدقِ دل سے ہوا میں تحلیل ہو جانے یا زمین کے شق ہونے کی قسم کے امدادی معجزات کی آرزو کی۔ کبیر نے لفظ کو بلند آواز میں پڑھنے کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''توڑا کرانا محبوب کے دل میں اپنے لیے تڑپ

Scanned by CamScanner

پیدا کرنے کے لیے جان بوجھ کر بے اعتنائی برتنا۔ مثلاً محبوب سے طے شدہ ملاقات کے حوالے سے پابندیٔ اوقات کو خاطر میں نہ لانا یا سرے سے ہی خاطر میں نہ لانا۔ بعد میں کسی ناگہانی حادثاتی لرزہ خیز بہانے سمیت محبوب کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے شکایت وغیرہ بھول کر صدقہ خیرات کا مشورہ دینے کے قابل بنانا۔ جواباً خدا کرے تمہاری بلا میرے سر آئے قسم کے کلمات ادا کر کے محبوب کی آنکھوں میں نمی پر خصوصی دھیان دینا یعنی اگر کوئی نمی ہو تو، بصورت دیگر بھی مفید ہے۔ اس کارروائی کے بعد اگلی ملاقات بمعہ عہد و پیمان طے کرنا مگر وقتِ مقررہ پر پھر وہی حرکت کرنا۔ دوسری شکل۔ مشترکہ واقف کار ذرائع کا سہارا لیتے ہوئے محبوب کو کسی دوسرے محبوب کی موجودگی کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کرنا۔ محبوب کے استفسار پر پُراسرار رویہ اختیار کرنا اور یوں بتدریج عاشق اور محبوب کے تعین کو الٹ کر رکھ دینے کی سعی کرنا...... وغیرہ وغیرہ...

'توڑا کرانا' فنِ عشق و مستی کی ایک انتہائی نادر مگر نازک گھات ہے لیکن اس کا غیر محتاط استعمال سنگین نتائج پیدا کر سکتا ہے یعنی 'توڑا کرانا' سب کچھ توڑ تاڑ کر محبوب کی طرف سے 'چھوڑا' کا سندیسہ بھی لا سکتا ہے اور عاشق نامراد کے لیے عمر بھر کا 'چھوڑا' بن سکتا ہے..... اسی لیے امداد صاحب کا مشورہ ہے کہ جید اور جغادری عشاق کے علاوہ عام زٹیل قسم کے عاشق اس کا رسک نہ لیں، واللہ اعلم بالصواب"۔

زہرہ بظاہر لاتعلق سی اٹھی جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی اور اب کتابیں وغیرہ دیکھنے کی اچانک خواہش کی تکمیل کرنے کے لیے کمرے کے سب سے دور افتادہ کونے میں جا رہی ہے۔ پھر کونے کی کتابوں کی طرف منہ کیے وہ بے آواز ہنسی کے دورے کا شکار ہو گئی۔ زہرہ کے اٹھ جانے پر امداد حسین نے قدرے اطمینان کا سانس لیا پھر سخت شاکی اور ملامتی سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔

"کبیر صاحب آپ بھی حد کرتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں آپ۔ یہ باتیں۔ اس طرح کی باتیں۔ بیگم صاحبہ کے سامنے کرنے کی ہیں کیا؟"

"بس سارا قصور۔ اس آپ کی اس 'بیگم صاحبہ' کا ہے۔ اسی لیے آپ کو یہ وقت دیکھنا پڑا۔" کبیر نے کہا۔

"میری بیگم صاحبہ!" امداد حسین کی بوکھلائی سرگوشی آئی اور کبیر نے سوچا کہ یہ وضاحت کرنا اب محال ہو گا کہ کونسی بیگم صاحبہ۔ اور کیسی بیگم صاحبہ چنانچہ اس نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر یہ تو چھوڑیں امداد صاحب۔ یہ تو سنجیدہ اور مشکل باتیں ہیں اور کسی حد تک دردناک باتیں ہیں۔ آپ بتائیں مسئلہ کیا ہے" اور زہرہ نے سن کر سوچا کہ مسئلہ حل ہونے تک وہ وہیں کھڑی سیکنڈ ہینڈ کتابیں ہی دیکھے گی۔

امداد حسین کے جانے کے بعد جب وہ کمرے کے رہائشی حصے میں واپس آئی تو اس نے کبیر کو پہلے کی اپنی 'بے رحمانہ شرارت بازی' سے بہت مختلف موڈ میں پایا۔ وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے پاؤں میز کے کونے پر جمائے کرسی کو پچھلی ٹانگوں پر جھلا رہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی مضطرب سوچ میں ڈوبی تھیں۔

"گر جاؤ گے" زہرہ نے قریب آ کر کہا۔

کبیر نے پاؤں میز سے ہٹا لیے اور کرسی ٹھک سے چاروں پاؤں کے توازن پر اتر آئی۔

"ہاں اس کا خطرہ یقیناً ہے۔ آگے پیچھے جھولنے کا مزہ لینے والوں کو گرنے کا خطرہ تو رہتا ہے۔"

"مسئلہ کیا تھا؟" زہرہ نے پوچھا۔

"امداد حسین صاحب کا مسئلہ اصل میں دو مسئلے تھے۔ پہلا مسئلہ بھورے بھینسے کے خواب کا مسئلہ اور دوسرا چھپائی میں گڑبڑ کا مسئلہ۔"

"اور تم خواب سے پریشان ہوئے یا گڑبڑ سے"

"کسی سے بھی نہیں۔ ویسے تو ساری گڑبڑ ہی خوابوں کی ہے"

"بھورا بھینسا اور چھپائی پھر بھی باقی رہ جاتے ہیں"

"ہاں 'زمینی' سورج کے نیچے کے 'معقول' روزمرہ زندگی کے مسائل اچھا کیا تم نے ادھر چلی گئیں۔ ورنہ بیگم صاحبہ یہیں رہتیں تو میرا مالک مکان بوکھلاہٹ میں بات ہی نہ کر سکتا۔"

"وہ تمہاری کیمسٹری تھی اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"بہرحال۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کئی دفعہ میرے بارے میں ایک پریشان کن خواب دیکھ چکا ہے اور ہر دفعہ ایک جیسا ہی کہ ایک بھورا بھینسا چھپ کر میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میں کبھی گلیوں میں جا رہا ہوتا ہوں۔ کبھی پہاڑی رستوں پر۔ کبھی درختوں میں۔ کبھی شہر کے سب سے بڑے بک سٹور میں" کبیر ہنسا "مگر بھینسا مذکورہ ہر جگہ اپنے بھورے پن سمیت چھپ کر اس فقیر کو ٹکر مارنے کے درپے ہے۔"

Scanned by CamScanner

زہرہ کچھ دیر خاموش رہی پھر گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے پوچھا ''پھر تم نے کیسے ہوگا اس غریب کو اس بات پر بھی۔''

''نہیں میں نے مسئلے کو بہت سنجیدگی سے لیا میں نے وعدہ کیا ہے کہ کل ہی پیر منگل شاہ صاحب ٹھٹھری والے کے آستانے پر جا کر ایک دافع بلیات قسم کا تعویز بنوا کر لا دوں گا۔''

''تم پہنچو گے'' زہرہ نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں تم بھی نہیں۔ تعویز امداد صاحب پہنچیں گے خواب انہیں آتے ہیں مجھے تو نہیں۔ اپنی طرف سے میں نے انہیں یقین دہانی کرائی ہے کہ آئندہ ان کے خوابوں میں گھسنے کی کوشش نہیں کروں گا میری طرف سے تسلی رکھیں باقی بھینسے کو پیر منگل شاہ کا تعویز سنبھال لے گا۔ یہ مسئلہ تو حل ہوا''۔

زہرہ ہنسی اور فوراً ہی پھر سنجیدہ ہو گئی۔ ''تم بہت بے فیض اور کمینے آدمی ہو، مجھے ترس آتا ہے اس بوڑھے پر۔''

''اب وہ خواہ تو اوا اپنی شفقتِ پدری مجھ جیسے بے فیض اور کمینے آدمی پر ضائع کرنا چاہتا ہے تو میں کیا کروں۔''

''میرا خیال ہے ہر طرح کی شفقت تمہارے اوپر ضائع ہی ہوتی ہے''۔

''یہ داوی اماؤں جیسی گفتگو تم نے کہاں سے سیکھی ہے''

''بکومت..... تم نے کبھی اس منحوس گندے شخص کا ذکر کیا تھا اُس سے''

''آ..... میرا خیال ہے تم عزیزی دوگی امیر جان کا حوالہ دے رہی ہو...... یقیناً کیا ہوگا، تمہارے اور ناصر کے علاوہ امداد صاحب میرے دیدہ نادیدہ دشمنوں کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں..... اُن کے 'بھینسائی' خوابوں کا ماخذ یقیناً یہ معلومات ہوں گی۔ تم ٹھیک سمجھی ہو۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا میں کیا سمجھی ہوں اور کیا نہیں سمجھی'' زہرہ نے خفگی سے کہا اور کچھ دیر کبیر کو بے یقینی سے دیکھنے کے بعد پوچھنے لگی ''اور وہ..... چھانٹی۔ گڑبڑ..... وہ کیا مسئلہ ہے؟''

''اس مسئلے پر سیر حاصل بحث ہمیں کچھ دیر کے لیے ملتوی کرنی پڑے گی۔ ابھی ہم ناصر کے سابقہ ہسپتال جا رہے ہیں۔'' کبیر نے اُٹھتے ہوئے کہا پھر تیزی سے پلنگ کے نیچے سے بوٹ

باہر نکال کر جرابیں پاؤں پر چڑھانے لگا۔

''ناصر کے سابقہ ہسپتال؟ کیا مطلب؟ کیا ہوا؟ کیوں؟'' زہرہ نے بہت حیرت سے پوچھا۔

''اس کا ناصر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری اس نوکری سے تعلق ہے۔ ٹھیک ہے میں علوم و 'کتوب' کی چھانٹی میں گڑبڑ کرنے لگا ہوں۔ مگر دوکان کے لیے مال کی خریداری میں مدد کرنا بھی تو میرے فرائض میں شامل ہے۔ ہم لوگوں نے یعنی مالک اور نوکر نے اس نیو سکالرز اولڈ بکس شاپ کو جلد از جلد دوبارہ بھرنا بھی تو ہے۔''

''اس کا ناصر کے ہسپتال جانے سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ وہاں کوئی ڈاکٹر باہر جا رہا ہے اور اپنی میڈیکل کی کتابیں فروخت کر کے چار پیسے کمانا چاہتا ہے۔ امداد حسین ساتھ جا رہا ہے ہمارے۔ اُسے رخصت کر کے پھر وہاں اگر ممکن ہوا تو وہیں ہسپتال کی کسی نامانوس کینٹین پر کچھ کھالیں گے۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے''۔

امداد حسین کا ڈاکٹر سے کتابوں کا سودا کرانے اور بنڈل امداد کرا کے اُسے رخصت کرنے میں انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ یہ دوپہر اور شام کے درمیان کے ایسے اوقات تھے جب نچلے درجے کے ہوٹلوں میں کھانے کی فراہمی یا تو معطل ہو جاتی ہے یا بہت محدود ہو جاتی ہے لیکن ہسپتالوں کی کینٹین کی یہ خوبی ہے کہ وہاں ایک اوسط قسم کا کھانا ہر وقت مل جاتا ہے کیونکہ مریضوں کی بھوک کے کوئی اوقات نہیں ہوتے اور لواحقین کے اوقات تیمارداری کی مجبوریوں سے بندھے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی جگہوں کی ایک اور خوبی کبیر کے خیال کے مطابق یہ بھی تھی کہ وہاں ہر کوئی مرض کی آفاقی شناخت میں ڈوبا نظر آتا ہے اور کوئی کسی کے بارے میں کسی اور حوالے سے متجسس نہیں ہوتا۔ وہ اُس نامانوس جگہ کے ایک گوشے میں آبیٹھے جہاں کینٹین کے سامنے یوکلپٹس کے درختوں کے نیچے انہوں نے چند میزیں رکھی ہوئی تھیں اور رش کی صورت میں گاہک یا کھلے میں بیٹھنے کے شائق وہاں بیٹھ جاتے تھے۔

''میرے لیے تمہاری یہ نامانوس جگہ ہرگز کوئی نامانوس جگہ نہیں ہے۔ میں اس جگہ کو اس سارے ہسپتال کو ناصر کے واقعے سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتی'' زہرہ نے افسردہ لہجے میں کہا اور پھر چاروں طرف دیکھا'' وہ گیٹ۔ وہ پارکنگ۔ وہ اُی پی وارڈ۔ اور اُدھر وہ ہڈی وارڈ۔ اوپر وہ کینسر وارڈ۔

Scanned by CamScanner

اور اس طرف جو تم کہو گے جانا پہچانا سائیکیاٹری وارڈ کا کاریڈور یہ سب کچھ میرے ساتھ ایک سرد غیریت کا تعلق بناتا ہے۔ کیا تمہارے لیے اس مقام میں اس منظر میں کچھ کشش ہے؟"

"ہاں" کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "اس جگہ کی کشش جسے وقت برباد کر دیتا ہے۔ وقت جو واقعہ ہے۔ وقت جو حادثہ ہے۔ یہ وہ ہسپتال نہیں جو ناصر کے یہاں سے نکالے جانے سے پہلے کا ہسپتال تھا۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رُکیں گے۔ اگر تم کہو تو ابھی چلے جاتے ہیں۔"

"نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں" زہرہ نے خنک سی ہنسی سے کہا۔

کبیر نے کھانے کا کہا اور پھر کسی تمہید کے بغیر کہنے لگا۔ "میرے پاس کا خیال ہے کہ میں پرانی کتابوں کی چھانٹی میں گڑبڑ کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ میرا بنیادی کام تو یہ ہے کہ سائنس کو مذہب سے مذہب کو تاریخ سے تاریخ کو فلسفے سے فلسفے کو ادب سے ادب وغیرہ وغیرہ کو وغیرہ وغیرہ سے صفائی کے ساتھ الگ الگ کروں۔ لیکن میں سب کچھ غلط کرنے لگا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"ہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دراصل غلطی میری تھی پچھلی رات میں نے اپنے ہی حجرے میں پرانی کتابوں کے ملغوبہ ڈھیروں کی ایک مختلف نئی قسم کی چھانٹی کر دی"

"کیا مطلب؟"

"میں نے دراصل کچھ دیر کے لیے علم و فضل کے سنہری جماعت بندی کے اصول یعنی طبیعی علوم، حیاتیاتی علوم، عمرانی علوم، ریاضیاتی علوم، ادبی علوم۔ وغیرہ کو ایک طرف ہٹا کر کچھ نئی جماعت بندیاں کیں۔ کھیل کھیل میں۔۔۔"

"کھیل کھیل میں؟" زہرہ نے کبیر کے اس اضطراب پر مضطرب ہوتے ہوئے کہا جو اس کی سیاہ آنکھوں میں تھا۔

"ہاں۔ مثلاً زبردست علوم، زیردست علوم۔ آزاد علوم۔ زیرِ حراست علوم۔ بھکاری علوم۔ شکاری علوم۔ سرکاری علوم۔ نجی علوم۔ جلادی علوم۔ کمینے علوم۔ چڑچڑے علوم۔ مصالحتی علوم وغیرہ بلکہ وغیرہ وغیرہ علوم بھی۔ اس نئی کیٹالاگنگ پر عمل شروع کیا تو اچھی خاصی آہ و بکا مچ گئی۔ کیمسٹری آرٹ کو کہنیاں مارنے لگی تو تاریخ نے ٹیکنالوجی کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ مذہب سائنس کے آگے بھاگتا فلسفے کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔۔۔" زہرہ نے مشکل

سے حلق میں پھنستا نوالہ نگلا اور حیرت زدہ تشویش سے کبیر کو دیکھنے لگی۔ "تم یا تو مذاق کر رہے ہو یا پھر اپنے حواس میں نہیں ہو۔"

"اس وقت تو شاید حواس میں ہی ہوں۔ لیکن رات مجھ سے بدحواسی یہ سرزد ہوئی کہ ایسی ہی نئی چھانٹی شدہ بلکہ نو چھانٹی زدہ کتابیں ویسی ہی پڑی رہنے دیں انہیں علوم کی شریفانہ تقسیم میں واپس لانا بھول گیا۔ صبح امداد حسین کا ملازم ویسی ہی بے ترتیب شدہ کتابیں اٹھا کر لے گیا۔ اب ٹھیک کروں گا۔ میرا خیال ہے اب تم امداد حسین کا چھانٹی میں گڑبڑ کا مسئلہ سمجھ گئی ہو گی۔"

"ہاں۔ شاید لیکن تمہاری اپنی گڑبڑ کا مسئلہ میں نہیں سمجھی کہ میں پوری طرح سمجھ رہی ہوں۔"

"میری گڑبڑ؟" کبیر نے پلیٹ میں پڑے ایک آلو کے ٹکڑے کو بداعتمادی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ذہنی گڑبڑ"

"میری ذہنی گڑبڑ یہ ہے کہ...... کیا یہ ضروری ہے کہ میں اپنی دنیا کی تقسیم اور ترتیب اسی طرح کروں جیسے سکالرز اولڈ بکس کے عالموں کی فوج ظفر موج کر رہی ہے۔ لکھائی اور علم کا یہ ظلم کیا ضروری ہے میں قبول کروں"

"اس میں تمہارے قبول کرنے نہ کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہے اس کے علاوہ کیا ہے کیا ہو سکتا ہے"

"بیت النفس کی اپنی دنیا ہے جو لا لکھائی اور لا۔ علم کی دنیا ہے اور جو سچ پوچھو تو سکالرز اولڈ بکس شاپ کی لکھائی اور علم کو مکمل بناتی ہے۔ آہ..... مجھے اپنے پہلے رجسٹر کی یاد آ رہی ہے جو میرے ساتھ خاکستر ہو گیا۔ تم نے مجھے بچا لیا مگر اس لالکھائی کو نہ بچا سکیں...... لالکھائی کا راستہ لا۔ علم کو جاتا ہے۔" کبیر نے ایک ہیجانی سا قہقہہ لگایا اور زہرہ ایک ہی آتشیں لمحے میں اس دہکتے جہنم میں چلی گئی جس میں کبیر بے سدھ پڑا تھا اس کے پھیپھڑوں میں تپتا ہوا دھواں بھرا تھا اور جسم پر جلتی ہوئی کتابیں گر رہی تھیں۔ کبیر نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے ذہن کے اندر جھانک رہا ہو۔

"تم وہ منظر دیکھ رہی ہو۔"

"ہاں۔ دیکھ رہی ہوں...... میں اکیلی تمہیں کبھی بچا نہ سکتی کبیر۔ اگر ناصر نہ ہوتا......"

Scanned by CamScanner

"ناصر نے تمہیں بھی آگ سے بچایا۔ وہ ہم دونوں کا بچانے والا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نہ آتا تو آج ہم دونوں......"

"مگر مجھے لگتا ہے ہمیں کوئی اپنے آپ سے نہیں بچا سکتا۔ ہم ایک دوسرے کی آگ کو ہوا دینے والے ہیں۔" زہرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ آگہی کی گھاتوں کا سبب دہندہ ہے"۔

"مجھے ناصر بہت یاد آتا ہے۔ تمہارے جھلسے ہوئے جسم کا زیادہ بوجھ اُس نے اُٹھایا ہوا تھا۔"

کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "میرے جھلسے ہوئے ذہن کا زیادہ بوجھ بھی اُس نے اُٹھایا ہوا تھا...... بلکہ...... اب...... بھی......"

"جمعرات کو جائیں گے ہم اُسے ملنے......"

"ہاں" کبیر نے کہا اور کھانے کے خالی برتنوں کو ایک طرف ہٹا دیا پھر یک دم ایسے لہجے میں بولا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو کچھ ایسا جو اُسے کسی پریشان کرنے والی گفتگو میں پھنس جانے سے بچا سکتا ہو۔ "ویسے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ وہ جو نہیں۔ جادو گری۔ جادو گرنیوں کے شکار کے عظیم دور میں...... جب زندہ جلاتے تھے۔ کچھ لوگ جو بچ گئے۔ ان کے تجربات۔ کہتے ہیں۔ سارا عذاب بس بے ہوش ہونے تک ہی ہوتا ہے۔ بے ہوشی جو عظیم نجات دہندہ ہے۔ میں تو خیر تھا ہی نیند میں...... ایک نجات دہندہ سے دوسرے نجات دہندہ تک...... اصل نجات دہندوں کی آمد تک......"

"ایک لا۔علم سے دوسرے لا۔علم تک۔ نیند سے بے ہوشی تک اور پھر موت تک۔" زہرہ نے اُس لہجے میں کہا جو اچانک ذہن میں آنے والے سب کچھ واضح کر دینے والے بے ربط فقروں کے ساتھ آتا ہے۔ وہ ہنسنے لگی اور اپنی ہنسی کے زہریلے پن پر متعجب بھی ہوئی۔

کبیر میز پر پڑے سالن سے لتھڑے برتنوں اور پلاسٹک کی چنگیروں میں روٹی کے بچے کچھ ٹکڑوں کو ایسے گھورنے لگا جیسے اُن کی وہاں موجودگی پر سخت حیران ہوا ہو۔ پھر اُس نے اچانک ایک اضطراری حرکت میں دایاں بازو اٹھا کر بیرے کو اشارہ کرنا چاہا مگر پھر اس حرکت کا تسلسل برقرار نہ رہنے کی اذیت اُس کے چہرے پر آ گئی اور اس نے ہاتھ کو سامنے لا کر کہا" لکھنے سے ہی نہیں۔ ایسی بے ساختہ حرکت پر بھی یہ لرزنے لگتا ہے۔ بہرحال"

بیرا برتن اٹھا کر لے گیا تو کبیر نے کہا "لا۔علم کی بظاہر لایعنیت پر تمہارا تمسخر قابلِ فہم ہے۔"

"لایعنیت کیا۔ میرا خیال ہے میں اس کی اصل تک پہنچ گئی ہوں۔ لا۔علم خالی الذہنی کی کیفیت ہے۔"

"آ۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم بالکل بھی کچھ اصل۔ وصل نہیں بھی ہو۔ اگر چہ وصل کے بارے میں اب کچھ ایسا کہنا ممکن نہیں۔ لیکن اصل۔ لا۔علم کی اصل سے تم لا۔علم ہو۔ لا۔علم خالی الذہنی نہیں ہے۔ جیسے لاکھائی خالی کاغذ نہیں ہے۔ اسی طرح لا۔علم خالی ذہن نہیں۔ لیکن جہاں تک تمہارا تعلق ہے۔ تمہارا خالی الذہن رہنا ہی ضروری ہے۔"

"کیا مطلب؟" زہرہ نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"املا لینے والے کو متن کے حوالے سے بالکل خالی الذہن ہونا چاہیے۔ ہم وہیں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں ہم ایک دفعہ آج صبح کے لکھنے لکھانے کی ریہرسل کے بعد پہنچے تھے۔ اپنے آپ کو اس ساری بک بک سے دور رکھو اگر تم میری کامیاب املا کار بننا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں ایسی کوئی یقین دہانی......" زہرہ نے مخصوص انداز میں سر جھٹکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اُس کے الفاظ وہیں تھم گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب زہرہ نے اُسے وہاں دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ پھر ایک بدلے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ "یہ تو وہی حرامزادی ہے"۔ کبیر نے اُس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ نرس مختاراں اُن سے کچھ ہی دور ایک میز پر بیٹھی تھی۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(25)

ہوا

کبیر اور زہرہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کبیر نے فیصلہ کیا کہ انہیں فوری طور پر اُس جگہ سے اُٹھ جانا چاہیے۔ اُس عورت کی اچانک وہاں موجودگی جو ناصر کی بربادی کا باعث بنی تھی اُس لمحے ان کے جینے کے احساس کو تہہ و بالا کر سکتی تھی۔ کبیر نے اس ارادے سے کہ وہ کھانے کی ادائیگی کاؤنٹر پر ہی کرے گا اٹھنا چاہا۔ زہرہ نے بھی اپنا پرس اٹھایا اور دونوں نے دزدیدہ نظروں سے اُسے دیکھا اور اسی وقت اُس نے بھی ایک نظر ان دونوں پر ڈالی۔ اور اُس کی وہی نظر تھی جس نے کبیر اور زہرہ کو نہ صرف فوراً وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ بدلنے بلکہ پھر اور بھی وہیں بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

نرس مختار بیگم کی آنکھوں میں ان دونوں کے لیے کوئی پہچان نہ تھی۔ اُس نے ان کی طرف دیکھا ضرور تھا۔ مگر انہیں نہیں...... ایسے ہی جیسے کوئی اپنے اردگرد موجود اجنبیوں پر لاتعلقی سے نظر ڈال کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس نے اپنے میلے بدرنگ سفید ایپرن کی جیب میں سے رومال نکال کر ماتھے پر پھیرا۔ کینٹین کے ملازم کو بلاتے وقت اس کی ویسی ہی ایک نظر پھر زہرہ اور کبیر پر سے گذر گئی۔

"کیا اُس نے ہمیں دیکھا نہیں؟" زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھا ہے بالکل" کبیر نے کہا اور پھر اس نے نرس مختار کی طرف براہ راست دیکھا وہ اس کی نظروں سے اب بھی ویسے ہی لاتعلق تھی۔ کبیر جو ابھی تک کرسی سے اٹھنے کی حالت میں تھا ایک دم ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا اور زہرہ سے کہنے لگا "میرا خیال ہے اس نے ہمیں پہچانا نہیں"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" اب زہرہ نے بھی نرس مختار کو گھور کر دیکھا۔

کینٹین کا ملازم چائے کا کپ اور ایک پرچ میں بسکٹ اس کے سامنے رکھ کر جا چکا تھا اور وہ بظاہر ایک گہرے استغراق کی کیفیت میں اُن چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔

"دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اُس نے ہمیں پہچانا نہیں۔ یا پھر وہ جان بوجھ کر ایسا تاثر دے رہی ہے کہ وہ ہمیں پہچانتی نہیں"۔ کبیر نے کہا۔

"ایسا تاثر دینا اتنا قدرتی نہیں ہو سکتا۔ زہرہ نے گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ جو شخص نہ پہچاننے کی اداکاری کرتا ہے وہ تھوڑا بہت مصنوعی ضرور ہو جاتا ہے۔ اور ضرورت سے زیادہ لاتعلق بنتا ہے۔ مگر دیکھو وہ کبھی کبھار ہمارے اوپر ایک نظر ڈال بھی لیتی ہے۔ جیسے وہ کبھی اُس مونچھوں والے گنجے یا اُس درخت پر نظر ڈالتی ہے...... اے...... اے۔ یہ اُس نے پھر ہمیں دیکھا مگر نہیں دیکھا۔"

"ہوں" کبیر نے گہرا سانس لیا "ہاں...... ویسے بھی میں نہیں سمجھتا اس نیک خاتون کی اعلیٰ پائے کی صلاحیتوں میں فنِ اداکاری بھی شامل ہے...... ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا"

"یہ نرس مختار بیگم نہیں بلکہ اس کی جڑواں ہم شکل بہن ہے جو ہمیں جانتی بھی نہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ یہ بے وقت کا مذاق ہے" زہرہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں میں سب امکانات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ تو اس کا مطلب ہے کہ یہ وہی عورت ہے جو ہمیں...... تمہیں یاد ہے جب ہم سائیکیاٹری وارڈ میں جاتے تھے ناصر سے ملنے...... تو یہ ہمیں کس قدر گہری اندر تک پہچان لینے والی نظروں سے گھورتی رہتی تھی...... اور اب یہ ہمیں سرے سے پہچان ہی نہیں رہی۔"

"ہاں...... اور ناصر بے چارہ بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بظاہر چپکی بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہتی ہے اور بہت گہرا دیکھتی ہے۔ اور ہمارے سب کے تعلق کے بارے میں اپنے ہی اندازے لگاتی رہتی ہے۔ اپنی ہی خوفناک کہانیاں بناتی رہتی ہے۔"

"خوفناک کہانیاں...... جن میں سے ایک کہانی کا شکار ناصر ہو گیا...... مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں اُس کی اس کیفیت کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اُس مریضانہ سازش کے بارے میں۔ آخر اس نے کیسی حیرت انگیز ترغیب کو استعمال کیا ہوگا...... آخر اس نے کس طرح اُس [illegible]

Scanned by CamScanner

عورت کو باصر پر جنسی حملہ کرنے کا اشتعال دلایا ہوگا۔" کبیر نے کہا۔

زہرہ نے دیکھا کہ شام کی تاریکی آچکی ہے کینٹین والے نے بتیاں روشن کر دی ہیں جو اب نرس مختار کے چہرے پر پیلی روشنی گرا رہی ہیں۔ "نہیں۔ اب تو ......" اُس نے عجیب سی بے چینی سے کہا" اب تو..... اس کا یہ انداز..... جو معمولی نہیں ہے..... کیا ہے؟..... کیا اس کی صرف ہمیں پہچاننے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے یا سب کو پہچاننے کی..... کیسے آخر..... ہمارے اُوپر بھی جو الزام اس نے لگائے..... جب ہاف مین زندہ تھا..... کہ ہم چاروں سائیکیاٹری وارڈ کی مریض...... مریضوں کی۔ مریض عورتوں کو..... کسی گھناؤنی سرگرمی کے لیے استعمال کرتے ہیں..... میرے خدا مجھے یاد ہے........ مجھے خاص طور پر یاد ہے..... مجھے دیکھتے ہی اُس کے ماسک جیسے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور اُس کی آنکھیں تو چھیدتی تھیں...... میں حیران ہوتی تھی۔ یہ عورت کیا مجھ سے نفرت کرتی ہے..... شاید یہی بات تھی..... مگر اب دیکھو....." زہرہ نے اب کسی بھی جھجک کے بغیر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "اس کی چائے بھی ویسی کی ویسی ہی پڑی ہے۔ مسلسل اُسے گھور رہی ہے اب تو..... مجھے تو یہ اس کی کوئی اور خوفناک کہانی لگتی ہے۔"

"شاید" کبیر نے کہا اور بیرے کو چائے لانے کے لیے کہا" ایک بات واضح ہے کہ ہم ابھی فوراً یہاں سے جا نہیں سکتے۔"

"مگر ہم یہاں بیٹھے اُسے گھورتے بھی رہیں گے تو بھی کیا ہوگا۔ کیا ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ اُس کا یہ غیر معمولی رویہ کیا ہے؟"

کبیر کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔ "نہیں" اُس نے کہا" آہ..... مجھے اپنے بے چارے سوختہ ٹیلے رجسٹر کی یاد آگئی"

"کیوں"

"اُس میں کہیں میں نے یہ لکھا تھا کہ فکشن کے خالق کو خدا بننے کا اختیار کس نے دیا..... مگر اب میں یہ کہتا ہوں کہ جب تک کوئی اُس سے یہ اختیار واپس نہیں لیتا وہ مختارِ کل ہے۔ وہ سب کچھ جان سکتا ہے۔ سب کچھ کر سکتا ہے..... اب ذرا سوچو...... یہ عورت نرس مختار بیگم جس کا یہ رویہ ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہے اور ایک مصیبت بنا ہوا ہے۔ اگر یہ عورت کسی افسانوی دنیا کا کردار ہوتی تو فاضل مصنف کس قدر آسانی سے اور مزے سے اُس کے ذہن کی گہرائیوں میں اُتر کر اس

کی اس غیر معمولی کیفیت کا راز افشا کر دیتا..... مگر ہم زمینی لوگ کہ ایسا کوئی اختیار نہیں رکھتے..... اُس اجنبی سرزمین میں اجنبی ناقابلِ فہم رویوں کے شاہد ہم حیرت اور خوف میں مبتلا ہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ...... مجھے تو لگتا ہے ..... یہ عورت بھی کچھ خوف میں مبتلا نہیں کیا؟ دیکھو جیسے....."

"میں نہیں جانتا زہرہ..... کچھ کہہ نہیں سکتے..... کچھ نہیں کہہ سکتے....." کبیر نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔" ہمارے لیے یہی ہے کہ کچھ دیر بیٹھ کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیں اور اندازے قائم کریں۔ جیسے کبھی یہ ہمارے بارے میں اندازے قائم کرتی تھی...... ہاں اتنا ضرور ہے کہ ..... اپنے مشاہدات سے اُس ستم رسیدہ کو بھی اگلی جمعرات کی ملاقات کے دوران آگاہ کریں....."

چائے آگئی اور زہرہ نے دیکھا کہ اُن کے لیے چائے لانے والے ملازم نے نرس مختار کی میز پر سے اُس کا ویسے کا ویسا بھرا ہوا ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھا لیا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک گرم بھاپ دیتی چائے کا کپ رکھ دیا ہے۔ کبیر اور زہرہ نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

نرس مختار نے چائے کے کپ کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اُبلتے ہوئے گندے پانی کے تالاب کے کنارے وہ کھڑی کھڑی تھک گئی ہے۔ کیوں نہ وہ اُس کے چپٹی کے بنے کنارے پر بیٹھ جائے اور پاؤں اندر لٹکا لے۔ اس کے تن من بھاری ٹھنڈے پاؤں کو آرام آجائے گا۔ "مگر نہیں مختار بیگم چائے کا کیا بنے گا۔ مہمان نے ابھی آنا ہے۔ کیا ہوگا مہمان آ جائے گا اور چائے نہیں آئے گی۔" اُس نے خاموشی سے اندر اپنے آپ کو کہیں ڈھونڈا اور کہا۔

کبیر نے واپس جاتے ملازم کو اشارے سے پھر بلایا۔

"جی صاحب"

"یار وہ۔ جو یہاں سونے کوڈوں جیسے بسکٹ ملتے ہیں وہ ہمیں بھی لا دو"

ملازم نے دانت نکال دیے" جی جناب۔ کتنے کھائیں گے"۔

"جتنے لاؤ گے سب کھا لیں گے۔ اور یہ..... کسی نے تمہاری چائے ویسے ہی واپس کر دی۔ مکھی پڑ گئی تھی کیا"

"نہیں جی...... یہ وہ بی بی...... کی ہے...... کبھی نہیں پیتی۔"

Scanned by CamScanner

"اچھا تو پھر تسلی نکلی ہوگی۔"

ملازم ہنس پڑا "نہیں سر جی۔ نکلا کچھ نہیں...... بس وہ مالک کا حکم ہے یہ بی بی چائے بنائے نہ پئے...... کپ ٹھنڈے ہوتے جائیں۔ تم اُٹھا اُٹھا کر رکھتے جاؤ......"

"اوہو...... مالک کی رشتے دار ہے کیا"۔

"نہیں...... یہ بات نہیں...... اس بی بی کی بددعا مالک کو لگ گئی تھی۔ ایک دن...... کافی دیر کی بات ہے ایسے ہی مالک نے ٹھنڈے کپ کا گرم کپ دینے سے انکار کیا۔ خود کپ اٹھا کر لے گیا۔ اس نے کہا بی بی نے "جا جس ہاتھ سے تو نے مہمان کے آگے سے کپ اٹھایا وہی تیرا ہاتھ ٹوٹ نے گا"۔ بس جی۔ دوپہر کو ہمارے سامنے آغا صاحب مالک اس کینٹین کا موٹر سائیکل پر گھر گیا واپس نہیں آیا۔ اطلاع آگئی ٹرک نے ٹکر ماری ہے دایاں بازو ٹوٹ گیا۔ ابھی تک چٹی پٹی میں لٹکائے پھرتا ہے وہ دیکھیں وہ...... وہ جی۔ وہ جو شین لاس پتیلے کے پیچھے وہ جو کریلا کاری ڈال کر دے رہا ہے۔ وہی ہے مالک آغا صاحب۔"

"یقیناً وہی ہوگا شین لاس پتیلے میں سے کریلا کاری ڈالنے کی سزا قدرت ضرور دیتی ہے۔"

کبیر نے پُرعبرت انداز میں کہا اور ملازم پھر ہنس پڑا۔

"نہیں جی۔ سزا تو دوسری بات پر ملی۔ ویسے سر جی آپ تو لے کافی ہیں۔" اُس نے کہا

"ہوں ناں" کبیر نے بہت خوش ہو کر کہا پھر مایوسی سے زہرہ کی طرف دیکھ کر کہا "یہ نہیں مانتی۔"

ملازم نے سخت ناپسندیدگی سے زہرہ کی طرف دیکھا اور زہرہ نے اپنے بیساختہ قہقہے کا گلا گھونٹتے ہوئے سوچا کس طرح یہ شخص کسی بھی لمحے کے عذاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا ہے اور اُس نے اپنی آنکھوں کی پوری شدت اُس کے اندر اُتار دی اور کبیر نے بوکھلا کر ملازم سے کہا "اب تمہارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تم ہمیں کوڑے...... نہیں بسکٹ لا دو......"

"ابھی لایا جی" ملازم نے کہا اور گنگناتا ہوا چلا گیا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر تم نہ ہوتے...... تو"

"تو میں...... خدا ہوتا...... ڈبویا مجھ کو ہونے نے...... وغیرہ وغیرہ...... معقول قسم کی مشتبہ مکالمہ بازی تمہارے بس کی بات نہیں"۔

"جہنم میں جاؤ"

"ایسا اب نرس مختار بیگم کی بددعا کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ کیا یہ اللہ لوک ہوگئی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ......"

ملازم بسکٹ کی پلیٹ لے آیا۔ وہ ابھی کچھ لمحے کبیر سے مزید گپ شپ کے موڈ میں تھا۔

"ویسے سر جی۔ میں نے سنا ہے یہ بی بی۔ پاگلوں کے وارڈ میں ہے۔ اُدھر سے بھی کچھ اثر ہوا ہے۔ میرا چاچا معراج کہتا ہے، پاگلوں کی ہوا اچھی نہیں ہوتی، بچنا چاہیے۔ چاچے معراج کا اپنا آرا ہے۔ مجھے بڑا کہتا ہے میرے ساتھ کام پر آ جاؤ۔ پر مجھے سر جی آرے کے کام سے بڑا ڈر لگتا ہے ذرا نظر ہٹی نہیں تو ہاتھ ہے نہیں یا بازو ہے نہیں...... اب ہاتھ اور بازو تو روز روز نہیں ملتے ناں جی......"

"بے شک" کبیر نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا اور اپنا دایاں ہاتھ زہرہ کی آنکھوں کے سامنے لایا۔ "ہاتھ اور بازو تو روز روز نہیں ملتے......"

"جی آ......" ملازم نے اپنے موقف کی تائید پر دلی اطمینان کا اظہار کیا اور شک بھری نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا "یہ عورت اس شخص کی صحیح قدر نہیں کر سکتی"۔

زہرہ نے چائے کا گھونٹ لیا اور کوڑا بسکٹ کھانے کی کوشش شروع کر دی۔ کبیر کہہ رہا تھا "اچھا تم اس بی بی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ہم دعا کرائیں گے۔ میرا مطلب ہے اگر بددعا کر کے بازو تڑوا سکتی ہے۔ تو...... دعا کر کے...... آہ...... کبھی ہمارے آنگن میں بھی پھول کھلتے۔"

کبیر نے رقت سے کہا اور ملازم نے دل میں کہا اوخو۔ خو تو یہ بات ہے۔ اس کے چہرے پر گہرے خلوص کی نرماہٹ پھیل گئی اور زہرہ کا کوڑے بسکٹ پر چلتا منہ وہیں ساکت ہوگیا۔ اُسے فوری احساس ہوا کہ کبیر نے اپنی لاف گزاف میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس کا اس سادہ لوح ملازم پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اور اس اثر کے نتیجے میں حیرت انگیز طور پر خود اس کے لیے اُس کی نظروں میں ناپسندیدگی کی جگہ ایک گہری ہمدردی نے لے لی ہے۔ اور پھر وہ بات بھی زہرہ کی سمجھ میں آگئی اور اس بات کی بھی سمجھ آگئی کہ کبیر کے گھوڑے جیسے دوڑتے ذہن میں ایک ہی لمحہ پہلے وہ بات آئی ہوگی کہ جس سے وہ ملازم کی ہمدردی حاصل کر کے نرس مختار بیگم کے بارے میں کچھ اگلوا سکتا ہے۔

Scanned by CamScanner

جو کچھ اُس نے اس عورت کے بارے میں بتایا تھا جو جانے کا دوسرا کپ بھی سامنے رکھے ویسے ہی
اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ مگر اس نے سوچا وہ کبیر سے بات کرے گی کیا وہ دنیا کی ہر بات کو اپنی بک
بک میں رگید سکتا ہے۔ مگر وہ بک بک تو نہیں کر رہا۔ ہمارا یہاں بیٹھنا اور ایک اجنبی شخص سے ایک
دوسرے اجنبی شخص کے بارے میں بات کرنا ایک سوچا سمجھا فیصلہ ہے پھر وہ کبیر کے ایک لاتعلق
سے فقرے پر اس قدر ٹھنڈی ہی کیوں ہو گئی۔ وہ بات کرے گی اس نے بسکٹ کا ملغوبہ چائے کے
گھونٹ کے ساتھ نگلا۔ ملازم کہہ رہا تھا۔

"میں بات تو کرلوں جی۔ پر وہ بی بی کسی سے بولتی نہیں جی بالکل......"

"صرف بددعائیں دیتے وقت بولتی ہے۔" کبیر نے کہا۔

"شاید جی......" ملازم کی بات ادھوری رہی۔ کینٹین کے اندر سے اٹھتی ایک چنگھاڑ جیسی
آواز ان تک پہنچی "شادے۔ اوئے گُمی نہ ہو جایا کر۔ گاہک کے پاس جا کر گُمی نہ ہو جایا کر۔"

"یہ آغا صاحب بولا ہے جی میں چلتا ہوں جی۔ ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے میں پھر آتا ہوں
جی۔" ملازم نے گھبرا کر کہا۔

"یہ تو اسی قابل ہے کہ اس کا بازو توڑئیے۔ ٹھیک ہے فارغ ہو کر آنا۔ ہم ادھر ہی بیٹھے ہیں۔
ابھی آنگن سُونا ہی سہی"

"بکواس" زہرہ نے ملازم کے جانے سے پہلے ہی شدت سے کہا اور ملازم پھر حیران ہوا
کہ وہ کیسی عورت ہے اور چلا گیا۔

"کیا مطلب" کبیر نے کچھ حیران سا ہو کر پوچھا۔

"تم انتہائی بیہودہ اور ذلیل انسان ہو۔" زہرہ کے لہجے کی شدت نے کبیر کو اور بھی حیران
کیا۔ "مجھ سے کچھ خطا سرزد ہوئی۔ مگر میں تو تم سے بات ہی نہیں کر رہا تھا میں تو اُس بے چارے
شادے سے جو گفتگو تھا کہ ہمارے نرس مختار کا معمہ حل ہونے کا کچھ سراغ ملے۔"

"میں تمہیں ہمارے کسی ایسے تعلق کو رگید نے و مضحکہ اڑانے کی اجازت نہیں دے سکتی جو
سرے سے ہے ہی نہیں اور نہ ہی شاید کبھی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی لاتعلق ہے...... یعنی لا۔ تعلق ہے۔" کبیر نے کہا اور سناٹا ان کی میز پر اتر آیا جس میں
وہ ایک دوسرے کو اجنبیوں کی طرح دیکھتے رہے۔ صرف دھڑکنیں جانی پہچانی ہو گئی تھیں۔ اور اس

شام وکل دفعہ تیز ہوا کا جھونکا ان کے اوپر سے گذر گیا۔

"تم پتہ نہیں کس خیال میں اُلجھ گئی ہو۔" بالآخر کبیر نے کھوکھلے سے لہجے میں کہا۔ "مگر مجھے
صرف اُس عورت کے خیالوں سے دلچسپی ہے جو وہاں کسی گم شدہ مورتی کی طرح بیٹھی ہے اور جس
کے ذہن کے اندر کی دنیا کوئی منحوس افسانہ نگار ہی جان سکتا ہے...... مگر پھر وہ یہ عورت نہیں ہو گی......
بہر حال...... وہ بات دوسری ہے...... مگر یہ بات طے ہے کہ یہ عورت بھی اُس ہیرا نائیڈ عورت سے
جا ملی ہے۔"

"شاید ایسا ہی ہے" زہرہ نے جیسے بہت کوشش سے واپس آتے ہوئے کہا۔ اور مختار بیگم کو
دیکھا اور اُس نے بھی انہیں دیکھا اور جو بھی دیکھنا تھا دیکھ کر اپنے اندر کہا "یہ مجھے ایسے دیکھتے ہیں
جیسے میں انہیں دیکھتی ہوں تو دیکھتی نہیں۔ پہچانتی نہیں۔ پر میں ایسے دیکھتی ہوں جیسے دیکھتی ہی
نہیں۔ اُس جیسے مرد اور اُس جیسی عورت کو کوئی اور کیسے دیکھے۔ ایسے دیکھے کہ دیکھے بھی تو پتہ نہ چلے
پر انہیں پتہ چل ہی گیا میں انہیں دیکھتی ہوں۔ بڑا خطرہ ہو جاتا ہے اُس جیسی عورت اُس جیسے مرد کو
دیکھنے میں۔ پھر انہیں پتہ چل جائے کہ دیکھتی ہے تو ایسے ہی جیسے...... جیسے سیدھے اوپر آجاتے
ہیں۔ جیسی یہ عورت ہے جیسا یہ مرد ہے۔ اور جیسا ان کا آپس کا ساتھ ہے مجھے تو نظر آتا تھا ناں۔
مجھے تو نظر آتا ہے ناں۔ اب بھی دیکھ لو کیسے ساتھ ہے۔ ساتھ ساتھ ہیں۔ ساتھ میں ساتھ ہے
...... سونے آؤ تو جاگے آؤ......"

"کبھی تو اک دم مجھے لگتا ہے۔ کہ وہ نہ صرف پہچانتی ہے بلکہ......"

"بلکہ خوب پہچانتی ہے" کبیر نے مضطرب سے انداز سے کہا۔

"بلکہ اب بھی وہ اپنے گوشت کی مورتی جیسے سراپے میں بیٹھی ہمارے بارے میں
خوفناک انداز سے لگا رہی ہے۔" زہرہ نے بوجھل آواز میں کہا اور نرس مختار کی طرف دیکھا۔

"مگر وہ ایسا کیوں کرے گی۔" کبیر نے کہا

"اگر وہ ہیرا نائیڈ عورت سے جا ملی ہے تو اس کیوں کا کوئی جواب نہیں"

"اگر وہ اس سے نہ بھی جا ملی ہو تو پھر بھی اس کیوں کا کوئی جواب نہیں۔ ابھی شادا ڈیوٹی ختم
کرکے آتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مناسب طریقے سے پوچھ گچھ پر وہ نرس مختار بیگم کے بارے میں
اور بھی سُنی سُنائی ہمیں سُنائے گا۔ اور نرس مختار بیگم اور ہیرا نائیڈ عورت کی تاریک دنیاؤں کے

Scanned by CamScanner

نقوش۔ خد و خال۔ پہاڑ، کھائیاں، شاید زیادہ صاف نظر آنے لگیں گے۔"

"اور تم اس شخص سے کچھ ویسی بیہودہ بے مقصد گفتگو نہیں کرو گے۔"

"لا۔ تعلق کی جو بے ہودگی میں اُس کے سامنے کر چکا ہوں۔ اُسے تو واپس نہیں لے سکتا۔ ویسے بھی میں جو لا۔ لکھائی اور لا۔ علم کے بے مقصد عذاب میں ہوں لا۔ تعلق کے عذاب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

زہرہ کبیر کی آنکھوں میں گھور کر دیکھتی ہے جیسے وہ گہری تاریک غاروں کے دہانوں جیسی ہوں جن کے اندر وہ جائے گی اور پھر اُسے واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔ کینٹین کے سامنے کے اُس کھلے میں شام گہری ہونے پر یک دم جگہ جگہ لٹکے ہوئے بجلی کے بلب روشن ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی تیز ہوا کا جھونکا یکائین کے پیلے پتوں کو ان کی میز پر گراتا ہے۔ دونوں ایک بے ساختہ خواہش سے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ ہوا پنکھا اور تیز چل پڑتی ہے۔

نرس عطار ٹھنڈی چائے کے کپ میں یکائین کا پیلا پتہ تیرتے دیکھتی ہے اور گدلے پانی کی جھیل میں تیرتی سونے کی کشتی کو پہچانتی ہے۔ آج مہمان شاید سونے کی سنہری کشتی پر بیٹھا آئے گا۔ وہ اپنے اندر کہتی ہے۔

"کیا تمہیں یقین ہے یہ لا۔ لکھائی۔ لا۔ علم اور ــــ اب یہ لا۔ تعلق یہ سب لا۔ حاصل نہیں ہے" زہرہ ایک پتے کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے کہتی ہے۔

"میں بے یقین ہوں" کبیر کہتا ہے۔ "مگر کیا یہ وقت ایسے مسئلوں پر کلام کرنے کا ہے۔"

"وقت کسی بھی کلام پر کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ کیا ایسا نہیں؟" زہرہ پوچھتی ہے۔

"نہیں ایسا نہیں ہے" "تم نے خود ہی کچھ دیر پہلے کہا تھا وقت باتوں کو برباد کر دیتا ہے۔ وقت ہی کلام کو پیدا کرتا ہے اور وقت ہی کلام کو ہلاک کرتا ہے۔ وہ ایک قاتل باپ ہے..... مگر دیکھو وہ شادا..... خاموش رہو" کبیر زہرہ سے کہتا ہے جو کچھ کہنا چاہتی ہے اور پھر کہتا ہے۔

"شادا نرس عطار کی میز کی طرف جا رہا ہے۔ شاید اس کی میز سے ٹھنڈا کپ اٹھانے اور نیا گرم کپ رکھنے کے لیے۔" اور شادا واقعی ہی ایسا کرتا ہے کبیر اسے بلاتا ہے اور پوچھتا ہے "تمہیں پتہ چل جاتا ہے اس بی بی کا کپ ٹھنڈا ہو گیا ہے اور نیا رکھنا ہے کیا وہ مانگتی ہے۔"

"نہیں جی وہ مانگتی نہیں"

"تو پھر"

"آغا صاحب کو پتہ چل جاتا ہے۔"

"یہ بہت عجیب معاملہ ہے" کبیر حیرت سے کہتا ہے۔

"بہت ہی عجیب جی۔ مجھے ڈر لگتا ہے جی۔ اس بی بی سے۔ میں تو ادھر نیا آیا ہوں پر سنا ہے ادھر بڑا چکر چلتا رہا ہے اندر پاگل خانہ وارڈ میں۔ میں آیا جی یہ جو بیٹھے ہیں اُن کا آڈر لگا کر رکھتی....."

شادا جاتا ہے اور کبیر اور زہرہ خاموشی سے تسلیم کرتے ہیں کہ شادے کا "بڑے چکر" کا ماجرہ سننا جو بھی ہے ان کے لیے لازم ہے۔ نرس عطار سوچتی ہے "ملازم چائے لانے میں کس قدر دیر لگاتا ہے۔ اگر اتنے میں مہمان آ جاتا تو کیا ہوتا۔" وہ ٹھنڈی چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتی ہے اس کے ہونٹ جل جاتے ہیں جلن کا درد ایک ہزار پائے کی طرح اس کے اندر جڑیں گاڑ لیتا ہے۔ "میں دیکھنے والی ہوں میں دیکھتی تھی ان کا ساتھ۔ دیکھنا سب کچھ کر لینے کا مزہ ہے۔ دیکھنے کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کوئی روک نہیں سکتا دیکھنا سونگھتا ہے۔ دیکھنا سنتا ہے۔ ہاں دیکھنا سنتا ہے۔ دیکھنا چھوتا ہے دیکھنا آزاد پنچھی ہے جو آگے جاتا ہے اور پھر پیچھے آتا ہے۔ پھر سے اڑتا ہے۔ اور اس کے اوپر جا بیٹھتا ہے اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ دیکھنے والا اور کچھ نہیں مانگتا۔ وہ جاسوس والی نہیں مانگتی تھی نہیں مانگتی تھی کہ دیکھنا ہی کافی ہے۔ دیکھنا سب کچھ کر سکتا ہے۔ میں ان کے ساتھ دیکھتی تھی۔ اس جیسی عورت اس جیسے مرد کا ساتھ۔ نامرد دیکھنے کے اندر آتا تھا اب اس عورت مرد کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں....."

"دیکھو۔ دیکھو" زہرہ کے لہجے کا تحیر کبیر کو بھی متحیر کر دیتا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے "دیکھا وہ چائے پی رہی ہے۔"

کبیر دیکھتا ہے "واقعی" وہ کہتا ہے اور ہنس پڑتا ہے۔ عجیب بات ہے ہم اس کے چائے پینے پر اس قدر حیرت زدہ ہیں جیسے وہ چائے نہیں زہر پی رہی ہے۔

شادا آ جاتا ہے۔ اور کبیر کے سوال پر کھل کر ہنستا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ "یہ آدمی اچھا لگتا ہے۔ اللہ اس کو اولاد دے" اور کہتا ہے "ہاں..... جی صاحب۔ چائے منگوائے گی تو پیئے گی بھی۔ بس تین چار بار ٹھنڈی خراب کر کے ہی پیتی ہے۔ آج تو پھر جلدی پی لی ہے۔ پر بڑا ہی چکر تھا جی

Scanned by CamScanner

چل رہا اندر۔ اللہ معافی دے۔"

"ادھر بیٹھو۔ بتاؤ۔" کبیر اسے کہتا ہے۔

"پاگل" نرس مختار بیگم کے اندر کسی نے کہا اور اس نے کسی سے کہا" جاسوسوں والی کہتی ہے نہیں صرف دیکھنے سے بچت نہیں ہوتی۔ دیکھتے دیکھتے ہی وہ ہر صبح میرے بچے نکال کر لے جاتے ہیں اور میں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ میرے بچے میرے اندر واپس ڈال دو۔" قلعے کی دیواریں قلعے کی دیواریں اوپر اٹھتی اٹھتی آخر جا کر آسمان کے پیالے سے جا ملی ہیں اور چھت سے آسمان کا نیلا رنگ قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے تو دیواریں شفاف شیشے کی ہو جاتی ہیں۔ اور شیشے کی دیواروں کے پیچھے بیٹھے وہ بالکل تیار نظر آتے ہیں ان کے ہاتھ ان کی ٹانگوں کے درمیان دبے ہوئے ہیں اور آنکھوں میں نمی ہے۔ دیواریں دھندلا جاتی ہیں اور پتھر اور اینٹیں واپس آ جاتی ہیں۔ اب کون دیکھ سکتا ہے۔ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھنے کو اب کچھ نہیں...... سونے آ ؤ تو جاگتے آ ؤ۔"

کبیر شادے کو تسلی دیتا ہے کہ وہ گھبرائے نہیں اور ایسی باتیں جو مرد اجنبی عورتوں کے سامنے کرنے سے گھبراتے ہیں ویسی باتیں بھی وہ اس عورت کے سامنے کر سکتا ہے۔ اور زہرہ کا چہرہ بے حس اور بے تاثر سا ہو جاتا ہے۔ شادا پھر بھی ایک چور نظر سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "بس جی سنا ہے۔ وہ شیطان ڈاکٹر جو تھا اس کے ساتھ دو اور مردوں اور ایک عورت کا گروہ تھا وہ پاگل عورتوں سے برے کام کرتے تھے اور آگے کہیں بے حیائی کرواتے تھے اللہ معافی دے۔ اس بی بی نے پکڑوا دیا۔ اس بدبخت ڈاکٹر نے سنا ہے جاتے جاتے اس غریب کو کوئی دماغ الٹانے کی دوا کھلا دی۔ پر اللہ ہی بہتر جانتا ہے جی یہی سنا ہے۔ کون جانے کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے۔ پر میرے حساب سے تو پاگلوں کی ہواڑی ہوتی ہے۔ میرا چاچا معراج کہتا ہے......" تمہیں دوائیوں کی ضرورت نہیں سائرہ۔ بس دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تمہیں کونسا جنات نے قابو کیا ہوا ہے۔ دوائیاں تو لینے آتا ہے جو مہمان ہے۔ مہمان دوائیاں لینے آتا ہے۔ سونے آ ؤ تو جاگتے آ ؤ.... تم دیکھو تو سہی سائرہ ایک بار دیکھو تو سہی دیکھ کر تو دیکھو۔ رات جب سو جائیں گے تم جاؤ گی اور اسے دیکھو گی دیکھنا دیکھنے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جہاں مرضی پہنچ جاؤ کچھ بھی کر لو۔ تو دیکھنا وہ تیرا سارا نقصان پورا کر دے گا۔ دیکھ لینا تیرے سارے بچے واپس تیرے اندر ڈال دے گا ہاں دیکھنا تو ہو گا۔ وہ اپنا اپرن وارڈ روب میں رکھنے جاتا ہے تو وہیں اسے دیکھ لینا وہ وہیں تیرا نقصان پورا کر

دے گا۔ میرا نقصان تو پورا نہیں ہو سکتا بچی کا جسمانی نقصان بہت ہوا ہے جی۔ ساری عمر کے فالج میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ابھی شکر ہے وہ عمر کے لحاظ سے اس طرح کے واقعہ کو پوری طرح سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں۔ آپ بھی کبھی اس سے اس واقعے کا ذکر نہ کریں۔ کبھی نہیں...... جسمانی نقصان کا شاید بعد میں کچھ ہو سکے مگر ذہنی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ شکر ہے ابھی یادداشت کی عمر نہیں۔ شکر ہے ابھی وہ عمر نہیں۔ اس عمر کا کچھ یاد نہیں رہتا......

"گورا سنا ہے جی سیلاب میں ڈوب کر مر گیا بُرے کاموں کے بُرے نتیجے۔ اللہ معافی۔ ویسے بڑی تباہی آئی تھی۔ چاچے معراج کا آرا پورا ڈوبا رہا۔ پانی گیا تو آرا پہچانا نہیں جاتا تھا زنگو زنگ۔ گوروں نے سنا ہے جی ادھر غلام باغ میں اڈا بنایا ہوا تھا ہماری پاگلوں کے ساتھ۔ اللہ معافی اللہ معافی۔"

"زنگو زنگ۔" کبیر کہتا ہے اور شادے سے پوچھتا ہے۔ "اور دوسرے مرد عورت، ان کا کیا بنا۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے جی۔ پر سنا ہے اس بی بی نے کبھی کینسر کی اپنی کیلی کو بتایا تھا اور اس نے پرانے پیر سے غیاث کو بتایا تھا۔ کہ سارے فساد کی جڑ وہی تھے وہ ہوتے نہیں جی جو ہر کسی کو خراب کر دیتے ہیں جن کے خمیر میں ہی بدی ہوتی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو خراب کیا۔ یہ آغا صاحب کہتا ہے صاحب جی کہ انہوں نے گورے کو بھی خراب کر دیا۔"

"آغا صاحب انہیں جانتا ہے؟" کبیر شادے سے پوچھتا ہے اور حیرت سے نرس کی طرف دیکھتا ہے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں اس کے منہ سے کچھ فاصلے پر عرصے سے معلق ہے۔ کبیر زہرہ کو دیکھتا ہے جو کہتی ہے۔

"ہاں میں دیکھ رہی ہوں۔"

"ہیں جی۔" شادا کہتا ہے۔

"کچھ نہیں" کبیر کہتا ہے اور آگے کہتا ہے "آغا صاحب انہیں پہچانتا ہے؟ برائی کے خمیر والے مرد عورت کو؟"

"پتہ نہیں جی" ایک بار کہہ رہا تھا اسے شک پڑتا ہے ایک دو دفعہ وہ...... گورے کے ساتھ اسے یاد پڑتا ہے...... ادھر کینٹین پر بیٹھے تھے مرد عورت ڈاکٹر اور گورا۔ گورے سے ہی اسے یاد پڑتا

Scanned by CamScanner

ہے...... پر میرا خیال ہے نہیں پہچانتا ہے۔ ورنہ ضرور وزنگ مارتا۔ پھر اسے آپ بددعا لگ گئی۔ اب تو اس چکر پر کوئی خاص کر بات نہیں کرتا بس بی بی آ جائے تو یہی کہتا ہے۔ کپ پر کپ رکھتے جاؤ اُٹھاتے جاؤ۔ گرم۔ ٹھنڈا۔ گرم۔ ایک اور بھی سنی ہے۔''

''وہ کیا؟'' کبیر کہتا ہے اور دیکھتا ہے اس کا کپ وہیں معلق ہے۔ اور کچھ اور لوگ بھی اور میز پر بیٹھے متوجہ ہو چکے ہیں اگرچہ ایسی جگہوں میں لوگ کم ہی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کبیر شادے کی طرف دیکھتا ہے اور شادا اب نرس مختار کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

''بس وہ آنے والا ہے۔''

''کون؟ کون آنے والا ہے'' کبیر پوچھتا ہے۔

''وہ کوئی نوکر پیشہ سا بندہ ہے جی۔ پر کپڑے مالکوں جیسے پہن کر آتا ہے۔ مجھے تو بیرا جیسا ہی لگتا ہے۔ وہ کوئی ہفتے عشرے میں اس بی بی سے کوئی دوائیاں لینے آتا ہے۔ یہ جب ہی آتی ہے آگے پیچھے کم ہی آتی ہے۔ اسے پتہ نہیں کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ آنے والا ہے اور اس کا کپ منہ سے آدھا فٹ ادھر ہی کھڑا ہو جاتا ہے پتہ نہیں اس کا بازو بھی نہیں اکڑتا۔''

''بازو ضرور اکڑتا ہوگا'' کبیر غائب دماغی سے کہتا ہے اور پھر زہرہ سے انگریزی میں بولتا ہے۔

''دوائیاں لینے آتا ہے۔ بیرا۔ یہ سب کچھ تو جانا پہچانا نہیں لگ رہا؟''

''ہاں۔ کیا وہ؟''

''وہی۔ ہو سکتا ہے...... اور کون......؟''

''شاید...... مگر......''

اس وقت جب شام رات بن رہی تھی۔ تیز چلتی ہوا میں یکا ئین کے درختوں کی ٹہنیاں اس قدر زور سے جھولنے لگی تھیں۔ کہ کھلے میں میزوں کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے والوں میں افراتفری سی مچ گئی تھی اور وہ اپنے برتن اٹھا اٹھا کر کینٹین کے اندر جانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ شادا سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں عورت مرد آخر کون ہیں۔ اور پھر جب اس نے اپنے ہی سوال کا جواب ان دونوں کو سنا بھی دیا تھا۔ ''آپ سرجی اخبار والے ہو ناں۔ جو یہ سب پوچھ رہے ہو۔'' تو کبیر نے کہا تھا ''ہاں بالکل ہم اخبار والے ہیں کیونکہ ہم اخبار خریدتے اور پڑھتے بھی ہیں۔'' اور شادے نے

سوچا کہ شاید اس کا دماغ چل گیا ہے اور پھر شادے نے سوچا تھا کہ وہ ابھی کینٹین میں ہی ہے تو اگر ڈیوٹی پر نہیں بھی ہے تو پھر بھی آندھی سے لوگوں کے سالن اور روٹیاں بچا دے تو یہ اچھا کام ہی ہے اور آغا صاحب بھی خوش ہو جائے گا۔ جو پتہ نہیں اس عورت مرد کے پاس اسے بیٹھا ہوا دیکھ کر اور وہ بھی اپنی ہی کینٹین میں...... کیا سوچ رہا ہوگا۔ شادا اپنی سوچ پر عمل کرنے کے لئے اٹھ گیا تھا اور اس نے ایک گاہک کی کڑھی پکوڑے کی پلیٹ کو اور چنگیر کے اندر سے روٹی کو اٹھایا تھا اور اندر لے گیا تھا جہاں اب اتنی جگہ نہیں تھی کہ تمام لوگ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے۔ اور جب کہ باہر تیز چلتی ہوا میں بظاہر بے نیاز وہ مرد عورت تھے اور وہ عورت تھی جس کا ہاتھ ایک کپ کو تھامے ہوئے اس کے جسم سے کچھ ہی دور آندھی میں معلق تھا۔ اور وہ شخص جس کی وہ منتظر تھی جس کے بارے میں کبیر اور زہرہ کے ذہنوں میں شاید اور مگر کا خلجان برپا تھا اور ہوا زہرہ کے بالوں کو اس کے شانوں سے ہٹا کر کہیں اور لے جانے کے لیے دیوانی ہوئی پھرتی تھی کہ...... وہ آ گیا۔

کیفے غلام باغ کے سابقہ بیرے عاشق علی نے دل ہی دل میں بے وقت بے موقع چل پڑنے والی آندھی کو گالیاں دیں اور اپنے چہرے کو رومال سے صاف کرنے کی کوشش کی تو رومال ہوا میں پھڑ پھڑا گیا۔ اس نے رومال کو بہت محنت سے استری کی ہوئی پتلون کی جیب میں بددلی سے ٹھونسا اور کینٹین کے سامنے کے کھلے حصے کے قریب پہنچ گیا اس مکمل ناامیدی کے ساتھ کہ مختار بیگم یقیناً اس گندے موسم میں اُسے وہاں نہیں ملے گی جہاں وہ ہر دفعہ اسے بیٹھی ملتی تھی۔ مگر اس نے دیکھا کہ وہ نہ صرف وہیں بیٹھی تھی بلکہ ویسے ہی بیٹھی تھی جیسے ہر دفعہ اس کے آنے پر وہ نظر آتی تھی۔ کہنی کو میز پر رکھے ہوئے اور کپ کو ہاتھ میں تھامے ہوئے۔ آندھی اب مٹی سے خالی ہو رہی تھی مگر ہوا صاف اور زنائے دار تھی۔ وہ سیدھا اس ہوائی مزاحمت کو چیرتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کی میز کے ساتھ رکھی ایک کرسی کو ہٹا کر بیٹھنے لگا تو کرسی شدت باد سے الٹنے کو آئی۔ پھر وہ زہرہ اور کبیر کو دیکھے بغیر ان کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ ''مختار بیگم مجھے یقین نہیں تھا تم ایسے میں بھی یہاں مجھے مل جاؤ گی۔'' اس نے کہا۔ اور کینٹین کے اندر کچھ لوگوں نے حیرت اور استہزا کے ساتھ ان لوگوں کی طرف دیکھا جو پاگلوں کی طرح جھکڑ میں بیٹھے رہنے پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ نے اپنے کھانے جلد از جلد ختم کرنے کی سرگرمی تیز کر دی اور کسی ایک نے جھکڑ میں یاروں کے پاس بیٹھی عورتوں پر گندے فقرے کسے جنہیں سن کر آغا صاحب اندر تک لرز گیا اور اس نے فوراً سب کے

Scanned by CamScanner

لیے اعلان کر دیا ''بس جی فارغ کریں۔ کینٹین بند کرتی ہے۔'' ''وہ جو باہر بیٹھے ہیں ان کے لیے
بھی بند کرتی ہے؟'' گنجے فقرے والے نے پوچھا اور پھر خود ہی جواب دے دیا۔ ''پر ان کے
لیے کیا بند کرتی ہے وہ تو آپ ہی باہر ہیں۔ ان کے لیے تو کھلی بند برابر ہے۔'' وہ ہنسا اور اس نے
چائے والی پڑی کو آخری بھرپور چوسا لگایا تو چائے کا السی بھاکا اس کے منہ کے اندر آ گیا اور کبر کے کی ساری
جوانی اس کے اندر اتار گیا۔ اس نے جنگل میں اور وہ بھی رات میں بجلی کی روشنی میں یاروں کے
ساتھ بیٹھی عورتوں کی طرف دیکھا۔ وہ جس کا یار ابھی بعد میں آیا تھا اور جو نرس تھی اس کا ایپرن ہوا
میں پھول رہا تھا۔ ''ہوا دوسری کے بھی پیچھے تک جا رہی ہوگی۔ حد ہے بھئی گرمی کی''.......... اس
نے گلے کا مزہ کھینچتے ہوئے سوچا اور اوپر خشک روٹی کا نوالہ منہ میں ڈال کر اسے چبکنے حلق میں فوراً
نگل جانے کی کوشش کی اور آغا صاحب کو آنکھ ماری۔ آغا صاحب نے غصے میں اس کی طرف دیکھا
اور آلو قیمے کے پتیلے کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھڑے شادے کو کہا ''جا۔ جا کر وہ جو کوئی تیرے گلتے
ہیں جن کے پاس تو بیٹھا تھا..... ان سے بول بل دیں اور تیز ہو جائیں۔ یہ کوئی سماں ہے ادھر بیٹھنے
کا۔ جا..... چل....''
''نہیں آغا جی'' شادے نے گھمبیر لہجے میں کہا ''ان سے نہ کچھ بولیں۔ اخبار والے ہیں۔
پتہ نہیں کیا چکر ہے۔''
''ہیں؟ اخبار والے؟'' آغا صاحب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں اور دوسرے ہی لمحے
بائیں آنکھ بند کر کے اس نے انگلیاں اس کے اوپر رکھ دیں۔ ہوا میں سے آتا کوئی تنکا سا پتہ نہیں
کیا اس کی آنکھ میں اتنی شدت سے رڑکتا ظاہر ہونے لگا تھا کہ اس لمحے آغا صاحب کے لیے دنیا
کے دیگر سب مسئلے لایعنی ہو گئے۔
''یہ کوئی بہت انوکھی پیش رفت ہے زہرہ۔'' کبیر نے کہا۔
''ہاں نظر آ رہی ہے'' زہرہ نے تصدیق کرنے کی کوشش کی اور منہ تیزی سے بند کر لیا پھر منہ
کے سامنے ہاتھ رکھا اور پھر اسے بھی لاپروائی سے ہٹایا اور عجیب سی پریشانی سے بولی'' بولتے
ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم کچھ نگل رہی ہوں۔ یہ عجیب سی آندھی ہے۔''
''یہ ہوا ہے'' کبیر نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی گہرا انکشاف کر رہا ہو۔ زہرہ نے چونک کر
اسے دیکھا اور کہا ''اچھا'' جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اس کی بات کا مضحکہ اڑائے یا سنجیدگی سے لے۔

پھر شاید اس الجھن سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ایسے ہی بولنے لگی'' کیفے غلام باغ جس کا اب کوئی
وجود نہیں اس کا پیرا ہوا کرتا تھا یہ شخص۔ عاشق علی جو ہمارے کیفے غلام باغ کے زمانے کا حصہ دار بنا
تھا۔ وہ شخص اب ایک اور زمانے میں.....؟''
''تیز چلتی ہوا کے زمانے میں'' کبیر نے مداخلت کی اور زہرہ کہتی رہی'' تیز چلتی ہوا کے
زمانے میں ایک پراسرار گھناؤنی عورت کے ساتھ بیٹھا پراسرار گھناؤنی باتیں کر رہا ہے......
اور......''
''پراسرار......شاید کہ ہم نہیں جانتے اس لیے پراسرار.....مگر گھناؤنی......تم کیسے کہہ سکتی ہو
کہ گھناؤنی۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں گھناؤنی......یا شاید وہ جان سکتا جو......''
''اب تم اس لعنتی خیالی افسانہ نگاری کی بات کرو گے جو سب کچھ جان سکتا ہے۔''
''سب کچھ تو وہ بھی نہیں اصل میں تو کچھ بھی نہیں......'' کبیر نے کہا اور ہوا میں سخت
اضطراب سے اڑتے زہرہ کے بالوں کو دیکھا جنہیں اب قابو رکھنے کی کوشش اس نے چھوڑ
دی تھی۔
''تم کرہ ہاوی کی عورت مخلوق لگ رہی ہو'' کبیر نے کہا
''ہم اس عورت مخلوق کی خاطر یہاں بیٹھے ہیں، بلکہ شاید کہنا چاہیے اڑ بیٹھے ہیں۔'' زہرہ
نے ہوا میں ''اڑ بیٹھے'' عاشق علی اور مختار بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔
''ہوا کی آواز سنو'' کبیر نے کہا۔
وہ آواز غصیلی سیٹیوں جیسی آواز تھی۔ کینسر وارڈ، ہڈی وارڈ، ٹی بی وارڈ، بچہ وارڈ، گائنی وارڈ
کی بلند عمارتوں اور طویل برآمدوں کی مزاحمت پر ہوا غضبناک ہوتی نکلتی جاتی تھی۔
''ایک بات تو طے ہے۔'' کبیر نے چپی لکڑی کے بھدے میز کو نیچے دباتے ہوئے کہا جس
کے دو پائے ہوا میں ایک اچانک تند تھپیڑے نے اوپر اٹھا دیے تھے۔
''کیا؟''
''ہوا کے مقابلے میں ہم عاشق علی اور نرس مختار سے کسی طرح کم نہیں ہیں یا شاید یہ کہنا
چاہیے کہ ہوا کے مقابلے میں عاشق علی اور نرس مختار ہم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ عجیب خیال
آتا ہے۔''

Scanned by CamScanner

''کیا؟''

''ہوا...... یا جو کچھ بھی ہے۔ اس کا رخ ہماری طرف سے ان کی طرف ہے۔ اگر یہ ان کی طرف سے ہماری طرف ہوتا تو شاید ان کی باتیں اڑ کر ہم تک پہنچ جاتیں۔ اور ہم سن لیتے۔''

''شاید...... کچھ نہ کچھ تو باتیں ہم سن ہی لیں گے۔''

ہاں...... غضب ناک ہوا کی شام بالکل ہی اکارت نہیں جائے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''نرس مختار کی بات اور ہے مگر عاشق علی یہاں سے بچ کر نہیں جائے گا۔ آخر تو میں اسے بلاؤں گا اپنے روبرو۔''

''ابھی تک تو اس نے ہمیں دیکھا نہیں۔''

''ظاہر ہے اس کی آنکھیں اس کی پشت پر نہیں ہیں۔''

''ایک بات اور بھی ثابت ہوگئی۔ نرس مختار نے واقعی ہمیں پہچانا نہیں۔ ورنہ اسے ضرور بتا دیتی......''

''ضرور؟ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں......''

''اچھا، اچھا...... کچھ نہیں کہہ سکتے......'' زہرہ نے چڑ کر کہا۔

''ویسے تم نے دیکھا زہرہ...... یہ وہ شخص نہیں جس نے...... جس نے اس وقت میں۔ اس رات میں۔ جب ہم کیلے غلام باغ کے باورچی خانے میں یخ بستہ سردی میں تھے۔ جس شخص نے ہمارے لیے آملیٹ بنایا تھا...... جب ہم عشق پر ناممکن مکالمہ کر رہے تھے۔''

''ہاں یہ وہ شخص نہیں...... یہ تو وہ شخص بھی نہیں کبیر جو مدد علی کے پاس اپنے گھر بیٹھا تھا اور ہمیں بتاتا تھا کہ مدد علی میں اب جنات بولتے ہیں۔ جب ہم مردہ سانپ کی شام کے بعد اس کے گھر گئے تھے۔ معلوم کرنے کہ مدد علی کہاں ہے۔ یہ وہ شخص بھی نہیں ہے۔ اور جانتے ہو کیوں؟'' زہرہ نے پوچھا

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اب وہ خود عشق پر اپنا ناممکن مکالمہ کر رہا ہے۔''

''آ......''

''اب یہ مت کہنا...... ہم کیسے کہہ سکتے ہیں...... میں جانتی ہوں......''

''کیا؟''

''کچھ نہیں۔''

''ہوں۔ سمجھ گیا'' کبیر نے زہرہ کی بات پر گہرے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر بولا ''میرا خیال ہے اب میں اسے بلاتا ہوں۔''

''نہیں'' زہرہ نے اسے سختی سے کہا۔ ''چیزوں کو ان کی قدرتی رفتار پر چلنے دو۔''

''قدرت کی رفتار تو یہی ہے۔'' کبیر نے بے ساختہ دونوں بازو ہوا میں بلند کرنا چاہے اور بے ساختہ ہی اس کا دایاں بازو بائیں بازو کے ساتھ اوپر نہ اٹھ سکا۔ اور کیبن کے اندر جواب طوفانی آندھی کے بعد سب گاہکوں سے خالی ہو چکی تھی آغا صاحب اور بوڑھے بیرے غیاث اور شارے نے کبیر کو دیکھا اور ان سب کے دلوں میں یہ سہارا دینے والا احساس اور بھی پختہ ہو گیا کہ ''آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔'' غیاث، جس نے زندگی میں بڑے بڑے عجیب نظارے دیکھے تھے، کہا ''ایسا میں نے آج تک نہیں دیکھا آغا صاحب'' اور پھر ان سب نے ان چاروں مرد عورتوں کو دیکھتے ہوئے بھی پھر دیکھا۔ وہ آندھی میں اپنی اپنی جگہ ویسے کے ویسے بیٹھے آپس میں کچھ بولتے ہی چلے جا رہے تھے۔

''ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے منتیں مانی ہوئی تھیں کہ جھکڑ میں ساری عمر کی باتیں کر کرکے ختم کریں گے۔''

''باتیں تو ختم ہوتی نہیں سکتیں۔'' شارا بولا۔

''اور جھکڑ میں ہی کیوں اور جھکڑ کیا یہ تو لگتا ہے طوفان ہے سب کچھ اڑا کر لے جائے گا'' آغا صاحب نے روہانسی سی آواز میں کہا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے...... ویسے میں نے ایک بات کی ہے'' غیاث نے بات کی اور وقتی طور پر کچھ اور بات کا امکان ختم کر دیا تو انتظار نے اپنا گھیرا اُن کے گرد اور بھی تنگ کر دیا۔ آندھی ختم ہونے کا انتظار۔ کسی نامعلوم خاتمے کا انتظار۔

کبیر نے ہوا میں بلند بایاں بازو نیچے کیا اور بھنچی ہوئی مٹھی کھول کر ہاتھ کو ایسے دیکھا جیسے شعبدہ باز خالی ہاتھ میں سے سکے برآمد کرتے ہیں اور کہنے لگا۔

''ہوا ہے اور کچھ نہیں..... مگر قدرت کی اس رفتار کو زمانے کی اس چال کو سمجھنے کے لیے مجھے عاشق علی بیرے کے ساتھ اپنی تاریخ میں تو جانے دو اور موٹی موٹی سرخیاں بولنے دو۔''

''ہاں جو نظر آ رہا ہے وہ کیسے ہوا۔ مگر تم کسی دوسرے کی سرخیاں کیسے بول سکتے ہو۔''

''مورخ کا یہی کام ہے۔ کہاں سے شروع کریں۔''

''شاید کیفے غلام باغ میں ہماری آخری رات سے۔'' زہرہ نے کہا۔

''یعنی آج کی رات سے۔ مگر اس رات میں عاشق علی کے لیے کچھ نہیں یا شاید..... صرف اتنا۔ کیفے غلام باغ میں عاشق علی کے چاروں چہیتے گاہک ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔''

''ہوں۔ آگے۔''

''ہاں آگے اور حال کے زمانے میں..... راوی ڈاکٹر ناصر۔ ماخذ۔ تماردار کبیر مہدی زہرہ یاور.....''

''راویوں اور ماخذوں کو چھوڑو۔''

''عاشق علی..... نہیں۔ یہ سرخی اس طرح بنے گی..... گونگے بھائی مدد علی کے لیے ادویات کے حصول کے لیے عاشق علی کی نرس مختار سے ملاقاتیں.....''

''ہاں یہ اہم ہے۔ او میرے خدا..... کس قدر طوفانی ہوا ہے اور دیکھو اب اس میں مٹی نام کو نہیں'' زہرہ نے کہا۔ اور کبیر ڈھونڈتا رہا۔

''اس کے بعد..... عاشق علی کہاں ہے.....؟ ہاں..... وہ خشک مٹی میں دھنسی میزوں کرسیوں اور مردہ سانپ اور خونی شفق والی شام۔ جس کے بعد ہم ''مدد علی کہاں ہے'' کا جواب ڈھونڈنے عاشق علی کے گھر گئے تھے۔ ہمارا سب کا خیال تھا کہ مدد علی بھی ہاف مین کے ساتھ ہی ختم کھنڈر کے تہہ خانے میں دفن ہو چکا ہوگا مگر اسے زندہ سلامت دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی تھی یعنی خوشگوار حیرت اور پھر وہ خوفناک حیرت میں بدل گئی تھی۔ جب عاشق علی نے بتایا تھا کہ مدد علی کی اب اچانک بیٹھے بیٹھے زبان کھل جاتی ہے اور جب وہ بولتا ہے تو اصل میں اس میں جنات بولتے ہیں اور وہ کبھی عورت کی زبان میں کبھی مرد کی زبان میں اور وہ بھی انگریزی زبان میں بولتے ہیں۔ پھر مدد علی پر ہماری موجودگی میں دورہ پڑا تھا اور انتہائی خوفناک حیرت یہ تھی کہ جنات کبیر، ناصر، زہرہ اور ہاف مین کی کہی ہوئی باتیں گزشتہ زمانوں کی بولتے تھے اور کبھی تو ہاف مین کی اکاؤکا جرمن بھی بولتے تھے..... تمہیں یاد ہے؟''

''ظاہر ہے، کیسے بھول سکتی ہوں تم نے کہا تھا مدد علی ایک انسانی ٹیپ ریکارڈر بن چکا ہے۔ مگر کیا یہ تمہاری سرخیاں ہیں؟''

''نہیں..... میں ڈھونڈ رہا ہوں سرخیاں اس متن میں آگے ہاں......... ڈاکٹر ناصر نے مدد علی کو اتنی دیر چھپائے رکھنے پر عاشق علی کو برا بھلا کہا تھا اور اس نے مدد علی کے جنات کو طب کا ایک محیر العقول واقعہ قرار دے کر مدد علی کو اسی رات ہسپتال میں داخل کر لیا تھا..... ہاں..... یہ سرخی نکلتی ہے۔ بھائی کے جنات کے علاج کے سلسلے میں عاشق علی کا ہسپتال میں قیام۔ نرس مختار سے مزید قربت۔''

''اس آخری ٹکڑے کا ماخذ کیا ہے۔'' زہرہ نے نرس مختار بیگم اور عاشق علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جو ویسے کے ویسے تیز و تند ہوا میں جامد تھے۔ نرس مختار کا ایپرن پھول کر اسے ایک دیو قامت بنچ جیسا بناتا تھا۔

''تم نے خود ہی کہا تھا تاریخ کی سرخیاں بناتے وقت راویوں اور ماخذوں کو چھوڑ دو.....''

''چھوڑ دو..... ہاں یہ سب کچھ چھوڑ دو'' اچانک زہرہ نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری ہمت جواب دے رہی ہے۔ حیرت ہے کیا یہ رات بھر اس زناٹے دار ہوا میں ایسے ہی بیٹھے رہیں گے۔''

''عاشق علی کے جنات بردار بھائی مدد علی کے سمیت سائیکیاٹری وارڈ میں داخل ہونے اور ناصر کے ذلیل اور رسوا ہو کر وہاں سے نکالے جانے کے درمیان کیا ہے'' کبیر نے زہرہ سے اور اپنے آپ سے پوچھا۔

''کوئی نہیں جانتا۔ یہاں تمہاری عاشق علی بیرے کی تاریخ کا خاتمہ ہوتا ہے..... میں جانا چاہتی ہوں کبیر۔''

''تم تو کبیدہ ہی تھیں، چیزوں کو ان کی قدرتی رفتار پر چلنے دو''۔

''اس میں میری اپنی رفتار بھی شامل ہے۔ کیا ہم قدرت کا حصہ نہیں ہیں۔''

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ نہیں۔ قدرت خود ہی کچھ ہستیوں کو رد کر دیتی ہے۔ ہم رد شدہ ہیں'' کبیر نے گہرا سانس لیا اور اس کے خارج ہونے والے سانس کو ہوا چشم زدن میں اڑا کر لے گئی۔

''آج کا دن لگتا ہے ایک صدی پر محیط ہے۔ صبح تمہارے بیت المقدس سے لے کر یہاں

Scanned by CamScanner

"کون جانتا تھا آج شام دنیا پر یہ وحشی ہوا چھا جائے گی۔" زہرہ نے بوجھل لہجے میں کہا
تب......
اور دنیا میں ہوا کی آواز تھی۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں۔ خاموش ہو جاتے ہیں اور ہوا کی شوک سنتے ہیں اور زناٹوں کی گرج پر سر دھنتے ہیں۔" کبیر نے کہا اور زہرہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں ایسا ہی کر رہی ہوں اچانک میرا جی چاہا ہے۔ کہ یہ اتنی تند ہو جائے کہ زمین سے ہمارے پاؤں اکھاڑ کر اڑا لے جائے۔ اوپر بلندیوں میں۔ ہمیشہ کے لیے......" زہرہ نے کہا۔

"کرہ باد میں گردش کی۔ خیال معقول ہے۔"

"لیکن زمین کی کشش سب سے بڑا ظلم ہے۔" زہرہ نے کہا۔

کبیر نے آگے جھک کر زہرہ کے ہونٹوں کو ہونٹوں سے چھو لیا اور ٹی بی وارڈ سے ہوا کا تھپیڑا ٹکرایا۔ چٹخ کر بڑی وارڈ کے شیشے توڑتا کینسر وارڈ کی طرف بڑھ گیا۔

"نہیں آغا صاحب ایسا میں نے ساری عمر نہیں دیکھا۔ ایسی بے حیائی" غیاث نے ہوا کے شور کے اوپر چیخ کر کہا۔

"او نہیں غیاث۔ اتنی آندھی کے شور میں بات کرنے کے لیے منہ قریب لانا پڑتا ہے اور کوئی بات نہیں۔" آغا صاحب نے کہا۔

"ہاں جی منہ قریب لانا پڑتا ہے۔ کان کے قریب خاص کر۔" شادے نے تصدیق کی۔

"پر وہ دوسرے تو۔ منہ قریب نہیں لا رہے" غیاث نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے وہ ویسے ہی منہ پھلائے بیٹھے ہیں۔ کچھ بول ہی نہیں رہے" شادے نے رائے ظاہر کی۔

"مختار بیگم مجھے مڑ کر دیکھنے دو" عاشق علی نے کہا۔ اس کی آواز میں کسی شدید جسمانی اذیت کا ارتعاش تھا جسے ہوا کا شور بھی دبا نہیں سکا تھا۔

"نہیں" نرس مختار نے کہا۔ اس کی 'نہیں' ہوا میں کیل گاڑنے کی آواز تھی۔

"مگر کیوں" عاشق علی کراہا۔

"مڑ کر دیکھو گے تو پتھر کے ہو جاؤ گے۔"

"میں تو پہلے ہی پتھر کا ہو چکا ہوں مختار بیگم" عاشق علی چیخا۔ "جب سے یہاں آ کر بیٹھا ہوا

تم نے بت بنا دیا ہے۔ تم نے مجھے پتھر کا بنا دیا ہے۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں مڑ کر نہ دیکھنا جب بت مڑ کر دیکھتے ہیں تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ مڑ کر دیکھ لو۔"

عاشق علی کا جسم کسی نادیدہ شکنجے میں جکڑا ہوا کسمسایا اور درد سے نکلی اس کی چیخ ہوا کی چیخوں میں گم ہو گئی۔

"مگر ہے کیا؟ پیچھے۔ ہے کیا میرے پیچھے جو مڑ کر دیکھوں گا تو پتھر کا ہو جاؤں گا۔ بتاؤ مجھے بتا تو دو مختار بیگم۔"

نرس مختار نے عاشق علی کے پیچھے اپنی گھورتی آنکھیں گاڑیں اور ڈراؤنی سی آواز میں کہنے لگی۔ "وہی چھوٹی لڑکی پھر پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی ہے تمہارے۔ اب وہ اسے پتھر کا بنا رہے ہیں۔ اب وہ بھاگنے لگی ہے اور ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ اب وہ اس کے ٹکڑوں کو اس کے لال لال خون سے جوڑ رہے ہیں۔ لو وہ جڑ بھی گئی ہے۔ پتھر کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ٹکڑے ان کے لال خون سے جڑ جاتے ہیں۔ تم نہیں جڑ سکو گے عاشق علی۔" وہ قہقہہ لگاتی ہے اور ویسے ہی بولتی ہے۔ "تمہارے پیچھے وہ اس کو جوڑ رہے ہیں اور تم دیکھ بھی نہیں سکتے...... سوتے آؤ تو جاگتے آؤ۔"

عاشق علی کو جھرجھری سی آئی۔ "بس کرو۔ بس کرو۔"

"دیکھنے کے لیے مڑنا کوئی ضروری ہے۔ کوئی ضروری نہیں۔ میں تو مڑے بغیر ہر طرف دیکھ لیتی تھی۔ پھر تم میرے ساتھ سونے آ گئے اور میری پچھلی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ عاشق علی میرے پیچھے کیا ہے میرے پیچھے کیا ہے۔ میرے پیچھے کیا ہے......"

نرس مختار کی "میرے پیچھے کیا ہے" کی آواز کا تواتر شور کرتی طوفانی آندھی میں غیبی پنجوں کی طرح بڑھ کر عاشق علی کی طنابیں کھینچ لیتا ہے۔

وہ چیختا ہے۔

کبیر سنتا ہے "مجھے لگتا ہے وہ چیخا ہے۔"

"نہیں یہ ہوا کی چیخ ہے۔ سنو۔ بس سنو۔"

"تمہارے پیچھے کیا ہے۔ میرے پیچھے کیا ہے۔ مجھے پتہ ہے تمہیں پتہ نہیں...... تیرے پیچھے کیا ہے۔ میرے پیچھے کیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں۔"

Scanned by CamScanner

زہرہ کہتی ہے۔

"میرے خدا مجھے لگتا ہے، وہ گا رہی ہے۔"

"یہ کوکتی۔ کھوکتی۔ ٹھیک کتنی ہوا کی آواز ہے زہرہ۔ گانا نہیں۔ سنو۔ سنو۔" کبیر کہتا ہے۔

"نہیں۔ وہ گا رہی ہے۔"

"نہیں۔ سنو۔ سنو۔۔۔"

عاشق علی کانپنے لگتا ہے۔ "مجھے جانے دے مختار۔ مجھے جانے دے۔"

"سونے آتے ہو تو جاگتے بھی آؤ۔ سونے آؤ تو۔ جاگتے آؤ۔۔۔ سونے آؤ تو جاگتے آؤ۔۔۔" وہ گاتی ہے۔

"آغا جی اگر میرے کان نہیں بج رہے تو وہ گا رہی ہے" شادا ہنس کر کہتا ہے۔

"دونوں میں سے کون سی عورت؟" غیاث پوچھتا ہے۔

آغا صاحب کا جسم تھرا جاتا ہے اور وہ کہتا ہے "وہی جو پہنچی ہوئی ہے۔ یا اللہ معاف کر۔ یا اللہ معاف کر۔ یا اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔۔۔"

"آغا جی۔ آغا جی۔ آغا صاحب۔ کیا ہوا۔ کیا ہوا۔۔۔ آغا۔۔۔"

"دورہ پڑ گیا ہے شادے۔ پانی لا۔۔۔ پانی لا" غیاث کہتا ہے۔

"وہ کیبن کے اندر لوگ کیا کر رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، مذاق کر رہے ہیں۔ کسی کو لتاڑ رہے ہیں۔" زہرہ حیرت سے پوچھتی ہے۔

"دفع کرو" کبیر کہتا ہے۔ "ایسے میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ایسے میں کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ذرا سوچو طوفانی آندھی میں دو مرد دو عورتیں سب دنیا سے بے نیاز راز و نیاز کر رہے ہیں۔ یہ کیا ہے۔۔۔؟"

"پاگل پن کی انتہا" زہرہ کہتی ہے۔

"نہیں پاگل پن کی ابتدا۔ اچھا سنو۔ مجھے یقین ہے، اُن کی آوازیں اب آندھی سے بلند ہو رہی ہیں۔ وہ ابتدا سے انتہا کی طرف جا رہے ہیں۔ زہرہ آج دنیا ابتدا سے انتہا کی طرف جا رہی ہے۔"

"سنو سنو۔ سنو۔" زہرہ اضطراب سے کہتی ہے۔

"سونے آؤ تو جاگتے آؤ۔ سونے آؤ تو جاگتے آؤ۔۔۔ سونے آؤ تو جاگتے آؤ۔۔۔" نرس مختار کی آواز اب آندھی سے بلند ہو جاتی ہے اور عاشق علی کا خیالی خوف سے تھرایا ہوا جسم کسی دوسرے حقیقی خوف سے متحرک ہونے لگتا ہے۔

"ہوش میں آؤ۔۔۔ مختار بیگم ہوش میں آؤ۔۔۔ آہستہ۔ آہستہ بول۔۔۔" عاشق علی روتے ہوئے کہتا ہے، "یہ آندھی۔ یہ منحوس آندھی۔ یہ ذلیل آندھی یہ کالی آندھی۔ یہ آوازیں۔۔۔" کبیر دیکھتا ہے کہ پہلی دفعہ عاشق علی بیرے کا جسم حرکت میں آیا ہے۔

"مجھے لگتا ہے آخری لمحہ آن پہنچا" کبیر کہتا ہے۔

"کس کا آخری لمحہ۔ اُن کا یا ہمارا" زہرہ پوچھتی ہے۔

"پتہ نہیں۔ سنو۔ سنو۔۔۔"

وہ کہہ رہی ہے اور سب سنتے ہیں۔ اس کی آواز آندھی کے زناٹوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ "یہ منحوس آوازیں نہیں عاشق علی۔ یہ تیرے بھائی کے جنات کی آوازیں ہیں۔ آج وہ سب نکل بھاگے ہیں۔ سونے آؤ تو جاگتے آؤ۔ سونے آؤ تو جاگتے آؤ۔۔۔"

"میں سونے نہیں آتا۔ میں دوائیاں لینے آتا ہوں" عاشق علی غصے میں بولتا ہے مگر جیسے غصے میں بھیک مانگ رہا ہے۔

"میں لائی ہوں دوائیاں۔۔۔ میں دوائیاں لائی ہوں۔۔۔ مہمان کے لیے۔۔۔"

کبیر اور زہرہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"آہستہ بول مختار۔ آہستہ"

"جنات کا شور اتنا زیادہ ہے۔ اونچا نہ بولوں تو کیا کروں۔ میں دوائیاں لائی ہوں۔ دیکھو، دیکھو۔۔۔"

نرس مختار اپنے ایپرن کی جیب میں سے بہت سی دوائیاں نکال کر میز پر رکھتی ہے۔ تیز ہوا انہیں چشم زدن میں اڑا کر لے جاتی ہے۔ عاشق چیختا ہے اور اڑتی ہوئی دوائیوں کے پیچھے لپکنے کی کوشش میں گرتا ہے۔

"کیا۔ کیا۔۔۔ کیا کرتی ۔۔۔ ہے تو۔۔۔"

"او۔۔۔ وہ تو اڑ گئیں۔ جن دوائیاں ساتھ لے گئے۔ اچھا اچھا۔۔۔ تم انہیں اس میرے

Scanned by CamScanner

اپیرن میں باندھ کر لے جاؤ۔ کپڑے میں باندھ کر لے جاؤ۔"
نرس مختار تیزی سے اٹھتی ہے اور اپنے اپیرن کے بٹن کھولنے لگتی ہے۔
"نہ کر..... نہ کر" عاشق علی کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔
زہرہ اور کبیر سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں نرس مختار اپنا اپیرن کھول کر جسم سے الگ کرتی ہے تو ایک ہی لمحے میں تیز ہوا اسے ایک زوردار پھڑپھڑاہٹ سے اڑا کر لے جاتی ہے۔ عاشق علی اچھلتا ہے گرتا ہے۔
"مختار..... مختار..... بیگم....."
"یہ گیا اپیرن....." نرس مختار ہنستی ہے۔ "وہیں وارڈ روب میں واپس۔ سائرہ کے بچے نکال کر لے جاتے تھے۔ میں نے تو نہیں کہا تھا اپنے بچے واپس لینے جائے۔ کس نے کہا تھا۔ عاشق علی تم نے کہا تھا۔"
"نہیں نہیں....." عاشق علی چیختا ہے۔
"کس نے کہا تھا؟ سونے آؤ تو جاگنے آؤ..... آؤ۔ سونے آؤ تو جاگنے آؤ۔ آؤ....." نرس مختار اپنے لباس کو جسم سے الگ کرنا شروع کرتی ہے۔ "لو اس میں باندھ کر لے جاؤ دوائیاں..... گیا..... یہ بھی گیا..... اچھا یہ لو..... گیا..... یہ بھی گیا۔"
وقت کے اس پُرتشدد لمحے میں کبیر نے فوری طور پر یہی سوچا تھا کہ طوفانی جھونکے نے زہرہ کے قدم اکھاڑ دیے ہیں اور وہ بیٹھی بیٹھی یک دم بے وزن ہو کر اڑتی ہوئی نرس مختار کے پاس جا پہنچی ہے۔ دوسرے لمحے اس نے دیکھا کہ وہ اس عورت کی برہنگی کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی ہے جو تیز ہواؤں کے ظلم میں بے بس کھڑی ہے۔ یہ احساس اس سب کچھ کو جو بیت رہا تھا اور بیت چکا تھا۔ سب کچھ کو ہیچ کرنے والا احساس تھا۔ انسانوں کے انسانوں بارے میں دیے سب فیصلوں کو تہ و بالا کرنے والا احساس تھا۔ کائنات۔ انسان۔ پیدائش کے سب اسرار اور عظیم خداؤں کے احکامات ایک نقطے پر سمٹ آئے تھے۔ زہرہ اس دوسری عورت کو سمیٹے کھڑی تھی اور اس کی اپنے ہی اوپر پلٹ پڑنے کی آخری برہنہ خواہش کوئی الفور دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتی تھی۔
"اندھا کر دینے والی تاریکی ہی سنگین برہنگیوں کو سمیٹ سکتی ہے۔" کبیر نے سوچا تھا اور

بہوت کھڑے عاشق علی کے پاس سے ہوتا وہ کینٹین کے اندر روشنی منقطع کرنے والے کسی کھٹکے تک جانا ہی چاہتا تھا کہ اندھیرا چھا گیا۔ آغا صاحب۔ غیاث اور شارے کی بصیرت بھی وہی تھی جو کبیر کی تھی اور انہوں نے اس پر عمل کر دیا تھا۔
کبیر تاریکی میں ان تینوں کے قریب آیا تو نرس مختار کی ہنسی بلند ہوئی اور اس نے کہا "عاشق علی میں نے کہا تھا ناں پیچھے مڑ کر دیکھو گے تو پتھر کے ہو جاؤ گے۔ اب تمہارے ٹکڑے بھی ہوں گے۔ تمہارے بت کے۔ سونے آؤ تو جاگنے آؤ۔ سونے آؤ تو جاگنے آؤ....."

O

مختار بیگم کو تاریکی میں ڈھانپ کر انتظامیہ کے سپرد کرانے کے بعد کبیر نے شارے اور آغا صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اخباری لوگ ہی ہیں اور جو کچھ ہوا ہے اس میں ان کا یعنی کینٹین والوں کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس طرح کے واقعہ پر کوئی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ قصور اور کارروائی کے جائز حق دار کے طور پر البتہ کبیر نے عاشق علی کا انتخاب پہلے ہی کر لیا تھا جو اس سارے ہوش رُبا ہنگامے کے بعد کسی سنگین فردِ جرم کے انتظار میں لرزاں و ترساں کھڑا تھا۔ کالی آندھی والی شام نے..... کہ جس نام سے اس نے ان واقعات کو بعد میں ہمیشہ یاد رکھا تھا..... اس کے جسم اور جان کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اسے مختار بیگم کی بات یاد آئی اور اسے یہی محسوس ہوا کہ وہ واقعی پتھر بن کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور اب اُسے پتھر بنانے والے اُسے گھر لے جا کر اس سے ٹکڑے ٹکڑے کا حساب لینے کی باتیں کر رہے تھے۔ آندھی کا زور کم ہو گیا تھا۔ مختار بیگم کو وارڈ والے لے جا چکے تھے۔ دوائیاں اس منحوس ہوا میں اڑ گئی تھیں۔ اگر دوائیاں بھائی مدد علی کو نہ ملیں تو پتہ نہیں کیا ہوگا۔ وہ سر جھکائے کھڑا ان کے حکم کا منتظر تھا جن کو مڑ کر دیکھنے پر دنیا پتھر کی ہو جاتی تھی۔ جو بھی وہ میرے ساتھ کریں کر سکتے ہیں، اس نے اپنے آپ کو فیصلہ سنایا اور ان کی باتوں میں سے بھی کوئی کوئی بات تھی جو اس کے کانوں میں پڑتی تھی۔
"اس گھٹیا شخص نے اُس عورت کو برباد کیا ہے اور ہو سکتا ہے ناصر کی بربادی کا بھی اُس کے اس..... ذلیل تعلق سے کوئی تعلق ہو" وہ عورت کہہ رہی تھی جس کے حسن پر اور جس کے عورت پن پر اور جس کے بے باک یوں مردوں کے ساتھ کسی ڈر خوف کے بغیر برابر اترنے پر وہ بکیے غلام

Scanned by CamScanner

باغ کی کتنی ہی سرد گرم راتوں میں اپنے ہی خاموش دل میں کوئی آواز نکالے بغیر صدقے واری ہوتا رہا تھا۔

اس کا مرد کہہ رہا تھا جسے جو کوئی بھی دیکھتا تھا تو صاف سمجھتا تھا کہ یہی اس عورت کا مرد ہو سکتا ہے" کچھ کہہ نہیں سکتے کہ اس کا تعلق ذیل ہے۔ ابھی تو اس کی کہانی سنی پڑے گی۔ اور اس کے بھائی کے جنات کے تازہ ترین بیانات لینے پڑیں گے۔ مٹی میں جکڑی کرسیوں میزوں کی خونی شام کے بعد تو ہم نے اسے دیکھا نہیں۔ اس کے بارے میں بھی کچھ فیصلہ کرنا ہوگا۔ مدھلی کے بارے میں۔ چلیں؟"

"چلو" زہرہ نے کہا۔

زہرہ اپنی گاڑی کو ہسپتال سے نکال کر سڑک پر لائی تو انہوں نے دیکھا کہ بڑا شہر "ہوا کے بعد کا بڑا شہر" ہے اور ثابت کرتا ہے کہ پرواز کے علاوہ حرکت کی باقی سب صورتیں محال ہیں اور رکاوٹ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی ہموار سطحوں پر آزادانہ حرکت کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے والے لوگ سامنے گرے درختوں کے تنوں، کھمبوں اور سائن بورڈوں کے مزاحمتی وجود کی شدت سے آگاہ ہوتے تھے اور معلوم مگر مسدود راستوں کی اطراف میں نامعلوم مگر ہنوز کھلے رستوں کے امکان کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ زہرہ نے کئی بار گاڑی کو کہیں بھی بند کر دینے کا عندیہ دیا تو کبیر نے فی الفور "پیدل ہی منزل کی طرف رواں دواں" ہونے کی تجویز دی مگر کبیر کے تازہ دم اصرار پر حیران ہونے کے باوجود وہ اس تجویز پر عمل نہ کر سکی۔ "موت جیسی تھکن" اس نے کبیر کی "کیوں" کے جواب میں کہا تھا۔

"لیکن اس عاشق کی داستان عشق سننے سے پہلے تم موت جیسی تھکن کو وارد نہیں ہونے دو گی۔"

"اگر میں گاڑی کہیں بھی بند کرتی ہوں تو میں وہیں اس کے اندر سو جاؤں گی۔ کبھی کبھی یہ گاڑی مجھے اپنی اصلی ماں لگتی ہے جس کے اندر میں محفوظ ہو جاتی ہوں۔"

"تم فی الحال اپنے آپ کو اس کی مشفق ممتا سے محروم ہی رکھو اور کوئی راستہ ڈھونڈو۔۔۔" کبیر نے سڑک کے بیچ آڑے ترچھے پڑے اور آدھے کھڑے سینما کے عظیم الشان سائن بورڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گاڑی کی روشنیوں میں درختوں کی ٹہنیوں اور ان گنت کاغذوں، شاپر بیگوں کا ڈھیر فلمی

سائن بورڈ کے سامنے اس مقام پر اکٹھا تھا جہاں ایک نارنجی رنگ کا کبڑا مرد ایک گلابی رنگ کی حسینہ سے بغل گیر ہونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"عاشق علی تم نے یہ کبڑا عاشق نامی فلم دیکھی ہے؟" کبیر نے پوچھا۔

انہیں عاشق علی کی سراسیمہ سی جوابی منمناہٹ سنائی دی اور زہرہ نے گاڑی کو پچھلی سمت بھگاتے ہوئے ایک موڑ کاٹا اور پھر گاڑی ایک تنگ گلی میں ڈال دی۔

O

نیم تاریک کمرے میں جس کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ کر چھوٹی چھوٹی گہرائیاں بنا رہا ہے۔ ان گہرائیوں میں پھنسی گھر کی گندگی کا یا تو نکالنا بہت مشکل ہے یا گھر کی کسی عورت نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ گھر کا مرد کمرے میں بچھی دو چارپائیوں میں سے ایک پر جس کے اوپر سبز اور کالی چارخانہ چادر بچھی ہے سیدھا اکڑا بیٹھا ہے اور مسلسل بولے جا رہا ہے۔ اس مرد کا بھائی دوسری چارپائی پر سکڑا ہوا لیٹا ہے اور بظاہر کمرے کی ہر شے سے بے نیاز اچانک انگریزی زبان میں مکالمے بولنے لگتا ہے۔ غور سے دیکھنے اور سننے پر پتہ چلتا ہے کہ تین مردانہ اور ایک زنانہ آواز میں مکالمے اس کی کسی کوشش کے بغیر اور جیسے لب ہلائے بغیر اس کے اندر سے نکل پڑتے ہیں۔ گھر کی دو بہترین کرسیوں پر مہمان مرد اور عورت بیٹھے ہیں جو منصف بھی ہیں اور جو کبھی کبھار گھر کے پہلے مسلسل بولتے ہوئے مرد کو ٹوک کر کوئی سوال کرتے ہیں تو رات کا پچھلا پہر انصاف سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ کمرے کی بائیں دیوار پر کہیں کہیں آرائشی جھنڈیاں لٹک رہی ہیں۔ جھنڈیاں اس قدر پرانی ہیں کہ سب ایک جیسی بدرنگ ہیں۔ اس دیوار کے ساتھ ایک بائیسکل سٹینڈ پر کھڑا ہے۔ بائیسکل کے پچھلے پہیے کے مڈگارڈ کے اوپر لکڑی کے ایک چھوٹے سے تختے کی نشست بنی ہے جس کے اوپر گندے کپڑوں کا ایک بہت بڑا گٹھڑ پڑا ہے۔ گٹھڑ میں سے بے تکان اٹھتی گھر کے ہر فرد کے جسم کی بو چارپائی کے نیچے پڑی انگریزی مکالمے نکالنے والے بھائی کی دوائیوں کی شیشیوں سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں سے مل کر ایک ایسی مہک مرتب کر رہی ہے جس میں زوال کی عارت گری معلق ہے اور جو بار بار انصاف کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ ایسے حائل لمحوں میں منصف مرد کمرے کے واحد روشن دان کی سلاخوں پر نظریں گاڑتا ہے۔ پچھلے پہر کی رات کی مستطیل کے سامنے ایک

Scanned by CamScanner

مکڑی چاروں طرف پھیلائی اپنی کائنات کے مرکز میں خفیف لرزشوں کی آرزو میں مستعد مکڑی ہے اور منصف مرد کو حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ آخر وہ کس طرح کمرے میں سانس لیتی پاگل خواہشوں کی لرزش سے لاتعلق رہ سکتی ہے۔ وہ منصف عورت سے سرگوشی کرتا ہے جبکہ گھر کا پہلا مرد بولے چلا جا رہا ہے۔

منصف مرد ''مکڑی کس قدر لاتعلق اور اپنی دنیا میں کس قدر مکمل ہے۔ یہ کس قدر ناانصافی ہے۔''

منصف عورت ''مکڑی بھی تمہارے بارے میں ایسے ہی احساسات رکھتی ہے۔''

منصف مرد ''میری بے انصافی مکڑی کا انصاف ہے۔ مکڑی کی بے انصافی میرا انصاف ہے۔''

منصف عورت ''تیرا انصاف میری بے انصافی ہے اور میرا انصاف...... سنو، سنو مدد علی بول پڑا ہے۔ میرے خدا اب میری آواز میں......'' ''یہ یہ جہنم کھنڈر کا تہہ خانہ ہے اور ہم چاروں مدد علی کے گنگے پن کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ سنو۔'' (پہلا مرد بولتا جا رہا ہے)

پہلے مرد کا بھائی (زہرہ کی آواز) ''اچھا میں یہ سانپ ادھر چھپا کر رکھتی ہوں......''

(ناصر کی آواز) ''ہاں...... ہاں...... جلدی کرو...... ہاف مین ٹارچ تیار......''

(ہاف مین کی آواز) ''کاہر ہے اور اس کالے جہنمی سوراخ کو روشن کیا چیز کر رہی ہے......''

(ناصر کی آواز) ''میرا مطلب سمت سے ہے۔ ٹارچ کو...... ٹارچ کی روشنی کو سانپ کی سمت گھمانے کے لیے تیار رہو۔ اور تم کبیر تیار ہو......''

(کبیر کی آواز) ''میں ازل سے تیاری کی حالت میں ہوں۔ لیکن اگر تم مدد علی کی آنکھیں بمعہ منہ۔ تمہارے اشارے پر اچانک روشن ہونے والے سانپ کی طرف گھمانے کے حوالے سے میری تیاری و مستعدی کے بارے میں پوچھ رہے ہو تو میں بہترین تجرباتی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فی الحال بھائی مدد علی اس تاریک گوشے کی ماہیت پر غور و فکر کر رہے ہیں کیونکہ میرا ہاتھ ان کے سر کی آزادانہ حرکت کی راہ میں حائل ہے۔ مگر جب تم اشارہ دو گے مزاحمت ختم ہو جائے گی اور وہ کالی زرد سانپ بھائی مدد علی کے بصری ادراک میں بحیثیت اصل سانپ داخل ہوگا اور پھر بعد کے حالات و واقعات وقوع پذیر ہوں گے جن کے بارے میں ہم

فی الوقت کوئی قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف دعا کرنا چاہتا ہوں...... الٰہی اس نفسیاتی تجربے میں برکت ڈال اور صدیوں پرانے اس منحوس عقوبت خانے کی مزید انسانی قربانیوں کی ہوس کو غارت کر...... میں...... ہم''

(زہرہ کی آواز) ''اچھا اب بند کرو اپنی بک بک...... ناصر نے سانپ رکھ دیا......''

(ناصر کی آواز) ''گڈ۔ ہاف مین...... کبیر...... اسے ادھر لاؤ۔ ہاف مین۔ ٹارچ......''

پہلا مرد مسلسل بول رہا ہے۔ پہلے مرد کے بھائی کے منہ سے انگریزی مکالمے نکلنے بند ہو جاتے ہیں۔ منصف مرد اور منصف عورت کے چہرے تحیر اور تاسف سے دھندلا جاتے ہیں اور یک وقت ان کی نظریں مکڑی کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں سے اٹھ کر کمرے کی روشنی کی طرف آنے والا ایک کیڑا مہین جالوں کے گرداب میں پھنسا بے بسی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مکڑی اس کے جسم میں زندہ گوشت کو پانی کر دینے والا سیال داخل کر رہی ہے۔

منصف مرد منصف عورت کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔

''مکڑی اپنی دنیا سے لاتعلق نہیں رہ سکتی''

''جیسے ہم اپنی دنیا سے''

''ہاں مگر یہ تعلق ایک ہی ہے''

''کیا؟''

''مکڑی اور کیڑے کا لا۔ تعلق''

''تم ابھی وہیں ہو''

''میں اور کہیں نہیں جا سکتا''

کبیر نے عاشق علی کی کہانی سنی تو جو خیال کمرے کے گرد و پیش کی دنیا سے لحہ بہ لحہ آگاہ ہونے اور مدد علی کے جنات کے بیانات سننے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں گہری جڑیں پکڑتا چلا گیا وہ یہ تھا کہ یہ تو ایک بالکل اَن ہونی کہانی ہے۔ اس خیال کے ساتھ وہ دوسرے اندازے اور حساب کتاب لگاتا تھا کہ جب وہ ناصر کو یہ کہانی سنائے گا تو اس اَن ہونی کہانی کی اصلیت کہاں تک برقرار رہے گی۔ شاید پہلے سیدھے موٹے موٹے واقعات، سرخیاں ترتیب میں بتانا مناسب رہے گا مگر...... سرخیاں، واقعات کہاں ہیں اور ترتیب کہاں ہے؟ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ

Scanned by CamScanner

یہ بتایا جائے کہ ان ہونی کہانی کے نتائج کیا برآمد ہوئے۔ عاشق علی اور نرس مختار کا معاملہ کیسے بالآخر ناصر کے معاملے تک جا پہنچا۔ مگر کونسا کس کا معاملہ؟ اور پھر خصی کلب کا معاملہ؟ پھر اسے خیال آیا کہ وہ ان ہونی کہانی کا واحد سامع نہیں ہے۔ زہرہ ان ہونی کی اپنی اصلیت بتائے گی اور میں کیا کہہ سکتا ہوں یہ اس کے لیے ان ہونی ہے بھی یا نہیں اور جب ان تینوں میں بات آگے بڑھے گی تو اس ان ہونی کہانی کی اصل اصلیت کیا سامنے آئے گی۔ سنے ہوئے کو سنانے کے درمیان ہزاروں گھاتیں ہیں۔ یہ سوچ کر اسے اپنا آتش شدہ نیلا رجسٹر یاد آیا۔

"آنجہانی ایسی ہی گھاتوں کا رزمیہ تھا" اچانک اس نے زہرہ سے کہا۔

"کیا؟" زہرہ نے حیرت سے منہ اور آنکھیں کھولیں۔

"کچھ نہیں" کبیر نے کہا اور سوچا کہ وہ ناصر سے نیلے رجسٹر کی بات کرے گا ایسے ہی مزے کے لیے۔

عاشق علی خاموش ہو چکا تھا۔ مددعلی کے جنات جا چکے تھے یا نیند کی حالت میں تھے۔ "ٹھیک ہے عاشق علی۔ ہم اب جائیں گے" کبیر نے کہا اور وہ دونوں اٹھے تو عاشق علی نے تھکے ہارے لہجے میں پوچھا۔

"میرے لیے اب کیا حکم ہے سرکار"

کبیر نے ٹھنڈا سانس لیا اور زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہم ناصر کو تمہاری کہانی سنائیں گے۔ پھر دیکھتے ہیں غیب سے کیا حکم ملتا ہے......ہاں البتہ مددعلی کے لیے فیصلہ ہو چکا ہے کہ اب وہ فساد کی جڑ دوائیاں کھانے کی بجائے کھوہ چیتا سائیں جائے گا۔ اس کے جنات کی اصل قدر وہیں ہوگی۔"

"کب جائے گا" زہرہ نے پوچھا۔

"ناصر کو آج کی کہانی۔ بلکہ آج کی سب کہانیاں بشمول ان ہونی کہانی سنانے کے بعد غیب سے حکم لینے کے بعد......لکھنے لکھوانے کے ہمارے کام کا پہلا باب ختم کرنے کے بعد۔ ہم مددعلی کو لے کر سمیال جائیں گے"

"ہم؟"

"ہاں۔ آخر کیوں نہیں، تم جل پچھری کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی"۔

"اور انعام گزشتہ"

"جو بھی پہلے ہوا۔ اچھا عاشق علی"

"سرکار کوئی تو حکم دیں" عاشق علی نے گڑگڑا کر کہا۔

"آ......اچھا تم فی الحال ایسا کرو۔ وہ......اُدھر اس روشن دان میں مکڑی نے بہت بڑا جالا بنایا ہوا ہے۔ اسے صاف کردو۔" پھر وہ عاشق علی کو حیران و پریشان چھوڑ کر باہر آئے تو پو پھوٹنے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر کبیر نے کہا تھا "یہ آسمان چاندی کا آسمان ہے۔" زہرہ جب کبیر کو بیت المقدس کے قرب و جوار میں چھوڑنے کے بعد یاور ہاؤس پہنچی تو بوڑھا سراج اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"تم بہت جلدی جاگ گئے تھے سراج"

"میں ساری رات سویا ہی نہیں بی بی"

"کیوں؟"

سراج ہچکچایا "وہ جی آپ ناراض ہوں گی لیکن ساری رات آپ کی فکر کرتا رہا۔"

زہرہ نے نیند زدہ سا قہقہہ لگایا "اچھا پھر کیا نتیجہ نکلا فکر کا......یہی ناں کہ آج کی رات بھی مجھے کچھ نہیں ہوا۔ جن کی فکر دنیا چھوڑ دیتی ہے انہیں کچھ نہیں ہوتا۔"...."فکر مت کرو۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔"

سراج نے سر جھکا لیا اور بولا "وکیل صاحب آئے تھے جی۔ انتظار کرتے رہے۔ پھر لفافہ دے گئے۔"

زہرہ نے سونے سے پہلے لفافہ کھول کر دیکھا۔ عاق نامے کی عبارت پڑھ کر اسے ہنسی آئی۔ عام فہم واقعے کو کس قدر ناقابل فہم زبان میں پیش کیا گیا تھا۔ پھر اس کے ذہن نے سوال کیا۔ عاق ہونا کس حد تک ایک عام فہم واقعہ ہے۔ پھر اس نے سوچا اس بارے میں وہ پھر بھی سوچے گی اور آہستہ آہستہ دھندلاتے شعور میں منقولہ غیر منقولہ کی گردان سنتے سنتے وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب (26)

ان ہونی کہانی کی کہانی

"نہیں وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ عاشق علی کچھ بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ صرف اس کی کہانی ان ہونی تھی۔" کبیر نے زہرہ کے سوال کے جواب میں کہا۔ وہ غصیلی احتجاجی نظروں سے اسے گھور رہی تھی اور جیسے کہہ رہی تھی "میں تمہیں بچ کر نہیں جانے دوں گی" کبیر نے امداد طلب نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔

ایک مضمحل سی مسکراہٹ ناصر کے باریش چہرے پر پھیل گئی۔ "ان ہونی کا لفظ اب میری لغت میں نہیں رہا۔ جو میرے ساتھ ہو گزرا ہے۔ ہو رہا ہے اور شاید ابھی ہوگا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان ہونی کوئی چیز نہیں۔"

"ہا۔" کبیر نے اپنی مخصوص مضطرب خوشی کی آواز حلق سے نکالی اور بولا "نپولین نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی تھی۔ مگر شاید ابھی وہ سینٹ ہلینا کے جیل خانے میں جلوہ افروز نہیں ہوا تھا۔ جب کہ تم جیل سے یہ بیان جاری کر رہے ہو اور میرا خیال ہے فرانسیسی میں بھی 'ان ہونی' اور 'ناممکن' دو الگ الگ تصورات ہیں لیکن تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس جیل زدہ داڑھی میں تم بہت بھلے لگ رہے ہو۔ لگتا ہے کوئی کمی تھی جو پوری ہو گئی۔"

"میری سب کمیاں پوری ہو گئی ہیں" ناصر نے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا جس پر زہرہ نے اسے ایک بے چین تجسس سے دیکھا۔ وہ کبیر سے اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔ "لیکن مجھے خوشی ہے کبیر تم اپنا تمسخر کا کاٹ دار انداز بدستور کامیابی سے اپنائے ہوئے ہو"

"ہاں شاید۔ ڈھیٹ ہوں اس لیے۔ حالانکہ میرے ساتھ بھی بہت ہو چکی ہے۔"

"آگ سارے جسم کو بھسم کر سکتی ہے مگر ذلت کی آگ روح کو بھسم کرتی ہے" ناصر نے کہا۔

"اور روح اس میں سے کندن ہو کر نکلتی ہے" کبیر نے ٹکڑا لگایا۔

"بے شک ایسا ہی ہوتا ہے" ناصر نے کہا اور پھر کبیر نے بھی اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے لہجے کی گہری، ناقابل تردید افسردگی اور اس افسردگی کی مکمل قبولیت زہرہ اور کبیر دونوں کے لیے ایک اجنبی رویہ تھی۔ کبیر کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے یہ وہ بات ہے جس پر آج اس ملاقات میں بات ہونی چاہیے تھی مگر ہوا یہ کہ میں تمہیں کالی آندھی والی رات عاشق علی ہیرے کی سنائی ہوئی کہانی سناتا رہا۔ بہر حال جو میں نے سنی وہ تمہیں سنا دی۔ بات ختم ہوئی..... جو میں نے سنی۔"

"جو ہم نے سنی صرف تم نے نہیں اور بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔" زہرہ نے کہا اور خصوصی ملاقات کے کمرے میں ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے رکھے ایک بدرنگے صوفے سے اٹھ گئی۔ آہنی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے جیل کے دو باوردی ملازم اب کھل کر اسے گھورنے لگے تھے۔ ان کی گفتگو کے ٹکڑے کبھی کبھی ناصر کبیر اور زہرہ کی ملاقات کے بیچ بیچ گوشت کے متعفن ٹکڑوں کی طرح آ آ کر گرتے تھے۔

"بڑی رن ہے شاہ جی۔"

"ایسی ویسی۔ ویسے تیرا کیا خیال ہے گھگے۔ دونوں کے ساتھ چالو ہے؟"

"او یہ سب کے ساتھ ہی چالو ہوتی ہیں۔"

ناصر کی ملاقات میں تعفن پھیل گیا۔ زہرہ کا چہرہ پہلے زرد ہوا پھر سرخ ہو گیا اور لگتا تھا کہ وہ سلاخوں والے دروازے کی طرف بڑھ کر پتہ نہیں کیا کرنے والی ہے لیکن ناصر نے ہاتھ ہوا میں اٹھا دیا "نہیں۔ وہ ہماری دنیا نہیں ہیں۔ ذلت سب سے پہلے یہی تو بتاتی ہے۔ ہماری دنیا کونسی ہے اور ان کی دنیا کون سی ہے۔"

"ان کی دنیا کی ہونی تمہاری دنیا کی ان ہونی ہے اور تمہاری....." کبیر نے کہا.....

"بکواس۔ پرلے درجے کی لغو۔ ذلیل بات....." اب لگتا تھا جیسے زہرہ سلاخوں والے دروازے کی طرف جھپٹنے کی بجائے کبیر پر جھپٹ پڑی ہو۔

"میں..... میں سمجھتا....." کبیر نے کچھ کہنا چاہا مگر زہرہ نے موقع نہ دیا۔

"وہ بھی۔ اسی قماش کا شخص ہے۔ وہ ہیرا..... اس نے اس عورت کو برباد کیا۔ اس نے اس کی جسمانی ضرورتوں کو جگایا۔ انہیں اشتعال دیا۔ ان سے فائدہ اٹھاتا رہا اور....."

Scanned by CamScanner

"ایک منٹ" اب کبیر نے مداخلت کی اور ناصر سے مخاطب ہوا۔ "اب یہ لازم ہے کہ کالی آندھی والی رات کے واقعات تم زہرہ کی زبانی سنو۔ سچ اور سنائی کے درمیان ہزاروں گھاتیں ہیں۔"

"میں صرف تمہاری۔ وہ کالی آندھی کی رات ہی نہیں۔ بلکہ اس دن کے واقعات بھی زہرہ کی زبانی سنتا۔ مگر جیل کی ملاقات کا وقت خواہ اس میں سپرنٹنڈنٹ کی سفارش بھی کیوں شامل نہ ہو، محدود ہوتا ہے۔"

"اور محدود وقت میں یا تو کہانیوں کا خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے یا ان کے اخلاقی نتائج پر بات ہو سکتی ہے" کبیر نے کہنا شروع کیا "اور اخلاقی نتائج حسب ذیل ہیں۔ مرد عورت کا استحصال کرنے والا جانور ہے۔ کسی ایک مرد کے استحصال کا نشانہ بننے والی عورت کسی دوسرے مرد کو انتقام کا نشانہ بنا سکتی ہے۔ اول الذکر مرد کے ساتھ استحصالی تعلق اور موخر الذکر مرد کے ساتھ انتقامی تعلق کے درمیان بعض اوقات بہت سے ان ہونے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔"

"جنہیں تم ان ہونے کہتے ہو۔ اصل میں وہ صاف جھوٹ ہے۔ دروغ گوئی ہے۔ من گھڑت قصے جنہیں اس شخص نے اپنی بدمعاشی پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑا ہے۔" زہرہ نے کہا۔

"دروغ گوئی ایک پرلے درجے کا تخلیقی فعل ہے۔ کیفے غلام باغ کے سابقہ بیرے کی تخلیقی مخیلہ کے بارے میں میری رائے کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔ نرس مختار بیگم کے ساتھ اس کا تعلق کیسے قائم ہوا اور یہ تعلق پیرا نائیڈ عورت کو لپیٹ میں لیتا ہوا خود ڈاکٹر ناصر کے خلاف نرس مختار کی انتقامی کارروائی پر کیسے منتج ہوا۔ ان نتائج کے اسباب و علل کے حوالے سے جو طلسم ہوش رُبا عاشق علی نے سنائی تمہارا کیا خیال ہے وہ اسے تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے زمانی و مکانی و لسانی و تعقلاتی و حیاتیاتی و نفسانی و روحانی و جدلیاتی و واقعاتی ـــــ" اچانک سلاخوں کے دروازے کے پیچھے سے کچھ مدھم مگر قابل سماعت آوازیں ملاقات میں سرسراتی گھس آئیں اور کبیر نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ویسے مجھے حرام ہے جو مجھے ان حرامزادوں کی کوئی ایک بات بھی اب تک سمجھ آئی ہو۔"

"او شاہ جی آپ نے سمجھ کر کیا کرنا ہے۔ ویسے پاگل زنانیاں ان کی باتیں لگتا ہے خوب سمجھتی تھیں۔"

"توبہ۔ توبہ۔ توبہ میری توبہ۔ عورت سے زیادتی کرنے والے کو اور وہ بھی پاگل عورت سے۔ میرا تو جی چاہتا ہے اپنے ہاتھ سے پھانسی دوں۔"

جیل میں ملاقات کا وہ کمرہ مستقل مراعات یافتہ، یا کبھی کبھار مراعات حاصل کرنے والے قیدیوں کی ملاقات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن یہ خصوصی کمرہ بھی قیدی اور اسکے ملاقاتیوں کو ڈیوٹی پر موجود عملے کی آزادانہ آراء سے محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ آراء اس شک کی بنا پر آزادانہ ہو جاتی تھیں کہ جیسے نہ تو قیدی اور ملاقاتی کی آوازیں باہر محافظ سن پا رہے ہیں اور نہ ہی محافظوں کی آوازیں اندر کمرے میں پہنچ پا رہی ہیں۔ مقبول عام سیاسی قیدیوں کے لیے تو محافظوں کے تبصرے اکثر و بیشتر حوصلہ مندی کا باعث بنتے تھے۔ سنگین پیشہ ور مجرموں پر کوئی بات کم ہی ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تھی تو ایسے قیدی کے لیے بالکل لاتعلق ہوتی تھی لیکن اشتعال انگیز اور عوامی ردعمل کا باعث بننے والے اخلاقی جرائم کے الزامات والے قیدیوں کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ محافظ ایسے کسی قیدی کے جرم کے بارے میں اپنے ردعمل سے بھرے بیٹھے، ملاقات کی ڈیوٹی کو غنیمت جان کر اپنے جذبات کا دل کھول کر اظہار کر ڈالتے تھے اسی شک کی بنا پر کہ شاید اس مرزدہ انسان سے ملنے کے لیے آنے والے ان کی بات نہیں سن پا رہے ہوں گے۔

"ان لوگوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جرم کی بدترین شکلیں مجرم کی صورت میں دیکھی ہوں گی۔" ناصر نے خاموشی کی اس بھاری سِل کو ہٹایا جو خصوصی ملاقات کے کمرے میں موجود دو ملاقاتیوں کے دلوں کو کچل رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ناصر کے چہرے پر ایک ایسا سکون تھا جو کسی بھی سکون سے مختلف اور کہیں آگے کا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "مگر ان سخت گیر پتھر دل اشخاص کے لیے بھی میرا 'جرم' ایسا ہے کہ وہ میری زندگی کا خاتمہ خود اپنے ہاتھوں کی جسمانی قوت سے کرنا چاہتے ہیں۔ کبیر تم ایسے مجرم کے بارے میں کیا کہتے ہو جسے بھیانک سزا دینے کی لذت حاصل کرنا ہر فرد کی ذاتی حسرت بن جائے......"

کبیر کے کچھ بولنے سے پہلے زہرہ ٹھہرے ہوئے غضب ناک لہجے میں بولی "یہ متعفن ذہنوں کے مکروہ مریض لوگ ہیں جن کی تم بات کرتے ہو۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم جانتے ہیں تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"جو جتنا جانتا ہے اسی کی بنیاد پر انصاف کرتا ہے اور یہ کوئی ناانصافی کی بات نہیں۔" ناصر

Scanned by CamScanner

نے کہا۔

''مگر حقیقت تو اپنی جگہ برقرار رہتی ہے'' کبیر نے کھوکھلے سے لہجے میں کہا اور اُس نے اپنے اندر صاف محسوس کیا کہ وہ لمحہ کتنی کے اُن چند لمحوں میں سے تھا جن میں اُس نے حقیقت اور زبان کو ایک دوسرے کے سامنے بے بس پایا تھا۔

''جرم کی حقیقت فردِ جرم سے ہے۔ جرم کی حقیقت کچھ بھی ہو، فردِ جرم برقرار رہتی ہے۔'' ناصر نے کہا اور کبیر نے اور زہرہ نے دیکھا کہ اس کی آواز میں کوئی غصہ، کوئی انتقام۔ کوئی نفرت۔ کوئی احتجاج نہیں ہے اور وہ کسی نامعلوم شناختی کے ایسے خطے میں ہے جو اُن کے لیے بالکل اجنبی ہے۔

''یہ وہ ناصر نہیں ہے جو فردِ جرم سے پہلے کا ناصر تھا۔ یہ ناصر اسی ناصر میں کہیں تھا۔ مگر ہم اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ سننا نہیں چاہتے تھے......'' کبیر نے سوچا اور پھر سوچا کہ وہ زہرہ سے یہ بات کیسے کہے مگر شاید کہ وہ بھی ایسا ہی سوچ رہی ہے۔ نہیں...... زہرہ شاید ابھی بھی عاشق علی ہیرے کی انہونی کہانی کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے اور...... ناصر کے سامنے اسی کسی دیگر بحث میں مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے لفظی منصوبے باندھ رہی ہے دلائل بازی کی ترکیبیں سوچ رہی ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ اس لمحے زہرہ ناصر کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے۔ ''کیا سوچ رہی ہو زہرہ'' کبیر نے کہا اور ہمیشہ کی طرح پھر سوچا یہ جاننے کے لیے کہ کوئی کیا سوچ رہا ہے، یہ کس قدر لغو سوال ہے۔

''کچھ نہیں'' زہرہ نے جواب دیا اور کبیر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ ایسے لغو سوال کا ایسا ہی لغو جواب لوگ ہمیشہ سے دیتے آئے ہیں۔

''کبیر سمجھتا ہے کہ تم نے غلط کہا ہے زہرہ'' ناصر نے کہا۔ ''یہ ہو نہیں سکتا کوئی کہے میں کچھ نہیں سوچ رہا۔ مگر میں تمہیں بتاؤں ایسا ہو سکتا ہے۔ میں پہروں اپنی کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہتا ہوں اور کچھ نہیں سوچتا مکمل طور پر کچھ نہیں۔ مگر چھوڑو۔ میں شاید بتا نہ پاؤں...... سمجھا نہ پاؤں...... ہم...... تم چاہو تو وہیں واپس آ جاؤ۔ عاشق علی ہیرے کی کہانی ان ہونی تھی یا جھوٹی تھی۔ تم ان ہونی کہانی اور جھوٹی کہانی میں سے کسی ایک کو ماننے کا فیصلہ کیے بغیر ٹلنے والے نہیں ہو......''

''ویسے شاہ جی یہ جب بولتے بولتے لمبے چپ ہو جاتے ہیں تو کیا...... میرا مطلب ہے کیا سوچیں آتی ہوں گی ان کو......''

''اپنی...... یا پھر یہ جو ساتھ آئی ہے اس......'' شاہ جی نے اپنے لفظوں کا مزہ منہ میں بھرتے ہوئے کہا، پھر بری طرح کھانسا جیسے غوطہ لگا ہو، پھر ہچکیوں اور کھنگاروں کے بیچ بولا ''پر میری سمجھ میں نہیں آتا، اس طرح کے گندے کوڑے مجرم کو۔ پاگل زنانیوں سے...... زنا کرنے والے کو یہ خاص ملاقات کا کمرہ کیسے دے دیا سپرنٹنڈنٹ صاحب نے۔ کوئی ضرور...... بڑی اوپر کی سفارش کروائی ہوگی......''

وہ جس کا نام لگا تھا بنیا۔ اُس کی ہنسی کی ہر قرش خور کر کسی لفظ کی محتاج نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ بولا۔ ایک ایک لفظ پر سے شیرنی چاٹتا ہوا ''او...... سفارش تو ساتھ آئی ہے شاہ جی، اوپر سے سفارش ڈلوانے کی کیا ضرورت ہے...... ادھر ہی کچھ ڈالنے ڈلوانے سے...... کام برابر...... ہی۔ ہی۔ ہی...... ہا...... تمہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب کا تو پتہ ہی ہے۔ اوپر سے یہ ران...... یہ تو اپنا یار صاف چھڑوا کر لے جائے...... تم اس ملاقات خاص۔ کی بات کرتے ہو۔ او میں تمہیں بتاؤں شاہ۔ قسم خدا سے۔ یہ ران تو کسی مرد سے کچھ بھی منوا سکتی ہے۔ قسم خدا کی...... یہ جیسے اپنی ٹانگوں کے بیچ قابو کر لے ناں...... وہ مرد قسم خدا کی پانی نہیں مانگے گا......''

''نہ پانی کیوں مانگے گا۔ اس نے جو مانگنا تھا مانگ لیا'' شاہ جی نے کہا اور اس پر دونوں خوب ہنسے اور شاہ نے اپنے قہقہوں میں اپنی اس برجستگی پر اپنی داد کو بھی شامل کر لیا اور گلے سے مربیانہ انداز میں کہنے لگا۔ ''ویسے گلے تیری پہچان بڑی قاتل ہے۔ بڑی تاڑ و نظر ہے تیری۔''

''بس شاہ جی نظر جو آ جاتا ہے۔ سامنے......''

''اچھا۔ کیا؟''

''وہی جو ہوتا ہے...... سامنے نظر آتا ہے۔ صاف......''

''اچھا کس کے ساتھ۔ وہ جو پاگل زنانیوں والا ہے۔ اس کا تو خیر چسکا ہی کوئی اور ہے۔ حرامزادے کا...... ویسے دیکھ گلے جیل کی داڑھی میں کیسا مولوی جیسا لگتا ہے۔''

''اس کی مولوی کی......''

''آہستہ بول...... آواز اُدھر جاتی ہوگی......''

Scanned by CamScanner

''اونہیں جاتی..... جاتی بھی ہے تو کیا..... آ..... نہیں۔ نظر آ جاتا ہے، تیرے مولوی کے ساتھ۔ یا..... اپنے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ..... یا یہ جو یار اپنا ساتھ لائی ہے، اس کے ساتھ.....''

''یا تیرے ساتھ.....'' شاہ جی نے بھوکا قہقہہ لگایا۔

''ہائے..... شاہ جی۔ کیا بات کر دی..... وہ تو اب ہوگا..... کئی راتیں سُکھی ہوں گی کیسے کیسے ہوگا..... سب اپنے اختیار میں ہے۔'' دونوں اس اختیار کے تصور پر خوب ہنسے۔

''پر ایک بات بتاؤں تمہیں شاہ جی'' گھگے نے کہا۔

''کیا؟''

''یہ جو اس کا یار ساتھ آیا ہے..... یہ بڑی بدی کرتا ہوگا اس کے ساتھ.....''

''اچھا! وہ کیوں پر.....'' شاہ نے کسی نوآموز کے تجسس سے پوچھا۔

''دیکھتے نہیں۔ شکل، ماتھے پر لکھا ہوا ہے..... بڑے اعلیٰ درجے کے حرامی جو ہوتے ہیں، ان کی شکل ہے یہ..... مجھے تو لگتا ہے..... اس ساری واردات کے پیچھے بھی یہی ہے..... پاگل زنانیوں کے جوس یہی نکالتا ہوگا..... کوئی بڑی گہری واردات ہے.....''

''ہاں..... لگتا ہے..... دفع کر.....'' شاہ نے بے چینی سے کہا، ''تو یہ اول درجے کا حرامی تجھے لگتا ہے بڑی بدی کرتا ہوگا۔ کیسے؟''

''کوئی خاص طریقہ کرتا ہوگا.....''

''ایسا ویسا..... پورا نقشہ سامنے بنتا ہے..... شاہ جی.....''

''اچھا..... تو کھینچ ذرا نقشہ..... ہمارے سامنے بھی.....''

گھگا سلاخوں کے اندر کھڑی 'عورت اور اس کے یار' کو پورے کا پورا اپنے اندر اتارتا ہے اور پھر لفظ لفظ نکال کر کے انہیں شاہ کے سامنے نکالتا ہے.....

یہ ایک معدوم دورانیے کا لمحۂ حال ہے۔ کبیر زہرہ اور ناصر ان ہوئی کہانی اور جھوٹی کہانی میں فرق کو واضح کرنے کے لیے باہم مکالمہ کرتے ہیں۔ شاہ اور گھگے کا مکالمہ ان کی ان ہوئی اور جھوٹی کے درمیان ایک سفاک تسلسل کے ساتھ گھومتا جا رہا ہے۔ ان ہوئی اور جھوٹی ایک ہے یا الگ الگ بار بار کٹ کر الگ ہوتی ہے۔ پھر جڑتی ہے۔ کبیر اور زہرہ کے لیے مکالمہ جاری رکھنا ناممکن ہوتا چلا

جاتا ہے اس صورت میں کہ..... دونوں کرداروں کے لیے مکالمہ جاری رکھنا ناممکن ہے..... اس صورت میں کہ وہ بظاہر خارج از مکاں کرداروں کا مکالمہ انہیں ایک عظیم جارحیت کے ذریعے لا۔ کرداروں میں بدلنے کے درپے ہے۔ ناصر اس صورت حال کی موجودگی کو مسلسل غیر موجودگی باور کرانے کے لیے لسانی اقدامات کرتا چلا جاتا ہے، جیسے کہ شاہ اور گھگے کی گفتگو اس قدر غیر متعلق واقعہ ہے کہ لا۔ گفتگو ہے اور یکسر غیر موجود ہے۔ اور آوازیں کانوں میں داخل ہونے کے باوجود نقطۂ سماعت کو جنم نہیں دیتیں وغیرہ، لیکن کبیر اور زہرہ کے لیے عظیم ذلت کے عظیم انکار کی عظیم قوت حاصل کرنا ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اُن کی لا کرداریت کی تجسیم مکالمے کی اندرونی سمت سے بھی جاری ہو جاتی ہے۔ مقام۔ کردار۔ واقعہ۔ کلام تجرید کے جبر میں معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

نقطۂ ج پر کرداروں کے دو سیٹ۔ ک۔ ز۔ ن اور گ۔ ش (لا) موجود ہیں پھر یہ تین سیٹوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ س ا۔ (ک۔ ز) س ۲۔ (ن۔ ز) س ۳۔ (گ۔ ش)۔ س ۲ میں تعلقات کے امکانات محدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ س ۲۔ س ا کو معدوم کرتا ہے اور واقعۂ ق ا ظاہر ہوتا ہے۔ س ۳ واقعۂ ق ا کو کالعدم کرتا ہے اور واقعۂ ق ۲ ظاہر ہوتا ہے۔ س ا واقعۂ ق ا۔ اور واقعۂ ق ۲ دونوں کو معدوم کرتا ہے اور واقعۂ ق ۳ ظاہر ہوتا ہے جو نقطۂ ج پر ک۔ ز۔ ن اور گ۔ ش کے لا مکانی و لا زمانی اشتراک کا، لا۔ حاصل ہے۔ نقطۂ ج سے پھوٹتی لکیریں ک۔ ز۔ ن کے مشترک زمان کی سمت بڑھتی ہیں اور پھر پلٹتی ہیں، ک۔۔ ز (ماضی)۔۔ ک۔۔ ز۔۔ مستقبل ک۔۔ ز (ماضی ک۔۔ ن (مستقبل)۔۔ ز۔۔ ن (ماضی)۔۔ ز۔۔ ن (مستقبل)۔ لکیریں نقطۂ ج سے منتشر ہوتی ہیں اور دیگر نقطۂ ج پر ہی مرکوز ہوتی ہیں جو معدوم دورانیے کا لمحۂ حال ہے.....

O

''اس لحاظ سے 'دوبارہ لکھو' ایک گمشدہ متن کی تلاش ہے'' کبیر نے لکھوایا اور بیت المقدس میں تبدیل کر لکھوانے کے محدود امکان سے فائدہ اٹھانے کے بعد وہ چلا اور اس نے دیکھا کہ زہرہ وہ فقرہ لکھ چکی ہے اور منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

''تمہیں اتنی منتظر نظروں سے میری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایک مستقل

Scanned by CamScanner

اخلاقی کا انداز اپنانا چاہیے۔ جب تم اگلے فقروں کے انتظار کا تاثر دیتی ہو تو میرے ذہن پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔" کبیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی" زہرہ نے مختصراً کہا اور رائٹنگ ٹیبل پر سامنے پڑے فولڈر میں لگے کاغذوں پر نظر ڈالی۔ آدھے بھرے آدھے خالی صفحے کے اوپر اسے لکھوایا گیا تھا۔ باب اول۔ دوبارہ لکھو.........

"اچھا۔ لکھنا۔ اِدھر" اچانک کبیر کی بے چین آواز اسے سنائی دی" اُدھر مابعد اخلاقی خیالات کے فولڈر میں۔ پہلے باب کا عنوان ابھی ادھورا ہے۔ ابھی طے شدہ نہیں۔ کچھ چیزیں میرے ذہن میں آئی ہیں۔ لکھنا۔ یہ میں بعد میں دیکھوں گا۔"

زہرہ نے کبیر کی طرف دیکھے بغیر میز پر رکھے تین دوسرے فولڈروں میں سے ایک اٹھایا۔ کھولا۔ انگلیوں میں تھامے قلم کو گول گول گھمایا اور کہا "بولو۔"

"باب اول۔ دوبارہ لکھو' کچھ نظری مباحث...... یا پھر...... دوبارہ لکھو ایک وضاحت۔ نہیں۔ چند وضاحتیں۔ ایک نئی تعقلاتی تشکیل۔ بہت بھدا ہے لیکن لکھ لو۔ دوبارہ لکھو۔ ایک عالمی اصطلاح۔ عالمی تحریک۔ بکواس بہرحال لکھ لو...... دوبارہ لکھو۔ علاقیات اور نشانیات کا نیا منطق۔"

"دوبارہ لکھو' جواز کی تعلیل، تاریخی تعلیل......" کبیر نے رک کر ایک کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھامنا چاہا۔ اس کا دایاں ہاتھ لرزش کی زد میں آیا اور گرفت قائم نہ کر سکا۔ "اس کی حالت بتدریج بگڑ رہی ہے"۔ کبیر نے سپاٹ، لہجے میں کہا۔ "یہ بھی درج کرتا ہے؟" زہرہ نے کبیر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"نہیں میں ہاتھ کی بات کر رہا ہوں۔ یہ لرزہ۔ یہ اس دن سے شروع ہوا۔ ناصر کے ساتھ پچھلی ملاقات کے بعد۔" زہرہ نے کبیر کی طرف دیکھا۔ "اب میں اس لیے منتظر نظروں سے دیکھ رہی ہوں کہ شاید تم بتاؤ گے کہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میرا مطلب ہے تمہارے اسی ہاتھ کے ساتھ جس کے ساتھ پہلے ہی کچھ کم نہیں ہو چکا۔"

"اس دن وہاں سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا۔ سوائے ان دونوں کے جن کی آوازیں سلاخوں کے پیچھے سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ بھی کچھ ہو جاتا اگر میں ان میں سے کم از کم ایک کا گلا گھونٹ دیتا۔"

"اس ناکارہ ہاتھ کے ساتھ؟" یہ الفاظ زہرہ کے منہ سے کسی ارادے کسی خواہش کسی علم کے بغیر نکلے۔ اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ شل سے ہو گئے۔ بیت المقدس میں سناٹا چھا گیا اور سناٹے میں کہیں بہت دور سے آتی، کسی ایمبولینس کے سائرن کی آواز اور کھلی کھڑکی کے باہر دہلیز پر پھدکتی چڑیوں کے پروں کی آوازیں نمایاں ہو گئیں۔

زہرہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ان ظالمانہ الفاظ پر کبیر سے کوئی معذرت نہیں کرے گی کیونکہ کبیر جانتا ہے کہ وہ لفظ کسی ارادے اور کسی علم کے بغیر اس کے منہ سے نکلے ہیں۔

"اس ہاتھ کے لکھنے کے عضلات مفلوج اور ناکارہ ہوئے ہیں، گلا گھونٹنے کے نہیں۔ دیکھو ادھر دیکھو۔" کبیر نے کہا۔

زہرہ نے دیکھا کہ کبیر کا دایاں بازو جو اس نے اپنے سامنے پھیلا رکھا تھا، کلائی سے نیچے کسی چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح جھٹکے کھا رہا تھا۔

"تم۔ جانتے ہو، وہ لفظ میرے اختیار اور میرے علم کے بغیر آئے۔" زہرہ نے کہا اور ساتھ ہی اس نے اندر سے اٹھ کر آنکھوں اور حلق میں چھلکنے کو بڑھتے احساس کو راستے میں ہی روک دیا۔

"مجھے ان الفاظ پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔ میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھ کی حرکت بھی میرے علم اور اختیار سے آزاد ہے اور شاید ہمارے وہی الفاظ اور ہمارے جسم کی وہی حرکات بچی ہیں جو ہمارے علم اور ارادے سے آزاد ہیں۔" کبیر نے کہا۔

"جن پر کوئی الزام نہیں" زہرہ نے کہا۔

"اور جن کی کوئی ستائش نہیں۔"

"جو نہ میرے ہیں نہ تمہارے ہیں۔"

"جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے"۔

"اور شاید یہی انہونی کہانی ہے" یک دم زہرہ نے کہا۔

"اور جو سچی بھی ہے" کبیر نے کہا۔

"اور جو جھوٹی بھی ہے"۔

"ناصر کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ بیرا نامیہ عورت۔ نرس ہتار۔ عاشق علی ہیرے کی کہانی کسی کے بھی علم اور کسی کے بھی ارادے سے آزاد ہے۔"

''چلو سب بری الذمہ قرار پائے۔ کچھ باقی نہ رہا۔''

''نہیں ایسا نہیں'' کبیر نے ٹھنڈی سانس لی۔

''مطلب؟۔ ابھی کچھ اور باقی ہے'' زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم سب ابھی بھی باقی ہیں۔''

''انہونی کی باقیات''۔ زہرہ نے کہا اور کبیر کا چہرہ اُس کے لیے دمک اٹھا'' کلام کیسے میرے اندر سے نکل کر تمہارے اندر داخل ہوتا ہے اور تمہارے اندر سے نکل کر میرے اندر داخل ہوتا ہے اور اندرون اور بیرون کے سفر میں کیسے انوکھے معانی سے حاملہ ہو جاتا ہے۔''

''معانی۔ انہونی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔'' زہرہ نے کہا جو سوال بھی تھا اور جواب بھی تھا۔

''ہاں۔ وہی۔ جو تم کہہ چکی ہو۔ تمہارے اندر سے ظاہر ہو چکا ہے۔ انہونی کی باقیات جس کی ذمے داری سے کوئی بچ نہیں سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

''لاعلمی اور بے اختیاری کے ازال کا مزہ لینے والوں کو انہونی کا ایک آدھا انڈہ تو دینا پڑتا ہے اور پھر اسے سینا بھی پڑتا ہے اور پھر جو کچھ اس میں سے نکلے، اُسے پالنا بھی پڑتا ہے'' کبیر نے سفاک لہجے میں کہا۔

''ہوں'' زہرہ نے کہا اور سوچا'' کبیر۔ تم لکھنے کے لیے نہیں بولنے کے لیے پیدا ہوئے ہو'' اور وہ مسکرائی اور پھر بے اختیاری سے ہنسی اور اس نے محسوس کیا کہ کیسے وہ کبیر کے ساتھ اپنے اصل جون میں واپس آتی جا رہی ہے اور 'لکھنے' کے عذاب سے اُسے وقتی نجات مل گئی ہے اور کیا اُسے بھی۔ شاید نہیں...... وہ اب اُسی زبان کا نشہ چڑھ جانے پر اپنی ازلی و ابدی 'بک بک' کی کیفیت میں ہے جس کیفیت میں اس نے اسے پہلی بار پہچانا تھا اور اس نے بھی۔ پھر وہ کچھ دور اس کے ساتھ جا کر واپس پلٹ آئی تھی۔ دونوں واپس پلٹ آئے تھے۔ مگر اب......

''عقل و خرد پر لعنت بھیجنے والی لاعلم اور بے اختیار کرنے والی قوت سے مباشرت کے بعد کچھ تو سامنے آتا ہے۔ ضرور سامنے آتا ہے۔'' کبیر نے زہرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جیسے؟''

''جیسے تمہاری یہ مسکراہٹ۔ جیسے تمہاری یہ ہنسی۔ تم مسکرائی کیوں۔ تم ہنسی کیوں؟''

''نہیں تم پوچھتے میں ہنسی کیوں اور میں روئی کیوں۔ سب رونا باہر نظر نہیں آتا۔''

''چلو یہی پوچھ لیا۔''

''میں ہنسی اس لیے کہ جیسا تم بولتے ہو ویسا کوئی بولتا نہیں ہوگا اور میں روئی اس لیے کہ تم ہی ہو کہ اپنا بولا ہوا لکھ نہیں سکتے۔''

کبیر اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ساکت ہو گیا۔ کمرے میں خاموشی کا سایہ گہرا اتر آیا، اس کے دائیں بازو کے جھٹکے شدید ہو گئے۔ زہرہ نے سب کچھ دیکھا مگر اسے تھامنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اس کے سامنے ایک کرسی میں بیٹھ گیا۔ اُس نے گہری سانس کھینچنی چاہی مگر اُسے اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس نے کمرے کے اُدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا امداد حسین چائے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ نجات کا ایک لمحہ بنا وہ کبیر کے لیے، اندر آ گیا۔

''آیئے امداد صاحب...... باہر کیوں کھڑے ہیں'' کبیر نے کہا۔

''میں پہلے بھی دو بار جھانک چکا ہوں۔ دروازہ بھی کھلا تھا اور آپ نے اجازت بھی دے رکھی ہے۔ پہلے تو آپ بیگم صاحبہ کو...... میرا مطلب ہے زہرہ صاحبہ کو لکھوا رہے تھے۔ ڈکٹیٹ کروا رہے تھے۔ میں نے مداخلت مناسب نہ سمجھی کہ 'لکھائی' کا سنجیدہ کام جاری ہے۔ پھر جب آپ نے...... میں نے آ کر دیکھا کہ آپ بیت بازی کر رہے ہیں تو میں نے سوچا چائے لے آؤں۔ بیت بازی تو مزے کے لیے ہوتی ہے......''

''بیت بازی'' کبیر اور زہرہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ سخت حیرت سے کہا۔

''جی...... جناب...... مگر معافی چاہتا ہوں۔ شعر کچھ ٹھیک نہیں رہے تھے۔ ادھورے مصرعے لگ رہے تھے......''

کبیر اور زہرہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ کہہ کر زبردست قہقہوں سے باز رہنے کا فیصلہ بھی ایک دوسرے کو دے دیا۔

''جی امداد صاحب۔ وہ آزاد شاعری کی بیت بازی تھی۔ نئی نکلی ہے یہ قسم۔ ادھورے بے سروپا۔ لایعنی مصرعوں بلکہ فقروں کی بیت بازی۔ جو جی میں آتا ہے اندھا دھند ایک دوسرے پر داغا جاتا ہے۔'' کبیر نے تشریح کی۔

''اور اسی میں اپنے اپنے مطلب کی بات بھی ہو جاتی ہے'' زہرہ نے اپنے ہی دل میں اپنا

Scanned by CamScanner

مطلب نکالتے ہوئے اور کبیر تک منتقل کرتے ہوئے کہا۔ مگر امداد حسین نے اس کی بات کو یک دم بہت سنجیدگی سے لیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"مگر یہ تو کچھ قابل مذمت....." پھر اس نے سنبھالا لیا "میرا مطلب ہے عجیب سی بات ہے۔ بہر حال زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔"

"بے شک۔ اب ہمارا بھی ارادہ ہے کہ زمانے سے پوچھ گچھ کی جائے کہ آئے دن قیامت کی چال چل جانے سے اس کا کیا مطلب ہے۔"

امداد حسین ہنسا اور زہرہ نے فوری فیصلہ کیا کہ بیت بازی پر قہقہوں کی کسر نکالنے کا یہ اچھا موقعہ ہے اور پھر کبیر بھی اس میں شامل ہو گیا۔ تب امداد حسین نے کچھ مشکوک سے انداز میں ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بہر حال۔ آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ مگر اب تو یہی دعا ہے۔ اللہ آپ کے سیدھے ہاتھ کو تندرستی دے اور اللہ زہرہ صاحبہ کو ہمت اور حوصلہ دے کہ آپ کا لکھوایا ہوا قرطاس ابیض پر پوری وفاداری سے قلم بند کرتی رہیں اور اللہ کرے آپ کی کتاب جلد از جلد منصۂ شہود پر آئے۔ صاحب اب تو اور دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"یقیناً" کبیر نے خشک لہجے میں کہا۔ امداد حسین چلا گیا۔ اس کی جاتے جاتے کی گفتگو نے قہقہوں کا اثر زائل کر دیا تھا۔ چائے کے بعد وہ دونوں پھر اس مقام پر آ گئے جہاں زبان و بیان میں بے اختیار ہو کر جینے کا، بہنے کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔

"لایعنی، ادھورے فقروں کی بیت بازی" اچانک کبیر نے کہا۔

"جسے لکھا نہیں جا سکتا" زہرہ نے کہا

"میں لکھنے کی نہیں۔ دوبارہ لکھنے کی بات کرتا ہوں" کبیر نے تاریک لہجے میں کہا۔

"کرو" زہرہ۔

"لکھنے میں ہی دوبارہ لکھنے کی جڑوں کے بیج دفن رہتے ہیں" کبیر۔

"کھود نکالنے والوں کے لیے" زہرہ۔

"اور پھر بونے والوں کے لیے" کبیر۔

"کیسی مٹی میں؟" زہرہ۔

"مٹی جس میں تاریخ کی کرسیاں میزیں منجمد ہو جاتی ہیں" کبیر۔

"کیسے" زہرہ۔

"انہونی کی باقیات" کبیر۔

"جیسے" زہرہ۔

"جیسے تیز ہوا کی شام" کبیر۔

"جیسے؟" زہرہ۔

"جیسے عاشق علی بیرے کی کوٹھڑی کے روشن دان میں۔ باہر رات کے مقابلے میں جالا تانے بیٹھی مکڑی۔"

"جیسے؟"

"جیسے کانسٹیبل گھلا اور کانسٹیبل شاہ سامنے کھڑے مرد و زن کے برہنہ پتلے بنا کر ہوس کا کھیل دکھلاتے ہیں۔"

"جیسے؟"

"جیسے ذلت کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا ناصر۔"

"جیسے؟"

"جیسے میرا نیم مفلوج ہاتھ جو اب نیم رعشہ زدہ ہے۔"

"جیسے؟"

"جیسے...... جیسے...... مددعلی کے جنات جو ہاف مین کی جرمن اور ہم چاروں کی مختلف زبانوں میں ہم کلام ہوتے ہیں۔"

"جیسے...... ہاف مین کی محبوبہ جو ابھی زندہ ہے...... جیسے...... جیسے۔"

کبیر رُکتا ہے اور گہری منتظر نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ زہرہ میز پر پڑا قلم 'دوبارہ لکھو' کے آدھے صفحے کے باب اول کے اوپر رکھ دیتی ہے اور کبیر کی آنکھوں میں اتر جاتی ہے۔ کلام کا ہیجان ان کے جسموں کے اندر دھمک دیتا ہے۔ جسم کے اندر سے اٹھنے اور جسم کے اندر اترنے کی اتھاہ ہر ایک کے قابو میں ہے مگر دوسرے کو بے قابو کرتی ہے۔

"جیسے؟" کبیر کی آنکھیں دھندلی ہیں۔

Scanned by CamScanner

''جیسے۔ جسم کھنڈر کے اندھے کنویں کو دیکھنے آنے والی گرز یوڈ جانتی ہے کہ کنویں کی سیاہی کا نظارہ کرنے والے دوسرے کون ہیں؟'' زہرہ

''جیسے؟'' کبیر

''جیسے گنجینہ سنگالا'' زہرہ

''جیسے نیلار جنز'' کبیر

''جیسے جنجی نواب کے منہ پر زخم کا نشان چھوڑتا میرا تھپڑ''

''زخم کے نشان کو سہلاتی انگلی جو مدتوں تھپڑ والی کا شہد چھوڑتی ہے'' کبیر جواباً کہتا ہے۔

''آگ'' زہرہ

''ہوا'' کبیر

''پانی'' زہرہ

''مٹی'' کبیر

''ناصر'' زہرہ

''ہاف مین'' کبیر

''کبیر'' زہرہ

''زہرہ'' کبیر

''یادرعطائی'' زہرہ

''باقیات'' کبیر

''وہ سب کچھ جو اور بھی ہے'' زہرہ

''وہ سب کچھ جو ہو سکتا ہے'' کبیر

''وہ سب کچھ جو نہیں ہو سکتا'' زہرہ

''وہ سب کچھ جو لکھا جا سکتا ہے'' کبیر

''وہ سب کچھ جو نہیں لکھا جا سکتا ہے'' زہرہ

''وہ سب کچھ جو بولا جا سکتا ہے'' کبیر

''وہ سب کچھ جو نہیں بولا جا سکتا'' زہرہ

''وہ سب کچھ جو سنا جا سکتا ہے'' کبیر

''وہ سب کچھ جو نہیں سنا جا سکتا'' زہرہ

''اس سب کچھ کو جینے کی ضرورت ہے'' کبیر

''اس سب کچھ کو دوبارہ جینے کی ضرورت ہے'' زہرہ

''دوبارہ لکھو'' کبیر

''دوبارہ بولو'' زہرہ

''دوبارہ سنو'' کبیر

''دوبارہ جیو'' زہرہ

''دوبارہ جیو'' کبیر

''دوبارہ جیو'' زہرہ

''دوبارہ جیو'' کبیر

''دوبارہ جیو'' زہرہ

''دوبارہ جیو'' کبیر

ادھ کھلے دروازے میں امداد حسین پھر نمودار ہوا اور ٹھٹھک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے بے اختیار آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ چند لمحے کسی بوڑھے بلے کی طرح کھڑا ہو تکتا رہا۔ پھر اس نے 'ان معاملات' میں اپنے عمر بھر کے تجربوں میں چند ایک کا اضافہ کیا۔ اول۔ بات اگر بنی بنائی ہو تو توڑا کرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوم۔ شعر و شاعری بلکہ لکھنے لکھانے میں اشتراک بعض اوقات مرد و زن کو 'ان معاملات' میں گہرے اشتراک کی طرف بھی لے جا سکتا ہے۔

جب وہ واپس آئے تو زہرہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چلو چلیں۔ انہوں نے انڈے''۔

''کہاں'' کبیر نے پوچھا۔

''انعام گڑھ''

''ہاں۔ بہت دیر ہو گئی۔ مگر چلو چلیں'' کبیر نے کہا اور پھر لکھنے کی میز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس 'دوبارہ لکھو' کے باب اول کے آدھے صفحے کو تم ہی اپنے ہاتھوں سے کاٹ دو زہرہ۔''

''نہیں۔ یہاں سب کچھ ایسا ہی رہے گا۔''

Scanned by CamScanner

"بیت المقدس کا آخری لمحہ"۔

"یہ ابدی رہے گا۔"

"اور وقت اس کے آگے شروع ہوگا۔"

"دوبارہ"

امداد حسین نے حیرت سے ان دونوں کے تمتماتے ہوئے چہروں اور دہکتی ہوئی سی آنکھوں کو دیکھا۔ "مگر جناب مجھے کچھ بتائیں تو آپ کہاں جا رہے ہیں۔ ایسے اک دم اٹھ کر ایسی افراتفری میں......"

"دوسری دنیا میں" کبیر نے کہا۔

"اللہ نہ کرے" امداد حسین نے کہا اور پھر اس نے بہت بے چینی سے زہرہ کی طرف دیکھ کر کبیر کو ایک طرف لے جانے کی کوشش کی۔ "میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ بعض اوقات 'ان معاملات' کے...... میرا مطلب ہے کہ...... کے بعد ضعف اعصابی ضعف عقل پر منتج ہوتا ہے۔"

"آپ درست نتیجے پر پہنچے ہیں۔ میرا کمرہ ویسے کا ویسے بند رہے گا۔ چلو زہرہ"

"مگر کبیر صاحب چھانٹی کا کیا بنے گا۔ علوم کی جماعت بندی کیوں کر ممکن ہو پائے گی"

امداد حسین نے احتجاج کیا۔

"فی الحال کسی بھی علم کی جگہ کوئی بھی علم رکھ دیں" کبیر نے کہا۔

"نئے علم کے آنے تک" زہرہ نے کہا اور اسے اپنا جسم اس قدر ہلکا محسوس ہوا کہ جیسے ہلکی سی چھلانگ اسے عمارت کی چھتوں کے اوپر لے جائے گی۔ وہ امداد حسین کو دیکھ کر ہنس پڑی اور وہ نہال ہوگیا۔

"آپ کا حکم ہے میڈم تو...... خیر...... لیکن...... میرا مطلب ہے......"

"اگر آپ برا نہ مانیں...... تو میرا خیال ہے۔ کبیر کے واپس آنے تک یہ کاروبار بند کر دیں...... ہم آپ کا نقصان پورا کر دیں گے......"

"آ...... نن...... نہیں مجھے نقصان کی کچھ پرواہ نہیں۔ مجھے صرف کبیر صاحب کی پرواہ ہے۔"

"اس کی پرواہ میں کرتی ہوں" زہرہ نے کہا اور امداد حسین کے دل نے کہا یہ معاملہ 'ان

معاملات' سے کچھ اور ہے۔ ان کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ لاجواب سا ہوگیا اور ہارے ہوئے انداز میں کبیر سے پوچھنے لگا "کوئی پوچھ ہی لیتا ہے۔ کوئی رابطہ......"

"میں رابطہ رکھوں گا۔" کبیر نے کہا اور وہ دونوں چلے گئے۔ امداد حسین وہیں سکالرز اولڈ بکس شاپ کے تھڑے پر دھڑ سے بیٹھ گیا۔ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا اور اس قدر غیر متوقع تھا کہ جیسے کوئی حادثہ بیت گیا تھا۔ اس کی کھلی آنکھوں میں سندر شام روڈ کی اکا دکا ٹریفک گزر رہی تھی مگر اندر وہی دونوں کھڑے تھے۔ تپتے ہوئے چہرے اور سینک دیتی آنکھیں۔ ایسے چہرے ایسی آنکھیں اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی تھیں۔ کہاں۔ کب۔ کہیں بہت زمانہ پہلے۔ بہت دور...... اور پھر اسے کالیا اور پارو یاد آگئے۔ وہ دس برس کا تھا، جب ان کے گاؤں سوریا گھاٹ میں کالیے اور پارو پر کالے علم اور جادوگری کا الزام لگا تھا۔ دونوں جوان میاں بیوی تھے۔ ٹھاکروں کے ملازم بدری ناتھ نے الزام لگایا تھا کہ اس نے خود مسلمانوں کے قبرستان میں پارو کو کالی جمعرات کی رات بچے کی لاش پر بیٹھی ننگی نہاتی دیکھا ہے۔ کالیا پاس کھڑا تھا، بعد میں کالیے نے وہیں پارو کے ساتھ مرد کا کام کیا۔ پنچایت لگی تھی اور سارا گاؤں اکٹھا تھا۔ وہ بھی لوگوں کی ٹانگوں میں سے رستہ بناتا آگے جا پہنچا تھا۔ وہ دونوں کھڑے تھے کالیا اور پارو اور ان کے چہرے اور آنکھیں۔ ہاں یہ وہی چہرے اور آنکھیں تھیں جو اسے ان دونوں کے چہرے اور آنکھیں دیکھ کر یاد آئی تھیں...... کالیے اور پارو پر اور بھی بہت الزام لگے...... شمشان گھاٹ کی راکھ پر شیطانی عمل کر کے لوگوں کو کھلانے کا الزام کہ جس سے وہ سوکھ سوکھ کر مر جاتے تھے۔ پھل دار درختوں کو اپھل کرنے کے لیے جادو کیا ہوا بانجھ عورت کا حیض کا خون جڑوں میں دبانے کا الزام اور ایسے ہی بہت سے دوسرے الزام۔ وہ ہر الزام سے انکار کرتے تھے مگر ہر الزام کو ثابت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی گواہ ضرور آجاتا تھا۔ آخر پنچایت نے فیصلہ دیا کہ دونوں کی کمریں جوڑ کر رسیوں سے باندھ کر زندہ جلا دیا جائے۔ پھر انہوں نے آخری خواہش کی تھی کہ انہیں آمنے سامنے جوڑ کر باندھا جائے جو پنچایت نے مان لی تھی۔ امداد حسین نے دیکھا تھا کہ جب وہ انہیں زمین پر گرا کر آمنے سامنے سینے جوڑ کر رسیوں سے باندھ رہے تھے اور پھر اٹھا کر چتا میں ڈالنے لگے تھے تو ان کی آنکھیں تھیں جو ایک دوسرے میں گڑی تھیں جیسے وہ وہاں تھے ہی نہیں۔ سوریا گھاٹ وہاں نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ امداد حسین تھڑے پر بیٹھا بیٹھا لرز گیا۔ پھر چتا کے شعلے بلند ہوئے تھے تو وہ گھر کو بھاگ گیا تھا

Scanned by CamScanner

اور اگلے دنوں اسے خوب بخار چڑھا تھا۔ کسی نے انگریز حاکم کو واقعے کی خبر کر دی تھی۔ گورا کپتان بھوری مونچھوں والا لوگوں سے پوچھتا پھرتا تھا مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ پھر علاقے میں سوکھا پڑا اور بڑا کال آیا اور ہر کوئی سب کچھ بھول بھال گیا۔ انگریز بھی دور دراز کے علاقے سے اناج کال کے علاقوں میں پہنچانے لگا اور لوگ بادشاہ کے انصاف کے گن گانے لگے۔

امداد حسین تھڑے سے اٹھا تو لڑکھڑا گیا۔ پھر اس نے دُکان کے لڑکوں کو بلایا اور پرانی کتابوں کی دُکان بند کر کے تالا لگا دیا۔ لڑکوں کے پوچھنے پر کہ اب دُکان کب کھلے گی۔ اس نے کہا۔

"کچھ پتہ نہیں کب کھلے گی۔ شاید کبھی نہیں۔ بس دعا کرو۔ سوکھا نہ پڑے کال ٹل جائے۔ ہونی کا ٹل جانا انہونی ہے پر دعا میں بڑی طاقت ہے۔ یہ لو مہینے مہینے کی تنخواہ۔"

لڑکوں نے حیرت سے اور پھر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور یہی سمجھے کہ آخر کار بڈھا بالکل سنک گیا ہے۔ وہ بھی چلے گئے اور امداد حسین اپنے کمرے میں جا کر لمبی تان کر سو گیا اور کالے اور پارو کے زندہ جلائے جانے کے خواب دیکھنے لگا۔

OOO

باب (27)

انعام گڑھ

کبیر اور زہرہ کی آنکھوں میں وحشت بھری تھی۔ وحشت جو برباد مقامات کے پر ہول سناٹے کو کفن لپیٹے اور ویرانوں میں بے آواز گھومتی ہوا کے اچانک چھو لینے پر طاری ہو جاتی ہے۔

انہیں انعام گڑھ کے قصبے کے باہر سڑک کے کنارے پر سے گزرتے ایک نوجوان دیہاتی لڑکے کی باتیں یاد آ گئیں۔ زہرہ نے گاڑی روکی تھی اور کبیر نے اس سے ماگھر جاتی اور ماگھر جُو کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت ابھری تھی شاید اس لیے کہ کبیر اور زہرہ جیسے لوگ ایسا سوال کیوں کر رہے ہیں۔ پھر اس نے تنفر سے کہا تھا۔ "اب تو یہ لوگ ادھر کوئی خاص کر نہیں۔ مر کھپ گئے ہیں شاید اُدھڑ گئے ہیں۔ پر بڑے بزرگ بات کرتے ہیں کبھی ادھر بہت ہوتے تھے۔ کتا بلا ہر چیز کھا پی جاتے تھے۔ اپنے ہی منحوس طور طریقے تھے ان کے۔ اللہ معافی دے۔ ادھر شہر میں بھی سنا ہے ان کے بندے زنانیاں آتے جاتے تھے۔ عورتیں حرام کام کرتی تھیں اور بندے جو کوئی کہے پیسے دے کر کرا لے۔ پتہ نہیں۔ بس بزرگ بتاتے ہیں۔ پر اب کوئی ہیں نہیں خاص کر ادھر۔ آپ نے......"

"کہاں رہتے ہیں۔ راستہ۔ کدھر سے جاتا ہے"۔ کبیر نے اسے پوچھا تھا اور اس کا فی غیر متوقع اطلاع کے اثرات زہرہ کے چہرے پر دیکھے تھے جو بے حس تھا اور بھوئیں سکڑی ہوئی تھیں۔ دیہاتی لڑکے نے شمال مغرب کی طرف ایک مبہم سا اشارہ کیا تھا۔

"ادھر ہے وہ جگہ۔ جدھر کہتے ہیں ماگھروں کی بستی ہوتی تھی۔ یہ کھیتیاں جہاں ختم ہوتی ہیں آگے رکڑ میدان ہے ڈھال اس کی جا لگتی ہے سوکڑ نہر کے کنارے پر۔ آگے اونچے بے ہیں نہرو نہر، کبھی نہر سنا ہے ادھر بنے گی تھی پر نہ بنی۔ جنگل بیابان ہے...... پر آپ کیوں جی......"

"گاڑی ادھر چلی جائے گی؟" کبیر نے پھر اس کو اس کی شدید دلچسپی کا سوال نہ پوچھنے دیا تھا۔

"پولیس کی جیپیں ادھر جا سکتی ہیں تو یہ کیوں نہیں جائے گی پر آپ کیوں؟"

"پولیس کی جیپیں۔۔وہ کیوں؟" کبیر نے پوچھا

"چوروں۔ ڈاکوؤں کا علاقہ ہے......یہی ماگر......یہی سنا ہے قتل مقتل...... پتہ نہیں۔"

لڑکے نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ اگر وہ اس کی دلچسپی کی بات کوئی نہیں بتاتے تو وہ کیوں کچھ اور بتائے اور جب وہ کچھ اور بتائے بغیر ہی آگے کو چل پڑا تھا تو کبیر نے سڑک کی بائیں طرف دیکھا تھا۔ کچھ دور انعام گڑھ کا قصبہ افق میں ایک عظیم القامت قبر کی طرح بلند ہو رہا تھا۔ دائیں طرف حد نگاہ تک کھیت اور درخت تھے جن کے آگے کیا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ ایک سُن کر دینے والی خاموشی دونوں پر طاری تھی۔ جس میں کسی بھی گفتگو کی ضرورت نہ تھی۔ زہرہ نے کچھ آگے بڑھ کر گاڑی دائیں طرف ایک کچے راستے پر ڈال دی تھی جو کھیتوں اور درختوں کی قطاروں کے بیچ میں سے ٹیڑھا میڑھا گزرتا کسی، معلوم مقام کی طرف جا رہا تھا۔

اور وہ نامعلوم مقام جب آیا تو انہیں فوری علم ہو گیا کہ یہی ان کا اصل مقام ہے۔ دُور کھیتوں کی حدود ختم ہونے کے بعد وہ رکڑ میدان تھا جو ڈھلوان ہوتا ہوا آگے جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کے گھنے پھیلاؤ سے جا ملتا تھا جو اور بھی آگے بڑھ کر مٹی کے بڑے۔ بڑے تودوں کی لمبی قطار تک جا پہنچتا تھا۔ مٹی کے ٹیلوں جیسے یہ تودے کسی زمانہ قدیم کی شہر سازی کی باقیات تھے۔ انہوں نے گاڑی درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے کھڑی کی اور پیدل اس سمت میں بڑھے تھے پھر وہ رک گئے۔ میدان میں لاتعداد مربع مستطیل کہیں تکون اشکال کے نشانات تھے جو ابھری ہوئی سخت مٹی کی لکیروں سے بنے تھے۔ زہرہ کو یاد آیا جب وہ بچپن میں ایک دفعہ سکول کے گرل گائیڈز کے کیمپ میں شرکت کے لیے گئی تھی تو کیمپ ختم ہونے کے بعد جب خیمے اکھاڑے گئے تھے تو ایسے نشانات زمین پر باقی رہ گئے تھے مگر یہ نشانات ان عارضی اور بھربھری مٹی کی حدود بندیوں سے بہت مختلف تھے۔ یہ مربعے مستطیلیں تکونیں میدان میں جم کر بیٹھی تھیں اور کسی بڑے خاتمے کی خبر دیتی تھیں۔

تب انہوں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا تو ویرانہ انہیں نگل جانے کو آیا تھا۔ دوپہر کا سورج سر پر چمکتا تھا۔ سناٹے میں ہوا بجتی تھی اور خشک مٹی کے مربعوں اور مستطیلوں میں اُگے ناگ پھنی۔

تھوہر۔ آک۔ بھنگ اور دھتورے کے پودوں میں سے گزر کر جب ان اجنبی ہستیوں کو ناپسندیدگی سے چھوتی وہ ہوا آگے بڑھتی تھی تو فضا قدیم زہرناک نباتات کی وحشت سے بھر جاتی تھی۔

"یہ تو کسی......" کبیر نے کچھ کہنا چاہا پھر کہا "یہ تو کسی تباہی کا منظر نامہ ہے۔"

"تباہی جو زمین پر کچھ بڑے نشان نہیں چھوڑتی۔" زہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ جس طرح کے عظیم نشان ہم غلام باغ میں محفوظ کرتے ہیں" کبیر نے کہا۔

"مٹے ہوؤں کے مٹنے کے بعد کوئی آثار قدیمہ باقی نہیں رہتے۔ کوئی غلام باغ باقی نہیں رہتا" زہرہ نے کہا۔

"یہ ایک اور طرح کی آرکیالوجی ہے۔ ان آثار کی جو مٹی میں دبے ہوئے نہیں ملتے۔"

"اس لیے کہ وہ خود مٹی ہیں۔"

وہ ذرا سی بھی دیر کو خاموش ہوتے تھے تو گہری کائناتی خاموشی میں پلٹ جاتے تھے مگر پھر سناٹے کا وہ بلاوا، اچانک اور مکمل مٹ جانے کی سراسیمگی جگا دیتا تھا اور وہ جلد گفتار سے اپنا اور دوسرے کا قیام پھر ممکن بنا دیتے تھے۔

"ان چھوٹے چھوٹے قطعوں میں بھی گھر ہوں گے۔ جہاں یاور عطائی کی نسل بھی زندہ ہوگی۔ اب یہاں کوئی بولنے والا نہیں......" زہرہ نے کہا۔

"نہ کوئی سننے والا" کبیر نے کہا۔

"نہ کوئی جینے والا" زہرہ نے کہا۔

پھر جیسے ان کے اس مکالمے کی فوری تردید کرنے کو وہ آواز ناگ پھنی کے کانٹوں میں سے گزرتی ان تک پہنچی۔ ناگ پھنی کے جھنڈ سے آگے مٹی کے ٹیلوں تک ڈھلوان زمین اس مقام پر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی جہاں کبیر اور زہرہ کھڑے تھے۔ وہ کوئی انسانی آواز تھی اور بجلی کی تیزی سے کبیر اور زہرہ کے درمیان زندگی کی موجودگی کا احساس جگا گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس سمت کو لپکے تھے مگر خاردار جھاڑیاں اور پودے ان کی راہ میں حائل ہو جاتے تھے۔ ڈھلوان رکڑ کچھ ہی آگے جا کر ایک ہموار مگر وسیع و عریض خشک نہر جیسی شکل اختیار کر لیتا تھا جو شمالاً جنوباً دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ خشک نہر کی یہ پٹی اوپر رکڑ میدان میں اُگی نباتات کے علاوہ ببول کیکر۔ جنڈ۔ پھلاہی اور

Scanned by CamScanner

کری کی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ایک خوفناک فصیلے لمبے دبلے پتلے جنگل کا تاثر دیتی تھی۔

زہرہ اور کبیر ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ منظر ایسے اچانک، آنے والے کے سامنے آ جاتا تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے حسی توازن کو بگاڑ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر ببول کے درختوں کے پیچھے کھڑے سوکڑ نہر کے اس ویران بیلے کے جنگلی حسن کو دیکھتے رہے کہ اتنے میں وہ آوازیں پھر انہیں سنائی دیں اور تب انہوں نے ماگھر پٹی کی ان آخری چند تچھڑیوں کو دیکھا جو جنگلی جانات کو صاف کر کے ویسے ہی مربع شکل کے قطعوں میں بنائی گئی تھیں جن کے نشانات اب پرکز میدان میں باقی تھے۔ ہر تچھڑی زمین پر بیٹھے کسی دیوہیکل کچھوے جیسی تھی کہ جس کی پشت پر ان گنت رنگوں کے کپڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا چولا ڈال دیا گیا تھا۔ یہ جگہ چند سو فٹ آگے جا کر مٹی کے اونچے کناروں سے جا ملتی تھی اور وہاں کبیر اور زہرہ نے دیکھا کہ مٹی میں غاروں جیسے سوراخ کھدے تھے اور جن میں سے چند ایک کے سامنے بوری نما پردے لٹک رہے تھے۔ مگر آوازیں۔

اب آوازیں بہت قریب سے آ رہی تھیں اور پھر انہوں نے انہیں دیکھ لیا۔

وہ چند ننگ دھڑنگ بچے تھے۔ جن کی سیاہی مائل بھوری جلد گرد و پیش میں اس قدر گھلی ہوئی تھی کہ ایک طرح سے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ وہ اس تچھڑی کے نزدیک موجود تھے جو ببول کے درختوں کے قریب ترین تھی اور جہاں کبیر اور زہرہ اب اچانک ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چھپنے کا ڈھنگ اختیار کر چکے تھے۔ جنڈ کی کانٹے دار جھاڑی کے نیچے وہ ایک پھٹے ہوئے غلیظ سے اخبار پر کچھ چیزیں بچھائے، اردگرد کچھ بیٹھے کچھ کھڑے تھے اور ان کی گہرے انہماک کی حرکتیں بتاتی تھیں کہ وہ کچھ کھانے میں مشغول ہیں۔ زہرہ اور کبیر ان کے دسترخوان کو قریب سے دیکھنے کے لیے درختوں کی آڑ میں دبے پاؤں آگے بڑھے۔ حیرت بے یقینی اور ابکائی کے احساس نے یک دم اندر سے اٹھ کر زہرہ کے حلق میں ٹھوکر سی لگائی اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے غور سے ان چیزوں کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ کیچڑ اور مٹی میں لتھڑا ہوا ایک شاپر بیگ۔ ایک ادھ کھایا سیب جس کے چبائے ہوئے بھورے حصے پر سگریٹ بجھانے کے نشان نظر آتے تھے۔ جام کی ٹوٹی ہوئی بوتل کے ٹکڑوں کے ساتھ چپکا ہوا سنگترے کا مارملیڈ۔ ابلے ہوئے انڈوں کی پیلی گیندوں جیسی دو زردیاں۔ سوکھی گاجریں۔ سارڈین مچھلی کا کٹا ہوا ڈبہ، دانتوں سے کاٹے ہوئے یا چھری سے کاٹے ہوئے۔ ہاتھ سے توڑے ہوئے۔ سینکے ہوئے۔ کچے۔ سڑے ہوئے۔ سبزی مائل

پھپھوندی زدہ ڈبل روٹیوں کے بے شمار ٹکڑے۔ پچھڑی ہوئی مرغ کی ٹانگیں اور چانپیں جن کے ساتھ غالباً گوشت کے کچھ ریشے ابھی چپکے باقی تھے۔ مکی کے بھٹے اور ایسی ہی چھوٹی موٹی بہت سی اور چیزیں جنہیں زہرہ کی نظر پہچان نہیں پائی تھی۔

"میرے خدا۔ یہ تو کوڑے کے ڈھیروں سے...... اٹھائی ہوئی...... لگتی ہیں" کبیر نے حیرت سے سرگوشی کی "مگر یہاں اس ویرانے میں کیسے......؟" اس نے مزید حیرت سے کہا۔

زہرہ کا بے یقینی کا احساس سُن کر دینے والا تھا وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہ تھی، نہ ہی اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دیکھتی رہی۔ ایک بچہ مسلسل ڈبل روٹیوں میں سے اپنے لیے ابھی تک قابل قبول حصے الگ کر کے ہڑپ کرتا جا رہا تھا۔ ایک اور تھا جو انڈے کی زردی کو ہاتھ کی ہتھیلی پر دھرے اس کی گیندی شکل کو مسکرا کر دیکھتا تھا، غالباً سوچتا تھا کہ اس سے کھیلے یا کھالے اور پھر اس نے کھانے کو ترجیح دی۔ ایک بچی مسلسل جام کی ٹوٹی ہوئی بوتل پر سے میٹھا لیس دار مواد انگلی سے اتارنے اور چوسنے میں مصروف تھی پھر ٹوٹے شیشے نے اس کی انگلی سے خون نکال دیا تو تکلیف کا شائبہ بھی اس کے چہرے پر نمودار نہ ہوا۔ اب وہ ایک بار جام اور ایک بار اپنا خون چوسنے لگی۔ ایک اور بچہ جس کی عمر دس گیارہ سال رہی ہو گی مایوسی سے مرغے کی ٹانگ کی ہڈی کو دیکھتا تھا پھر اس نے ہڈی کو ایک قریب پڑے پتھر پر رکھا اور ایک دوسرے چھوٹے سے پتھر کی ضرب سے اسے توڑا اور پھر ایک تنکے کی مدد سے گودہ کرید کر کھانے لگا......

زہرہ نے نظریں ہٹا لیں اور کبیر کی طرف دیکھا تو کبیر اسے اپنے ایک کان کے پیچھے ہاتھ کا پیالہ سا بنائے ساکت کھڑا نظر آیا۔ پھر اس نے بھی کچھ پوچھے بغیر اپنے آپ کو کسی ایسی آواز کے لیے مجسم سماعت کر دیا جو یقیناً بچوں کے کھانے کی آوازوں اور کھانوں پر اپنے تاثرات کا تبادلہ کرنے کی آوازوں کے علاوہ کہیں تھی۔ پھر اس کے جسم نے اس مدھم ارتعاش کو قبول کر لیا۔ وہ کسی ٹریکٹر یا بلڈوزر کے چلنے کی آواز جیسی تھی۔ "تم نے سنا" اچانک کبیر نے بے اختیار بلند آواز میں کہا اور پھر حیرت انگیز سرعت سے وہ طلسم ٹوٹتا چلا گیا۔ بچوں نے انہیں دیکھ لیا اور وہ سب کچھ بھول کر خوف زدہ جانوروں جیسی آوازیں نکالتے ہوئے تچھڑیوں اور کھڈوں کی طرف بھاگے۔ پھر ان کے بڑے بھی ویسی ہی نیم انسانی نیم حیوانی کیفیتوں میں سامنے آئے، ماگھر جاتی کے آخری بارہ چودہ مرد و زن۔ ایک سفید بالوں، سفید داڑھی، بھورے جسم اور خمیدہ کمر والا بوڑھا جس کی عمر نوے

Scanned by CamScanner

سے متجاوز ہوگی ایک کھڈے میں سے لرزتا کانپتا ہوا اٹھا تو جاتی کی ایک ادھیڑ عمر عورت نے اسے
سہارا دے کر آگے بڑھایا اور اس کے اصرار پر اسے کبیر کے قدموں میں گرنے میں مدد دی۔ اس
نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی مگر دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے قریب نہ آتے تھے۔ وہ کانپتی ہوئی
آواز میں اپنی بولی میں بولا "چوہدری صاحب..... کالیے اور پارو کو ہم نے دفع کر دیا ہے۔ وہ اب
ادھر نہیں رہتے۔ نہ ادھر آتے ہیں۔ ہم انہیں ادھر نہیں آنے دیتے۔ دفع کر دیا ہے۔ جاتی سے
نکال دیا ہے۔ رحم کریں، رحم کریں.....''

رکڑ میدان میں سے دھتورے، آک، اکسن اور بھنگ کی زہرناک ہوا کا جھونکا آیا اور کبیر کو سر سے پاؤں تک شل کر گیا۔ صرف اس کا دایاں ہاتھ تھا جو اس کی پتلون کی جیب میں جھٹکوں سے لرزتا تھا۔ زہرہ پیچھے کھڑی تھی وہ آگے آ گئی اور بلڈوزروں کی آواز اب پہلے سے زیادہ واضح تھی اور کہیں قریب سے آتی تھی۔

O

رحیم ہنگل کو اس انہونی سی بات کی اطلاع غیاث کاچھر کے بڑے بیٹے ذیشان کاچھر نے دی کہ بڑے شہر کے کوئی مرد عورت ہاکڑوں کے کھنڈروں میں آ کر رہ رہے ہیں۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ سوکڑ نہر جسے انعام گڑھ کے کوڑے سے پتہ نہیں کب سے کن زمانوں سے بھرا جا رہا تھا وہ بھرائی لگتا ہے کہ اب آخرکار مکمل ہونے والی ہے اور ہاکڑوں کے کھنڈروں تک جا پہنچی ہے۔ ذی شان کاچھر نے جو رحیم ہنگل کا داماد بھی تھا اور انعام گڑھ کی دو بڑی اصیل نسلوں کے اتحاد کی ایک عمدہ اور کامیاب مثال تھا اس نے اپنے سسر کو یہ بھی بتایا کہ کالیا اور پارو ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ ستر سالہ چوہدری رحیم ہنگل نے داماد کی سب باتیں سن لی تھیں مگر وہ سوچ مسلسل ایک ہی بات رہا تھا۔ یہ کون مرد عورت ہیں جو اس جنگل بیابان میں ان وحشیوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ انہونی سی بات ہے اور چوہدری رحیم ہنگل کو علاقے میں انہونی باتیں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ ایسی باتوں کے لیے بڑا شہر اور اس سے بھی بڑا ملک کوئی کم ہے۔ اس کا پختہ خیال تھا اور سب ہنگل اور کاچھر سرزمین بھی اس سے متفق تھے کہ کم از کم اپنا علاقہ صاف ستھرا سمجھ میں آنے والا ہونا چاہیے۔ نہ سمجھ میں آنے والی منحوس باتیں ادھر نہیں ہونی چاہئیں اور

دنوں سے پہلے تو بالکل بھی نہیں۔

O

جیل میں ناصر کے نام کبیر اور زہرہ کا ایک وقت مشترکہ خط:

''.................. (جاری) ذرا اس لمحے کی شدت کا اندازہ لگاؤ۔ صورت حال کی مکمل دیوانگی کا ادراک کرو۔ ایک نامعلوم شخص میرے قدموں میں گرا مجھ سے رحم کی اپیل کر رہا ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے کہ ان مجبور و مقہور انسانوں کا جرم کیا ہے۔ کالیا اور پارو کون ہیں۔ ان سے کونسا جرم عظیم سرزد ہوا ہے۔ سورج سر پر چمکتا تھا اور جیسا میں نے تمہیں بتایا اوپری رکڑ کی نسبت یہاں گھنی جنگلی نباتات اور کانٹے دار درخت تھے۔ خودرو زہریلی نباتات کی کانٹے دار جارحیت گرم دھوپ کے اٹھائے ہوئے مرطوب ابخروں کی ملائمیت سے مل جاتی تھی اور موت اور زندگی اور اذیت اور لذت کی یک دم موجودگی کا ایسا احساس پیدا کرتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہیں۔

میں لکھتی ہوں۔ زہرہ۔ جیسا کبیر نے تمہیں شروع میں ہی لکھوا دیا تھا کہ یہ خط تمہیں ایسے ہی ملیں گے۔ اس کے لکھوائے ہوئے کو لکھتے وقت جہاں میں چاہوں گی، اسے خاموش ہونے کا اشارہ کر کے خود لکھنا شروع کر دوں گی۔ یہ تجربہ اس قدر ہمارا مشترک ہے کہ اور کوئی ہو نہیں سکتا مگر پھر بھی کس قدر مختلف ہے۔ الفاظ میں، میں بھی کس قدر بیان کر پاتی ہوں۔ علیحدہ بات ہے مگر میں اس وقت کانٹے دار جھاڑیوں اور دھوپ کے بخارات وغیرہ کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہی تھی۔ میں صرف اور صرف اپنے اور ان بارہ پندرہ انسانوں کے تعلق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ساری عمر میں اپنے باپ اور خود اپنے نسلی اصل کے بارے میں جستجو کرتی رہی۔ کتنے ہی سوال میری زندگی کے مختلف زمانوں میں جن میں سے کئی ہم سب نے (چاروں نے۔ تینوں نے۔ دونوں نے؟) حل کر دیکھے ہیں اور کچھ حصے اکٹھے جئے ہیں..... کتنے ہی سوال ان زمانوں میں یاور عطائی۔ میری ماں اور بھائی اور انعام گڑھ اور جب تم معلوم کر کے آئے تھے کہ ماگر جاتی..... تم ہی نے کہیں سے۔ انعام گڑھ جا کے..... معلوم کر کے جب تم نے اس وقت بتایا تھا۔ یاور عطائی کا تعلق ماگر جاتی سے ہے اور یہ سب کچھ مل کر۔ کئی سوال میرے اندر اٹھاتا رہا۔ ان سب سوالوں کا

ایک جواب ایک طرح سے اُس وقت میرے سامنے تھا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ جو ہوا وہ جیسے اک دم ایک بہت بڑی غیریت کا خلا تھا جو میرے اندر پیدا ہو گیا۔ ان بارہ چودہ انسانوں کو دیکھ کر جو ایسی دہشت زدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے جیسے ان پر کوئی قیامت ٹوٹنے والی ہو اور ان میں سے ایک جو یقیناً ان کا سربراہ ہوگا (بلکہ اب تو ہم جانتے ہیں کہ وہی ان کا سب کچھ ہے۔) سربراہ نہیں بلکہ کہنا چاہیے بادشاہ۔ ذرا سوچو بارہ چودہ مرد، عورتوں اور بچوں کا بادشاہ۔ اب کبیر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ان کا مورخ بھی ہے۔ مانگر جاتی کا مورخ۔ بہر حال یہ باتیں آگے آئیں گی اور کبیر ان پر کافی بات کرنا لکھوانا پسند کرے گا۔ وہ شخص کبیر کے قدموں میں گرا گڑگڑا رہا تھا۔ میں بات کر رہی تھی غیریت کی۔ یہاں کوئی زیادہ مضبوط لفظ ہونا چاہیے جیسے مکمل دوری کا احساس۔ خیر میں نے اوپر لکھ دیا تھا کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ در حقیقت بہت کچھ ہوا مگر ویسا نہیں جیسا میں عمر بھر سوچتی رہی مگر سوال یہ ہے کہ میں عمر بھر کیا سوچتی رہی بلکہ کیا اسے سوچنا کہہ بھی سکتے ہیں۔ وہ کیا تھا۔ بھیا تھا ایک..... کیا ایک معجزے کا انتظار۔ ہاں اس سے کچھ ملتا جلتا۔ اپنی گم شدہ اصل۔ جسے میرا باپ چُھپانا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے اگر وہ نہ چھپاتا تو..... تو میرے لیے کچھ بھی باقی نہ رہتا..... اپنی گم شدہ چھپائی گئی اصل کو پالینے پر کوئی معجزہ ہونے کی توقع..... ایسا معجزہ جو تمام زندگی کے ماضی کے خلا کو بھر دے گا؟ مگر یہاں تو ایک اور خلا کا سامنا تھا..... ایک..... کچھ..... میں۔

کبیر۔ زہرہ نے مجھے یہ سب کچھ سنایا جو مجھے اشارہ اور اجازت ہے کہ آگے اگر میں چاہوں تو لکھوں یعنی لکھواؤں کیونکہ یہاں محاورتاً اور حقیقتاً زہرہ کا قلم جواب دے رہا تھا۔ حالانکہ قلم بدستور اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ میرے "یہ عظیم افکار" قلم بند کرتی جا رہی ہے۔ دراصل تھوڑی وضاحت کی ضرورت ہے۔ پچھلی دفعہ تمہارے ساتھ جیل میں ملاقات بلکہ خصوصی ملاقات کے دوران جہاں عاشق علی بیرے کی انہونی کہانی پر کچھ لسانی تگ و دو ہوئی تھی وہاں تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے ذکر کیا تھا کہ میرے لکھنے والے ہاتھ کی معذوری کے بعد میں نے اور زہرہ نے لکھائی کا ایک طریقہ کار وضع کیا ہے اور اس کی کچھ تربیت (دوطرفہ) بہم پہنچائی ہے۔ وہ تو خیر کانسٹیبل گلا اور کانسٹیبل شاہ کے حیوانی و نفسانی اظہاریوں نے سب کچھ چوپٹ کر دیا تھا اور ہم ذلت کی کیف و مستی کی تمہاری نو دریافت شدہ منزل تک پہنچنے میں ناکام ہو کر مفرور ہو گئے تھے۔ مگر ان سب پیچیدہ کیفیات اور اُن کے لسانی و روحانی انشراح کا جمع جتھا اور کچا چٹھا بالآخر ایک روز بیت الخلا میں

یک جا ہوا۔ میں اپنے آپ کو مسلسل اشتعال دلاتا ہوا آخرکار اس تخلیقی کرب و بلا کے مقام پر جا پہنچا تھا جہاں عمر بھر کی لا لکھائیوں کو ہڑپ کرنے یعنی سکالرز اولڈ بکس شاپ کے ساتھ بھسم ہونے کے بعد پھر ققنس جنم لیتا ہے اور ایک نیا راگ الاپنا شروع کرتا ہے۔ میرے اندر ایک ایسا یقین تھا اور وہ یقین کوئی ایسا اندھا بھی نہ تھا صاف نظر آتا تھا کہ وہ عمل جسے میں دوبارہ لکھائی کی بک بک کہتا ہوں اُس کے اصول و ضوابط اور نشیب و فراز کیا ہوں گے۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، فلسفہ اور دیگر یک بک کے کونسے مقامات آہ و فغاں میں سے کیا فیض حاصل کرنا مقصود ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ سب کچھ ہر طرح تیار تھا فرق صرف اتنا تھا کہ بات میرے منہ سے نکل کر زہرہ کے کانوں سے ہوتی ہوئی پھر اُس کے ہاتھوں سے جا نکلتی اور میرا دست راست اس دوران بھلے اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے کانپنے کے شغل میں مصروف رہتا۔ باب اول یعنی دوبارہ لکھو، کے باب اول کو لکھنا شروع کرنے کے تمام انتظامات مکمل تھے..... مگر..... آہ..... مگر..... جیسا کہ زہرہ نے اپنی بچی اور براہ راست زبان میں کہا کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ شاید آدھے صفحے کی فقرہ بازی کرنے کے بعد..... وہی جیسا اس نے مانگر جاتی کے دس چودہ افراد کو سوکڑ نہر کے زہریلے کانٹے دار جنگل میں یک دم سامنے پا کر تجربہ کیا۔ ایک بہت بڑی غیریت کا خلا..... عجیب مماثلت ہے یا شاید وہم ہے کہ مماثلت ہے۔ میں زہرہ سے کہتا ہوں کہ وہ ابھی پیچھے لکھے اپنے الفاظ دوبارہ لکھ دے۔

زہرہ..... مجھے پیچھے دیکھنا پڑے گا۔ ہاں۔ اپنی گمشدہ..... چھپائی گئی اصل کو پالینے پر کوئی معجزہ ہونے کی توقع۔ ایسا معجزہ جو تمام زندگی کے ماضی کے خلا بھر دے گا مگر یہاں تو ایک اور خلا کا سامنا تھا۔

زہرہ۔ میں جاری رکھتی ہوں۔ شاید یہ پہلا اور آخری موقع ہوگا کہ میرے جیسے شخص کے لکھے ہوئے فقرے کو ایک باقاعدہ ادیب نے حوالے کے ساتھ اپنی تحریر میں بیان کیا ہے۔ یہ یقیناً میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ کبیر میرے یہ فقرے سن کر فوراً ہی مداخلت کے موڈ میں آ گیا ہے۔ کبیر۔ زہرہ کی طنز کی گہری کاٹ میرے اندر تک پہنچی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ اندر اب کٹنے کو کچھ بھی باقی نہیں۔ سب کچھ کٹا کٹایا ہے۔ ویسے بھی خلا کو کون کاٹ سکتا ہے۔ منقسم کر سکتا ہے۔ جیسے میں نے خط کے شروع میں کہا تھا۔ اس روز بیت الخلا سے جیسے ہم مکمل طور پر جسمانی اور ذہنی (اور روحانی شاید) طور پر خالی ہو کر نکلے تھے اور مکمل خالی پن کی ایک وحشت ہمارے اوپر

Scanned by CamScanner

سوار تھی جس نے امداد حسین کو متحیر کر دیا تھا۔ مکمل خالی پن کی وحشت ایک خطرناک وحشت ہے، اپنے سے بڑھ کر غیر کے لیے۔ ذرا تصور کرو زہرہ اپنی منزل پر پہنچتی ہے تو اس کا خالی پن ایک اور خلا سے پر ہو جاتا ہے اور میں شاید واپس وہیں پہنچ جاتا ہوں جہاں سے چلا تھا یعنی خلا سے......

زہرہ۔ یہ چل نہیں سکتا کبیر میرے محسوسات اور میں کن کیفیات سے گزری اگر گزر رہی ہوں کیوں اپنے لفظوں میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے، اتفاق سے میں یہاں موجود ہوں اور قلم بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے اس کے اندر کچھ لفظ فقرے وغیرہ سے ہیں جو خواہ مخواہ باہر نکلنے کے لیے بے قابو ہو رہے ہیں اور باہر نکل اس طرح سکتے ہیں کہ اگر وہ میرے اور اپنے اس خلا کو ایک جیسا قرار دے۔ ثابت کر دے۔ میرا خیال ہے ایسا ہو نہیں سکتا یعنی اگر ایسا ہی ہے تو بھی خود اپنے کو پتہ نہیں چلتا۔ سرزد ہوتا جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب لوگ نچی اور بچی اور شاید اوپر اور اوپر کی سطحوں پر اکٹھے سے ہوتے چلے جاتے ہیں تو یہ سب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جیسا اس روز کبیر کے باب اول شروع کرنے میں شدید ناکامی کے بعد ہوا۔ تو وہ سب کچھ ہمارے درمیان ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی اس ہوتے چلے جاتے کو۔ کو پکڑنے کی کوشش کرے اس کو بیان کرنے کی کوشش کرے تو یہ ناممکن ہے اور کبیر پھر بے چین ہو رہا ہے۔ میں یہ لکھتے وقت ساتھ بولتی چلی جاتی تھی وہ سنتا ہے۔ اُسے کچھ کہنا ہے۔ ویسے مجھے نہیں پتہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ شروع سے ہی کیا کہنا چاہتا ہے۔

کبیر۔ شروع اور آخر کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے، شروع اور آخر تمہارا اپنا فیصلہ ہے اور جو شروع ہے وہ آخر بھی ہے۔ ماگر جاتی کے آخری مٹتے ہوئے انسانوں کا پہلا نظارہ ایک شروع بھی ہے اور ایک آخر بھی ہے مگر یہ ایک لمبی بحث ہے اور لمبی بحثوں اور نظریہ بازی کے زمانے گزر گئے۔ ابھی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک بڑا فرق جو مجھ میں اور تم میں ہے تم اس 'ہوتے چلے جانے' کے ساتھ ناچتی چلی جاتی ہو، خوش قسمت ہو۔ میں اس مرض میں مبتلا ہوں کہ میں اپنے لفظی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس 'ہوتے چلے جانے' کے ساتھ گتھم گتھا ہو جاتا ہوں کہ کچھ میرے پاس باقی رہ جائے۔ مگر میری بدقسمتی کی انتہا دیکھو کہ ہر دفعہ بُری طرح شکست کھاتا ہوں اور یہ تمہارا 'ہوتا چلے جانے والا' مجھے مکمل کچل کر میرا سب کچھ چوس چاس کر بھاگ جاتا ہے اور میرا خلا باقی رہ جاتا ہے مگر میں یہ کس بک بک میں پڑ گیا ہوں۔ لگتا ہے میں پھر نیلے رجسٹر کا

اندراج کر رہا ہوں۔ آہ میرا بیچارہ مرحوم و مغفور نیلا رجسٹر......"

ناصر نے ٹھنڈی سانس لی اور خط سے نظریں ہٹا کر اپنی کوٹھڑی کی دیوار پر نظریں ڈالیں، جیل میں شام ہو رہی تھی۔ اور جیل میں خود کلامی ایک بہت معمول کی بات محسوس ہوتی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے بہت سے کاغذوں کو مخاطب کیا.........."نیلا رجسٹر تمہیں واپس مل جائے گا۔ تم دونوں کو ایک دن۔ میں اپنے کمینے پن کا مکمل کر اعتراف کروں گا۔ میں نیلا رجسٹر واپس کر دوں گا مگر یہ جو تم دونوں نے مل کر رجسٹر کھولا ہے، اس بھیانک جگہ میں جا کر۔ یہ کوئی اور ہی رجسٹر ہے۔" پھر اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"...جو جیسے آگ سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ بہر حال میں کہہ رہا تھا کہ یہ میں کس بک بک میں پڑ گیا ہوں۔ دراصل رات باہر نہر کے بلند کناروں میں کھدے ہوئے اس غار نما سوراخ سے باہر تاریک اور بھیانک حد تک خوبصورت ہے۔ مکمل سیاہی میں ہم دونوں ایک موم بتی کی روشنی میں ان چند دستہ کاغذوں پر یہ سب گھسیٹتے چلے جائیں تو وقت اچھا گزر جائے گا۔ لیکن......

میرے خدا تمہارے نام یہ خط بھی ویسا ہی بدہیت بنتا جا رہا ہے۔ جیسا میرا وہ خط تھا جب تم زہرہ کے عشق میں مبتلا ہوئے تھے۔ بڑا پُرآشوب دور تھا۔ مگر اس خط اور اُس خط میں فرق یہ ہے، اب اس میں زہرہ بھی ملوث ہے مگر یہ میں کیا کہہ رہا ہوں، ملوث تو اس وقت بھی تھی۔

زہرہ۔ میں نہیں سمجھتی عشق پر ناممکن مکالمے کے اعادے کا یہ کوئی وقت ہے۔ یہ خط میرے ذریعے سے لکھا جا رہا ہے تو مجھے شدت سے احساس ہے کہ ہم نے تمہیں ابھی تک اس لیے پر روک کر رکھا ہوا ہے۔ جب وہ قابل رحم بوڑھا کبیر کے قدموں میں گرا تھا............اور ہم خواہ مخواہ کی اِدھر اُدھر کی باتوں سے کاغذ کالے کر رہے ہیں۔"

"خواہ مخواہ کی اِدھر اُدھر کی باتیں" ناصر نے آہ بھری "تمہاری یہی ایسی ہی باتیں مجھ پر ہمیشہ فیصلے صادر کرتی رہی ہیں۔" اس نے لائنیں ڈھونڈ کر پھر آگے پڑھنا شروع کیا۔

"حالانکہ اب آگے کا حال بیان کرنا ضروری ہے۔ تم تو انتہائی تجسس کر رہے ہو گے کہ آگے کیا ہوا...... کبیر کچھ کہہ رہا ہے...... تجسس پیدا کرنے اور متجسس اذہان کی تسلی و تشفی کے لیے بیان بازی کا گندہ کام چونکہ میرا ہے اس لیے آگے کا حال میری زبانی سنو۔ فاصلہ وقت کا ہو یا مقام کا واقعے کی بازیافت کو دھندلا دیتا ہے۔ اب اس جگہ آئے ہوئے ہمیں تین دن گزر چکے ہیں یعنی یہ

Scanned by CamScanner

آج تیسری رات ہے جو ہم اس مٹی میں مکعب شکل کے کھدے ہوئے ڈبے جیسے غار میں گزار رہے ہیں بلکہ اسے کھڈا ہی کہنا چاہیے جو لفظاً مگر اس تعبیر کے لیے بولتے ہیں۔ اس دوران جو کچھ بیت چکا ہے، لازم ہے کہ اس لمحے اور پھر بعد کے لمحوں کے میرے بیان کو متاثر کرے گا۔ جبکہ وہ بوڑھا اپنے سفید بال میرے قدموں پر پھیلائے فریاد کر رہا تھا۔ اس لیے میں کیفیات اور تاثرات کو ان کی اصل حالت میں واپس لانے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ ایسی کوشش لاحاصل ہوگی۔ دوسرے ہر لمحہ..... جب ہم یہ کہہ دیں کہ یہ ایک لمحہ ہے تو اس کی ایک 'شریفانہ اظہاری' حد ہوتی ہے۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ صرف اہم نتائجی واقعات بیان کروں۔ دیکھو میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہوں بلکہ ہم کامیاب ہوتے ہیں، زہرہ کی مداخلت کی تلوار..... بلکہ ہم دونوں کی ایک دوسرے کے تحریری بیان میں مداخلت کی تلوار ہر وقت لٹکتی رہتی ہے۔ (آخر لوگ قلم کو تلوار کے طور پر استعمال کرنے کا دعویٰ بھی تو کرتے ہیں۔)

میں نے اضطراری انداز میں فوراً جھک کر اس بزرگ کو شانوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا۔ سب سے پہلا مرحلہ دو طرفہ قبولیت قائم کرنے کا تھا۔ چنانچہ تفصیل میں جائے بغیر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اولاً ہم نے ان لوگوں کا یہ عظیم خوف دور کیا کہ ہمارا تعلق انعام گڑھ کی کسی کا چھر یا نگل برادری سے ہے اور یہ کہ ہم کالیا اور پارو نامی کسی مرد و زن کو گرفتار کرنے آئے ہیں، جنہوں نے مذکورہ اشرافیہ کے کسی بزرگ کے ساتھ کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ (یہ کالیا اور پارو کون تھے اور ان کا جرم کیا تھا اس کا حال آگے آئے گا)۔ جب ہم انہیں اور خاص طور پر ان کے سربراہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہمارا انعام گڑھ کے سرکردہ طبقے سے کوئی تعلق نہیں تو دوسرا مرحلہ آیا جو اصل میں پہلے کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ یعنی اپنی شناخت کرانے کا مسئلہ..... تو پھر ہم کون مرد و عورت ہیں جو اس ویرانے میں..... زہرہ وہی لٹکتی تلوار..... اس لمحے میرے اوپر۔ واضح تھا یعنی ایک دم نظر آتا تھا۔ وہی مکمل غیریت کا خلا۔ مجھے لگتا تھا کہ جو کچھ میں عمر بھر سوچتی رہی اور عجیب غصیل اور کبھی پراسرار فیکشن بناتی رہی، اس سب کچھ کا اس لمحے سے کوئی تعلق نہیں.....
ہاں کیمبر۔

میرا خیال ہے زہرہ کا یہ تجربہ ویسا ہی ہوگا جیسے بعض اوقات 'مہذب دنیا' کے محقق اپنی جڑیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے 'تاریک براعظم' کے کسی مقام پر جا پہنچتے ہیں اور آخر جب کچھ افراد کا سامنا

کرتے ہیں اس آخری علم کے ساتھ کہ یہی ان کی 'اصل' ہیں تو مکمل لاحاصلیت کا احساس انہیں گھیر لیتا ہے۔ یہ ایک مشکل اور دلچسپ موضوع ہے گو کہ بہت متعلق موضوع ہے مگر یہاں اگر اس میں پھنس گئے تو بات کہیں اور نکل جائے گی اور زہرہ یقیناً مجھ سے اتفاق کر رہی ہے کہ فی الحال اسے چٹھی نویسی کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں بارے کہ مقصد ابھی تمہارے تجسس کا ازالہ کرنا ہے..... بات ہو رہی تھی کہ ہمیں مشکل یہ درپیش تھی کہ ان لوگوں کے سامنے اپنی شناخت قابلِ فہم اور قابلِ قبول کیوں کر بنائیں۔ مجھے ایک خیال آیا کہ شاید ہم انتھروپالوجسٹ ہیں اور ایک مٹتے ہوئے وحشی قبیلے کے آخری افراد پر تحقیق کرنے آئے ہیں۔ پھر اس بے ہودہ خیال کو ذہن نے فوراً رد کر دیا ایک تو اس لیے کہ انتھروپالوجسٹ قسم کی کوئی مخلوق ہمارے ہاں پائی نہیں جاتی اور اگر پائی بھی جاتی ہے تو اس کا کوئی قابلِ فہم تصور بھورے بادشاہ تک منتقل کرنا ناممکن ہوتا، ہاں اس پیرِ فرتوت کا نام بھورا بادشاہ ہے اور وہ ماگر جاتی کے ان آخری بارہ چودہ افراد کا بادشاہ ہے۔ یہاں میں نے لفظ بادشاہ محاورتاً یا کسی علامتی طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ جیسے آگے واضح ہوگا (یا شاید نہیں ہوگا) کہ اس جاتی میں بادشاہت کا طرزِ حکومت ہی رائج رہا ہے۔ بھورا بادشاہ فقط بادشاہ ہی نہیں بلکہ ماگر جاتی کا..... کیا کہنا چاہیے مفکر، نظریہ ساز، ماگر جاتی کا فلسفی ہے اور مورخ بھی اور طبیب بھی۔ آہ شاہی طبیب! کیا یاد آ گیا۔ یادرعطائی کے خصوصی کمرے میں شیشے کے مرتبانوں میں ازمنۂ رفتہ کے شاہی طبیبوں کے مکاشفات..... زہرہ نے قلم چھوڑ کر مجھے برفیلی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا ہے، اس لیے میں غیر ضروری تلازمات میں بہکنے سے باز آتا ہوں۔ تو جیسا میں نے کہا ہمارے لیے مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح ایک گمشدہ دنیا کے باقی ماندہ افراد..... یعنی 'انہونی کی باقیات' کے لیے اپنے آپ کو قابلِ قبول اور قابلِ فہم بنائیں۔ جب کہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے کہ بھورے بادشاہ کی فہم کی حدود اور حدودِ اربعہ کیا ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ بھورا بادشاہ اخبار وغیرہ کا کوئی تصور تو رکھتا ہوگا اور مجھے حیرت ہوئی کہ وہ نہ صرف ایسا ایک تصور رکھتا تھا بلکہ بہت ہی بامعنی تصور رکھتا تھا۔ اس نے اخبار کے بارے میں کہا۔ 'ہاں وہ کاغذ جس میں اجاتی، (ماگر تصورِ کائنات کے مطابق دنیا بنیادی طور پر جاتی اور اجاتی میں منقسم ہے) کے بادشاہوں کی جنگ کے حال کی روداد لکھت پڑھت آ جاتی ہے۔' اس جامع تعریف سے مجھے اپنی اور زہرہ کی پہچان قبول کرانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے کہا 'ہم میاں بیوی ہیں اور

Scanned by CamScanner

بادشاہوں کی جنگوں کا حال اِدھر اُدھر سے سن کر اخبار والوں کو جا کر سنا دیتے ہیں کہ وہ آگے اس کی لکھت پڑھت کریں۔ اس طرح ہم روزی کماتے ہیں۔ اس پر بھورے بادشاہ نے خاموشی اختیار کی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر بولا 'تم آپ لکھت پڑھت نہیں کرتے؟'

مجھے اعتراف ہے کہ بھورے بادشاہ کا یہ سوال سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ اس کا وہ سوال کس قدر بامعنی اور حسبِ حال تھا!..... آخر میں خود لکھت پڑھت سے باغی، لکھت پڑھت سے مفرور، لکھت پڑھت سے ہارا ہوا انسان تھا مگر یہ سب اپنی ذہنی کھد بد بھورے بادشاہ تک پہنچانی ناممکن تھی اور ویسے قطعاً ضروری بھی نہ تھی لیکن اس کے سوال کا جواب ابھی میرے اوپر باقی تھا۔ میں نے کہا 'نہیں، ہم صرف 'کہی سنی' اکٹھی کرتے ہیں اور جا کر سنا دیتے ہیں۔' بھورے بادشاہ نے پھر خاموشی اختیار کی گو اب یہ خاموشی بہت طویل نہ تھی مگر اب اس کا سوال اس کی کسی ذہنی الجھن کی غمازی کرتا تھا۔ 'تو۔ تم۔ کہتے ہو تم انعام گڑھ سے نہیں آئے۔' میں نے کہا 'ہم انعام گڑھ سے نہیں آئے، انعام گڑھ آئے ہیں اور بڑے شہر سے آئے ہیں۔' 'وہیں پر' اس نے پوچھا۔ 'تو یہاں کیوں آئے ہو؟' اور یہی وہ پوچھنا بھی چاہتا تھا۔ اب مجھے اپنے اختیار کردہ موقف کے شدید احمقانہ پن کا احساس ہوا۔ گویا وہ پوچھ رہا تھا 'اجاتی کی جنگ کی کنسوئی لینے یہاں آئے ہو۔ تمہاری عقل ٹھکانے پر ہے' لیکن جو اس کے الفاظ تھے وہ یہ تھے 'ماگر جاتی کی بو ہے جو بچی گئی ہے۔ اِدھر اجات کنسولے کا کیا کام؟' اب اجات کنسولے کا۔ یعنی میرا ابھی کام تھا کہ میں جھوٹ سچ بات سے بات بناتا جاؤں اور آگے معاملہ بھورے بادشاہ کی 'جاتی فہم و فراست' پر چھوڑ دوں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ زہرہ نے بہرحال اس مشکل گھڑی میں میری کوئی مدد نہیں کی۔

زہرہ..... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم۔ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں کیا اس ویرانے میں ہم کچھ بھی دیر اور رکیں گے اور کیوں؟ مجھے کچھ بھی خیال نہیں تھا اور میں تو شاید کچھ بھی نہیں سن رہی تھی کہ کبیر اور بھورے بادشاہ کے درمیان کیا بات ہو رہی تھی۔ مجھے ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا کہ اگر میں ان لوگوں کو بتانا چاہوں تو ناممکن ہے۔ یہ کہ میرا باپ انہیں کی نسل میں سے تھا اور ان میں سے اٹھ کر اس نے بڑے شہر میں جا کر کیسی حیرت انگیز زندگی گزاری تھی اور جو بڑا تماشہ جو میرے باپ نے کیا تھا جو خود مجھے کچھ نہیں آتا تھا اور تم جانتے ہو، ناصر اس تماشے نے خود ہمارے ساتھ کیسے کیسے تماشے کیے...... وہ سب کچھ کیا ان بربادوں کو بتایا جا سکتا ہے اور پھر یہ کہ میں انہیں برباد کہتا

ہوں آخر کیوں۔ کیا وہ خود بھی اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہیں۔ میرا ذہن مسلسل۔ نہیں۔ نہیں کی رٹ لگا رہا تھا۔ کس بات کی نہیں۔ یہ بھی پوری طرح واضح نہیں تھا۔ عجیب تماشہ تھا...... میں...... کبیر (فوری مداخلت)...... کیا 'یہ بیک وقت مشترکہ خطوط نویسی' کوئی نیا پیرایۂ اظہار ہے میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ کیسے یہ بظاہر عام سا سادہ سا لفظ زہرہ کی زبان میں سے باہر آ گیا۔ 'تماشہ'۔ مجھے اک دم ایسا محسوس ہوا ہے کہ مدتوں سے مجھے اسی لفظ کا انتظار تھا۔ تماشہ۔ کیا یہ حیرت انگیز نہیں کہ کس طرح ایک ہی لفظ مدتوں اور زمانوں کے عذابوں کو مکمل اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اگر زہرہ اجازت دے تو میں اس کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ کروں گا... خواب۔ یہ خواب تماشہ ہے۔ ہاں زہرہ کو کوئی اعتراض نہیں۔ تو میرے پیارے ناصر تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ اس خواب تماشے کا آغاز تمہیں سے ہوا اور اس رات سے جب زہرہ اور ماگر جاتی کا سپوت یاور عطائی تمہارے وارڈ میں آئے اور جیسا تم نے بتایا تھا اس رات عطائی پر بار بار وحشت طاری ہوتی تھی کہ 'زمین گر رہی ہے'۔ اور زمین اب بھی گر رہی ہے۔ اس وقت جب کہ ہم آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر جنگل بیابان میں مٹی میں کھدے گڑھے میں موم بتی کی روشنی میں یہ مشترکہ چٹھی نویسی کر رہے ہیں دور سے بلند وزروں کی آوازیں اس ہوا کے ساتھ آتی ہیں جو سامنے لٹکے بورے کو ہٹا کر اندر داخل ہوتی ہے..... مگر میں پھر واپس جاتا ہوں، واقعات کو ان کی ترتیب میں ہی آنے دو خواہ وہ خواب تماشہ واقعات ہی کیوں نہ ہوں۔

میں پھر اصل مقام اور اس وقت کی صورتِ حال کی طرف واپس آتا ہوں۔ پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ بھورے بادشاہ کی 'رعایا' نے جب یہ بھانپ لیا کہ ہماری طرف سے انہیں کوئی خطرہ نہیں تو وہ غالباً بھورے بادشاہ کے کسی غیر محسوس سے اشارے پر ہی اپنی معمول کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور اب ہم اس کے روبرو جوابدہ کھڑے تھے کہ اگر ہم اخبار والے ہی ہیں تو پھر بھی یہاں ماگروں کی بو میں ہمارا کیا کام ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے وہ سلسلۂ کلام چند لمحوں بعد ہی منقطع ہوتا نظر آتا تھا اور الٹے قدموں اپنی واپسی بھی صاف نظر آتی تھی۔ بچے پھر اپنے دسترخوان کی طرف پلٹ گئے تھے اور عورتیں جھگیوں میں گھس گئی تھیں۔ لیکن ایک ادھیڑ عمر مرد اب بھی قریب ہی اکڑوں بیٹھا گہرے شک کی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا تھا۔ شک تو بھورے بادشاہ کی نظروں میں بھی تھا مگر میں یہ کہوں گا کہ اس کا شک کچھ عجیب آفاقی کائناتی سطح کا تھا جب کہ اس

اکڑوں بیٹھے مرد کا شک کسی بڑی زمینی کیتلی سے بھرا لگتا تھا سمجھو لو کہ جیسا فرق بلندی پر پرواز کرتے
پرندے کے شک اور چوہے کے شک میں ہوگا۔ بہر حال...... تو میں کچھ بک بک کر کے انعام گڑھ
کی اُس یاترا کے اختتام کا سوچ ہی رہا تھا کہ پھر ایک عجیب ماجرا ہوا اور وہی...... آہ...... یہ کتنا
پُر معنی استعارہ ہے اور کتنی آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ اس خواب تماشے کا ایک اور باب کھل گیا۔
خواب کے آگے خواب کی طرح ہی، قطعاً غیر متوقع، اور تم دیکھو گے کہ اچھا خاصا تماشہ۔ بھورے
نے اچانک ہمیں مخاطب کیا مجھے اور زہرہ دونوں کو یقیناً۔

"تم دونوں ایک دوسرے کے کیا ہو؟"

میں جو پہلے ہی اپنی معمول کی بلا سوچے سمجھے کی بک بک کی ترنگ میں تھا۔ جس کا مقصد
تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ چونکانا، دہلانا اور بس مزے لینا ہی ہوتا ہے...... بولا...... "میں بس
غلام ہوں۔"

"ہاں مجھ سے بہتر کون جانتا ہے" ناصر نے ٹھنڈی سانس لی اور کاغذ پر سے نظریں ہٹائیں تو
کوٹھڑی کی تاریکی پر اسے حیرت ہوئی، یہ تو خط پڑھتے پڑھتے ہی شام سے رات ہو گئی، اُس نے
سوچا۔ پھر اچانک ہر رات اپنے آپ جل پڑنے والا مدھم روشنی کا بلب جل پڑا۔ جو بس تاریکی کو
کچھ کم تاریک کر دیتا تھا۔ ناصر نے ہاتھ میں تھامے اوپر تلے رکھے دس بارہ صفحات کی ترتیب کو
جوں کا توں قائم رکھنے کی کوشش کی۔ صفحات پر کوئی اعداد درج نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بے ترتیب
ہو جانا اچھی خاصی تباہی لا سکتا تھا اور پھر تحریر بھی ایسی کہ جس کا کوئی بھی لفظ آغاز بھی ہو سکتا تھا اور
انجام بھی۔ وہ کبیر اور زہرہ کے اپنے قائم کیے آغاز اور انجام کو اپنی بے احتیاطی سے درہم برہم نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا تو چھت کے عین درمیان لگے بلب کی روشنی نے اُس کے سائے کو فوراً اُس
کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ اُس نے کوٹھڑی کے ایک کونے میں چھپا کر رکھا ایک بال پوائنٹ پین
نکالا جسے جیل کا ایک بھلا مانس کانسٹیبل اپنے بھائی کے لیے پرانے بخار کا نسخہ لکھوانے کے بعد بھول
گیا تھا۔ بخار کو افاقہ ہوا تھا اور کانسٹیبل ڈاکٹر کے لیے اور بھی بھلا مانس ہو گیا تھا۔ ناصر نے کبیر،
زہرہ خط کے صفحات کو اسی ترتیب میں رکھا جیسے وہ لفافے کے اندر سے نکلے تھے اور انہیں بائیں
ہاتھ کے انگوٹھے اور دو انگلیوں میں دبا کر کہ اگر اس نے ذرا بھی اپنی گرفت کمزور کی تو وہ صفحات
آپ ہی آپ اُڑ کر آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے۔ پھر اس نے ایک کے اوپر ایک سے

چودہ تک کے اعداد ثبت کیے اور پھر یک دم انہیں ایسے بے سہارا چھوڑ دیا کہ وہ اڑتے ہوئے ہی
کوٹھڑی کے فرش پر بکھر گئے۔ پھر ناصر نے انہیں چن چن کر ایک سے اکیس تک پھر اکٹھا کیا تو اسے
بے لگام قوتوں پر قابو پالینے کی فتح مندی کا احساس ہوا۔ وہ مسکرایا پھر اپنی اس سب حرکت کے
بچگانہ پن پر ہنسا اور خط پھر پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا اور وہ کیفیت پوری شدت سے اس پر طاری
ہوئی جو کسی حیرت ناک مقام کی جانب پھر پلٹ جانے کا ارادہ کرنے والے مہم جو پر طاری ہوتی
ہے۔ جو نا معلوم کے خوف سے دور بھاگنے کی بجائے اُسی کی جانب بھاگتا ہے۔ وہ نا معلوم مقام
جہاں سے وہ دو آوازیں اُسے آ رہی تھیں جو اس کے لیے دنیا کی سب سے زیادہ مانوس اور سب
سے زیادہ قریبی آوازیں تھیں۔ وہ نا معلوم مقام تاریکی کا ایک منطقہ تھا اور سناٹے کا ایک کرہ تھا
جس میں سے کہیں کسی نیم روشن گوشے میں سے یا کسی گپھا کے کونے میں سے وہ دو آوازیں اسے
آتی تھیں اور اس قدر آپس میں گتھی ہوئی، ایک دوسرے میں اس قدر گھلی ہوئی کہ اکثر ایک
دوسرے کی شناخت ختم کرتی تھیں۔ جیسے گہرے جسمانی اختلاط میں وہ دونوں اپنی اپنی لمبے لمبے کی
ہستی کا حال کہہ ڈالنے کی محال کوشش کرتے ہوں۔ پھر کچھ مانوس تصویریں بنتی تھیں جو کتابوں
کہانیوں کے جانے پہچانے تجربوں نے قائم کی تھیں۔ جیسے مہذب تو آبادکار کسی وحشی قبیلے میں جا
پھنسے ہوں انہیں معلوم نہ ہو کہ وہ آدم خور ہیں یا کیا ہیں اور سنسنی خیزی کے تقاضے کو پورا کرنے
کے لیے رات گہری ہوتی جا رہی ہو۔ یا فرار کے رستے مسدود ہوتے جا رہے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ مگر
اس طرح کی امیجری زیادہ دیر ناصر کے ذہن میں قائم نہیں رہتی تھی کبیر کی بک بک یا زہرہ کی سیدھی
سیدھی بات۔ (اسے پہلی بار زہرہ کا تحریری شکل میں تجربہ ہوا تھا)۔ اسے انعام گڑھ واپس لے
جاتی اور اسے یاد آتا کہ جب وہ زہرہ کی خاطر انعام گڑھ گیا تاکہ اس کے باپ یاور عطائی کے
بارے میں کچھ سراغ لگا سکے جس کے بارے میں وہ زندگی موت کے مسئلے کی طرح پریشان رہتی تھی
تو اس کے پاس صرف یاور عطائی اور اس کے باپ کا نام تھا اور اتنی اطلاع تھی کہ وہ ڈاکیا تھا۔ باقی
سارا مسئلہ اس کے مجسٹریٹ دوست نے حل کر دیا تھا جو کہ ڈاکٹری سے مجسٹریٹی کی طرف چلا گیا
تھا۔ اُسے صرف اُس کے ڈرائنگ روم میں ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے بیٹھنا پڑا تھا اور اس کے کارندے
اطلاع لے آئے تھے کہ ڈاکیا کسی ذلیل و خوار سی نسل سے تعلق رکھتا تھا جس کا نام ماگر جاتی تھا۔
مجسٹریٹ دوست نے انعام گڑھ کی ممتاز نسلوں کے بارے میں بھی اسے بتایا تھا۔ پھر وہ گائی کی دو

Scanned by CamScanner

نرسوں کے بارے میں اپنی یادیں تازہ کرتے رہے تھے۔ واپسی پر قصبے میں سے گزرتے وقت
تازہ چھڑے ہوئے چاولوں کی خوشبو کا احساس ناصر کے باقی ہر احساس پر حاوی ہُوا تھا۔ سوائے
اس مسلسل سوال کے کہ وہ کن الفاظ میں زہرہ کو اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کرے گا...... مگر کبیر اور
زہرہ کی آوازیں جو اس انوکھے خط پر سوار اس تک پہنچ رہی تھیں ایک ایسی فضا بناتی تھیں جس میں
انعام گڑھ کی رائس ملوں کی پھٹک کی مہک نہ تھی بلکہ کسی تاریک ویرانے میں اُگی زہریلی نباتات کی
مسموم اندھیری خوشبو تھی جو دماغ کو چکرا دیتی تھی اور ہوش و حواس کو مختل کرتی تھی۔ خواب تماشہ۔
ناصر کو کبیر کے الفاظ یاد آئے جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے پڑھے تھے اور جن کی طرف وہ پلٹنے کے
لیے بے تاب تھا۔ 'خواب تماشہ' اس نے کہا اور پھر اپنے آپ سے کہا 'تماشہ' خواہ خواب تماشہ ہی
کیوں نہ ہو، اس میں بھی تماشہ کرنے والوں اور تماشہ دیکھنے والوں کی تقسیم قائم رہتی ہے۔ اس
حیثیت کو خواب بھی نہیں بدل سکتا مگر شاید کبیر اسے بھی نہیں مانے گا اور بحث کر کے ثابت کرنے کی
کوشش کرے گا کہ ایسا نہیں۔ تماشہ کرنے والوں کا اپنا تماشہ بھی تو لگا رہتا ہے۔ وہ کچھ اسی طرح کی
بات کرے گا۔

پھر ناصر نے ان دونوں کو ایک لامتناہی تاریک کائنات میں اپنے روشن جسموں کے ساتھ
ایک دوسرے میں پیوست دیکھا اور انہیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے سپرد کر کے اپنی اس
مہاشانتی کی طرف پلٹ جانے کی کوشش کی جو ذلت کی کایا کلپ نے اسے انعام میں دی تھی مگر درد
کی ایک ٹیس اس کے اندر سے اور اندر کی طرف کاٹتی چلی گئی۔ ۔نہیں اب بھی وہ انہیں ایک
دوسرے کے سپرد کر کے کہیں پلٹ نہیں سکتا۔ کتنی ہی بار اس نے اپنے لیے شانت دوری کے مقام
بنائے اور انہیں ایک دوسرے کے سپرد کر کے دور ہٹ جانا چاہا مگر ایسا نہ ہو سکا اور پھر اس نے اپنے
ساتھ ساتھ کے مرد کی ہوس کو بے لگام ہونے کا موقع دیا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں اس قدر گر جائے
کہ بالکل غائب ہو جائے۔ اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنی خواہش کو نرس مختار کی احمقانہ سازش
کا شکار ہونے دیا۔ اس نے [illegible] عورت کی آمادگی کو کسی بھی عورت کی آمادگی سمجھ کر قبول کیا۔ اور
جانتے بوجھتے یہ بھول گیا کہ دنیا جنون کی آمادگی کو کبھی آمادگی تسلیم نہیں کرتی مگر اس نے اپنے آپ
کو بہک جانے دیا۔ اس قدر گھٹیا، اتنا ذلیل۔ معالج کے مقدس رشتے کو پامال کرنے والا ملعون۔
دنیا جس پر تھوکتی ہے مگر اب وہ کامیاب تھا۔ وہ ذلت کی آگ میں بھسم ہونے کے بعد اب جو

شانت ہوا تھا ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ پھر وہ آئے تھے۔ وہ دوبارہ لکھنؤ کے اپنے مشترکہ تحریری کام کی
بات کرتے تھے۔ انہوں نے انہونی کہانی کے قصے کو کھولا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بات تھام کر اپنی
بات آگے بڑھاتے تھے مگر وہ قائم رہا تھا۔ ان کی ہمیشہ کی ایک دوسرے کو خود سپردگی کو دیکھ کر وہ
بالکل ڈانواں ڈول نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کو ان کی دنیا میں چھوڑ کر الگ۔ اپنی اس ذلت کی بھٹی میں
سے نکلی مہاشانتی کی دنیا میں وہ بالآخر ایک ایسی معکوس بلندی پر قائم و دائم تھا جہاں اب کچھ بھی
اسے متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔

ناصر نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ اسے جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس
کے سانس میں ایک تپش ہے اور جسم میں کسی بہت مانوس بخار کی آنچ ہے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ
کھڑا ہوا۔ خط اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ "مگر یہ خط...... یہ جہنمی تحریر اس نے اس جہنم کو پھر سے
زندہ کر دیا ہے جسے میں سمجھتا تھا، ذلت کے بڑے جہنم نے ٹھنڈا کر دیا۔ ٹھنڈا کر دیا مگر نہیں۔ یہ
آوازیں۔ جو ان کے ذہنوں۔ ان کی سوچوں۔ ان کی روحوں کے اختلاط کی آوازیں ہیں اور
جسموں کے اختلاط کی شہوت انگیز پاگل کر دینے والی آوازوں سے کہیں۔ کہیں زیادہ پاگل کر دینے
والی ہیں، اس جہنم کو دہکا دیتی ہیں جسے میں سمجھتا تھا، میں ٹھنڈا کر چکا ہوں......"

ناصر کے جسم نے اور اس کے ذہن نے اس جانی پہچانی ٹیس کو پہچانا جو تماشہ شروع ہونے
کے پہلے لمحے کی پہچان تھی۔ اس نے اپنے سر کو پیچھے کی جانب ڈھلک جانے دیا پھر آنکھیں کھول
دیں۔ چھت کے عین درمیان اپنے آپ ہر شام جل جانے اور ہر صبح بجھ جانے والا بلب جل رہا
تھا۔ ناصر کی آنکھوں میں اس کی سرخ روشنی انگارے جیسی اتر آئی اور پوری کائنات پر پھیلنے لگی۔

'بھلا مانس کانسٹیبل' نے حیرت سے قیدی کو دیکھا جو سر پیچھے ڈالے کھڑا اوپر چھت کی طرف
آنکھیں کھولے کھڑا تھا۔ وہ اسی کی طرف پیغام لے کر آیا تھا کہ اس کا وکیل اس سے ملنے آیا ہے۔
مگر وہ کیسے کھڑا ہے۔ 'بھلا مانس کانسٹیبل' نے اپنی چھڑی سے سلاخوں کو کھٹکھٹایا مگر اس کی حالت
میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ "اللہ معاف کرے" 'بھلا مانس کانسٹیبل' نے سوچا۔ یہ تو ایسے کھڑا ہے جیسے
پھانسی پر لٹکا ہو۔ صرف فرق یہ ہے کہ پاؤں زمین پر لگے ہیں اور سر نظر نہیں آتا۔ 'بھلا مانس کانسٹیبل'
کچھ خوف زدہ سا ہو گیا تو اس نے اونچی آواز لگائی۔ "خیر تو ہے ڈاکٹر صاحب۔ سب خیر تو ہے"
ناصر نے آواز سنی اور اس کا سر جھٹکے سے آگے ہو کر معمول پر آ گیا۔ اس نے کانسٹیبل نذیر کو

Scanned by CamScanner

دیکھا تو اس کے سر کے اندر کی دنیا بھی باہر کی دنیا سے دنیاداری کے توازن کا رشتہ پھر سے استوار کرتی چلی گئی۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

''آؤ کانسٹیبل نذیر۔ کیا بات ہے۔''

''بات تو آپ پہلے بتائیں۔ کیسے کھڑے تھے میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''

''وہ میرے سر میں درد تھا۔ درد رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم سناؤ بھائی کا کیا حال ہے؟''

''میں کہتا ہوں جی معجزہ ہو گیا۔ اب تو بھلا چنگا ہے۔ اللہ نے آپ کے ہاتھ میں ویسے بڑی شفا دی ہے۔ آپ نے بغیر اس کا ملاحظہ کیے نسخہ دیا اور فضل ہو گیا۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔''

''بس یار اب ڈاکٹری ہی کریں گے۔ کہیں دور جا کر۔ اگر یہاں سے رہائی ہو گئی تو......''

ناصر نے بوجھل تلخ لہجے سے کہا۔

''ان شاء اللہ! آپ کا وکیل بڑا قابل ہے اور جناب یہی میں آپ کو بتانے آیا ہوں۔ وکیل آپ کا ملنے آیا ہوا ہے۔''

''وکیل!'' ناصر نے حیرت سے کہا۔ ''اس وقت۔''

ہاں جی آ جائیں میں تالا کھولتا ہوں۔

ناصر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اس وقت بیرسٹر اظہر جعفری کی آمد کے دو ہی سبب ہو سکتے تھے یا تو بہت اچھی خبر یا بہت بری۔ اس نے کیپر۔ زہرہ خط کو احتیاط سے تہہ کر کے واپس لفافے میں ڈالا۔ اس تحریر کا مزید مطالعہ ابھی ممکن نہ تھا۔ اس نے موٹا لفافہ بمشکل جیب میں گھسیڑا اور بھلے مانس کانسٹیبل نے سلاخوں والا دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کا موقع دیا۔

OOO

بھوری مائی اور اُس کا غلام

بیرسٹر اظہر جعفری کے پیشہ ورانہ فلسفے کے مطابق مؤکل کے کیس کی اصل حقیقت' مؤکل کا ایک انتہائی نجی معاملہ ہوتا ہے۔ جس سے وکیل کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا دائرہ کار صرف کیس کی حقیقت تک محدود ہے اور جس سے وہ سب کچھ مراد ہے جو بالآخر مؤکل کی رہائی پر منتج ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کیس کی حقیقت ایک فن پارہ ہے جسے وکیل شواہد اور دلائل کے میڈیم میں اپنی فنی مہارت کے ذریعے تخلیق کرتا ہے۔ قاری یعنی منصف اس فن پارے بعنوان 'باعزت رہائی' کے مواد اور ہیت کی مطابقت اور موزونیت کو تسلیم کرتا ہے یا رد کر دیتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ناصر کے کیس کی حقیقت کو تخلیق کرتے وقت بھی مختلف مراحل پر بیرسٹر جعفری اپنے ذہین اور باذوق مؤکل سے ایک طرح کی جمالیاتی ستائش کا طالب ہوتا تھا اور جس میں ناصر نے کبھی غیر ضروری بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

آج تو اس ستائش کی طلب بہت ہی واضح تھی کیونکہ جعفری کے خیال کے مطابق اس کا تازہ قانونی اقدام ایک آخری فنکارانہ جنبش موقلم کے مترادف تھا جس نے ''ڈاکٹر ناصر کیس کی حقیقت'' نامی تصویر بالکل مکمل کر دی تھی۔ اس نے اپنی اُس تخلیقی سرگرمی سے ناصر کو آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں کسی فنکار کی دادطلب آنکھوں کی طرح ہی چمک رہی تھیں۔

''ڈاکٹروں کے بورڈ نے نرس مختار بیگم کو مکمل طور پر ذہنی مریض قرار دیا ہے۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

''آئی سی... مگر اس سے اُس کے سابقہ بیانات کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے''۔ ناصر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور جعفری بے چین ہو کر بولا۔

Scanned by CamScanner

"کیا بات کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ آپ تو خود اس شعبے میں ہیں۔ ذہنی مرض کوئی نزلہ زکام کی طرح نہیں کہ آج ہے اور پچھلے ہفتے نہیں تھا۔ یہ امراض آہستہ آہستہ پختہ ہوتے ہیں اور آج کے مریض کے سابقہ بیانوں کے پیچھے کوئی سابقہ بیانات کو بھی ناقابلِ اعتبار اور قانونی طور پر ناقابلِ قبول بنا دیتے ہیں۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"میرا خیال ہے، آپ درست کہہ رہے ہیں۔" ناصر نے ویسے ہی غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

"ایک ہی پیشی میں.......... اگلی پیشی میں۔ پرسوں یہ مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کے کراس سے نے یہی بیان دینا ہے کہ آج کی ذہنی مریضہ کے سابقہ بیانات بھی قطعاً ناقابلِ اعتبار ہیں۔ میں آپ کو باعزت رہائی پر پیشگی مبارکباد دیتا ہوں۔"

"اصل مبارکباد کے مستحق تو آپ ہیں، بیرسٹر صاحب! آپ کے ہاتھوں میں حقائق اور واقعات ایسے شکل بدلتے ہیں جیسے کوزہ گر کے ہاتھوں میں مٹی۔"

"آہ! کیا مثال دی ہے جناب واہ۔ ایسے صاحبِ ذوق مؤکل بھی کہاں روز روز ملتے ہیں" بیرسٹر جعفری نے پھڑک کر کہا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" ناصر نے کہا۔

"آ...... یہ ایک مشکل کیس تھا مگر جناب ہم تو فن برائے فن کے قائل ہیں۔"

"جی! آپ نے فرمایا تھا ایک دفعہ...... آپ مؤکل کے کیس کی اصل حقیقت سے بالکل لاتعلق رہتے ہیں۔"

"جی بالکل۔ بالکل لاتعلق۔"

"مگر مؤکل تو لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اپنی اصل حقیقت سے۔ میرا مطلب ہے، اپنے کیس کی اصل حقیقت سے۔" ناصر نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"آ...... درست۔ شاید مگر وہاں میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اُس تاریک دنیا میں نہیں۔" بیرسٹر جعفری نے ایک مصنوعی تاسف سے کہا۔

"مگر ضروری نہیں کہ بھی کی وہ دنیا تاریک ہو۔" ناصر نے ایک کمزور سا احتجاج کیا۔ "میرا مطلب ہے مؤکل کی اصل حقیقت میرا مطلب ہے اس کے کیس کی اصل حقیقت اور آپ کی تخلیق کردہ حقیقت ایک بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"بالکل۔ بالکل۔ سو فی صد۔ بہت ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے مگر میں...... آپ کو راز کی بات بتاؤں...... میں تاریک کینوس پر روشنی کی تصویر بنانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

ناصر نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ روشنی اس نے زیرِ لب کہا اور پھر بیرسٹر جعفری سے مخاطب ہوا

"میری خواہش ہے میں کبھی آپ کی ملاقات اپنے ایک دوست سے کرواؤں۔ وہ یقیناً آپ کے فلسفہ وکالت کو بہت پسند کرے گا۔"

"آ...... ضرور...... ضرور...... وہ بھی وکیل ہے کیا؟"

ناصر ہنسا "نہیں...... کبھی وہ اپنے آپ کو نظریہ باز کہتا تھا...... کسی زمانے میں...... اب تو بہر حال۔ اس کا کہنا ہے کسی بھی نظریے کو سچ ثابت کیا جا سکتا ہے اور پھر اتنی ہی شدت سے اسے جھوٹ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک کھیل ہے...... جیسے چاہو کھیل لو......"

وکیل نے آنکھیں نچائیں "آ...... یہ تو بھی کوئی اپنے قبیلے کا ہی بندہ لگتا ہے۔ کرتا کیا ہے؟"

ناصر کے چہرے پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "بس یوں سمجھ لیں وہ بھی تاریک کینوس پر روشنی کی تصویر بناتا ہے۔ مگر وہ ایک اور کام بھی کرتا ہے......"

"آ...... وہ کیا" جعفری نے پوچھا۔

"وہ روشن کینوس پر تاریکی کی تصویریں بھی بناتا ہے۔" ناصر نے کہا۔

"اوہ۔ گہری بات، کوئی بہت گہری بات۔ مگر میں اس کا مطلب نہیں پوچھوں گا" جعفری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا پھر ٹٹولنے والی نظروں سے ناصر کو دیکھ کر کہنے لگا "مگر تم...... کچھ خوش نظر نہیں آرہے ڈاکٹر...... اپنی باعزت بریت پر۔"

"باعزت بریت کے امکان پر۔" ناصر نے تلخی سے کہا۔

"سو فی صد امکان پر...... جو یقین بن جاتا ہے۔" بیرسٹر نے تصحیح کی۔

"مجھے ابھی علم نہیں میرا کینوس تاریک ہے یا روشن" ناصر نے خشک ہنسی سے کہا "لیکن آپ کے کمالِ فن کا میں معترف ہوں جناب۔"

"OK۔ پرسوں پیشی تک۔ آخری پیشی تک۔ خدا حافظ۔"

بیرسٹر نے پہرے پر کھڑے پولیس کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ ناصر سے مصافحہ کیا اور تیزی

Scanned by CamScanner

سے نکل گیا۔ کانسٹیبل نے ملاقات کے کمرے کو تالا لگایا اور پھر وہ قیدی کو اس کی کوٹھڑی میں بند
کرنے کے لیے لے چلا۔ جو کچھ اس نے سنا اور دیکھا اس سے اسے دو باتوں کا یقین ہو گیا تھا۔
ایک تو یہ کہ یہ ڈاکٹر جس کے ہاتھ میں اللہ نے اتنی شفا دی اسے ضرور سزا ہو جائے گی۔ اگر وکیل
نے اسے کوئی اچھی خبر سنائی ہوتی تو وہ خوش خوش نظر آتا۔ ایسا مایوس تو نظر نہ آتا۔ دوسرے کوئی روشنی
اندھیرے کا مسئلہ ہے۔ شاید کوٹھڑی میں بلب چھوٹا لگا ہوا ہے، اس کی شکایت کرتا ہے۔ یہ سب
سوچ کر اس نے افسوس سے کہا "ڈاکٹر صاحب بری ہونا نہ ہونا تو بڑے لوگوں کے فیصلے ہیں۔ پر
کوٹھڑی کی لیٹ کا تو ہم بھی کچھ کر کرا سکتے ہیں۔ بڑا بلب لگوا دیتے ہیں۔ روشنی ہو جائے گی۔"

ناصر نے سخت حیرت سے اس کی طرف دیکھا "بلب؟ کیا مطلب؟"

"وہ جی۔ روشنی اندھیرے کی بات ہو رہی تھی ناں جی آپ کی وکیل صاحب کے ساتھ۔
تاریکی یعنی کہ۔۔۔۔" اور ناصر بے ساختہ ہنس پڑا اور اسے محسوس ہوا ایسی بے ساختہ ہنسی شاید اسے
مدتوں بعد نصیب ہوئی تھی۔

"نہیں نذیر ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تو۔۔۔۔ دل کی روشنی تاریکی کی بات ہو رہی تھی۔ مگر تمہارا
دل روشن ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو۔" ناصر نے پہلی بار اس کانسٹیبل کے کندھے پر تھپکی دی اور
کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ کانسٹیبل نے باہر سے تالا لگایا اور اپنی ہی حیرت کی دنیا میں سے بولا۔

"اچھا جی!"

ناصر اپنے فرشی بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تو اسے مبہم سا یاد آیا کہ اس نے وہ الفاظ کہاں
سنے تھے۔ دل کی تاریکی۔۔۔۔ پھر اسے مکمل یاد آ گیا۔ کہیں گزرے زمانے میں کبیر اور وہ کونراڈ کے
ناول کے عنوان کے ترجمے پر بحث کرتے رہے تھے۔ "تاریکی کا دل" بھدا اور بھونڈا ٹھہرتا تھا۔
جبکہ "قلب تاریک" کہیں اور لے جاتا تھا۔ اور "دل کی تاریکی"، "سیاہ دل" وغیرہ بالکل مذاق بن
جاتے تھے۔ ناصر نے چھت کے بیچوں بیچ لگے مدھم روشنی کے بلب کو دیکھا۔

"سادہ دل لوگ کس طرح تاریکیوں سے بچ جاتے ہیں۔" اس نے سوچا "اور بڑی بڑی
پیچیدہ سوچوں والے لوگ تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی سیاہ گھاتوں کا
شکار ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔" اس نے پھر شک کیا "سادہ دلی بھی کہاں ٹھہرے گی۔۔۔۔" اسے
کانسٹیبل شاہ اور گھاکی غلیظ باتوں کی سیاہی یاد آئی جو ہر طرف پھیلی تھی اور وہ ایسی تاریکی تھی جو

کونراڈ کے ناول کے عنوان کے کسی بھی ترجمے میں فٹ نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ نہ تو "تاریکی کا دل" تھی
نہ "دل کی تاریکی" نہ ہی "قلب تاریک"۔" پھر اس نے ایک عبوری سا حکم لگایا۔ "ہر تاریکی ایک
منفرد تاریکی ہے۔۔۔۔ بشمول میری اپنی تاریکی کے۔۔۔۔" پھر ناصر نے بے چین ہو کر جیب سے
زہرہ۔ کبیر ضخیم خط نکالا اور اس مقام کو سامنے لایا جہاں گہری تاریک رات میں مٹی میں کھدے کسی
غار نما مقام میں موم بتی کی روشنی میں ایک دوسرے میں گھسے دو اشخاص ایک نامکمل تحریر کو ختم کر رہے
رہے تھے اور جس تحریر کے مطابق اب وہ لمحہ آ رہا تھا جہاں زمین کی ذلتوں میں لوٹ لگاتا کوئی
دیوانہ خواب دیکھنے والا کوئی انکشاف کرنے والا تھا۔ ناصر نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

وہ زہرہ کے سامنے جھک گیا، اس کی آنکھوں میں ایک وجدانی خوف تھا۔ وہ بھرائی ہوئی
آواز میں بولا "بھوری مائی۔ بھوری مائی کا غلام۔ میں نے کہا تھا سب سے۔ بھوری مائی آئے گی۔
اپنے پتلے واپس لینے آئے گی۔ اپنا غلام ساتھ لائے گی۔ بھوری مائی کا لیے اور پارو نے اپنی جاتی
کے خون میں اجاتی کے خون کا سنگم کیا اسے مٹی میں گوندا۔ تیرا پتلا بنایا تیرے غلام کا پتلا بنایا۔ سات
رُتوں تک اُن پر وہ عمل کیا جو مٹی میں دفن سانپوں کو زندہ کر دیتا ہے اور بس گھولتے باہر نکالتا ہے۔
سات رُتوں تک تیری راہ دیکھی۔ ڈوڈو پانی آئے۔ اُڑاڑہ ہوا آئی اور جالو آگ میں بیٹھ کر کالے
اور پارو نے تیرا بلاوا کیا تو آئے گی، تیرا غلام آئے گا۔ اپنے پتلے لینے آئے گی اگر جاتی کا کال
اپنے ساتھ لے جائے گی۔ یہی تیرا انعام ہے۔۔۔۔ بھوری۔۔۔۔ بھوری مائی تیرے پتلے میں تیری
بھینٹ کرتا ہوں۔۔۔۔ بھوری۔۔۔۔!

یہ سب کہہ کر وہ شخص الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور اس مقام کے جسے وہ گھروں کی کھوہ کہتا تھا کے
کسی گوشے میں غائب ہو گیا۔ دن اب ڈھلنے سے آگے جا چکا تھا اور اس ویرانے میں شام آ رہی
تھی اور میں نے محسوس کیا کہ زہریلی جنگلی نباتات کی خوشبو بدل رہی ہے۔۔۔۔ (زہرہ) جو میں نے
محسوس کیا اس کا باہر کی کسی خوشبو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ سب اندر کا معاملہ تھا اور اس قدر عجیب
وغریب۔ میں کیا سن رہی تھی، کیا دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص کیا بات کر رہا تھا۔ کونسی بھوری مائی اور غلام
اور وہ سب کچھ جو وہ کہہ رہا تھا۔ کہنے کی کسی نامعلوم حیرت انگیز سطح پر۔ یوں سمجھو غیریت۔ جس کا
میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا، اس کی جگہ اب ایک اور غیریت کا سامنا تھا مگر دونوں میں فرق یہ تھا کہ
پہلی دور بھگاتی تھی اور یہ دوسری اپنی طرف کھینچتی تھی جیسے۔۔۔۔ جیسے کوئی سحر ہو۔

(کبیر) ہاں سحر۔ زہرہ نے درست کہا۔ سحر۔ واقعی وہ ایک سحر زدگی کی کیفیت تھی جو ہم پر طاری تھی اور ہم ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

تب وہ دوسرا شخص اٹھا اور ہمارے پاس آیا۔ وہی شخص جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا۔ جو اس سب خواب تماشے کے دوران کچھ دور بیٹھا کسی چوہے کی کمینی شکی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا تھا۔ اس نے بات شروع کی اور بہت سیدھی سیدھی بات۔ یہ آگے آنے والا مکالمہ عین بعین اس کے اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ اس کی بولی کے کہیں کہیں ترجمے اور تدوین کے بعد پیش کر رہا ہوں۔ ایسا ہی میں نے بھورے کی باتوں کو بیان کرتے وقت کیا۔ ان کی زبان کئی مقامی بولیوں کا ایک مرکب ہے اور ایک ماہر لسانیات کے لیے اچھی خاصی دلچسپی کا باعث ہوگی مگر میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ اس شخص نے کہنا شروع کیا۔

'باؤجی۔ یہ جو بابا ہے ہمارا۔ اس کی باتوں پر نہ جائیں۔ یہ بابا بالکل پاگل ہے۔ اس کو بخار چڑھتا ہے۔ اس کی ساری باتیں پاگل کی واہی تباہی ہیں۔ یہی سوچیں اس کا نام ہیرا ہے اور یہ اپنے کو بھورا بادشاہ کہتا ہے۔ جھوٹ بادشاہ۔ پتہ نہیں کس بھورے بادشاہ کی بات کرتا ہے۔ یہ ابھی جوان ہی ہوا تھا پر اس انعام گڑھ کی کسی ملنگوں کی عورت کے پیچھے لگ گیا تھا۔ سائیوں نے مار مار کر فنا کر دیا۔ انہوں نے تو مار ہی دیا تھا، پر یہ بچ گیا پر دماغ الٹ گیا بالکل۔ پھر یہ اللہ معافی پتہ نہیں کیسے کیسے شخص کالے علموں کے چکر میں پڑ گیا۔ اس کا تو کچھ بنا نہیں پر ماگھر جاتی پر بڑی سختی آئی۔ لوگوں کے بچے سوکھے سے مرنے لگے۔ چیزوں میں اپنے آپ آگ لگ جاتی تھی۔ سانپ بیلے میں سے آ کر دیکھتے دیکھتے لوگوں کو ڈس جاتے تھے۔ کپڑوں میں سے بچھو نکلتے تھے اور کاٹتے تھے۔ لوگ نیلے کالے ہو کر مرنے لگتے تھے۔ تو یہ آ جاتا تھا اور اپنے الٹے علم سے انہیں بچا لیتا تھا۔ اس سے اس کی بڑی دہشت بیٹھ گئی۔ کوئی اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ پر پھر شکر وہ پھر آسمان سے مینہ پڑنے لگا اور ساتھ مری ہوئی چڑیاں گریں تو سب نے صلاح کر کے اس کا منت ترلا کیا اور اس کا کھٹا بستی سے کافی ہٹ کر دور بنا دیا کہ کوئی شیطانی پھیرا آئے تو اس کے پاس ہی آئے۔ پر پھر بھی ماگھر جاتی ہلک ہلک تنگ اور کال سے اجڑ ہی گئی اُدھر اوپر رکڑ میں بہت تیزیاں تھیں۔ کچھ مر کھپ گئے کچھ اڈپڈ گئے۔ پھر ایک اور ظلم اس نے کیا جس کا حال میں بتاتا ہوں۔ اس کے بعد تو بس اب یہی بارہ پندرہ جی بچے ہیں۔ کھانے کو کسی کے پاس کچھ ہے نہیں۔ بال بچے گند میں رزق ڈھونڈتے ہیں۔ اُدھر پیچھے بلذوزر لگے

ہیں۔ ادھر سب کچھ برابر ہو جاتا ہے۔ سو گڑھ پورا انہوں نے پٹ کر دیتی ہے۔ ادھر کچھ نہیں بچتا۔ میں بھی اب نکلنے والا ہوں۔ آج نہیں تو کل...... ہاں جی تو میں نے کہا تھا کہ اس نے اور جو ایک بڑا اندھیر کیا ہیرے نے اس نے کالیے اور پارو کو اپنی راہ پر لگا لیا۔ دونوں چنگے بھلے مرد عورت تھے بس اولاد نہیں تھی۔ کالیا کھیج بناتا تھا اور پارو گھگھو گھوڑے۔ گڑھ جا کر بیچ لیتے تھے۔ پھر پتہ نہیں اس نے کیا پٹی پڑھائی دونوں اس کے کھٹے میں جا کر رات رات رہنے لگے۔ بڑی بڑی ڈراؤنی آوازیں یہاں تک آتی تھیں۔ پتہ نہیں کیا شیطانی کارخانہ چلتا تھا۔ پھر ایک دن جو پتہ لگا، پارو گڑھ جا کر تائی سردار جیات ملنگ کے ساتھ رات جا کر سوئی اور اس کا گلا کاٹ کر بھاگ گئی۔ وہ تو اپنے خصم کے ساتھ بھاگ گئی۔ پر ادھر پلس پڑی اور ایسی پڑی۔ توبہ۔ میری توبہ...... وہ کچھ دیر خاموش رہا اور آنکھیں بند کر کے سر کو دائیں بائیں حرکت دیتا رہا۔ پھر یک دم آنکھیں کھول کر بولا۔

'اُدھر اوپر رکڑ میں ساری جاتی کو انہوں نے، کیا مرد، کیا عورت، کیا بچہ، کیا بوڑھا سوٹوں سے کوٹ کوٹ کر مٹی کے ساتھ مٹی کر دیا۔ پر وہ کالیے اور پارو کو کدھر سے پیدا کرتے۔ اخیر میں نے جا کر حوالدار کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ وہ بھی مجھ سے لاوارث لاشیں دبواتا تھا، چار پیسے دے دیتا تھا۔ جانتا تھا۔ میں نے کہا حوالدار جی ادھر کوئی بچا بچایا ہی نہ تو انہیں کدھر سے ڈھونڈو گے جنہیں قابو کرنے آئے ہو۔ میں انہیں پکڑواؤں گا۔ نہیں تو ان کی خبر دوں گا میں مرد کی زبان کرتا ہوں۔'

'اوئے تیرے مرد کی...... اس نے گالی دی پر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے تھانیدار سے بات کی اور پھر ان کا مجھے بڑا سختی کا حکم ہوا کہ اس مرد عورت کو اور جو جو کوئی ان کے ساتھ ہے، انہیں جلدی سے جلدی پیش کروں نہیں تو ادھر ہی سب کٹ بل کو مکا کر ایسا غائب کریں گے کہ کسی کی ہڈی کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ بلڈوزر تو پہلے ہی لگے ہوئے ہیں۔ میں نے پاؤں پڑ کر کہا میں ڈھونڈ کر لاؤں گا، جدھر بھی ہوں گے۔ پلس چلی گئی اور ادھر سے سارا جیا جنت راتوں رات نکل گیا۔ بس میں اور میرے سارے جی نہیں گئے۔ اور ایک دو جھگے اور، اب جانے کو ہیں۔ پتہ تھا کہ اب پکڑا گیا تو پھر کوئی معافی نہیں ہوگی۔ وہ دن اور آج کا دن روز گڑھ تھانے میں کوئی نہ کوئی کہانی سناتا ہوں جھوٹو جھوٹ پلس کو کھوجیں دیتا ہوں، ماریں کھاتا ہوں۔ کبھی کہتا ہوں پارو کو ادھر دیکھا ہے، کالیے کو اُدھر دیکھا ہے۔ دونوں کو وہاں بیلے میں دیکھا ہے۔ پلس جاتی ہے خالی آتی ہے

اور میری ہڈیاں پھر ٹوٹتی ہیں۔ پر کب تک۔ کب تک۔ ہاں اب...... دور کا اور اس سمت میں دیکھئے
لگا جدھر بھورا گیا تھا۔ کچھ دیر کچھ انتظار رہا پھر بولا۔
'اب۔ پر اب آگے سنا ہے وحشت پڑتے ہیں۔ گڑھے میں ہر طرف سے بڑے بڑے نامی سردار آئے ہیں۔ آج اُدھر جلسہ ہے۔ اُدھر انھوں نے لنگر کھولا ہے کوئی آئے جتنا چاہے کھائے۔ پر اب اِدھر سے کوئی گیا نہیں تو مرا نہیں۔ پر اب سنا ہے اب وحشت جو پڑتے ہیں تو گڑھے کے وڈیرے اب اس ساری واردات پر چپ چاپ کرنے کے چکر میں ہیں کہ زیادہ ہوا شا اڑے کہ ماگروں کی کچھ زن حیات جنگل کا نفس کاٹ کر بھاگ گئی۔ پر کب تک اخیر تو یہ فساد پھر اٹھنا ہی ہے اور پھر اِدھر موت ہی موت ہے۔ دیکھو کب آتی ہے...... میں سمجھ گیا ہوں تم اخبار والے ہو اور اِدھر گڑھے میں جلسے کی خبر کرتے پھرتے اِدھر جنگل بیابان میں نکل آئے ہو۔ پر میری صلاح ہے رات ہونے سے پہلے پہلے اِدھر سے نکل جاؤ۔ اس شخص نے گویا اپنے طویل بیان کو جو میں تمہیں بتا دوں کہ کسی جذباتی ابتار چڑھاؤ سے یکسر عاری تھا۔ ایک آخری ناقابلِ تردید انجام تک پہنچایا اور زہرہ کی طرف دیکھا۔

(زہرہ) میں نے میکانکی طور پر اپنے ہاتھوں میں پرس کو کھولنے کی کوشش کی۔ پرس جو میرے ہاتھوں میں نہیں تھا بلکہ گاڑی میں تھا۔ اس سے میری ذہنی کیفیت کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ وہ خوفناک داستان جو اس شخص نے سنائی اُس نے میرے ذہن پر کیا اثر کیا میرے لیے بتانا مشکل ہے لیکن میں وہی لفظ استعمال کروں گی۔ غیریت کا۔ تو یہ غیریت کی ایک تیسری سطح تھی جو نہ دور بھگانے والی تھی نہ اپنی طرف کھینچنے والی تھی۔ بلکہ...... دفن کرنے والی تھی۔ گہری مٹی میں اس وقت تک جب تک کہ بچھڑے پھٹنے کو آ گئیں۔ بھورے بادشاہ نے جو سحر زدگی کی کیفیت طاری کی تھی، کیا یہ اس کا ایک بھیانک توڑ تھا۔ کیا تھا کبیر نے اپنی جیب سے پرس نکالا تھا۔

(کبیر) ہاں میں نے کچھ رقم اس شخص کی طرف بڑھائی۔ اس نے خاموشی سے رقم لی اور اس جانب گہری خوفزدہ نظروں سے دیکھا جدھر بھورا بادشاہ غائب ہوا تھا اور پھر وہ جیسے کمزور ارنگ کر ایک تیزی میں گھس گیا۔ اب ہم دونوں بظاہر اکیلے کھڑے تھے یوں سمجھو کہ سحر اور حقیقت کے درمیان اور جو دونوں ہی بھیانک لگتے تھے۔ تم جانتے ہو ناصر کہ ہم وقت کے کافی مختصر دورانیوں میں پے در پے مجوبہ ذہنی اور شاید جسمانی کیفیتوں سے دو چار ہونے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔

حوالے۔ کیسے غلام دماغ کی تپتی۔ تجو...... بھگی۔ وحشت بھری راتیں وغیرہ وغیرہ۔ ماگڑھ میں ماگڑوں کے خواب گردیا نے سامری بھورے بادشاہ اور ان کے حقیقت پسند افادیت پسند دور اندیش شخص کے یکے از بعد بیانات نے ہمارے اوپر ایک فالج جیسی کیفیت طاری کر دی۔

(زہرہ) ہاں وہ ایک شدید طاقتی کا احساس تھا جیسے روح جسم میں سے نکل کر نیچے مٹی میں چلی گئی ہو۔ روح جس کا کہتے ہیں کہ جسم سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ بہر حال...... میں نے اچانک محسوس کیا میں کھڑی نہیں رہ سکتی اور میں پیچھے زمین پر بیٹھ گئی۔ اور تم بھی کبیر...... ہاں میں بھی۔ اور پیچھے زمین پر گرنے کی طرح بیٹھ کر مجھے تو فائدہ ہوا اور تمہیں بھی کبیر۔ ہاں مجھے بھی فائدہ ہی کہیں گے۔ جیسے زمین پر بیٹھ جانا ایک بہت اچھا کام تھا۔ ہاں بہت۔

(کبیر) گھاس مٹی بھلائی کے باریک سوکھے تنوں اور جھنڈ کے بکھرے تنکوں میں بیٹھ کر یہ احساس ہوا کہ ماگڑھ کے ہمارے لیے دو پیغامات ہیں۔ ایک سحر۔ جادو اور کالے علم کا...... اور دوسرا ابھی کالے علم کا۔ حقیقت کے کالے علم کا۔ ان دونوں میں حقیقت کیا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے۔ کچھ علم نہیں تھا۔ علم لاعلمی یہ سب کچھ دور کہیں مدتوں پہلے دیکھا بھولا بسرا تماشہ لگتا تھا۔

ویرانے میں تذبذب کی فضا میں زہریلی ہوا گونگو کرتی آگے گزر جاتی تھی اور یہ ایک ایسی ویرانگی تھی جو کم از کم میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ کیا ہم نے ماگڑ حقیقت پسند کے نقطۂ نظر اور مشورے کو تسلیم کرنا ہے اور اس پُر خطر مقام سے راہِ فرار اختیار کرنی ہے یا پھر بھورے بادشاہ کی واپسی کے بعد اس کے بھورے دامنوں کے بھورے کردار بننا ہے۔ یک دم بھورا اور بھوریت اپنی تمام معنی خیزیت کے ساتھ میرے سامنے آ گئے۔ میں نے سوچا بھورا ایک طرح سے سیاہ و سفید کے درمیان تذبذب کا ایک منطقہ ہے یہ بظاہر ایک عام فہم اور رٹی پٹی بات کرتا ہے مگر اُس وقت وہ ایک شدید 'بے یقین زندگی کرنے' کی کیفیت تھی اور جو دونوں اطراف میں راہِ فرار اختیار کرنے پر اکساتی تھی اور اپنی ماہیت میں بالکل انوکھی محسوس ہوتی تھی۔ ماگڑھ اس وقت بھورے کلام اور بھورے منطق کا دائرہ تھا، جس کے اندر سے کالے جادو کی لکیریں باہر کو دوڑتی تھیں جیسے بجلی کے لہریے بادلوں میں دوڑتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی کی کیفیت تھی اور میری ذات تک محدود تھی۔ زہرہ یقیناً کہیں اپنی دنیا میں تھی۔ مگر پھر ہمارے درمیان کچھ مکالمہ شروع ہوا جسے میں چاہوں گا کہ زہرہ خود بیان کرے کیونکہ اس کی مکالموں کی یادداشت مجھ سے ہزار درجہ

Scanned by CamScanner

بہتر ہے۔ میں لکھواؤں گا تو بہت کچھ اس لمحے کی بک بک کو شامل کرنے پر زور ماروں گا، جب کہ وہ
من وعن بیان کرے گی۔

(زہرہ) مجھ سے تم من وعن کی توقع کیوں رکھتے ہو۔ اس ایک دوسرے میں پھیلی ہوئی تحریر
میں بھی ہر کوئی اپنے اپنے مقام پر رکا رہا ہے۔

(کبیر) تسلیم۔ تسلیم۔ بالکل۔ تم بھی اب بھٹکو نہیں۔ آخری موم بتی بھی ختم ہو رہی ہے۔
وہیں سے آگے چلو جب میں نے کہا تھا کیا کہا تھا؟ ہاں" جان لیوا تذبذب کے ایسے بھنور کے لمحے
میں نے آج تک نہیں جئے۔

(زہرہ) ہاں۔ اور میں نے کہا تھا۔ "کیا تم اسی لیے نہیں نکلے تھے اور اسی لیے یہاں نہیں
آئے تھے؟

(کبیر) "کیا مطلب؟"

(زہرہ) جو تم نے آج تک نہ جیا ہوا سے جینے کے لیے۔ خواہ وہ...... جو تم کہتے ہو تذبذب
کے جان لیوا بھنورے لمحے ہوں یا کچھ...... دوبارہ جینے کے لیے......

کبیر "آ...... ہیت النفس میں دوبارہ 'لکھو' کی آخری ناکامی کا شکار ہونے کے بعد جب
مفلوج ہاتھ کے مالک لکھوانے والے اور لکھنے والی کے درمیان زبان کے رشتے ایک ہذیانی بخار کا
شکار ہوتے ہیں تو جسم کی زبان بھی ہذیان کا شکار ہو جاتی ہے اور باقی کیا رہتا ہے؟ امداد حسین جو
ادھ کھلے دروازے سے جھانکتا ہے۔"

"اور انہونی کی باقیات۔"

"ہاں۔ انہونی کی باقیات۔ یہی تو ہے انہونی کی باقیات۔ اس سے پیشتر کہ 'دوبارہ جیو'
'دوبارہ دیکھو' 'دوبارہ سنو' 'دوبارہ بولو' اور 'دوبارہ جیو' اس کو جس کے لیے تم اندھے بہرے اور گونگے
تھے اور جس کے لیے تم مردہ تھے۔"

"ہاں یہی تو تھا۔"

(کبیر) وہ ایک کایا کلپ جیسی کیفیت تھی جیسے دوبارہ سوچنا دوبارہ جینے کی جون میں آ گیا
ہو جیسے ہیت النفس جون بدل کر ماگرہ میں بدل گیا ہو مگر کسی اچنبھے کے بغیر جیسے یہ تو ہونا ہی تھا۔

(زہرہ) اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس جگہ اور ہو رہا ہے اس کے لیے ہمیں ایک دوسرے

سے مشورے کرنے یا منصوبے بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

کبیر' کیا یہ ایسا نہیں تھا جیسا ہمارے درمیان پہلے کبھی نہیں ہوا تھا؟'......

O

ناصر نے کاغذوں کے پلندے کو نظروں سے پرے ہٹایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سارا
جسم پسینے میں شرابور تھا اور سانس ٹھہر ٹھہر کر آ رہا تھا جیسے بخار ٹوٹ رہا ہو۔ اس سب کیفیت کا بخار جو
اُس خط کی 'اختتامی' تحریر کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس پر طاری ہوئی تھی۔

باہر جیل کے احاطے میں ڈیوٹیاں بدلنے کے سائرن کی آواز آئی اور بھلا مانس کانسٹیبل
دوسرے کو ڈیوٹی پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے قیدی پر ایک 'شب بخیر' قسم کی نظر ڈالی مگر اس کا دل اسے
بتاتا تھا کہ اس کے ساتھ سب خیر نہیں ہے۔ پھر اس نے اس کے لیے خصوصاً اور پوری انسانیت
کے لیے عمومی دعا کی کہ اللہ سب کی مشکلیں آسان کرے۔

ناصر کے اندر سب مشکلیں آسان ہونے اور بخار ٹوٹنے کی کیفیت تھی۔ وہ سب کچھ جو خط
پڑھنے کے دوران اس کے اندر متلاطم رہا تھا اب ایک ہی ساحل پر آ کر ٹھہر گیا تھا اور اس ساحل کا
نام وہی لفظ تھا جسے زہرہ نے بار بار اپنے آپ کو انوکھی کیفیتوں کی زد میں پا کر اپنے آپ کو دیکھنے کے
لیے استعمال کیا تھا۔ خیریت، خیریت کا ساحل آزادی کا ساحل تھا۔ خیریت اپنے سادہ اور مکمل
معنوں میں جو اس کے اس احتجاج کے ساتھ اور بھی واضح اور بھی مکمل ہو رہی تھی۔

"تمھیں کیا حق حاصل ہے مجھے اپنا قاری بنانے کا۔ تمھیں کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھے اپنا
آزمائشی قاری بناؤ۔ کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنا لکھا ہوا کسی کو پڑھنے پر مجبور کرے...... مجھے
آزاد کر دو۔ تم مجھے اپنا کہا سننے اور اپنا لکھا پڑھنے کی غلامی سے آزاد کر دو...... تم مجھے رد کر دو۔ مکمل
اور آخری بار ہمیشہ کے لیے رد کر دو۔ میرے لیے بس صرف ظاہر کرنے کی بات ہے پھر تمہارے
پاس اور کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ سوائے مجھے رد کر دینے کے...... وہ وقت آئے گا۔ آخر وہ وقت
آئے گا۔ میری آزادی کا وقت، میرے بھی دوبارہ جینے کا وقت......" وہ اٹھا اس نے کاغذات
ایک طرف رکھے اور ایک مختصر سے میلے تولیے سے اپنا چہرہ پسینے سے صاف کیا۔ اچانک اسے آئینے
میں اپنا چہرہ دیکھنے کی شدید خواہش ہوئی مگر وہاں کوئی آئینہ نہیں تھا۔ جیل میں کوئی بھی ایسی چیز جو

Scanned by CamScanner

مہلک کناروں کی شکل اختیار کر سکے قیدیوں کے لیے ممنوع تھی مگر اس خواہش نے اسے کچھ دیر پریشان کیے رکھا۔ کیا اس کا چہرہ ویسا ہی ہے یا بدل گیا ہے۔ کیا وہ پہچانا جائے گا۔ جب ایک دن وہ کبیر اور زہرہ کے سامنے پیش ہوگا اور اپنے لیے 'ارتداد' کا فیصلہ لے گا کیا وہ پہچانا جائے گا...... پھر ناصر نے اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور گہرے لمبے سانس لینے کا آزمودہ نسخہ اپنایا اور آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑتا چلا گیا۔ اس نے خط کے کاغذ اٹھائے جن میں ابھی پتہ نہیں کتنے اور پڑھنے باقی تھے۔ ہر ایک صفحہ پڑھنے کے بعد اسے سب سے نیچے رکھتے پر وہ سب ہاتھوں میں جوں کے توں رہتے تھے اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اختتام ابھی کتنا دور ہے۔ اس نے تحریر میں وہ مقام ڈھونڈا جب کبیر زہرہ سے دونوں کی 'ادغامی' کیفیت کے بارے میں سوال کرتا ہے کہ کیا وہ کیفیت ایسی نہیں تھی کہ جیسی پہلے ان دونوں کے تجربے میں کبھی نہیں آئی تھی اور زہرہ نے ابھی کبیر کے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا..........

کبیر۔ ''کیا یہ ایسا نہیں تھا جیسا ہمارے درمیان پہلے کبھی نہیں ہوا تھا؟''

زہرہ۔ ''میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اتنے یقین سے کہہ سکوں جیسا ہمارے درمیان کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ کہنا بھی کس قدر مشکل ہے کہ ہمارے درمیان اب تک کیا ہوا۔ 'کبھی نہیں' اور 'ہمیشہ' پر میں اکثر لڑکھڑا جاتی ہوں۔''

کبیر ''شاید مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے۔ میں ہمیشہ (پھر ہمیشہ) 'ہمیشہ اور کبھی نہیں' کا اسیر رہا ہوں۔''

''ہاں جو ظلم کی دو شکلیں ہیں۔''

''سیاہ اور سفید کا مٹ جانا بھی تو ظلم ہے۔''

''ہاں مجبوراً ظلم''

''پھر اب ہمارے لیے کیا ہے۔ دوبارہ جینے کے لیے۔''

''مجبوری مائی اور اس کا غلام ہے۔''

''یہ کتنا عجیب احساس ہے جو بات اس شخص نے کی۔ اچانک تم اپنے آپ کو کسی دیوانی داستان کے مرکز میں کھڑا محسوس کرتے ہو اور تمہارا جی چاہتا ہے، قہقہے لگاتے وہاں سے بھاگ جاؤ مگر پھر......''

''مگر پھر تم محسوس کرتے ہو کہ کچھ ایسے انجانے طلسمی قوانین تمہیں اپنی گرفت میں لے چکے ہیں کہ تم اس دیوانی داستان سے فرار حاصل کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے۔ تمہیں تو کسی اور ہی دنیا نے حیرت انگیز ذمے داریوں کے بوجھ سے لاد دیا ہے اور اگر ہم داستان کی بات کرتے ہیں تو یہ سب کچھ انوکھا بھی نہیں، داستانوں میں...... جنگل میں راہ بھٹک کر ہمارا ستم رسیدہ لکڑہارا خوفناک رات میں بھی نامعلوم منزل کی طرف سفر جاری رکھتا ہے اور پھر جب صبح کے آثار نمودار ہوتے ہیں، وہ اپنے مریل گدھے پر سوار اجنبی شہر کے دروازے تک جا پہنچتا ہے اور پیشتر اس کے کہ اس کے حواس بحال ہوں تاجِ شاہی اس کے سر پر پہنا دیا جاتا ہے کیونکہ اس اقلیم میں نئے فرماں روا کی تعیناتی کا یہی نہایت آزمودہ طریقہ رائج ہے کہ بادشاہِ وقت کے انتقالِ پُر ملال کے بعد اگلے روز جو شخص بھی سب سے پہلے شہر کے دروازے پر پہنچتا ہے تختِ شاہی کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ اب ہمارے ہیرو کے لیے لکڑہارانہ معذرت خواہی کی کوئی گنجائش نہیں اور راج نیتی کے فرائض سے پہلو تہی کرنا ناممکن ہے۔ بصورتِ دیگر مریل گدھے پر اس کے مالک کا سر بریدہ لاشہ لاد کر پھر جنگل کی طرف روانہ کر دیا جائے گا کہ جاہ و جلالِ خسروانہ کو رد کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہنسو نہیں۔ یہ داستان تم نے سنی ہوگی اور جو دیوانی ہے۔ ہر دیوانگی ایک داستان ہے اور ہر داستان ایک دیوانگی ہے۔ جیسے کسی نے کہا تھا ہر صحیفہ ایک خواب ہے اور ہر خواب ایک صحیفہ ہے اور سنو......

ایک بلند ہمت چور اپنی کچھ ناپسندیدہ حرکتوں کی وجہ سے ایک بلند و بالا قلعے میں قید کر دیا گیا۔ چور مذکورہ بلند ہمت ہی نہیں بلند تر قوتِ تخیلہ کا بھی مالک ہے۔ وہ مصر کاٹھ کباڑ سے اپنے لیے پر تیار کرتا ہے اور انہیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح لگا کر قلعے کی بلند دیوار سے پرواز کر جاتا ہے لیکن پر زیادہ دیر تک اس کے جسم اور گناہوں کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتے اور وہ نیچی پرواز کرتا کرتا ایک گاؤں میں جا گرتا ہے۔ اہلِ دیہہ چور کو 'پنکھ بردار چور' یا 'ہوائی انسان' وغیرہ سمجھنے کی بجائے فرشتہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اسے 'گمراہ فرشتہ' بھی نہیں سمجھتے بلکہ محض فرشتہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو انسان فرشتوں کے ساتھ کرتا آیا ہے اور سابقہ چور حال فرشتہ سے بھی اُسی کرداری طرزِ عمل کی توقع رکھتے ہیں جو فرشتوں کے شایانِ شان ہو...... اور سنو۔ اپنے آپ سے ہارے وہ دو مرد و زن کہ وہ مرد اپنی آخری شکست میں آخری فتح ڈھونڈنے کے لیے اس عورت کو اس کی اصل کے واہمے کی تصدیق و تکذیب کے لیے بھگائے لے جاتا ہے۔ 'اصل کا واہمہ' کہ جو ایک

Scanned by CamScanner

مقام کا نام ہے۔ جب وہ اس مقام پر پہنچتے ہیں تو ایک پیرِ فرتوت نمودار ہوتا ہے اور 'بھورا بادشاہ'
کے نام نامی سے اپنے تئیں متعارف کرواتا ہے اور پھر یوں گویا ہوتا ہے بھوری مائی تو آ گئی۔ میں
جانتا تھا تو آئے گی اور تیرا انتظام ساتھ آئے گا۔ مرد...... ابھی......"

"رک جاؤ"

"کیا ہوا"

"یہ داستان ابھی نامکمل ہے اور تم اپنی مزاحیہ نوک جھونک سے اسے خراب نہیں کرو گے
میں سمجھ گئی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"آ..... میں معافی چاہتا ہوں۔ مزاحیہ اور نوک جھونک۔ یہ ایک دورہ ہے جو مجھے کبھی کبھی پڑتا
ہے۔ میری اس صلاحیت کو اس سے پیشتر بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جنرل ہسپتال کی کینٹین کے
بیرے نے تیز ہوا کی شام نرس نگار کے آنے سے پہلے یا شاید بعد میں میرے بارے میں یہ
فیصلہ دیا تھا کہ صاب ویسے آپ نوک جھونک لیے بڑے اچھے ہیں..... اُن داستانی ادوار میں اگر میں ہوتا
تو شاہی مسخرہ ہوتا......"

"میرے خدا تم کس طرح کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہو۔ مجھے وہ خوفناک رات نہیں
بھول سکتی۔ جب وہ عورت وہاں بیٹھی تھی اور اس کے چائے کے کپ ایک کے بعد ایک ٹھنڈے
ہو رہے تھے۔ ہم حیران تھے وہ ہمیں پہچان رہی ہے یا نہیں اور پھر ہوا تیز ہونا شروع ہوئی اور
رات آئی اور....."

"چھوڑو۔ کتنی ہی خوفناک راتیں نہ بھولنے والی ہیں..... اس کی بات کرو جو آ رہی ہے۔"

"یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہی آخری بات کی تھی تم سے۔ آنے والی رات پر
ایک پُر امید تشویش کا اظہار کیا تھا اور پھر ان واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جو اپنے آپ رونما
ہوتے چلے گئے تھے جیسے پہلے سے لکھے ہوئے ڈرامہ سکرپٹ کے واقعات ہوں اور جن کی
نوعیت۔ انتخاب اور ترتیب میں ہمارے کسی بڑے ارادے یا منصوبے کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ جیسے
ہمیں بس ایک کردار ادا کرنا ہو۔ واقعات کے اس سلسلے میں..... اور یہاں زہرہ مجھ سے اتفاق
کرے گی کہ اگر مکالمات کی بازیافت اس کی تخصیص ہے تو واقعہ نگاری میں اس احقر کو کچھ تک بھی
تجربہ ضرور حاصل ہے۔ سو میری جان لکھتی رہو، اس وقت تک کم از کم جب تک کہ میں لکھوانا بند نہ کر

دوں یا میرے مفلوج دائیں ہاتھ کی توانائی پھر سے عود نہ کر آئے یا میرا بایاں ہاتھ لکیریں اور نشان
بنانے میں رواں نہ ہو جائے۔"

"میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں مگر نہیں کہوں گی۔ تم کہو۔"

"ہاں تو زہرہ نے گزری ہوئی خوفناک راتوں اور اس رات آنے والی رات پر ابھی کوئی
بات نہیں کی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ شام اور رات کے درمیان کا یہ مختصر سا وقت جو نہ شام ہوتا ہے
نہ رات ازل سے انسان کے دل کو نامعلوم کے خدشات سے بھرتا رہا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے
جب ایک طرف گذرے دن کی کارگزاریاں۔ کامیابیاں۔ ناکامیاں اور دوسری طرف آنے والی
رات کے خوف۔ خطرات اور بلائیں۔ قدیم تاریکی کے ترازو میں متوازن ہو جاتی ہیں اور جب
بھی یہ توازن بگڑتا ہے تو انسان اپنا اصل اپنے سامنے دیکھتا ہے مگر مانتا نہیں۔ انسان کے ساتھ
سب سے بڑی خرابی یا خوبی یہی ہے کہ وہ کبھی پوری طرح مانتا نہیں ہے۔ بہر حال کچھ ایسی ہی
سوچیں تھیں اور زہرہ کے کچھ بولنے اور میری بات کا کچھ جواب دینے کا انتظار تھا مگر وہ نہ بولی۔ وہ
اُس وقت کیا سوچتی تھی میں نہیں جانتا۔ کون جان سکتا ہے۔"

"مجھے یاد ہے، میں بال میں ہاف مین کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تم بہت حیران ہوئے
ہو مگر میں یہی سوچ رہی تھی کہ وہ اگر زندہ ہوتا اور یہاں ہوتا تو سب کچھ کیسا ہوتا مگر تم یہ چھوڑو۔
آگے چلو۔"

کبیر "میں حیران ہوں شاید۔ مگر تم نے ناصر کے بارے میں نہ سوچا۔ وہ اگر یہاں ہوتا تو
سب کیسا ہوتا۔"

زہرہ "جو سوچا ہی نہ جائے، اس پر یہ بات کہ ویسا سوچا جاتا تو کیا ہوتا۔ بہت احمقانہ نہیں کیا
مگر..... شاید یہی کوشش ہے یہ خلا اب پتہ نہیں۔ خلا تو ایسے کبھی نہیں ہوتے مگر یہ بھی چھوڑو کیا کچھ
کیسا ہوتا ہے۔ ہمارے لیے سب کچھ دھندلا گیا ہے۔ گزر سا گیا ہے مگر اب جب ہم اسی کو لے
کر چلے ہیں تو ہونے دو۔ ہم اس تحریر میں ناصر سے کلام کر رہے ہیں۔ کیا ہم اُسے اس تجربے میں
شامل کرنا چاہتے ہیں یا کچھ اور ...."

"ہمیں شاید ایک غیر کی ضرورت ہے اور غیر سے کلام کے بغیر اپنی گرہیں کبھی نہیں کھلتیں یہ
اُلجھی تحریر جو معرضِ وجود میں آ رہی ہے۔ اس میں تکون کا تیسرا زاویہ..... 'قاری'..... مگر چھوڑو ہم

Scanned by CamScanner

پھر بھٹک رہے ہیں.........''
ناصر نے شدید بے چینی اور اضطراب سے ادھورا فقرہ پڑھا اور زور زور سے سر نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ نہیں۔ تم بھٹک نہیں رہے۔ بولو۔ بولو...... کہو...... کہو — آگے کہو...... اور خدایا...... تم اور بھی کچھ یہاں تک دیتے تو میرے ارادے۔ میرے فیصلے میں اور بھی قوت شامل ہو جاتی۔''

خط کا پلندہ ایک طرف رکھ کر وہ اٹھا اور کونے میں رکھے ایلومینیم کے جگ سے منہ لگایا اور پانی کے گھونٹ لیے اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے اپنے آپ کو اپنی پوری جسمانی حیات میں محسوس کیا اور اپنے آپ کو متوازن کیا اور پھر کاغذوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ کبیر کہہ رہا تھا۔

''بھورا بادشاہ غائب تھا اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ ماگھر حقیقت پسند کی بعد کی تنبیہ کہ 'بھورا بالکل پاگل ہے۔' کے بعد بھی مجھے اس کا انتظار تھا اور میں اس کی بھوری مائی اور اس کے غلام، پتلوں اور دوسرے واہموں کو کسی نہ کسی سطح پر متشکل دیکھنے کی شدید خواہش اندر چھپائے بیٹھا تھا پھر، ماگھر حقیقت پسند کی مداخلت کے بعد، جب دیوانگی اور کالے جادو کے سنگم کے اشارے ملے تھے تو یہ حسرت شدت سے جاگی تھی کہ دیوانگی کی اس جہت کا بھی نظارہ کیا جائے اور اگر ہو سکے تو اسے برتا جائے۔ کالا جادو اگر غیر حقیقی ہے تو اسے ماننے والا اور اس کی تخلیق کرنے والا غالباً کسی جنون میں ہی مبتلا ہوتے ہوں گے اور پیارے ناصر یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم تو اب مدتوں سے انہیں انتہاؤں کے درمیان جھول رہے ہیں۔ دیوانگی کا عشق اور عشق کی دیوانگی، کوئی اس 'جھلاؤ' میں کہاں ہے وہی نقطہ اس کی ذات کے پنڈولم کی موسیقیائی حرکت کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے مگر دیوانگی یا عشق کی ہنوز نامعلوم منزلوں سے نئی آگاہی اس حرکت میں نئی تبدیلی لاتی ہے اور پھر اپنے اندر ہی اپنے ہونے کا مزہ بدل جاتا ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوا۔ بہت ہوا...... سو میں بھورے کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے گا اور مجھے کسی ڈراؤنی آسیبی دنیا میں لے جائے گا جہاں انسان کے قدیم خوف متشکل ہوں گے اور بہر حال...... شاید زہرہ بھی بھورے کے بارے میں کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔''

''صرف بھورا نہیں۔ میں تو کچھ ہونے۔ کچھ بھی ہونے کچھ بھی ہو جانے کو مکمل قبول کرنے کی کیفیت میں تھی۔ 'دوبارہ جینے' وغیرہ کے اس مکالمے کے بعد وہ لمحے جنہیں تم نے کچھ اور ہی

طرح بیان کیا ہے میرے لیے بس یہی احساس لائے ہوئے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے یا شاید...... یا اپنی ہی خواہش تھی کہ کچھ ہو جائے کچھ بھی ہو جائے......''

(کبیر) ''...... 'کچھ بھی ہو جائے' میرے لیے بھورے کی متوقع آمد کی شدید خواہش کا نام تھا اور وہ خواہشات جو میں نے اوپر بیان کیں مگر بھورا نہ آیا اور جو آیا بلکہ آئے وہ وہی مفلوک الحال فاقہ زدہ بچے تھے جنہیں ہم نے اس جگہ آمد پر اس گھناؤنی ضیافت میں مصروف دیکھا تھا مگر اب وہ ویسے مفلوک الحال نظر نہ آتے تھے کیونکہ دنیا کے سب بچوں کی طرح وہ کھیل کود، بھاگ دوڑ اور چھینا جھپٹی میں مصروف تھے اور کھیلتے بچے خواہ وہ قحط زدہ علاقوں کے ہوں یا شکم سیر سلطنتوں کے ہوں، وقتی طور پر ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں۔

اب یہ ضروری ہے کہ اس مقام کا منظر کچھ تفصیل سے پیش کیا جائے تاکہ آمدہ واقعات کے بیان میں آسانی ہو۔

ماگھر لوگ اب ہمیں بالکل نظرانداز کر کے اپنی آمد شب کی مصروفیات میں لگ گئے تھے۔ ایک عورت جس کی عمر کا کچھ اندازہ کرنا ناممکن تھا۔ (درحقیقت ان مرد و زن کی عمروں کے بارے میں کچھ بھی کہنا ناممکن تھا۔ یا تو بچے ہیں یا مرد و عورت۔ یا پھر بے انتہا بوڑھے جیسا بھورا بادشاہ ہے۔) تو ایک عورت ایک تندور نما گڑھے میں خشک ٹہنیاں اور پتے جھونک کر آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کا ہمیں نظرانداز کرنا درحقیقت نظرانداز کرنے کے عام معنوں سے کہیں مختلف تھا۔ جیسے ہم وہاں تھے ہی نہیں یا اگر تھے بھی تو ایسے ہی جیسے کوئی پتھر یا درخت ہو...... عورت کی آگ جلانے کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور گڑھے میں سے دھواں اور پھر یکدم شعلے بلند ہوئے اور ویرانے میں روشنی اور زندگی کا احساس پھیل گیا۔ پھر اچانک ایک چیخ سنائی دی جو اس بچی کی تھی جو ایک دوسرے بچے کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کر رہی تھی اور جو دونوں ہمیں کوئی مٹی کے ڈھیر یا جھاڑیاں سمجھ کر ایک لمحہ پہلے ہمارے قریب سے کلکاریاں مارتے آگے گئے تھے۔

انسانی چیخ کہ جو دوسرے انسان کی توجہ کے لیے انسان کا آخری بلاوہ ہے۔ جو ارادی اور شعوری نہیں اور نہ ہی دوسرے کی توجہ ارادی اور شعوری ہے۔ جو سب قیاس آرائیوں اور نظریوں اور ان پر مبنی ارادوں اور منصوبوں کو تہس نہس کرتی انسانوں کو ایک لمحہ معدوم میں یکجا کرتی ہے۔

بس ایسا ہوا تھا کہ سوچنے سمجھنے سے پیشتر اس جگہ موجود سب لوگ اس بچی کے گرد اکٹھے تھے

Scanned by CamScanner

سوائے مانگر حقیقت پسند کے جو اپنی تیزی میں جا چکا تھا۔ بچی کی بائیں کلائی سارڈین کے کٹے ڈبے کے تیز دھار کنارے سے کٹ چکی تھی جو دونوں بچوں میں چھینا جھپٹی کا سبب تھا، ڈبہ زمین پر پڑا تھا اور بچی کے خون کے قطرے تیزی سے اس پر گر رہے تھے۔ زہرہ نے تیزی سے بچی کی کلائی کو زخم کے پیچھے سے اپنے ہاتھ میں تھاما تو خون رک گیا مگر گرفت ڈھیلی کرنے پر پھر تیزی سے ایک دھار کی طرح بہا۔

'یہ تو سیریس معاملہ لگتا ہے۔ ایمرجنسی صورتحال ہے۔' اس نے کہا اور میں نے اس سے اتفاق کیا۔

چیخ کی وقتی مساوات کے بعد مانگر جاتی پھر لاتعلقی کی غیریت پر واپس آ گئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ ان کی نظریں کہہ رہی ہیں کہ انہیں ہماری کوئی ضرورت نہیں ہم جو کوئی بھی ہیں۔ اور یہ کہ وہ اپنا حادثہ خود سنبھال لیں گے۔ اگرچہ انہوں نے واضح طور پر ہمیں الگ ہٹنے کو تو نہ کہا مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ ہم اس صورت حال سے نمٹنے کی ان کی کوششوں میں حائل ہیں۔ پھر ایک مانگر عورت تیزی سے آگ کے گڑھے کی طرف گئی اور کچھ راکھ ہاتھ میں لے کر آئی۔ اس نے آہستگی سے بچی کی کلائی زہرہ کے ہاتھ سے الگ کی اور زخم کے اوپر راکھ جمانے کی کوشش کی۔

مگر خون نہ رکا۔ اب یہ بالکل واضح تھا کہ جاتی کی وہ روایتی ابتدائی طبی امداد کی کوششیں کارگر نہیں ہوں گی۔ زہرہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر انہوں نے کسی قسم کی قبولیت ظاہر نہ کی۔ اتنے میں ایک جھگی کے سامنے کا پردہ ہٹا اور وہ شخص برآمد ہوا جسے میں اب تک مانگر حقیقت پسند کے قدرے غیر حقیقی نام سے پکارتا آیا ہوں اور اب میں اسے اس کے حقیقی نام سے پکاروں گا جو کہ مُندری تھا۔ مُندری جو بچی کی چیخ پر وہاں نہیں پہنچا تھا اب اپنی تیزی سے پرسکون قدم اٹھاتا وہاں آیا اور اس نے ساری صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد سب کو تحکمانہ انداز میں ڈانٹا جس سے ساری کارروائی رک گئی سوائے بچی کے خون کے جو اب بھی تیزی سے گر رہا تھا۔ اب زہرہ نے تیزی سے اپنا رومال پھاڑا اور زخم کے پیچھے باندھ دیا۔ ہماری پُرتشویش امدادی سرگرمی کو دیکھ کر مُندری کچھ دیر عجیب سے انداز میں مسکراتا رہا اور پھر بولا 'باؤ جی آپ ابھی ادھر ہی ہو، اُدھر انعام گڑھ میں تو جلسہ شروع بھی ہو چکا ہوگا۔ میں نے تو آپ سرکار کی منت کی تھی کہ رات ہونے سے پہلے ہی ادھر سے نکل جائیں۔'

(نوٹ: واضح رہے جیسے پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ جاتی کے افراد کے مکالمے میں نے ان کی بولی سے سہل و سلیس کر کے لکھے ہیں اور یہ عین بعین اصل نہیں ہیں۔ نقل اگر کوئی لسانی فساد پیدا کرتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ کبیر)

میں نے مُندری سے کہا 'وہ سب ٹھیک ہے۔ ہم شاید اب تک چلے ہی جاتے مگر ہم بھورے کا انتظار کر کے جانا چاہتے تھے اور پھر اس وقت تو مسئلہ اس بچی کا ہے۔ اس کی رگ کٹ گئی ہے اور اسے فوراً ہسپتال پہنچانا چاہیے۔ ٹانکے لگیں گے ورنہ خون بند نہیں ہوگا اور بچی کی جان بھی جا سکتی ہے۔'

میری بات سن کر مُندری ہنسا۔ 'جان کا ادھر کیا ہے باؤ جی۔ ہے نہیں ہے۔ پر آپ ٹھیک ہے امداد کر دیں۔ کچھ رقم دے دیں۔ ہم اسے آپ لے جائیں گے گڑھ بچی کرانے۔'

میں نے زہرہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ (زہرہ) صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ اب وہ عورت جو راکھ لائی تھی، اس کا میرے اوپر کچھ اعتماد قائم ہوا۔ اس نے پھر بچی کی کلائی میرے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ وہ بچی کی ماں تھی۔ پہلی دفعہ اس نے ہماری طرف پُرامید نظروں سے دیکھا اور پھر اس شخص کی طرف بے یقین التجائی نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ہم بچی کو ابھی گاڑی میں لے جائیں گے، انعام گڑھ۔ کسی ہسپتال یا کلینک میں، وہاں ہسپتال اور کلینک تو ہوں گے۔ اس پر وہ شخص پھر مسکرایا اور مجھے اپنے آپ پر افسوس ہوا کہ مجھے اس کی مسکراہٹ سے نفرت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ وہاں تو کسی بھی شخص سے کسی بھی نفرت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بہرحال اس نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جائے گا اور پھر غالباً اس نے خرچے وغیرہ کی کوئی بات کی۔ ظاہر ہے اُس کے ساتھ جانے پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر میری خواہش تھی کہ بچی کی ماں ساتھ جائے۔ میں نے اُس سے بچی کا نام پوچھا۔ 'بالی' اس نے بتایا۔

پھر کبیر نے مجھ سے انگریزی میں کہا اس شخص کا ساتھ جانا بہتر ہے کیوں کہ ہم انعام گڑھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

'پتہ نہیں کیوں مجھے اس شخص پر کچھ یقین نہیں'۔ میں نے کہا اور پھر کبیر نے کہا۔

'مکمل بے یقینی سے کچھ انسانی یقین کی سطح پر ہم آئے ہیں۔ اس تشویش ناک حادثے کی وجہ سے۔'

Scanned by CamScanner

'ہاں اب شاید یہ ذلتوں کے مارے لوگ ہمیں پتھر لکڑی کی بجائے انسان سمجھنے لگے ہیں۔'
میں نے کہا۔
'یہ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ ہنوز ہم ماگر جاتی کے تصورِ انسان سے نابلد ہیں۔' کبیر نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا اور میں نے کہا 'اچھا اب تم انگریزی میں یہ سب بکواس بند کرو یہ سب بہت مشکوک ہو رہے ہیں۔' مگر بند کرنے کی بجائے کبیر نے اور بھی اترا کر کہا 'یہ زبان ہی ایسی ہے اردگرد شک کے عنصر پیدا کرتی ہے۔ تمہیں یاد نہیں؟ کیفے غلام باغ میں جب ہم ہاف مین کی وجہ سے اس لسانی واسطے میں کلام اور 'تحت الکلام' کرتے تھے تو ہمارے اردگرد شک کی لہریں موجزن ہونے لگتی تھیں۔' اور مجھے ہزاروں مرتبہ کے بعد پھر ایک مرتبہ حیرت ہوئی کہ یہ شخص کس طرح کوئی موقع محل دیکھے بغیر تیزی سے چھلانگیں لگاتا ہوا کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے چنانچہ میں نے پھر کہا۔
'بند کرو یہ بکواس' اور پھر اس شخص اور بچی کی ماں سے کہا کہ جلدی چلنے کی تیاری کریں۔ میں نے دیکھا کہ اس شخص کی مسکراہٹ بھی کچھ بدل سی گئی تھی۔ جیسے کسی مسکراتے ہوئے بندے کو اچانک تھپڑ پڑ جائے تو جیسی کچھ دیر بعد کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کچھ ایسا ہی عجیب تاثر تھا۔ بہر حال میں نے ان لوگوں سے بار بار کہا کہ بچی کو فوراً لے جانا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا اعتماد یا جو کچھ بھی وہ سوچتے تھے، وہ پہلی حالت میں واپس آیا۔
(کبیر) زہرہ کی ذہانت کا مجھ پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور میں نے بھی مندری اور جاتی کی اس بیگانگی کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی جو ہماری وقتی ناقابلِ فہم گفتگو کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے قائم ہو گئی تھی اگرچہ بنیادی غیریت، زہرہ اتفاق کرے گی، اٹل تھی اور وہیں کی وہیں تھی اور قبول کی یہ بین الموضوعی کیفیات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ یہ صفحات جو پہلے ہی خط کے نام پر ایک مجرمانہ ضخامت کی طرف بڑھ چکے ہیں، اس کے تجزیے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ پھر اس مشق میں زہرہ کی متواتر مداخلت ناگزیر ہوگی اور جسے میں اس مرحلے پر کم سے کم رکھنے کا خواستگار ہوں۔ کیونکہ آگے کے واقعات اتنے گھمبیر اور، اگر میں یہ لفظ استعمال کر سکوں، اگرچہ یہ ایک سخت اور بھاری لفظ ہے۔ ہولناک۔ تو یہ واقعات اتنے ہولناک ہیں کہ شاید زہرہ کا قلم انہیں سنبھال نہیں سکے گا۔ مگر شاید یہ بھی میرا خود پسندانہ واہمہ ہے۔ اس 'دوطرفہ ملوث خطانویسی' میں ایک بات جو بار بار مجھے محسوس ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ زہرہ خواہ میرے لکھوائے ہوئے کی املا کرتی ہے یا خود لکھتی ہے یعنی مداخلت

کرتی ہے، انداز نگارش جسے ماہرینِ ادب و تنقید اسلوب بھی کہتے ہیں، ایک جیسا ہی ہوتا جا رہا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی تحریری شناخت ختم ہی جا رہی ہے۔ اگر اب یہ واضح کرنا چھوڑ دیا جائے کہ کون لکھ رہا ہے تو قاری (ناصر) کے لیے یہ پہچاننا مشکل ہو جائے کہ کون لکھ رہا ہے۔
(زہرہ) یعنی جو تم کھو رہے ہو میں وہ پا رہی ہوں مگر فکر نہ کرو میری تحریر کی کوئی شناخت نہیں اور بے شناخت تحریر سب کچھ پا کر بھی بے شناخت ہی رہتی ہے۔
(کبیر) آہ...... اب یہ فقرہ ہی مثلاً اگر یہ میں کہتا تو بھی ایسا ہی کہتا۔
(زہرہ) اسے میں تمہاری نذر کرتی ہوں۔ تم آگے چلو وہ واقعات۔ میرے خدا ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایک ہی رات میں کیا قیامت برپا ہونے والی ہے۔
(کبیر) میں نے مندری سے کہا کہ وہ بچی کو اٹھائے اور چلے مگر اس نے عجیب بات کی جس کا اس صورت حال سے بظاہر کچھ بھی تعلق نہیں تھا۔ 'پانچ سو دیگیں پکتی ہیں۔ زردہ۔ پلاؤ۔ گوشت۔ لنگر نکلتا ہے۔ پانچ سو دیگیں......' وہ کچھ اسی طرح بڑبڑا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مرتی کی دھندلاہٹ پھیلی تھی۔ اس پر میں نے خود بچی کو گود میں اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر عین اس وقت ایک ایسی مداخلت سامنے آ گئی کہ جس کے ہم یوں تو بہت منتظر رہے تھے مگر اب بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ بھورا ارشاد آ رہا تھا۔
زخمی بچی کی طرف بڑھے میرے ہاتھ وہیں رک گئے اور میں جو آگے کو جھکا ہوا تھا سیدھا کھڑا ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ بھورا اس سمت سے آنے کی بجائے کہ جدھر وہ گیا تھا، دائیں طرف کی گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے نکلا تھا اور اسی سے اس کے نمودار ہونے کا ہمیں اچانک پتہ چلا تھا۔ وہ ہمارے قریب پہنچا اس نے دونوں بازو آگے کو پھیلا رکھے تھے اور اس کے ہاتھوں پر لکڑی کا ایک تختہ تھا جس کی جسامت بچوں کی لکھائی کی تختی سے دوگنی ہوگی۔ پہلی نظر میں مجھے اس تختے پر گیلی مٹی کی کچھ ڈھیریاں سی نظر آئیں مگر جب بھورا سر جھکائے ہاتھوں پر تختے کو متوازن کیے قریب آیا تو پتہ چلا کہ ڈھیریاں اصل میں تازہ گیلی مٹی سے بنے دو انسانی پتلے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ چند لمحوں کے لیے میں ان دو پتلوں کے علاوہ دنیا کی ہر چیز کو فراموش کر بیٹھا۔ وہ ایک عورت اور ایک مرد کے پتلے تھے جن کی جسامت کوئی ڈیڑھ دو بالشت کے لگ بھگ ہوگی اور بظاہر مجسمہ سازی کی بھدی مثال ہونے کے باوجود دیکھنے والے کے ذہن پر ایک عجیب جمالیاتی

Scanned by CamScanner

بے چینی کا تاثر چھوڑتے تھے۔ عورت اور مرد کے چہروں کے نقوش کا فرق تو پہچانا جاتا تھا مگر ان کی
جسمانی ساخت کے فرق کو بھی مزید نمایاں کیا گیا تھا۔ مرد پتلے کی جنسی ساخت کو کیکر کے ایک
پھول سے ظاہر کیا گیا تھا جبکہ زنانہ پتلے کے سینے کی مخصوص ساخت کو نمایاں کرنے کے بعد
زیرِ ناف گندم کے تین دانے گیلی مٹی میں اس طرح دبائے گئے تھے کہ ان کی درمیانی لکیریں مل کر
ایک ہی لمبی لکیر بنا رہی تھیں۔ دونوں پتلوں کی آنکھوں کی جگہ کوئی گول سیاہ بیج گڑے تھے جو کسی
درخت کے تھے۔ میں بتا نہیں سکتا مگر ان بیجوں نے آنکھوں کو خوفناک حد تک حقیقی رنگ دے دیا
تھا۔ بالوں کی جگہ پرندوں کے پروں کے مہین روئیں گاڑے گئے تھے۔ مرد پتلے کے روئیں مختلف
رنگوں کے تھے جبکہ زنانہ پتلے کے بالوں کو صرف بھورے رنگ کے پروں کے روئیں سے بنایا گیا
تھا۔ اسی پر مجھے خیال آیا کہ بھورا جو اتنی دیر غائب رہا ہے تو کیوں غائب رہا ہے۔ بھوری مائی۔
غلام۔ کالیا۔ پارو۔ پتلے اور ایسی ہی ناقابل فہم باتیں کرنے کے بعد وہ گیا تھا اور اس عرصے میں وہ
جس تخلیقی سرگرمی میں مصروف رہا تھا اس کا حاصل ہمارے سامنے تھا اور وہ حاصل ایک ایسی انوکھی
شہوانیت کا ہیجان پیدا کرتا تھا جو جنسی عریانیت کی سستی امیجز کی عمومی اشتعال بازی سے قطعاً مختلف
تھا۔ اچانک مجھے مندری کی کرخت آواز سنائی دی۔

'بے شرم بڈھا' اور پھر بھورے نے جو ویسے ہی سر جھکائے اور سامنے پھیلائے ہوئے
ہاتھوں پر وہ تختہ رکھے ہمارے سامنے کھڑا تھا اپنی بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا 'بھوری مائی،
اپنے پتلے لے جا۔ جاتی کا کال لے جا۔ بھوری پتلے لے جا کال لے جا۔' پھر وہ اس فقرے کو
مسلسل ایسے دہرانے لگا جیسے کوئی الاپ کر رہا ہو۔

'پاگل ہے بے شرم۔ میں نہیں کہتا تھا صاحب۔ پاگل ہے' مندری کی آواز آئی۔

میں نے زہرہ کی طرف دیکھا تو دیکھا...... (زہرہ) تم کیسے بتا سکتے ہو تم نے زہرہ کی طرف
دیکھا تو کیا دیکھا۔ خود میرے لیے شاید ممکن نہیں کہ بتا سکوں۔ کبیر نے پیچھے کہیں کہا تھا کہ وہ دل ہی
دل میں بھورے کا انتظار کر رہا تھا اور وہ اس کی کسی دیوانی جادوئی دنیا میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ مجھے
ایسا کوئی انتظار نہیں تھا، میں شروع سے اس کی باتوں کو کوئی غیر معمولی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ چونکہ کبیر
کی ہی شرارت بازی سے اس نے وہ واہمہ بنانا شروع کیا تھا یا وہ واہمہ پہلے ہی اس کے ذہن میں
تھا اور کبیر کی کسی بات سے اسے اظہار کا کوئی اشارہ ملا تھا۔ پھر ایک لمحے کے لیے میں نے اسے کوئی

مذاق بھی سمجھا تھا مگر آخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ شخص ان لوگوں کی دنیا میں کسی ایسے کام اور
مقام پر ہے جسے ابھی ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں نے اس کے مکمل ناقابل فہم ہونے کو ہی قبول کر
کے اور کسی قیاس آرائی کو رد کر کے، جو کسی طرح کی ذہن میں آئی تھیں سب کو نظر انداز کر دیا تھا اور
'کچھ بھی ہونے' کا انتظار کرنے لگی تھی اور جو ہوا وہ اس بچی کا حادثہ تھا جو ابھی تک وہاں جو کچھ بھی
ہو رہا تھا، اُس میں سب سے زیادہ حقیقی تھا اور اس پر ہمارا ردعمل بھی بالکل حقیقی تھا اور ہم اسے لے
کر اس کے زخم کا علاج کرانے کے لیے جانے ہی والے تھے کہ وہ آ گیا اور وہ پھر سے ایک عجیب
انوکھا غیر حقیقی ناقابل فہم واقعہ تھا مگر اب اُس کی باتوں کی طرح اُسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ میری
نظریں بھی ان گیلی مٹی کے پتلوں پر گڑی تھیں اور پھر وہ احساس میرے اندر اتر آیا اندر سے ابھرا،
کہ میں اپنی فطری حالت میں زمین پر پڑی ہوں اور زمین کا ہی حصہ ہوں مگر نہیں ہوں۔ اور دنیا
مجھے دیکھ رہی ہے مگر مجھ میں چھپ جانے اور اپنے کو ڈھانپ لینے کی کوئی خواہش نہیں اور جیسے میری
یہ حالت کسی پر کوئی بہت بڑی بربادی نازل کرنے والی ہے۔ یہ احساس جتنا لحاتی تھا، اتنا ہی شدید
تھا اور جو حیرت ہے کہ ایک گزرے ہوئے واقعے سے جا ملا جس کے بارے میں، میں نے کبھی
سوچا بھی نہیں تھا۔ جب یادر ہاؤس پر انہوں نے قبضہ کیا اور میری ماں نے مجھے میرے بھائی کے
گھر میں رکھ کر میری ہٹ دھرمی توڑنے کی کوشش کی تو ایک روز بارش ہوئی ٹھنڈی جس میں اولے
تھے۔ میں باہر نکل گئی پانی اور کیچڑ میں لیٹ گئی اور منہ کھول کر بارش کو سیدھا منہ میں اتارتی رہی۔ یہ
منظر میری نظروں کے سامنے آیا تھا کہ اس شخص نے وہ الفاظ بڑبڑانے شروع کر دیے۔ اس کی
بڑبڑاہٹ کا کوئی ڈراؤنا پن تھا کہ جس سے وہ بچی ڈر گئی اور تیزی سے پیچھے ہٹی تو میری نظر اس کی
کلائی پر پڑی۔ اس کا ہاتھ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور یہ دیکھتے ہی وہ سب کچھ میرے لیے
پہلے جیسا ہی غیر حقیقی اور ناقابل فہم ہو گیا سوائے اس بچی کے بازو کے۔ خون روکنے کے لیے اس
کی کلائی پر جو رومال میں نے باندھا تھا اس نے خون کو بالکل روک دیا تھا اور یہ بھدی ابتدائی طبی
امداد اس کے ہاتھ کو شدید نقصان پہنچا سکتی تھی۔ میں نے کہا 'اب کچھ بھی ہو ہم ایک لمحہ بھی یہاں
رک نہیں سکتے۔'

(کبیر) یقیناً میں کبھی نہیں بتا سکتا تھا کہ جب میں نے زہرہ کو دیکھا تو کیا دیکھا مگر میں نے
اس کی بھرائی ہوئی آواز سنی 'جلدی بچی کو لے چلو ورنہ اس کا ہاتھ مردہ ہو سکتا ہے'۔ میں بھی جو اپنے

Scanned by CamScanner

مردہ ہاتھ کے حوالے سے ان الفاظ کی شدت خوب پہچانتا ہوں اُس کیفیت سے جسے زہرہ غیر حقیقی کہتی ہے اچٹ گیا اور درپیش معاملے کی سنگینی نے دیگر سب حقیقی غیر حقیقی معاملوں اور مداخلتوں پر فوقیت حاصل کر لی مگر پھر...... بھورے نے اچانک اپنی بڑبڑاہٹ بند کی اور سر اٹھا کر ہماری طرف پہلی دفعہ دیکھا اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر اپنے اساطیری تحیر اور خوف کے تاثرات نمودار ہوئے کہ جو مجھے بھی خوفزدہ کر گئے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا 'بھوری مائی کہاں ہے اور اُس کا غلام کہاں ہے۔'

پھر اس نے اور بھی وحشت زدہ آواز میں وہی سوال دہرایا۔ تب زہرہ نے میری طرف دیکھا شاید اس کی نظروں میں یہی حکم تھا کہ تم ہی اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہو، اب تم ہی اس سے نپٹو۔ اُدھر بوڑھا اپنی خوف زدہ آواز میں جیسے اکیلا ساری دنیا سے یہ سوال کر رہا تھا۔ 'بھوری مائی کہاں ہے اس کا غلام کہاں ہے؟'

تو میں کیا کرتا۔ کیا میں اس سے یہ کہتا۔ یہ اعتراف کرتا اور قبول کرتا کہ میں کسی عجیب وغریب مخلوق 'بھوری مائی کا غلام ہوں۔' اور زہرہ کوئی عجیب وغریب مخلوق بھوری مائی ہے یعنی اپنی اس ایک لمحے کی بک بک کو آخر میں میں بھورے کی واہموں بھری التباسی دنیا کا حصہ بنا دیتا۔ میں ایسا کیسے کر سکتا تھا مگر جو بات میرے لیے چکرا دینے والی تھی وہ یہ تھی کہ اگر وہ ہمیں (اپنی التباسی دنیا میں ہی سہی) کوئی ویسی ہی مخلوق سمجھتا تھا تو پھر اب ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اگر ہم پہلے ویسے تھے جیسے وہ سمجھتا تھا۔ تو اب بھی ویسے ہی تھے۔ ہم اب کیسے اس کے لیے 'لافانی اساطیری' سے گر کر 'فانی زمینی' ہو گئے تھے۔ میں اس سے یہ سوال کبھی بھی نہ کرتا، میں اس سے یہ سوال کر ہی نہیں سکتا تھا نہ میں نے کیا۔ میرے پاس زبان اور اظہار کا کوئی ایسا وسیلہ تھا ہی نہیں کہ میں واہمے اور التباس کی گرائی پر اس سے کوئی سوال جواب کرتا۔ مگر اسی وقت مُندری کی آواز پھر آئی۔ وہ بھورے سے گالی جیسے لہجے میں مخاطب تھا 'او پاگل، سودائی......' پھر اس نے میری اور زہرہ کی طرف دیکھ کر چیخ کر کہا۔ 'او...... انہیں ہی تو۔ میم صاحب کو صاحب کو کہتا تھا۔ وہ سب۔ جو پاگل بناتا تھا، اپنے ساتھ۔ وہی ہیں۔ اب بدل گئے ہیں؟' اس پر بھورا خاموش ہو کر پھر سے ہمیں گہری نظروں سے دیکھنے لگا ہنسا اور بولا 'مجھے مورکھ کہتا ہے۔ یہ تو وہ اخبار زوزنانی اور مرد ہیں جو جاتی کے بادشاہوں کے بھید لیتے پھرتے ہیں۔'

تب زہرہ نے بھی چیخ کر سختی سے کہا 'کبیر چلو۔ وقت ضائع مت کرو' اور مُندری نے زہرہ کی بات سے اسی شہ پا کر یک دم آگے بڑھ کر بھورے کے ہاتھوں پر اب بھی رکھے تختے کو زور سے اُلٹ دیا۔ گیلی مٹی کے پتلے نیچے گرے اور گرتے ہی ٹوٹ پھوٹ گئے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ دیکھ کر میرا دل دہل گیا جیسے کوئی بہت بڑا ظلم ہو گیا ہو۔ کوئی بڑا اندھیر ہو گیا ہو۔ زہرہ نے اسی وقت بچی کی کلائی پر بندھے رومال کی گرفت ڈھیلی کی تا کہ خون ہاتھ میں جانا بالکل رک نہ جائے اور اگلے ہی لمحے کٹی ہوئی رگ سے خون کی دھار پھوٹ نکلی مگر ہاتھ کی رنگت فوراً بدل گئی۔ میں نے بچی کو اٹھایا اور زہرہ، میں اور پیچھے مُندری تیزی سے اوپر کار کی طرف چلے۔ بھورا چیختا ہوا پیچھے آیا۔ اس کی آواز دہشت ناک تھی۔ 'خون۔ خون بھوری مائی اُس کا غلام چلے گئے۔ پتلے نہیں گئے۔ کال نہیں گیا۔ کال۔ کال۔ خون۔ جاتی کا خون ہوگا۔ جاتی اجاتی کا خون ہوگا......' جب زہرہ نے گاڑی کا رخ واپس انعام گڑھ کی طرف کیا تو بھی وہ پیچھے بھاگتا ہوا آ رہا تھا اور چیخ چیخ کر وہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ کچے راستے پر گاڑی کی رفتار سست تھی مگر پھر بھی مجھے اس عمر میں اُس کے اس طرح بھاگنے پر حیرت ہو رہی تھی۔ اچانک زہرہ نے گاڑی روکی۔ پچھلا دروازہ کھولا اور باہر کھڑے ہانپتے بھورے کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ یک دم خاموش ہو گیا اور مُندری کے بائیں طرف سیٹ کے اوپر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور پھر کچھ نہ بولا۔ مُندری نے اسے گاڑی میں بٹھانے پر کوئی احتجاجی کلمہ کہنا چاہا تو زہرہ نے اسے ڈانٹ دیا اور ہم پھر جتنا بھی تیزی سے ممکن تھا، انعام گڑھ کی طرف چلے۔ بچی میرے پاس آگے تھی میں نے مڑ کر دیکھا تو بھورے کا چہرہ زرد تھا مگر آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پھر راستے میں مجھے پیچھے سے بھورے کے ساتھ مُندری کی ترغیبی گھسر پھسر سنائی دیتی رہی۔ 'پاگلا بے شرم بڑھیا۔ کچھ شرم کر۔ چل تو بھی چل جشن کر میرے ساتھ لنگر پر۔ اب بالڑی کے بہانے گڑھ تو جانا ہی ہے۔ لنگر پر چل۔ ہر سال پانچ سو دیگیں پکتی ہیں، اس سال ہزار پکی ہیں۔ پرچھوں کا جلسہ جو ہوا۔ غلہ منڈی۔ پھر لنگر۔ جہاں ہر سال ہوتا ہے۔ زردے۔ پلا۔ بوٹیاں...... کنجرا نہ تُو اُس کنجری اور اس کے ڈنے کو اپنے کب پر لگا تا۔ نہ وہ جیاتے پنگل کا...... کالتی۔ نہ پلس مار کرتی۔' 'پرچھوں کا جلسہ' پہلی دفعہ میں نے ان الفاظ پر غور کیا تو مجھے اس دیہاتی لڑکے کی باتیں یاد آ گئیں جو اسی صبح ہمیں ملا تھا جب ہم انعام گڑھ کی سڑک پر ماگڑھ کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔

Scanned by CamScanner

'ادھر جی جلسہ ہے شام کو۔ پرچیوں کا۔ بڑی بڑی نامی ہستیوں نے پہنچنا ہے جی' اور جب اُس نے بڑی بڑی ہستیوں کے نام بتائے تھے تو واقعی ہی وہ بڑی بڑی تھیں بلکہ ایک آدھ تو کافی بڑی تھی۔ 'ادھر بڑا آدم اکٹھا ہوتا ہے جی۔ بڑی خلقت پڑے گی۔ بڑی خدائی بھولی ہے ادھر۔ پھر غریب غربے کا لنگر کھلتا ہے جلسے کے بعد۔ ادھر تو حشر نشر ہو جاتا ہے۔'

اور جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں کچا راستہ واپس سڑک سے جا ملتا تھا اور جسے عبور کر کے ہم نے دوسری طرف قصبے کو جانا تھا تو اس لڑکے کی باتیں مجھے حرف بحرف درست ہوتی نظر آ گئیں اور مندری کی قابلِ رحم نفرت انگیز باتیں بھی مجھے کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ 'حشر نشر' کا پہلا منحوس منظر ایک خوفناک ٹریفک جام کی شکل میں ہمارے سامنے تھا۔ اندھیرے میں دونوں اطراف سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے سڑک روشن تھی اور ہر قسم کی گاڑیاں ایک دوسرے کی راہ روکے پھنسی کھڑی تھیں۔ ٹرک۔ بس۔ کاریں۔ ٹریکٹر ٹرالے۔ جیپیں۔ تانگے۔ ریڑھے۔ موٹر سائیکل۔ پک اپ۔ ویگنیں۔ سب جیسے ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے تھے۔ ہارنوں اور انجنوں کے شور اور انسانوں کی انتہائی ہوئی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور جو بھی سنائی دیتی تھی، وہ گندی گالیوں کی صورت میں تھی جو لوگ آنے والی بڑی بڑی شخصیات کو دے دے کر دل ٹھنڈا کر رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ بڑی بڑی اور خاص طور پر بہت بڑی شخصیت کی رواں دواں آرام دہ نقل و حرکت کو برقرار رکھنے کے لیے فالتو خلقِ خدا کا رستہ روکا گیا تھا لیکن اب یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ اس مشینی اور انسانی جہنم سے اور وہ سب کچھ جو اسے عبور کرنے کی صورت میں دوسری طرف قصبے میں ہمارا منتظر تھا، اس سب کچھ سے ہمارا ایک ناقابلِ تردید رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ گویا ماکونڈو کی 'حقیقت پسندی' اور 'طلسمی شعور' سے ہی نہیں انعام گڑھ کی 'تاریخی و ثقافتی و سماجی و معاشی و سیاسی جدلیات' سے بھی پیچھا چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ زہرہ نے ٹھنڈا سانس لیا اور مایوسی سے بچی کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم اس سڑک کو عبور کر کے دوسری طرف قصبے میں جا سکتے۔ اس نے پھر رومال کی گرفت ڈھیلی کی۔ کچھ خون بچی کے ہاتھ میں اور زہرہ کے کپڑوں پر گرا۔ میں گاڑی سے اترا اور سامنے کھڑے ٹرک اور بس ڈرائیوروں پر صورتِ حال کی سنگینی واضح کی کہ بچی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ انہوں نے اپنی ہمدردی اور بے بسی کا اظہار کیا جو قابلِ فہم تھی۔ کسی کے لیے ایک انچ بھی آگے پیچھے ہلنا ممکن نہیں تھا کجا یہ کہ وہ گاڑی کے لیے راستہ بناتے۔

بچہ اب سیٹ پر ایسے پڑا تھا جیسے رحمِ مادر میں بچہ جبکہ مندری ابھی تک ایک شیطانی سی لاتعلقی سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا 'کوئی اور راستہ بھی تو ہوگا۔' اس پر وہ ہنسا 'ہاں جی صاحب ہے پر اندھیرا بہت ہو گیا ہے۔ میم صاحب جی وہ راستہ بہت خراب ہے۔' 'وہ تم چھوڑو رستہ دکھاؤ' زہرہ نے کہا۔ اب اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا 'پر صاحب جی۔ میم صاحب جی لنگر ضرور کھانا ہے۔ بالی کی پٹی کے بعد لنگر ضرور کھانا ہے۔' میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ 'میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں لنگر ضرور کھلایا جائے گا۔' میں نے کہا اگرچہ ابھی مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ لنگر کیا بلا ہے۔

پیارے ناصر یہاں میں مختصر کرتا ہوں کیونکہ میں بے تاب ہو رہا ہوں کہ جلد از جلد تمہیں ان واقعات تک لے جاؤں، وہ بھیانک غارت گری جس کا حال تم اس خط کے ملنے تک یا اس کے بعد شاید، میں نہیں جانتا تمہیں جیل میں اخبار بینی کی سہولت حاصل ہے یا نہیں مگر جو یقیناً اخباروں میں انعام گڑھ کی خونی بھگدڑ جیسی سرخیوں سے چھپے گا۔ بہر حال قصہ مختصر یہ کہ مندری ہمیں اسی کچے راستے پر واپس لایا اور پھر جنوب کو جاتے ایک اور بھی زیادہ کچے راستے پر ڈال کر اور پھر سڑک کے نیچے سے گزرتے ایک برساتی پل کے نیچے سے گزار کر انعام گڑھ کے عقبی مضافات کی طرف لے گیا۔ یہ مشکل دشوار گزار سفر اس لحاظ سے اچھا ثابت ہوا کہ ہم ایک دیہاتی ڈسپنسری کے سامنے جا پہنچے۔ جہاں رات کے نو بجے ایک ڈاکٹر نہ صرف اپنے کوارٹر میں موجود تھا بلکہ بیتھوون کی نویں سمفنی سن رہا تھا۔ 'میم صاحب۔ صاحب' اور ان کے ہمراہ 'جنگلی قبیلے' کے افراد دیکھ کر وہ سخت حیران ہوا مگر بچی کی کیفیت دیکھ کر وہ سب کچھ بھول کر اپنی مکمل پیشہ ورانہ شخصیت میں آ گیا اور جب اس نے انتہائی چابک دستی سے بچی کے زخم کو ٹانکے لگائے، مرہم پٹی کی اور بچی کو دوا کھلا کر ہر لحاظ سے اپنی تسلی کر لی تو مجھے، اور میں کہہ دیتا ہوں کہ زہرہ کو ایک ایسی گہری طمانیت کا احساس ہوا جیسے ہم نے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہو......

(زہرہ) ہاں جیسے دنیا میں اس سے بڑا میرے لیے اور کوئی کام نہیں تھا۔ مجھے احساس ہوا جیسے دنیا میں میرے لیے رکھے گئے سب کام ختم ہو گئے ہیں۔

(کبیر) ہاں۔ جیسے اب اور کہیں نہیں جانا تھا اور جیسے اور کچھ باقی نہیں تھا۔

ہم 'اُس سب کچھ مکمل ہو جانے' کی کیفیت میں تھے کہ اس اچھے انسان دوست ڈاکٹر نے

Scanned by CamScanner

دبے لفظوں میں ہمارے حدود اربعے کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے کہانی پہلے ہی گھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم اخبار والے ہیں اور جلسے کی کارروائی کور کرنے کے لیے آئے تھے مگر رستے میں ان لوگوں کو مصیبت میں مبتلا دیکھا تو انہیں یہاں لے آئے۔ اس وضاحت پر ڈاکٹر ایک طنزیہ خوش دلی سے بولا، 'اس کا مطلب ہے کہ اخبار والوں میں ابھی تک کچھ اچھے لوگ باقی ہیں۔' میں بھی جواباً ہنسا اور اس نوجوان کی شناخت میں 'اچھا انسان دوست' معقول ڈاکٹر کا اضافہ کیا اور کہا، 'نہیں ایسا کہنا بہت مشکل ہے۔' وہ اور بھی خوش دلی سے ہنسا اور ہمیں چائے کی پیشکش کر دی جو شاید ہم قبول کر لیتے کیونکہ دنیا میں ہمارا کام مکمل ہو چکا تھا مگر سُندری نے صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے میرے کان میں مضطرب سی سرگوشی کی 'صاحب لنگر کھانا ہے۔ لنگر ضرور کھانا ہے۔' میں اگر جانی کے حقیقت پسند بلکہ کہنا چاہیے کہ 'ناٹ جیٹ پسند' سے وعدہ خلافی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دوسری طرف 'جلسی شعور' ابھی تک گاڑی میں جستین کی شکل میں پڑا تھا اور پھر آخر ان سب کو واپس ماٹر کو بھی پہنچانا تھا۔ چنانچہ ہم نے ڈاکٹر سے معذرت کی اور اجازت مانگی۔ اس نے کہا 'اچھا آپ نے جلسے کی کوریج بھی کرنی ہوگی۔ ویسے یہ بڑا احساس سیاسی علاقہ ہے اور ثقافت، سائنس اور مذہبی امور کی وزارتیں اکثر ادھر کے بڑوں کو مل جاتی ہیں۔ اس دفعہ تو سنا ہے زیادہ بڑے عزائم ہیں مگر کچھ عرصہ پہلے یہاں کی ایک بڑی معزز شخصیت کی غالباً گھریلو ملازمہ نے...... کچھ لوگ کہتے ہیں، نوجوان فقیرنی نے......' پھر وہ یک دم خاموش ہو گیا اور اس نے زہرہ کی طرف اجنبی سی بے چین نظروں سے دیکھ کر مجھے مخاطب کیا، 'بہر حال آپ سب کچھ کور کر ہی لیں گے۔'

میں نے اسے یقین دلایا کہ یقیناً ہم سب کچھ کور کرنے کی کوشش کریں گے۔

'آپ چلیں گے جلسے پر؟' میں نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔

'جی نہیں میں نے پی تھوون کی نویں سمفنی سننے کو ترجیح دی ہے۔ میرے محلے کے لوگ گئے ہیں۔ خاص طور پر لنگر پر؟'

'پی تھوون؟' زہرہ نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

'جی۔ مجھے مقامی موسیقی بالکل پسند نہیں۔ حالانکہ میں بھی اتنا ہی محبِ وطن ہوں جتنا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔'

یہ ایک ایسا لمحہ تھا کہ اگر ہم ڈاکٹر کے اس عجیب و غریب سوال کا جواب دینے میں الجھ جاتے

تو ایک زمانہ وہیں بیت جاتا اور سُندری سے میرا وعدہ کہ 'لنگر ضرور کھلایا جائے گا' دھرا رہ جاتا۔ اب میں سوچتا ہوں۔ کاش! ہم کلاسیکی مغربی موسیقی اور غریب الوطنی میں تعلق ڈھونڈنے بیٹھ ہی جاتے اور اس خونی لنگر کی طرف نہ جاتے اور وہ سب کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اگر وہ بچی سارڈین کے کٹے ڈبے کے لیے چھینا جھپٹی نہ کرتی تو اسے زخم نہ لگتا۔ نہ اسے زخم لگتا نہ ہم اس کا علاج کرانے نکلتے۔ نہ سُندری ساتھ آتا نہ وہ لنگر پر جاتا اور نہ وہ سب کچھ ہوتا جو ہوا مگر اور کہیں سے بھی شروع کر کے ہم بچ سکتے ہیں...... نہ یار عطائی بڑے شہر جاتا نہ اس کی بچی اس کی بنیاد کے بارے میں متفکر ہوتی نہ وہ ہاتھ گنوا آتی نہ وہ سب کچھ ہوتا جو ہوا۔ نہ فقیر پیدا ہوتا نہ وہ سب کچھ ہوتا جو ہوا۔ واقعے کی دُم سے واقعہ باندھتے چلے جانا سستی بلکہ نام نہاد اعلیٰ فکشن کا بھی تقاضا تو ہو سکتا ہے مگر زندگی تو وہی ہے جو بس ہاتھ سے نکلتی چلی جاتی ہے اور دوسرے ہی لمحے کچھ باقی نہیں رہتا سوائے تاسف کے۔ مگر چھوڑو میں کدھر چل پڑا۔ یہ وقت ہرگز نہیں اس طرح کی بک بک کا۔

قصبے میں داخل ہوئے تو پہلا تاثر یہاں بھی وہی تھا جو اس دیہاتی لڑکے کے الفاظ تھے یعنی حشر نشر۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ بازاروں میں دوکانیں بند تھیں مگر ہر طرف ایک عجیب ہیجانی افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ چوکوں اور بازاروں میں ٹولیوں کی صورت میں ہر سمت آ جا رہے تھے۔ یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ وہ کدھر سے آ رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ سُندری ہمیں غلہ منڈی کی راہ دکھا رہا تھا۔ بچی غالباً دوا کی وجہ سے سو گئی تھی اور بھورا اپنی جستین نیند سے بیدار ہو کر بیٹھ چکا تھا اور باہر دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر جیسے بند تھیں۔ میں نے سوچا وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے غالباً اسے خواب سمجھ رہا ہے ایک دیوانے کا خواب۔

سُندری نے جب اسے 'بے شرم بڈھیا' کہا تو مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ اگر اس نے ایک لفظ بھی بھورے سے کہا تو اسے وہیں اتار دیا جائے گا۔ میں نہیں جانتا اس نے میری ڈانٹ کا کیا اثر قبول کیا مگر اس نے بار بار گاڑی کے آگے آنے والی ٹولیوں کے بارے میں جو بہت بادل ناخواستہ رستہ دیتی تھیں۔ کہا 'یہ خلقت ساری بسم صاحب جی لنگر کا ہی انتظار کر رہی ہے۔ پر جلسہ ختم ہو تو لنگر کھلے۔' اتنے میں ہمیں لاؤڈ سپیکروں کی آوازیں آئیں اور ساتھ ہی مجھے دھان کی خوشبو آئی۔ 'غلہ منڈی آ گئی ہے' سُندری نے کہا۔

غلہ منڈی ایک وسیع و عریض میدان تھا جس کی وسعت کا اندازہ رات کے وقت ہمیں ان

Scanned by CamScanner

برقی قمقموں کی بہت بڑی دائرہ نما روشنی سے ہوا جو میدان کے گرد لکڑی کے کھمبے گاڑ کر لگائے گئے تھے۔ یہ میدان قصبے کے بیچوں بیچ تھا اور اردگرد آبادی تھی۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ میدان کسی زمانے میں کھیل کا میدان تھا مگر مقامی جاگیردار جو رائس ملوں کے مالک بھی تھے، اسے دھان سکھانے کے زیادہ اہم مقصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ بہرحال ہم اس مقام کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کئی قسم کے باوردی محافظوں نے گاڑی کو پارک کرانے کے لئے ہماری رہنمائی کی۔ لاؤڈ سپیکروں سے 'عظیم سیاسی شعور' 'عوامی قوت کا مظاہرہ' 'بے لوث خدمت' وغیرہ کی ولولہ انگیز آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا خیال ہے بلکہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم / میں اُس وقت تک اُس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔

(زہرہ) ہاں وہ سب کچھ مجھے ایک عظیم الشان میلہ لگ رہا تھا۔ انسانوں کا ایک ہجوم جس میں نہیں مکمل اجنبی تھی اور یہ اجنبیت بہت پُرلطف ہو رہی تھی جیسے کوئی لاتعلق تماشائی ہو......

(کبیر) بالکل درست مگر میں اس کے لیے تماش بینی کا لفظ استعمال کروں گا۔ میں اپنے بارے میں کہوں گا کہ ایک حظ تماش بینی میرے اندر عود کر آئی تھی اور میں نے زہرہ کو آمادہ کر لیا کہ بجائے گاڑی میں بیٹھے رہنے اور یہ انتظار کرنے کے کہ کب مُندری لنگر کھا کر آتا ہے اور کب ہم واپس مانگر بُو کے ویرانے کی طرف جاتے ہیں، ہم بھی اپنی اجنبیت اور لاتعلقی میں مست ان نظاروں کا مزہ لوٹتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوئی ہوئی بچی کو اٹھایا اور زہرہ، مُندری اور بھورا کہ ایک نیند میں چلنے والے کی طرح ہمارے ساتھ تھا، ہم باہر نکلے۔ لاؤڈ سپیکروں سے اب عوامی مسائل کا آخری حل 'روحانی اقدار' اور 'سماجی حقیقتوں' جیسی پُرسوز آوازیں آ رہی تھیں اور میدان میں بیٹھا ہجوم نعرے بلند کرتا تھا تو اپنی سب لاتعلقی میں مست ہونے کے باوجود ہجوم کا دل و جان سے حصہ بن جانے کی خواہش ابھرتی تھی۔ بچوں کے لیے غبارے اور کھلونے بیچنے والا ایک سرکنڈے کے ناڑ سے بنے باجے سے مسلسل ٹیں ایں کی آواز پیدا کیے جا رہا تھا۔ ایک سوڈا واٹر بیچنے والا بوتلوں کی قطار پر تیزی سے چابی گزارتا تھا تو کررررررر ٹک ٹک کی آواز برآمد ہوتی تھی جو بعض اوقات توجہ مبذول کرانے میں لاؤڈ سپیکروں کی آواز سے کہیں آگے بڑھ جاتی تھی۔

'ادھر لنگر تو کہیں نظر نہیں آتا' میں نے مُندری سے پوچھا۔ جواباً وہ ہمیں ایک تنگ سڑک پر سے گزار کر آگے لایا تو وہ سڑک ایک احاطے میں کھلی جو سڑک کے علاوہ ہر طرف سے بند تھا اور

جس کا رقبہ ایک ٹینس کورٹ سے تین گنا بڑا ہو گا۔ پیچھے ایک طرف ایک گودام جیسی عمارت تھی جس کے سامنے دھان کی بوریاں اوپر تلے چُنی تھیں۔ مگر احاطے میں سب سے نمایاں وہ سینکڑوں اور مجھے تو لگا ہزاروں دیگیں تھیں جو احاطے کے اردگرد رکھا اور کوئلے کی تہہ میں جما کر رکھی گئی تھیں۔ 'یہ ہے جی۔ لنگر ادھر ہی کھلے گا۔ پر ابھی کھلا نہیں۔' مُندری نے کہا۔

ہم واپس آئے اور پارکنگ کے قریب ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ ہماری ٹولی کی ہیئت کذائی لوگوں کی عظیم نظریاتی وابستگی اور سنگین سماجی مسائل کے باوجود ہر انوکھی چیز کے لیے اُن کی زیادہ جبلی توجہ کو ابھارتی تھی یعنی میم صاحب اور صاحب جس نے زخمی مانگر بچی کو اٹھایا ہوا تھا۔ مُندری اور بھورا۔ اگر میں نے بچی کو گود میں نہ اٹھایا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ ہمیں گھور گھور کر دیکھنے والے اس ہجوم میں لوگ مُندری اور بھورے کو ہمارے ساتھ ذرا بھی متعلق نہ سمجھتے مگر اس طرح وہ پانچ افراد کا ایک ایسا اکٹھ تھا جو فوری طور پر دیکھنے والے کی سمجھ سے باہر تھا۔ اسی لمحے لاؤڈ سپیکروں نے جلسے کے اختتام کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ پھر لاؤڈ سپیکروں نے امن و امان برقرار رکھنے پر عوام کا شکریہ ادا کیا اور پھر انہوں نے ہجوم کو باخبر کیا کہ عظیم شخصیت، انتہائی بڑی شخصیات، بڑی بڑی شخصیات اور معززین کے جانے کے بعد لنگر شروع کیا جائے گا۔ اتنے میں بہت سی اقسام کے باوردی بے وردی محافظوں کے جلو میں اسٹیج سے اہم شخصیات کی پارکنگ کے حصے تک بحفاظت ترسیل شروع ہوئی اور جس جگہ ہم گاڑیوں کی قطار کے ساتھ دوسرے لوگوں کے ساتھ جڑے کھڑے تھے وہاں سے کافی قریب عظیم اور ساتھ انتہائی بڑی شخصیات ہاتھ ہلاتی گزریں۔ باوردی مسلح محافظ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے عروج کے لمحات سے گزر رہے تھے۔ پھر بڑی شخصیات گزرنی شروع ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ ان سب میں ایک بات مشترک تھی کہ ان کے چہرے چکنے ربڑ جیسی کھال کے بنے تھے۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ بڑی شخصیات میں کھال کے اس اشتراک کو کیا نام دیں گے کہ لاؤڈ سپیکر نے ایک انقلاب آفریں نغمہ گانا شروع کر دیا۔ پھر اسے یکلخت روک کر ایک اہم اعلان کیا گیا اور جو یہ تھا کہ لنگر اتنا زیادہ ہے کہ انعام گڑھ کی تاریخ میں اتنا بڑا لنگر آج تک نہیں کھولا گیا ہو گا۔ اس لیے عوام کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ عظیم مہمانوں کی بحفاظت رخصتی ہمارا اہم ترین قومی فرض ہے۔ اس اعلان کے بعد انقلابی ترانہ پھر شروع ہوا ہی تھا کہ میں نے 'انہیں' اور 'انہوں' نے ہمیں دیکھا اور زہرہ کا یہ تاثر کہ ہم اس عظیم الشان میلے میں

Scanned by CamScanner

بالکل اجنبی تھے، غلط ثابت ہو گیا۔ ہمیں جاننے بلکہ شاید بہت قریب سے جاننے والے قریب آ رہے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ زہرہ ہی ان کی توجہ مبذول کرانے کا باعث بنی ہو گی کیونکہ ہماری طرف تماشہ ٹولی میں شامل وہ عورت جلسے کی کارروائی میں شامل دیگر خواتین مثلاً زنانہ سیاسی کارکنوں، فقیرنیوں اور لیڈی پولیس سب سے مختلف تھی۔ بہر حال جب نجم الثاقب یعنی عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ اور محی امیر جان نے اُسے اور پھر ساتھ کھڑے اس خاکسار کو دیکھا تو زہرہ نے ابھی اُن کے پیارے چہرے نہیں دیکھے تھے..... انتہائی غیر متوقع اور شاید انتہائی مہلک مخلوق کو دیکھ کر بنی نوع انسان کے چہروں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کے بیان کے لیے محاورے عموماً کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے اور زہرہ کو دیکھ کر ان دونوں شریف مردوں کا وہی حال ہوا کہ 'کاٹو تو لہو نہیں' یا 'سانپ سونگھ گیا' یا 'آدھا سانس اوپر اور آدھا نیچے' وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک میری اپنی کیفیت کا تعلق ہے تو میں آدھا سانس اوپر اور آدھا نیچے کو ترجیح دوں گا۔ محاوراتی اظہار کے علاوہ دونوں بڑی بڑی شخصیات کے چہروں پر تحیر اور ان کی اپنی اپنی مخصوص خباثت کا امتزاج نمایاں تھا۔ عزیزی امیر جان کا چہرہ تحیر، غیظ و غضب اور حماقت کا حسین امتزاج تھا جبکہ عزیز از جان ایڈیٹر عصری ڈائجسٹ کا بشرہ تحیر، کمینی سراغ جوئی اور بے رحم مستقبل بینی کا مرقع تھا۔ وہ ہم سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر تھے مگر چونکہ اطراف میں کھڑے ہجوم میں سے عظیم شخصیات کو گزارنے کے لیے حفاظتی دھکم پیل بھی جاری تھی اس لیے ان کی رفتار کافی سست تھی اور ہمارے قریب پہنچنے اور قریب سے گزرنے میں انہیں کئی منٹ لگے۔ اب جبکہ وہ کافی قریب آ گئے تھے تو میرا اوپر نیچے کا سانس برابر ہوا اور میری اپنی بے ضرر خباثت بھی عود کر آئی اور میں نے بے اختیار سا ہو کر کسی قدر بلند آواز میں عزیز از جان ایڈیٹر کو 'اسلام علیکم سر' کہا اور اسی وقت زہرہ بھی میرے سلام کے ہدف کی طرف متوجہ ہوئی۔ میں اُس کے ردِ عمل کو محاوراتی یا کسی اور وسیلے سے بیان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا اور اس سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنا اظہارِ ذات کا حق اس وقت استعمال نہ کرے کیونکہ بیانیہ زوروں پر ہے اور واقعات گھمسان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

میرے زوردار 'اسلام علیکم سر' پر جہاں زہرہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی وہاں اُس آہستہ آہستہ رینگتے بڑی بڑی شخصیات کے سیلان میں شامل اور بھی کئی آنکھیں ہماری طرف اٹھ

گئیں اور جب میری بھی ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایک اور خوشگوار حیرت نے مجھے گھیرا۔ ان میں کئی ایسی عظمتیں تھیں جنہیں میں نے ایک رات یاور عطائی مرحوم کے ڈرائنگ روم میں بوجوہ الٹتے پلٹتے دیکھا تھا۔ میرے اور زہرہ کے لیے ان کی نظروں کی پہچان یقین اور بے یقینی میں چکراتی رہی اور وہ دیگر بڑی شخصیات کے ہم رکاب قدم بڑھاتے رہے۔ میں نے بچی کو ایک بازو سے دوسرے میں منتقل کیا تو وہ جاگ گئی اور یک دم اپنے آپ کو ایک خوفناک ہجوم میں دیکھ کر ڈر گئی اور رونے لگی۔ اس پر بھورے نے بچی کو مجھ سے لے کر اپنی گود میں لے لیا اور وہ چپ کر گئی۔ ان سب ننھے ننھے واقعات نے گزرنے والے بڑی بڑی چہروں پر کئی طرح کے اثرات مرتب کیے۔ نجم الثاقب اور امیر جان اب ہمارے اتنے قریب سے گزر رہے تھے کہ میں چند انچ آگے ہاتھ بڑھا کر اپنا یہ شک دور کر سکتا تھا کہ ان کے چہرے ربڑ کے بنے ہیں یا کھال کے۔ مگر میں نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کی بجائے ایک بار پھر عزیز از جان ایڈیٹر کو مخاطب کر کے 'اسلام علیکم سر' کہا اور ساتھ ہی مجھے زہرہ کی کہنی کی زوردار ضرب جائز طور پر برداشت کرنا پڑی اور پھر مندری نے کہا 'بس اب لنگر ضرور کھل جائے گا۔'

لنگر کھل گیا۔ عظیم نامی گرامی ہستیاں بحفاظت رخصت ہوئیں۔ کاروں، جیپوں کا اژدہام ختم ہوا تو لاؤڈ اسپیکروں نے ایک بار پھر یہ مژدہ سنایا کہ لنگر اس قدر زیادہ ہے کہ انعام گڑھ کی ساری آبادی بھی کھائے تو ختم نہ ہو۔ اس لیے عوام اب پورے صبر و تحمل کے ساتھ جائیں اور لنگر لیں۔ جنہوں نے یہیں کھانا ہے، ان کے لیے احاطے میں اخباروں کی دو من ردی رکھوا دی گئی ہے۔ اخبار لیں۔ چاول، زردہ، پلاؤ لیں۔ اوپر ڈالیں اور کھائیں۔ انقلابی نعرہ پھر شروع ہوا اور ہم بھی اسی طرف چلے۔ مندری کا لنگر کے لیے اضطراب قدرے دھیما پڑ گیا تھا غالباً اس نے لاؤڈ اسپیکروں کی فراوانی خوراک کی یقین دہانی کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا اور اب وہ زیادہ ہموار انداز میں لنگر لینے کے لیے قدم بڑھا رہا تھا۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم گاڑی میں بیٹھیں گے اور مندری کے لنگر لینے، کھانے کے بعد واپس مانگر جو جائیں گے اور اس کے بعد کیا ہو گا، ہم نے سوچا نہ تھا مگر جو میں نے فوری طور پر سوچا وہ یہ تھا کہ بھورے اور بچی کو بھی تو بھوک لگی ہو گی۔ میں نے بھورے سے کہا کہ وہ بھی کھانا کھا لے اور مندری کے ساتھ احاطے میں چلا جائے مگر بھورے نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔ بچی کے لیے میں نے مندری سے کہا کہ ٹھیک ہے ہم بھی تمہارے ساتھ احاطے میں جاتے ہیں تم بچی کے

Scanned by CamScanner

لے کچھ لادے اور ہم واپس آجائیں گے اور گاڑی میں تمہارا انتظار کریں گے۔ مندری نے اثبات
میں سر ہلایا مگر وہ ہماری سست رفتاری پر کچھ ناخوش نظر آتا تھا۔ اتنے میں فضا میں پکے ہوئے چاولوں
اور مصالحوں کی خوشبو ایک بے تحاشا شدت کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ کپڑوں میں لنگر باندھے
جاتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ہم احاطے میں پہنچے تو ہر دیگ کے ساتھ ایک شخص کھڑا خوراک تقسیم
کرنے پر مامور نظر آیا۔ احاطہ اب تیزی سے بھر رہا تھا اور جگہ جگہ کئی مرد زمین پر اخباریں بچھا کر
اوپر چاول وغیرہ ڈلوا کر کھا رہے تھے۔ احاطے کے عقب میں گودام کی دیوار کے ساتھ امن وامان
قائم رکھنے کے لیے مقامی پولیس کے اہلکار کھڑے تھے۔

پھر میں نے دیکھا کہ مندری اپنا کرتا اتار رہا ہے اور پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بازوؤں
کے سوراخوں اور گلے کے سوراخ کو گانٹھیں دے کر بند کیا تو کرتا ایک اچھا خاصا تھیلا بن گیا۔ میں
سمجھ گیا کہ وہ اس ریڈی میڈ تھیلے میں لنگر ڈلوائے گا اور کچھ ادھر بھی کھائے گا باقی ساتھ لے جائے
گا۔ میں ابھی مندری سے انسانی لباس کے اس استعمال کے بارے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ
میرے پاس کھڑے بھورے کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی جیسے اسے غوطہ لگا ہو۔ ساتھ ہی
اس نے بچی کو واپس مجھے تھمادیا اور میں نے دیکھا کہ اس کی نظریں دور احاطے کے ایک نیم تاریک
گوشے کی طرف گڑی ہیں جہاں نہ جانے کوئی دو افراد بیٹھے لنگر کھا رہے تھے۔ وہ گوشہ دیگوں اور دھان
کی بوریوں کے بیچ تھا اور پھر بھورے کے حلق سے بھرائی ہوئی سرگوشی جیسی آواز نکلی جو بہت حد تک
اضطراری تھی۔ "کالیا۔ پاروؤ۔" اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ میرے اور زہرہ کے علاوہ شاید ہی ارد گرد
کسی نے سنی ہو مگر میں نے دیکھا کہ دیگوں کی طرف بڑھتے مندری کے قدم وہیں رک گئے۔ اس
کے چہرے پر کسی عیار کتے کی چالاکی اور پھرتی عود کر آئی تھی جو شکار کی آہٹ پا کر چوکنا ہو کر
جھپٹ پڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ حیرت انگیز طور پر لنگر وغیرہ کو جیسے
بھول ہی چکا ہے اور اس کی نظریں بھورے کی نظروں کا اس نیم تاریک گوشے کی طرف تعاقب کر
رہی ہیں۔ اس سارے عمل میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے اور پھر ہمارے کچھ سوچنے
سمجھنے سے پہلے ہی مندری اس افراتفری میں غائب ہو گیا جو لاؤڈ سپیکروں کی جانب سے لنگر کی
فراوانی کی مسلسل یقین دہانی کے باوجود لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ پھر میں یہی سمجھا کہ مندری اب
لنگر لینے گیا ہے اور پہلے وہ ہمیں بچی کے لیے کچھ لا کر دے گا اور ہم واپس سڑک پر سے گزر کر

گاڑی میں چلے جائیں گے۔ ہم احاطے میں اس مقام پر کھڑے تھے جہاں تنگ سڑک آ کر کھلتی
تھی۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ اس تنگ سڑک کی دونوں اطراف میں بند دوکانیں تھیں۔ ان میں
سے بعض کے آگے کافی اونچے تھڑے تھے۔ میں نے سوچا کہ مندری کے آنے تک ہم تھڑے کی
اونچی جگہ پر کھڑے ہو جائیں تاکہ وہ آئے تو ہمیں دیکھ لے یا ہم اسے دیکھ لیں۔ میں بچی کو
اٹھائے تھڑے پر چڑھا پھر زہرہ اوپر آئی پھر میں نے اپنا فارغ ہاتھ آگے بڑھا کر بھورے کو بازو
سے پکڑ کر تھڑے کے اوپر کھینچا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر نحیف و نزار ہے اور جیسے اس کا تو کوئی
وزن ہی نہیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور کسی ایسی زبان میں بڑبڑا رہا تھا جو کم از کم میری سمجھ سے
بالکل باہر تھی۔ پھر وہ پیچھے کو ہٹا اور دوکان کے بند چوبی دروازے کے ساتھ اپنی کمر لگا کر
آہستہ آہستہ نیچے پھسلتا پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ اور مجھے یہ پریشان کن سا احساس ہوا کہ ہجوم
لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا ہے اور ہمیں واپس نکلنے میں مشکل پیش آئے گی۔ پھر اسی لمحے گودام کی
طرف سے شور سنائی دیا۔ ہم چونکہ اب اونچی جگہ پر کھڑے تھے اس لیے احاطے میں پیش آنے
والے چھوٹے بڑے واقعات کو بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ پولیس کی نفری جو
امن وامان قائم کرنے کے لیے متعین ہے، یک دم ایک متحرک حملہ آور قسم کا پینترہ اختیار کر چکی
ہے اور میں نے دیکھا کہ مندری ایک موٹے پولیس والے سے جو یقیناً ان کا سربراہ تھا، کوئی بات
کر رہا ہے اور اسی نیم تاریک گوشے میں بیٹھے کوئی دو انسانی ہیولوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

پیارے ناصر اس کے بعد کے واقعات اس نوعیت کے ہیں کہ جن کا افسانوی بیان مصنفوں
کی قوت متخیلہ و بیانیہ وغیرہ کا امتحان ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے چونکہ یہ آنکھوں دیکھا معاملہ ہے اور
بازیافت کا معاملہ ہے اس لیے متخیلہ کی غیبی امداد مجھے میسر نہیں۔ مگر آنکھوں دیکھا حال بھی
بازیافت کے بیانیے میں آ کر کس قدر متخیلہ سے ملوث ہو جاتا ہے یہ ایک الگ بحث ہے جس میں
الجھنے کا یہ وقت نہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس گوشے سے وہی دو انسانی ہیولے اچھل کر ایک حیوانی
سرعت سے بھاگے اور دیگوں کے اوپر سے چھلانگیں لگاتے چاولوں کی بوریوں کے اوپر چڑھنے
لگے۔ اب صاف نظر آرہا تھا کہ ان میں سے ایک مرد ہے اور دوسری عورت۔ غالباً وہ اوپر تلے رکھی
بوریوں کو سیڑھیوں کی طرح استعمال کر کے گودام کی چھت کی راہ سے فرار ہونا چاہتے تھے مگر میں
نے دیکھا کہ دو پولیس والوں نے لاٹھیوں سے انہیں ضربیں لگائیں اور وہ الٹ کر نیچے گرے اور

Scanned by CamScanner

ساتھ ہی پھر اچھل کر اٹھے اور اُس سمت بھاگے جدھر وہ تنگ سڑک احاطے سے باہر نکلتی تھی۔ اور
جہاں ہم تھڑوں کے اوپر کھڑے تھے اور جہاں سے وہ سڑک پھر باہر میدان کو نکل جاتی تھی۔ اس
کے ساتھ ہی سربراہ پولیس والے نے سیٹیاں بجائیں اور پھٹی ہوئی بلند آواز میں دھاڑا 'خبردار۔
ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ اشتہاری مجرم پکڑو۔ پکڑو خبردار گولی ماردوں گا'۔ اس آواز کے ساتھ ہی لنگر
کھاتے۔ لنگر لیتے۔ دیگوں میں سے چاول نکالتے۔ کپڑوں میں باندھتے ہجوم میں ہر شخص نے
بیک وقت ہٹ جانے اور پکڑنے کی کوشش کی اور ان محنت لوگوں کے کھاتے موئنہوں کی ہُم ہُم اور
برتنوں کی کھٹ پٹ یک دم خاموش ہوگئی۔

ہجوم کے اس حصے میں جہاں سے وہ مرد اور عورت سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کو ایک طرف
دھکیل کر اور اوپر سے پھلانگ کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک کچھ لوگ جیسے پیچھے کو لہرائے
اور گر گئے۔ مرد اور عورت کے سامنے راستہ صاف ہونے لگا اور یوں لگتا تھا کہ وہ اس ناممکن
رکاوٹوں کی دوڑ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تب پولیس والے لاٹھیاں لے کر جھپٹے اور کسی پولیس
والے نے شاید گھبرا کر ایک ہوائی فائر جھونک دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک بھگدڑ کا آغاز
ہوگیا۔ میں نے اُس مرد اور عورت کی آنکھوں میں جو وحشت دیکھی وہ ایک تاریک آگ جیسی
تھی۔ جیسے سیاہی دہک رہی ہو۔ مرد کچھ آگے تھا اور عورت پیچھے۔ اس نے گھوم کر عورت کی طرف
دیکھا اور اسی لمحے ایک پولیس والے نے عورت کے سر پر لاٹھی سے زوردار ضرب لگائی، وہ تیورا کر
نیچے گرنے ہی والی تھی، کہ مرد نے سرعت سے گھوم کر اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں تھام لیا مگر اسی
وقت لاٹھی کی دوسری ضرب اس کے سر پر لگی اور وہ دونوں نیچے گر گئے۔ اس لمحے میں نے دیکھا کہ
ان کے بازو ایک دوسرے کے گرد ہیں اور چہرے آسمان کی طرف ہیں۔ میں بس ایک لمحے کے
لیے انہیں ان کے اس روپ میں دیکھ سکا جس میں ان کی ماؤں نے انہیں جنا تھا۔ پھر پولیس والے
نے تیزی سے انہیں قابو کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی گر گیا اور پھر وہ لوگ جو پہلے گرے تھے ان میں
سے ہر ایک نے تیزی سے اٹھ کر کھڑے ہونے اور بھاگنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی ایک
انسانی ریلہ سب کو روندتا ہوا گزر گیا اور پھر گرنے۔ اٹھنے۔ بیٹھنے۔ کھڑے ہونے۔ جھکنے۔ چلنے۔
بھاگنے کے انسانی افعال کی ازلی تمیز نیست و نابود ہوگئی۔ کچلے جانے کی موت کا خوف ہر دوسرے کو
کچل دینے کے جنون کو جنم دیتا ہے۔ گرنے والا اٹھتا ہے، اٹھنے والا بھاگتا ہے مگر پھر سب کچھ

واپس پلٹ جاتا ہے۔ انسانی ہجوم روندتے قدموں تلے کی زمین بن جاتا ہے۔ سر، بازو، ٹانگیں،
پیٹ، چیخوں اور کراہوں کی شدت کے ساتھ اپنی شناخت سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میری نظریں بھگدڑ کے اس نقطے پر گڑی تھیں جہاں وہ مرد اور عورت گرے تھے۔ میں نے
دیکھا کہ چند ہی لمحوں میں ان کے پیٹ کچلتے قدموں کی ضربوں سے پھٹ گئے اور میں نے دیکھا
کہ کچلے جانے کی موت سے دور بھاگ جانے کی دیوانہ وار کوشش کرنے والے ان کی انتڑیوں میں
الجھ کر گرے اور وہ بھی کچلے گئے۔ میری نظریں اس سے زیادہ اُس منظر کی تاب نہ لاسکیں۔ خون اور
ناقابلِ شناخت انسانی اعضاء کے اوپر ہر طرف لنگر زردے پلاؤ کے چاول بکھرے تھے۔ میں نے
زہرہ کی طرف دیکھا تو زہرہ کی آنکھیں ایسی پھٹی ہوئی تھیں جیسے بے جان ہو چکی ہوں۔ میں نے
آنکھیں بند کر لیں مگر اسی لمحے میں نے سوچا کہ یہ اونچا تھڑا ہمیں اور کچھ لوگوں کو اس خون آشام
انسانی تلاطم سے محفوظ رکھے ہوئے ہے شاید زیادہ دیر محفوظ نہ رہ سکے گا کیونکہ اب دہشت زدہ لوگ
تھڑوں پر بھی چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے زہرہ کو جھنجھوڑا۔ بچی کے رونے کی آوازیں
آہ و بکا میں گم ہو رہی تھیں۔ ہمیں صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا تو ہم نے تھڑے کے پیچھے دوکان
کے لکڑی کے دروازے کو زور زور سے پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور میں نے دیکھا کہ بھورا اب بھی
ویسے ہی بیٹھا ہوا ہے اور اب زیادہ بلند آواز میں وہی ناقابلِ فہم بڑبڑاہٹ جاری رکھے ہوئے ہے۔
اس وقت جبکہ ہم دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شاید کھل جائے یا ٹوٹ جائے تو چار پانچ
افراد نے، جن کے چہرے موت کے خوف سے مسخ ہو رہے تھے، یک دم تھڑے پر چڑھنے کی کوشش
کی اور یقیناً ان کی یہی مجنونانہ حرکت تھی جس نے سب کو دھکیل کر دروازے کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ
ایک طرف قبضوں سے اکھڑ کر اندر کو کھل گیا اور اس کے ساتھ ہی ہم سات آٹھ افراد دوکان کے اندر
اُلٹ کر گرے اور یہی حرکت ہماری جانوں کو محفوظ کرنے کا سبب بن گئی۔ اس وقت میں نے ایک
کمینی حرکت کی۔ میں نے دروازے کو پھر سے اس کے اکھڑے کواڑ تک واپس دھکیل کر بند کر دیا
تاکہ باہر سے ایسا ہی لگے کہ بند ہے۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ہجوم اندر نہ گھس آئے۔

وقت کا تصور معدوم ہو چکا تھا، وہ چند منٹ تھے چند گھنٹے یا چند سال یا جیسے صدیاں جو اُس
دوکان کے اندر بیت گئیں۔ وہ پلاسٹک کے برتنوں اور ایسے ہی دیگر ساز و سامان کی دوکان تھی۔
کوئی بھی شخص دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ روشن دان کے رستے سے روشنی

Scanned by CamScanner

ایک سپاٹ لائٹ کی طرح پلاسٹک کے ایک سرخ ٹب، نیلی بالٹی اور پیلی صابن دانیوں پر پڑ رہی تھی اور وہ سبھی عام چیزیں مدتوں تک میرے لیے دنیا کی معتبر ترین ہستیاں بنی رہیں۔ بھورے کی بڑبڑاہٹ مدہم ہوتی جا رہی تھی اور پھر آہستہ آہستہ باہر سے آتے شور کی آوازیں بھی مدہم ہوتی چلی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں اٹھا اور دروازے کو اندر کھینچا۔ باہر کا منظر بیان کرنا غیر ضروری ہے مگر جو الفاظ میرے ذہن میں آئے تھے وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ 'جھکڑ کے بعد کی دنیا۔ انہونی کی باقیات۔' میدان کی طرف سے جھکڑ کے بعد کے حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے کئی اداروں کے افراد آ رہے تھے۔ سائرنوں کی آوازیں اس بات کی علامت تھیں کہ امدادی کارروائیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔

مختصر یہ کہ ہم جیسے بھی گاڑی میں پہنچے سو پہنچے۔ مندری کی تلاش بے کار تھی۔ زہرہ نے گاڑی کا رخ ماگھر ٹو کی طرف کیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی کا کنٹرول سنبھالنا شاید اس کے لیے مشکل ہے۔

(زہرہ) کیا وہ ایک بھیانک خواب سے بیدار ہونے کی کیفیت تھی۔ نہیں وہ ایک ایسے بھیانک خواب سے بیدار ہونے کی کیفیت تھی کہ جس کے بعد علم ہو کہ وہ تو خواب نہیں تھا۔ وہ تو اب بھی ہے جو دیکھا تھا۔ جو سنا تھا جو کیا تھا جو جیا تھا۔ اُسے دوبارہ جینا ہے۔ کیا یہی تھا وہ 'دوبارہ جینا' جس کے لیے ہم نکلے تھے اور میں نے کبیر سے بھی ایسا ہی کچھ کہا اور کبیر نے کہا 'شاید ایسا ہی ہے' اور میں روئی۔ بہت پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ جیسا کہ میں کبھی نہیں روئی تھی اور نہ روؤں گی۔

(کبیر) ماگھر ٹو کی وہ امانتیں ہمارے ساتھ تھیں جنہیں لوٹانا لازم تھا یعنی وہ بچی اور بھورا۔ جب ہم کچھ رستے پر آئے تو پچھلی راتوں کا چاند آسمان پر نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ویرانے میں پھیلی چاندنی ہمارے کچلے ہوئے اعصاب کو کچھ سکون پہنچا رہی تھی کیونکہ ہمارے جسم کچلے جانے سے محفوظ رہے تھے۔ بھیانک موت کے جنون کا وہ نظارہ خواب تماشے کی ایک انوکھی تعبیر تھی۔

ہم گاڑی کو ورکر سے آگے تیزیوں کے قریب لے گئے۔ بچی کی ماں جاگ رہی تھی اور باہر بیٹھی تھی۔ اس نے بچی کو سنبھالا اور پھر دیر تک زہرہ کے ہاتھوں کو چومتی رہی اور اس کے آنسو زہرہ کے ہاتھوں پر گرتے رہے۔ ہم نے اس عورت کو کچھ بتانے کی کوشش نہ کی کہ ہم کیا کچھ دیکھ کر اور

سن کر اور رو کر آ رہے ہیں۔ میں نے بھورے کو دیکھا تو وہ عجیب سی کیفیت میں تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ تو ختم ہو چکی تھی مگر آنکھیں جیسی پتھرائی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو اس کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا مگر شاید جھنجھوڑنے سے اس کے حواس بحال ہوئے اور پھر اچانک اس نے بڑی ہوش مندی سے بھری نظروں سے میری اور زہرہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ 'تم اجاتی کے بادشاہوں کے بھید لینے آئے تھے، پر اب بھورے بادشاہ کے بھید لے کر جاؤ گے۔' یہ کہہ کر وہ مڑا اور چاندنی رات میں جنڈ اور پھلائی کے درختوں میں غائب ہو گیا۔

'وہ اپنے گھنڈ ے میں گیا ہے' عورت نے کہا۔

میں بھورے کے ان الفاظ کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ ہم نے بچی کو روداد نہ دینے کی ہدایت عورت کو سمجھائی اور واپس گاڑی میں آ گئے۔ فیصلہ یہی تھا کہ صبح کو وہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ میں اگلی سیٹ کو پیچھے جھکا کر آدھا لیٹا اور آدھا بیٹھا اور زہرہ پچھلی سیٹ پر دراز ہو گئی اور پھر ہر طرح کے جینے سے فرار کی خواہش تھی کہ موت جیسی نیند نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

OOO

Scanned by CamScanner

باب(29)

نشان زدہ لوگ

سورج کے بلند ہونے کے بعد روشنی جب جھاڑیوں کے اوپر سے ہو کر گاڑی میں داخل ہوئی تو ہم جاگے۔ جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا مگر بیداری کا احساس ہوتے ہی گذشتہ رات کے واقعات کسی یک دم اٹھنے والی ٹیس کی طرح شعور میں واپس آ گئے۔ نیند کی عارضی خود فراموشی ختم ہو چکی تھی۔

گاڑی سے باہر نکلے تو ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور حیرت کی آواز زہرہ کے حلق سے بھی نکلی۔

یہ ویرانہ وہ ویرانہ تو نہیں لگتا تھا جہاں ہم گذشتہ رات واپس آئے تھے۔ تو پھر کیا ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب جلد ہی واضح ہو گیا۔ وہ جگہ اب مکمل ویرانہ تھی۔ اگروکی آخری انسانی آبادی کا کوئی بھی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ سوائے زمین میں ان کی جھگیوں کی حدود کے چوکور نشان جہاں کبھی وہ قبروں جیسی کھڑی تھیں۔ اوپر کرز میں پھیلے ایسے ہی مدھم نشانوں کے مقابلے میں یہ بہت نمایاں اور واضح تھے۔ یقیناً سُندری بچ گیا تھا اور رات کہیں آیا تھا اور اپنی باقی ماندہ جاتی کو کسی نامعلوم مقام کی طرف ہانک کر لے گیا تھا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

تو بھورا بھی کیا ان کے ساتھ ہی جا چکا ہوگا؟ یہ جاننے کے لیے ہم سوکز نہر کے اونچے مٹی کے کناروں میں کھدی ہوئی ان غار نما رہائش گاہوں یا کھڈوں کا جائزہ لینے کے لیے گئے۔ وہ کھڈے کسی زمانے میں ٹھوس مٹی میں کھود کر اور تراش کر بنائے گئے ہوں گے۔ مگر اب تراش خراش کے نشان موجود نہیں تھے شاید انہیں اندر سے لیپ دیا گیا تھا۔ بیشتر کھڈے بالکل خالی تھے چند ایک میں جنگلی حیات حیوانی اور نباتاتی شکل میں موجود تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مدتوں سے غیر آباد ہیں۔

مگر بھورا کہیں نہیں تھا۔ پھر ہمیں جنڈ اور پھلائی کی جھاڑیوں کے پیچھے ایک بوریا سا لٹکتا نظر آیا۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے ہم قریب گئے تو اندازہ ہوا کہ بوریے کے پیچھے اصل میں ایک اور کھڈا ہے۔ بوریا ہٹا کر اندر جھانکا تو بھورا ہمیں مل گیا۔ وہ ویسے ہی بوریے پر لیٹا تھا۔ ہم جھکتے ہوئے کھڈے میں داخل ہوئے جس کی لمبائی چوڑائی سات ضرب چھ فٹ رہی ہوگی اور اس میں سیدھا کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں بھورے کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے ماتھے کو چھوا تو وہ اب بھی ویسا ہی گرم تھا جیسا رات کو تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک مٹی کے گھڑے اور پیالے کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نظر نہ آیا۔

'پانی' اچانک بھورے کے منہ سے آواز نکلی۔ زہرہ نے پیالے میں پانی ڈالا اور اسے سہارا دے کر پلایا۔ اس سے اس کی حالت کچھ بدلی اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک ہمیں نظریں جمائے دیکھتا رہا جیسے اپنی کسی نامعلوم دنیا میں بیٹھا ہمارے بارے میں یا خدا جانے کس بارے میں کچھ حساب کتاب لگا رہا ہو۔ آخر اس نے خاموشی توڑی اور بولا۔

'بھورے بادشاہ کے بھید لینے آئے ہو۔ آؤ۔'

میں نے اور زہرہ نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مجھے بھورے کی گذشتہ رات کی آخری بات یاد آ گئی جسے میں نے اس وقت کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اب بھی اس کی کیا اہمیت تھی کچھ واضح نہیں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ سُندری سب کو لے کر جا چکا ہے تو اس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا اور کہا، 'ہاں آج جاتی کا آخری دن ہے لیکن بھورا بادشاہ بھید دے کر جائے گا۔'

اس کے بعد اس نے یک دم بولنا شروع کر دیا مگر میں کیا بتاؤں کہ اس نے کیا بولنا شروع کر دیا۔ ہاں اس غیر متوقع اور اچانک پیدا ہونے والی صورت حال نے مجھے بوکھلاہٹ سے دوچار کر دیا۔ گذشتہ رات ہمارا آخری فیصلہ یہی تھا کہ صبح وہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ مگر اب اس فیصلے پر عمل کرنا کیسے ممکن تھا؟ ایک قریب المرگ شخص کی آخری بات سنے بغیر اسے اس کے آخری لمحوں میں تنہا چھوڑ کر جانا کیسے ممکن تھا۔ میں شدید تذبذب کے عالم میں تھا مگر زہرہ یقیناً اس وقت بھی مجھ سے بہت بہتر فیصلے کرنے کے قابل تھی۔

(زہرہ) جو بیت چکا تھا اس کے بعد کچھ بھی میرے لیے حیرت کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔ میں ابھی تک ان ہولناک خونی مناظر کو ذرہ برابر بھی اپنے ذہن سے ہٹا نہیں سکی تھی اور اگر میں

Scanned by CamScanner

یہ کہوں کہ بھورے بادشاہ کی وہ کیفیت اور یہ کہ وہ اپنی اس ہذیانی بخار کی کیفیت میں ہمارے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا تو یہ میرے لیے ایک غنیمت کی بات تھی ایک وقتی نجات کا موقع تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ دنیا کے سب انسان اور ان کے آپس کے سب تعلق ختم ہو گئے ہیں۔ شاید یہ تعلق کی ایک نئی صورت تھی میں کچھ بھی نہ پا رہی تھی۔ پھر اس حالت میں اُسے مدد کی شدید ضرورت تھی۔ میں نے اسے کہا ہم اسے قصبے میں اسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں جس نے پالی کی مرہم پٹی کی تھی مگر اس نے ایسی کسی تجویز کا شدید انکار کیا اور کہا 'بس تم سنو۔ بھورے بادشاہ کی بات سنو۔'

کبیر نے کہا 'ہم بھورے کی بات سنیں گے اور اس کے بھید لیں گے مگر تم سب کچھ لکھو گی۔ گاڑی میں کوئی کاغذ قلم ہو ڈھونڈو۔'

میں اسی وقت گاڑی میں گئی اور کچھ بسکٹوں کے ڈبے لئے اور کچھ بخار کی دوائیاں جو میرے پرس میں پڑی تھیں۔ پھر مجھے سفید کاغذوں کے کچھ دستے مل گئے جو میں نے کبھی وہاں رکھے تھے جب سے کبیر کی املائی مشقوں میں شامل ہوئی تھی کیونکہ اس کے خیالات اور مداخلتی خیالات کہیں بھی بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو سکتے تھے۔ جب میں یہ سب کچھ لے کر واپس آئی تو کبیر......

(کبیر) بھورے کے بھید بھی بلائے ناگہانی تھے جو نازل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے زہرہ سے کہا بہت مضطرب ہو کر لکھو لکھو۔

'کیا لکھوں؟'

'وہی جو بھورا بول رہا ہے۔'

مگر اس میں مشکل یہ تھی کہ بھورے کی کچھ لسانی ترجیحات زہرہ کے لیے اجنبی تھیں چنانچہ ہوا یہ کہ بھورا بولتا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے کسی مترجم کی طرح بولتا تھا اور زہرہ لکھتی تھی اور اس طرح یہ سلسلہ چلا۔

یہ سلسلہ چلا مگر یک دم رک گیا۔ بھورا پھر خاموشی میں ڈوب گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس کی نبض دیکھی جو تیز اور تیز چل رہی تھی۔ اس کی یہ پہلی خاموشی ہمارے لیے شدید اضطراب کا باعث بنی۔ کیا اس نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ مگر ہم اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔ ہم اسی کشمکش کے عالم میں تھے کہ وہ اچانک پھر بولنے لگا جیسے کسی اتھاہ خاموشی کے سمندر میں ڈوب کر

پھر گفتگو کی سطح پر ابھر آیا ہو۔ اس کا وہ کلام جو مکمل طور پر یک طرفہ تھا اور جس میں ہمارے سوال جواب کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اب کوئی پندرہ بیس منٹ جاری رہا اور وہ پھر واپس پلٹ گیا مگر اس سے پہلے ہی زہرہ نے زبردستی اسے بخار کی گولی نگلوا دی جس کا مجھے یقین تھا کہ اس کے جسم سے بالکل غیر متعلق ہے۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

باہر ویرانے میں صبح اور دوپہر کے درمیان کا وقت ایک خوشگوار اور تازہ ہوا سے بھرا تھا مگر یہ خاموشی کے وقفے بہت صبر آزما تھے اور پیارے ناصر بھورے بادشاہ کے بھورے بھید بھرے کلام اور اتنی ہی بھید بھری خاموشی کے یہ درمیانی وقفے ہی تھے کہ جنہیں کاٹنے کے لیے اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے ہمارے ذہن میں تمہیں خط لکھنے کا خیال آیا اور وہ سب کچھ جو ہم پر بیت چکا تھا اسے محفوظ کرنے کا خیال آیا۔ ہم اسے ایک سپاٹ ڈائری نما بیانیے کی شکل بھی دے سکتے تھے۔ جیسا میں کبھی لا لکھائی کے شاہکار 'نجبانی' نیلارجنز میں کیا کرتا تھا۔ مگر خط میں مکتوب الیہ کی نہایت ہی مانوس اور جانی پہچانی سی موجودگی لکھنے والے کو ایک حوصلہ مندی دیتی ہے اور 'میں' کی وسعت اور تنگ دامنی 'مخاطب' 'میں' کی انا کی صلاحیت سے اصلاح پذیر ہوتی ہے۔ پھر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ خط ہم دونوں کی طرف سے بیک وقت لکھا جائے گا اور اس طرح لکھا جائے گا جیسا کہ یہ لکھا گیا اور تم نے پڑھا۔

تو پیارے ناصر یہ 'خطی' تحریر بھورے بادشاہ کے ہذیانی کلام کے درمیانی خاموشی کے وقفوں کو جو اکثر کافی طویل ہوتے تھے کچھ زیادہ جھیلنے کے قابل بنانے کے لیے معرض وجود میں آئی اور بھورے متن اور بھوری خاموشی کاٹنے پاٹنے کے لئے متن کے یہ دونوں سلسلے ایک دوسرے میں الجھے آگے بڑھتے رہے تا مگر ہوگی گذشتہ صبح سے لے کر اب گزرتی رات کے آخری پہر تک اور ہر دفعہ جب بھورا اپنی خاموشی کی اقلیم سے واپس آتا تھا اور بھید دیتا تھا تو اس کی آواز پہلے سے بھی مدھم ہوتی تھی اور خاموشی کے ہر وقفے میں اور بھورے کے کلام میں زہرہ کا لکھتا ہوا ہاتھ اور بھی تھکتا چلا جاتا تھا اور میں اپنے ٹنڈے مفلوج ہاتھ سے اس کی کسی مدد کے قابل نہیں تھا۔ اس طرح اب جبکہ رات ختم ہونے والی ہے یہ 'خط' اور 'بھورے بادشاہ کے بھید' نامی دو مخطوطے جنم لے چکے ہیں۔ بھورے کی نبض اتنی مدھم ہو چکی ہے کہ شاید اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ شاید تم اسے ہماری خود غرضی کہو کہ ہم نے اس کی جان بچانے کے لیے کوئی بڑا اقدام کیوں نہیں کیا

Scanned by CamScanner

لیکن اگر تم یہاں ہوتے تو تم بھی شاید ایک مرتے ہوئے انسان کی سب سے شدید آخری خواہش کا احترام کرتے لیکن شاید ایک احساسِ جرم ہے کہیں شاید۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ دونوں تحریریں میں آج ڈاک کے ذریعے ایک تمہیں اور دوسری اپنے لینڈ لارڈ امداد حسین کو رجسٹرڈ بھیج دوں گا۔ اس طرح یہ محفوظ ہو جائیں گی تو کیا یہ ہمارے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہیں؟ شاید نہیں۔ میں نے خط میں اوپر ذکر کیا تھا کہ جلنے میں پرانے مہربانوں سے اچانک مُدھ بھیڑ 'تجدیدِ محبت' کا سبب بن سکتی ہے۔ اس وقت تو بس ایک عظیم خاتمے کا احساس ہے جو بیک وقت ایک عظیم آغاز کا احساس بھی ہے۔

تم یقیناً جاننا چاہو گے کہ بھورے بادشاہ کے 'بھید' کیا ہیں۔ آہ یہ ایک بہت مشکل سوال ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اگر میں اس سوال کا جواب مزید سوالوں کی شکل میں دوں اور کسی کے جواب کی بھی کوئی ذمہ داری قبول نہ کروں تو یہ ایک بہت آسان سوال ہے............ کیا یہ ایک ایسی کائنات کی تصویر ہے جس میں شگون قوانینِ فطرت کی جگہ لے لیتے ہیں؟... کیا یہ بھورے بادشاہ بھوری مائی اور اس کے غلام کی گم گشتہ اساطیر ہیں؟... کیا یہ ظلم اور جبر کی کالی قوتوں اور کالے جادو کی جنگ کا رزمیہ ہے؟... کیا یہ انعام گڑھ کی متوازی ہذیانی تاریخ ہے؟۔ میرے پاس ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب موجود نہیں۔ میرے پاس یہ تحریر ہے بلکہ یوں کہو کہ میرے پاس یہ زبانی کلام ہے جسے میں نے تحریر میں مقید کرنے کی گستاخی کی ہے اور زہرہ کو شریکِ جرم بنایا ہے اور یہ تحریر جو غیر مربوط بگڑی ہوئی خلط ملط۔ جس کا نہ کوئی زماں ہے نہ مکاں۔ لا لکھائی کا ایک اور شاہکار ہے۔ اب جبکہ رات ختم ہو رہی ہے اور ہمیں دور سے بلڈوزروں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہم اس تحریر کا اختتام کرتے ہیں اور تم سے ملاقات کی شدید خواہش کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں۔

کبیر۔ زہرہ۔ کبیر۔ زہرہ

P.S (زہرہ) ایک بات جس کا کبیر نے ذکر نہیں کیا۔ جب ہم نے یہ خط (اسے خط ہی کہیں گے) لکھنے کا ارادہ کیا تو اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس وقت ہمارے دل ایک خوفناک حزن و ملال سے بوجھل تھے (اب بھی ہیں) مگر ہم نے مل کر یہ طے کیا تھا کہ یہ خط چونکہ اس سب کچھ کا شروع سے حال ہے جو ہم نے جیا اور جو ہم پر بیتا اور جب ابھی ہمارے دل بھی اتنے ملول نہیں تھے، اس لیے ہماری اب کی دل گرفتگی کو پہلے کے حال پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے (پتہ نہیں بات کچھ مجھ سے الجھی

گئی ہے) بلکہ اُسے ایسا ہی آنا چاہیے کہ جیسا کہ وہ تھا یا ہم پر بیتا۔ ہم اس میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں تم بتا سکتے ہو۔"

O

ناصر نے کبیر زہرہ خط کے آخری الفاظ پر اپنی پلکیں جھپکیں تو اسے احساس ہوا کہ جیسے مدتوں سے اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور جلن کے ساتھ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا، اس نے زور سے آنکھیں میچیں تو یہ احساس اور بھی بڑھ گیا۔ پھر اس نے خود کلامی کی اور انہیں بتایا "ہاں میں بتا سکتا ہوں۔ تم کامیاب ہوئے ہو۔ اتنے کہ انسان جو مرد اور عورت میں ایک ہوتا ہے۔ اپنی اکیتا میں شاید ہی کبھی اتنا کامیاب ہوا ہو گا مگر وہ جو اس اکیتا میں نہیں ہے، اس کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنی اکیتا کے ساتھ الگ ہو جائے۔"

اس نے خط کے پلندے کو بیگ میں ڈالا اور اسے ایک قیمتی امانت جان کر کوٹھڑی کے محفوظ ترین گوشے میں رکھا اور آنکھیں بند کر کے پتھریلے بستر پر دراز ہو گیا۔ باہر شفٹ بدل رہی تھی اور جیل کے نئے محافظ ڈیوٹیاں سنبھال رہے تھے۔

O

کبیر اور زہرہ نے نامعلوم خوف کے اُس احساس کے ساتھ اب ایک دوسرے کی طرف دیکھا جو مسلسل ان کی ہر کیفیت کو ایک یخ بستہ ہوا کے جھونکے کی طرح چھوتا گزر جاتا تھا مگر وہ جانتے ہی نہ تھے کہ اُن کی اُس طویل مشترکہ خط نویسی میں کہیں بھی وہ احساس لفظوں کی کوئی تعبیر حاصل نہ کر سکا تھا۔ اس ڈبہ نما مٹی کے غار میں صبح دوپہر میں بدلی تھی اور دوپہر شام میں اور پھر رات آئی تھی اور وہ باہر ویرانے میں کبھی انجانی چاپیں اور نامعلوم آہٹیں سنتے تھے مگر بھورے کے کلام، کبیر کے الفاظ اور زہرہ کے لکھتے ہاتھ کی حرکت کا بخار زدہ تسلسل ٹوٹتا نہ تھا اور باقی سب کچھ بے معنی ہو کر نظر انداز ہو جاتا تھا مگر اب جبکہ کاغذوں کا ایک ایک پلندہ دونوں کے ہاتھ میں تھا تو یکدم مستقبل اُن پر ٹوٹ پڑنے کو زور مارنے لگا۔

بلڈوزروں کی آواز اب ایسے لگتا تھا، بہت قریب سے آ رہی ہے۔ کبیر جو مسلسل بھورے کی

Scanned by CamScanner

نبض تھامے بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیوں کے پور اس زندگی کے نحیف ارتعاش کو چھونے کے لیے اب
بھی بے تاب تھے۔ جو بھورا بادشاہ تھا۔ مگر اب وہاں سناٹا تھا اور گہرا سکون اور دائمی سکوت۔ اس
نے اس کی پلکوں کو پلٹ کر دیکھا اور پھر بھرائی آواز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے، وہ جا چکا ہے۔“
اس کے ساتھ ہی انہیں ایسا محسوس ہوا کہ زمین کسی عظیم زلزلے کی زد میں ہے اور اب
بلڈوزر کی بہت بلند آواز سننے پر انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔
اپنے اپنے ہاتھوں میں اپنے اپنے مسودے تھامے وہ اس مٹی کے ڈبے سے باہر کو جھپٹے۔

O

(اسی رات میں کچھ عرصہ پہلے)

”مگر امیر جان، لالہ جان یہ دونوں ہیں کیا؟“ حیات پنگل کے بھتیجے شیر زمان پنگل نے
امیر جان سے پوچھا جو جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اوس آسمان سے اتنی زیادہ اتر رہی
تھی کہ اسے کبھی کبھی وائپر چلانا پڑ رہا تھا۔ سوکڑ شہر کے عقب سے ملحقہ کچے راستے پر وہ جیپ اس
مقام کی طرف جا رہی تھی، جہاں کہیں اونچے مٹی کے کناروں کے ساتھ ایک بلڈوزر کو کھڑا کیا گیا
تھا۔ امیر جان کا چہرہ پھولا اور لٹکا ہوا تھا۔ گردن کی کھال میں سلوٹیں اور بھی گہری ہو گئی تھیں۔ اس
کی چربیلی اور گدلی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے لہرا رہے تھے ونڈ سکرین پر ٹھہری ہوئی تھیں مگر
ذہن کے اندر کہیں بھی کچھ ٹھہرتا نہیں تھا۔ یاور عطائی کے ڈرائنگ روم کے چوتھے دروازے کے
پیچھے صوفے پر جہاں وہ بے خبر سوتی تھی اور جب جلسے کے بعد اچانک وہ اس حرامی پلے کے ساتھ
کھڑی ہوئی کسی بھوت کی طرح ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے بیچ جو زمانہ تھا اس میں کہیں بھی کچھ ٹھہرتا
نہیں تھا۔ لوگ۔ باتیں۔ مرد۔ عورتیں۔ نام۔ آنا جانا۔ سب کہیں سے اٹھ اٹھ کر آ رہے تھے۔ جا
رہے تھے اور اسے گرم سرد کر رہے تھے مگر آنکھیں بدستور ونڈ سکرین پر جمی تھیں۔ اس نے آنکھیں
میچیں اور ہاتھ سے ملیں مگر دھندلاہٹ سکرین پر تھی، اس نے پھر وائپر چلایا اور ساتھ ہی اسے مبہم سا
احساس ہوا کہ انعام گڑھ کے چھوٹے چوہدری نے کوئی بات کی ہے۔
”تم نے کچھ کہا چھوٹے چوہدری۔؟“
”ہاں۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ دونوں جن کی قبر ہم بنانے جا رہے ہیں۔ یہ اصل میں

ہیں کون؟“
”چھوڑو۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بڑی مشکل کہانی“ امیر جان نے کہا۔ لمبی کہانیاں سنانا اس
کے لیے بڑا اکتا دینے والا کام تھا۔
”وہ تو ہو گی۔ لیکن میں نے چاچے کو اتنا پریشان کم ہی دیکھا ہے۔ کچھ تو بتاؤ۔ کیسے ہیں
مطلب یہ دونوں؟“
”بس مرد عورت ہیں۔“
”پر کیسے مرد عورت۔“
اچانک چھوٹے چوہدری کے سوال کے جواب میں امیر جان کی ناف سے بلبلے اٹھے اور گہرا
ہف ہف کرتا قہقہہ اس کے حلق سے نکلنے لگا۔ اس نے کہا۔
”بس...... سمجھ لو۔ ویسے مرد عورت ہی ہیں جنہوں نے تمہارے چاچے کو فارغ کر دیا۔“
چوہدری شیر زمان بری طرح جھینپ گیا مگر بڑے تحمل سے بولا۔
”انجام پھر جو ہوا کتوں کا۔ لاشوں کا قیمہ بن گیا۔“
”اور ساتھ دو دوسروں کا بھی“۔ امیر جان نے لاتعلقی سے یاد دہانی کرائی۔
”ایک تو بھوک نہیں جاتی ان کی۔ ان...... صبر نہیں پڑتا۔ ہزار اعلان کرائے بڑا رزق ہے۔
بڑا رزق ہے۔ جتنا چاہو کھاؤ مرو۔“ چوہدری شیر زمان نے غصے اور نفرت سے کہا۔
”تو وہی ہوا۔ کھاؤ اور مرو۔“ امیر جان نے کہا اور دونوں ہنس پڑے۔
”وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ پر ان دونوں کا تو پہلے ہی سن کر چاچا وہم میں پڑ گیا تھا۔“
”کیا مطلب۔“
چھوٹے چوہدری نے ڈینگ مارنے کے لیے پینترا بدلا۔ ”او لالہ جی امیر جان جی ادھر
علاقے میں کوئی آ جائے ہماری نظر سے بچ نہیں سکتا۔ ہمیں تو اسی وقت اطلاع ہو گئی تھی جب یہ ادھر
کو پہنچے تھے۔ انہونی سی بات تھی اور ادھر علاقے میں ہم انہونیاں چلنے نہیں دیتے۔“
”بس تو پھر یہ تو ہونے والی ہے۔“ اس نے سوچا اور پھر بلند آواز سے کہا۔ ”تمہیں پکا یقین
ہے ناں دونوں اندر ہی ہیں۔“
”حد ہو گئی ہے۔ پل پل کی خبر ہے۔ کل صبح سے وہ اندر سے نہیں نکلے۔ پر یہ کام ذرا پہلے ہو

Scanned by CamScanner

کوشش کی۔"

زہرہ نے کبیر سے پوچھا۔ جبکہ گاڑی سڑک پر بھاگ رہی تھی اور صبح آگے بڑھ کر دن کو راہ دے چکی تھی مگر دوپہر ابھی دور تھی اور وہ وقت دنیا میں ڈھنگ کے کام کرنے والوں کیلئے سب سے قیمتی وقت تھا۔

"ہاں۔ وہ مر چکا تھا۔ میری انگلیاں کافی دیر سے اُس کی نبض پر تھیں۔ زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ پھر جب ہم نے گڑگڑاہٹ سنی بلڈوزر کی...... تو...... وہ کافی پہلے جا چکا تھا۔ بھورا بادشاہ۔ وہ بہت سکون سے گیا۔ بجھا بجھا بجھ گیا اور اپنے راز ہمیں دے گیا۔" کبیر نے اداسی سے کہا اور ٹھنڈا سا سانس لیا۔ "مٹی اس کے جسم کو سمیٹ چکی ہوگی۔ بلڈوزر کی حرکت جو ہماری موت کا اہتمام کر رہی تھی بھورے کی تدفین کے کم از کم تقاضے پورے کر گئی۔" "مگر ہماری موت کے تقاضے پھر بھی پورے نہ ہو سکے۔" زہرہ نے گاڑی کی رفتار کو کچھ دھیما کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے عناصر ہمیں واپس لینے پر تیار نہیں۔ آگ نے اُگل دیا اور مٹی بھی پیچھے رہ گئی بس ہماری نشان زدہ زندگی ایک بار پھر باقی رہ گئی۔"

"نشان زدہ زندگی؟"

"ہاں۔ اگلے زمانوں میں وہ ان کے ماتھوں کو نشانوں سے داغ دیتے تھے۔ مگر وہ سادہ لوگ تھے خواہ مخواہ انہیں نشان زدگی سے ممتاز کر دیتے تھے۔"

"ممتاز کر دیتے تھے؟"

"ہاں نشان زدگی جو ماتھے پر بھی نظر آتی ہے، ایک معکوس امتیاز ہی مگر امتیاز ہے جو دیکھنے والے کے دل کو دہلا تا ہے اور نشان زدہ کو ایک زہرناک اطمینان دیتا ہے مگر پھر جب انسان کو کاغذ کی عیاری نصیب ہوئی تو اب وہ داغنے کی بجائے کہیں کسی کاغذ پر اس کے نام کو لکھ کر اس پر نشان لگا دیتا ہے۔ کراس کرتا ہے یا اور گرد سرخ دائرہ لگاتا ہے۔"

"یعنی موت کا دائرہ" زہرہ نے تھیٹریکل انداز میں کہا اور ہنس پڑی۔

"نہیں وہ نشان جو اس روزمرہ کی دنیا میں زندگی اور موت کے درمیان کھنچے خط کی تنسیخ کرتا ہے اور زندگی اور موت ایک دوسرے میں حلول کر جاتی ہیں"۔ کبیر نے باہر تیزی سے پیچھے بھاگتے درختوں، مکانوں اور انسانوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر کیلئے یہ تو سب کے ساتھ ہے۔ زندگی اور موت کا ایک دوسرے میں حلول یہ تو واضح بات ہے۔"

"ہاں ہے مگر جو سب کے ساتھ ہے وہ اسی واضح بات کا التوا ہے۔ وہ ایک ٹھنڈا اور افتادہ امکان ہے کہ زندگی اور موت کا توازن کسی لمحے بگڑ جائے گا مگر وہ مرحلہ التوا کے لاتناہی لمحوں کی آرام دہ نیم گرم کائنات سے ماورا ہے۔ نشان زدہ لوگوں کے لیے یہ التوا میسر نہیں۔ نشان زدہ کے لیے ایک گم نام خاتمہ ہر موڑ پر منتظر رہتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے...... وہ ہر لمحے جانتا ہے۔"

"میں نہیں مانتی...... کہ وہ ہر لمحے جانتا ہے۔ وہ بھی اپنا التوا ضرور بناتا ہے۔ موت کے التوا کے بغیر زندگی کیسے ممکن ہے۔" کبیر نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی کئی راتوں کی بے نیند سوجی ہوئی آنکھیں سامنے سڑک پر جمی تھیں اور گاڑی تیزی سے سڑک کو نگلتی جا رہی تھی۔

"نشان زدہ شخص بھی موت کا التوا ضرور بناتا ہے" کبیر نے زہرہ کی بات ایک سوالیہ خودکلامی کے انداز میں دہرائی اور پھر خاموش ہو گیا۔ گاڑی کے انجن کی مسلسل ہیکا کی گونج ایک گہرا خواب آور اثر رکھتی تھی۔ اور دنیا بے نشان پیچھے کو بھاگ رہی تھی۔ درخت، ریل، بھینسیں، کسان، مزدور، فیکٹریاں، بچے، بوڑھے، سکول، تھانے، جوہڑ، دوکانیں، کھیت......"

کبیر خواب سے ہڑبڑا کر جاگا تو زہرہ ہنس پڑی۔ گاڑی اب بھی ویسے ہی آگے جا رہی تھی۔ "میں نے سوچا تھا تم لمبی نیند لو گے مگر تم تو اونگھے ہوئے اور ہڑبڑا کر جاگ گئے۔" پھر اس نے کبیر کے چہرے پر وحشت دیکھی تو پریشان ہو کر بولی۔ "خیریت۔ لگتا ہے تم نے اتنے میں ہی کوئی بہت ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں" کبیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اسے بہت ڈراؤنا خواب ہی کہیں گے۔ میں نے دیکھا کہ بھورا زندہ ہے۔ منوں مٹی کے نیچے بھی وہ زندہ ہے۔ پھر وہ مجھے بتاتا ہے کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے اسے زندہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے مگر مجھے صاف نظر آ رہا ہے اور پھر۔ یہ اور بھی خوفناک بات ہے...... شاید میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس حالت میں بھی مطمئن ہے۔ خوش نظر آتا ہے۔ میں کیسے اس کی حالت بیان کروں اور پھر وہ مجھے کہتا ہے کہ "اس بات کا بھی ایک بھید ہے۔"

"میرے خدا" زہرہ نے جھرجھری لی اور گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے وہ اُسے سڑک کی

Scanned by CamScanner

کوشش کی۔"

زہرہ نے کبیر سے پوچھا۔ جبکہ گاڑی سڑک پر بھاگ رہی تھی اور صبح آگے بڑھ کر دن کو راہ دے چکی تھی مگر وہ پہر ابھی دور تھی اور وہ وقت دنیا میں ڈھنگ کے کام کرنے والوں کیلئے سب سے قیمتی وقت تھا۔

"ہاں۔ وہ مر چکا تھا۔ میری انگلیاں کافی دیر سے اس کی نبض پر تھیں۔ زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ پھر جب ہم نے گڑگڑاہٹ سنی بلڈوزر کی..... تو..... وہ کافی پہلے جا چکا تھا۔ بوڑھا بادشاہ، وہ بہت سکون سے گیا۔ بجھتا بجھتا بجھ گیا اور اپنے راز ہمیں دے گیا۔" کبیر نے اداسی سے کہا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ "مٹی اس کے جسم کو سمیٹ چکی ہوگی۔ بلڈوزر کی حرکت جو ہماری موت کا اہتمام کر رہی تھی بھرے ہی تدفین کے کم از کم تقاضے پورے کر گئی۔" "مگر ہماری موت کے تقاضے پھر بھی پورے نہ ہو سکے۔" زہرہ نے گاڑی کی رفتار کو کچھ دھیما کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے عناصر ہمیں واپس لینے پر تیار نہیں۔ آگ نے اگل دیا اور مٹی بھی پیچھے رہ گئی بس ہماری نشان زدہ زندگی ایک بار پھر باقی رہ گئی۔"

"نشان زدہ زندگی؟"

"ہاں۔ اگلے زمانوں میں وہ ان کے ماتھوں کو نشانوں سے داغ دیتے تھے۔ مگر وہ سادہ لوگ تھے خواہ مخواہ انہیں نشان زدگی سے ممتاز کر دیتے تھے۔"

"ممتاز کر دیتے تھے؟"

"ہاں نشان زدگی جو ماتھے پر بھی نظر آتی ہے، ایک معکوس امتیاز سہی مگر امتیاز ہے جو دیکھنے والے کے دل کو دہلاتا ہے اور نشان زدہ کو ایک زہرناک اطمینان دیتا ہے مگر پھر جب انسان کو کاغذ کی عیاری نصیب ہوئی تو اب وہ داغنے کی بجائے کہیں کسی کاغذ پر اس کے نام کو لکھ کر اس پر نشان لگا دیتا ہے۔ کراس کرتا ہے یا اردگرد سرخ دائرہ لگاتا ہے۔"

"یعنی موت کا دائرہ" زہرہ نے ہسٹریکل انداز میں کہا اور ہنس پڑی۔

"نہیں وہ نشان جو اس روزمرہ کی دنیا میں زندگی اور موت کے درمیان کھنچے خط کی تنسیخ کرتا ہے اور زندگی اور موت ایک دوسرے میں حلول کر جاتی ہیں۔" کبیر نے باہر تیزی سے پیچھے بھاگتے درختوں، مکانوں، انسانوں، کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر کبیر کیلئے یہ تو سب کے ساتھ ہے۔ زندگی اور موت کا ایک دوسرے میں حلول یہ تو واضح بات ہے۔"

"ہاں ہے مگر جو سب کے ساتھ ہے وہ اسی واضح بات کا التوا ہے۔ وہ ایک ٹھنڈا اور افتادہ امکان ہے کہ زندگی اور موت کا توازن کسی لمحے بگڑ جائے گا مگر وہ سرد لمحہ التوا کے لاتعداد لمحوں کی آرام دہ نیم گرم کائنات سے مارا ہے۔ نشان زدہ لوگوں کے لیے یہ التوا میسر نہیں۔ نشان زدہ کے لیے ایک کم نام خاتمہ ہر موڑ پر منتظر رہتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے..... وہ ہر لمحے جانتا ہے۔"

"میں نہیں مانتی..... کہ وہ ہر لمحے جانتا ہے۔ وہ بھی اپنا التوا ضرور رکھتا ہے۔ موت کے التوا کے بغیر زندگی کیسے ممکن ہے۔" کبیر نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی کئی راتوں کی بے نیند سوجی ہوئی آنکھیں سامنے سڑک پر جمی تھیں اور گاڑی تیزی سے سڑک کو نگلتی جا رہی تھی۔

"نشان زدہ شخص بھی موت کا التوا ضرور رکھتا ہے" کبیر نے زہرہ کی بات ایک سوالیہ خودکلامی کے انداز میں دہرائی اور پھر خاموش ہو گیا۔ گاڑی کے انجن کی مسلسل میکانکی گونج ایک گہرا خواب آور اثر رکھتی تھی۔ اور دنیا بے نشان پیچھے کو بھاگ رہی تھی۔ درخت، بیل، بھینسیں، کسان، مزدور، فیکٹریاں، بچے، بوڑھے، سکول، تھانے، جوہڑ، دکانیں، کھیت....."

کبیر خواب سے ہڑبڑا کر جاگا تو زہرہ ہنس پڑی۔ گاڑی اب بھی ویسے ہی آگے جا رہی تھی۔ "میں نے سوچا تھا تم لمبی نیند لو گے مگر تم تو دو لمحے سوئے اور ہڑبڑا کر جاگ گئے۔" پھر اس نے کبیر کے چہرے پر دہشت دیکھی تو پریشان ہو کر بولی۔ "خیریت۔ لگتا ہے۔ تم نے اتنے میں ہی کوئی بہت ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں" کبیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اسے بہت ڈراؤنا خواب ہی کہیں گے۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھا زندہ ہے۔ منوں مٹی کے نیچے بھی وہ زندہ ہے۔ پھر وہ مجھے بتاتا ہے کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے اسے زندہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے مگر مجھے صاف نظر آ رہا ہے اور پھر۔ یہ اور بھی خوفناک بات ہے..... شاید میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس حالت میں بھی مطمئن ہے۔ خوش نظر آتا ہے۔ میں کیسے اس کی حالت بیان کروں اور پھر وہ مجھے کہتا ہے کہ" اس بات کا بھی ایک بھید ہے۔"

"میرے خدا" زہرہ نے جھرجھری لی اور گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے وہ سڑک کی

Scanned by CamScanner

بائیں طرف درختوں کے جھنڈ کے پیچھے لے گئی۔ وہاں گھنی چھاؤں تھی اور گھاس ایک قدرتی برساتی تالاب کے کناروں تک پھیلی تھی جس میں کنول کے گول بے تحاشہ بڑے بڑے پتوں میں سے اور سبز ڈنٹھلوں میں سے اوپر اٹھتے گلابی پھول نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف ایک گہری خاموشی تھی اور ہوا مدھم بے آواز بہتی تھی۔ گاڑی کے اکتا دینے والے میکانکی شور کے بعد وہ ایک اچانک آنے والی شانتی کا خطہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے ان دونوں نے اسے بھی خواب ہی جانا مگر خاموش رہے۔ کبیر کے خواب کے بعد کی خاموشی دوسری ہر خاموشی پر حاوی تھی گھنی چھاؤں سبز گھاس اور اس سبز میں بھی بہت سے مختلف سبز درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سب کبیر کے خواب کے بعد کی خاموشی تلے دبے تھے۔ جیسے مدتیں گزر گئیں۔

آخر زہرہ نے سٹیرنگ پر رکھا سر اٹھایا اور سیٹ میں پیچھے کو جھکتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

''مگر تم نے تو کہا تھا۔ تمہیں یقین ہے بھورا اس وقت زندہ نہیں تھا'' ۔اس نے کہا۔

''ہاں مجھے یقین ہے میں نے ایسا ہی کہا تھا'' کبیر کی آنکھیں دھندلی تھیں جیسے اب بھی خواب دیکھ رہا ہو۔ ''بھورا.....اس وقت زندہ نہیں تھا.....''

''اب تم اتنے یقین سے نہیں کہہ رہے۔'' زہرہ نے خود بھی بے یقینی سے کہا۔

''اور اب بے یقینی۔ بے شک۔ بڑھتا جائے گا۔ ایک احساس جرم۔ ایک احساس گناہ...... انعام گڑھ کے دوسرے تختوں میں ایک بیا سو ربھی ساتھ رہے گا۔ عمر بھر...... مگر نہیں...... مجھے یقین ہے۔ بھورا آخری سانس لے چکا تھا۔ اس کا دل بند تھا۔ نبض رکی تھی۔ سانس نہیں تھا۔ زندگی اور کیا ہوتی ہے۔''

''نشان زدہ زندگی...... جو پھر بھی سب سے پہلے اپنے خاتمے کو التوا میں ڈالتی ہے۔''

''یہ ایک اچھا فقرہ ہے تمہارا۔ ایک تیز نشتر'' کبیر نے کہا اور پھر اک دم بھڑک کر بولا ''بھورا جا چکا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے۔ اور پھر خواب تو خواب ہے۔''

''ہاں۔ خواب تو خواب ہے۔'' زہرہ نے کہا۔

''مگر خاتمے کا التوا...... شاید اس سے کوئی نجات نہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ شاید ایک سطح پر تم ٹھیک کہتی ہو۔''

''سزائے موت کا قیدی بھی آخری لمحے تک التوا کا منتظر رہتا ہے'' زہرہ نے کنول کے

چوڑے گول پتوں اور گلابی پھولوں کو پہچانتے ہوئے کہا۔

تب کبیر نے چھاؤں کی نرم ٹھنڈک کو سانسوں میں اتر جانے دیا اور جانا کہ وہ جگہ سڑکوں کے کناروں کے ساتھ کہیں اچانک آنے والی ایک چھوٹی سی بے نام خوبصورت جگہ ہے۔ ایسی خوبصورت جگہیں جو تیزی سے گزر جانے والوں کی توجہ کبھی حاصل نہیں کر پاتیں اور پھر وہ بولا۔

''ہاں مگر سزائے موت کے قیدی اور نشان زدگی کی سزا پانے والے میں ایک بڑا فرق ہے۔ نشان زدہ کا خاتمہ ایک گم نام خاتمہ ہے۔ جبکہ سزائے موت سے خاتمہ ایک علانیہ خاتمہ ہے جسے اداروں کی تائید اور دلائل و براہین کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ سزائے موت پانے والا ایک دشمن کھلاڑی ہوتا ہے جبکہ نشان زدہ تو کھیل سے ہی منکر ہوتا ہے۔ سرے سے منکر۔ وہ کھیل کے قواعد وضوابط کے اندر سزا پا نہیں سکتا۔ لازم ہے کہ اس سے باہر باہر ہی نپٹا جائے۔ گم نامی سے۔ خاموشی سے کہیں احتیاط سے تنہائی میں یا کہیں ہجوم میں کہ کانوں کان خبر ہی نہ ہو......''

''یا کہیں بھگدڑ میں......'' اچانک زہرہ نے کہا۔

''ہاں بھگدڑ میں کہ کوئی شکوہ بھی نہ کر سکے۔'' کبیر نے کہا اور دونوں میں پھر گہری خاموشی اتر آئی۔ پھر زہرہ نے کہا۔ ''کس قدر خوبصورت ہے یہ جگہ۔''

''ہاں۔ گمنام۔ تنہا۔ خاموش اور بے حد خوبصورت۔''

''جی چاہتا ہے یہیں سو جاؤں اور مدتوں نہ اٹھوں۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر ابھی ہمیں یہ دونوں مسودے محفوظ مقامات تک پہنچانے ہیں ڈاک کے ذریعے۔ کسی قصبے کا ڈاک خانہ...... ویسے تمہیں ایک اور بھید کی بات بتاؤں۔''

''کیا؟''

''میرا خیال ہے ہم بڑے شہر کی طرف بھاگنے کی بجائے بڑے شہر سے دور بھاگے جا رہے ہیں۔''

''کیا؟'' زہرہ نے چونک کر کہا اور تم نے بتایا ہی نہیں۔

''التوا کی ہوس سمتوں کا احساس فنا کر دیتی ہے۔ انعام گڑھ سے دور۔ دور...... بڑے شہر کی طرف یا بڑے شہر سے مخالف...... آؤ چلیں......''

''میرا جی چاہتا ہے میں نیچے اتر کر کچھ دیر تو یہاں گزار لوں۔''

Scanned by CamScanner

"پھر کبھی سہی.....اب یہ جگہ بھی ہمارے لیے ایک نشان زدہ جگہ ہے.....ایک اور طرح سے نشان زدہ۔" کبیر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی یہاں کچھ بھی اور ٹھہرنے کا مطلب ہے کہ ہم ان درختوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے گر کر گہری نیند میں ڈوب جائیں گے اور اس سڑک پر سے تیزی سے گزر جانے والے کم از کم ایسا کوئی نظارہ نظرانداز نہیں کر سکیں گے۔"

"کوئی بھی نظرانداز نہیں کرتا۔" زہرہ کے لہجے میں تھکن تھی۔

"نشان زدہ لوگوں کو۔" کبیر نے کہا۔

"ہاں۔ فی الحال اسی قسم کے لوگوں کو۔ پتہ نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔" زہرہ نے کہا اور گاڑی کا رخ پھر سڑک کی طرف موڑ دیا۔

O

"آپ آ گئے کبیر صاحب۔ بیگم.....ہم.....میرا مطلب ہے میڈم جی۔ صاحب....." امداد حسین نے ان دونوں کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جو بیت المقدس میں جیسے کسی لمبے تھکا دینے والے سفر کے بعد تھکے ماندے گرے پڑے تھے۔ کبیر نے ایک بناوٹی حیرت سے مبالغہ آمیز سوالیہ انداز سے زہرہ کی طرف دیکھا "کیا خیال ہے تمہارا کیا ہم آ گئے ہیں" پھر زہرہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی بولا "جی امداد صاحب ہم آ گئے ہیں، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے ہیں۔"

امداد حسین مسکرایا "جی جناب وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

اب کبیر کی حیرت بناوٹی نہ تھی۔ "آپ بھی دیکھ رہے ہیں؟"

"اب آپ کی آنکھیں ویسی نہیں ہیں جیسی جاتے وقت تھیں۔"

"جاتے وقت کیسی تھیں؟" زہرہ نے تعجب سے پوچھا۔

"ان دونوں جیسی" امداد حسین نے کہا اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے کہ جیسے بات کہہ کر پچھتا رہا ہو۔

کبیر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "کون دونوں؟" اس نے پوچھا اور امداد حسین نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ اب میں کیا بتاؤں وہ دونوں اور ان دونوں کی آنکھیں کیسی لگتی تھیں۔ پھر اس

نے بات گول کرنے کی بھرپور کوشش کی "کیا بتاؤں کبیر صاحب ایسے ہی منہ سے کوئی نہ کوئی الٹ پلٹ بات نکل جاتی ہے۔ حقیقت میں کل کی بات آج میں اور آج کی کل میں ملا رہا ہوں۔ معاف رکھیے۔ جواب دیتے جا رہے ہیں۔ دفع کریں۔ اچھا وہ آپ کا ایک خط آیا ہوا ہے گھر سے شاید اور ایک پیکٹ۔"

کبیر خوب جانتا تھا کہ پیکٹ میں کیا ہوگا۔ بھرے کا مسودہ جو ناصر کو بھیجے خط کے ساتھ ہی اس نے حوالۂ ڈاک کیا تھا مگر گھر سے خط یقیناً فوری توجہ کا مستحق تھا۔ امداد حسین ان دونوں اور ان دونوں کی آنکھوں کی بات ٹالنے میں کامیاب رہا۔ "خط لائیں۔ دکھائیں" کبیر کے لہجے میں بے چینی تھی۔

امداد حسین نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ کبیر کی ادھیڑنے کی تفتیش کا شکار ہونے سے بچ گیا اور پھر ڈاک لینے چلا گیا۔ کبیر نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھولیں تو مدتوں کی باسی ہوا باہر نکل گئی اور نیچے سندر شام روڈ کی مانوس آوازیں اور خوشبوئیں اسے بھلی لگیں۔

"مجھے تو یہاں بھی گھر واپسی کا احساس ہو رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "مگر گھر سے بھی ایک خط ہے۔"

"سمیال سے؟" زہرہ نے پوچھا اور آرام کرسی میں اپنے جسم کو اور بھی آرام پہنچانے کے لیے اس نے جسم کو کئی سمتوں میں حرکت دی اور بیٹھی بیٹھی اور بھی آگے کو سرک گئی۔

"ہاں اور سمیال سے خط، 'ہم یہاں خیریت سے ہیں آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے' وغیرہ قسم کا خط ہو نہیں سکتا۔ میری حرکتوں کی وجہ سے اب بہت ہی کم معاملات ہیں جن میں وہ مجھے بھول نہیں پاتے اور یہ کوئی ایسا ہی معاملہ ہوگا۔"

زہرہ نے اس نامیاتی تشویش کے ساتھ کبیر کی طرف دیکھا جو اکٹھے زندگیاں گزارنے والوں کے درمیان ایک غیر محسوس انداز میں پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

"فکر نہ کرو.....سب خیریت ہوگی۔" اس نے کہا اور کبیر ہنس پڑا۔

"نہایت ہی بیویانہ قسم کی بات کی تم نے۔"

"بکواس۔" زہرہ نے غصے سے کہا۔

امداد حسین خط اور پیکٹ لے آیا۔ کبیر نے پیکٹ میز پر رکھا جہاں زہرہ اور اس کی دوبارہ

Scanned by CamScanner

کی منتوں کی باقیات جوں کی توں بکھری تھیں۔ اُس نے خط کھولا اور پڑھ کر زہرہ کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو کسی حادثے یا المیے کا نتیجہ تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ زہرہ نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک سوالیہ سی آواز نکالی "ہوں؟"

"چنا سائیں مر گیا۔" کبیر نے اعلان کیا۔

"چنا سائیں..... تمہارا مطلب ہے وہ شخص جو کسی غار میں......" اور اسے وہ کہانی یاد آ گئی جو کبیر نے ان چاروں کو سنائی تھی۔

"ہاں۔ بیچارا افلاطون انتقال کر گیا۔ آہ۔ مجھے ہاف مین بری طرح یاد آ رہا ہے۔ اب یہ سفر تھا جس میں شامل ہونے کی اسے حسرت تھی۔"

"سفر؟" زہرہ نے کہا اور چونک کر اپنے اندر اور باہر اس کیفیت کو پہچانا جو پھر کسی ہونے والی، کسی آنے والی، کی چاپ جیسی تھی۔ دنیا ایک بار پھر کروٹ لے کر بدل جانے والی تھی اور بدلنے والی اس کے سامنے کبیر کے لحظہ بہ لحظہ بڑھتے اضطراب میں ظاہر ہو رہی تھی۔

"دوسرا سفر کہنا چاہیے"۔ وہ کہہ رہا تھا۔ انعام گڑھ کی سنگین یاترا اختتام ہوئی بلکہ یوں کہو کہ ناتمام ہوئی اور جیسا الداد صاحب نے کہا ہم واپس آ گئے۔ اب یہ دوسرا وعدہ تھا میرا۔ سمیال کے سفر کا۔ کھو چنا سائیں کے گائیڈ ٹور کا۔ جل چھتری جیسے قابلِ دید مقام...... کا۔" پھر وہ خاموش ہوا اور ایک ٹورسٹ گائیڈ کے انداز میں بولنے لگا "سر۔ میڈم یہ جل چھتری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ ایک عظیم الشان چٹان ہے جو پہاڑ میں سے ایک انگلی کی طرح باہر نکلی ہے جو مشرق کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور اس چٹان کے نیچے مقامی لوگ لیٹ کر اپنا منہ کھول دیتے ہیں اور اس چشمے کا قطرہ قطرہ پانی ان کے منہ میں گرتا ہے۔ مقامی ضعیف الاعتقادی یہ ہے کہ جل چھتری کا ایک قطرہ ہی پیاس بجھا دیتا ہے مگر زیادہ چالاک لوگ قطرے کے نیچے مٹی کا پیالہ رکھ دیتے ہیں پیالہ بھرتا ہے تو پیتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں آپ..... مگر تجربہ شرط ہے چٹان کے نیچے لیٹ کر منہ کھولنا ہوگا۔ آپ آزمائیں گے سر۔ میڈم آپ تجربہ کریں گی۔ یقین کریں یہ زندگی میں صرف ایک بار قسم کا تجربہ ہے۔ آئیں...... پلیز، پلیز....." اور پھر وہ قہقہے لگانے لگا۔

زہرہ اسے دیکھتی رہی اور کچھ نہ بولی۔

"خیر، خیر..... پھر سہی۔" اُس نے کہا اور پھر زہرہ کو مخاطب کرتے بولا "میرا اصل وعدہ تو

مدد علی سے ہے۔"

"تو تم اپنے پاگل پن سے باز نہیں آؤ گے۔" زہرہ نے ایسے ہارے ہوئے لہجے میں کہا جیسے اب تک وہ ہونے والی کو بہت آگے تک دیکھ چکی ہو۔

"یہ پاگل پن نہیں ہے میری جان۔ چنا سائیں کے انتقال کے بعد اب اس کے صحیح جانشین کی تعیناتی کا وقت آن پہنچا ہے۔ ذرا سوچو جب زائرین اس سے منتیں مانگیں گے اور وہ کبھی انگریزی میں اور کبھی جرمن میں اور کبھی عورت اور کبھی مردوں کی زبان میں باتیں کرے گا۔"

کبیر اس تصور پر ہنستا چلا گیا۔ زہرہ اسے دیکھتی رہی پھر وہ اٹھی اور اس نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ کبیر کی ہنسی ہلکی سی چیخ میں بدل گئی۔

"بس کرو کمینے۔ اب یہ بس کرو۔ سب کچھ بس کرو۔ دیکھا جائے گا۔" زہرہ نے بوجھل آواز میں کہا۔

"نہیں یہ سفر ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں جلد از جلد تیاری کرنا ہوگی۔ مدد علی کو تیار کرنا ہوگا اور آہ..... آہ..... ناصر..... پیارے ناصر کے بغیر تو سب کچھ ناتمام ہے اور یہ سفر تو خاص طور پر..... چیزیں اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ زہرہ تم نے دیکھا سارا فساد مدد علی ہی کے گونگے پن سے شروع ہوا جو اختیاری سے غیر اختیاری ہو گیا اور اب بے اختیاری ہو جائے گا" وہ پھر ہنسا اور پھر چیخا۔

"بے اختیاری میں ایسا ہی ہوتا ہے" زہرہ نے اپنی انگلیاں کبیر کے بالوں سے نکالتے ہوئے کہا اور کبیر اپنے سانس میں اٹھتی آنچ کو پہچان کر اس کی طرف آیا۔ "مدتیں ہو گئیں ایک دوسرے کو الفتوں میں ڈالے ہوئے......"

O

"بی بی جی گورے آئے تھے" سراج دین نے زہرہ کو اطلاع دی۔ چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور دیکھا کہ بی بی جو اپنے کمرے کی کھڑکی کی راہ سے باہر شاید ان کے درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاید اس کی بات سنی بھی نہیں تھی۔ سراج دین نے ٹرے اٹھا کر دوسری جگہ رکھی اور کچھ کھنکا پیدا کیا اور پھر کھانسا۔ زہرہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

Scanned by CamScanner

"ہاں سراج دین مجھے چائے بنا بھی دو" اس نے کہا اور اریکا پام کی روش کے عقب میں دائیں طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ بڑے پانی کے زمانے میں جو بڑا شیشم وہاں سے گر گیا تھا، اُس سے کیسا بدنما خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اس خلا کو پُر کرنے کی کوئی بھی صورت اسے نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔ "آخر بڑے بڑے درخت جلد از جلد پیدا کرنے کا کوئی طریقہ دریافت کیوں نہیں ہو جاتا" پھر اپنی اس حماقت کی سوچ پر اسے اور بھی غصہ آیا۔ تب سراج دین نے پھر کہا۔

"بی بی جی گورے آئے تھے"۔ زہرہ نے کھڑکی سے نظریں ہٹا کر سراج دین کی طرف دیکھا اور بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ "گورے۔ کونسے گورے؟"

سراج دین نے آدھا چمچ چینی کپ میں گھولتے ہوئے سوچا کہ "کونسے گورے؟" کا وہ کیا جواب دے۔ گورے تو بس گورے ہوتے ہیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے پوتے شبیر نے بھی تو گوروں سے انگریزی میں بات کی تھی جو دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور جس دن گورے آئے تھے، وہ اتفاق سے اپنے باپ کے ساتھ دادے کو ملنے آیا ہوا تھا۔ چنانچہ جو پوتے نے دادے کو گوروں کے بارے میں بتایا تھا اسے بنیاد بنا کر سراج نے زہرہ کے سوال کا جواب دیا۔

"وہ جی کسی آدھے آدمی کے چکر میں آئے تھے اور آپ کا پوچھتے تھے۔"

زہرہ کا ہاتھ جو چائے کا کپ اٹھانے کے لیے بڑھا تھا۔ وہیں رک گیا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آدھے آدمی کے چکر میں۔ کیا کہہ رہے ہو سراج دین؟"

زہرہ کا بات پوچھنے کا انداز سراج دین کو یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے مگر کیا؟ وہ کیا جانے۔ اگر کوئی قصور ہے تو شبیر کا ہے جس نے اسے بتایا تھا۔

"بی بی جی۔ پتہ نہیں جی۔ وہ شبیر جو میرا پوتا ہے اس دن آیا ہوا تھا۔ اس نے بات کی تھی، گوروں سے۔ انگریزی میں جی۔ ایک مرد تھا ایک عورت تھی۔ انگریزی میں بات کی تھی..... شبیر نے"

زہرہ الجھن میں پڑ گئی "انگریزی میں بات..... آدھے آدمی..... او..... ہو" زہرہ کے چہرے کے تاثرات یکلخت بدلے اور اس نے چائے کا کپ اٹھانے کا ارادہ پھر ملتوی کر دیا اور بے تحاشہ قہقہے لگانے لگی۔ سراج دین اور بھی گھبرا گیا۔ "کوئی غلطی ہو گئی بی بی جی....."

"نہیں سراج دین تمہارے پوتے سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ وہ آدھے آدمی کے چکر میں ہی آئے ہوں گے۔ انگریزی میں آدھا آدمی ہاف مین ہی ہوتا ہے....."

"بی بی جی..... بالکل مجھے بھی لگا تھا اللہ بخشے ہاف صاحب کی کچھ بات تھی..... شبیر نے نام....."

"ہاں..... ہاف صاحب....." پھر وہ سنجیدہ ہو گئی اور سوچنے لگی "مگر ہاف مین کیوں؟ کون لوگ ہو سکتے ہیں....." پھر اس نے سراج دین سے پوچھا "اور بھی کچھ کہا ہو گا انہوں نے..... گوروں نے....."

"بس جی آپ کا پوچھا تھا شبیر سے بار بار..... آپ تھی نہیں..... میں نے کہا بول دے بی بی کے آنے کا کچھ پتہ نہیں....."

"ہاں..... میرے آنے کا..... تو کچھ پتہ نہیں تھا....." زہرہ نے زیرلب کہا مگر سراج کو کچھ اندازہ نہ ہوا کہ بی بی گوروں کی دوبارہ آمد چاہتی ہے یا نہیں۔ پھر بھی اس نے بے تاثر سے لہجے میں کہہ دیا۔

"آئیں گے ضرور جی گورے۔ پھر....."

اور اسی شام وہ پھر آ گئے۔ مائیکل ووڈز اور کلارا گولڈ برگ۔ مسٹر ووڈز ایک تیس پینتیس سالہ درمیانے قد کا دبلا پتلا برطانوی تھا۔ جسم سے مطابقت رکھتے اس کے لمبوترے چہرے پر ایک دائمی غمزدگی کی کیفیت تھی جو گفتگو کے دوران اس کی راکھ جیسی رنگت کی آنکھوں اور پتلے حساس ہونٹوں سے بار بار جھلکتی تھی۔ پھر جب وہ اپنے سرمئی بالوں کی کسی خیالی بے ترتیبی کو درست کرنے کے لیے ہاتھوں کو مضطربانہ حرکت دیتا تھا تو کسی ایسے صحرائی چوہے جیسا لگتا تھا جو بل سے بھٹک کر دور کہیں انجانے خطروں میں گھر گیا ہو۔ اپنے تعارف کے مطابق اس کا میدان آرکیالوجی تھا مگر اس کی تخصیص آرکیالوجسٹس کا طریقہ کار تھا۔

"میں آرکیالوجی سے زیادہ آرکیالوجسٹس میں دلچسپی لیتا ہوں۔" وہ اپنی گفتگو میں اکثر یہ اعتراف کرتا تھا اور پھر مخاطب کو اپنی اس بے اعتدالی پر معذرت خواہانہ انداز میں دیکھتا تھا۔

کلارا گولڈ برگ ایک پینتالیس سالہ کٹیلی پر اعتماد جرمن خاتون تھی۔ سفارت خانے سے وابستہ۔ وہ اپنی ملکی ثقافتی سرگرمیوں کو مقامی تقریبوں کے ذریعے برپا کرنے کی ذمہ دار تھی۔ دنیا

Scanned by CamScanner

سے اور خصوصاً ایک اجنبی دنیا سے معاملہ کرنے میں اس کا رویہ مسٹر ووڈز جیسے افسردہ عالم کے رویے سے بہت مختلف تھا۔ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں کسی بھی اجنبی ملک میں تعیناتی کے بعد وہ جلد ہی مقامیوں کی بنیادی اقسام دریافت کر لیتی تھی یا پہلے سے دریافت شدہ اقسام میں کم از کم ایک آدھ نئی قسم کا اضافہ ضرور کر دیتی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرتی تھی کہ ثقافتی سرگرمیاں مقامیوں کی کس بنیادی قسم کی ضرورت ہیں اور پھر وہ اسی قسم سے اصل معاملہ شروع کرتی تھی اور بہت کامیاب رہتی تھی۔ مائیکل ووڈز کی آمد اور اس کی دیکھ بھال اور اس کی تحقیقی ضرورتوں سے متعلقہ امور کا انتظام و انصرام ووڈز کے برطانوی ہونے کے باوجود اس کے دائرہ کار میں تھا کیونکہ اس برطانوی آرکیالوجسٹ کا تحقیقی میدان ایک جرمن آرکیالوجسٹ تھا۔ سفارت خانے میں ہاف مین سے متعلق ریکارڈ اس کے شعبے کی براہ راست نگرانی میں تھا۔ اس کے علاوہ سبکدوش ہونے والے اپنے سابقہ ہمعصر سے ہونے والی تفصیلی گفتگو کے ذریعے بھی وہ فریڈرک ہاف مین کے کیس سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ یہ کیس جو اب سفارتی اور علمی حلقوں میں 'ہاف مین کا المیہ' یا فریڈیز فال (Fredy'sFall) کے عنوانات سے جانا جاتا تھا مائیکل ووڈز کی خصوصی تحقیقی دلچسپی کا باعث بنا تھا۔

زہرہ نے انہیں روزمرہ کے استعمال کے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا تھا کیونکہ عطائی کا ڈرائنگ روم اب اس کے لیے اپنے ہی گھر کے آثار قدیمہ کی طرح تھا جو محفوظ اور بند پڑا تھا۔ تعارف کے بعد کلارا گولڈ برگ نے مسٹر ووڈز کی آمد کا مدعا بیان کیا۔

"مسٹر ووڈز ہاف مین کے کیس پر تحقیق کر رہے ہیں۔ آپ یقیناً ہاف مین کو جانتی ہیں"۔ گولڈ برگ نے کہا اور زہرہ نے محسوس کیا کہ اس کی نیلی آنکھیں چبھنے والی ہیں مگر وہ اور بھی کوشش کر کے انہیں اس کی آنکھوں میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کی خفیف سی مسکراہٹ اس توقع کو ظاہر کر رہی ہے کہ اب یہ مقامی عورت یقیناً کچھ آئیں بائیں شائیں کرے گی۔ پھر اس کی بوکھلاہٹ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی آسانی فراہم کرے گی۔ زہرہ یہ سب کچھ اور یہ کہ یہ سب کچھ غلط بھی ہو سکتا ہے، سوچ کر ہنس پڑی اور پھر کہنے لگی۔

"ہاں میں یقیناً ہاف مین کو جانتی ہوں وہ ہمارا دوست تھا۔ میرا دوست تھا۔"

گولڈ برگ اور ووڈز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے انہیں مقامی عورت سے ایسے

واضح اور عام معمول کے جواب کی توقع نہ تھی۔

"دراصل مسٹر ووڈز ہاف مین کے المیے پر تحقیق کر رہے ہیں"۔ گولڈ برگ نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"ہاف مین کا المیہ۔ آہ..... آپ ہاف مین کی موت کی بات کر رہی ہیں"۔ زہرہ نے کہا اور گہرا سانس لیا۔ "ہاں شاید ___ اسے المیہ بھی کہیں گے..... مگر میں نے اسے المیہ نہیں کہا تھا۔ ایک شخص جو اپنے کام کی لگن میں موت تک جا پہنچتا ہے۔ کیا یہ ایک شاندار موت نہیں ہے" اور زہرہ نے سوچا کہ وہ کبیر کے الفاظ دہرا رہی ہے۔

مائیکل ووڈز نے ایک اداس بے چینی سے اپنے سلیٹی رنگ کے بالوں پر پیچھے کو ہاتھ چلایا مگر ان کی ترتیب ویسی کی ویسی ہی رہی۔ وہ مضطرب لہجے میں بولا۔

"آ..... میرا خیال ہے ___ یہ اتنا سادہ نہیں ہے ___ یہ سب ___ 'ہاف مین کا المیہ' جسے کچھ سکالر 'Fredy's Fall' کہتے ہیں..... میں کہوں گا۔ اتنا سادہ نہیں ہے۔ ہاف مین کا المیہ محض اس کی جسمانی موت کا المیہ نہیں ہے۔ بلکہ..... اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے ___ میں چونکہ آرکیالوجی سے زیادہ آرکیالوجسٹس میں دلچسپی رکھتا ہوں..... بلکہ اس کی ذہنی موت کا المیہ بھی ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ جس میں کلارا گولڈ برگ اپنی پُرتشویش اور مشکوک نظریں مسٹر ووڈز اور مقامی عورت کے درمیان گھما گھما کر بدل رہی تھی۔ زہرہ نے اپنے آپ کو بتایا کہ یہ لوگ کچھ فیصلے کر کے آئے ہیں یا کم از کم یہ عورت ضرور جانتی ہے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ پھر زہرہ نے اُن دونوں سے کہا۔

"ذہنی موت..... تو کیا ___ آپ کا مطلب ہے ہاف مین مرنے سے پہلے ذہنی طور پر مردہ ہو چکا تھا؟"

ووڈز کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گولڈ برگ نے اپنے اندازے کے مطابق بہت مناسب موقع پر بہت مناسب سوال کیا۔

"اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں ___ مس ___ زہرہ یاور....."

Scanned by CamScanner

''یہی فیصلہ کرنے میں تم ہماری مدد کر سکتی ہو۔ ہاف مین کا سابقہ تحقیقی کام اول درجے کا ہے۔ ہمیں علم ہے وہ یہاں آیا اور پھر کیا ہوا۔ کہ وہ اپنے شعبے کے معزز ماہرین سے رابطہ قائم رکھنے کی بجائے کچھ اور طرح کے لوگوں میں گھر گیا اور...... اس کا اپنا کام...... یہ نتیجہ......''

''اور آپ کا خیال ہے کہ میرا تعلق ایسا کچھ اور طرح کے لوگوں سے ہے۔'' زہرہ نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اچانک ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ آخر اسے ناراض ہونے کی بھی کیا ضرورت ہے اور پھر اس کی جذباتی کیفیت بدل ہی گئی۔

گولڈ برگ نے فوراً ہی پینترہ بدلا ''اور طرح کا۔ میرا مطلب ہے۔ مختلف ہونا۔ یہ کسی الزام کے معنوں میں نہیں۔ ہمیں ہاف مین کے کرائسس سے دلچسپی ہے اس کے ساتھ یہاں کیا ہوا۔''

''آپ کا مطلب ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟'' زہرہ نے ایک کھلی خوش دلی سے پوچھا اور گولڈ برگ کوشش کے باوجود اس میں کوئی طنز نہ ڈھونڈ سکی۔

''آہ...... ویل...... میں نہیں جانتی...... لیکن۔ اگر دیکھ لیں۔ اگر انہیں لفظوں کے ساتھ...... اگر بات آگے چلتی ہے تو...... او...... کے...... ایسا ہی سہی۔''

زہرہ کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھیں جیسے کہیں دور دیکھنے لگیں۔ پھر اس نے سوچا جو وہ کہنے والی ہے، وہ ویسا تو نہیں ہوگا۔ جیسا اگر یہاں کیبر ہوتا تو کہتا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ ایسا نہیں۔ وہ وہی کہے گی اور کہہ رہی ہے۔ جو وہ خود کہنا چاہتی ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے پھر اس شک نے آلیا کہ آخر یہ جاننے کا کیا طریقہ ہے۔ کوئی طریقہ بھی تو نہیں کہ کوئی جو کچھ بھی کہتا ہے اس میں کتنا اس کا اپنا ہے کتنا دوسرے کا......

مائیکل ووڈز اور کلارا گولڈ برگ 'مقامی عورت' کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ گولڈ برگ کی آنکھیں کسی ایسی عیار بلی کی طرح چمک رہی تھیں جو چوہے کے بلا آخر بل سے باہر آنے کا یقین کیے بیٹھی ہو جبکہ ووڈز کی دائمی افسردگی پر ایک غیر محسوس تحیر غالب آ رہا تھا...... وہ کہیں اور تھی وہ حسین مقامی عورت، اور کہیں اور سے کچھ لانے والی تھی۔ کیا؟ اس خیال سے اس کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس لمحے میں گزری کیفیتوں میں بھی جب کچھ اور سوچنا مشکل تھا۔ اس نے اپنے اس دیرینہ احساس کو ذہن میں جگہ دی کہ وہ بنیادی طور پر ایک روحانی شخص ہے۔

اور زہرہ نے اسی کی طرف دیکھتے ہوئے اور گولڈ برگ کو جیسے جان بوجھ کر بالکل نظر انداز

کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ہمارے ساتھ بہت دور تک آگے چلا گیا تھا۔ ہاف مین ہمارے ساتھ، دیوانگی کے سفر میں۔ میرا خیال ہے وہ ہمارے ساتھ جنون کی مہم جوئی میں اس مقام تک چلا گیا تھا۔ جہاں سے بعض اوقات واپسی مشکل ہو جاتی ہے...... شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

گولڈ برگ کی آنکھوں میں چمک پھڑپھڑائی ''جنون کی مہم جوئی...... آ...... سمجھی ہے۔ میں سمجھ گئی۔'' اور اس نے چوہے کی جھلک پر پہلا پنجہ مارا۔ ''جنون کی مہم جوئی...... منشیات کے جہازوں پر سوار ہو کر...... بہت خوب...... مجھے پہلے ہی اس بات کا شک تھا کہ ہاف مین کا ذہن نامعلوم منشیات کے استعمال سے برباد ہو گیا......''

زہرہ نے اس عورت کی آنکھوں میں دیکھا اور گہرا دیکھتی رہی۔ اس کی خوش دلی آہستہ آہستہ ماند پڑتی چلی گئی اور اندھا سیاہ غصہ اور پیچھے اس کی رگوں میں کسی کالے پارے کی طرح چڑھنے لگا تھا۔

''منشیات نامعلوم منشیات کیا مطلب؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ گولڈ برگ کو یقین تھا کہ اب شکار بچ کر نہیں جائے گا ''بہت کہانیاں ہیں ہمارے ریکارڈ میں، میرا اسٹاف رو ہاف مین کا دوست تھا اس نے مجھے کئی مشکوک کہانیاں سنائی ہیں۔''

''افرو ڈانسکس کے بارے میں؟'' زہرہ نے تیز اور بلند آواز میں اس کی بات کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اس کے لہجے سے ووڈز کی متحیر افسردگی یکدم جڑ سے اکھڑ گئی اور اس نے جان لیا کہ سب کچھ برباد ہونے والا ہے۔ اس نے گولڈ برگ کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اس پر اور اپنے آپ پر لعنت بھیجی کہ وہ اکیلا اس ملاقات کے لیے کیوں نہ چلا آیا۔ یقیناً اس کامیاب سفارت کار اور مقامیوں پر تخصیص کا دعویٰ رکھنے والی گھاگ معاملہ باز عورت سے اندازے کی کوئی سنگین غلطی ہوئی ہے۔ اور یہ مقامی عورت جو کچھ دیر پہلے دھند بھرے جنگلوں میں پھرتی مخلوق لگ رہی تھی اب ایک ایسا جوالا مکھی نظر آ رہی تھی جو اگلے ہی لمحے پھٹنے والا تھا اور اس عورت نے کہا۔

''اگر تم لوگ نامعلوم...... معلوم منشیات اور نامعلوم یا معلوم افرو ڈانسکس پر تفتیش کرنے آئے ہو تو اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہو اور اگر پھر آؤ تو یہاں قانون نافذ کرنے والے مقامیوں کے ساتھ آؤ...... تم جا سکتے ہو۔''

Scanned by CamScanner

زہرہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئی اور ووڈز کی حالت ایسی ہوگئی جیسے اسے کسی قسم کا اعصابی دورہ پڑ گیا ہو۔ دائمی افسردگی، بوکھلاہٹ اور غصے نے مل کر اس کے چہرے کو مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ احتجاج اور التجا کے بیک وقت اظہار نے اس کی آواز کو بھرا دیا تھا "خدا کے لیے۔ خدا کے لیے..... ایسا نہ کہو۔ ہم نے خدا۔ پلیز نہیں..... نہیں..... میں جا نہیں سکتا۔ اتنا قریب پہنچ کر نہیں۔ خواہ تم میرے اوپر اپنے کتے چھوڑ دو..... نہیں۔"

"ووڈز اپنے اوپر قابو رکھو" گولڈ برگ نے سخت تحکمانہ لہجے میں کہا مگر ووڈز پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"مجھے منشیات سے کچھ لینا دینا نہیں اور نہ ان سے..... افروڈ..... میڈم گولڈ برگ..... کو بھی۔ وہ سنی سنائی باتیں بتا رہی تھیں۔ سفارت کاروں کی افواہیں۔ ہاف مین کے المیہ پر کافی سکینڈل بنے ہوں گے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں آرکیالوجی سے زیادہ آرکیالوجسٹس میں دلچسپی لیتا ہوں۔ میں غلام باغ کا معمہ میں دلچسپی لیتا ہوں۔ اس مسودے میں۔ یہ ایک علمی کام ہے ایک اور طرح کا تحقیقی کام ہے۔ آرکیالوجی کی سوشیالوجی ایک نوخیز علم ہے..... آپ میری بات سنیں۔ میری بات سنیں۔ آپ....."

زہرہ گہرا سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئی اور ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گولڈ برگ سے مخاطب ہوئی "میں کس کی بات سنوں ایک معاملہ فہم سفارت کار کی یا ایک اعصاب زدہ سکالر کی۔"

"انتخاب تمہارا ہے مگر میری درخواست یہ ہے کہ موازنہ نہ کرے....." گولڈ برگ نے ٹھنڈے غیر جذباتی لہجے میں کہا اور زہرہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جو اس کے غصیلے ردعمل کی توقع کر رہی تھی، لیکن کرائسس کے لمحوں میں اپنے آپ کو بالکل ٹھنڈا کر لینا گولڈ برگ کی کامیابیوں کے رازوں میں سے ایک راز تھا لیکن اس نے یہ ضرور سوچا۔ آج تک کسی رنگ دار مقامی عورت کے ہاتھوں مجھے ایسی زک نہیں اٹھانی پڑی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قسم کو آگے تک دیکھے گی۔

مائیکل ووڈز کہہ رہا تھا "میں کہہ رہا تھا یہ ایک نوخیز علم....." اور گولڈ برگ نے سوچا "یہ برطانوی چمچکا میری توقع سے کہیں زیادہ احمق نکلا۔"

"نوخیز چیزوں کے جلد مر جانے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ مسٹر ووڈز....." زہرہ نے بھی

ٹھنڈے رہنے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور اندر ہی اندر ہنسی۔ کیا میں اس عورت کا مقابلہ کر رہی ہوں۔

"ایسا خطرہ ضرور ہے مگر یقیناً آپ ایک ناگہانی موت پسند نہیں کریں گے۔ ایسا..... آپ۔ ہم پھر واپس آتے ہیں۔ آپ ہاف مین کے ساتھ کسی دیوانگی کے سفر کسی جنون کی مہم جوئی کا ذکر کر رہی تھیں۔ یقیناً یہ علامات ہیں۔ گہرے معنی رکھنے والے الفاظ ہیں۔ شاعرانہ اظہار کا طریقہ ہے آپ کا....."

زہرہ نے ہاتھ کو جنبش دی اور ووڈز خاموش ہوگیا "شاید ایسا ہی ہو مگر اس شاعرانہ اظہار پر میں مزید کچھ بات کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ شاید جو میں نے کہہ دیا وہ بھی کہنا نہیں چاہیے تھا۔ ہاف مین ہمارا معاملہ تھا..... مادام گولڈ برگ نے درست کہا تھا شروع میں..... کچھ اور طرح کے لوگ جن میں ہاف مین پھنس گیا، وہ میرے علاوہ کچھ اور بھی تھے....."

ووڈز کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ مگر ساتھ ہی اسے بات آگے بڑھتی نظر آئی تو اس نے ملتجی لفظوں میں کہا "میں ان..... دوستوں سے..... اگر وہ..... مجھے..... وقت دے سکیں..... بلکہ یہ تو بہت ضروری ہوگا..... بے حد ضروری۔ آپ بہت عدیم الفرصت ہوں گے میں جانتا ہوں۔ مگر مجھے..... میری درخواست ہے مجھے..... وقت دیں....."

زہرہ سوچ میں پڑ گئی اور ایک بے ساختہ جوش بھری کیفیت اس پر طاری ہوئی۔ کبیر اس پیش رفت پر کیا کہے گا اور ناصر۔ پھر اس نے سوچا کل ناصر کی رہائی پر اس سے ملاقات میں کتنی ہی باتیں اکٹھی ہو جائیں گی۔ مدد علی کو سمبھال لے جانا۔ خود ناصر کی رہائی اور اب یہ ہاف مین کے "غلام باغ کا معمہ" کا معمہ..... اور اس نے کہا۔

"ابھی یہ ممکن نہیں۔ میں..... یہاں نہیں ہوں گی کچھ عرصے کے لیے....."

مائیکل ووڈز نے آہ بھری اور سوچا کہ یہ بات اگر یہ جرمن عورت بگاڑ نہ دیتی تو خدا جانے کہاں تک واضح ہو جاتی۔ پھر اس نے اپنا کارڈ نکالا اور سامنے میز پر رکھا۔

"جب بھی آپ یہاں ہوں۔ براہ کرم مجھے ضرور اطلاع دیں۔ میں خود تو پوچھتا ہی رہوں گا۔ کیا میں آپ کا فون نمبر لے سکتا ہوں؟"

زہرہ نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد نمبر دے دیا۔ گولڈ برگ اب بظاہر بالکل لاتعلق اور

Scanned by CamScanner

عدم دلچسپی سے بیٹھی ووڈز کو دیکھتی تھی پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ووڈز اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے مسودہ بریف کیس میں رکھا اُسے بند کیا اور اس لیے پھر چھن جانے کا بھاری احساس زہرہ پر حاوی ہوا۔

ووڈز نے پوچھا: ''میں صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں...... مس...... یادر......''

''جی''

''اس مسودے میں بھی اور الگ اپنے...... ہاف مین نے...... اپنے اس مسودے میں بھی اور الگ اپنے چھپے ہوئے نوٹس میں بھی کچھ کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ بار...... بار...... جو اصل نام نہیں ہیں۔ مثلاً مونگا سپیرا۔ خصی نواب، خیر یہ تو واضح ہے۔ مگر نظر یہ باز اور ڈاکٹر...... اور...... اور...... ملکہ سبا...... کیا یہ نام ہے......'' پہلی دفعہ ووڈز کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دکھائی دی جو ایک افسردہ مسکراہٹ ہونے کے باوجود کافی دلکش تھی اور مخاطب کے ذہن پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

زہرہ مسکرائی ''میں ہاف مین کے ذاتی ذخیرۂ الفاظ میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی...... اور نہ انہیں اپنے معانی پہنانے کی کوشش کروں گی۔''

''مگر میرے لیے یہ ضروری ہے۔ خدا کی قسم میرے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ اگر میں نے اس مسودے کا معمہ حل کرنا ہے۔ اس کا کچھ حصہ ایک تحقیقی مقالے جیسا ہے لیکن پھر یہ سفرنامہ بن جاتا ہے۔ یا...... شاعری...... یا فرضی تاریخ۔ یا سیدھی سیدھی واہی تباہی...... مجھے...... جاننا ہوگا۔ مجھے آپ کو۔ وقت دینا ہوگا......''

''مسٹر ووڈز'' اب گولڈ مین نے اُسے واضح اشارہ دیا کہ اگر وہ اپنا واہیات تماشہ ختم کر چکا ہے اور یقیناً کر چکا ہے۔ اس لیے انہیں چلنا چاہیے اور وہ چلے گئے۔

OOO

باب(30)

غلام باغ

ناصر نے خط کا پیکٹ کبیر کی طرف بڑھایا اور کہا ''یہ لو تمہارا خط'' کبیر نے زہرہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہمارا خط''

اور زہرہ نے سوچا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ وہ ناصر کے گھر آئی ہے۔ ورنہ کسی زمانے میں تو جب کیفے غلام باغ ہوتا تھا تو اور کسی جگہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھر ناصر کا وارڈ تھا یا کبیر کا گھونسلا۔ پھر گھونسلا جل کر بیت المقدس ہو گیا۔ ناصر اپنے عذاب میں گم ہو گیا اور دنیا میں جیسے مل بیٹھنے کو کوئی جگہ ہی نہ رہی۔

''ہاں...... ہمارا خط......'' زہرہ نے بھی کہا۔

ناصر نے پھر پیکٹ کبیر کی طرف بڑھایا۔

''اصل میں تو یہ تمہارا خط ہے'' کبیر نے کہا۔

''نہیں یہ میرے لیے نہیں تھا، صرف میرے پڑھنے کے لیے تھا۔ وہ میں نے پڑھ لیا تھا۔ اب اس کی تمہیں ضرورت ہوگی۔'' ناصر نے کہا۔

''مجھے تو اُس کی بھی ضرورت ہوگی۔ جو تم نے پڑھ کر اس سے حاصل کیا......'' وہ ہنسا ''کیا کہیں گے جو سبق حاصل کیا۔ مجھے اس کی بھی ضرورت ہے۔''

''سبق تو میرے لیے ہے۔ اسے تو میرے پاس ہی رہنے دو۔'' ناصر نے کہا اور اداسی سے مسکرایا اور زہرہ نے اس کی مسکراہٹ کا مائیکل ووڈز کی اداس مسکراہٹ سے موازنہ کیا اور کہا ''تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو ناصر...... اور ظاہر ہے اس لیے صبر آزما تجربے کے بعد......''

''مجھے راحت ہو رہی ہے کہ تمہارے چہرے کے کھیت کھلیان صاف ہو گئے۔ اور بے گناہی

Scanned by CamScanner

ثابت ہونے پر اور باعزت رہائی پر....'' کبیر نے زہرہ کی بات کاٹ کر کہا۔

''بے گناہی ثابت کرنا بیرسٹر اظہر جعفری کا کمال تھا اور باعزت رہائی نام کی کوئی چیز نہیں۔ فرد جرم..... قید..... جو ذلت ہے۔ وہ داغ جو کوئی باعزت رہائی دھو نہیں سکتی''۔

کبیر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے ''مگر ذلت کے تجربے سے تو تم نے کئی مابعد الطبعیاتی عرفان حاصل کیے تھے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا جب جیل میں ہماری ملاقات ہوئی تھی تم نے ذلت کے تجربے کی ماورائی سمتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور وہ بہت متاثر کرنے والا تھا میں تمہیں بتا دوں۔ مگر اب تم بالکل افادی لوگوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ زہرہ؟'' کبیر نے اپنی بات کی تائید کے لیے اس کی طرف دیکھا۔

مگر زہرہ گفتگو میں رہنے کے ساتھ ساتھ کمرے کا اثر بھی لے رہی تھی کسی تنقیدی ارادے کے بغیر۔ اسے لگا کہ یہ ڈرائنگ روم بتاتا ہے کہ اس گھر کے مکین آنے والوں کے بارے میں کچھ زیادہ متفکر نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ کوئی گندا اور بے ہنگم غیر آراستہ کمرہ تھا۔ بس وہ ایک سیدھا سادھا، خنک، نارمل اور تعدیل زدہ کمرہ تھا جس کی سب سے نمایاں بات یہ تھی کہ اس میں کچھ بھی نمایاں نہیں تھا۔

''سوائے ہم تینوں کے'' زہرہ نے سوچا اور کبیر کی بات پوری طرح سمجھنے کے باوجود اس پر کچھ بات کرنے کی بجائے اس نے کہا ''تم جاب پر کب جا رہے ہو ناصر''

اور ناصر نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ جو اس کے اندر تھا وہ جیل کے بعد ان کی پہلی ملاقات میں ہی باہر آ جائے۔ شاید غیریت کی انتہائی منزل تک ایک ہی جست میں پہنچنا میری امت سے باہر ہے مگر جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرنے کے بعد ہی سہی۔ اس نے سوچا۔

''میں یہ ہسپتال کی جاب چھوڑ رہا ہوں۔ میں سائیکیاٹری کا کاروبار ہی چھوڑ رہا ہوں۔ میں کسی جگہ چھوٹی سی دوکان کھول کر صرف بیمار جسموں کا علاج کر کے روزی کمانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''آہ'' کبیر نے اپنے مخصوص اضطراب کو ظاہر کیا۔ ''یہ دلچسپ ہے مگر یہ کوئی چھوٹی سی دوکان کھولنا کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔ اور اس پر ہم ابھی بات نہیں کریں گے۔ کرنے کی بات یہ

ہے کہ تمہیں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے اور اس تبدیلی کا موقع خدا نے مہیا کر دیا ہے۔''

ناصر نے سوچا کہ یہ شخص اب بھی وہی ہے ہر لمحے اپنے کایا کلپ کے ڈراموں میں دوسروں کے لیے کردار لکھنے والا شیطانی ہدایت کار..... پھر اس نے سوچا یہ جو فقرہ جو بات اس کے ذہن میں آتی ہے کیا وہ ابھی کہہ دے..... نہیں نہیں۔ ابھی نہیں اور اس نے کہا ''میں سمجھا نہیں''

''یہ اس خط سے آگے کی باتیں ہیں۔'' کبیر نے کہا اور پھر اس نے ناصر کے سامنے اس واقعاتی دنیا کی پھر تخلیق کی جو بلڈوزروں کی آوازوں سے شروع ہوتی نشان زدگی کے نزول سے گذر جاتی تھی اور ننگے افلاطون کی موت کے بعد کی خاموشی کو مدعلی کے گونگے کلام سے پُر کرتی ہاف مین کی باقیات تک جا پہنچی تھی۔

''مدعلی کو جاب پر لگانے کے بعد ہم..... اس برطانوی..... کیا نام بتایا تھا تم نے....''

''مائیکل ووڈز.....'' زہرہ نے کہا اور وہ مسلسل ناصر کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں مائیکل ووڈز کے اداسی کے نغمے سنیں گے اور اسے بتائیں گے۔ کہ غلام باغ کا معمہ ہمارا ہے۔ لالکھائی کا ہر مسودہ ہمارا ہے۔ پھر تمہاری چھوٹی سی دوکان پر بات ہوگی تفصیل سے۔''

ناصر نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی اور اپنے آپ سے کہا ''میرے خدا۔ سکرپٹ لکھا جا چکا ہے۔ اور کس قدر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ہر کردار ہر مکالمہ ہر حرکت لکھی جا چکی ہے۔ مگر یہ اس شخص کی آخری تمثیل ہوگی اور کسی کردار کے لیے تمثیل آخری ہو جاتی ہے عدم شمولیت سے یا اپنی شمولیت کو ہی برباد کر دینے سے۔'' پھر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ دوسرا اور آخری رستہ ہی اُس کے لیے کھلا ہے اور یک دم اٹھ کھڑا ہوا ''میں چائے لاؤں'' اُس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔

''گذرے ہوئے کو۔ جسے تم جانتے ہو اسے دوسرے تک ایسے پہنچانا کہ کچھ بھی ضائع نہ ہو کس قدر مشکل ہے۔'' کبیر نے کہا۔

''نہیں یہ مشکل نہیں۔ ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن ہے۔'' زہرہ نے کہا۔

''ہاں شاید ایسا ہی ہے۔ بلکہ..... ایسا ہی ہے..... یہ ناممکن ہے....'' وہ خشک ہنسی ہنسا۔

Scanned by CamScanner

''ناممکن سوالوں میں الجھے ایک زمانہ بیت گیا۔''
''ہاں مگر کیا ایک وقت ایسا آتا نہیں کہ ناممکن بھی بالکل ہی ناممکن ہو جاتا ہے'' زہرہ نے بے چینی سے کبیر کی طرف دیکھا اور پھر کہا ''پتہ نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں......''

''تم جو کہہ رہی ہو میں سمجھ رہا ہوں'' کبیر نے کہا ''میں......''

''تم نے دیکھا تھا؟'' یک دم زہرہ نے کہا۔

''کیا؟''

''جو میں نے دیکھا...... جب تم اپنی ترنگ میں اپنی داستان سنا رہے تھے۔''

''ہاں نشان زدہ داستان......''

''تو میں ناصر کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا ایک دفعہ بھی...... اور وہ...... تمہاری طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا......''

''تو......؟''

دروازے پر کھٹکا ہوا اور ناصر چائے کی ٹرالی دھکیلتا اندر لے آیا۔

''کاش تم نے اس برطانوی بڈھے سے ہاف مین کا مسودہ لے لیا ہوتا۔'' کبیر نے ایسے ہی کوئی بھی بات کر دی۔

''اس جرمن شارک کی موجودگی میں ناممکن تھا۔'' زہرہ نے 'کوئی بھی' کا جواب دے دیا اور چائے بنانے لگی۔ ناصر بیٹھ گیا اور کبیر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''مدد علی اب بھی میرا کیس ہے اور یہ جو منصوبہ تم نے اُس کے بارے میں پہلے ہی بنا رکھا ہے اور اکیلے ہی اُس کا ذکر کرتے رہے ہو۔ میں...... ضروری نہیں میں اس سے اتفاق کروں۔ اُس کے معالج کی حیثیت سے میں اس کے علاج سے دست بردار نہیں ہوا۔''

کبیر خاموش رہا اور زہرہ خاموشی میں ہی خاموشی سے چائے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھتی رہی اور کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا جیسے کسی میں بولنے کی سکت نہ رہی ہو، یا گفتگو۔ کلام یک دم دنیا سے اٹھ گیا ہو۔ جیسے وہ کسی سناٹے کی خلا میں تین گونگے نقطے ہوں اور ایک دوسرے سے یکساں رفتار کے ساتھ دور ہٹتے جا رہے ہوں۔ اور وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ آخر کبیر نے خالی پیالی میز پر رکھی اور ناصر نے پوچھا۔

''مدد علی اب کہاں ہے؟''

''میرا خیال ہے اپنے بھائی کے گھر۔ عاشق علی کے گھر۔''

''میرا تو تم جانتے ہو عرصے سے بیرونی دنیا سے رابطہ نہیں رہا تھا۔''

''مگر اس عرصے میں اندرونی دنیا سے تمہارا رابطہ...... میرا خیال ہے...... بہت گہرا اور بہت مختلف رہا ہے'' کبیر نے رُک رُک کر کہا۔

ناصر کا جواب فوراً سامنے آیا۔ ''گہرے کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا یوں بھی خیالات اور کیفیات کی گہرائیاں ماپنا تم لوگوں کا کام ہے میں تو......''

زہرہ نے شدت سے ناصر کی بات کاٹی۔

''تم یا تو میری بات کرو۔ یا کبیر کی بات کرو۔ الگ الگ بات کرو۔''

ناصر کی مسکراہٹ عجیب تھی۔ اس نے میز پر رکھے خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس تحریر یا اس خط کے بعد بھی...... ایسا ممکن ہے۔ الگ الگ بات کرنا''

خاموشی ایک مرتبہ پھر غالب آ گئی۔ مگر پہلے سے مختلف۔ خاموشی کے خلا میں اب تینوں گونگے نقطوں کی رفتاریں اور سمتیں بے ترتیب ہو گئی تھیں اور کوئی نقطہ کسی بھی دوسرے سے ٹکرا کرتا ہو سکتا تھا۔

ناصر کی بات نے زہرہ کے لیے احساس کا ایک ایسا لمحہ تخلیق کیا جو کبھی بھی اس کی زندگی میں نہیں آیا تھا۔ کبھی اُس کے خیالی تجربے میں سے بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ احساس ایسا ہی تھا جو اس شخص کا ہوگا جس کے سامنے اُس کے کسی ناجائز تعلق کے ناقابل تردید ثبوت کھول کر رکھ دیے جائیں۔

زہرہ کچھ نہ بولی کبیر نے گہرا سانس لیا اور پھر ایک بسکٹ کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور پھر وہ اس کے گھلنے پر اسے منہ میں گھماتا اس کے نمکین اور میٹھے ذائقوں کو الگ الگ کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ پھر اس نے میز سے خط اٹھایا اور کہا۔

''اس خط کے بعد...... کیا ایسا ممکن ہے؟ واقعی...... یہی بات دیکھنے کی ہے کہ اس خط کے بعد کی دنیا میں کیا کچھ ممکن ہے...... کچھ تو وہ تھا جو بلند وزر کی آواز کے بعد ممکن ہونا شروع ہوا تھا اور ہوتا چلا گیا تھا اور اُسے جس حد تک بھی۔ تم تک پہنچانا ممکن تھا میں نے کوشش کی۔ پھر زہرہ کے گھر گورے آئے اور اس سے آگے بھی کچھ ممکن نہ ہوا...... اور تمہارے لیے ڈاکٹر اس خط کے بعد

Scanned by CamScanner

کیا صرف اتنا ممکن ہوا کہ تم نے میرے اور زہرہ کے درمیان تمیز کرنا چھوڑ دیا؟"

"یہ پھر اب اپنی اسی اوقات پر آ گیا ہے۔ اپنی چکرانے والی تھرے بازی کی شعبدہ بازی پر اتر آیا ہے۔ مگر اب اور نہیں۔ میرے خدا، اب اور نہیں....." ناصر نے سوچا مگر کہا "تم لوگ یہ بھول رہے ہو کہ میں اس خط کی دنیا کی تخلیق میں شامل نہیں۔ میرا اس سے رشتہ ویسا ہی ہے جیسا تم نے متعین کیا یعنی ایک مجہول منفعل قاری کا رشتہ۔ اس لیے میرے لیے جو دنیا وغیرہ تم کہہ رہے ہو، وہ زیادہ سے زیادہ اس تحریر سے میرے انفعالی رشتے کے بعد کی دنیا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے" زہرہ نے یک دم شدت سے کہا "وہاں جو کچھ ہوا اس کی شدت۔ اس کے تحیر اور اس کی سفاکی کا تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ میں جو عمر بھر اپنی اصل کے گمشدہ رومانی تجربے کی تلاش میں تھی۔ مجھے آخر علم ہوا کہ اصل..... اصل میں کچھ بھی نہیں۔ مگر اس علم کا حصول زندہ انسانوں کا قیمہ بنتا دیکھنے کے بعد ہوا....."

"اور یہ ایک"..... کبیر نے کہنا چاہا۔

"تم خاموش رہو کبیر" زہرہ نے چیخ کر کہا۔

"نہیں کبیر کے خاموش رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح تو یہ باہم مربوط تحریر لکھی گئی ہوگی۔ آدھی بات تم نے کی اور باقی آدھی کبیر نے مکمل کی" ناصر نے مسکرا کر کہا اور زہرہ اس کی بات پر اور اس کی مسکراہٹ پر یک دم صدمے سے بھر گئی۔ اور کچھ نہ بولی۔

کبیر مسکرایا۔

"اب جبکہ میری بجائے تم خاموش ہوگئی ہو اور میری آدھی خاموشی کو اپنی آدھی خاموشی سے مکمل کر رہی ہو اور اب جبکہ ناصر نے ہمارے اسلوبِ مکتوب نگاری کی اصل تکنیک کو پکڑ ہی لیا ہے تو میں بولتا ہوں" اور اس نے ناصر کو مخاطب کیا "میری جان۔ یہ جو تم باہم مربوط تحریر کہتے ہو تو اس کی باہم مربوطی بروزن لولی میں وہ بھی ہے جس کے نہ ہونے کے وقفوں میں یہ لکھی گئی۔ بھورے کی خاموشی کے وقفوں میں جب ہم اس کے کلام یا اس کی موت کا انتظار کرتے تھے تو اسی وقت ہم تمہیں اپنے آپ کو مخاطب کر کے اپنا حال احوال بلکہ حالِ زار بیان کرتے تھے۔ جو بیت رہی تھی اس پر ایک دوسرے کا سر دھنتے تھے تو..... میری آدھی اور زہرہ کی آدھی کے بیچ بھورے بادشاہ کی نحیف و نزار نبض اور آگے پیچھے اس کے مکاشفات اپنی گونج دیتے تھے تو اس طرح یہ

کلام نرم و نازک منصۂ شہود پر آیا۔ مگر اے واے کہ یہ بے اثر رہا۔"

ناصر مسکرایا۔ "میرے مرد ناداں ہونے میں کوئی کلام نہیں۔" اس نے کہا۔

"بلکہ ایک نادان مرد ہونے میں بھی....." زہرہ نے کہا اور ناصر کا چہرہ ایک لمحے کے لیے پھیکا پڑ گیا اور کبیر نے کہا "تو اس کا مطلب ہے کہ ہم دو دنیاؤں میں بٹ چکے ہیں۔ اس خط کے بعد کی دنیا والے اور اس خط کی خواندگی کے بعد کی دنیا والے۔"

"خط کے بعد کی دنیا کا اہم ترین واقعہ..... قاتلانہ حملے سے تمہارا بال بال بچ نکلنا ہے.........." ناصر نے کہا اور کبیر ہنس پڑا۔

"آ..... ہم اسے قاتلانہ حملے سے بال بال بچ نکلنے کی طرح کے بھدے، صحافتی، غیر رومانی انداز میں بیان نہیں کرتے بلکہ..... ہم کہتے ہیں کہ ہم ایسے نشان زدہ لوگ ہیں جنہیں حاصر ابھی واپس قبول کرنے پر تیار نہیں....."

خاموشی پھر اتر آئی مگر اس بار کوئی تکون زیادہ دیر برقرار رہی۔ ناصر نے گہری سنجیدگی سے کہا "اس کے لیے میں حاصر کا شکر گزار ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

زہرہ نے ناصر کی آواز میں شدید جذباتی لرزش کو محسوس کیا اور اسی لمحے کسی احساسِ جرم کے دائرے میں گھر گئی مگر اس سے بھی بڑا اور اس شدید احساس کا تھا کہ آخر یہ کیا احساس ہے۔ پھر وہ مسکرائی اور بولی "اور خط پڑھنے کے بعد کا اہم ترین واقعہ ظاہر ہے کہ تمہاری رہائی ہے۔ اور ان غلیظ گھناؤنے الزامات سے بریت ناصر جن کے تصور سے ہی میرا خون کھول جاتا تھا۔ میں اُبکائی کی زد میں آ جاتی تھی میں جو تمہیں اسی لمحے آزاد دیکھنا چاہتی تھی۔"

"کیا واقعی....." ناصر کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے اور وہ بے چین سا ہو کر اٹھ گیا اور اس کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جو اس کے گھر کے صحن کی طرف کھلتی تھی۔ گھر میں پچھلے پہر کی دھوپ منڈیر کے اوپر سے گزرتی گزر رہی تھی اور اس کی ماں صحن میں ادھر ادھر پھرتی ان گنت چھوٹے موٹے کام کرتی پھر رہی تھی۔ شام اس نے اپنی ہم عمر محلے دار عورتوں کو بیٹے کی رہائی کی خوشی میں چائے پر بلایا ہوا تھا۔ ناصر گہرے گہرے سانس لیتا اسے دیکھتا رہا۔

کبیر نے ایک اور بسکٹ پر ہاتھ صاف کیا اور زہرہ سے کہا "تمہیں یاد ہے بھورے بادشاہ کے کھنڈرے میں۔ کھنڈرے کے وہ دن اور راتیں ہم نے بخش بسکٹوں پر گزارہ کیا تھا۔"

Scanned by CamScanner

زہرہ ہنسی "مگر اردو تو میں نے کیا تھا تم تو ہڑپ کرتے رہتے تھے۔" اس نے کہا پھر یک دم عجیب سے لہجے میں بولی "مُندری آخر ان بچے کھچے لوگوں کو کہاں لے گیا ہوگا؟" اور ناصر نے سنا اور ایک جھرجھری اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ کبیر کوئی جواب دیتا وہ مڑا اور کہنے لگا۔

"تمہیں ان طوفانی بارشوں کے دن یاد ہیں؟"

"ظاہر ہے انہیں کون بھول سکتا ہے" زہرہ نے کہا مگر اس کے چہرے پر ابھی تک کہیں اور ہونے کے تاثرات تھے۔

"اور جو میرے لیے کبیر مسلم کے دن تھے اور زہرہ پنکھا کرتی تھی" کبیر نے کہا اور سوچا شاید یہاں میں نیا ہوا ہے، ایسا کبھی ہوا نہیں، نہ کوئی کسی کی بات سن رہا ہے اور نہ ہی کوئی سنانا چاہتا ہے۔

"تم نے کچھ کہا کبیر" اچانک زہرہ نے کہا۔

"یہاں سب پانی تھا۔ اتنا بلند۔" ناصر نے کھڑکی کے نچلے حصے کو ہاتھ سے چھوا۔ "اور باہر جو گلیوں سے باہر دور جو بڑی سڑک ہے وہاں سے جب کوئی بڑی گاڑی پانی کو کاٹتی گذرتی تھی تو پانی میں اس کی دھمک یہاں تک پہنچتی تھی گلیوں میں سے ہوتی ہوئی اور یہاں پانی شراپ شراپ کرتا تھا۔"

"اور رات کے سناٹے میں تو وہ آواز عجیب لگتی ہوگی۔" زہرہ نے تخیل سے وہ منظر دیکھ لیا۔ اور واپس آ گئی۔

"ڈراؤنی" ناصر نے کہا۔

"پانی کی دھمک...... آہ...... یہ اچھا ہے......" کبیر نے کہا۔

خاموشی پھر آئی مگر بہت مختصر کہ جیسے وہ جانتے ہوں کہ اب یہ جو آئی ہے تو ذرا دیر بھی آگے چلانے والی نہیں۔ یک دم ناصر نے بدلے ہوئے لہجے اور قدرے اونچی آواز میں کبیر سے کہا۔

"میں نے تم سے مدثر علی کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"ہاں...... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اگر اب بھی کہو گے کہ اس کا علاج ممکن ہے اور اسے کسی روحانی نجات گھر میں منتقل کرنا اس کی ذہنی و جسمانی حالت کو سمیٹنے کے لیے ضروری نہیں ہے اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو میں اُسے اُس کے اور تمہارے حال پر چھوڑ دوں گا اور بھورے

بادشاہ کے مکاشفات اور یہ خط جس کی ملکیت قبول کرنے سے تم تو مصر ہو انہیں اپنے بستر کے سرہانے رکھ کر گہری نیند سو جاؤں گا اور پھر کسی لمحے زہرہ کی ٹیلی فون کال مجھے بتائے گی کہ مائیکل وولز آ گیا ہے اور ہم پر اپنے پیارے آنجہانی باقی مین کے گمشدہ مسودے تلاوم باغ کا معنی کی بازیابی کا وقت آن پہنچا ہے۔ پھر اس بازیابی کے بعد میں اور کہانی کے تینوں شاہکاروں کو اپنے سر کے گرد لپیٹ کر گہرے مراقبے میں چلا جاؤں گا اور تلاوم باغ کے نئے زاویے خواب دیکھنے کی کوشش کروں گا اور پھر پتہ نہیں میرے ساتھ کیا ہوگا۔ امکانات اور ناممکنات دونوں ختم ہو رہے ہیں" ناصر نے خط کا پیکٹ پھر اٹھایا اور کبیر کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہاری امانت ہے۔"

"شکریہ" کبیر نے ہنس کر کہا۔

"اس کے علاوہ بھی ایک امانت......" ناصر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیسی امانت......" زہرہ نے چونک کر پوچھا پھر اپنے چونکنے پر اسے حیرت ہوئی۔

"کچھ نہیں...... ٹھیک ہے میں نے مدثر علی کو عرصے سے دیکھا نہیں عاشق علی کے گھر تک جانا پڑے گا اور جگہ بھی اب ٹھیک سے یاد نہیں۔"

کبیر اٹھ بیٹھا۔ "اس خاکسار کو یاد ہے۔ اگر زہرہ کو نہیں بھی یاد...... تیز ہوا کی شام وہ ہمیں اپنی انہونی کہانی سنانے اپنے گھر ہی لے گیا تھا۔"

"میرے لیے اب یہ کہنا مشکل ہے۔ جھوٹی کہانی۔ شاید نہیں" زہرہ نے گہری اداسی سے کہا۔ کبیر نے اسے دیکھا اور کچھ نہ بولا۔

"چلیں...... پھر...... مدثر علی کے" ناصر بولا اور وہ اٹھ گئے۔

O

"وہ تو جی پاگل اُسی پاگل نرس کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ دروازے کے پٹ کے پیچھے کھڑی عورت نے انہیں بتایا جو عاشق علی بیرے کی بیوی تھی۔ شادی شدہ زندگی کے ان گنت موسموں کی کھائی ہوئی مار اس کے چہرے پر ایک خود حفاظتی مظلومیت کی شکل میں رچ بس چکی تھی اور تھکن کے سامنے ہارے ہوئے مگر پھر بھی مسلسل ٹھہرے ہوئے جسم میں زندگی اور ماندگی ایک دوسرے کو سہارا دیتی نظر آتی تھیں۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عورت ان کو پھر جانچنے لگی کہ وہ کون لوگ ہیں۔

اُس عورت اور ایک مرد کو دیکھ کر بار بار اسے یاد آتا تھا کہ انہیں اس نے کہیں دیکھا ضرور ہے۔

"کب..... اس نے ایسا کیا؟" کبیر نے پوچھا اور اس کی آواز سنتے ہی عورت کو سب یاد آ گیا۔ پہچان لینے کے بعد اُس کے چہرے کی کرختگی میں بھی کچھ کمی آئی۔

"اب تو کافی عرصہ ہو گیا ہے جی آپ کو تو پورا اندازہ ہو جائے گا جی جس رات..... اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ جب آپ بی بی کے ساتھ نہیں آئے تھے اور کوٹھڑی میں ساری رات اُس سے باتیں کرتے رہے تھے عاشق علی سے۔ بڑی آندھی طوفان آیا تھا اس رات..... یاد ہے جی....."

"ہاں..... یاد ہے....." زہرہ نے جواب دیا۔

"تو بس..... اس سے اگلے دن..... وہ چلا گیا..... اب سنا ہے اسی کے ساتھ رہتا ہے۔"

"اِسے کی صحت بڑی پکی ہو گئی ہے ماں۔ کل میں نے اسے سائیکل پر دیکھا تھا۔ منہ کافی موٹا ہوا ہوا تھا۔" ایک دس سالہ بچے نے اچانک پٹ کے پیچھے سے نکل کر اطلاع دی۔

"ہاں..... سنا ہے وہ ساری اپنی کمائی اسی پر لگاتی ہے۔ جو کہتا ہے کھلاتی ہے....." عورت نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔ بچے کے چہرے پر تحیر اور اشتیاق کی لہر ابھری۔ "ماں۔ کیا کھلاتی ہے کچھ بھی؟ پوریاں..... مچھلیاں..... کیلے، ٹافیاں بھی....."

"پتہ نہیں کیا کھلاتی ہے۔ کسی دن زہر بھی کھلا دے گی۔ دیکھ لینا..... تو چل شہزادے اندر....."

شہزادہ اپنے مفرور باپ کے بارے میں ہونے والی دلچسپ گفتگو اور آئے ملاقاتیوں کو چھوڑ کر اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ عورت نے پھر ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ اب وہ اور کیا جاننا چاہتے ہیں۔ عاشق علی کے بارے میں بنیادی معلومات وہ فراہم کر چکی ہے۔

"پر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

ناصر جو عورت کی باتیں سن کر کسی خوفناک سنجیدگی کا شکار ہو گیا تھا اور جس سنجیدگی پر عورت کے بچے کی پُرلطف باتوں سے بھی کچھ فرق نہیں پڑا تھا اور زہرہ نے یقیناً چند لمحوں کے لیے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی ذہنی جھٹکے کی کیفیت میں ہے۔ اب عورت کے کھلے استفسار پر وہ چونکا۔ کبیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور زہرہ بھی ایسے کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ اب تمہیں ہی یہاں ہماری آمد

کا اصل مدعا بیان کرنا چاہیے۔

"وہ..... بی بی بات اصل میں یہ ہے کہ..... ہم ویسے تو عاشق علی سے..... تو خیر ملنا ہی ہوتا۔ مگر اس لیے کہ..... ہم اس کے بھائی مدد علی کو دیکھنے آئے ہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں اور مدد علی کا علاج میں کر رہا ہوں۔ عاشق دوائیاں لاتا تھا۔ مجھ سے....."

پہچان کی ایک اور لہر عورت کے چہرے پر نمودار ہوئی جس میں اچانک امید کی چمک بھی تھی..... "او..... اچھا جی آپ جی..... آپ وہ ڈاکٹر ہیں..... اُدھر ہسپتال میں ہی تو سب کچھ ہوا....." پھر وہ یک دم خاموش ہو گئی..... اور دروازے سے ہٹ کر بولی۔ "آ جائیں جی..... دیکھ لیں اُسے جی....." پھر اس نے بچے سے کہا۔ "شہزادے جا تائے کو جگا....."

"وہ سوتا کب ہے جو جگاؤں..... اور پھر جن آ گیا تو؟" شہزادہ گھر جانے کی بجائے گلی میں بھاگ گیا۔

مدد علی انہیں ایک تنگ برآمدہ نما کونے میں ملا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے سامنے ٹانگیں پھیلائے پڑا تھا۔ کونے میں باسی غذا کی سڑاند اور مدد علی کے لباس سے اٹھتی گھٹی بو تھی جو شاید مدتوں سے دھلا نہیں لگتا تھا۔ عورت پر نظر پڑتے ہی اس نے فوراً پاس رکھے ایک ایلومینیم کے برتن کو زور زور سے فرش پر مارنا شروع کر دیا۔

"بس اب جو بختی آئی ہے" عورت نے روہانسی آواز میں کہا "اب یہ سوتا نہیں ہے اور ہر وقت کھانے کو مانگتا رہتا ہے۔ میں کہاں سے لاؤں۔ اتنا کھانا۔ جنات ہیں جو کھا جاتے ہیں۔ اکیلا بندہ تو کھا نہیں سکتا اتنا۔"

ایک جبلی سے خوف کی ایک لہر زہرہ کے جسم میں دوڑ گئی۔ پھر اس عورت نے یک دم رونا شروع کر دیا۔ اُس کا مظلوم اور رُلا ہوا اعتماد اس طرح اچانک ٹوٹا تھا کہ زہرہ کا خوف رہتے میں ہی رہ گیا اور حیرت میں بدل گیا۔ وہ ناصر کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

"اللہ رسول کے لیے۔ ڈاکٹر صاحب..... اسے لے جائیں۔ میں اس کا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ جنوں کو کون کھلا سکتا ہے۔ میں بچے پال لوں گی۔ اس کا بھائی مرے مرژدہ اس مردار کے ساتھ..... مجھے کچھ پرواہ نہیں..... پر اسے لے جائیں۔ ہسپتال لے جائیں جی۔ کہیں لے جائیں۔ میں منت کرتی ہوں۔"

زہرہ نے اس کے شانے کو تھپکا اور بولی "ہم ایسا ہی کریں گے...... تم فکر نہ کرو...... مت رو...... اسے لے جائیں گے۔ تم اگر کچھ کام کر سکتی...... مجھے بتاؤ...... گھر...... میرے...... بس اب رو نہیں۔"

عورت خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکا تو وہ بہت مختلف سی نظر آنے لگی۔ ایلومینیم کے برتن کی مسلسل کھٹ کھٹ اعصاب کو جھنجھلا رہی تھی۔ عورت نے برتن مدد علی کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیا۔

"ہم اسے ایک ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں یہ بہت خوش رہے گا۔ کچھ بھی کرے گا پھر بھی خوش رہے گا اور اس کے اردگرد بھی لوگ خوش رہیں گے۔ ناصر تم........... تمہیں کوئی......؟"

کبیر نے سوالیہ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔

ناصر نے کندھوں کو غیر محسوس سی جنبش دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "...... ہاں...... میں...... سمجھتا ہوں...... ان حالات میں...... جب کہ میں سائیکیاٹری وارڈ جنرل ہسپتال سب چھوڑ رہا ہوں۔ ان حالات میں......"

اور پھر وہ بات بظاہر ادھوری چھوڑ کر مدد علی کے قریب چلا گیا اور اس کے پاس اکڑوں بیٹھ کر اس کی آنکھوں کو تشخیصی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی نبض کو جانچنے کے بعد اس نے اسے مخاطب کیا۔ "مدد علی"۔

اور پھر جیسے کسی ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دب جاتا ہے۔ یک دم مدد علی کے منہ سے دو مختلف قہقہوں کی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ اور وہ کبیر اور ہاف مین کے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔ پھر ہاف مین کی آواز آئی......

"میرے خدا...... یہ...... یہ کیا...... کیا نکلا ڈاکٹر......"

اور پھر قہقہوں کے بعد کبیر کی آواز آئی...... "میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں ڈاکٹر تم دنیا کے واحد ڈاکٹر ہو جس کے علاج کے نتیجے میں سونے کا سکہ برآمد ہوا ہے۔"

اور پھر قہقہے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ زہرہ آسیبی کیفیت میں تھی۔ کبیر کے چہرے پر کسی ناقابل فہم طمانیت کے آثار تھے اور ناصر کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

"یہ...... یہ...... کیا تھا...... میں نہیں جانتی......" زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ زہرہ سے پہلے کے زمانے کا واقعہ ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ یہی واقعہ فساد کی جڑ تھا جس نے واقعات کی شریفانہ رفتار کو حرام کر دیا تھا تو غلط نہیں ہوگا۔" کبیر نے کہا۔

"ہر واقعہ ہی فساد کی جڑ بن سکتا ہے۔" ناصر کے لہجے میں ایک نامعلوم سی دھمکی تھی۔ پھر اس نے عورت سے کہا "میں کل اسے لے جاؤں گا گھبراؤ نہیں۔ بس آج رات کی بات ہے۔"

وہ جب باہر گلی میں آئے تو ناصر نے کہا "میں اسے کل لے کر آ جاؤں گا......"

"میری طرف ہی لے آنا۔ بیت التقمص میں۔" کبیر نے کہا۔

"نہیں...... میں اسے وہیں لاؤں گا...... ہسپتال۔ جہاں تم کہتے ہو۔"

کبیر اور زہرہ نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اس غیر متوقع سی بات پر ایک مایوسی ان پر چھا گئی۔

"تو تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے......" زہرہ نے پوچھا۔

"نہیں...... یہ ضروری نہیں" ناصر نے کہا "میں اسے لے آؤں گا۔ تم فکر نہ کرو سب انتظام ہو جائے گا۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں...... کیا تمہارا خیال ہے میں اسے کہیں اور لے جاؤں گا۔"

"نہیں میرا ایسا کوئی خیال نہیں۔ میں تمہیں سمجھتا ہوں تمہیں کہاں پہنچنا ہے۔"

کبیر نے کہا اور اسے اپنی آواز عجیب دکھ بھری محسوس ہوئی۔

"مجھے جنرل ہسپتال کے سامنے ڈراپ کر دینا۔" ہسپتال کی راہ جانے کے بعد ناصر نے زہرہ سے کہا۔ زہرہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

O

جنرل ہسپتال کے سائیکیاٹری وارڈ کے آفس سپرنٹنڈنٹ اور ڈاکٹر ناصر کے درمیان اس پیچیدہ مسئلے پر بحث ہوئی کہ اگر ایک سرکاری ملازم معطل ہو پھر بحال ہو اور پھر وہ استعفے دینا چاہے تو اس عمل کے مختلف مراحل کیا ہوں گے۔

"ڈاکٹر صاحب آپ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں کہ آپ جب جیل...... میرا مطلب ہے جب آپ معطل تھے تو ادھر پیچھے وارڈ میں بھی انہوں نے ساری انتظامیہ تبدیل کر دی عملہ تبدیل کر دیا آپ کی جگہ نیا ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔"

Scanned by CamScanner

"الماس صاحب مجھے کیا لینا دینا ئی انتظامیہ سے نئے عملے سے نئے ڈاکٹر سے جو بندہ جا ہی رہا ہے۔ استعفیٰ دے رہا ہے۔ اس کا کیا تعلق ان معاملات سے......"

سپرنٹنڈنٹ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "دیکھیں ڈاکٹر صاحب۔ استعفیٰ کا بھی ایک پروسیجر ہوتا ہے۔ دیا جاتا ہے۔ منظور ہوتا ہے۔ لکھت پڑھت ہوتی ہے۔ کوئی چارج دینا دلانا۔ کوئی بقایا جات اور پھر آپ یہ تو چاہیں گے ناں کہ ہسپتال سے آپ کو اچھے چال چلن کا سرٹیفکیٹ مل جائے جو جھوٹے الزامات تھے ان کی کیا کہتے ہیں تردید ہو جائے۔ آگے بھی تو کہیں نوکری کریں گے......"

"آگے پتہ نہیں کیا کروں گا۔ بہر حال نوکری نہیں......"

"کلینک...... پرائیویٹ......"

"کلینک...... اسپشلسٹس کے ہوتے ہیں۔ میرے جیسے جی پی...... کی دکان ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے الماس صاحب...... اجازت دیں میں استعفیٰ کل......"

سپرنٹنڈنٹ نے یک دم ناصر کے بازو کو جیسے گرفت میں لے لیا۔ "ادھر جی۔ بیٹھیں...... بیٹھیں...... کہاں جا رہے ہیں۔ کوئی دو گھڑی غریبوں کے پاس بھی بیٹھ جائیں چائے منگوائی ہے۔ قسم خدا کی آپ کو واپس دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی ہے بیان سے باہر...... ہم تو سر جی ویسے ہی آپ کے مرید ہیں...... جیسے آپ نے میری بھتیجی کا بغیر کسی دوائی کے علاج کیا تھا...... آپ کی قابلیت تو ہم جانتے ہیں ناں سر...... پر اب تو...... تختہ ہی الٹ گیا ہے۔ کرسی ذرا آگے کر لیں۔"

ناصر نے کرسی آگے کھسکائی وہ سپرنٹنڈنٹ کی اس عادت سے بخوبی واقف تھا کہ رازدارانہ باتیں وہ سرگوشیوں میں کرتا تھا۔

"میں عرض کر رہا تھا۔ ادھر تختہ ہی الٹ گیا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"کیوں کیا ہوا؟" ناصر نے بھی اپنی آواز کو سرگوشی بنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"بس جی بجلی خانہ کھل گیا ہے وارڈ میں۔"

"کیا مطلب۔"

"بس جی کرنٹ پہ کرنٹ۔ تھاہ کرنٹ۔"

"کیا مطلب الماس صاحب۔ میں سمجھا نہیں۔"

"جھٹکے جی بجلی کے...... مریضوں کو......"

"او...... آئی سی...... E.C.T. "

"جی جناب...... دو نئی مشینیں منگوائی ہیں جو نئے پروفیسر صاحب آئے ہیں انہوں نے پالیسی دی ہے۔ ہم نے مریضوں کا علاج کر کے یہاں سے نکالنا ہے۔ انہیں یہاں پالنا نہیں...... وہ جو آپ کی جگہ آیا ہے چھوٹا۔ وہ تو نرا قصائی ہے۔ کہتا ہے۔ (میں نے سائن کروانے گیا تھا) ہر دماغی مریض خطرناک مریض ہوتا ہے۔ خطرناک مریضوں کے کرنے پھر آباد کروا دیتے ہیں۔ مریض آتا بعد میں ہے کرنٹ پہلے لگواتا ہے......"

ناصر نے ٹھنڈا سا سانس لیا "آسان طریقہ ہے الماس صاحب۔ کبھی نتائج بھی دیتا ہے۔ مگر مریض کے لیے خطرناک ہے......"

"پر سر آپ بھی تو تھے...... پیار خلوص سے مریض آدھا ویسے ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

ناصر ہنسا "مشکل طریقہ ہے...... پتہ نہیں کوئی نتیجہ بھی دیتا ہے یا نہیں۔ مگر ڈاکٹر کے لیے خطرناک ہے۔"

چائے آ گئی اور سپرنٹنڈنٹ نے E.C.T. مشینوں کی خرید کے سلسلے میں ہونے والی کچھ بے ضابطگیوں کا تذکرہ کیا۔ ناصر خاموشی سے سنتا رہا۔ چائے ختم کی اور جانے کے لیے اٹھا۔

"استعفیٰ پھر ٹائپ شدہ کل لائیں گے؟" سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

"نہیں، کل نہیں کل میں کچھ...... دوستوں...... کے ساتھ کہیں جا رہا ہوں۔ واپسی پر اسی مہینے کسی دن۔ خدا حافظ"

وارڈ کے آفس سے نکلتے وقت ناصر نے سوچا کہ اگر سارا عملہ ہی بدل گیا ہے تو کیوں نہ وہ ایک اجنبی کی طرح وارڈ سے ہوتا ہوا گذر جائے۔ وہ آگے بڑھا غیریت کا احساس بڑے لگے قدم کے ساتھ بڑھتا گیا اور پھر غیریت نجات کی کیفیت میں بدلنے لگی۔ وہ تو کبھی وہاں تھا ہی نہیں تھا۔ اور پھر اس نے اُسے دیکھا۔ وہ پیرانائیڈ عورت کو نیل بنچ پر کہیں لے جا رہے تھے۔ اس کے پھول دار کپڑوں کا لباس تھا جو یک دم ناصر کی نظروں میں کھب گیا تھا اور پھر اس نے اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں دھندلی تھیں جیسے وہ کسی کو بھی دیکھ نہیں رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایک خوابناک مسکراہٹ تھی۔ وہ اُسے لیے اس کے قریب سے گذرنے والے تھے اور ناصر نے اپنی

Scanned by CamScanner

دھڑکن کی تیزی محسوس کی پھر وہ یک دم اس کے قریب رک گئے اور اسے ایک پاٹ دار کراری آواز سنائی دی۔

''سلام ڈاکٹر صاحب......جی......آپ جی......''

وہ وارڈ بوائے جارج تھا۔ شاید جارج کی سطح پر ابھی تبدیلی کا عمل مکمل نہیں ہوا تھا۔ ناصر نے سلام کا جواب دیا مگر اس کی نظریں اب بھی پیرانائیڈ عورت کے چہرے پر جمی تھیں۔

''ٹیک لگا ہے۔ ابھی نکالی گئی ہے'' جارج نے پھر پورا دانت نکالتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

''اوہو......اچھا......اچھا......'' ناصر نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ ہسپتال سے باہر نکلا تو شام ہو چکی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اسے ابھی کل مدنی کو لے جانے کے لیے کہیں سے گاڑی بھی مانگنی ہے۔ اور وہ دوسری جانب بس سٹاپ تک پہنچنے کے لیے اور سڑک پار کرنے کے لیے ٹریفک کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔

O

نرس نے پیرانائیڈ عورت کے دانتوں میں ربڑ کا ٹکڑا مضبوطی سے جمایا تاکہ بجلی کے جھٹکے کے تشنج سے اس کی زبان کٹنے نہ پائے......... پیرانائیڈ عورت دیکھ رہی ہے کہ وہ شفاف نیلگوں پانی کی جھیل میں اپنی گلابی کشتی تیرا رہی ہے۔ پھر جھیل کے اندر ایک لمبا شگاف پڑ جاتا ہے اور پانی اوپر لپے کناروں کی صورت میں اٹھ کر اندر دھنسنے لگتا ہے۔ وہ چیخنا چاہتی ہے مگر چیخ نہیں پاتی۔ اٹھنا چاہتی ہے اٹھ نہیں سکتی۔ اس کی کشتی شگاف کے اندر کھنچتی جا رہی کھنچتی جا رہی ہے پھر شگاف کے اندر سے جھیل کے نیچے سے کہیں چھپا بیٹھا آتش فشاں پھوٹ پڑتا ہے اور اس کی کشتی اوپر کو بلند لاوے کے ساتھ اوپر کو اٹھتی چلی جاتی ہے اوپر اوپر اور پھر سب کچھ تاریک ہو جاتا ہے۔

نرس نے مریضہ کے بازوؤں اور ٹانگوں کو جکڑنے والی چمڑے کی رسیاں کھولیں اور اس کے سر سے بجلی کے الیکٹروڈ اتارے اور پھر ملازم نے اسے سٹریچر پر ڈالا۔ دروازہ کھولا اور باہر کھڑے جارج سے کہا وہ مریضہ کو لے جائے اور اگلا مریض آدھے گھنٹے بعد لائے۔

نئے ڈاکٹر نے دوسرے نئے ڈاکٹر کی طرف پر خیال انداز میں دیکھا اور کہا ''یہ اب ایک

کافی محفوظ طریقہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ الیکٹرک امپلس سب اٹامک سرجیکل انسٹرومینٹس کی طرح برین کے ابنارمل پاٹیکلز کی سرجری کر دیتی ہے اور انہیں ختم کر دیتی ہے اور مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔''

''ہاں یہ ایک دلچسپ خیال ہے'' دوسرے نئے ڈاکٹر نے کہا۔

''اور اس پر ریسرچ کی ضرورت ہے'' پہلے نئے ڈاکٹر نے پر عزم لہجے میں کہا۔

O

کمرے کی فضا میں تمباکو کے دھوئیں اور نشہ آور مشروبات کی مہک تھی اور فضا میں فیصلوں، تجزیوں، ارادوں اور احکامات کی جھنجھناہٹ تھی۔

''عطائی کے نسخوں پر کام جاری ہے۔ تمہیں علم ہے۔''

''کوئی کامیابی......''

''ہاں......'' ہاں کی آواز لمبی تھی اور اس کے آگے کھنچتی جاتی تھی ''کچھ......کچھ......کچھ......کچھ۔''

''اور اس کچھ کچھ کے کچھ ہونے تک...... ہماری ٹانگیں قبر میں پہنچ جائیں گی......''

''ویسے مجھے اب پورا یقین ہو گیا ہے کہ ان نسخوں دوائیوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اصل چیز عطائی کا ڈرائنگ روم تھا اور اس کی باتیں جو حوصلہ مندی دیتی تھیں۔''

''اور ہم سب کی وہاں ایک عجیب کلب جیسی موجودگی بھی تو you know......''

''کلب نہیں حمام کہو......''

''اچھا تمہارا مطلب ہے وہ اس حمام میں بھی......والا......''

''اور میرا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہا۔ہا۔ہا۔ہا۔ یار اس حمام کو پھر سے چالو کرنے کا کچھ سوچو۔''

''ہوں۔ I don't know۔ مشکل ہے۔ شاید......ویسے تو یہ ہمیشہ چالو رہے گا لیکن وہ والا...... I don't know''

''ہو۔ہا۔ہا۔ہی۔ہو۔ہو۔ہا۔ہا۔ہا''

Scanned by CamScanner

امبر جان نے اپنے کونے میں ساتھ بیٹھے رسالے والے کو کہا۔ "یار...... یہ بہت خوش رہے ہیں...... خوش ہیں...... انہیں ابھی بتا دینا کہ اب اس کام میں امبر جان سے کوئی غلطی نہیں ہوگی"۔

"غلطی نہیں کرو گے تو کچھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور اگر کرو گے تو شاید تمہاری بھی آخری غلطی ہوگی۔" مجم الثاقب نے کہا اور امبر جان نے لمبا سانس کھینچنے کی کوشش کی اور ہمیشہ کی طرح وہ رستے میں ہی اٹک گیا۔

O

مائیکل ووڈز نے سوچا کلارا گولڈبرگ اسے یہ مشورہ کل کسی وقت بھی دے سکتی تھی۔ رات کے دو بجے اس کی نیند برباد کرنے کا آخر کیا مطلب تھا۔

"میرا مشورہ یہی ہے کہ ان لوگوں سے جن سے ہاف مین ملوث رہا ان سے مزید رابطے بڑھانا یہاں تمہاری صاف ستھری علمی سرگرمیوں کی تصویر خراب کر سکتا ہے۔ تم ان سے اجتناب کرو۔"

ووڈز نیند میں کراہا۔ "اچھا میں دیکھوں گا۔"

"دیکھو نہیں اس پر سنجیدگی سے غور کرو۔ بہت زیادہ سنجیدگی سے۔ جو میں جانتی ہوں تم نہیں جانتے۔ کچھ خوفناک لوکل معاملات ان لوگوں کے۔"

"اچھا میں سنجیدگی سے غور کروں گا" اس نے کہا۔

"گڈ۔ تو ملاقات ہوگی۔ شب بخیر" دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مائیکل ووڈز نے پھر سونے کے لیے لیمپ بجھایا تو نیند دور بھاگ چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اس بڑھیا کو کوسا اور لیمپ پھر روشن کر دیا۔

"خوفناک لوکل معاملات۔ سنجیدگی سے غور کرو۔ بیڈ کر" وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ایک فولڈر سستی سے اٹھایا جس کے اوپر لکھا تھا، ہاف مین کے ڈسٹ بن اور کمرے کے دیگر کوڑے سے ملنے والے کاغذات۔ یہ اوپر تلے پن کیے ہوئے پھٹے پرانے کاغذوں کے ٹکڑوں، کہیں سگریٹ کی ڈبیوں اور کہیں باقاعدہ کاغذوں پر لاپروائی سے اور کسی ترتیب کے بغیر

پھیلی ہوئی تحریروں کا عجیب و غریب مجموعہ تھا۔ ووڈز نے ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔

"گونگے سپیرے کو جہنمی کمرے میں پہنچا کر اچانک ربڑ کا سانپ دکھایا جائے۔ منصوبہ ڈاکٹر کا تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ نظریہ باز کس طرح غیر محسوس طریقے سے اسے اس طرف لا رہا تھا اور ملکہ سبا سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھتی ہے سوائے مجھے......"

پھر ایک اور جگہ......... "نظریہ باز ہر روز ایک نظریہ بناتا ہے اس پر تاریخ درج کرتا ہے اس سے کھیلتا ہے اور پھر کوڑے میں پھینک دیتا ہے۔ میری تہذیبی شناخت پر اس نے آج کی تاریخ کا نظریہ جاری کیا۔ تمہاری دنیا دراصل ایک عظیم الشان ایستادہ مردانہ عضو تناسل پر کھڑی ہے۔"

ایک سگریٹ کی ڈبی پر "آج کی تجمدات میں ملکہ سبا نے شاید ایک بتا تین کے اشتراک کی منطق قبول کر لی۔"

ووڈز نے گھبرا کر فولڈر بند کر دیا۔ نیند اب بالکل اڑ چکی تھی۔

"سنجیدہ غور کرنے کے لیے ..... تو یہ..... جنسی..... تحریریں ہی..... خوفناک لوکل معاملات۔"

پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کافی بنائے گا اور نیند کا مکمل خاتمہ کرے گا۔

O

چناسائیں ساری عمر لباس فطرت میں رہا تھا مگر اس کا جانشین اس کی قبر کا مجاور داخلی۔ "مدد علی عرف گونگا سائیں مٹیالے لباس میں رہے گا جو کھوہ چناسائیں کے علاقے کی چٹانوں کا رنگ ہے اس طرح کہ کبھی کبھی وہ نظر ہی نہ آنے پائے۔ گو کہ سامنے بیٹھا ہو...... کہ وہ انسان ہے یا کہ کوئی بھربھری پتھریلی مٹی کی چٹان۔"

چنے سائیں کی قبر کے متولی خاندان کے آخری چشم و چراغ نور داد کو پیر کی باتیں کچھ سمجھ میں آتی تھیں اور کچھ نہیں اور کچھ پر تو اسے شک ہوتا تھا کہ مہدی خان کا بیٹا شہری ہوا نے کھسکا دیا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود "گدی نشینی" کی رسومات کی ہر تفصیل طے کرتے وقت اسے اس سے بار بار مشورہ کرنا پڑتا تھا پھر اس کے کہے کو حکم جانتا تھا۔

انہوں نے مدد علی کو نہلا کر خوشبو لگائی اور اس کے جسم کے مطابق سلا سرمئی مٹی رنگ کا لباس

اسے پہنایا۔ اس سارے عمل کے دوران اس کی کیفیت دیکھنے والے کے لیے ایسی ہی تھی جیسے کہ کسی انسانی جسامت کے پتلے کے ساتھ وہ سب کچھ ہو رہا ہو۔ مگر پھر جب اچانک وہ کسی بے ڈھب کھچاتانی پر احتجاج کرتا تو گونگے سائیں کے جنات اس کی مدد کو آجاتے اور گرد و پیش کی انسانی دنیا میں سراسیمگی کی لہر دوڑ جاتی۔ ایسا ہی اس وقت ہوا جب انہوں نے اس کے سر پر کپڑا باندھنے کی کوشش کی۔ اس نے پہلے تو سر کے شدید جھٹکوں سے اس حرکت پر سخت ناقبولیت کا مظاہرہ کیا مگر جب متعلقہ ملنگ 'دستار بندی' کی کوششوں سے باز نہ آیا تو گونگے سائیں کے اندر سے انگریزی بولتے جن کی آواز آنے لگی اور وہ جوان العمر ملنگ زمین پر جھکا اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا "معافی سرکار معافی۔"

کبیر نے یہ منظر گہرے اطمینان سے دیکھا اور ملنگ کو ہدایت کی "رہنے دو۔ نہ کرو۔ سائیں جی کھلے سر ہی رہیں گے۔" اور پھر وہ ڈھول والوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ اتنے میں دیگیں پکانے والے استاد کے کارندے نے اس سے آکر پوچھا کہ چاولوں کے لیے لونگ مصالحہ نہیں ہے تو استاد پوچھتا ہے کہ ویسے ہی پکا لے۔ کبیر نے اسے جھڑکی دی اور کہا کہ ویسا ہی پکا لے اور زہرہ نے سوچا ایسا لگتا ہے جیسے پیدا تو ادھر ہوا ہی مگر ساری عمر بھی اسی کام میں گذاری۔ وہ مسکرائی اور اس نے ناصر کی طرف دیکھا جو ایک تلخ سنجیدگی سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

زہرہ اور ناصر دونوں اس جگہ سے کچھ دور ایک ہموار چٹان سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور ان کے پیچھے کچھ اور چڑھائی کے بعد اس پہاڑی کی چوٹی تھی جو کھوہ چنا سائیں کے نام سے معروف تھی اور جس سے کچھ ہی نیچے وہ غار تھا جو چنے سائیں کا مسکن رہا تھا اور جہاں اب اس کی قبر بنائی گئی تھی اور غار کو جاتے رستے سے پہلے وہ ہموار کی گئی جگہ جہاں دور سے آنے والے زائرین کی شب بسری کے لیے کچھ سادہ سی اقامت گاہیں تھیں۔ یہیں پر لنگر پکانے کے لیے ایک جگہ مخصوص تھی جس کے ارد گرد کے درخت مسلسل دھوئیں کی وجہ سے سیاہ ہو رہے تھے مگر جو حصے دوسری طرف سورج کے رخ تھے وہ سرسبز تھے۔ پہاڑی جنگلی خودرو جھاڑیاں نیچے سے آنے والے رستے کو نظروں سے چھپا لیتی تھیں اور آنے والے یک دم نمودار ہوتے تھے۔ ہر طرف رنگ برنگے کپڑوں کی دھجیاں تھیں اور موسم بہار میں جب ارد گرد پھول کھلتے تھے تو پھولوں کا ہی گمان پیدا کرتی تھیں اور سبز جھنڈیاں تو سارا سال قدرتی سبزے کی ہم نشین تھیں۔ ڈھول، چمٹے،

اکتارے، بنسری اور کچھ دیگر مقامی سازوں والے غالباً سب کے سب اس جگہ کے مستقل مکین نہیں تھے۔ بلکہ اکثر اس موقع کی موسیقائی ضرورتوں کے مطابق بلوائے گئے تھے۔ گونگے سائیں کی تیاری میں براہ راست حصہ لینے والوں کے علاوہ سیاہ اور سبز لباسوں میں کئی رنگ و روپ کے ملنگ، مگر جن میں ایک بنیادی یکسانیت ضرور تھی، گلوں میں منکوں، کوڑوں اور نامعلوم دھاتوں کے سکوں کی مالائیں ڈالے اور پاؤں میں گھنگھرو باندھے تیاری کے منظر کو اپنے اپنے تحیر اور تقدس کے مقام سے دیکھ رہے تھے۔ بہت سے دوسرے تھے بظاہر کسی خاص پہچان کے بغیر مگر اس مقام کی کسی نہ کسی سمت میں کچھ مفید اور ناگزیر کام کرنے والے اور اسے قائم و دائم رکھنے میں خاموش مددگار تھے۔ سنمبیال گاؤں کے کچھ لوگ تھے جو کھوہ چنا کے متولی خاندان سے اپنے تعلق کی مناسبت سے اس انوکھی چہل پہل میں آسودہ پھرتے تھے اور قریبی علاقوں کے کچھ زائرین جو قبل از دوپہر اس وقت ہی وہاں پہنچ گئے تھے اور مسائل کے تعلق لاتعلقی کے رشتے میں بندھے یقین بے یقینی میں بٹے اپنی اپنی آرزو کی شدت لیے پھرتے تھے۔

زہرہ وہ سب دیکھ رہی تھی اور ناصر کی نظروں کے سامنے بھی وہی سب کچھ تھا۔ پھر زہرہ نے گہرا سانس لیا اور خوشبو کی راہ اس مقام تک پہنچنے لگی۔ نمک جو بے بو ہے مگر جیسے وہاں خوشبو بنا تھا اور بہار کے جنگلی پھولوں سے مل کر ان کی خوشبو کو دھیما بناتا مگر گہرا اتارتا تھا۔ ایسے کہ سارے جسم میں خوشبو کی خبر پھیل جاتی تھی۔ یک دم زہرہ کو احساس ہوا کہ اس مقام کی خوشبو اگر جو کے رگڑ بیلے کی زہرناک کڑوی خوشبوؤں سے کس قدر مختلف ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ ناصر کو اپنے اس احساس میں شریک کرے مگر جس طرح بے ساختہ اس نے یہ چاہا تھا ویسا ہی بے ساختہ دوسرا احساس تھا کہ وہ ناصر کو اپنے احساس میں شریک نہیں کر سکتی، احساسات، خیالات، تاثرات، کی وہ شراکت جو مدتوں سے ان میں تھی ناصر ان سے دور ہٹ رہا تھا اور جو نئی بات تھی وہ یہ کہ وہ اس فاصلے کو چھپا نہیں رہا تھا بلکہ شاید اب تو خود نمایاں کر رہا تھا۔

وہ گذشتہ روز شام کو محکمہ کان کنی کے اس ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تھے جو سنمبیال کے قریب ہی واقع تھا۔ مدد علی کو ایک گوشے میں محفوظ کر کے وہ کل کی سرگرمی کی تفصیل پر بات کرنے لگے تھے تو کبیر کی ہر بات کا ناصر نے ایک ہی جواب دیا تھا "جیسا تم مناسب سمجھو۔" جب اس نے کہا کہ کل مدد علی کو اس کی روحانی آرام گاہ پر پہنچا کر اور سب انتظام و انصرام مکمل کرنے کے بعد وہ جل پھری

Scanned by CamScanner

سے پانی کا قطرہ پینے چلیں گے جو ایک قطرہ ہی پیاس بجھا دیتا ہے تو ناصر نے کہا "جو مناسب سمجھو"
اور جب کبیر نے کہا تھا کہ وہ تو صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے ہی ریسٹ ہاؤس سے اپنے گاؤں
سنیال کی طرف نکل جائے گا اور مسجد کے نمازیوں میں اپنے باپ کو تلاش کر کے اسے دہلا دے گا کہ
شاید اس کے بیٹے کی روح آ گئی ہے اور پھر گھر جا کر جب اُس کی ماں اسے گلے لگا کر روئے گی تو وہ
اسے دیر تک رونے کا موقع فراہم کرے گا اور اگر ہو سکا تو خود بھی رونے کی کوشش کرے گا تو ناصر
نے پھر کہا "جو مناسب سمجھو۔" اس پر زہرہ نے پہلی بار سوچا تھا کہ شاید وہ اتنا دور جا چکا ہے کہ جتنا وہ
جانتے نہیں۔ یا جاننا نہیں چاہتے۔ وہ ہمیشہ سے اس کے دوری اور قربت میں جھولنے کے عادی
ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے سوچا تھا کہ انسانوں کی خصوصیات کا عادی ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ
انسانوں کو خود ہی کسی خصوصیت سے سجا کر اس کا عادی ہو جانا۔ زہرہ کے ذہن میں کچھ ایسا ہی الجھا
ہوا خیال تھا جب ناصر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور کبیر بھی یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ وہ جلد سونا چاہتا ہے
تا کہ صبح جلد اٹھ سکے اور زہرہ اکیلی برآمدے میں دو خالی کرسیوں کے ساتھ بیٹھی رہی تھی بلندی
پر واقع اس اجنبی مقام پر جہاں ارد گرد بکھری پہاڑیاں جو لمحوں پہلے بھوری مٹیالی سرخ زرد نظر آتی
تھیں تیزی سے تاریک ہوتی شام میں رنگ چھوڑ رہی تھیں اور سناٹا بہت گہرا تھا جو صرف پہاڑوں
میں تخلیق ہوتا ہے۔ ایک شدت کے لمحے میں زہرہ کو احساس ہوا تھا کہ وہ اس پوری کائنات میں
بالکل اکیلی ہے پھر اس نے خالی کرسیوں کی طرف دیکھا تھا اور 'کل کیا ہونے والا ہے' کا احساس
پھر اس پر غالب آ گیا، پھر اس نے بھی سوچا کہ اسے بھی کل کیا ہونے والا ہے، تک کا زیادہ سے زیادہ
فاصلہ نیند میں مٹا دینا چاہیے اور وہ تیسری کرسی بھی خالی کر کے اپنے کمرے میں سونے چلی گئی۔

اور جو کل ہونے والا تھا وہ اب ویسے ہی ہو رہا تھا جیسا کہ کبیر نے چاہا تھا اور ان کی نظروں
کے سامنے ہو رہا تھا۔ اچانک گونگا سائیں پھر کسی خلاف ورزی پر برہم ہوا اور اب کی بار جرمن
بولنے والا جن اس کی مدد کو آیا مگر ملنگوں نے اس نازک 'جاتی لسانی' فرق کو بالکل محسوس نہ کیا
مگر کبیر ہنسا اور اس نے دور کھڑے زہرہ اور ناصر کو دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا بالکل ویسے ہی
جیسے کوئی بچہ اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا ہو اور دوسروں کو اس خوشی میں شامل کر رہا ہو۔ بے اختیار زہرہ
مسکرائی اور اس نے ہاتھ ہلایا۔

"میں نہیں سمجھتا میں پیشہ ورانہ حیثیت میں اس احساسِ جرم سے کبھی چھٹکارا پا سکوں گا"

اچانک ناصر نے کہا اور زہرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے اسے اس کی وہاں موجودگی
کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ ناصر کا چہرہ کسی اندرونی اذیت نے بگاڑ دیا تھا۔

"مم میں...... نہیں سمجھی......" زہرہ نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔

"اب یہ جو کیفیت ہے مدد علی بول رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اعضائے نطق میں کوئی خرابی
نہیں مگر وہ...... صرف ایک انتہائی محدود بازیافت میں قید ہو گیا ہے۔ اب مسئلہ اس کی یادداشت
کا ہے گویائی کا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر اس کا علاج اس نئے نقطۂ نظر سے کیا جاتا تو......" زہرہ نے
حیرت سے اسے دیکھا "مگر اس نے تم سے پوچھا تھا کبیر نے...... اس نے کہا تھا کہ اگر تم اس کا
علاج جاری رکھنا چاہو گے اور اسے یہاں لانے کی اجازت نہیں دو گے تو وہ ایسا نہیں کرے گا"
"میری اجازت...... ہنہہ" اور زہرہ نے اس کے لفظوں سے زیادہ اس کے لہجے کی زہر آلود نفرت
کو محسوس کیا۔ "میری اجازت، کیسی اجازت...... یوں کہو کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی دنیا میں
آ بسنے والے لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ایک ہی رشتہ باقی رہ جاتا ہے۔ غلامی کا...... وہ
ایک ایسا عفریت ہے جو اپنے ارد گرد لوگوں کے ارادوں، خواہشوں، حتیٰ کہ سوچوں تک کو کھا جاتا
ہے...... اور تم بھی یہ جانتی ہو"۔

ہوا کا جھونکا گزرا اور زہرہ کو ایسا لگا کہ جیسے کھوچنا کے پھولوں کی خوشبو ناگ بو کی زہریلی
بوؤں سے بھی زیادہ زہرناک ہو چکی ہے۔ اس نے سانس کھینچا اور باہر نکالا کہ وہ زہر اس کے اندر
سے نکل جائے مگر وہ اور بھی اندر تک اتر گیا۔ ناصر کے الفاظ اس کے اندر ایک ڈراؤنی گونج بن
گئے۔ "کیا واقعی میں جانتی ہوں۔ کیا ناصر سچ کہتا ہے۔ کیا میں جانتی ہوں......"

تب ایسا ہوا کہ اک تارے نے گمکتی سُر بلند کی، بنسری نے اس کا ساتھ دیا اور پھر چمٹے نے
جھپک کر انہیں پکڑ لیا اور ساتھ ہی سب ڈھول یک بارگی بج اٹھے۔ سُر تال کا یہ ایک ایسا اچانک
حملہ تھا کہ جیسے موسیقی کا جوالا مکھی پھوٹ پڑا ہو...... چند ہی لمحوں کی بات تھی کہ زہرہ بالکل فراموش
کر بیٹھی کہ کچھ دیر پہلے ناصر نے اس سے کیا کہا تھا۔ وہ زہریلے چھیدنے والے الفاظ کیا تھے۔ وہ
کیا جانتی تھی۔ کیا نہیں جانتی تھی اور پھر ایک ایک کر کے ملنگ اور ملنگنیاں سب بے اختیار ہو کر تال
اور تھاپ کے تلاطم میں ہچکولے کھانے لگے۔ ان کا ایک بازو ہوا میں بلند ہوتا تو دوسرا نیچے آتا
تھا اور پھر دوسرا پلٹ کر پہلے کی سمت کو اٹھتا تو ان کے پاؤں بے تابی سے زمین کو ضرب لگاتے تھے

Scanned by CamScanner

اور گھنگھروؤں کی چھن چھن سُر۔ لے۔ تال کے تال میل میں ایک انوکھے ارتعاش کی لہریں دوڑا دیتی تھی۔

زہرہ کے لیے یہ ایک مسحور کن نظارہ تھا ایک ایسا انوکھا تجربہ جو اس کی زندگی میں پہلے کہیں نہیں تھا۔ یک دم ڈھول والے نے تال بدلی تو جسموں کی بے قراری کے زاویے بدل گئے اور زہرہ نے محسوس کیا کہ تال تھاپ سُر کی ہر تبدیلی جسم کے اندر اپنا ہی کوئی انوکھا مقام پیدا کرتی تھی۔ پھر اس نے وہ حیران کن منظر دیکھا۔ مدعلی یا اب گونگا سائیں جو ابھی تک مٹی کے باوے کی طرح بیٹھا تھا آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے لگا اور پھر اس نے اپنے بازوؤں اور پاؤں کو حرکت دی تو اس کے حلق سے کسی چیختے ہوئے پرندے جیسی آواز نکلی اور پھر اسے بھی سُر تال کے اُس ہیجان نے اپنے اندر کھینچ لیا۔ تب کبیر نے بے اختیار نعرہ بلند کیا اور زہرہ نے دیکھا کہ اُس کا سارا جسم جھولتا ہے اور وہ اسے وہیں بلاتا ہے۔ اب کوئی تذبذب نہیں تھا کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ وہ سحر زدگی کے سے عالم میں پاؤں اٹھاتی کبیر کے پاس چلی گئی اور دوسرے ہی لمحے جب اس نے اپنے جسم کو حرکت دی تو اس کے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ اپنے جسم کو متحرک کرنے والی وہ خود تھی یا کوئی اور تھا...... سازندوں نے جب گونگے سائیں کو رقص میں اپنے اندر موجود پایا کہ وہ مجذوب ہر کسی کے حال کے ساتھ بے حال ہوتا تھا تو ان کی سرمستی نے سازوں کی مستی کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا اور پھر حیرت کا وہ عالم کہ جب عروج ٹھہر جاتا ہے اور وہ محال مقام کہ جب عروج کہ اپنی اصل میں اگلے لمحے کا زوال ہے زوال سے بے نیاز ایک ابدیت میں قیام کر جاتا ہے۔ ناچنے والوں کے جسم ایسے متحرک تھے کہ جیسے اگلے ہی لمحے اپنی روح سے جدا ہو جائیں گے مگر روح ہی تھی جو ہر ایک سے الگ ہو کر سب میں یکجا ہو گئی تھی۔ اس انتہا پر جسم و جان کا قائم رہنا ایک معجزہ تھا جو فانی جسم کی آلائشوں کو دھو ڈالتا تھا اور پھر جب کہ وہ لمحہ تھا کہ بس اس انتہا کے آگے اب فنا ہی ہوگی تو وہ جنون خود ہی پلٹا اور اس پلٹنے میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہ تھا قابو۔ نہ سازندوں کا کوئی ارادہ تھا نہ ناچنے والوں کا کوئی فیصلہ۔ وہ تھمتے چلے گئے اور آخر تھم گئے مگر چند ایک اب بھی ایسے تھے کہ جو اپنی ہی دھن میں تھے اور ابھی ناچتے تھے اور یہ انکشاف کرتے تھے کہ انہیں پہلے بھی کسی کی تال تھاپ کی ضرورت تھی نہ اب ہے۔ زہرہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر سوچا "یہ کیسے لوگ ہیں" پھر اس نے کبیر کو دیکھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے جسم پسینے سے شرابور تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا مگر تھکن نام کو نہیں تھی پھر زہرہ کو محسوس ہوا کہ ان دونوں میں کچھ نیا ہے

جو آیا ہے مگر پھر جب اس نے آسمان کو دیکھا تو جب بھی اسے لگا کہ اس کے اور آسمان کے درمیان بھی کچھ نیا ہے جو آیا ہے پھر اس نے ڈھاک کے اس درخت کو دیکھا جو کھوہ کے ساتھ گہرا سبز بلند ہو رہا تھا تو اس نے جانا کہ اس کے اور درخت کے درمیان بھی کچھ نیا ہے جو آیا ہے......اور پھر اس نے پھر کبیر کی طرف دیکھا جو صرف اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

زہرہ مڑی اور واپس اس چٹان کی طرف آئی جہاں وہ اور ناصر کھڑے رہے تھے۔ ناصر وہاں نہیں تھا مگر ناصر کے وہاں نہ ہونے پر اسے نہ حیرت ہوئی نہ پریشانی بس یہی تھا کہ ناصر وہاں تھا اب نہیں تھا تو کہیں اور ہوگا۔ ہر شے جیسے تھی اس کے ویسے ہی ہونے ویسے ہی دیکھنے سننے اور محسوس کرنے کی وہ کیفیت ہر دوسرے احساس پر حاوی تھی۔ کیا تھا کیا ہوگا مساموں سے پھوٹے پسینے کے ساتھ بہہ چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اب مدعلی کو کہیں لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تب کبیر زہرہ کے پاس آیا آسودہ اور مطمئن "وہ مدعلی کو کھوہ میں لے جا رہے ہیں پھر کھانا ہوگا اور پھر ہم لوگ چلیں گے اور پھر تم جل چتھری کا ایک قطرہ پانی پینے میرے ساتھ چلنا۔ ناصر کہاں گیا؟" اس نے پوچھا "شاید وہ نیچے چلا گیا ہوگا جہاں گاڑیاں کھڑی کی تھیں" زہرہ نے کہا۔ کبیر نے کچھ نہ کہا اور واپس ملنگوں اور متولیوں کی طرف چلا گیا۔

اور پھر باقی بھی ویسا ہی ہوا جیسا کبیر نے سوچا تھا۔ مدعلی کی مردہ آنکھوں میں ایک نئی زندگی کی چمک تھی اور جسم میں ایک نیا اور انوکھا تحرک۔ اس وقت کبیر نے پھر سوچا کہ آخر ناصر کہاں گیا۔ وہ اسے مدعلی کی کایا کلپ دکھانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا اس سے بھی کیا فرق پڑتا۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔

نوروادے نے کبیر کو رخصت کرتے وقت کہا "اللہ تمہارا بھلا کرے کبیر چنا سائیں کی قبر تو خیر تھی ہی پر گونگے سائیں جی کی برکت جو آئی ہے ان کے جنات کی طاقت جو آئی ہے تو پروردگار کی شان سے یہ ڈیرہ چلتا ہی رہے گا۔"

کبیر نے اسے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ پھر جب وہ کھوہ چنا کی پہاڑی سے نیچے کی طرف اترائی میں جا رہے تھے اور چٹانوں ڈھلوان تنگ رستوں پر اور کبھی گھنی جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے جا رہے تھے تو انہیں ایک دوسرے سے کسی کلام کی ضرورت ہی نہ تھی۔ خاموشی اور سورج اور اُتران۔ اور جب وہ پہاڑی سے نیچے اتر آئے اور اس پتھریلے پہاڑی رستے پر کچھ آگے بڑھے تو

زہرہ کی بات درست ثابت ہوئی۔ ناصر وہیں تھا۔
''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔
''تو تمہارا انتظار ختم ہوا۔'' کبیر نے کہا۔
''مجھے تم لوگوں سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' ناصر نے کہا۔
''ابھی ہم سب جل چھتری سے پانی کا ایک قطرہ پینے جا رہے ہیں۔ وہیں تم اپنی ضروری بات کر لینا اور ایک قطرہ پی لینا۔ تمہاری پیاس بجھ جائے گی یہ بھی بہت ضروری ہے۔'' کبیر نے کہا۔
''میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو۔''
''لیکن میں جانتا ہوں تم کیا کہہ رہے ہو۔'' کبیر نے کہا۔
''شاید نہیں۔ نہیں اب نہیں۔'' ناصر نے ایک زہریلا سا قہقہہ لگایا۔
زہرہ نے کہیں کسی جبلی سطح پر محسوس کیا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ کیا اُس میں جو کبیر کا تھا وہ تمام ہوا؟۔ اور باقی کسی کا کیا ہے جو ہونا ہے؟ خود اس کا کیا ہے جو ہونا ہے؟ وہ نہیں جانتی اور سورج گرم چمکتا تھا۔

O

امیر جان نے فیصلہ کیا کہ وہ زیادہ تیز رفتاری سے اُن تینوں کے پیچھے پہاڑی کی چڑھائی نہیں کرے گا۔ اس کا سانس زیادہ پھول گیا اور اُس کی ٹانگیں زیادہ تھک گئیں تو اُس کے ہاتھ کی گرفت بھی کمزور پڑ جائے گی اور ہاتھ کی کمزور گرفت بے خطا نشانہ باز کو بھی دھوکا دے جاتی ہے۔ وہ ایک جگہ رک گیا اور نیچے وادی میں سمیال گاؤں کو اترتے رستے کو حقارت سے دیکھنے لگا اور پھر اس نے رستے کو کسی ذی روح کی حرکت کے لیے دیر تک دیکھا وہاں نیچے کوئی بھی نہ تھا سوائے اُن کے جو اوپر جا رہے تھے۔

O

''کیا میں اب بھی واپس پلٹ سکتا ہوں۔ ان دونوں کی دنیا میں؟'' ناصر کے اندر یہ سوال

ابھرا۔ اس یک دم جاگ اٹھنے والی پورے جسم و جان کی خواہش کے ساتھ کہ کوئی اور وقت ہوتا اور اس حیرت انگیز خوبصورت مقام پر میں ان کے ساتھ ہوتا تو یہی مقام ہی لیے کس قدر مختلف ہوتے۔ کس قدر؟ اُس سے جو ہے''
وہ انوکھی چٹان جو پہاڑ سے کسی انگلی کی طرح نکل کر مشرق کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور جس کے نیچے بڑے بڑے پتھروں کے اندر جو جگہ ہے جو کسی انسان کے لیٹنے کے لیے کافی ہے اور نیچے پتھروں کی بغلوں میں وہ جگہ ہے جو شاید قدرتی ہے۔ یا بنائی گئی ہے اور مٹی کا ایک پیالہ ایک طرف پڑا ہے جو اب خالی ہے۔ مگر اس وقت بھرا ہوا تھا جب وہ چڑھائی کے بعد یہاں آئے تھے۔ اور اس پیالے کے عین بیچ میں پانی کا قطرہ ایک بندھے ہوئے وقفے کے بعد گرتا تھا۔ اس نظارے کو دیکھ کر ان دونوں پر ویسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی جو ملنگوں کے ناچ میں شامل ہونے کے بعد ان پر طاری ہوئی تھی۔ اس وقت تو وہ نیچے اتر آیا تھا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ مگر اب تو ایک ہی بڑی واپسی ہے جو ہونے والی ہے مگر کیا اب بھی؟ اب بھی جب کہ وہ انہیں اپنی واپسی کے صاف اشارے دے چکا ہے کیا اب بھی وہ ان کی دنیا میں پلٹ سکتا ہے۔ ان دونوں کی دنیا میں جس کے یہ لمحے ان دونوں میں اس مقام پر ایسے ہیں کہ جیسے بچے کوئی نیا کھیل کھیلنا سیکھتے ہیں۔ وہ باری باری اُس چٹان جس کا نام جل چھتری ہے کے نیچے لیٹتے ہیں اور اُس شگاف کے نیچے جہاں سے پانی کا قطرہ گرتا ہے وہ اپنا منہ کھول دیتے ہیں اور قطرہ ان کے حلق کے اندر گرتا ہے پھر قہقہے لگاتے ایک دوسرے کی باری چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کھیل میں اس قدر مگن ہیں کہ قطعاً فراموش کر چکے ہیں کہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے مگر نہیں زہرہ اُس کی طرف دیکھتی ہے اور آواز دیتی ہے ''ناصر..... آؤ ناصر یہ بہت عجیب تجربہ ہے۔''
''آؤ..... ناصر..... باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی مگر جل چھتری کے قریب پہنچ کر اس کے جل سے محروم رہنا بڑی بدقسمتی ہوگی۔'' کبیر زور زور سے کہتا ہے اور اس تک اپنی آواز پہنچاتا ہے۔
''کوئی بات نہیں میں بدقسمتیوں کا عادی ہوں۔'' ناصر بھی زور سے کہتا ہے اور وہاں سے ہٹ کر پتھروں اور درختوں اور زیر درختوں میں سے رستہ بناتا جل چھتری سے دور ہٹ جاتا ہے۔ اسے سمتوں کا احساس کرنے میں چند لمحے لگتے ہیں۔ وہ جنوب کی طرف منہ کیے کھڑا ہے۔ اور مغرب کی طرف وہ چٹان ہے۔ اور مشرق کی طرف ہموار پتھریلی جگہ کافی کھلی ہے جو آگے بڑھ کر

Scanned by CamScanner

دوسری پہاڑی کی جانب بتدریج بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ ناصر کھلی پتھریلی جگہ پر کھڑا جنوب کی طرف دیکھتا ہے آگے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور پھر چونک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ آگے گہرائی یک دم سیدھی اور عمودی ہے اور سینکڑوں فٹ نیچے سنگلاخ نوکیلی چٹانیں ہیں اور یہی چٹانیں ہیں جو نچلی پہاڑیوں کی بلندیاں ہیں اور جنوب کی طرف اپنی بلندی کم کرتی کرتی میدانوں سے جا ملتی ہیں۔

''بلندی سے کود کر خودکشی کرنے والوں کے لیے یہ ایک مثالی مقام ہے۔'' ناصر سوچتا ہے مگر ابھی تک کبیر کا فقرہ مسلسل اس کے ذہن میں گونج رہا ہے ''آؤ ناصر...... باقی باتیں پھر ہوں گی۔'' تو گویا وہ جانتا ہے کہ کچھ باتیں ہیں جو ابھی ہونا باقی ہیں وہ جانتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح۔ اس عورت کے ساتھ ان بچگانہ حرکتوں میں بھی اس بے حال دھمال کے اندر بھی وہ لمحہ لمحہ جانتا تھا کہ ابھی کیا باتیں ہوتی ہیں۔ ناصر کیا کہے گا اور میں کیا کہوں گا۔ میرے کہے پر وہ ایسا جواب دے گا اور اس کے جواب پر میرا جواب یہ ہوگا۔ کبیر سب جانتا ہے............ یک دم ناصر کو محسوس ہوا کہ جیسے اسے کوئی ایسا خطرہ درپیش ہو کہ وہ زور زور سے چیخنے لگے گا اور وہ یک دم عمودی گہرائی کو آگے جھک کر دیکھنے لگا پھر چکرا کر پیچھے ہٹ آیا اور ایک چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر دیر تک آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ ''نہیں اس دفعہ وہ میرے الفاظ کو میرے منہ سے نکلنے سے پہلے ہی نہیں جان پائے گا۔ اس دفعہ نہیں...... بلکہ شاید وہ میرے الفاظ کو میرے منہ سے نکلنے کے بعد بھی پوری طرح جان نہیں پائے گا۔ وہ توقع نہیں کر سکتا وہ دونوں توقع نہیں کر سکتے کہ میں اپنی ذلت میں کتنا دور جا سکتا ہوں۔''

سورج اس وقت عروج سے زوال کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ اور مارچ کی بہار گزرے سرما کے پیچھے رہ جانے والے خنک جھونکوں کو چند آخری آزادیوں کا موقع فراہم کر رہی تھی۔ ناصر نے خنک ہوا کے جھونکے پر آنکھیں کھولیں۔ جل پتھری دوسری طرف کچھ نیلی چٹانوں کے پیچھے تھی اور وہ دونوں اُسے نظر نہیں آ رہے تھے اور نہ ہی ان کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور اس نے اس مقام کو جیسے پھر سے ایک نئی نظر سے دیکھا۔ واقعی یہ حیرت انگیز عمودی گہراؤ۔ پانی کا قطرہ دینے والی چٹان۔ بلندی کے اوپر یہ ہموار پتھریلی جگہ جس کے پتھروں کے اندر سے جیسے گھاس اور پھول دار بوٹیاں زور لگا کر باہر کو نکل رہی ہیں اور شمال کی طرف سے چڑھائی کے ختم

ہونے کے بعد چٹانوں گھاس جھاڑیوں اور ڈھاک کے درختوں کا وہ جھنڈ جس کے کچھ ہی آگے یہ ہموار جگہ شروع ہو جاتی ہے اور جو آگے جنوب کو بڑھتی بڑھتی کسی بے خبر کو موت تک لے جا سکتی ہے۔

اس جگہ کا حسن آسیبی ہے ناصر کو احساس ہوا پھر اُسے اپنے اس احساس پر تعجب ہوا تو اُس نے سوچا کہ وہ جیسے بہت شدت سے اس مقام پر موجود ہے اور اتنی ہی شدت سے موجود نہیں بھی ہے اور اس کا یہ ذہنی کھنچاؤ اُس کے اندر ایک عجیب غیر مرئی سا احساس پیدا کر رہا ہے اور ابھی اگر چٹانوں کے پیچھے سے کسی غیر مرئی مخلوق کو نکلتا دیکھ لے یا ڈھاک کے اس درختوں کے جھنڈ میں کسی اساطیری ہستی کو کسی انسانی چہرے اور بیل کے جسم والے مینطور کو یا انسان اور بکرے کے مرکب سیٹیر کو نمفز کے پیچھے بھاگتا دیکھ لے تو اسے حیرت نہیں ہوگی۔ اس اساطیری تخیل طرازی نے اور اس مقام کے آسیبی گرد و پیش نے اس کے ذہن پر ایک انوکھا سکون آور اثر ڈالا پھر اسے زہرہ اور کبیر کی ایکتا کا خیال آیا کہ یوں تو وہ خیال ہر لمحہ اس کے اندر تھا مگر اب اس خیال پر دیومالائی تخیل کا دروازہ کھل گیا۔ ہیرمافروڈائٹس۔

وہ اساطیری مخلوق جو آدھا مرد آدھی عورت تھی اور...... پھر اسے ٹھیک طرح یاد نہ آیا کہ وہ مخلوق کیا اپنی وحدت میں مکمل تھی اور کیا اسے مرد اور عورت کے قالب میں دیوتاؤں نے الگ الگ کر دیا تھا اور وہ اب تک ایک دوسرے کی طرف بھاگ رہی تھی کیا ہوا تھا...... وہ سوچتا رہا پھر یک دم ایک خیال نے اسے ایک قوت کے احساس سے بھر دیا جیسے امتحان سے پہلے اپنی کسی قابلیت کا اچانک خیال ایک بروقت اعتماد سے دل کو قوی کر دیتا ہے۔ پھر اس نے شک سے سوچا کہ شاید وہ دل میں اُس بات پر ہراساں تھا کہ وہ بات کیسے شروع کرے گا۔ وہ کسی ہتھلے پوچ بات کرنے والے کی طرح، مسکین بھاگنے والے، کمتری کے مارے ہوئے، الزامات دھرنے والے، شکایتی لیٹر بکس کی طرح بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب اس جگہ نے جو دیومالائی تصویریں اسے دکھائی ہیں تو بات شروع کرنے کا ایک شوشہ بھی اسے دکھا دیا ہے ناصر مسکرایا۔ مگر بس بات شروع کرنے کا قرینہ ہو گا پھر...... وہ وہی کچھ کہے گا جو اسے کہنا ہے اس نے پھر پہلے سے کہیں زیادہ اپنائیت سے اس جگہ کو دیکھا۔ اس کی نظر ڈھاک کے درختوں کے جھنڈ کی طرف گئی اور ایک لمحے کے لئے اسے وہاں کسی متحرک شے کسی انسان کے وجود کا گمان ہوا مگر اگلے ہی لمحے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کیا وہ

Scanned by CamScanner

"بصری واہموں کا شکار ہونے لگا ہے؟" اس نے مزے سے سوچا۔ "جیسی یہ جگہ ہے اور جس کیفیت میں وہ ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

پھر ناصر نے اُن کی آوازیں سنیں اور اس کے سانس اور دل کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ آ رہے تھے اور وہ لمحہ اب قریب آ رہا تھا جو شاید ان تینوں کے درمیان ایک زمانہ گزر جانے کا آخری لمحہ ہو گا۔ وہ سرمئی چٹانوں کے پیچھے سے نکلے تو متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ناصر کو چٹان کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا دیکھ کر وہ سیدھے اس کے پاس آ گئے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور آنکھیں روشن تھیں اور لباس بھیگے ہوئے تھے۔ زہرہ نے دیکھا کہ ناصر اب اتنا پژمردہ نظر نہیں آ رہا تھا جتنا پہلے تھا۔

زہرہ کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے پیالہ ناصر کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارے لیے ہے" اس نے کہا اور ناصر نے ایک لفظ کہے بغیر پیالہ لیا اور ٹھنڈا پانی پی لیا۔ پھر پیالہ زہرہ کو واپس تھماتے ہوئے کہنے لگا "بے حد شکریہ۔ واقعی میں پیاسا تھا اگرچہ پیاس کا احساس نہیں تھا۔ شاید یہ اس جگہ کا کمال ہے۔"

"جگہیں وقت کو برباد کر دیتی ہیں اور وقت جگہوں کو..... اس جگہ یہ دونوں ہی عمل جاری ہیں کم از کم میرے لیے....." کبیر نے کہا۔

"اوہو۔ تو یہ اس نے سوچا ہے اس کی پرانی نظریہ بازی کی شعبدہ بازی....." ناصر نے سوچا اور پھر ہنس کر کہا "تم اب اپنے آپ کو دہرا رہے ہو۔ تم پہلے بھی یہ بات کر چکے ہو مگر اب شاید تم نے وہی نظریے بنانے شروع کر دیے ہیں۔"

"ہاں۔ مجھے بھی حیرت ہے یہ کچھ ٹھہر رہی ہے یہ وقت اور جگہ کی بک بک۔ غالباً اس کا نزول مٹی میں جکڑی کرسیوں اور سنہرے سانپ کے آخری نظارے کے روزِ پُر آشوب کو ہوا تھا۔ زہرہ تمہیں کچھ یاد ہے؟"

"شاید" زہرہ نے کہا اور کچھ دیر پہلے کی چونچلاہٹ کی جگہ ایک نیلگوں اداسی اس کی آنکھوں میں اترنے لگی۔

"ہاں انسان کیا یاد کرے اور کیا فراموش کرے" کبیر نے کہا۔ "مگر ابھی اس بک بک کا اطلاق یوں ہوا ہے کہ میں جب اس جگہ آیا تھا تو بڑے شہر کے وقت کے زیر اثر تھا مگر اس جگہ اور

اس سے بھی پہلے کھوہ چنا سائیں کی اس جگہ نے میرے اُس وقت کو برباد کر دیا اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ابھی واپس نہیں جاؤں گا اور کچھ دیر اس جگہ قیام کروں گا اور زندگی کا آخری فیصلہ کروں گا کہ مجھے لکھنے کا دھندہ جاری رکھنا ہے یا اتمام کرنا ہے اور اگر موخر الذکر فیصلہ ہوا تو پھر مجھے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اپنے باپ کی دو ایکڑ زمین پر سبزیاں کاشت کرنی ہیں یا کھوہ چنا کے ہمارے گوتے سائیں کی خدمات کے لیے کچھ ماہانہ معاوضہ یعنی کمیشن طلب کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک عمدہ وظیفۂ جاریہ ہوگا۔"

"یہ ایک بہت گھٹیا فیصلہ ہوگا" زہرہ نے کہا اور اسے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے وہ اداسی جو گہری نیلی ہوتی جا رہی ہے۔ کبیر نے ناصر کو گہری نظروں سے دیکھا اور بولا "مجھے لگتا ہے کہ یہ ہُوا ہے کہ یہ بات جلد گھٹیا اور بڑھیا کی گھٹیا تقسیم سے آگے جانے والی ہے۔" ہرمافروڈائٹس ناصر نے سوچا اس کا اساطیری شوشہ تو دھرے کا دھرا رہ گیا مگر آئے گا وہ بھی آئے گا اپنی جگہ آئے گا اور اس نے کہا "ہاں..... تمہارا یہ احساس درست ہے۔"

"میں نے زہرہ سے کہا تھا کہ جب تک میں یہ آخری فیصلہ نہیں کر لیتا 'بھورے کے مکاشفات' اور وہ خط جسے تم نے قبول نہیں کیا اور بیت المقدس سے برآمد ہونے والی میری ہر طرح کی تحریری بک بک اُس کے سپرد ہے اور ہاف مین کا غلام پاخ کا معمہ جو ابھی اُس نے اُس انگریز لدھڑ سے حاصل کرنا ہے۔ وہ بھی۔"

"یعنی جب تک تم دوبارہ لکھنے کا فیصلہ نہیں کر لیتے یہ تمہارے زہرہ کے لیے احکامات ہیں۔" اور زہرہ نے ناپسندیدگی اور تاسف سے ناصر کو دیکھا۔

"آ..... نہیں دوبارہ کا خواب منتشر ہو چکا ہے اور اب فقط چند نشان زدہ خواب ہیں جو باقی ہیں اور یہ جگہ ہے....."

"تم خوش قسمت ہو کہ اس جگہ کو لوٹ سکتے ہو جو تمہاری اصل ہے۔" زہرہ نے کہا۔

"اصل کی اصل کیا ہے؟ اصل کی اصل تو ہنگڈر میں نکل گئی تھی" کبیر نے کہا اور ناصر کو ان کے خط کا وہ مقام یاد آ گیا اس نے کہا۔

"وہ یقیناً ایک بھیانک منظر ہوگا جو تم دونوں نے وہاں دیکھا اور جیسا بھی میں نے اس خط میں پڑھا جو تم نے لکھا..... اگرچہ وہ میرے لیے نہیں تھا..... تم نے خود لکھا کہ تمہیں ایک 'دوسرے

Scanned by CamScanner

کی ضرورت تھی جسے مخاطب کر کے تم اپنی بیانیہ روانی برقرار رکھ سکو۔"
مگر جھگڑے کے تذکرے کے بعد "دوسرے" کی ضرورت...... پر ناصر کی طنز کچھ اثر نہ چھوڑ سکی۔ فوراً ہی زہرہ اور کبیر ان مناظر کے خوفی بہاؤ میں ڈوب گئے۔

"وہ...... سب کچھ ایسا تھا کہ انسان کے عمر بھر کے فیصلوں اور گہری سوچوں کو جڑ سے اکھاڑ سکتا تھا۔" زہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور شاید ایسا ہی ہوا تھا۔" کبیر نے کہا اور گھراؤ کی طرف دیکھا۔

"میں مانتا ہوں" ناصر نے سچائی سے کہا "میں جانتا ہوں اگرچہ میں اس تجربے میں نہیں تھا۔ جیسا کہ تم میرے اس تجربے میں نہیں تھے جس میں میں تھا......"

"تمہارے ایام اسیری؟" کبیر نے کہا

"وہ بھی اور اس سے پہلے بھی تم کبھی بھی اس تجربے میں نہیں تھے جس میں میں تھا۔ شاید یہ ناممکن ہے کوئی دو انسان ایک تجربے میں اس طرح ہو سکتے ہیں جس طرح کہ تم دونوں ہو۔" ناصر نے کہا اور سوچا کہ یہ اچھا ہو کہ ان کا یہ آخری مکالمہ بھی انہیں ان گنت مکالموں کی بے ہیئت لفظیت اور معنویت کے انتشار کے اسلوب میں آ جائے جس میں کوئی کچھ بھی کہہ سکتا ہے اس طرح کہ جیسے کچھ نہیں کہہ رہا۔ ہر کسی کو مخاطب کر سکتا ہے اور جیسے مخاطب کوئی نہیں۔ مگر اس کے ذہن نے اس خیال کی نفی کی۔ نہیں یہ مکالمہ ویسا بھی نہیں۔ انتشار کی آنکھ مچولی آج میسر نہیں ہوگی۔ چیزیں سیاہ و سفید کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

"کوئی بھی دو شخص کیسے بھی ہوں۔ اپنا اپنا الگ تجربہ رکھتے ہیں۔" زہرہ نے تلخ لہجے میں ناصر سے کہا۔

"ہاں اس یاد دہانی کی ضرورت نہیں اپنی اپنی ذات کا قید خانہ سب جانتے ہیں۔ میرا اور دو میرا درد ہے وغیرہ۔ یہ ایک اصول کی بات ہے۔ مگر ہم اس سے پہلے کی بات کر رہے ہیں۔ لوگ اس حد تک ایکتا میں چلے جاتے ہیں کہ شاید اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔" اور زہرہ نے سوچا اگر اس شخص کی باتوں پر مجھے غصہ آتا ہے تو مجھے اس غصے کو اور بھی آگے بڑھ کر قبول کرنا چاہیے اس طرح شاید مجھے اس گہری نیلی اداسی سے نجات مل جائے وقتی طور پر ہی سہی شاید جو لمحہ لمحہ اندر اترتی چلی جا رہی ہے اور اس نے کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو ناصر" اور اسے اپنا کہا بہت بھدا لگا۔

"کچھ بھی نہیں۔" ناصر بولا "میں...... صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کبیر کہتا ہے میرے ایام اسیری۔ تو...... میرے ایام اسیری ابھی تمام نہیں ہوئے مجھے آزاد کر دو......"

کبیر نے اس وقت سلیٹی سی جھاڑیوں اور ڈھاک کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے کسی شے کو متحرک دیکھا مگر دوسرے لمحے وہاں کچھ بھی نہیں تھا پھر وہ اگلے ہی لمحے اس معمولی سی بات کو بھول بھی گیا اور ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"مگر یہ پہلا موقعہ نہیں ہے یہ کچھ نیا نہیں ہے کہ ہم اپنے اس تعلق کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم بار ہا اسے سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ جب ہم چاروں تھے اور اب جب کہ ہم تینوں ہیں......"

"دونوں کہو ایک 'میں' اور ایک 'تم'...... دونوں" ناصر نے کہا۔

"آہ...... یہ ایک اداس کرنے والی بات ہے ناصر"۔ کبیر نے کہا۔

"میرے لیے بھی شاید۔ مگر یہ ہے" ناصر بولا

"شاید ہمارے مدتوں پر محیط مکالمے اس ناممکن تعلق کو سمجھنے کی کوشش تھے۔" زہرہ نے کہا

"شاید مگر ہمیشہ ہر کوشش کے بعد آخر میں سب کو وہی کچھ سمجھ میں آیا جو کبیر نے چاہا۔ تم اپنی دنیا میں کسی کو پر بھی نہیں مارنے دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں پرواز کر رہے ہیں۔ لمبی اڑان میں ہیں مگر ڈور تمہارے ہاتھ میں رہتی ہے۔ جب چاہو کھینچ لو...... تم ناممکن کھیل شروع کرتے ہو اور اپنے ساتھ والوں کو بوکھلا دیتے ہو۔ پھر انہیں کھیل کے لالچ میں تھوڑا تھوڑا امکان تقسیم کرتے ہو تا کہ وہ تمہارے اسیر رہیں۔"

کبیر مسکرایا اور ایک عجیب سی اپنائیت سے ناصر کی طرف دیکھنے لگا "ایام اسیری نے تمہاری قوت بیانیہ پر عمدہ اثر ڈالا ہے۔ ناممکن کے کھیل...... تھوڑا تھوڑا امکان تقسیم کرنا۔ واہ، کاش یہ الفاظ میرے کسی کام آ سکتے مگر یہ بھیانک الفاظ ہیں...... اگر میں اس بیانیے کی گرفت میں آتا ہوں تو میں ایک قابل نفرت ہستی ہوں۔"

کبیر کے الفاظ سن کر ناصر مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ ان کے مکالمے کی اس منزل پر بہت غیر متوقع تھی۔ وہ ایک عجیب خوفناک مسکراہٹ تھی۔ "قابل نفرت ہستی کیا تم جانتے ہو قابل نفرت

Scanned by CamScanner

ہستی کیا ہوتی ہے۔ قابلِ نفرت ہستی ہونا کیا ہوتا ہے۔ تم صرف لفظوں سے کھیل سکتے ہو۔ جیسے تم ہمیشہ لفظوں کے کھیل کھیلتے رہے ہو اور جو نہیں کھیل سکتے انہیں اپنا غلام بنائے رکھتے ہو۔ قابلِ نفرت ہستی ہونا کیا ہوتا ہے تم اپنے خون میں نہیں جانتے۔" ناصر نے کہا اور اس کا کہا سناٹے پر حاوی ہونے لگا۔

کبیر خاموش رہا اور زہرہ حیرت سے ناصر کو دیکھ رہی تھی اور ناصر نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ نفرت ذلت کو جنم دیتی ہے مگر ذلت کو قبول کرنے والا نفرت اور محبت دونوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔ جیل میں میں نے اس راز کو پا لیا تھا..... اور تم نے دیکھا تھا کہ میں نے یہ راز پا لیا تھا....."

"ہاں۔ میں نے دیکھا تھا....." کبیر نے کہا اور اُسے احساس ہوا بہت اندر اور گہرا کہ سب کچھ کسی بڑے خاتمے کی طرف بڑھ رہا ہے اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اس کا یہ احساس ایسا ہے اور وہ لمحے ایسے ہیں کہ اس احساس کو بھی ان ہی کے مکالمے کے کل کا جز بنانا چاہیے اور اس نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ لازم ہے کہ جو بھی میرے اندر ہے وہ اس مکالمے میں شامل کر دوں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں ناصر..... زہرہ..... کہ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ چیزیں اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہیں کیوں کہ یہ انکشاف کی گھڑیاں ہیں۔"

"تمہیں یہ احساس اب ہوا ہے مگر میں اسے عرصے سے ساتھ لیے پھرتا ہوں۔ مجھے اس لمحے کا انتظار تھا۔ خاتمے کے لمحے کا..... تو تم نے دیکھا تھا کہ میں نے ذلت کے زہر سے آزادی کا شہد نچوڑ لیا تھا..... مگر پھر تم لوگ وہاں آنے لگے۔ اور سب کچھ پھر زہرناک ہونے لگا اور پھر تم اس خلا میں لپٹے برہنہ میری کوٹھری میں آئے میں نے یہ آخری فیصلہ کیا میں تم سے بھی آزادی حاصل کروں گا..... ویسے ہی جیسے میں نے دس لاکھ بے نام گم نام انسانوں کے ہجوم کی ذلت سے آزادی حاصل کی۔ میں نے جان لیا کہ جب تک میں تمہارے قرب کی خواہش کی غلامی سے آزادی حاصل نہیں کروں گا سب کچھ جھوٹ رہے گا۔ میں چاہتا تھا تم مجھے رد کر دو..... مجھے رہا کر دو....." اس نے کہا۔ اور وہ خاموش ہو گیا اور زہرہ نے دیکھا کہ کبیر کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔

امیر جان نے ڈھاک کے جھنڈ میں پڑے بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے لیٹ کر اور اپنے پستول کو ایک دوسرے پتھر پر ٹکا کر فیصلہ کیا اب اگر وہ سامنے آیا تو یہ ایک بے مثال مورچہ ہے جو

نشانہ باز کے لیے بے خطا نشانے کی سب شرطیں پوری کرتا ہے۔ اس کا سانس جو چڑھائی کے بعد پھول رہا تھا اب صرف اس لمحے کے انتظار میں بے ترتیب تھا۔ اگر وہ خود اس کے مورچے کے سامنے نہ آیا تو پھر وہ خود جائے گا اور.....

جنوبی آسمان کا سناٹا گہراؤ کے قریب کھڑے تینوں افراد کی گہری چپ کو ٹکاتا ہر سمت پھیل گیا، بند جگہوں کی سانس روکنے والی خاموشی کے برعکس یہ عظیم وسعت اور اتھاہ گہرائی کا سناٹا تھا جو کنارے پر کھڑے شخص کے ساتھ گہراؤ میں اڑان کی آزادی کی سازش کرتا تھا اور پھر اس کے پاؤں کی غلامی پر اس کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ ان تینوں کی نظریں گہراؤ کے آگے کی وسعت میں گم تھیں..... پھر جب زہرہ نے دیکھا کہ کبیر کنارے کی طرف بڑھ گیا ہے تو کسی بھی تشویش یا خوف کا کوئی بھی تاثر اس کے دل میں پیدا نہ ہوا اور وہ بھی کنارے کی طرف بڑھ گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔ سینکڑوں فٹ نیچے سنگلاخ نوکیلی چٹانیں گرنے والے کی ازلی بھوک لیے کھڑی تھیں۔

"آؤ تم بھی دیکھو ناصر" کبیر نے پیچھے مڑ کر ناصر سے کہا۔

"میں دیکھ چکا ہوں" اس نے جواب دیا "مگر تم کہتے ہو تو پھر دیکھ لیتا ہوں۔ خودکشی کرنے کے لیے یہ ایک مثالی مقام ہے" اور وہ بوجھل قدم اٹھاتا آیا اور ان کے قریب ہی کنارے پر کھڑا ہو گیا پھر اس نے نیچے نگاہ ڈالی تو کبیر نے کہا۔

"میرا تعلق اس علاقے سے ہے اور یہاں اس جگہ کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوئی روایت نہیں۔"

"میرا ایسا کوئی تعلق نہیں" ناصر نے کہا۔

"یہ ایک عمودی گہراؤ ہے اور روکنے والا کوئی نہیں" زہرہ نے کہا اور پھر اندر ہی اندر چونک گئی اس نے کس کو مخاطب کیا ہے کسی کو بھی نہیں۔ وہ کسی سے بھی مخاطب نہیں تو پھر کون کس سے مخاطب ہے۔ صرف کبیر صرف کبیر ہی سب سے پھر مخاطب ہے۔ پھر زہرہ نے وہ سوال کیا جو اپنے آپ سے چھپا رہی تھی۔ "کیا ناصر سچ کہتا ہے کیا ناصر سچ کہتا ہے۔"

"ہم میں سے کوئی بھی بلندیوں کے خوف میں مبتلا نہیں" کبیر کہہ رہا تھا۔

"مگر بلندیوں کے عذاب میں ضرور مبتلا ہیں" زہرہ نے کہا اور دیکھا کہ کبیر کے چہرے پر وہی سرخی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں وہی سیاہی تھی جسے وہ خوب جانتی تھی۔

Scanned by CamScanner

''مگر خودکشی کے معقول انجام، الزام کے علاوہ بھی کچھ حقیقت اس مقام میں ہے'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''گہراؤ کا یہ کنارہ گہرائی میں اتر جانے کی آزادی اور زمین میں پاؤں گڑنے کی خواہش کے درمیان جھولنے والا چکر اور اپنے والا لمحہ ہے، روکے جانے اور رہائی پانے کے بیچ سسنتا ہوا گہراؤ ہے اور یہی وہ گہراؤ ہے جو کلام اور کلام کی اور ان کہی اور ہونی اور ان ہونی کے درمیان ہے۔ عشق کا ہر عمل گہراؤ میں اندھی چھلانگ ہے۔ آزادی جو بولنے والے کا بولنے والے سے تعلق ہے اور خلائی۔ وہ بھی بالکل یہی تعلق ہے۔ مگر جو میرے ساتھ گر نہیں سکتا وہ میرے ساتھ ٹھہر نہیں سکتا۔'' کبیر ناصر کو دیکھ رہا تھا اور زہرہ کبیر کو دیکھ رہی تھی سن رہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور کچھ نہ بولی۔ اور پھر اپنے آپ سے مخاطب ہوئی ''ناصر سچ کہتا ہے یہ شخص لفظوں کا ایک ایسا عفریت ہے جو اپنے ارد گرد کے دنیا والوں کی سوچوں کو ہڑپ کر جاتا ہے۔''

''یہ الفاظ بالکل تمہارے جیسے... مکمل کبیر کے کہے جیسے....... جو تم کہہ رہے ہو ناممکن لفظوں کی دنیا میں قید کر کے تم دوسرے کو سر پٹخنے کے لیے چھوڑ دیتے ہو مگر اپنے گہراؤ کی بات کرتے ہو جو خاموشی اور گویائی کے بیچ ہے۔ جس میں کودنے پر مجبور کر کے تم دوسرے کی بے بسی کا نظارہ کرتے ہو مگر گہراؤ اور بھی ہیں جن سے تم واقف ہی نہیں۔ میں اپنا گہراؤ ساتھ لیے پھرتا ہوں جس میں تم ڈر کے مارے ہو اور نہ کنارے پر کھڑے رہ سکتے ہو۔'' ناصر نے کہا۔

کبیر کنارے سے ہٹ آیا اور پھر وہ تینوں اس چٹان کی طرف بڑھے جہاں کچھ دیر پہلے ناصر ٹیک لگا کر کھڑا رہا تھا۔۔۔ گہری خاموشی پھر تینوں پر اتر آئی اور گہراؤ میں گونج تھی۔

آخر کبیر نے ناصر کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا ''تو تم کوئی اعتراف کرنا چاہتے ہو۔ کوئی اعتراف گناہ'' اور ناصر اپنے قدموں پر پتھر ہو گیا اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبیر کو دیکھا۔ اور اس کے چہرے پر مایوسی اور مکمل بے چارگی اور شکست کی کیفیت زہرہ کے دل میں کسی تیز دھار آلے کی طرح اتر گئی۔ اس نے فیصلہ کیا وہ اس شخص کو تنہا نہیں چھوڑے گی۔ مگر یہ کس اعتراف کی بات ہے جس نے ناصر کو پتھرا دیا ہے۔

''تو تم...... یہ بھی جانتے ہو'' ناصر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں۔ میں جانتا ہوں شروع سے'' کبیر نے اعتراف کے لہجے میں کہا پھر ہنسا ''کم از کم یہ اعتراف میں بھی کر سکتا ہوں'' اور پھر زہرہ نے اسے دیکھا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ وہ آنکھوں اور

تیز سی مسکراہٹ کے ساتھ۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ناصر کے کس اعتراف کی بات کرتے تھے مگر اس نے کبیر کو اس طرح مخاطب کیا کہ جس طرح اسے مخاطب کرنا وہ مدتوں سے بھول ہی گئی تھی اور پھر ناصر کا سچ اس کے منہ سے بولنے لگا۔

''تم نے یہ کبھی سوچا کبیر۔ جانتے ہو۔ تم ہی ہو یہاں۔ اور ہمیشہ تم ہی ہو جسے کبھی کوئی اعتراف نہیں کرنا ہوتا۔ اس لیے کہ اعتراف۔ اعتراف گناہ ہو یا کچھ اور...... تمہارے اسیر کو کرنا ہوتا ہے...... تم ہر اعتراف سے بلند ہو۔''

''آہ...... میں نے ٹھیک کہا تھا۔ چیزیں اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہیں تو شاید تمہیں بھی کوئی اعتراف کرنا ہے۔ ناصر کے اس عظیم الشان اعتراف سے پہلے ہی۔ جسے میں پہلے ہی سے جانتا ہوں۔''

''تم ایک سب کچھ پہلے سے جاننے والے اتراتے ہوئے۔ سستے...... لفظی شعبدے دکھانے والے۔ اکڑباز۔ گھمنڈی ہو۔''

زہرہ نے غصے سے کہا اور اسے احساس ہوا کہ وہ کیا فضول بکواس کر رہی ہے مگر وہ بکواس بھی کتنی ضروری ہے۔

''میں سمجھتا تھا کہ عشق پر ناممکن مکالمے کا زمانہ بیت گیا مگر شاید یہ میری بھول تھی اس لیے کہ یہ مکالمہ ہمیشہ ناممکن ہی نہیں نامکمل بھی رہے گا۔ کیا ایسا ہی ہے ناصر...... زہرہ......''

ناصر کا چہرہ اترا ہوا تھا کسی ایسے لڑاکے کی طرح جو لڑائی کے لیے کوئی خفیہ پینترہ سوچ کر آیا تھا مگر اس کے استعمال سے پہلے ہی اس کے دشمن نے اسے بے اثر کر دیا۔ اپنی ذلت کے اعتراف سے ان کی نفرت چھپا کر رد ہونے کی کوشش یہ سب کچھ اب اسے ایک بچگانہ خیال لگا۔ مگر کیا زہرہ جانتی ہے؟ نہیں وہ نہیں جانتی اور اس نئی صورت حال نے اسے ایک اور سطح پر بے حال کر دیا۔ زہرہ نہیں جانتی......

''میں نے سنا نہیں تم نے کیا کہا......'' ناصر نے کبیر سے کہا۔

''میرے اوپر ابھی انکشاف ہوا تھا۔ عشق پر ناممکن مکالمہ ہمیشہ نامکمل رہے گا اس لیے بوجوہ اس پر ابدی و ازلی بک بک کی گنجائش ہمیشہ رہے گی۔ اپنے اس بیان کی صحت یا عدم صحت پر تمہاری رائے مطلوب ہے۔''

Scanned by CamScanner

ناصر کچھ نہ بولا اور اس نے سوچا کہ ہرمافروڈائٹس کی اساطیری غیبی امداد وہ اب کبھی استعمال نہیں کر سکے گا۔ شاید اس کی گنجائش ہی موجود نہیں اور زہرہ کہہ رہی تھی۔

"کوئی بھی مکالمہ آخری مکالمہ نہیں ہو سکتا۔ سوائے 'بھورے بادشاہ کے مکاشفات' کے مگر وہ مکالمہ نہیں تھے۔ موت سے پہلے تک ہر مکالمہ کھلا رہتا ہے۔" زہرہ نے کہا۔

"بے شک۔ مگر تم ایک کمزور حمایتی ہو۔ ناصر کو تمہاری انسانی ہمدردی والی حمایت کی ضرورت نہیں" کبیر نے ہنس کر کہا۔

"بکومت تم" زہرہ نے بے ساختہ چیخ کر کہا۔

"میں یقیناً ایسا ہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر تم..... اس کے اعتراف کو تو دیکھو..... تم یہ تو دیکھو کہ وہ اپنے قابل نفرت فعل کی دہائی دے کر رہائی لینے آیا تھا۔ جسے میں پہلے ہی جانتا ہوں۔ تم اس کی کیا مدد کر سکتی ہو۔"

"تم شروع سے جانتے ہو..... اور تم..... تمہیں..... اس سے کچھ فرق نہیں پڑا..... تم مجھے ویسا ہی..... تمہیں..... میرے بارے....." ناصر نے کچھ کہنا چاہا اور کہہ نہ سکا۔

اور زہرہ کی نیلی اداسی میں سیاہی پھیلنے لگی۔ "یہاں کچھ ایسا ہے جسے میں نہیں جانتی" اس نے سوچا اور گہراؤ کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ سنہرے پرندے نیلگوں فضا میں بے تکان پرواز کر رہے تھے۔ اس نے لمحے کے لیے اپنے آپ کو پرندوں میں ایک پرندہ کر دیا اور رہائی کا ایک لمحاتی احساس اس کے اندر آیا اور رہا مگر پھر کبیر کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے اور وہ جان گئی کہ گہراؤ میں یک دم گرنا کیسا ہوتا ہے۔

"میں شروع سے ہی جان گیا تھا کہ عزیزہ ورس مختار بیگم کے الزامات اگر سب سچ نہیں تو سب جھوٹ بھی نہیں۔ خصوصاً پیرانائیڈ خاتون کے حوالے سے۔ تمہاری رہائی جیسا تم نے اشاروں میں کہا تھا جب ہم تمہارے گھر بیٹھے تھے اور مدد علی کی تعیناتی کا منصوبہ بنا رہے تھے تمہارے وکیل کی قابلیت کا نتیجہ تھی نہ کہ حق کی فتح..... مگر یہ سب کچھ میرے لیے تمہارے مقام کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ تمہارا کوئی اعتراف مجھے حیران نہیں کر سکتا۔"

اور پھر کبیر نے دیکھا کہ ناصر اس کی بجائے زہرہ کی طرف دیکھ رہا ہے اور زہرہ..... جیسے کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی۔ وہ دیکھنے سے آگے مسلسل گرنے کی کیفیت میں ہے۔ آخر وہ مڑی اور گہراؤ

کے کنارے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ سنہرے پرندوں میں سے کسی نے حلق میں سے چیخ جیسی آواز نکالی اور سب ایک ہی اڑان میں اوپر اٹھتے چلے گئے۔

کبیر اور ناصر نے ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھا جیسے دونوں ہی خطا کار ہوں پھر ناصر نے کہا۔

"مگر شاید تم یہ نہیں جانتے۔ مجھے یقین ہے تم یہ نہیں جانتے کہ تمہارا نیلا رجسٹر اب بھی میرے قبضے میں ہے....."

ایک بے ساختہ حیرت کی چیخ جیسی آواز کبیر کے حلق سے نکلی "نیلا رجسٹر میرا نیلا رجسٹر۔ لکھائی کا وہ دوسرا یا شاید تیسرا شاہکار تمہارے قبضے میں ہے؟"

اور زہرہ نے یہ سنا تو جیسے ایک زوال کے خاتمے کے بعد کسی دوسرے زوال کے آغاز کی طرف بڑھنے کے لیے جیسے اس نے پھر سے جنم لے لیا اور کنارے سے واپس آ گئی۔ "وہ تمہارے پاس ہے نیلا رجسٹر۔" الفاظ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے۔

"ہاں۔ جب ہم کبیر کو جلتے ہوئے کمرے سے نکال رہے تھے تو اس کے سرہانے پڑا تھا..... میں نے اسے بھی تھام لیا تھا۔ تمہیں پتہ نہیں چل سکا تھا۔"

"اور تم نے..... بتایا ہی نہیں کبھی....." زہرہ کے لہجے کی حیرت ناصر کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔

یک دم کبیر نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور گھمبیر لہجے میں کہنے لگا "آ..... نہیں..... اعتراف۔ بازیافت..... انکشاف اور دریافت کے بعد الزام ایک پوچ انتخاب ہے۔ اور عزیزہ یہ جان لو کہ چھپانے کا بھی ایک وقت ہے اور بتانے کا بھی ایک وقت ہے..... مگر اس کلام کے لئے مجھے اپنے خشک حلق کو تر کرنا ہوگا۔ جل چھتری کے جل کے ایک قطرے سے جو ایک قطرہ ہی سب پیاس بجھا دیتا ہے۔"

اور سمیال کے کبیر مہدی کے یہ آخری الفاظ تھے جو زہرہ نے اور ناصر نے اور کسی بھی انسان نے سنے۔

وہ جل چھتری کی طرف بڑھا۔ سرمئی چٹانوں سے آگے آیا وہ اس چٹان کے قریب پہنچا تو اس کے پاؤں جیسے ہوا میں اٹھ رہے تھے۔ وہ اتنا ہلکا پھلکا تھا جیسے سب وزن ختم ہو چکے ہوں وہ

Scanned by CamScanner

چھری کی سل پر لیٹا تو خنکی کی لاتعداد لہریں اس کے جسم میں دوڑ گئیں پھر اس نے منہ کھول دیا اس
کی آنکھیں چٹان کے اس سیمیں شگاف پر جم گئیں جہاں سے پانی کا قطرہ نکل کر اس کے حلق کے
اندر سیدھا خشک گرتا تھا اور وہ گرا اور اسے ہر دفعہ کی جانی پہچانی مگر ہر دفعہ کی انوکھی خوشی کا احساس
ہوا اور پھر اگلے قطرے کے انتظار میں اسے نیلے رجسٹر کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ ناصر کے
ہاتھ میں آگ سے نکلتے وقت وہ کچھ نہ کچھ جلا تو ضرور ہوگا اور یہ آخری خیال تھا اور پھر اسے اپنی
بائیں کنپٹی پر جلن کا احساس ہوا اور یہ آخری احساس تھا اور اس کے دائیں ہاتھ نے خفیف سی
حرکت کی اور یہ آخری حرکت تھی اور اس کے بعد ایک مردار جامد کائنات تھی جو ہونی اور انہونی کی
باقیات حنوط کرنے کے لیے ازل سے تیار کھڑی تھی۔

امیر جان نے اپنے شکار کی حرکت کا انتظار کیا مگر کوئی حرکت نہ تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ
دونوں دوسرے جو دوسری طرف کھڑے تھے اور اسے اپنے "مورچے" سے نظر آتے تھے۔ گولی کی
آواز سن کر آئیں گے تو وہ انہیں بھی نشانہ بنائے گا۔ مگر انہوں نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ آگے بڑھا
اور اس چٹان کے قریب چلا گیا جس کے نیچے وہ لیٹا تھا اور اس نے دیکھا کہ گولی اس کی بائیں کنپٹی
سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس نے اپنے سچے نشانے پر اپنے آپ کو داد دی۔ مگر پھر
یک دم کچھ حرکت ہوئی اور وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا مگر پھر کوئی حرکت نہ تھی وہ اس کے کھلے منہ کو
دیکھتا رہا جو خون سے بھرا تھا اور پھر اچانک پانی کا قطرہ شڑاپ سے اندر گرا۔ اور خون اس کے
ہونٹوں کے کناروں سے نیچے اترنے لگا۔

زہرہ اور ناصر نے دھماکے کی آواز سنی اور اسے اس مقام کے کسی نامعلوم غیر متعلق واقعے کی
طرح نظر انداز کر دیا۔ وہ اپنے اپنے مقام پر کھڑے ایک اٹل چپ میں مبتلا تھے اور اس انتظار میں
کہ کبیر کی واپسی ہی شاید کوئی گویائی کا معجزہ لائے گی مگر وہ گویائی بھی کیا ہوگی وہ نہیں جانتے تھے اور
پھر انہوں نے ایک ساتھ ہی اسے دیکھا وہ سرمئی چٹانوں سے نکل کر ان کے بہت قریب آ چکا تھا
اس کی پچکی پچکی وحشت ناک آنکھیں زہرہ پر جمی تھیں اور زہرہ نے اس کے ہاتھ میں کھنچے پستول کو
دیکھا تو وہ دھماکہ جیسے اسے پھر سنائی دیا اور ایک لمحے میں کیا کچھ بیت گیا تھا اس کے اندر موت کی
طرح اترا اور ایسا ہی کچھ ناصر پر بیت گیا۔

"کبیر" زہرہ کے حلق سے چیخ نکلی جو نیلگوں سناٹے میں گونج چلی گئی۔ اس نے کبیر کی

طرف بھاگنا چاہا تو وہ آگے آ رہا تھا اور ناصر نے دیکھا کہ اچانک زہرہ وہاں سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر
کھائی کی طرف جا رہی ہے اور پھر اس نے ناصر کو نشانہ بنانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ناصر
نے ان لمحوں کے جنون میں جب موت اچانک سامنے آتی ہے۔ زہرہ کو آواز دی "زہرہ پیچھے
مت جاؤ" اور پھر اپنی موت کے ساتھ اس موت لانے والے کی موت یقینی بنانے کے لیے وہ
وحشت کے عالم میں کسی تند خو جانور کی طرح اس کے جسم سے ٹکرایا۔ ٹکراؤ میں گولی اس کے
کندھے کے قریب سے گزر گئی اور امیر جان جو چند قدم ہی پیچھے گہری کھائی کی موت سے آگاہ
نہیں تھا انہیں پھر سے نشانہ بنانے کے لیے تیزی سے پیچھے ہٹا اور اتنا پیچھے کہ اس کے توازن کے
خاتمے کے لیے کافی تھا۔

اور پھر وہ دونوں اسی وحشت و دیوانگی کے لمحوں میں اس طرف بھاگے جس طرف کبیر گیا تھا
اور زہرہ نے دیکھا کہ جل پتھری کا ٹھنڈا پانی پتھری سل سے پھوٹ کر نکلتی بھاری پھل دار تلخ جڑی
بوٹیوں اور سبز گھاس کو سینچتا سینچتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

O

علاقے کے تھانے دار راجہ شیر گل کے لیے یہ ایک قتل کی آسان واردات تھی۔ قاتل مقتول
دونوں ختم۔ آلۂ قتل برآمد۔ موقع کے گواہ موجود جو مقتول کے ساتھ تھے جو قاتل کو نہیں جانتے تھے۔
مقتول علاقے کا تھا اس کا خاندان قاتل کو نہیں جانتا تھا۔ پھر اس نے اونچے فیصلے کرنے والی
جگہوں سے حکم مانگا ہر جگہ سے ایک ہی حکم آیا۔ کیس داخل دفتر۔ نہ کوئی تفتیش کا جھنجھٹ نہ کوئی
کارروائی کی بک بک۔ داخل دفتر۔

شام گہری ہو کر رات بن رہی تھی جب اس نے مقتول کے ساتھی مرد عورت کو جانے کی
اجازت دی۔ پھر اس نے دونوں پاؤں میز پر رکھے اور ہاتھوں کو سر کے پیچھے باندھ کر کرسی پیچھے
جھلائی اور حوالدار راسب علی سے قاتل کے بارے میں کارروائی کا پوچھا "کارروائی کیا راجہ
صاحب بس بوٹیاں ہی اکٹھی کرنی تھیں۔"

"اچھا اچھا بس دفع کرو داخل دفتر"۔

"ویسے راجہ صاحب وہ گھاٹی ہے بڑی خطرناک"۔

Scanned by CamScanner

''خدا کا شکر کہ جس نے وہ کھائی بنائی اور وہ جہنم واصل ہوا۔ ورنہ وہ اُسے مار کر اور مجھے کُتی بے سب کو ہی مار کر نکل جاتا تو ہم بھی مارے گئے تھے یا نہیں، واصل دفتر۔''

''جی راجہ جی'' حوالدار راسب علی نے اتفاق کیا اور چائے کی پیالی تھانیدار کے سامنے رکھی۔

اس نے آنکھیں میز سے ہٹالیں اور چائے کی طرف ہاتھ بڑھانے کی بجائے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام لیا اور ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔

''ویسے راسب علی اتنی خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی''۔

حوالدار راسب علی نے تھانیدار کی رائے کو جانچنے میں کچھ وقت لیا اور بولا۔

''آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی راجہ صاحب۔ ویسے مرنے والا بھی کم نہیں تھا۔''

''ہاں۔ اور یہ بات دل کی ہی ہے''۔

اور پھر وہ دونوں اُس دن کے واقعات پر ان کہی کہانیاں بننے لگے جو مدتوں سمبیال کی وادی کے چھوٹے بڑے تھانوں میں گردش کرتی رہیں۔

O

بوڑھا مرد جھکی ہوئی کمر کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ اس نے چولہے میں سلگتی آگ پر پانی ڈالا اور گھر کی سب بتیاں بجھا دیں پھر وہ بوڑھی عورت کے ساتھ گھر کے سب سے تاریک کمرے میں چلا گیا۔

''تمہارا بیٹا اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔'' وہ بولا

''تم ہی اس کو بھیجنے والے ہو..... اور تم ہی.....'' بوڑھی عورت آگے کچھ نہ بول سکی۔ بوڑھے نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور پھر وہ تاریکی اُن کی تھکے ہوئے زخمی بوڑھے جانوروں جیسی آوازیں سننے لگی جس تاریکی میں ان کے تعلق نے بھی اسے جنم دیا تھا۔

O

زہرہ اور ناصر اس جگہ پہنچے جہاں انہوں نے اپنی گاڑیاں کھڑی کی تھیں۔

''میں اوپر جا رہی ہوں'' اُس نے بے حس لہجے میں کہا۔ بہت دیر سے انہوں نے آپس میں

کوئی بات نہیں کی تھی۔

''اس وقت رات بہت تاریک ہے۔'' ناصر نے کہا

''ہاں! ایسا ہی ہے تم اگر جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔''

ناصر نے سر جھکا لیا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''تم اگر مجھے ساتھ جانے کی اجازت دو گی تو میں جاؤں گا۔ اگر اجازت نہیں دو گی تو پھر بھی میں جاؤں گا۔'' زہرہ کچھ نہ بولی

تاریک رات میں وہ مقام ایسا تھا کہ جیسے سب کچھ گہراؤ کی اتھاہ تاریکی میں شامل ہو گیا ہو اور ہر اگلا قدم ہی آخری کنارہ ہو۔ زہرہ سیدھی لمبی رات کی طرف قدم اُٹھاتی چٹان کے نیچے جھکی اور اس نے اپنا جسم پتھر پر لمبا پھیلا دیا۔ پھر جل پتھری کا قطرہ اس کے ماتھے کے بیچ گرا اور ٹوٹ کر اُس کی دونوں آنکھوں کی طرف ڈھلک گیا۔

ناصر سرمئی چٹانوں کے ساتھ گہرے اندھیرے میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اُس کا ذہن اُسی عظیم گہراؤ کی طرح خالی تھا۔ سوائے اس عورت کی موجودگی کے احساس کے جو گہراؤ کے اوپر کسی سنہرے پرندے کی طرح تیرتا تھا۔ رات تھی اور سناٹا اب کامل اور اٹل تھا مگر سنائی دیتا تھا۔ چٹان کے نیچے سے..... ڈھاک کے درختوں کے جھنڈ میں سے پتھریلی مٹی کی درزوں سے اور شاید روشن ستاروں سے۔ ایک آہٹ کی طرح۔ ایک چاپ کی طرح۔ رات گزرتی تھی اور جل پتھری کے قطرے مسلسل اُس کے ماتھے پر گرتے تھے اور اس کی آنکھوں کو دھو ڈالتے تھے۔

سورج نکلا اور ایک جادوئی صبح اس مقام پر روشن ہو گئی۔ زہرہ چٹان کے نیچے سے باہر آئی تو کسی موتی کی طرح اُجلی تھی۔ اس کی دھلی ہوئی آنکھیں شفاف اور روشن تھیں۔ پھر اس نے ناصر کو دیکھا جو سرمئی چٹان کے ساتھ اُگی گھاس میں سمٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ایک طویل سانس لیا اور بولی ''ناصر''

ناصر کی آنکھیں سیدھی اُس پر کھلیں تو وہ اُسے صبح کے نیلے آسمان میں بلند نظر آئی اور اس کے ماتھے پر سورج چمک رہا تھا۔

''آؤ ناصر'' اُس نے کہا اور اُتران کی طرف بڑھ گئی۔

O

Scanned by CamScanner

گولڈبرگ نے مائیکل ووڈز کو یہ بُری خبر فون پر سنائی کہ یونیورسٹی اس کے احمقانہ ریسرچ پراجیکٹ پر گرانٹ دینے سے انکاری ہے اور وہ اپنا بے وقوفانہ کام منسوخ سمجھے۔

"ریسرچ اُن کا کہنا ہے۔ آرکیالوجیکل ریسرچ۔ مقاماتِ قدیمہ کے آثار پر کی جاتی ہے۔ آرکیالوجسٹس کے آثار پر نہیں"۔

"مگر میری دلچسپی آرکیالوجی سے زیادہ آرکیالوجسٹس میں ہے" ووڈز نے کراہتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے بھی تم میں یعنی آرکیالوجسٹ میں اتنی دلچسپی ہے اس لیے میں سمجھتی ہوں سیا اچھا ہوا ورنہ تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتے۔ اب اُدھر کا رُخ بھی نہ کرنا"۔

"میں۔ رُخ کر چکا ہوں۔ میں اس خاتون کو غلام باغ کا مسودہ کی عکسی نقل دے بیٹھا تھا۔

"کیا" دوسری طرف گولڈبرگ کی چنگھاڑ سنائی دی۔ "تم نے وہ مسودہ اس حرافہ کو دے دیا۔ میرے خدا"۔

"صرف نقل میڈم گولڈبرگ صرف نقل ..... میں اس کی درخواست پر انکار نہیں کر سکا؟"

"جلد ہی تم اُسے کچھ بھی انکار نہیں کر سکو گے۔ ووڈز تم میرے اندازے سے کہیں بڑے احمق ثابت ہوئے ہو۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم اس قدر واہیات سطح پر پہنچ جاؤ گے"۔

"میرا خیال ہے زبان کو قابو میں رکھا جائے" ووڈز نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اور تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو"۔

"اگر یونیورسٹی مجھے گرانٹ نہیں دے رہی تو میرے قابو میں رہنے یا نہ رہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا"۔

"جہنم میں جاؤ" سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اور ووڈز نے ٹھنڈا سانس لیا اور سوچا۔ تو وہ اب اپنے آپ پر ہے۔ یا ہاف مین کی باقیات ہیں اور وہ عورت ہے۔ پھر وہ اپنی آرام دہ کرسی میں گہرا دھنس کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا وہ عورت جسے وہ مسودے کی نقل دے کر آیا تھا وہ اس حسین مقامی عورت تھی جس سے وہ کلارا گولڈبرگ کے ساتھ ملا تھا مگر پھر بھی جیسے اب وہ کوئی دوسری عورت تھی اور ایک بے نام اُلجھن تھی جو بڑھتی جا رہی تھی اور پھر اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اس اُلجھن سے اتنی آسانی سے چھٹکارا نہیں پا سکے گا۔

O

بیت المقدس کے کاغذ کا آخری پرزہ تک زہرہ کے سپرد کر کے امداد حسین نے سب کچھ فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ بڑے شہر کے علم کے پیاسوں اور سستی سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدنے کے شائقین میں یہ خبر پھیلتی چلی گئی کہ شہر کی پرانی کتابوں کی سب سے کارآمد دکان میں کتابوں کی لوٹ سیل لگا دی گئی ہے اور یہ خبر صحیح بھی ثابت ہوئی تھی اور پھر جب چند ہی دنوں میں سکالرز اولڈ بکس شاپ ہر طرح کی کتاب سے خالی ہو گئی تو امداد حسین نے دکان کو تالا لگایا اور سنڈ رشام روڈ کی ذیلی گلیوں میں سے ہوتا بڑے شہر کے انبوہِ عظیم میں ایک گم نام نقطے کی طرح غائب ہو گیا۔

O

"غلام باغ میں جب شام رات کی طرف بڑھتی ہے تو یہ گھڑیاں اکثر مشکل فیصلوں اور انوکھے ارادوں کی گھڑیاں بن جاتی ہیں۔ تم نے کبھی ایسا سوچا، دیکھا ناصر؟" زہرہ نے ناصر سے کہا جو اس کے ساتھ ہی جنم کھنڈر کے قریب ایک پرانی مسمار شدہ دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا جی پی کا بیگ اٹھا کر ایک طرف رکھا اور دیوار پر دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں رکھ کر اوپر کو اٹھا اور زہرہ کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں اب سوچتا ہوں میں ابھی تک اُسی لمحے میں دیکھ رہا ہوں جس میں کبیر نے مجھے دیکھنے کا مشورہ دیا تھا یا شاید حکم دیا تھا" وہ گہری لگاوٹ سے ہنسا۔

"کس لمحے میں" زہرہ نے پوچھا۔

"تم ابھی نہیں آئی تھیں اور کہتے غلام باغ بھی ہوا کرتا تھا ایسے ہی بہار کی شام تھی مگر ہلکی بارش ہو رہی تھی جو اسے بہت پسند تھی پھر اچانک اُس نے مجھے کہا تھا۔" اسی لمحے میں دیکھو..........."

"اور پھر.........." زہرہ کی آنکھوں میں گہرا اشتیاق تھا۔

"اور پھر میں دیکھنے لگا اور اسے بتانے لگا پھر میں خاموش ہو گیا مگر پھر بھی اُسی لمحے میں دیکھتا رہا مگر شاید بتانا چھوڑ دیا...... یا شاید کم کر دیا.........."

زہرہ مسکرائی "تو تم اسی لمحے سے آزادی چاہتے تھے.........."

"اب بھی ہوں...... چاہتا ہوں...... مگر اب اس لمحے کی قید سے رہائی مجھے تم دے سکتی ہو۔"

زہرہ نے گہری نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی اور شام غلام باغ میں چند قدم اور آگے بڑھ گئی اور پھر بولی "میں نے کہا تھا ناں غلام باغ میں دن کی یہ گھڑیاں مشکل فیصلوں اور انوکھے ارادوں کی گھڑیاں بن جاتی ہیں۔"

"میں بھی مشکل فیصلوں کی بات کر رہا ہوں....."

"خواہ وہ آزادی غلامی کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو........"

"غلامی اگر آزادی سے قبول کی جائے تو غلامی نہیں رہتی۔ یہ کبیر نے کہا تھا" ناصر نے کہا اور زہرہ ہنس پڑی۔

"اس کے لفظوں پر مت جاؤ......... جانتے ہو میں کبھی بھی اس کے لفظوں پر نہیں جاتی تھی........"

ناصر مسکرایا "کیا واقعی؟ کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو؟"

زہرہ صدیوں پرانی دیوار سے نیچے اتری تو کھریا مٹی کا ایک ٹکڑا نیچے گرا۔ زہرہ نے جھک کر اسے اٹھایا اور اسے واپس اسی جگہ پر بٹھانے کی کوشش کی جہاں سے وہ اکھڑا تھا۔ "نہیں اب یہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ غلام باغ کی صدیوں سے ٹوٹ کر اب یہ اسی لمحے کا قیدی بن گیا ہے....."

ناصر ہنسا اور زہرہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم ہنسے کیوں؟"

"اس کی محبت میں جو ہم میں نہیں ہے مگر ہر دم ہے..... میں نے سوچا اس بے وقعت سے واقعے پر کبیر بات کرتا تو ایسے ہی کرتا..... جیسے تم نے کی ایسے ہی لفظوں میں شاید....."

"تو پھر میرے لفظوں پر بھی مت جاؤ" زہرہ ہنسی

"میرے لیے ایسا ممکن نہیں ہے" ناصر نے کہا "میرے لیے۔ کبیر کے لفظوں کے لیے ایسا کبھی ممکن نہیں تھا..... اور شاید اسی لیے ایک وقت آیا کہ.......... مگر شاید آزاد لوگ ایک دوسرے کے لفظوں پر نہیں جاتے........" ناصر نے بے چینی سے اپنا بیگ اٹھایا۔ "میں وہ لایا ہوں.......... اس کے الفاظ..... تمہاری امانت..... کبیر کا نیلا رجسٹر۔"

اور ناصر نے اپنے بیگ سے نیلے جلے ہوئے گتے کا وہ رجسٹر نکالا تو زہرہ کا سارا بدن تن

گیا۔ پھر اس نے لرزتے ہاتھوں میں اسے تھاما جیسے وہ کوئی بہت نازک جیتی جاگتی ہستی تھی اور ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ پھوٹ جانے والی تھی۔ وہ دیر تک اسے ویسے ہی دیکھتی رہی پھر اس نے اسے چہرے کے قریب لا کر سونگھا اور صرف اتنا کہا۔

"ہاں یہ اُس کا ہے.......... اور ناصر میں جنم کھنڈر کے کھنڈر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

زہرہ اس بے تکلفی سے رجسٹر کو سینے سے لگائے اور ناصر اپنے کھلے بیگ کو اٹھائے غلام باغ کی روشوں۔۔ غلام باغ کی صدیوں پر قدم اٹھاتے جنم کھنڈر کی جانب بڑھے تو وہ کسی ایسے اجنبی جوڑے جیسے لگ رہے تھے کہ جسے پبلک مقامات پر اپنی چیزیں سمیٹنے کا سلیقہ نہ ہو۔

"یہ وہ آخری امانت ہے جو وہ تمہارے سپرد کرتا" ناصر نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ناصر..... اگر یہ....." وہ ہنسی "لا۔ لکھائی..... وہ اسے لالکھائی کا شاہکار کیا کرتا تھا۔ یا نہیں دوسرا شاہکار۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا تھا..... لیکن اگر وہ..... آج بھی ہوتا۔ یہ اسے مل جاتا تو..... وہ..... آخری فیصلہ..... جو اس نے کرنا تھا..... لکھنے یا سبزیاں بونے کے بارے میں..... وہ کیا ہوتا.........."

ناصر نے کچھ دیر سوچا اور بولا "میں نہیں جانتا..... مگر اب..... اب یہی فیصلہ تم نے کرنا ہے....."

زہرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور گزرتے گزرتے اس نے ڈالیا کا پھول توڑنے کی کوشش کی مگر جب وہ پودا اسی ساتھ میں اکھڑ کر ہاتھ میں آنے لگا تو اس نے وہیں چھوڑ دیا.........

"تو تم جانتے ہو..... ہاں..... مگر وہ کوئی مشکل فیصلہ نہیں..... وہ اپنی سب لا۔ لکھائیاں میرے لیے چھوڑ گیا....."

"تو پھر مشکل فیصلہ کیا ہے" ناصر نے زہرہ سے پوچھا۔

وہ جنم کھنڈر کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی زنجیر گھیراؤ کے گرد کافی فاصلے پر حائل تھی اور ایک بے زار سا چوکیدار انہیں آگے جانے سے منع کر رہا تھا اور انہیں بہت مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاف مین کی روح یہیں کہیں تیرتی ہوگی" زہرہ نے اُداسی سے کہا۔

Scanned by CamScanner

''وہ ووڈز کا کیا بنا......'' تم نے مسودہ لے لیا۔

''نقل...... ہاں......'' وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''وہ دلچسپ قصہ ہے اس نے ذرا چوں چراں نہیں کی۔''

''ہاں ملکہ سبا کے سامنے......'' ناصر نے کہا

زہرہ نے اُس کی طرف ایک نظر دیکھا۔ غلام باغ کے مغربی اُفق پر سُرخ شفق میں دور دور تک بھورے لہریے دوڑ رہے تھے۔ زہرہ نے گہرا سانس لیا۔ ''چلو ناصر چلیں''

اور ناصر انہیں قدموں پر پتھر ہو گیا اور لمحے ان دونوں کے درمیان گزر گئے اور پھر اس نے زہرہ کی آواز سنی جس میں بے نام کرختگی تھی۔

''تم نے کہیں اور جانا ہے؟......''

''بھوری مائی کا غلام اور کہاں جا سکتا ہے'' اُس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

دُور کھڑے جنم کھنڈر کے محافظ نے اب سخت پریشانی سے اُن مرد عورت کو دیکھا جن کی چال ڈھال اُسے دیر سے مشکوک لگ رہی تھی اور اب اُن کے ارادے بھی عجیب لگ رہے تھے۔

زہرہ ہنسی اور ناصر نے کہا ''تمہیں اُس خط کی داستان میں بھوری مائی اور اُس کے غلام کی آمد یاد ہے زہرہ............''

زہرہ ایک دم پھر بہت سنجیدہ ہو گئی اور بولی ''مجھے سب یاد ہے۔''

اور پھر وہ دونوں گھراؤ کو دُور سے دیکھتے واپس آئے۔ زہرہ چند قدم آگے تھی مگر جیسے گن گن کر قدم اُٹھا رہی تھی پھر اُس نے ہاتھ میں تھاما نیلا رجسٹر بہت آہستہ بہت نازک کھولا اور کبیر نے کہا ''فکشن کے خالق کو خدا بننے کا اختیار کس نے دیا ہے۔'' اور زہرہ گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

غلام باغ میں ہوا اور بھی بھیگ رہی تھی اور رات آ رہی تھی۔

OOO